Registered No. D--207

جلد ۱ نمبر ۵ || ۱۶ جولائی ۱۹۴۸ء || ایڈیٹر: ڈاکٹر سید عابد حسین

خوف کاہے کا؟

مہاتما گاندھی

میں اپنے سفر کے سلسلہ میں جہاں کہیں بھی گیا مجھ سے لوگوں نے پوچھا کہ "ہندوستان کو فوری ضرورت کس چیز کی ہے؟ ...... (میرے نزدیک) عام الفاظ میں سب سے بڑی اور فوری ضرورت صحیح مذہبی روح کی ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ جواب بہت عام ہے جس سے کوئی شخص مطمئن نہیں ہو سکتا اور پھر یہ جواب تو خاص اس وقت کی حالت پر نہیں بلکہ ہر وقت اور زمانے کے حالات پر صادق آتا ہے۔ میرا مطلب دراصل یہ ہے کہ چونکہ ہماری مذہبی روح سوئی ہوئی ہے اس لئے ہم ایک دائمی خوف کی حالت میں زندگی بسر کرتے ہیں ہم دنیوی حکام سے بھی ڈرتے ہیں اور دینی پیشواؤں سے بھی۔ ہماری اتنی مجال نہیں کہ پنڈتوں اور پروہتوں کے سامنے اپنی رائے کا اظہار کر سکیں۔ اسی طرح ہم پر دنیوی حکام کا رعب طاری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس طرح ہم اپنے حق میں بھی برا کرتے ہیں اور ان کے حق میں بھی۔ نہ تو ہمارے روحانی معلموں کی اور نہ ہمارے حاکموں کی یہ خواہش ہو سکتی ہے کہ ہم سچائی کو ان سے چھپائیں۔ ظاہر ہے کہ نڈر ہونے کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ ہم دوسروں کا جیسا چاہیئے ادب نہ کریں یا ان کے جذبات کا احترام نہ کریں۔ میری ناقص رائے میں کسی حقیقی یا مستقل کامیابی کے حاصل کرنے کی پہلی ناگزیر شرط یہ ہے کہ ہم نڈر ہوں۔ یہ صفت بغیر مذہبی شعور کے پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہم خدا سے ڈریں تو پھر ہمیں انسان کا ڈر نہیں رہے گا...... اگر ہم اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ ہمارے اندر خدا موجود ہے جس سے ہمارا کوئی خیال اور کوئی فعل چھپا ہوا نہیں جو ہمیں سیدھے رستے پر چلاتا ہے اور ہماری حفاظت کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ ہمیں خدا کے سوا دنیا میں کسی کا خوف نہیں رہے گا۔ اس احکم الحاکمین کی وفاداری اور ہر قسم کی وفاداری پر مقدم ہے اور اس کے بغیر کوئی وفاداری کچھ معنی نہیں رکھتی۔"

میں نے ہندوستان بھر کے سفر کے دوران میں یہ دیکھا کہ ہمارے ملک پر اور خاص کر ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ پر ایسا خوف مسلط ہے جس نے اس کے دل و دماغ کو شل کر دیا ہے۔ ہماری مجال نہیں کہ لوگوں کے سامنے ہونٹ تک ہلائیں اور ان خیالات کا اظہار کر سکیں جو ہمارے دل میں راسخ ہیں۔ چوری چھپے ہم ان کا ذکر کر سکتے ہیں۔ اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ مگر ایسی باتیں برملا کہنے کی نہیں ہیں۔ اگر ہم خاموشی کا عہد کر لیتے تو مجھے کوئی اعتراض نہ تھا۔ مگر جب ہم مجمع عام میں چہکنا شروع کرتے ہیں تو بہت کچھ کہہ ڈالتے ہیں جسے ہم دراصل دل سے نہیں مانتے۔ شاید ہر پبلک لیڈر کا جو ہندوستان میں مجمع عام میں تقریر کرتا ہے یہی تجربہ ہوگا۔ اس لئے میں آپ سے یہ کہتا ہوں کہ صرف ایک ہی ذات ہے۔ اگر اس کے لئے ذات کا لفظ مناسب ہو جس سے ہمیں ڈرنا چاہیئے اور وہ خدا ہے۔ جب ہم خدا سے ڈرتے ہیں تو ہمیں کسی انسان کا ڈر نہیں ہونا چاہیئے وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ اگر آپ کسی شکل میں بھی حق کی پیروی کا عہد کرتے ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آپ کا دل خوف سے خالی ہو۔ چنانچہ بھگوت گیتا میں بے خوفی کو ایک برہمن کی پہلی اہم صفت قرار دیا گیا ہے۔ ہم نتائج سے ڈرتے ہیں اس لئے سچی بات کہتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ جو انسان خدا سے ڈرتا ہے وہ یقیناً کسی دنیاوی نتیجے کی پروا نہیں کرے گا۔ قبل اس کے کہ ہم اس مقام تک پہنچنے کی ہمت کریں جہاں مذہب کی حقیقت سمجھ میں آتی ہے یا ہندوستان کی رہنمائی کا منصب حاصل کرنے کا حوصلہ کریں کیا آپ کے نزدیک یہ ضروری نہیں کہ ہم بے خوفی کی عادت ڈالیں؟ یا ہمیں یہ کرنا چاہیئے کہ جس طرح ہم خود مرعوب ہیں اسی طرح اپنے ہم وطنوں پر رعب جمائیں؟"

"انگریز اپنی جان ہتیلی پر لئے پھرتے ہیں۔ عرب اور پٹھان موت کو ایک معمولی سی تکلیف سمجھتے ہیں اور جب کوئی مر جاتا ہے تو کبھی نہیں روتے۔ یورپ کی عورتیں موت کے خوف سے بالکل آزاد ہیں۔ جنگ یورپ میں ہزاروں یورپی عورتیں بیوہ ہو گئیں۔ انہوں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی۔ کیا ہوا اگر شوہر یا بیٹا مارا گیا۔ یہ کیا کم ہے کہ ملک کی عزت بچ گئی؟ اگر ملک غلام بن جاتا تو شوہر کس کام کا؟ اپنے بیٹے کے جسم فانی کو دفن کر دینا اور اس کی لافانی یاد کو دل میں رکھنا اس سے اچھا ہے کہ اسے زرعی غلام بنا کر رکھا جائے۔ ان باتوں سے یورپی عورتوں نے اپنے دل کو مضبوط کیا اور اپنے پیاروں کو موت کے فرشتے کے حوالے کر دیا۔ جن لوگوں کا ہم نے نام لیا وہ مار کر مرتے ہیں۔ مگر ان لوگوں کا کیا کہنا جو دوسروں کو نہیں مارتے بلکہ خود مرنے کو تیار رہتے ہیں۔ ایسے لوگ ساری دنیا کی تعریف کے مستحق ہوتے ہیں یہی ہیں جنھیں خلاصۂ کائنات کہہ سکتے ہیں۔

فہرست مضامین

قیمت فی پرچہ تین آنے

اسلامی تہذیب کی روح

خواجہ غلام السیّدین

(۱)

(الف)

بہت سے لوگ ان تبدیلیوں سے جو ہماری قوم پر گذر رہی ہیں اور دوسری قوموں پر گذر رہی ہیں اس شدت سے متاثر ہیں کہ وہ تہذیبی مسئلوں کی کوئی اہمیت نہیں سمجھتے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایٹم بم ہر چیز کا خاتمہ کر دے گا اور جب مذہبی جنون کی آگ بھڑکے گی تو ساری تہذیبی قدریں جل کر راکھ ہو جائیں گی جب روما کا شہر جل رہا ہو تو بانسری بجانا بے حسی نہیں تو اور کیا ہے؟

آئیے ذرا اس نقطۂ نظر پر غور تو کریں۔ دراصل یہاں یہ بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کی سب سے اچھی اور قیمتی چیزیں کیا ہیں؟ جو گوناگوں مشاغل ہماری توجہ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں ان کی قدر و قیمت کے تعین کا ہم کون سا معیار اختیار کریں؟ کیا یہ دانشمندی کا فعل ہے کہ جب لڑائی سر پر منڈلا رہی ہو تو ہم آرٹ اور ادب، سماجی اور اخلاقی قدروں کی ادھیڑ بن میں رہیں اور "ذہنی دنیا" کی فضاؤں میں اڑتے رہیں؟ یا ہم سر دست ان چیزوں کو بالائے طاق رکھ دیں، صرف سیاسی اور فوجی چالیں سوچتے رہیں اور ان چیزوں پر غور کرتے رہیں جو عملی مسائل کے شاندار نام سے یاد کی جاتی ہیں؟ اگر ہم ایسا کریں تو اس کے کیا معنی ہیں؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب ہم خطروں میں گھرے ہوں تو ہمیں ان سب چیزوں سے ہاتھ دھو لینا چاہئے جو زندگی میں لطف اور معنویت پیدا کرتی ہیں، جو اسے سچائی، خوبصورتی اور نیکی سے آراستہ کرتی ہیں جو انسان کو بہیمیت کی سطح سے اونچا کرتی ہیں۔ مگر یہ تو بالکل الٹی بات معلوم ہوتی ہے۔ آخر ہم ایک آزاد اور طاقتور قومیت کی تعمیر کس لئے کرنا چاہتے ہیں؟ اسی لئے تاکہ ایسے حالات پیدا ہوں جن میں انسان کی تخلیقی روح حق اور حسن کی جستجو میں سرگرمی دکھا سکے؟ نوعِ انسانی کی حقیقی تاریخ، جو اس نام نہاد تاریخ سے بالکل الگ ہے جس سے ہماری درسی کتابیں بھری پڑی ہیں، جنگ و جدال اور سیاسی کشمکش کی روداد نہیں بلکہ اس سعی پیہم کی داستان ہے جو عورتیں اور مرد کبھی الگ الگ اور کبھی مل جل کر صنعت اور دستکاری، ادب اور شاعری، سائنس اور فلسفہ کی ترقی کے لئے اور عمرانی تعلقات کی درستی کے لئے کرتے رہتے ہیں۔ میں معاشی اور سیاسی جدوجہد کی اہمیت کو کم کر کے نہیں دکھانا چاہتا۔ میں بے تامل تسلیم کرتا ہوں کہ تہذیبی و اخلاقی کا کوئی نظام انگیز نہیں ہو سکتا جب تک اس کی بنیاد سازگار مادی حالات اور معقول معیارِ زندگی پر قائم نہ ہو۔ لیکن ہم لوگوں کے لئے جو گرمی کی حالت میں بھی، گو ذہنی اور روحانی اقدار کی خدمت میں مصروف ہیں، ضروری ہے کہ جو چیزیں مقدم ہیں ان کو مقدم سمجھیں، وقت کے لحاظ سے نہیں بلکہ اہمیت کے لحاظ سے۔ مجھے آکسفورڈ کے ایک پروفیسر کی بات یاد آتی ہے جو انھوں نے تیس سال ہوئے پہلی جنگ عظیم کے دوران میں کہی تھی۔ فوج کے ایک بڑے افسر نے کسی قدر حقارت سے بیٹھے ہی پوچھا "پروفیسر صاحب آپ جنگ کے زمانے میں ملک کی کیا خدمت کر رہے ہیں؟" انھوں نے سوکھے منہ سے جواب دیا "جی کچھ نہیں صرف اس تہذیب کی تخلیق میں مدد دیتا رہا ہوں جس کی آپ اپنے خیال میں حفاظت کر رہے ہیں۔" اس لئے اگر ہم اپنے وقت اور اپنے فکر و عمل کو ان اقدار کے لئے صرف کرتے ہیں تو ہمیں کسی معذرت کی ضرورت نہیں اس لئے کہ دنیا کی نجات انھیں اقدار کی صحیح قدر و قیمت کے پہچاننے اور ان میں ایک نئی روح پھونک کر ان سے ایک زندہ محرک قوت کا کام لینے پر موقوف ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کی موجودہ الجھن صرف سیاسی اور معاشی الجھن ہے اندھے یا کم نظر ہیں۔ دراصل یہ ایک روحانی کشمکش ہے، اخلاقی اقدار کی جنگ ہے یہ جنگ اس شدت اور وسعت کے ساتھ تو پہلے کبھی نہیں ہوئی مگر یوں ہمیشہ سے جاری ہے۔ دنیا کی تاریخ ایک مسلسل کشتی ہے یہ امن تخلیق اور تخریب کی قوتوں میں، محبت اور نفرت میں، عام انسانی برادری اور تنگ نظرانہ فرقہ بندی میں، معاشی انصاف اور طبقہ واری استبداد میں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ہر تہذیبی یا علمی تحریک جو تخلیقی روایات کو اور انسانی برادری کی تحریک کو تقویت پہنچائے تو یہ انسان کی قابلِ قدر خدمت ہے۔

(ب)

یہ تو ایک تمہید تھی جس میں نے عام طور پر تہذیبی اقدار کی تحقیق و تلاش کی طرف توجہ دلائی۔ مگر اس مضمون میں خاص طور پر مجھے اسلامی تہذیب کی قدر و قیمت سے بحث کرنی ہے۔ اس سے مراد وہ تہذیب ہے جس نے مذہب اسلام کے فیضان سے پچھلے چودہ سو سال میں نشوونما پائی۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہم سب ہندوستانیوں کے لئے خواہ وہ کسی مذہب و ملت کے ہوں بلکہ اور قوموں کے لئے بھی ایسی تہذیب کا مطالعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی بہت سی وجوہ ہیں جن میں سے میں صرف دو کا ذکر کروں گا۔ ایک تو آج کل کی دنیا میں ایسی وحدت پیدا ہو گئی جو پہلے کبھی نہ تھی ان تمام اختلاف اور جھگڑوں کے باوجود جو بین الاقوامی معاملات میں نظر آتے ہیں یہ بات اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے۔ دراصل یہ اختلافات اسی لئے اور زیادہ خطرناک ہیں کہ سب ملک ایک دوسرے سے اس قدر وابستہ ہو گئے ہیں کہ ایک کے فائدے یا نقصان کا اثر سب پر پڑتا ہے اور یہ وابستگی صرف معاشی یا صنعتی نہیں بلکہ ذہنی اور تہذیبی بھی ہے۔ خیالات اشیاء اور انسانوں سے کہیں زیادہ تیزی سے حرکت کرتے ہیں۔ ایسی دنیا میں لوگوں کا ایک دوسرے کی تہذیب سے ناواقف ہونا صرف حماقت اور بدتہذیبی ہی نہیں بلکہ بڑی خطرناک چیز ہے۔ اب کوئی قوم یا جماعت یہ نہیں کر سکتی کہ اپنے گرد ایک حصار کھینچ لے اور اس کے اندر رہ کر اپنی تہذیبی خصوصیات کو دوسری تہذیبوں سے الگ تھلگ رکھ کر نشوونما دے۔ غرض دنیا میں تہذیبی دولت کی لین دین بہت ضروری ہے اور اس میں اسلامی تہذیب دوسری تہذیبوں کو بہت کچھ دے سکتی ہے اور ان سے بہت کچھ لے سکتی ہے۔ دوسروں سے علیحدگی اور بے تعلقی خود اسلامی تہذیب کی روح کے بھی منافی ہے اور اگر اس نے یہ طرز اختیار کیا تو اندیشہ ہے کہ اپنی تخلیقی قوت سے اور قوت حیات سے ہاتھ دھو بیٹھے گی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ہندوستان صدیوں سے متعدد تہذیبوں کو اپنے دامن میں جگہ دیتا رہا ہے اور وہ ایک جگہ سے نا مدہ اٹھاتی رہی ہیں اور باہم مل جل کر ایک ہم آہنگ مشترک تہذیب بناتی رہی ہیں۔ ان میں دراوڑی تہذیب، ہندو آریہ تہذیب (اور اس سے قدرے مختلف بودھ تہذیب)، مسلم تہذیب (جو ترکوں، ایرانیوں اور مغلوں کی تہذیب سے مرکب تھی) اور انگریزوں کی لائی ہوئی مغربی تہذیب خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ہندوستانی ذہن ہمیشہ سے فراخ دلی اور رواداری کے لئے مشہور ہے۔ اس نے باہر سے آنے والے تہذیبی تحفوں کو رد نہیں کیا بلکہ ان کو اپنی قومی تہذیب میں سمیٹنے کے اندر بڑی لچک اور نشوونما کی صلاحیت ہے جذب کرتا رہا۔ اس کا یہ طرزِ عمل صرف آریوں کے ساتھ جو سب سے پہلے باہر سے آئے تھے اور مسلمانوں کے ساتھ جو ہزار برس سے یہاں رس بس گئے ہیں نہیں تھا بلکہ انگریزوں کے ساتھ بھی جنھوں نے فاتح بن کر رہنا چاہا اور صرف ڈیڑھ سو برس تک ٹک سکے۔ باوجود ان ناگوار اور ناسازگار حالات کے جن میں مغرب کا سابقہ ہندوستان سے رہا، مغربی تہذیب کے بہت سے عناصر ہماری تہذیب کا جزو بن گئے۔ اب ہی مسلم تہذیب (میں نے خاص کر کے مسلمانوں کی تہذیب کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ اس لئے کہ ہندوستان کی مسلم تہذیب کو صرف مسلمانوں ہی نے نہیں بنایا بلکہ یہ بہت سے فرقوں کے باہمی تعاون سے تعمیر ہوئی) تو اس کے اثرات اتنے متعدد اور مختلف ہیں اور عام ہندوستانی تہذیب میں اس طرح پیوست ہو گئے ہیں کہ اگر ان کو الگ کرنا چاہیں تو اندیشہ ہے کہ یہ ساری تہذیب ہی درہم برہم ہو جائے گی۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ پچھلے سیاسی واقعات نے جس کی وجہ سے ہندو مسلمانوں کے تعلقات حد سے زیادہ بگڑ گئے تھے، یہ خطرہ پیدا کر دیا ہے کہ اس خوبصورت ہم آہنگ تہذیب کو برباد کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس رجعت پسندانہ ذہنیت کے بہت سے آثار نظر آ رہے ہیں جن کو روکنے کی اور خود اس ذہنیت کی اصلاح کی بہت سخت ضرورت ہے۔ صرف مسلمانوں کی خاطر نہیں بلکہ ہندوستانی تہذیب اور خود ہندوستان کی خاطر۔ جب تک ہندوستان کی تقسیم کا زخم ہمارے دلوں میں ہرا ہے۔ یہ رویہ سمجھ میں آ سکتا ہے اگرچہ اسے جائز نہیں ٹھہرایا جا سکتا لیکن اگر ہندوستان کو تہذیب کے میدان میں عظمت اور بلندی حاصل کرنی ہے تو اس کی تہذیبی روایات کے تسلسل میں خلل نہیں پڑنا چاہئے۔ کچھ دن ہوئے مولانا آزاد نے ایک کانووکیشن ایڈریس میں فرمایا تھا "ممکن ہے دوسری قوموں کو اپنے اندر وسعت نظر اور رواداری پیدا کرنے کے لئے ایک نئے سبق کو سیکھنے کی ضرورت ہو لیکن جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے ہم فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو ہماری قدیم تہذیب کی ایک بنیادی خصوصیت ہے اور ہمارے اندر ہزاروں سال سے رچی ہوئی ہے۔ یہاں سب مذہبوں، سب تہذیبوں اور سب معاشرتوں کو آزادی تھی کہ جیسے چاہیں اپنی نجات کی راہ تلاش کریں۔" کیا ہم رواداری اور وسعت قلب کی اس میراث کو اب بیسویں صدی میں جب کہ اس کی ہمیشہ سے زیادہ اور شدید ضرورت ہے چھوڑ دیں گے؟ مہاتما گاندھی نے اپنی فطری حق پرستی اور انصاف پسندی کی بدولت اس خطرے کو محسوس کر لیا تھا اور اپنی عظیم الشان شخصیت کی پوری قوت سے ملک کو اس سے محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہے تھے اور بار بار متنبہ کرتے تھے کہ سماجی، سیاسی اور تہذیبی تنگ نظری اکثریت کے لئے اور اقلیتوں کے لئے یکساں مہلک ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ

(بقیہ ملاحظہ ہو صفحہ ۲)

پچھلا ہفتہ :- ہندوستان

۱- ریاستوں کی وزارت کی سال گرہ

۵ جولائی کو ریاستوں کی وزارت کی عمر ایک سال کی ہوگئی۔ اپنی سال گرہ منانے کے لئے وزارت نے ایک "سفید کاغذ" شائع کیا ہے جس میں اپنے محکمہ کی کارگزاریاں مختصر طور پر بیان کی گئی ہیں۔

برطانیہ اس بات کا فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ پندرہ اگست کو ہندوستان کے ہاتھ میں سارے اختیارات منتقل کر دے گی۔ برطانوی ہندوستان کے اختیارات تو پاکستان اور انڈین یونین کے درمیان تقسیم کئے جانے والے تھے لیکن دیسی ریاستوں پر جو اقتدار اعلیٰ اسے حاصل تھا اسے وہ اپنے پچھلے معاہدوں اور وعدوں کا عذر کر کے پاکستان یا انڈین یونین کے سپرد کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھی۔ کم سے کم اس کے لئے تو اسے وہ ریاستوں ہی کو لوٹانا چاہتی تھی لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس طرح کام چلے گا نہیں۔ اکثر ریاستیں اتنی چھوٹی تھیں ان کے برطانوی ہند کے تعلقات خصوصاً مدافعت، حمل و نقل اور خبر رسانی اور تجارتی معاملات کے سلسلہ میں اتنے قریبی تھے اور وہ برطانوی ہندوستان پر انحصار کرنے کے لئے اس قدر مجبور تھیں اور ان کی رعایا کی ہمدردیاں برطانوی ہندوستان کے ساتھ اتنی زیادہ تھیں کہ وہ کسی طرح برطانوی ہندوستان سے، جو اب پاکستان اور انڈین یونین میں تقسیم کیا جانے والا تھا، آزاد نہیں رہ سکتی تھیں۔ اس لئے ان نئی ریاستوں کے ساتھ باہمی اشتراک کی کوئی صورت نکالنا ناگزیر تھی۔ چنانچہ ریاستوں کی یہ وزارت ۵ جولائی ۱۹۴۷ء کو اس غرض سے قایم کی گئی تھی کہ وہ ریاستوں کو خارجی طور پر تو باہم متحد ہونے اور پھر انڈین یونین میں شامل ہونے اور داخلی طور پر ذمہ دار حکومت قایم کرنے کے لئے مایل کرے اور جب تک ریاستیں اس کے لئے مایل نہ ہوں ان کے ساتھ معینہ مدت کے لئے معاملات کو جوں کا توں رکھنے کا معاہدہ کرے۔

"سفید کاغذ" میں اس بات کو کھول کر بیان کیا گیا ہے کہ اپنے اس کام کو ریاستوں کی وزارت نے کس طرح انجام دیا۔ جوناگڑھ، کشمیر اور حیدرآباد کے معاملوں کا اس میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ صرف ان ریاستوں کا ذکر ہے جہاں باہمی معاملات کا تصفیہ پر امن طریقہ پر اور خوش دلی اور رضامندی کے ساتھ کیا گیا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ریاستوں کی وزارت کا یہ کارنامہ بہت زیادہ شاندار ہے۔

کام کی وسعت اور اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ تقسیم سے پہلے کے ہندوستان میں ریاستوں کی تعداد ۵۶۲ اور ان کی کل آبادی نو کروڑ تیس لاکھ تھی۔ اس میں سے انڈین یونین کو جن ریاستوں سے [illegible] ان کی آبادی آٹھ کروڑ نوے لاکھ ہے یعنی پاکستان کے حصہ میں دیسی ریاستوں کی صرف چالیس لاکھ آبادی آئی ہے۔

انڈین یونین نے ان ریاستوں کے ساتھ چار قسم کے معاہدے کئے ہیں یا تو اس نے (۱) انھیں ملحقہ صوبوں میں ضم کر دیا ہے (۲) ان کے انتظام کو مرکزی حکومت نے چلانا شروع کر دیا ہے (۳) انھیں باہم متحد کر دیا ہے یا (۴) انھیں اپنی سابقہ حالت پر قایم رکھا ہے لیکن ہر صورت میں ان کے یہاں ذمہ دار حکومت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

پہلے قسم کا معاملہ جن ریاستوں کے ساتھ کیا گیا ان کی تعداد ۲۱۹ اور ان کی آبادی ایک کروڑ بیس لاکھ ہے۔

دوسرے قسم کا معاملہ جن کے ساتھ کیا گیا ہے ان کی تعداد ۲۲ اور ان کی آبادی ۱۴ لاکھ ہے۔

تیسرے قسم کا معاملہ جن کے ساتھ کیا گیا ہے ان کی تعداد ۲۹۱ اور ان کی آبادی ۲ کروڑ ۲۰ لاکھ ہے اور ان کی چھ یونین بنا دئے گئے ہیں یعنی سوراشٹر، متسیا، وندھیا پردیش، راجستھان، مدھیہ بھارت اور پٹیالہ یونین۔

چوتھے قسم کا معاملہ ان ریاستوں کا ہے جن کی ایک جداگانہ حیثیت مان لی گئی ہے۔

ریاستوں کی وزارت کو ان معاملات کے طے کرنے میں بہت سخت کام کرنا پڑا تب کہیں یہ کامیابی میسر آئی اور اس کے لئے سردار پٹیل اور ان کے سرگرم سکریٹری مسٹر مینن مبارک باد اور شکریہ کے مستحق ہیں۔

ابھی کام ختم نہیں ہوا ہے۔ بہت سے ضروری کام کرنا باقی ہیں۔ ریاستوں کے طرز حکومت میں بنیادی تبدیلیاں کرنا ہیں۔ لیکن سردار پٹیل کے تدبر، دور اندیشی اور عزم مصمم سے ہمیں امید ہے کہ جلد ہی ایسے حالات پیدا ہو جائیں گے کہ انڈین یونین کے دوسرے صوبوں اور دیسی ریاستوں کے طرز حکومت میں کوئی فرق باقی نہیں رہے گا اور یہاں کی آبادی بھی اسی قسم کی جمہوریت اور سماجی اور معاشی ترقی سے فیض یاب ہو سکے گی جیسی کہ ہندوستان کے باقی صوبوں میں رائج ہوگی۔

۲- ہندوستان میں فولاد کا نیا کارخانہ

"نئی روشنی" کے پچھلے نمبروں میں ہم بتلاتے رہے ہیں کہ معاشی ترقی کے لئے ہندوستان کو فنی مہارت اور مشینوں کی کتنی سخت ضرورت ہے اور ان کے حاصل کرنے کے لئے وہ بیرونی امداد کا کس درجہ محتاج ہے۔ اس سلسلہ میں حکومت ہند جو کارروائیاں کر رہی ہے اس میں ہم نے چیکوسلواکیا کے تجارتی وفد کی آمد کا تذکرہ کیا تھا۔ جاپان سے بھی ایک تجارتی وفد آیا ہوا تھا اور ان دونوں ملکوں سے جو بات چیت کی گئی ہے اس کی بنا پر ماہروں اور مشینوں کے ملنے کی امید ہے۔ برطانیہ نے اسٹرلنگ قرضہ کے سلسلہ میں جو معاہدہ کیا گیا ہے اس کا بھی نتیجہ نکلے گا کہ ہندوستان وہاں سے مشینیں اور فنی ماہروں کو حاصل کر سکے گا۔ امریکہ سے بھی اسی قسم کی امداد حاصل کرنے کی کوششیں برابر جاری ہیں۔ ان ہی کی ایک کڑی وہ معاہدے ہیں جو فولاد کا ایک کارخانہ قایم کرنے کے سلسلہ میں امریکہ اور برطانیہ کے ایسے تین ممتاز فرموں سے کئے جا رہے ہیں جنھیں اس قسم کے کارخانے قایم کرانے کا عملی تجربہ ہے۔ یہ فرم حکومت ہند کو مشورہ دیں گے کہ دس لاکھ ٹن فولاد تیار کرنے کے لئے ہندوستان میں کس قسم کے وسائل اور امکانات موجود ہیں۔ ان فرموں سے چھ مہینے کے اندر رپورٹ دینے کے لئے کہا گیا ہے۔

فولاد کی ہمارے زمانے میں جو اہمیت ہے وہ محتاج وضاحت نہیں۔ جنگ اور امن کے تمام [illegible] کاموں میں فولاد کا استعمال کیا جاتا ہے اسی لئے ملکوں کی عظمت اور [illegible] کا شمار ان کی فولاد کی پیداوار کو دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ معاشی ترقی کی جو اسکیمیں فی الحال ہندوستان کے سامنے ہیں ان کے لئے فولاد کی ضرورت کا تخمینہ ۲۵ لاکھ ٹن سالانہ کیا گیا ہے۔ ہندوستان میں اس وقت جو فولاد کے کارخانے موجود ہیں ان میں صرف ۱۵ لاکھ ٹن سالانہ پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔ اس لئے بقیہ دس لاکھ ٹن کے لئے ایک اور مزید کارخانہ کو قایم کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اس نہایت ضروری پیداوار کے لئے ہندوستان دوسروں کا محتاج نہ رہے۔

حکومت ہند نے فولاد کے لئے جو کمیٹی مقرر کیا تھا اس کی رپورٹ میں اندازہ کیا گیا تھا کہ اس قسم کے کارخانے کے بنانے میں پانچ سال لگیں گے اور دو سال مزید اس کی پیداوار کو ستر فیصد شرح سالانہ تک پہنچانے میں لگیں گے اور اس کی لاگت کا اندازہ پچاس کروڑ روپیہ کیا گیا تھا۔

بہرحال کام صحیح بنیاد پر شروع کیا جا رہا ہے اور امید ہے کہ اس کے نتائج ضرور اچھے ثابت ہوں گے۔

۳- متحدہ اقوام کا کشمیر کمیشن

متحدہ اقوام کے کشمیر کمیشن کے اراکین دہلی آنا شروع ہو گئے ہیں اور وہ اپنا کام شروع کرنے والے ہیں۔ حکومت ہند کی طرف سے انھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں اور غالباً مسٹر دلوڈی کو ان کے کام میں ضروری امداد دینے کے لئے مقرر کیا جا رہا ہے۔ کراچی میں جو بیان کمیشن کے ایک رکن نے دیا ہے اس سے ان کے ارادے بھی نیک معلوم ہوتے ہیں لیکن اس قسم کے کمیشنوں کا جو تجربہ دنیا کو اب تک ہوا ہے اس کی روشنی میں ان کی ان نیک ولاید کوششوں سے کوئی قابل اطمینان نتیجہ نکلنے کی امید قایم نہیں کی جا سکتی اور ان [illegible] معاملات متعلق کے بارے میں غالب کا ہم نوا ہو کر یہ کہنے کو جی چاہتا ہے

حضرت ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرش راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

۴- آہ بریگیڈیر عثمان!

بریگیڈیر عثمان کی جواں مرگی جہاں ایک طرف ساری قوم کے لئے ایک صدمہ جانکاہ ہے وہاں دوسری طرف ساری قوم کے لئے ایک پیغام ہمت اور بلند حوصلگی بھی ہے۔ وہ ایک جانباز سپاہی تھے، وہ ایک سرفروش مجاہد تھے، وہ ایک وفادار محب وطن تھے، وہ ایک سچے مسلمان تھے۔ برطانوی فوج کے افسر کی حیثیت سے بھی انہوں نے کارہائے نمایاں انجام دئے تھے، لیکن جب ۱۵ اگست کو ہندوستان کو آزادی ملی تو اپنی ذمہ داری کے احساس نے قومی فوج کے اس مسلمان سپاہی کو ادائے فرض سے اس درجہ معمور کر دیا کہ وہ اپنی جان کی حفاظت کی طرف سے بالکل بے پروا ہو گیا۔ وہ ہند یونین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرنا چاہتا تھا۔ اپنی طرف سے بھی خدمت کرنا چاہتا تھا اور اپنے ان مسلمان بھائیوں کی طرف سے بھی جو کبھی ہندوستانی فوج میں

۲۔ پاکستان

۱۔ سرحد میں سختیاں۔

سرحد کی حکومت اور اس کے حامیوں کا کہنا تھا کہ خدائی خدمت گاروں کے خلاف کارروائیوں سے صوبہ میں عام لوگوں پر کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔ یہ تحریک ان کے اندازے کے مطابق عوام میں اپنی مقبولیت کھو چکی تھی اور اب صرف چند انے گنے آدمی اس کے اثر میں تھے۔ غالباً ان اندازوں میں حکومت نے غلطی کی تھی۔ ان کارروائیوں کے بعد روز بروز حکومت کی بڑھتی ہوئی سخت گیری اس کا کھلا ہوا ثبوت سمجھی جاتی ہے۔ پچھلے دنوں وزیر اعظم خان عبدالقیوم خاں کو غیر معمولی اختیارات مانگنے کی ضرورت پڑ گئی اور اس سلسلہ میں ایک آرڈیننس نافذ کر دیا گیا ہے۔ خان عبدالقیوم نے یہ اختیارات "صوبے کی سرحدوں کے اندر رہنے والے بیرونی دشمنوں کی کارروائیوں کا سدباب کرنے کے لئے مانگے ہیں۔" یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ وزیر اعظم نے خان عبدالغفار خاں پر یہی الزام لگایا تھا کہ وہ پاکستان کے دشمنوں سے ساز باز کر رہے تھے ایسی صورت میں "بیرونی دشمنوں" کی خطرناک اصطلاح کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ سرحد کے عوام کو ایک فرضی خطرے سے ڈرا کر خدائی خدمتگاروں کے اثر سے نکال لیا جائے۔

مقصد جو بھی ہو اس میں شبہ نہیں کہ حکومت سرحد نے جو اختیارات اس آرڈیننس کے ذریعہ سے حاصل کئے وہ حد سے زیادہ وسیع اور مستبدانہ ہیں۔ اس آرڈیننس کے مطابق حکومت جس کو چاہے غیر محدود مدت کے لئے قید کر سکتی ہے اور ایسی کسی جماعت کے اثاثہ پر قبضہ کر سکتی ہے جس کے متعلق وہ یہ فیصلہ کرے کہ اس کی کارروائی سے حکومت کو خطرہ ہے۔ پریس سے متعلق ایک دفعہ کے مطابق حکومت کسی بھی شخص کو جو صوبے میں خوف یا دہشت پھیلائے یا حکومت کے کسی ملازم کو بدنام کرے گرفتار کر سکتی ہے۔ یہ جرائم اتنے مبہم ہیں کہ حکومت جس کو چاہے اپنے راستے سے ہٹا دے۔ ایک نئی نئی جمہوریت کے لئے یہ آثار کچھ بہت امید افزا نہیں کہے جا سکتے۔

لیکن خان عبدالقیوم خاں کا ستارہ گردش میں معلوم ہوتا ہے۔ انھیں اپنے دشمنوں اور مخالفوں سے ابھی اچھی طرح نپٹنے کی فرصت بھی نہیں ملی تھی کہ ان کے اپنے دوستوں نے ان کے لئے ایک بڑا دردِ سر پیدا کر دیا ہے۔ صوبہ کی لیگ اسمبلی پارٹی نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ صوبہ میں غذا کی رسد کا مناسب انتظام کرے ورنہ سب لیگ ممبر استعفیٰ دے دیں گے معلوم نہیں حکومت اب کیا کرے گی۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اگر حکومت نے کچھ نہ کیا تو لیگ اسمبلی پارٹی واقعی اتنی بڑی قربانی کر دے گی مگر اس سے یہ پتہ تو بہرحال چلتا ہے کہ صوبہ کی حالت معاشی اعتبار سے بہت زیادہ ناقابل اطمینان ہے۔ اس معاشی پس منظر میں حکومت کے نئے غیر معمولی اختیارات کو دیکھئے تو صورت حال واقعی بہت ہی خطرناک معلوم ہوتی ہے۔

۲۔ قبائلی علاقوں میں کشمکش

قبائلی علاقوں میں بھی بے چینی کے آثار نمایاں ہیں۔ سرحد پار سے خبریں اس زمانے میں بھی جب ہندوستان تقسیم نہیں ہوا تھا کم ہی آتی تھیں۔ اب جب بیچ میں ایک اور غیر ملکی حکومت بن گئی ہے خبر کے ذرائع اور بھی محدود ہو گئے ہیں۔ اس لئے سرحد پار کے واقعات کو ٹھیک سے سمجھنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ کچھ دن ہوئے ایک مختصر سی خبر آئی تھی کہ فقیر ایپی کے پیرووں کو میران شاہ میں بڑی بھاری شکست کھانا پڑی۔ لیکن نہ تو یہ پتہ چلتا ہے کہ فقیر ایپی کی اس لشکر کشی کا مقصد کیا ہے۔ نہ اس کی وجہ صاف سمجھ میں آتی ہے۔ پاکستان کے ہمدرد اس کو فقیر ایپی کی ہندو پرستی بتاتے ہیں۔ لیکن جہاں تک حکومت ہند کا تعلق ہے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اسے اس مسئلہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ قبائلی علاقوں کی نگرانی کا کام جن لوگوں کے سپرد ہے وہ برطانیہ عظمیٰ کے ازلی اور ابدی دوست ہیں اور قبائلی علاقہ والے برطانیہ کے پرانے دشمن قیاس یہ ہے کہ یہ کشمکش اسی پرانی کشمکش کی آواز بازگشت ہے بہرحال قبائلی علاقوں کی صورت حال خاصی نازک لگتی ہے۔ اس کا اظہار اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ حکومت پاکستان نے قبائلی علاقوں کے لئے ایک نئی وزارت کے قیام کا فیصلہ کیا ہے۔ یوں اس کا چارج ایک اور وزیر کے ہاتھوں میں ہوگا۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ جناح صاحب اس محکمے کو خود اپنی نگرانی میں رکھیں گے۔

۳۔ کراچی کی قسمت کا فیصلہ

کراچی کی قسمت کا فیصلہ آخرکار ہو گیا سندھ کی اسمبلی لیگ پارٹی کو جناح صاحب کے سامنے ہار ماننی ہی پڑی۔ لیکن صوبائی مسلم لیگ اپنے اعتراضات پر قائم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مسئلہ کی بازگشت آیندہ بھی سنائی دے سکتی ہے۔ لیگ اسمبلی پارٹی کے ایک ممبر کے الفاظ میں پارٹی نے یہ فیصلہ اس وجہ سے کیا ہے کہ اسے یہ معلوم تھا کہ حکومت پاکستان سندھ کے عوام کی مرضی کے خلاف کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کے فیصلہ پر عمل کرنے کا مصمم ارادہ کر چکی ہے۔ ایسا کرنے میں پارٹی نے وزیر اعظم کو ایک ۱۷۔ پائنٹ کا حکم نامہ دیا ہے۔ اس کی ایک اہم دفعہ یہ ہے کہ "پناہ گزینوں کے بسانے اور آباد کرنے کے معاملہ میں اس کا خیال رکھا جائے کہ اتنے ہی لوگ لئے جائیں جو صوبہ سے ہجرت کر جانے والوں کی جگہ پر بسائے جا سکیں" ایک بار سہروردی صاحب نے کہا تھا۔ پناہ گزین بہت ہی ناگوار قسم کے ناخواندہ مہمان ہیں۔ سندھ کے لیڈروں نے اس بات کو کافی لطیف طریقہ سے واضح کر دیا ہے۔

۴۔ امریکہ سے ایک کروڑ ڈالر کا قرضہ

حکومت پاکستان کو امریکہ سے ایک کروڑ ڈالر کا قرض ملا ہے۔ اس قرض کی مقدار بہت مختصر سی ہے اور اس کا مقصد بھی محدود ہے۔ امریکی حکومت نے یہ قرض اس لئے دیا ہے کہ پاکستان پناہ گزینوں کی طبی اور دوسری طرح کی امداد کے لئے امریکہ سے فاضل سامان خرید سکے۔ اس سلسلہ میں جو اعلان ہوا ہے وہ مبہم سا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ امریکی حکومت یکم جولائی ۱۹۴۸ء سے اس طرح کے فاضل سامان کی فروخت کچھ عرصہ کے لئے ملتوی کرنے والی ہے۔ لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ کچھ ہی عرصہ کے بعد یہ فروخت پھر شروع ہو جائے گی اور تب حکومت پاکستان زرعی مشینیں اور اس طرح کی دوسری چیزیں جن سے پناہ گزینوں کو دوبارہ بسانے کے کام میں مدد ملے خرید سکے گی۔ لیکن اس ایک سال کی مہلت میں جو حکومت پاکستان کو ملے گا یہ پتہ نہیں کہ حکومت پاکستان کیا اور کتنی مقدار میں چیزیں خرید سکے گی؟ شاید یہ امریکہ کی دوستی کا ایک معمولی سا ثبوت ہے فی الحال اس قرض سے دواؤں وغیرہ کی خرید کا ذکر بہت کیا گیا ہے۔ اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ پاکستان میں ان چیزوں کی بڑی کمی ہوگی لیکن حکومت پاکستان کے متعلق ایک خبر یہ ملی ہے کہ اس نے حکومت ہند سے اجازت مانگی ہے کہ اسے حیدرآباد دوائیں لے جانے کے لئے جہاز بھیجنے کی اجازت دے دی جائے۔ معلوم نہیں ان دواؤں میں دماغ کی بیماریوں کے لئے بھی کوئی پیٹنٹ دوا ہوگی یا نہیں۔

مشرقی پاکستان کی اقلیتوں کی شکایتیں

جولائی کے پہلے ہفتہ میں مشرقی بنگال کی کانگریس اسمبلی پارٹی کے ایک وفد نے وزیر اعظم سے ملاقات کی اور ان کے سامنے اپنی تین شکایتیں رکھیں۔ پہلی شکایت عام قسم کی تھی کہ سیلاب زدہ علاقوں میں مدد کا معقول انتظام نہیں کیا گیا ہے۔ دوسری دو شکایتیں اقلیتوں کے حقوق کے مسئلہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ وفد کا کہنا ہے کہ ملازمتوں میں اقلیت کے تناسب کے متعلق حکومت نے جو فیصلہ کیا ہے اس پر عمل نہیں ہو رہا ہے۔ حکومت کے اعلان کے مطابق مشرقی پاکستان میں ہندوؤں کو تیس فیصدی ملازمتیں دی جائیں گی۔ اسمبلی میں اقلیتوں کی جو نشستیں خالی ہوئی ہیں اس کے لئے انتخابات نہ ہونے کی بھی شکایت کی گئی ہے۔ ان شکایتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اقلیت کو پاکستان کی تعمیر کے کام میں حصہ لینے کے پورے مواقع نہیں ملتے۔ کچھ عرصہ سے صوبہ کی فرقہ وارانہ صورت حال بہتر ہو گئی ہے۔ چنانچہ ابھی پچھلے دنوں مغربی بنگال کی حکومت نے یہ اعلان کیا تھا کہ پاکستان سے آنے والے ہندوؤں کو پناہ گزین تصور نہیں کرے گی مشرقی پاکستان کی حکومت کو کوشش کرنی چاہئے کہ یہ اصلاح مستقل ہو جائے اور اقلیت کے دل میں واقعی یہ احساس پیدا ہو جائے کہ وہ شبہ کی نظر سے نہیں دیکھی جاتی اور اس کے لئے ملک میں جگہ ہے۔ اقلیتوں میں یہ احساس دونوں نئی ریاستوں کی ترقی کی پہلی شرط ہے۔

(بقیہ ہندوستان)

بڑی تعداد میں تھے لیکن اب پاکستان کی ایک جداگانہ ریاست بن جانے کے بعد ہند یونین میں خال خال رہ گئے تھے، جن کی وفاداری شبہ کی نگاہ سے دیکھی جانے لگی تھی اور جن کو فوج میں بھرتی کرنا تقریباً مسدود کر دیا گیا تھا۔ وہ ان سب کی نمائندگی کر کے یہ دکھانا چاہتے تھے کہ ہند یونین کے مسلمان اب بھی فوج میں بھرتی ہونے کے لئے اتنے ہی بلکہ اس سے زیادہ بھرتی کے لائق ہیں جتنے وہ پہلے کبھی رہ چکے ہیں۔ یہ اعلان وفاداری ہے جو بریگیڈیر عثمان نے انڈین یونین کے مسلمانوں کی طرف سے اپنے جوان خون کے روشن حرفوں سے لکھ کر پیش کیا ہے جو لوگ اب تک انڈین یونین کے مسلمانوں کی وفاداری پر شک کرتے ہیں ان کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ بھروسہ بھروسے سے پیدا ہوتا ہے۔ بریگیڈیر عثمان گاندھی جی کے بھگت اسی لئے تھے کہ گاندھی جی مسلمانوں پر بھروسہ کرتے تھے۔ (م ع)

مغربی دنیا

برلن کا بلوکیڈ

برلن کے بلوکیڈ کا اب تیسرا ہفتہ ختم ہو رہا ہے۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ روسی خفا ہیں، اور ان کی خفگی کا سبب یہ ہے کہ متحدہ ریاستوں اور برطانیہ نے مغربی جرمنی کو ایک الگ ریاست کی حیثیت دے دی ہے اور اس ریاست کی معاشی بہبودی کے لئے نیا سکہ جاری کیا ہے، مگر ابھی تک کسی کو علم یا اندازہ نہیں ہے کہ برلن کا بلوکیڈ کرنے میں روسیوں کا خاص مقصد کیا ہے۔

۹ر جولائی کو وہ احتجاجی نوٹ شائع ہوئے جو متحدہ ریاستوں، برطانیہ اور فرانس نے روس کو بھیجے ہیں۔ ان نوٹوں کی زبان مختلف ہے، مگر ان میں باتیں ایک سی کہی گئی ہیں۔ متحدہ ریاستوں اور برطانیہ کے نوٹوں میں اس پر خاص طور پر زور دیا گیا ہے کہ انھیں برلن کے ان حصوں پر قبضہ رکھنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا روس کو مشرقی جرمنی پر قبضہ رکھنے کا ہے، اور جون ۱۹۴۵ء میں جو سمجھوتا ہوا تھا اس میں انھوں نے بعض ایسے علاقوں کو چھوڑ کر جن میں ان کی فوجیں پہنچ گئی تھیں برلن میں رہنے کا حق حاصل کیا تھا۔ اس وقت مارشل ستالن نے وعدہ کیا تھا کہ برلن کے اس حصے میں آنے جانے کے راستے کھلے اور محفوظ رہیں گے، اور اب کسی اختلاف کی بنا پر ۱۹۴۵ء کے سمجھوتے کو منسوخ نہیں کیا جا سکتا۔

یہ بحث کا قانونی پہلو ہے، اور اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ روس اس بنا پر جرمنی کی ... تقسیم پورا نہیں کر سکتے کہ آیندہ کے لئے بھی جرمنی کے دو حصے کر دئے گئے ہیں۔ اسی کو فوجی نقطۂ نظر سے بیان کیا جائے تو یہ کہا جائے گا کہ روسیوں کو یا تو یہ ماننا چاہئے کہ برلن پر متحدہ ریاستوں اور برطانیہ کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ ان کا، یا پھر انھیں وہ علاقے واپس کر دینے چاہئیں جو انھیں برلن کے بدلے میں دئے گئے تھے۔ غالباً مغربی طاقتوں کو یہ اندیشہ ہے کہ لیوبک سے تریاست تک ایک لائن جو ۱۹۴۵ء میں یورپ کا بٹوارا کرنے کے لئے بنائی گئی تھی روسی اب ایسے ... مورچہ قرار دینا اور اس کی مورچہ بندی کرنا چاہتے ہیں، اور اس مورچہ بندی کی تکمیل کے لئے لازمی ہے کہ اتحادیوں کو برلن سے بے دخل کیا جائے۔ لیکن اتحادیوں نے برلن میں رہنے کے حق کو اسی حیثیت سے خریدا یا حاصل کیا تھا اور ۱۹۴۵ء کی حد بندی کو ایک مستقل سیاسی

اور فوجی حیثیت نہ دے سکیں، اور اب وہ اپنا ایک حق کو چھوڑ دیں تو انھیں نہ معلوم اور کیا کیا چھوڑنا پڑے گا۔

یوگوسلاویہ کا مسئلہ

اگر ہم یہ مان لیں کہ روسی واقعی ایک غیر محفوظ مغربی سرحد چاہتے ہیں تو یہ بات بھی سمجھ میں آسکتی ہے کہ یوگوسلاویہ کو "کومن فورم" سے کیوں خارج کیا گیا ہے۔ کومن فورم کی طرف سے یوگوسلاویہ پر کچھ اصولی اعتراض کئے گئے تھے اور ایک بڑا سیاسی عذر تھا کہ وہاں کی حکومت اور کومیونسٹ پارٹی یوگوسلاویہ کے حق میں بہتر سمجھتی ہے کہ روس کے بجائے مغربی طاقتوں کا سہارا لیا جائے۔ یوگوسلاویہ پر الزام لگانے اور اسے مجرم قرار دینے میں روسی حکومت بظاہر شریک نہیں ہوئی، لیکن یہ ناممکن ہے کہ ایسی کارروائی اس کے علم اور رضامندی کے بغیر ہو سکے، اور اس وجہ سے یہ معاملہ بہت پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ یوگوسلاویہ کے پڑوسیوں میں سے صرف البانیہ نے کومن فورم کے فیصلے کو ایک حکم مان کر اس کی تعمیل کی ہے، اور یوگوسلاویہ سے سیاسی اور معاشی تعلقات توڑ دئے ہیں۔ بلغاریہ کی کومیونسٹ پارٹی نے کومن فورم کے فیصلے کی تصدیق کی، مگر اس کے ساتھ ہی حکومت نے ایسے بیان شائع کئے ہیں جن کا مقصد اس کا اطمینان دلانا تھا کہ اس سے بلغاریہ اور یوگوسلاویہ کے تعلقات میں کوئی خاص فرق نہ پڑے گا۔ بلغاریہ کی حکومت میں مسیو دمتروف سے بڑھ کر ... جو کومیونسٹ پارٹی کے بہت ہی ممتاز اور معتبر رکن ہیں، اور اگر ان کا ... گوشہ نہیں گیا ہے تو ہمیں بعد ... طرزِ عمل کو صحیح پالیسی کا نمونہ سمجھنا ... چاہئے۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یوگوسلاویہ کے ساتھیوں اور پڑوسیوں نے اسے مجرم ٹھہرایا ہے اور اس سے بگاڑ نہیں چاہتے۔ ان میں روسی حکومت کی ... اور شاید خواہش بھی نہیں ہے۔ لیکن وہ اس کی مرضی کے خلاف بھی کر رہے ہیں۔

روس کا منشا

اگر اس معاملے پر روسیوں کے نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو اس سے

اتنے بہل نتیجے نہیں نکلتے۔ روسی بے شک کومیونسٹ ہیں، مگر وہ اپنی خارجی سیاست کو بالکل آزاد بھی رکھنا چاہتے ہیں۔ اصول اور مصلحت دونوں کے لحاظ سے وہ چاہتے ہیں کہ پولینڈ، مشرقی جرمنی، چیکوسلوواکیہ، آسٹریا، ہنگری، یوگوسلاویہ، بلغاریہ، رومانیہ اور البانیہ میں کومیونسٹ پارٹی کی حکومت ہو، مگر روس کا فائدہ اس میں ہے کہ وہ مشرقی اور جنوب مشرقی یورپ کی سیاست اور معیشت پر حاوی رہے، اور یہاں کومیونسٹ حکومتیں قائم کرنے سے روس کا یہ اصل مقصد حاصل ہوتا نظر نہ آئے تو روسی اس کا بالکل خیال نہ کریں گے کہ یہ حکومتیں جن لوگوں کے ہاتھ میں ہیں ان سے ان کے کیسے پرانے تعلقات ہیں اور وہ کتنے سچے اور اچھے کومیونسٹ ہیں۔ ان لوگوں کو حکومت کرنے کا جو موقع ملا ہے اس سے انھوں نے فائدہ اٹھایا ہوگا، حکومت کے انتظامات کو درست کیا ہوگا۔ ترقی اور بہبودی کی تدبیریں کی ہوں گی، مخالفوں کو کچھ راضی کچھ مجبور کر کے عداوتوں کی آگ کو بجھایا ہوگا۔ ان سب باتوں سے حکومت میں استقلال پیدا ہوتا ہے، اور استقلال سے طاقت۔ دو چار برس میں ممکن ہے کہ جو کومیونسٹ حکومتیں روس کے بل بوتے پر قائم ہوئی تھیں صحیح معنوں میں قومی حکومتیں بن جائیں، قوم کے مفاد کو اصولی باتوں پر ترجیح دینے لگیں، روس کا آلۂ کار ہونے کے بجائے اپنی سیاست کے مقصد خود مقرر کرنے لگیں۔ ان میں کبھی اتنی طاقت نہیں ہو سکتی ہے کہ روس کا مقابلہ کر سکیں اور مغرب کی طرف سے ان کو مدد نہیں پہنچ سکتی ہے، لیکن روس کے لئے بہت بہتر صورت یہ ہے کہ ان ملکوں میں اتنی طاقت بھی نہ ہو کہ وہ مقابلے کا حوصلہ کر سکیں اور ان کی حکومتیں اپنی قوم کا سہارا ... اور کسی قسم کا استقلال حاصل نہ کر سکیں۔ کومن فورم نے یوگوسلاویہ ... کے جو فیصلہ کیا ہے اس سے مشرقی اور جنوب مشرقی یورپ کے کومیونسٹوں میں بڑا انتشار پیدا ہوگا، جن لوگوں میں خودداری اور ذمے داری کا احساس ہے وہ سمجھے بیٹھے ہوں گے کہ انھیں یا تو حکومت سے دست بردار ہونا یا روس سے منہ موڑ لینا ہے، جو لیڈری اور حکومت کے امیدوار ہوں گے انھوں نے مارشل ٹیٹو کی مثال سے سبق لیا ہوگا اور سوچتے رہے ہوں گے کہ حکومت کے بدلے ضمیر کا سودا کریں یا نہ کریں، جو زمانہ ساز ہیں وہ اس انتظار میں ہوں گے اور سوچ رہے ہوں گے کہ روس کی ان کی

خدمت سے فائدہ اٹھائیں۔ یوگوسلاویہ کے کومیونسٹ اور غیر کومیونسٹ شہری ابھی تک مارشل ٹیٹو اور اس کی حکومت کا ساتھ دے رہے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کومن فورم کا فیصلہ کس طرح نافذ کیا جاتا ہے۔ روسیوں کو جلدی کرنے کی ضرورت نہیں، خطرہ ہو اور نظر نہ آئے تو اس سے بھی ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔ روسی چاہتے ہیں کہ تریاست کے قریب تک اپنی فوجیں پہنچا دیں، اور یہ بہت بہتر ہوگا اگر اپنی فوجیں بھیجتے وقت وہ کہہ سکیں کہ انھیں یوگوسلاویہ میں امن قائم رکھنا ہے۔

فرانس کی حالت

۹ر جولائی کو جو احتجاجی نوٹ روس کو بھیجے گئے ہیں ان میں سب سے کمزور فرانس کا ہے۔ فرانسیسی وزارت نے بڑی مشکل سے پارلیمنٹ کو اس پر راضی کیا تھا کہ مغربی جرمنی کے بارے میں جو فیصلے لندن کانفرنس میں کئے گئے تھے انھیں منظور کر لے۔ وہاں کے مدبروں کا اب بھی خیال ہے کہ روس سے سمجھوتا کرنے کی ہر ایک کوشش کرنا چاہئے، اس لئے کہ متحدہ ریاستوں اور برطانیہ کی پالیسی کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ جرمنی ترقی کر کے اور طاقتور ہو جائے، اور یہ دونوں جس طریقے سے فرانس کی حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں اس سے فرانسیسیوں کو اطمینان نہیں ہوتا۔ وہ آج بھی جرمنی کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں اور اس کی طاقت سے ڈرتے ہیں۔ روس کی ترقی سے ان کے دلوں میں کوئی اندیشہ پیدا نہیں ہوتا۔ وہ چاہتے ہیں کہ روس کی رضامندی سے جرمنی پر مستقل قبضہ رکھنے کی کوئی صورت نکالی جائے، اور کبھی کو یہ یاد رکھنے کی اجازت نہ دی جائے کہ جرمنی کبھی آزاد اور خود مختار تھا۔

مارشل پلین کے ماتحت فرانس کو امداد ملنے لگی ہے لیکن اس سے حکومت کی دشواریاں کچھ بہت کم نہ ہو جائیں گی۔ اسے اپنے عملے میں تخفیف اور تنخواہوں میں کمی کرنا ہے، مگر اس طرح کہ ملک میں انتشار نہ بڑھے۔ فرانسیسی کومیونسٹ متحدہ ریاستوں سے مدد لینے کے خلاف ہیں، اور اب جو یہ مدد ملنے لگی ہے تو وہ کوشش کریں گے کہ اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچے۔ مزدوروں کی سب سے بڑی سبھا ان کے قبضے میں ہے اور اب حکومت خرچ میں کمی کرنے کی جو تدبیریں کر رہی ہے اس سے آبادی کے دوسرے طبقے بھی بیزار اور فساد کرنے پر تیار ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ فرانس میں بگڑتا ہوا کوئی سلسلہ ختم نہیں ہوتا اور سیاسی اور معاشی زندگی کو سکون نصیب نہیں ہوتا۔

براہِ کرم خط لکھتے وقت اپنا پتہ صاف لکھئے

غزل

اثر لکھنوی

وہ زندگی کی حلاوت سے دور رہتے ہیں
جو بد نصیب محبت سے دور رہتے ہیں

اسیر اپنی خودی کے کبھی سمجھ نہ سکے
کہ فکر عیش میں راحت سے دور رہتے ہیں

یہی ہے آئینۂ دل کی تیرگی کا سبب
جو خود نگر ہیں وہ نفرت سے دور رہتے ہیں

وہ خاک عشق کی عصمت کے پاسباں ہوں گے
جو اپنے دل کی طہارت سے دور رہتے ہیں

وہ لوگ جن کے عزائم میں استواری ہے
مصیبتوں میں بھی کلفت سے دور رہتے ہیں

گناہ کرکے پشیماں جو نہیں ہوتے
ہوائے دامنِ رحمت سے دور رہتے ہیں

صفات وذات میں تفریق ہم نہیں کرتے
طلسم بندیٔ کثرت سے دور رہتے ہیں

ہوا کے ساتھ بدلنا ہمیں نہیں آتا
بلا سے امن و فراغت سے دور رہتے ہیں

یہ جانتے ہوئے شہرت ہے منتظر اُن کی
جو باکمال ہیں شہرت سے دور رہتے ہیں

ادائیں جن کی دل آرا جفائیں دل جو تھیں
وہ ہم سے روٹھ کے مدت سے دور رہتے ہیں

اثر یہ سچ ہے کہ ہم میں ہنر کوئی
ہزار شکر دنارت سے دور رہتے ہیں

ویرانی

کوثر بلگرامی

یوں تعجب سے تاسف سے نہ دیکھ اے ہمدم!
میرا تاریک سا، ویران سا ایوانِ حیات!
کچھ ہمیشہ ہی سے ویراں ہو یونہی، یہ تو نہیں
اس کی تخریب میں مضمر ہے جہانِ آیات!

اسی تاریک سے ویران سے کاشانے میں
آرزوؤں کے دیئے میں نے جلا رکھے ہیں
اپنے معصوم و حسیں خوابوں کی تصویروں سے
اس کے سب طاق و در و بام سجا رکھے ہیں

ذرّے ذرّے سے اُبلتے تھے خوشی کے دھارے
گوشے گوشے میں فروزاں تھے محبت کے چراغ
رشکِ بزمِ ثریا تھی بساطِ محفل
خندہ زن گردشِ ایام پہ مینا و ایاغ

پھر یکایک رُخِ ہستی سے نقاب اُٹھنے لگی
جاگ اُٹھا گوشۂ دل میں کہیں احساسِ الم
زلزلے آئے تخیل کی حسیں وادی میں
ہوگئی دیکھتے ہی دیکھتے محفل برہم!

آئی جام سے حسرت مجھے بوئے لہو
پردۂ درد نہاں خندۂ شمعِ محفل
دیدۂ گل میں لرزتے ہوئے آنسو دیکھے
رقصِ پروانۂ بیتاب تھا رقصِ بسمل

میں نے خود کر دیئے گل اپنی مسرت کے چراغ
بے ہنر کر دیئے طاق و درو ایوانِ حیات
یوں تعجب سے تاسف سے نہ دیکھ اے ہمدم!
میرا تاریک سا، ویران سا ایوانِ حیات
کچھ ہمیشہ سے ہی ویراں ہو یونہی یہ تو نہیں
اس کی تخریب میں مضمر ہے جہانِ آیات!

عصمت چغتائی

آل احمد سرور

کئی سال کی بات ہے کہ عصمت چغتائی کا مضمون "دوزخی" شایع ہوا۔ میں اس زمانے میں علی گڑھ میں تھا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی سے اکثر ادبی مباحث پر گفتگو رہتی تھی۔ رشید صاحب سے میں نے اس مضمون کا ذکر کیا اور زور دیا کہ اس کا ضرور مطالعہ کریں مجھے اندیشہ تھا کہ اس مرقع کی بے رحم حقیقت نگاری اور بے باک طنز کو وہ شاید پسند نہ کریں۔ یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔ رشید صاحب اس مضمون کو ایک مریض ذہنیت کا آئینہ دار سمجھتے تھے۔ حالانکہ میرے خیال میں اپنی واقعیت اور صداقت اور نفسیاتی تجزیے کے اعتبار سے وہ اردو میں اپنے رنگ کی پہلی کامیاب کوشش ہے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ دوزخی، لحاف، یا ٹیڑھی لکیر کو بہت سے بزرگ عریاں، اخلاق سوز، جنسیات کی دلدل اور خدا جانے کیا کیا کہتے ہیں۔ اردو ناول اور افسانہ دراصل پریم چند کے زمانے تک اچھے لڑکوں، لڑکیوں کو ان کے نیک کاموں پر انعام بانٹتا رہا۔ پریم چند بہت آخر میں اس جذباتیت سے نکل گئے۔ اردو افسانہ نگاری اب جا کر بلوغت کو پہنچی ہے اور اردو ناول تو ہنوز عالم طفلی میں ہے۔ ناول کے لئے زندگی کے متعلق جس بصیرت، نظر کی جس گہرائی، شعور کی جس پختگی اور دوسرے کے مزاج، کردار، یا نفسیات میں ڈوبنے کی جو صلاحیت ضروری ہے وہ ابھی کم لوگوں میں پیدا ہو سکی ہے۔ ناول اور افسانے میں جان زندگی اور انسانی فطرت کے سمندر میں بار بار غوطہ لگانے سے آتی ہے اور آپ پیٹھ پر اخلاق، تہذیب، ریاست وغیرہ کا بہت بھاری بوجھ لے کر بار بار نہ تو غوطے لگا سکتے ہیں نہ سمندر کی تہ پر قدم جما سکتے ہیں۔ ہمارے ادب میں اب بھی مشرقیت، شرافت، وضع داری، عورت، مرد کے خانے بنے ہوئے ہیں اور ان خانوں میں ظاہرداری کو بڑی اہمیت ہے۔ جو مر گیا وہ مرکر مقدس ہو گیا۔ اس کے عیبوں پر پردہ ڈھکنا چاہئے۔ جو نیک و سعادت مند، شریف اور وضع دار ہے زندگی میں اسے فتح ہوئی ہو یا نہ ہو مگر از کم افسانے میں تو اسے نیکی کا صلہ ملنا ہی چاہئے۔ نئے ادب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اس جذباتیت اور خود فریبی کو دور کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ اس لئے اس دور کے فن کاروں کو سمجھنے کے لئے اس دور کے معیاروں اور فنی اصولوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔ عصمت چغتائی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ عورت، مرد، اخلاق، سیاست، مذہب کی آڑ لے کر ادبی دنیا میں نہیں آئیں۔ انہوں نے ثابت کر دیا کہ فن کار یا ادیب محض عورت یا مرد، مشرقی یا مغربی نہیں ہوتا بلکہ وہ بہت کچھ ہوتا ہے۔ وہ جو آب حیات دنیا کو عطا کرتا ہے اسے تیار کرنے کے لئے اسے سینکڑوں زہر پینے پڑتے ہیں۔ انسانیت کو آخر میں فتح تو ضرور ہوتی ہے مگر روزانہ انسانیت حیوانیت سے شکست بھی کھاتی رہتی ہے۔ جیسا کہ ہمارے ملک میں اس سال دیکھا گیا۔ بہت سے لوگ جذباتیت کے دھندلکے میں زیادہ مگن رہتے ہیں کڑی دھوپ اور روشنی کی تاب نہیں لا سکتے۔ عصمت کے افسانوں کو پڑھ کر وہ حیران ہوتے ہیں یا خفا ہوتے ہیں۔ وہ افسانہ نگار سے بیان اور اپنے خیالات کی تائید ڈھونڈتے ہیں۔ جس طرح مولوی یا وکیل آیت یا نظیر سے اپنے منشا کے مطلب دلیلیں نکالتے ہیں۔ افسانہ نگار یا شاعر کی عظمت تک پہنچنے سے پہلے اپنی عظمت کو بھولنا اور اس کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ گداسنے حقیر روایات جھگڑا سیر و سیاحت کے آداب کے منافی ہے۔ ناول اور افسانہ بھی ایک ذہنی سفر ہے۔ فرہنگ آسٹ اور یہی بات یہاں بھی صادق آتی ہے۔

اردو میں ادھر ناول کی کمی اور افسانوں کی زیادتی کا خاصا چرچا ہوا۔ جبھی تو بعض ہر افسانہ نگار ناول لکھ رہا ہے یا لکھنے کی تیاری کر رہا ہے۔ عصمت نے ناول، ڈرامے، افسانے سبھی لکھے ہیں۔ ان کا "ضدی" اس وقت کی یادگار ہے جب ان کا شعور فنی پختہ نہیں ہونے پایا تھا۔ مگر اس میں بھی ایک حرارت اور قوت کا احساس ہوتا ہے۔ "کلیاں" عصمت کی افسانہ نگاری کی پہلی منزل ہے۔ اس میں کئی ڈرامے اور افسانے عجیب ہیں۔ مگر عصمت ڈرامے کے فن سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں۔ ان کے تازہ ترین ڈرامے "دھانی بانکیں" میں یہ خامی اور بھی نمایاں ہے۔ "دھانی بانکیں" کا موضوع کیسا ہی اہم اور عظیم الشان سہی مگر ڈراما معمولی، پھیکا اور بے جان ہے۔ عصمت کا سماجی احساس بہت گہرا نہیں ہے۔ بمبئی کے فسادات سے وہ متاثر ضرور ہوئی ہیں مگر ڈرامہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میں لایا گیا ہوں، یہ دنیا عصمت کی دنیا نہیں۔ مگر چوٹیں ایک بات اور ٹیڑھی لکیر کا بڑا حصہ اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہیں۔ "چوٹیں" کے متعدد افسانے اردو افسانوں کے ہر انتخاب میں جگہ پا سکتے ہیں۔ لحاف، پنکچر، بھول بھلیاں، ڈائن، تل میں عصمت نے جس بے باکی، سادگی اور نفاست سے افسانے کی جھولی بھری ہے، دنیا میں زندگی کی گرمی، شرارت اور سیمابیت بھرتی ہے وہ ہر ایک کے بس کی نہیں۔ لحاف پر جو ہنگامہ ہوا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لحاف کا ہم پر بڑا گہرا اثر ہے۔ ہم تو گھبراتے ہیں۔ عورت ڈھونڈتے ہیں نانی کے یہاں نسائیت سے کترا جاتے ہیں۔ ان کے یہاں رہ جاتی ہے ناگوار ذہنیت۔ عصمت کے یہاں واقعیت صوت۔ ڈرامائی ہیئت دیکھنے کے بجائے فلسفہ زندگی ڈھونڈتے ہیں۔ چھوٹی باتوں میں مضبوطی دیکھنے کے بجائے بڑی باتوں میں کمزوری تلاش کرتے رہتے ہیں۔ زمین پر چلتے وقت آسمانوں پر نگاہ رکھتے ہوئے اس کا لطف نہیں اٹھا سکتے جو ہمیں ہے اس کی کمی کا رونا روتے رہتے ہیں۔ لحاف افسانہ نہیں زندگی ہے لیا گیا ہے۔ اچھی اور بڑی زندگی کی ایک تصویر ہے۔ بیگم جان کی تخلیق نہیں۔ وہ پرچھائیں نہیں بلکہ ایک جیتی جاگتی شخصیت معلوم ہوتی ہے۔ فن کار نے بڑی چابکدستی سے اسے نگاہوں کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ مگر لوگ اب بھی اس پر حیرت کرتے ہیں کہ ایک عورت کیسے اس قدر بے باک ہو سکتی ہے۔ ادب میں یہ بے ادبی کب تک؟

عصمت کا نیا ناول ٹیڑھی لکیر کئی باتوں کی وجہ سے اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں جو شروع کیا گیا ہے وہ ابتدا سے تو ٹیڑھا ہے۔ شمشاد کو ایک نارمل ماحول نہیں ملا۔ والدین کا سایہ سر پر ہونے کے باوجود وہ یتیم رہی۔ اس کا وجود گھر میں ایک خوشگوار اضافے کے بجائے گھریلو زندگی کے مسائل میں ایک اور الجھن رہا۔ کسی نے اس سے اس کی خاطر محبت نہ کی۔ آخر تک وہ باوجود دوستوں، عاشقوں اور شوہر کے اپنا سفر اکیلے ہی طے کرتی ہے۔ ابتدا میں اسے کوئی سہارا نہ ملا اور بعد میں اسے کسی سہارے کی ضرورت نہ رہی۔ اس کی شخصیت عجیب مگر منفرد ہے۔ وہ نہ کسی کو پورے طور پر جذب کر سکتی ہے اور نہ کسی میں جذب ہو سکتی ہے۔ اردو ادب میں یہ پہلی آزاد عورت ہے۔ اچھی ہے یا بری یہ سوال بعد میں پیدا ہوتا ہے۔ جو سوتے کے ناول میں کہیں جھکاؤ یا یکسانیت یا خشکی نہیں۔ زندگی میں سیدھی لکیریں کم ہوتی ہیں مگر ہر افسانہ نگار اسے سیدھا کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ عصمت کی خوبی یہ ہے کہ اس نے اس ٹیڑھی لکیر کو سیدھا کرنے کی کوشش نہیں کی جیسی تھی اسی طرح دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ یہ ادبی دیانت معمولی بات نہیں ہے۔

کتاب شروع سے آخر تک نفرت کی پیداوار ہے۔ عزیز احمد نے اپنے تبصرے میں ٹھیک لکھا تھا کہ عصمت کی ہیروئن کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ دل سے اسے نہ کسی مرد نے چاہا اور نہ اس نے کسی مرد کو مگر عزیز احمد نے ناول کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ناول میں ہمدردی کسی حد تک ملتی ہے۔ یہ بعد کی بات ہے بڑی بات یہ ہے کہ عصمت کی تصویریں کیسی ہیں۔ وہ ان میں کیسے شوخ اور جیتے جاگتے رنگ استعمال کرتی ہے۔ وہ اپنے کرداروں کو کیسی بامحاورہ، شستہ، زندہ اور معطل دو زبان عطا کرتی ہیں۔ ان کے یہاں کیسی بے پناہ تخلیقی قوت کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ کس قدر نڈر، بے باک اور بہادر ہیں۔ ان کی دنیا کیسی گرم، ہنگامی، جاذب، ہنگامی، پراسرار اور رنگین ہے۔ ان چیزوں کا اعتراف کر لینے کے بعد ہمیں یہ کہنے کا حق پہنچتا ہے کہ عصمت کی دنیا بھی ساری دنیا نہیں ہے۔ ساری دنیا کو دیکھنے اور دیکھتے رہنے کی سعادت کسے ملتی ہے۔

ٹیڑھی لکیر کی ہیروئن شمشاد جس گھر میں پیدا ہوتی ہے وہ ایسا انوکھا نہیں۔ یوپی کے مسلمانوں کے یہاں متوسط طبقے میں ایسے گھروں کی کمی نہیں۔ ان گھروں پر عورت کی حکومت ہے اور مرد پرچھائیوں کی طرح ہیں۔ ماں باپ بچے پیدا کرنے میں زیادہ مصروف رہتے ہیں۔ بچوں کی تربیت میں حصہ نہیں لیتے۔ یہاں بیوہ عورتیں زندہ شہیدوں کی طرح رہتی ہیں اور ساری عمر اپنی بدقسمتی کا انتقام گھر بھر سے لیتی رہتی ہیں۔ یہاں تمام زندگی اتنی پھیکی اور بے کیف ہوتی ہے کہ شادی یا غمی کے واقعات تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں شادیاں رومانی آنکھ مچولی اور چھیڑ چھاڑ کے بہترین مواقع فراہم کرتی ہیں۔ یہاں لاڈ پیار صرف بیماری میں ہوسکتا ہے نہ کہ تندرستی میں۔ یعنی محبت خوف پر قائم ہے۔ یہاں

اچھی لڑکیاں وہی ہیں جو شریفوں کی طرح گھر میں رہیں پھر کوئی اللہ کا بندہ انھیں بیاہ کرلے جائے۔ وہاں جب تک جی میں طاقت رہے بچے پیدا کریں، پالیں پوسیں پھر کسی دائمی مرض میں مبتلا ہو کر دکھ سہتی رہیں اور ایک دن اللہ ان کی مٹی عزیز کرلے اور سب بے اختیار کہہ اٹھیں کیا جنتی بیوی تھی"

شمشاد کی پیدائش پر نہ ستارے ٹوٹتے ہیں نہ انقلاب آتا ہے۔ نہ گھر میں کوئی خاص خوشی ہوتی ہے۔ بڑی بہن کو تو اس کا آنا اور بھی برا لگتا ہے کہ خدمت اس کو کرنی پڑتی ہے۔ منجھلی بہن کو کچھ انس آتا ہے مگر پھر اس کا رخ بدل جاتا ہے۔ ماں اتنے بچے پیدا کرنے کے باوجود ننھی بنی رہتی ہیں۔ شمشاد کا بچپن مٹی کھانے، لڑنے بھڑنے، مارے باندھے پڑھنے، عجیب وغریب دریافتیں کرنے اور بیٹھنے میں گزرا۔ گھر سے اسے کوئی دلچسپی نہ ہو سکی۔ گھر نے اسے کچھ دیا بھی تو نہیں۔ عصمت سے پہلے گھر کی چار دیواری نوابوں کی دنیا تھی یا تاریکی کی کسی نے وہاں کے فتنوں کو نہ دیکھا تھا۔ عصمت سے پہلے افسانوں میں عورت یا دیوی ہے یا حور یا کسی کے خوابوں کی ملکہ۔ وہ جیتی جاگتی عورت نہیں ہے عصمت سے پہلے حقیقت نگار کا قلم گھر کی چار دیواری تک پہنچ کر رک جاتا تھا۔ عصمت نے اس بندش کو توڑ دیا شاید ان کی طرح کسی نے اس سے نفرت بھی نہ کی ہوگی۔ اس لئے اس کی تلخیوں اور محرومیوں کی تصویر بھی نہیں کھینچی گئی۔ شمشاد اس ماحول سے نکل کر اسکول کی چار دیواری میں قدم رکھتی ہے تو ایسی پکی ہو چکی تھی کہ کسی سے محبت کرنے یا کئے جانے کو حد سے زیادہ مکاری سمجھتی ہے۔ پھر بھی چونکہ اس کی روح پیاسی ہے۔ اس لئے جس طرح منجھو کی شفقت نے اسے موم کر لیا تھا اسی طرح ایک استانی مس چرن کی مہربانیاں اسے بہالے جاتی ہیں۔ مس چرن سے اس کی عقیدت میں عنفوان شباب کی ہیرو پرستی اور جانے کیا کیا نفسیاتی الجھنیں شامل ہیں۔ مگر گھر کے قید خانے کی طرح اس قید خانے کی بھی عصمت نے ایسی مصوری کی ہے کہ اردو ادب میں کہیں اور نہیں ملتی۔ پرنسپل، استانیاں، لڑکیاں، امتحانات کی تیاری، ڈرامے، نمائش کی سیر، لڑکیوں کی ایک دوسرے سے محبت اور پھر موقع ملنے پر لڑکوں سے محبت۔ ان مرقعوں میں تخیل کی پرچھائیاں نہیں۔ سچ مچ کی، جیتی جاگتی، گوشت پوست والی عورتیں ملتی ہیں۔ یہاں علی گڑھ بھی ہے اور لکھنؤ بھی۔ شمشاد یہاں تھوڑی دیر کے لئے اپنی نفرت کو بھول جاتی ہے۔ زندگی کی دلچسپیاں اور رنگینیاں اسے بھی بہالے جاتی ہیں۔ سنہرے خواب، پراسرار کھیل، رشید سے آنکھ مچولی، کوریالوں کی تفریح، اس زمانے کی یہی ساری کائنات ہے۔ عصمت کی نظر یہاں بھی ان فریبوں کو دیکھ لیتی ہے جن پر روشن خیالی کا غلاف چڑھا دیا گیا ہے۔ لڑکیوں کے اس مدرسے میں اگر کوئی لڑکی کسی مضمون میں کمزور ہوتی تو ٹیوشن کے لئے پرنسپل کے بھائی رشید سے زیادہ شریف اور مقبول نوجوان نہ ملتا۔ ڈرامہ ہوتا تو تصویر کھچوانے کے لئے رشید کو تکلیف دی جاتی۔ باہر کا کوئی آدمی بلایا جاتا تو بے کار غل مچتا۔ بھلا کو اعتراض ہوتا۔ دولت مند لڑکیاں اس قید و بند سے آزاد ہوتیں، اسکول میں صرف ان کا حکم چلتا تھا جو پرنسپل کی رشتہ دار تھیں۔ ہمارا کون سا تعلیمی ادارہ ان باتوں سے پوری طرح آزاد ہے۔ اس فضا میں نجمہ اور خورشید دو ستارے ہیں جو باری باری شمشاد کی دنیا میں آئے اور غائب ہو گئے۔ حسرت نے اپنی محبوبہ کی خوشبو کو بھی اس مزے سے بیان نہیں کیا جس طرح عصمت نے نجمہ کی خوشبو کو مقید کرلیا ہے۔ بلقیس شروع ہی سے ایسی شوخ، چنچل، حسین اور بے باک ہے کہ وہ جب تک موجود رہتی ہے سورج چمکتا رہتا ہے اور غم پاس نہیں پھٹکتا مگر اس کو زندگی میں غلط قدریں ملی ہیں۔ "محبت غریبوں ہی سے زیادہ ہوتی ہے مگر شادی تو امیر ہی سے کرنی پڑتی ہے۔" عصمت نے ہنسی ہنسی میں نئی عورت کے ذہنی معیار کی ساری حقیقت بیان کر دی ہے۔

اس مسلم تعلیمی ادارے سے شمشاد ایک مشنری ادارے میں پہنچتی ہے۔ جہاں کی فضا زیادہ وسیع ہے، جہاں باہر سے تعلق زیادہ ہے، جہاں لڑکے لڑکیاں آزادی سے ملتے ہیں اور تعلیم، سیاست، مذہب، [illegible] اور عورت، پر لمبی لمبی بحثیں کرتے ہیں، اور جہاں پہلے پہل شمشاد بہت کچھ پڑھتی ہے، بہت کچھ سیکھتی ہے اور بہت کچھ کھوتی ہے۔ ایلما سے دوستی۔ افتخار اور ستیل سے ملاقاتیں۔ پربھا اور رائے صاحب اور ترنیدر کے ساتھ سیر و تفریح۔ میٹرن اور [illegible] کی مریض شخصیتیں عصمت نے ان سب کو خوب بیان کیا ہے۔ رائے صاحب سے شمن کا عشق اس کے ذہنی بچپن کو ظاہر کرتا ہے۔ یہیں سے وہ ٹیڑھی لکیریں ظاہر ہونے لگتی ہیں جن کے خم رفتہ رفتہ فولاد کے تاروں کی طرح ضدی ہو جاتے ہیں اور کسی طرح سیدھے ہونے میں نہیں آتے۔ گھر سے اس کا تعلق کبھی بھی گہرا نہ تھا اور اب بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ وہ تعلیم سے فارغ ہو کر ایک مسلم اسکول کی ہیڈ مسٹرس ہو جاتی ہے۔ افتخار اس کی زندگی میں بار بار آتا ہے۔ وہ مریض بھی ہے، پراسرار بھی اور ذہین بھی اور شمن کو ان تینوں چیزوں سے دلچسپی ہے۔ مگر اپنے آپ کو کسی کے حوالے کرتے ہوئے ڈرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی عاشقوں کی پوری ٹیم کے ساتھ فٹ بال کھیلتی ہے۔ کبھی بہن کے بچے کو گود میں لینے کی کوشش کرتی ہے۔ کبھی قومی، تعلیمی اور اصلاحی مسائل میں اپنے آپ کو غرق کرنا چاہتی ہے مگر [illegible] کچھ نہیں کر سکتی۔ عاشقوں کے ساتھ اس کی چھیڑ چھاڑ دلچسپ ہے [illegible] پروفیسر، شاعر، نواب اور [illegible] کارکن کی شخصیتیں انداز قد سے پہچانی جا سکتی ہیں۔ اگرچہ عصمت کا کوئی کردار محض نقالی پر نہیں جتنا اپنی زندگی بھی رکھتا ہے۔ اسکول کی تعلیمی پستی، منیجر کی بدحواسی، مسز منیجر کی نامرادی، رضیہ بیگم کی شخصیت اور انسپکٹرس کے معائنہ کا حال بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ شمن کی ٹریجڈی یہی ہے کہ وہ محبت کا دباؤ بھی قبول نہیں کر سکتی، خدمت کا بوجھ بھی نہیں اٹھا سکتی سب کچھ دے کر سب کچھ لے لینا اس کے بس کی بات نہیں۔ وہ سیاسی شعور رکھتی ہے مگر سیاست کی سنگلاخ اور سخت وادی میں قدم رکھتے ہوئے ڈرتی ہے۔ اس نے ترقی پسند ادیبوں کا خوب مذاق اڑایا ہے۔ شروع شروع میں اس تحریک کی آڑ میں کتنے دبے ہوئے ارمانوں کو کھل کھیلنے کا موقع ملا۔ مگر افسوس یہ ہے کہ اس نے اس تحریک کے بعض علمبرداروں کی کمزوریاں دیکھیں اس تحریک کی طاقت اسے نظر نہیں آئی۔ یہ ذہین، نڈر، بے خوف مگر بے روح عورت بڑے بڑے داؤں لگا سکتی ہے۔ ایک آفاقی نقطۂ نظر، مشرق و مغرب کے سنجوگ کی خاطر قربانی کا بکرا بننے کو تیار ہے اور ایک آئرش فوجی افسر ٹیلر سے شادی بھی کر لیتی ہے۔ مگر شروع سے ظاہر ہے کہ یہ تجربہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ٹیلر شمن سے کہتا ہے "بڑی خراب زبان ہے تمہاری" یہی خرابی شمشاد کی کجی کا باعث ہے شمشاد دلوں میں گھاؤ ڈال سکتی ہے۔ مگر زخموں پر مرہم رکھنا نہیں جانتی۔ وہ ہر چیز کو توڑ سکتی ہے، ہر دیوار میں رخنے ڈال سکتی ہے۔ مگر جوڑنا اسے نہیں آتا۔ اس کی کا راز اس کی نئی زندگی میں نہیں، پرانی زندگی میں، جوانی میں نہیں بچپن میں، نئے دور کے صحرا میں نہیں، پرانے نظام معاشرت کی کال کوٹھری میں تلاش کرنا چاہئے اس کتاب کا نام موزوں ہے۔ اور ناول اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔

(باقی آئندہ)

(بزم بے تکلف (بسلسلہ صفحہ ۴)

پاکستان کا دشمن ہے۔ تعلقداری کے قانون کے مطابق آپ بھائیوں کو وہ کھانا کھلائیے جس میں ان کا "گزارہ" ہو جائے اور آپ وہ کھائیے جس میں آپ کی پانچوں گھی میں ہوں اور سر کڑھائی میں۔ انھوں نے بڑی حسرت کے ساتھ کہا "اب تعلقداری کا ست جگ کہاں رہا اب تو جمہوریت کا کلجگ ہے۔ میں نے کہا پھر کیا ہوا جمہوریت میں تو اور بھی مزے ہیں۔ ووٹ سب کے اور مال یاروں کا ۔

جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا

کہنے لگے کہ بھائی وہ سوشلسٹ گروہ اودھم مچاتے ہیں کہ مال ہضم نہیں ہونے دیتے۔ میں نے کہا خیر جمہوریت نہ سہی اشتراکیت سہی۔ میری اور آپ کی ناشتہ میں شرکت رہتی ہے مگر اس طرح ۔ کہ جو شریک ہے میرا شریک غالب ہے

ناشتہ قریب قریب سالم بلکہ مسلم آپ کا ہوتا ہے۔ میرے حصے میں چھوٹی سی کسر آتی ہے اور پھر بھی پیٹ میں کسر رہ جاتی ہے۔ بولے میاں کیا باتیں کرتے ہو۔ اشتراکیت وہاں کام آتی ہے جہاں شریک کا ناشتہ کمزور ہو۔ وہ تینوں تو کم بخت اسکول اور کالج کے لڑکے ہیں جن کے معدے کی تھاہ کسی نے آج تک نہیں پائی۔ میں نے دیکھا کہ ان کی کسی طرح تسکین نہیں ہوتی تو آخری دلیل سے کام لیا جو آج کل ان جیسے لوگوں کا آخری سہارا ہے۔ غرض کی اور کچھ نہیں تو فلسفہ تو کہیں نہیں گیا۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ اس بات کو سن انھیں کسی قدر سکون ہوا مگر پھر سوچ میں پڑ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس طرح جیسے اپنے دل سے باتیں کر رہے ہوں آہستہ آہستہ بولے "ہاں جس کی ...... لاٹھی ...... اس کی ...... بھینس ...... مگر ...... مگر ...... کس کی لاٹھی اور کس کی بھینس؟" اس کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

بتاؤں آپ کو مرنے کے بعد کیا ہوگا
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا
(اکبر)

اب اہل ذوق کو تسکین روحانی نہیں ملتی
جو پریانی میسر ہے تو بورانی نہیں ملتی

اب پرانے کباب کی باتیں
اپنی ہیں جیسے خواب کی باتیں

ہندوستانی تہذیب کے عناصر

سید احتشام حسین

(۱)

ادھر تھوڑے دنوں کے اندر بعض ہندوستانی رہنماؤں کے بیانات اور تقریروں نے ہندوستانی تہذیب کے متعلق بنیادی سوالات کھڑے کر دیے ہیں۔ یہ رہنما بھی تقسیم ہند سے پہلے ہندوستان کی قومی وحدت کے قائل تھے، ایسی قومی وحدت جس کی تعمیر و تشکیل میں مختلف عناصر کارفرما رہے ہیں لیکن آج وہ اس تہذیبی سرمائے کو اپنے مخصوص تعصب آمیز خیالات اور رجعت پسندانہ جذبات کے سانچے میں ڈھال دینا چاہتے ہیں جسے مختلف قومیت اور مذہب رکھنے والوں نے ہم تک پانچ ہزار سال میں اکٹھا کیا ہے۔ اس جارحانہ قومیت پرستی نے معاشرت، زبان، سیاسی نقطۂ نظر ہر چیز میں ایک طرح کا غیر مہذب اور فسطائی رجحان پیدا کر دیا ہے۔ وقت ضائع کئے بغیر ہندوستانی تہذیب کے مختلف پہلوؤں کی جانچ پڑتال ضروری ہے ورنہ ہزارہا سال کے بطن سے پیدا ہونے والی قدریں اور مستقبل کے امکانات دونوں خطرے میں پڑ جائیں گے۔ ہندوستانی معاشرت کے تقریباً تمام اچھے جاننے والے اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستانی کلچر کی وحدت میں بہت سے مختلف النوع عناصر شامل ہیں اور ان کی ترکیب سے ایک خاص تہذیب کا ظہور ہوا لیکن تاریخ کی منطق نے انھیں اس طرح ایک ہونے دیا کہ ان متعدد عناصر کی خصوصیات بالکل ایک دوسرے میں ضم ہو جائیں۔ نیگرائڈ، پروٹو آسٹرولائڈ اور دراوڑیوں سے لے کر انگریزوں تک نہ جانے کتنی قومیں ہندوستان میں آئیں اور یہاں کے قومی سرمایہ تہذیب میں اپنے تعلق کے تناسب سے کچھ نہ کچھ شامل کر گئیں۔ اس طرح ایک تہذیبی حقیقت کا ظہور ہوا جسے ہندوستانی تہذیب کہا جاتا ہے۔

ممکن ہے کہ ہم تہذیب کی ایسی تعریف نہ بنا سکیں جو سب کے معیار پر پوری اُترے لیکن جب ہم یہ لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے کسی قوم یا ملک کی داخلی اور خارجی زندگی کے تمام اہم پہلوؤں سے مجموعی طور پر پیدا ہونے والی وہ امتیازی خصوصیات مراد ہوتی ہیں جنھیں اس ملک کے لوگ عزیز رکھتے ہیں اور جن کے حوالے سے وہ دنیا میں پہچانا جاتا ہے۔ انسان قدرت کے بدلنے اور محفوظ رکھنے کی جدوجہد میں اپنی قومی تہذیب پیدا کرتا ہے۔ وہ تہذیب اس کے ماضی سے ہم آہنگ ہوتی ہے اور دنیا کی عام رفتار ترقی سے نسبت رکھتی ہے۔ تہذیب قومی زندگی کی ساری جذباتی، روحانی اور مادی شکلوں اور خواہشوں کا احاطہ کر لیتی ہے۔ اس کو بنانے اور سنوارنے کا ہر ایک ایسا نصب العین بخشتی ہے جو زمانے کی ضرورتوں کا ساتھ دے سکے۔ وہ ان ساری طاقتوں کو سمیٹتے ہوئے آگے بڑھتی ہے جو ماضی نے اسے عطا کی ہیں۔ آباؤ اجداد کی بخشی ہوئی اس دولت سے منہ موڑ لینا بہت سوچی سمجھی بات ہی نہیں بلکہ احیائے ماضی کی وہ خواہش ہے جسے رجعت پرستی کہا جاتا ہے۔

پانچ ہزار سال گذرے دراوڑیوں کے عروج کے زمانے میں ہندوستان ایک اعلیٰ درجے کا تمدن رکھتا تھا، دراوڑی گو یہاں کئی دوسری قوموں کے بعد آئے تھے لیکن انھوں نے اس سرزمین سے مکمل مطابقت اختیار کر لی تھی کوئی ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح آریہ آئے۔ ان کے متعلق یہ خیال عام ہے کہ وہ دراوڑیوں کے مقابلے میں زیادہ مہذب، زیادہ شریف اور روحانی اور مادی طاقتوں سے ان کے مقابلے میں زیادہ بہتر طریقے پر مسلح تھے۔ انھوں نے شمالی ہندوستان کے زرخیز میدانوں پر قبضہ کر لیا اور دراوڑیوں کو وہاں سے ہٹ جانا پڑا۔ تاریخ کا یہ ایک مابہ النزاع مسئلہ ہے کہ دراوڑی اور آریائی تہذیب کے سوتے کہاں تک ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اور ان میں ہندوستان میں کتنا اختلاط ہوا لیکن اتنا ضرور صحیح ہے کہ آریوں اور دراوڑیوں کی علیحدگی کی وجہ سے بہت دنوں تک ان میں وہ اختلاط پیدا نہ ہو سکا جو مکمل امتزاج کا ضامن ہوتا۔ زبانوں کے اختلاف سے تہذیبیں ایک دوسرے میں جلد مدغم ہوتی ہیں لیکن یہاں یہ نوبت نہیں آئی کہ یہ اپنی ترقی یافتہ مہذب سنسکرت کے سامنے دراوڑی زبانوں سے بے نیازی کا اظہار کرتے رہے اور دونوں زبانوں کی لسانی ساخت میں بنیادی فرق سے وہ ایک دوسرے سے الگ رہنے میں اعانت کرتا رہا تاہم وقت کے ساتھ ساتھ ذات پات کی تفریق، زراعت اور دستکاری کی اور برہمنوں کی مذہبی کمتری کے باوجود ہندوستانی تہذیب کی تشکیل اس طرح ہوئی کہ اس میں دراوڑی رنگ کی جھلک نظر آ جاتی ہے۔

بودھ اور جین مت ہندوستانی زندگی میں زبردست انقلاب تھے لیکن انھیں یہاں کی تہذیبی زندگی میں کوئی انوکھی چیز سمجھنا، کوئی ایسا واقعہ سمجھنا جو تاریخی بہاؤ میں بالکل الگ تھلگ معلوم ہو صحیح نہیں۔ یہ اسی تہذیب کا تسلسل تھا جو ڈھائی ہزار سال میں ایک خاص شکل اختیار کر چکی تھی۔ آریوں نے ہندوستان کے ہزار سالہ قیام میں جو قدریں پیدا کی تھیں بودھ مت نے انھیں نئے پہلو اور نئے رنگ دیے۔ برہمنی نظام کی رسم پرستی اور سخت گیری نے ان قدروں اور فکری کارناموں کو جمود کی ایک ایسی منزل پر پہنچا دیا تھا جہاں انقلاب کی ضرورت تھی۔ یہ عوامی سماجی انقلاب ان نئے مذاہب کی شکلوں میں رونما ہوا۔ وہ زنجیریں ٹوٹ گئیں جنھوں نے تہذیب کو جکڑ رکھا تھا اور ہندوستانی تفکر کے لئے نئی راہیں کھل گئیں۔ بودھ مذہب جب شروع ہوا اس وقت تو وہ برہمنی نظام کے خلاف ایک زبردست بغاوت معلوم ہوتا تھا لیکن تھوڑے ہی دنوں کے اندر تحقیق حق کی جستجو میں انسانی مسرت کی تلاش میں دونوں نظام ایک ہو کر رہ گئے۔ ہندوستان دنیا کی نظر میں بہت اونچا اُٹھ گیا اور ملک کی عوامی زندگی کی سطح بلند ہو گئی۔ پراکرتیں جو محض عوام، عورتوں اور غلاموں میں رائج تھیں نئے ڈھانچے میں اہم جگہ اختیار کر گئیں اور حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے ذرائع سب کے لئے کھل گئے۔ قدیم آریائی تہذیب کی حدیں اس طرح وسیع ہو گئیں کہ اس کی کوئی خصوصیت جو زندہ رہنے کے قابل تھی ضائع نہیں ہونے پائی۔

پھر ویشنوی تحریک شروع ہوئی جسے بعد میں عام طور سے بھگتی کی تحریک کہا جانے لگا۔ بودھ مذہب سے اثر لے کر اور بعد میں اسلام سے متاثر ہو کر اس تحریک نے مذاہب کی عالمگیر صداقتیں پیش کیں۔ ہندو مذہب کی آفاقیت اپنی فلسفیانہ تفصیلات کو چھوڑ کر نتھری ہوئی شکل میں سطح پر اُبھر آئی، اور پھر اس نے اپنا الگ فلسفیانہ نظام بنا لیا جو اس تہذیب میں مل گیا جسے ہزاروں سال میں تیار کیا گیا تھا۔ بھگتی تحریک نے مذہبی ظاہرداریوں اور رسمی مراسم عبادت پر کاری ضرب لگائی اور جب ہندو تمدن میں گھن لگ چکا تھا اور بودھ مذہب میں رسم پرستیاں شروع ہو گئی تھیں، بھگتی تحریک کے فلسفی نئی طاقت لئے ہوئے آئے۔ جب اسلام ہندوستان میں آیا تو اس تحریک میں اسلام کی صداقتیں اور ہندوستانی مذاہب کی صداقتیں پہلو بہ پہلو مل گئیں۔

اسلام عرب میں پیدا ہو کر ایشیا اور افریقہ کے مختلف حصوں میں پھیل چکا تھا۔ ہندوستان سے عربوں کا تعلق قدیم تھا لیکن اس میں تہذیبی لین دین برائے نام ہوا تھا۔ اصل تعلقات دسویں صدی کے آخر میں شروع ہوئے جب مسلمان بڑی تعداد میں ہندوستان میں آ گئے۔ اسلام سامی نسل میں پیدا ہوا تھا لیکن بہت جلد ایران، ترکستان اور وسط ایشیا میں پہنچ گیا جہاں قدیم آریائی نسل کے لوگ آباد تھے۔ مسلمان کئی صدیوں تک زرتشت اور آتش کدے ایران میں رہ کر وہاں کی تہذیبی زندگی میں ڈوب کر ہندوستان گئے۔ ایرانی مسلمانوں کی زندگی میں سامیت اور ایرانیت کی آمیزش ہو گئی تھی۔ اس میں زرتشتی ثنویت، بودھ اخلاق اور مسیحی رہبانیت کے واضح اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ مسلمان تھے جو فاتحوں کی حیثیت سے ہندوستان میں آئے اور قدیم آریائی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ایرانی، ترکستانی اور وسط ایشیائی زبانیں بولتے تھے جن میں اسلام کے اثرات سے عربی الفاظ بھی شامل ہو گئے تھے۔ ہندو سیاست کے زوال اور عالمگیر سیاسی تقاضوں نے مسلمانوں کے لئے ہندوستان کا راستہ کھول دیا۔ گذشتہ چار ہزار سالوں میں اس راہ پر مختلف قومیں چل چکی تھیں لیکن اب حالات مختلف تھے۔ مسلمان آریوں کی طرح یہاں آ کر آباد ہو گئے اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں ہندوستانیت نمایاں ہو گئی۔ عربستان کا صرف ایک قسم کا روحانی تعلق باقی رہ گیا۔ ورنہ طرز بود و باند، طریقۂ حکومت اور دوسری حیثیتوں سے وہ ہندوستانی زندگی میں پوری طرح شریک ہو گئے۔

مسلمانوں کے ہندوستان میں بس جانے سے وہ تہذیبی تسلسل ختم نہیں ہوا بلکہ تہذیبی زنجیر میں نئی کڑیوں کا اضافہ ہو گیا جس نے اُسے اور مضبوط، وسیع اور دلکش بنا دیا۔ مسلمان بادشاہوں نے زبردست حکومتیں قائم کیں۔ انھوں نے اپنی حکومت کے استحکام کے لئے خود مسلمانوں سے لڑائیاں لڑیں۔ اپنے بھائی بندوں کا خون کیا۔ تاج و تخت کے لئے جنگ کرتے ہوئے کبھی مسلم اور غیر مسلم کا فرق نہیں کیا۔ انھوں نے مسلمان بن کر نہیں بادشاہ بن کر حکومت کی اور مذہبی تبلیغ کو اپنی حکمت عملی کا جزو کبھی نہیں بنایا۔ ان کی حکومت کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے باج گذار ریاستوں پر اکتفا نہ کر کے مرکزیت اور مطلق العنان حکومتوں پر زیادہ زور دیا اور جاگیرداری تمدن کو اور زیادہ جان دار بنایا۔ وہ یہیں جئے، یہیں مرے، انھوں نے اس سرزمین سے محبت کی اور کبھی اس ملک کو چھوڑ کر باہر جانے کا خواب بھی نہیں دیکھا۔

مسلمان بادشاہوں اور صوفی درویشوں نے موسیقی

(بقیہ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۲ پر)

کون جانے

صالحہ عابد حسین

جب نوجوان ڈاکٹر آئنگر مدراس کے میڈیکل کالج میں طب کی تعلیم پاتا تھا تو اس کے بعض خیالات عجیب و غریب تھے اس کا عقیدہ تھا کہ ایسے مایوس مریضوں اور اپاہج لوگوں کو جن کی صحت سے مایوسی ہو چکی ہو اور جن کی زندگی سے نہ دنیا کو کوئی فائدہ ہو اور نہ دنیا سے اُنھیں کوئی نفع، زندہ رکھنا حماقت ہے۔ وہ اپنے ساتھی طالب علموں سے کئی بار اس پر بحث کیا کرتا۔ آخر ساتھی عاجز آکر اس سے کہتے "لیکن ہم ڈاکٹروں کا یہی تو فرض ہے کہ اندھے، اپاہج، لنگڑے لولوں کی خبر گیری کریں، مریضوں کا علاج کر کے انھیں تندرست کریں۔"

"بے شک ہم ڈاکٹروں کا یہ فرض ہے کہ مریضوں کا علاج کر کے انھیں تندرست کریں۔ لیکن اگر ان کا مرض لاعلاج ہو چکا ہو اچھے ہونے کی کوئی اُمید باقی نہ رہی ہو تو؟ پھر ان سسکتے ہوئے مریضوں کو زندہ رکھنے سے کہیں بہتر ہے کہ انھیں ختم کر دیا جائے۔" ڈاکٹر آئنگر ہمیشہ یہ کہہ کر انھیں لاجواب کر دیا کرتا۔

ڈاکٹر آئنگر کا میڈیکل کالج میں آخری سال تھا۔ ان دنوں میں اُسے کبھی کبھی باہر کسی کیس پر بھی جانا پڑتا تھا۔ ایک رات ڈاکٹر آئنگر کو غریبوں کی بستی میں ایک بہت نادار گھر میں جانا پڑا۔ یہاں ایک پردیسی غریب عورت دردِ زہ میں مبتلا تھی اور اس کی کوٹھری اُس کے چھ چھوٹے چھوٹے بچوں کی گریہ و زاری اور چیخ پکار سے گونج رہی تھی۔ تھوڑی دیر کی کوشش کے بعد اس عورت کے ساتواں بچہ پیدا ہوا بچہ بالکل بے دم اور بے حس و حرکت تھا۔ ڈاکٹر نے بچے کو ہاتھوں پر اُٹھایا اور چاہتا تھا کہ اس کے منہ میں ہوا پھونکے تاکہ اُسے سانس آئے کہ اس کی نظر بچے کے پاؤں پر پڑی اور وہ ٹھٹک گیا۔ بچے کی ایک ٹانگ دوسری سے چھوٹی اور شل تھی۔ "لاحول ولا قوۃ"...... بھلا اس کے وجود سے دنیا کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے...... خود اس بچے کی زندگی اس مفلوج ٹانگ کی وجہ سے مصیبت بنی رہے گی دوسرے بچے اسے لنگڑا لنگڑا کہہ کر چڑائیں گے...... آخر اس ننھی سی مظلوم جان کو کیوں جینے پر مجبور کیا جائے؟ دنیا کبھی اس کی کمی محسوس نہ کرے گی!" لیکن ڈاکٹر کا ضمیر اس کے نظریے سے زیادہ قوی تھا۔ وہ اضطراری طور پر بچے کے منہ میں ہوا پھونکنے اور اسے الٹنے پلٹنے لگا اور چند لمحے کے بعد اُس نے دیکھا کہ بچے کے ننھے سے پھیپھڑوں نے اپنا کام کرنا شروع کر دیا، چہرے پر زندگی کا رنگ دوڑ گیا اور ایک کمزور سی چیخ بچے کے منہ سے بلند ہوئی۔ ڈاکٹر نے اپنا بیگ اُٹھایا اور وہاں سے روانہ ہوا مگر رستے بھر وہ اپنے آپ کو لعنت ملامت کرتا رہا۔ "آخر میں نے کیوں اُسے زندہ رکھنے کی تدبیر کی؟ اس افلاس زدہ گھر میں چھ بچے ہی کیا کم عذاب تھے کہ ایک اور اپاہج لنگڑے بچے کا اضافہ ہو گیا ہمارے اس غریب ملک میں جہاں پہلے ہی سے لولے لنگڑے موجود تھے ایک اور کا اضافہ...... اور میرے ہاتھوں! بھلا دنیا کو یہ لنگڑا کیا فائدہ پہنچائے گا......" وہ رستے بھر اسی طرح بڑبڑاتا رہا۔

بہت دن گذر گئے۔ اب ڈاکٹر آئنگر مدراس سے کچھ دور ایک شہر میں پریکٹس کرتے تھے۔ اب جوانی کی وہ انتہا پسندی اور عجیب و غریب نظریے ختم ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر آئنگر اب بڑا جفاکش، ہمدرد، محنتی اور ہر وقت ہر مریض اور معذور کے علاج کے لئے کمربستہ رہنے والا ڈاکٹر تھا جو سدا کام کی زیادتی سے تھکا ہوا رہتا۔ وہ دن رات مریضوں کے علاج معالجے میں مشغول رہتا...... بغیر اس خیال کے کہ ان مریضوں کا مر جانا زندہ رہنے سے بہتر ہے۔

ڈاکٹر آئنگر کو بھی گردشِ زمانہ کا شکار ہونا پڑا۔ اس کا اکلوتا لڑکا اور اس کی بیوی موٹر کے ایک حادثے میں ختم ہو گئے، اور اب ڈاکٹر آئنگر کی زندگی کا سہارا صرف اس کی ایک کم سن پارو رہ گئی تھی۔ ڈاکٹر کی بیوی جسے وہ دل و جان سے چاہتا تھا پارو کے پیدا ہوتے ہی چل بسی تھی۔ ڈاکٹر کی ساری محبت اور توجہ کا مرکز اب صرف پارو رہ گئی

کئی سال گذر گئے۔ پارو اب سولہ سترہ سال کی نوجوان لڑکی تھی۔ اس نے گھر کا کام انتظام اس نے سنبھال لیا تھا اور اپنے بوڑھے باپ کی آرام و آسائش کا ہر دم خیال رکھتی تھی۔

ایک دن صبح کو پارو کی آنکھ کھلی تو اس کی گردن اکڑی ہوئی تھی اور ہاتھ پاؤں میں شدید درد تھا۔

پہلے تو ڈاکٹر آئنگر یہی سمجھے کہ لڑکی سردی کھا گئی ہے معمولی درد ہے جاتا رہے گا۔ لیکن کچھ دن میں یہی معمولی درد ایک سخت قسم کے مرض میں تبدیل ہو گیا اور پارو چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔

یہ مرض شاذ و نادر ہی کسی کو ہوتا تھا۔ ڈاکٹری کی موٹی موٹی کتابوں میں صرف اس کے متعلق اشارات تھے۔ خود ڈاکٹر آئنگر کو اپنی تیس سالہ پریکٹس میں ایک بھی اس مرض کے شکار سے سابقہ نہ پڑا تھا۔ ڈاکٹر نے آس پاس کے ہر قسم کے بڑے ماہروں کو بلا بلا کر لڑکی کو دکھایا، مگر سب نے مایوسی کا اظہار کیا۔ کیا وہ اس میں کچھ نہیں کر سکتے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ درد بڑھتا چلا جاتا ہے اور کم و بیش فالج کی سی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

ڈاکٹر آئنگر کا چہرہ سفید پڑ گیا "اُف اس کی پیاری نوجوان بچی کیا زندگی بھر یوں اپاہج بن کر زندہ رہے گی!"

پارو جو امید بھری نظروں سے سب ڈاکٹروں کو دیکھ رہی تھی...... اپنے باپ کے دکھ بھرے چہرے کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے...... کیا وہ اب ساری عمر اپاہجوں کی طرح اپنے باپ پر بار ہو کر زندہ رہے گی!"

ایک ڈاکٹر نے ڈاکٹر آئنگر سے کہا "ایک نوجوان ڈاکٹر مکرجی نے ان امراض کی ریسرچ کی ہے۔ اس کا لکھا ہوا ایک پمفلٹ میں نے پڑھا ہے۔ ڈاکٹر مکرجی نے کلکتے سے قریب ہی ایک انسٹیٹیوٹ بھی قائم کیا ہے جس میں وہ ریسرچ بھی کرتا ہے اور اس قسم کے مریضوں کا علاج بھی۔ میری رائے ہے کہ آپ لڑکی کو وہاں لے جائیں۔"

ڈاکٹر آئنگر کو اُمید کی ایک کرن نظر آئی اور وہ فوراً پارو کو لے کر کلکتے روانہ ہو گئے۔

کلکتے سے موٹر میں ڈال کر آئنگر پارو کو لے کر ڈاکٹر مکرجی کے چھوٹے سے انسٹیٹیوٹ میں آیا جو وہاں سے کچھ میل کے فاصلے پر قائم اور بہت سے مایوس مریضوں کی اُمید گاہ تھا۔ ڈاکٹر مکرجی نے خندہ پیشانی سے ڈاکٹر آئنگر کا سواگت کیا۔ ڈاکٹر آئنگر نے دیکھا کہ مکرجی کی ایک ٹانگ دوسری سے چھوٹی ہے اور وہ لنگ کرتا ہے مکرجی نے آئنگر کو غور سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ڈاکٹر صاحب تعجب نہ کیجئے۔ میں خود بھی بچپن سے لنگڑا ہوں اور اسی لنگڑے ہونے کی بدولت مجھے ان سب مریضوں اور اپاہجوں سے دلی ہمدردی، اور ان کی تکلیف دور کرنے کی لگن پیدا ہوئی۔"

ڈاکٹر آئنگر کچھ بولے نہیں غور سے مکرجی کو دیکھتے رہے...... آرام کرسی پر لیٹی ہوئی پارو اُمید و بیم کی نظروں سے مکرجی کے وجیہہ چہرے کو تک رہی تھی!

ڈاکٹر مکرجی نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھا "میں نے مریض بچوں کو اجازت دے رکھی ہے کہ وہ مجھے لنگڑا کہہ کر پکاریں...... وہ بے تکلف مجھے ڈاکٹر لنگڑے کہہ کر پکارتے ہیں اور اُن کے منہ سے مجھے یہ نام اپنے اصلی نام وینکٹ راؤ سے زیادہ اچھا لگتا ہے۔"

"وینکٹ راؤ؟" ڈاکٹر وینکٹ راؤ آئنگر کے منہ سے حیرت کے عالم میں نکلا......

"جی ہاں وینکٹ راؤ...... یہ مدراسی نام میری ماں نے اُس نوجوان ڈاکٹر کے نام پر رکھا تھا جو میری پیدائش کے وقت آیا تھا اور جس کی کوشش نے مجھے زندہ رکھا۔"

"ڈاکٹر وینکٹ راؤ آ......" آنکھیں آبگوں ہو گئیں اور آواز گلے میں پھنس گئی۔ انھیں اپنی وہ بات یاد آ گئی "دنیا کو اس بچے سے کیا فیض پہنچ سکتا ہے...... دنیا کبھی اس کی کمی نہ محسوس کرے گی......" اُف وہ اندھا تھا...... بالکل اندھا......

ڈاکٹر آئنگر نے مکرجی کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور عقیدت و محبت سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "لنگڑا ہونا اندھے ہونے سے بدرجہا بہتر ہے"

کئی مہینے گذر چکے...... مکرجی کی ان تھک محنت، اور دن رات کی کوشش کی بدولت پارو اپاہج پنے کی مصیبت سے نجات پا چکی تھی اور اب سوائے ہلکے سے لنگ کے اور کوئی اثر پرانی بیماری کا باقی نہ رہا تھا۔

ڈاکٹر آئنگر اپنے کمرے کی کھڑکی کے سامنے کرسی پر بیٹھے ایک بڑی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے کہ ان کی نظر اچانک پڑ اٹھی تو دیکھا کہ باہر باغ میں پھولوں کے ایک جھنڈ کے پاس پارو اور مکرجی ایک دوسرے کا سہارا لئے چہل قدمی کر رہے ہیں...... جب مکرجی مسکرا کر محبت پاش نظروں سے پارو کی طرف دیکھتا ہے تو وہ شرما کر نظریں جھکا لیتی ہے، اور اس کے چہرے پر سُرخی دوڑ جاتی ہے۔ ڈاکٹر آئنگر کے چہرے پر دلی مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن محبت کے یہ متوالے اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ کوئی تیسرا شخص بھی ان کو دیکھ رہا ہے۔

(ماخوذ)

ہندوستانی تہذیب کے عناصر (بسلسلہ صفحہ ۱)

ادب، زبان، تعمیر، فنون لطیفہ اور دوسرے تہذیبی اداروں کو ترقی دینے اور آگے بڑھانے میں جتنا حصہ لیا اور ہندو مسلم اتحاد کے ذریعے قومیت کی تعمیر میں غیر شعوری طور پر ہی سہی جو کوششیں کیں ان کا افسانہ تاریخ کی زبان پر ہے جس بات کو اچھی طرح سمجھنا ہے وہ اس ہندوستانیت کی نشو و نما ہے، جو ہندو مسلمانوں کے اختلاط سے پیدا ہو رہی تھی۔ پراکرتوں کا ارتقا بھی اس ہندوستانیت کے نشو و نما کا ایک حصہ ہے۔ چند صدیوں کے اندر ان پراکرتوں نے اعلیٰ درجے کا ادب پیدا کیا بلکہ اس کا ایک بڑا حصہ تو مسلمانوں کی سرپرستی اور ہمت افزائی کا نتیجہ ہے۔

اگر کسی تکمیل انسانوں کے با تصوف ہوتی ہے اور اس کا اظہار ان کی زندگی میں ہوتا تو یقیناً ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی زندگی میں ایک نئی انسانیت کا ظہور ہو رہا تھا۔ اس کے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس انسانیت پر جاگیردارانہ تہذیب کی مہر تھی۔ اس تہذیب نے کبیر، گرونانک، اکبر، خان خاناں، دادو دیال، ریداس، تان سین اور دارا شکوہ پیدا کیے۔ اس نے ہند اسلامی طرز تعمیر، موسیقی اور مصوری کو جنم دیا اور ایک نئی آریائی زبان کی تخلیق کی جس سے تہذیبی اختلاط اور اس کی ترکیبی وحدت کی غیر مشکوک الفاظ میں نمائندگی ہوتی ہے۔ اس زبان کو ہندوستانی کہا جاتا ہے۔ اس نے ہندوستانی تہذیب کی روح اپنے اندر جذب کی تھی، اور پہلی مرتبہ ملک نے لسانی اتحاد کی طرف قدم بڑھائے تھے۔ یہ تاریخی اور سماجی ارتقا کے تقاضوں کو پورا کر رہی تھی۔ اس لئے ہندو اور مسلمان دونوں اس کی طرف متوجہ ہوئے اسی کی ایک شکل کا نام اردو ہے اس زبان کے یا اس میں پیدا ہونے والے سرمائے کے لئے بدیشی یا غیر ملکی کا لفظ استعمال کرنا تاریخ تمدن سے ناواقفیت کی دلیل ہی نہیں ہے بلکہ بدمذاقی اور بے انصافی بھی ہے۔ صرف وہ لوگ ایسے عجیب و غریب خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں جو تہذیبی ارتقا اور اختلاط کے قائل نہیں ہیں جو صرف مذہبی تہذیب کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ پاکستان کے وزیر اعظم نوابزادہ لیاقت علی خان نے اسے اچھی طرح ثابت کر دیا ہے، کیونکہ ان کا بھی یہی خیال ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ ہندوستان میں شری پرشوتم داس ٹنڈن بھی دوسرے الفاظ میں یہی کہتے ہیں گو دونوں کے کہنے کے مقاصد جداگانہ ہیں۔ زبان اسی وقت مذہبوں سے متعلق کی جا سکتی ہے جب ذہن بیمار ہو اور نظر پر تعصب اور فرقہ پرستی کے جذبات نے پردے ڈال دیئے ہوں۔ لیاقت علی خاں کی زبان سے ایسی بات سن کر تعجب نہیں ہوتا کیونکہ فرقہ پرستی، مذہبی قومیت اور دو قوموں کے نظریے ہی سے انھوں نے اپنی سیاسی زندگی بنائی ہے لیکن ایک ایسا شخص جو کل تک وحدت قومی کا قائل تھا اور اگر پوچھا جائے تو آج بھی اس سے انکار نہ کر سکے گا جب ایسی بات کہتا ہے تو حیرت ہوتی ہے۔ کیونکہ یا تو وہ اس بات کا قائل ہے کہ ہندو مسلمان کبھی ایک نہیں ہو سکتے یا پھر ایک ہندوستانی تہذیب کو تسلیم کرتا ہے جس میں دونوں شریک ہیں۔ ماضی کو گالیاں دینا تاریخ سے لڑنا صحت مند ذہن کا پتہ نہیں دیتا۔ اسی طرح سوچنا کہ اگر یہ نہ آئے ہوتے درا اوڑی ہوتے، مسلمان نہ آتے تو صرف آریہ ہوتے۔ انگریز نہ آتے تو مسلمانوں کی حکومت ہوتی۔ خواب اور خود فریبی اور طفل تسلی ہے۔ جو کچھ ہو چکا اور اس کا جو حصہ قابل قدر اسے تسلیم کرنا ہی مستقبل کی ترقی کا ضامن ہو سکتا ہے۔

اِسلامی تہذیب کی روح (بسلسلہ صفحہ ۲)

بات ہندوستان اور پاکستان دونوں پر صادق آتی ہے۔ پاکستان بھی اگر اپنا بھلا چاہتا ہے تو ہرگز نہیں کر سکتا کہ تہذیب کے معاملے میں الگ تھلگ رہنے کی پالیسی اختیار کرے اور ہندو مسلمانوں کے ہزار سال کے سابقے سے جو پھل ہم کو ملا ہے اس کو رد کر دے یہ پالیسی صرف رجعت پسندانہ ہی نہیں بلکہ اسلام کی روح کے منافی ہے۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ چونکہ یونین میں مسلمانوں کی تعداد کا تناسب کم ہو گیا ہے اور ان کی سیاسی اہمیت گھٹ گئی ہے۔ اس لئے یہ بات اور بھی زیادہ ضروری ہے کہ ان کا اور عام طور پر اسلامی تہذیب کا جو حصہ ہندوستان کی عام تہذیب میں ہے اس کی قدر کی جائے تاکہ محض اقلیت میں ہونے کی وجہ سے ان کی قیمتی بضاعت جو سب کے لئے قدر و قیمت رکھتی ہے ضائع نہ ہو جائے۔ اس کے علاوہ مشرق قریب اور مشرق بعید میں بہت سے مسلمان ملک ہندوستان کے ہمسائے ہیں جن سے اس کے تعلقات ہمیشہ اچھے رہے ہیں اور ہندوستانی تہذیب کا مطالعے کی وجہ سے ان ملکوں سے اس کا دوستی کا رشتہ اور زیادہ مضبوط ہو جائے گا

(باقی)

نئی روشنی

اِدارۂ تحریر:-

ڈاکٹر سید عابد حسین ۔ صالحہ عابد حسین ۔ عبدالحلیم ندوی

ہر انگریزی مہینے کی یکم، ۸، ۱۶ اور ۲۴ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ سال بھر کا چندہ آٹھ روپے اور چھ مہینے کا ساڑھے چار روپے۔ منی آرڈر سے چندہ بھیجنے میں کفایت رہتی ہے اور پرچہ جلد ملتا ہے

مسلمان اور آزادی

ڈاکٹر سید عابد حسین

بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں مسلمانوں نے روڑا اٹکایا۔ پچھلے پانچ سات برس میں جو کچھ ہوا اُسے سرسری نظر سے دیکھئے تو صحیح ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، لیکن سرسری نظر اکثر دھوکا دیتی ہے۔ آیئے کچھ اور پیچھے چلیں اور پچھلے تیس سال کے واقعات پر ایک گہری نظر ڈال کر دیکھیں کہ یہ بات کہاں تک صحیح ہے۔

یوں تو ہماری آزادی کی تحریک کو شروع ہوئے ساٹھ برس سے اوپر ہو چکے ہیں لیکن تیس پینتیس سال تک وہ تھوڑے سے پڑھے لکھے لوگوں تک محدود رہی۔ گاندھی جی نے آکر اسے خاص و عام سب کے دل میں اُتار دیا، آزادی کا جذبہ خون بن کر ہماری رگوں میں دوڑنے لگا، روح کی طرح نس نس میں سما گیا۔

اس سے پہلے کانگریس میں جس نے آزادی کی تحریک اُٹھائی تھی مسلمان بہت کم تھے۔ عام مسلمانوں میں سیاسی احساس نہ ہونے کے برابر تھا، مذہبی جوش بہت تھا۔ انھیں بھی انگریزوں سے بڑی نفرت تھی مگر اس لئے کہ وہ ترکی کی خلافت کو ختم کرکے اسلام کو کمزور کرنا اور مسلمان ملکوں کو غلام بنانا چاہتے تھے۔ مولانا محمود الحسن اور علی برادران نے مسلمانوں کو سمجھایا "دوسرے ملکوں کو تو انگریز غلام بنانا چاہتے ہیں مگر تمھیں غلام بنا چکے ہیں۔ ترکوں سے ہمدردی کرنا بڑی اچھی بات ہے، پر اپنی غلامی کا بھی تو احساس ہونا چاہئے۔ جب تک تم خود غلام ہو ترکوں کی کیا مدد کر سکتے ہو۔ یہ بھی سمجھ لو کہ انگریز، مصر اور عرب کے جزیرہ نما پر اپنا اثر زیادہ تر اسی لئے رکھنا چاہتا ہے کہ ہندوستان کے راستے محفوظ رہیں، جہاں ہندوستان اُس کے ہاتھ سے نکلا اسے مسلمان ملکوں میں اپنا اثر قائم رکھنے کی اتنی زیادہ خواہش نہیں رہے گی اور اگر رہی بھی تو ہندوستان کے سپاہیوں کے بغیر انھیں دبانے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔" کتنا صحیح اندازہ تھا! آج ہمیں یہ بات صاف نظر آ رہی ہے۔

غرض مسلمانوں میں غلامی کا گہرا احساس اور آزادی کا شدید جذبہ مسئلہ خلافت کے ذریعے سے اُبھرا۔ کانگریس نے برطانوی حکومت کے سامنے سوراج کی مانگ کے ساتھ ساتھ کچھ وقتی مطالبے بھی رکھے تھے۔ ان میں خلافت کا مطالبہ بھی شامل کر لیا تھا۔ مسلمان بڑے جوش سے بہت بڑی تعداد میں کانگریس میں شریک ہوئے۔ خلافت کمیٹی اور کانگریس کا چولی دامن کا ساتھ ہو گیا۔ مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں ہزاروں لاکھوں محب وطن ستیہ گرہ کی نہتی لڑائی لڑنے لگے۔ بہت سے لوگوں نے وکالت چھوڑی، نوکریاں چھوڑیں، لڑکوں نے مدرسے چھوڑے۔ ملک کے جانباز سپاہیوں نے لاٹھیاں اور کہیں کہیں گولیاں کھائیں اور برسوں جیلوں میں پڑے سڑتے رہے۔ ان دنوں ہندو مسلمان اس طرح گھل مل گئے تھے کہ کسی نے گنتی نہیں کی کہ ملک کے لئے قربانیاں کرنے والوں میں ہندو کتنے ہیں اور مسلمان کتنے ہیں، لیکن اگر گنتی کی جائے تو شاید مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہی ہوگی۔

یہ حالت ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۳ء تک رہی لیکن اس عرصے میں ترکوں نے خلافت کو خود ختم کر دیا۔ اس سے ہمارے ہاں اکثر مسلمان لیڈروں کو جن کی سیاسی زندگی تحریک خلافت سے شروع ہوئی تھی بڑا سخت دھکا لگا۔ بہت سے تو بالکل بیٹھ ہی گئے، اور بہت سے ڈگمگانے لگے لیکن عام مسلمانوں کے دل میں اب آزادی کا جذبہ خلافت سے الگ اپنی جگہ کر چکا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۳۰ء میں ستیہ گرہ کی دوسری تحریک میں بھی انھوں نے جوش و خروش سے حصہ لیا۔ اس وقت بڑے مسلمان لیڈروں میں سے پکے کانگریسیوں کو چھوڑ کر بہت کم میدان میں آئے لیکن عام مسلمان چھوٹے چھوٹے لیڈروں کی رہنمائی میں کانگریس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے اور انھوں نے پھر جیلوں کو بھر دیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے لکھا ہے کہ ۱۹۳۰ء میں کوئی دس ہزار مسلمان جیل میں گئے۔

اس کے بعد بارہ سال کا زمانہ کانگریس کی تاریخ میں زیادہ تر تعمیری کاموں کا زمانہ ہے۔ مہاتما گاندھی نے یہ محسوس کیا تھا کہ ہمیں برطانوی سامراج سے آخری لڑائی لڑنے سے پہلے اپنے دلوں کی اور اپنی سماج کی گندگی کو صاف کرنا ہے۔ کسانوں اور مزدوروں کی عملی خدمت کرکے ان کے دلوں کو اپنے ہاتھ میں لینا ہے۔ اس لئے وہ خود اور ان کے حلقے کے کارکن جنھیں وہ کانگریس کی جان سمجھتے تھے زیادہ تر تعمیری کاموں کی انجمنیں قائم کرنے اور انھیں مضبوط بنانے میں مصروف رہے۔ نمک کی محدود ستیہ گرہ کے سوا اس زمانے میں عام سول نافرمانی کی تحریک شروع نہیں کی گئی۔ یہ مسلمانوں کے سیاسی جوش کی موت تھی۔ تعمیری کاموں سے اُن کا جی گھبراتا تھا۔ انھیں تو بس نعرے لگانے، لاٹھیاں کھانے اور جیل جانے سے دلچسپی تھی، اور اس کا اب موقع نہیں ملتا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کانگریس سے کٹ گئے، اور ان پر ایک افسردگی سی چھا گئی۔ اب فرقہ پرست لیڈروں اور انگریزی حکومت کے وفاداروں کو موقع ملا کہ مسلمان عوام کے دل میں آہستہ آہستہ اپنے افسون پھونکیں، پھر بھی ان کرائے کے لیڈروں کی مجال نہ تھی کہ عام جلسوں میں آکر زبان کھول سکیں۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں انھیں کانگریس کی مخالفت کی ہمت نہیں ہوئی۔ یو۔پی میں لیگی بورڈ اور دوسرے صوبوں میں بھی مسلمان امیدواروں نے زیادہ تر یہی کہہ کر عام مسلمانوں سے ووٹ لئے کہ ہم کانگریس کے ساتھ مل کر کام کریں گے۔

۱۹۳۷ء میں سات صوبوں میں کانگریسی حکومتوں کا قائم ہونا، ان کا غیر کانگریسی مسلمانوں کے ساتھ کولیشن بنانے سے انکار کرنا، زمینداری کو ختم کرنے کی تجویز، ان چیزوں نے خصوصاً مسلمانوں کے اونچے اور متوسط طبقوں کو بدحواس کر دیا۔ وہ سمجھے کہ ہم سیاسی اور معاشی حیثیت سے برباد ہو جائیں گے۔ اب فرقہ پرست لیڈروں کی بن آئی، اور انھوں نے "اسلام خطرے میں" چلانا شروع کیا۔ ادھر برطانوی حکومت کانگریس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے بہت ڈر گئی تھی اور اپنے سارے زبردست وسائل سے فرقہ پرستوں کی مدد کر رہی تھی، چونکہ مسلمان فرقہ پرست لیڈروں کے ذریعے سے کامیابی کی زیادہ امید تھی اس لئے ان پر نظر عنایت زیادہ تھی۔ پھر بھی مسلم لیگ کو جس میں سرکار کے وفادار اور قوم کے "بہی خواہ" دونوں جمع ہو گئے تھے کئی سال تک زیادہ مقبولیت حاصل [illegible] پاکستان کا نعرہ ایجاد کیا اس کے

مفہوم کو اس قدر مبہم رکھا گیا کہ ہر شخص جو مطلب چاہے سمجھ لے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ مسلمان زمیندار اور لاکھوں آدمی جن کے اغراض ان کے ساتھ وابستہ تھے، پاکستان کے نام کو ایک تعویذ سمجھتے تھے جس کی برکت سے ان کی زمینداری اور دوسرے حقوق بچ جائیں گے۔ لیکن عام مسلمانوں کو یہ بتایا گیا کہ اس سے وہ خطرہ جو اسلام کے سر پر منڈلا رہا ہے ٹل جائے گا۔ روپیہ ان لوگوں کے پاس تھا، اخبار اُن کے ہاتھ میں تھے، حکومت کی طاقت اُن کے ساتھ تھی، کانگریسی مسلمان اور دوسرے نیشنلسٹ مسلمان تعداد میں کم نہ تھے، اور انھوں نے کوشش میں کمی نہیں کی کہ لوگوں کو حقیقت حال سمجھائیں، لیکن وسائل کی کمی نے اور تنظیم کی کمی نے اُن کو کامیاب نہ ہونے دیا، ان کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ گئی۔

اب ۱۹۴۵ء کے انتخابات کا موقع آیا۔ آپ اس بات کو مد نظر رکھئے کہ مسلمانوں میں ووٹ دینے والے زیادہ تر اونچے اور متوسط طبقے کے تھے اور یہ تقریباً سب کے سب زمیندار اور سرکاری ملازم تھے یا ان کے ساتھ وابستہ تھے۔ کئی سال سے مسلم لیگ تبلیغ و اشاعت کے سارے وسائل اختیار کرکے ان کے مذہبی جذبات کو بھڑکا رہی تھی۔ حکومت حکمت عملی کی باریک سوئیوں سے ان کے خون میں فرقہ پرستی کا زہر داخل کر رہی تھی، اور پھر بھی کونسلوں کے انتخابات میں صوبہ سرحد میں کانگریسی مسلمانوں کی اکثریت رہی، پنجاب میں مسلم لیگ کو سخت ناکامی ہوئی اور سندھ میں اس کی اکثریت نہ ہو سکی۔ یو۔پی میں بارہ کانگریسی اور نیشنلسٹ مسلمان امیدوار کامیاب ہوئے اور ہارنے والوں میں بہت سے تھوڑے ووٹوں سے ہارے۔ اندازہ لگایا گیا تھا کہ مسلمانوں کے ۳۹ یا ۴۰ فی صدی ووٹ مسلم لیگ کے خلاف پڑے۔ دوسرے صوبوں کے اعداد و شمار میرے پاس نہیں ہیں، لیکن یہ معلوم ہے کہ بہار اور آسام میں بہت بڑی تعداد میں اور دوسرے صوبوں میں معقول تعداد میں مسلمانوں نے مسلم لیگ کے خلاف ووٹ دئے۔

غرض ۱۹۴۵ء تک باوجود اس کے کہ چار پانچ برس سے مسلمان اپنے آپے میں نہ تھے بلکہ ایک دماغی ہیجان میں مبتلا تھے ان میں سے بہتوں کے دل میں آزادی کا جذبہ اور وطن کی محبت کا جذبہ اس ہیجان پر غالب رہا۔ آپ یقین کیجئے کہ ۱۹۴۵ء میں بلکہ ۱۹۴۶ء کے آخر تک خود مسلم لیگ کے پیروؤں کی بہت بڑی اکثریت یہ چاہتی تھی کہ کانگریس اور لیگ میں سمجھوتہ ہو جائے اور ہندوستان متحد ہو کر آزادی حاصل کرے۔ لیکن ارباب غرض نے جن میں ہر فرقے اور کئی طبقوں کے لوگ شامل تھے، یہ دیکھ کر کہ ان کے ولی نعمت انگریز جا رہے ہیں، ان کو روکنے کے لئے اپنا آخری خونی کھیل کھیلا۔ کلکتہ میں فرقہ وارانہ فساد کی آگ لگائی گئی، اور ملک میں چاروں طرف پھیلنے لگی، نواکھلی، بہار، گڑھ مکتیسر سے ہوتی ہوئی پنجاب پہنچی، جہاں پہلے ہی سے بارود بچھی ہوئی تھی۔ عام لوگ غصے نفرت اور خوف سے بدحواس ہو گئے تھے، اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں، اور کیا ہو رہا ہے۔

اس آگ کو بجھانے کے لئے ہندوستان کی تقسیم کا اعلان کرنا پڑا۔ جو علاقہ پاکستان میں چلا گیا وہاں کے مسلمانوں پر اس کا کیا اثر ہوا اس سے مجھے بحث نہیں، لیکن ہندوستان کے مسلمان سناٹے میں آ گئے، خود مسلم لیگی سر پکڑ کر بیٹھ گئے کہ یہ کیا ہو گیا۔ تھوڑے سے لوگ جن کے پاس دولت تھی

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

ہفت روزہ

نئی روشنی دہلی

یکم ستمبر سنہ ۱۹۴۸ء

حیدر آباد سیاست عالم کی بساط پر

بہت دن سے یہ خبر گرم تھی کہ حیدر آباد اپنے اور حکومت ہند کے معاملے کو اقوام متحدہ کی مجلس کے سامنے پیش کرنے والا ہے۔ اب اس کی باضابطہ تصدیق ہوگئی ہے۔ حیدر آباد کے وزیر اعظم میر لائق علی نے پنڈت جواہر لال نہرو کو ایک خط کے ذریعے سے اپنی حکومت کے اس ارادے کی اطلاع دے دی ہے۔

قانونی نقطۂ نظر سے ہندوستان کے سیاسی حلقوں میں اور اخباروں میں اس مسئلے پر کافی بحث ہوئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ حکومت ہند اور حیدر آباد کے تعلقات کے بارے میں اقوام متحدہ کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اقوام متحدہ کے ادارے کا آئین کچھ بھی ہو اس کا عمل یہی بتاتا ہے کہ وہ قانونی نقطۂ نظر کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا بلکہ ہر معاملے پر سیاسی مصلحتوں کے لحاظ سے غور کرتا ہے۔ آئیے ذرا یہ دیکھیں کہ بین اقوامی سیاست کے آئینے میں حیدر آباد کے معاملے کی شکل کیا نظر آتی ہے۔

اقوام متحدہ کے ادارے میں دو جتھے ایک دوسرے کے مدمقابل ہیں۔ بڑا جتھا امریکہ اور انگلستان کا اور چھوٹا روس کا ہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ نئے ملکوں کو جو اس ادارے میں شریک ہوں اپنے حلقۂ اثر میں لے آئیں۔ اس کے لیے درشتی اور نرمی، ہمدردی اور بیزاری، دھمکی اور لالچ دونوں سے کام لیا جاتا ہے۔ چنانچہ جب سے ہندوستان یو، این، او کا ممبر ہوا ہے، امریکی جتھے کی طرف سے اس پر دونوں ہتھیاروں کے وار ہو رہے ہیں۔ روسی جتھا اب تک بے تعلقی اور بے پروائی کا حربہ استعمال کر رہا ہے لیکن جب ضرورت ہوگی دوسرے حربوں سے بھی کام لے گا۔

یہ کہنا غلط ہوگا کہ دنیا کی قومیں صرف اپنی غرض کو دیکھتی ہیں، حق و انصاف سے بالکل آنکھیں بند کر لیتی ہیں۔ اگر کسی بہت بڑی غرض کا پردہ حائل نہ ہو تو انھیں حق کی صورت بھی نظر آتی ہے، لیکن ان کے پیشہ ور سیاست داں عام طور پر اپنی آنکھوں کو اس طرح سدھاتے ہیں کہ انھیں حق اسی بات میں دکھائی دیتا ہے جس میں ان کا فائدہ ہو۔ تاہم کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان سیاست دانوں کو اپنے ملک کی رائے عامہ سے مجبور ہو کر حق کا ساتھ دینا پڑتا ہے خواہ وہ ان کے مفاد کے خلاف ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ حیدر آباد کا معاملہ دوسرے ملکوں کے عوام کو حق کی روشنی میں کیسا معلوم ہوگا اور ان کے پیشہ ور سیاست دانوں کو غرض و مصلحت کی عینک سے کیسا نظر آئے گا۔

عوام کو چاہے وہ جمہوری ملکوں کے ہوں یا کمیونسٹ ملکوں کے رجعت پسند فسطائی حکومت سے کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی جس نے ایک ایسی سیاسی پارٹی کے مسلح رضاکاروں کی مدد سے عام رعایا اور فرماں روا دونوں کے دلوں پر دہشت کے پہرے بٹھا رکھے ہیں اور جسے اس میں ذرا بھی باک نہیں کہ اپنے سیاسی مخالفین کو قید کرے یا اگر زیادہ خطرناک سمجھے تو قتل کرا دے۔ اگر میر لائق علی یا ان کے ہم زاد قاسم رضوی یہ سمجھتے ہیں کہ کسی مہذب ملک کے باشندے حیدر آباد کے جاگیرداری طرز حکومت کی جسے حال میں فسطائیت کے پیوند نے اور زیادہ رجعت پسند بنا دیا ہے، حمایت کریں گے تو وہ بڑے دھوکے میں ہیں۔

لیکن در اصل حیدر آباد کے سیاست باز کسی ملک کے عوام سے کوئی توقع نہیں رکھتے۔ بلکہ ان کی امیدیں ان پیشہ ور سیاست دانوں سے وابستہ ہیں جو اقوام متحدہ کی مجلس میں اپنے ملک کی نمائندگی کرتے ہیں۔ قاسم رضوی صاحب اب اپنی تقریروں میں دنیا کو کمیونزم کے ہوّے سے ڈراتے ہیں اور یہ وعدہ کرتے ہیں کہ حیدر آباد کمیونسٹ محاذ کا مقابلہ کرنے میں امریکہ کا ساتھ دے گا۔ ان کے خیال میں امریکی اس نازک وقت میں اُن کی اور ان کے رضاکاروں کی مدد کو بہت غنیمت سمجھے گا، اور اسے ہر قیمت پر حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔

لیکن جو لوگ اقوام متحدہ کے طرز عمل کو پچھلے دو سال سے غور سے دیکھ رہے ہیں وہ جانتے ہیں کہ روسی یا امریکی جتھے کو حیدر آباد کے معاملے سے اگر کوئی دلچسپی ہوگی تو صرف اتنی کہ اس کے ذریعے سے ہندوستان پر کس طرح احسان رکھا جا سکتا ہے یا دباؤ ڈالا جا سکتا ہے۔ روسی رویے کا اندازہ کرنا تو بہت مشکل ہے مگر امریکی جتھے کا معاملہ صاف ہے۔ اگر وہ ممبروں کی اکثریت کو اس پر آمادہ نہ کر سکا کہ اس مقدمے کی قانونی کمزوری کو نظر انداز کریں تو وہ خود ہی حیدر آباد کی درخواست کو رد کر کے ہندوستان پر احسان رکھے گا اور جو کہیں قانونی تاویل سے اور پس پردہ گفت و شنید سے لوگ مقدمے پر غور کرنے کے لیے راضی ہو گئے تو پھر کیا ہے، ہندوستان پر دباؤ ڈالنے کا ایک اور حربہ ہاتھ آ جائے گا۔

لیکن حیدر آباد کی چار دیواری میں رہنے والے مدبروں کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بین اقوامی سیاست کی بساط پر ان جیسے پیادے محض اس کام آتے ہیں کہ انھیں پٹوا کر اپنے کسی قیمتی مہرے کو بچا لیا جائے یا حریف کے کسی قیمتی مہرے کو پھانس لیا جائے۔ اگر حیدر آباد آئندہ چند ہفتوں میں اندرونی سازشوں اور سورشوں کا شکار ہونے سے بچ گیا اور یو، این، او نے اس کی درخواست پر غور کرنا منظور کر لیا تو ممکن ہے اس سے امریکی جتھے کی حکمت عملی کو تھوڑی بہت مدد ملے۔ مگر حیدر آباد کی موجودہ حکومت کا بھلا نہیں ہوگا۔ اس پیادے کو تو پٹنا ہی ہے، چاہے پہلی چال میں پٹے یا دوسری میں یا تیسری میں۔

بزم بے تکلف

نعیم صاحب اور ان کی وکالت میں ان بن تو رہتی ہی تھی سنہ ۱۹۲۱ء کی سیاسی تحریک میں موقع دیکھ کر اُسے طلاق دے بیٹھے۔ خدا کے فضل و کرم سے معاش سے آزاد تھے۔ جن کا بھائی محکمۂ تعمیرات میں انجینیر ہو وہ آرام سے گھر بیٹھ کر، سونے کا نوالہ کھا سکتا ہے۔ اس لیے کہ انجینیری تو کیمیا کا نسخہ ہے، مٹی سے سونا بنانا اور جگہ استعارہ ہو۔ مگر محکمۂ تعمیرات میں حقیقت ہے۔ ریت سے، سیمنٹ سے، اینٹوں سے، لوہے سے ہر چیز سے کھرا کندن بنتا ہے۔

وکالت چھوڑ کر نعیم صاحب نے سیاست میں قدم رکھا مگر منڈیری کے استاد رہے، اکھاڑے میں نہیں اُترے، ان کے گھر پر شام کو کانگریس اور خلافت کے پٹھے جمع ہوتے تھے نعیم صاحب ان کو اندرونی اور بیرونی سیاست کے داؤں پیچ سمجھاتے اور اس کے بعد پان کا دور چلتا۔ پہلے دھواں دھار تقریر اور پھر گرما گرم چائے۔ لوگ صبر کی تلخی کو، بر شیریں کے لالچ میں برداشت کرتے تھے۔

نعیم صاحب کے ولی نعمت اور بھائی انجینیر صاحب پنشن پانے کے ہول سے وفات پا گئے۔ اور وصیت نامے میں، بیوی بچوں کے نام جائداد اور نعیم صاحب کے نام دعائے خیر لکھ گئے۔ اس صدمے سے نعیم صاحب کا دماغ الٹ گیا۔ بہت دنوں تک مرے ہوئے بھائی کو کوستے رہے کہ اتنی جلدی کیوں مر گئے سیاست بگھارنے کا شوق اب بھی باقی تھا مگر بگھارنے کا سامان نہیں رہا تھا۔ اپنے ہاں چائے پلا کر چلنے میں جو شان تھی وہ دوسروں کے ہاں پی کر بہکنے میں نہ تھی۔ مگر ان کو اس کا احساس نہ تھا بلکہ جوں جوں ان کی مالی حالت ابتر ہوتی گئی اس کی تلافی کے لئے سیاست دانی کا ادعا بڑھتا گیا۔ رفتہ رفتہ تخیل کے زور سے فکر اور عمل کا فصل مٹ گیا۔ اب بچارے پر سیاست کی نظری باریکیاں سمجھانے ہی کا نہیں بلکہ ان کی عملی گتھیاں سلجھانے کا بار بھی پڑ گیا اور اس کو یہ ناتوان اُٹھائے پھرتا ہے۔

فرماتے ہیں دیّہ ٹرومین تو ٹائیں ٹائیں فش ہو کر رہ گیا اب دیکھیں ڈیوی کیا کرتا ہے ہماری رائے میں تو جنرل کو چاہیے کہ امریکی شہری بن کر صدر منتخب ہو جائے۔ امریکہ والوں کو آج کل ایسے ہی قابو چی کی ضرورت ہے اور یہ چین اور جرمنی کے جھگڑے تو محض بے کار ہیں۔ کوئی ان کو سمجھائے کہ میاں دو قوموں کا نظریہ مان لو۔ دونوں دو حصوں میں بٹ کر برطانوی ڈومینینس بن جاؤ۔ گورنر جنرلوں کی ضرورت ہو تو ہندوستان سے منگوا لینا۔ رہا فلسطین تو وہاں نئی ریاست کا بادشاہ قاسم رضوی کو بنا دو اپنے آپ کو عرب نسل سے بتاتا ہے۔ صورت سے یہودی معلوم ہوتا ہے۔ دونوں خوش ہو جائیں گے اور ضمناً حیدر آباد کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ چین کا قصہ برسوں سے چل رہا ہے کسی طرح طے ہونے میں نہیں آتا۔ اس کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ جاپان پوست کی کاشت کرے اس کی معاشی مشکل آسان ہو جائے گی اور چین کو افیون بھیجی جائے اس کی سیاسی گتھی سلجھ جائے گی۔ افیم کے عمل سے چینیوں میں ہمدردی، دھیان گیان، رقت قلب اور صلح جوئی پیدا ہو جائے گی اور اس روز روز کی خانہ جنگی سے چھٹکارا مل جائے گا۔ اور کشمیر کا جھگڑا بھی کوئی جھگڑا ہے۔ وہ تو اسی دن طے ہو گیا تھا جس دن مہاراجہ نے "مایۂ خویش" یا ہر کے بنکوں میں منتقل کر کے ریاست کا حساب کم و بیش شیخ عبداللہ کے سپرد کر دیا۔ اب

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

پچھلا ہفتہ : ۱۔ ہندوستان

سارا گلہ جاتا رہا

شاید بہت کم لوگوں کو اندازہ ہوگا کہ مشرقی پنجاب میں ڈھلوں صاحب کا فاقہ ٹوٹ جانے سے کتنا بڑا خطرہ ٹل گیا۔ آزاد ہند فوج کے اس ہردلعزیز افسر نے یہ فاقہ مشرقی پنجاب کی حکومت کے ایک اعلان کے خلاف احتجاج کے طور پر شروع کیا تھا۔ اعلان میں حکومت نے آزاد ہند فوج کے سابق جنرل سردار موہن سنگھ پر الزام لگایا تھا کہ وہ نوجوانوں کو فوجی تربیت دینے کے بہانے سے اپنی فوج تیار کر کے مشرقی پنجاب کی حکومت پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ آئی۔این۔اے کے لوگوں اور ان کے ہمدردوں میں عام طور پر اس اعلان کی وجہ سے بے چینی تھی اور پھر ڈھلوں صاحب کے فاقے نے اس کو اور تیز کر دیا تھا۔ اہل غرض اس سے فائدہ اٹھا کر سخت شورش برپا کر سکتے تھے۔ خصوصاً سکھوں کے فرقہ وارانہ جذبات کو بہت بھڑکایا جا سکتا تھا۔ مگر ڈھلوں صاحب سردار موہن سنگھ اور ان کے ساتھیوں کی تعریف کرنی چاہیئے کہ انھوں نے اس قصے میں فرقہ وارانہ رنگ کی خفیف سی جھلک بھی نہیں آنے دی۔ اور صوبے کی کانگریس کمیٹی کے صدر سردار گرمکھ سنگھ مسافر اور سکریٹری سردار لہنا سنگھ کو مبارکباد دینی چاہیئے کہ انھوں نے بیچ میں پڑ کر حکومت میں اور سردار موہن سنگھ میں صفائی کرادی۔ دونوں فریقوں کی غلط فہمیاں دور ہو گئیں اور ان کو ایک دوسرے سے جو شکایتیں تھیں وہ جاتی رہیں۔ اس معاملے کا تعلق جتنے لوگوں سے تھا وہ سب سکھ تھے۔ ان کا اس پیچیدہ گتھی کو اتنی خوش اسلوبی سے سلجھا لینا بڑا نیک شگون ہے۔ اس سے امید ہوتی ہے کہ قوم پرست سکھوں سے مشرقی پنجاب کی بگڑی ہوئی حالت کو سدھارنے میں بڑی بیش بہا مدد ملے گی۔

خیر ایک ہی قدم سہی

ڈومنین پارلیمنٹ کی پچھلے پندرہ دن کی کارروائی کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا ملک ابھی سماجی اصلاح کے میدان میں بہت پیچھے ہے مگر رفتہ رفتہ آگے بڑھ رہا ہے۔ ایک طرف تو بہت لوگوں کا ہندو کوڈ بل کی مخالفت کرنا اور بہتوں کا اسے ٹالنے کی کوشش کرنا، اور دوسری طرف اس بل کا جو بچپن کی شادی کے قانون [illegible] تعلق رکھتا ہے، برسوں کی رکاوٹ کے بعد سلیکٹ کمیٹی کے سپرد کر دیا جانا بظاہر ان دونوں باتوں میں تضاد معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں کوئی تضاد نہیں۔ پہلا بل ایک دم سے ہندوؤں کی ساری سماجی زندگی میں انقلاب پیدا کرنا چاہتا ہے۔ دھرم شاستر کے مختلف مذاہب میں سے سب سے معقول اصول لے کر ان کو ایک ہم آہنگ اور مکمل ضابطہ کی شکل دینا چاہتا ہے اور اس ضابطے کو ہر علاقے، ہر ذات، ہر خیال کے ہندوؤں پر یکساں عاید کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو انقلاب کو انسانی فطرت سیاست میں قبول کر لے تو کر لے معاشرت میں عموماً قبول نہیں کرتی۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ اس بل کی بہت مخالفت ہوئی۔ یہاں تک کہ خود کانگریس پارٹی میں ایک گروہ اسے ملتوی کرنے پر مصر ہوا۔ اندیشہ تھا کہ کانگریس پارٹی میں اس معاملے میں پھوٹ پڑ جائے گی مگر ۲۶ اگست کے جلسے میں پارٹی نے متفقہ فیصلہ کیا کہ بل پر غور کرنے کی تجویز موجودہ سیشن میں منظور کر لی جائے مگر اس پر بحث آئندہ سیشن کے لئے ملتوی رکھی جائے۔ اس طرح بات کچھ دن کے لئے ٹل گئی۔ اب رہا دوسرا بل وہ بظاہر ایک جزوی چیز تھی۔ اصولی بات مانی جا چکی ہے کہ بچپن میں شادی کی ممانعت کر دی جائے۔ اب اس میں چند ترمیمیں تجویز کی جا رہی ہیں مثلاً شادی کی عمر اور بڑھا دی جائے۔ قانون کی خلاف ورزی کو پولیس کی دست اندازی کے قابل جرم قرار دیا جائے۔ ایسی شادی کی بھی ممانعت کر دی جائے جس میں دولہا دلہن کی عمر [illegible] مثلاً دلہن [illegible] دولہا ۵۰ سال کا ہو [illegible] ترمیمیں [illegible] ہے حالانکہ [illegible] کہ [illegible] ہیں کہ [illegible] اس بل کو بغیر زیادہ مخالفت کے سلیکٹ کمیٹی کے سپرد کر دیا۔

صلح کے پیامی

کشمیر کمیشن نے ۱۳ اگست کو لڑائی بند کرنے کی [illegible] کی حکومتوں کے سامنے پیش کی تھی اس کا کوئی نتیجہ ظاہر نہیں ہوا۔ دونوں حکومتوں کے جواب تو کمیشن کے پاس پہنچ گئے ہیں پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک سگر گو مگو رہی ہے۔ کسی نے کوئی دو ٹوک بات نہیں کہی۔ کمیشن کئی روز تک دونوں فریقوں کے جوابوں پر غور کرنے کے بعد اب پھر پاکستان کی حکومت سے بات چیت کرنے کراچی گیا ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ رکاوٹ جو کچھ ہے اس طرف سے ہے۔ خدا کرے اب کی بار وہ کوئی قطعی جواب لے کر آئے اور ہمیں افسوس کے ساتھ یہ نہ کہنا پڑے

نتیجہ نہ نکلا تھکے سب پیامی
وہاں جاتے جاتے یہاں آتے آتے

یوں دیکھنے میں آثار کچھ اچھے ہی معلوم ہوتے ہیں اس لئے کہ کمیشن نے اقوام متحدہ کے مرکز سے ایک فوجی مشیر اور چالیس ناظر (آبزرور) جلد بھیجنے کا تقاضا کیا ہے۔ دراصل لڑائی بند ہونے میں تو کچھ ایسی دشواری نہیں۔ اصل مسئلہ صلح کی شرطوں کا ہے۔ ابھی تک کچھ پتہ نہیں چلا کہ کمیشن نے اس کے بارے میں بھی کوئی تجویز دونوں حکومتوں کے سامنے رکھی ہے یا نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ایک طرف شیخ عبداللہ اور دوسری طرف چودھری غلام عباس اور سردار محمد ابراہیم (ایک نیام میں دو تلواریں!) اپنی تقریروں میں کہہ رہے ہیں کہ ہم ریاست کی تقسیم ہرگز نہیں چاہتے۔ اس لئے قیاس یہ کہتا ہے کہ کمیشن نے تقسیم کی تجویز پیش کی ہو یا کرنے والا ہے۔ ایسا ہو تو کوئی تعجب نہیں اس لئے کہ یہ زمانہ ہی تقسیم کا ہے انڈونیشیا، فلسطین، جرمنی یہاں تک کہ یروشلم اور برلن کے شہروں تک کے دو دو تین تین ٹکڑے کر دئے گئے ہیں۔ یہ تو بہ قول اکبر کے وہ لوگ ہیں کہ ع

ہم کیا ہیں خدا کے تین ٹکڑے کر دئے

رعب کی حکومت یا محبّت کی

[illegible] انگریز گورنر جنرل [illegible] شان و شکوہ دیکھتے ہیں [illegible] ان کی رعب داب کی تقریریں سنی ہیں [illegible] ہندوستانی گورنر جنرل [illegible] راج گوپال اچاری [illegible] اجلال کی شان دیکھ کر اور ان [illegible] ارشادات گرامی کو سن کر حیران رہ جاتے ہیں۔

خود دار السلطنت کے اندر جلسوں [illegible] ریاست کا سردار حکومت کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو کی طرح کھدر کے سیدھے سادے مگر صاف اور بے داغ کپڑے پہنے لوگوں میں اس طرح گھس بیٹھ کر گھل مل کر ہنستا بولتا نظر آتا ہے جیسے ایک بے تکلف خوش مزاج باپ اپنے شوخ بچوں کے جھرمٹ میں۔ اور اب جو راجا جی اپنے خاص صوبے مدراس کے دورے پر گئے ہوئے ہیں تو کچھ نہ پوچھیے گرمجوشی اور بے تکلفی کی حد نہیں رہی۔ مدراس ڈیفنس ایسوسی ایشن میں راجا جی کے استقبال کی تصویر اخبار میں آئی ہے۔ مجمع میں گھرے ہوئے ہیں، ایک خاتون ان کے گلے میں ہار ڈال رہی ہیں اور وہ خود ایک چھوٹی سی بچی کے دونوں ہاتھ پکڑے ہوئے ہیں [illegible] تقریروں کی رپورٹیں دیکھئے تو الفاظ اور [illegible] لونا را نہیں ہوتے ہیں بلکہ ایک دل [illegible] نکل کر سیدھے دوسرے دلوں میں جا رہے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح حاکمانہ شان و شوکت اور رعب داب کے بغیر حکومت ہو سکتی ہے پاکستان کے ارباب حکومت کے خیال میں تو نہیں ہو سکتی۔

تن ڈھانکنے کو کپڑا

معلوم ہوتا ہے کہ اب کپڑے کو ترسنے والوں کی مشکل کچھ آسان ہونے والی ہے۔ صوبوں کی حکومتوں نے عملی قدم اٹھانا شروع کر دیا ہے۔ مدراس میں ملوں کا کپڑا جس پر حکومت نے قبضہ کر لیا تھا صوبے کے بائیس کو اپرٹیو سٹورز کو مناسب قیمت پر فروخت کرنے کے لئے دیا گیا ہے۔ اور یہ تجویز ہے کہ ملوں کی پیداوار میں سے آگے بھی اسی طرح حکومت کی لیسنس دار دکانوں سے فروخت ہوا کرے۔ بمبئی میں قیمت کا کنٹرول اور راشن دونوں جنوری میں شروع ہونے والے ہیں شہروں میں (غالباً سال بھر میں) فی کس ۲۴ گز کپڑا اور دیہات میں فی کس ۱۸ گز ملا کرے گا۔ قیمتیں لاگت پر لانے لے جانے کا خرچ اور ۱۲ سے فی صدی منافع رکھ کر لگائی جائیں گی۔ امید ہے کہ دوسرے صوبے بھی بہت جلد بمبئی یا مدراس کی تقلید کریں گے۔

کھانے کو روٹی

غلے کی گرانی دور ہونے کی کوئی صورت ابھی تک نظر نہیں آتی۔ تھوڑی قیمتوں میں تو کچھ خفیف کمی ہوئی ہے [illegible] مگر قیمتوں پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ معاملہ مشکل ضرور ہے۔ اس لئے کہ ایک دم سے بھاؤ کا گرنا کسانوں کے لئے بہت برا ہوگا۔ لیکن ابھی تو بیچ والوں کی نفع خوری کو ختم کرکے قیمتوں میں خاصی کمی کی جا سکتی ہے کسانوں کے نقصان یا فائدے [illegible]

۲۔ پاکستان

روشنی کی کرن

مغربی پاکستان کے پرانے کانگریسیوں نے اپنی ایک کانفرنس میں جو ابھی حال میں ڈھاکہ میں منعقد ہوئی تھی پاکستان نیشنل کانگریس کے قیام کا فیصلہ کیا ہے۔ نئی جماعت کے مقصد کی وضاحت ایک رزولیوشن میں یوں کی گئی ہے "پاکستان کی نیشنل کانگریس کا مقصد ہماری آزاد ریاست پاکستان میں امن و آشتی رکھنے انفرادی آزادی کے تحفظ اور خوش حالی کے قیام کی کوشش ہے۔" طریق کار کے متعلق اس رزولیوشن میں بتایا گیا ہے کہ تنظیم کے ممبر سچائی، عدم تشدد اور خدمت کو اپنا آدرش بنائیں گے، اور اس طرح وہ یہ کوشش کریں گے کہ ملک میں ہر طبقہ اور ہر مذہب کے لوگوں کے ساتھ سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف کیا جائے۔ مسٹر سریش داس گپتا نے جو پاکستان کی مجلس آئین ساز کے ممبر ہیں اپنی تقریر میں گاندھی جی کے اصولوں کی عالمگیر عظمت کا ذکر کیا اور کہا کہ ان کے اصول آج بھی ان کے لئے اسی طرح مشعل راہ بن سکتے ہیں جیسے اور کبھی۔

اس نئی جماعت کی ضرورت شاید یوں پڑی ہو کہ لیگ نے جو پاکستان کی برسر اقتدار جماعت ہے اپنا دروازہ اب تک دوسرے مذہب کے لوگوں کے لئے نہیں کھولا ہے، اور وہ اب بھی ایک فرقہ پرور جماعت ہے۔ اس بات میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہو کہ اتفاق سے لیگ جس فرقہ کی جماعت ہے وہی ملک میں اکثریت میں ہے۔ ممکن ہے کہ لیگ کے ارباب حل و عقد نے اس ڈر سے اپنا دروازہ پاکستان کے دوسرے شہریوں کے لئے بند کر رکھا ہو کہ اس اصلاح کے بعد وہ اسلام کے نام سے اتنا کام نہ لے سکیں گے۔ بہر حال اس کی وجہ سے ایک ایسی جماعت کے قیام کی ضرورت بہت بڑھ گئی ہے جو غیر فرقہ پرور ہو، جس کے دروازے سب کے لئے کھلے ہوں۔ اس نئی جماعت کے بانیوں نے ابھی اپنا دائرہ صرف مشرقی پاکستان تک محدود رکھا ہے۔ ان کی ایک کمیٹی نئی جماعت کا قانون مرتب کرنے کے لئے بنائی گئی ہے۔ خود یہ بات کہ انھوں نے اپنے سامنے گاندھی جی کی مثال رکھی ہے اس کی ضمانت ہے کہ ان کا دامن فرقہ پرستی سے آلودہ نہ ہوگا۔ پاکستان کے ترقی پسند اور جمہوریت دوست جماعتوں اور افراد کا فرض ہے کہ وہ اس نئی جماعت کو جو قوم پرستی کی بنیاد پر قائم ہوئی ہے پھلنے پھولنے میں مدد دیں۔

گھر کے بھیدی

پچھلے دنوں سرحد کی حکومت نے سرخ پوشوں کے ایک مجمع پر گولی چلوائی۔ جس میں لوگ بڑی تعداد میں مارے گئے۔ حکومت نے اس سلسلے میں جو بیان دیا ہے اس پر بھروسا کرنا مشکل ہے۔ قیوم صاحب شاید اپنے سائے سے ڈرنے لگے ہیں۔ مٹھی بھر خدائی خدمت گار ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں تو ان کے نزدیک ریاست کے وجود کے لئے عظیم الشان خطرہ ہو سکتا ہے۔ ان کے اپنے آدمیوں ہی کے قول کے مطابق انھوں نے لیگ کے لوگوں پر... وہ کارکنوں کو بھی پاکستان دشمنی کے الزام میں گرفتار کر رکھا ہے جو خان عبد الغفار خاں کے نام لینے والوں پر ان کے خطاب کا بھید کیا گھر کا نا ہو سکتا ہے۔

غالباً ان کی تشدد آمیز پالیسی اب ظلم و تعدی کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ ورنہ مغربی پنجاب لیگ کی ایڈہاک کمیٹی کا لہجہ اتنا سخت نہ ہوتا۔ کمیٹی نے سرحد کے معاملات پر ایک رزولیوشن پاس کیا جس کے الفاظ یہ ہیں۔ "ملک میں عام خیال پیدا ہو گیا ہے کہ صوبہ سرحد میں انتہائی بے چینی بلکہ بے دردی کا دور دورہ ہے۔ عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ سرحد سے ہر طرح کی شخصی آزادی ختم ہو چکی ہے اور سرحد کی حکومت نے بہت زیادہ سختیوں اور ظلم سے کام لیا ہے۔" کمیٹی نے اس سلسلے میں حکومت پاکستان اور صوبے کے وزیر اعظم مسٹر عبد القیوم سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ صوبے میں حکومت کے ظلم و ستم کی غیر جانب دارانہ تحقیقات کا انتظام کریں۔ کمیٹی نے کہا ہے کہ مخالفت کو ظلم کے ذریعے ختم نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس سے ایسے عناصر کے پیدا ہونے اور ابھرنے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے جو نہ صرف صوبے بلکہ سارے ملک کے امن و امان کو خطرے میں ڈال دیں۔ قیوم صاحب کی سیاست کا نیا رنگ جناح صاحب کے دورۂ سرحد کے بعد شروع ہوا ہے۔ اس لئے یہ قیاس غالباً ٹھیک ہوگا کہ انھیں جناح صاحب کی تائید حاصل ہے۔ ایسی صورت میں یہ امید کہ وہ تحقیقات پر آمادہ ہو جائیں گے یا تاریخ کے اس سبق کو یاد کریں گے کہ ظلم سے عوام کو کچلا نہیں جا سکتا، امید موہوم سے زیادہ نہیں۔ لیکن پنجاب لیگ قابل مبارک باد ہے کہ اس نے حق کی حمایت کی جرأت کی۔ صحت مند جمہوریت کی تعمیر ایک مناسب حزب مخالف کے بغیر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

یہ آئین زبان ہندی

مغربی پنجاب کی حکومت نے اپنے ایک پریس نوٹ میں پریس کو متنبہ کیا ہے کہ پاکستان کی مخالفت میں پروپیگنڈے پر سخت کارروائی کی جائے گی۔ حکومت کو پریس کے ایک حصے کی بعض حرکتیں گراں گذری ہیں اور اس بات سے تشویش پیدا ہو گئی ہے کہ کھلے بندوں اور ڈھکے چھپے بعض اخبارات نے پاکستان کے بعض قومی مقاصد کی مخالفت کرنے کو اپنا مقصد بنا لیا ہے۔ ان مقاصد میں خاص طور پر کشمیر کے بارے میں حکومت کی پالیسی کا ذکر کیا گیا ہے۔ حکومت کی دوسری شکایت یہ ہے کہ بعض اخبارات عوام اور پاکستان کے موجودہ لیڈروں کے درمیان ایک خلیج پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ پریس نوٹ میں قومی اتحاد و نظم پر زور دیا گیا ہے۔ اور حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان رجحانات کو دبانے اور ختم کر دینے کے لئے سخت کارروائیاں کرے۔

حکومت کی شکایتوں میں کتنی سچائی ہے یہ کہنا مشکل ہے۔ لیکن یہ قیاس کرنا بھی آسان نہیں کہ کوئی ایسا اخبار بھی پاکستان میں موجود ہے جس پر پاکستان کے قومی مفاد کی مخالفت کا شبہ بھی کیا جا سکے۔ لیکن یہ حکومت کے اپنے موڈ ہیں اور بحث رموز مملکت سے نہیں، اصل سوال یہ ہے کہ حکومت اخبارات کے معاملے میں اس طرح خود ہی جج بن جاتی ہے، خود ہی الزام لگاتی ہے اور خود ہی سزا بھی دیتی ہے۔ یہ صورت حال ایک نئی نئی جمہوریت کے لئے کچھ زیادہ امید افزا بات نہیں۔ حکومت پنجاب نے پچھلے دنوں دو اخبارات کے خلاف سخت کارروائی کی ہے۔ اس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے پاکستان ٹائمز نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے احتجاج میں ایک بیان شائع کیا ہے ان کی بعض نصیحتوں پر عمل کر کے مغربی پنجاب کی حکومت اپنے کو زیادہ شدید تر خطرے کے امکان سے بچا سکتی ہے۔ ہماری حکومت اگر واقعی عوام کے فلاح و بہبود سے دلچسپی رکھتی ہے اور ملک کو انقلاب کی سختیوں سے بچانا چاہتی ہے تو اس کو چاہئے کہ اپنے شہریوں کو زیادہ سے زیادہ آزادی خیال اور آزادی تقریر دے۔ عوام کی آزادی تقریر و تحریر میں مداخلت کا یہی نتیجہ ہو سکتا ہے کہ طاقت و اقتدار پر امن قانونی لوگوں کے ہاتھ سے نکل کر سوسائٹی کے انقلاب دوست عناصر کے ہاتھ میں چلا جائے اور انقلاب سے سب کو ڈرنا چاہئے، کم سے کم مغربی پنجاب کی حکومت کو تو ضرور ہی۔

پناہ گزیں کہاں جائیں؟

کچھ ہی عرصہ ہوا مغربی پنجاب کی حکومت کے بعض ذمہ دار وزراء نے ایسے بیانات شائع کئے تھے جس سے یہ خیال ہوتا تھا کہ حکومت پناہ گزینوں کے سوال پر قابو پا چکی ہے۔ اس خوش فہمی نے پچھلے ہفتے ایک دردناک صورت حال پیدا کر دی۔ حکومت نے پناہ گزینوں کے ایک لیڈر کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ اس پر احتجاج ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پولیس نے گولی چلائی۔ اور دو آدمی جان سے مارے گئے اور کافی تعداد میں لوگ زخمی ہوئے۔ منٹگمری میں جہاں جھگڑا شروع ہوا حکومت کے اعلان کے مطابق اب بھی کھچاؤ باقی ہے گو صورت حال پر قابو پا لیا گیا ہے۔ بعض دوسرے کیمپوں میں بھی احتیاطی تدابیر کی گئی ہیں اور کم سے کم یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ منٹگمری کا سین کہیں اور دہرایا نہیں جائے گا۔

لیکن اس واقعہ سے پناہ گزینوں کا مسئلہ پھر سامنے آ گیا ہے۔ مغربی پنجاب کے کیمپوں میں کم و بیش ۵ لاکھ پناہ گزیں پڑے ہوئے ہیں اور پاکستان کے ریلیف کمشنر نیعاری صاحب نے بہت ہی صاف الفاظ میں کیمپوں کی حالت کی خرابی کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن ان کا کہنا ہے کہ اگر یہ پانچ لاکھ پناہ گزیں کہیں اور نہ ہٹائے گئے تو کیمپوں کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب ہو جانا ناگزیر ہوگا۔ انھوں نے بتایا کہ مغربی پنجاب نے اپنی پرانی آبادی سے ۲۵ فی صدی زیادہ پناہ گزیں اپنے ہاں بسا لئے ہیں۔ اس کے برخلاف صوبہ سرحد اور سندھ میں دو دو تین تین لاکھ پناہ گزینوں کو بسایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے کہا جہاں تک مغربی پنجاب کا تعلق ہے اب اس میں اور لوگوں کو بسا سکنے کی صلاحیت نہیں رہی۔

ان اعداد سے خیال ہوتا ہے کہ مغربی پاکستان کے مختلف صوبوں نے پناہ گزینوں کو بسانے کے مسئلے میں تعاون نہیں کیا ہے۔ قصور بڑی حد تک مرکزی وزارت کا سمجھنا چاہئے۔ اس لئے کہ یہ کام اس کا تھا کہ صوبوں کی صلاحیتوں کا اندازہ کر کے پناہ گزینوں کو بسانے کا ایک پروگرام مرتب کرتی۔ اس ہفتہ کراچی میں اس سلسلے میں ایک جلسہ ہو رہا ہے اور کم سے کم اس جلسے کے بعد پالیسی کا تعین ضرور ہو جانا چاہئے۔ لیکن پالیسی کے تعین کے بعد بھی یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اتنی تاخیر کے لئے کیا قیمت دینی ہوگی۔ پانچ لاکھ انسانوں کو مغربی پنجاب سے سرحد اور سندھ منتقل کرنا خود ایک دشوار کام ہوگا۔ اس میں وقت لگے گا۔ اور اس وقفہ میں کیمپوں کی حالت اگر نہ سدھری تو پھر پانی سر سے گذر جائے گا۔ ممکن ہے بہت سے لوگ مغربی پنجاب سے ہٹنا نہ چاہیں۔ حکومت کو ان کے ساتھ بھی زبردستی کرنی ہوگی۔ حکومت کو کوئی ایسا طریق کار ڈھونڈنا ہوگا کہ اسے پناہ گزینوں کا پورا پورا تعاون حاصل ہو سکے۔ پورے تعاون کے بغیر کچھ کرنے کی

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

مغربی دُنیا

برلن میں کبڈی کا کھیل

دو حریفوں کو ایک دوسرے کے خلاف خوب بھڑکا دیئے مگر لڑنے نہ دیجئے تو ان سے عجیب مضحکہ خیز حرکتیں سرزد ہوتی ہیں۔ پچھلے ہفتے جو برلن کی حالت تھی اُسے دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ جرمنی کے المناک ڈرامے کا داخراش اختتام کرنے کے لئے بیچ میں ایک تفریحی شغل داخل کر دیا گیا ہے۔ برلن میں ایک چوک پوٹسڈامر پلاتس کہلاتا ہے یہاں برلن کے روسی، امریکی اور برطانوی علاقوں کی سرحدیں ملتی ہیں۔ ۲۰ اگست کو روسی پولیس چور بازاری کے ملزموں کا پیچھا کرتی ہوئی امریکی علاقے میں داخل ہو گئی اور ملزموں کو پکڑ لے گئی۔ اس سے امریکی اور برطانوی علاقوں میں ہلچل مچ گئی۔ مسلح پولیس اور فوج موقع [illegible] پر بھیج دی گئی۔ ادھر سے روسی پولیس اور فوج بھی آ گئی۔ بیچ میں سفید روغن کی ایک چوڑی سی لکیر کھینچ دی گئی۔ لیجئے پالا بن گیا۔ اس کے بعد لوگوں کے ادھر سے اُدھر آنے جانے، گرفتار ہونے یا بچ نکلنے کے متعدد واقعات ہونے لگے جنھوں نے بالکل کبڈی کی صورت اختیار کر لی۔ چند روز کے بعد یہ سلسلہ تو موقوف ہو گیا۔ لیکن شہر کے جرمن باشندوں میں سے کمیونسٹ پارٹی نے برلن کی حکومت بلدیہ کے خلاف جس میں مغربی علاقے کے رکنوں کی اکثریت ہے مظاہرے شروع کر دئے ہیں۔ دونوں پارٹیاں حکومت کی حمایت میں مظاہرے کر رہی ہیں۔

ادھر ماسکو میں مغربی جمہوریتوں کے نمائندوں اور روسی حکومت میں گفت و شنید برابر جاری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ۲۲ اگست [illegible] کی رسمی [illegible] سے زیادہ [illegible] ثابت ہوئی [illegible] طور پر کوئی [illegible] طاقتوں [illegible] کیا گفتگو [illegible] جو اس وقت سارے [illegible] زیر بحث تھا [illegible] سمجھا جاتا ہے تفصیلات خود برلن میں فریقین کے مقامی [illegible] آپس میں طے کریں گے اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ لیکن کوئی فوری [illegible] کے علاوہ جرمنی اور بقیہ یورپ کے معاملات کے متعلق بھی کچھ بات چیت ہو رہی ہے [illegible]

اب ماسکو میں گفت و شنید جاری رہنے کے کیا معنی ہیں۔

اُدھر صلح کی باتیں اِدھر یہ

ایک طرف تو یہ خبریں آ رہی ہیں کہ ماسکو میں روسی حکومت سے امریکا اور روس کے سفیروں کی بات چیت کا رنگ اچھا ہے اور برلن کے معاملے میں سمجھوتے کی بڑی اُمید ہے اور دوسری طرف یہ معلوم ہوا کہ امریکا نے روسی قونصل کو روس کے اس الزام میں کہ اس نے چند روسیوں کو جو امریکا کی پناہ میں تھے حبس بے جا میں رکھا، واپس چلے جانے کا حکم دے دیا ہے اور روس نے اس کے جواب میں اپنے ہاں کے امریکی قونصل خانے بند کر دئے ہیں اگر امریکا میں صدر کا انتخاب قریب نہ ہوتا تو ہم سمجھتے کہ امریکی حکومت نے ایسا اقدام اٹھایا ہے جس کا رُخ اعلان جنگ کی منزل کی طرف ہے۔ لیکن وقت تو پریسیڈنٹ ٹرومین کا ایک انتخابی ہتھکنڈا معلوم ہوتا ہے [illegible] لینے کے لیے اپنے ڈنگ پن کا رعب دیں۔ غالباً روس اس بات کو جانتا ہے۔ اس نے ترکی بہ ترکی جواب تو دے دیا لیکن ماسکو کی بات چیت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑنے دیا

ہارے دُشمن کی دُرگت

پچھلی جنگ کے ختم ہونے کے بعد مغلوب ملک کے ارکان حکومت اور بڑے بڑے عہدہ داروں پر مقدمے چلا اور ان کو سزائیں دینا ایک [illegible] [illegible] یا رسوائی [illegible] [illegible] لئے [illegible] [illegible] کی کوشش [illegible] میں روسیوں کو قتل [illegible] کو ناریوں [illegible] بار مصیبتیں اُٹھانی پڑی تھیں۔ لیکن اُن کے غصے کی لپیٹ میں جنگی مجرموں کے ساتھ وہ جرمن فوجی افسر بھی آ گئے جن کا قصور اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انھوں نے اپنے ملک کی طرف سے لڑ کر روس کی فوجوں کو شکست دی۔

امریکا اور انگلستان سے [illegible] توجہ نکالنے میں ان پر بہت [illegible] ایک یہ بھی تھی کہ جرمن فوج کے بعض اعلیٰ افسر جو ان کے ہاں قید ہیں مقدمہ نہیں چلایا جاتا۔ اب معلوم ہوتا ہے روسیوں کی تالیف قلب کے لئے ان کی یہ شکایت دور کر دی جائے گی۔ حال میں فیلڈ مارشل رنڈسٹیڈٹ، فیلڈ مارشل براؤخش، فیلڈ مارشل مان اشتائن اور جنرل سٹراؤس کو انگلستان سے جرمنی بھیجا گیا ہے [illegible] قیدیوں کی حیثیت سے [illegible] معمولی قیدیوں کی حیثیت سے رکھے [illegible] ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب [illegible] سے دوسری جگہ بھیجا جاتا تو ان کو اپنا سامان خود لاد کے لیجانا پڑتا ہے۔ انگلستان میں اس مسئلے پر خاصی گرم بحث ہے۔ کچھ لوگ ان پر سختی [illegible] اور مقدمہ چلانے کی حمایت کر رہے ہیں اور کچھ اسے شرافت اور انسانیت کے خلاف بتاتے ہیں۔ [illegible] میں کہیں شرافت و انسانیت کا نام سنائی دے [illegible] بہت غنیمت ہے۔

تکلّف یا ہچکچاہٹ؟

مغربی یورپ کی ایک متحدہ پارلیمنٹ کی تجویز جو برسلز کانفرنس نے مسٹر چرچل کی صدارت میں منظور کی تھی اب فرانس کی طرف سے سرکاری طور پر اٹھائی گئی ہے۔ فرانس کی حکومت نے ان سب ملکوں کو جو برسلز کے معاہدے میں شریک تھے خط لکھے ہیں جن میں ان سے اس تجویز پر غور کرنے کی درخواست کی ہے۔ ابھی انگلستان نے یہ معلوم ہوا کہ ان خطوں کے کیا جواب [illegible] میں مگر اس بات [illegible] مسٹر اٹیلی۔ مسٹر چرچل [illegible] [illegible] تائید [illegible] ہے اور [illegible] اٹیلی لے لیجئے۔ معلوم ہوتا ہے [illegible] مغربی یورپ کے اتحاد عمل [illegible] وفاق کی حد تک لے جانے میں تامل ہے۔ پیرس کے اخبار "لی مانڈ" کے ایک مضمون نگار نے مسٹر اٹیلی کے اس [illegible] پر تنقید کرتے ہوئے ان سے پوچھا ہے کہ کیا آپ اپنے ملک کو مغربی یورپ کا امام بنانے کے بجائے پچھلی صف میں رکھنا چاہتے ہیں۔ اس نے انھیں غیرت دلائی ہے کہ فرانس میں موسیو بلوم اور موسیو رمادیے اور بلجیم میں موسیو اسپاک تو اس مقصد کی طرف جو حقیقت میں سوشلسٹ مقصد ہے دلیری سے قدم بڑھا رہے ہیں اور آپ یورپ کے مفاد اور عقل کے تقاضے کو نظرانداز کر کے چھوٹی چھوٹی اندرونی مصلحتوں کی وجہ سے آگے بڑھتے ہوئے ہچکچاتے [illegible] آخر میں اس نے یہ اُمید ظاہر کی ہے [illegible] اور مسٹر بیون خود اپنے ملک اپنی پارٹی کی رائے سے مجبور ہو کر وفاق یورپ کی تحریک میں شریک ہو جائیں گے۔

یہ تو ممکن نہیں کہ مغربی یورپ کی لیڈری کا تاج مسٹر اٹیلی کے دل کو نہ کھینچتا ہو۔ یا تو وہ محض تکلف کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں [illegible] زیادہ اصرار کیا جائے یا انھیں یہ قدم اُٹھانے میں کچھ خطرات نظر آتے ہیں اس کی وجہ سے ہچکچاتے ہیں۔ خطرات بظاہر دو ہو سکتے ہیں: ایک تو یہ کہ وفاق کا رکن ہونے کے بعد انگلستان کو آئندہ جنگ میں لازمی طور پر شریک ہونا پڑے گا مگر سچ پوچھئے تو یوں بھی اس نے اپنے آپ کو مغربی یورپ سے اس طرح وابستہ کر لیا ہے کہ اگر جنگ وہاں تک پہنچی تو وہ کسی طرح الگ نہیں رہ سکتا۔ دوسرا خطرہ یہ ہے کہ کہیں وفاق کے اندر سوشلسٹ پارٹی اقلیت میں نہ رہ جائے، اور مغربی یورپ کی لیڈری مسٹر اٹیلی کی بجائے مسٹر چرچل کے ہاتھ میں نہ پہنچ جائے۔ یہ پہلو واقعی قابل غور ہے اور اگر مسٹر اٹیلی اسی وجہ سے تامل کر رہے ہیں تو کچھ بے جا نہیں۔ اس لئے کہ اگر خدا مسٹر چرچل کو ناخن دے دے تو پھر یورپ کی خیریت نہیں۔

پاکستان (بسلسلہ صفحہ ۵)

کوشش کی گئی تو نتائج خاصے دردناک اور خطرناک ہو سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ منٹگمری میں پناہ گزینوں نے اسلحہ جمع کر رکھے ہیں۔ یہ اس خطرہ کی طرف ایک معمولی سا اشارہ ہے۔ ادھر بارش کی کثرت اور سیلاب کی وجہ سے ایک نئی مشکل بھی پیدا ہو گئی ہے سندھ اور مغربی پنجاب دونوں ہی جگہ فصل کو کافی نقصان پہنچا ہے۔ اس سے یہ اندیشہ پیدا ہو سکتا ہے کہ مغربی پاکستان کی غذائی صورت حال خراب ہو جائے۔ اگر ایسا ہوا تو پناہ گزینوں کا مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہو جائے گا۔ مغربی پنجاب کے متعلق لیگ کی ایڈہاک کمیٹی نے اپنی ایک تجویز میں مغربی پنجاب کی غذائی صورت حال کے متعلق تشویش کا اظہار کیا ہے، اور کہا ہے کہ اگر اس صورت حال پر قابو پانے کی کوشش نہ کی گئی تو فاقہ کشی کی مصیبت سے بچنا مشکل ہو گا۔

ا - ن - س

یہ لوگ

اختر انصاری

ستم قاتل بہ اعتبارِ اثر
یوں تو شاخِ نبات ہیں یہ لوگ

ذہن تاریک اُن کے دل تاریک
علم و عرفاں کی رات ہیں یہ لوگ

دشمنی اِن کی ہر اُجالے سے
ظلمتِ کائنات ہیں یہ لوگ

قلب یخ بستہ، روح یخ بستہ
انجمادِ حیات ہیں یہ لوگ

نہیں ان میں کوئی تڑپ باقی
مدفنِ حسیات ہیں یہ لوگ

تپشِ زیست سے عناد انھیں
موت کا سرد ہاتھ ہیں یہ لوگ

نہ تفکر، نہ سوزِ دل، نہ شعور
کس قدر واہیات ہیں یہ لوگ

فرار

کوثر بلگرامی

مطربا! کیسی قیامت کی گھٹا چھائی ہے
اہرمن کی سپہ شر کی صف آرائی ہے
کشت و خوں، قحط و بلا، ذلت و رسوائی ہے
نوعِ انساں پہ تباہی کی گھڑی آئی ہے

روح بیتاب تڑپتی ہی چلی جاتی ہے!
زندگی آہ کے سانچوں میں ڈھلی جاتی ہے!

یہ بھڑکتے ہوئے شعلے، یہ گرجتے طوفاں
یہ تڑپتی ہوئی آہیں، یہ سسکتے ارماں
نیم جاں، تشنہ دہاں، فاقوں کے مارے انساں
چار جانب ہے بپا ایک قیامت کا سماں

یہ نئے نشترِ خاطر نہیں دیکھے جاتے!
یہ جگر سوز مناظر نہیں دیکھے جاتے!

محفلِ عیش نہیں، بزمِ عزا ہے دنیا
لاکھ آنسو ہیں یہاں ایک تبسم کی بہا
چار سو خونِ تمنا، الم و آہ و بکا
دل میں اب طاقتِ برداشت نہیں، ساز اٹھا!

تارِ احساس ہو خاموش تو ہو جانے دے!
مجھے نغمات کے سیلاب میں کھو جانے دے!

نزولِ رحمت

اختر حمید خاں

(۱)

اگر نزول نہ رحمت کا آسماں سے ہو
اگر کرم کا ترشح زمیں کو نم نہ کرے
اگر یہ آبِ مصفّٰی یہ شبنم و باراں
زمیں کی خشکی و شوریدگی کو کم نہ کرے
تو یہ فروغ، یہ امیدگی کہاں سے ہو
تو زندگی یہ نئی روح آکے دم نہ کرے

(۲)

مری مثال بھی اُس خاکِ تشنہ کی سی ہے
جو اب ہاں سے نمناک و سرفراز رہے
یہ ولولے، یہ اُمنگیں نزولِ رحمت ہیں
خدا کرے کہ مرا دل یونہی گداز رہے
نئی ترنگ، نئی اک شگفتگی سی ہے
امید و شوق کا یہ سلسلہ دراز رہے

(۳)

ہوائیں پورب و پچھم کے ساگروں سے اٹھا
اُٹھا کے لاتی ہیں انمول موتیوں کی لڑی
نکھارتے ہیں سمندر سے دیوتا جس کو
بلاشبہ وہی امرت ہی ساونوں کی جھڑی
طواف کرتی ہیں جس ارض کا نسیم و صبا
وہ ارض ہوتی ہے شاداب و خوش گوار بڑی

(۴)

مری مثال بھی اُس ارضِ خوش گوار کی ہے
نسیم ہے مرے کوچے میں اور صبا بھی ہے
کھلے ہوئے ہیں شگوفے، نیا ہوں صحنِ چمن
خدا کے فضل سے بارش بھی ہے ہوا بھی ہے
دبا ہوا ہوں زمانے کے پاؤں کے نیچے
اور آسمان و سمندر سے واسطہ بھی ہے

(۵)

ہوا نے، ابر نے، موسم نے، روحِ فطرت نے
دیا ہے بوسہ بہ پیغام نازنینوں کو
ہمارے پاس بھی آیا ہی عرش سے تحفہ
حقیر سمجھو نہ ہم زاویہ نشینوں کو
سناؤں گا یہی دو چار گیت برکھا کے
کشیدہ قامت و گل پیرہن حسینوں کو

میں نے کہانی کیوں نہیں لکھی؟

خواجہ احمد عباس

ایک دو نہیں میری نگر کے ایس پی کالج سے چار نوجوان دوست فرمائش لے کر آئے۔ کل ہماری بزم ادب کا جلسہ ہے۔ اس میں شرکت کرو اور ایک کہانی پڑھو۔ اب کوئی انکار کرے بھی تو کیونکر۔

"کون سی کہانی پڑھوں؟" میں نے اپنے ایک دوست سے پوچھا جس کا نام بھی وہی ہے جو میرا ہے اور جو میری ہی طرح گنجا اور پست قد ہے، غرض ہو بہو "میں" ہے۔

"کشمیری نوجوانوں کی محفل میں کہانی پڑھنے والے ہو تو کشمیر پر کوئی کہانی پڑھو۔" اس نے جواب دیا۔

"میں نے تو کشمیر کے بارے میں ایک ہی کہانی لکھی ہے زعفران کے پھول۔ مگر وہ تو یہاں کی جنگ آزادی کے ایک دور سے پہلے کی عکاسی کرتی ہے۔ آج تو حالات بدل چکے ہیں......"

میں نے فقرہ پورا نہیں کیا تھا کہ وہ بولا "تو کوئی نئی کہانی لکھو۔"

"کہنا آسان ہے اور لکھنا مشکل ہے۔" میں نے کہا "چند گھنٹے ہی تو رہ گئے ہیں کیسے لکھ پاؤں گا؟"

مگر اس نے بچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ "لکھنے والے چند گھنٹے میں بھی کہانی لکھ سکتے ہیں۔ زعفران کے پھول تم ہی نے سری نگر سے راولپنڈی تک کے سفر میں لکھی تھی، ہاں اگر کوئی اپنی سستی کے بہانے تلاش کرنا چاہے تو......"

میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اچھا بھئی اچھا۔ تم جیتے میں ہارا۔ نئی کہانی ہی لکھتا ہوں......"

کاغذ قلم لے کر میں بیٹھ گیا۔ چہرے پر انہماک بلکہ الہام کے اثرات پیدا کرنے کی کوشش کی کہ آس پاس والے سب جان جائیں کہ دماغ پر تخلیقی بھوت سوار ہے۔ کیا کہانی لکھوں یہ سمجھ میں نہیں آیا۔

کہانی کے بارے میں اکثر کم سمجھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بھی اخبار کے مضمون کی طرح لکھی جاتی ہے۔ ناپ تول کر۔ یا غزل کی طرح قافیے ردیف کو گھڑ کر تیار کی جاتی ہے۔ درحقیقت کہانی لکھی نہیں جاتی بلکہ الہامی اشعار کی طرح نازل ہوتی ہے۔ کسی گجراتی افسانہ نگار نے کہانی کو ایک ہرنی سے تشبیہ دی ہے، جو جنگل میں کلیلیں مارتی پھرتی رہتی ہے اور کوئی خوش قسمت اور چالاک شکاری ہی اس کو قابو میں کر پاتا ہے۔

عالم خیال کے جنگلوں اور میدانوں میں میں اسی ہرنی کی تلاش میں کہاں کہاں پھرا مگر ہر بار وہ زقند مار کر نکل گئی اور میں نشانہ لگاتا ہی رہا۔ کشمیر کی ہر جنت نظیر وادی، ہر دامن کوہسار، ہر جھیل اور دریا کی سیر میں نے کی۔ شکارے پر بیٹھ کر میں ڈل میں گھوما، گھوڑے پر سوار ہو کر البتر ہو آیا۔ شالامار میں گاتے ہوئے آبشاروں کے نغمے میں نے سنے مگر کہیں مجھے کہانی نہ ملی۔ میں ہر طبقے کے کشمیریوں سے ملا۔ ہانجی، شکارے والے دست کار، گوجر، پنڈت، پیر، لکڑہارے، بڑھئی، لہار، سنار، شالی کوٹتی ہوئی عورتیں، دھان کے کھیتوں میں گھٹنوں گھٹنوں پانی میں کھڑے ہوئے کسان، مگر یہ سب تو معمولی کام کرنے والے انسان تھے۔ بھلا ان کے بارے میں کہانی کیسے لکھی جا سکتی ہے۔ کہانی تو ہیرو، ہیروئن کے بارے میں لکھی جاتی ہے اور ہیرو ہیروئن صرف ایک کام کرنا جانتے ہیں۔ — عشق

غرض اس جنت نظیر ملک میں جہاں قدرت نے انسان اور اس کے قدرتی ماحول دونوں کو حسن بخشا ہے، جہاں کا ہر نظارہ رومان انگیز ہے، جہاں حبہ خاتون عرفانی محبت سے سرشار رہی اور جہاں شہزادے اور لالہ رخ کا عشق پروان چڑھا مجھے کہیں عاشق و معشوق کا جوڑا نہ ملا تاکہ میں ان کے بارے میں ایک رومانی افسانہ تصنیف کر سکوں۔ اب آپ ہی سوچئے کہیں میلے کچیلے کپڑے پہننے والے ہانجیوں اور کسانوں کے بارے میں کہانی لکھی جاتی ہے......

جیسا میں نے عرض کیا عالم خیال میں اسی طرح کہانی کی تلاش میں سرگرداں پھر رہا تھا کہ میں نہ جانے کس طرح پام پور جا نکلا۔ پام پور! اسی گاؤں کے بارے میں میں نے کتنی ہی رومانی روایات سنی تھیں۔ کرشن چندر نے کہیں لکھا ہے کہ جس نے پام پور کا چاند نہیں دیکھا وہ دنیا کے حسین ترین نظارے سے محروم رہا ہے۔ نہ معلوم پامپور میں کوئی الگ چاند نکلتا ہے یا وہی زرد رو روشنی کی ٹکیا جو ساری دنیا میں دکھائی دیتی ہے پھر ہاں اور دوستوں کی زبانی سنا تھا کہ زعفران کے موسم میں پام پور کے قریب زعفران کے کھیت، چاندنی رات میں عجیب پر بہار کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ پام پور، زعفران اور شہد، اخروٹ، بو اور مٹھاس، دریا کا کنارہ اور وہ مست چاند، میں نے سوچا پام پور میں ضرور رومان پلتے ہوں گے۔ مگر جب میں نے گاؤں کے تنگ اور تاریک ٹوٹے پھوٹے مکانوں کو دیکھا تو میرا دل بیٹھ گیا۔ سڑک پر بارش کی وجہ سے کیچڑ تھا اور مرد عورت سب اونچی اونچی لکڑی کی چبوترے نما کھڑاویں پہنے پھر رہے تھے۔ جہلم میں سیلاب آیا ہوا تھا اور وہ ایک رومانی، مدھم بہنے والی ندی کے بجائے ایک بپھرا ہوا سمندر بنا ہوا تھا۔ چاروں طرف نظر دوڑائی کہیں نہ رومان کا پتہ چلا اور نہ کوئی ہیرو ہیروئن ملے۔

پھر میں نے دور سے ایک لڑکی کو دیکھا جو گھڑا سر پر اٹھائے پانی بھرنے جا رہی تھی۔ اس کی چال سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ضرور جوان ہے، جیسا آپ سب جانتے ہیں، سر پر گھڑا اٹھائے ہوئے پنگھٹ کی طرف جاتی ہوئی عورت ہمیشہ ایک خوب صورت اور رومانی منظر پیش کرتی ہے پنگھٹ کا تصور ہی کس قدر دل فریب اور رومانی ہے سکھیوں کی چہل، پانی کے چھینٹے، عاشقوں کا چھپ چھپ کر دیکھنا، کسی مسافر کا پنگھٹ پر ٹھہر کر پانی مانگنا اور شربت دیدار کے گھونٹ پی کر ٹھنڈی آہیں بھرتے ہوئے چلے جانا......

معاف کیجئے میں کسی فلم کا خیال کر رہا تھا۔

وہ لڑکی پنگھٹ پر جانے کے بجائے دریا کے کنارے پر گئی اور وہاں سے گھڑا بھر کر واپس ہوئی۔ میری نگاہ میں یہ ایک رومانی فعل نہیں بلکہ ایک نہایت غیر صحت مند فعل تھا۔ کیونکہ سیلاب کی وجہ سے دریا کا پانی گدلا اور گندا تھا۔ نہ جانے کیا الابلا بہا کر لا رہا تھا۔ بھلا کوئی کنوئیں کا صاف پانی چھوڑ کر اس گندے پانی کو کیوں پیئے؟

میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کسی نے مجھے بتایا کہ سیلاب کی وجہ سے دریا کا گندا پانی رس رس کر کنوؤں میں بھی پہنچ گیا ہے، اور اس وقت تو دریا کا بہتا ہوا پانی کنوئیں کے ٹھہرے ہوئے پانی سے بہتر ہے۔

ہاں تو جب وہ لڑکی پانی بھر کر واپس ہوئی تو میں نے دیکھا کہ وہ نوجوان ہی تھی، گوری رنگت تھی مگر اس پر کچھ کیچڑ لگا ہوا تھا، بالوں میں دھول اٹی ہوئی تھی، پیراہن میلا تھا، ننگے پاؤں کیچڑ میں دھنسے جاتے تھے میرے رومان زدہ دماغ نے فوراً کہانی کا عنوان سوچ لیا "کیچڑ کا کنول"۔

قریب کھڑے ہوئے ایک بڑے میاں سے میں نے پوچھا اس لڑکی کا نام کیا ہے، جواب ملا "نوراں"۔

نوراں کتنا اچھا نام ہے! کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو دونوں کی کہانیوں میں آ چکا ہے۔ یہ لڑکی ضرور ایک افسانے کی ہیروئن بن سکتی ہے۔ اس کی نگاہوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ضرور کسی سے عشق کرتی ہوگی۔

ایک اور آدمی سے میں نے پوچھا "کیوں بھائی یہ نوراں کسی سے عشق کرتی ہے؟"

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا "عشق! اس کی تو کئی برس ہوئے شادی ہو چکی ہے!"

لاحول ولاقوۃ۔ میں نے سوچا۔ جبھی تو ہندوستان اور کشمیر دونوں ترقی نہیں کر پاتے، ابھی لڑکی جوان نہیں ہوتی، دو چار عشق نہیں کر پاتی کہ جھٹ سے اس کی شادی کر دی جاتی ہے۔ بھلا شادی شدہ لڑکی کے بارے میں بھی کوئی افسانہ لکھ سکتا ہے؟ جب تک وہ اپنے شوہر کے بجائے کسی دوسرے جوان کے عشق میں گرفتار نہ ہو جائے! اور نوراں کی چال ڈھال، وضع قطع سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان سیدھی سادھی جاہل ہندوستانی لڑکیوں میں ہے جو شادی بیاہ ہی کو اپنے رومان کی معراج اور اس کا اختتام سمجھتی ہیں۔

خیر میں نے سوچا، اس نوراں کے شوہر سے تو ملا جائے، شاید اسی میں رومانی جراثیم پائے جائیں۔

میں نے ایک راہ چلتے سے پوچھا "کیوں جی اس نوراں کا شوہر کیا کرتا ہے؟"

اس نے کہا "نانبائی" ہے۔ میرے رومانی تخیل کو پھر ایک ٹھیس پہنچی۔ بھلا کوئی نانبائی بھی عشق و محبت کو سمجھ سکتا ہے، کیا اس کے دل میں بھی آٹے کی طرح خمیر اٹھ سکتا ہے؟ یا وہ ایک خوب صورت حسینہ کو دیکھ کر بھی سوچ سکتا ہے کہ اس کے بھرے ہوئے گال بالکل میری نانوں کی طرح ہیں۔

پھر بھی میں نے سوچا چلو، اسے دیکھ تو لوں "کیوں بھائی اس کی دوکان کہاں ہے؟"

"وہ کیا ہے سامنے۔"

"مگر وہ تو بند ہے۔"

"یار وہ محاذ پر گیا ہوا ہے۔"

"محاذ پر؟ تمہارا مطلب ہے جنگی محاذ پر؟"

"ہاں ہاں فرنٹ پر۔"

یہ سُن کر میں خوش ہوگیا۔ نوراں کا شوہر میدانِ جنگ پر دشمن کا مقابلہ کر رہا ہے۔ شاید درجنوں قبائلیوں کو مار چکا ہوگا۔ شاید اُسے کوئی میڈل یا انعام ملا ہو۔ وہ ضرور ہیرو بننے کے قابل ہوگا۔ میں ضرور اس سے فرنٹ پر جا کر ملوں گا۔ تب میرا افسانہ مکمل ہو جائے گا۔

میں نے پوچھا "نیشنل ملیشیا میں ہے نا؟"

جواب سُن کر میرے جوش و خروش پر پانی پڑ گیا "نہیں جی۔ وہ تو بے چارہ قلی بن کر گیا ہے ہندوستانی فوج کا سامان اُٹھا کر لے جاتا ہے۔"

اب آپ ہی سوچئے۔ ایک سپاہی کو تو ہیرو بنایا جا سکتا ہے۔ مگر ایک قلی کو کیسے ہیرو بنایا جا سکتا ہے ..... سپاہی خواہ کیسا ہی معمولی کیوں نہ ہو اُس کی رومانی ہستی ہوتی ہے۔ مگر قلی

خیر میں نے پوچھا "نام کیا ہے اس کا؟"

"احمدو۔"

میں نے دماغ میں نام نوٹ کر لیا کہ شاید [illegible] کام آ سکے۔

پھر میں نوراں کے گھر دیکھا کہ ممکن ہے وہاں کوئی افسانوی مسالہ مل جائے، مگر اس کا گھر جس کے آنگن میں پانی بھرا ہوا تھا۔ نہایت غیر رومانی تھا۔ میں نے سوچا تھا شاید نوراں اپنے شوہر کے فراق میں بیٹھا کوئی درد بھرا کوئی کشمیری گیت گا رہی ہو۔ مگر وہ نہایت غیر رومانی انہماک سے دھان کوٹ رہی تھی .... ہاں اسی کے پاس ہی اس کا ڈیڑھ دو برس کا بچہ گیلی زمین پر بیٹھا رو رہا تھا۔ نانیا اور مکھی جو گھر بھر میں گھوم رہی تھی وہ اس کی آنکھوں میں گر گئی تھی کیونکہ وہ بار بار آنکھیں مل رہا تھا۔

اس گھٹیا قسم کے گھریلو منظر میں مجھے کوئی رومانی یا افسانوی پہلو نظر نہیں آیا۔ اس لئے میں وہاں سے چلنے لگا یہ سوچ کر کہ کس معافی مانگ لوں گا کہ کہانی مکمل نہیں ہوئی .... مگر میں باہر نکلنے والا ہی تھا کہ میں نے دیکھا کہ نوراں نے کام روک کر بچے کو گود میں اُٹھا لیا ہے اور اسے پیار کرتی جا رہی ہے اور کچھ کہتی جاتی ہے اور اس کی آنکھیں دور، بہت دور سے کچھ دیکھ رہی ہیں۔ بہ یک وقت ہنس بھی رہی ہیں اور رو بھی رہی ہیں۔ میں کشمیری نہیں سمجھ سکتا۔ اس لئے میں نے ایک ہمسائے سے پوچھا۔ "یہ نوراں اپنے بچے سے کیا کہہ رہی ہے؟" وہ بولا "یہ کہتی ہے کیوں روتا ہے رے تو؟ تجھے تو باپ کی طرح بہادر ہونا چاہیئے رے۔"

بہادر! یہ لفظ سن کر میں ٹھٹکا۔ میں نے سوچا اب احمدو کی ضرور تلاش کرنی چاہیئے شاید وہ بیچ [illegible] کا پہلو نکل آئے [illegible]

مگر احمدو پہنچ کہاں ملتا؟ فرنٹ پر تو ہزاروں قلی کام کرتے ہیں۔ کچھ بھی جب میں بارہ مولا منشی [illegible] میں پہنچا تو میں نے دریافت کیا کہ کیا قبائلیوں کے رجسٹر میں کہیں احمدو کا نام درج ہے؟ معلوم ہوا ایک نہیں درجن بھر احمدو لکھے ہوئے ہیں۔

اوڑی کے راستے میں میں ایک پکٹ پر ٹھہرا، جہاں نیشنل ملیشیا کی ایک کمپنی تعینات تھی۔ ان سے باتیں کر رہا تھا کہ وہاں اوڑی سے واپس آتی ہوئی قلیوں کی ایک لاری ٹھہری۔ یہ وہ لوگ تھے جو فرنٹ پر چار پانچ ہفتے کام کر کے اپنے گھر واپس جا رہے تھے۔ ملیشیا کے لڑکے لاری کی طرف دوڑے اور پوچھا۔ "کیوں بھئی بام پور والا احمدو بھی ہے تم میں کیا؟"

ایک بوڑھا قلی ہنس کر بولا۔ "اور .... احمدو واپس آ سکتے ہیں مگر بام پور والا احمدو فرنٹ سے ٹلنے والا نہیں۔" میرے دماغ میں یادداشت کی ایک گھنٹی بجی لاری روانہ ہو گئی۔ میں نے ملیشیا والوں سے پوچھا "کیوں بھئی یہ بام پور والا احمدو، کیوں مشہور ہے؟" انہوں نے بتایا کہ اسے ملیشیا میں بھرتی ہونے کی تین بار کوشش کی تھی مگر ہر بار اُسے نامنظور کر دیا گیا۔

"مگر کیوں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔ "زیادہ قابلِ اعتبار آدمی [illegible] ہے۔"

"قابلِ اعتبار کیوں نہیں؟ نیشنل کانفرنس کا پرانا کارکن ہے۔ کرانس کی [illegible] نہایت کمزور ہیں۔ اس لئے ڈاکٹری معائنہ میں .... چار انہیں رد کر جاتا ہے۔ تو وہ فرنٹ پر چلا گیا [illegible] کا مہم تھا لیکن [illegible] فیلوں کے رستے میں بھرتی ہو گیا اور اب تین مہینے سے کام کر رہا ہے۔"

معاملہ کہ احمدو اوڑی کے محاذ پر ہے۔ میں اس سے ملنے اوڑی پہنچا۔ وہیں معلوم ہوا کہ پہاڑوں میں زیادہ خطرہ ہونے کی وجہ سے قلی وہاں جانے سے جھجکتے ہیں۔ اس لئے احمدو ان کو لے کر اس محاذ پر چلا گیا ہے۔ میں ٹیٹھوال پہنچا تو وہ سکھ دور جا چکا تھا۔ میں سکھ دور میں تو وہ پونچھ میں، پونچھ میں تو وہ واپس اوڑی میں۔ کبھی ملاقات نہ ہوئی۔ اور جب تک وہ نہ ملے تو میری کہانی کیسے پوری ہو!

میں واپس اوڑی پہنچا۔ جو کرنیل قلیوں کا انچارج تھا اس سے پوچھا۔ "آپ کے یہاں ایک احمدو قلی ہے بام پور والا" یہ کہہ کر میں قلم کاغذ نکال کر بیٹھ گیا۔ تاکہ اس کے حالات معلوم کر کے افسانہ مکمل کر لوں، کرنیل نے میری طرف ایک عجیب انداز سے دیکھا۔ اور جواب میں صرف ایک لفظ کہا۔ "تھا .... تھا؟"

ہاں "کرنیل بولا" رات وہ ایک قریب کی پہاڑی پر مارا گیا۔"

"مارا گیا؟ مگر وہ سپاہی تو نہ تھا، وہ صرف ایک قلی ...."

کرنیل نے کہا "احمدو صرف ایک قلی نہیں تھا؟"

میں کچھ مطلب نہیں سمجھا اتنے میں ایک کپتان داخل ہوا اس کے ہاتھ میں ایک زنگ لگی [illegible] کی دقیانوسی توڑے دار بندوق تھی۔ کرنیل کو سلام کرتے ہوئے اس نے کہا "جناب اپنی بندوق ہے اس نے دشمن کے آدمی ہلاک کر دیئے۔ اسے وہ ہمیشہ اپنے بستر میں چھپا کے رکھتا تھا۔"

[illegible]

میں نے کرنیل سے کہا "کیا میں احمدو کی لاش کو دیکھ سکتا ہوں [illegible] کے خدوخال میں [illegible] وطن پرستی [illegible] مل سکے!

کرنیل نے افسوس سے ابھی تک سر ہلایا۔ کپتان نے پہلے سے سمجھایا کہ ایک [illegible] احمدو کو [illegible] تھا۔ [illegible] تھا۔

میرے ہاتھ سے قلم گر پڑا۔ میں نے احمدو کی بندوق اٹھالی جس کے کندے پر اب تک لہو .... احمدو کا لہو .... لگا ہوا تھا

سو احمدو سے میری ملاقات نہ ہوسکی جو یہ افسانہ مکمل ہو سکتا۔ اُمید ہے کہ آپ معاف کریں گے کہ میں آپ کی فرمائش پوری نہ کر سکا۔ بہرحال اب آپ جان گئے کہ میں نے کہانی کیوں نہیں لکھی۔

مسلمان اور آزادی (بسلسلہ صفحہ ۲)

جنھیں پاکستان میں نوکری کا اور دوسرے حریفوں سے ملنے کا موقع تھا، وہاں جانے کی تیاریاں کرنے لگے باقی سب ظاہر میں چاہے کچھ ہی کہتے ہوں، دل میں افسردگی، مایوسی، ندامت لئے ہوئے رہ گئے۔

اسی عالم میں ۱۵ اگست آئی، کلکتہ، بمبئی، دہلی اور دوسرے شہروں میں جن لوگوں نے یومِ آزادی کا شاندار منظر دیکھا وہ کہتے ہیں کہ ایک بار کی زندگی کے سوتوں سے حقیقی سیلاب اسی طرح پھوٹا کہ ہندو، مسلمان، کانگریسی، سبھائی، لیگی سب کو بہا لے گیا۔ کلکتہ میں نوجیرکا [illegible] پرست بمبئی کو کیا کہیے کہ بمبئی کے مسلمان، ہندوؤں کے محلوں میں اور ہندو مسلمانوں کے محلے میں بلا تکلف قدم رکھتے ہوئے ڈرتے تھے اور آج اپنے گھروں کی طرح جا رہے تھے۔ ایک دوسرے سے بھائیوں کی طرح گلے مل رہے تھے۔ آزادی کی خوشی قلب کی گہرائیوں سے اس طرح اُمنڈ رہی تھی کہ تھوڑی دیر کے لئے غرض کا کھوٹ اور تعصب کا میل بالکل غائب ہو گیا تھا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تعصب اور نفرت کا جو زہر مسلم لیگ نے ہندوستان کے مسلمانوں میں دس سال میں (بلکہ پانچ چھ سال کہیے اس لئے کہ عام مسلمانوں میں اس کا اثر پانچ چھ سال سے زیادہ نہیں رہا) پھیلایا تھا۔ اس کی تلخی نے کام و دہن کو تلخ کر دیا مگر رگ و پے میں نہیں پہنچنے پائی۔ عام مسلمانوں کے دل میں وطن کی محبت، آزادی کی لگن جو ۱۹۲۱ء میں تھی جو ۱۹۳۰ء میں تھی، اب بھی دبی ہوئی موجود ہے۔ صرف اُسے اُبھارنے کی ضرورت ہے۔ حقیقت میں ۱۹۴۲ء تک جیت [illegible] اور خان بہادروں کو چھوڑ کر مسلمانوں کی پوری جماعت دل و جان سے تحریکِ آزادی میں شریک تھی۔ ۱۹۴۲ء تک بڑھے ساتھ رہے [illegible] دور سے تماشا دیکھتے رہے، اس کے بعد بے شک کچھ لوگ ان سے بدظن ہو کر لیگ کے قریب ہو گئے۔ پاکستان بن چکے ہیں۔ [illegible] کی تکفیر کا مطالبہ کرنے والوں نے لئے آزادی کی راہ میں رکاوٹ ڈالی اور بہت سے لوگوں نے [illegible] ان کا ساتھ دیا۔

[illegible]

[illegible] اور حبِ وطن کے جذبے کو جو کچھ [illegible] ہے [illegible] جگانے کی کوشش کرنا ہے خود ان کو، کانگریس کو، اور حکومت کو۔

(منقول از "اطلاعات صوبۂ متحدہ")

اپاہج بچے اور اُن کا علاج

صالحہ عابد حسین

یوں تو بہت سی مصیبتیں اور مشکلیں ہمارے ملک کو گھیرے ہوئے ہیں، لیکن ان میں سب سے بڑی مصیبت بیماری کی ہے۔ قسم قسم کی بیماریاں ہیں جن کی بدولت لاکھوں اپنی زندگی سے بیزار رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک بچوں کا فالج بھی ہے۔ نہ جانے کتنے بچے اس مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اور ہمیشہ کے لئے اپاہج، معذور اور بے دست و پا ہو کر زندگی گذارتے ہیں۔ وہ خود اپنے لئے وبال جان اور اپنے بدبخت ماں باپ کے لئے روحانی تکلیف کا باعث ہوتے ہیں۔ ان کی مصیبت دور کرنے کی کوئی تدبیر نہیں کی گئی۔ ہمارے اس وسیع ملک میں جو ایک برِاعظم کہا جاسکتا ہے ایک بھی ایسا ادارہ نہیں ہے (یا کہنا چاہیئے نہیں تھا) جہاں اپاہج بچوں کا علاج کرایا جاسکے۔

ہمیں محترمہ فاطمہ اسمٰعیل صاحبہ کا شکر گذار ہونا چاہیئے کہ انھوں نے اس اہم اور نازک مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کو مبارکباد دینی چاہیئے کہ وہ اس میں ایک حد تک کامیاب بھی ہوئیں۔ انھیں اس کا خیال کیسے آیا، یہ ایک داستان ہے۔

سنہ ۱۹۴۶ء میں ان کی ڈھائی سال کی بچی اچانک بچوں کے فالج میں مبتلا ہوگئی۔ اگرچہ وہ بمبئی میں رہتی ہیں جس کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ ملک بھر میں یہی ایک ایسا شہر ہے جہاں ہر قسم کے علاج معالجے کی سہولتیں میسر ہیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ جب فاطمہ اسمٰعیل کی بچی اس مہلک مرض میں مبتلا ہوئی اور انھوں نے اس کے علاج کی کوشش شروع کی تو ہر ڈاکٹر کی طرف سے انھیں یہی جواب ملا کہ یہ مرض لاعلاج ہے۔ بچی کو اس کے حال پر چھوڑ دو، صبر کرو اور دیکھو کہ خدا کیا کرتا ہے۔ لیکن ماں کے تو دل کو لگی تھی اس سے یہ نہ ہوسکا کہ وہ اپنی پیاری بچی کو اس حالت میں چھوڑ کر قسمت پر شاکر ہو جائے۔ خوش قسمتی سے بیگم اسمٰعیل کو ... ایک ڈاکٹر ملا جس نے کچھ امید بندھائی اور کہا کہ ... کچھ نہ کچھ تدبیر کی جا سکتی ہے، ہاں شرط یہ ہے کہ انتہائی محنت اور استقلال کے ساتھ کام کرو۔ بچی کی محبت میں بے قرار ماں نے اس کا عزم کرلیا کہ خواہ اس راہ میں اُسے کتنی ہی مصیبتیں کیوں نہ جھیلنی پڑیں وہ ہمت نہ ہاریں گی۔ چنانچہ آٹھ ہفتے تک فاطمہ اسمٰعیل اپنی بچی کے ساتھ ... اسپتال میں رہیں اور اس دوران میں ڈاکٹر نے ان کو اپاہج اور معذور بچوں کا عضویاتی طریقے سے علاج کرنے کے ابتدائی اصول سمجھائے۔ اس کے بعد ایک سال تک ... کے "بحالی کے مرکز" میں ... جو لڑائی کے زخمیوں کے لئے قائم ہوا تھا ... صرف یہی ایک ایسا ادارہ تھا جہاں مالش وغیرہ کے ذریعے دوبارہ کام کرنے کے قابل بنانا سکھایا جاتا تھا۔ وہاں رہ کر مسز فاطمہ اسمٰعیل نے ایک کورس ٹریننگ کا لیا تاکہ وہ اپنی بچی کا علاج خود کرسکیں۔ اور اس طرح انھیں عضویاتی طریقۂ علاج کے بارے میں واقفیت حاصل ہوئی۔

انھوں نے تحقیق و جستجو کی تو انھیں معلوم ہوا کہ امریکہ اور یورپ میں اس طریقۂ علاج کا کافی کامیاب تجربہ ہوا ہے اور صرف "عضویاتی طریقۂ علاج" ہی مایوس اور اپاہج بچوں کی اُمید ثابت ہوسکتا ہے۔ انھیں بڑا افسوس ہوا کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں جہاں لاکھوں ایسے بچے موجود ہیں نہ صرف یہ کہ ایسا کوئی ادارہ نہیں، بلکہ لوگ اس طریقۂ علاج سے واقف بھی نہیں ہیں۔ انھیں یہ سوچ کر تکلیف ہوئی کہ میری طرح اور ہزاروں مائیں بے بسی سے ان بچوں کو اس مہلک مرض میں مبتلا دیکھتی ہوں گی اور اسے لاعلاج اور اپاہج کو بے بس سمجھتی ہوں گی؟ ان کی اپاہج بچی عضویاتی طریقۂ علاج کی بدولت اب تقریباً بالکل تندرست تھی اور سوا ایک ہلکے سے نقص کے کوئی مرض اور کوئی نشان باقی نہ رہا تھا۔ کیوں نہ دوسرے بچوں کو بھی اس طرح تندرست کرنے کی کوشش کی جائے۔ انھوں نے دیکھا تھا کہ ایسے سب اپاہج بچوں کو اور نوجوانوں کو ہفتے کے بعد یہ کہہ کر خارج کر دیا جاتا ہے کہ ان کا مرض لاعلاج ہے اور انھیں قسمت پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ عمر بھر بے بسی اور محتاجگی کی دردناک زندگی بسر کریں۔ بلکہ میں ایک بھی آدمی، ایک بھی ادارہ ایسا نہیں جو ان کی اُمیدگاہ اور رہنما ہو۔ اپاہج بچوں کی بے بسی نے انھیں بے چین کردیا۔ اور انھوں نے پوری لگن اور استقلال سے ایسے ادارے کی قیام کی کوشش شروع کردی، جہاں عضویاتی طریقے سے، مالشوں وغیرہ کے ذریعے، اپاہج بچوں کو پھر سے کام کے قابل بنایا جاسکے۔

مارچ سنہ ۱۹۴۷ء میں فاطمہ اسمٰعیل صاحبہ نے بمبئی کے چوٹی کے ڈاکٹروں کو جمع کرکے یہ تجویز ان کے سامنے پیش کی اور انھوں نے ہر قسم کی مدد اور مشورہ دینے اور خود کام کرنے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ ایک ادارے کے قیام کا فیصلہ کیا گیا جس کا نام "اپاہج اور معذور بچوں کے عضویاتی طریقۂ علاج کا مرکز" رکھا گیا۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں کام کرنے والے، سامان، اعزازی ... سب کچھ فراہم ہوچکا تھا۔ لیکن مکان نایاب تھا۔ ... ممکن کوشش کی مگر کامیابی ... ممکن تھا کہ ناامید ہو کر یہ خیال چھوڑ دیا جاتا ... ڈاکٹر ... نے اپنے اسپتال کے کمرے میں ایک ... بیماروں کی مالش کے لئے مخصوص کردی ... اپنے خاص نیک نیتی اور بلند مقصد پر بھروسہ کرکے ان لوگوں نے ۲ جولائی کو کام شروع کردیا۔ مہینہ بھر بعد ڈاکٹر ... جو چند مہینے کے لئے امریکہ جا رہے تھے، عارضی طور پر اپنا اسپتال اس کام کے لئے پیش ... اور دسمبر کے آخر تک ... کی طرف سے اطمینان ہوگیا مگر پھر ... آخر حکومت بمبئی نے ایک پرانی فوجی عمارت ایک سال کے لئے کرایہ پر دے دی۔ لیکن عمارت خستہ حالت میں تھی اور اس میں نہ نل تھا، نہ نالیاں ... خیال تھا کہ حکومت ان کے بلند مقصد اور اس ضرورت کو ... ان کو ہر طرح کی سہولتیں پہنچائے گی۔ چنانچہ عمارت کی مرمت اور درستگی کے لئے دس ہزار روپے کا تخمینہ حکومت کے سامنے پیش کیا گیا۔ دو مہینے تک درخواست دفتر ... میں رہی اور اس کے بعد یہ جواب ملا کہ حکومت ایک ایسے مکان کی مرمت میں جو صرف سال بھر کے لئے کرائے پر دیا گیا ہے، اتنی رقم خرچ نہیں کرسکتی۔ اب کیا کیا جائے؟ کیا اس تجربہ گاہ کو بند کردیا جائے جو ابھی سے بہت سے مریضوں کی امیدگاہ ہوگیا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ حکومت کا سہارا چھوڑ کر فیاض عوام پر بھروسہ کیا گیا اور ۲۴ دسمبر سنہ ۱۹۴۹ء کو ڈاکٹر جیوراج مہتہ کے ہاتھوں ادارے کی نئی عمارت کی بنیاد رکھی گئی۔ مارچ سنہ ۱۹۵۰ء میں اس ادارے میں ۳۹ بچے زیرِ علاج تھے اور ۴۰ بچے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔

۲۲ ستمبر سنہ ۱۹۴۹ء کو ایک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی گئی جس کا نام "اپاہج اور معذور بچوں کا علاج کی انجمن" رکھا گیا۔ اس کے مقصد یہ تھے۔

"ایک تو ایسا ادارہ قائم کیا جائے جس میں اپاہج بچے اور معذور بچوں کے مرض کی تشخیص اور ان کو دوبارہ باکار بنانے کا کام ہو ...... دوسرے سارے ملک میں بے کار بچوں اور جوانوں کے علاج اور ان کے لئے اسپتال قائم کرنے کا پرچار کیا جائے اور لوگوں کو اس کی اہمیت اور ضرورت کا احساس دلایا جائے۔"

"اپاہج اور معذور بچوں کے علاج کے اس ادارے کو سائنٹیفک طور پر چلانا شروع کیا گیا ہے اور فوجی ٹرینڈ نرسیں وغیرہ اس کے اسٹاف میں رکھی گئی ہیں اس لئے کہ ہندوستان میں صرف فوجی ٹرینڈ اسٹاف ہی اس کام سے تھوڑا بہت واقف ہے۔ اس کے علاوہ اکثر لوگوں نے اپنی اعزازی خدمات اس کے لئے پیش کی ہیں اور بہت سی عورتیں ہمدردی اور خدمتِ خلق کے جذبے کے ماتحت اس ادارے کی خدمت انجام دے رہی ہیں۔ لیکن اس کی روحِ رواں بیگم فاطمہ اسمٰعیل ہیں۔ جو تن من دھن سے اس کی ترقی میں کوشاں ہیں۔ اور دلی لگن اور سچے خلوص کے ساتھ اپاہج اور معذور بچوں (اور بالغوں) کی خدمت کررہی ہیں۔

اس طریقۂ علاج کو دراصل دواؤں سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ مختلف قسم کی مالشوں کے ذریعے بے حس دیے کار ہو جانے والے اعضا کو دوبارہ حرکت کرنا سکھایا جاتا ہے۔ فاطمہ اسمٰعیل صاحبہ خود اپنے ہاتھ سے مریضوں کی مالش کرتی اور دوسروں کو اس کے طریقے سکھاتی ہیں۔

ضرورت ہے کہ سارے ملک میں اس کی شاخیں قائم ہوں، اور ہر جنرل اسپتال میں ایک شعبہ اپاہج اور معذور بچوں کے علاج کا ہو۔

یہ ملک کی کتنی بڑی خدمت ہے ...... اور کتنی اہم؟ اس کا اندازہ ہماری حکومت اور ہمارے عوام دونوں کو کرنا چاہیئے، اور اس ادارے کی دل و جان سے مدد کرنی چاہیئے۔ جو ہمارے معذور اپاہج اور ناکارہ بچوں کو دوبارہ باکار انسان بناتا ہے۔

بزمِ بے تکلف

(بہ سلسلہ صفحہ ۳)

جو ہندوستان اور پاکستان کی میزان نہیں بیٹھتی تو اس کی تدبیر ہم سے پوچھو۔ پنڈت نہرو تو کرلیں شادی اور لیاقت علی خاں تجرد کی زندگی اختیار کریں، تیل مرچ، کھٹائی، بادی چیزوں کا پرہیز رکھیں پھر اگر ہماری سیاست اعتدال پر نہ آجائے، تو تمیم کا نام بدل دینا مگر مشکل یہ ہے کہ یہ سب کسے کون سے دے کہ ایک تمیم کم بخت اکیلا کس کس چیز کو سنبھالے، ایک دل ہزار فکریں، ایک سر ہزار سودا۔"

سیلون میں ہندوستانیوں کی حالت

پرنسپل عبدالشکور۔ رام پور

حال ہی میں سیلون کے نمائندوں کے ایوان میں ۱۸ ووٹوں کی اکثریت سے یہ بل منظور ہوا ہے جس کی رو سے صرف وہ ہندوستانی سیلون کے شہری ہونے کا حق حاصل کر سکیں گے جو ۱۹۴۲ء سے متواتر سات سال تک اس جزیرے میں مقیم ہوں گے حالانکہ ہندوستان کی حکومت کی جانب سے یہ مطالبہ پیش کیا گیا تھا کہ یہ سات سال کی مدت ۱۹۴۲ء سے شمار کی جائے۔ لیکن اس ہمسایہ جزیرے کے ایوان حکومت نے ہندوستان کا یہ مطالبہ مسترد کر دیا۔ اور اپنے پہلے فیصلے پر قائم رہا۔ اس سے اندیشہ ہے کہ ہندوستان اور سیلون کے درمیان تلخی پیدا ہو، اور آگے چل کر سیلون میں بھی ہندوستانیوں سے وہی ناروا سلوک شروع کر دیا جائے جو ہندوستان کے ساتھ جنوبی افریقہ میں مدت مدیدت ہو رہا ہے۔

جنگ کے دوران میں جب سیلون پر غنیم کے حملے کا قوی اندیشہ تھا، بہت سے ہندوستانی سیلون کی حکومت کے مشورے کے مطابق ہندوستان واپس آ گئے تھے۔ حقیقت میں ان کا ہندوستان کو اُن حالات میں واپس آنا ایک نوع کی امداد تھی جو انھوں نے سیلون کے ساتھ کی، لیکن اس ہمدردی کے جذبے کا سیلون کی حکومت اور اس جزیرے کے نمائندوں پر خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔ اور جنگ کے اختتام پر ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ جنوبی افریقہ کے ساتھ ساتھ سیلون کی سرزمین بھی ہندوستانیوں کے لئے تنگ سے تنگ تر ہوتی جا رہی ہے۔ گذشتہ سال یو۔ این۔ او کے عام اجلاس میں جنوبی افریقہ کے ظالمانہ رویے پر سخت لے دے کی۔ لیکن جنوبی افریقہ کے رویے میں رتی بھر بھی فرق نہ آیا، اور آج تک وہ اسی ظالمانہ پالیسی پر کاربند ہے جواب سیلون رفتہ رفتہ ہندوستانیوں کے خلاف اختیار کر رہا ہے۔

سیلون کو یہ حق ہے کہ وہ آیندہ ہندوستانیوں کی اپنے ملک میں درآمد بالکل بند کر دے، لیکن ان ہندوستانیوں کے خلاف ناروا اور ظالمانہ رویہ اختیار کرنا جو مدت سے وہاں مقیم ہیں اور جنھوں نے اس جزیرے کو اپنا وطن بنا لیا ہے۔ انصاف کا خون کرنا ہے۔ جس روز ہندوستانیوں کو سیلون یا جنوبی افریقہ میں شہری اور وطنی حقوق حاصل ہو جائیں گے اسی دن سے ہندوستان کی حکومت سے ان کا سیاسی تعلق ختم ہو جائے گا۔ اگر کوئی تعلق ان سے باقی رہے گا تو وہ صرف اخلاقی اور تمدنی ہوگا۔ یہ ضرور ہے کہ برما اور سیلون دونوں ملکوں میں ہندوستانی کچھ زیادہ ہر دل عزیز نہیں ہوئے۔ بہت سے ہندوستانیوں نے ان مقامات پر روپیہ بنایا، ثروت حاصل کی اور دولت کمانے میں کامیاب اور سرخ رو ہوئے۔ ان میں سے بہت سے دولت کما کر اپنے ملک کو واپس آ گئے۔ اور ان ملکوں کی آبادی پر ناخوش گوار اثر چھوڑ گئے مگر ان کے ساتھ ساتھ ہزاروں ایسے بھی ہندوستانی ہیں جنھوں نے سیلون کو اپنا مستقل وطن بنا یا اور اسی خاک سے ہمیشہ کے لئے وابستہ ہو گئے۔

جنگ کے دوران میں سیلون کی حکومت کے بلانے پر بھی ہندوستان کے مزدور سیلون جانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اس لئے جب یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ سیلون میں جس قدر ہندوستانی موجود ہیں وہ وہاں کے مستقل باشندے ہیں۔ اس لئے انصاف کی رو سے ان کو وہ حقوق ملنا چاہیے جو سیلون کے عام باشندوں کے لئے قانونِ مروجہ کی رو سے مل سکتے ہیں۔

ہمیں یہ دیکھ کر بڑی مسرت حاصل ہوئی کہ نمائندوں کی ایوان میں جب یہ بل پیش ہوا تو قدم قدم پر مختلف سیاسی جماعتوں کے نمائندوں نے اس کی بڑی شدت سے مخالفت کی اور محض نامزد شدہ ممبروں کی امداد سے حکومت اس بل کو منظور کرانے میں صرف اٹھارہ کی اکثریت سے کامیاب ہوئی۔ سیاسی جماعتوں کی مخالفت اس صالح سیاسی شعور کا پتہ دیتی ہے جو اب رفتہ رفتہ سیلون کی فضا پر چھاتا جا رہا ہے۔ وہ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ اس بل کا منظور ہونا ان تعلقات کو تلخ کر دے گا جو ہندوستان اور سیلون کے درمیان قائم ہیں اور دنیا کی رائے عامہ بھی اس بل کی مخالفت پر ہمیشہ کمربستہ رہے گی۔ اس بل کا ایک نمایاں اثر یہ ہوگا کہ اسی لاکھ ہندوستانی سیلون کے شہری حق سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دئے جائیں گے۔ ان کی آواز ایوان حکومت تک نہ پہنچ سکے گی، اور کسی ملک سے ان کی سیاسی وابستگی قائم نہ رہے گی خود وزیر اعظم نے اس کا اعتراف کیا کہ وہ ان ہندوستانیوں کو ہندوستان واپس کرنا چاہتے ہیں جن کی اب سیلون کو ضرورت نہیں ہے۔ سیلون کے مفکرین کو یہ خطرہ ہے کہ وہاں کا اصلی باشندہ تجارت میں ہندوستانیوں کے مقابلے میں سرسبز اور کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے وہ بات کو ذرا پیچ دے کر فرماتے ہیں کہ ہندوستانیوں کے قیام سے ان کو یہ خطرہ دامن گیر ہے کہ ان کی موجودگی وہاں کے معاشرتی معیار کو پست کر دے گی لیکن یہ مفکرین آسانی سے فراموش کر دیتے ہیں کہ جن ہندوستانیوں کو واپس کرنے کی تجویز ہو رہی ہے وہ سیلون میں ہی پیدا ہوئے اور اسی سرزمین میں پلے بڑھے اور پروان چڑھے۔ ان کو شہری حقوق سے محروم کرنا ایک ایسا ظلم ہے جس کی مثال صرف سرزمین جنوبی افریقہ میں تو مل سکتی ہے مگر اور کہیں مشکل سے ملے گی۔ سیلون کی حکومت کی جانب سے یہ صفائی پیش کی جاتی ہے کہ یہ بل کسی قومی یا نسلی تعصب کی بنا پر پیش نہیں کیا گیا ہے بلکہ محض اقتصادی بنا پر معرض وجود میں آیا ہے۔ اس کی مثالیں فلسطین اور جنوبی افریقہ کے حالات میں پائی جاتی ہیں۔ یہودیوں سے عربوں کی مخالفت محض نسلی نہیں ہے بلکہ اقتصادی ہے دولت مند اور کفایت شعار یہودی کے مقابلے میں عربوں کا اقتصادی میدان میں گوئے سبقت لے جانا ناممکن ہے۔ اسی طریقے پر جنوبی افریقہ میں ڈچ اور یہودی دونوں وہاں کی ہندوستانی آبادی کی کفایت شعاری اور سادہ زندگی کا مقابلہ کرنے میں قاصر ہیں، اور اس بنا پر وہاں آئے دن ہندوستانیوں کے خلاف نت نئی پابندیاں اس لئے عاید کی جاتی ہیں کہ اس سرزمین سے ہندوستانی نیست و نابود ہو جائے۔

اس موقع پر یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ سیلون کا یہ مجوزہ بل حقیقت میں ایک سیاسی چال ہے جس اس پہلو پر عموماً کم توجہ کی گئی۔ وہاں کا ہندوستانی سیاسی اعتبار سے بیدار، روشن خیال اور باخبر ہے۔ اس کے مقابلے میں وہاں کے مقامی مزدور عموماً جاہل اور بے خبر ہیں۔ اور اپنی جہالت اور بے خبری کی بنا پر مزدوروں کی کثیر آبادی موجودہ حکومت سے تعاون کرنے پر آسانی سے تیار ہو جائے گی اور انتخابات کے موقع پر اس کی امداد کرے گی۔ اگرچہ حکومت کے نمائندوں میں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی بڑی اکثریت ہے، حکومت کو خوف ہے کہ اگر ہندوستانی فرقے کی تعداد میں معتدبہ تخفیف نہ ہوئی تو ان کی موجودگی انتخابات کے موقع پر موجودہ حکومت کے مفاد کے لئے مضر ثابت ہوگی۔ اس لئے انھیں ووٹ سے محروم کر دینا چاہئے، اور جہاں تک ہو سکے اُن کی تعداد کو اس حد تک کم کر دینا چاہیے کہ آیندہ اُن سے کسی قسم کا خطرہ باقی نہ رہے۔ اس قسم کا ناروا اور ظالمانہ سلوک ہندوستانیوں کے ساتھ جنوبی افریقہ سے شروع ہوا، اس کا تتبع اب سیلون کر رہا ہے اور کیا عجب ہے کہ اس کے خطرناک جراثیم آہستہ آہستہ ملایا، سنگاپور، فیجی، مارشس، مشرقی افریقہ اور مغربی افریقہ تک پہنچ جائیں، جہاں ہندوستانی کثیر تعداد میں عرصہ دراز سے آباد ہیں۔ عنقریب پیرس میں یو۔ این۔ او کے جنرل اسمبلی کا اجلاس منعقد ہونے والا ہے اور کوشش کی جا رہی ہے کہ ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اس اجلاس کے موقع پر ہندوستانی وفد کے سردار کی حیثیت سے شامل ہوں۔

اس اجلاس میں جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کا مسئلہ پیش ہونے والا ہے، اس موقع پر یقیناً ان مظالم کا ذکر ہوگا۔ جو ان کے ساتھ وہاں کی حکومت ان کے ہمیشہ تراشتی رہتی ہے۔ مگر سیلون کے مجوزہ بل کی وجہ سے ہندوستانیوں کا معاملہ کمزور پڑ جائے گا۔ جنوبی افریقہ کے نمائندے بڑے شد و مد کے ساتھ اس بل کا ذکر کریں گے، اور ان کے لئے یہ دلیل ہو جائے گی کہ جب سیلون جو ہندوستان سے اس قدر قریب اور تمدنی اعتبار سے ہم آہنگ ہے دیہ بل عالم وجود میں لا سکتا ہے تو جنوبی افریقہ یہ پالیسی کیوں نہ اختیار کرے، اور ان ہندوستانیوں کو ہندوستان واپس نہ کر دے جن کی موجودگی اس ملک میں بے چینی اور انتشار پیدا کرنے کا موجب ہے۔

اس سلسلے میں مندرجہ ذیل بیانات جو اخباروں میں شائع ہوئے ہیں دلچسپی کا موجب ہوں گے۔

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی دہلی
۱۶ ستمبر ۴۸ء

بحران کا وقت

واقعات کی رفتار نے پچھلے ہفتہ ہی اس امید کو بہت دور کر دیا کہ کشمیر کا مسئلہ اور حیدرآباد کا مسئلہ صلح و آشتی سے طے ہو جائے گا۔ مصالحت کی کوشش اب بھی جاری ہے۔ خدائی قدرت اور انسان کی عقل سے مایوس اب بھی نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن اپنے دل و دماغ کو اس کے لئے تیار رکھنا چاہیے کہ چھوٹے یا بڑے پیمانے پر نئی جنگی کارروائیوں کی خبریں سننے میں آئیں اور یہ سوچنا چاہیے کہ ایسی حالت میں ہمارا کیا فرض ہے؟

سب سے پہلے ہمیں اپنے ذہن میں یہ بات صاف کر لینی چاہیے کہ ان دونوں معاملوں میں ہماری حکومت کا رویہ مجموعی طور پر صحیح اور حق بجانب ہے۔ یوں تو ہر بات کے دو پہلو ہوتے ہیں اور ہر پہلو کی تائید میں بھی خاصی دل کو لگتی دلیلیں دی جا سکتی ہیں۔ خطابت اور وکالت کا مقصد قدیم زمانے سے کر آج تک یہی رہا ہے کہ کمزور دلیل کو قوی بنا کر دکھایا جائے۔ اور یہ دونوں فن برابر ترقی کرتے رہے ہیں لیکن خوش قسمتی سے سوفسطائی تلبیس کے ساتھ ساتھ سقراطی تنقید نے بھی ترقی کی ہے دلیلوں کی ملمع سازی کی مشق کے ساتھ ساتھ چھلوں کے کھوٹے کھرے کو پرکھنے کی مشق بھی بڑھ گئی ہے

جہاں تک کشمیر کے معاملے کا تعلق ہے چودھری ظفر اللہ خاں صاحب نے جنھیں قانونی بحث اور مذہبی مناظرے میں حیرت انگیز مہارت ہے۔ یو۔ این۔ او میں پاکستان کی وکالت کا پورا حق ادا کر دیا تھا۔ اور اب یو۔ این۔ او کے کشمیر کمیشن کے سامنے بھی اپنے مقدمے کو بڑی قابلیت سے پیش کر رہے ہیں۔ لیکن قانونی باریکیوں کے اس طلسم میں جو چودھری صاحب نے باندھا ہے کشمیر کمیشن ہی کو نہیں بلکہ ہر شخص کو جس کی آنکھیں کھلی ہیں یہ معمولی سی بات صاف نظر آگئی ہے کہ معاملے کی جو تصویر انھوں نے یو۔ این۔ او کے سامنے پیش کی وہ بالکل غلط تھی۔ پاکستان ابتدا سے قبائلی حملہ آوروں کی پوری مدد کر رہا ہے، اس کی فوجیں ایک عرصے سے ان کے دوش بدوش لڑ رہی ہیں۔ اس حقیقت کے کھل جانے کے بعد جسے چودھری صاحب نے جب تک چھپ سکتے تھے چھپایا۔ کشمیر کمیشن کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ صورت حال بدل گئی ہے اور رائے شماری کی شرائط طے ہونے سے پہلے پاکستان کی فوجوں کا کشمیر سے نکلنا ضروری ہے۔ چودھری صاحب کا اصرار ہے کہ پہلے ہندوستان اس رزولیوشن کو مان لے جو یو۔ این۔ او نے رائے شماری کے بارے میں پاس کیا تھا وہ یہ نہیں سمجھتے یا سمجھنا نہیں چاہتے کہ ان کے ڈالے ہوئے پردے کے اٹھ جانے کے بعد یو۔ این۔ او کے رزولیوشن کی بنیاد ہی منہدم ہو گئی ہے، اور اب اس کو سارے معاملے پر نئے سرے سے غور کرنا ہوگا۔ بہرحال ان باتوں میں کتنے ہی پیچ کیوں نہ ہوں اس میں کوئی پیچ نہیں کہ کمیشن کی صلح کی تجویز کو ہندوستان نے بغیر کسی قید کے مان لیا ہے، اور پاکستان اس کے ماننے کے لئے ایسی شرطیں لگا رہا ہے جن پر ہندوستان تو کیا کمیشن تک غور کرنے کو تیار نہیں ہے۔ اس لئے اگر صلح کی کوشش خدانخواستہ قطعاً ناکام رہی تو اس کی ذمہ داری سرکار پاکستان پر ہوگی۔

اب رہا حیدرآباد سو اس کو تو کوئی چودھری صاحب سا مناظر اور وکیل بھی نہ ملا جو تھوڑے دن تک "کمزور دلیل کو قوی بنا کر دکھا سکتا"۔ بس اشتراکیت اور جمہوریت کے زمانے میں دنیا میں کون ہوگا جو قاسم رضوی صاحب کے ہم نوا ہو کر [illegible] کی تائید کرے۔ ہم ہرگز [illegible] ذمہ دار حکومت قائم نہیں [illegible] مسٹر چرچل تک جن کی آنکھوں میں آزاد ہندوستان کو دیکھ کر خون اتر آتا ہے یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ حیدرآباد کے معاملے کو جمہوری راستے طے ہونا چاہیے۔

یہ یاد رکھئے کہ حیدرآباد کا اصل مسئلہ ذمہ دار حکومت اور رضاکاروں کا ہے۔ دوسرے قصے محض اس لئے چھیڑے گئے ہیں کہ ان بنیادی سوالوں کی طرف سے توجہ ہٹ جائے۔ اگر آج اعلان کر دیا جائے کہ حیدرآباد میں جمہوری ذمہ دار حکومت قائم کی جا رہی ہے اور رضاکاروں کی تنظیم توڑی جا رہی ہے تو حکومت ہند مطمئن ہو جائے گی اور دوسرے مسائل کے فوراً طے ہونے پر اصرار نہیں کیا جائے گا۔ لیکن ایک نجی سیاسی فوج اور ایک غیر ذمہ دار حکومت کا وجود اور اس کی غیر ذمہ داریاں جو کبھی نہ صرف حیدرآباد کے لوگوں کے لئے بلکہ سارے ہندوستان کے لئے سوہان روح ہیں۔ حکومت ہند نے انتہائی صبر سے کام لیا ہے۔ اس سے زیادہ صبر کا مطالبہ اس سے نہیں کیا جا سکتا۔

یہ دیکھنے کے بعد کہ ہماری حکومت کا طرز عمل دونوں معاملوں میں ایسا ہے جس پر کسی انصاف پسند کو اعتراض نہیں ہو سکتا، ہمارا کھلا ہوا فرض ہے کہ ہم اس کے ساتھ پورا تعاون کریں۔ اس وقت حکومت ہم سے صرف یہ چاہتی ہے کہ ملک میں امن اور سکون کی فضا قائم رکھیں خصوصاً فرقہ وارانہ جھگڑے نہ اٹھنے دیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ملک کی پوری آبادی دل و جان سے حکومت کی اس خواہش کو پورا کرنے کو تیار ہے لیکن اگر کہیں اکا دکا ایسے شریر اور فتنہ انگیز لوگ موجود ہیں جو اس نازک وقت میں گڑبڑ پیدا کر کے حکومت کو پریشان کرنا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ رائے عامہ کے دباؤ سے ان کو روکیں۔ ورنہ پھر ظاہر ہے کہ حکومت ان کو بے دردی کے ساتھ کچلنے پر مجبور ہوگی۔ بیرونی خطرے کی حالت میں دنیا کی کوئی حکومت اندرونی فساد کو برداشت نہیں کر سکتی۔

ہمیں زیادہ خطرہ اس کا نہیں کہ لوگ جان بوجھ کر فساد برپا کریں گے، بلکہ یہ اندیشہ ہے کہ کہیں گھبراہٹ بدحواسی یا جوش کی حالت میں ان سے اضطراری طور پر ایسی حرکتیں سرزد نہ ہوں جن سے فضا بگڑ جائے۔ ملک کو اس وقت ہمارے جوش و خروش سے کہیں زیادہ ہمارے صبر و سکون کی ضرورت ہے۔ جو شخص خاموشی اور اطمینان سے اپنا کام کرتا رہے، افواہوں سے پریشان نہ ہو، وہم اور وسوسے سے متاثر نہ ہو وہ ملک کا حقیقی بہی خواہ اور قوم کا سچا خادم ہے۔

بزمِ ماتم

قائد اعظم محمد علی جناح ۱۱ ستمبر کو رات کے ساڑھے دس بجے دنیا سے اٹھ گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ خدا ان کی مغفرت کرے اور سب عزاداروں کو صبر جمیل عطا کرے۔ آج سارے پاکستان میں ان کا ماتم ہو رہا ہے اور دنیا کا ہر ملک بقدر تعلق اس میں شریک ہے۔

مرحوم نے ہندوستان کی اور دنیا کی سیاست پر جو انقلاب انگیز اثر ڈالا اس کے مفید یا مضر ہونے کے بارے میں شدید اختلاف ہے مگر اس بات پر موافقین اور مخالفین سب متفق ہیں کہ مرحوم کی شخصیت تاریخ کی عظیم ترین شخصیتوں میں شمار ہوگی۔ مرحوم کے ذاتی اوصاف نے ابتدا سے لوگوں کے دلوں پر ان کا سکہ بٹھا دیا تھا اور وہ روز بروز گہرا ہی ہوتا گیا۔ ان کی ذہانت اور فراست، سرعت فہم اور دقت نظر، متانت اور خودداری، ارادے کی قوت اور اخلاقی جرأت، خلوص اور دیانت، صاف گوئی اور سخت گیری نے مل کر ان کے اندر وہ ہیبت و وقار پیدا کر دیا تھا جو اس زمانے کے چوٹی کے ارباب اقتدار میں شاید ہی کسی میں پایا جائے۔ جس زمانے میں انگریزی حکومت کا رعب ہندوستان میں اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ بڑے سے بڑے ہندوستانی کے لئے ایک معمولی انگریز سے آنکھ ملانا مشکل تھا اس زمانے میں مرحوم نے انگریز ججوں، گورنروں اور وائسرایوں سے ٹکر لی، اور ان کے دانت کھٹے کر دئے۔ آخر میں اپنی سیاسی مصلحتوں سے ان کو برطانوی حکومت کا حلیف بننا پڑا لیکن اس میں بھی ان کی یہ شان رہی کہ ہر انگریز محسوس کرتا تھا کہ اس دبلے پتلے نحیف و ناتواں آدمی سے صرف کاروباری اصول پر برابر کا معاملہ ہو سکتا ہے اس کو خریدا نہیں جا سکتا، دبایا یا دھمکایا نہیں جا سکتا۔

ہمارے ہمسایہ ملک پاکستان کے لئے جو کل تک ہمارے جسم کا ٹکڑا تھا یہ حادثہ بہت سخت اور یہ وقت بہت نازک ہے۔ ہمیں اپنے پاکستانی بھائیوں سے اس مصیبت میں قلبی ہمدردی ہے ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ان کو اس کے برداشت کرنے کی ہمت دے، اور ان کو اس نازک وقت میں کوئی ایسا رہبر مل جائے جس میں قائد اعظم مرحوم کی صفات کا پرتو بھی موجود ہو اور اس کے ساتھ ساتھ صلح جوئی، سلامت روی، دل کشی اور دل نوازی بھی ہو تاکہ وہ پاکستان کے اندر سب فریقوں اور جماعتوں کو ساتھ لے سکے۔ اور ہندوستان اور باہر کے ملکوں سے خوش گوار اور دوستانہ تعلقات قائم رکھ سکے۔

پچھلا ہفتہ: ۱۔ ہندوستان

صلح کی صرف یہی صورت ہے

کشمیر کمیشن نے اپنی صلح کی جو تجویز شائع کی ہے اس میں کشمیر اور جموں کے مسئلے کا آخری حل بہتر رائے عامہ سے تمام ... کی ... رہنے اور متحدہ اقوام کی نگرانی میں اس کام کو ... کی ہے۔ لیکن چونکہ متحدہ اقوام کی انجمن کے پاس اپنی کوئی فوج اور پولیس نہیں ہے اور نہ وہ اپنا ذاتی عملہ ریاست کے انتظام کو جاری رکھنے کے لئے مقرر کر سکتی ہے۔ اس لئے وہ مقامی حکام کی مدد لینے پر مجبور رہے۔ یہ مدد کس سے لی جاتی؟ ہندوستان یا پاکستان سے یا دونوں سے؟ اگر دونوں سے تو ان میں کس تناسب سے؟ اس معاملے میں کمیشن نے ہندوستان اور شیخ عبداللہ کی حکومت پر بھروسہ کیا ہے، پاکستان پر نہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ انصاف کے خلاف ہے، اور یہ بات ظفر اللہ خاں صاحب نے کہی بھی ہے۔ لیکن ذرا سا غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت قابل عمل نہیں تھی۔ متحدہ اقوام کو یقین دلایا گیا تھا کہ پاکستان کی فوجیں کشمیر کی جنگ میں شریک نہیں ہیں۔ ریاست کے مسلمان عوام نے ریاست کی مستبد حکومت کے خلاف بغاوت کر کے ایک آزاد حکومت قائم کر لی ہے۔ وہ لڑ رہے ہیں اور ان کی مدد ان کے ہم مذہب قبائلی کر رہے ہیں۔ لیکن کشمیر کمیشن جیسے ہی پاکستان پہنچا تو اس کو بتایا گیا کہ اب پاکستان کی فوجیں بھی اپنے خلاف ہندوستان کے حملے کا دروازہ بند کرنے کے لئے کشمیر میں لڑ رہی ہیں۔ کشمیر کمیشن کو جب تحقیقات کرنے اور تجاویز مرتب کرنے کا کام سپرد کیا گیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ پاکستان کی فوجیں کشمیر میں موجود نہیں ہیں۔ اب اسے معلوم ہوا کہ پاکستان کی فوجیں محض حفاظت کے لئے لڑ رہی ہیں۔ کمیشن نے پاکستان کی اس بات کو مان لیا اور جب اس نے جنگ بند کرنے کی تجویزیں بنائیں تو ان میں سب سے مقدم اس بات کو رکھا کہ پاکستان اپنی فوجیں واپس بلائے کیونکہ جب جنگ بند ہو جائے گی تو حملے کا خطرہ بھی ختم ہو جائے گا اور کشمیر میں پاکستان کی فوجوں کے رہنے کی کوئی وجہ جواز باقی نہیں رہے گی۔ اسی طرح قبائلیوں کو بھی کشمیر سے واپس بلانے میں پاکستان کو پوری مدد کرنا ہوگی۔ یہ لوگ پاکستان کے بیان کے مطابق اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد ایسے زمانے میں کرنے کے لئے گئے تھے جب کہ ان پر ظلم توڑے جا رہے تھے اور ان کی فریاد سننے والا کوئی نہیں تھا۔ مجوزہ صلح کے بعد جب کہ متحدہ اقوام کے نگراں ہر بات کی دیکھ بھال کرنے کے لئے کشمیر میں موجود ہوں گے ان کا وہاں رہنا نہ صرف غیر ضروری بلکہ کمیشن کے کام میں رکاوٹ کا موجب ہو سکتا ہے۔

رہا کشمیر کی آزاد حکومت کا معاملہ، چونکہ اس کے وجود کو ابھی تک دوسری حکومتوں کا تو کیا ذکر خود پاکستان کی حکومت نے تسلیم نہیں کیا ہے اور اس کا کوئی باقاعدہ نظم و نسق نہیں ہے اس لئے اس کے قبضے میں جو علاقہ ہے اس کا انتظام کمیشن جب تک ... مقامی حکام ہی کی نگرانی میں رہے گا۔

اب رہا کشمیر اور جموں کے بقیہ حصے کا انتظام اور ہندوستان کی فوجیں واپس بلانے کا سوال۔ اس بقیہ علاقے کا نظام چونکہ شیخ عبداللہ کی مسلمہ اور مستحکم حکومت باقاعدگی کے ساتھ چلا رہی ہے اس لئے اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ رائے شماری کا مخصوص کام کمیشن اپنی مکمل نگرانی میں انجام دے گا۔ شیخ عبداللہ کو اندرونی امن و نظام قائم رکھنے اور غیر منظم قبائلیوں سے کشمیر کی سرحد کی حفاظت کرنے کے لئے کچھ باقاعدہ فوج کی ضرورت ہوگی۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ہندوستانی فوج سے کام لیا جائے گا اور اس کی ایک مناسب تعداد جس کا فیصلہ کمیشن کے مشورے سے کیا جائے گا کشمیر میں اس طرح رکھا جائے گا کہ وہ عام رائے شماری کے کام میں کوئی مداخلت نہ کر سکے۔ باقی ہندوستانی فوج کشمیر سے واپس بلا لی جائے گی۔

انتظام کی صرف یہی ایک صورت قابل عمل تھی اس لئے اسی کو کمیشن نے تجویز کیا کیونکہ اگر ہندوستان اور پاکستان دونوں کی فوجوں کو کشمیر میں رکھا جاتا تو ذرا سی بات پر دونوں میں جنگ چھڑ جانے کا اندیشہ تھا۔

اب رہا یہ سوال کہ شیخ عبداللہ کی حکومت اور ہندوستانی فوج کی موجودگی سے رائے شماری کا کام غیر جانب داری سے نہ ہو سکے گا۔ لوگ ان سے مرعوب ہو کر اپنی آزادانہ رائے نہیں دے سکیں گے تو اس میں کوئی شک نہیں جو لوگ مذبذب ہیں ان پر اس کا ضرور اثر پڑے گا لیکن جو لوگ اپنی ایک مستقل رائے رکھتے ہیں ان کی رائے کو موثر بنانے کے لئے متحدہ اقوام کی طرف سے بہت سے نگراں موجود رہیں گے۔ ان کو پاکستان کی موافقت میں اپنے خیال کی اشاعت کرنے کی پوری آزادی ہوگی۔ اس آزادی میں کوئی رکاوٹ ڈالی جائے گی تو وہ ساری دنیا کو جس کے اخباری نمائندے کشمیر میں موجود ہوں گے متوجہ کر سکیں گے۔ اگر جیسا کہ پاکستان کا دعوےٰ ہے کشمیر اور جموں کی غالب اکثریت، دل و جان سے پاکستان میں شرکت کی تائید میں ہے تو شیخ عبداللہ کی حکومت اور ہندوستانی فوج کی موجودگی کی وجہ سے اس میں سے تھوڑے سے ووٹ شاید ٹوٹ جائیں باقی سب کے ٹوٹنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ آزادی عطیہ کے طور پر نہیں ملتی اس کو قربانی کے ذریعے حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اگر اپنے ضمیر و ایمان کے مطابق رائے دینے کی وجہ سے ان لوگوں کو کچھ قربانی بھی کرنا پڑے تو اس کے لئے انھیں تیار رہنا چاہئے۔ شیخ عبداللہ اور ان کی جماعت نے کشمیری رہنمائی کا حق اسی قربانی کے ذریعے حاصل کیا۔ انھوں نے ڈوگرا فوج اور مہاراجہ کشمیر کی حکومت کی مخالفت سے باز ... اگر سردار محمد ابراہیم اور چودھری غلام عباس میں ہمت ہے تو وہ بھی اب لوگوں سے اپنا رہنمائی کا حق تسلیم کرائیں۔ ورنہ شیخ عبداللہ کے راستے سے ہٹ جائیں۔ کشمیر بہت تباہ ہو چکا ہے۔ کشمیر کے کسی محب وطن کو اب ایک لمحے کے لئے بھی تباہی کو جاری رکھنے میں مدد نہیں دینا چاہئے۔ ملک میں امن و سکون پیدا کرنے کے لئے اگر انھیں اپنے ذاتی حوصلوں اور جماعتی عصبیت کو قربان کرنا پڑے تو اس کے قربان کرنے میں ان کو ذرا تامل نہ ہونا چاہئے۔

حیدرآباد کی گتھی کیسے سلجھے

ہندوستان کی پرامن ترقی کو برطانوی شہنشاہیت نے چلتے چلتے جو آخری ڈنک مارا ہے وہ اس کا یہ اعلان تھا کہ جیسے ہی برطانوی حکومت ہندوستان سے رخصت ہوگی ویسے ہی وہ اقتدار اعلیٰ بھی ختم ہو جائے گا جو دیسی حکمرانوں پر حاصل ہے۔ یہ ریاستیں انڈین یونین یا پاکستان جس کے ساتھ چاہیں اپنی مرضی کے مطابق شامل ہو سکیں گی اور اس سلسلے میں ضروری معاہدے کر سکیں گی۔ اس اعلان نے ریاستوں میں بڑی غلط فہمی پیدا کر دی۔ جو چھوٹی اور کمزور ریاستیں تھیں انھوں نے تو جلد ہی اس بات کو محسوس کر لیا کہ یہ نرا فریب ہی فریب ہے پہلے کی طرح اب بھی انھیں اپنے متعلقہ ڈومینین کے ماتحت رہنا ہے اور جیسا وہ کہے اس کی مرضی کے مطابق چلنا ہے۔ کچھ اور ریاستوں نے تھوڑی آنا کانی کی لیکن ان کو بھی جلد ہی عقل آ گئی۔ لیکن حیدرآباد کو اس کے بر خود غلط مصلاح کاروں نے کچھ ایسا گمراہ کیا کہ یہ انڈین یونین سے جس کے ساتھ اس کو آخر میں بہر حال رہنا ہے برابر دور ہٹتا چلا گیا۔ اس نے ایک سال کے لئے ہندوستان سے اس بات کا ضرور معاہدہ کیا کہ معاملات جوں کے توں رکھے جائیں لیکن اس عرصے میں رضاکاروں کی جماعت برابر اپنی تنظیم بڑھاتی رہی اور ہندوستان کے ساتھ شریک ہونے کی جو تحریک ریاست میں شروع کی گئی تھی اس کو زور زبردستی سے دباتی رہی جس کی وجہ سے ہندوستان اور حیدرآباد میں برابر بدمزگی بڑھتی گئی اور معاملات کو سلجھانے کے لئے جو گفتگوئیں ہندوستان سے کی گئیں اور تجویزیں مرتب کی گئیں وہ بار آور نہیں ہو سکیں۔ ہندوستان کی طرف سے دباؤ بڑھتا گیا حیدرآباد کی طرف سے جوابی کارروائیاں کی گئیں دونوں طرف سے جواب اور جواب الجواب ہوئے اور اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ حکومت ہند کو اس کے سوا اور کوئی صورت حیدرآباد میں دوبارہ امن و امان اور انتظام قائم کرنے کی نظر نہیں آتی کہ وہ پہلے کی طرح سکندرآباد میں اپنی فوجیں رکھے۔ چنانچہ ہندوستان کی حکومت نے حیدرآباد کی حکومت کو لکھا ہے کہ وہ رضاکاروں کی جماعت کو توڑ دے اور ہندوستانی فوج کو سکندرآباد میں آنے کا پرامن طریقے پر موقع دے ورنہ حکومت ہند، حکومت حیدرآباد کی مرضی کے بغیر اپنی فوج کو سکندرآباد بھیج دے گی۔

حکومت ہند کی طرف سے جو سفید کاغذ شائع کیا گیا، اور پارلیمنٹ میں جواہر لال جی نے جو بیانات دئے اور اخبارات کے نمائندوں سے اس کی جو گفتگو کی ہے ان سب کے مطالعے سے حیدرآباد کے معاملے میں حکومت کے نقطۂ نظر کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ان کے مطابق حیدرآباد کبھی بھی دلی کی حکومت سے آزاد نہیں رہا۔ اس نے ہمیشہ دلی کی حکومت کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کیا ہے جو صورت اب تک رہی ہے وہ آئندہ بھی رکھی جائے گی۔ لیکن اپنے اندرونی معاملات میں حیدرآباد آزاد رہ سکتا ہے۔ البتہ اس کو اپنی رعایا سے بات چیت کر کے اسے ذمہ دار حکومت دینی ہوگی۔ انڈین یونین میں کسی مطلق العنان حکمراں کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہ تو لمبی مدت کی پالیسی ہے۔ فوری طور پر رضاکاروں نے جو ہنگامہ مچا رکھا ہے اس کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے حکومت ہند کے خیال میں اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں رہا ہے کہ سکندرآباد میں انڈین یونین کی فوجیں رکھی جائیں اور نظام کے ہاتھ مضبوط کئے جائیں تاکہ وہ رضاکاروں کی جماعت کو توڑ سکیں اور لوگوں میں دوبارہ بھروسے کی کیفیت پیدا کر سکیں۔

یہ تجاویز ایسی ہیں جن کی معقولیت سے بہت کم لوگ انکار کر سکیں گے۔ متحدہ اقوام میں اگر حیدرآباد کا معاملہ پیش ہوا تو وہاں بھی اس کے سوا دوسرا کوئی حل تجویز نہیں کیا جائے گا۔ حیدرآباد کو آزاد مملکت کی حیثیت سے وہاں بھی کوئی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگا اور جب یہ حیثیت نہیں مانی جائے گی تو پھر انڈین یونین کی موجودہ تجویزیں ہی سب سے زیادہ پسندیدہ نظر آئیں گی۔

تازہ اطلاع کے مطابق نظام نے حکومت حیدرآباد کے مشورے (یا دباؤ؟) سے ہندوستانی فوج کے داخلے کے لئے اپنی رضامندی دینے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جب ہندوستانی فوجیں ... میں داخل ہوتی ہیں تو حکومت حیدرآباد صرف قانونی احتجاج کرتی ہے، یا مسلح مزاحمت کر کے خودکشی کی مرتکب ہوتی ہے۔ (م ع)

مصنف

اختر انصاری

مجھے خدا نے بنایا ادیب اور فن کار
الم پرست ستم دوست خوں فشاں شاعر
اگر کتابوں کی دنیا ہی تھی مری تقدیر
تو کیوں نہ مجھ کو بنایا کتابوں کا ناشر
جو یہ نہیں تو بناتا کرم سے اپنے مجھے
رسائل و کتب و کاغذات کا تاجر
اگر میں اس کے بھی قابل نہ تھا تو پھر مجھ کو
بنایا ہوتا کتابت کے فن کا ہی ماہر
یہ کیا کیا کہ مصنف بنا دیا مجھ کو
بنا دیا کہ نہ جانے مٹا دیا مجھ کو

غزل

اختر انصاری

مطرب دل کی وہ تانیں کیا ہوئیں؟
وہ تخیل کی اڑانیں کیا ہوئیں؟
کیا ہوئے وہ ترچھی نظروں کے خدنگ؟
ابروؤں کی وہ کمانیں کیا ہوئیں؟
وہ ادائیں جن پہ ہوتی تھیں نثار
چاہنے والوں کی جانیں کیا ہوئیں؟
کیا ہوئے ٹوٹے دلوں کے زمزمے
بے زبانوں کی زبانیں کیا ہوئیں؟
کیا ہوئے اختر امیدوں کے حصار؟
اور عزائم کی چٹانیں کیا ہوئیں؟

ٹیگور کے گیت

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

میرے دوست!

تمہارا آنگن کتنے سندر [illegible] رنگ برنگ کے ان گنت [illegible] سے بھرا ہوا ہے لیکن تمہاری بگیا سنسان باغ کی طرح اس سمے بھی [illegible] ہے [illegible] ڈوبتے ہوئے سورج کے خون میں نہار ابھی ابھی لگی ہے۔

وہ مرتے ہوئے انسان کی آخری سانس کی طرح کپکپاتی ہے۔ وہ اس [illegible] روح کی طرح بڑی جلدی جگ مگ کرتی ہے جس نے اپنی ساری آلائشوں کو جلا کر بھسم کر دیا ہو۔

اس میں شک نہیں کہ تمہارا آنگن نہایت خوبصورت ہے۔ وہ تاروں کے موتیوں سے جڑا ہوا ہے۔ لیکن تمہاری تلوار اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس کا خیال آتے ہی دل دھک دھک کرنے لگتا ہے۔

اے میرے دوست!

ایسی بھیانک رات میں میں تم سے ملنے کی خاطر نکل پڑا ہوں۔ آسمان کسی مایوس کی طرح چیخ رہا ہے۔ درختوں کے پتے ہاتھ مل رہے ہیں۔ میری آنکھوں میں اس وقت نیند کہاں۔ بار بار دروازہ کھولتا ہوں۔ باہر گھپ اندھیرا چھایا ہے۔ اسی اندھیرے میں میں تمہاری راہ دیکھ رہا ہوں۔

بن میں یہ کس کی سرسراہٹ ہے؟
ندی کے اس پار کون کھڑا ہے؟
تاریکی کو اور زیادہ تاریک کون بنا رہا ہے؟
بتاؤ دوست!

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

سالکؔ ہندی

سر اونچا رکھو

آج کل ہندوستان کے مسلمانوں اور غالباً پاکستان کے ہندوؤں میں بھی ایک ایسی ذہنیت پیدا ہو رہی ہے جس کے خلاف خطرے کی گھنٹی بجانا ضروری ہے۔ دونوں نے اپنے صدیوں کے ساتھیوں اور ہم وطنوں کے ہاتھوں جو دکھ اٹھائے ہیں اور اقلیت ہونے کا احساس جو دونوں ملکوں میں بہت بڑھ گیا ہے اس کی وجہ سے انھیں اپنا مستقبل بہت تاریک نظر آتا ہے اور ان میں ایک عجیب ذہنی کیفیت اور الجھن پیدا ہو گئی ہے بعض نے تو تھکے ہارے جیسے بیوں کی طرح کندھا ڈال دیا ہے اور بس ہو گئی، ہم کیا کر سکتے، جو کچھ ہونا ہے وہ ہو جائے گا۔ بعض یہ طے نہیں کر سکتے کہ انھیں اپنے موجودہ وطن میں رہنا چاہئے یا دوسرے ملک میں چلا جانا چاہئے جس کو وہ دور ہی کا فریب کھا کر جنت سمجھتے ہیں۔ بعض یہ طے کر چکے ہیں کہ یہاں ہیں، یہیں رہنا ہے وہ خود کو لباس، زبان، وضع قطع کے لحاظ سے ایک ایسے سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں کہ ان میں اور اکثریت کے افراد میں تمیز نہ کی جا سکے، جس طرح بعض جانور پرند اور کیڑے مکوڑے ماحول اور موسم کے مطابق رنگ اختیار کر لیتے ہیں، بعض تنگ نظر حلقوں کا ان سے مطالبہ بھی یہی ہے کہ تم اپنی کسی قسم کی مذہبی یا تہذیبی انفرادیت قائم نہ رکھو کیونکہ یہی قوم پرست ہونے کا ثبوت ہے! اگر وہ یہ تبدیلی خلوص کے ساتھ کریں تو اس میں زیادہ بحث کی گنجائش نہیں، لیکن وہ تو خود کو امتیاز کے خطروں سے محفوظ کرنے کے لئے مجبوراً ایسا کرنا چاہتے ہیں۔ کیا ایسا کرنا مناسب ہے؟ قابل اعتراض کیا چیز ہے؟ جماعتوں اور افراد کی خاص خاص تاریخی روایات اور طور طریقے یا وہ ذہنیت جو کسی قسم کے اختلاف کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں بلکہ سب کو ایک ہی سانچے میں ڈھالنا چاہتی ہے؟ کیا ہندو یا مسلمان یا سکھ ہونا کوئی گناہ یا جرم ہے جس کو اکثریت کی نگاہ سے پوشیدہ رکھنا ضروری ہو؟ کیا اچکن یا شلوار پہننا یا داڑھی رکھنا یا اردو یا گورمکھی کے ساتھ وابستہ ہونا کوئی عیب ہے جس کا اظہار ایک متمدن سماج میں نہ کرنا چاہئے؟ فرقہ وارانہ جنونیوں کے ان کارناموں کو دیکھنے کے بعد بھی جنھوں نے خوف کی یہ ذہنیت پیدا کی ہے اور ہماری صدیوں کی تہذیبی قدروں کو خاک میں ملا دیا ہے۔ میں یہی کہوں گا کہ مرض کا یہ علاج ٹھیک نہیں۔ اگر کسی ملک میں رہنا ہے تو خودداری کے ساتھ اور سر اونچا کر کے رہو۔ بے شک انسان کی طرح سر بلند کر کے جینا، گرگٹ کی طرح رینگنے سے زیادہ مشکل ہے اور اس میں خطرے بھی زیادہ ہیں۔ لیکن میں تو گرگٹ کو انسان پر ترجیح دینا میرے نزدیک تو ٹھیک نہیں۔

آج کل کے ہندوستان میں کوئی بات معقولیت اور انصاف کی کہو تو اس کا سلسلہ خود بخود جا کر گاندھی جی تک پہنچ جاتا ہے مجھے گاندھی جی کے اس خیال سے پورا اتفاق ہے کہ ہندوستان کی قومیت سچی نہیں ہو سکتی جب تک اس میں بہتر ہے کہ ہر کوشش کرتا رہے کہ ہندو اچھا ہندو بنے، مسلمان اچھا مسلمان بن کر، سکھ اچھا سکھ بن کر اچھے ہندوستانی اور اچھے انسان ہونے کا ثبوت دے۔ ایک موقع پر گاندھی جی نے "شدھی" کی یہی الٹی لیکن دل لگتی تفسیر پیش کی تھی! یہ بات ٹھیک ہے اگرچہ بہت سے تنگ نظر، روشن خیال قوم پرستوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ جہاں تک ہندوستان کے مسلمانوں کا تعلق ہے۔ ان کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ مسلمان رہتے ہوئے اپنی تہذیبی دولت اور روایتوں کا احترام کرتے ہوئے اپنی شرافت، انسانیت، رواداری اور خدمت کے ذریعے اپنے ہم وطنوں کے دل میں گھر کریں۔ بے لوث اور پرخلوص خدمت کی حرارت انسان کا کیا ذکر ہے پتھر اور لوہے کو موم بنا سکتی ہے۔ گاندھی جی کی شہادت سے پہلے کرول باغ میں مسلمانوں کا ذاتی شہرت برادری کی صداقت کو ہمیشہ ثابت کر دکھائی کا ایک ورق ۔۔۔ اسی حال میں جامعہ ملیہ میں ہوا جہاں ہندو اور سکھ شرنارتھی استادوں اور استانیوں کے لئے ہمدردی کے سب شرنارتھی تھے، ایک انڈسٹریل کورس منعقد کیا گیا تھا۔ یہ سب پنجاب کے خونی واقعات کو جھیل چکے تھے۔ ان کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے شک تھا، تلخی تھی، غصہ تھا لیکن جامعہ کی فضا اور جامعہ کے سلوک نے جس میں پیار، خلوص اور خدمت کا معجزہ تھا ان کے زخموں پر مرہم رکھا اور ان کے دل میں رواداری، دوستی اور محبت کی شمع پھر سے روشن کر دی۔ اگر مسلمان ہندوستان میں اسی جذبے کے ساتھ کام کریں گے تو کیا وجہ ہے کہ وہ اپنی بہترین خصوصیات کو قائم رکھتے ہوئے ملک میں ایک عزت کا مقام حاصل نہ کریں۔ اسی خدمت اور خلوص کی آگ میں سیرت کا سونا تپ کر ایسا کندن بن جاتا ہے کہ جب گذشتہ سال جالندھر کے اسٹیشن پر ایک مشتعل مجمع نے ذاکر صاحب کو گھیر لیا اور ایک شخص ان کو قتل کرنے پر آمادہ تھا ان سے سوال کیا کہ "کیا تم مسلمان ہو" تو انھوں نے بہت اطمینان سے جواب دیا "الحمد للہ، میں مسلمان ہوں" یعنی میری زندگی خدا کی چیز ہے اور اس کے بندوں کی محبت اور خدمت کے لئے وقف ہے، اگر اس جرم میں میری جان لینا چاہتے ہو تو لے لو، حیات جاوداں سے تو مجھے محروم نہیں کر سکتے!

آج سے تیرہ سال پہلے جب ہندوستان کے سیاسی مطلع پر ملک کی تقسیم اور فرقہ وارانہ جھگڑوں کے تاریک بادل محیط نہ تھے انھیں ذاکر صاحب نے کاشی ودیاپیٹھ کے سالانہ اجلاس میں یہ الفاظ کہے تھے جو بار بار دہرانے کے قابل ہیں:

"سچے مسلمان ہندوستانی اپنی مذہبی روایات، اپنی تاریخ، اپنی تمدنی صدمات اور اپنے تمدنی توقعات کی وجہ سے اپنے ملی وجود کو خود اپنے ہی لئے بے بہا نہیں سمجھتے بلکہ ہندوستانی قومیت کے لئے بھی نہایت بیش قیمت جانتے ہیں ۔۔۔ ان کا حوصلہ یہی کہ اپنے مسلم ہوں اور اچھے ہندی اور نہ کوئی مسلمان انھیں ہندی ہونے پر شرمائے، نہ کوئی ہندی ان کے مسلمان ہونے پر انگلی اٹھائے" یہ بات اگر ۳۵ء میں صحیح تھی تو آج بھی اور اتنی ہی صحیح ہے۔ گذشتہ چند سال کے واقعات اس حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتے بلکہ ان کی وجہ سے اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

لیکن گذشتہ سالوں میں ہمارے رہنماؤں نے اپنی جہالت اور عاقبت ناشناسی کی وجہ سے اسلام کی تعلیم اور تہذیب کو ایک غلط رنگ میں پیش کیا۔ انھوں نے اس کی عالم گیر دوستی، اس کی رواداری، اس کی فرض شناسی، اس کے احترام مذاہب کو بھلا دیا اور مسلمانوں کو ہر معاملے میں علیحدگی اور جماعتی عصبیت کی تعلیم دی جس سے صرف مسلمانوں ہی کو نقصان نہیں پہنچا بلکہ اسلام کا ایک تنگ اور غلط تصور دوسروں کے دماغ میں پیدا ہو گیا جس سے دوسرے شرپسندوں اور متعصب کارکنوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور اس طرح باہمی اختلافات کی خلیج بڑھتی چلی گئی۔ اب کہ ہندوستان کا سیاسی نقشہ بالکل بدل گیا ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کو ہندوستان کی غیر مذہبی جمہوری ریاست میں اپنے فرائض کو ادا کرنے اور اپنا صحیح مقام حاصل کرنے کے لئے اسلام ہی کے بہترین اصولوں اور قدروں سے روشنی حاصل کرنی چاہئے۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کے لئے معذرت کرنی ضروری ہو۔ ہر شخص اور ہر جماعت کو حق ہے کہ وہ اپنی سیرت کی تشکیل کے لئے اس سرچشمۂ الہام سے فیض حاصل کرے، جس سے اس کو دلی عقیدت ہے۔ کیا گاندھی جی یا سر رادھا کرشنن کی انسانی عظمت اور ان کے خیالات کی اخلاقی اہمیت اس وجہ سے کم نہیں ہو جاتی کہ وہ بھگوت گیتا یا ہندو فلسفہ سے روحانی تقویت حاصل کرتے ہیں؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ جس طرح وہ اپنی فراخ دلی اور وسیع النظری کی وجہ سے دوسری تہذیبوں اور مذہبوں کے معترف اور ان سے مستفید ہونے کو تیار ہیں۔ اسی طرح ہمیں بھی پوری رواداری اور احترام کے ساتھ ہر اچھی چیز کو لینا اور قبول کرنا چاہئے خواہ وہ کہیں سے دستیاب ہو۔ حکمت تو مومن کی کھوئی ہوئی پونجی ہے۔ لیکن ہمارے تنگ خیال لیڈر اکثر اس ارشاد نبوی کو بھول جاتے ہیں۔ ہمیں اپنے وطن ہندوستان میں، جس کو ابھی صرف سیاسی آزادی ملی ہے بہت سے بڑے بڑے کام کرنے ہیں۔ لاکھوں ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنا ہے۔ دماغوں سے تنگ خیالی اور تعصب کو نکالنا ہے۔ افلاس بیماری اور جہالت کے خلاف جنگ کرنی ہے جو ہر طرح کے دکھوں کی پیدا کرتی ہے اور ذات پات، نسل اور مذہب کے فرق کو بھلا کر سیوا کرنی ہے۔ یہ اتنا بڑا کام ہے کہ خود کو اس میں کھپا کر ہم جسم اجتماعی کے تمام زہروں کو دور کر سکتے ہیں اور کھوئی ہوئی قومی صحت پھر سے حاصل کر سکتے ہیں...... اور اسی میں ہماری ذاتی جماعتی اور قومی نجات ہے۔

دستورِ زباں بندی

میں نے اس سلسلے کے پہلے مضمون میں لکھا تھا کہ ہر قسم کی ترقی کے لئے خیال کی آزادی ضروری ہے۔ اگر فکر کو زنجیریں پہنا دی جائیں یا اس کی آنکھوں پر اندھیریاں چڑھا دی جائیں تو نہ صرف ذہنی ترقی کا خاتمہ ہو جاتا ہے بلکہ مادی خوش حالی، سماجی اور سیاسی اصلاح سب خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔ لیکن ہندوستان (یعنی انڈین یونین اور پاکستان دونوں) اس وقت ایک ایسی منزل میں سے گذر رہے ہیں جب مطلق العنانی کے ظاہری بندھن ٹوٹ چکے ہیں لیکن ابھی تک ہم نے اختلاف خیال کی پذیرائی کرنا ٹھنڈے دل سے اس پر غور کرنا نہیں سیکھا۔ اس کی چند واضح مثالیں

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

۲۔ پاکستان

جناح صاحب کے بعد کیا ہوگا

جناح صاحب پاکستان کے بانی بھی تھے اور اس کے معمار بھی۔ وہ بنیاد کو کمزور اور تعمیر کو ناتمام چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئے اس لئے قدرتاً ذہنوں میں یہ سوال اٹھتا ہے اب کیا ہوگا؟ سب سے پہلا امکان اور اندیشہ تو یہ ہے کہ پاکستان میں لیڈروں کے آپس کے اختلافات خطرناک صورتیں اختیار کر لیں نئے گورنر جنرل کے تقرر میں خاصی دیر ہوئی اور اس کے بعد بھی تقرر عارضی کیا گیا۔ اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ اس معاملے میں پورا اتفاق رائے نہیں ہو سکا۔ یہ کچھ ایسی اہم بات نہیں کیونکہ کسی گورنر جنرل کو اب وہ حیثیت حاصل نہیں ہو سکے گی جو جناح صاحب کو حاصل تھی، اور آئینی گورنر جنرل کی حیثیت سے حکومت کی ہوگی ملک کی سیاست پر اس کا اثر بلا واسطہ ہوگا بالواسطہ نہیں۔ پاکستان میں موجودہ اختلافات کی بنیاد در اصل شخصی رقابتوں پر ہے اور اگر ریاست کی سیاسی زندگی کسی شدید خطرے میں پڑ گئی تو لوگ ان اختلافات کو کچھ دنوں کے لئے بھول جائیں گے۔ کم از کم آئندہ انتخاب تک یہ دبے رہیں گے

شخصی رقابتوں پر قابو پا لیا گیا تو پھر سیاسی تصورات کی کشمکش زیادہ بڑھ نہ سکے گی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ موجودہ برسر اقتدار جماعت کے مخالفین کئی گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ان کے مل کر کام کرنے کے امکانات بہت کم ہیں اس وقت حزب مخالف کی جماعتوں میں بعض مذہبی [illegible] پیشواؤں کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ لیکن شریعت کی تعبیر میں بڑا اختلاف رائے ہے۔ اگر پیر مانکی شریف امیر المومنین بننا چاہیں تو جماعت اسلامی لیاقت علی خاں صاحب کو ان پر ترجیح دے سکتی ہے ابو الاعلیٰ صاحب سیاسی اقتدار کی لڑائی میں کود پڑیں تو ان کے مخالفوں میں پیر مانکی شریف کا شریک ہو جانا بعید از قیاس بات نہ ہوگی۔ یہ ضرور ہے کہ شریعت کا نام اب زیادہ سنائی دے گا۔ جناح صاحب کا عوام کے دل و دماغ پر اتنا گہرا اثر تھا کہ وہ شریعت کی جو بھی تعبیر کر دیتے لوگوں کے لئے قابل قبول بن جاتی۔ مخالفت میں آوازیں اٹھتیں تو ان کی زیادہ شنوائی نہ ہوتی۔ اب عوام کے مذہبی جذبات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش زیادہ آسانی سے ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر پاکستان کے چوٹی کے رہنما متحد رہے تو ان کی رجعت پسندی اس طرح کے نعروں کو دبا لے گی۔ وہ ایسا بھی چاہیں تو پاکستان کو ایک حقیقی عہد جدید کی جمہوریت بنا سکتے ہیں۔

پاکستان میں بائیں بازو کی جماعتوں کا وجود عدم کے برابر ہے۔ اس لئے ان کی طرف سے مستقبل قریب میں کسی نمایاں اختلاف کا اندیشہ نہیں۔ جناح صاحب کی شخصیت نے ان سب کو قریب قریب مٹا دیا اور موجودہ سیاسی فضا پر اتنی مذہبیت طاری ہے کہ میاں افتخار الدین تک کو شریعت کا جامہ پہننا پڑا ہے اب ان کا طرز عمل کچھ ان سے مختلف ہوگا یا نہیں؟ اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے لیکن حال کی روشنی میں مستقبل کے متعلق کچھ کہا جا سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ یہ لوگ مذہبیت کا جامہ ابھی نہیں اتاریں گے اور پاکستان میں سیاست یا معاشیات کی بنیاد پر جماعتوں کا قیام مستقبل بعید کا ایک خواب ہے۔ ایک معمولی سی بات سے جو ابھی پچھلے دنوں ہوئی ہے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے۔ مغربی پنجاب کے مزدوروں میں ریلوے والے شاید سب سے زیادہ متحد ہیں اور ان کے مسلم الثبوت لیڈر مرزا ابراہیم ہیں۔ انہیں پچھلے دنوں تین سال کی قید کی سزا دی گئی ہے۔ لیکن اس سزا کے خلاف شدید احتجاج تو درکنار کسی قابل ذکر شخصیت نے اس پر ایک بیان دینا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ پاکستان میں صنعتی مزدوروں کی تعداد ویسے بہت کم ہے اور اشتراکیت کے ہراول بھی ایک دو اکے ہی ہیں۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح کی تحریکوں کے لئے زمین ہموار کرنا ہی ایک بڑا کام ہے پاکستان کی سیاسی زندگی میں کوئی جماعت یا شخصیت ابھی دکھائی نہیں دیتی جو اس کام کو انجام دے سکے۔

مستقبل کا ایک سوال جس کا جواب مشکل ہے صوبوں کے اور مرکز کے تعلقات کا ہے۔ یہ بڑا پیچیدہ سوال ہے اور ہو سکتا ہے اس پیچیدگی کے احساس کی وجہ سے گورنر جنرل نے اتنی بے جا دخل دیا مسٹر جناح کی شخصیت صوبوں اور مرکز کی سیاست پر یکساں حاوی تھی۔ اب مرکزی حکومت میں کوئی ایسا نہیں جو صوبوں کی سیاست پر اسی طرح اثر انداز ہو سکے مشرقی بنگال جو پاکستان سے اتنی دور اور الگ تھلگ سا ہے یہ مسئلہ سب سے زیادہ ٹیڑھا تھا۔ کم از کم عارضی طور پر ناظم الدین صاحب کو گورنر جنرل بنانے سے مشرقی پاکستان میں یہ احساس پیدا کیا جا سکے گا کہ وہ پاکستان کا ایک اہم جز ہے۔ لیکن صوبوں کی طرف سے یہ مطالبہ اب زیادہ زور شور سے ہوگا کہ مرکز اور صوبوں کے اختیارات اور ذمہ داریوں کی حد بندی کر دی جائے اور مرکز صوبوں کے اندرونی معاملات میں بہت گہری دلچسپی نہ لے۔ اس کا ایک حل یہ ہو سکتا ہے کہ مرکزی حکومت کی تعمیر اس طرح کی جائے کہ صوبے کی اہم شخصیتیں مرکز میں آ جائیں لیکن یہ صورت بھی آئندہ انتخابات کے وقت ہی اختیار کی جا سکتی ہے اس وقت تک کے لئے ـــــ شاید جناح صاحب کی وفات کے اندیشے سے مرکزی حکومت نے بہت وسیع اختیارات لے رکھے ہیں۔ اور اگر فوراً ہی کسی صوبے میں کسی نے زیادہ جوش سے کام لیا تو اس پر سنگین الزام لگایا جا سکے گا کہ وہ پاکستان کی وحدت کو خطرے میں ڈال رہا ہے

ہند و پاکستان میں کیسی نبھے گی

ہندوستان نے جس طرح پاکستان کے غم میں شرکت کی ہے اس کا ایک اثر تو پاکستان پر پڑنا ہی چاہیے کہ ہندوستان کے ارادوں کے متعلق شک اور بدگمانی کی فضا چھٹ جائے۔ ملک کی تقسیم اور اس کے بعد کی ہولناکیوں کی یاد سے بلاشبہ ہندوستان میں بہت سے دلوں میں تلخی اور غصہ باقی ہے۔ لیکن اس نے ماتم کے طول و عرض میں جبکہ پاکستان کے رہنما کی موت کا غم منایا گیا۔ ہندوستان کے لیڈروں نے اسیاست دانوں نے غرض سبھی نے جناح صاحب کی موت پر اظہار غم کیا اور پاکستان سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ ملک کے اخباروں نے جناح صاحب کی موت پر بہت ہی مناسب الفاظ میں مقالے لکھے اور ان سب میں جو جذبہ کارفرما تھا اس کا تھوڑا سا اندازہ ہندوستان ٹائمز کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ہو سکتا ہے "یہاں شاید یہ کہہ دینا بے جا نہ ہوگا کہ اس اخبار سے بہت سے لوگوں کو قرار واقعی جانبداری اور اس طرح کی دوسری شکایتیں ہیں۔ پاکستان کے امن اور استحکام سے ہندوستان کو جو دلچسپی ہے وہ پاکستان کے عوام سے کچھ ہی کم ہے۔ ہند و پاکستان دونوں ایک عظیم الشان میراث کے مالک ہیں جس سے غفلت کو کوئی بھی گوارا نہیں کر سکتا ان میں باہم کوئی کشمکش یا تصادم نہیں۔ یا کم از کم ہونا نہیں چاہیے ان کے عوام دل سے ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہتے ہیں۔ ۔۔۔ ان میں کوئی ایسا بنیادی اختلاف نہیں جس پر دونوں ریاستوں میں آپس میں جھگڑے ہوں۔ اس کے برخلاف ان کے مل جل کر کرنے کے کتنے ہی کام ہیں جن سے دونوں کے عوام کا بھلا ہوگا۔ ۔۔۔ خود غم کا شکار ہندوستان پاکستان کے غم کو بھلانے میں ہر طرح کی مدد دینے کو تیار رہے گا کہ دونوں ملک بے جا منافرت کو بالائے طاق رکھ کر ایشیا کی رہنمائی کا کام انجام دے سکیں"

بعض اخبارات نے جن میں سٹیٹس مین سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ جناح صاحب کے بعد ممکن ہے دونوں حکومتوں کے تعلقات بہتر ہو جائیں۔ انگلستان کے بعض اہم اخبارات بھی یہی کہتے ہیں ممکن ہے یہ اندازہ صحیح نہ ہو کہ ہند و پاکستان کے تعلقات کے خراب ہونے کی ذمہ داری زیادہ جناح صاحب پر تھی لیکن اتنا تو بہرحال کہا جا سکتا ہے کہ ان کے بعد دونوں ریاستوں کے تعلقات کے ابتر ہو جانے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس وقت حیدرآباد کے مسئلے کا اس طرح آسانی سے حل ہو جانا ایک بہت ہی خوش آیند فال ہے کہ اس طرح دونوں حکومتوں کے درمیان اختلاف رائے کا ایک بڑا سبب دور ہو گیا ہے۔

قیوم صاحب کی قوامی

قیوم صاحب نے اپنے مخالفوں کو ختم کرنے کی جو مہم شروع کر رکھی تھی اس کا آخری مرحلہ بھی طے ہو گیا۔ سرخ پوشوں کی گرفتاریاں کافی بڑے پیمانے پر پہلے ہی ہو چکی تھیں لیڈروں کو کئی کئی سال کے لئے قیوم صاحب نے جیلوں میں بند کر کے اپنے راستے سے ہٹا دیا تھا بس ایک مخالف جماعت کا نام کا کانٹا باقی تھا سو قیوم صاحب نے اسے بھی نکال دینے کی کوشش کی ہے۔ پچھلے دنوں سرخ پوشوں کی جماعت تنظیم کو حکومت نے خلاف قانون قرار دے دیا ہے اور ان کی ملکیت وغیرہ پر حکومت کا قبضہ ہو گیا ہے اس آخری قدم کے اٹھانے کی ضرورت کیا تھی؟ اگر قیوم صاحب کے ان دعووں پر غور کیجئے کہ اب صوبے میں خدائی خدمت گاروں کو کوئی کوڑی کو بھی نہیں پوچھتا تو پھر اس کارروائی کی ضرورت سمجھ میں نہیں آتی۔ ۔۔۔ ایسا ہوتا ہے کہ قیوم صاحب کے سارے ظلم و تشدد کے باوجود صوبہ سرحد میں اس جماعت کا اثر اب بھی کافی ہے۔

(۱ ۔ ۱ ۔ س)

مشرقی دُنیا

چین کی حالت سے سبق لو

[illegible] اعداد و شمار فراہم کئے ہیں [illegible] آمدنی [illegible] وقت [illegible] عہدہ دار حکومت کے خرچ پر آراستہ کئے ہوئے عالیشان مکانوں میں مرفہ الحالی سے فروکش ہیں ان کو تمام مراعات حاصل ہیں جن کی وجہ سے انہیں اپنی تنخواہ پر گذر کرنا نہیں پڑتا۔ اوسط درجے کے حکومت کے ملازم کو صرف ۹۰۸ امریکن ڈالر یعنی ۲۲۳۰ روپے ماہوار اور چاول شکر نمک اور کوئلہ کا راشن ملتا ہے۔ ان میں سے بیشتر حکومت کے ہوسٹلوں میں رہتے ہیں جہاں چار چار پانچ پانچ کے خاندان ایک چھوٹے سے کمرے میں [illegible] کر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

طالب علموں کی حالت اور بھی خراب ہے تقریباً ایک تہائی طالب علم حکومت کی مدد کے محتاج ہیں۔ ان ہی حالات کا نتیجہ ہے کہ چینی طالب علموں میں بڑی بے چینی پیدا ہوگئی ہے۔ اس بے چینی کو دبانے کے لئے حکومت نے نظام مرسید ھار استہ اختیار کیا ہے جو کبھی منزل تک نہیں لے جاتا۔ پچھلے دنوں جنرل ہو چیانگ نے طالب علموں کے خلاف کچھ قوانین بنائے ہیں ان قوانین کا مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ حکومت اس طرح کمیونسٹ خیال سے متاثر طالب علموں کو دبا دینا چاہتی ہے۔

سپاہیوں کا حال اتنا برا نہیں جتنا عام خیال ہے لیکن دیہی علاقوں میں حکومت کے سپاہیوں کے متعلق عام شکایت ہے کہ وہ من مانی لوٹ مار کرتے رہتے ہیں۔

اونچے اونچے عہدہ داروں کے خلاف بے ایمانی اور رشوت ستانی کی داستانیں عام ہیں اور حکومت نے ان کے خلاف کسی قسم کی کوئی کارروائی نہیں کی ہے۔

خانہ جنگی میں پچھلے سال ڈیڑھ سال میں حکومت کی فوجوں کی حالت بہت خراب ہوگئی ہے۔ منچوریا اور شمالی چین کا بڑا حصہ ان کے ہاتھ سے تقریباً نکل چکا ہے پچھلے دنوں چینی حکومت کے وزیر دفاع نے حکومت کی بعض بڑی ناکامیوں کی وجہ بتلاتے ہوئے کہا کہ قومی فوج کی تعداد چینی کمیونسٹوں نے مقابلے میں [illegible] اور ان [illegible]

[illegible] ایسی مثال ہے کہ باوجود اس کے کہ قومی حکومت کے پاس امریکہ کی عنایت سے بہت سامان جنگ موجود ہے اور اس کے پاس ایک ہوائی بیڑہ بھی ہے جو کمیونسٹوں کے پاس نہیں اسے کوئی کامیابی نہیں ہو [illegible] سب سے بڑی وجہ عام بددلی ہے جس سے چینی سماج کا کوئی حصہ بچا ہوا نہیں ہے۔ اس صورت حال کی بڑی ذمہ دار افراط زر ہے۔ جو خانہ جنگی کے [illegible] اخراجات کا نتیجہ ہے یہ بحران تقریباً مستقل ہو کر رہ گیا ہے چنانچہ امسال کے دوسرے نصف حصے کا جو چینی بجٹ شائع کیا گیا ہے اس کے متعلق اندازہ کیا گیا ہے کہ اس کا تقریباً دو تہائی حصہ فوجی خرچ پر صرف ہوگا۔ ماہرین کی رائے میں معاشی صورت حال خانہ جنگی سے زیادہ نازک ہو چکی ہے۔

کچھ عرصے سے اس سلسلے میں اصلاح کی کوششوں کی افواہیں گرم ہیں۔ اب چینی حکومت نے ایک نیا سکہ جاری کیا ہے مگر شاید موجودہ حالات میں نئی کرنسی کے اجراء سے چین کا معاشی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ اصل مسئلہ فوجی مصارف کا ہے۔ موجودہ پیمانے پر فوجی خرچ جاری رہا تو کوئی بھی اصلاح چین کو اس ابتری سے نہیں نکال سکتی۔ چین کی حکومت نے جنگ کے مصارف کو پورا کرنے کے لئے چین کے دولت مندوں سے ٹیکس وصول کرنے کی جرأت نہیں کی ہے۔ کومن تانگ کی حکومت کی بنیاد جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی بہبودی کے مقصد پر قائم ہے اور موجودہ جنگ کا مقصد انھی کے مفاد کی حفاظت ہے۔ مگر بڑے تعجب کی بات ہے کہ یہ پورا طبقہ اس قدر کوتاہ اندیش ہے کہ یہ بھی محسوس نہیں کر سکتا کہ موجودہ صورت حال باقی رہی تو ان کی بھی خیر نہیں۔

انڈونیشیا میں بھی پھوٹ پڑگئی

انڈونیشیا سے پچھلے دنوں جو خبریں آئی ہیں ان سے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جمہوریت نوازوں کی دوستانہ گفت و شنید کے بے نتیجہ رہنے سے کہیں انڈونیشیا کے صبر کا پیمانہ لبریز تو نہیں ہو گیا ہے؟ جہاں تک ڈچ حکومت کا تعلق ہے وہ تو مدتوں سے یہ اعلان کر رہی ہے کہ انڈونیشیا میں دہشت پسندی اور [illegible] [illegible]

سیاسی اختلافات نے پچھلے دنوں زیادہ نمایاں شکل اختیار کر لی ہے۔ جمہوریت کے ایک مشہور لیڈر نے [illegible] ہندوں کمیونسٹ پارٹی سے اپنے تعلق کا اعلان کر دیا ہے اور ڈاکٹر محمد حطا نے اپنی ایک تقریر میں کہا ہے کہ سیاسی اختلافات کی پیدا کی ہوئی ابتری کی بدولت بیرونی ملکوں میں جمہوری حکومت کی پوزیشن بہت کمزور ہو رہی ہے۔

جمہوری حکومت کے بائیں بازو کی چار جماعتوں میں سے تین پارٹیوں نے کمیونسٹ پارٹی میں ضم ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ اب انھوں نے لنگاجاتی اور رینویل معاہدوں کی مخالفت شروع کر دی ہے۔ اس تبدیلی کا سبب یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان جماعتوں کو یہ یقین ہو گیا ہے کہ ڈچ حکومت سے گفت و شنید کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ دھیرے دھیرے جمہوری حکومت کمزور ہوتی جائے۔ یہاں تک کہ ڈچ حکومت ایک آخری وار کرے اور جمہوریت پیدا ہونے سے پہلے ہی ختم کر دی جائے۔ خود ڈاکٹر حطا کو ڈچ حکومت سے اسی طرح کی امیدیں ہیں چنانچہ انھوں نے اس خطرے کا اعتراف کیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ عارضی فیڈرل حکومت کو ڈچ انڈونیشین جمہوریت کو کچل ڈالنے کی خاطر استعمال کریں۔ مستقبل کے اس نقشے کی روشنی میں یہ افسوسناک بات ہے کہ ڈاکٹر حطا نے کمیونسٹوں کو کچل ڈالنے کی دھمکی دی ہے انھوں نے انتہا پسندی کو انڈونیشین جمہوریت کی بچپن کی بیماریوں سے تعبیر کیا ہے اور بچوں کے ساتھ بہت زیادہ سختی جائز نہیں سمجھی جاتی۔ قومی اتحاد کی ضرورت آج انڈونیشین جمہوریت کو ہمیشہ سے زیادہ ہے، اور یہ عقلمندی کی بات نہیں ہوگی کہ جو لوگ میدان جنگ میں آپ کے دوش بدوش دشمنوں سے لڑیں گے ان پر ناروا سختیاں برتی جائیں۔

کمیونسٹوں کا مطالبہ ہے کہ قومی اتحاد کی خاطر ایک قومی حکومت قائم کی جائے لیکن ڈاکٹر حطا نے اس مطالبے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ ان کی ساتھی دو جماعتیں اس پر [illegible] ہیں اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ دونوں جماعتوں میں حکمت عملی کا بڑا فرق ہے۔ ایک بیان میں کہا گیا ہے کہ اس مسئلہ پر گفت و شنید بھی اس وقت تک بیکار ہے جب تک دعوت دینے والوں کو اور ان لوگوں کو جنھیں دعوت دی گئی ہے ایک دوسرے پر اعتماد نہ ہو۔ اور اس عدم اعتماد سے فائدہ اٹھا کر ڈچ حکومت [illegible] [illegible]

گئی ہیں

ڈچ حکومت سے جو گفت و شنید ہو رہی تھی اس کی صورت حال یہ ہے۔ انڈونیشین جمہوریت کے لیڈروں نے یو۔ این گوڈ آفس کمیٹی کے آسٹریلین اور امریکن ممبروں کی تجویزوں کو گفت و شنید کی بنیاد کے طور پر مان لیا ہے۔ حالانکہ ان تجویزوں کے ماننے میں جمہوریت کو کتنے ہی تلخ گھونٹ پینے پڑے ہیں۔ ڈچ حکومت اس کو بنیاد کے طور پر بھی ماننے کو تیار نہیں۔ ڈچ حکومت کٹھ پتلی ریاستوں کی تعمیر کا کام زور شور سے کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں حال میں مشرقی سماترا کی ریاست کو حق خود اختیاری عطا کئے جانے کی خبریں آئی ہیں۔ یہاں کی اسٹیٹ کونسل کو جو ڈچ حکومت کے نیازمندوں پر مشتمل تھی پارلیمنٹ بنا دیا گیا ہے۔ سیاست کے ساتھ ساتھ کچھ روپے کے جادو سے بھی کام لیا جانے والا ہے۔ خبر آئی ہے کہ ڈالر کی جو مدد مارشل ایڈ کے ذریعے مل رہی ہے اس کا کچھ حصہ اب انڈونیشیا کے جمہوریت پسندوں کو بھی مل سکے گا۔

بھلا ملایا کو کیسے چھوڑ دیں

ملایا کے باغیوں کو کچل ڈالنے کے کام میں آسٹریلین حکومت بھی اپنے بس بھر حصہ لے رہی ہے آسٹریلیا سے اسلحہ فراہم کئے جا رہے ہیں اور آسٹریلیا کے وزیراعظم مسٹر چیفلے نے یقین دلایا ہے کہ برطانوی حکومت سے مدد مانگی تو اس تجویز پر وہ پوری ہمدردی سے غور کریں گے "آسٹریلیا ہمیشہ برطانیہ کی مدد کو تیار رہے"۔ اس کے باوجود ملایا کے یورپین سرمایہ داروں کے بارے میں جن کے لئے یہ سب کچھ ہو رہا ہے مسٹر چیفلے کی رائے کچھ اچھی نہیں ہے"۔ ۰۰ لاکھ کی آبادی میں صرف ۱۷ ہزار یورپین ہیں جنھیں ملک سے کوئی محبت نہیں۔ وہ محض نفع کی خاطر وہاں ہیں"۔ اصل بات یہ ہے کہ ملایا میں ٹین اور ربر کی کثرت ہے اور برطانیہ کی موجودہ معاشی صورت حال میں اسے ایسی ان تمام چیزوں کی ضرورت بہت سخت ہے جس سے ڈالر مل سکیں۔ ملایا سے برطانیہ کی یہ ضرورت بہت بڑی حد تک پوری ہوتی ہے۔

معاشی خود غرضی پر جمہوریت نوازی کا پردہ ڈالنے میں کچھ ایسی دقت نہیں پڑتی جب جمہوریت کی تعریف برطانوی حکومت اپنی مرضی کے مطابق کر سکے۔ اس سلسلے کا سب سے شاندار کارنامہ سیام کے ڈکٹیٹر مارشل سونگرام سے یہ سمجھوتا ہے جس کی رو سے برطانوی حکومت کو ملایا کے کمیونسٹوں کے کچلنے کے کام میں کچھ سہولت ہو گی۔

(ا۔ س)

ذاکر صاحب کی واپسی پر

آل احمد سرور

صد شکر اپنا مردِ قلندر پھر آگیا
صحرا سے تازہ دولتِ عرفاں لیے ہوئے
آنکھوں میں عزمِ کوہ کنی کی حلاوتیں
باتوں میں لطفِ صبحِ بہاراں لیے ہوئے
افسردگی کے دور میں امید کی کرن
تاریکیوں میں شمعِ فروزاں لیے ہوئے

جذبہ جسے کچل نہ سکا کوئی بھی ستم
شعلہ جو آندھیوں سے بھی برہم نہ ہو سکا
دیوانگی کے رقص، لہو کی ترنگ میں
انسانیت پہ جس کا یقیں کم نہ ہو سکا
ہر برقِ تازہ شمعِ سیہ خانہ بن گئی
دل وقفِ خود فریبیِ ماتم نہ ہو سکا
سوزِ نفس کی آنچ بجھائے نہ بجھ سکی
خونِ جگر کا نقش تھا مدھم نہ ہو سکا

محفل پہ آج موت کا سایہ ضرور ہے
تیری جبیں سے نورفشاں زندگی تو ہے
ذہنوں پہ چھا گیا ہے اندھیرا تو کیا ہوا
ہمدم تری نظر میں ابھی روشنی تو ہے

مرشد کی واپسی پہ یہ حاضر ہیں چند شعر
بے رنگ و بو ہیں پھول، مگر تازگی تو ہے

غزل

خلیل الرحمٰن اعظمی

اُکسا رہا ہے جیسے کوئی حسنِ تازہ کار
اے بے خودیِ شوق یہ کیسا مقام ہے
کھوئی گئیں تصورِ جاناں کی لذتیں
کچھ اس طرح سے آج یہ گردش میں جام ہے
باقی نہیں رہی ہے ستاروں میں روشنی
کیسا بجھا بجھا سا یہ ماہِ تمام ہے
جنبش میں ہیں ہنوز وہی پردہ ہائے شب
گونجا ہوا اگرچہ سحر کا پیام ہے
شعلوں کا رقص پھر دو لہو کی شراب میں
افسانۂ حیات ابھی ناتمام ہے

غزل

باقر مہدی

آزادیِ حیات کی دل میں خوشی ہے کیا
میری نظر میں اب بھی وہی زندگی ہے کیا؟
شیرازۂ حیات بکھرتا چلا گیا
جانے سے تیرے دہر میں کوئی کمی ہے کیا؟
آہوں سے اونچے اونچے محل تھرتھرا اٹھے
عشرت کدوں پہ چھائی ہوئی بے بسی ہے کیا؟
میں مبتلائے کشمکشِ زندگی رہا
بن بن کے ایک ایک تمنا مٹی ہے کیا؟
کل کائنات درد سے پھر محوِ رقص آج
تاریکیٔ محیط میں یہ روشنی ہے کیا؟

دیہی اور گھریلو صنعتیں

۲۔ موافقت میں دلیلیں

پروفیسر محمد عاقل

"نئی روشنی" کی پچھلی اشاعت میں ہم نے تبلایا تھا کہ ہندوستان میں پچھلے تیس سال میں بڑے پیمانے کی صنعتوں نے ایسی ترقی کرلی ہے کہ اب ہندوستان کا شمار دنیا کے ترقی یافتہ صنعتی ملکوں میں آٹھویں نمبر پر کیا جانے لگا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس سے ہمارے دیہات کی بے کاری کا مسئلہ حل ہو سکا ہے یا نہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک طرف تو ہمارے دیہات کے لوگوں کے پاس ملک کے مختلف حصوں میں سال میں تین مہینے سے لے کر چھ یا نو مہینے تک آمدنی فراہم کرنے کے لائق کوئی کام نہیں ہوتا اور دوسری طرف ہماری آبادی رکنے کا نام نہیں لیتی۔ برابر تیزی کے ساتھ بڑھتی چلی جارہی ہے ذیل کے نقشے سے اس بات کا کچھ اندازہ لگایا جاسکے گا کہ ۱۹۲۱ء کے بعد سے کارخانوں میں کام کرنے والوں کی تعداد کتنی بڑھی ہے:

سال	بڑے کارخانوں میں کام کرنے والوں کی تعداد	کام کرنے والی کل آبادی کے مقابلے میں ان کا تناسب فی صد	مجموعی آبادی کے مقابلے میں اس کا تناسب فی صد
۱۹۲۱ء	۱۵ لاکھ ۶۰ ہزار	۱٫۷۰	٫۵۰
۱۹۳۱ء	۱۵ " ۷۰ "	۱٫۰۲	٫۴۱
۱۹۳۹ء	۲۰ " ۳۰ "	۱٫۲۰	٫۵۴

اب اس کا مقابلہ آبادی کے اضافے سے کیجئے جو ہر سال چالیس پچاس لاکھ کے حساب سے بڑھ جاتی ہے! اس سے صاف ظاہر ہے کہ بڑے پیمانے کی صنعتیں چاہے ان کی ترقی کی رفتار کتنی ہی تیز کیوں نہ ہو نہ تو ہماری بڑھتی ہوئی آبادی کو اپنے اندر جذب کرسکتی ہیں اور نہ

فراہم کریں اور ان کی آمدنی میں اضافہ کا موجب بنیں چاہے یہ اضافہ کتنا ہی قلیل کیوں نہ ہو ذیل میں ایک نقشہ دیا جاتا ہے اس سے اچھی طرح ثابت ہو جائے گا کہ پارچہ بافی کی صنعت میں مختلف قسم کے طریقوں کو اختیار کرکے کتنا سرمایہ لگانے سے کتنے آدمیوں کو روزگار سے لگایا جاسکتا ہے۔

ذیل کا نقشہ ظاہر کرتا ہے کہ جب کپڑا بننے کا کام ایسے ابتدائی طریقے سے کیا جاتا ہے جس میں کم سرمایہ لگانے کی ضرورت ہوتی ہے تو سرمایہ کی ایک مقررہ رقم سے زیادہ مزدوروں کو کام سے لگایا جاسکتا ہے جس قدر زیادہ ترقی یافتہ طریقے اختیار کئے جاتے ہیں اتنی ہی سرمایہ فی مزدور کی رقم بڑھتی جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے پیداوار فی مزدور تو ضرور بڑھتی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ سرمایہ کی مفروضہ رقم کے ذریعے زیادہ مزدوروں کو کام سے لگانے کا امکان کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے پیداوار فی مزدور کو بڑھانے کے لئے اگر ترقی یافتہ طریقوں کا اختیار کرنا ناگزیر بھی سمجھا جائے تب بھی ابتدائی منزلوں میں ترقی یافتہ طریقوں کو اختیار کرنے کی رفتار کو ایک طرف تو سرمایہ کی کمیابی کی وجہ سے اور دوسری طرف مزدوروں کے روزگار کی مجموعی مقدار کو قائم یا اضافہ پذیر رکھنے کے خیال سے سست ہی رکھنا پڑے گا۔

پھر اس کے علاوہ بڑے پیمانے کی صنعت کی دوسری خرابیاں بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتیں مرکزیت پسند نظام دولت آفرینی میں جہاں سرمایہ کی بڑی مقدار کو صنعت میں لگانے کی ضرورت ہوتی ہے وہاں پیداوار کی تقسیم میں عدم مساوات کے پیدا ہونے کا امکان بھی بڑھ جاتا ہے اور پیداوار کے بڑے حصے سے مزدوروں کو محروم ہو جانا پڑتا ہے۔ پھر ضرورت سے زیادہ گنجان شہروں اور تنگ و تاریک مکانوں میں رہنے اور اس طریقے سے دولت آفرینی کے دوسرے خطرات اور مشکلات کو برداشت کرنے کی وجہ سے مزدوروں کو جن تکلیفوں، بیماریوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان سب کا شمار بھی اگر مصارف پیدائش میں کیا جائے تو بڑے پیمانے کی صنعت کی کفایتیں ان عدم کفایتوں کی تلافی کرنے میں غائب ہو جائیں گی۔ ذرا سا غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ بڑے پیمانے کی صنعت کی بہت سی کفایتیں درحقیقت ان امدادی کاموں کی رہین منت ہیں، جو مرکزی اور صوبے کی حکومتیں، میونسپلٹیاں اور ڈسٹرکٹ بورڈ سماج کی خدمت کی صورت میں عام رعایا سے وصول کئے ہوئے محصول کو خرچ کرکے فراہم کرتی رہتی ہیں۔ اگر ان سرکاری اداروں کے مصارف کو صنعتی مصارف میں شامل کیا جائے تو پھر چھوٹے پیمانے کی دیہی صنعتوں کے مقابلے میں بڑے پیمانے کی شہری صنعتوں کی کفایتیں بہت کم رہ جائیں گی۔

پیداوار کا طریقہ	سرمایہ فی مزدور جو لگایا گیا	پیداوار فی مزدور	پیداوار فی مزدور کے مقابلے میں سرمایہ کا تناسب	سرمایہ کی اکائی کے مقابلہ میں کام سے لگے ہوئے مزدوروں کی تعداد
جدید طرز کا کارخانہ (بڑے پیمانے پر)	بارہ سو روپے	چھ سو پچاس روپے	۱٫۹	۱
قوت محرکہ سے چلنے والا کرگھا (چھوٹا پیمانہ)	تین سو روپے	دو سو روپے	۱٫۵	۴
خود حرکی کرگھا (گھریلو صنعت)	نوے روپے	اسی روپے	۱٫۱	۱۳
دستی کرگھا (" ")	پینتیس روپے	پینتالیس روپے	٫۸	۳۴

زمین پر آبادی کا فی الحال جو دباؤ ہے اس کو کم کرسکتی ہیں۔ پھر چونکہ بڑی صنعتوں کو شہروں ہی میں شروع کیا جاسکتا ہے اس لئے اس سے دیہات کی آبادی کو زیادہ فائدہ پہنچنے کی امید نہیں کی جاسکتی۔ اتنا فائدہ البتہ ہوتا ہے کہ ان سے صنعت کے لئے کچے مال کی اور شہروں کے لئے غذا کی مانگ بڑھ جاتی ہے۔ غرض ہندوستان کی معیشت کے موجودہ پس منظر میں بڑے پیمانے کی صنعتوں کی ترقی ہمارے لئے بہت زیادہ فائدہ مند ثابت نہیں ہوسکتی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں اس قسم کی صنعتوں کی بھی ہندوستان کو ضرورت ہے خاص کر بنیادی صنعتوں کو تو بڑے پیمانے پر اور شہری ماحول ہی میں چلایا جاسکتا ہے۔ لیکن ہمارا مقصد دیہات کی بے کاری یا نیم بے کاری کو ختم کرنا ہے تو ہمیں چھوٹے اور متوسط پیمانے کی صنعتوں ہی پر زیادہ انحصار کرنا ہوگا

ہندوستان کی معیشت کی بنیادی خصوصیتیں یہ ہیں (۱) یعنی اس کے ساتھ مزدور موجود ہیں [illegible] سرمایہ موجود نہیں ہے (۲) لوگوں میں وسیع پیمانے پر بے کاری یا نیم بے کاری پائی جاتی ہے [illegible] کے مقابلہ میں سست ابتدائی طریقوں [illegible] دی جائے۔ دوسری خصوصیت اس بات کو واضح کرتی ہے کہ [illegible] سماں کی اتنا ضرورت [illegible] دیہی صنعتوں کو ترقی دینا [illegible] موقعے

بہرحال اس بات سے بہت کم لوگوں کو اختلاف ہوگا کہ ہماری سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہم متوسط پیمانے اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی (جن کے چلانے میں جہاں ممکن ہو بجلی کی طاقت سے بھی کام لیا جاسکتا ہے) حوصلہ افزائی کریں تاکہ ہمارے صنعتی نظام میں ہمارے مخصوص حالات اور مالی وسائل کے مطابق تنوع پیدا کیا جاسکے۔

ہماری دوسری ضرورت یہ ہے کہ ایسی گھریلو صنعتوں کو ترقی دی جائے جنہیں زراعت کے کام کے ساتھ شامل کیا جاسکتا ہو تاکہ کسانوں کو جس طرح آج کل سال کے بڑے حصے میں مجبوراً بیکار رہنا پڑتا ہے وہ نہ رہنا پڑے۔

ہماری تیسری ضرورت یہ ہے کہ دیہات کی موجودہ صنعتوں اور دستکاریوں کو ہم نہ بھول جائیں اور ان کو امداد دینے اور زیادہ کارگذار اور نفع بخش بنانے کی پوری کوشش کریں۔

ہم کو یہ بات بھی یاد رکھنا چاہئے کہ زراعت پیشہ آبادی کو سارے سال کے لئے کام فراہم کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ ہم یا تو ایسی صنعتوں پر خاص زور دیں جو کھیتی کی پیداوار کو مصنوعہ یا نیم مصنوعہ شکل دیتی ہیں یا ایسی ضمنی صنعتوں پر جن میں کھیتی کو نقصان پہنچائے بغیر کسان اپنے آپ کو مصروف رکھ سکتے ہیں۔ دیہی صنعتوں کے نام، ان کی ترقی کے امکانات اور ذرائع کو بیان کرنے سے پہلے ہم یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ دیہاتی اور گھریلو صنعتوں کو ترقی دینے کے سلسلے میں جو خاص خاص سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی طرف سے ایسے تجربے اور کوششیں کی جاتی رہی ہیں ان کا خلاصہ پیش کردیں۔

گلاب، رومان اور فریب

از۔ ہینری (ترجمہ از "جاہ نعم")

راونیل سیاح، آرٹسٹ اور شاعر سبھی کچھ تھا۔ رسالہ دیکھتے دیکھتے اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اس نے رسالے کو اپنے دوست سیمی براؤن کے آگے پھینک دیا جو اس کے قریب ہی کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔

"کیا ہوا، ریوی (راونیل) ؟" اس نے پوچھا۔ معلوم ہوتا ہے ناقدوں نے تمھیں آڑے ہاتھوں لیا ہے ——"

"رومان مرگیا، دفن ہوگیا ....." راونیل نے آہستہ سے کہا جب راونیل آہستہ بولتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ وہ بہت سنجیدہ ہے۔ اس نے رسالہ دوبارہ اٹھا لیا اور ورق گردانی کرنے لگا۔

"بھئی سیمی یہ تو تمھارا جیسا کاروباری آدمی بھی جو ساہوکار کے یہاں بہی کھاتے لئے جھک مارا کرتا ہے سمجھ سکتا ہے کہ آج کل ادب کی کیا درگت بن رہی ہے۔ اب دیکھو نا یہی رسالہ تمھارے سامنے ہے ......" راونیل نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا —— "کبھی اس میں پو، لاول اور وہٹ مین کی تحریریں چھپا کرتی تھیں، لیکن ذرا اس نمبر کے مضامین پر نظر ڈالو تو دیکھیں ایک مضمون جنگی جہازوں میں کوئلہ جھونکنے والوں اور ان کے ذخیروں پر ہے، دوسرا اس پر کہ کلیجی کا قیمہ کیونکر بنایا جاتا ہے، تیسرا وال اسٹریٹ میں معیاری بیکنگ پاؤڈر کے استعمال پر ایک نظم اس رنگ پر اور اس کے موجد پریزیڈنٹ کا نشانہ چوک گیا۔ ایک اور افسانہ اس عورت کی زبانی جس نے مشرق ریاستوں میں جاسوسی کے فرائض انجام دیے ایک اور فرضی قصہ جس سے موٹر اور پٹرول کی بو آتی ہے۔ البتہ اس کا عنوان ضرور دلکش ہے یعنی کیوپڈ اور شوفر۔

ایک آرٹیکل بحری فوجی نقشہ کے متعلق ہے جسے ہسپانوی آرمیڈا اور نئے اسٹیشن جزیرے کی تصویروں سے مزین بھی کیا گیا ہے۔ ایک اور کہانی اس سیاسی ایجنٹ کے متعلق ہے جس نے نفتھ ایونیو کی ایک حسین لڑکی کو اپنا گرویدۂ محبت بنا لیا اور بقیہ آنیس صفحے ایسے ہیں جن کو ایڈیٹر نے رسالہ کی اشاعت کے بارے میں اپنی مجذوب کی سی بڑ سے سیاہ کیا ہے۔ سیمی ان سب باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ رومان مرگیا، دفن ہوگیا۔ تمھیں کہو میں جھوٹ کہتا ہوں کہ نہیں؟ ——"

سیمی براؤن نہایت آرام سے چمڑے کی آرام کرسی پر بیٹھا تھا جو کھڑکی کے قریب پڑی ہوئی تھی اور اپنے دوست کے ادبی مرثیے کو سن رہا تھا۔ اس کا سوٹ گہرا بادامی رنگ کا تھا جس کی ایک جیب سے چار سگاروں کے سرے نظر آرہے تھے۔ اس کے جوتے گلابی رنگ کے تھے۔ موزے خاکستری، قمیص آسمانی جس کے کالر بہت سخت اور انڈے کی طرح سفید تھے۔ اس کے اوپر ایک سیاہ بو تھی جیسے سفید بھیڑوں پر کوئی سیاہ تیتری آکر بیٹھ گئی ہو۔ سیمی کا چہرہ جس میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی گول اور بشاش تھا اور اس کا رنگ ہلکا شہابی۔ اس کی آنکھوں میں اپنے دوست راونیل کی طرح دم بھر کے رومان کے لئے کوئی اضطراب نہ تھا۔ بے چینی نہ تھی۔

راونیل کے کمرے کی وہ کھڑکی جس کے پاس سیمی بیٹھا ہوا تھا ایک باغ میں کھلتی تھی جو پرانے درختوں اور گھنی جھاڑیوں سے بھرا ہوا تھا۔ راونیل کا مکان اس باغ کے کنارے پر تھا اور اس کا کمرہ گھر کی پہلی منزل پر —— باغ کے سامنے اینٹ کی ایک اونچی دیوار تھی جو باغ اور عام سڑک کے درمیان ایک حدِ فاصل کا کام کرتی تھی۔ راونیل کی کھڑکی کے سامنے باغ کے آخری کنارے پر ایک پرانی عمارت واقع تھی جس کا ایک حصہ پرانی بیلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ یہ مکان کیا تھا گویا ایک قلعہ تھا جو محصور ہو۔ شہر اس کے دروازوں پر چیختا، چلاتا اور ہتھیار ڈالنے کی شرائط پیش کرتا لیکن اس مکان کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی تھی۔ گرد کی تہیں کی تہیں اس کے درختوں پر جمی ہوئی تھیں۔ اس قلعہ نما مکان میں ایک سن رسیدہ مرنجان، مرنج شریف آدمی رہتا تھا جسے اپنے اس پرانے گھر سے بڑی محبت تھی اور جسے وہ کسی قیمت پر بھی فروخت کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ یہ تھا محصور قلعہ کا رومان ——

سیمی براؤن ہر ہفتہ تین چار مرتبہ راونیل کے یہاں آیا کرتا تھا وہ "شعراء کے کلب" کا ممبر تھا اور خود اس کا باپ ایک خوش گو شاعر تھا۔ لیکن اس میں کاروبار کی وجہ سے کچھ سوقیت آگئی تھی۔ اسے اس بات کا کوئی افسوس نہیں تھا کہ موجودہ دور رومان سے محروم ہے اسے تو صرف اپنے معاملات سے اور اپنی گھڑی کی ٹک ٹک سے جس کا نغمہ اس کی روح میں رچا ہوا تھا دلچسپی تھی۔ راونیل کی کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس بیٹھنا اور اس سے باغ کا نظارہ کرنا اس کا ..... مشغلہ تھا۔ اور راونیل کو اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ سیمی اس کی گفتگو غور سے سنتا اور اس میں دلچسپی لیتا تھا اور پھر ایک ساہوکار کا کلرک ہونے کی وجہ سے وہ جہالت اور علمیت کا اس قدر مکمل نمونہ تھا راونیل اس کی صحبت میں اپنی کسرِ شان نہیں سمجھتا تھا۔

"بھئی ہم تو یہ جانتے ہیں کہ" سیمی نے کاروباری اختصار سے کہا۔ "اس رسالہ نے تمھاری نظموں کے چھاپنے سے انکار کردیا ہوگا۔ اسی کا یہ سارا غصہ ہے"

"جی یہ بھی کوئی وال اسٹریٹ میں زنانہ کلب کی صدارت کا انتخاب ہے جس میں آپ کا اندازہ صحیح نکلے۔" راونیل نے نہایت اطمینان سے جواب دیا "آپ کی دعا سے اسی نمبر میں میری ایک نظم موجود ہے ——"

"اچھا تو پھر پڑھ کر سناؤ ......" سیمی نے اپنے پائپ کے دھوئیں کے بادلوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

راونیل مندرجہ ذیل نظم رسالے سے پڑھ کر سنائی۔

"چار گلاب کے پھول"

"ایک گلاب کا پھول .... جسے میں نے تمھارے بالوں میں لگایا۔

(سفید پھول —— جو محبت کا اظہار تھا)

اور دوسرا پھول ..... جسے تم نے اپنے سینہ پر لگایا

(سرخ پھول —— آغازِ عشق کی نشانی)

ایک اور پھول ..... جسے تم نے گلاب کی شاخ سے توڑا۔

(زرد پھول —— جس کے معنی تھے اقرار)

اور ایک وہ پھول ..... جو تم نے مجھے دیا۔

(جس میں میرے لئے تمھاری یاد کے کانٹے تھے۔)

"بہت خوب، بہت خوب، ماشاءاللہ" سیمی نے تعریف کی۔

"ابھی تو پانچ بند اور باقی ہیں ——" راونیل نے زیرلب تبسم کے ساتھ کہا —— "اور ظاہر ہے کہ ہر بند کے خاتمہ پر توقف ضروری ہے ......"

"یقیناً ......" سیمی بولا —— "لیکن ریوی اس وقت تو رہنے ہی دو۔ پھر سن لیں گے۔ ویسے تم کہو تو سن لوں کہیں تم برا مان جاؤ۔ بھئی تم تو جانتے ہو کہ میں شاعری کے معاملے میں بالکل سپاٹ ہوں ...."

راونیل نے ایک آہِ سرد کھینچی اور رسالہ رکھ دیا۔

"کیوں ٹھیک ہے نا" سیمی نے خوش ہوکر کہا "پھر کبھی سہی، اچھا اب چلتا ہوں۔ ۵ بجے مجھے ایک صاحب سے ملنا ہے" اور یہ کہہ کر اس نے کھڑکی سے باہر سرسبز سایہ دار باغ پر ایک جھلملاتی ہوئی نظر ڈالی اور سیٹی بجاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

دوسرے دن سہ پہر کو راونیل اپنے نئے سانیٹ کے ایک ٹکڑے مصرعے میں زیادہ روانی پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا، اس کی نظر قلعہ نما مکان کے دریچے پر پڑی جو کھلا ہوا تھا کیا دیکھتا ہے کہ دریچے میں اس کے رومان اور شاعری کا ایک حسین مجسمہ ایستادہ ہے۔ پری لباس میں ملبوس کھڑا ہے اسے ایک لمحہ کو معلوم ہوا کہ اس کے خواب مجسم ہوگئے ہیں یہ ایک حسین لڑکی تھی شبنم کی طرح تر و تازہ کسی لچکیلی بیل کی طرح نازک اور اس پھول کی طرح خوبصورت جس کی تعریف میں شاعر رطب اللسان رہتے ہیں۔ راونیل نے آج اسے پہلی مرتبہ دیکھا وہ کچھ دیر دریچہ میں کھڑی رہی اور پھر ایک جھپاکے کے ساتھ غائب ہوگئی۔ راونیل کے کانوں تک کسی گیت کے میٹھے بول آئے اور پھر یہ بول ٹریفک کی آمد و رفت کی آوازوں میں گم ہوگئے لیکن اس ایک لمحے کے منظر نے راونیل کی دنیا ہی بدل دی تھی۔ اب اس بیل گاڑیوں کے پہیوں سے جو اس کے گھر کے پاس سے گزرتی تھیں محبت کا نغمہ نکلتا تھا۔ اخبار بیچنے والے لڑکے کی چیخیں طائرانِ خوش الحان کی نواسنجیاں معلوم ہوتی تھیں۔ باغ کوئی حسین تفریح گاہ معلوم ہوتا تھا اور ...... اس کے دروازے پر کھڑا ہوا دربان گویا ایک مرزم خور دیو تھا اور خود راونیل وہ بہادر شہزادہ جو اس پر حملے کے لئے کیل کانٹے سے لیس ہو —— جب "وہ" نظر آئی تو بجائے خود رومان کا مرجع تھی اور جب غائب ہوگئی تو اس کی کھڑکی، اس کی دیوار دیوار کی اینٹیں۔ باغ، باغ کے درخت سب رومانی کہر میں لپٹے ہوئے دکھائی دیتے۔

دوسرے دن چار بجے راونیل نے اپنی کھڑکی سے دوبارہ سرزمینِ رومان کی سمت نگاہ ڈالی اور اس نے دیکھا کہ سامنے کے دریچے میں چار گلدان رکھے ہوئے ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں ایک بڑا گلاب کا پھول کھلا ہوا ہے، جوں ہی راونیل نے اسے گھور کر دیکھا وہ پھولوں پر جھک سی گئی۔ گویا وہ انھیں اس طرح سجانے سے شرما رہی ہو۔ لیکن جب اس کی نظریں راونیل پر پڑیں تو وہ ان کو وہیں چھوڑ کر چلی گئی۔

معلوم ہوتا ہے یہ گل دان خاص اشارے ہیں۔ وہ دل میں سوچنے لگا کہ اگر اس نے ان اشاروں کو نہ سمجھا تو یہ اس کی انتہائی نالائقی اور نااہلی ہوگی۔ یقیناً اس نے اس کی نظم "چار گلاب" پڑھی ہوگی، اور اس سے متاثر ہوکر اس نے نظم کا جواب ان گل دانوں سے دیا ہے۔ یقیناً وہ جانتی ہوگی کہ امریکا کا سب سے بڑا رومانی شاعر اس کا پڑوسی ہے اور وہ سامنے کے مکان میں رہتا ہے اور یہ بھی اغلب ہے

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

ترکی

پچھلے پچیس سال میں

(۲)

ترکی کی نئی جمہوریہ نے معاشی حیثیت سے ملک کو صرف دہقانوں اور زراعت پیشہ لوگوں کا ملک پایا جہاں عملاً کارخانوں کا کہیں وجود نہ تھا۔ قدرت نے معدنی دولت دے رکھی تھی لیکن نہ کبھی ان سے کام لیا گیا اور نہ کبھی ان کی تحقیق و تفتیش کی گئی۔ تجارتی میدان میں غیر ملکیوں نے ترکوں کو پیچھے دھکیل دیا تھا اور خود بڑے بڑے شہروں میں کاروبار پر اپنا اجارہ قائم کر رکھا تھا۔ اسی طرح رسل و رسائل و ذرائع آمد و رفت بھی بڑی افسوسناک حد تک کم تھے۔ ملکی یہودیوں اور عیسائیوں کے پاس تھوڑا بہت سرمایہ تھا۔ لیکن پرجوش قوم پرست کب اس کی اجازت دے سکتے تھے کہ غیر معتمد اقلیتیں حکومت سے ترقی کے کاموں سے فائدہ اٹھائیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عثمانی خلافت کے زمانے میں جو قرضے لئے گئے تھے اور اگرچہ وہ اب ختم ہو چکے تھے۔ لیکن اب تک ان کی مثال لوگوں کے سامنے تھی۔ اس لئے اب یہ لوگ ان اقلیتوں سے بھی گھبراتے تھے کہ مبادا یہ ترکی کو پھر مالی مشکلوں میں نہ الجھا دیں۔ ان قوم پرستوں کا کہنا تھا کہ ترکی سرمایہ اور ترکی محنت ہی سے کچھ ہو سکتا ہے، دوسروں سے ترقی کی امید رکھنا بے کار ہے

جمہوری حکومت نے برسر اقتدار آتے ہی اصلاح و ترقی کے کام شروع کر دئے۔ اس کے لئے ضرورت تھی سرمائے کی اور سرمائے کا فقدان شروع ہی سے تھا اس لئے اس نے ملکی قرضوں کے لئے اپیل کی، اور اس طرح مختصر سا سرمایہ فراہم کر لیا اور اس سے ملک میں چھوٹے پیمانے پر کارخانوں کی ابتدا کر دی گئی۔ ملک کی ریلوں پر غیر ملکیوں کا اجارہ تھا۔ حکومت نے ان کو ان کے مالکوں سے خرید کر مزید لائنیں بنائیں اور ضروری اصلاحات کیں، چنانچہ اب ریلیں زیادہ مستعدی اور پابندی وقت کے ساتھ چلنے لگیں۔ حکومت نے اپنے سرمائے سے بنک قائم کئے اور ان سے بھی ملکی حالت سنوارنے میں بہت مدد ملی، ان بنکوں نے اپنے سرمائے سے کانوں، لکڑی چیرنے کے کارخانے کپڑے اور فولاد کے کارخانے اور اسی طرح کے کئی اور کارخانے قائم کئے، اور ان کو اپنے انتظام اور سرمایے سے چلاتے رہے۔ ملکی صنعت کو فروغ دینے اور ابتدائی کاموں کو مقابلے سے بچانے کے لئے حکومت نے درآمد و برآمد پر بھاری ٹیکس عاید کر کے کارخانوں کے تحفظ کا پورا انتظام کیا، اسی طرح غیر ملکی تجارت میں دشواری اور پیچیدگی پیدا کر کے ملکی تاجروں اور اندرونی کاروبار کو پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کئے، معاشی مسئلہ کی طرف حکومت نے جو زیادہ توجہ دی اس سے نہ صرف ملکی حالت بہتر ہوگئی بلکہ قوت میں بھی اضافہ ہوا اور دولت بھی خوب بڑھی اور اس طرح سے حکومت اپنے حکام کی تنخواہوں میں قابل قدر اضافہ کر سکی جس سے وہ حکومت کے پکے وفادار ہو گئے کیونکہ جن کاموں کی مہم ان کی سپرد کی گئی تھی۔ اکثر غیر نفع بخش اور بسا اوقات خسارہ کا باعث ہو جاتے تھے۔ مثلاً ترکی کا فولاد باوجود ملکی ہونے کے امریکا کے فولاد کے مقابلے میں کبھی سستا نہ بک پاتا اور جو امریکا کا فولاد محاصل باربرداری، اور چنگی وغیرہ ادا کر کے بھی ترکی فولاد کے مقابلے میں سستا فروخت ہوتا، حکومت کو اپنے سرمائے سے کاروبار چلانے میں مادی نقصان ضرور ہوا لیکن اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ کاروبار کے اور صنعتی کاموں کی خاصی تعلیم اور اچھا تجربہ ہو گیا۔

بہت سے ترکوں اور غیر ملکوں کا خیال ہے کہ ترکی معدنی وسائل کے اعتبار سے بہت مالدار ہے اور اگر کوشش کی جائے تو اس سلسلے میں یہاں بہت ترقی ہو سکتی ہے۔ اسی خیال سے تیل کی کھدائی کی گئی لیکن نتیجہ صفر رہا اور تیل کا ایک قطرہ بھی نہ نکل سکا۔ ہاں بحر اسود کے ساحل پر آبنائے باسفورس کے قریب دال کے کوئلہ کا ایک مختصر سا میدان ہے۔ اسی طرح سے پتھر کا بھورے رنگ کا کچا کوئلہ بہت سے علاقوں میں پایا جاتا ہے لیکن ان کو کام میں لانے کے انتظامات بالکل ابتدائی حالت میں ہیں۔ اسی طرح کچا فولاد بھی خاصی بڑی مقدار میں پایا جاتا ہے۔ لیکن وہ کوئلے کے کانوں سے اتنی دور ہے کہ اس کو کام میں لانا مشکل ہو رہا ہے۔ کچا کرو م ترکی کے بہت سے علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ اور جنگ کے زمانے میں جب قیمتیں خوب چڑھی ہوئی تھیں، بڑی تعداد میں برآمد بھی کیا جاتا تھا۔ آج کل تھوڑا بہت تانبا بھی نکلتا ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سی کارآمد کانوں کے خزانوں کا علم ہو چکا ہے۔ پن بجلی کے بھی معتدبہ وسیلے ملک میں ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے وہ ملک کے آباد حصوں سے اتنی دور ہیں کہ ان سے استفادہ نہیں کیا جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک ترکی کی معدنی اور قدرتی ذرائع کا کسی کو اچھی طرح علم نہیں ہو سکا ہے کہ بڑے پیمانے پر ترکی کی صنعتی ترقی کے امکانات پر غور کیا جا سکے۔

ترکی کے زراعتی وسائل اچھی طرح معلوم نہیں زراعتی پیداوار میں ترکی کسی کا دست نگر نہیں ہے بلکہ وہ خود کفیل ملک ہے، مخصوص پیداواریں مثلاً تمباکو اور خشک میوے خاصی مقدار میں باہر کے ملکوں کو برآمد کئے جاتے ہیں، چونکہ کسان ہی ملک کی دولت کے اہم پیدا کرنے والے ہیں۔ اس لئے جب کسی حکومت کی کامیابی کا اندازہ لگانا ہوگا تو ضروری ہوگا کہ ہم یہ معلوم کریں کہ حکومت نے ملک کے اس اہم طبقے کو کس قدر متاثر کیا ہے؟ اور اس نے اپنے وجود سے ان کو کس قدر فائدہ پہنچایا ہے؟ موجودہ ترکی حکومت نے ملک کے اس طبقے کے لئے جو کام کیا ہے وہ بہت قابل قدر اور لائق ستائش ہے۔ اس حکومت نے ان کو امن و سکون کی وہ دولت عطا کی ہے جس کے لئے وہ پشتہا پشت سے ترستے رہے ہیں اسی طرح امن عامہ اور تحفظ کا وہ انتظام کیا ہے جو اس سے پہلے ترکی کسانوں کو کبھی نصیب نہ ہوئی تھی اور سب سے بڑا کارنامہ اس حکومت کا یہ ہے کہ اس نے زمین کے لگان کی ادائیگی کا طریقہ کسانوں کے حسب منشار اور ان کی افادیت کے مدنظر بہت معقول کر دیا ہے، عثمانی سلطنت کے زمانے میں لگان جنس کی شکل میں لیا جاتا تھا جو کسانوں پر شاق گذرتا تھا۔ اب حکومت نے نقدی کی شکل میں لگان لینے کا طریقہ رائج کر دیا ہے نئی ریلوں اور روز افزوں باربرداری کے موٹروں کی بدولت ترکوں کے حسب منشا بازار کھلتے جا رہے ہیں اور حکومت کی کوششوں سے زیادہ سے زیادہ زمینوں پر کاشت کی جا رہی ہے جس سے پیداوار میں خاصی ترقی ہو رہی ہے۔ کسانوں کو نئے بیج بونے کی ترغیب دینے، بیجوں کو اچھا بنانے اور زراعت کے نئے طریقوں کو رواج دینے کے لئے حکومت نے جابجا نمونے کے زراعتی فارم قائم کر دئے ہیں کسانوں کی قدامت پسندی، جہالت اور لاعلمی، اور افسران متعلقہ کے شکوک و شبہات کی وجہ سے ابھی تک اس میں نمایاں کامیابی نہیں ہو سکی ہے لیکن اس کے باوجود پیداوار میں ترقی ہے اور روز افزوں اس سلسلے میں اور بھی ترقیوں کے امکانات تھے، لیکن دسمبر ۱۹۴۰ء میں حملے کی دھمکی کے ذریعے ترکی کو اپنی فوجوں کو ایک جگہ مجتمع کر دینا پڑا۔ اس کا اثر زراعت کے علاوہ دوسری صنعتوں پر بھی بہت پڑا، اور پورے نظام میں گڑبڑ ہوگئی، اس قسم کے خطرات پہلے تو نازیوں سے تھے اور اب وہ نہیں ہیں تو روس نے ان کی جگہ لے لی ہے اور فوجوں کے بل پر ترکی کی بہترین پیداوار پر قبضہ کر لینا چاہتا ہے، یہ صورت ترکی کے لئے بہت خطرناک ہے۔ اسی لئے اس نے اپنی فوجوں کو مدافعت کے لئے جمع کر دیا ہے جس سے پیداوارش کے کام کرنے والوں کی سخت کمی ہو گئی ہے اس فوج کو منتشر اس لئے نہیں کیا جا سکتا ہے کہ معلوم نہیں کب روسی فوجیں اچانک حملہ کر دیں، اور ترکی میں رسل و رسائل کی آسانیاں اتنی نہیں ہیں کہ جب ضرورت ہوئی آسانی کے ساتھ تھوڑے وقت میں فوجوں کو جمع کر لیا جائے۔ نوجوان اور کام کرنے والوں کے فوج میں چلے جانے کی وجہ سے پیداوار میں خاصی کمی ہوگئی ہے۔ باقی ماندہ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں نے اپنی سی کوششیں کی ہیں اور کر رہے ہیں لیکن ان سے وہ کمی پوری نہیں کی جا سکتی جو ہو چکی ہے، اور روس کا دباؤ برابر بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ جو ترکی کی معاشی زندگی کو گھن کی طرح دھیرے دھیرے کھا رہا ہے۔

ترکی کی انسانی قوت بہت خوش آیند ہے، گذشتہ پچیس سال کے عرصے میں ترکی کے ہر طبقے اور ہر جنس نے یہ بات اچھی طرح واضح کر دی ہے کہ موجودہ صنعتی طرز معاشرت کی اہلیت میں وہ کسی سے کم نہیں ہیں۔ مزید تعلیم کا مطالبہ اور حکومت کی اس سلسلے میں کوششیں بہت کامیاب رہی ہیں اور تعلیم میں بہت موثر ترقی ہوئی ہے۔ ایک طرف تو صنعتی تربیت کی طرف بہت زور دیا جا رہا ہے، دوسری طرف اس کی بھی کوشش کی جا رہی ہے کہ کاشتکار اپنی زمینیں نہ چھوڑیں، صدیوں سے جنگوں میں جو جانی نقصان ہو رہا تھا اور جس سے گاؤں کے گاؤں تباہ ہو جاتے تھے چونکہ اب ان کا سلسلہ بالکل موقوف ہو گیا ہے اور اس کے علاوہ حکومت نے صحت عامہ کے لئے بہت اچھے انتظامات کر دئے ہیں اس لئے آبادی میں خاصا اضافہ ہوا اور اب مجموعی تعداد تقریباً ایک کروڑ ۹۰ لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔

ترکی میں ابھی تک پوری طرح فارغ البالی نہیں پیدا ہو سکی ہے، کیونکہ اول تو ترکی کے اکثر حصے ناہموار اور پتھریلے ہیں۔ اس کے علاوہ خاصا بڑا حصہ ریتیلا ہے، اور پھر جو خطے اور وادیاں زرخیز ہیں وہ بہت ہی گنجان آباد ہیں ملک کے اکثر خطوں میں بغیر پانی کے کاشت ہوتی ہے اور جانوروں کو چرایا جاتا ہے، اور ان علاقوں میں آبادی چھدری ہونے کے باوجود بھی صرف گذارے کے لائق ہی پیداوار ہوتی ہے۔ نہری آب پاشی کے ذریعے مزید زمینوں پر کاشت ہو سکتی

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

اسٹالین کی ایک جھلک

شیخ حبیب اللہ

اسٹالین کی پسند عجیب ہے اور طبیعت نرالی ہے۔ وہ ہر جدت کا دشمن ہے، اور قدیم طرز تعمیر اور قدیم ادب کا بہت دل دادہ ہے۔ اس کو نقاشی سے بہت کم دلچسپی ہے۔ یہ ہے ایک فرانسیسی جو یدے کی رائے روس کے لیڈر اسٹالین کے متعلق۔

افسانہ نگاروں میں وہ پشکن اور چیخوف کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہے۔ اس کا محبوب جارجی مصنف بارھویں صدی میں گذرا ہے جس نے "چوٹا رستاوی" لکھی تھی۔ اسٹالین کو غیر ملکی مصنفین سے بہت کم دلچسپی ہے پھر بھی اُسے ایمیل زولا کے ناول پڑھنا، مسٹر پیناف پیرس، اور ہیوگو، ای فرایل اور ہیلنگ وے کی "فور مین ... لیک تہ دریا" پسند ہیں۔ ان کے علاوہ ڈکنس اور شیکسپیر کے شہ پاروں سے بھی اسٹالین محفوظ ہوتا ہے۔

اسٹالین کے کتب خانے میں سنسنی خیز جاسوسی قصے کہانیوں کی کتابیں بھی ملتی ہیں لیکن عموماً یہ اُسے پڑھی ہوتی ہیں وہ کہتا ہے کہ "مجھے کتاب ختم کرنے سے پہلے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ قاتل کون ہوگا"۔ ایسے ساز جن میں فنی باریکیاں نہ ہوں اسٹالین کو بہت پسند ہیں، ایک دفعہ اُسے ایک محفل سرود میں مدعو کیا گیا لیکن وہ تھوڑی دیر کے بعد وہاں سے صرف اس وجہ سے اُٹھ کر چلا آیا کہ وہ سازکی لے کو سیٹی پر نہ بجا سکتا تھا۔ طبیعت کی اسی افتاد کی وجہ سے وہ روسی اوپرا کو بہت پسند کرتا ہے، حالانکہ لینن کو ان سے بے حد نفرت تھی۔

موجودہ زمانے کے گویوں، سازندوں اور ڈرامانگاروں کا وہ بہت مخالف ہے۔ اسے جاز بھی مرغوب نہیں، لیکن بیلے سے لگاؤ ہے۔

اسٹالین کو صرف رومان پسند مصوروں کی تصویریں بھاتی ہیں۔ پکاسو جیسا مصور بھی اسٹالین کی تصویر بنائے تو اسے وہ بالکل پسند نہیں کرتا اور اس کو غارت گری کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ ہٹلر کی طرح اسٹالین کو فن تعمیر اور آرائش بلدہ کے کاموں سے خاصی دلچسپی ہے لیکن لینن کے برخلاف وہ جدید فن تعمیر کو نہیں پسند کرتا۔

اسٹالین نے بعض ایسے ڈراموں پر سے جو قانوناً ممنوع تھے، پابندیاں ہٹا دی ہیں، اسی قسم کا ایک ڈراما تھا جس میں باغیانہ خیالات کا اظہار تھا، اور خاندان زار کی تعریف کی گئی تھی۔ ۱۹۳۶ء میں اس کا دکھانا خلاف قانون قرار دے دیا گیا تھا۔ لیکن اسٹالین نے اس پر سے پابندی اُٹھالی، اور اس کو دوبارہ تیار کرنے کا حکم دے دیا۔

کریملن میں اسٹالین کے تین خوب صورت کمرے ہیں ان میں سے ایک اس کے کھانے کے لئے مخصوص ہے غذا میں اس کو چاول گوشت اور لکڑی کی آگ پر تیار کیا ہوا کباب بے حد پسند ہے، اسٹالین شراب کا بہت عادی ہے اور ووڈکا کے مقابلے میں ارغوانی شراب کو زیادہ شوق سے پیتا ہے۔ تمباکو نوشی کی بھی اسے سخت عادت ہے، اور روزانہ سخت قسم کے تمباکو کے چالیس پائپ پی جاتا ہے۔ کبھی کبھار سگریٹ کے بھی دو ایک کش لگا لیتا ہے۔ لیکن سگار پیتے ہوئے آج تک اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ مسٹر چرچل نے ایک مرتبہ اُسے سگار پیش کیا، لیکن اس نے لینے سے انکار کر دیا۔

اسے تاش سے تو نفرت ہے، لیکن شطرنج سے خاصی دلچسپی ہے۔ اس کا محبوب ترین مشغلہ گھوڑے کی سواری ہے جب وہ اپنے دیہاتی مکان پر جو ماسکو سے ۲۲ میل دور ہے، رہتا ہے تو روزانہ صبح کو پستول اور رائفل کے نشانے کی مشق کرتا ہے۔

لباس کے معاملے میں اسٹالین کی بے پروائی مشہور ہے۔ ہاں ادھر کچھ دنوں سے اس میں کمی ہو رہی ہے۔ چنانچہ ماسکو کانفرنس میں اس کے کپڑے نسبتاً اچھے تھے۔ آج کل وہ فوجی وردی میں رہتا ہے جس پر صرف "ہیرو آف دی سوویٹ یونین" کا تمغا لگا رہتا ہے۔

عمر کے ساتھ ساتھ اسٹالین کی جسمانی کمزوری بھی اب بڑھتی جا رہی ہے۔ بال بالکل سفید ہو گئے ہیں اور وزن بھی بارہ پونڈ کم ہو گیا ہے۔ اب کی دفعہ زندگی میں پہلی بار اس نے اپنی مونچھیں ترشوائی ہیں۔ وہ روزانہ بارہ گھنٹے کام کرتا ہے، اس کے رفیق اور بے تکلف دوست بہت کم ہیں۔ مولوٹوف سے اس کے تعلقات صرف کاروباری قسم کے ہیں۔ کہتے ہیں کہ صرف مارشل ووروشیلوف سے اس کی بے تکلفی ہے۔ عام سیاسی لوگوں کے برخلاف وہ ہمیشہ سکون اور اطمینان قلب کے ساتھ رہتا ہے۔ اس پر افسردگی یا شادمانی کے اثرات بہت کم پڑتے ہیں۔

سینما سے اُسے مطلق دلچسپی نہیں اور باوجود اس کے کہ اب سینما کو فنون لطیفہ میں شمار کیا جاتا ہے اسٹالین کو اس کا اعتراف ہے کہ اس سے اُسے نفرت ہے۔

(ترجمہ)

گلاب، رومان اور فریب (بسلسلہ ۹)

کہ اس نے مختلف رسالوں میں اس کی تصویر دیکھی ہو۔ یہ نازک لطیف رنگین، خوب صورت اور شاعرانہ پیغام کسی طرح بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

راونیل نے اس ذہنی شاعری کے بعد جب دوبارہ دریچے کو دیکھا تو اس کو ان چار بڑے گلدانوں کے پاس ایک چھوٹا سا گلدان اور نظر آیا جس میں ایک چھوٹا سا پودا لگا ہوا تھا بغیر کسی شرم کے احساس کے اس نے اپنی دوربین اُٹھائی اور اپنی کھڑکی کے پردے سے لگا کر اسے غور سے دیکھا "او ہو! یہ گل ریحاں کا پودا ہے" فوراً شاعرانہ فراست کے اشارے پر اس نے الماری سے ایک کتاب نکالی اور اس میں "پھولوں کی زبان" کا باب نکال کر پڑھنے لگا۔

"گل ریحاں ——— ملاقات کی اُمید" وہ فرط مسرت سے اچھل پڑا ——— "دیکھا! رومانی تخیل کے پس منظر میں ہمیشہ ایک حقیقت ہوتی ہے۔ اب اگر وہ دوبارہ آئی تو وہ ضرور اپنے ساتھ کوئی ایسی چیز لائے گی جیسے سوئیٹر بننے کا سامان وغیرہ جس کی وجہ سے وہ دیر تک دریچے میں بیٹھ سکے اور وہ اس کا نظارہ کرتا رہے۔

یہ سوچ کر راونیل مسکرایا۔ عاشق اس وقت مسکراتا ہے جب وہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے برعکس محبت کرنے والی عورت کامیابی کے بعد مسکرانا بند کر دیتی ہے وہ ایک معرکہ سر کرتا ہے اور وہ ایک دوسرا میدان کارزار گرم کرتی ہے۔ راونیل سوچنے لگا کہ اس کے دیکھنے کے لئے چار گلابی پھولوں کو دریچوں میں سجانا کتنا نادر خیال ہے۔ وہ یقیناً ایک شاعرانہ روح کی حامل ہے۔ اب صرف ملاقات کی تکمیل باقی ہے۔

راونیل ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ دروازوں کے بند ہونے اور کھلنے اور سیٹی بجانے کی آواز آئی۔ یہ سیمی براؤن کی آمد کا پیش خیمہ تھا۔

راونیل دوبارہ مسکرایا۔ شاید سیمی براؤن اس کے لئے اس وقت عہد وسطیٰ کا کوئی رومانی کیریکٹر معلوم ہو رہا تھا اس کے فیشن ایبل کپڑے۔ اس کا گول چہرہ، اس کی سادہ زبان اور اس کی ناقابل فہم کثیف راونیل کے لئے یہ سب چیزیں رومان انگیز تھیں۔

سیمی کھڑکی کے قریب والی اپنی پرانی نشست پر بیٹھا اور اپنی پرانی عادت کے مطابق باغ کا نظارہ کرنے لگا۔ پھر اس نے اپنی گھڑی کو دیکھا اور فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔ گویا اسے کوئی بات یاد آ گئی۔

"اُف وہ ———" اس نے کہا۔ "چار بج کر بیس منٹ۔ اب میں ایک لمحہ نہیں ٹھیر سکتا ساڑھے چار بجے مجھے ایک شخص سے ملنا ہے"۔

"جب تمہیں اس وقت ملنا تھا تو یہاں آنے کی ایسی کیا ضرورت تھی؟" راونیل مسکراتے ہوئے گویا سیمی کی بدحواسی پر طنز کیا" میں تو سمجھتا تھا کہ تم کاروباری لوگ اپنے گھنٹوں اور لمحوں کا حساب زیادہ باقاعدہ رکھتے ہو، مگر آج معلوم ہوا کہ اس معاملے میں بھی تم بس بالکل بے خیال کے لوگ ہو ———"

سیمی جاتے جاتے دروازے میں رکا اور یک لخت اس کا چہرہ گلابی سے سفید ہو گیا۔

"بھئی یہ بات ہے ———" اس نے معذرت کے ساتھ کہا "کہ میں جب تک یہاں نہیں آیا تھا مجھے خود اس بات کا علم نہیں تھا کہ مجھے ملاقات کرنی ہے ——— اب یار تم سے کیا چھپانا۔ قصہ یہ ہے کہ ربوی کے سامنے کے پرانے مکان میں ایک خوب صورت لڑکی رہتی ہے اور میں اس پر جان دیتا ہوں، اور اب ہم دونوں ایک دوسرے سے وابستہ ہو چکے ہیں۔ میرا مطلب ہے رشتہ محبت سے۔ اس کا باپ انکار کرتا ہے۔ مگر ہمیں کب اس کھوسٹ کی پروا ہے۔ وہ بھی مجھ پر جان چھڑکتی ہے۔ میں ایڈمنڈ سے دریچے کو یہاں تمہاری کھڑکی سے دیکھ سکتا ہوں۔ جب کبھی وہ خرید و فروخت کے لئے بازار جاتی ہے تو مجھے اشارہ کر دیتی ہے اور میں اس سے وہاں مل لیتا ہوں۔۔ ...... آج ساڑھے چار بجے ملاقات ہے۔ مجھے چاہئے تھا کہ یہ راز تم سے ذرا پہلے کہہ دیتا لیکن خیر ایک ہی بات ہے۔ تم میرے دوست ہو، اور دوست سے دیر کیا اور سویر کیا ——— اچھا بھئی اب چلتا ہوں خدا حافظ ———"

"اچھا.......... لیکن کم بخت یہ تو بتاتا جا کہ اس نے تجھے اشارہ کیسے کیا؟" راونیل نے جس کے چہرے کی مسکراہٹ اب رخصت ہو چکی تھی جلدی سے پوچھا

"گلاب کے پھولوں سے ———" سیمی نے جواب دیا "چار گلاب کے پھولوں کا مطلب چار بجے۔ ہما ڈوسے کے نکڑ پر ———"

"اور گل ریحاں کا مطلب" راونیل نے بھاگتے ہوئے رومان کا دامن پکڑنے کی کوشش کی۔

"گل ریحاں سے مراد آدھا گھنٹہ ———" سیمی ہال کے آخری حصے سے چلایا ——— "اچھا پھر ملاقات ہوگی ———"

ادارۂ تحریر
تاریخ اشاعت: یکم، ۸، ۱۶، ۲۴
ڈاکٹر سید عابد حسین، صالحہ عابد حسین، عبد الحلیم ندوی
چندہ: سالانہ ۵ر ششماہی ۳ر

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

دیکھئے اور عبرت حاصل کیجیے۔

(۱) حیدرآباد کے چند ممتاز شہری اور سابق سرکاری ملازمین حکومت نظام کو اس بات کا مشورہ دیتے ہیں کہ اسے ہندوستانی یونین میں شریک ہو جانا چاہیے اور رضاکاروں کی بد لگامیوں کو روکنا چاہیے۔ قطع نظر اس کے کہ یہ رائے اپنی جگہ پر مناسب ہے، ہر شخص کو اپنے ملک یا ریاست کے اہم سیاسی معاملات میں اظہار رائے کا صرف حق ہی حاصل نہیں بلکہ وہ اس کا فرض بھی ہے۔ لیکن اس اظہار خیال کی پاداش میں ان سے جواب طلب کیا جاتا ہے، ان کی پنشن بند کرنے کی دھمکی دی جاتی ہے، اور ان کو خطرناک نتائج کا خوف دلایا جاتا ہے۔ یہ جمہوریت یا شخصی حکومت نہیں فاشزم ہے!

(۲) پاکستان میں ابھی تک کوئی ایسی منظم جماعت قائم نہیں ہوئی جو حزب مخالف کی حیثیت رکھتی ہو اور بے لاگ تنقید کی ہمت رکھتی ہے۔ لیکن وہاں بعض ایسے ادبی اور سیاسی گروہ اور افراد ہیں جو وطن دوستی اور ارکین حکومت کی جا و بے جا تائید میں فرق کرتے ہیں اور ہر وقت ان کی شان میں قصیدہ پڑھنے کے بجائے تنقید کا فرض ادا کرنا چاہتے ہیں لیکن نشۂ قوت ایک خطرناک چیز ہے۔ اور نئے حکام اپنی شان میں تنقید کی گستاخی پسند نہیں کرتے۔ چنانچہ حال ہی میں حکومت نے نوائے وقت، نقوش، سویرا تین سالوں کی زبان بندی کر دی ہے۔ کیونکہ ان کی اشاعت "مفاد حکومت" کے خلاف ہے! ان میں سے پہلا ایک سیاسی اخبار ہے۔ باقی دونوں ادبی رسالے ہیں اس قسم کا اقدام جذبات اور فکر کی آزادی کو سلب کرنا چاہتا ہے، خوف کی ذہنیت اور عاقبت ناشناسی کا ثبوت ہے، اور یہ کسی ملک کے مستقبل کے لئے اچھا شگون نہیں ہے۔ تنقید کو برداشت کر سکنا تہذیب اور خود اعتمادی کی علامت ہے۔ اس کا گلا گھونٹنا سیاسی اور اخلاقی کمزوری کا نشان ہے!

(۳) خود ہمارے ملک میں بھی اس قسم کے رجحانات پائے جاتے ہیں جن کی روک تھام اشد ضروری ہے۔ اس کی بھی ایک تازہ ترین مثال سن لیجیے جو المناک بھی ہے اور مضحک بھی۔ خواجہ احمد عباس کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ گذشتہ پندرہ سال سے ان کا شغل اخبار نویسی ہے اور ایک جرنلسٹ اور ادیب کی حیثیت سے انھوں نے ملک میں اپنے لئے ایک ممتاز مقام پیدا کر لیا ہے جس وقت مسلمانوں کی اکثریت فرقہ پرستی میں گرفتار تھی انھوں نے اپنی قوم پرستی اور رواداری کو بے داغ رکھا۔ کم لوگوں نے قلم کے ذریعے باہمی دوستی اور مفاہمت کی خاطر اس قدر خلوص کے ساتھ جہاد کیا ہوگا یا خود مسلمانوں کی غلط راہ روی پر اس سختی کے ساتھ تنقید کی ہوگی جس قدر احمد عباس نے........ انھوں نے حال ہی میں ایک کہانی لکھی تھی جس کا عنوان تھا "سردار جی" جس میں دکھایا گیا تھا کہ کس طرح ایک سکھ اپنی جان پر کھیل کر فساد کے زمانے میں ایک ایسے تنگ خیال مسلمان کی جان بچاتا ہے جس کے دل میں سکھوں کی طرف سے بغض اور عناد بھرا ہے اور اس ایثار کی بدولت اس مسلمان کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ بعض حلقوں میں اس کہانی کے خلاف جو باہمی اتفاق اور اتحاد کے لئے ایک زبردست ادبی اپیل ہے سخت پراپگنڈا جاری ہے! کیوں؟ خدا ہی جانے! شاید ان لوگوں نے اس کو پڑھا ہی نہیں یا اس کا صرف پہلا حصہ پڑھا ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ سکھوں کی طرف سے اس مسلمان کے کیا جذبات تھے۔ ان حضرات نے یہ نہیں دیکھا کہ کہانی کا مقصد اور انجام کیا ہے، یہ نہیں معلوم کیا کہ وہ کس شخص نے لکھی۔ بس ایک مورچہ قائم کر لیا ہے کہ اس کہانی کو جو ایک شریف سکھ کی خدمت میں ایک مسلمان کا ہدیہ عقیدت ہے "ضبط کر لیا جائے"! سنتا ہوں (لیکن یقین نہیں آتا) کہ ایک روشن خیال کانگریسی حکومت نے بھی بغیر سوچے سمجھے اس کہانی اور رسالے کو "بحق سرکار ضبط" کر لیا ہے!

خیر میں اس کے متعلق تو کچھ نہیں کہنا چاہتا کیونکہ اپنی مصلحتوں کو حکومت ہی خوب جانتی ہے۔ لیکن میں ان حضرات سے جو اس ایجی ٹیشن میں شریک ہیں اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ وہ دوستوں اور دشمنوں میں تمیز کرنا سیکھیں، بغیر کسی چیز کو پڑھے اور سمجھے رائے قائم نہ کریں بغیر پورے واقعات معلوم کئے اس رائے کا اظہار نہ کریں، ورنہ ان کی جلد بازی اور بے صبری ان کی پوزیشن کو مضحک بنا دے گی۔ شاعر نے یہ شکایت کی تھی کہ شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد۔ بے چارہ ادیب سوچے گا کہ میری کہانی کن سخن شناسوں کے پنجے میں جا پھنسی! ان تمام حضرات کی خدمت میں جو آزادانہ اظہار رائے کو جرم سمجھتے ہیں اور ادب کو شکنجے میں کسنا چاہتے ہیں میں فرانس کے مشہور ادیب اور نقاد والٹیر کا یہ قول پیش کرتا ہوں اور اس کا مطلب نکالنا ان کی ذہانت پر چھوڑتا ہوں۔

"جو کچھ تم کہتے ہو مجھے اس سے شدید اختلاف ہے۔ لیکن تمھیں اس کے کہنے کا حق ہے اور میں تمھارے اسی حق کی خاطر اپنی جان دینے کو تیار رہوں گا"

جان دینے کو دوستو، جان لینے کو نہیں!

ترکی پچھلے پچیس سال میں

(بہ سلسلہ صفحہ ۱۰)

ہے لیکن اگر عوام کا معیار زندگی بلند کرنا ہے تو یہ کافی نہیں ہے بلکہ کاشتکاری کو اور زیادہ ترقی دینے اور مستعدی اور تندہی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس وقت تک جس تناسب سے پیداوار بڑھ رہی ہے اسی تناسب سے آبادی میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے جس سے معیار زندگی بلند ہونے کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی۔

ترکی میں اب تک صرف ایک ہی سیاسی پارٹی حزب خلق یا پیوپلز پارٹی تھی اور اس پر یہ الزام لگایا جاتا تھا کہ وہ اپنے مخالفوں کو سختی سے کچل دیتی ہے۔ لیکن اگر مقامی معیار سے دیکھئے تو مخالفوں کے ساتھ برتاؤ کرنے میں "حزب خلق" نے بہت صبر و ضبط سے کام لیا ہے۔ صرف مٹھی بھر آدمیوں کو پھانسی دی گئی ہے اور چند درجن آدمیوں کو جلاوطن کیا گیا ہے، اس موقعہ پر اگر چینی اور روسی انقلاب سے ترکی انقلاب کا مقابلہ کیا جائے تو ان میں اور ترکی انقلاب میں ایک نمایاں فرق نظر آئے گا۔ مصطفیٰ کمال نے مخالف جماعتوں کی ہر طرح ہمت افزائی کی۔ لیکن یہ ہمت افزائی اسی وقت تک رہی جب تک کہ انھوں نے امن و سکون کے ساتھ صرف سیاسی کام کئے۔ لیکن جب انھوں نے اپنی سرگرمیوں سے امن عامہ کو متاثر کرنا شروع کیا۔ لوگوں کو مخالفت پر اکسانا شروع کیا تو مصطفیٰ کمال نے ان کو ختم کر دیا، اور سختی سے اُن کی عملی کارروائیاں روک دیں —— ایک پارٹی کے نظام حکومت اور اسی کے اقتدار کو کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا ہے۔ اور نہ ایسی حکومت کو کبھی معیاری نظام حکومت سمجھا گیا ہے۔ اگر کبھی ایسی پارٹی برسر اقتدار آگئی تو بالآخر اس میں دو یا اس سے زیادہ پارٹیاں بن جاتی ہیں۔ یہ کیفیت "حزب خلق" میں نہیں ہے۔ اس کے جلسوں میں معاملات پر حقیقی مباحثے ہوئے ہیں۔ رائے طلب امور میں آزادی اور پوری خود مختاری سے رائیں دی گئی ہیں، اس طرح قومی مجلس کی کمیٹیوں نے بھی بغیر کسی بے جا دباؤ کے ہر معاملے پر پوری آزادی اور بے باکی سے رائیں دی ہیں اور پالیسی کے متعلق ہر پہلو پر پوری طرح سوچا بچار اور غور و خوض کیا ہے، اور بغیر ادنیٰ مداخلت کے ممبران نے اپنی رائے ظاہر کی ہے۔

ملک کا اکثریت والا طبقہ نظم و ضبط، رواداری و مواخات کی اہمیت کو خوب اچھی طرح سمجھتا ہے، اسی طرح وہاں کی اقلیتیں بھی اس بات کو اچھی طرح جانتی ہیں کہ صبر اور دلائل کی طاقت سے وہ اکثریت کو اپنا ہم خیال بنا سکتی ہیں۔ الغرض ترکی میں جمہوری تصور اور اس کی کارروائیوں کا خاصا مطالعہ کیا جا چکا ہے اور ایک حد تک ان پر عمل بھی کیا جا چکا ہے۔

(باقی آئندہ)

ترجمہ از عبد الحلیم ندوی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۱ نمبر ۱۶ | ۸ر اکتوبر ۱۹۴۸ء | ایڈیٹر: ڈاکٹر سید عابد حسین

دونوں زبانیں دونوں کی ہیں

ڈاکٹر راجندر پرشاد

وہ زبان جو شمالی ہندوستان میں آج کل بولی جاتی اور سمجھی جاتی ہے اُسے خواہ کسی نام سے بھی پکارا جائے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر وہ ہندو مسلمانوں کی متحدہ کوشش کی پیدا کی ہوئی نہیں ہے تب بھی اس پر ہندو مسلمانوں کی کوششوں کا بہت زیادہ اثر پڑا ہے۔ اس کا ماخذ سنسکرت اور سنسکرت کی شاخیں پراکرت اور پالی زبانیں ہیں جو کہ اس زمانے میں رواج پا گئیں جب سنسکرت عام بول چال کی زبان نہیں رہی تھی۔ مسلم حملہ آوروں اور فاتحوں کی اپنی اپنی الگ زبانیں قبیلوں کے لحاظ سے تھیں لیکن ان میں سے ہر ایک پر فارسی کا زیادہ اور عربی کا کم کم اثر تھا۔ مسلمانوں کی حکومت کے عہد میں سرکاری زبان فارسی تھی اور اونچے خاندانوں کے ہندو بھی کثرت سے اسے پڑھتے اور حاصل کرتے تھے بالخصوص وہ ہندو جن کا حکومت سے اور حکمرانوں سے قریبی واسطہ اور تعلق تھا۔ لیکن وہ کبھی عوام کی زبان نہ ہوئی اور نہ ہو سکتی تھی۔ چونکہ مسلمانوں کے اندر زیادہ تعداد ایسے ہی مسلمانوں کی تھی جو ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے اس زمانے کے مسلمان عوام کی زبان بھی فارسی نہ تھی۔ اس لئے قدرتی طور پر ایک ایسی زبان کی ضرورت تھی جس میں ملک کے حکمران اور محکوم جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے باہم بات چیت کر سکیں۔ دونوں نے مل کر بول چال کے لئے ایسی زبان کو ترقی دینا شروع کیا اور بالکل ابتدائی زمانے ہی میں یعنی امیر خسرو کی زندگی میں وہ اتنی ترقی کر چکی تھی کہ امیر خسرو نے اس میں شعر کہے ہیں جو آج بھی لوگوں کی زبان پر ہیں اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے۔ (کیونکہ آج کل وہ دو زبانیں خیال کی جاتی ہیں) حامی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ان دونوں زبانوں کی ترقی میں ہندو اور مسلمان دونوں کا حصہ ہے۔ چونکہ اپنے مذہبی احکام کے متعلق ہندوؤں کو سنسکرت کی طرف اور مسلمانوں کو عربی اور فارسی کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا اس لئے یہ ایک قدرتی بات تھی کہ ان دونوں ماخذوں سے الفاظ اس میں داخل ہوتے رہتے۔ مگر اس کا اپنا ڈھانچا اصلی حالت پر قائم رہتا۔ وہ اصلی نیو جس پر کہ زبانوں کی عمارت بنتی ہے زبان کی دونوں صورتوں یعنی اردو اور ہندی میں بالکل ایک ہے۔ فرق و امتیاز جو کچھ ہے وہ تھوڑے سے الفاظ میں ہے۔ اسی لئے شمالی ہندوستان میں اصل ہے کہ صرف ایک زبان ہے جس میں ہندو اور مسلمان دونوں گفتگو کرتے ہیں۔ اگرچہ تعلیم یافتہ لوگ اپنی اپنی تحریروں میں سنسکرت اور عربی اور فارسی کے الفاظ اپنی اپنی تعلیم کے مطابق کم یا زیادہ تعداد میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ ایک ایسی چیز کے متعلق بھی اختلافات کھڑے کر لئے جائیں کہ جو بالکل صحیح طور پر ہندو مسلمان دونوں کا مشترکہ ورثہ ہے بھی، اور ہونا بھی چاہیے۔

ہندی کی طرف سے لڑنے والے کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے اور کسی وقت میں بھی مسلمانوں کے اس احسان سے چشم پوشی نہ کرنی چاہیے جو ہندی زبان اور ہندی ادب کو ترقی دینے کے صورت میں انھوں نے امیر خسرو کے وقت سے لے کر آج تک کیا ہے۔ اس کی بہت اچھی مثال پنڈت رام نریش ترپاٹھی کے اس مجموعۂ نظم میں مل سکتی ہے جو انھوں نے "کویتا کومدی" کے نام سے شائع کی ہے جس میں ہر زمانے کے مسلمانوں کا کلام ہے۔ اس مجموعہ میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے نہ صرف وہ زبان اپنے اشعار میں استعمال کی ہے جسے ہندی کے ادیب ہندی کہتے ہیں، بلکہ اس میں بعض ایسی مذہبی نظمیں بھی شامل ہیں جن کا اصل مضمون بھی ہندوانہ ہے۔ یہ مختصر کتاب ان پانچ جلدوں کے مجموعے میں شامل ہے جو گورکھپور کے گیتا پریس نے شائع کیا ہے۔ اس میں صرف مسلمانوں کے لکھے ہوئے مذہبی بھجن ہیں اور ہندو مذہب کا دلدادہ ان سے لطف اندوز ہونے اور ان سے روحانیت کا سبق حاصل کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ رحمان کے دوہے شمالی ہند میں ظرافت طبع اور عقل آموزی کے لیے اسی طرح گھر گھر میں پھیلے ہوئے ہیں جس طرح گردھر کے سورٹھے۔ کبیر کا نام ایک مذہبی فلسفی کی حیثیت سے اس سے پہلے ہی لیا جا چکا ہے جس نے کہ اپنشدوں اور ویدانت کی بلند تعلیمات کو ان کے اونچے منبر سے گرا کر اس قدر نیچے کر دیا ہے کہ وہ عوام کی سمجھ میں آ سکیں اور انھیں جوگیوں کی پوشیدہ گپھاؤں اور جنگلوں اور پہاڑوں اور آشرموں سے کھینچ کر کسانوں کی جھونپڑیوں میں پہنچا دیا ہے جو خدمات کالی داس نے شمالی ہندوستان میں اور مہا پربھو چیتن نے بنگال اور بہار میں بھگتی کی تہذیب کو ہر دل عزیز بنانے میں انجام دی ہیں وہی لوگ اور ویدانت کی تعلیمات عام کرنے کے لئے کبیر نے شمالی ہند میں انجام دی ہیں۔

اس طرح اردو ادب کی جو خدمت ہندوؤں نے کی ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ آج بھی ہندو اس جماعت کا ایک بہت بڑا حصہ نہیں ہیں جو کہ اردو زبان اور اردو ادب کی دلدادہ ہے۔ اس لئے یہ صرف گذشتہ تاریخ ہی کو جھٹلانا نہیں ہے بلکہ فی الحقیقت موجودہ زمانے کی زندگی کے روزمرہ واقعات سے انکار کرنا ہے کہ زبان کے مسئلے کو ہندو مسلمانوں کے درمیان لڑائی کی بنیاد بنا دیا جائے۔

مسلمانوں کی خدمات صرف ہندی یا اردو ہی کو ترقی دینے تک محدود نہیں رہی ہیں دوسری صوبہ واری زبانوں کی بھی انھوں نے بہت کچھ خدمت کی اور وہ بھی اپنی ترقیات کے لئے ایک بڑی حد تک مسلمانوں کی مرہونِ منت ہیں، شمال میں سندھی، مغرب میں مرہٹی اور پورب میں بنگالی زبانیں محض بول چال کی زبانوں سے ترقی کر کے ادبی زبانیں بن گئیں اور اس ترقی میں مسلمانوں کا کافی حصہ ہے۔

(ہندوستان کا مستقبل)

فہرست مضامین

ہم کیا کریں؟

ڈاکٹر ذاکر حسین

ایک دوست نے، جو کوئی اٹھائیس سال سے قومی خدمت میں دل و جان سے لگے رہے ہیں اور ہمیشہ ایک متحدہ ہندوستان کی حمایت کرتے رہے ہیں، ایک خط بھیجا ہے جس میں پچھلے سال کی درد بھری داستان پر تبصرہ ہے۔ اصول اور واقعات کی ٹکر ان کے عقیدہ کو شکست نہیں دے سکی ہے۔ مگر اس سے جو مسائل پیدا ہوئے ہیں ان کی طرف سے بھی یہ آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔ ان کے خط کا مرکزی سوال ان لفظوں میں سامنے آجاتا ہے: "ہندوستان کے مسلمانوں پر معاش کی راہیں تنگ ہوتی جاتی ہیں۔ آپ کی رائے میں اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے کیا تدبیریں اختیار کرنی چاہئیں؟"

یہ سوال کسی نہ کسی شکل میں روز سامنے آتا ہے۔ بہت سے لوگ اسے قابل اعتنا نہیں سمجھتے، بہت سے اس میں ایک عام مایوسی اور بددلی کا جواز تلاش کرتے ہیں۔ دونوں باتیں مجھے ٹھیک نہیں معلوم ہوتیں۔ پیٹ کم بخت ایسی حقیقت ہے کہ اسے باتوں سے ٹالا نہیں جا سکتا۔ لیکن مایوسی اور بددلی سے بھی یہ بھرتا نہیں ہے۔ اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اس دوسری حقیقت کو یاد رکھنا چاہئے کہ ایک کھانے والے منہ کے ساتھ قدرت نے دو کام کرنے والے ہاتھ عطا کئے ہیں۔ معیشت کا وسیلہ محنت ہے۔

ہاں ہم نے جس سماج میں پرورش پائی ہے، اس میں بے محنت یا بہت کم محنت سے پیٹ بھر سکنے کے امکانات بھی تھے اور ہیں۔ ہوشیار لوگوں کی نظر اکثر انھیں پر رہتی ہے۔ ان میں کمی ہوتی ہے تو یہ بے چین ہو جاتے ہیں۔ اور ان میں کہیں کمی ہو رہی ہے کہیں اضافہ۔ مسلمانوں کے لئے بھی، اوروں کے لئے بھی۔ مثلاً زمینداریاں ختم ہو رہی ہیں۔ اوروں کی دوسروں کی محنت سے اپنا پیٹ پالنے کی ایک راہ بند ہو رہی ہے مگر سرمایہ داری صنعت کو فروغ ہو رہا ہے اور مزدوروں کی محنت سے پیٹ پالنے ہی کی نہیں تو ندیں بھرنے کی راہ کھل رہی ہے۔ مسلمان زمیندار اور تعلقدار زمینداری ختم ہونے پر روتے ہیں اور ان کو اندیشہ ہے کہ زمینداری کا سارا معاوضہ خود وہ اور ان کے ولی عہد عیاشی میں اڑا کر برابر کر دیں گے اور غیر مسلم اسے صنعت میں لگا کر اور دھن کمائیں گے۔ پہلے زمینداری میں اثر اور طاقت کے زور پر دولت حاصل کرتے تھے، اب دولت کے زور پر اثر اور رسوخ بڑھائیں گے۔ اپنی غفلت یا اپنی عادتوں کی خرابی سے مسلمان زمیندار اس نئی لوٹ میں حصہ نہیں لے سکتے تو شکایت کیا اور کس کی؟ یا تو وہ بھی صنعت میں سرمایہ لگائیں اور جب تک صنعت قومی تصرف میں نہیں آتی وہ بھی اس سے شخصی نفع کمائیں، یا اگر وہ اس کو برا سمجھتے ہیں تو اس بدعت کو پھیلنے اور زور پکڑنے سے روکنے کی کوشش کریں۔ اشتراکی مسلک کو اپنائیں اور پھیلائیں، یا کم سے کم امداد باہمی کی درمیانی راہ پر چل کر دیسی صنعتوں کی تنظیم پر کمربستہ ہوں، کمائیں اور دوسروں کو کمانے میں مدد دیں، اور اگر بدکاری اسراف اور تعیش ہی پر اصرار ہے تو مٹ جائیں مگر بدکار اور مسلمان کو ہم معنی لفظ بنانے کی کوشش نہ کریں۔

معیشت کی ایک دوسری راہ سرکاری ملازمت تھی۔ بنے "تعلیم یافتہ" مسلمانوں نے اپنا کعبۂ مقصود بنا لیا تھا۔ ایک عرصے تک سرکاری ملازمت میں یہ خاص بہ حیثیت مسلمان کے حصہ مانگتے اور پاتے رہے تھے۔ یہ مقابلے کے امتحانوں کی مخالفت کرتے تھے، سفارش یعنی نااہلی کے باوجود جگہ پانے کی سفارش، خاندانی خدمات، یعنی ہندوستان میں اسلامی حکومت کو ختم کرنے میں اپنے خاندان کی خدمات یا سیاسی بیداری کے روکنے میں اپنی اور اپنے بزرگوں کی خدمات کے زور پر ملازمت چاہتے تھے۔ اور پاتے تھے! ہماری قومی جد و جہد کا یہ مخصوص شغل تھا کہ اپنے اچھوں بروں سب کو سرکاری ملازمت میں کھپائیں۔ اچھی سے اچھی علمی صلاحیت کے نوجوانوں کو ڈپٹی کلکٹری کی معراج تک پہنچانے پر ہمارے "رہنما" علی الاعلان فخر کیا کرتے تھے۔ بڑی بڑی اسلامی تعلیم گاہوں کی پچھلی پچاس سال کی تاریخ پر نظر ڈالیے۔ ان میں سے جو نوجوان تعلیم پا کر نکلے وہ سب یہ تو نہ تھا کہ نالائق ہی تھے۔ ذہین سے ذہین، قابل سے قابل نوجوان یہاں آئے۔ مگر کسی نے کبھی یہ نہ چاہا کہ ان میں سے علمی صلاحیت والوں کو علمی کاموں کے لئے روکا جائے، کچھ کو تجارت کی ترغیب دی جائے۔ کچھ کو صنعت میں بھیجا جائے۔ بس ڈپٹی کلکٹر، تحصیل دار، نائب تحصیل دار!! ہم اپنے بہترین دماغوں کو ایک ایسے کاروبار میں لگاتے جس میں انھیں واقعی کوئی اختیار نہ تھا، ایک پردیسی مشین کے پرزے تھے، اپنے ہم وطنوں کی حق تلفی، انھیں غلام رکھنے، ان کے ہر حریت خواہ رجحان کو دبانے میں کام آتے تھے۔ انعام تھا "تنخواہ" حکومت اور "بالائی یافت"۔ اس طائفہ کے اعمال پر تبصرہ یہاں مقصود نہیں۔ سوال کے جواب میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ اب سرکاری ملازمت ہمارے تعلیم یافتوں کا تنہا پیشہ نہیں رہ سکتی اور اچھا ہے کہ نہ رہے۔ اب کوئی نوکری مسلمان کو اس لئے نہیں ملے گی کہ وہ مسلمان ہیں۔ لیکن اس لئے مل سکے گی کہ وہ اس کام کا اوروں سے زیادہ اہل ہے۔ مسلمانوں کو پرورش کی جگہ مقابلہ کے حق پر اصرار کرنا ہوگا۔ اور مقابلہ میں اپنی قابلیت منوانی ہوگی۔ ہم اپنی تعداد کی نسبت سے نوکریاں نہیں مانگیں گے اپنی قابلیت کی نسبت سے مانگیں گے۔ کچھ دن تک اس میں دقت ہوگی۔ اس لئے کہ مصنوعی تحفظات نے سفارش کی جو عادت ڈال دی ہے وہ جاتے ہی جاتے جائے گی، خود اعتمادی آتے ہی آتے آئے گی۔ لیکن میرا یقین ہے کہ مسلمان نوجوان حکمرانی کے بہت سے کاموں کے لئے کسی دوسرے سے کم نہیں بلکہ شاید بعض اعتبارات سے بہتر ہی ہیں۔ آزمائش کا ایک مختصر سا زمانہ گذرنے کے بعد ان کے لئے سرکاری ملازمت کے امکانات میں بھی کمی نہ ہوگی۔ مگر قابلیت، صلاحیت اہلیت کے زور پر۔ نالائق اور نااہل کسی تاریخی استحقاق کے بل پر اپنی پرورش نہ کرا سکیں گے اور اچھا ہو کہ یہ نااہل اور مسلمان کو مرادف الفاظ بنانے کی کوشش چھوڑ دیں۔

تعلیم کی توسیع کے ساتھ ساتھ دوسروں کی طرح مسلمانوں کے بھی سب قابل نوجوان سرکاری ملازمت میں نہیں کھپ سکیں گے۔ انھیں دوسری چیزوں کی طرف بھی قدم اٹھانا ہوگا۔ طب اور انجنیری کے پیشے ان کی ملازمت پرستی کی بدولت ان سے خالی سے ہیں۔ ادھر تیز تیز قدم بڑھانا چاہئے۔ تجارت کے میدان میں بعض مخصوص مسلم گروہوں کے سوا تعلیم یافتہ لوگ جاتے ہی نہیں۔ ادھر رخ کرنا چاہئے۔ تعلیم کے پیشے کو وسیع پیمانے پر اپنانا چاہئے۔ اور ان کاموں میں امتیاز حاصل کر کے آگے آنے والوں کے لئے اچھی روایتیں قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ابتدائی عبوری دقتوں کو سر کرنا تو ہوگا، مگر یہ سب سر ہو سکتی ہیں۔ محنت اور ہمت کی ضرورت ہے۔ کم ہمتی اور کاہلی کو مسلمانوں سے مخصوص نہ کرنا چاہئے۔

اوپر کے لوگوں اور متوسط تعلیم یافتہ طبقہ کے علاوہ ہماری قوم کے عوام ہیں۔ ان غریبوں کو کبھی کسی نے قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ ان کے متعلق برابر یہ رویہ رہا ہے کہ اوپر کے لوگ پیٹ بھر کر کھائیں گے تو ان تک بھی کچھ ٹکڑے پہنچ جائیں گے۔ اوپر کے لوگ تعلیم پائیں گے تو اس کی برکتیں چھن چھن کر ان تک بھی پہنچیں گی، اوپر والے حکمراں ہو جائیں گے تو ان کے لئے سب کچھ کر دیں گے۔ ان سے کھیلے سب ہیں۔ ان کے کندھوں پر رکھ کر بندوقیں چلائی ہیں۔ ان کے نام پر اپنا کام بنایا ہے، ان سے اپنے معرکے سر کرائے ہیں اور موقع پایا ہے تو ان کو چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ سب سے بڑی ضرورت ان میں تعلیم کو عام کرنا ہے۔ حکومت کی طرف سے جلد ہی ہمارے ملک میں تعلیم عام اور لازمی ہو جائے گی۔ لیکن پھر بھی اتنا بڑا ملک ہے کہ اس کے ہوتے ہوتے خاصی دیر لگے گی ہمیں اس کی رفتار کو تیز کرنے میں ساعی ہونا چاہئے۔ تعلیم کے ایسے نظام کی حمایت کرنی چاہئے جس سے افراد کا سب پیدا ہوں۔ لازمی تعلیم کی مدت کو اتنا بڑھانے پر ہمیں اصرار کرنا چاہئے کہ تعلیم ایک آرائشی کھیل نہ بن کر رہ جائے بلکہ کام کی ایک چیز ہو۔ اس طرح حکومت پر اثر انداز ہونے کے علاوہ ہمیں نجی کوششوں سے بھی عام مسلمانوں میں تعلیم کی کمی کو تیزی سے پورا کرنے میں لگ جانا چاہئے۔ مخلص کام کرنے والوں کا ایک لشکر کا لشکر شہروں کے مسلمان محلوں میں تعلیم بالغان کے کام میں لگ سکتا ہے اور مسلمانوں ہی کی نہیں ساری قوم کی ترقی میں معتدبہ حصہ لے سکتا ہے۔ ان محلوں میں امداد باہمی کے اصول پر قرضہ اور عام ضرورت کی چیزوں کی فراہمی کے لئے انجمنیں بنائی جا سکتی ہیں۔ جس سے شخصی مفاد کی انتشاری قوت کی جگہ جماعتی مفاد کی تنظیمی توانائی پرورش پائے۔ مسلمان بہت اچھے کاریگر ہیں۔ دہلی کے فسادات میں جب مسلمانوں پر زمین تنگ تھی، میں نے غیر مسلم کارخانہ والوں، جوہریوں، پریس کے مالکوں کو جو سب وقتی تعصبات سے بھی خالی نہ تھے۔ اپنے مسلمان کاریگروں کی تلاش میں سرگرداں اور انھیں دہلی میں روکنے کے لئے کوشاں پایا۔ ان کے بغیر ان کا کام نہیں چلتا تھا۔ لیکن کاریگروں کی ان

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
۸ راکتوبر ۱۹۴۸ء

کشمیر کے مسئلے کی حقیقت

خدا میں بڑی قدرت ہے۔ وہ چاہے تو کشمیر کا مسئلہ اب بھی صلح و آشتی سے طے ہو سکتا ہے مگر آثار سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ جنگ نہ صرف جاری رہے گی بلکہ بہت شدت پکڑ جائے گی۔

ہم جمہوری ملک کے شہری ہیں۔ عام طور پر ہم ہر معاملے میں حکومت کا ساتھ دیتے ہیں یہ سمجھ کر کہ حکومت ہماری بنائی ہوئی ہے اور ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جن پر ہم کو پورا اعتماد ہے لیکن ایسے اہم معاملات میں جیسے جنگ کا معاملہ ہے بے سمجھے ساتھ دینے سے کام نہیں چلتا اس لئے کہ اس میں ضرورت کے وقت بڑی بڑی قربانیاں کرنی پڑتی ہیں اور وہ انسان تبھی کر سکتا ہے جب اس نے جنگ کے مقصد کو اچھی طرح سوچ سمجھ کر صحیح اور برحق مان لیا ہو۔ اس لئے ہمیں پہلے اپنے دل سے یہ سوال کرنا چاہیے کہ کشمیر کے معاملے میں ہند کی حکومت حق پر ہے یا نہیں۔

اس سوال کا ایک جواب تو یہ ہے کہ پچھلے سال آخر اکتوبر میں (قبائلیوں کے حملے کے وقت) مہاراجہ نے جو قانون کے مطابق ریاست کا سردار ہے انڈین یونین میں شریک ہونے کی درخواست کی اور وہ منظور کر لی گئی اس لئے کشمیر یونین کا ایک جزو ہے اور حکومت ہند اسے حملہ آوروں سے بچانے میں اپنا فرض ادا کر رہی ہے یہ جواب بہت سے قانون والوں کے اور بین الاقوامی عدالتوں کے لئے بالکل کافی ہے لیکن ہم جیسے لوگوں کے لئے جو یہ سمجھتے ہیں کہ قانون ہمیشہ حق و انصاف کے مطابق نہیں بلکہ کبھی کبھی خلاف بھی ہوتا ہے ہرگز کافی نہیں۔ دنیا کا مروجہ قانون کشمیر میں اقتدار اعلیٰ کا حامل مہاراجہ کو سمجھتا ہو لیکن ہمارا حق و انصاف کا تصور جو جمہوریت پر مبنی ہے اس کا حامل کشمیر کے ارادۂ عامہ کو قرار دیتا ہے اس لئے ہم یہ پوچھیں گے کہ کیا کشمیر کے عوام واقعی ہندوستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ ان ہی لوگوں کو جن سے ہم ان کی حفاظت کر رہے ہیں اپنا دوست سمجھتے ہیں اور ان ہی کا ساتھ دینا چاہتے ہیں؟ اس وقت شیخ عبداللہ کی حکومت اور آزاد کشمیر کی حکومت دونوں کا یہ دعوے ہے کہ جموں اور کشمیر کے باشندوں کی اکثریت اُن کے ساتھ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ دونوں میں سے کس کا دعوے سچا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس وقت جبکہ ریاست میں جنگ چھڑی ہوئی ہے باقاعدہ رائے شماری نہیں ہو سکتی جس سے اس معاملے کا دو ٹوک فیصلہ ہو جائے سردست جو کچھ فیصلہ ہو سکتا ہے عام مشاہدے اور پچھلی تاریخ کی شہادت کی بنا پر ہو سکتا ہے۔ عام مشاہدہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ پچھلے اکتوبر میں جب حملہ آور دو طرف سے سری نگر شہر کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے مہاراجا اپنی ساری فوج کو لے کر جموں بھاگ گئے تھے اور ہندوستان سے فوجی امداد پہنچنے کی اُمید موہوم نظر آتی تھی وادیٔ کشمیر کے باشندوں نے عام طور پر اور سری نگر شہر کے لوگوں نے خاص طور پر حملہ آوروں کا ساتھ دینے کے بجائے شیخ عبداللہ اور ان کے رفیقوں کا ساتھ دیا۔ اگر شہر اور مضافات کے باشندوں کی بڑی تعداد شیخ عبداللہ کے خلاف اور حملہ آوروں کے موافق ہوتی تو کیا عقل اس بات کو قبول کرتی ہے کہ شیخ صاحب شہر کے انتظام کو نیشنل کانفرنس کے والنٹیروں کی مدد سے پورے امن و امان کے ساتھ چلا سکتے تھے؟ پھر ہندوستانی سپاہی جو تھوڑے تھوڑے کر کے ہوائی جہازوں سے آ رہے تھے حفاظت سے ہوائی اڈے پر اُتر سکتے تھے ان کو بار برداری سامان اور رسد مزدور اور رہبر مل سکتے؟ ہندوستان کی فوج کا پچاس پچاس سو سو کر کے کئی روز میں ایک اجنبی خطے میں پہنچنا، اپنا کیمپ بنانا، ضرورت کی سب چیزیں فراہم کرنا، دشمن کی نقل و حرکت کا ٹھیک ٹھیک پتہ چلانا، اور پھر اس کے بے شمار دستوں کو جو ساری وادی میں پھیل چکے تھے اور شہر کو گھیر چکے تھے دو ہفتے کے اندر ساٹھ ستر میل پیچھے دھکیل دینا اس قدر خطرناک اور مشکل کام تھا کہ مقامی آبادی کی پوری اور سچی مدد کے بغیر کسی طرح انجام نہیں پا سکتا تھا۔ اس سے تو ناگزیر طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ کشمیر کے لوگ ہندوستانی فوج کو اپنا دوست اور حملہ آوروں کو دشمن سمجھتے تھے۔

اب ذرا تاریخی شہادت پر نظر ڈالیے جو ہمیں بیس برس کی ذاتی واقفیت کی بنا پر بہم پہنچی ہے۔ ۱۹۳۰ء تک کشمیر کی عام آبادی خصوصاً مسلم اکثریت، استبدادی حکومت کے شکنجے میں اس طرح جکڑی ہوئی تھی کہ ہل نہیں سکتی تھی دوسرے سال چند کشمیری مسلمان نوجوانوں نے جو علی گڑھ سے تعلیم پا کر آئے تھے اور ہندوستان کی قومی تحریک سے متاثر تھے۔ اس استبداد کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ ان ہی میں شیخ عبداللہ بھی تھے جو اپنی خداداد قابلیت کی بدولت ان کے قائد بن گئے۔ شیخ صاحب کی آواز نے مسیحائی کی اور کشمیری مسلمانوں کے مردہ جسموں میں جان پڑ گئی۔ ۱۹۳۲ء میں یہ تحریک مسلم کانفرنس کی شکل میں منظم ہوئی۔ استبداد کی سختیاں، قید کی مصیبتیں ان لوگوں کے حوصلوں کو پست نہ کر سکیں۔ ان کا اثر بڑھتا گیا۔ حکومت کو ان کے بعض مطالبات ماننے پڑے اور مسلمانوں کو ملازمتیں اور تعلیمی سہولتیں پہلے سے کچھ زیادہ ملنے لگیں۔ ۱۹۳۸ء تک مسلم کانفرنس اتنی طاقتور ہو گئی تھی کہ پرجا منڈل کی انتخابی نشستوں میں اس نے ۲۵ میں سے ۱۹ پر قبضہ کر لیا۔

کوئی اور ہوتا تو خوشی سے پھولا نہ سماتا مگر بلند حوصلہ قائد شیخ عبداللہ نے اپنے کاموں کا جائزہ لیا تو ان کو سخت مایوسی ہوئی۔ انھوں نے دیکھا کہ جو سات برس کی قربانیوں کے بعد تعلیم یافتہ مسلمانوں کو جو عہدے ملے عوام کو کچھ بھی نہیں ملا۔ ان کی مصیبتوں میں کچھ بھی کمی نہیں ہوئی اس پر یہ ... مسلمانوں کو کانفرنس نے ریاست میں بڑے عہدے دلوا دئے تھے وہ اپنے دلی نعمت کی خوشامد میں عوام کو اور مسلم کانفرنس کو بھولتے جاتے اور دن بدن زیادہ اپنا حال دکھاتے تھے شیخ صاحب کے درد قومی اور عقل سلیم نے ان کو یہ حقیقت سمجھائی کہ فرقہ وارانہ جماعت سے خواہ وہ کتنی ہی بے تعصب کیوں نہ ہو عوام کی فلاح و بہبود کا مقصد کبھی حل نہیں ہو سکتا۔ ... تعلیم یافتہ طبقہ کی ذاتی اغراض کا آلۂ کار بن جاتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے مسلم کانفرنس کا جلسہ کر کے اس کے دستور اساسی کو بدلا۔ اس کا نام نیشنل کانفرنس رکھا۔ اس کے دروازے ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے لئے کھول دئے اور چھوٹے چھوٹے مقاصد کو چھوڑ کر عوام کی حکومت کو اپنا خاص مقصد قرار دیا۔ شیخ صاحب کے مسلمان رفیقوں کی بہت بڑی اکثریت نیشنل کانفرنس میں ان کے ساتھ رہی، اور بہت سے ہندو اور سکھ جو پہلے بھی ان کے دست راست تھے اب رفیق کار بن گئے لیکن پرانے ساتھیوں میں سے چند ایسے بھی تھے جنھیں یہ تبدیلی پسند نہیں آئی۔ انھوں نے مسلم کانفرنس کو قائم رکھنے کی کوشش کی اور اس میں تنگ خیال مولویوں، ریاست کے حکام اور ان سب لوگوں نے جو شیخ عبداللہ کی انقلابی جدوجہد سے خائف تھے اُن کا ساتھ دیا۔ سات آٹھ برس تک نیشنل کانفرنس اور مسلم کانفرنس ایک دوسرے کی مدمقابل رہیں لیکن جو لوگ اس عرصے میں کشمیر گئے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ نیشنل کانفرنس کی تنظیم ایک ایک گاؤں میں موجود تھی اور مسلم کانفرنس کا اثر سری نگر کے چند محلوں اور دوسرے شہروں میں ایک چھوٹی سی جماعت تک محدود تھا۔ اس کے لیڈر زیادہ تر قوم کے غم میں حکام کے ساتھ ڈنر کھانے والے اور موقع ملے تو خود حکام کے زمرے میں داخل ہو جانے والے لوگ تھے چنانچہ جب امتحان کا وقت آیا یعنی ۱۹۴۶ء میں شیخ عبداللہ نے مہاراجہ کے خلاف "کشمیر چھوڑ دو" کی مہم شروع کی اور نیشنل کانفرنس والے قید کی مصیبتیں اٹھانے لاٹھیاں اور گولیاں کھانے لگے تو مسلم کانفرنس کے لیڈر، سوا چودھری غلام عباس اور دو چار اور مخلص آدمیوں کے میدان چھوڑ کر بھاگ گئے اور آئینی جدوجہد اور تاج کی وفاداری" کے محفوظ قلعوں میں پناہ گزیں ہو گئے۔ پاکستان بننے کے بعد جب یاران طریقت کی سیاسی مصلحتوں نے پینترے بدلے، ... جدوجہد اور قبائلیوں کے ناکامیاب حملوں کی ... "کشمیر کی جنگ آزادی" کی زنجیر کھڑی کی تو یہ مسلم کانفرنس ... جا بجا اُدھر پہنچے اور آزاد کشمیر کی حکومت میں شامل ہو گئے

اب آپ ہی بتائیے جن لوگوں کی نظر میں یہ تاریخی پس منظر ہے کیوں کر ممکن ہے کہ وہ شیخ عبداللہ اور ان کے ... کو کشمیر کے عوام کا حقیقی نمائندہ تسلیم نہ کریں اور ہندوستانی حکومت کے اس فعل کی دل و جان سے تائید نہ کریں کہ وہ ان کے جان و مال عزت اور آزادی کی حفاظت کے لئے دفاعی جنگ کر رہی ہے؟

بزم بے تکلف

ہمارے دوست ل، ک، ملاحی صاحب دیکھنے میں تو بڑے حلیم الطبع اور رقیق القلب نظر آتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ دائمی نزلے نے ان کی آواز میں ایک جکڑی ہوئی نرمی اور چہرے پر ایک بہتی ہوئی رقت کی کیفیت پیدا کر رکھی ہے لیکن اگر کبھی غصہ آ جائے تو الامان، الحفیظ یہی رقت اس طرح تپنے اور دہکنے لگتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے جوالا مکھی کے دہانے سے لاوا ابل رہا ہے۔ لوگ جتنا ان کے فرط غضب سے ڈرتے ہیں، اتنے ہی ان کے وفور محبت سے بھی خائف رہتے ہیں اس لئے کہ دونوں حالتوں میں صرف پاسبان عقل ہی نہیں بلکہ پاسبان ادب بھی اس بگڑے دل کو تنہا چھوڑ کر ٹہل جاتا ہے، اور اس کی زبان سے بے ساختہ اردو کے معلّے کے چھٹے ہوئے محاورے سرزد ہونے لگتے ہیں جن میں عموماً مخاطب کی خلاف شرع پیدائش کا ذکر ہوتا ہے اور اس کے خاندان کے ساتھ سسرالی رشتوں کا اور طرح طرح کے ازدواجی اور غیر ازدواجی تعلقات کا دعوے کیا جاتا ہے۔ ملاحی صاحب کو اپنے صاف دل ہونے پر بڑا فخر ہے اور یہ اس لحاظ سے صحیح ہے کہ گو ان کے دل میں گندگی بڑی کثرت سے پیدا ہوتی ہے پر ٹھہرنے نہیں پاتی فوراً اُگل پڑتی ہے اور دل بنی ہوئی ... کی طرح صاف ہو جاتا ہے۔ مگر ان کو یہ شکایت ہے کہ ان کا دل صاف ہوتے ہی دوسروں کا دل میلا ہو جاتا ہے۔ سخت افسوس کیا کرتے ہیں کہ اس انگریزی تہذیب نے ہمارے مذاق اور اخلاق کا ہاضمہ خراب کر دیا ہے ان کو کوئی چٹ پٹی مسالہ دار چیز پچتی ہی نہیں ہے۔

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

پچھلا ہفتہ : ۱۔ ہندوستان

صلح نمائی اور جنگ فروشی

صلح پسندوں کی یہ اُمید کہ کشمیر کا مسئلہ پر امن طریقے سے حل ہو جائے گا، کم ہو جاتی ہے۔ پچھلے ہفتہ لیاقت علی صاحب نے مغربی پاکستان کے دورے کے سلسلے میں جو تقریریں کیں ان سے جنگ جوئی کا اظہار زیادہ ہوتا ہے اور صلح جوئی کا کم۔ پنڈت نہرو نے اپنی ۱۰ ستمبر کی تقریر میں پاکستان سے صلح و امن کی اپیل کی تھی اس کے جواب میں لیاقت علی خاں صاحب نے فرمایا کہ ہم ہندوستان سے دوستی کے لئے تیار ہیں۔ لیکن دوستی کشمیر کے معاملے کے طے ہونے پر موقوف ہے۔ انھوں نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا کہ اسی کشمیر کے معاملے میں یو، این، او کمیشن نے جس کے بلانے کے لئے خود پاکستان نے پورا زور لگایا تھا، دو مہینے کی کوشش کے بعد مصالحت کی ایک ابتدائی تجویز مرتب کی جسے ہندوستان نے منظور کر لیا، لیکن پاکستان نے رد کر دیا یہ بھی نہیں فرمایا کہ اگر وہ ایک غیر جانب دار کمیشن کی تجویز کو قابل غور نہیں سمجھتے، تو آخر وہ خود مصالحت کی کیا صورت تجویز کرتے ہیں۔ اس کے بجائے انھوں نے پاکستان کی بحری، بری اور ہوائی فوج کی رجز خوانی شروع کر دی۔ یہ تو صلح جوئی نہ ہوئی بلکہ صلح نمائی اور جنگ فروشی ٹھہری۔

اس کے بعد سے پنڈت نہرو کا لہجہ بھی سخت ہو گیا ہے۔ یکم اکتوبر کی تقریروں میں، پنڈت نہرو اور سردار پٹیل دونوں نے اس بات کو صاف کر دیا ہے کہ اگر پاکستان کا یہی طرز رہا، تو کشمیر کی جنگ جو آج کل رُکی ہوئی سی ہے پوری شدت سے شروع کر دی جائے گی۔ مگر اسی کے ساتھ دونوں نے یہ یقین دلایا ہے کہ خود پاکستان پر ہندوستانی فوج ہرگز حملہ نہیں کرنا چاہتی۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ پاکستان کی طرف سے، اس کا کیا جواب ملتا ہے۔ اگلے چند روز صلح پسندوں کے لئے بہت تشویش ناک ہیں۔

درشتی و نرمی بہم در بہ است

یکم اکتوبر کو سردار پٹیل نے پالم میں ہندوستانی ہوائی فوج کے عملے کے سامنے تقریر کرتے ہوئے اقوام متحدہ کی انجمن (یو، این، او) پر بڑی سختی سے نکتہ چینی کی۔ انھوں نے کہا کہ یو، این، او آج تک کسی مسئلے کو طے کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی ہے پھر بھی اس کو اپنے دائرہ عمل کے بڑھانے کا اس قدر شوق ہے کہ اس کی سیکورٹی کونسل حیدر آباد کے معاملے میں (جس سے اس کو خود اپنے آئین کی رو سے کوئی تعلق نہیں) دخل دینے پر راضی ہو گئی اور اب بھی جبکہ معاملہ طرفین کی رضامندی سے بہ خیر و خوبی طے ہو رہا ہے اور نظام نے اپنی شکایت کو واپس لے لیا ہے، سیکورٹی کونسل کو اصرار ہے کہ یہ مسئلہ اس کے ایجنڈا پر رہے اور اس پر مزید بحث کی جائے۔ سردار پٹیل نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اگر یو، این، او کی اصلاح نہ ہوئی تو وہ دنیا میں امن قائم کرنے کے بجائے اور زیادہ تباہی اور خونریزی کا باعث بن جائے گی۔

اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ سردار پٹیل کی یہ تنقید حرف بہ حرف صحیح ہے، لیکن اس کو اخبار میں پڑھنے کے بعد دل میں یہ بات کھٹکتی تھی کہ اس کا لہجہ ضرورت سے زیادہ سخت ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ پیرس سے خبریں آ رہی ہیں کہ سیکورٹی کونسل حیدر آباد کے معاملے میں اپنی غلطی محسوس کر رہی ہے اور اس کی تلافی کرنے پر تیار ہے۔ جی چاہتا تھا کہ اس مایوسی میں جو سردار نے یو، این، او کی طرف سے ظاہر کی ہے تھوڑی سی امید کی جھلک بھی ہوتی۔ اس لئے کہ لے دے کے یہی ایک سہارا دنیا کے امن کا رہ گیا ہے اس کو اتنی جلدی ہاتھ سے نہیں دینا چاہیئے۔ شکر ہے کہ دوسرے دن وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے اپنے اس تقریر میں جو انھوں نے باشندگان دہلی کے عام جلسے میں کی ہمارے دل سے اس خلش کو مٹا دیا انھوں نے کہا کہ یو، این، او کی ان سب کمزوریوں کے باوجود جو ہمارے سامنے ہیں ہمیں اس کی طرف سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ اس کی بنیاد اونچے مقاصد پر رکھی گئی ہے۔ نائب وزیر اعظم کی جھڑکی اور وزیر اعظم کی تھپکی دونوں مل کر ان خیالات کی پوری ترجمانی کرتی ہیں جو ہندوستان کا سوچنے والا طبقہ یو، این، او کے بارے میں رکھتا ہے۔

کیا زمینداری کا مسئلہ کھٹائی میں پڑ گیا؟

کانگریس نے زرعی اصلاحات کی جو کمیٹی مقرر کی تھی وہ اور تو سب صوبوں کا دورہ کر چکی ہے صرف یو، پی اور مدراس کے صوبے باقی رہ گئے ہیں۔ اب معلوم ہوا کہ یو، پی میں شدت سے سیلاب آنے کی وجہ سے کمیٹی کو اس صوبے میں اپنا پروگرام ملتوی کرنا پڑا ہے۔ اب وہ مدراس کا دورہ مقررہ وقت سے ایک مہینہ پہلے شروع کر دے گی اور یو، پی کی باری اس کے بعد آئے گی۔ صوبوں کی حکومتیں زمینداری کے متعلق نئے قانون بنانے سے پہلے اس کمیٹی کی رپورٹ کا انتظار کر رہی ہیں، کہا جاتا ہے کہ کانگریس کے حلقوں میں زمینداری کو جلد سے جلد ختم کرنے کا جوش فی الحال ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ کیونکہ یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ اگر اس میں عجلت کی گئی تو حکومتوں کو کم سے کم معاوضے کی ادائیگی کے لئے بھی اربوں روپے کی ضرورت ہوگی جس کا فوراً مہیا ہونا محال ہے اور اگر کسی طرح ہو بھی گیا تو اتنی بڑی رقم کے گردش میں آ جانے سے افراط زر حد سے گذر جائے گی اور پھر گرانی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہے گا۔

ہمارے خیال میں مناسب یہ ہے کہ حکومتیں اس معاملے میں وہ طرز عمل اختیار کریں جو انگلستان کی حکومت نے بنک آف انگلینڈ کو قومی ملکیت بنانے کے سلسلے میں اختیار کیا تھا یعنی زمینداریوں پر سرکار کا قبضہ ہو جائے اور زمینداروں کو لگان کی ایک مقررہ رقم ہر سال ادا ہوتی رہے۔ جب معاوضہ کی مجوزہ رقم ادا کرنے کا سبیتا ہو تو یہ سالانہ ادائگی بند کر دی جائے۔ اس سے سب فریقوں کو یکسوئی ہو جائے گی اور موجودہ انتظار اور اضطراب کی حالت جاتی رہے گی جس نے ملک کے معاشی توازن میں خلل ڈال رکھا ہے۔

اتحاد کا مضبوط رشتہ

۲ اکتوبر کو گاندھی جینتی جس شان سے سارے ملک میں منائی گئی اس نے ایک بار پھر ہمیں یہ یاد دلایا کہ طرح طرح کے اختلافات کے باوجود ہندوستان اس سرے سے اس سرے تک ایک اتحاد کے رشتے میں مربوط ہے اور وہ رشتہ گاندھی جی کی شخصیت کا ہے۔ جو روحانی مقاصد، اخلاقی اصول خیالات اور جذبات ہم سب میں مشترک ہیں، ان کا مجسم نمونہ گاندھی جی کی ذات تھی اور اب ان کی یاد ہمیں اس اشتراک کا احساس دلاتی ہے اور اُسے قوت پہنچاتی ہے۔ سارے ملک میں، ایک ایک شہر میں، ایک ایک گاؤں میں یہ تقریب خوشی اور رنج، فخر اور شرم کے مخلوط جذبات کے ساتھ منائی گئی۔ خوشی اور فخر اس پر کہ یہ فخر انسانیت ہم میں سے تھا۔ رنج اور شرم اس کی کہ جس نے ہماری روح کو ہلاکت سے بچایا۔ اس کے جسم کی ہم حفاظت نہ کر سکے۔ یوں تو ہر جگہ اس تقریب نے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی کے فرق کو کم سے کم تھوڑی دیر کے لئے مٹا دیا لیکن حیدر آباد میں خاص طور پر اس کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو اس کا موقع ملا کہ پچھلے آٹھ مہینے کے افسوسناک واقعات کو بھلا کر ایک جگہ جمع ہوں اور گاندھی جی کی محبت کے سہارے آپس کی محبت کو تازہ کریں۔ سنا ہے ۲ اکتوبر کو جا بجا شہر کے ہندو، مسلمان اور ہندوستانی اور حیدر آبادی فوج کے سپاہی مل جل کر مہاتما گاندھی زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سب ایک ہی مدرسے کے لڑکے ہیں جو اپنے عزیز استاد کا جوش و خروش سے استقبال کر رہے ہیں۔

ایک دلچسپ تجویز

ڈاکٹر رام منوہر لوہیہ کی یہ تجویز بہت دلچسپ ہے کہ حکومت ہند اپنے اسٹرلنگ قرضے کے بدلے انگریزوں کے کارخانے اور ان کی دوسری املاک جو ہندوستان میں موجود ہیں لے لے۔ ان کا اندازہ ہے کہ انگریزوں کی کل املاک کی مالیت آٹھ ارب روپے کے قریب ہے اگر یہ حکومت ہند کو مل جائے تو قرضے کا بہت بڑا حصہ ادا ہو جائے گا۔ اس میں ڈاکٹر صاحب نے دو بڑے فائدے بتائے ہیں ایک یہ کہ اسٹرلنگ قرضے کی ادائیگی جس میں بڑی مشکلات پیش آ رہی ہیں، آسانی سے ہو جائے گی۔ دوسرے یہ کہ ہندوستان کی صنعت کا بیس فی صدی حصہ جو اب انگریزوں کے پاس ہے حکومت ہند کی ملکیت اور انتظام میں آ جائے گا۔ اور صنعتوں کو قومی بنانے کے مقصد میں بیس فی صدی کامیابی ہو جائے گی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ اس سودے پر انگریز سرمایہ داروں اور برطانوی حکومت کو کیسے راضی کریں گے۔ شاید برما چین میں اس طرح کا معاملہ ہوتا تو انگریز اس پر غور بھی کرتے لیکن ہندوستان جیسے پرامن ملک سے اپنا کاروبار چھوڑ کر وہ کیوں جائیں گے۔ اگر ڈاکٹر صاحب جبر سے کام لینا چاہتے ہیں تو پھر صنعتوں کو قومی بنانے کا مسئلہ بیس فی صدی کیا سو فی صدی حل ہو سکتا ہے۔

(ع، ح)

۲۔ پاکستان

وہی بیرونی سرمائے کا آسرا

حال میں پاکستان کے وزیرِ صنعت نے ملک کی صنعتی ترقی کا جو جائزہ لیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہاول پور اور کراچی میں دو سوتی کپڑے کی ملیں قریب قریب مکمل ہو گئی ہیں۔ اس طرح پاکستان میں سوتی کپڑا پیدا کرنے کی صلاحیت دگنی ہو گئی ہے۔ ساری دنیا کو تو شکایت ہے کہ سوتی کپڑے کی مشینیں کافی تعداد میں اور باسانی دستیاب نہیں ہوتیں، مگر وزیرِ صنعت نے یہ کہا ہے کہ حکومت پاکستان کو مشینوں کے بارے میں پریشانی نہیں، انھیں یہ ڈر نہیں کہ ان کا اگلا پنج سالہ پروگرام مشینوں کے نہ ملنے کی وجہ سے خطرے میں پڑ جائے گا۔ مشینوں کے وعدے انگلستان، فرانس، جاپان، اٹلی اور چیکوسلوواکیا نے کئے ہیں۔

دو جوٹ کی ملیں بھی جلد ہی قائم ہونے والی ہیں۔ وزیرِ صنعت نے اس موضوع پر کچھ بتانے سے گریز کیا کیونکہ اس سلسلے میں ابھی گفت و شنید ہو رہی ہے۔ قیاس یہ ہے کہ یہ صنعتیں بیرونی کمپنیاں قائم کریں گی۔ بہت عرصہ ہوا خبریں آئی تھیں کہ کلکتہ میں جوٹ کی کچھ انگریزی کمپنیاں اپنی توجہ پاکستان کی طرف منتقل کر رہی ہیں۔ ان کا اور حکومت پاکستان کا جو معاہدہ ہو رہا ہے اس کی تفصیلات کا مطالعہ دلچسپ ہوگا۔ شاید پاکستان کو جو شرطیں پیش کی جائیں گی وہ اس کے لئے خاصی پسندیدہ ہوں گی۔

پچھلے دنوں چمڑے کی صنعت سے تعلق رکھنے والے صوبوں اور مرکز کے نمائندوں کی ایک کانفرنس ہوئی تھی۔ اس کانفرنس نے بعض سفارشیں کی تھیں جن کا مقصد یہ ہے کہ خام پیداوار کی زیادہ مقدار کو ملک کے اندر ہی کام میں لگایا جائے۔ ان سفارشات پر حکومت غور کر رہی ہے۔ ویسے مسٹر فضل الرحمٰن نے کہا کہ حکومت اس سلسلے میں اپنی گہری دلچسپی کا اظہار پہلے ہی کر چکی ہے۔

دواؤں کی صنعتوں کو مدد دینے کے سوال پر بھی سوچ بچار کیا جا رہا ہے۔ حکومت کے پیشِ نظر یہ سوال بھی ہے کہ ان صنعتوں کی پیداوار کی اچھائی وغیرہ کی نگرانی کے لئے مناسب صورت کیا ہوگی۔ قیمتوں پر بھی نگرانی رکھنے کا ارادہ کیا جا رہا ہے۔

مشرقی بنگال میں کاغذ کے لئے ضروری خام اشیا ملتی ہیں۔ وہاں ایک کاغذ بنانے کی مل کے قیام کے سوال پر بھی حکومت غور کر رہی ہے۔ اس مل پر ایک یا ڈیڑھ کروڑ کا سرمایہ لگے گا اور حکومت بعض ماہرین فن سے اس سلسلے میں مشورہ کرنے والی ہے۔

شکر سازی کی صنعت کی طرف بھی دھیان دیا جا رہا ہے۔ بلکہ اس سلسلے میں تو پاکستان کو اپنے اس ارادے پر خاصا فخر ہے کہ مردان کی نئی شکر فیکٹری شاید ایشیا میں سب سے بڑی ہوگی۔ مشرقی بنگال میں جو ملیں موجود ہیں ان میں بھی توسیع ہو رہی ہے۔

بیرونی سرمائے کے داخلے کے سوال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسٹر فضل الرحمٰن نے کہا "حکومت نے یہ ضروری سمجھا ہے کہ بیرونی سرمائے کو دعوت دی جائے تاکہ پاکستان کی صنعتی ترقی کا کام ہو سکے۔ ایسا کرنے میں حکومت نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ بیرونی کارخانوں کے ساتھ سیاسی اثرات نہ آنے پائیں۔" مگر قیاس یہ ہے کہ سیاسی اثرات پہلے ہی آ گئے ہیں، کارخانے بعد میں قائم ہوتے رہیں گے۔ اس بات کا شبہہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ وزیرِ صنعت کو اپنی پالیسی کی صحت کا سرٹیفکٹ امریکا سے ملا ہے اور انھوں نے خود اس پر خوشی کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے کہا "حکومت کی پوزیشن کو باہر اچھی طرح سمجھا گیا ہے۔ ہمارے پاکستان سے امریکا کے معاشی تعلقات کے سوال پر نیویارک کی نیشنل فارن ٹریڈ کونسل نے ایک رپورٹ میں جو حال میں ہی شائع ہوئی ہے کہا گیا ہے کہ حکومت پاکستان کی پالیسی حقیقت بینی پر مبنی ہے۔ اور اس سے پاکستان میں سرمایہ کاری کے امکانات قوی ہو گئے ہیں۔ اس رپورٹ کے الفاظ میں 'یہاں بیرونی سرمائے کو خوش آمدید کہا جائے گا۔ اور جو معاشی نظام بنے گا وہ سرمایہ کاری کے لئے نفع بخش ہوگا۔' پاکستان کے وزیرِ صنعت نے اپنی اس امید کا اضافہ کیا ہے کہ اس سے پاکستان کے حقیقی مفاد کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ لیکن دوسرے ملکوں کا تجربہ کچھ زیادہ امید افزا نہیں۔ دنیا ابھی اس منزل سے بہت دور ہے جہاں ایک ملک دوسرے ملک کی مدد خالصتاً لوجہ اللہ کرے گا۔ کونسل کے بعض مبہم الفاظ کی تفسیر کی جائے تو یہ ہوگی کہ اسے پاکستان سے اس بات کا اندیشہ نہیں کہ وہ معاشی حیثیت سے کوئی ایسا راستہ اختیار کرے گا جو سرمایہ داری کے مندرسے دور جاتا ہو یا سیاسی حیثیت سے اس سمت جائے جو امریکا کے مفاد کے خلاف ہو۔ ممکن ہے پاکستان کے عوام کا مفاد یہی ہو اور وہ یہی فیصلہ کریں۔ بیرونی سرمایہ قبول کرنے یا اس کے چنگل میں پھنس جانے کے بعد پھر اس فیصلہ کو بدلنا آسان نہیں ہوگا اور سیاسی آزادی معاشی زنجیروں میں جکڑ کر دم توڑ دے گی۔ پاکستان اگر یہ چاہتا ہے کہ اس کی معاشی حکمت عملی اس کے اپنے قومی مفاد کی پابند ہو تو اسے اپنا راستہ نکالنے کے لئے اپنے ہی قوت بازو پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ ہند و پاکستان کے تعلقات بہتر رہیں تو وہ دقتیں جو حکومت پاکستان کو اس سلسلے میں پیش آئیں گی یا آ رہی ہیں چشم زدن میں ختم ہو جائیں گی۔

(ا، س)

صلح میں جنگ کی باتیں کیسی؟

پاکستان کے وزیرِ اعظم لیاقت علی صاحب نے قائدِ اعظم کے انتقال کے بعد پہلی مرتبہ پاکستان کے اہم شہروں یعنی لاہور، پشاور اور راولپنڈی کا دورہ کیا اور عام جلسوں میں اہم اور طویل تقریریں کیں۔ دورہ پر روانہ ہونے سے پہلے کراچی سے ریڈیو پر بھی ایک تقریر کی تھی۔ ان تمام تقریروں میں انھوں نے ہمارے وزیرِ اعظم جواہر لال نہرو کی اس اپیل کے حوالے دئے ہیں جو انھوں نے ۱۸ ستمبر کی تقریر میں پاکستان سے کی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ خوف اور شبہے کو دل سے نکال ڈالئے اور امن و آشتی کے قیام میں مدد دیجئے۔"

لیاقت علی صاحب نے اپنے براڈکاسٹ میں نہرو جی کی اپیل کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کو یقین دلایا تھا کہ دونوں حکومتوں کی دوستی کے رشتے کو مضبوط کرنے اور امن و امان کے قیام میں وہ ہر طرح مدد دینے کی کوشش کریں گے۔ لاہور کی تقریر میں بھی اس وعدہ کو دہرایا مگر اسی کے ساتھ بہت سی اور باتیں کہیں، جن سے یہ وعدہ مشروط ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد پشاور میں انھوں نے صاف صاف فرمایا کہ جب تک کشمیر کا مسئلہ اطمینان بخش طور پر حل نہیں ہو جاتا، اس وقت تک ہندوستان اور پاکستان میں دوستی ہو ہی نہیں سکتی۔ اور راولپنڈی پہنچنے کے بعد ایک قدم اور آگے بڑھ کر فرمایا کہ "کشمیر تو پاکستان کا جزو ہے، جسے کسی طرح الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔"

ہم سمجھتے ہیں کہ لیاقت علی خاں صاحب نے کراچی کے براڈکاسٹ میں جس صفائی کے ساتھ دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا اور نہرو جی کی اپیل کا خیر مقدم کیا تھا، اسی پر قائم رہنا چاہئے اور صلح کے لئے خلوص دل سے کوشش کرنی چاہئے۔ بعد میں انھوں نے جو شرطیں پیش کی ہیں اور جس طرح حملہ کا خطرہ ظاہر کیا ہے اور پاکستان کی جنگی قوت کا رعب ڈالنا چاہا ہے، اس سے کشیدگی دور نہیں ہوگی بلکہ اور بڑھ جائے گی۔

آپ کا بھی تو کچھ فرض ہے

بنگال کے وزیر، شہاب الدین صاحب سے حیدرآباد سندھ کے ہندوؤں کے ایک وفد نے ملاقات کی۔ وزیر موصوف نے وفد کو اقلیتوں کے ساتھ اچھا اور مساوی برتاؤ کا یقین دلایا، مگر اسی کے ساتھ یہ بھی جتا دیا کہ جو لوگ ایک قدم پاکستان میں رکھتے ہیں اور دوسرا پاکستان کے باہر وہ اپنے حق میں کانٹے بو رہے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ حکومت کی "پانچویں دستے" پر بڑی کڑی نگاہ ہے۔ اس سلسلے میں کسی کو چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان کسی قسم کی رعایت کی توقع نہیں کرنی چاہئے۔ انھوں نے یہ انکشاف بھی کیا کہ اس سلسلے میں ہندوؤں سے کہیں زیادہ مسلمان گرفتار کئے گئے ہیں۔

شہاب الدین صاحب نے اقلیت کو جو مشورہ دیا ہے اس میں شبہہ نہیں کہ وہ بہت ٹھیک ہے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہوں کی اقلیتوں کو آخری طور پر طے کر لینا چاہئے کہ انھیں کہاں رہنا ہے اور اس کا فیصلہ کر چکنے کے بعد انھیں پوری وفاداری اور خلوص کے ساتھ حکومت کے کاموں میں ہاتھ بٹانا چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ شروع میں انھیں بڑی مشکلیں اٹھانی پڑیں گی لیکن اس کے بعد جو سماج بنے گی وہ دونوں ملکوں میں سچی جمہوریت کا نمونہ پیش کر سکے گی۔ اسی کے ساتھ شہاب الدین صاحب سے بھی عرض کرنا ہے کہ وہ اقلیتوں کے جذبات اور شبہات کو بھی سمجھنے کی کوشش کریں۔ ایسی حالت میں جبکہ ہنوز پاکستان کا دستور تیار نہیں ہوا ہے اور وہاں ایسی جماعتوں کی کمی نہیں جو خالص مذہبی حکومت کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ اقلیتوں کے خدشے بے بنیاد نہیں ہیں۔ حکومت پاکستان کو چاہئے کہ ان کو مطمئن کرنے کے لئے کوئی ٹھوس قدم اٹھائے۔ اس سے ہندوستان کے ساتھ اس کے تعلقات پر بھی خوش گوار اثر پڑے گا۔

(ع، ل)

مشرقی دُنیا

یہ بغلی گھونسہ ہرا ہی

ایسے لوگوں کی تعداد کم نہیں جن کا خیال ہے کہ جنوبی مشرقی ایشیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی اصل ذمہ داری ماسکو پر ہے بہت پہلے جب یورپ میں کمیونسٹ اثرات کی قوت کم ہو رہی تھی تو یہ کہا گیا تھا کہ ممکن ہے کمیونسٹ پارٹیاں اب اپنی توجہ ایشیا کی طرف پھیر دیں۔ اٹلی میں کمیونسٹ پارٹی کی شکست کے بعد ہی ملایا کا جھگڑا شروع ہوا۔ اس طرح کے اور اتفاقات نے یہ موقع دے دیا ہے کہ اس ساری جدوجہد کو ایک پروگرام کا نتیجہ بتایا جائے جو ماسکو میں مرتب ہوا ہے اور جس کا مقصد ساری دنیا پر قبضہ جمانا ہے۔ اس میں کچھ تو اس بات کو دخل ہے کہ مغربی ممالک کے رہنما نو آبادیات کو کسی طرح چھوڑنا نہیں چاہتے، اور ان کے اس قبضے کو جائز ثابت کرنے کی صورت ایک ہی ہے کہ نو آبادیات کی جدوجہد کو جمہوریت اور کمیونسٹ استبداد کی کشمکش بتا کر اپنا الو سیدھا کیا جائے ان تحریکوں کا سلسلہ ماسکو تک پہنچانے کے لئے جن دلیلوں سے کام لیا گیا ہے وہ دلچسپ ہیں۔ جنوبی مشرقی ایشیا میں محض بنکاک ہی ایک جگہ ہے جہاں روس کا ایک لگیشن ہے اس کے روسی افسروں کی تعداد چالیس ہے چالیس افسر اتنی چھوٹی سی جگہ میں! اب زیادہ بحث و گفتگو کی ضرورت ہی کیا رہی؟ ظاہر ہے ان کا کام یہی ہو سکتا ہے کہ مشرقی ایشیا پر روس کا اقتدار قائم کرنے کی کوشش کریں بنکاک میں ایک ایشیا کی کومن فارم کا وجود ایک واقعہ کی حیثیت سے ساری دنیا کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ بنکاک میں برطانوی سفارت خانے کے اسٹاف کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہے۔ لیکن اس کے متعلق یہ نہیں کہا گیا کہ وہ وہاں مارشل سونگرام کی فوجی ڈکٹیٹر شپ کے لئے راستہ ہموار کرنے کا کام کر رہے ہیں کمیونسٹوں کی بین الاقوامی سازش کے لئے جہاں تک اس کا تعلق ایشیا سے ہے ایک اور دلچسپ بات بھی کہی گئی ہے۔ جنوبی مشرقی ایشیا کے واقعات کی کڑی پچھلے کمیونسٹ پارٹی کی کانفرنس سے جو پچھلے سال کلکتے میں ہوئی تھی جوڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگرچہ برما اور ملایا میں کہیں بھی یہ ثبوت نہیں مل سکا ہے کہ ماسکو نے یہاں کے کمیونسٹوں کی کوئی مدد کی ہے لیکن یہ الزامات اسی شد و مد سے دہرائے جا رہے ہیں۔

بھلا ہو انڈونیشیا کی کمیونسٹ جمہوریت کے لیڈروں کا کہ انھوں نے پروپیگنڈے کے لئے ایک نئی اور بظاہر قوی دلیل مہیا کر دی ہے۔ انڈونیشیا کی نئی کمیونسٹ جمہوریت جو ابھی قائم ہوئی ہے اس کے صدر موسو صاحب ہیں جو ۲۵ برس کی جلا وطنی کے بعد پچھلے ہی دنوں ماسکو سے انڈونیشیا واپس آئے ہیں۔ یہ پروپیگنڈا بہت زور شور سے جاری ہے، دیکھا ہم نہ کہتے تھے کہ کمیونسٹ نے ساری جنوبی مشرقی ایشیا پر قبضہ جمانے کی مکمل سازشیں کر لی ہیں۔ چنانچہ لندن ٹائمز نے کہا ہے کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ملایا میں عوام کی جدوجہد کے لئے نو آبادیاتی اور اجارہ دارانہ نظام کے مصائب ایک وجہ جواز تھے تو برما میں کمیونسٹ تحریک کے لئے کون سا جواز پیش کیا جا سکتا ہے جہاں کی حکومت اب سوشلسٹ ہے۔ اور انڈونیشیا میں تو کوئی وجہ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ جہاں کی حکومت عرصے سے سوشلسٹ چلی آ رہی ہے۔ ایک وقت وہ تھا کہ انڈونیشیا کی حکومت کے لیڈروں کو کمیونسٹ کہا جاتا تھا غنیمت ہے کہ اب ٹائمز نے ان کو کمیونزم کے الزام سے بری کر دیا ہے بہر حال انڈونیشیا کی کمیونسٹ بغاوت کے بارے میں ہمیں نہایت افسوس کے ساتھ ٹائمز سے اتفاق رائے کرنا پڑتا ہے۔

ملایا اور برما دونوں میں بلاشبہ کمیونسٹ تحریکوں کے پیدا ہونے کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ ملایا تو آبادیاتی استبداد کا شکار ہے۔ برطانوی حکومت نے پر امن سیاست کے نکتے پن کا تصور اس طرح لوگوں کے ذہنوں پر بٹھا دیا ہے کہ یہ خواہش ہوئی کہ تشدد کی زبان استعمال کی جائے جسے طاقتور حکومت سمجھتی ہے۔ زور پکڑ گئی تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ برما میں دائیں بازو کا اثر اتنا بڑھ گیا کہ تھاکن نو جیسا وزیر اعظم مجبور ہو کر رہ گیا۔ وہاں کمیونسٹ پارٹی اپنی حفاظت کے لئے بغاوت کرنے کا عذر پیش کر سکتی ہے۔

لیکن انڈونیشیا میں کمیونسٹ بغاوت کے لئے کوئی معقول وجہ نہیں، کہا گیا ہے کہ ڈاکٹر حطا نے ڈچ سے مل کر کمیونسٹوں کو ختم کرنے کا ارادہ کیا ہے اور اس لئے اپنے آپ کو اور آزادی اور جمہوریت کو بچانے کی خاطر یہ جہاد شروع کر رکھا ہے لیکن اس الزام کی کوئی بنیاد نہیں جس حطا کے خلاف آج کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر اپنا سارا زور خطابت ختم کر رہے ہیں اس میں وہ بھی ڈاکٹر محمد حطا کے ساتھ شریک تھے ڈچ حکومت کے متعلق ڈاکٹر حطا نے ابھی پچھلے ہی دنوں جس صاف گوئی سے کام لیا ہے اس کی روشنی میں ان پر ڈچ سے مل جانے کا الزام سراسر زیادتی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈچ حکومت سے بارہا بات چیت ہوئی اور ہر بار انڈونیشین حکومت کو ناکامی کے تلخ گھونٹ پینے پڑے ہیں۔ اس لئے وہاں انتہا پسندی کا جذبہ زور پکڑ گیا۔ یہ بات سمجھ میں بھی آ سکتی ہے لیکن اس صورت میں کمیونسٹ بغاوت کا مقصد ڈچ اقتدار کو نقصان پہنچانا ہونا چاہئے تھا، نہ یہ کہ جمہوریت کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا جائے۔

اس بغاوت کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ توقع تو صرف کمیونسٹ پارٹی ہی کو ہو سکتی ہے کہ وہ جمہوریت کو جھٹ پٹ ختم کر کے پھر ڈچ حکومت سے بھی نپٹ لے گی۔ بغاوت کے متعلق خبریں پوری طرح نہیں آ رہی ہیں۔ لیکن یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ یہ بغاوت خاصی وسیع ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جمہوریت کو اسے دبانے میں اچھی خاصی مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا۔ یہ کشمکش لمبی ہو سکتی ہے اور اس صورت میں ڈچ حکومت اسے مداخلت کا بہانہ بنا سکتی ہے ایسا ہوا تو یہ ڈچ حکومت کی بڑی زیادتی ہوگی۔ کیونکہ انڈونیشیا کے متعلق اور کچھ طے ہو نہ ہو یہ قطعی طور پر طے ہے کہ انڈونیشیا کے لوگ ڈچ اقتدار کے آگے سر جھکانے کو تیار نہیں۔ مگر ایسی انصاف پسندی کا ثبوت سامراجی طاقتوں نے کم ہی دیا ہے۔ اگر ڈچ حکومت بیچ میں کود پڑی تو جمہوریت کو کون بچا سکے گا جسے انڈونیشیا کے حالات سے کچھ بھی واقفیت ہے اسے یہ اندازہ ہوگا کہ ڈچ حکومت دوبارہ "پولیس ایکشن" کے لئے تیار بیٹھی ہے اور یہ صرف غیر ملکی رائے عامہ کا ڈر ہے کہ اس نے اس سلسلے میں آخری اقدام سے گریز کیا ہے۔ اب کمیونسٹ خطرے کی وجہ سے مغربی ملکوں کی رائے عامہ ڈچ حکومت کی تائید پر آمادہ ہو جائے گی۔ غرض انڈونیشیا کی کمیونسٹ پارٹی نے سامراج کا مقابلہ کرنے کے بجائے سامراج دشمن طاقتوں کو کمزور کرنے کا کام شروع کیا ہے جس کی دنیا میں کوئی ترقی پسند حمایت نہیں کر سکتا۔

چین کی قومی حکومت کا حال زار

پچھلے دنوں چینی کمیونسٹوں کو ایک بہت بڑی کامیابی ہوئی ہے۔ انھوں نے سنان پر جو ایک صوبے کا دار السلطنت ہے قبضہ کر لیا ہے۔ اس لڑائی میں انھیں صرف دس دن کوشش کرنی پڑی اور یہ اہم جگہ ان کے ہاتھ آ گئی اس سے نانکنگ کی حکومت کے وقار کو بہت دھکا لگے گا۔ لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس شہر کے فتح ہو جانے کی وجہ سے شمالی اور وسطی چین کے درمیان ایک اور شگاف پڑ جائے گا شمالی چین میں قومی حکومت کی فوجی حالت نازک ہو جائے گی۔ سنان پر حملہ ہوا تو قومی حکومت کی فوج بالکل تیار نہ تھی اور اسے بچانے کی کوشش بہت دیر میں شروع کی گئی۔ یہ بات اہم ہے کہ ڈویژنل کمانڈر جو اس شہر کی مدافعت پر مامور تھا اپنی فوج کے ساتھ چینی کمیونسٹوں سے مل گیا۔

پچھلے دنوں جو خبریں آئی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ چین میں قومی حکومت کی حالت اور بھی خراب ہو گئی ہے۔ کم سے کم امریکن اخبارات کی پریشانی سے یہی اندازہ ہوتا ہے اور چیانگ کائی شک کو ہر طرح کی مدد دینے کے مطالبے کئے گئے ہیں مشکل یہ ہے کہ اس وقت کیومنتانگ کی مدد جس طرح سے ہو رہی ہے اس سے کوئی کامیابی کی امید نہیں باندھی جا سکتی۔ لیکن امریکا میں مسٹر ڈیوئی جو ریپبلکن پارٹی کی طرف سے صدارت کے امیدوار ہیں چین کی قومی حکومت کو زیادہ سے زیادہ مدد دینے کے وعدے بڑے زور شور سے کر رہے ہیں۔ دیکھنا ہے کہ انتخاب کے بعد وہ ان وعدوں کو کہاں تک پورا کرتے ہیں۔ (ا۔س)

بزمِ بے تکلّف (بسلسلہ صفحہ ۴)

موجودہ عہد کے اخلاقی ضعف معدہ پر ملامت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آخر ہمارے بزرگ بھی تو تھے جو میر ضاحک اور سودا کی ہجویں جعفر زٹلی کی ہزل، رنگین اور جان صاحب کی ریختی شوق کی مثنویاں، یہاں تک کہ چرکین کی اسہالیات ہضم کر جاتے تھے اور ڈکار نہ لیتے تھے بیچارے نئے ادب کی عریانیات میں ملاحی صاحب کو خاک مزہ نہیں آتا۔ وہ تو اس آسیر کے قائل ہیں جس سے مرادآباد میں مردہ زندہ ہو جائے جیسا ج کل کی کسی تصنیف نہانی کا ذکر سنتے ہیں تو بڑے شوق سے منگوا کر پڑھتے ہیں اور مایوس ہو کر کہتے ہیں، "واہ سب دیکھ لیا" اس بہستے پر یہ تتا پانی !!

غزل

باقر مہدی

بادہ خانوں پہ کوئی شعلہ فشاں ہے کہ جو تھا
بزمِ رنداں میں وہی شورِ فغاں ہے کہ جو تھا

اُن کا اندازِ تغافل ہے وہی اے غمِ دل
یاں وہی دردِ وفا سب پہ عیاں ہے کہ جو تھا

عالمِ عشق میں آتے رہے لاکھوں طوفاں
دردِ دل اب بھی وہی نذرِ بتاں ہے کہ جو تھا

حسنِ آدم پہ خزاں چھائی ہوئی ہے کہ جو تھی
چمنِ دہر سے اٹھتا سا دھواں ہے کہ جو تھا

جگمگاتی ہوئی کرنوں سے سیاہی نہ مٹی
روحِ انساں پہ وہی بارِ گراں ہے کہ جو تھا

اپنی وحشت کے کرشموں کا تماشا کیسا
ابنِ آدم کا جنوں اب بھی جواں ہے کہ جو تھا

غزل

فرید بخش قادری

دیارِ شوق میں رسوا ہوئے ہیں فرزانے
انھیں فریب دیا اعتبارِ فردا نے

جنوں بھی خام ہے، ذوقِ طلب بھی خام ان کا
بھٹک رہے ہیں سرِ رہگذار دیوانے

خدا کرے کہ مجھے زندگی بھی راس آئے
زہے نصیب وہ آئے ہیں غم کو بہلانے

بلا سے ہجر میں تھی لذتِ طلب باقی
تمہارے آتے ہی پرواز کی تمنا نے

بس اتنا میں نے سنا تھا بہار آئی ہے
پھر اس کے بعد گلستاں میں کیا ہوا جانے۔

گلہ

طپش صدّیقی

گلہ نہیں مجھے اے طپش ان رفیقوں سے
جنھوں نے تیرگیِ غم میں ساتھ چھوڑ دیا
گلہ نہیں مجھے ماحول کے شکنجوں سے
جنھوں نے اک دلِ بیدار کو مروڑ دیا
گلہ نہیں مجھے غدّارِ غم گساروں سے
جنھوں نے بادۂ نو رس میں سم نچوڑ دیا
گلہ نہیں مجھے مذہب کے ناخداؤں سے
جنھوں نے رشتۂ انسانیت کو توڑ دیا
گلہ ہے مجھ کو خود اپنی بلند فطرت سے
کہ اس نے شانۂ احساس کیوں جھنجھوڑ دیا

عینک فروش

(بسلسلہ صفحہ ۹)

جو خام کار اسرار میں تنہائی اختیار کرتے ہیں۔ ان کے دل کا زنگ دور نہیں ہوتا۔ بلکہ ہوائے نفس سے اور گہرا ہو جاتا ہے۔ وہ ادنیٰ خواہشات و جذبات کی مستی کو نشۂ معرفت، غرورِ نفسانی کو تکمیلِ معرفت سمجھنے لگتے ہیں، خدا تک پہنچنے کا کوئی چھوٹا سا راستہ نہیں ہر سالک کو زندگی اور دنیا کی سنگلاخ راہوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ بے شک اس راہ میں راہزن بھی ہیں مگر اسی کے ساتھ رہنما بھی ہیں۔ ہر انسان اپنا اور دوسروں کا راہزن ہو سکتا ہے مگر راہنما بھی ہو سکتا ہے۔ یہی خیر و شر کا امکان زندگی ہے۔ یہی دنیا ہے۔ کمزور دل اِس دگدے سے کانپتے ہیں مگر مضبوط لوگ اس میں یک سوئی ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آپ کو کیا کرنا چاہئے۔ میں مفصل جواب دیتا مگر وقت کم ہے۔ یہ اسٹیشن جو آنے والا ہے اسی پر مجھ کو اترنا ہے۔ وہ دیکھئے سگنل گذر گیا اب صرف چند منٹ باقی ہیں۔ اس لئے میں آپ کے سوال کے جواب میں ایک شاعر کے چند شعر پڑھتا ہوں جس نے زندگی کے راز کو سمجھا بھی اور اپنی زبان میں سمجھا بھی دیا سنئے ؎

کاٹئے دن زندگی کے ان یگانوں کی طرح
سعی سے اُکتاتے اور محنت سے کنیاتے نہیں
رسم و عادت پر ہیں کرتے عقل کو فرماں روا
شادمانی میں گذرتے اپنے آپے سے نہیں
رکھتے ہیں تسکیں جوانی میں بڑھاپے سے سوا
بلتے ہیں اپنوں میں غیروں سے سوا بیگانگی
آس کھیتی کے پنپنے کی اُنھیں ہو یا نہ ہو!
کام سے کام اپنے ان لوگو ہو عالم نکتہ چیں
طعن سُن سُن احمقوں کے ہنستے ہیں دیوانہ وار

جو سدا رہتے ہیں چوکس پاسبانوں کی طرح
جھیلتے ہیں سختیوں کو سخت جانوں کی طرح
نفس پر رکھتے ہیں کوڑا حکمرانوں کی طرح
غم میں رہتے ہیں شگفتہ شادمانوں کی طرح
سہتے ہیں جو نچال پیری میں جوانوں کی طرح
پر بھلا تکتے ہیں اِک اِک کا یگانوں کی طرح
ہیں اسے پالی ہوئے جاتے کسانوں کی طرح
رہتے ہیں بتیس دانتوں میں زبانوں کی طرح
دن بسر کرتے ہیں دیوانوں میں سیانوں کی طرح

لیجئے وہ اسٹیشن آگیا۔ اب میں جاتا ہوں۔ خدا حافظ، میں آپ سے یہ نہیں پوچھتا کہ آپ نے اپنا قصد بدلا یا نہیں۔ کیونکہ جب میں نے آپ کو خدا کی حفاظت میں دے دیا تو پوچھنے کی ضرورت کیا اور میں پوچھنے والا کون۔ آیئے مصافحہ کر لیجئے۔ خدا حافظ "

یہ کہہ کر پیرِ مرد نے اپنا ہینڈ بیگ سنبھالا اور گاڑی سے اتر کر چل دئے۔ مجھے بھی اس اسٹیشن پر اتر کر گاڑی بدلنا تھی۔ میری گاڑی سامنے کھڑی تھی۔ صرف پلیٹ فارم درمیان میں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ذرا ٹھہر کر کسی طرح یہ معلوم کر لوں کہ نوجوان کا ارادہ اب کیا ہے مگر اتنے میں میری گاڑی نے سیٹی دی اور میں مجبوراً اترا اور دوڑ کر بدحواسی میں ایک دوسرے درجے کے ڈبے میں گھس گیا۔ چلتے چلتے میں نے دیکھا کہ نوجوان سر جھکائے گہری فکر میں ڈوبا ہوا بیٹھا ہے اور موٹے مسافر کھڑکی سے سر نکالے بھونڈے لحنِ شدادی میں چائے والے کو پکار رہے ہیں۔

عینک فروش

ڈاکٹر سید عابد حسین

ڈاک گاڑی اپنی پوری رفتار سے چل رہی تھی۔ مجھے معمولی سواری کی رفتار سے بھی وحشت ہوتی ہے اور ڈاک گاڑی کی تیزی سے تو اختلاج ہونے لگتا ہے۔ اکثر یہ خیال آتا ہے کہ اگر خدانخواستہ میرے سفر کی سمت غلط ہو تو جتنی تیز یہ گاڑی چلے گی اتنی ہی میں منزل مقصود سے دور ہو جاؤں گا۔ پھر سوچتا ہوں کہ یہی صورت زندگی کے سفر کی ہے۔ سست قدم راہ رو اگر غلط راہ بھی اختیار کر لے تو دن بھر میں منزل سے دور نہ ہٹے گا لیکن وہ مسافر جو برق رفتار مرکب پر سوار ہے راہ سے بے راہ ہو جائے تو دم بھر میں خدا جانے کہاں جا پہنچے گا۔ عقل کہتی ہے کہ یہ منطق غلط ہے۔ تیز چلنے والا تیزی سے واپس بھی آ سکتا ہے۔ مگر جو شخص قدم گن گن کر رکھتا ہے اُسے آدھی دور سے لوٹنا پڑے تو جانے میں جتنی دیر لگی تھی اتنی ہی آنے میں لگے گی۔ کس کی مجال ہے کہ ریاضی کی اس مساوات سے انکار کرے مگر یہ بتائیے کہ پچھلے ہفتے جب میں دلی سے لاہور جانا چاہتا تھا اور غلطی سے بمبئی کی ڈاک میں بیٹھ کر جھانسی جا پہنچا، آٹھ گھنٹے تک واپسی کے لئے پسنجر بھی نہ ملی، اس وقت یہ مساوات کہاں چلی گئی تھی۔ اس وقت میں ریاضی سے سر پھوڑتا یا منطق کو لے کر چاٹتا۔ ریاضی اور منطق کی صحت مسلم مگر زندگی میں ان کا استعمال اتنا سہل نہیں جتنا لوگ سمجھتے ہیں۔ غرض مجھے ڈاک گاڑی کی رفتار سے ڈر لگتا ہے۔ میرا سر چکرا جاتا ہے، طبیعت بے قابو ہو جاتی ہے۔ بات بات پر غصہ آتا ہے۔ ہر شخص سے لڑنے کو جی چاہتا ہے۔ اس میں منطقی دلیل یا ریاضی کی مساوات کو کوئی دخل نہیں۔

میں ڈیوڑھے درجے کے ایک چھوٹے سے ڈبے میں بیٹھا تھا جس میں آمنے سامنے صرف دو بنچیں تھیں۔ میرے علاوہ تین مسافر اور تھے۔ ان میں سے ایک پہلی نظر میں موٹے معلوم ہوتے تھے۔ دوسری نظر میں اُس سے بھی زیادہ موٹے اور تیسری نظر میں یہ انکشاف ہوتا تھا کہ گو ان کی آنکھیں کھلی ہیں اور منہ بھی کھلا ہے مگر وہ سو رہے ہیں۔ یہ بزرگ میرے سامنے کی پوری بنچ پر پھیلے ہوئے بیٹھے تھے اور جب کبھی میں نظر اٹھاتا تھا مجبوراً ان کے چہرے کی زیارت ہوتی تھی۔ مجھے ان کے موٹاپے سے اور ان کے یوں بے ساختہ سونے سے بڑی کوفت ہوتی تھی اور جب یہ سوتے سوتے جوش میں آ کر خراٹے بھی لینے لگتے تھے تب تو بے ساختہ جی چاہتا تھا کہ بقیہ دو مسافروں کی مدد سے انھیں اُٹھا کر کھڑکی سے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ دروازے سے باہر پھینک دوں۔

میری بنچ کے ایک سرے پر میں تھا اور میرے داہنے ہاتھ پر ایک نوجوان بیٹھے تھے جن کے چہرے سے کسی گہرے صدمے کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ ان کے لب خشک تھے۔ چہرے کا رنگ زرد تھا، اور آنکھوں کی بے حالی سے دل کی بے چینی ٹپک رہی تھی۔ بنچ کے دوسرے سرے پر ایک پیر مرد، نیم دیسی، نیم انگریزی وضع کے تشریف فرما تھے جنھیں میں نے اکثر ریل میں سفر کرتے دیکھا تھا۔ ان کے ساتھ ایک چمڑے کا ہینڈ بیگ تھا جس پر ان کا نام اور پتہ لکھا ہوا تھا۔ میں نے اس سے پہلے کئی بار اسے پڑھنے کی کوشش کی مگر چونکہ کھٹکا رہتا تھا کہ وہ میرے اس خلاف تہذیب تجسس کو نہ دیکھ لیں اس لئے کبھی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ آج موقع پا کر میں نے اتنا معلوم کر لیا کہ وہ عینک کے ایک مشہور کارخانے کے ایجنٹ ہیں۔ نام دوسری طرف تھا اُسے نہ پڑھ سکا۔

میں خود ریل میں باتیں نہیں کرتا، اور چاہتا ہوں کہ کوئی نہ کرے۔ اس لئے حتی الامکان خالی درجے میں بیٹھا کرتا ہوں۔ مگر ڈیوڑھے درجے میں خالی ڈبہ تقدیر ہی سے ملتا ہے۔ آج میرے ساتھ تین مسافر تھے۔ مگر بظاہر ان میں سے کسی سے یہ اندیشہ نہ تھا کہ زیادہ باتیں کرے گا۔ سامنے کی بنچ والے خواہ مخواہ مردم آزاری کا شمار تو اس قسم حیوان ناطق کی ذیل میں تھا ہی نہیں، رہے وہ دونوں حضرات جو میری بنچ پر تھے، ان میں سے نوجوان تو بے چارے حزن و ملال کی تصویر بنے ہوئے تھے اور پیر مرد عینک فروش کسی کتاب کے مطالعے میں غرق تھے۔ اس لئے میں اطمینان سے بیٹھا گاڑی الٹنے، پل ٹوٹنے، آدمیوں کے گرنے، کچلنے، مرنے کے تصور سے اپنے دل کو دہلانے اور پریشان کرنے کا سامان کر رہا تھا۔

گاڑی ...... اسٹیشن پر رکی۔ باہر کی چہل پہل کے اثر سے ہمارے چھوٹے سے حلقے میں بھی کچھ حرکت پیدا ہوئی۔ ہمارے نوجوان رفیق گھبرا کر اس انداز سے اُٹھے گویا یہیں اُترنا چاہتے ہیں۔ مگر جب انھوں نے کھڑکی کے پاس جا کر اسٹیشن کا نام پڑھا تو کسی قدر مایوسی کے ساتھ آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ موٹے مسافر نے بھی گاڑی ٹھہرتے ہی آنکھ کھولی اور بیٹھے ہی بیٹھے اسٹیشن کی طرف مڑ کر گردن کھڑکی میں سے نکالی۔ انھوں نے اس کریہہ آواز سے جو شاید نزع کے وقت انجن کے گلے سے نکلتی ہوگی، سودے والے کو بلایا اور تھوڑی دیر میں ان کی بنچ کے ایک کونے میں مٹھائی، پوری، کباب، دہی بڑے، ککڑی، امرود، الم غلم کا ایک ڈھیر لگ گیا۔ میں سمجھا کہ شاید انھیں کئی دن تک مسلسل سفر کرنا ہے۔ اس لئے انھوں نے یہ ذخیرہ جمع کر لیا ہے۔ لیکن جب انھوں نے نیت باندھ کر کھانا شروع کیا تو میرے دیکھتے ہی دیکھتے چند منٹ میں وہ سارا سامان رسد ان کے صندوق شکم میں جا کر غائب ہو گیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر انھوں نے ایک بڑا سا لوٹا اٹھایا اور منہ سے لگا کر ایک سانس میں خالی کر دیا۔ پھر آستین سے منہ پونچھا، ڈکار لی، گاڑی کی دیوار کے سہارے سے پھیل کر بیٹھ گئے۔ آنکھیں بند کر لیں اور چشم زدن میں جہاں سے آئے تھے وہیں پہنچ گئے۔

میں اس روح فرسا نظارے کو دیکھ کر دل میں کڑھ رہا تھا کہ گاڑی چلی، اور پیر مرد نے جو اب تک برابر مطالعے میں مصروف تھے دفعتہً کتاب بند کر دی اور نوجوان مسافر کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگے: "آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟" یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مجھے یہ بات بے حد ناگوار ہوئی۔ مغربی تہذیب میں اگر مجھے کوئی اصول پسند ہے تو یہ کہ جس شخص سے تعارف نہ ہو اس سے بے ضرورت گفتگو کرنا جائز نہیں۔ میرا جی چاہا کہ ان سے پوچھوں آپ کو ایک اجنبی سے اس طرح سوال کرنے کا کیا حق ہے مگر خیال ہوا کہ کہیں وہ نہ کہہ بیٹھیں کہ تمہیں دخل در معقولات کا کیا حق ہے۔ اس لئے میں خاموش ہو رہا لیکن دل میں دعا مانگتا تھا کہ نوجوان پیر مرد کی اس جسارت پر ناپسندیدگی کا اظہار کریں مگر نوجوان نے کھوئی ہوئی آواز میں صرف اتنا کہا "کیا عرض کروں، کہاں جا رہا ہوں۔" اب مجھے یقین ہو گیا کہ گفتگو کا سلسلہ چلا اور دور تک چلا۔ غصہ تو مجھے ضرور آیا مگر اس کے ساتھ یہ اشتیاق بھی تھا کہ نوجوان کی اس شکستہ دلی اور مایوسی کی وجہ معلوم ہو۔ بظاہر تو میں منہ پھیر کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا مگر کان ان دونوں کی گفتگو پر لگے تھے۔

"آپ بہت اُداس معلوم ہوتے ہیں۔"

"جی ہاں کچھ ایسی پریشانیاں ہیں۔"

"آخر معلوم تو ہو وہ کون سی ایسی بات ہے جس نے آپ کو شگفتگی کے موسم میں پژمردہ کر دیا ہے۔ میری اس بے تکلفی کو معاف کیجئے۔ میں بے فائدہ دوسروں کے حالات کا تجسس نہیں کرتا۔ آپ سے یہ سوال اس لئے پوچھتا ہوں کہ شاید آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔"

"میں آپ کی اس بزرگانہ شفقت کا شکر گزار ہوں مگر میری مدد دنیا میں کوئی نہیں کر سکتا۔"

"آپ کیوں میرا حوصلہ پست کرتے ہیں، اپنی سی کوشش تو کرنے دیجئے۔"

"جب آپ کی کوشش ناکام ہوگی تو حوصلہ اور زیادہ پست ہوگا۔"

"نہیں ایسا نہیں، راہ سعی میں پیروں کا تھک جانا اس سے اچھا ہے کہ آرزوئے سعی میں دل ڈوب جائے۔"

"شاید ہو مگر میرا تجربہ اس کے خلاف ہے۔ میں تو اسی سعی ناکام کا کشتہ ہوں اور اب سعی، کوشش، عمل کے نام سے کانپتا ہوں۔ آپ نے دریافت کیا تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں، میں وہاں جاتا ہوں جہاں انسان دنیا کے شور و شر سے امین، زندگی کی کشمکش سے محفوظ، امن و عافیت سے دن گزار سکتا ہے۔ جہاں نہ اُسے بھائیوں کی غفلت، جہالت، پستی، نکبت کے منظر آنکھوں سے دیکھنا پڑیں گے، اور نہ ان کی نامہربانی، ناشکرگزاری، احسان فراموشی، کینہ پروری کے زخم سینے پر کھانا پڑیں گے، جہاں نہ وہ اپنی قوم کے تنزل و انحطاط سے تڑپے گا اور نہ اس کی اصلاح کی کوشش کر کے پچھتائے گا۔ میں آبادی سے دور پہاڑوں پر جا رہا ہوں کہ وحدت کی مومیائی سے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑوں۔ خلوت کے دامن میں بکھری ہوئی طبیعت کو سمیٹوں، باہر کی دنیا سے آنکھ بند کر لوں، اور اندر کی دنیا کو آنکھ کھول کر دیکھوں۔"

"مگر یہ تو معلوم ہو کہ ہماری دنیا نے آپ کا کیا بگاڑا ہے جو آپ اس سے اس قدر بیزار ہیں۔"

"سنئے صاحب میرے لئے دنیا ہندوستان ہے اور یہی ہو سکتا تھا۔ یہی وہ زمین ہے جس میں میری زندگی کی جڑیں پھیلی ہوئی ہیں اور یہیں میرا شجر حیات پنپ سکتا تھا۔ اب آپ یہ پوچھئے کہ ہندوستان نے میرا کیا بگاڑا ہے۔ اس کا میں جواب دیتا ہوں۔ مگر میرا دل یہ کہانی کہتے دکھتا ہے اور آپ کا دل اسے سن کر دکھے گا۔ آہ اس بدنصیب ملک نے مجھ سے وہ دولت چھین لی جو زندگی کا سہارا ہے یعنی عقیدہ اور امید اور مجھے وہ چیز دے دی جو موت کا پیام ہے یعنی انکار اور مایوسی۔ جب میں نے اپنے آپ کو دل و جان سے اس کی خدمت کے لئے وقف کیا تھا اس وقت میرا سینہ عقیدے کے نور سے معمور تھا اور میرا دل امید کے ولولے سے لبریز۔ میں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی خدمت کا بیڑا اٹھایا تھا اور چاہتا تھا کہ ان کو نئے دور کے دوش بدوش جنگ آزادی کے میدان

میں اور گمراہ کر دوں۔ مجھے یقین تھا کہ ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایمان ہے، خلوص ہے، درد ہے، قابلیت ہے، ذہانت ہے، جفاکشی ہے، صبر ہے، استقلال ہے، صرف ہمت، عزم اور جوش کی کمی ہے۔ مجھے اُمید تھی کہ یہ چیزیں ذرا سی کوشش سے پیدا ہو جائیں گی جس طرح مستوں کے لئے ایک الاپ، دیوانوں کے لئے ایک ہو، عقل مندوں کے لئے ایک اشارہ کافی ہے۔ اسی طرح ہندوستانیوں کے لئے صرف ایک ترانۂ امید، ایک نعرۂ مستانہ چاہئے۔ یہ آواز کانوں میں پہنچتے ہی وہ اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ غلامی کا طوق اُتار کر پھینک دیں گے، جہالت کی بیڑیاں توڑ کر رکھ دیں گے۔ اور پھر ہندوستان میں ایک عظیم الشان قومی تمدن کی بنیاد پڑے گی جو ساری دنیا کے لئے باعث حیرت اور قابل تقلید ہوگا۔ یہ تھا میرا عقیدہ، یہ تھی میری اُمید۔

مگر افسوس کیا سمجھا تھا اور کیا نکلا۔ میں اور مجھ جیسے دوسرے تعلیمیں اُٹھا کر، لڑیاں جھیل کر سارے ملک میں پھرے کہ سوتوں کو جگائیں، رہ نوردوں کو رہنمائی کا پیام پہنچائیں۔ سونے والے اُٹھے، مسافروں نے آگے قدم بڑھایا، اور جوش و خروش سے ہمت و استقلال سے بڑھتے ہی چلے گئے یہاں تک آزادی کی منزل آ گئی۔ مگر افسوس صد افسوس منزل پر پہنچ کر راہ طلب کے رہروؤں میں پھوٹ پڑ گئی۔ آزاد ہونے سے پہلے غریب ہندوستان کے بڑی بے دردی سے دو ٹکڑے کر دئے گئے۔ اس خوفناک عمل جراحی کے بعد ملک کے مجروح جسم سے اس قدر خون بہا کہ اس پر غشی سی طاری ہو گئی۔

ہندوستان کے ضعف نے سب جماعتوں کے قلب و دماغ کو ضعیف کر دیا۔ ہندو، غصّے، بیزاری اور شک کی ہسٹریا، خوف، کھسیان پن اور ضد کی نفسی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے۔ مسلمانوں پر سب سے بڑی مصیبت یہ آئی کہ اس نازک وقت میں کوئی ان کی رہنمائی کرنے والا نہ رہا۔ ان کے کچھ رہنما راہزن نکلے اور کچھ راہ سے نابلد، ان میں سے بعض اپنے پیروؤں کو دوسرے کر چل دئے اور بعض ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے اور اس پر جھگڑنے لگے کہ دائیں کو مڑیں یا بائیں کو، آگے بڑھیں یا پیچھے ہٹیں۔ یہ نتیجہ ہوا سالہا سال کی کوشش کا، یہ پھل ملا دقتوں کی ریاضت کا۔ میرا تو یہ دیکھ کر دل چھوٹ گیا، ہاتھ پیر شل ہو گئے، زبان بند ہو گئی، افسردگی دل و دماغ پر مسلط ہو گئی۔ مایوسی رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ میں نے سمجھا کہ یہ ہندوستانی مسلمان ہمیشہ غفلت کی نیند سوتے رہیں گے، ناکامی اور ذلت اُٹھاتے رہیں گے۔ مجھ میں یہ جانکاہ نظارہ دیکھنے کی تاب نہیں اس لئے میں آبادی سے منہ موڑ کر کوہ و بیابان کی طرف جا رہا ہوں، تاکہ کم سے کم اپنی روح کو اس ندامت اور پستی سے بچاؤں اور تزکیۂ نفس و تصفیۂ قلب کے ذریعے سے معرفت اور نجات حاصل کروں۔"

مجھے خوشی تھی کہ نوجوان کی آنکھوں سے فریب ہستی کا پردہ اُٹھ گیا ہے لیکن یہ افسوس تھا کہ اس پر بجائے طیش کے یاس کا غلبہ ہو گیا ہے۔ میں تو اسے یہ رائے دیتا کہ دنیا سے پیچھا چھڑانے کی جگہ دنیا کے پیچھے پڑ جائے، سست قدم رہ نوردوں کو ملامت کرے اور جھوٹے رہنماؤں کی قلعی کھولے۔ بہر حال میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ پیر مرد پر اس گفتگو کا کیا اثر ہوا، اس لئے میں نے ذرا سا مڑ کر کنکھیوں سے ان کے چہرے کو دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ ایک لمحے تک مجھے ہمدردی کے، افسوس کے، دُکھ کے آثار نظر آئے مگر فوراً ہی یہ کیفیت جاتی رہی اور وہی سکون و اطمینان اور خفیف سا تبسم جو پہلے تھا پھر نظر آنے لگا۔ انھوں نے نوجوان سے مخاطب ہو کر کہا:-

میں نے آپ کی داستان بہت غور سے سُنی اور میرے دل پر اس کا بڑا گہرا اثر ہوا، مگر ایک بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ جب آپ کا جذبۂ محبت سچا تھا تو آپ نے انجام کی فکر کیوں کی۔ پروانہ جس کی فطرت میں جلنا ہو کامیابی اور ناکامی سے غرض نہیں رکھتا۔ شمع جس کی سرشت میں گھلنا ہے، یاس اور اُمید کی پابند نہیں ہوتی۔ مستی میں یہ ہوشیاری کیسی؟ دیوانگی میں یہ تدبیر کیوں؟ آپ کی طرف سے سعی اور خدا کی طرف سے اتمام، آپ نے اپنا کام کرتے کرتے خدا کے کام کی فکر اپنے سر کیوں لے لی؟

"جناب انسان کو جس نے عشق دیا ہے اسی نے عقل بھی دی ہے اور تدبر، تعقل، تفکر کی تاکید بھی کی ہے۔ انسان نہ پروانہ ہے کہ حسن سوز نہ کی ایک جھلک دیکھ کر دیوانہ وار جل مرے اور نہ شمع کہ عشق سوزاں کی آنچ اور آہ میں گھل گھل کر مر مٹے۔ اس کی مستی ہوشیاری کے سہارے جیتی ہے۔ اس کی دیوانگی دانائی کے پروں پر اُڑتی ہے۔ عشق انسان کے دل میں شوق منزل پیدا کرتا ہے اور ذوق سفر، عقل اسے راہ سجھاتی ہے اور اس کے لئے زاد راہ فراہم کرتی ہے۔ میرا جذبۂ محبت تو خیر جیسا کچھ ہے میں جانتا ہوں۔ لیکن میری عقل کہتی ہے کہ ملک و قوم کے بننے کی کوئی اُمید نہیں تو اپنی روح کو بچا اور اس کی بالیدگی کا سامان کر۔"

"الحمد للہ کہ آپ عقل کے قائل ہیں اور اسے عشق کا دست و بازو سمجھتے ہیں۔ ورنہ ہمارے اہل حال کے یہاں تو عقل بے چاری راندۂ درگاہ ہے۔ اس لئے کہ وہ عشق کی ضد سمجھی جاتی ہے۔ آپ نے جو کچھ ابھی فرمایا اس کے سبب سے گفتگو میں بڑی آسانی ہو گئی۔ عقل کا قدم درمیان رہے تو باہمی مفاہمت ممکن ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ آپ کی ہنگامۂ زندگی سے مایوسی اور گوشۂ خلوت کی طلب عقل پر مبنی ہے یا محض جذبات کے ردعمل کا نتیجہ ہے۔ پہلے اس پاس کو لیجئے۔ آپ کی باتوں سے یہ معلوم ہوا کہ آپ کی مایوسی خدا نخواستہ نظام عالم اور قانون زندگی سے نہیں ہے۔ بلکہ انسانوں سے ہے۔ اپنے ملک کے مسلمانوں سے ہے۔ آپ کو یہ بدگمانی نہیں کہ دنیا میں سعی اور عمل، خلوص و ایثار، پامردی اور استقلال کا پھل نہیں ملتا بلکہ یہ گمان ہے کہ آپ کی جماعت ان چیزوں سے محروم ہے۔ آپ کے دل میں یہ وسوسہ نہیں کہ رحمت ایزدی مستحقوں کو نہیں پہچانتی یا جان بوجھ کر ان سے روگردانی کرتی ہے بلکہ یہ خدشہ ہے کہ آپ کے بھائی اس رحمت کے مستحق نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ اس اتھاہ مایوسی سے بچے ہوئے ہیں جو روح کے لئے دائمی موت ہے۔ مگر یہ دوسری قسم کی مایوسی یعنی اپنی جماعت کی طرف سے ناامیدی جو آپ کے سر پر منڈلا رہی ہے یہ بھی کچھ کم مہلک نہیں، اگر سچی ہو، مگر مجھے یقین ہے کہ یہ سچی اور پائدار مایوسی نہیں بلکہ ایک عارضی افسردگی ہے جو جوش کی حد سے بڑھ جانے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ اگر آپ تاریخ عالم کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو کہ قوموں کی زندگی کے اُتار چڑھاؤ کا اندازہ مہینوں اور برسوں سے نہیں قرنوں اور صدیوں سے کیا جاتا ہے، ہندوستان بلکہ ایشیا کی پچھلی نصف صدی کی تاریخ آپ کو یہ بتائے گی کہ اکثر قوموں میں خصوصاً مسلمانوں میں ایک عام بیداری پیدا ہوئی ہے۔ دنیا کے اہل الرائے اس پر متفق ہیں کہ لوگ خواب غفلت سے چونک اُٹھے ہیں۔ ان کی رگوں میں زندگی کا خون جو اب تک منجمد تھا پھر گردش کر رہا ہے۔ انھوں نے راہ عمل پر چلنا بلکہ دوڑنا شروع کر دیا ہے۔ ٹھوکریں کھاتے ہیں، مگر سنبھل جاتے ہیں، تھک کر بیٹھتے ہیں مگر پھر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

کوئی اس کا دعوے نہیں کر سکتا کہ اسے انجام کا یقینی علم ہے۔ بڑے سے بڑا دانشمند علامات پر حکم لگاتا ہے اور علامات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ترقی کی لہر جو اُٹھی ہے یہ اب رکنے والی نہیں۔ یہ لوگ جو اس راہ پر گامزن ہیں بہت بھٹکیں گے، بہت نشیب و فراز دیکھیں گے۔ مگر ایک نہ ایک دن منزل پر ضرور پہنچیں گے۔ سلسلۂ کوشش کبھی رائگاں نہیں جاتی۔ زندگی کا یہ قانون ہے، دنیا کا یہ دستور ہے، خدا کا یہ وعدہ ہے۔

آپ جس تحریک کی ناکامی کو رو رہے ہیں وہ ہندوستانی قومیت کے سلسلے کی کڑی تھی۔ اس کا لوہا کمزور تھا جب زندگی کے جھٹکے پڑے تو ٹوٹ گئی۔ اس پر فریاد کرنا نادانی ہے اور اس سلسلے کو ناتمام چھوڑنا بزدلی ہے۔ لوہے کو کچھ دن آگ میں تپنے اور ہتھوڑے کی چوٹ کھانے دیجئے کہ وہ فولاد بن جائے، پھر نئی کڑی میں لڑی پڑتی جائے گی، سلسلہ بڑھتا جائے گا اور توڑنے والوں کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔"

خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ تو اس وقت میرے حق میں مسیحا ہو گئے۔ آپ کی باتوں کا جو اثر دل پر ہوا ہے اس کا پورا اندازہ تو بعد میں ہوگا مگر اس وقت معلوم ہو رہا ہے کہ جیسے تیز بخار بعد مدت کے اترا ہو۔ مایوسی کی کیفیت میرے دل سے کچھ یہ بالکل جاتی رہی۔ اور اُمید کا ایک ہلکا سا رنگ چھا گیا۔ مگر یہ تو فرمائیے کہ میں اب کیا کروں؟ جو قصد کر چکا ہوں اُسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا مگر یہ خیال ہوتا ہے کہ صحرا نوردی کی ایک مدت معین کر لوں اور اسے پورا کر کے واپس آ جاؤں۔ آپ فرماتے ہیں کہ لوہے کو فولاد بنانا چاہیئے۔ لیکن لوہا اگر زنگ آلود ہو تو اس پر صیقل کرنے کی ضرورت ہو اور اس کی صورت یہی نظر آتی ہے کہ انسان کچھ دن تنہائی میں ریاضت کرے۔ دنیا کی آلائشوں میں رہ کر تو یہ کثافت دور نہیں ہوتی۔"

"آپ کا یہ حسن ظن جو میرے حق میں اور خود اپنے حق میں ہے صحیح نہیں۔ آپ کا بخار اگر اُترا ہے تو اس کا سبب یہی کہ خود آپ کی طبیعت میں مرض کو دفع کرنے کی قوت موجود تھی اور ایک ذرا سا سہارا ڈھونڈتی تھی۔ آپ کی مایوسی اگر دور ہوئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے نیچے امید کی نہر ابھرنے کو مستعد تھی اور ایک ہلکی سی چھیڑ کی منتظر تھی۔ میں نے طبیب کا کام نہیں کیا بلکہ ایک معمولی تیماردار کا۔ اب رہا آپ کا یہ خیال کہ آپ تنہائی کی زندگی میں محض اپنی قوت سے تزکیۂ نفس کے ہفت خواں کو طے کر لیں گے۔ یہ بہت بڑا دھوکا ہے۔ جس منزل کو آپ ابتدائی منزل سمجھتے ہیں یہ آخری منزل ہے۔ خلوت کے سکون کا انعام اسی کو ملتا ہے جو جلوت کی سعی کے امتحان میں پورا اُتر چکا ہو۔ لوہے کا زنگ وہی زندگی کی آگ دور کر سکتی ہے جو اُسے فولاد بناتی ہے۔ اس کے بعد کہیں وہ وقت آتا ہے کہ فولاد جلا پاتے پاتے شیشہ بنے

(بقیہ صفحہ ۔ پر)

دور کے ڈھول سہانے

(ادیبہ)

صالحہ عابد حسین

ادیبہ کا نام سنتے ہی ہم لوگ عجیب قیاس آرائیاں کرنے لگتے ہیں۔ اس کی صورت کے بارے میں یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ کم سے کم اپنے قصوں کی ہیروئن جیسی حسین ہوگی۔ اس کے چہرے سے سلیقت اور لیاقت ٹپک رہی ہوگی، اس کی گفتگو میں ڈراما کے مکالموں کا سا انداز ہوگا، غرض عام انسانوں، معمولی عورتوں سے بالکل الگ کچھ یونانی دیوی منروا سے ملتی جلتی ہوگی۔ اور کیوں نہ ہو؟ اس کے دماغ میں مضمون، افسانے اور ناول پرورش پلتے ہیں، وہ کرداروں کی خالق ہے، اپنے قلم کی معمولی جنبش سے جیتے جاگتے، ہنستے بولتے انسان پیدا کر دیتی ہے لیکن جب خوش قسمتی یا بدقسمتی سے کسی ادیبہ یا مصنفہ سے ہماری ملاقات ہوتی ہے تو اکثر یہ خیالی قلعے مسمار ہو جاتے ہیں۔ ہمارے دل کو ایک دھچکا سا لگتا ہے؛ ارے یہی ہیں وہ مشہور و معروف ادیبہ؟ انہیں کی اس قدر شہرت ہے؟ بھئی ہماری نظر میں تو کچھ جچیں نہیں بھلا یہ کیا خاک لکھتی ہوں گی۔

بے شک حقیقی فن کار میں، بعض باتیں ضرور عام لوگوں سے مختلف اور غیر معمولی ہوتی ہیں۔ مگر مشکل یہی ہے کہ وہ آپ اس کے چہرے پر لکھی ہوئی نہیں دیکھ سکتے۔ اس کی صورت، گفتگو، طرز زندگی اور روزمرہ کے مشاغل عام طور پر ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے دوسروں کے۔ فرق جو کچھ ہے وہ دل و دماغ کے لحاظ سے ہے۔ اس کا مشاہدہ گہرا اور تخیل بلند ہوتا ہے اور یہی احساس کی شدت، مشاہدہ کی گہرائی، تخیل کی بلندی فن کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ سچا فن کار اپنے فن کا اظہار نہ لوگوں کو متحیر اور مسحور کرنے کے لئے کرتا ہے نہ تعریف و تحسین کا خراج وصول کرنے کے لئے اور نہ روپیہ کمانے کی خاطر۔ بلکہ اس کی اندرونی کیفیات اور جذبات ذوق اظہار سے مجبور ہو کر اپنے لئے کوئی پیکر تلاش کر لیتی ہیں۔ کبھی وہ پتھر کے بے حس ٹکڑے میں جان ڈال کر بت تراش کہلاتا ہے، کبھی موقلم اور رنگوں سے کاغذ کے ورق کو زندہ جاوید بنا کر مصور کا لقب پاتا ہے، کبھی الفاظ میں شعر کا اعجاز دکھا کر پیمبر سخن بنتا ہے اور کبھی نثر میں اپنے احساس و جذبات کا اظہار کر کے ادیب کہلاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ادیب کی ان خصوصیات میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں کہ وہ دیکھنے میں دوسرے انسانوں سے مختلف معلوم ہو۔

اور پھر ادیب یا ادیبہ کے متعلق یہی نہیں اور بھی بہت سی غلط فہمیاں لوگوں کو ہوتی ہیں۔ بظاہر لوگ سمجھتے ہیں بھئی کیا قسمت کے دھنی لوگ ہیں۔ محفلوں اور جلسوں میں انہیں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے لوگ گھیر کے دنیا بھر کی باتیں پوچھتے ہیں، نو عمر لڑکے لڑکیاں اپنی آٹوگراف بک میں ان کے دستخط لیتے ہیں، رسالوں اخباروں میں ان کی تعریف کی جاتی ہے اور ان کے کتابوں کے اشتہاروں میں تو کچھ نہ پوچھئے، تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے جاتے ہیں........ بھئی کیا خوش قسمت لوگ ہیں دو چار قصے کہانیاں لکھ کر مفت کی شہرت اور عزت مل گئی۔ کاش لوگ یہ جانتے کہ فطری اور سچے ادیب کا مقصد کبھی سستی شہرت یا ظاہری عزت حاصل کرنا نہیں ہوتا اور اس کی راہ میں ایسی ایسی مشکلیں ہوتی ہیں کہ اگر وہ اپنی فطرت سے مجبور نہ ہو تو کبھی لکھنے کی مصیبت اپنے سر نہ لے۔

دنیا میں عورت پر ایک تو یوں ہی قدرت نے غیر معمولی ذمہ داریاں ڈال دی ہیں۔ پھر ہندوستانی عورت کو تو سماج نے پابندیوں میں اس طرح جکڑا ہے کہ اس کا ہلنا مشکل ہے۔ گھرداری کے فرائض، شوہر کی دلداری، خاندان کی دیکھ بھال، بچوں کی پرورش غرض دنیا بھر کے جھگڑے ہیں اور اس کی جان۔ اگر ان سب کے ساتھ ساتھ وہ ایک ادیب کا دل اور دماغ بھی رکھتی ہے تو اس کی بدقسمتی میں کیا شک رہ جاتا ہے۔ ایک طرف تو وہ سب فرائض ادا کرنے میں جو صدیوں سے اس کے ذمے چلے آ رہے ہیں۔ دوسری طرف دل اور دماغ کے تقاضے سے لکھنے پر بھی مجبور ہے۔ اگر دوسرے فرائض میں سارا وقت گنوا دیتی ہے تو ذوق خامہ فرسائی چین نہیں لینے دیتا اور اگر لکھنے میں کچھ وقت صرف کرنے کی وجہ سے گھریلو اور خاندانی فرائض میں کچھ کوتاہی ہو جائے تو لوگوں کے طعنے تشنے سننے پڑتے ہیں۔ یوں اکثر دوست اور عزیز اس کا مذاق اڑانا اپنا فرض سمجھ لیتے ہیں، "آپ کا کیا کہنا ———— آپ ٹھہریں ادیبہ" "ارے بھئی ان سے ڈرو ———— ان کے ہاتھ میں قلم ہے جانے کیا لکھ ماریں" "میاں مضمون نگار بیوی کا ڈر تو اکبر تک نے مانا ہے" وغیرہ وغیرہ عام طور پر ادیبہ کو اپنے دیکھنے عزیزوں سے اس قسم کے مزاحیہ اور طنزیہ فقروں کا انعام ضرور ملتا ہے۔ گویا ذوق ادب ایک مضحک چیز ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی وہ اپنے اس شوق کو نہیں چھوڑتی ... کیوں؟ اس لئے کہ اپنی طبیعت سے مجبور ہے۔ شدت احساس کی بدولت وہ معمولی معمولی واقعات سے متاثر ہو جاتی ہے۔ مشاہدہ کی گہرائی اس کی نظر وہاں تک پہنچا دیتی ہے جہاں دوسروں کا تصور بھی نہیں پہنچتا، اور تخیل کی بدولت دماغ میں افسانے کا پلاٹ مرتب ہو جاتا ہے۔ اور وہ مجبور ہو جاتی ہے کہ کس طرح ان کیفیات، احساسات اور جذبات کو صفحۂ کاغذ پر منتقل کر دے۔ وہ کسی نہ کسی طرح اس کے لئے وقت نکالتی ہے ...... اگر نہیں لکھ سکتی تو ایک بے چینی ایک الجھن ایک کشمکش اس کے دماغ کے اندر برابر رہتی ہے۔

انسان کی ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ارد گرد اپنے ہم مذاق اور ہم خیال لوگوں کو دیکھنا اور ان ہی سے ملنا جلنا پسند کرتا ہے۔ مگر شاید قسمت ہی سے ہمارے ملک میں کسی ادیب عورت کو ایسا مناسب اور پسندیدہ ماحول نصیب ہوتا ہو۔ ...... بڑی خوش نصیبی سمجھئے اگر کسی عورت کو خاندان میں یا دوستوں میں دو ایک ایسے لوگ مل جائیں ورنہ اکثر لوگ ادب سے بیگانہ اور خود ادیبہ کی قابلیت اور صلاحیت سے ناواقف ہوتے ہیں ...... یا وہ ان میں ان کی سی بن کر رہے اور اپنے ذوق ادب کو دبائے رکھے، یا ان کے سامنے اپنے ذوق کا اظہار کر کے بھینس کے آگے بین بجائے اور خود ان کے طنز اور مذاق کا نشانہ بنے۔ کسی ادیبہ کے دل سے پوچھئے کہ یہ ناموافق ماحول اس کے دل پر کیسا گراں گزرتا ہے۔

اور پھر ہماری ادیبہ کے لئے یہ رسالے اخبار اور ایڈیٹر بھی ایک مستقل مصیبت ہیں۔ جب وہ نو مشق اور غیر معروف ہوتی ہے تو ایڈیٹروں کی خوشامد کرنی پڑتی ہے اور اسے ان کا احسان مند رہنا پڑتا ہے، اور جب مشہور ہو جائے تو ان کے اصرار اور تقاضے ناک میں دم کر دیتے ہیں۔ اکثر ان رسالوں کا مذاق بھی عجیب ہوتا ہے۔ ادیب اپنی اپج اور شوق سے کچھ لکھتا ہے جس میں اس کی خوبیاں اور صلاحیتیں اجاگر ہیں مگر ایڈیٹر صاحب کو وہ ناپسند ہے۔ وہ اس میں ترمیم اور تنسیخ کرانا چاہتے ہیں۔ بلکہ اکثر افسانے کا پلاٹ بھی تجویز کر دیتے ہیں۔ ادیبہ دو ایک رسالوں کو پسند کرتی ہے اور اس میں لکھنا چاہتی ہے، لیکن بیچاری کے پاس بیسیوں ایڈیٹروں کے خط آتے ہیں کہ ہمارے علمی، ادبی، معاشرتی، مذہبی۔ رسالے کے لئے مضمون، افسانہ، نظم (وہ بھول جاتے ہیں کہ ادیبہ شاعرہ نہیں) بھیجئے ...... ایک مرتبہ کے انکار سے وہ مطمئن نہ ہوں گے۔ بار بار اصرار کریں گے، خفا ہوں گے، مغرور، کنجوس، خود غرض کہیں گے، اور فرمائشیں جاری رکھیں گے۔

ایک نئی مصیبت ادیبہ پر افسانوں کے مجموعوں کی شکل میں نازل ہوئی ہے جسے دیکھئے ادیبہ سے ایک افسانے کا طالب ہے تاکہ اپنے "بے مثل" "نایاب" مجموعے میں اسے شائع کر کے ادیبہ کی عزت افزائی کرے۔ یہ مجموعے عام طور پر حقیقی معنوں میں نایاب ہوتے ہیں۔ یعنی ان کے چھپنے اور شائع ہونے کی نوبت ہی نہیں آتی۔

لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ادیبہ اپنے دماغی مشاغل میں اتنی منہمک، اپنی خیالی دنیا میں اس قدر مگن رہتی ہے کہ دنیاوی فکریں، خاندانی جھگڑے، مالی پریشانیاں اسے نہیں ستا سکتیں۔ وہ ان سب سے بالاتر ہے۔ بھلا وہ فکر دنیا میں کیوں سر کھپائے ع وہ کہاں اور یہ وبال کہاں لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ادیبہ بھی انسان ہے، عورت ہے، اسے بھی وہ ساری مشکلیں اور پریشانیاں سہنی پڑتی ہیں جو کسی اور عورت کو اور چونکہ وہ زیادہ حساس ہوتی ہے اس لئے انہیں دوسروں سے کچھ زیادہ ہی محسوس بھی کرتی ہے۔ اور پھر اس کے لئے تو اور مصیبت ہے اسے دوسروں کے رنج و غم، مشکلوں اور پریشانیوں تکلیفوں اور مصیبتوں کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ مشاہدہ کی گہرائی اور نظر کی وسعت کی وجہ سے اپنے ذاتی غم و الم اور مشکلوں کو اتنی زیادہ اہمیت نہیں دیتی کہ دوسروں کی زندگی عذاب کر دے، مگر یہ خیال کہ دنیا میں دوسرے لوگ بھی ہیں جو مجھ سے زیادہ قابل رحم ہیں، اس کی ذاتی مشکلوں اور مصیبتوں کو ایک حد تک ضرور قابل برداشت بنا دیتا ہے لیکن اسی کے ساتھ اسے غم روزگار ———— یعنی ساری دنیا کے غم کا روگ لگ جاتا ہے۔ خصوصاً ہمارے دیس کی آج کل جیسی ابتر حالت ہے کہ وہ ایک حساس ادیبہ کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ وہ جس طرف نظر اٹھاتی ہے اسے افلاس جہالت بیماری، نفرت، عداوت

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

سونا کیا ایک مصیبت ہے

عبد الحلیم ندوی

عرصے سے امریکا میں ایک پیلے رنگ کی خطرناک دھات کی بڑی ہوشیاری اور فنی مہارت کے ساتھ حفاظت کی جا رہی ہے۔ یہ خطرناک دھات جس کے لئے دائمی پہروں اور چوکیوں کا انتظام کیا گیا ہے کوئی عجیب و غریب انجان دھات نہیں ہے۔ ہم آپ سبھی اس کو جانتے اور پہچانتے ہیں ۔۔۔۔۔ سے سونا کہتے ہیں۔ پیلے رنگ کی چمکیلی اور جاذب نظر دھات۔

امریکہ نے ساری دنیا سے گھسیٹ کر ۲۲ ارب ڈالر کی قیمت کا سونا اپنے بہترین فولاد اور سیمنٹ کے بنے ہوئے تہہ خانوں میں بحفاظت تمام دفن کر رکھا ہے۔ ان تہہ خانوں کی مضبوطی اور پائداری کا اندازہ اس سے لگا سکتے ہیں کہ نہ ان کی چھتوں پر بموں کا اثر ہو سکتا ہے اور نہ وہ آسانی سے گرائے اور توڑے پھوڑے جا سکتے ہیں اور دروازے ایسے دیو پیکر کہ صرف ایک کا وزن ۲۰ ٹن ہے۔

ذرا اس کا تصور کیجئے کہ اگر یہ سب سونا دنیا کی سب قوموں میں برابر تقسیم کر دیا جائے تو دنیا کا نقشہ کیا ہو جائے؟ لیکن اس دولت کے مالک امریکی آپ کے ان حسین تصورات سے بے نیاز اپنی پالیسی سے نہ صرف مطمئن ہیں بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے جو کچھ کیا ہے خوب کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آگے چل کر دنیا کو ایک سخت قسم کی معاشی تباہ حالی سے یقیناً دوچار ہونا ہے اور ایسے نازک موقع پر ہم اپنی دولت سے اس کا مقابلہ کریں گے اور دنیا کے دکھوں کو کم کرنے میں مدد دیں گے۔

آج کل دنیا کا معیار مبادلہ زر اس قدر مضحکہ خیز ہو گیا ہے کہ بالکل پیشہ ور مسخروں کی طرح انوکھی شکلیں بدلتا رہتا ہے۔ امریکہ نے اس موقع سے خوب فائدہ اٹھایا، چنانچہ اس نے ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء تک کے اس قلیل عرصہ میں جتنا بھی سونا ہاتھ لگا بلا تامل خرید لیا، بے چارے آسٹریلیا، افریقہ، کناڈا اور چین کے کان کن زیادہ سے زیادہ جتنا سونا نکال سکتے تھے نکالتے رہے اور امریکا اسی تیزی سے اُسے اپنے تہہ خانوں میں دفن کرتا گیا اور آج وہی سونا امریکا کے خزانوں میں عمارتی اینٹوں کے برابر اسی شکل اور موزونیت کے ساتھ پوری حفاظت سے موجود ہے۔ ان میں سے ہر اینٹ کی قیمت تین ہزار ڈالر اور ہر ایک کا وزن ۲۷½ پونڈ ہے۔

سونے کی یہ اینٹیں جن بڑے بڑے زیر زمین تہہ خانوں میں جمع کی گئی ہیں ان میں سب سے بڑا اور سب سے مضبوط ناکس کینٹکی نامی قلعہ ہے۔ امریکا میں ناکس جیسے عظیم الشان تہہ خانے ایک دو نہیں بلکہ پورے چودہ ہیں اور ہر ایک کی حفاظت مائیکروفون، برقی آنکھوں، اشک آور دھانوں اور خطرے کے پیچیدہ آلات کے ذریعے کی جاتی ہے۔

یہ سب حفاظتی تدبیریں اور پہرہ داروں کے انتظامات صرف ایک زرد رنگ کی دھات کی حفاظت کے لئے کئے جاتے ہیں جو خواہ مخواہ ساری دنیا میں اس قدر گراں بہا اور قابلِ قدر چیز بن گئی ہے۔ حالانکہ اسی دنیا میں تقریباً ۲۹ دھاتیں اس سے کہیں زیادہ قیمتی اور قابل قدر بھی ہیں۔ مثلاً ریڈیم ہی کو لے لیجئے کہ ایک اونس کی قیمت دس گنے سونے کے برابر ہوتی ہے۔ لیکن سونے کی مخصوص شکل میں دولت کا تصور دنیا میں کچھ اس طرح عام اور اس قدر رائج ہو گیا ہے کہ اس کے مقابلے میں اگر کسی دھات کو پیش کیجئے تو سب آپ پر ہنسیں گے اور آپ کی عقل کا ماتم کریں گے۔

امریکا والوں کو سونا جمع کرنے کا خبط دراصل پریذیڈنٹ روزولٹ کی پالیسی کی وجہ سے ہوا جس وقت انھوں نے اپنے عہدہ صدارت کا چارج لیا تو امریکا کی مالی ساکھ بہت گر چکی تھی۔ چنانچہ انھوں نے بین الاقوامی تجارت کو اپنے ملک کے حق میں سازگار بنانے کے لئے یہ ترکیب نکالی کہ ڈالر کی قیمت بڑھا دی، برطانیہ نے بھی یہی ترکیب ۱۹۳۱ء سے اختیار کر رکھی تھی۔ انھوں نے یہ تدبیر اس خیال سے کی کہ جب سونے کی قیمت چڑھے گی تو لازماً تجارتی اشیا کی قیمتیں بھی بڑھ جائیں گی۔ اور چونکہ دنیا کی منڈیوں پر ہمارا قبضہ ہے اس لئے اس سے خوب نفع ہوگا اور ملک میں خوش حالی پیدا ہو جائے گی اور واقعی ایسا ہی ہوا لیکن اس کے ساتھ ایک اور بات بھی ہوئی اور وہ یہ کہ جونہی سونے کی قیمت بڑھی ساری دنیا میں بڑی تیزی اور کثرت سے اس کی تلاش اور کھدائی کا کام ہونے لگا پہلے سونے کی جتنی قلت تھی دیکھتے دیکھتے اس کی اتنی ہی کثرت ہو گئی۔ اس کا ردعمل یہ ہوا کہ بہت شدید قسم کی افراطِ زر پیدا ہوئی۔ کیونکہ دنیا کی تاریخ میں اس قدر سونا کبھی نہیں نکلا جتنا اس قلیل عرصے میں نکال لیا گیا۔

جن ملکوں میں پہلے سے سونے کی کھدائی کا کام ہوتا تھا ان کے علاوہ افریقہ میں نئے کارخانوں میں کام شروع ہوا۔ روس نے "لینا" کے کان کا جب پورا سونا نکال لیا تو اپنی دوسری مقبوضات میں لگا دیا، اور ہندوستان کے راجے مہاراجے اس دوڑ میں کیوں پیچھے رہتے، انھوں نے بھی اپنے طلسمی خزانوں کے منہ کھول دئے اور بڑھتی ہوئی قیمتوں پر خوب خوب سونا بیچا۔ چنانچہ یہ سن کر حیرت ہوگی کہ مشرق بعید نے ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۶ء کے مختصر سے عرصے میں ایک ارب ۲۸ کروڑ ڈالر کی قیمت کا سونا اگل دیا۔

اب سوال یہ ہے کہ آخر یہ سب سونا ہوتا کیا تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سارا سونا ڈھلک کر امریکا کے پُراسرار اور گہرے تہہ خانوں میں پہنچ کر دفن ہو جاتا تھا۔ کیونکہ امریکا کو اس زمانے میں ایک مخصوص قانون کے ذریعے (جسے اس نے اپنے نفع کی خاطر خود ہی بنایا تھا) یہ حق مل گیا تھا کہ جتنا سونا بھی اسے پیش کیا جائے وہ سات ڈالر فی اونس کے حساب سے خرید لے۔ برطانیہ نے بھی فی اونس سات ڈالر شرح مقرر کی تھی لیکن اس نے امریکا کے مقابلے میں بہت ہی کم سونا خریدا۔ مسٹر روزولٹ کی صدارت کی ابتدا میں امریکا کے پاس صرف چار ارب ڈالر کی قیمت کا سونا تھا ۱۹۳۴ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۸ ارب ڈالر ہو گئی اور دوسری جنگ عظیم کے آغاز کے وقت ریاستہائے متحدہ امریکا کا ذخیرۂ طلا بڑھ کر سولہ ارب ڈالر تک پہنچ گیا۔ ۱۹۴۲ء میں تو یہ تعداد ۲۳ ارب ڈالر ہو گئی۔ اور اس طرح دنیا کا ¾ حصہ سونا امریکا کے پراسرار خزانوں میں پہنچ گیا لیکن اس کے باوجود امریکا کی پیاس نہ بجھی اور ھل من مزید کا نعرہ برابر بلند ہوتا رہا۔

یہ حالت کب تک رہتی آخرکار ۱۹۴۳ء میں برطانیہ اور امریکا دونوں سونا جمع کرتے کرتے عاجز آ گئے اور دونوں قوموں کے ماہرین معاشیات نے مل کر یہ طے کیا کہ ایسے طریقے اختیار کرنے چاہئیں جن سے سونے کی اہمیت ذریعہ مبادلہ کی حیثیت سے کم ہو جائے۔ چنانچہ بڑے سوچ بچار کے بعد ان مفکرین نے مطلوبہ سونے کو "بانجھ بنانے" کا نسخہ تجویز کیا جس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ ان ماہرین نے پہلے سے بھی زیادہ بڑی اور گہری خندقیں کھود کر ان میں سونے کو دفن کر دیا ممکن ہے یہ طریقہ شروع میں بہت موثر معلوم ہوا ہو لیکن جب اس کو برتا گیا تو پتہ چلا کہ اس پر تو بہت زیادہ خرچ آتا ہے۔ کیونکہ جن قلعوں میں امریکا نے دنیا کا سونا سمیٹ کر بھر رکھا تھا۔ ان کی پاسبانی کے لئے انھیں بہت سے پہرہ دار رکھنے پڑتے تھے اور ان کو معقول تنخواہ دینی پڑتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ سونا امریکا کے شہریوں سے قرض لے کر خریدا گیا تھا اور ان کو خاصا منافع دینا پڑتا تھا۔

ہاں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر امریکا کے لوگ پریذیڈنٹ روزولٹ کی پالیسی کے خلاف سونے کی قیمت گرا دیں تو مجبوراً سونے کے کان کن کھدائی کا کام بند کر دیں گے اور پھر امریکا کو زمین کے اندر اس کے گاڑنے کی ضرورت نہیں رہے گی کیونکہ جہاں تک محض جمع کرنے کا تعلق ہے وہ بہت خوشی سے اس کے لئے تیار ہو جاتا ہے لیکن جب اخراجات کا معاملہ آتا ہے تو ہمت جواب دینے لگتی ہے لیکن اس صورت میں اس کا اندیشہ ہے کہ کہیں ایک عالمی کساد بازاری نہ پیدا ہو جائے۔ امریکا کے لوگوں کو اس کا خطرہ ہے کہ اس عمل سے معیار طلا قائم نہ رہ سکے گا اور دوسروں کے مقابلہ میں امریکا پر اس کا براہ راست اثر پڑے گا۔ کیونکہ جب سونے کی قیمت گرے گی تو غلے کی قیمت بھی گر جائے گی اور اس طرح کسان طبقہ مارا جائے گا اور اگر اس کی موجودہ قیمت میں آدھی تخفیف کر دی جائے تو اس کا اثر یہ ان کان کنوں پر پڑے گا کہ وہ اپنا کام چھوڑ دیں گے اور سونے کی رسد کم ہو جائے گی اور جب رسد کم ہو جائے گی تو دنیا سے حصول کے بازار میں زلزلہ آ جائے گا اور ساری دنیا کے اسٹاک ایکسچینج تہ و بالا ہو جائیں گے

اب آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اچھا اگر سونے کی قیمت بالکل گرا دینے یا کم کر دینے میں یہ خطرات اور پیچیدگیاں ہیں تو امریکا سرے سے سونا خریدنا ہی کیوں نہ بند کر دے کہ قصہ ہی پاک ہو جائے۔ لیکن امریکا کے حق میں یہ اور زیادہ بدتر ہے۔ کیونکہ اس طرح تو اس نے اب تک جتنا سونا خریدا ہے اس کی قیمت گر کر صفر کے برابر ہو جائے گی اس کے علاوہ دنیا کے لئے بھی یہ کچھ سود مند نہیں ہے، اس لئے کہ اگر امریکا جو اس وقت دنیا میں سونے کی سب سے بڑی منڈی بنا ہوا ہے، خرید سے تو اشیا

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

ادارۂ تحریر
ڈاکٹر سید عابد حسین ۔ صالحہ عابد حسین ۔ عبدالحلیم ندوی

تاریخ اشاعت: یکم ، ۸ ، ۱۹۶۸ء ۲۴
چندہ: سالانہ ، ششماہی

دور کے ڈھول سہانے

(پیوستہ صفحہ ۱۰)

ظلم، ناانصافی، زرپرستی، لالچ، خود غرضی، مصیبت اور مشکلات کا سمندر لہریں لیتا نظر آتا ہے۔ اگر وہ چاہے کہ حقیقت کی تلخیوں کو بھلانے کے لئے تخیل کی دنیا میں پناہ لے تو یہ بھی اس کے لئے ناممکن ہے۔ جسے خدا نے آنکھیں دی ہیں اور دل دیا ہے جو اپنے ملک قوم اور اپنی جنس کی یہ زبوں حالت دیکھی اور اس سے متاثر ہوتی ہے اسے کس طرح دماغی سکون میسر آ سکتا ہے اس کے تخیل میں بھی یہی درد و مصیبت کی دنیا بسی رہتی ہے۔ اس کے قلب پر ان کو دیکھ کر اور محسوس کر کے جو کیفیت گذرتی ہے اسے وہ افسانہ یا ناول کے سانچے میں ڈھال کر دنیا کے سامنے پیش کر دیتی ہے کیونکہ یہی اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ جو کچھ محسوس کرے اسے بیان بھی کر دے لیکن اسی کے ساتھ ایک حقیقی اور اچھے ادیب کا فرض یہ بھی ہے کہ خدا نے جو صلاحیت اسے دی ہے اس سے کام لے کر اپنے اردگرد کی دکھ بھری دنیا کی اصلاح کی کوشش بھی کرے۔ آج کل اپنے دیس کی حالت دیکھ کر عام طور پر درد مند اور حساس دل لوگوں پر ایک مایوسی اور بے بسی کا سا عالم طاری ہو جاتا ہے کیا یہ دکھ بھری دنیا پھر سکھ کا سانس لے گی؟ یہ سسکتی ہوئی انسانیت کیا پھر سے زندہ ہو گی؟ یہ بدنصیب دیش اس کے جاہل، مفلس باشندے، اس کی جہالت اور ظلم کے بوجھ سے دبی ہوئی عورتیں ابھر سکتی ہیں؟ ترقی کر کے اپنی اور دوسروں کی زندگی بنا سکتی ہیں؟ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب محال ہے اور اس احساس کے ساتھ دل پر جو درد و غم کی کیفیت گذرتی ہے اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن بلند مقصد، بلند خیال، بلند نظر ادیب کو اس تاریکی میں بھی روشنی کی کرن نظر آ جاتی ہے۔ انسان سے مایوس ہونا خدا سے مایوس ہونا ہے ادیب کو خدا پر بھروسہ ہونا چاہیئے۔ اسی انسان میں انسانیت سوئی ہوئی ہے جس کا جگانا ابھارنا ہر ادیب کا فرض ہے، خصوصاً ادیب عورت کا۔

ساری دنیا کے دکھ درد کو محسوس کرنا اور اس کی اصلاح کا بیڑا اٹھانا کیا آسان کام ہے؟

(لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوئی)

کی قیمتیں بھی لازماً گر جائیں گی اور اسی طرح پھر اسی کساد بازاری کے پیدا ہو جانے کا خطرہ ہے جو قیمت کے کم کرنے کی صورت میں پیدا ہو رہی تھی۔

انہی دشواریوں اور پیچیدگیوں کی بنا پر امریکا دھڑے سے سونا خریدے جا رہا ہے ادھر برطانیہ کی یہ کیفیت ہے کہ اب اس کو اپنا پس انداز سونا بھی بیچنا پڑ رہا ہے چنانچہ آسٹریلیا سے جتنا بھی سونا نکلتا ہے برطانیہ اس کو ایک ہاتھ سے خریدتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے ڈالر کی خاطر امریکا کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ سے وکٹوریا اور مغربی آسٹریلیا میں سونا نکالنے کا کام بڑی سرگرمی سے شروع ہو گیا ہے، اور اب جو آسٹریلوی سونے کی برآمد کا حکومتی تخمینہ بعد وضع محاصل کیا گیا ہے تو پتہ چلا کہ گذشتہ سال آسٹریلیا نے ۹ لاکھ ۱۰ ہزار ۸ سو اونس سونا برآمد کیا ہے جس کی قیمت ایک کروڑ ڈالر تھی، اور ابھی اس مقدار میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ اندازہ ہے ماہانہ ترقی کی رفتار ۴۰ ہزار اونس سونا ہے۔ یہ سب سونا سب سے پہلے برطانیہ آتا ہے اور پھر یہاں سے امریکا منتقل ہو جاتا ہے اور امریکا اسے زمین کی انتہائی گہرائیوں میں دفن کر دیتا ہے۔

اس وقت اشد ضرورت اس کی ہے کہ اس الجھے ہوئے مسئلے کا کوئی مناسب حل تلاش کیا جائے۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ماہرین معاشیات اس نیک ساعت کا انتظار کر رہے ہیں جب انسائیکلو پیڈیا کے اوراق میں سونے کے بارے میں یہ عبارت لکھی ہو گی:۔

"سونا ایک نرم وزنی اور سرخی مائل پیلے رنگ کی دھات ہے جس کا جوہری وزن ۱۹۷٫۲ اور ثقل نوعی ۱۹٫۳ ہے۔ اس دھات کا استعمال کارخانوں، نگارخانوں اور آرائش گاہوں میں کم ہوتا ہے۔ پہلے اس کو کانوں سے کھود کر باہر نکالتے تھے اور پھر دوبارہ زمین کی گہرائیوں میں دفن کر دیتے تھے اور اس خیال کے پیش نظر اس کی بہت سخت حفاظت کی جاتی تھی کہ اس کے بل بوتے پر مالیاتی کارروائیاں بڑے اطمینان اور استقلال سے کی جا سکتی ہیں۔"

(ترجمہ)

ہم کیا کریں؟

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

صفوں میں نئے لوگ کم بھرتی ہوتے تھے۔ اب کوشش کا ایک نیا میدان یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں کاریگروں کی اچھی تعلیم اور انھیں کام سکھانے کا انتظام کیا جائے۔ اس کی صلاحیت ہمارے عوام میں ہے۔ روایات بھی ہیں، قومی کام کرنے والوں کو انھیں بے کار نہ جانے دینا چاہیئے۔

مگر یہ سب باتیں جو میں نے اوپر لکھی ہیں محنت چاہتی ہیں اور ہمت کی طالب ہیں جو ہمت ہار بیٹھے گا اور محنت سے جی چرائے گا اس کے لئے ہندوستان میں کیا ہر جگہ حلال معیشت کی راہیں بند ہیں۔ حرام کے کچھ اور راستے بھی ہیں، خدا کرے وہ مسلمانوں پر، نہیں سارے انسانوں پر، جلد سے جلد بند ہو جائیں اور مسلمان اگر ان کے بند کرانے والوں میں ہو جائیں تو دنیا میں اپنا صحیح منصب پورا کریں گے۔

معاصرین کی خدمت میں

"نئی روشنی" کے مضامین بہت سے معاصرین اپنے صفحات میں نقل کرتے ہیں مگر ان میں سے بعض "نئی روشنی" کا حوالہ نہیں دیتے۔ ان سے درخواست ہے کہ براہ کرم حوالہ ضرور دے دیا کریں۔

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی (دہلی) رائے جامعہ
مطبوعہ: حیدر پریس دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۱ نمبر ۱۷ | ۱۶ راکتوبر ۱۹۴۸ء | ایڈیٹر: ڈاکٹر سید عابد حسین

ماضی حال کے آئینے میں

جواہر لال نہرو

مجھے تاریخ سے دیر میں سابقہ پڑا اور وہ بھی اس طریقے سے نہیں کہ ان واقعات کا مطالعہ کرتا اور ان سے نتیجے نکالتا جنھیں میری زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا جب تک میں یہ کرتا رہا تاریخ میری نظر میں ایک بے معنی چیز تھی۔ مابعد الطبیعی نظریات سے یا آئندہ زندگی کے مسائل سے مجھے بہت کم دلچسپی تھی۔ اس سے کہیں زیادہ شوق سائنس سے روزمرہ کے واقعات سے اور موجودہ زندگی کے مسائل سے تھا۔

مگر جذبے اور ارادے کے ایک معجون مرکب نے جس کا مجھے محض دھندلا سا شعور تھا، مجھے عمل پر ابھارا اور عمل نے میرے اندر مزید فکر کا شوق اور اپنے زمانے کو سمجھنے کی خواہش پیدا کی۔ چونکہ اس زمانے کی جڑیں ماضی میں پیوستہ ہیں اس لئے میں نے ماضی پر تحقیق کی نظر ڈالی اور ہمیشہ ان چیزوں کی تلاش میں رہا جن سے حال کے سمجھنے میں مدد ملے۔ اس حالت میں بھی جب میں پچھلے واقعات اور گذرے ہوئے لوگوں کے خیال میں محو ہو جاتا تھا اور مجھے یہ خبر نہ رہتی تھی کہ میں کون ہوں اور کہاں ہوں۔ حال کا تصور میرے دل و دماغ پر چھایا رہتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے یہ احساس ہوتا تھا کہ میں ماضی کے قبضے میں ہوں، مگر اسی کے ساتھ یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ آج سارا ماضی میرے تصرف میں ہے۔ گذشتہ تاریخ موجودہ تاریخ میں جذب ہو جاتی تھی اور ایک زندہ حقیقت بن جاتی تھی جو راحت و الم کے احساسات سے وابستہ تھی۔

جہاں ماضی حال بن جاتا تھا وہاں کبھی کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ حال پیچھے ہٹتے ہٹتے بہت دور چلا جاتا تھا اور ماضی کی طرح پتھر کی بے حس و حرکت مورت بن کر رہ جاتا تھا عین شدت عمل کی حالت میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی گذرا ہوا مرحلہ ہے جسے پیچھے مڑ کر دیکھ رہا ہوں۔ یہی ماضی کو حال کے آئینے میں دیکھنے کی خواہش تھی جس کی وجہ سے میں نے اب سے بارہ سال پہلے "تاریخ عالم کی ایک جھلک" اپنی بیٹی کے نام خطوط کے پیرائے میں لکھی۔ میں نے یہ کتاب سرسری طور پر سیدھے سادے اسلوب میں لکھی تھی اس لئے کہ میرا خطاب ایک کم سن لڑکی سے تھا۔ اس کی تہہ میں وہی تحقیق اور تلاش کی لگن تھی۔ مجھ پر مہم جوئی کا شوق غالب تھا۔ اور میں پرانے زمانے کے مردوں اور عورتوں کے ساتھ ایک ایک کرکے تاریخ کی منزلوں سے گذر رہا تھا جیل میں فرصت ہی فرصت تھی مجھے یہ فکر نہیں تھی کہ کوئی ضروری کام ہے جسے ایک مقررہ مدت کے اندر ختم کرنا ہے اس لئے جب جی چاہتا تھا تیزی سے قدم بڑھاتا تھا اور جہاں جی چاہتا تھا رک جاتا تھا، تاکہ تاثرات دل میں اچھی طرح بیٹھ جائیں اور ماضی کی سوکھی ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھ جائے۔ یہی تحقیق کی دھن تھی۔ اگرچہ اس کا دائرہ اپنے زمانے اور جانے بوجھے لوگوں تک

محمود صاحب نے آگے چل کر مجھ سے "میری کہانی" لکھوائی۔

میرا خیال ہے کہ میں اس بارہ برس میں بہت کچھ بدل گیا ہوں، مجھ میں غور و فکر کا مادہ بڑھ گیا ہے۔ شاید پہلے کے مقابلے میں کچھ توازن اور تجرد طبیعت میں قدرے اطمینان و سکون پیدا ہو گیا ہے۔ اب المناک واقعات کا مجھ پر اتنا شدید اثر نہیں ہوتا دل میں ہیجان کم پیدا ہوتا ہے اور کم دیر تک رہتا ہے۔ حالانکہ المناک واقعات اس زمانے میں پہلے سے کہیں زیادہ ہوئے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھ میں تسلیم و رضا کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے یا صرف یہ بات ہے کہ اعصاب سخت ہو گئے ہیں۔ یہ محض کہولت کا اثر، قوت حیات کا انحطاط جوش زندگی کی کمی ہے یا اس کا نتیجہ ہے کہ مدتوں قیدخانے میں رہنے سے زندگی کا چڑھا ہوا دریا رفتہ رفتہ اتر گیا ہے۔ خیالات کے جھونکے آکر گزر جاتے ہیں اور ذہن کی سطح پر خفیف سے ہلکورے چھوڑ جاتے ہیں، افکار اور آلام کا مارا ہوا دل نرم ارکی زنگ کھنڈ ہے جو اس صدمے سہتے سہتے بے حس ہو جاتے ہیں۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا رنج و مصیبت کے بوجھ میں اس قدر دبی ہوئی ہے کہ تھوڑی سی کمی بیشی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ صرف ایک چیز ہے جسے کوئی طاقت ہم سے نہیں چھین سکتی اور وہ یہ عزم ہے کہ ہم ہر حال میں ہمت اور وقار کے ساتھ اپنا کام کرتے رہیں گے اور ان آدرشوں کو نہ چھوڑیں گے جن کے بغیر زندگی ایک بے معنی چیز ہے۔

کچھ دن ہوئے کسی نے کہا تھا "موت ہر شخص کا پیدائشی حق ہے" بات کچھ عجیب ہے۔ مگر کہنے کا انداز عجیب ہے اس پیدائشی حق سے نہ کسی نے انکار کیا ہے اور نہ کر سکتا ہے۔ ہم خود ہی کوشش کرتے ہیں جہاں تک ہو سکے اس حق کو بھول جائیں اور جتنے زیادہ عرصے تک ممکن ہو اس کے استعمال سے بچے رہیں مگر یہ جملہ نیا اور دلچسپ ہے۔ چونکہ زندگی سے اس قدر نالاں ہیں ان کے لئے نجات کی راہ ہر وقت کھلی ہوئی ہے۔ جب چاہیں اس سے چھٹکارا حاصل کر لیں۔ اگر ہمیں زندگی پر قابو نہیں موت پر تو اختیار ہے۔ یہ ایک دل خوش کن خیال ہے جس سے بے بسی کا احساس کم ہو جاتا ہے

فہرست مضامین

قیمت فی پرچہ ۳ر

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

سالکِ ہندی

افق پر روشنی کے آثار

آپ کو شکایت ہے کہ اس عنوان کے تحت میں نے اب تک جو کچھ لکھا ہے اس میں تصویر کا صرف تاریک رخ دکھایا ہے۔ آپ پوچھتے ہیں کیا ہندوستان کی تصویر میں کوئی شگفتہ رنگ نہیں ہیں؟ اگر ہیں تو انھیں کیوں نہیں دکھاتے؟

اعتراض تسلیم، لیکن عذر بھی سن لیجئے۔ اس عنوان کے تحت میں آپ کو ان چیزوں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جن میں اصلاح اور تبدیلی کی ضرورت ہے۔ جن کا وجود ہماری قومی تہذیب اور سلامتی کے لئے ایک مستقل خطرہ ہے۔ میرا خیال یہ ہے (خواہ آپ اس کو سادہ لوحی اور غلط فہمی سمجھیں) کہ سیدھے راستے پر چلنا انسان کی فطرت ہے اور اس سے ہٹنا اس کی بھول ہے۔ راست رفتاری اس کا معمول ہونا چاہیے اور بھول پر اس کو ٹوکنا ضروری ہے۔ گذشتہ چند سال سے ہم بدقسمتی اور ناعاقبت اندیشی کے ایک ایسے چکر میں پھنس گئے ہیں کہ اچھی باتیں کبھی کبھار ہوتی ہیں اور پریشان کرنے والی باتیں روزمرہ ہوتی رہتی ہیں۔ ایسی حالت میں انسان کیا کرے؟ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ سچا دوست وہ ہے جس کی آنکھوں میں ہمیں اپنی اصلی صورت دکھائی دے اور اگر صورت میں کوئی خرابی ہو تو وہ آئینے کا قصور ہے یا صورت کا؟

لیکن ہوا کا رخ بدلنا ضرور شروع ہوا ہے اور بہت سے چھوٹے بڑے تنکوں سے یہ رخ پہچانا جا سکتا ہے۔ چند مثالیں سن لیجئے تاکہ امید اور ایمان کا چراغ روشن رہے اور آندھیوں کی دھمکیاں اس کو آزردہ نہ کر سکیں۔

آپ نے یوم آزادی پر ہمارے بڑے بڑے نیتاؤں کی تقریریں اور بیان پڑھے اور سنے ہوں گے۔ ان میں پنڈت جواہر لال اور راجہ جی کی تقریریں خاص طور پر قابل غور تھیں۔ مجھے ان کی علمی اور سیاسی اہمیت پر تبصرہ کرنا مقصود نہیں۔ دل بہت کچھ ہو سکتا ہے ان کی اخلاقی قدر و قیمت کا اعتراف کرتا ہے۔ پنڈت جی کی تقریر میں انکسار اور احتساب نفس کی ایک خاص شان تھی، اپنی کوتاہیوں کا اعتراف تھا۔ گاندھی جی کے بلند نصب العین کی وضاحت تھی اور اس پر عمل کرنے کا عہد تھا۔ اپنا ڈھول خود پیٹنا۔ اپنے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا اپنی حماقتوں اور نا انصافیوں پر پردہ ڈالنا ایک آسان چیز ہے اور ہم نے بہت سے سیاسی لیڈروں کو اس قسم کی ذاتی اور قومی خود ستائی میں گرفتار دیکھا ہے۔ لیکن یہ عقل اور مصلحت کا تقاضا نہیں، حماقت کا ثبوت ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ پنڈت جی نے اس تاریخی موقع پر وقار اور شرافت کا اظہار کیا اور کوئی گھٹیا یا اوچھی بات نہیں کی اور خود کو ان لوگوں کی ذہنی سطح اور تعریف دونوں سے بلند رکھا جو ہر موقع پر تقریر کی کتاب میں تلوار کی کھڑکھڑاہٹ سننا چاہتے ہیں!

راجہ جی نے اپنی تقریروں میں جو انداز اختیار کیا ہے وہ بھی قابل تعریف اور امید افزا ہے۔ وہ بہت سیدھی سادھی، لیکن پکی اور سچی تلی باتیں کہتے ہیں اور ان اٹل اخلاقی قدروں پر زور دیتے ہیں جو ان کے نزدیک ذہنی اور مادی اور صنعتی ترقی سے بھی زیادہ ضروری ہیں۔ انھوں نے بھی اس تقریر میں گاندھی جی کے اہنسا کے نظریئے کو اپنے انداز میں پیش کیا اور بہت خوش اسلوبی کے ساتھ اس امر کی طرف توجہ دلائی کہ ہندوستان اور پاکستان کی قسمت ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہے اور جب تک ان کے باہمی تعلقات خوشگوار اور پر امن نہ ہوں گے اس وقت تک ایک کا بھی بھلا نہیں ہو سکتا۔ بے تکلف یہ باتیں ایسے انداز میں کہنا کافی نہیں اور زبان و عمل کی دنیا میں ایک وسیع اور گہری خلیج حائل ہے جس کو پار کرنے کے لئے بڑے صبر و سمجھ داری اور محنت کی ضرورت ہے۔ لیکن ایک ایسے وقت میں جب دونوں ملکوں میں نیک کلمہ خیر لینے میں بھی بخل ہو ہمارے چوٹی کے لیڈروں اور ملک کے قسمت سازوں کی طرف سے ایسے جذبات کا اظہار مقام شکر و مسرت ہے۔ اور اگر کہیں دونوں ملکوں کے لیڈر اپنی تقریروں کی تعداد کم کر دیں اور ان میں دشمنوں کا لفظ کم استعمال کیا کریں تو کیا ہی کہنا ہے!

حیدرآباد کا معاملہ جس خوش اسلوبی اور سمجھ داری اور سب جماعتوں کے تعاون کے ساتھ طے ہوا وہ بھی ایک نیک شگون ہے۔ خون ریزی اور باہمی کش مکش کا جو اندیشہ تھا اس کا دور ہو جانا ملک کے مستقبل کے لئے بہت بہت اچھا ہوا لیکن میرے نزدیک مسلمانوں کے لئے اس واقعہ کی اصل اہمیت یہ نہیں کہ ان کی وفاداری کا امتحان ہو گیا اور وہ اس میں پورے اترے اور ملک میں ان کی پوزیشن مستحکم ہو گئی۔ یہ سب چیزیں بھی اپنی جگہ پر اچھی ہیں گو میرا خیال یہ ہے کہ وفاداری کی آزمائش کا یہ سارا قصہ معقولیت کی حد سے کہیں آگے بڑھ چلا تھا اور ملک کی کسی ایک جماعت کو بحیثیت جماعت کے، کسی دوسری جماعت کے امتحان لینے کا حق نہیں، کیونکہ آج ہمارے ملک میں مسلمان ہی نہیں بلکہ تمام مذہبوں اور جماعتوں کے لوگ عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہیں اور سب کو اپنی اپنی بداعمالیوں کی جواب دہی کرنی ہے۔ میری نظر میں اس واقعہ کی حقیقی سیاسی اور اخلاقی اہمیت یہ ہے کہ مسلمانوں نے جہاں تک ان کے طرز عمل ارادہ اور غور و فکر کا تعلق ہے مسئلے کی نوعیت کو سمجھا اور ان لوگوں کے ہاتھ میں نہیں کھیلے جو غلط بحث کر کے انھیں غلط راستے پر ڈالنا چاہتے تھے انھوں نے دیکھا کہ بعض لوگ جو خود کو مسلمان کہتے ہیں ایک ایسا راستہ اختیار کر رہے ہیں جو انصاف، رواداری اور جمہوریت کے صریحاً خلاف ہے۔ انھوں نے اپنے عمل سے اس بات کو واضح کر دیا کہ جو لوگ اس راستے میں اسلام کے نام پر ان کی امداد کی توقع کرتے ہیں وہ اسلام کی توہین اور اس کی عدل و انسانیت کی تعلیم کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور وہ ان کو سہارا دینے کے لئے تیار نہیں۔ سب سے پہلے میں اصلی چیز ظلم اور انصاف کے درمیان حکم لگانا اور تعاونوا علی البر و التقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم و العدوان کے اصول پر عمل کرنا ہے۔ جب تک ہندوستان کے اور دنیا بھر کے مسلمان اسلام کے تمام اصولوں کو مضبوط نہ پکڑیں گے دنیا کی موجودہ حالت نہیں سدھر سکتی۔ اگر ہندوستانی مسلمانوں کی حالیہ روش میں اس حقیقت کا اعتراف پوشیدہ ہے تو وہ ایک مبارک فال ہے۔ ورنہ محض خوف یا جبر کی وجہ سے کوئی اچھا کام بھی لیا جائے تو وہ اخلاقی قدر سے عاری ہوتا ہے۔

قائد اعظم محمد علی جناح کے انتقال پر ہندوستانی لیڈروں اور اخباروں نے بحیثیت مجموعی جس معقولیت اور متانت کے ساتھ اظہار خیال کیا وہ بھی ایک امید افزا بات ہے اور پاکستان نے جس خلوص کے ساتھ گاندھی جی کے ماتم میں شرکت کی تھی اس کا ایک اچھا جواب ہے۔ اندیشہ ہو سکتا تھا کہ گذشتہ دس سال کے واقعات اور گذشتہ سال بھر کے خونی فسادوں کی وجہ سے بہت سے لوگوں کا ذہنی توازن اس قدر برہم ہو گیا ہے کہ وہ اپنی تہذیبی روایات کو بھول کر اس موقع پر انداز خیال کا ناپسندیدہ طرز اختیار کریں۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ دو تین اخباروں کو چھوڑ کر (جو روش عام کو ترک کرنا اپنی بڑائی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں) عام طور پر اخباروں اور لیڈروں نے اختلاف خیال کے باوجود ان کی ذاتی عظمت اور کارناموں کا اعتراف کیا۔ ... اس کا افسوس کس ہندوستانی کو نہیں ہوگا کہ تاریخ کی قوتوں نے محمد علی جناح جیسی قابلیت کے انسان کو دوسرے ہندوستانی لیڈروں کے ساتھ مل کر اپنی مادر وطن کی خدمت نہ کرنے دی۔ اگر وہ بھی آخر تک اس جنگ آزادی میں گاندھی جی کے دوش بدوش رہے ہوتے تو آج ہندوستان کا خانگی نقشہ اور اس کی بین الاقوامی پوزیشن کس قدر مختلف ہوتی، لیکن یہ مقدر نہ تھا اور اب عقل کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں طرف کے لیڈر دوستی کا ہاتھ بڑھائیں اور اپنی تقریروں، تحریروں اور کارناموں میں کوئی ایسی بات نہ ہونے دیں جو باہمی تعلقات میں بدمزگی پیدا کرے۔

لیکن چوکسی کی ضرورت

افق پر روشنی کے آثار ضرور ہیں لیکن ابھی تاریکی دور نہیں ہوئی۔ اگر چاروں طرف روشنی ہو تو اڑتا ہوا جگنو دکھائی نہیں دیتا۔ یہ تو تاریکی ہی ہے جو جگنو کی ننھی سی روشنی کو اجاگر کر کے دکھاتی ہے۔ ہمارے ملک کے سیاسی اور ذہنی مطلع سے خطرہ ابھی ٹلا نہیں ہے۔ اس کی پرچھائیاں عجیب عجیب شکلوں میں نظر آتی ہیں۔ دیکھئے!

ایک اخبار نے اپنے "بزم بے تکلف" قسم کے کالم میں لکھا ہے کہ ہمیں چاہیے کہ لوگوں کو ہتھیاروں کا استعمال اور اپنی حفاظت کرنا سکھائیں۔ شاید اس بارے میں مکمل اہنسا کے ماننے والوں کو اعتراض ہو۔ لیکن عام طور پر لوگ اس خیال سے اختلاف نہ کریں گے۔ لیکن اگلے ہی فقرے میں یہ اخبار اپنی ذہنیت کو اس طرح بے نقاب کر دیتا ہے "یہ بات اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم درخت بونے

(بقیہ صفحہ ۱۴ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

۱۶ اکتوبر سنہ ۴۸ء

محتاط اشتراکیت
یا
روشن خیال سرمایہ داری

پچھلے ہفتے حکومت ہند نے دو نہایت اہم قدم اٹھائے ہیں۔ ایک تو اس نے ان تجویزوں کا اعلان کیا ہے جن پر وہ افراط زر اور گرانی کو روکنے کے لئے عمل کرنا چاہتی ہے۔ دوسرے مزدوروں کے سرکاری بیمے کا کارپوریشن قائم کیا ہے گرانی کو روکنے کی تجویزوں میں اور تو سب ضمنی حیثیت رکھتی ہیں اصل تجویز جو موجودہ حالات میں موثر ثابت ہو سکتی ہے یہی معلوم ہوتی ہے کہ مشینوں پر محصول درآمد معاف کر کے اور نئے کارخانوں کو انکم ٹیکس سے مستثنے کر کے سرمایہ داروں کی ہمت افزائی کی جائے کہ وہ بے کار سرمائے کو کام میں لگائیں اور اشیاء کی پیداوار بڑھائیں۔ صنعت کاروں اور مزدوروں دونوں کا برابر خیال رکھنا اور دونوں کے لئے یکساں سہولتیں بہم پہنچانا۔ روشن خیال سرمایہ داری کی پالیسی ہے جسے پریذیڈنٹ روزویلٹ نے امریکا میں اختیار کیا تھا اور جو "نیو ڈیل" کے نام سے مشہور تھی۔

ہمارے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا سب اہم صنعتوں کو سرکار کی طرف سے چلانے کی اشتراکی پالیسی جس کا ہماری حکومت پہلے کئی بار اعلان کر چکی ہے ترک کر دی گئی اور روشن خیال سرمایہ داری کی پالیسی مستقل طور پر اختیار کر لی گئی؟ اس کا جواب دراصل اس وقت ملے گا جب وزیر اعظم جواہر لال نہرو مجلس آئین ساز میں اس پر روشنی ڈالیں گے کہ پیداوار بڑھانے کی مجوزہ تدبیریں محض عارضی ہیں یا حکومت کی مستقل پالیسی کو ظاہر کرتی ہیں ہمارے ہر دل عزیز گورنر جنرل نے بیمہ کارپوریشن کے افتتاح کے موقع پر جو تقریر کی اس کے بعض فقرے ہمارے دل میں یہ اندیشہ پیدا کرتے ہیں کہ چاہے وزیر اعظم خود یہ سمجھتے ہوں کہ وہ بڑی احتیاط سے آہستہ آہستہ اشتراکیت کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر ہماری حکومت کے نزدیک منزل مقصود دراصل روشن خیال سرمایہ داری ہے۔ راجہ جی نے فرمایا "میں آجر اور مزدور کی اصطلاحیں پسند نہیں کرتا۔ آجر تو صرف ریاست ہے جتنے کام کرنے والے ہیں وہ سب محب وطن شہری ہیں۔ ہر جھگڑا اس طرح چکایا جا سکتا ہے کہ پیداوار کم نہ ہونے پائے اس لئے کہ

مزدوروں کے بہت بڑے دوست، جن کی دوستی میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا، حکومت میں اخباروں میں اور ان پارٹیوں میں موجود ہیں جو ہماری سیاست پر حاوی ہیں۔" سردار پٹیل نے بھی اپنی زبردست تقریر میں جو انھوں نے ۱۳ اکتوبر کو باشندگان دہلی کے ایڈریس کے جواب میں کی تھی آجروں اور مزدوروں دونوں کو ان کے فرائض یاد دلائے اور دونوں کو اس بات کا یقین دلایا کہ وہ ان کے دوست ہیں۔

ہمیں اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ حکومت کے ارکان خصوصاً ہمارے کانگریسی وزیر آجروں اور مزدوروں دونوں کے سچے خیر خواہ ہیں۔ اور یہ چاہتے ہیں کہ دونوں کا مقصد ایک ہو، یعنی دونوں ریاست کو اصل آجر اور اپنے آپ اس کے کارکن سمجھیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ نظام سرمایہ داری کی تاریخ میں یہ مبارک خواہش کبھی پوری نہیں ہوئی اسی لئے اشتراکیوں کو یہ کوشش کرنی پڑی کہ محض استعارے میں نہیں بلکہ حقیقت میں "آجر صرف ریاست ہو اور جتنے کام کرنے والے ہیں وہ سب اس کے محب وطن شہری ہوں" یعنی سب صنعتیں صرف ریاست کی ملکیت ہوں اور اسی کی انتظام میں چلائی جائیں یہاں تک کہ انگلستان جیسے ملک کو جس کے باشندے احتیاط اور اعتدال میں ضرب المثل ہیں آخر مجبور ہو کر یہی راہ اختیار کرنی پڑی۔

ہم حکومت ہند کی صنعتی پالیسی سے پوری طرح مطمئن نہیں ہو سکتے۔ لیکن دو باتیں ہم کو اپنے ذہن میں صاف کر لینی چاہئیں۔ ایک یہ کہ جیسا سردار پٹیل نے فرمایا موجودہ پالیسی کیبنٹ کی کسی ایک پارٹی کی نہیں بلکہ پوری کیبنٹ کی پالیسی ہے۔ چاہے اس کے ممبروں میں نظری اصول کے بارے میں اختلاف ہو لیکن جو عملی قدم اٹھائے جاتے ہیں ان پر سب ممبر کم و بیش متفق ہوتے ہیں دوسرے یہ کہ پچھلے انتخابات میں ہمارے رائے دہندوں نے جو نمائندے منتخب کر کے بھیجے ہیں ان کی اکثریت کا اعتماد اپنے اوپر قائم رکھنے کے لئے حکومت اس کے سوا کوئی پالیسی اختیار نہیں کر سکتی۔ یعنی دراصل خود ہماری رائے عامہ ابھی تک روشن خیال سرمایہ داری کے تصور سے آگے نہیں بڑھی ہے۔ اس حقیقت کے سمجھ لینے سے ان لوگوں کی حیرت رفع ہو جائے گی۔ جو یہ پوچھا کرتے ہیں کہ آخر پنڈت نہرو جنھوں نے ہمیں سب سے پہلے چاک گریباں کی تعلیم دی کیا ایک دم سے وضع احتیاط کے پابند کیسے ہو گئے؟ ان کو یہ سوچنا چاہئے کہ ہم اس نازک وقت میں جبکہ ہندوستان کی نئی ریاست کو نہایت شدید اندرونی اور بیرونی طوفان کا مقابلہ کرنا تھا پنڈت نہرو کے ہاتھ میں حکومت کی کشتی کی پتوار دی۔ ان کو یہ تاکید کر دی کہ گرداوں اور چٹانوں سے بچتے ہوئے چلو، ان کو کشتی کے کھینے والے ایسے دئے جو سچے دل سے سمجھتے ہیں کہ آہستگی میں سلامتی ہے پھر ہم ان سے یہ توقع کیسے کر سکتے ہیں کہ وہ جلد سے جلد ساحل مقصود تک پہنچ جائیں۔

وزیر اعظم ان کی حکومت اور مجلس آئین ساز پر اعتراض کرنے سے ہمارے آزادی رائے کے جذبے کو تسکین ہو تو خیر یہ بھی کرتے رہیں لیکن ہم کو اس دھوکے میں نہیں رہنا چاہئے کہ اس سے کوئی عملی فائدہ ہوگا اگر ہمیں اپنے ملک میں اشتراکی جمہوریت قائم کرنی ہے تو ایک طرف رائے عامہ کو صبر و استقلال کے ساتھ سمجھا بجھا کر صنعتی سرمایہ داری کے خلاف اسی طرح ابھارنا ہوگا جیسے ہم نے اسے زمینداری کے خلاف ابھارا اور دوسری طرف فرقہ داری اور صوبہ داری تعصبات کے خلاف جہاد کرنا ہوگا۔ اس لئے کہ جب تک رائے عامہ کا یہی تقاضا اور اس کی پوری مدد نہ ہو کوئی جمہوری حکومت سرمایہ داری کے زبردست نظام کو توڑنے کا ارادہ نہیں کر سکتی۔ اور جب تک مختلف فرقوں اور صوبوں کے آپس کے جھگڑے ہر وقت اس کی توجہ کو ہٹاتے رہیں اور اس کی قوت کو منتشر کرتے رہیں وہ اس ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

بزم بے تکلف

(۱)

"کیوں حضرت آپ نے تو بہت سی لغت کی کتابیں چاٹ ڈالی ہیں، کیا لیڈر کے لئے ہمارے ہاں کوئی لفظ نہیں جو ہم یہ کمبخت انگریزی لفظ استعمال کرتے ہیں؟ جب سے سنئے لیڈر، لیڈر، لیڈر۔ کان پک گئے سنتے سنتے۔ آخر پیشوا، رہنما، رہبر، زعیم، قائد کہتے کیا زبان گھستی ہے؟"

"زعیم اور قائد کہنے میں تو ضرور گھستی ہے، بلکہ اگر خشوع خضوع کے ساتھ کہئے تو حلق میں خراش بھی آ جاتی ہے۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ ان سب لفظوں میں خصوصیت ہے اور لیڈر میں عمومیت ہے۔"

کیا مطلب آپ کا؟ یعنی لیڈر میں کوئی خصوصیت ہی نہیں تو پھر لیڈر کیوں بنا پھرتا ہے؟"

ارے بھئی مطلب یہ ہے کہ اور سب لفظوں کا مفہوم خاص ہے اور لیڈر کا مفہوم عام ہے۔"

"اور آپ کا مفہوم بندے کے فہم سے باہر ہے؟"

"گھبرائیے نہیں ابھی آپ کے فہم کے اندر سما جائے گا دیکھئے "پیشوا" روحانی نجات کی راہ دکھلانے والوں کے لئے مخصوص ہے "رہنما" اور "رہبر" اخلاقی ہدایت کرنے والوں کے لئے۔ زعیم وہ سیاسی نیتا جو گرجتا اور بسکتا (؟) رہے۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر ہوا ضیغم کچھار سے

اور قائد وہ ہے جو دوسروں کو قید و بند میں رکھتا ہے اور خود ہر قید سے آزاد ہوتا ہے۔ دیکھا آپ نے ان لفظوں کے مفہوم محدود ہیں۔ مگر لیڈر ان سب پر حاوی ہے۔"

"سب پر حاوی نہ ہو تو لیڈر کاہے کا۔ مگر پھر بھی بات صاف نہ ہوئی، آخر ان پانچوں میں اور لیڈر میں کیا فرق ہے؟"

یہی فرق ہے کہ اور سب اضافی اصطلاحیں ہیں اور لیڈر مطلق ہے۔"

"پھر وہی موٹے موٹے لفظ، حیوان مطلق، جاہل مطلق تو سنا تھا یہ خالی مطلق کیا بلا ہے؟"

"شاید آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں لیڈر کی منطقی تعریف کر دوں اور یہ بہت مشکل ہے۔"

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

پچھلا ہفتہ: ۱۔ ہندوستان

حیدرآباد روبہ صحت ہے

حیدرآباد میں امن قائم کرنے کا کام بہت ہو چکا ہے، تھوڑا باقی ہے۔ دیہات میں ابھی کہیں کہیں رضاکاروں اور کمیونسٹوں کے جتھے اپنی سرگرمیاں دکھا رہے ہیں اور ہندوستانی فوج حیدرآبادی فوج کے ساتھ مل کر ان کے خلاف کارروائی کر رہی ہے۔ سکندرآباد میں کبھی کبھی دوکانوں اور لوٹنے کے واقعات ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے فوجی حکومت نے کرفیو اور دوسری پابندیوں کی میعاد میں تھوڑی سی توسیع کر دی ہے۔ ریل کی آمد و رفت، ڈاک، تار، ٹیلیفون کا انتظام ساری ریاست میں معمول پر آگیا ہے۔ باہر سے مسافروں کے مال اور ڈاک کے آنے جانے میں اب کوئی دقت نہیں رہی ہے۔ صدر میں اور اضلاع میں چند خاص ذمہ داری کے عہدوں پر حکومت ہند نے عارضی طور پر اپنے آدمی مقرر کر دیئے ہیں، لیکن جہاں تک ممکن ہے یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ پرانے ملازموں کو اپنے عہدوں پر برقرار رکھا جائے بلکہ ان میں سے جو لوگ چھٹی پر تھے خطرے کی وجہ سے بھاگ کر چلے گئے، یا میر لائق علی کی حکومت کے زمانے میں بے وجہ برخاست کر دیئے گئے تھے ان کو واپس بلایا جا رہا ہے۔

لیکن حیدرآباد کی حکومت کا آیندہ نقشہ ابھی تک نہیں بنا ہے یہ تو ظاہر ہے کامل ذمہ دار حکومت قائم ہونے سے پہلے درمیانی زمانے کے لئے عوام کی نمایندہ حکومت قائم ہوگی۔ لیکن حکومت کی تشکیل کس انداز پر ہوگی، کن کن جماعتوں کے آدمی کیبنٹ میں لئے جائیں گے، وزیر اعظم بھی عوام کا نمایندہ ہوگا یا اُسے نظام مقرر کریں گے۔ یہ سب باتیں فیصلہ طلب ہیں۔ فیصلے میں دیر غالباً اس لئے ہو رہی ہے کہ اسٹیٹ کانگریس کی تنظیم ازسرنو کرنے کی کوششیں جاری ہیں اور ان کے نتیجے کا انتظار ہے اگر ریاست کے سب قوم پرور مسلمان اسٹیٹ کانگریس میں شریک ہو جائیں تو اس سے ایک مضبوط حکومت بنانے کا کام بھی آسان ہو جائے گا اور ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات پر بھی بڑا خوشگوار اثر پڑے گا۔

وصل یا فراق

"اکتوبر کو، لندن میں کامن ویلتھ کے وزیر اعظموں کی کانفرنس ہو رہی ہے اس کی شرکت کے لئے ہمارے وزیر اعظم جواہر لال نہرو لندن پہنچ گئے ہیں ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد کامن ویلتھ میں رہنے یا اس سے الگ ہونے کے بارے میں کافی لکھا اور کہا جا چکا ہے۔ بائیں بازو والوں کا بڑا سخت اصرار ہے کہ ہندوستان کو کامن ویلتھ سے فوراً الگ ہو جانا چاہئے اور کانگریس چاہتی ہے کہ جذبات سے الگ ہو کر تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد کوئی فیصلہ کرنا چاہئے۔ البتہ اس سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہوگا کہ برطانیہ سے خوشگوار اور گہرا تعلق رکھنے میں ہندوستان کا بڑا فائدہ ہے اور ان دونوں کے اتحاد سے دنیا کے امن اور اس کے اتحاد و ترقی کو بڑی مدد مل سکتی ہے۔

ہندوستان کامن ویلتھ میں شریک رہے گا یا اس سے الگ ہو جائے گا۔ اس کے متعلق فی الحال کوئی پیشین گوئی کرنا مشکل ہے۔ البتہ یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ ہندوستان کوئی ایسی شرط ماننے کے لئے تیار نہیں ہوگا، جس سے اس کی خارجی سیاست قطعی طور پر پابند ہو جائے۔ اور نہ وہ کسی حالت میں بھی یہ برداشت کرے گا کہ کامن ویلتھ کے شریک ملکوں میں اس وقت جو نسلی امتیازات پائے جاتے ہیں وہ موجود رہیں اور جنوب مشرقی ایشیا اور افریقہ کی نوآبادیاں بدستور غلام رہیں۔ اسی کے ساتھ کامن ویلتھ کے بعض قاعدوں اور اصولوں میں بھی تبدیلی کرنی پڑے گی۔ لندن کے مشہور اور با اثر ہفتہ وار اخبار "اکانومسٹ" نے "کامن ویلتھ کیا ہے" کے عنوان سے، چند دن ہوئے۔ ایڈیٹوریل لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ کامن ویلتھ میں بعض ایشیائی ملکوں کی شرکت سے اس کی صورت حال میں، نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ پہلے قانونی رشتہ کے علاوہ کامن ویلتھ کے شریک ممالک کی روایات، طبائع اور رجحانات میں بڑی حد تک اتحاد اور یکسانی تھی۔ مگر ہندوستان، پاکستان، سیلون اور دوسری نوآبادیات ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں اس لئے یہ ممالک پرانے قوانین اور شرائط پر کامن ویلتھ میں شریک ہونے پر راضی نہیں ہوں گی۔

اس وقت بڑی طاقتوں میں جو اختلافات ہیں اور طاقت حاصل کرنے کے لئے، جو کھیل کھیلے جا رہے ہیں ان میں ہندوستان بالکل غیر جانبدار رہنا چاہتا ہے، وہ اگر ایک طرف برطانیہ اور امریکہ سے دوستی رکھنا چاہتا ہے تو دوسری طرف روس سے بھی بلاوجہ بگاڑ کرنا نہیں چاہتا۔ وہ چاہتا ہے کہ جو بین اقوامی مسائل پیدا ہوں ان کے متعلق مفاد کو پیش نظر رکھ کر آزادی کے ساتھ جو چاہے فیصلہ کرے۔ موجودہ پیچیدہ حالات میں اس قسم کی پالیسی پر عمل کرنا مشکل ضرور ہے مگر ہندوستان جیسے ملک کے لئے، جو طویل غلامی سے ابھی ابھی آزاد ہوا ہے یہ پالیسی بہت ضروری ہے مگر ظاہر ہے غیر جانبداری کی یہ پالیسی اسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے۔ جب تک ہندوستان کا بنیادی مفاد دونوں فریقوں میں سے کسی ایک کے مفاد سے نہیں ٹکراتا۔

ہند میں ایک اور بین اقوامی ادارہ

۴ اور ۵ اکتوبر کو نئی دہلی میں عالمی ادارۂ صحت کی علاقہ واری کمیٹی کا جلسہ منعقد ہوا۔ یہ ادارہ یو، این او کے ماتحت ڈبلیو، ایچ، او (ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن) کے نام سے قائم کیا گیا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کے سب ملکوں میں لوگوں کی صحت کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے۔ کام کی سہولت کی خاطر اس کی پانچ علاقہ وار کمیٹیاں قائم کی گئی ہیں۔ یہ جلسہ جنوب مشرقی ایشیا کی کمیٹی کا تھا جس میں سیلون، اسیام، برما، افغانستان اور نیپال کے نمایندوں نے شرکت کی۔ پاکستان مشرقی وسطی کی علاقہ وار کمیٹی میں ہے۔ اس لئے اس کانفرنس میں اس کا کوئی نمایندہ نہیں تھا۔ کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے جواہر لال نہرو نے فرمایا کہ "اگر صحت اور ایسے ہی دوسرے امور میں زیادہ سے زیادہ بین اقوامی اشتراک عمل سے کام لیا جائے تو ہم معاشی اور سیاسی پیچیدہ مسائل میں بھی ایک دوسرے سے قریب تر ہو جائیں گے۔ اگر یہ ادارہ اپنے مقاصد یعنی عام جسمانی دماغی اور سماجی بہبودی میں کامیاب ہوا، تو دنیا کے اور بہت سے مسائل بھی حل ہو جائیں گے۔"

کمیٹی کا سب سے اہم فیصلہ یہ ہے کہ مجوزہ ادارہ جو پورے جنوب مشرقی ایشیا کے لئے ہوگا، دہلی میں قائم کیا جائے۔

اس ادارہ سے ہماری بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ مشرقی ممالک خصوصاً ہندوستان کی صحت بڑی توجہ کی محتاج ہے۔ کون سی بیماری ہے جو یہاں نہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا سال گذرتا ہو جس میں ہزارہا انسان قبل از وقت نہ مر جاتے ہوں۔ اگر اس ادارے نے سیاسی اختلافات سے بلند ہو کر اور صحیح معنی میں بین اقوامی نقطۂ نظر سے کام کیا تو یہ دنیا کی بہت بڑی خدمت انجام دے گا۔

الیکشن میں دھاندلی

فرنچ انڈیا کی میونسپلٹی کے جو انتخابات ۱۰ اکتوبر کو ہونے والے تھے وہ ملتوی کر دیئے گئے۔ پچھلے دو ہفتوں کے واقعات پر نظر ڈالتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ فرانسیسی مقبوضات کے انڈین یونین میں شامل ہونے کے مسئلے پر وہاں آزاد رائے شماری کا امکان نہیں۔ مقامی حکومت اپنی پوری طاقت اس بات پر صرف کر رہی ہے کہ جائز اور ناجائز طریقے سے ہندوستان میں شامل ہونے والوں کے ووٹ کو بے اثر کر دیا جائے اس کے لئے انتخابی حلقے بار بار بدلے جاتے ہیں تاکہ بعض حلقوں میں ہندوستان کے حامیوں کی اکثریت، اقلیت میں تبدیل ہو جائے جلسوں پر پابندیاں ہیں، ہندوستان کے خلاف غلط اور جھوٹے پروپیگنڈے کئے جا رہے ہیں طلبہ سے کہا جاتا ہے کہ فرنچ انڈیا میں جو رعایتیں انہیں حاصل ہیں، وہ ہندوستان میں شامل ہونے کے بعد ختم ہو جائیں گی پنشن یافتہ ملازموں کو دھمکی دی جاتی ہے کہ اگر انھوں نے ہندوستان کے حق میں ووٹ دیا تو ان کی پنشنیں ضبط کر لی جائیں گی۔ متوسط طبقہ کے لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں جانے کے بعد انھیں بھاری ٹیکس ادا کرنا پڑے گا۔ غرض ہر طرح کے دباؤ۔ اور جھوٹے پروپیگنڈے سے رائے عامہ کو غلط راہ پر ڈالنے کی بڑی کوششیں ہو رہی ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس کی روک تھام کے لئے انڈین یونین کوئی موثر اور فوری قدم اٹھائے۔

۲۔ پاکستان

شیخ غلام حسین ہدایت اللہ کی وفات

پچھلا پرچہ پریس بھیجا جا چکا تھا، سندھ کے گورنر شیخ غلام حسین ہدایت اللہ کے انتقال کی خبر آئی۔ مرحوم کوئی ۴۰ سال سے سندھ کی پبلک زندگی میں دخیل رہے۔ ابتدا شروع میں تو انھوں نے اپنے صوبے کی مقامی اور چھوٹے موٹے اداروں کے ذریعے خدمت کی لیکن اپریل ۱۹۳۶ء میں سندھ الگ صوبہ بنا تو ان کی خدمت کا حلقہ اور وسیع ہو گیا۔

پچھلے چند سال میں سندھ کی سیاست میں مرحوم کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اگرچہ ہمیں ان کی سیاست سے ہمیشہ اختلاف رہا ہے اور انھوں نے برسر اقتدار رہنے کے لئے جو طریقے اختیار کئے وہ قوم پرور حلقوں میں کبھی پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھے گئے۔ مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے سندھ کی بڑی خدمت کی ہے اور ان کا صوبہ ایسے موقع پر ان کی خدمات سے محروم ہو گیا جب اسے اُن کی بڑی ضرورت تھی۔

پچھلے دنوں پاکستان کی مرکزی حکومت سے سندھیوں کو بڑی شکایت ہو گئی تھی اور اگر مرحوم کی شخصیت درمیان میں نہ ہوتی، تو ممکن ہے صوبے اور مرکز کا یہ اختلاف کوئی بہت ہی ناگوار صورت اختیار کر لیتا۔

لاہور ہائی کورٹ کے سابق جج دین محمد صاحب مرحوم کے جانشین مقرر ہوئے۔ موصوف کی قانونی قابلیت مسلم ہے لیکن پاکستان کے بعض اخبارات نے اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ سندھیوں کو پنجاب کے لوگوں سے جو مخالفت ہے وہ اس تقرر سے کہیں اور نمایاں نہ ہو جائے کیونکہ مرکزی حکومت اور سندھی حکومت کا پچھلا اختلاف جو جناح صاحب کی شخصیت اور غلام حسین ہدایت اللہ صاحب کی کوششوں سے دب گیا تھا، کہیں پھر ابھر نہ آئے۔ خدا کرے کہ یہ اندیشہ غلط ثابت ہو، تاکہ پاکستان ان جھگڑوں میں الجھنے کی بجائے تعمیری کاموں کی طرف توجہ دے سکے۔ اس سے صرف پاکستان ہی کو فائدہ نہیں ہوگا بلکہ ہندوستان کو بھی۔

اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

پاکستان میں گرفتاریوں کا سلسلہ جاری ہے اور بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ایسا کوئی ایک شخص بھی جیل کے باہر نہیں رہ سکے گا، جو کسی طریقے سے بھی ——— خواہ وہ ہمدردانہ ہو یا مخالفانہ، پاکستان کی حکومت پر تنقید کرے۔ شروع میں ایسے اشخاص کو چن چن کر گرفتار کیا گیا جن کا تقسیم ہند سے پہلے کانگرس سے ذرا سا بھی تعلق تھا۔ اس کے بعد کمیونسٹ پارٹی اور مزدور انجمنوں کے کارکنوں کو جیل میں بھر دیا گیا یہاں تک کہ ڈاکٹر اشرف کو بیماری کی حالت میں ایک ہسپتال سے گرفتار کیا گیا اور اب جماعت اسلامی کے رہنماؤں اور کارکنوں پر نظر عنایت ہے۔ چنانچہ امیر جماعت مولانا ابو الاعلیٰ مودودی، جماعت کے ناظم طفیل احمد صاحب اور اس کے روح رواں اور راولپنڈی شاخ کے انچارج مولانا امین احمد صاحب اصلاحی گرفتار کر لئے گئے ہیں۔ ان لوگوں کا جرم صرف اتنا ہے کہ مسلم لیگ نے انتخابات کے وقت جو وعدے کئے تھے، ان کو پورا کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس سے بھی بڑا جرم یہ ہے کہ انھوں نے کشمیر کی لڑائی کو اسلامی جہاد تسلیم کرنے سے انکار کیا اور پاکستانی حکومت کو مشورہ دیا کہ جب تک ہندوستان سے پاکستان کا معاہدہ ہے اس وقت تک کشمیر پر حملہ کرنا یا کسی جماعت کی فوجی مدد کرنا جو اس پر حملہ کر رہی ہو ناجائز ہے۔ جماعت اسلامی کی اس صداقت گوئی پر، پہلے اس کے اخبارات کو بند کیا گیا اور اب اس کے ممتاز کارکن گرفتار ہوئے گئے ہیں۔

پاکستان اپنے قیام سے جس پالیسی پر چل رہا ہے اس سے آمرانہ رجحانات کی موافقت و مخالفت بھی ہو چکے ہیں۔ مگر حکومت پر اس کا اثر کچھ الٹا ہی ہوتا ہے۔ تازہ گرفتاریوں اور سختیوں پر پاکستان ٹائمز لاہور نے اپنی ۵ ستمبر کی اشاعت میں "ہنگامی اختیارات" کے عنوان سے اداریہ لکھا ہے جس میں اس نے بتلایا ہے کہ گرفتاریوں کی زد سے مسلم لیگ، احرار، کانگرس، کمیونسٹ، سوشلسٹ، مزدور اور کسان انجمنیں غرض کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔ اور بقول پاکستان ٹائمز "ان کے جرائم" سے نہ صرف عوام کو بے خبر رکھا گیا ہے بلکہ ان گرفتار ہونے والوں میں سے بہتوں کو بھی اپنے جرم کا علم نہیں۔ آخر میں پاکستان ٹائمز نے مسلم لیگ سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے اور تمام پاکستانیوں کو ——— چاہے وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، یہ یقین دلائے کہ انھیں باقاعدہ عدالتی کارروائی کے بغیر کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔"

لازمی اور عام تعلیم

پاکستان اپنی اندرونی اور خارجی سیاست میں کچھ ایسا الجھا ہوا ہے کہ اسے تعمیری کاموں کی طرف توجہ کرنے کا موقع بہت کم مل سکتا ہے۔ جن اہم مسائل پر اب تک دھیان نہیں دیا گیا ہے ان میں سے ایک تعلیم بھی ہے۔ تسلی ہے کہ اب توجہ کی جا رہی ہے۔ پاکستان کے ناظمان تعلیمات کی کمیٹی کا ابھی حال میں جلسہ ہوا اور اس نے تعلیم کو لازمی اور عام کرنے کے مسائل پر غور کیا۔ کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ جس طرح ترکی میں تعلیم کو عام اور لازمی کرنے کے سلسلے میں دیہاتوں میں خود عوام نے اپنے اسکول قائم کئے تھے اسی طرح پاکستان میں بھی عوام کو اس پر آمادہ کیا جائے۔ جسمانی تربیت کے لئے دو کالجوں کے قائم کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا ہے، ایک مغربی پاکستان میں اور ایک مشرقی پاکستان میں۔ معلوم ہوا ہے مغربی پنجاب کی حکومت مرتبا میں اس طرح کا ایک کالج قائم کرنے کے لئے عمل کر بھی چکی ہے۔ تعلیم بالغان پر کمیٹی نے بڑا زور دیا ہے اور اس سلسلے میں معلومات اور تجربہ حاصل کرنے کے لئے میکسیکو اور ترکی وغیرہ میں جہاں تعلیم بالغان کا کامیاب تجربہ کیا جا چکا ہے، مطالعہ کے لئے ماہرین تعلیم کو بھیجنے کی سفارش کی گئی ہے۔ تعلیمی مسائل کے ساتھ ساتھ اردو رسم خط کے سلسلے میں بھی متعدد تجویزوں پر بحثیں ہوئیں۔ زیر غور تجویزوں میں ایک رومن خط اور ایک نسخ ٹائپ کے اختیار کرنے کی بھی تجویز تھی۔ یہ مسئلہ کافی اختلافی اور غور طلب تھا۔ اس لئے اسے ماہروں کی کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا ہے۔

ان سفارشات پر غور کیا جائے تو پاکستان ٹائمز" کی اس رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ پریس رپورٹ سے یہ نہیں واضح ہوتا کہ ان تجویزوں پر عمل درآمد کس طرح ہوگا۔ اگر اسکولوں کے قائم کرنے کی ذمہ داری تمام تر عوام پر ڈال دی گئی تو اس کی کامیابی معلوم! نیز اس کی بالکل وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ تعلیم کا طریقہ کیا ہوگا؟ کیا وہی پرانا طریقہ جو اب تک مکتبوں اور مدرسوں میں رائج ہے یا نئے طریقے اختیار کئے جائیں گے؟ اگر نئے طریقے اختیار کئے گئے تو استادوں کی ٹریننگ کا حکومت کو فوراً کوئی انتظام کرنا چاہئے۔ اسی طرح تعلیم بالغان کے متعلق بھی کوئی واضح فیصلہ نہیں کیا گیا ہے۔ اس مسئلے پر پاکستانی علاقوں خاص طور پر پنجاب میں صوبائی خود مختاری کے بعد کئی اسکیمیں بنائی گئیں اور کمیٹیاں مقرر کی گئیں۔ مگر نتیجہ صفر سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ اب بھی صرف ترکی اور میکسیکو وغیرہ کی "سیر" تک کام کو محدود رکھا گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ تعلیم کی اصلاح و ترقی کے لئے ہندوستان میں بھی بہت زیادہ کام نہیں ہوا ہے مگر یہاں سٹنڈرڈ سے بہت کچھ ہو رہا ہے اور آزادی کے بعد اس طرف توجہ کچھ زیادہ ہی ہوئی ہے، کم نہیں، مگر پاکستان نے تو ابھی تک اس مسئلے کو چھیڑا ہی نہیں تھا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تعلیم جیسے اہم اور ضروری کام میں کس قدر تساہل سے کام لیا جا رہا ہے۔ "پاکستان ٹائمز" (مورخہ ۲ ستمبر) میں ایک فنی ماہر تعلیم" کا خط چھپا ہے جس میں پاکستان کی تعلیمی رفتار پر بڑی مایوسی ظاہر کی گئی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ "جلسے اور کانفرنسیں تو بہت منعقد ہوتی ہیں، اسکیموں کی بھی کمی نہیں، مگر تعلیم کی کیفیت یہ ہے کہ کراچی میں جو چند تعلیمی ادارے پہلے سے موجود تھے، وہ بھی یا تو بند ہو چکے ہیں یا بند ہو رہے ہیں۔ پاکستان میں دو بڑے بڑے کارخانے ہیں فنی ماہروں اور سکیلڈ مزدوروں کی کمی کی وجہ سے دم توڑ رہے ہیں۔" مکتوب نگار نے آخر میں پاکستان سے مطالبہ کیا ہے کہ "ہمیں میٹھے وعدوں اور کاغذی اسکیموں کی ضرورت نہیں ہے، ہم عمل دیکھنا چاہتے ہیں اور ابھی۔"

جنگ کا موّا

پاکستان کے وزیر اعظم صاحب نے

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

مغربی دنیا

پنچوں کی رائے

روس اور اتحادیوں کا جو مقدمہ آج کل یو، این، او کے سامنے پیش ہے اس میں تو صرف اتنا ہو سکتا ہے کہ دونوں کے بیان سن کر یہ بتا دیا جائے کہ کون ٹھیک کہتا ہے۔ اتنا ہو جائے تو بھی بہت ہے اس سے آگے کچھ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ورنہ روس پنچایت سے اٹھ کر چلا جائے گا اور قوموں کی محفل بے رونق ہو جائے گی۔ اس بات کو روسی اور ان کے مخالف دونوں خوب سمجھتے ہیں۔

لیکن جب فیصلہ کرنے کا موقع ہی نہیں ہے تو بحث کرنے سے کیا فائدہ؟ جمہوری پارٹیاں چاہتی ہیں کہ اگر لڑائی ہو تو کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ اس سے بچنے کی انتہائی کوشش نہیں کی گئی۔ روسی یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اتحادیوں نے ان تمام معاہدوں کی خلاف ورزی کی ہے جو طہران، یالٹا اور پوٹسڈم میں کئے گئے تھے اور اس کے علاوہ جمہوری ملکوں کے لیڈر لڑائی چھیڑنے کی غرض سے جنگ کا چرچا اور اس کے لئے تیاری کرتے رہے ہیں اور اب تو انھیں اور بھی یہ کہنے کا موقع ہے اس لئے کہ مغربی یورپ کی قوموں کا ایک الگ اتحاد ہو گیا ہے اور فیلڈ مارشل منٹگمری کی صدارت میں ایک کمیٹی مغربی یورپ کی حفاظت یعنی روس کے خلاف لڑنے کے لئے جنگ کے نقشے تیار کرنے کی غرض سے مقرر ہوئی ہے۔ یو، این، او کی بحثوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ اس وقت ساری زیادتیاں روس کی طرف سے ہو رہی ہیں ان کا خیال اور پختہ ہو جائے گا۔ اور جو لوگ سمجھتے ہیں کہ ہر معاملے میں زیادتی برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ انھیں اس کا آخری اور یقینی ثبوت مل جائے گا۔

مغربی یورپ کا بچاؤ کیسے ہوگا؟

ایک خاتون مس سمرز نے، جو پچھلی جنگ کے دوران میں جنرل آئزن ہاور کا موٹر چلاتی تھیں حال ہی میں ایک کتاب میں اپنی دیکھی سنی باتیں بیان کی ہیں، ان کا بیان ہے جنرل آئزن ہاور کے لئے جرمنوں سے لڑنا اتنا مشکل نہیں تھا جتنا کہ جنرل منٹگمری کو راضی رکھنا۔ اس بیان میں کچھ مبالغہ ضرور ہوگا لیکن پھر بھی تعجب ہوتا ہے کہ مغربی یورپ کے بچاؤ کی تدبیریں کیا بالکل انگریزی اور فرانسیسی سپہ سالاروں کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ غالباً اس کا مطلب یہ ہے کہ امریکی ماہر روسی فوجوں سے مقابلے کر انھیں روکنا ممکن نہیں سمجھتے۔ وہ بے شک حملے کو روکنے اور پسپا کرنے میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی ہر طرح سے مدد کریں گے، مگر اپنے لئے انھوں نے یہ تجویز کیا ہوگا کہ برطانیہ اور شمالی افریقہ میں ہوائی اڈے قائم کر کے یہاں سے بڑے پیمانے پر بم باری کریں اور جب اس کا پورا اثر ہو جائے تو میدان میں آئیں۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کو زیادہ فکر اس کی ہے کہ روسیوں کا پہلا حملہ ان کے ملکوں کو برباد نہ کرنے پائے اور ان کے لئے کوئی چارہ نہیں ہے۔ سوا اس کے کہ میدان میں جم کر لڑنے کی تیاری کریں۔

فرانس کا کوئی بھروسہ نہیں

بچاؤ کی تمام تدبیروں کا دار و مدار اس پر ہوگا کہ فرانسیسی سیاست میں ایسا انقلاب نہ ہو کہ کمیونسٹ حکومت حاصل کر لیں اس وقت فرانسیسی عام طور پر اپنی حالت سے بیزار ہیں۔ موجودہ لیڈروں سے خفا ہیں مگر نہ تو جنرل دے گول کو برسر اقتدار لانا چاہتے ہیں نہ کمیونسٹوں کو۔ جنرل دے گول کا مزاج اتنا تیز ہے کہ ان کا نہ اپنی قوم سے نباہ ہو سکے گا نہ دوسری قوموں سے اور کمیونسٹ حاوی ہو گئے تو ظاہر ہے کہ وہ روسی فوجوں کے لئے راستہ صاف کر دیں گے شاید اسی وجہ سے یہ تحریک ہوئی ہے کہ ہسپانیہ کو مہذب قوموں کی برادری میں شامل کر کے اس سے پھر سفارتی تعلقات قائم کئے جائیں اور اسے یو، این، او کا ممبر بنا لیا جائے۔ متحدہ ریاستیں اس تحریک کی تائید کرنے پر تیار ہیں، لیکن برطانیہ میں اس کی ضرور مخالفت کی جائے گی۔ وہاں اس کی کوشش کی جا رہی ہے کہ سوشلسٹوں اور دستوری بادشاہی کے حامیوں میں صلح کرائی جائے اور ہسپانیہ میں جمہوری حکومت قائم کرنے کی راہیں نکالی جائیں۔ جنرل فرینکو اس پر بہت خفا ہیں اور ہسپانیہ کے اخباروں میں برطانیہ کے خلاف بہت سخت مضمون لکھے جا رہے ہیں۔ لیکن ہسپانیہ کی خانہ جنگی ایسی پرانی بات نہیں ہے جسے لوگ بھول گئے ہوں اور برطانیہ کی سوشلسٹ حکومت ایسی تدبیروں کو محکم کرنے کی خاطر ان انگریزوں کی انصاف پرستی اور جمہور دوستی پر پانی نہیں پھیر سکتی۔ جنھوں نے ہسپانیہ کی جمہوری حکومت کو بچانے اور فاشسٹ سیلاب کو روکنے کے لئے اپنا خون بہایا تھا غالباً متحدہ ریاستوں کا دباؤ اور خود جنرل فرینکو کی مصلحت اندیشی معاملے کو بگڑنے نہ دے گی۔ جنرل فرینکو خود کمیونزم کے کٹر دشمنوں میں سے ہیں اور وہ یہ کبھی نہ چاہیں گے کہ روسی فوجیں فرانس کو فتح کرتی ہوئی ہسپانیہ کی سرحد تک پہنچ جائیں۔ فرانس میں ایسا کوئی نہیں ہے جس پر دباؤ ڈالنے سے کچھ فائدہ ہو، جس کی مصلحت اندیشی قوم اور حکومت کو راہ راست پر لا سکے۔ فیلڈ مارشل منٹگمری کو اپنے فرانسیسی رفیقوں کی آنکھ بچا کر جنگ کا ایسا نقشہ بنانا ہوگا جس میں فرض کیا گیا ہو کہ جنگ شروع ہوتے ہی روسیوں نے فرانس پر قبضہ کر لیا ہے۔

(م، م)

اس لوٹ کا کچھ ٹھکانا ہے!

پچھلے سو برس سے اوپر کی مدت میں جرمنی اور فرانس کے تعلقات کا اتار چڑھاؤ تاریخ کا ایک بہت ہی دلچسپ باب ہے۔ ۱۸۰۶ء میں نپولین نے پرشیا کو شکست دی تھی، اور برلن میں داخل ہوا تھا۔ اسی کا بدلہ ۱۸۷۰ء میں بسمارک نے لیا تھا اور پیرس میں کم و بیش اسی شان سے داخل ہوا تھا اسی کا بدلہ پچھلی جنگ میں فرانس نے دوبارہ جرمنی کو شکست دے کر لیا تھا، ہٹلر نے ۱۹۴۰ء میں اس کا انتقام تو لیا مگر خود جرمنی کو اینگلو امریکن اور روسی فوجوں نے شکست دی فرانس اگلی جنگ کا انتظار کرنے سے پہلے ہی غالباً انتقام لے رہا ہے مگر اس بار اس کا طریقہ اور ہے اور اسی لئے ہم اس پر غور کرنا چاہتے ہیں۔

ابھی ابھی ایک انگلستان کے مصنف نے چشم دید واقعات بیان کئے ہیں۔ جرمنی کے ایک حصہ پر جو جنوب مغرب میں واقع ہے فرانس کی حکومت ہے۔ جرمنی سب ہی فاتح قوموں کے حصے میں آیا ہے۔ اور سب ہی اس سے ضرورت کے مطابق فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ورٹمبرگ کا یہ حصہ کثرت سے آباد ہے اور خصوصیت یہ ہے کہ اس حصے میں کارخانے اور صنعتیں سب گاؤں ہی میں واقع ہیں۔ دنیا بھر کو جراحی کا سامان بیچنے ... ہے ... اور مشہور گھڑی بنانے کی ... صنعتیں ... ورٹمبرگ آج امریکن اور فرانسیسیوں کے حصہ میں آیا ہے۔ امریکا کے زیر اثر حصہ قدرے بہتر حالت میں ہے۔ ہم صرف فرانسیسی حصہ کی حالت کو دکھانا چاہتے ہیں۔

اگست کے وسط میں ورٹمبرگ کی حکومت نے استعفیٰ دے دیا تھا اور ایک روز تک عام ہڑتال رہی تھی۔ اس کی وجہ معلوم کرنے کے لئے ہم کو ذرا تفصیل سے دیکھنا ہوگا کہ فرانس نے جرمنی کے اس حصہ میں پچھلے تین سال میں کیا کیا کرم کئے ہیں۔

۱۹۴۵ء میں اندازہ لگایا گیا تھا کہ اس حصے میں تقریباً ۸۰۰۳ مشینیں ہوں گی۔ ۱۹۴۶ء میں ۲۰۰۰ جن میں نئی مشینیں زیادہ تھیں فرانس پہنچائی گئیں۔ ۱۹۴۷ء میں ۴۳۰۰ کے لے جانے کا آرڈر ہوا۔ اب جو آخری حکم ملا ہے اس میں ۸۲۰۵ مشینیں فرانس پہنچائی جائیں گی۔ اس وقت موقع نہیں ہے کہ تفصیل سے یہ اعداد و شمار درج کئے جائیں، مگر جو درج ہیں ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس حصے کے جفاکش اور قابل کاریگروں کا کیا حال ہوگا۔ ساتھ ہی ساتھ ورٹمبرگ کی حکومت سے مجبوراً ایک معاہدہ کیا گیا جس سے ۴۰ فی صدی گھڑیاں تو فرانس کو دی جائیں گی جو ان کو خود سے کوئی قیمت مقرر کر کے فروخت کرے گا اور ۴۰ فی صدی گھڑیاں جرمنی سے باہر جو مال جا رہا ہے اس میں بھیجی جائیں گی اور صرف ۲۰ فی صدی جرمنی کے حصے میں آئیں گی۔ ادھر گھڑیاں غائب ہوئیں ادھر امریکن اپنے حصہ میں امریکا سے سامان منگوا کر گھڑیاں بنانے کے کارخانے قائم کر رہے ہیں۔ یہ علاقہ چند ہی میل دور ہے۔

پچھلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء–۱۹۱۸ء کے بعد بھی فرانس نے فتح کے نشے میں جرمنوں پر کئی سال تک ایسی ناکہ بندی کر رکھی تھی جس میں لاکھوں معصوم جرمنوں پر مصیبت اور تباہی ڈھائی گئی تھی اس وقت بھی اندازہ لگایا گیا تھا کہ یہ طریقہ اسی قوم کو دبانے اور پھر سے نہ اٹھنے دینے کے لئے کافی ہوگا، اس پالیسی کا نتیجہ ۱۹۳۹ء کی جنگ تھی اور ہٹلر کے لئے زمین اسی پالیسی نے تیار کی تھی۔ تاریخ کے سبق کو

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

عیدِ قرباں

ڈاکٹر سیّد عابد حسین

حسنِ عشق آموز جاناں تیری شوخی کے نثار
مجھ کو مجھ سے کھو دیا اور خود رہا بیگانہ وار

چہرۂ زیبا پہ تیرے بے نقابی ہی نقاب
دیکھنے والوں کی نظریں بن گئیں خود پردہ دار

پھر دکھا دے اپنا جلوہ اے جمالِ طور سوز
ہم بھی جل جائیں فروغِ حُسن سے پروانہ وار

ہے ہمارا دل بھی ممنونِ نگاہِ شعلہ خو
ہم بھی رکھتے ہیں جگر میں سوزِ الفت کا شرار

دل نے سیکھا تھا نگاہوں سے محبت کا چلن
اب نگاہیں دل سے سیکھیں گی تڑپنے کا شعار

دل میں تو، آنکھوں میں تو، خلوت میں تو، جلوت میں تو
ہر طرف تو ہے تو پھر "اس" "میں" کا کیا ہو اعتبار

نیست ایں ہستی بجز عکسِ جمالِ شاہدے
لاشریکے۔ لایزالے، ذوالجلالے، واحدے

دل کہ تھا روزِ ازل زینت فزائے بزمِ یار
آج وہ حسرت کا مرقد ہے تمنا کا مزار

آ ادھر اے بے دلی تو ہی مری دم ساز ہے
کر مدد اے نا اُمیدی تو ہے میری غم گسار

نارسا ہے آہ میری، کیا کروں مجبور ہوں
گر پہنچ جائے تو ہو جائے فلک کے دل کے پار

آج میں اس جبر کے پردے کو کردوں تار تار
جبر کے مالک مجھے مل جائے اتنا اختیار

مرحبا اے سوزِ غم دردِ دروں را تازہ کن
حبذا اے نیشِ الفت زخمِ دل را زندہ دار

باز آمد عیدِ قرباں در دلِ ویرانِ من
باز شد آئینہ دار یارِ من مہمانِ من

جانتی ہے عید بھی طرزِ تغافل ہائے یار
ہائے اس کا منہ دکھانا سال بھر میں ایک بار

اے تعالیٰ اللہ کیسا خوش دلی کا روز ہے
ہر خوشی دنیا کی اس دینی مسرت پر نثار

نعرۂ الیوم عیدٌ ساز لب سے نغمہ ریز
کتبۂ الحب للہ لوحِ دل پر آشکار

سر خمارِ بادۂ عشرت سے محوِ سرخوشی
رُخ وفورِ نشۂ شادی سے ہم رنگِ بہار

باش اے طبعِ فضولم یاوہ گوئی تا کجا
نغمۂ مستانہ سنج و خموشی عرضہ دار

بس خجل ہستم نہ دارم فدیۂ شایانِ تو
آنچہ غیر از نست شاہا می کنم قربانِ تو

غزل

سیّدہ فرحت

اے ہم نشیں نہ پوچھ غمِ زندگی نہ پوچھ
پابندِ مرگ و زیست کی بے چارگی نہ پوچھ

یہ جانتی ہوں ہستیٔ دل ہے گراں بہا
پھر کیوں ہے مجھ کو آرزوئے بیدلی نہ پوچھ

اے چشمِ ملتفت مری خندہ لبی کو دیکھ
آنکھوں سے کیوں جھلکتی ہے افسردگی نہ پوچھ

ہوش و خرد میں کیفیتِ شوق یہ کہاں
کیفِ جنوں و لذتِ دیوانگی نہ پوچھ

تجھ میں بھی کچھ خلوص ہے فرحتؔ یہ غور کر
ہر کس لئے یگانوں میں بیگانگی نہ پوچھ

یورپ کا خط

بخارسٹ

۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء

کوئی مہینہ بھر ہوا میں نے بلگراڈ سے "نئی روشنی" کو اپنا پہلا مراسلہ بھیجا تھا اور مہینہ بھر میں یورپ کے ان مشرقی ملکوں میں رہا جو عام طور پر روس کے زیر اثر سمجھے جاتے ہیں۔ میں یورپ کی اس تقسیم میں، مشرقی اور مغربی یا روسی اور امریکن حلقہ اثر میں سے کسی کا مخالف ہوں نہ کسی کا موافق۔ ہر ملک کو اپنی مصلحتوں کے مطابق اپنی سیاست کی تشکیل کا حق ہے چاہے جس سے دوستی کرے میں مغربی ملکوں میں تو رہتا ہی ہوں البتہ یہاں مشرقی ممالک میں پہلی بار آیا ہوں جو خاص فرق مجھے ان ملکوں اور مغربی یورپ کے ملکوں میں نظر آیا۔ وہ یہ ہے کہ مغرب میں لوگ تھکے تھکے سے ہیں، پژمردہ ہیں، حوصلہ پست ہے۔ ولولہ ناپید۔ امریکہ کے روپیے پر سب کی نظر ہے، اسی کی مدد پر سب کچھ منحصر ہے لیکن دل اس سے بھی صاف نہیں کسی کا! امریکی تو دوستوں کو سب یورپ والے دلی حقارت سے دیکھتے ہیں، دلی مگر چھپی، غرض کی وجہ سے ظاہر نہیں کر سکتے اور دل ہی دل میں کڑھتے ہیں۔ روس کا ڈر لوں بھی عام ہے اور امریکن اپنی مدد کو ناگزیر بتلانے کے لئے اس ڈر سے اور بھی ڈراتے رہتے ہیں۔ اسی خوف میں لوگ امریکہ کے سہارے جیتے ہیں اور پورا بھروسہ اس پر بھی نہیں کہ یہ اپنے قابو کی چیز نہیں ہے۔ امریکہ سے پوچھتے ہیں کہ روس نے حملہ کر دیا تو ہماری سرحد کی حفاظت کر سکو گے؟ وہ کہتا ہے "یہ کیسے بتا سکتا ہوں جنگ کے جو تقاضے ہوں گے وہ پورے کئے جائیں گے۔ یہ کیا معلوم کہاں مورچہ بنے گا۔ روس کو شکست ہم دے دیں گے لیکن الگ الگ ہر ملک کی سرحد کی حفاظت کے ضامن ہم کیسے بن جائیں؟" اس سے ان ملکوں کو تسکین نہیں ہوتی۔ سوچتے ہیں کہ جب جنگ کی تباہی نے ہمارے وطن کو پامال کر دیا تو ہمیں اس سے کیا کہ روس ہارا یا امریکہ جیتا۔ غرض ہر طرف بڑا تذبذب ہے۔ زندگی میں کیف نہیں۔ [illegible] سیاست ریاکاری [illegible] ہے لوگ [illegible] کی سی باتیں کرتے ہیں۔

وہاں سے یہاں آیا تو کچھ رنگ ہی اور پایا۔ یہاں عام کیفیت اس سے [illegible] روس سے اندر ونی اختلافات یہاں بھی ہیں، پارٹی بازی بھی ہے۔ آپس کی شخصی رقابتیں بھی ہیں لیکن عام فضا مایوسی کی نہیں امید کی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ تعمیر کا ہی دور اس کے لئے کوشاں معلوم ہوتے ہیں۔ جنگ کی تباہی کے آثار تیزی سے مٹائے جا رہے ہیں ہر طرف تعمیر نو کا زور ہے۔ مثلاً یوگوسلاویہ کو لیجئے۔ میں صرف زغرب، لوبلیانا، اور بلگراڈ ہی جیسے بڑے شہروں میں نہیں گیا۔ چھوٹے چھوٹے قصبوں اور گاؤں میں بھی جانے کا موقع بھی ہوا، ہر جگہ لوگوں میں ہمت اور ولولہ نمایاں ہے۔ کام میں ضبط اور نظم ہے اور کام کی دھن ہے۔ کھانے کو کافی ہے، کپڑا بھی ہے جوتے بھی۔ دودھ اور چکنائی کی کمی ہے۔ مگر لوگ تندرست ہیں، مطمئن ہیں، حکومت سے خوش اور اس کے لئے کام کرنے کو تیار، مزدور اور کسان خوش حال ہیں اور بشاش۔ پرانے مالدار خاندان اور سرمایہ دار ضرور کچھ شکایتیں کرتے ہیں، لیکن عام خوش حالی کے نقار خانے میں اُن کی آواز سنائی بھی نہیں دیتی۔

نوجوانوں طالب علموں کی ہمت اور حوصلہ دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے۔ یہ خالی باتیں نہیں کرتے، تقریروں کے زور پر دنیا کا نقشہ بدلنا نہیں چاہتے بلکہ کام کرتے ہیں، نظم کے ساتھ، منظم کام کرتے ہیں۔ نوجوان تحریک میں دو ملین سے زیادہ نوجوان شریک ہیں۔ ان میں سے پچھلے دنوں کوئی تین لاکھ نوجوان "کام کے دستوں" میں مصروف عمل رہے ہیں۔ ان دستوں میں جو نوجوان کام کرتے ہیں ان کا انتخاب بڑے اہتمام سے ہوتا ہے۔ ہر گاؤں ہر قصبے کی کمیٹی اپنے یہاں سے چنے ہوئے نام بھیجتی ہے۔ پھر ضلع کمیٹی ان میں سے چھانٹتی ہے اور ان میں سے مرکزی کمیٹی انتخاب کرتی ہے۔ جس نوجوان کا انتخاب ہوتا ہے وہ اس پر فخر کرتا ہے۔ انتخاب کے بعد خاصی کٹھن تیاری کرنی ہوتی ہے اور پھر کام پر پہنچنا ہوتا ہے۔ پچھلے سال ان دستوں نے سماق سے سراجیوو تک ۲۵۰ میل سے زیادہ لمبی ریل بنائی، مانٹی نگرو میں ایک اور ریل تیار کی، اس سے ذرا چھوٹی بلگراڈ کے قریب ایک [illegible] اور مشینوں کا کارخانہ بنایا اور جگہ جگہ سڑکیں۔ ہر دستہ میں ۱۵۰ سے ۲۰۰ تک نوجوان ہوتے ہیں اور ہر جوان اپنے دستہ میں ایک مہینے کام کرتا ہے، روزانہ کا معمول یہ ہے: صبح ۴½ بجے سب اٹھتے ہیں ۵ بجے تک تیار ہو کر اپنے کام پر پہنچ جاتے ہیں۔ ۵ بجے سے ۱۲ بجے تک روزانہ جم کر کام ہوتا ہے بس ۹ بجے آدھ گھنٹے کو ناشتہ کے لئے چھٹی ہوتی ہے ناشتہ میں روٹی، جام اور بے دودھ کی کافی ملتی ہے۔ ۱۲ بجے دوپہر کا کھانا ہوتا ہے گوشت ترکاری روٹی اور پھل ایک بجے سے تین بجے تک آرام کرتے ہیں اور اس کے بعد لکھنا، پڑھنا، گانا، بجانا ہوتا ہے، ڈراما کرتے ہیں، مباحثے ہوتے ہیں، استاد بھی ساتھ ہوتے ہیں اور امتحان دینے والوں کو امتحان کی تیاری بھی کرائے جاتے ہیں۔

ان کا کام واقعی کام ہوتا ہے کھیل نہیں ہوتا، سماق سے سراجیوو تک جو ریل انہوں نے بنائی ہے اس میں پانچ تونل بنانے پڑے ہیں اور [illegible] سرنگیں، لاسووا کے پاس ایک سرنگ ۵۰۰ گز سے زیادہ لمبی ہے اور ۳۰ گز موٹی چٹان کو کاٹ کر بنائی گئی ہے۔ جو پتھر اس سے یہاں کاٹا تھا اسے ایک دوسرے رستے سے اٹھا لیا اور دریا بوسنا کے کنارے کنارے ایک دیوار بنی جس کی بڑی ضرورت تھی۔

عام تعلیمی ترقی کا اندازہ آپ کو اس طرح ہو سکے گا کہ ۱۹۳۶ء میں یہاں یونیورسٹیوں میں کوئی ۱۶ ہزار طالب علم تھے ۱۹۴۷ء میں ۴۰ ہزار داخل ہوئے ہیں۔ تعلیم گاہوں اور اقامت گاہوں کی عمارتوں کو جو نقصان جنگ میں پہنچا تھا وہ تقریباً سب کا سب پورا کیا جا چکا ہے۔ سراجیوو میں ایک فنی طبی یونیورسٹی قائم کی گئی ہے اور ایک اور طبی یونیورسٹی مقدونیہ میں۔ بلگراڈ میں کان کنی اور انجینیری کی تعلیم کا خاص انتظام کیا گیا ہے ۴ نئی اقامت گاہیں کھلی ہیں جن میں ۴ ہزار سے اوپر طالب علم رہتے ہیں، ۱۰ کھانے کے مرکز کھلے ہیں جہاں ۱۰ ہزار طلبہ کو سستا کھانا ملتا ہے طلبہ کا اپنا امداد باہمی کا انتظام ہے۔ [illegible] تک طالب علم خود ۲ ملین دینار سے زیادہ اپنی ضرورت کے لئے آپس میں جمع کر چکے ہیں۔ حکومت کی طرف سے وظائف برابر بڑھائے جا رہے ہیں۔ ۱۹۴۶ء میں ۵ ہزار طلبہ کو حکومت نے وظیفے دئے تھے ۱۹۴۷ء میں ۱۳ ہزار سے اوپر طلبہ سرکاری وظیفہ پا رہے ہیں۔

ہنگری، رومانیہ اور پولینڈ میں بھی کم و بیش یہی رنگ ہے۔ ہنگری میں جنگ کی تباہی بہت عام ہے۔ بڈاپسٹ میں تو شاید ہی کوئی عمارت ہو جسے نقصان نہ پہنچا ہو۔ بہت تو ایسی سمجھئے کہ بالکل مسمار ہو گیا ہے۔ لیکن اس تباہی کا بھی لوگوں کے دل امید سے معمور معلوم ہوتے ہیں ساری قوم کی تعمیر از سرِ نو ہو رہی ہے، مادی بھی، روحانی بھی، غریب اور پسماندہ طبقوں کو اُبھارنے کی خاص کوشش ہو رہی ہے۔ مثلاً جنگ سے پہلے ہنگری میں صرف ۲ فی صد یونیورسٹی کے طلبہ کسانوں کی اولاد تھے اور کسانوں کی آبادی ہے ۸۰ فی صدی۔ اب ان کے لئے خاص ادارے کھولے گئے ہیں اور گوشے گوشے میں کھولے جا رہے ہیں ان کے استادوں کی تربیت کا خاص اہتمام ہے۔ اور بہترین آدمی اس کام کے لئے چنے جا رہے ہیں۔ اسی طرح رومانیہ میں بھی کسانوں میں بھی تعلیم و ترقی کے جتن ہو رہے ہیں۔ پولینڈ میں تو تباہی کی کوئی حد ہی نہ تھی۔ وارسا کے شہر میں پتھروں کا ایک انبار تھا کم و بیش یہی حال اور شہروں کا تھا، لیکن ایک نئے ولولے نے تباہی کے یہ نشان بہت کچھ مٹا دئے ہیں۔ نوجوانوں میں بڑا جوش عمل ہے۔ یونیورسٹیوں میں جو بربادی ہوئی تھی اس کے درست کرنے میں بوڑھے پروفیسر اور جوان طالب علم ایسے منہمک نظر آتے ہیں کہ انسانیت کے مستقبل پر ایک دفعہ تو پھر کچھ اعتماد ہونے لگتا ہے۔ کسانوں اور مزدوروں کے لڑکے لڑکیاں ثانوی مدرسوں اور کالجوں میں جوق در جوق آ رہے ہیں یونیورسٹی میں ان کے لئے خاص انتظام ہے۔ ثانوی تعلیم کی کمی پوری کرنے کے لئے یونیورسٹی کے ساتھ ایک سال کا خاص نصاب جاری کیا گیا ہے: اور استاد اور شاگرد سب صرف علمی اور ادبی کاموں میں مصروف نہیں بلکہ اپنی تعلیم گاہوں کی تباہ شدہ عمارتوں کو بھی یہی بنا رہے ہیں۔ استقلال، پامردی، محنت جفاکشی، سب کی پیشانیوں پر ہویدا ہے۔

ان ملکوں کا یہ حال دیکھ کر مجھ پر تو بڑا اثر ہوا، جو میں نے سمجھا کہ کوئی واقعی بڑا جماعتی کام آدمی کرتا ہے تو وہ کام خود آدمی کو بدل دیتا ہے، ولولہ اور ہمت ابھر اور کام کی اچھائی پر یقین ہو تو سخت سے سخت مصیبت میں قوائے عمل شل نہیں ہوتے۔ یہ احساس کوئی نیا کام انجام پا رہا ہے

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

دیہی اور گھریلو صنعتیں

۳- چرخہ اور کھادی

پروفیسر محمد عاقل

گھریلو صنعتوں کو دوبارہ زندہ کرنے کا کام، دیہات سدھار کے مجموعی کام کا ایک حصہ ہے اور مختلف سرکاری اور غیر سرکاری اداروں سے انجام دیتے رہتے ہیں۔ ان سب کی کارگذاری کا جائزہ لینے سے اس بات کا اندازہ کیا جاسکے گا کہ دیہی اور گھریلو صنعتوں کی از سر نو تنظیم و ترقی کا کام کن راستوں پر چلانا مفید ثابت ہوگا۔ ہم اپنے اس جائزہ کو غیر سرکاری اداروں کے کام سے شروع کریں گے۔

اکھل بھارتیہ چرخہ سنگھ

۱۹۲۱ء میں انڈین نیشنل کانگرس نے معاشی اصلاح کے کام میں چرخہ کو مرکزی جگہ دی اور ۱۹۲۳ء میں اکھل بھارتیہ چرخا سنگھ اس لئے بنایا گیا کہ اپنے مختلف مرکزوں اور بھنڈاروں کے ذریعے کھادی کی تیاری کے کام کی نگرانی رکھے اور روپیہ فراہم کرے۔

چرخا سنگھ کا بڑا کارنامہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ دیہات کی ایک بڑی تعداد کے لئے ان کے قدرتی ماحول میں کام مہیا کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ سنگھ کی ۱۹۴۱-۱۹۴۲ء کی رپورٹ میں لکھا گیا تھا کہ اس نے پندرہ ہزار ایک سو دس گاؤں میں پھیلے ہوئے تین لاکھ ۴۵ ہزار ۲۵ دستکاروں سے کام کرایا اور اٹھارہ مہینوں میں جو ۳۰ جون ۱۹۴۲ء پر ختم ہوئے تقریباً اسی لاکھ روپیہ اجرت کے طور پر تقسیم کیا۔ کھادی کی مجموعی لاگت میں جس کی میزان ایک کروڑ بیس لاکھ دو ہزار چار سو تیس ہوتی تھی۔ اجرتوں کا تناسب دو تہائی کے قریب تھا۔ یہ کھادی ایک کروڑ ۴۴ لاکھ ۸۴ ہزار ۳۰۱۵ روپیہ کی فروخت کی گئی

چرخہ سنگھ کا کام شروع ہونے کے بعد سے ۱۹۴۲ء تک یعنی ۱۷ سال کی مدت میں کل پیداوار کی قیمت ۶ کروڑ ۴۸ لاکھ ۷۵ ہزار ۲۸۶ روپے کی ہوئی جس میں سے چار کروڑ ۱۰ لاکھ ۲۰ ہزار ۳۱ روپے اجرت کے طور پر تقسیم کئے گئے۔ اس تنظیم کو بہت کم سرمائے سے شروع کیا گیا تھا۔ اور ۱۹۴۱-۱۹۴۲ء میں اس کے پاس جو سرمایہ تھا یعنی پچاس لاکھ روپیہ جب اس کے مقابلے میں سوتی کپڑے کے کارخانوں کے سرمائے یعنی ۵۰ کروڑ روپئے سے کیا جاتا ہے تو سرمایہ کی یہ رقم بہت بے حقیقت معلوم ہوتی ہے لیکن اسی بے حقیقت رقم نے ملک کے سارے کارخانوں میں جتنے مزدور کام کرتے تھے ان کے نصف سے زیادہ کے لئے کام مہیا کیا۔

چرخہ سنگھ کے پروگرام میں اس مقصد کو ہمیشہ نظر کے سامنے رکھا گیا ہے کہ گاؤں کی ضرورتیں گاؤں کے اندر پوری کی جائیں۔ نصب العین یہ رہا ہے کہ ہر گھر میں ایک یا ایک سے زیادہ چرخے ہوں اور ہر گاؤں میں ایک یا ایک سے زیادہ کرگھے ہوں۔ کپڑا بننے کے ہر کام کے بارے میں خاص طور پر ابتدائی کام کے بارے میں سنگھ کے کارکن باقاعدہ تعلیم دیتے ہیں اور ان کاموں کو یا ان اوزاروں کو جن سے یہ کام کئے جاتے ہیں سادہ سے سادہ بنانے اور ان کی کارگذاری کو بڑھانے کے لئے برابر تجربے کئے جارہے ہیں اور اس سلسلہ میں علمی تحقیق جاری ہے۔ چنانچہ روئی کے دھننے۔ پونی بنانے، کاتنے اور بانٹنے سوت کی مضبوطی اور یکسانی کو بڑھانے کے سلسلے میں گذشتہ سترہ سالوں میں اوزاروں اور کاموں میں بڑی انقلاب انگیز تبدیلیاں کی گئی ہیں۔

چونکہ سنگھ کے پروگرام میں کھادی کی تیاری کے کام کو تجارتی اصول پر چلانا بھی شامل ہے اس لئے لاگتوں کو کم کرنے اور پیداوار کو بڑھانے اور ساتھ ہی ساتھ مال تیار کرنے کا کام بھی جاری ہے ۱۹۳۵ء سے اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ کاتنے والوں کی اجرت کو اتنا بڑھا دیا جائے کہ اس سے ان کا گذر ہو سکے اور اس کے بعد سالوں میں کم ترین اجرتوں کا تعین دھننے اور بننے والوں کے لئے بھی کر دیا گیا ہے۔

اس کام کو چونکہ ایک سیاسی تحریک کے ساتھ ساتھ چلایا گیا ہے۔ اس لئے اس کی تائید یا تنقید کرتے وقت اکثر سیاسی جذبات اور تعصبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ان سے خالی ہوکر اس مسئلے کے ہر پہلو پر غور کیا جائے۔

اوپر جو اعداد مجموعی صورت میں پیش کئے گئے ہیں وہ بظاہر بہت بھاری بھر کم معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ایک ہر دستکار کی اجرت کی صورت میں پھیلا کر دیکھئے تو یومیہ اجرت ڈھائی پیسہ یومیہ کے قریب نکلتی ہے۔ اس آمدنی کا مقابلہ شہر کے خرچ سے کیجئے جہاں چائے کی پیالی دو آنے، پان دو پیسے اور دیا سلائی ایک آنے میں ملتی ہے تو ایسا نظر آئے گا کہ چرخا سنگھ کے مخلص اور ایثار پیشہ کارکنوں کی ساری محنت اکارت جارہی ہے وہ پہاڑ کے برابر محنت کرتے ہیں اور صرف ایک رائی کا دانہ پیدا کر سکتے ہیں۔

لیکن ہمیں اس بات کو نہ بھولنا چاہئے کہ یہی ڈھائی پیسے سال بھر میں پندرہ روپے ہو جاتے ہیں اور اگر ملک کے محض دس کروڑ بچے، عورتیں اور مرد پندرہ روپے سالانہ فی کس کمائیں تو ان سب کی مجموعی آمدنی ڈیڑھ ارب روپیہ ہو سکتی ہے۔ پھر اگر وہ اصل پیشے جن سے یہ لوگ اس وقت لگے ہوئے ہیں ویسے کے ویسے ہی رہیں یا ان میں کچھ اور اضافہ ہو جائے اور امدادی پیشہ کے طور پر چرخہ اور کھادی کے ذریعے یہ ڈیڑھ ارب روپئے کے برابر قومی آمدنی کو بڑھا سکیں تو پھر کھادی اور چرخے کی قدر و قیمت اتنی حقیر نظر نہیں آئے گی، جیسی سرسری نظر میں معلوم ہوتی ہے۔

چرخے اور کھادی کی صنعت کے حامی اس کی تین مختلف صورتوں کو جداگانہ طور پر پیش کرتے ہیں یعنی اس کی ایک صورت تو وہ ہے جس میں یہ صنعت اصل پیشہ کے طور پر اختیار کی جاتی ہے۔ دوسری وہ جس میں اس کی حیثیت امدادی پیشے کی ہوتی ہے اور تیسری وہ جس میں یہ خود کفالتی حیثیت رکھتی ہے۔

اصل پیشہ کی صورت میں بھی اس صنعت کے مختلف کاموں میں امتیاز کرنا ضروری ہے، یعنی دھننے کا کام، کتائی کا کام اور بنائی کا کام رضائی اور لحاف بھرنے کے موسم میں دھننے کو اپنے کام سے اچھی خاصی اجرت مل جاتی ہے لیکن اس کام میں پھیلاؤ کی زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ اسی طرح بننے والا اگر اسے سوت ملتا رہے اور اس کا بنا ہوا مال نکلتا رہے سال بھر اپنے آپ کو مصروف رکھ سکتا ہے اور اپنی گذر کر سکتا ہے۔ ان کے مقابلے میں اگر کوئی شخص محض کاتنے کو اپنا ذریعہ معاش بنانا چاہے تو جب تک وہ بہت سخت محنت نہ کرے اور چرخہ سنگھ والوں یا دوسرے گرام سیوکوں کی مدد اسے نہ ملے اس کے لئے اپنے گذر کے لائق کمترین اجرت کمانا بھی بہت مشکل ہوگا۔

موٹے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک معمولی مہارت کا آدمی نصف گھنٹے میں معمولی چرخے کے ذریعے دس نمبر کے ڈیڑھ سو تار کات سکے گا لیکن سوت کاتنا شروع کرنے سے پہلے اسے بازار سے روئی خریدنا ہوگی روئی کو دھننا اور اس کی پونی بنانا ہوگی اور سوت کے کاتنے کے بعد اسے اٹیرنا اور اس کی لچھی اور گنڈی بنانا ہوگی جو ۶۴۰ تار کی ہوتی ہے۔ اگر وہ آدھ گھنٹے سے زیادہ کام کرے گا تو ظاہر ہے اس کی رفتار آخر تک وہ نہ رہے گی جو شروع میں ہوگی ان سب باتوں کو اگر سامنے رکھا جائے تو اس کی آمدنی روزانہ آٹھ گھنٹے کام کرنے کی صورت میں کیا ہوگی یہ ٹھیک ٹھیک بتانا مشکل ہے کیونکہ کام کرنے والے کی مہارت، چرخہ کی قسم، سوت کے نمبر اور گنڈی کی قیمت وغیرہ کی وجہ سے اجرت میں بڑا فرق ہو سکتا ہے۔ گنڈی کے دام ایک وقت میں دو آنے اور دوسرے وقت میں پانچ آنے ہوئے تو اجرت میں ہو سکتا ہے ڈھائی گنے کا فرق ہو جائے۔ سوت کے ایک نمبر کے دام دو آنے گنڈی اور دوسرے نمبر کے تین آنے گنڈی ہوئے تو اجرت میں ڈیڑھ گنے کا فرق ہو سکتا ہے۔ ایک چرخے کی پیداوار دوسرے کے مقابلے میں زیادہ ہوئی تو پہلے چرخے پر کام کرنے والے کی اجرت دوسرے کے مقابلے میں زیادہ ہوگی۔ اسی طرح ایک ماہر کام کرنے والے کی اجرت اپنے زائد کام کی وجہ سے زیادہ ہوگی۔ پھر گذر کے لائق کم ترین آمدنی کسے کہا جائے اس کے بارے میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس کے بارے میں کوئی قطعی بات کہنا تو بات مشکل ہے لیکن جانکاروں کی یہ رائے ہے کہ کتائی کے کام کو اگر مستقل پیشے کے طور پر اختیار کیا جائے تو اس سے عام طور پر اتنے پیسے نہیں کمائے جا سکیں گے کہ اس سے زندگی گذاری جا سکے۔ عام طور پر اوسطاً تین گنڈی سے زیادہ ایک شخص تیار نہ کر سکے گا اور لاگت نکالنے کے بعد جو مزدوری اسے بچے گی وہ گذر کے لئے ناکافی ہوگی۔

اب رہی چرخہ اور کھادی کی صنعت کی وہ بقیہ صورتیں سو ان میں پہلے اس کی امدادی شکل کو لیجئے یعنی کھیتی کے اصل پیشہ کے مددگار کے طور پر اس صنعت کا اختیار کرنا

ہمارے ملک ہندوستان میں کھیتی کے کام کو بہت سے قدرتی خطروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان سے بچنے کی تدبیریں کرنے پر بھی ملک کے بہت سے حصوں میں یہ خطرے باقی رہتے ہیں اور رہیں گے۔ دوسرے کھیتی سارے سال کا دھندا نہیں ہو سکتا۔ کھیتی کے

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

کشمیر کا خط

(۱)

"سیلانی"

سری نگر
۲۰ ستمبر ۱۹۴۸ء

گذشتہ ہفتے میں دہلی میں تھا جب حیدرآباد میں ہندوستانی فوجوں کی پیش قدمی شروع ہو گئی تھی اور قاسم رضوی کی لیڈری بھبکیوں کا بھانڈا ایک ہی دو دن میں پھوٹنے والا تھا۔ مگر کشمیر کے محاذ کے متعلق وہاں کچھ عجیب عجیب پریشان کن افواہیں چپکے چپکے اس زمانے میں پھیلائی جا رہی تھیں، کوئی کہتا تھا کہ کشمیر کا حال کچھ اچھا نہیں ہے ... کوئی حیدرآبادی شکستوں کا جواب کشمیر کے محاذ سے ملنے کا اندیشہ ظاہر کرتا تھا۔ کوئی اپنے اندیشوں اور بدگمانیوں کو کسی فوجی سپاہی یا افسر کی زبان سے نقل کرتا تھا اور یہ رائے تو ہر چھوٹے بڑے سیاست داں کی زبان سے آپ سن سکتے ہیں کہ کشمیر کا اتنا پھیلا ہوا مورچہ اور ہندوستان سے چار سو میل دور پہاڑیوں پر وہاں رسد پہنچانا کوئی آسان کام ہے۔ کروڑوں روپیہ بے دریغ صرف ہو رہا ہے ...... آخر کس لئے؟ کشمیری مسلمان ...... پہلے مسلمان ہیں ...... اور پھر کشمیری ...... شیخ عبداللہ بے چارے کہتے تو سب کچھ ہیں مگر کتنے ووٹ وہ ہندوستان کے لئے لا سکتے ہیں ...... رائے عامہ معلوم کرنے کا وقت آنے دیجئے ...... کشمیر بالآخر پاکستان ہی میں جائے گا ...... ہندوستانی فوج کیا یہ نہیں جانتی ...... بس پنڈت جی کی ضد ہے کہ مسلمان کو ملائیں گے ...... ہند یونین کو سیکولر اسٹیٹ بنائیں گے۔ دو قوموں کے نظریے کا جواز کشمیر میں نکالیں گے اور ہندوستان کو یہ بنائیں گے! وہ بنائیں گے۔ روس بنا دیں گے! امریکا بنا دیں گے! بھگوان ہی جانے کیا بنائیں گے! ہم تو یہ جانتے ہیں کہ اسی ضدا ضدی میں بات بگڑتی جا رہی ہے۔ کشمیر میں تو الجھے تھے ہی اب حیدرآباد میں ادھر الجھ گئے۔ خیر! حیدرآباد میں جو ہوگا سو ہوگا مگر کشمیر میں شکست بھی ہو گئی تو پھر پاکستان سے جیتنا مشکل ہو جائے گا ...... ہندوستان کا بٹوارہ جب مان لیا تو کشمیر بھی بانٹ لیں جانے دیں کشمیر کے مسلمانوں کو بھی پاکستان میں! بات کی پیچ کرنے سے فائدہ! یو، ان، او کمیشن آیا ہی ...... موقع اچھا ہے ...... اور شاید اوپر اوپر کچھ بات چیت بھی ہو رہی ہے!"

یہ اور اسی طرح کی باتیں اچھے اچھے شہر خبریوں اور معتبر نائیروں کی زبان سے سن کر جی اداس ہو جاتا تھا میں ۱۶ر ستمبر کو یہاں پہنچا تھا۔ دریائے جہلم کی گود میں ایک ہاؤس بوٹ پر قیام ہے۔ قریب ہی سرکاری مہمان خانے ہیں جہاں یو، ان، او کمیشن کے ممبر ٹھہرائے گئے ہیں سفید فام ولایتیوں کی شاید یہی ایک ٹولی ہے جو آج کل یہاں نظر آتی ہے۔ ورنہ جنگی حالات کی وجہ سے بیرونی اور اجنبی لوگوں کی آمد و رفت اور سیر و تفریح پر مجبوراً اب پابندیاں لگا دی گئی ہیں۔ کئی ولایتی پاکستان کی جاسوسی میں اب تک ماخوذ اور شہر بدر کئے جا چکے ہیں۔ کمیشن کے لوگ البتہ بلا کسی روک ٹوک کے کہیں موٹروں پر کہیں پیدل اور کہیں شکاروں پر گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اور کشمیر کے اصلاحات بچشم خود مطالعہ کرتے ہیں جدھر جاتے ہیں صدہا فرزند اور عوام مانجی اور شکارے والے قدم قدم پر صاحب لوگوں کو بے تکلف گھیر لیتے ہیں، روک لیتے ہیں اور کچھ انگریزی، کچھ ہندوستانی اور کچھ کشمیری میں یعنی خالص اردو زبان میں کمیشن کے اراکین سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرتے ہیں۔ کچھ پیسے وصول نہ ہوئے نہ سہی مگر انھیں یہ اطمینان ضرور ہو جاتا ہے کہ انھوں نے بھی جہاں تک اس کا تعلق ہے کشمیر کے مقدمے کی پیروی کا گویا حق ادا کر دیا۔

کشمیر پاکستانی حملے سے پہلے دنیا بھر کے سیلانیوں کا ایک تفریحی مرکز تھا اور یہاں کے سوداگر اور دستکار کشتی والے اور سیر کرانے والے سب انھیں سیلانیوں کی خریداری اور سیر و تفریح سے اپنی روزی کماتے تھے، بلکہ اپنی جیبیں بھرتے تھے اور لوٹنے کے فن میں ایسا کمال حاصل کیا تھا کہ جو اجنبی اس سرزمین میں آ جاتا تھا وہ یہاں سے ننگا ہی واپس جاتا تھا۔ یہاں کا کاری گر طبقہ غریب ہندوستانیوں کو تو خیر بخش دیتا تھا لیکن پردیسیوں کو خدا کی نعمت سمجھتا تھا۔ اور انتہائی خاکساری اور لجاجت، چالاکی اور ہوشیاری سے مونڈتا تھا۔ مگر سیلانیوں کی آمد و رفت پر اس وقت جو پابندیاں عائد ہو گئی ہیں اس کا اثر کشمیر کی پوری معاشی زندگی میں نظر آتا ہے اور گذشتہ چند سال کے اندر جو سیاسی بیداری اور انقلاب کشمیر میں رونما ہوا ہے یہ اسی کا کرشمہ ہے کہ اس مشکل ترین زمانے کو بھی کشمیری انتہائی صبر و استقامت سے گذار رہے ہیں۔ اور اپنی ان معاشی تکالیف اور پریشانیوں کا غم، ولولہ انگیز سیاسی بیداری سے غلط کر لیتے ہیں۔

میں نے پرسوں ڈل کے کنارے شکاروں کے ایک اڈے کے پاس دو صاحب بہادروں کو شکارے والوں کے جھرمٹ میں دیکھا۔ میں سمجھا کہ "بزم بے تکلف" کی کچھ باتیں ہو رہی ہیں، میں بھی قریب چلا گیا اور وہاں دیکھا کہ وہ لوگ بڑے جوش و خروش سے صاحب بہادر کو اپنے کسی جلسے پر مدعو کر رہے ہیں۔ بات چیت کا انداز سنیے "صاحب! آپ ہمارے شیر کشمیر کا مہمان ...... ہمارا بھی مہمان ...... ہم آپ کو سیر کرائے گا ...... صاحب! آپ ہمارے جلسے میں تقریر کرے گا؟ ہم سب لوگ بوٹ مین یونین کا ممبر ہے، ہم شیر کشمیر کو بھی دعوت دے گا، وہ ضرور آئے گا ...... ہم اپنے بخشی صاحب کو بھی لائے گا ...... یہ ہمارا بچہ لوگ بھی ہے۔ پیس بریگیڈ کا ممبر ہے ...... ہمارا اپنا بھائی لوگ کشمیر ملیشیا میں پاکستانی قبائلی سے لڑنے لداخ چلا گیا ہے ...... صاحب! صاحب! تم جواہر لال نہرو سے ملا ہے! وہ بھی ادھر آ چکا ہے، ہمارا بڑا لیڈر ہے ...... ہم نے بہت بڑا جلسہ کیا۔ اس نے ڈیڑھ گھنٹہ تقریر کیا۔ صاحب! آپ نہیں تقریر کرے گا؟" وغیرہ وغیرہ۔

صاحب لوگ اس بات چیت کا جواب دوستانہ تبسم سے دیتے رہے اور کشمیر کی نوزائیدہ قوم اور شیر کشمیر کی اُمت کے چند لوگوں سے جو انھیں سر راہ مل گئے تھے جلد رخصت ہو کر کہیں جانا چاہتے تھے مگر ان لوگوں کا حال یہ تھا کہ وہ قصہ کشمیر، برسر کشمیر بلکہ اسی جگہ اسی وقت طے کر کے اپنی سیاسی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہونا چاہتے تھے اور ان کی خواہش یہ معلوم ہوتی تھی کہ جو کچھ طے ہو جائے اس کا اعلان خود ان نمائندوں کی زبان سے کسی جلسے میں کرایا جائے۔

جنگ عظیم کے زمانے میں ہر بڑا شہر ایک فوجی چھاؤنی معلوم ہوتا تھا۔ جدھر دیکھو جیپ اور فوجی لاریوں کی بھاگ دوڑ، ہر گلی اور ہر کوچے میں سپاہیوں اور فوجیوں کی چہل پہل۔ یہی کیفیت کچھ آج کل سری نگر کشمیر کی ہے۔

گذشتہ سال" قبائلیوں کے حملے کے بعد جب ہندوستانی افواج یہاں بھیجی گئی تو ہماری فوج کے سپاہی بھی ہندوستان کی مسموم فرقہ وارانہ فضا سے وہاں کا اثر اپنے ساتھ لائے تھے اور یہاں پہنچتے ہی انھوں نے بھی کچھ ایسی زیادتیاں کیں کہ جو افسوسناک تھیں لیکن شیر کشمیر شیخ عبداللہ اور ان کے رفقائے کار کے "تحمل" اور حکومت ہند کے تدبر سے اس کی اصلاح فوراً ہی کر دی گئی اور اب تو کیفیت یہ ہے کہ ہر کشمیری انڈین یونین کی افواج اور اس کے ہر جوان اور ہر سپاہی کو اپنی جان و مال، عزت اور آبرو کا محافظ سمجھتا ہے اور اس کی شرافت اور انسانیت، ہمدردی اور خدمت کے گیت گاتا ہے۔ اس تعلق، خاطر اور اعتماد کی ایک وجہ یہ معلوم ہوئی کہ پچھلی سردیوں میں کچھ غیر معمولی برف باری کی وجہ سے کشمیر تک رسد پہنچانے کا واحد راستہ مسدود ہو گیا۔ اور ضروری سامان کا کوئی ذخیرہ سول آبادی کے لئے جمع نہ ہو سکا۔ اس لئے باہر سے آنے والی ہر چیز کا یہاں بڑا کال پڑا۔ لوگ کہتے ہیں کہ نمک جیسی چیز دیکھنے کو نصیب نہ تھی۔ جو کچھ تھا بھی وہ نفع بازوں نے روک لیا۔ اور چور بازار میں ۳۰، ۴۰ روپئے سیر تک نمک بیچا گیا! یہی حال شکر اور دیا سلائی، چاول اور غلے اور دوسری چیزوں کا بھی تھا۔ اس نازک وقت میں انڈین یونین کی فوجوں نے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر اپنے محاذ جنگ پر گاؤں گاؤں رسد پہنچائی، اور بھوکوں مرنے والوں کی جانیں بچائیں۔

انڈین یونین کی افواج کی طرف سے انسانیت اور ہمدردی کے اس عدیم المثال مظاہرے نے کشمیریوں کو اس حد تک متاثر کیا کہ اس وقت تقریباً تیس ہزار

کشمیری مختلف حیثیتوں سے کشمیر کے محاذ جنگ پر انڈین افواج کے ہم رکاب ہیں اور میدان جنگ کے مشکل سے مشکل کام خواہ اسکاؤٹنگ کا ہو یا مخبری کا قلی کا ہو یا مزدور کا بڑے جوش و خروش سے انجام دے رہے ہیں۔ انھی کی وجہ سے انڈین یونین کی افواج کشمیریوں میں ایک ایسا رابطہ اور تعلق، اعتماد اور یک جہتی پیدا ہو گئی ہے کہ اب کشمیر کی جنگ کو ہندوستانی سپاہی بھی اپنی جنگ، ہندوستان کی جنگ اور ہندوستان کی قومی جنگ سمجھنے لگا ہے۔ علاوہ ان کشمیری سیوکوں کے کشمیری نوجوانوں کی ملیشا بھی بن گئی ہے جس میں اس وقت صرف ۰۰۰ سپاہی ہیں۔ ان کی فوجی تربیت، ہندوستانی کمان کی نگرانی میں ہوتی ہے، اور اب یہ لوگ بھی میدان جنگ میں ہندوستانی سپاہیوں کے دوش بدوش لڑ رہے ہیں۔ گذشتہ چار ماہ کے اندر اس ملیشیا نے اپنے افسروں اور کمانڈروں سے ڈسپلن، بہادری، ہمت اور استقلال کی ایسی سند بر حاصل کی جو بقول ہمارے ایک کرنل کے دنیا کی کسی سپاہ کے لئے باعث فخر ہو سکتی ہے۔ کشمیر ملیشیا کے کارناموں نے اور کشمیری خادمانِ فوج کی سچی رفاقت اور ان کے مجاہدانہ جوش و خروش نہ صرف یہ کہ کشمیری مسلمانوں کی طرف سے ہر بدگمانی کو دور کر دیا ہے بلکہ ہندوستانی فوج کو متحدہ قومیت کا ایک ایسا ناقابل فراموش درس دیا ہے جو غالباً صرف میدان جنگ ہی میں جان کی بازی لگا کر دیا جا سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی سپاہیوں کے خلاف اب تک کسی منہ سے کوئی شکایت نہیں سنی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کا محاذ جنگ ہماری فوجوں کے لئے صرف محاذ جنگ ہی نہیں ہے بلکہ ایک سیاسی تربیت گاہ بھی ہے۔ شیر کشمیر کی قیادت نے اس جنت نظیر ملک کی سیاسی آب و ہوا بھی ایسی بدل دی ہے کہ یہاں آنے کے بعد بڑے سے بڑا فرقہ پرست اپنی فرقہ پرستی سے توبہ کر لینے پر مجبور ہو جاتا ہے اور صحیح معنوں میں بالکل تندرست ہو جاتا ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ حیدرآباد میں پاسبانِ طریقت کی سیاست کا خاتمہ اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے ختم ہو گیا۔ کشمیر کا بچہ بچہ اور ہر سپاہی اور ہر جوان حیدرآباد کے مورچہ کو کشمیر ہی کا ایک محاذ سمجھتا تھا اسی لئے اس مورچہ پر ہندوستانی افواج کی شاندار کامیابی کو کشمیر کے لئے فال نیک سمجھتا ہے۔ اس کامیابی نے واقعہ یہ ہے کہ یہاں ایک ایک سپاہی اور ایک ایک جوان میں ایک ایک فوج کی قوت اور خود اعتمادی پیدا کر دی ہے کچھ ذمہ دار فوجی افسروں سے بھی مجھے ملاقات و گفتگو کا موقع ملا اور مجھے محسوس ہوا کہ حیدرآباد کی طرح کشمیر کا معاملہ بہت پہلے طے ہو چکا ہوتا۔ اگر صرف فوجی مقابلہ ہوتا، لیکن فوجیوں کو شکایتیں ہیں کہ اس فوجی محاذ کا فیصلہ مختلف قسم کے بین الاقوامی، سیاسی اور فرقہ دارانہ مصالح اور نظریات کی وجہ سے ہونے نہیں پاتا۔

ایک طرف یو، این، او میں مقدمہ دائر ہے اور بین الاقوامی سیاست کے جال میں پھنس کر یہ معاملہ سلجھایا جا رہا ہے۔ پھر پاکستان تو ہم سے لڑ رہا ہے مگر ہمیں پاکستان سے لڑنے کی اجازت نہیں! اس کے بعد خود ہندوستان کے فرقہ پرستوں، رجعت پسندوں اور سرمایہ داروں کی سازشیں الگ اپنا اپنا نقشہ جما رہی ہیں۔ وہ معلوم نہیں کیا چاہتی ہیں مگر ان کی ایک ایک سازش اور ان کی ایک ایک حرکت کی چوٹ خود ان کے ملک پر پڑتی ہے، ان کے وطن پر پڑتی ہے ان کے جانباز سپاہیوں پر پڑتی ہے جو اس وقت کشمیر کی پہاڑیوں پر جنگ لڑ رہے ہیں اور ہندوستان کے یہ نادان محب وطن اپنی تنگ نظری اور فرقہ پرستی کی بدولت اپنے وطن کے دشمنوں کے ہاتھ میں کھیل رہے ہیں! غیر شعوری طور پر دشمنوں کو قوت پہنچا رہے ہیں۔

خط ذرا طویل ہو گیا، مگر کیا کروں۔ لطیف بود حکایت دراز تر گفتم! ارادہ ہے کہ جب تک یہاں رہوں یہاں کے حالات آپ کو لکھتا رہوں۔ (باقی آئندہ)

بزم بے تکلف (بہ سلسلہ صفحہ ۳)

"حضرت میں بالکل نہیں چاہتا کہ آپ لیڈر کی کسی قسم کی تعریف کریں۔ میں تو صرف یہ پوچھتا ہوں کہ لیڈر کہتے کس کو ہیں"

"بھئی آپ کو کیسے سمجھاؤں۔ سچ پوچھیے تو لیڈر ہر اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے آپ کو لیڈر کہتا ہے"

(باقی)

دیہی اور گھریلو صنعتیں (بہ سلسلہ صفحہ ۹)

موسم میں بھی اس میں ایک سی محنت نہیں کرنی پڑتی۔ خاص خاص مہینوں پر اس میں بہت سے آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے اور باقی دنوں میں مالک، اور اس کے گھر کے لوگ بھی بے کار رہتے ہیں۔ ان حالات میں ہندوستان میں زراعت اور صنعت کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا بلکہ کھیتی کے ساتھ کوئی دوسرا دھندا جسے امدادی دھندا کہنا چاہیے لگانا ضروری ہو جاتا ہے۔ کھیتی کے اس امدادی دھندے میں مندرجہ ذیل صلاحیتیں ہونی چاہئیں۔

(الف) امدادی کام ایسا ہونا چاہیے کہ وہ اصل کام یعنی کھیتی کے ساتھ پوری مطابقت پیدا کر سکے اور اس کی وجہ سے کھیتی کے کام میں کوئی بگاڑ پیدا نہ ہو۔

(ب) یہ ایسا ہونا چاہیے کہ جب اصل کام کے لئے محنت کی ضرورت پڑے تو اُسے بغیر کسی نقصان کے سمیٹا جا سکے اور ادھر اُدھر دھیان دئے بغیر اس کا کام چلتا رہے۔

(ج) یہ روزگار کی شکل نوکری کی نہیں بلکہ خود مختار محنت کی ہونا چاہیے۔

(د) اس کام میں مشین اور کچے مال کے لئے اتنی پونجی کی ضرورت نہ ہونا چاہیے کہ وہ عوام کی استطاعت سے باہر ہو۔

(ہ) یہ ایسا ہونا چاہیے کہ کھیت کے نزدیک یا اپنے گھر اور گاؤں میں کیا جا سکے۔

(و) کروڑوں آدمیوں کو اُسے اپنانے کی صلاح دینی ہو تو یہ دھندا ایسا ہونا چاہیے کہ اس کا مال آسانی سے کھپ سکے۔ یعنی وہ عام استعمال کی چیز ہو۔

(ز) اسی طرح کروڑوں کے نقطۂ نگاہ سے امدادی دھندے کا انتظام کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا انتظام جھٹ پٹ آسانی سے اور تھوڑے خرچ میں کیا جا سکتا ہو۔

(ح) اسی طرح کروڑوں کے نقطۂ نگاہ سے وہ ایسا بھی ہونا چاہیے کہ ان پڑھ، تھوڑی عقل کے، کمزور، چھوٹے بڑے سب طرح کے لوگوں سے ہو سکے۔

(ط) اس کے ساتھ ساتھ یہ ایسا نہ ہونا چاہیے کہ وہ آدمیوں کو مشین کا ایک بے جان پرزہ بنا دے اور انھیں کام کے دوران میں خوشی اور ذوق سے محروم کر دے اور کام کے بعد ان کے اندر بیزاری اور تھکاوٹ پیدا کر دے۔

چرخہ اور کھادی کے حامیوں کے نزدیک صرف یہی دھندا اوپر بیان کئے ہوئے معیار پر پورا اترتا ہے۔ گائے بھینس کے پالنے کا کام بھی اوپر کی بہت سی شرطوں کو پورا کرتا ہے اور اسے بھی کل ملک کے لئے امدادی دھندا بنایا جا سکتا ہے لیکن اس کی کامیابی کے لئے تھوڑی بہت زمین اور پونجی کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے وہ کچھ زمین رکھنے والے کسانوں کے لئے امدادی دھندا بن سکتا ہے۔ لیکن ان لاکھوں لوگوں کے لئے موزوں نہیں ہے جو صرف کھیتی کی مزدوری ہی پر گزر کرتے ہیں دوسرے مویشی پالنے کا کام کھیتی سے علیحدہ ایک مستقل دھندا بھی ہو سکتا ہے اور چرخہ کے کام کو ان دونوں کے ساتھ امدادی دھندے کے طور پر چلایا جا سکتا ہے۔

آخر میں چرخہ اور کھادی کی صنعت کی تیسری صورت یعنی خود کفالتی کھادی کو لیجیے۔ یا تو کسان اپنے ہی کھیت کی کپاس سے خود اوٹ، دھن کات لے اور صرف بنائی کے پیسے خرچ کرے یا یہ پیسے بھی خرچ نہ کرے اور بنائی کا کام سیکھ کر اپنے لئے خود ہی کھادی بننے لگے تو یہ کھادی مل کے کپڑے کے مقابلے میں سستی پڑتی ہے اور اسے چرخے اور کھادی کی بہترین صورت سمجھنا چاہیے۔

چرخے اور کھادی کی صنعت کی جگہ اگر صرف دستی بنائی کی صنعت کو ترقی دی جائے اور مل کے سوت کو استعمال کرنے کی اجازت دی جائے تو کسان کے لئے امدادی روزگار کی مقدار بہت کم ہو جائے گی۔ دستی کتائی کے کام کو جس طرح سب لوگ کر سکتے ہیں اس طرح دستی بنائی کے کام کو نہیں کر سکتے۔ ہندوستان کو روزانہ دو کروڑ گز کپڑے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ سارا کپڑا دستی کرگھے پر بنا جائے تو بھی اس میں زیادہ سے زیادہ روزانہ دو گھنٹے کام کرنے والے ایک آدھ کروڑ بننے والوں کو ہم کام سے لگا سکیں گے اگر یہ کہا جائے کہ اتنے بننے والوں کو نہیں بلکہ اتنے خاندانوں کو کام ملے گا تو روز کی آمدنی اتنے ہی لوگوں میں بٹ جائیں گے اور اس طرح فی آدمی آمدنی اور بھی کم ہو جائے گی۔

چرخہ امدادی صنعت ہی ہو سکتا ہے اور بنائی مستقل صنعت کی صورت ہی میں چل سکتی ہے۔ یہ بات دھیان میں رکھنے کی ضرورت ہے۔

اگر قانون کے ذریعے مل کی بنائی بند نہ کی جائے بلکہ عوام کی کوشش ہی سے اس کا

اِدارۂ تحریر
ڈاکٹر سید عابد حسین - صالحہ عابد حسین - عبدالحلیم ندوی
تاریخ اشاعت: یکم ۱۰، ۱۶، ۴۷
چندہ: سالانہ للعہ ششماہی للعہ

باقی کاٹ کرنا پڑے تو بننے والوں کو ملے گے رحم و کرم پر ہی رہنا پڑے گا کیونکہ ملیں تو دستی بنائی کی حریف ہیں اور روز بروز ملیں ہی بنائی کا کام زیادہ کرتی جا رہی ہیں اور آئندہ یہ مقابلہ اور بھی سخت ہو جائے گا۔

اس کے برخلاف دستی کرگھے اور چرخہ دونوں جڑواں بھائی بہن ہیں دونوں ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔

لیکن چرخے پر اتنا زور دینے سے یہ سمجھنا صحیح نہیں ہوگا کہ اس کے سوا اور کوئی امدادی دھندا نہیں ہونا چاہیئے۔ مقامی حالات اگر موافق ہوں اور چرخے کے مقابلے میں دوسرا امدادی دھندا کہیں چل سکتا ہو تو چرخے کے بدلے یا اس کے علاوہ اس کو بھی ضرور چلانا چاہیئے۔ ایسے دھندوں کے بارے میں ہم نئی روشنی کی آئندہ اشاعت میں کچھ باتیں بیان کریں گے

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

تعلیم اور تہذیب کو پھیلانے اور سوت کاتنے کا ڈھونگ رچاتے رہیں گے۔ ایسے ڈھونگ ہم بہت رچا چکے ہیں! دیکھا آپ نے؟ وہی تعمیری کام، زندگی بخشنے والے کام، انسان بنانے والے کام سے بیزاری۔ وہی گوبلز کی طرح ادیب اور آرٹسٹ پر ریوالور کو ترجیح، یہ ذہنیت خراب ہے اور خطرناک ہے۔ ان کو شروع ہی سے قابو میں رکھنا چاہیئے۔

بعض اخبار آج کل بڑے زور شور سے لوگوں کے خط اس مضمون کے شائع کر رہے ہیں کہ رضاکاروں کو زنجیریں پہنا کر عجائب خانوں کے اندر پنجروں میں رکھا جانا چاہیئے، تاکہ لوگ تمیز شدہ انسانوں کا تماشہ کر سکیں، مجھے رضاکاروں کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں، انہوں نے جو خلاف قانون حرکتیں کیں یا لوگوں پر سختیاں کیں ان کی سزا انہیں ضرور ملنی چاہیئے لیکن آخر یہ عبرتناک تشہیر صرف رضاکاروں ہی کے لئے کیوں تجویز کی جاتی ہے، ان مدعیان انسانیت کو اس وقت کیا ہوا تھا جب کلکتہ، نواکھلی، بہار، امرتسر، راولپنڈی، دلی، پٹیالے میں سبھی فرقوں کے لوگوں نے رضاکاروں سے بڑھ کر جنسیانہ حرکتیں کیں۔ نہ بچوں اور نہ عمر کا پاس کیا، نہ عزت و ناموس کا، نہ بوڑھوں کے سفید بالوں کا، نہ عورتوں کی بےبسی کا، نہ بچوں کی معصومیت کا۔ اس وقت یہ مطالبہ کیوں نہیں کیا تھا! ان ہزاروں شقی انسانیت لوگوں کو ہے کہ قانون کے مطابق ہی سزا دی جائے۔ ہندوستان اور پاکستان کے کونے کونے میں عورتوں، مردوں، بچوں کا خون بہتا رہا شرافت کا خون بہا رہا۔ لیکن اسی وقت مسلمانوں نے مسلمانوں پر ہندوؤں نے ہندوؤں پر، سکھوں نے سکھوں پر سختی کے ساتھ احتساب نہ کیا اور مجرموں اور بدمعاشوں کو سزا دینے کے لئے نہ حکومت کی مشینری حرکت میں آئی نہ رائے عامہ کا دباؤ بلکہ بہت سے وہ لوگ جنھوں نے یہ شرمناک اور کمینہ حرکتیں کیں، دوبارہ بغیر کسی تامل کے سوسائٹی میں لے لئے گئے۔ شاید کہیں کہیں ان کو سورما کا مرتبہ دیا گیا۔

دوستو، کبھی کبھی سامنے اور پیچھے کی گٹھریوں کو جن میں دوسروں کے اور ہمارے اعمال نامے ہوتے ہیں، ادل بدل کر کے بھی دیکھ لیا کرو۔ کیا عجب ہے کہ تمہاری آنکھ کا شہتیر دوسروں کی آنکھ کے تل سے بڑا ہو!

یورپ کا خط

(بہ سلسلہ صفحہ ۸)

خود سمیٹ کر بلند کر دیتا ہے۔ فنی عمارت بنانے اور پرانی بوسیدہ عمارت کو تھونیاں لگا لگا کر برقرار رکھتے ہیں دو بالکل مختلف ذہنی کیفیتیں سامنے آتی ہیں۔ ہمارے

مغربی یورپ کا حال بوسیدہ مکان کو سہارا دینے کا سا ہے۔ یہاں مشرقی یورپ میں یہ احساس ہے کہ ہم ایک نئی دنیا بنا رہے ہیں۔ وہاں تھوڑے سے آدمیوں کے حاصل شدہ حقوق کی حفاظت کا سوال ہے، یہاں بے حق، حق داروں کو حق دلوانے کی مہم ہے۔ میرا خیال ہے دیکھ کر آپ کے ملک کے عظیم الشان مواقع کی طرف جاتا ہے آپ کے ملک نے ابھی آزادی حاصل کی ہے۔ وہاں بھی ایک نئی دنیا بنانے کا موقع ہے اگر اس کی لگن لگ جائے تو آزادی اور غلامی کا اصل فرق سامنے آئے۔ یہ نہ ہو تو تھوڑے دن میں آزادی بھی ایک بے کیف عادت ہو جاتی ہے۔ دنیا کی نظریں ہندوستان پر لگی ہوئی ہیں اور ہم سب کی خواہش ہے کہ آپ اپنی آزادی کو کام کی چیز یعنی کام کا موقع بنائیں۔

پاکستان

(بہ سلسلہ صفحہ ۵)

ادھر جتنی تقریریں کی ہیں ان سب میں پاکستان پر حملہ کا بار بار ذکر آیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان میں ہر شخص کے اعصاب پر جنگ سوار ہے اور وہاں کے اخبارات اور لیڈر اس کیفیت کو دور کرنے کے بجائے اس کو اور تیز کر رہے ہیں، چند دن ہوئے، خان قلات نے بلوچیوں کو مدافعت کی تیاری کا حکم دیا تھا اور اب وزیرستان کے قبائلیوں کو خان جہاں گیر خاں نے تیار رہنے کا حکم صادر فرمایا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سرحدی قبائلیوں اور بلوچیوں کی توجہ کو اصل مسائل سے ہٹانے کے لئے کشمیر کا "جہاد" شروع کیا گیا، جہاں سے یہ مقصد پورا نہیں ہو رہا ہے۔ اس لئے اب نئے خطرے اور نئے حملے کے نعرے بلند کرنے کی ضرورت پیش آ رہی ہے، اگر ایسا ہے تو پاکستان اپنے لئے بڑا سخت خطرہ مول لے رہا ہے۔ اگر عوام کے ذہن و دماغ کی اس طرح تربیت کی گئی تو وہ ایک دن خود پاکستان کے لئے وبال جان بن جائیں گے۔

(ع، ل)

مغربی دنیا

(بہ سلسلہ صفحہ ۶)

پس لینٹ ڈال ار ایک بار پھر فرانس اسی راہ پر چل رہا ہے مشینوں کی لوٹ اس آرڈر میں کہ جنگ کا سامان بنانے والے کارخانے توڑے جا رہے ہیں۔ اس طرح جاری بھی رہی تو ان محنتی کاریگروں کے ہاتھ کا جوہر کیسے چھین لیا جائے گا۔ غرض ورٹمبرگ کی پرانی فیکٹریاں فرانسیسی اور انگریزی ہاتھوں سے تباہ ہو رہی ہیں اور چند ہی میل پر امریکن علاقے میں امریکن نئی فیکٹریاں قائم کر رہے ہیں۔ اور جوان مرد قوم وہاں کم سے کم اجرت پر کام کرنے پر مجبور ہے۔ انگلستان سے نامہ نگار سے ایک کاریگر نے یہ کہہ بھی دیا کہ ہمارے سامنے کوئی اور راہ نہ ہوگی تو ہم ایسا ہی کریں گے۔ اس نامہ نگار کو یہ امید نہیں تھی کہ انگریز، امریکی اور فرانسیسی کمانڈر جو اس علاقہ کے مالک ہیں اس آخری لوٹ کو روک کر جو ستمبر کے شروع میں ہونے والی تھی خستہ حال مگر چابک دست کاریگروں کو بچا سکیں گے۔

(ا، ع)

پرچہ نہ ملنے کی صورت میں

کاغذ کی قلت کی وجہ سے "نئی روشنی" کی تعداد کا پیمانہ بہت کم تعداد میں چھپتی ہیں، اس لئے اگر اتفاق سے کوئی پرچہ کسی صاحب کو نہ ملے تو براہ کرم ایک ہفتہ کے اندر اندر اس کی دفتر کو اطلاع کر دی جائے، ورنہ ممکن ہے مطلوبہ پرچہ آپ کو نہ مل سکے۔

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی بی اے، جامعہ
مطبوعہ: جید پریس، دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۱	نمبر ۱۸	۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۸ء	ایڈیٹر ڈاکٹر سید عابد حسین

دعا

مولانا محمد علیؒ

۹ر نومبر ۱۹۲۱ء کو ہمدرد کی دوسری بسم اللہ کے موقع پر ان دعا سے ہوئی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اے رب ذوالجلال، اے وہ کہ تیری لطف فرمائی و کرم گستری کے بغیر ارادے ناکام حوصلے پست، اور آرزوئیں صحرائے نامرادی میں تشنۂ تکمیل رہتی ہیں تیرا ایک عاجز و خطا کار بندہ محمد علی تیرے حضور میں حاضر ہوا ہے کہ دل کی تڑپ اور روح کی بے چینی کے ساتھ دست دعا دراز کرے، اور تجھ سے اپنے ان عزائم و افکار کی کامیابی اور اپنے ان مقاصد و اغراض کی تکمیل کے لئے رہنمائی و توفیق کی درخواست کرے جو آج سے دس بارہ سال پہلے لے کر نکلا تھا، اور جو ایک عرصے سے میرے عمق قلب میں پرورش پا رہے تھے...

میں اپنی کھوٹی پونجی لے کر بازارِ جہاں میں نکلا ہوں جو چند ارادوں اور چند افکار سے زیادہ نہیں ہے اس کے سوا میرے ہاتھ خالی ہیں، نہ تو میری جیب میں دولت ہے جس کا مجھے غرور ہو، نہ میرے پاس طاقت ہے جس کا مجھے گھمنڈ ہو، نہ اعوان و انصار کی کوئی فوج ہے جس پر بھروسہ ہو لیکن باوجود ان بے سروسامانیوں کے ایک تیرا وجود ہے جس پر مجھ کو بھروسہ اور ایک تیری ذات ہے جس پر تکیہ اور سہارا ہے اور یہ اتنا بڑا بھروسہ اور اتنا بڑا سہارا ہے کہ اگر دنیا کی ہر ایک چیز مجھ سے چھین لی جائے، میرا تمام ساز و سامان بے سروسامانیوں سے بدل جائے اور میں دنیا سے اور دنیا مجھ سے الگ کر دی جائے تب بھی جب تک تجھ پر بھروسہ کرنے کی توفیق شامل حال ہے میں اپنے آپ کو بہت بڑا خوش نصیب سمجھتا ہوں، البتہ مشکلات سفر کو بڑھانے کے لئے ایک نفس امارہ بار گردن ہے جس سے نجات کی تجھی سے التجا کرتا ہوں . . .

اے میرے معبود اور اے کائنات عالم کے پروردگار میں تجھ سے دولت کے انبار اور زر و جواہر کے ڈھیر نہیں مانگتا۔ میں تجھ سے صبر و استقامت کی درخواست کرتا ہوں مجھے مسلح شیطانی طاقت کا گھمنڈ درکار نہیں ہے اور نہ ابلیسی قوتوں کا بل اپنے بازوؤں میں پیدا کرنا چاہتا ہوں، بلکہ ایک درد مند اور عاجز بندے کی طرح ظلم و ناانصافی کے خلاف حق و صداقت کے ہتھیاروں سے جنگ کرنا چاہتا ہوں۔

ما دریں در نہ پے حشمت و جاہ آمدہ ایم	از بدِ حادثہ ایں جا بہ پناہ آمدہ ایم
آبروی رود اے ابر خطا پوش ببار	کہ بہ دیوان عمل نامہ سیاہ آمدہ ایم
با چنیں گنج کہ شد خازنِ او روح امیں	بہ گدائی بہ درِ خانۂ شاہ آمدہ ایم
لنگر حلم تو اے کشتی توفیق کجاست	کہ دریں بحر کرم غرق گناہ آمدہ ایم

خداوندا تو دلوں کے چھپے ہوئے بھیدوں اور پہلوئے قلب کے رموز و اسرار کا علیم و خبیر ہے۔ اگر میرے دل میں کچھ کھوٹ ہو تو اپنے لطف بندہ پروری سے اس کو دور کر، اور میری نیت، میرے قول، اور میرے عمل کو صدق و صفا کے زیور سے آراستہ فرما دے تاکہ صداقت و راستی کا دریا میرے قلب کی گہرائیوں میں موجزن ہو جائے، کیونکہ تو حق پرستی کو دوست رکھتا اور صداقت و راستی کو پیار کرتا ہے۔ میرے مالک اور میرے آقا میرا ملک، اور میری قوم جو ۳۲ کروڑ نفوس پر مشتمل ہے خانہ جنگی میں مبتلا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تیری نصرت بخشی میرا ساتھ دے اور میں اپنی قوم اور اپنے ملک کو اس ہلاکت و بربادی کے دوزخ سے نکال کر صلح و سلامتی اور امن و آشتی کے بہشت زار حیات میں لا کھڑا کر دوں اور ہندوستان جو سالہا سال سے آپس کے لڑائی جھگڑوں سے جہنم کدۂ فساد بنا ہوا ہے وہ پھر جنت نشان بن جائے۔ گو حالت نہایت یاس انگیز اور مایوس کن ہے۔ لیکن اے وہ ذات پاک کہ یخرج الحی من المیت و یخرج المیت من الحی تیری شان ہے، میں مایوس نہیں ہوں، اور کیوں کر مایوس ہو جاؤں جبکہ مژدہ لا تقنطوا من رحمۃ اللہ اور فرمان لا تئیسوا من روح اللہ موجود ہے۔ پس اے مایوسی کو کامیابی، ناامیدی کو امید اور ناکامی و نامرادی کو کامیابی و کامرانی سے بدل دینے والے قادر ذوالجلال ہم پر رحم کر۔ تو نے ابراہیمؑ کو نمرود سے نجات دلائی، موسیٰ کو فرعون سے چھٹکارا دلایا۔ رام کو راون پر فتح دی اور کرشن کو کنس پر غالب کیا، ہم بھی مظلوم ہیں، اور محکوم ہم کو بھی غلامی کی زنجیروں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے پاک اور روحانی طاقت عطا فرما یعنی ہمارے قلوب کو سمندروں کا سا جوش و خروش، پہاڑوں کی سی مضبوطی اور عزم و وقار اور زمین کی سی عجز و فتادگی اور تحمل و برداشت مرحمت فرما، تاکہ آزادی کی منزل مقصود پر پہنچنے کے لئے ہم بھی کوشش سے دریغ نہ کریں، اور کسی ناکامی و نامرادی سے نہ گھبرائیں۔ اور انھیں کی تقلید کریں جن کے بارے میں تو نے فرمایا ہے۔ فما وھنوا لما اصابھم فی سبیل اللہ وما ضعفوا وما استکانوا واللہ یحب الصابرین۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

فہرست مضامین

قیمت فی پرچہ تین آنے

کشمیر کا خط

(۲)

"سیلانی"

سری نگر
۲۶ر ستمبر ۴۸ء

میں نے اپنے پچھلے خط میں کچھ ان گمنامیوں اور بدانتشیوں کا ذکر کیا تھا جو وہاں ہماری ہندوستانی افواج کے متعلق ہمارے بدخواہوں اور بھولے نادان دوستوں کی طرف سے پھیلائی گئی ہیں، اور جو تحقیقات سے ابھی یہاں بالکل بے بنیاد معلوم ہوئیں۔

وطن کے بدخواہوں سے تو شکایت ہی کیا! البتہ وہ نادان دوست جو بزعم خود سیاست پر گہری نظر رکھتے ہیں، حالات کا مطالعہ بالکل غیر جانبداری سے کرتے ہیں اور اپنی صاف گوئی کے ثبوت میں اپنے خلاف اپنے مخالفوں کی ہر غلط دلیل کو صحیح تسلیم کر کے اپنی فراخ دلی کا مزید ثبوت پیش کرتے ہیں اور دشمنوں کی ہوائیوں کو حقائق کا درجہ دیتے ہیں۔ ان سے اتنی گذارش ہے کہ آپ شوق سے ملکی اور بین الاقوامی سیاست کا مطالعہ کیجئے، لیکن یہ یاد رکھئے کہ اگر خدانخواستہ زیادہ گہری نظر سے آپ نے مطالعہ کیا تو آپ اپنے اور اپنے ملک کے دشمنوں کے مقصد کو غیر محسوس طریقے پر پورا کر رہے ہوں گے۔

مثلاً ایک سوال جو ہر وقت مسئلہ کشمیر کی بنیادی کمزوری کو ثابت کرنے کے لئے زیر بحث رہتا ہے اور ہر طرح کی قیاس آرائیوں اور فرضی اعداد و شمار کی مدد سے اس کو حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ کشمیر کی رائے عامہ کشمیر کے مسئلے کا فیصلہ کس طرح کرنا چاہتی ہے؟

اس سوال کا مقدمہ یوں شروع ہوتا ہے کہ "کشمیر کی غالب اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے"۔ اس کے بعد یہ مفروضہ پیش کیا جاتا ہے جس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت ہی نہیں کہ "مسلمان بہرحال مسلمان ہیں یعنی مسلم لیگی" اس لئے قدرتاً پاکستان کے ساتھ ان کی ہمدردیاں ہیں، اور وہ پاکستان ہی کے ساتھ کشمیر کے الحاق کے آرزومند ہیں! لہٰذا کشمیر کی رائے عامہ کا فیصلہ ظاہر ہے۔ بدیہی باتوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا! حقائق کو جھٹلایا نہیں جا سکتا، انکار میں [illegible] نہیں ہو سکتی جا سکتی" وغیرہ وغیرہ! اور پھر آخر میں یہ فیصلہ کہ اس وقت بزور فوج اور بزور شمشیر ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کی تمام تر کوششیں اور تمام ریشہ دوانیاں جابرانہ ہیں! ظالمانہ ہیں! فاسشسٹانہ ہیں! [illegible] ہیں!

عوض کشمیر کی رائے عامہ کا فیصلہ خواہ کچھ ہی ہو ہم [illegible] اپنی [illegible] کشمیر کی رائے عامہ کے فیصلے" کا تصفیہ گویا اپنے گھر میں بیٹھے بیٹھے کر چکے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ مسلم لیگ کا یہی وکیلانہ طرز استدلال ہے جس کی بدولت انگریزی سرکار کی انوکھی سیاسی عدالت سے ہمارے ملک کے بٹوارے کا مسئلہ بالآخر ملک دشمنوں کے حق میں طے ہوا۔ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی حکومت قائم ہوئی اور اب اگر کشمیر کو پاکستان کے حوالے کرنے سے ہندوستان میں ہندوؤں کی خالص حکومت قائم ہو جائے تو پھر کیا ہے ہندو اور مسلمان فرقہ پرستوں کی منہ مانگی مراد مل گئی۔ کشمیر کی صرف چالیس لاکھ آبادی کو پاکستان کے حوالے کر دیجئے، اور اس کے بعد اطمینان سے شدھ ہندو حکومت جو دنیا کی بڑی سے بڑی حکومتوں سے بھی بڑی ہو بنا لیجئے! یہ تجویز اتنی معقول، اور اتنی منصفانہ ہے کہ ہر فرقہ پرست خواہ وہ مسلم لیگی ہو یا مہاسبھائی اس کو قبول کرنے سے انکار نہیں کر سکتا اور اسی لئے حکومت پاکستان نے اس پر زور دینا لیے کی تائید اگر ہندوستان کے کسی حلقے میں ہو رہی ہے تو وہ یہی مہاسبھائی حلقہ ہے ___ بلکہ حیدرآباد کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے ہی ہاں اس حلقہ کی طرف سے کشمیر کا فیصلہ چکانے کے لئے بڑے زور شور کی کوششیں شروع ہو گئی تھیں [illegible] دار اخبارات نے حمایت سے مہاراجہ کی کشمیر [illegible] شد و مد سے تحریک شروع کر دی تھی، اور اسی تجویز کے لئے میدان تیار کیا جا رہا تھا۔

یہاں سری نگر میں، مگر مجھے ایسا معلوم ہوا ہے کہ جس مسئلہ کو از سر نو طے کرنے پر وہاں اصرار ہے یعنی الحاق کا مسئلہ، وہ یہاں ایک طے شدہ مسئلہ سمجھا جاتا ہے اور یہ فیصلہ ان لوگوں کا ہے جو کشمیر کی اکثریت کے حقیقی نمائندے ہیں۔ ان کے اس فیصلے کے عمل درآمد پر پورا ایک سال گزر چکا ہے۔ ہر دیکھنے والا یہ اپنی آنکھ سے دیکھ سکتا ہے کہ وادی کشمیر کی رائے عامہ کلیۃً اس فیصلہ کی تائید میں ہے۔ جن علاقوں پر پاکستانی قبائل کا قبضہ ہو گیا تھا اور جو پھر پاکستانیوں سے خالی کرا لیے گئے ان کی "رائے عامہ" بھی غیر مشتبہ طور پر اس فیصلے کے حق میں ہے۔ ہاں ان کی اس "رائے عامہ" کے معنی یہی ہیں کہ وہ شیخ عبداللہ کے ساتھ ہیں! اور مہاراجہ کے مخالف! اس وقت تک جو علاقے پاکستان کے قبضہ میں ہیں اور کشمیری ہیں ان کے متعلق بھی پورے وثوق کے ساتھ معلوم ہے کہ ان کی رائے عامہ بھی شیر کشمیر کے ساتھ ہے، اور وہ مہاراجہ کے خلاف ہے، کشمیر کی سیاست کا یہی ایک عقدہ تضاد ہے جو شیخ عبداللہ اور ان کی عوامی حکومت آج کل سلجھانے کی کوشش کر رہی ہے۔ شیخ صاحب اور ان کی عوامی حکومت کے مخالفین کی فہرست تیار کی جائے تو سر فہرست مہاراجہ کا نام نامی آئے گا اور پھر ان کے دست راست کا، مسلم کانفرنس کا اور اس کے مفرور شکست خوردہ لیڈروں کا، ملازمت پیشہ مجاہدین اسلام کا، اقتدار یافتہ برہمنوں کا، جاگیرداروں کا، اور سرمایہ داروں کا! یہ سب حضرات اپنی اپنی اغراض کے بندے ہیں اور اسی لئے شیخ صاحب کے مخالف ہیں اور ان کی عوامی حکومت کے مخالف ہیں۔ ان کی کل تعداد ۵، ۱۰ فی صدی ہی سہی، لیکن اب تک تو انہیں کا راج رہا ہے۔ یہی لوگ اپنے مستقل مفادات کی بدولت ۹۰ اور ۹۵ فی صدی آبادی پر حکومت کرتے رہے ہیں، ان کو لوٹتے رہے ہیں، اور ان کی لوٹ پر پلتے رہے ہیں۔ ان میں شیخ بھی ہیں اور برہمن بھی ہیں، مسلمان بھی ہیں اور کافر بھی ہیں، کٹر مسلم لیگی بھی ہیں اور کٹر مہاسبھائی بھی، پاکستانی بھی ہیں اور پاکستان کے دشمن بھی، لیکن جہاں تک ان کے اغراض اور مفاد کا تعلق ہے سب کے سب شیر کشمیر اور ان کے عوامی راج کے دشمن ہیں اور اس لحاظ سے بقول مرشد سب کے سب "امت واحدہ" میں شمار کئے جا سکتے ہیں؛ کل تعداد ان کی مگر ۱۰ فی صدی سے زیادہ نہیں ہے۔ [illegible] کو نہ چھوڑئیے [illegible] فی صدی شیخ عبداللہ کے ساتھ ہے۔ شیخ عبداللہ کا فیصلہ ان کا فیصلہ ہے۔ اور جن لوگوں کو اب تک معلوم نہیں ہے ان کو بھی صاف اور صریح الفاظ میں عنقریب معلوم ہو جائے گا۔ نیشنل کانفرنس کا کنونشن اوائل اکتوبر میں طلب کیا گیا ہے، اس میں دو فیصلے ہونے والے ہیں ایک تو ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے مستقل الحاق کا فیصلہ اور دوسرا عوامی راج کے "نئے کشمیر" کا تعمیری پروگرام

شیخ عبداللہ کے عوامی راج اور ان کے "نئے کشمیر" میں مہاراجہ کے لئے صرف برائے نام جگہ رکھی گئی ہے اور وہ بھی صرف حکومت ہند کی عام ریاستی سیاست کی یکسانی کو قائم رکھنے کے لئے، ورنہ کشمیر کے معاملات میں فی الحقیقت اب مہاراجہ کا کوئی عمل دخل نہیں رہا ہے اور کشمیر کا بچہ بچہ روز بروز اس حقیقت سے واقف ہوتا جا رہا ہے اور اسی لئے گزشتہ چند ماہ کے عرصے میں شیخ عبداللہ کا اثر اور اقتدار اور ان کی عوامی حکومت بڑی مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر قائم ہو گئی ہے۔ شیخ صاحب کو اور ان کے رفقا کار کو بھی یہ اطمینان اور یقین ہو گیا ہے کہ ان کے "نئے کشمیر" کی عمارت رفتہ رفتہ جیسے بلند ہو گی کشمیر کی سیاست کا عقدہ تضاد خود بخود حل ہو جائے گا۔

کشمیر کی عوامی حکومت کی یہی خود اعتمادی ہے جس کے بل بوتے پر وہ کشمیر کی سیاسی [illegible] اور ہندوستان کی قومی جنگ اس وقت لڑ رہے ہیں اور "نئے کشمیر" کی تعمیر کر رہے ہیں۔

وہاں ہندوستان میں جس طرح عنان حکومت اس وقت کانگریس کے ہاتھ میں ہے، بالکل اسی طرح یہاں حکومت کشمیر پر نیشنل کانفرنس کا تسلط ہے۔ نیشنل کانفرنس کی مخالف جماعت "مسلم کانفرنس" تھی جو برائے نام مسلم تھی، اور فی الحقیقت بلا تفریق مذہب و ملت جملہ رجعت پسندوں کی واحد نمائندہ جماعت تھی! اس کے لیڈر سب کے سب پاکستان چلے گئے، لیکن جس طرح تقسیم سے پہلے ہندوستان میں مسلم لیگ کے اصلی کارکن اور روح رواں سرکاری دفاتر کے ملازم پیشہ مسلمان تھے اسی طرح یہاں بھی مسلم کانفرنس کے اصلی کارکن سرکاری دفاتر ہی میں ملیں گے۔ ان خاموش کام کرنے والے

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۶ء

قومی تہذیب اور قومی زبان

اس مسئلے پر ہم ۸ر جولائی کے "نئی روشنی" میں اپنے خیالات اختصار کے ساتھ ظاہر کر چکے ہیں۔ اب اس پر دوبارہ قلم اٹھانے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اس عرصے میں شری پرشوتم داس ٹنڈن نے ایک تہذیب اور ایک زبان کی تحریک اٹھائی ہے جو ہمارے نزدیک ملک اور قوم کے لئے نہایت مضر ہے، اور ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اہلِ نظر کو اس کے خطرات سے آگاہ کر دیں۔

اس وقت اگر ملک کی تہذیبی حالت کا جائزہ لیا جائے تو یہ نظر آتا ہے کہ بہت سے تہذیبی عناصر میں سب فرقوں اور جماعتوں میں صدیوں سے گہرا اشتراک چلا آرہا ہے۔

بعض میں اشتراک پچھلے ڈیڑھ سو سال میں پیدا ہوا ہے۔

بعض میں ابتدا سے اختلاف ہے، اور وہ کچھ دن سے بہت بڑھ گیا ہے

جو چیزیں مدتوں سے مشترک چلی آتی ہیں، ان میں رہنے سہنے، کھانے پینے کا طریقہ ہے، عام طبیعت اور مزاج، سبھاؤ اور برتاؤ ہے، عام وجدان اور احساس، آرٹ اور ایک حد تک ادب ہے۔ ان چیزوں کے بارے میں ہم کو جزوی اختلافات ضرور نظر آتے ہیں، مگر وہ ایسے سطحی ہیں کہ ان سے زندگی کی بنیادی وحدت میں خلل نہیں پڑتا۔ غیر ملک کے لوگوں سے پوچھئے تو ان کو سب ہندوستانیوں کی گھریلو معاشرت اور تہذیب یکساں نظر آتی ہے۔

جو مشترک چیز زمانہ حال میں مغربی اثر سے پیدا ہوئی ہے یا اگر تھوڑی بہت پہلے سے موجود تھی تو اب زیادہ ابھر آئی ہے، وہ جمہوری روح اور علمی نقطۂ نظر ہے۔ علمی نقطۂ نظر سے جو اشتراک خیال پیدا ہوا ہے وہ تو صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے تک محدود ہے، مگر جمہوری روح انڈین نیشنل کانگریس کی ساٹھ برس کی کوششوں سے خاص و عام میں پھیل گئی ہے، اور اس نے ذہنی وحدت کی ایک مضبوط بنیاد قائم کر دی ہے جس پر تہذیبی وحدت کی پائدار عمارت کھڑی ہو سکتی ہے۔

اب ان عناصر کو لیجئے جن میں اختلاف ہے، ان میں سب سے اہم مذہب ہے اور زبان۔ مذہبی عقائد و اعمال کے فرق سے ہم فرقوں میں اور زبانوں کے فرق سے لسانی حلقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ مذہب اور زبان یہی ہمارے سب سے بڑے تہذیبی اختلافات ہیں۔ برطانوی حکومت نے اور اس کی سرپرستی میں ان ہندوؤں اور مسلمانوں نے جو جمہوریت و آزادی کی تحریک سے خائف تھے اور اس کو کچلنا چاہتے تھے، ان اختلافات کو خوب خوب ابھارا، یہاں تک کہ ملک ایک خوں ریز عمل جراحی کے ذریعے سے دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔

اب ہندوستان کے سب بہی خواہ چاہتے ہیں کہ آئندہ ہمارے ملک کے اندر یہ دونوں چیزیں قومی وحدت میں خلل ڈالنے کا باعث نہ بنیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ اس کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ جہاں تک کہ مذہب کا تعلق ہے، اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ سب مذہبوں کو ایک سرے سے ختم کر دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ سب لوگوں کو ایک مذہب اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے۔ تیسرے یہ کہ ہر مذہب سے بے جا تعصبات کا پردہ ہٹا کر اس کی حقیقی روح کو بے نقاب کیا جائے۔ اس لئے کہ متعدد ہندو مسلمان عارفوں کی تعلیم اور زندگی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ سچی مذہبی روح ہندوستان میں فصل کی قوت نہیں بلکہ وصل کی قوت ہے۔ شکر ہے کہ پہلی دو صورتوں کی حمایت ہمارے ملک میں کسی ذمہ دار فرد یا جماعت نے آج تک نہیں کی، البتہ تیسری صورت ہمارے زمانے میں مہاتما گاندھی نے اختیار کی اور اب ان کے سچے پیرو اختیار کر رہے ہیں۔

اب رہی زبان سو اس کے اختلاف کو مٹانے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ کسی ایک ترقی یافتہ زبان کو سارے ملک کی علمی ادبی اور سرکاری زبان بنا دیا جائے دوسرا یہ کہ فی الحال ان سب کاموں کے لئے کسی حد تک انگریزی اور بڑی حد تک صوبائی زبانوں کو استعمال کیا جائے (مدھیہ دیش کے صوبوں میں ہندی اور اردو دونوں کو صوبائی زبانوں کی حیثیت حاصل رہے) مگر اسی کے ساتھ یہ کوشش کی جائے کہ ہندوستانی جو مدھیہ دیش میں عام بول چال کی زبان ہے، سارے ملک کے اندر ایک کاروباری زبان کی حیثیت سے پھیلے۔

ان میں سے پہلے طریقے پر شری پرشوتم داس ٹنڈن زور دے رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہندی زبان پر سنسکرت کا رنگ زیادہ سے زیادہ چڑھا کر اسے جلد سے جلد ملک کی عام زبان بنا دیا جائے۔ ٹنڈن جی کے اس خیال سے کسی محب وطن کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ ہندوستانی قومیت کے استحکام کے لئے ایک مشترک قومی تہذیب کا ہونا لازمی ہے اور قومی تہذیب کی تکمیل کے لئے ایک قومی زبان ضروری ہے۔ اختلاف اس امر میں ہے اور بڑی شدت سے ہے کہ یہ مقصد ادبی ہندی کو جو زیادہ سے زیادہ ایک خاص علاقے میں ایک بڑی جماعت کی زبان ہے، زبردستی سب جماعتوں اور سب صوبوں پر ادبی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے مسلط کر دینے

(بقیہ صفحہ ۴ پر)

بزمِ بے تکلف

(۲)

"بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ جو اپنے آپ کو لیڈر کہے وہ لیڈر ہے؟"

"بات کیوں نہیں ہوئی۔ ارے بھئی لیڈر کی تعریف اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔ یہی سب لیڈروں میں قدرِ مشترک ہے، اور یہی ان میں اور دوسروں میں ما بہ الامتیاز۔"

"قبلہ آپ نے تو اور بھی بڑے بڑے پتھر لڑھکانے شروع کر دیئے۔ مشترک تو قدرے سمجھ میں آبھی گیا، مگر یہ "ما بہ" تو کسی طرح گلے نہیں اترتا، معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے موٹی سی گالی دے دی۔"

"معلوم نہیں آپ مجھے بنانے کے لئے بنتے ہیں یا بنے بنائے ہیں۔ خیر! اب سن لیجئے۔ قدرِ مشترک وہ صفت ہے جو ایک نوع کے سب افراد میں موجود ہو۔ سب پرندوں میں یہ صفت ہے کہ وہ اڑتے ہیں۔ سب لیڈروں میں ——————"

"........ یہ صفت ہے کہ وہ اڑاتے ہیں۔ بے پر کی۔ اب سمجھ گیا۔"

"خاک سمجھ گئے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ سب لیڈروں میں قدرِ مشترک ادعا ہے۔ یعنی ہر ایک لیڈر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اپنی زبان سے اپنے آپ کو لیڈر کہتا ہے۔"

"ہاں! ہاں صاحب!! وہی مثل ہے کہ اپنے منہ میاں مٹھو۔ مگر یہ بے پر کی اڑانا نہیں ہوئی تو اور کیا ہوئی؟ آپ تو خواہ مخواہ کی حجت کرتے ہیں۔"

"اچھا آپ یوں ہی سمجھ لیجئے۔ اب رہا ما بہ الامتیاز۔ یہ اس صفت کا نام ہے جو ایک نوع کی ایک جنس میں ہو اور دوسری میں نہ ہو۔ مثلاً یہی اڑنے کی صفت کہ پرندوں میں ہے، انسانوں اور دوسرے جانوروں میں نہیں پائی جاتی۔"

"سو لیڈر کے وہ تو ایسا اڑتا ہے کہ کیا کوئی پکھیرو اڑے گا۔ یوں تو خیر پیر بھی اڑتے ہیں مگر انہیں اڑنے کو پر یا ہونے چاہئیں۔ لیڈر کو اس کی ضرورت نہیں وہ اپنی ہوا میں آپ ہی فراٹے بھرتا ہے۔"

"ارے بھائی یہ اڑنا استعارہ ہے، پرندوں کا اڑنا حقیقت ہے، مگر بات آپ ٹھیک کہتے ہیں— اچھا تو لیڈر ——————"

"میں کتنی ہی ٹھیک بات کہوں، آپ میں میکھ نکالے بغیر نہیں رہتے، خیر آگے چلئے۔ اچھا تو لیڈر ——————"

"اپنی نوع کے دوسرے لوگوں سے اس بات میں امتیاز رکھتا ہے کہ وہ خود اپنی زبان سے لیڈری کا دعویٰ کرتا ہے، اور دوسرے اپنی بڑائی کا کم سے کم صریحی یعنی کھلا ہوا دعویٰ نہیں کرتے۔"

"جی، اور یہ شاعر حضرات کیا ڈھکا چھپا دعویٰ کرتے ہیں۔

ع سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا

(بقیہ صفحہ ۴ پر)

۲۔ پاکستان

مشرقی بنگال سے فتنہ اُٹھ رہا ہے

اپریل ۱۹۵۰ء میں ہندوستان اور پاکستان کے معاہدے کے بعد مشرقی بنگال سے ہندوؤں کے نکلنے کی رفتار سُست ہوگئی تھی۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد یہ سلسلہ پھر شروع ہوگیا اور آنے والوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ ۲۵ر جون کو مغربی بنگال کی حکومت نے اعلان کیا کہ اس تاریخ کے بعد آنے والوں کو پناہ گزین تصور نہیں کیا جائے گا، اور انھیں کسی خاص امداد کا مستحق نہیں سمجھا جائے گا۔ اس کی وجہ سے نقل مکان کے اس رجحان میں کچھ کمی آئی۔ لیکن اب یہ مسئلہ دوبارہ بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے اور مغربی بنگال کی حکومت نے ازسرِ نو کچھ پابندیاں لگائی ہیں۔

سہروردی صاحب نے مشرقی پاکستان کی حکومت سے اپیل کی ہے کہ وہ اقلیتوں کے دل میں اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ ان کی تجویز ہے کہ اقلیتوں کے نمائندوں کو وزارت اور دوسرے اہم عہدے دیئے جائیں تاکہ ان میں یہ احساس پیدا ہوسکے کہ پاکستان میں وہ اجنبی نہیں ہیں۔ قیاس یہ ہے کہ یہ تجویز حکومتِ پاکستان کے لئے قابلِ قبول نہیں ہوگی، لیکن سہروردی صاحب کی اپیل کا ایک حصہ پھر بھی اہم ہے۔ انھوں نے کہا ہے "ہمیں یہ حق ہے کہ حکومت پاکستان سے ایسا برتاؤ کرنے کا مطالبہ کریں جس سے ہندوستان کے مسلمانوں کا بھلا ہو۔ حکومت پاکستان کو انتہائی کوشش کرنی چاہیے کہ ہندو مشرقی پاکستان میں ٹھہر جائیں"۔ انھوں نے پاکستان کے ارباب حل وعقد کو یہ موٹی سی بات یاد دلائی کہ دونوں ملکوں میں اقلیتوں کے ساتھ برتاؤ کا ایک یہ پیمانہ بھی ہوسکتا ہے کہ کہاں سے اقلیتیں بھاگنا چاہتی ہیں اور کہاں وہ رہنا چاہتی ہیں۔ انھوں نے پاکستان کی حکومت کو یاد دلانے کی کوشش کی ہے کہ ان کی یہ پالیسی ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے تباہ کن ہوسکتی ہے۔

پاکستان میں ہندوستان کے ہائی کمشنر سری پرکاش نے ان اسباب کی وضاحت کی ہے جن کی وجہ سے ہندو مشرقی بنگال سے ہجرت کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان کے ارباب حل وعقد ہر وقت اپنی ریاست کے "اسلامی" ریاست ہونے پر زور دیتے رہتے ہیں اور اس لئے قدرتاً غیر مسلم اس فضا میں اپنے لئے ایک مبہم سا خوف محسوس کرتے ہیں۔ سری پرکاش نے کہا کہ دونوں ملکوں کو چاہیے کہ ایسی کسی بات پر زور نہ دیں جس سے یہ گمان ہو کہ ان کی ریاست ایک مذہبی ریاست ہے۔ ہندوستان میں یہ نعرہ بلند کرنے والوں کی تعداد بہت کم رہ گئی ہے۔ پاکستان میں یہ نعرہ نہ لگانے والوں کی تعداد کم ہے۔ اقلیتوں کے ساتھ سلوک جمہوری حکمرانوں کی اچھائی کا ایک معیار ہے۔ حکومت پاکستان خود بھی۔ لئے اور ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کے لئے مذہبی ریاست کا نعرہ بلند کرکے کانٹے بو رہی ہے۔

حیدرآباد میں دخل در معقولات

معین نواز جنگ صاحب نے عارضی طور پر حیدرآباد کا مسئلہ سیکیورٹی کونسل سے واپس لے لیا ہے اور کراچی تشریف لائے ہیں۔ تاکہ وہاں سے حیدرآباد کی "حقیقی" صورتِ حال کا اندازہ لگائیں اور پھر فیصلہ کریں کہ حیدرآباد کے سوال کو دوبارہ اُٹھائیں یا نہیں۔ معین نواز جنگ صاحب کی اس ہستی کے متعلق ہمیں کچھ نہیں کہنا ہے، کیونکہ وہ بے چارے وبساطِ سیاست کے ایک مہرے ہیں جن کی چالیں دوسروں کے ہاتھ میں ہیں۔ لیکن حکومت پاکستان سے کچھ ضرور کہنا چاہتے ہیں۔ پچھلے دنوں پاکستانی وزیرِ اعظم نے ہندوستان کے ساتھ دوستی کے بہت سے دعوے کئے تھے۔ بعد میں انھوں نے ان دعووں کے ساتھ ایک شرط لگا دی ہے، وہ شرط یہ ہے کہ ہندوستان کشمیر کو بھون کر اور ایک پلیٹ میں رکھ کر لیاقت علی صاحب کی خدمت میں پیش کردے۔ اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ نہ تو دوستی کی خواہش میں خلوص ہے نہ ان دعووں کی کوئی حقیقت ہے۔ حیدرآباد کے سلسلے میں پاکستان کی یہ درخواست ہے کہ اب کی بار جب اس سوال پر بحث ہو تو انھیں بھی اس میں حصہ لینے کا حق دیا جائے۔ دوستی کے ان دعووں کی آخری تردید ہے۔ ظاہر ہے حکومت پاکستان کو یہ توقع نہیں ہوسکتی کہ متحدہ اقوام حیدرآباد کے عوام کا فیصلہ بدل سکے گی۔ اس دلچسپی کا مقصد یہی ہوسکتا ہے کہ سیکیورٹی کونسل کے اس جلسے میں اگر حیدرآباد پر مزید بحث و گفتگو کی حماقت کی جائے، ظفر اللہ صاحب ہندوستان کے خلاف زہر اگلیں۔ کیا پاکستان میں ایسا ایک بھی آدمی نہیں جو عوام کو یہ سمجھانے کی کوشش کرے کہ ہندوستان سے دشمنی پاکستان کے مفاد کے لئے تباہ کن ہوگی؟

البتہ خواجہ ناظم الدین صاحب نے حال میں جو بیان دیا ہے اس کا لہجہ مصالحانہ ہے۔ انھوں نے دولتِ مشترکہ کی ممبر ریاستوں سے درخواست کی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں سمجھوتا کرانے کی کوشش کریں، اور یہ اُمید ظاہر کی ہے کہ کشمیر کے مسئلے کا فیصلہ پُرامن طریقے سے ہوسکتا ہے۔ خواجہ صاحب نے بہ خلاف لیاقت علی خاں صاحب کے سمجھوتے کے لئے کوئی ایسی شرط نہیں لگائی کہ دوسرا فریق ہتھیار ڈال دے۔ اگر پاکستان کے وزیرِ اعظم اور وزیرِ خارجہ بھی صلح جوئی کا یہی انداز اختیار کریں، تو شاید کچھ نتیجہ نکلے۔

غذا کی حالت بگڑ گئی

پچھلے دنوں پاکستان کے وزیرِ غذا مسٹر عبدالستار پیرزادہ نے ایک پریس کانفرنس میں بتایا کہ چاول کی فصل کی تباہی کی وجہ سے پاکستان ہندوستان کو چاول نہیں دے سکے گا۔ پاکستان میں عام طور پر غلّے کی بہتات ہوتی ہے لیکن اس سال کوئی ۲۵ لاکھ ایکڑ زمین سیلاب کی زد میں آگئی اور اس طرح پاکستان کو کوئی چھ لاکھ ٹن کا نقصان اُٹھانا پڑا ہے۔ مشرقی پاکستان میں جو عام صورتوں میں بھی اپنی ضرورت بھر غلّہ پیدا نہیں کرتا محض سیلاب سے ۱۰ لاکھ ایکڑ کی اُگی ہوئی فصلوں کو نقصان پہنچا۔ چار لاکھ ایکڑ کی پیداوار تو بالکل ہی تباہ ہوگئی ہے۔ مشرقی پاکستان کی غذائی صورتِ حال نازک تو ہمیشہ ہی رہتی ہے، اس مصیبت کی وجہ سے جو دقتیں پیدا ہوں گی ان کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ پچھلے دنوں یہ خبر آئی تھی کہ مشرقی بنگال کے بعض علاقوں میں چاول کے دام بڑھ کر ۴۰ سے ۶۰ روپے من تک پہنچ گئے ہیں ظاہر ہے یہ قیمت مشرقی پاکستان کے بسنے والوں کی سکت سے بالکل باہر ہے۔ مغربی پنجاب میں ساڑھے چار لاکھ ایکڑ کی ساری فصل بالکل ہی تباہ ہوگئی ہے۔ ویسے سیلاب کا اثر کوئی ۱۵ لاکھ ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا۔ اب مغربی پنجاب نے ۷۵ ہزار ٹن غلّہ مرکزی حکومت سے مانگا ہے۔ مرکزی حکومت نے ۱۷ ہزار ٹن غلّہ مغربی پنجاب کو دیا ہے اور عبدالستار صاحب پیرزادہ نے کہا ہے کہ اس بات کا دار و مدار کہ پاکستان کی مرکزی حکومت مغربی پنجاب، مشرقی بنگال اور دوسرے صوبوں کو کتنا اناج دے سکے گی اس پر ہوگا کہ بین الاقوامی غذائی کونسل پاکستان کو کتنا اناج دے گی۔ وزیرِ غذا نے بتایا کہ پاکستان نے کونسل سے ایک لاکھ پچھتر ہزار ٹن اناج مانگا ہے جو اس کی ضرورت کے لئے ناگزیر ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان نے اور ملکوں سے بھی غلّہ حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دی ہیں، اور اگر ضرورت پڑی تو ڈالر کے علاقے سے بھی درآمد کرنے پر تیار ہوگا۔ وزیرِ غذا نے یقین دلایا کہ پاکستان میں قحط پڑنے کا کوئی اندیشہ نہیں کیونکہ حکومت پاکستان اپنے اس فرض سے واقف ہے کہ عوام کو غذا بہرحال ملنی چاہیئے اور وہ اپنا یہ فرض پوری طرح ادا کرے گی۔ لیکن سیلاب کی تباہ کاریوں سے ہندو پاکستان دونوں کو ایک اور سبق لینا چاہیے اور وہ یہ کہ اس مصیبت سے جو ہر سال کہیں نہ کہیں تباہی پھیلاتی ہے، بچنے کی صورتیں نکالی جائیں۔

تجارت کے سنبھلنے کی اُمید

حکومتِ پاکستان نے حال ہی میں چیکوسلوواکیہ سے ایک تجارتی معاہدہ کیا ہے۔ چیکوسلوواکیہ سے ایک صنعتی مشن ہندوستان اور پاکستان آیا تھا۔ اس مشن نے ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کو فنی امداد فراہم کرنے کی پیش کش کی تھی۔ چیکوسلوواکیہ وسط یورپ کا شاید سب سے زیادہ ترقی یافتہ صنعتی ملک ہے اور وہاں سے پاکستان اور ہندوستان دونوں کو بہت سے کام سکھانے والے اور ماہر مل سکتے ہیں جو ہماری صنعتوں کے قیام میں مدد دے سکتے ہیں۔ پتہ نہیں چیکوسلوواکیہ کے مشن کی اس پیش کش کے بارے میں کیا فیصلہ کیا گیا ہے لیکن یہ تجارتی معاہدہ مزید نفع بخش تعاون کے لئے راستہ کھول سکتا ہے۔ موجودہ حالت یہ ہے پاکستان میں مشینوں کی ضرورت سخت ہے اور چھوٹی چھوٹی صنعتوں کی دوبارہ

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

مشرقی دنیا

برما کی حالت ناگفتہ

برما کے متعلق خبریں بہت تھوڑی آتی ہیں اور ادھوری آتی ہیں، لیکن اگر کوشش کی جائے تو ان کی بنا پر ملک کے مسائل کا ایک ایسا خاکہ بنایا جا سکتا ہے جو سارے مسائل کا احاطہ کرلے۔ سب سے پہلے خانہ جنگی کا جائزہ لیا جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کمیونسٹ اثر و اقتدار وسط برما میں قائم ہے اور یہاں سے اس کا ہٹانا مشکل ہے۔ اس لئے یہ خانہ جنگی طویل ہوگی۔ پچھلے دنوں یہ خبریں آئی ہیں کہ میڈم آنگ سان اس کوشش میں لگی ہوئی ہیں کہ انٹی فاشسٹ لیگ (آنگ سان کی جمعیت) سے الگ ہو جانے والی جماعتوں کو دوبارہ لیگ کے حلقے میں داخل کر لیا جائے۔ اس کوشش میں کامیابی ناممکن سی معلوم ہوتی ہے۔ پیپلز والنٹیر لیگ کے ایک حصہ کی یہ رائے تھی کہ برمی حکومت کی پالیسی کے تعین میں کمیونسٹوں کو شریک کرنا ضروری ہے اور جب ان کا یہ مطالبہ منظور نہیں کیا گیا تو وہ الگ ہو کر کمیونسٹوں کے ساتھ شریک ہو گئے۔ انھیں اب کمیونسٹوں سے توڑنا مشکل ہے۔ قیاس ہے کہ خانہ جنگی میں پارٹیوں کی موجودہ تقسیم غالباً عارضی نہیں ہے۔

اس خانہ جنگی کو برما کی موجودہ معاشی زندگی کے پس منظر میں دیکھنا چاہئے۔ برما کے بجٹ میں دس کروڑ کا خسارہ ہے، لیکن خسارہ کا یہ اندازہ ان مفروضوں پر مبنی ہے کہ بغاوت جلد ختم ہو جائے گی یا کی جا سکے گی۔ یہ مفروضہ غلط ثابت ہوا اور امکان اسی کا ہے، تو پولیس اور فوج کے مصارف میں ظاہر ہے اضافہ ہوگا، اور بجٹ کا خسارہ اسی تناسب سے بڑھ جائے گا۔ ملک کی موجودہ سیاسی حالت میں اس خسارے کو پورا کیونکر کیا جائے گا؟ موجودہ حالت تو یہ ہے کہ انتظامی مشین بہت سے علاقوں میں درہم برہم ہو چکی ہے اور اس کی کارکردگی عام طور پر بری طرح مجروح ہو چکی ہے۔ حکومت کے محصول کہیں کہیں تو جمع نہیں کئے جا سکتے اور کہیں کہیں ادا نہیں کئے جاتے۔ محصولوں میں اضافے شاید چین کی طرح برما میں بھی نہیں کئے جا سکیں گے۔ اضافے ہوئے تو ان کا جمع کرنا آسان نہ ہوگا۔ ملک کی معاشی زندگی خود اس طرح درہم برہم ہے کہ یہ توقع بھی نہیں ہونی چاہئے کہ برما اپنی تجارت باقی رکھ سکے گا۔ اس سال برما شاید ڈیڑھ ملین ٹن سے زیادہ چاول برآمد نہ کر سکے گا۔ اتنا بھی برآمد ہو سکے گا یا نہیں یہ بھی مشتبہ ہے اور اس کا دار و مدار نقل و حمل کی سہولتوں کی دستیابی پر ہوگا، اور برما کی معاشی زندگی کا یہ پہلو بھی ایسا زیادہ امید افزا نہیں ہے۔ پیداوار میں اضافے کی توقع اس لئے نہیں کی جا سکتی کہ برما کی حکومت نے جو چند ایک اچھے کام کئے تھے وہ ادھورے رہ گئے تھے اس لئے ان سے اچھے نتائج کی امید نہیں ہو سکتی۔ مثال کے طور پر زمینوں کے قومی ملکیت بنائے جانے کا مسئلہ لیجئے۔ حکومت نے یہ اعلان کیا تھا کہ زمینیں وہ اپنے قبضے میں لے لے گی۔ اس طرح زمیندار محنت کرنے سے بچنے لگے اور یہ اصلاح کی نہیں گئی۔ اس لئے کہ کسانوں نے اس خلا کو پر کرنے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ خانہ جنگی نے طول کھینچا تو معاشی زندگی کا نقشہ اور بھی درہم برہم ہو جائے گا۔ زندگی کے مصارف آج بھی بہت بڑھ چکے ہیں۔ سنہ ۱۹۴۲ء کے اعداد و شمار سے مقابلہ کیا جائے تو قیمتیں چار گنی بڑھ گئی ہیں۔ بجٹ کے گھاٹے کو نوٹوں سے پورا کرنے کی کوشش ہوئی تو اندیشہ ہے کہ برما کی حالت چین کی سی ہو جائے گی۔

پچھلے دنوں برما کو انگریزی حکومت کی طرف سے تھوڑی سی مدد ملی ہے۔ برما کو یہ حق دے دیا گیا ہے کہ وہ دو ملین پونڈ ڈالر کے علاقے کے ملکوں سے ضروری چیزیں منگانے پر صرف کر سکے گا۔ یہ رقم اس سے الگ ہوگی جو برما اپنی تجارت کے ذریعے سے حاصل کرے لیکن اس سے جو مدد ملے گی وہ عارضی ہوگی۔

برما کے سامنے ایک اور بھی پیچیدہ سوال ہے۔ وہ کرن قبیلوں کا یہ مطالبہ ہے کہ انھیں ایک علیحدہ ریاست قائم کرنے کا حق دیا جائے۔ اس مطالبے کے لیڈر سایا اوگوئی صاحب ہیں۔ کرن بغاوت سے دلچسپی لینے والوں میں ایک انگریز افسر صاحب کا ذکر آیا ہے۔ وہ پچھلے دنوں کلکتہ میں مقیم تھے، اور اب کسی نامعلوم جگہ چلے گئے ہیں۔ بعض حلقوں میں اس مطالبے سے خاصی ہمدردی کا اظہار کیا گیا ہے، اور اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ تفریقی رجحانات کو شہ دینے کی روایت پر انگریزوں نے برما میں بھی عمل کیا ہے۔ کرن مطالبات کا ماننا تقریباً ناممکن ہے۔ وہ بہت سے وسیع علاقوں کے لئے خود مختاری کا حق مانگتے ہیں، جن میں خاصی تعداد میں برمی رہتے ہیں۔ یہ علاقہ معاشی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ چاول کی پیداوار کا بڑا حصہ یہیں سے آتا ہے، لیکن مطالبات نہ مانے گئے تو برمی قومی حکومت کے لئے بڑی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ برما کی پولیس اور فوج میں کرن عنصر بہت زیادہ ہے اور ایک خانہ جنگی کے وقت فوج کی وفاداری کے متعلق کسی طرح کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا۔ فوری طور پر تو حکومت نے کرن مطالبات مان لئے ہیں۔ تھاکن نو صاحب نے اعلان کیا ہے کہ کرن لیڈر سے سمجھوتے کی گفتگو کامیاب رہی ہے، لیکن کرن قوم کے بیرونی دوستوں کے اس سلسلے میں کیا ارادے ہیں یہ کون جانے؟

چین کا قصہ تمام ہی سمجھو

جنرل ہمو چیانگ کائی شک نے امریکیوں پر چینی انقلاب سے غداری کا الزام لگایا ہے۔ یہ الزام تو نیا نہیں، لیکن اس بات اس کے دہرانے میں چیانگ کائی شک کی مستقبل سے مایوسی کی جھلک نمایاں ہے، معلوم ہوتا ہے کہ چین کی خانہ جنگی کے ختم ہونے کے دن قریب آ رہے ہیں۔ چینی کمیونسٹوں کی کامیابی سے اب انکار کرنا ناممکن ہے۔ چیانگ کائی شک کو اب صرف اس طرح بچایا جا سکتا ہے کہ جمہوریت کی حفاظت کے لئے بیرونی فوجیں بلائی جائیں اور یہ صورت بھی قطعی کامیابی کی ضامن نہیں کہی جا سکتی۔

سنجوریا سے قومی حکومت کے اقتدار کا کم و بیش خاتمہ ہو چکا ہے، پچھلے دنوں چینی کمیونسٹوں کو یہاں دو ایک بڑی کامیابیاں ہوئی ہیں۔ سنجوریا پر پوری طرح چینی کمیونسٹوں کا قبضہ ہو گیا تو اس سے ان کی طاقت بہت بڑھ جائے گی کیونکہ اس طرح انھیں مکڈن کے اسلحے کا کارخانہ مل جائے گا جو چین میں اپنی قسم کا سب سے بڑا کارخانہ ہے جس میں چھوٹے چھوٹے ہتھیار بنتے ہیں پھر اس کے فتح ہو جانے سے ریلوں کے سلسلے پر چینی کمیونسٹ قابض ہو جائیں گے۔

کٹھ پتلیوں کی ضرورت ہے!

فرانسیسی حکومت ہند چینی میں اپنی پرانی چالوں سے دوبارہ جو کھیل رہی ہے اور یہ استقلال قابل رشک ہے۔ ہند چینی میں فرانسیسی حکومت نے کئی بار ایسے لوگ ڈھونڈھ نکالے جو ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہنے پر آمادہ ہو گئے لیکن یہ غلام فرانسیسی حکومت کے لئے زیادہ سود مند ثابت نہیں ہوئے۔ اب سابق بادشاہ باؤدے پیرس تشریف لے جا رہے ہیں۔ بعض فرانسیسی حکومت نے دعوت دی ہے اور اس گفت و شنید کا مقصد یہ ہے کہ ہند چینی کے مسئلے کا ایسا حل نکالا جائے جس میں فرانسیسی اقتدار اپنی جگہ قائم رہے، اور ہند چینی کے عوام کے جذبۂ آزادی کو بھی دھوکا دیا جا سکے۔ ایک خبر تو یہ ہے کہ ملک معظم اس بار فرانسیسی دباؤ میں آ جائیں گے لیکن ان کے ایک ساتھی نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ فرانسیسیوں سے کوئی معاہدہ کرنے جا رہے ہیں۔ آینگ باؤدے نے جو رویہ اختیار کر رکھا تھا وہ ان کے اپنے ایک جملے سے بہت اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے "آزاد رہنا اور محض شہری ہونا غلامی کی بادشاہی سے بہتر ہے" لیکن ایک شہری کی زندگی میں زندگی کی وہ لذتیں کہاں جو بادشاہوں کو حاصل ہوتی ہیں۔

فرانسیسی حکومت نے ڈاکٹر ہونشی من پر جو ہند چینی کی جنگ آزادی کے رہنما اور آزاد ہند چین کے صدر ہیں بارہا یہ الزام لگایا ہے کہ وہ گفت و شنید کے ذریعے مسائل حل کرنا ہی نہیں جانتے لیکن پچھلے دنوں ہونشی من نے پھر یہ اعلان کیا ہے کہ وہ فرانسیسیوں سے سمجھوتا کرنے پر تیار ہیں لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ یہ سمجھوتہ ویت نام کی حقیقی آزادی کا ضامن ہو اور فرانسیسی اقتدار ختم ہو جائے۔ ان شرائط پر فرانسیسی حکومت ——— جو ایک جمہوری حکومت ہے ——— صرف اسی وقت سمجھوتہ کرے گی جب وہ مجبور ہو جائے۔

ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد

پیرس میں یو۔ این۔ او کے اجلاس کے موقع پر یہ خبریں سننے میں آئی تھیں کہ پاکستان اور افغانستان وغیرہ اپنا

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

غزل

اختر انصاری

محبت کے غم دل کو کب تک نباہیں؟
بتا اے جُدائی! کہاں تک کراہیں؟
اِدھر سوزشِ دل، اُدھر کاہشِ جاں
اِدھر جلتے آنسو، اُدھر ٹھنڈی آہیں
یہ افسردہ چہرہ، وہ مغموم صورت
یہ ترستا ہوا دل، وہ پیاسی نگاہیں
اللہ کیوں نہ دیں اس بساطِ الم کو
نہ تم ہم کو چاہو، نہ ہم تم کو چاہیں
نہ تم نام لو گفتگو میں ہمارا
نہ ہم اپنے شعروں میں تم کو سراہیں
بہت ہو چکا پیار اب یادِ ماضی!
ہٹا ہاتھ اپنے، سمیٹ اپنی باہیں
نئے دور نے مجھ کو آواز دی ہے
بُلاتی ہیں مجھ کو نئی سیرگاہیں
پکارا ہے مجھ کو نئی منزلوں نے
مری منتظر ہیں نئی شاہ راہیں
حقیقت کی زد سے بچا دل نہ اختر
بہت ہم نے خوابوں میں ڈھونڈیں پناہیں

غزل

خلیل الرحمٰن اعظمی

اب نکھرتی ہے فضا وہ گیسوئے برہم کہاں
جاگ اے دل! اب اندھیری رات کا عالم کہاں؟
ناتوانوں نے بدل دیں آسماں کی گردشیں
اب جفائے حسن پر وہ نالۂ پیہم کہاں؟
خاک کے ذرے سنواریں گے اب اپنی کائنات
اب گہر کی آرزو میں دیدۂ پُرنم کہاں
لگ رہی ہے ہر چمن میں ہر طرف اک آگ سی
شعلۂ گُل رقص کر اب گریۂ شبنم کہاں
غیر کی بے مہریوں کے داغ تو اب مٹ چلے
مہ وشانِ ہند کے اس زخم کا مرہم کہاں؟
اب بھی باقی ہیں جہانِ نو کی کتنی منزلیں
اب یہاں کھوئی ہوئی اک راہ کا ماتم کہاں

غزل

رزم ردولوی

کمالِ دردکی دنیا نئی دوسری دیکھی
سنوارے موت جسے ایسی زندگی دیکھی
جو شور رشتوں کو زبان دے وہ گفتگو بھی سُنی
ہوا دے فتنوں کو ایسی بھی خامشی دیکھی
ہے رسم باطل و حق بھی بڑی تحیر زا
جُدا جُدا تو بھی یہ ملی جلی دیکھی
وہ راہ نکلی جو بھٹکا دے تیز گاموں کو
جو راستے پہ لگا دے وہ گمرہی دیکھی
خوشی و رنج کا اللہ رے ربط نیرنگی
کہ آنسوؤں میں تبسم کی روشنی دیکھی
تڑپ کے کود پڑا آتشِ بلا میں دل
پلٹ کے موت کو دیکھا نہ زندگی دیکھی
ستم ظریفیٔ فیضانِ انقلاب نہ پوچھ
کہ دیدنی تو شنی اور شنیدنی دیکھی

چچا چھکن نے کھانا پکوایا

صالحہ عابد حسین

چچی کو دن بھر کے لئے اپنی سہیلی کے ہاں جانا تھا، صبح سویرے سویرے سب کام کا انتظام کر، کپڑے وپڑے بدل ڈولی کا انتظام کر رہی تھیں کہ باورچی نے آ کر کہا "بیوی جی بچہ بہت بیمار ہے، دو دن کی چھٹی دے دو۔" چچی بولیں "نہیں بھائی آج چھٹی نہیں دے سکتی آج تو مجھے جانا ہے کل سویرے چلے جانا۔" باورچی نے کہا "بیوی بچے کا جی بہت برا ہے، گھر والی نے کہلا بھیجا ہے کہ آ کر کچھ کرو، ورنہ ملا پلایا بچہ ہاتھ سے چلا" یہ کہہ کر وہ رونے لگا، چچی متاثر ہو کر بولیں "ارے میں تو فوراً چھٹی دے دیتی پر اب کیا کروں، میاں اور بچوں کا رات کا کھانا کون پکائے گا؟" "بیوی جی میں عیوضی کی اپنے بھتیجے جمن کو بھیج دوں گا۔"

چچا چھکن دالان میں بیٹھے یہ سب سن رہے تھے کبھی کھڑے ہو جاتے کبھی ٹہلنے لگتے، کبھی اپنے ہاتھوں کو زور زور سے ملنے لگتے۔ آخر نہ رہا گیا، تیز تیز چلتے ہوئے چچی کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے "ارے بی کاہے کو پریشان ہوتی ہو، ہم جو ہیں۔" چچی کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ "اے بس معاف کرو۔ بھلا کھانا پکوانا مردوں کے بس کا کام ہے؟" چچا حیران ہو گئے "کھانا پکانا کون سا مشکل کام ہے؟ تم بیچاری گھر میں بیٹھنے والی ان جان عورت کیا جانو، مرد کیسے کیسے زبردست کام کرتے ہیں......"

چچی بات کاٹ کر بولیں "دنیا بھر کے کام مرد کرتے ہوں پر گھر نہیں چلا سکتے۔"

"جی ہاں ریلیں چلائیں، کارخانے چلائیں، جہاز چلائیں، اجی بم چلائیں، اور گھر نہیں چلا سکتے —— عورتیں کتنی جاہل ہوتی ہیں۔" چچا کو مردوں کی توہین سن کر طیش آ رہا تھا، چچی نے آگ پر اور تیل چھڑک دیا "اور چاہے کوئی کر سکے یا نہ کر سکے پر تم تو ہرگز نہیں کر سکتے۔"

"اُف تمہاری ان باتوں کو سن کر تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے آگ۔ تمہارے نزدیک تو میں دنیا بھر کا ناکارہ اور بدسلیقہ آدمی ہوں، مجھے کیا کریں سب گھر والے فاقہ۔"

منہ پھلائے سست رفتار سے چچا جا کر پھر اپنے پلنگ پر لیٹ گئے، اور بڑبڑانے لگے۔ چچی نے دیکھا معاملہ بگڑا جا رہا ہے، ان کے جلنے میں کھنڈت پڑے گی اور چچا کا منہ الگ کئی دن سیدھا نہ ہو گا۔ ہیں بڑی بڑی حضرت۔ مسکراتی ہوئی آ چچا کے پاس کھڑی ہو گئیں...... انھوں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا پر چچی نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا "اے اٹھو بھی —— تم تو حق ناحق خفا ہو گئے...... میں تو مذاق کر رہی تھی ——" چچا نے روٹھے ہوئے انداز سے جواب دیا "بس جی معاف کرو —— خدا کی قسم ایسی عورتیں ہم نے نہیں دیکھیں، جو یوں اپنے میاں کو بدنام کریں۔ ارے کون سا تمہارا کام ہے جو میں نے نہیں کیا ہو؟ دھوبن کو کپڑے دیئے، تصویر ٹانگی، گھر کے برتن صاف کئے تمہارے خطوں کے جواب لکھے، کیا کچھ نہیں کیا —— مگر تم تو بس کئے دھرے پر پانی پھیر دیتی ہو۔"

چچی ہنسی دباتے ہوئے بولیں "اے تو میں نے کب کہا کہ تم نے یہ سب کام نہیں کئے۔ کئے اور ایسے کئے کہ ساری دنیا کو خبر ہو گئی۔ اچھا تو یہ جنس کی کوٹھری کی کنجی۔ جمن کو جنس تول کر پکانے کو دینا میری کنجی تو ڈولی آ گئی، میں جا رہی ہوں، آٹھ بجے تک جا جاؤں گی۔" کنجی ہاتھ میں لے کر اور چچی کی میٹھی میٹھی باتیں سن کر چچا چھکن کی باچھیں کھل گئیں۔ چچی تو نیو کرکے ڈولی میں سوار ہو گئیں۔ بندو کو ساتھ لیتی گئیں اور چچا حقہ پیتے پیتے جانے کب غنی ہو گئے......

آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ودو اور چھٹن اسکول سے آ گئے ہیں اور سارے گھر میں اودھم مچا رکھا ہے۔ انھیں قسمت سے ایسا موقع ملا تھا کہ اماں گھر نہ ہوں، ابا خراٹے لے رہے ہوں، اور گھر میں اور کوئی روک ٹوک کرنے والا بھی موجود نہ ہو۔ انھوں نے اپنی اس آزادی سے پورا فائدہ اٹھایا، گھر بھر کی چیزوں کا معائنہ کر ڈالا۔ بستر کھول دیئے، کتابیں گرا دیں۔ نعمت خانے کی چیزوں کا صفایا کر دیا، سارے گھر میں کاغذ کے پرزے، گنے کے چھلکے اور روشنائی کے دھبے ہی دھبے نظر آ رہے تھے...... ایک دم چچا کی آنکھ کھلی "ارے شیطانوں......

یہ کیا ادھم مچا رکھا ہے..... اور گھر کا یہ کیا حال ہے...... آنے دو اپنی اماں کو دیکھو لو کیسی گت بناتی ہیں۔"

ودو نے جو چچا چھکن کی گرج سنی تو دوڑتا ہوا آیا "ابا میاں، ابا میاں، ایک لڑکا آیا بیٹھا ہے کہتا ہے خانساماں نے بھیجا ہے، جمن نام ہے، اب میں کھانا پکایا کروں گا۔"

"اچھا اچھا اُسے یہاں بھیج دو، اور تم شور مت کرو۔"

ایک سترہ، اٹھارہ سال کا لڑکا میلے کپڑے پہنے بے پھندنے کی ترکی ٹوپی اوڑھے آ کر سلام کر کے چچا کے سامنے کھڑا ہو گیا...... چچا چھکن نے سر سے پیر تک اس کا جائزہ لیا "ہوں! تو گویا تم جمن ہو...... کھانا پکانے آئے ہو......

تو کیا کیا پکا لیتے ہو؟"

"میاں پکانا وکانا تو جانتا نہیں...... ہاں کوئی بتا دے تو کچھ تھوڑا بہت کام کر لیتا ہوں۔" چچا نے اطمینان سے جواب دیا "خیر خیر اس کی فکر نہ کرو ہم سب بتا دیں گے...... ارے اب تو دوپہر ڈھلنی شروع ہو گئی —— تو یوں سمجھ لو کہ پکانے کا وقت آ گیا، اچھا چلو پہلے تمھیں جنس دے دیں" یہ کہہ کر چچا نے ایک عدد جمائی لی۔ پھر ایک انگڑائی لی اور بولے "اور کنجی کہاں ہے؟ جنس کی کوٹھری کی کنجی...... کچھ دھندلا سا خیال تھا کہ چلتے وقت چچی کنجی دے گئی تھیں۔ تکیے کے نیچے دیکھا، جھک کر پلنگ کے نیچے نظر ڈالی، اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ پائینتی لوٹا رکھا تھا، اس کے اندر دیکھا مگر کنجی نہ ملنا تھی، نہ ملی۔ اب تو چچا چھکن کو غصہ آنا شروع ہو گیا۔ یعنی آخر یہ کنجی گئی کہاں...... سب جگہ دیکھ چکے ملتی ہی نہیں...... بس کچھ نہیں وہ تمہاری چچی دے کر ہی نہیں گئیں...... اس بھول کا بھی بھلا کوئی ٹھکانا ہے......

...... اور بنتی ہیں بڑی سلیقہ والی......"

چچا سست رفتار سے دالان میں ٹہلتے جاتے تھے بکتے جاتے تھے، نظریں بھی چاروں طرف گھما رہے تھے کہ شاید کنجی کو رحم آ جائے اور وہ مل جائے اور ساتھ ساتھ پیٹ پر ہاتھ بھی پھیر رہے تھے کہ اچانک ان کا ہاتھ اپنے پیٹے پر پڑا...... کوئی سخت سی چیز محسوس ہوئی...... دیکھا تو ازار بند میں کنجی بندھی ہے مسکرائے آخر ہم نے ڈھونڈھ لی نا کنجی، اور جمن کو جو دیوار کے سہارے بیٹھا اونگھ رہا تھا کڑک کر آواز دی...... "چلو اٹھو بھی......

ہم نے انتظام کر لیا ہے کنجی کا۔"

صحن میں آئے، دو ایک سی کوٹھریاں، اور ان میں ایک سے تالے...... بڑی دیر تک سوچتے رہے جمن سے پوچھا تو اس نے کہا کہ میں کیا جانوں، میں تو آج ہی آیا ہوں۔ آخر ہار کر ایک تالے میں کنجی ڈالی تو پھنس کر رہ گئی۔ اب لاکھ لاکھ کوشش کرتے ہیں، مگر کنجی نہیں نکلتی۔ پسینے پسینے ہو گئے، جمن نے کہا "میاں ہٹئے آپ سے نہیں نکلے گی، میں نکال دوں۔" آنکھیں نکال کر بولے "...... یعنی کیا مطلب تیرا، جو کام ہم نہیں کر سکتے، وہ تو کرے گا؟" اور پھر چچا نے زور لگانا شروع کیا، مگر توبہ کیجئے اُسے تو ضد ہو گئی تھی بیچارے چچا چھکن سے۔ آخر پسپا ہو کر چچا پیچھے ہٹے، اور دبے دبے لہجے میں بولے "چلو تم بھی کوشش کر دیکھو جمن!"

جمن لپک کر آگے بڑھا، دو چار بار کنجی کو ہلایا پھر اس کے سرے میں ایک کیل ڈال جھٹکا جو دیتا ہے تو کنجی اس کے ہاتھ میں! چچا کی آنکھیں کچھ جھینپ سی رہی تھیں جمن نے جھٹ دوسری کوٹھری کا قفل کھول کواڑ کھول دیئے۔

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ چچی بڑے سلیقے کی عورت ہیں ان کی جنس کی کوٹھری بھی دیکھنے کے قابل تھی، ایک طرف لکڑی کا بڑا سا آٹے کا صندوق، دوسری طرف دیوار والی چھوٹی سی الماری تھی، دالیں، مسالہ وغیرہ رکھنے کے لئے۔ ایک طرف المونیم کا بڑا سا گھی کا ڈول رکھا تھا، دیوار کی الماری میں چینی اور شیشے کے برتن چنے تھے۔ لکڑی کی ایک کارنس پر بھرت کی ایک چمک دار کشتی آڑی کھڑی تھی، اور اس کے آگے چھ شیشے کے گلاس رکھے ہوئے تھے۔

چچا چھکن پہلی مرتبہ آج اس کوٹھری میں آ سکے تھے۔ پہلے تو سمجھے کہ غلطی سے چچی دوسری کوٹھری کی کنجی

جنوبی افریقہ کی حکومت کا نیا شاہکار

پرنسپل عبدالشکور، رام پور

کیپ ٹاؤن سے تازہ ترین اطلاع پہنچی ہے کہ جنوبی افریقہ کی پارلیمنٹ میں ایشیاٹک بل کا ترمیم دوسری مطالعہ کے لئے پیش ہوا، اور وزیر داخلہ مسٹر ڈانجس کا یہ خیال ہے کہ یہ ترمیم ہندوستانیوں کو جنوبی افریقہ سے جلا وطن کرنے کے بارے میں پہلا قدم ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ ترمیم کثرت رائے سے منظور ہوئی اور اس پر اب خوف ہے کہ بہت جلد عمل درآمد شروع کر دیا جائے گا۔ جنوبی افریقہ کے سابق وزیر اعظم جنرل اسمٹس نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ اس بل کو ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے تاکہ وہ اس پر غور و خوض کر سکے، اور آگے چل کر اپنی مفصل رپورٹ دے سکے، لیکن یہ تجویز مسترد کر دی گئی۔ اغلباً اس وجہ سے کہ جنوبی افریقہ کی موجودہ حکومت اس معاملے میں دیر نہیں کرنا چاہتی۔ اس بل کے مجوز اس ملک کے وزیر اعظم ڈاکٹر ملان ہیں جن کی ہندوستانیوں سے دشمنی کی مثالیں متعدد بار ہمارے سامنے آ چکی ہیں اور جن کے وزیر اعظم ہو جانے پر ہمیں شدید خطرات پیدا ہو گئے تھے۔ اس بل کا یہ نتیجہ ہوگا کہ یونین کی مجلس مقننہ اور نیٹال کے صوبہ جاتی کونسل میں ہندوستانیوں کی نمائندگی کا سلسلہ تام و کمال ختم ہو جائے گا، اور ۱۹۴۶ء کا ایکٹ کالعدم کر دیا جائے گا جس کی وجہ سے ہندوستانیوں کو یہ نمائندگی اس ملک کی تاریخ میں پہلی مرتبہ دی گئی تھی، حالانکہ ہمیں بخوبی یاد ہے کہ ۱۹۴۶ء کے بل سے بھی ہندوستانی متفق نہ تھے، اور بڑی شدت سے اس کی مخالفت کی گئی تھی۔ ہندوستانیوں کو جن کی تعداد اس نو آبادی میں ایک لاکھ پچاس ہزار ہے اس حق سے اس لئے محروم کر دیا جاتا ہے کہ آگے چل کر سرزمین کی اور غیر یورپین آبادی بھی اسی قسم کا مطالبہ پیش کرے گی۔ وہاں کی ہندوستانی آبادی کو ہمیشہ ایک خطرہ تصور کیا گیا، کیونکہ وہ دوسرے ملک سے آ کر وہاں آباد ہوئے۔ ان کا قیام ہمیشہ عارضی سمجھا گیا، اور وہ اپنی مشکلات اور دقتوں کو ہمیشہ ایک [illegible] کے سامنے پیش کرتے رہے۔

گذشتہ حکومت نے نیٹال کے میونسپل بورڈوں سے کہا تھا کہ ہندوستانیوں کو نمائندگی کا حق دیا جائے لیکن اس صوبے کے تمام بورڈوں نے اس کی سخت مخالفت کی تھی۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر اسمبلی میں ہندوستانیوں کے صرف تین نمائندے پہنچ جائیں تو پھر دیسی نمائندوں سے متحد ہو کر ایک مختصر سا مخالف گروہ بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ پارلیمنٹ کی موجودہ جماعت بندی میں جہاں حکومت کی اکثریت بہت کم ہے مخالف جماعت خطرہ ہے کہ جنوبی افریقہ کی سیاست پر ایسا گہرا اثر ڈالتی کہ یورپین ووٹر دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ جاتے۔ ڈاکٹر ملان کے خیال میں ہندوستانی آبادی کو یہ سیاسی حق دینا کسی عنوان سے جائز نہیں، اول تو وہ خود اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، دوسرے وہ یو، این، او میں اس معاملے کو پیش کر چکے ہیں اور بارہا جنوبی افریقہ کے مدبروں کو رسوا ہونا پڑا ہے۔ وزیر اعظم موصوف کو ہندوستانیوں سے یہ سخت شکایت ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو اس ملک میں ہمیشہ اجنبی ثابت کیا۔ ان کو اگر حکومت سے شکایات پیدا ہوئیں تو انھوں نے حکومت سے کبھی مرافعہ نہ کیا، بلکہ سیدھے ہندوستان کی راہ لی، بین الاقوامی ایوانوں کے دروازے کھٹکھٹائے؛ اور ہندوستان اور جنوبی افریقہ کے تجارتی تعلقات ختم کر دینا پڑے۔ دنیا بھر میں جنوبی افریقہ کو بدنام کیا، اس لئے وہ اگر اس ملک میں رہنا چاہیں تو ان کو پابندیوں کے ساتھ رہنے کی اجازت دی جائے گی۔ ان کو اپنے جداگانہ علاقوں میں رہنا پڑے گا، جہاں ان کی رہائش، طبی امداد اور تعلیم کا بندوبست کیا جائے گا، ان پر کوئی ظلم روا نہ رکھا جائے گا۔ لیکن پابندیاں ان پر ضرور عائد کی جائیں گی۔

مسٹر ڈانجس نے اپنی تقریر میں اور زیادہ شدت کا ثبوت دیا۔ ان کا خیال ہے کہ یہ مجوزہ طرز عمل ہندوستانیوں کو جلا وطن کرنے کے سلسلے میں پہلا قدم ہے۔ ان کے خیال میں ہندوستانیوں کو ووٹ کا حق دینے کے بعد ان کو جلا وطن کرنا محال ہو جائے گا۔ عارضی طور سے اس کا انتظام کیا جائے گا کہ ہندوستانی اپنی آواز حکومت تک پہنچا سکیں لیکن یہ آواز پارلیمنٹ صوبجاتی کونسل اور میونسپل بورڈ میں سنائی نہ دے گی۔ وزیر موصوف کا یہ بھی خیال ہے کہ ہندو اور مسلم علیحدہ علیحدہ اپنی جداگانہ مجالس کے ذریعے اپنے مطالبے حکومت تک پہنچائیں تو بہتر ہے۔ ہندو مسلم کی متحدہ جماعت یعنی جنوبی افریقہ کی نیشنل کانگریس کو حکومت قابل قبول تصور نہیں کرتی، بلکہ ہندو مسلم خلیج کو اور زیادہ وسیع کر کے اپنا کام چلانا چاہتی ہے۔ آگے چل کر اس کی اُمید کی جاتی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان سے کانفرنس کی صورت پیدا ہو اور ایسا ملک تجویز کیا جا سکے جہاں ہندوستانیوں کو جنوبی افریقہ سے بھیجا جا سکے، اور جہاں وہ آباد ہو سکیں۔

جنوبی افریقہ میں تو ہندوستانیوں کے لئے نئے ستم ایجاد کرنے کے یہ منصوبے باندھے جا رہے ہیں اور یو، این، او کی مجلس عامہ کے ایجنڈے میں وہ شکایت درج کر دی گئی ہے جو ہندوستان نے جنوبی افریقہ کے خلاف اس کے طرز عمل کے بارے میں کی ہے۔ اگرچہ جنوبی افریقہ کے ڈیلی گیٹ مسٹر ایرک لو نے اس کی دھمکی دی تھی کہ اگر ہندوستان کی یہ شکایت ایجنڈے میں داخل کی گئی تو پھر جنوبی افریقہ کی حکومت اس پر غور کرے گی کہ وہ اس مباحثہ میں شریک ہو یا نہیں۔ ڈیلی گیٹ موصوف کی وہی پرانی دلیل ہے کہ یہ معاملہ خانگی ہے۔ اسے یو، این، او کی دسترس سے باہر سمجھنا چاہئے۔ تقریر کے دوران میں فاضل مقرر نے اس پر زور دیا کہ خانگی معاملات میں مداخلت کرنا، یو، این، او کی بقا کے لئے مُضر ہو گا۔ مگر سر بی این راؤ نے جوابی تقریر میں کہا کہ یہ معاملہ ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء میں برابر زیر بحث رہ چکا ہے تو پھر اُسے ایجنڈے میں اب کیوں داخل نہ کیا جائے؟ بہر حال معاملہ ایجنڈے میں تو آ چکا ہے مگر اب دیکھنا یہ ہے کہ یو، این، او اس بارے میں کیا طرز عمل اختیار کرتی ہے کیا یو، این، او اس قدر طاقتور ہے کہ وہ جنوبی افریقہ کے اس دیرینہ اور ظالمانہ رویے کو تبدیل کر سکے گی؟ اس کے باور کرنے میں ہمیں بڑا تامل ہے، بہر حال اس سلسلے میں یو، این، او کی کارروائی کا مطالعہ بڑی دلچسپی سے کیا جائے گا۔

پاکستان

(بہ سلسلہ صفحہ ۵)

تعمیر کا سوال درپیش ہے۔ چیکو سلوواکیہ سے چھوٹی مشینوں اور اس طرح کی دوسری چیزوں کی دستیابی سے پاکستان کو بہت مدد ملے گی۔ چیکو سلوواکیہ کو جوٹ اور دوسری چیزوں کی ضرورت ہے جو پاکستان پوری کر سکتا ہے۔

ایک پریس کانفرنس میں پاکستان کے وزیر تجارت مسٹر فضل الرحمٰن نے بتایا کہ "تجارت کی بحالی ہمارے لئے ایک بہت ہی اہم مسئلہ بن کر رہ گئی ہے"۔ انھوں نے بتایا کہ باوجود اس کے کہ حکومت نے اس سلسلے میں بہت کوشش کی ہے۔ اسے اپنے مقاصد کے حصول میں پوری کامیابی حاصل نہیں ہوئی، پھر بھی کچھ نہ کچھ ضرور ہوئی ہے۔ فی الحال پاکستان کی اہم ترین اشیاء برآمد کے بیچنے میں کوئی دقت نہیں۔ جوٹ، روئی اور خام چمڑے کی جن میں پاکستان کی پوزیشن بہت اچھی ہے۔ اس وقت دنیا میں قلت ہے۔ لیکن دور تک سوچئے تو تجارت کی توسیع کا کام بغیر محنت کے نہیں ہو سکے گا۔ ضرورت اس کی ہوگی کہ دوسرے ملکوں کو پاکستان کی پیداوار سے روشناس کرایا جائے۔ اس سلسلے میں پاکستان کی حکومت مختلف ممالک میں اپنے تجارتی نمائندے متعین کرنے کے سوال پر سوچ بچار کر رہی ہے۔ تجارت کی ترقی کے لئے دوسری ضروری چیز ایک تجارتی بیڑے کا قیام ہے۔ فضل الرحمٰن صاحب نے بتایا کہ اس مقصد کے لئے حکومت ڈالر کی فراہمی میں زیادہ سے زیادہ سہولتیں دے رہی ہے۔ بحری تجارتی بیڑے کے افسروں کی تربیت کے لئے بھی حکومت ایک اسکیم تیار کر رہی ہے۔

(ا، س)

یورپ کے بھوت

(بہ سلسلہ صفحہ ۱۱)

کرنے میں ہیری کو دشواری پیش آتی ہے۔ لیکن ان کی بابت بھی وہ کوئی قطعی رائے نہیں دیتے صرف یہ کہتے ہیں کہ مری سمجھ اور علم اس واقعہ کی توجیہہ کرنے سے قاصر ہے۔

اب آپ ہی بتائیے کہ اس بیسویں صدی میں اگر کوئی قوم ایسی مہمل اور بے بنیاد باتوں پر یقین رکھے تو اسے کیا کہئے گا۔ ہندوستانی تو خیر توہم پرست مشہور ہی ہیں، لیکن انگریز قوم بھی جس نے ہر قسم کی ترقی کر لی ہے ابھی تک لاطائل خیالات سے پیچھا نہیں چھڑا سکی ہے۔

یورپ کے بھوت

عبدالحلیم ندوی

یورپ نے جو علمی، فنی، سائنسی اور میکانکی ترقی کی ہے اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ کتنی عبرت ناک حقیقت ہے کہ باوجود ان کمالات اور روز افزوں ترقیوں کے ابھی تک یہ قوم صدیوں پہلے کے طلسماتی اوہام اور خیالی عفریتوں کے چنگل سے نہیں نکل پائی ہے اور ابھی تک اس کے یہاں نہ صرف بھوتوں پریتوں کے وجود کو تسلیم کیا جاتا ہے بلکہ ان کے لئے حفاظتی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں اور اس کام کے لئے انجمنیں بنائی جاتی ہیں۔ ذیل میں یورپ کے بھوتوں کے قصے ان کا تاریخی پس منظر اور ان کی حقیقت پیش کی جاتی ہے۔

لندن ایوننگ نیوز نے چند مہینے ہوئے ایک خبر شائع کی تھی کہ "ونڈسر پارک" میں رہنے والا شکاری ہرن نامی بھوت دوبارہ ظاہر ہوا ہے۔ واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ پارک کی رہنے والی ایک عورت اس جنگل سے کچھ رات گئے گزر رہی تھی کہ دفعۃً اسے کچھ دور پر ایک گھڑسوار کا سایہ ہلتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اس کی طرف لپکی لیکن جوں ہی قریب آئی گھڑسوار ایک مجنونانہ قہقہے کے ساتھ غائب ہو گیا۔ اس کے غائب ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد اس نے شکاری کے قرنا کی آواز سنی۔

اہل مغرب کے بھوتوں کے عقیدے کی بابت کچھ کہنا بیکار ہے۔ کیونکہ ان کے یہاں بھوتوں کی اتنی ہی کثرت ہے جتنی امریکا میں دیمک کی۔ اور کم و بیش دونوں سے ایک ہی سے نتیجے نکلے ہیں۔

بھوت عموماً پرانے مکانات، گرے پڑے کھنڈرات میں رہتے ہیں اور جب کسی جگہ ایک مرتبہ ان کا قبضہ ہو جاتا ہے تو مشکل ہی سے وہاں سے ہٹتے ہیں۔

برطانیہ میں جنگ کے بعد ان کی بڑی کثرت ہو گئی ہے۔ پہلے تو ہرن جیسے اکیلے رہنے والے بھوتوں کی سارے یورپ میں کثرت تھی۔ لیکن سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ اب وہ بندروں کے غول کی طرح دکھائی دینے لگے ہیں۔ چنانچہ ابھی کچھ ہی دن ہوئے سینٹ ڈنسٹن کے ایک ممتاز پادری ریورنڈ اینٹن اسٹیفنس نے بتایا کہ انھوں نے اس قسم کے ایک عفریتی غول کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

اسیکس کے مقام پر بورلے ریکٹری نام کا ایک قلعہ ہے۔ کہتے ہیں یورپ بھر میں سب سے زیادہ بھوت یہیں رہتے ہیں۔ حال ہی میں انگریزی اخبارات نے ان بھوتوں کے بہت سے دلچسپ قصے شائع کئے تھے۔ بورلے میں جو بھوت رہتے ہیں ان میں دو سر کٹے کوچوان ایک نن اور ایک گاڑی بہت مشہور ہے جس میں دو گھوڑے جتے رہتے ہیں اور دوسرا پر ایک عورت بیٹھی ہوئی یہ چلایا کرتی ہے کہ "یہ مت کرو کارلوس۔ یہ مت کرو"۔ بورلے ریکٹری کی عمارت سنہ [illegible] میں بنی تھی اور اس وقت سے لے کر سنہ [illegible] تک اس کے قریب رہنے والے سب لوگوں کو یہاں بھوت دکھائی دیتے تھے۔ پھر اس میں آگ لگ گئی وہ تباہ و برباد ہو گئی۔ وہاں کے رہنے والوں کا کہنا ہے کہ جس وقت مکان جل رہا تھا تو ایک سر کٹی [illegible] لڑکی نے باہر جھانک رہی تھی اور دو لبادہ پوش آدمی اس کے باغ میں گھوم رہے تھے۔

یوں تو یورپ میں بھوتوں کا عقیدہ عہد وسطیٰ میں ہی اچھی طرح پھیل گیا تھا۔ لیکن اس کی تکمیل اٹھارھویں صدی میں ہوئی اور اس میں ریڈ کلف اور والپول کی گاتھک رومانی کہانیوں کو بہت دخل ہے۔ ان کے بعد اسکاٹ، ڈکنس، اور پھر ولیو راج اور کونن ڈائل اور بھوت کلب نے جس کی بنیاد سنہ [illegible] میں پڑی تھی اور اس کو حال ہی میں دوبارہ زندہ کیا گیا ہے، تو ان بھوتوں کا معاملہ بہت بڑھا دیا۔

جزیرہ برطانیہ کا سب سے مشہور بھوت ملکہ الزبتھ کے بچپن کے محل گلامس کاسل کا بھوت ہے۔ اس بھوت کو محل میں قیام کرنے والے تمام مہمانوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ عموماً یہ ایک لال بالوں والے دیو کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔

لیکن کیتھرین ہاورڈ نام کا ایک نامی بھوت تو گلامس کے تذکرہ بھوت سے بھی بڑھ گیا ہے۔ کیتھرین ہاورڈ کو ہنری ہشتم نے اس جرم میں قتل کرا دیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ بدمزاجی سے پیش آتی تھی۔ چنانچہ ملکہ کو جب اپنے فرمان قتل کی خبر ملی تو ایک دن وہ پہرے داروں کی نظر بچا کر بھاگ نکلی کہ بادشاہ سے حقیقت حال بتا کر اپنی سزا معاف کرا لے۔ لیکن عین موقع پر اس کو پہرہ داروں نے پکڑ لیا اور گھسیٹتے ہوئے اس کو مقتل میں لے گئے وہ بے چاری چیختی چلاتی رہی لیکن انھوں نے ایک نہ سنی اور اس کو قتل کر دیا۔ چنانچہ اس تاریخ سے میں اکثر اس کی روح اسی انداز سے چیختی چلاتی ہیمپٹن کورٹ محل دکھائی دیتی ہے۔

ڈروری لین تھیٹر کا بھوت کئی باتوں میں دوسروں سے بڑھ گیا ہے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ وہ ہمیشہ دن کو نکلتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ وہ نہ کسی کو ڈراتا ہے اور نہ ستاتا ہے۔ اس بھوت کو بھی سینکڑوں آدمیوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے جن میں ڈروری لین کے ممتاز مورخ میکن پوپ بھی شامل ہیں۔ وہ اپنے عینی مشاہدہ کی بنا پر کہتے ہیں کہ ڈروری لین کا یہ بھوت متوسط قد کا آدمی ہے، اور بھورے رنگ کا ایک سواری کا لبادہ پہنے اور ایک تکونہ ہیٹ لگائے رہتا ہے۔

لارڈ نلسن کی معشوقہ لیڈی ہملٹن نامی بھوت کو کیمبرج اسکوائر کے مکان نمبر ۲ میں رہنے والے لوگ یورپ کے سب بھوتوں میں سب سے زیادہ حسین سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ لیڈی ہملٹن جب ایک انداز دل ربا سے کوٹھے پر ٹہلتی ہے تو جیتے جی سے کہیں زیادہ حسین اور جاذب نظر معلوم ہوتی ہے۔ بس اس میں ایک بڑی بری عادت ہے اور وہ یہ کہ ہم لوگ تو دروازے بند کر کے چلے جاتے ہیں وہ انھیں چوپٹ کھول کر چل دیتی ہے۔

تاریخی ہستیوں کی روحیں جو اب بھوت بن گئی ہیں ان گنت ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام بلیک پرنس ہے۔ یہ بھوت بنگسلے کے قریب ہال پیلس میں رہتا تھا، اور پہلی جنگ عظیم میں برطانیہ کی شکست سے پہلے اس کو تین مرتبہ دیکھا گیا تھا۔ اس قسم کے دوسرے بھوت کو سر فرانسس ڈریک کہتے ہیں۔ یہ بھوت ڈارٹمور میں دو سر کٹے گھوڑوں کی گاڑی پر نکلتا ہے، گاڑی کے پیچھے پیچھے کتے بھاگتے رہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کتوں کے بھونکنے سے زندہ کتے تڑپ تڑپ کر مر جاتے ہیں۔ تیسرا تاریخی بھوت ڈک ٹرپن مشہور ڈاکو ہے۔ یہ بھوت لاکنگٹن کے قریب ٹیمپل ہل میں گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے سال میں تین مرتبہ دکھائی دیتا ہے۔

چنانچہ آخری مرتبہ جولائی سنہ [illegible] میں بلیڈی نامی ایک شخص کے مکان میں یہ بھوت دیکھا گیا تھا۔ اس نے حکومت کو درخواست دی تھی کہ چونکہ میرے گھر پر بھوتوں کی کثرت ہو گئی ہے اس لئے کرایہ دار بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور مجھے سخت نقصان ہوتا ہے۔ اس لئے مکان کے موجودہ ٹیکس میں کمی کر دی جائے۔ بھوتوں کی تفصیل بتاتے ہوئے اس نے لکھا تھا کہ یہ چند ڈاکوؤں کی روحیں ہیں جن کو ٹرپن نے پکڑا تھا اور ان کے جرم کا انکشاف [illegible] نہ کیا تو وہ بھی اس کے جرائم کو پوشیدہ رکھیں گے۔

انگلستان میں اگر کسی گھر کے متعلق یہ معلوم ہو جائے کہ اس میں بھوتوں کا اڈہ ہے تو اس کی قیمت گر جاتی ہے۔ دراصل قیمت کا گرنا بھوتوں کے برتاؤ پر منحصر ہے پھر بھی ایسے بدنام گھروں کے کرائے میں کچھ نہ کچھ کمی ضرور ہو جاتی ہے اسی لئے اب اگر کوئی کسی گھر کے متعلق بھوتوں کی خبر اڑائے تو قانوناً اس سے ہرجانہ وصول کیا جا سکتا ہے۔

جانوروں میں عموماً گھوڑے کی شکل کے بھوت انگلستان میں زیادہ پائے جاتے ہیں اور اکثر ان کے اور ان کے سواروں کے سر ندارد ہوتے ہیں۔ گھوڑوں کے بعد کتوں اور بلیوں کی شکل کے بھوتوں کا نمبر ہے۔ چنانچہ اس قسم کا ایک لمبا چوڑا جھبرے بالوں اور نرم پاؤں کا ٹرینس یا سٹرکر نامی کتا برسوں سے دیکھا گیا ہے۔ یہ کتا کبھی قصبے سے کچھ آگے اور کبھی کچھ پیچھے نظر آتا ہے۔ اور جب چلتا ہے تو اس کے پاؤں سے چھپ چھپ کی آواز نکلتی ہے جیسے کوئی پانی سے گزر رہا ہو۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ جو کوئی اس کو دیکھ لے بہت جلد مر جاتا ہے۔

انگلستان میں سب سے بڑے بھوتوں کے عامل ہیری پرائس جو [illegible] سال سے بھوتوں کی تحقیق کا کام کرتے ہیں۔ ان کے [illegible] کو نہیں ملتے۔ انھوں نے اپنے صرف سے ایک بہت اچھا معمل بنایا ہے جہاں وہ ان اطلاعوں کی جو بھوتوں کے متعلق ملتی ہیں تحقیق کرتے ہیں۔ اس معمل پر سالانہ ۱۸ ہزار خرچ ہوتے ہیں۔ بھوتوں کے واقعات کی کثرت کا یہ عالم ہے کہ ان کے پاس ہر ہفتہ کم و بیش ۲۵ اس قسم کے خطوط آتے ہیں۔ انھوں نے انگلستان کے ہر ضلع میں اپنے شاگرد اور کارندے رکھ چھوڑے ہیں جن کی مجموعی تعداد ایک سو سے زیادہ ہے۔ جہاں کسی واقعہ کی اطلاع ملی وہ فوراً مقامی کارندہ کو اس کی اطلاع کرتے ہیں کہ وہ اس کی تفتیش کرے اگر مقامی کارندہ واقعہ کی تصدیق کرتا ہے تو ہیری خود اپنے معمل میں اس کی تحقیق کرتے ہیں چنانچہ بیان کردہ [illegible] واقعات میں سے کہیں ایک ایسا نکلتا ہے جس میں ہیری کو تحقیق کرنی پڑتی ہے اور ایسے واقعات میں صرف ایک فی صدی ایسے ہوتے ہیں جن کی [illegible] توجیہ

ہفتہ وار نئی روشنی دہلی

ادارۂ تحریر

ڈاکٹر سید عابد حسین ۔ صالحہ عابد حسین ۔ عبدالحلیم ندوی

تاریخ اشاعت: یکم ، ۸ ، ۱۶ ، ۲۴

چندہ: سالانہ ۶ ششماہی ۳

چچا چھکن نے کھانا پکوایا (بسلسلہ صفحہ ۹)

چچا کا ذہن بیا فوراً مچان کی طرف منتقل ہوا۔ اتارو اس پر سے سینیاں اور خوان ابھی میں سب چیزیں تل کر رکھی جائیں گی۔ چمن غریب اوپر چڑھ کر چھی کے جہیز کے بھاری بھاری تین خوان اتار کر لایا ایک میں شکر رکھی، دوسری میں دالیں۔ دال بھی چچا نے سیر بھر تلوائی تھی ۔۔ چچا بولے " ارے یہ اندھیرا کیوں ہو گیا ۔۔ شاید بادل ہے ۔۔

۔۔۔ ذرا بجلی کا بٹن تو دبا دو۔ چمن نے اٹھ کر بٹن دبا دیا، ساری کوٹھری روشن ہو گئی۔ چمن نے گھبرا کر کہا" میاں رات تو ہو گئی، اب یہ اتنا بہت سا کھانا پکے گا کب؟ چچا چیں بجبیں ہو کر بولے ۔۔ رات ہو گئی تو ہمارا کیا قصور تو ہی ایسا کاہل سستی پوستی، دو بجے سے یہ وقت آ گیا، اب تک ذرا سی جنس نہ تولی جا سکی ۔۔ ہم خود پریشان ہو گئے سر میں درد ہو رہا ہے، پاؤں زخمی ہو چکا ہے چلو ۔۔ اٹھو دو سیر گھی بھی تول لو پھر پکانا شروع کریں"۔ چمن نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا " دو سیر گھی؟" چچا بگڑ گئے " ہاں دو سیر گھی ۔۔۔ ٹھیا! دیکھی کا بچہ بنا ہے ہر بات پر اعتراض کرتا ہے گویا ہم سے زیادہ جانتا ہے ۔۔۔۔۔ پاؤ بھر گھی کسی کے کس کھیل میں نہ پڑے ہنڈیا میں تو بھلا بچوں میں طاقت کیا آئے گی؟ ہمیں بھی کوئی شٹ پو سمجھا ہے، کنجوس، مکھی چوس سمجھا ہے جو چھٹانک بھر گھی ڈالیں؟ پڑھنے والے بچے، پھر ہم خود دماغی کام کرنے والے اتنا گھی بھی نہ کھائیں تو کیسے کام چلے۔ وہ تمہاری چچی ہمیشہ پاؤ بھر گھی کس کس میں ڈالتی ہیں، جب تو سالن میں انگلیوں سے اشارہ کرتے ہوئے، یہ بھی کچھ ہوتا ہے۔ چمن سخت پریشان تھا۔ آنسو، پسینے میں شرابور، چاروں طرف چیزوں کا انبار، سر کھجاتے چچا کی ڈانٹ سن رہا تھا۔ بھرائی آواز میں بولا " اللہ گھی تول کر رکھوں کس میں؟"

اچھا، چچا خیر تم یہ سب چیزیں باورچی خانے میں لے جا کر رکھو گھی کا ڈول ہم وہاں لئے آتے ہیں، پکاتے جائیں گے، ڈالتے جائیں گے۔"

چمن نے لمبا سا سانس لیا اور آٹے، دال، چاول، شکر وغیرہ کی بھری بھری سینیاں لے جا کر باورچی خانے کے سامنے رکھنی شروع کیں۔

چچا نے گھی کا ڈول ہاتھ میں لٹکایا اور رسی سے اٹھ کر لنگڑاتے ہوئے باہر نکلے ۔۔۔ ۔۔ باورچی خانے کے سامنے کشتی اور سینیوں کی لائن اور ان میں ڈھیروں سامان دیکھ کر کسی قدر جھنجھلائے ۔ چمن سے کچھ کہنے والے تھے کہ ٹن ٹن گھنٹے نے آٹھ بجائے ۔ چچا نے گھبرا کر کہا " ارے تو گویا سچ مچ رات ہو گئی ۔۔۔۔۔ آٹھ بج گئے ۔ ۔ چمن بھی تو بڑے پوستی ۔۔ بات پوری نہ کرنے پائے تھے کہ دروازے میں قدموں کی آواز آئی، اور چچا کی نظر جو اٹھی تو کیا دیکھتے ہیں کہ گھر کے سب پیچھے چچی چلی آ رہی ہیں ۔ چچا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا گھی کا ڈول ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر اوندھا گیا اور صحن بھر میں گھی کا دریا بہنے لگا ۔۔ چچا چند منٹ منہ لئے مبہوت کھڑے رہے اور پھر تیزی سے باہر دیوان خانے میں ! کمرہ اندر سے بند کر کمبل اوڑھ کر لیٹ رہے۔

کشمیر کا خط (بسلسلہ صفحہ ۲)

مجاہدین اسلام کے ساتھ سرکاری دفاتر میں دوسری جماعت مہاراجہ بہادر کے ڈوگرہ اور برہمن دوست ہیں! اور یہ دونوں جماعتیں اپنی اپنی جگہ صدق دل سے عوامی حکومت کے شدید ترین مخالف ہیں۔ لیکن فرماں برداری اور تابعداری کا حق پوری چاپلوسی سے ادا کرتے ہیں! مسلمان مجاہدین پوری منافقانہ شان سے پاکستان کے خلاف لڑنے کے لئے رضاکارانہ خدمات کی پیشکش کرتے ہیں! ڈوگرہ اور برہمن پر مہاراجہ کو برسر اقتدار کرنے کے لئے اسی منافقانہ شان سے ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے ہیں! لیکن ادھر پاکستان کی عنایت اور ادھر ہندوستان کے مہاراجہ نواز ہندوؤں کی عنایت سے دونوں گروہوں کو اپنی اپنی جگہ اب تک یکسوئی حاصل نہیں ہے، اور یہ لو اب تک لگی ہے کہ شاید پھر کشمیر کی کایا کوئی پلٹ دے! اور کشمیر پر گویا بیک وقت پاکستان کا پرچم بھی لہرائے اور مہاراجہ بہادر کا اقتدار بھی از سر نو قائم ہو جائے! اسی لئے یہ حضرات اندرونی طور پر شیخ عبداللہ کی عوامی حکومت کے ترقی پسند پروگرام کو دل ہی دل میں کوستے ہیں اور ساتھ ساتھ حق تابعداری بھی ادا کرتے ہیں! اپنی حکومت کے خلاف بڑی دیانت داری کے ساتھ ہر غلط الزام کو بھی صحیح تسلیم کرکے دل ہی دل میں رائی کا پہاڑ بنا دیتے ہیں! اور حکومت کی ہر پریشانی پر خوش ہوتے ہیں اور بغلیں بجاتے ہیں۔

مجھے اس طبقہ کے کچھ ممتاز لوگوں سے ملنے کا موقع ملا۔ بنڈتوں نے تو خیر رک رک کر اور دب دب کر شکایتیں کیں اور اپنا مستقبل تاریک بتایا! اور ایسا معلوم ہوا کہ ہندوستان بھاگنے کی فکر دامن گیر ہے!

"مجاہدین اسلام" نے بلا کسی انکسار اور تکلف کے فوراً ہی شیخ عبداللہ اور عوامی حکومت کے خلاف ادھر ادھر دیکھ کر اعلان جہاد کر دیا اور اسی دم اپنی تیغ زبان سے کشمیر کو فتح کر کے پاکستان کے حوالے کر دیا! اس کے بعد کھانے اور چائے کی پر تکلف ضیافت دیر تک رہی اور پھر نجی اور غیر رسمی گفتگو میں مجھے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کو بھی پاکستان بھاگنے کی فکر دامن گیر ہے، اور سمجھتے ہیں کہ اب کشمیر میں کسی پاکستانی کا کوئی مستقبل نظر نہیں آتا ہے! بوڑھے تو خیر کہیں جانے کی ہمت ہی نہیں۔ کہتے ہیں مگر نوجوان مجاہدین اسلام البتہ کسی نہ کسی بہانے سے راہ فرار تلاش کر رہے ہیں اور بلاوجہ مصیبت اور ہلاکت میں اپنی جان ڈالنا احکام اسلام کے خلاف سمجھتے ہیں۔

مشرقی دنیا (بسلسلہ صفحہ ۶)

الگ بلاک بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں، اس نئی جتھہ بندی کا شوشہ چھوڑنے کا سہرا مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ کے نمائندوں کے سر ہے اور اس کے ساتھ سارے عرب ملکوں کا بھی اس میں شامل ہیں، اس جتھہ بندی کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ سیکورٹی کونسل میں شام کی جگہ ان کا کوئی نمائندہ منتخب ہو دوسرا مقصد یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس گروہ کے ہاتھ میں بارہ ووٹ ہیں، اگر یہ مل کر کام کریں تو جنرل اسمبلی کے فیصلوں پر خاصا اثر ڈال سکتے ہیں، ایک خبر یہ بھی ہے کہ اس بلاک کے بنانے میں ان ملکوں کی اس خواہش کو بڑا دخل ہے کہ وہ اپنے معاشی مسائل کو مشترکہ کوشش کے ذریعے حل کریں۔ اگر یہ بات صحیح ہو تو اس کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار اس پر ہوگا کہ اس کی بنیاد میں ڈالر کی کتنی مقدار لگے گی۔ آج کل معاشی تعمیر کا کام سبھی لوگ ڈالر کے ذریعے کرنا چاہتے ہیں، دوسرا طریقہ ذرا مشکل ہے اور محنت چاہتا ہے اور جمہوریت گواز سیاست داں شاید محنت سے گھبراتے ہیں۔

(ا ۔ م ع)

پرچہ نہ ملنے کی صورت میں

کاغذ کی قلت کی وجہ سے "نئی روشنی" کی زائد کاپیاں بہت کم تعداد میں چھپتی ہیں۔ اس لئے اگر اتفاق سے کوئی پرچہ کسی صاحب کو نہ ملے تو براہ کرم ایک ہفتہ کے اندر اندر اس کی دفتر کو اطلاع کر دیں۔ ورنہ ممکن ہے مطلوبہ پرچہ ان کو نہ مل سکے۔

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی دہلی نے جامعہ پریس دہلی میں چھپوایا

مطبوعہ جدید پریس، دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۱ نمبر ۱۹ | یکم نومبر ۱۹۴۸ء | ایڈیٹر: ڈاکٹر سید عابد حسین

سرسید کا قوم پروری کا دور

ڈاکٹر راجندر پرشاد

۱۸۵۷ء کے غدر میں سرسید احمد خاں نے بہت مصیبت جھیلی تھی اور باغیوں کے ہاتھوں پریشان ہوئے تھے اور انھوں نے باغیوں کے خلاف انگریزوں کی مدد بھی کی تھی۔ ان کے دل پر اس بربادی کا بڑا اثر ہوا جو مسلمانوں کی ہوئی تھی۔ پھر انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ مسلمان انگریزوں سے ناواقفیت کی بنا پر ملازمتوں سے نکالے جا رہے ہیں وہ ایک قوم پرور شخص تھے۔ اور ان کا اعتقاد یہ تھا کہ ہندو اور مسلمان ایک متحدہ قوم ہیں اور اس قوم کو وہ ہندو قوم کہا کرتے تھے، کیونکہ ہندو اور مسلمان دونوں کا وطن ہندوستان تھا۔ اس لئے اپنے ابتدائی زمانے میں ان کی تحریریں اور تقریریں ہمیشہ قوم پرورانہ رہیں، اور ہندو اور مسلمان دونوں انھیں اپنا قومی لیڈر تسلیم کرتے تھے۔ وہ بالکل جائز طور پر یہ خواہش رکھتے تھے کہ مسلمانوں کی حالت میں ترقی ہو اور بالخصوص اس بات کے لئے کوشاں تھے کہ مسلمانوں کے لئے تعلیمی آسانیاں مہیا کی جائیں۔ انھوں نے مختلف مقامات پر جہاں جہاں وہ ملازمت کے سلسلے میں گئے، اسکول قائم کرنے میں مدد دی، اور ان میں سے بعض ابھی تک چل رہے ہیں۔ ان کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ انگریزی راج ہی قوم کے لئے بھلائی ہے اور اس حکومت میں جو نقائص ہیں اب حکام کو جتانے کی ضرورت ہے تاکہ وہ خرابیاں دور کر دی جائیں۔ ان کے اس اعتقاد میں اس زمانے کے تمام لیڈر شریک تھے حتیٰ کہ وہ بھی جنھوں نے انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھی۔ ان کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ نسل یا رنگ کی بنا پر یورپین اور ہندوستانی میں کوئی فرق نہ ہونا چاہیے اور سرکاری ملازمتوں کے معاملے میں یہ تفریق نہ برتی جانی چاہیے، اور یہ امتیاز سماجی تعلقات اور سیاسی دستوری حقوق کے بارے میں بھی نہ ہونا چاہیے۔ اسی بنا پر انھوں نے "البرٹ بل" کی وائسرائے کی کونسل کے ممبر کی حیثیت سے حمایت کی تھی اور آگرے کے دربار کے موقع پر وہ صرف اس وجہ سے اٹھ کر باہر چلے آئے تھے کہ وہاں یورپین لوگوں کے لئے تو ڈائس پر کرسیاں بچھائی گئی تھیں اور ہندوستانیوں کے لئے ڈائس سے نیچے۔ انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی تھی جس کے ممبر ہندو اور مسلمان دونوں تھے اور جس میں مقالات پڑھے جاتے تھے۔ "تہذیب الاخلاق" میں انھوں نے اس طرح لکھا ہے:۔

"کوئی قوم اس وقت تک قدر و منزلت حاصل نہیں کر سکتی ہے جب تک کہ وہ حکمران قوم کی برابری نہ حاصل کرے، اور جب تک کہ وہ اپنے ملک کی حکومت میں حصہ نہ لے۔ دوسری قومیں مسلمانوں اور ہندوؤں کی اس بات کے لئے عزت نہیں کر سکتیں کہ وہ محرری کی یا اور کسی ادنیٰ درجہ کی ملازمت پر متعین ہیں، اور بلکہ وہ حکومت بھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھی جا سکتی جو اپنی رعایا کی جائز عزت افزائی نہ کرے۔ عزت اسی وقت ہمیں حاصل ہو سکے گی جب میرے ہم وطن انھی رتبوں اور عہدوں پر فائز ہوں گے کہ جیسے حکمران قوم کو حاصل ہیں۔ حکومت نے سچے دل سے اور خلوص نیت کے ساتھ اپنی رعایا کو ہر ملک میں یہ حق دیا ہے کہ وہ اس برابری کے درجے کو پہنچیں، لیکن ہندوستانیوں کے راستے میں بہت سی رکاوٹیں ہیں۔ ہمیں عزم اور استقلال کے ساتھ کام کرتے رہنا چاہیے اور اس خوف سے کہ مبادا ہم پر کوئی مصیبت نازل ہو ہمیں قدم پیچھے نہ ہٹانا چاہیے۔"[1]

۱۸۸۳ء میں جبکہ "لوکل سیلف گورنمنٹ بل" کونسل میں پیش ہوا تھا تو انھوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ چونکہ ہندوستان میں مختلف مذہبوں کے اور مختلف رسم و رواج کے لوگ آباد ہیں اس لئے ضروری ہے کہ بورڈ کی کچھ نشستیں حکومت کی نامزدگی کے ذریعے پر کی جائیں اور بہت پایہ کہ ایک تہائی نشستیں اس طریقے پر پُر کی جانی چاہئیں، تاکہ ایسے ممبروں کو حکومت منتخب کرے کمی پوری کر دے جو کسی مخصوص فرقے کے نمایندے تھے لیکن انتخابات میں نہیں آئے ہیں۔ قابل لحاظ بات یہ ہے کہ انھوں نے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ مسلمانوں کے لئے نشستیں مخصوص کر دی جائیں یا یہ انتخابات جداگانہ ہوا کریں اور ظاہر ہے کہ وہ ایسا مطالبہ کر بھی کس طرح سکتے تھے جبکہ ان کا خیال یہ تھا کہ ہندو مسلمان مل کر ایک قوم ہیں، اور ان کا یہ اعتقاد ذیل کی سطروں سے جو ان کی تحریرات کا اقتباس ہیں اچھی طرح ظاہر ہوتا ہے:۔

"لفظ قوم کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا ہے جو ایک ہی ملک میں بستے ہوں ... یاد رکھیے ہندو اور مسلمان مذہبی نام ہیں، ورنہ ہندو اور مسلمان اور عیسائی بھی جو اس ملک میں بستے ہیں [illegible] مل کر ایک متحدہ قوم [illegible] میں شامل ہیں [illegible] ایک قوم ہیں تو [illegible] ملک کو نفع پہنچانے کی سب کو نفع پہنچانے والی ہوگی۔ اب وہ وقت گیا کہ صرف مذہب کے اختلاف کی بنا پر [illegible] الگ قومیں تصور کیا جاتا تھا۔"[1]

ایک دوسرے موقع پر انھوں نے یہ کہا ہے:۔

"جس طرح آرین لوگوں کو ہندو کہا جاتا ہے بالکل اسی طرح اسی معنی میں مسلمان بھی ہندو یعنی ہندوستان کے رہنے والے ہیں۔"[2]

پنجاب کے ہندوؤں کو مخاطب کر کے انھوں نے کہا کہ:۔

"اپنے لئے آپ نے لفظ ہندو جو استعمال کیا ہے میرے خیال میں وہ صحیح نہیں ہے کیونکہ میری رائے میں یہ مذہب کا نام نہیں ہے۔ ہندوستان کا ہر باشندہ اپنے آپ کو ہندو کہہ سکتا ہے۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ لوگ مجھے ہندو نہیں کہتے، حالانکہ میں بھی آپ کی طرح ہندوستان کا باشندہ ہوں۔"[3] (ہندوستان کا مستقبل)

فہرست مضامین

[1] طفیل احمد کی کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" صفحہ ۲۸۳ ماخوذ از مجموعہ لکچر سرسید احمد صفحہ ۱۶۷
[2] اسی کتاب کا صفحہ ۲۸۳ ماخوذ از "سرسید کے آخری مضامین" صفحہ ۵۵
[3] " " ۲۸۳ "سفرنامہ پنجاب" سرسید احمد " ۱۳۹

[1] ماخوذ از طفیل احمد کی کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" صفحہ ۲۸۱، ۲۸۲

قیمت فی پرچہ ۲ر

آزادِ تعلیم کا ایک تجربہ

ڈاکٹر ذاکر حسین

(جامعہ ملیہ کی اٹھائیسویں سالگرہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو منائی جارہی ہے۔ اس موقع پر ہم شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے اس خطبے کا ایک حصہ ناظرین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں جو موصوف نے جامعہ جوبلی کے موقع پر پڑھا تھا۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جامعہ ملیہ کی امتیازی خصوصیت کیا ہے۔)

جامعہ نے جو پہلے دن سے سرکاری اثر سے آزاد رہنے کا اعلان کر چکی تھی یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ کسی سیاسی جماعت کی تابع بھی نہیں ہے۔ ذہنی کام کی آزادی اور خود مختاری کا اصول سیاست کی دھوپ چھاؤں سے بے تعلقی، آنی اور وقتی منصوبوں اور پائدار اور دیر طلب کاموں میں مؤخر الذکر کی اہمیت کا اقرار، یہ ہمیشہ کے لئے جامعہ کی زندگی میں راسخ ہو گئے اور اگرچہ بسا اوقات اس سے بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں لیکن یک سوئی سے اس موقف پر قائم رہ کر ہم نے نکتہ چینوں کو بھی، ان کی نکتہ چینی کا فیصلہ حق جیسے بغیر مطمئن کر دیا کہ سیاست سے ہماری یہ دامن کشی نہ بزدلی ہے نہ بے ایمانی بلکہ ایک صبر طلب تعمیری کام کے تقریباً منطقی تقاضوں میں سے ہے۔ سیاست خصوصاً ہمارے ملک میں ایک پہاڑی نالا ہے آنا فاناً چڑھتا ہی اور دیکھتے دیکھتے اتر جاتا ہے، تعلیمی کام ایک دھیمے دھیمے بہنے والا ایک میدانی دریا ہے جو برسات ہی میں نہیں بہتا، گرمی میں بھی پہاڑوں کے برف جیسے دل کو پگھلا کر اپنی روانی کا سامان پیدا کرتا ہے۔ سیاست استحکامِ وجود قومی کی تمنا ہے، فطرتاً بیتاب؛ تعلیم اقدار رفیعہ کی عاشقی ہے، لازماً صبر طلب؛ تعلیم ان اعلیٰ اقدار کو تازہ اور شاداب رکھتی اور بیدار کرتی ہے، سیاست ان کی تنظیم کرتی ہے اور حفاظت؛ اس لئے وہ مخدوم ہے اور یہ خادم۔ سیاست شدت چاہتی ہے، تعلیم ہمت، سیاست کے پروگرام آئے دن بدلتے رہتے ہیں، تعلیم کا پہلا منصوبہ ہی اتنا ہمہ گیر ہے کہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس کی منزل پہنچنے کے لئے نہیں ہے، راہرو کا رخ متعین کرتی ہے ع

طلالِ عالمیاں دم بدم دگرگوں است
منم کہ مدتِ عمرم بیک طلال گذشت

بہرحال جامعہ نے اپنی اب تک کی زندگی میں تعلیم کو تمام غیر تعلیمی خارجی اثرات سے جو تعلیمی آزادی میں حائل ہوں محفوظ رکھنے کو اپنا اصول جانا ہے اور امید ہے کہ آنے والے دور میں اگر شاید تنگ دستی کی جگہ وسائل کی فراوانی کا دور ہو، اور رک رک کر آگے بڑھنے کی جگہ جلد جلد قدم اٹھانے کا موقع ملے، جامعہ کے کارکن اس اصول کو ہاتھ سے نہ دیں گے۔

غرض قومی زندگی میں تعلیم کی مرکزی حیثیت اور اس اہم وظیفے کو کما حقہٗ ادا کرنے کے لئے آزادی کی ضرورت ہم پر آغازِ کار ہی میں روشن ہو گئی تھی۔ اس وظیفہ کو ادا کرنے اور اس آزادی کو خالی منفی آزادی نہیں بلکہ عمل کی مثبت آزادی میں منتقل کرنے کا کام بڑا دشوار تھا۔ اس دشواری میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ جب بعض مجبوریوں کے باعث خواجہ صاحب شیخ الجامعہ کے عہدہ سے سبکدوش ہو گئے، اور پھر کچھ عرصہ بعد حکیم اجمل خاں صاحب کا سایہ ہمارے سر سے ہٹ گیا۔ اس جگہ جامعہ کی زندگی کے ایک خاص واقعہ کا ذکر مناسب ہوگا، اس سے جامعہ کے کام کی روح اور اس کے اسلوب کار پر روشنی پڑتی ہے۔ حکیم صاحب کے انتقال کے بعد ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری ہمارے امیر مقرر ہوئے۔ ان کی محبت اور شفقت ان کی فراخ دلی اور انسانی ہمدردی۔ ان کی برائی سے بیزاری اور نیکی کی ہر رنگ میں اعانت کا جذبہ ہم کارکنوں کی تربیت میں اپنا اثر چھوڑ گیا ہے اور ہم شکر گزاری کے ساتھ ہمیشہ اسے یاد رکھیں گے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے امارت جامعہ کا کام جب سنبھالا تو ہماری مالی حالت بہت سقیم تھی۔ شروع شروع میں جامعہ کے تمام مصارف کا بار جمعیۃ خلافت اٹھاتی تھی، لیکن سیاسی دریا کے اتار نے اس صورت کو ممکن نہ رکھا۔ حکیم صاحب تنہا اپنی ذاتی کوشش سے جامعہ کے کام کے لئے وسائل فراہم کرتے تھے۔ آخری زمانے میں مسلسل علالت اور غیر معمولی مصروفیت کے باعث ماہ بماہ فراہمی زر کے کام میں خلل پڑتا رہا، اور جب حکیم صاحب سدھارے تو جامعہ پر خاصا قرض تھا۔ ہم کارکنوں کو حتی کہ ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم تک کو یہ علم نہ تھا کہ حکیم صاحب کہاں سے ہمارے لئے روپیہ فراہم کرتے تھے۔ جب وہ رخصت ہو گئے تو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ میں نے خود ڈاکٹر انصاری کے مشورے سے ان کی خدمت میں ایک مراسلہ بھیجا کہ جامعہ کے کام کو جاری رکھنے کا قصد ہو تو فراہمی زر کی طرف امنائے جامعہ توجہ فرمائیں یا اس کے بند کرنے کا فیصلہ کریں تو مجھے اس فیصلے کے اعلان سے کچھ پہلے آگاہ فرما دیں تاکہ اگر اپنے ساتھ کام کرنے والوں کی مدد سے میں اس ادارہ کا کوئی چھوٹا سا حصہ بھی قائم رکھ سکوں تو اس کی کوشش کروں۔

ڈاکٹر صاحب نے میرا یہ مراسلہ امنا کی خدمت میں بھیجا اور انھیں فیصلے کی فوری ضرورت کی طرف متوجہ فرمایا۔ زمانہ بہت برا تھا۔ سیاسی ردعمل نے ساری امنگیں دبا دی تھیں، ایک عام انتشاری حالت تھی۔ تعلیم کے ایک ایسے کام کے لئے جسے حکومت وقت بھی تسلیم نہ کرتی ہو اور جو اپنی بے سر و سامانی کے باعث خود بھی ظاہر بیں نظروں کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے کون روپیہ دینے پر تیار نظر آتا۔ چنانچہ ہمارے امناء کی بہت بڑی اکثریت نے بلکہ پانچ چھ کو چھوڑ کر سب نے جواب دیا کہ جامعہ کو بند کر دینا چاہیئے، روپیہ فراہم نہیں کیا جا سکتا، اور بہت سوں نے شخصی طور پر میرے اور میرے ساتھیوں کے ہمدرد اور خیر خواہ تھے یہ مشورہ دیا کہ اس کے کسی حصہ کو زندہ رکھنے کا خیال قابل تعریف تو ہے مگر قابل عمل نہیں، اس خیال کو چھوڑ کر کوئی اور مفید کام کرو۔ اس فیصلے اور اس مشورے میں تجربہ، زمانہ شناسی، حکمت، دور اندیشی سبھی کچھ تھا، ہاں ہمت اور جرأت کی کمی ضرور تھی لیکن یہ چیزیں الحمد للہ کہ قوم کے نوجوانوں میں موجود تھیں۔ ہم نے اسی خط کے ساتھ جس کا ذکر کیا ایک خط اپنے ساتھیوں کو بھی لکھا تھا جو جامعہ میں کام کیا کرتے تھے۔ انھیں بتایا کہ غالباً امنا کا فیصلہ یہی ہو گا کہ جامعہ کو بند کر دو، کیا آپ سب مل کر اس کے کسی حصے کو بچا سکتے ہیں؟ روپیہ نہیں ہے، قرض ہے، جلد روپے ملنے کی کوئی توقع بھی بظاہر نہیں ہے، مکان کرائے کے ہیں۔ بچوں کو بلا کر کسی سال تعلیمی کے ختم سے پہلے واپس کرنا بہت بیجا ہو گا۔ لکھیے کیا رائے ہے؟ ان کا جواب آیا — سب کا، بلا استثنا سب کا، کہ کام کو جاری رکھنا چاہتے ہیں، روپیہ نہ ہو گا، بلا معاوضہ کام کریں گے، ایک دوسرے کو سہارا دیں گے، لیکن ایک بار کوشش کر کے ضرور دیکھیں گے۔ اس باہمت جواب کے بعد بے یقینی کا جو درجہ کام کو بند کرنے کے لئے ضرور تھا وہ میں نے اپنے اندر نہیں پایا، لہٰذا کام جاری رہا۔ ان ساتھیوں کی ہمت کا امتحان خوب خوب ہوا، مہینوں کسی کو ایک پیسہ معاوضہ کا نہ دیا جا سکا، لیکن ہم نے جامعہ کے انتظام میں ایک بنیادی تبدیلی کر لی۔ سب وہ جن کا تعلق رسمی تھا اس سے الگ ہو گئے۔ سب وہ جن کے دل کو لگی تھی اس کام کے ذمہ دار بن گئے۔ ایک انجمن، انجمن تعلیم ملی کے نام سے، قائم کی گئی، جس میں چند بنیادی امنا کے علاوہ وہ جو ہمارے شریک رہنے پر آمادہ تھے، گیارہ ساتھیوں نے حیاتی رکن بننا قبول کیا، اس شرط پر کہ وہ بیس سال تک، یا تا حیات، اگر زندگی بیس سال سے پہلے ختم ہو جائے جامعہ کی خدمت کریں گے، اور اپنی خدمت کا صلہ کبھی ۱۵۰ روپے سے زیادہ طلب نہ کریں گے۔ حالات نے آج تک کسی حیاتی رکن کو یہ معاوضہ بھی نہیں لینے دیا ہے۔ اب اس انجمن میں ۲۴ اراکین ہیں اور ہمارے دوسرے ساتھی جو ابھی رکن نہیں ہیں وہ بھی اراکین ہی کی سی پابندیوں کے ساتھ جامعہ کے کام کو ایک اچھا عبادت کا کام سمجھ کر انجام دے رہے ہیں۔ بہت مشکل تھا اس انجمن کا ابتدائی زمانہ مگر ہمارے محترم مولانا ابوالکلام آزاد نے ڈاکٹر انصاری مرحوم کے ہمراہ مدراس کا دورہ فرمایا، اور ان کے اثر اور سیٹھ جمال محمد کی فیاضی سے وہ سخت وقت بھی گذر گیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس انجمن کا قیام ہماری تعلیمی تاریخ میں ایک قابل توجہ واقعہ ہے اس نے اس زر پرستی کے زمانے میں تعلیمی، تہذیبی، دینی کام کو نیک کام کی حیثیت سے کرنے کی طرح ڈالی ہے اور اسے ایسا کام بنانا چاہا ہے جس کا اصلی انعام خود کام میں ہوتا ہے۔ ہمارے ماضی کی ساری شاندار روایات اس طرز عمل کی رہین منت ہیں۔ ہمارے مستقبل کے لئے اس نئے طرز خدمت کا رواج ایک فال نیک ہے۔

دوسرے اس انجمن کے قیام سے غیر سرکاری تعلیمی کام کے لئے ایک نئی راہ نکلی ہے تعلیمی آزادی کا وہ خیال جو پہلے دن سے جامعہ کی جان ہے، اس انجمن کے قیام سے اور واضح ہو گیا ہے

پچھلا ہفتہ: ہندوستان

بڑی خیریت ہوئی

کانگریس کی صدارت کے انتخاب میں حسب توقع ڈاکٹر پٹابھی ستیا رمیہ کامیاب ہو گئے لیکن خلاف توقع بہت تھوڑی اکثریت سے کامیاب ہوئے یعنی انھیں اپنے حریف سے صرف ۱۱۴ ووٹ زیادہ ملے۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ کانگریس کے بڑے لیڈروں نے پہلے یہ کوشش کی کہ مقابلہ نہ ہو اور جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اس معاملے میں غیر جانب دار رہیں گے، لیکن اپنے اس فیصلے کا اعلان نہیں کیا۔ اس کی وجہ سے دونوں فریقوں کے حامیوں کو موقع مل گیا کہ ان بزرگوں کے نام سے فائدہ اٹھائیں اور ووٹ دینے والے الجھن میں پڑ گئے اس کا اثر زیادہ تر گجرات اور بمبئی میں دیکھنے میں آیا۔ جہاں گاندھی جی کے پیروؤں کی اکثریت ہونے کے باوجود شری ٹنڈن کو زیادہ ووٹ ملے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں کے ووٹ دینے والوں کو غلط فہمی میں ڈال دیا گیا۔ اس بار جو گڑبڑ ہوئی اس سے سبق ملتا ہے کہ آئندہ سے صدارت کے انتخاب کے موقع پر کانگریس ہائی کمانڈ کو اپنی رائے کا صاف صاف اعلان کر دینا چاہیئے تاکہ ان کا نام لے کر لوگوں کو دھوکا نہ دیا جا سکے۔

بہرحال بڑی خوشی کی بات ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود ڈاکٹر ستیا رمیہ کانگریس کے صدر منتخب ہو گئے اور ملک کو یہ اطمینان ہو گیا کہ کانگریس بدستور گاندھی جی کے راستے پر چلنے کی کوشش کرتی رہے گی۔

سیاسی افق پر نیا ستارہ

سوشلسٹ پارٹی جو اس سال کے شروع میں قائم ہوئی تھی۔ اب دس مہینے بعد اپنی حالت کا اور ملک کے حالات کا جائزہ لے رہی ہے اور ہندوستان کے مجوزہ دستور اساسی کے مسودے پر غور کر رہی ہے۔ وسط اکتوبر سے اس مجلس عاملہ کا جلسہ بھوبنیشور میں ہو رہا ہے۔ اس کی کارروائی کے متعلق یہ خبر آئی ہے کہ اس نے دستور اساسی کے مسودے پر بحث کی اور اس میں بہت سی ترمیمیں تجویز کیں۔ اس کا سب سے اہم اور بنیادی مطالبہ تو یہ ہے کہ موجودہ آئین ساز اسمبلی جو ملک کی آبادی کے ایک بہت چھوٹے سے حصے کی نمائندگی کرتی ہے، توڑ دی جائے اور ہر بالغ کے حق رائے دہندگی کی بنا پر نئی اسمبلی منتخب ہو۔ دستور کے متعلق اس کی مجموعی رائے یہ ہے کہ وہ جمہوریت کے پرستاروں کے لئے مایوس کن ہے۔ اس کے ذریعے سے مکمل جمہوریت وجود میں نہیں آ سکتی، بلکہ اس کا امکان ہے کہ حکومت کو استبدادی بلکہ آمرانہ طرز عمل اختیار کرنے کا موقع مل جائے۔ سوشلسٹ پارٹی کی مجلس عاملہ بالغوں کے حق رائے دہندگی، وفاقی نظام اور پارلیمنٹری طرز حکومت کی دل سے حمایت کرتی ہے۔ مگر اس کا خیال ہے کہ دستور کے مسودے نے مجالس مقننہ کے دو ایوان تجویز کر کے جمہور کے قانون سازی کے حقوق میں دست اندازی کی ہے۔ وفاقی حکومت کو ہنگامی اختیارات دے کر صوبائی حکومت خود اختیاری کو خطرے میں ڈال دیا ہے اور گورنروں کے اختیار تمیزی کے ذریعے سے ذمہ دار حکومت کی کمر توڑ دی ہے۔

اس کا مطالبہ ہے کہ دستور میں حق ملکیت کو محدود کر دیا جائے اور اس بات کی صراحت کر دی جائے کہ ہندوستان میں جمہوری اشتراکیت کا نظام قائم کیا جائے گا۔ بہت سی ترمیمیں اس بنیادی اصول کو عمل میں لانے کے سلسلے میں پیش کی گئی ہیں۔

بیرونی سیاست کے سلسلے میں سوشلسٹ پارٹی یہ چاہتی ہے کہ ہندوستان کے برطانوی شرکت اقوام سے الگ ہو جانے کا اعلان کر دیا جائے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سوشلسٹ پارٹی جمہوریت، مساوات اور معاشی انصاف کا اونچا، بلند اور واضح تصور رکھتی ہے اور اس کے مخلص اور پرجوش لیڈر ان اصولوں پر عمل کرنے کے لئے زیادہ بے چین ہیں۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس نے کانگریس سے الگ ہونے میں کسی قدر عجلت سے کام لیا ہے۔ اس کے لیڈر اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کے ہم خیالوں کی بہت بڑی تعداد ابھی تک کانگریس میں بائیں بازو کی حیثیت سے موجود ہے اور صرف اس وجہ سے کہ اگر وہ الگ ہو جائے تو اس نازک زمانے میں حکومت کے سارے اختیارات رجعت پسند دائیں بازو کے ہاتھ میں چلے جائیں گے جس سے ملک کو شدید نقصان پہنچے گا۔ ان لوگوں کا خیال ہے آج کل ہندوستان ایک عبوری دور سے گذر رہا ہے اس وقت کانگریس کے اندر اتحاد اور ملک کے اندر امن قائم رکھنا سب سے زیادہ ضروری ہے۔ خواہ اس کی وجہ سے سیاسی اور معاشی ترقی کی رفتار کچھ دن کے لئے دھیمی پڑ جائے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایک دن وہ خود کانگریس کو رجعت پسند عناصر سے پاک کر کے ترقی پسند بنا لیں گے یا اگر اس میں کامیاب نہ ہوئے تو کانگریس کو چھوڑ کر الگ پارٹی بنائیں گے اور اس کے ساتھ زور شور سے آئینی جنگ کریں گے۔ ان کے نزدیک یہ وقت کسی شدید کشمکش کے لئے خواہ وہ آئینی ہو ہرگز مناسب نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ سوشلسٹ پارٹی کا خیال اس کے برعکس تھا لیکن پچھلے دس مہینے میں اس کے طرز عمل نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ بھی حکومت کے خلاف تنقید یا احتجاج کی کوئی پرزور تحریک اٹھانا ناممکن یا مناسب نہیں سمجھتی۔ ایسی صورت میں اس کی جلد بازی سے صرف اتنا فائدہ ہوا کہ اس نے ترقی پسند سیاست کی ایک صحیح تصویر ملک کے سامنے پیش کرنی شروع کر دی۔ اس کے مقابلے میں نقصان یہ ہوا کہ بایاں بازو کانگریس کے اندر پہلے سے کمزور ہو گیا۔ بہرحال نقصان عارضی ہے اور فائدہ امید ہے کہ مستقل اور پائدار ثابت ہوگا۔

بنگال کی حالت تشویشناک ہے

مغربی بنگال کے ذمہ دار لوگوں کا بیان ہے کہ مشرقی بنگال سے ہندو بہت بڑی تعداد میں ترک وطن کر کے آ رہے ہیں۔ اب تک جتنے لوگ آ چکے ہیں ان کی تعداد تیرہ لاکھ سے زیادہ بتائی جاتی ہے ان لوگوں کو مغربی بنگال میں جو پہلے ہی سے بہت گنجان ہے بسانے کا سوال خاصا نازک ہو گیا ہے اور اندیشہ ہے کہ اگر آنے والوں کی تعداد بڑھتی رہی تو یہ مسئلہ خطرناک صورت اختیار کر لے گا۔ انتقال آبادی کی وجہ یہ بتائی جاتی ہیں: ایک یہ کہ مشرقی بنگال میں ہندوؤں کے ساتھ حکام کا برتاؤ اچھا نہیں، بڑے پیمانے پر تلاشیاں لے کر پولیس ان کو دق کرتی ہے اور بہت سی باتوں میں ان کی حق تلفی کی جاتی ہے جس سے ان کو اپنا مستقبل تاریک نظر آتا ہے دوسرے گرانی حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ چاول جو صوبے کی عام غذا ہے پچاس روپے من ہو گیا ہے۔ مشرقی بنگال کے ایک وزیر حمید الحق چودھری صاحب نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ یہ بات غلط ہے کہ مشرقی بنگال سے بڑے پیمانے پر انتقال آبادی ہو رہا ہے۔ صرف تھوڑے سے لوگ تلاش معاش میں مغرب کی طرف جا رہے ہیں۔ ہم غیر جانب دار مبصرین کے خیال میں حمید الحق صاحب کا یہ بیان "بالکل لغو ہے"۔ پناہ گزینوں کی صحیح تعداد کے بارے میں اختلاف ہو سکتا ہے مگر بڑے پیمانے پر منتقلی آبادی ایک صریحی واقعہ ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے مشرقی بنگال کی حکومت کو مشورہ دیا ہے کہ اس خطرناک صورت حال کی جلد سے جلد اصلاح کرے ورنہ نتائج بہت افسوسناک ہوں گے۔

سخت تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ مشرقی بنگال کی حکومت اس نازک مسئلے کو حل کرنے کے بجائے اس کے وجود ہی سے انکار کر رہی ہے۔ شاید انکار محض بدنامی سے بچنے کے لئے ہو اور حکومت دل میں معاملے کی نزاکت کو محسوس کر رہی ہو۔ اس قیاس کی تائید ایک تازہ خبر سے ہوتی ہے کہ پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خاں صاحب شروع نومبر میں مشرقی بنگال کے دورے پر جا رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ اپنے دورے کا خاص مقصد مشرقی بنگال کے ہندوؤں کی شکایتوں کی تحقیقات اور تدارک کو قرار دیں گے۔

یہ گتھی سلجھتی نظر نہیں آتی

پچھلے دنوں کچھ امید پیدا ہوئی تھی کہ کامن ویلتھ کے وزراء کی کانفرنس سے فائدہ اٹھا کر کشمیر کے مسئلے کو پرامن طریقے سے حل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ یہ خبر سن کر کہ لیاقت علی خاں صاحب اور پنڈت نہرو میں دو مرتبہ انگلستان کے وزیر اعظم اور وزیر خارجہ کی موجودگی میں گفت و شنید ہوئی امید کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ مگر لیاقت علی خاں صاحب کے بیان سے معلوم ہوا کہ یہ گفت و شنید بے نتیجہ رہی اگر اس پر بھی امید پرور لوگ کو مایوسی نہیں ہوئی تھی تو وہ پاکستان کے سابق کمانڈر ان چیف میسروی صاحب اور حکومت پاکستان کے عارضی وزیر خارجہ غلام محمد صاحب کی تقریر کے بعد ہو جانی چاہیئے۔ ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ٹوری پارٹی کے اس حصے نے جو چرچل صاحب کا ہم خیال ہے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ کشمیر کی جنگ جاری رہے گی۔

> **ضروری اعلان** — یکم نومبر سے نئی روشنی کے منیجر کے فرائض عبدالحلیم ندوی صاحب بی اے جامعہ انجام دیں گے۔

۲۔ پاکستان
مکتوب کراچی

"جادہ پیما" نے بندر روڈ کراچی سے لکھا

لاہور، راولپنڈی اور پشاور آپ نے دیکھے ہوں گے؟ کراچی ان معنوں میں شہر ہرگز نہیں۔ یہاں آپ کو ہر دوسرا آدمی دہلی سے الہ آباد تک کسی بھی قصبہ یا شہر کا رہنے والا ملے گا، ہر تیسرا بندہ خدا الہ آباد سے پٹنہ تک کہیں کا باشندہ ہوگا۔ ہر چوتھا ذی روح جبل پور سے کان پور تک کسی جگہ کا ہو سکتا ہے۔ گویا ہندوستان کے تین صوبوں یوپی، بہار اور سی پی کی مکمل نمائندگی یہاں بکثرت موجود ہے۔ اب پانچویں سے آٹھویں تک جو اشخاص آپ کو ملیں گے وہ یقیناً میمن، خوجے اور بوہرے ہوں گے یعنی کاٹھیا واڑ، گجرات اور دکن کی پیداوار۔ ہر نواں شخص بنگالی، عرب، چینی، حبشی، ایرانی، مدراسی اور افغان میں سے کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ دسویں شخص آپ خود ہی ہیں، جو کراچی کے علاوہ پاکستان کے کسی اور علاقے کے رہنے والے ہوں گے۔ ہاں اگر خدانخواستہ کراچی پہنچتے ہی پہلی صبح کو آپ کے سر پر ہاتھ گاڑی یا گدھا گاڑی میں بیٹھنے کا شوق سوار ہو جائے تو بے شک پہلا شخص آپ کو کراچی کا اصلی باشندہ ملے گا، اور وہ ہوگا اونٹ یا گدھے کی گاڑی ہانکنے والا۔ اسے کراچی کے چپے چپے کا علم اور اس کے ذرہ ذرہ سے محبت ہے، لیکن اول تو وہ آپ کی زبان ہی نہ سمجھ سکے گا اور اگر تھوڑی بہت سمجھا بھی تو آپ کے ہاتھوں میں اپنا دل دینے سے ہچکچائے گا۔ کچھ تو اس لئے کہ وہ مزدور ہے اور آپ سیٹھ۔ اور مزدور اور سیٹھ کا تعلق ہر جگہ دل کا نہیں صرف پیٹ کا ہوتا ہے۔ دوسرے اس لئے کہ آپ سندھی بول سکتے ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں، اور اس کا ایمان ہے کہ کراچی کی کہانی صرف سندھی میں کہنی چاہیئے۔ جس طرح ڈل کے شکارے بان کا قاعدہ ہے کہ نسیم باغ کی حکایت صرف کشمیری زبان میں کہی جا سکتی ہے۔ یہاں آکر اگر آپ کا جی گدھے گاڑی یا اونٹ گاڑی میں بیٹھنے کو نہ چاہا، تو مہینوں گزار دیجئے لیکن کراچی کا اصلی باشندہ سندھی آپ کو غالباً ایک بھی نہ ملے گا۔

کراچی اپنے اصلی مکینوں سے اس قدر کیوں خالی ہے؟ اس برعظیم کے بدنصیب شمال مغربی خطے کا کون سا گاؤں، قصبہ یا شہر ایسا ہے جو آج اس سوال کے تلخ احساس کو بھلا دینا اور اس کے جواب کو بیچارے مؤرخ کے کاندھوں پر ٹال دینا نہ چاہتا ہو۔ اس سلسلہ میں کراچی کی بدنصیبی کہئے یا خوش نصیبی یا اس حالیہ انقلاب یا رد انقلاب کو دعا دیجئے کہ یوں تو اس میں سیدیں شہر اجڑے ہیں کوئی کم اور کوئی زیادہ اور غیر محرم لوگ محرم گھروں میں آکر بس گئے ہیں، لیکن شاید کہیں بھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی بڑے شہر کی .. فی صدی سے زائد آبادی سمندر اور خشکی کے راستے سے کوچ کر گئی ہو اور اصلی باشندوں میں جو ۲۴ فی صدی سے کم لوگ اس میں بچے ہوں وہ سب کے سب مزدور اور قلی ہوں۔ اتفاق سے کراچی کا یہی حشر ہوا ہے۔ یہاں کی آبادی کی بھاری اکثریت خوش حال سندھی ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ اب یہاں وہ خال خال نظر آتے ہیں۔ "کراچی ہمارا ہے" یا "ہم کراچی کے ہیں" یہ کہنے والے اب صرف مٹھی بھر سندھی مسلمان مزدور یا قلی رہ گئے ہیں۔

کراچی کے اس انتقال آبادی میں مزید تماشہ یہ ہوا ہے کہ جو لوگ باہر سے آئے ہیں وہ ایک زبان اور ایک معاشرت یا ایک صوبے کے نہیں وہ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں، رنگ برنگ کی معاشرت کے حامل ہیں، اور ہندوستان کے ہر صوبہ بلکہ ہر شہر کی یاد دلاتے ہیں، شاہراہوں پر، تفریح گاہوں میں اور تجارتی اداروں میں صبح و شام کسی وقت بھی آپ گجراتی، مرہٹی، لکھنوی، اردو، بنگالی، مدراسی، اردو، فارسی سب ہی زبانوں پر شوق سے سر دھنئے، یا لباسوں کی قطع برید سے لطف اندوز ہوتے رہیئے۔ صحیح معنوں میں کسی شہر کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ ایک ذی ہوش نووارد وہاں چند مہینے رہنے کے بعد یہ اندازہ لگا سکے کہ فلاں قسم کے لباس کے اور خاص طرح کے چال ڈھال والے شخص سے کون سا سوال کرنے پر کس قسم کا اور کس لہجہ میں کیا جواب ملے گا۔ کیونکہ ہر شہر میں کچھ مخصوص تمدنی طبقات ہوتے ہیں جن میں آسانی سے تمیز کی جا سکتی ہے اور روزمرہ کی باتوں کے متعلق ان کے ذہنی ردوبدل کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن کراچی ایک ایسا شہر ہے جس میں ایک شہر ہونے کا یہ بنیادی امتیاز سرے سے غائب ہے اور شاید مدت تک غائب رہے۔ کراچی آنے سے پہلے اور یہ معلوم کر کے کہ دہلی اور یوپی سے کراچی میں کافی لوگ آئے ہوئے ہیں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہاں دہلی کی زبان اور یوپی کا تمدن چھایا ہوا ہوگا۔ لیکن اس بارے میں یہاں آکر سخت مایوسی اور حیرت ہوتی ہے اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ سنئے۔

ایک روز شام کے وقت صدر میں جو یہاں کی انارکلی ہے، یہ آواز کان میں پڑی۔

"کھائیں گا تو ہمیشہ یاد کریں گا۔ دلی کے دہی بڑے ہیں یہ دلی کے"

میں خوانچہ والے کے پاس گیا اور پوچھا۔

"آپ دلی کے رہنے والے ہیں؟"

"جی ہاں"

"تو پھر آپ یہ کیا آواز لگا رہے ہیں۔ کھائیں گا تو ہمیشہ یاد کریں گا؟"

کیا کریں سرکار! جب دلی میں تھے تو شام کو فتح پوری میں آواز لگایا کرتے تھے۔ "ایک دفعہ کھائیے گا تو کبھی نہ بھولئے گا۔ شاہی دہی بڑے ہیں یہ شاہی دہی بڑے" جب سے قسمت یہاں لائی ہے، جیسی یہاں کی بولی ہے ویسی آواز لگاتے ہیں۔ کیا کریں سرکار پیٹ پالنا ہے۔ اب یہیں رہنا ہے۔ جیسا دیس ویسا بھیس"۔

واضح رہے کہ یہ خوانچہ والا دہلی کے اس طبقہ سے تعلق رکھتا ہے جس کو اپنی زبان پر بڑا ناز تھا اور جو چاندنی چوک، قاضی حوض یا فتح پوری میں پنجاب، سرحد وغیرہ کے گاہکوں کو غلط اردو پر ٹوک دیا کرتے تھے اور اکثر لطیفے ہی چوٹ بھی کر جاتے تھے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر کم و بیش یہی ذہنیت کہ "پیٹ پالنا ہے اور جیسا دیس ویسا بھیس" عام طور پر ہر دہلی اور یوپی سے آنے والے کی یہاں ہو کر رہ گئی ہے، خواہ وہ کسی طبقے سے تعلق رکھتا ہو۔ بے شک ان میں بعض مستثنیات بھی ہیں اور کہیں کہیں صحرائے اعظم کے نخلستان کی طرح خالص دہلوی تہذیب کے نظارے یا لکھنوی زبان کے چٹخارے بھی مل جاتے ہیں لیکن بہت کم اور شاذ و نادر دیکھا یہ گیا ہے کہ عموماً ان علاقوں سے آئے ہوئے لوگ زبان و معاشرت کے لحاظ سے اپنی امتیازی انفرادیت کھوتے جا رہے ہیں، یہی حال سی۔ پی اور بہار سے آئے ہوئے لوگوں کا ہے تقسیم ملک سے پہلے شمالی مغربی صوبوں کے مسلمانوں کو یوپی کے مسلمانوں کا احساس برتری اور اپنی زبان و تہذیب پر ان کا واجبی لیکن بعض دفعہ تکلیف دہ حد تک بڑھا ہوا فخر بڑا ناگوار گزرتا تھا لیکن یہاں کراچی میں آکر ان کے یہ دونوں احساس تقریباً مٹ چکے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ دانستہ اپنی انفرادیت مٹا دینا چاہتے ہیں۔ تاکہ جس قدر جلد ہو سکے یہ لوگ مقامی کل میں مدغم ہو جائیں شاید یہ رجحان "پناہ گیرانہ ذہنیت" کا ایک دوسرا تقاضا ہے جس کے ایفا میں آج لاکھوں انسان پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں میں لسانی و تمدنی موت مر رہے ہیں۔ زبان و تمدن کے اس "مرگ انبوہ" سے کوئی تمدنی حیات نو پیدا ہوگی جو عمومی بھی ہو اور ارتقائی بھی۔ اس کا فیصلہ تو مستقبل بعید ہی کر سکے گا۔ گو اس معاملے میں کراچی کے آثار چنداں حوصلہ افزا نہیں، لیکن اگر آپ "مرگ ثقافت جشن دارد" کے قائل ہیں تو شوق سے کراچی آئیے اور یہاں کے ہر ہوٹل اور ہر فلیٹ میں یوپی کی نازوں کی پلی ہوئی تہذیب کو دم توڑتے دیکھ لیجئے، اور ہر گلی اور ہر کوچہ میں دہلی کی کوثر میں دھلی ہوئی اردو زبان کی سسکیاں سن لیجئے۔

گو یہ تعجب کی بات ہے لیکن یہ ہے اپنی جگہ بالکل صحیح کہ کراچی میں نئے آئے ہوئے لوگوں میں صرف میمن، خوجے، بوہرے ایسے ہیں جنہوں نے اپنی جداگانہ زبان و معاشرت بڑی حد تک قائم رکھی ہے وہی ان کی گجراتی زبان، وہی سنہری پگڑی، وہی ملاجی، وہی رہن سہن اور وہی اپنی علیحدہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان میں صحیح معنوں میں پناہ گیر بہت کم ہیں میمن، خوجے اور بوہروں کے لئے پاکستان پناہ کی جگہ نہیں ہے بلکہ ایک تجارتی منڈی ہے جو ہندو تاجروں کے جانے سے لاوارث پڑی تھی۔ یہ لوگ بمبئی، کاٹھیاواڑ سے آئے اور اس کے وارث بن گئے، اور اس اسلامی نہیں بلکہ یہودیانہ ہجرت کی وجہ سے خوب سرخرو ہو گئے۔ لیکن حالات صاف بتا رہے ہیں کہ اگر ان مسلمان مارواڑیوں نے پاکستانی عوام سے معاشی سمجھوتہ نہ کیا اور اپنی امتیازی معاشرت کے موجودہ سنگین حصار کو نہ گرایا تو یہاں امن کے فرقے کا جداگانہ وجود گہری نفرت کا باعث بن جائے گا۔

کراچی کے بچے کھچے اصلی باشندے اکثر یہ سوال کرتے سنائی دیتے ہیں کہ "پاکستان سے پہلے کراچی میں ہندو سیٹھ لوگ ہوتا تھا۔ اب مسلمان سیٹھ لوگ آگیا ہے، ہم جب بھی مزدوری کیا اور اب بھی مزدوری کرتا ہے، ہمارے کو کیا ملا؟"

غالباً یہی سوال پاکستان کے ہر قریہ اور قصبے میں بھی غریب عوام ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں، اور کچھ دنوں بعد شاید یہ لوگ ایک آواز ہو کر حکومت وقت سے بھی پوچھیں گے اور اسی سوال کے تسلی بخش جواب پر پاکستان کے استحکام و ارتقا کا تمام تر انحصار ہے۔

الغرض پاکستان کا دارالسلطنت کراچی اس وقت شہر نہیں بلکہ ایک مسکن ہے جہاں انواع و اقسام کے لوگ سکونت پذیر ہیں۔ اور جن میں بیشتر مسکین ہیں۔ عمارتوں کے اعتبار سے تو کراچی بے شک ایک شہر ہے، لیکن یہاں کی پہلی شہریت تو کچھ عرصہ ہوا ہند کو کوچ کر گئی اور نئی شہریت پیدا ہونے کے لئے ابھی مدتیں درکار ہیں۔ یہ ایسا مدینہ ہے جس کی مدنیت یہاں سے دور جا کر غربت بن گئی اور کہیں دور کی مدنیت یہاں آکر غربت کا شکار ہو گئی ہے اس سلسلے میں راقم الحروف کو ایک دلچسپ واقعہ دیکھنے کا

(بقیہ صفحہ ۲۹ پر)

مغربی دنیا

امریکہ میں صدارت کی رسہ کشی

۲ نومبر کو امریکہ میں صدارت کا انتخاب ہونے والا ہے اس وقت تمام دنیا کی نگاہیں اس طرف لگی ہوئی ہیں۔ خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل مقابلہ صرف دو امیدواروں ——— مسٹر ڈیوی اور پریذیڈنٹ ٹرومین میں ہے اور واقف کاروں کا یہ بھی کہنا ہے کہ پریذیڈنٹ ٹرومین کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔ مسٹر ڈیوی بہت بڑی اکثریت سے کامیاب ہوں گے۔ اگر یہ اندازہ صحیح ہے، اور قرائن کہتے ہیں کہ ضرور صحیح ہوگا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا اثر بین الاقوامی معاملوں پر کیا اثر پڑے گا؟ کیا ۲۰ جنوری ۱۹۴۹ء کو جب مسٹر ڈیوی صدارت کی باگ ڈور سنبھالیں گے تو اس کے بعد امریکہ کی خارجی سیاست میں کوئی نمایاں تبدیلی ہوگی؟ روس اور امریکہ کے بڑھتے ہوئے اختلافات امن عالم کے لئے ایک عظیم الشان خطرہ ہیں، کیا صدر کی تبدیلی سے یہ اختلافات ختم ہو جائیں گے اور موجودہ خطرہ ٹل جائے گا؟ ہمارا خیال ہے کہ ان میں سے کوئی بات نہیں ہوگی، مسٹر ڈیوی اور پریذیڈنٹ ٹرومین دونوں کی طرف سے یہ کہہ دیا گیا تھا کہ الکشن کی تقریروں میں خارجی سیاست پر بحث اور متحدہ ریاستوں کی موجودہ پالیسی پر اعتراض نہ کئے جائیں گے صدارت کے تیسرے امیدوار مسٹر والیس متحدہ ریاستوں کی خارجی سیاست ہی میں بنیادی تبدیلی چاہتے ہیں مگر ان کے کامیاب ہونے کی کوئی امید نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ مسٹر ڈیوی بھی ترقی پسند ہیں اور وہ روس سے اس حد تک بگاڑ کرنا کہ دونوں ملکوں میں لڑائی کا خطرہ پیدا ہو جائے پسند نہیں کرتے، لیکن جب تک کہ امریکہ کی اندرونی سیاست اور حکومت کے ڈھانچے میں کوئی انقلاب نہ ہو وہاں کی خارجی سیاست میں کوئی بڑی تبدیلی کرنا ممکن نہیں، اس کا یہ مطلب نہیں کہ صدر کی شخصیت کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی اور اس کے خیالات کی ترقی پسندی سے دنیا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا، مگر مسٹر ڈیوی کی ترقی پسندی ایسی نہیں ہو کہ ہم کسی بڑی اصلاح کی آرزو

اس سے وابستہ کرلیں

روس نے کہا القط

برلن کی کش مکش کو دور کرنے کے لئے چھ غیر جانبدار ملکوں ———

ارجنٹائن، بلجیم، کناڈا، چین، کولمبیا اور شام نے حفاظتی کونسل میں جو تجویز پیش کی تھی، امن پسندوں کا خیال تھا کہ تھوڑی بہت ترمیم کے بعد روس اسے قبول کرلے گا۔ لیکن روس نے ویٹو کا حق استعمال کرکے اس امید کا خاتمہ کردیا۔ روس کے نمائندہ موسیو وشنسکی کا مطالبہ ہے کہ پورے برلن کے لئے روس کا سکہ تسلیم کرلیا جائے اور جرمنی کے تمام مسائل پر از سر نو غور کیا جائے۔ مغربی طاقتوں نے ان دونوں مطالبوں کو منظور کرلیا ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ پہلے برلن کا محاصرہ اٹھا لیا جائے، تاکہ دنیا کو یہ محسوس نہ ہو کہ دباؤ کے ماتحت پسپائی کی جا رہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود روس اور مغربی جمہوریتوں میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا، اس لئے کہ دونوں ایک دوسرے سے خوف زدہ ہیں، دونوں ہی اندر اندر لڑائی کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اور شاید دونوں ہی دنیا کے امن و امان سے زیادہ، اپنے اغراض و مفاد کو عزیز رکھتے ہیں، حالات جب یہ ہوں تو چھوٹے سے چھوٹا مسئلہ بھی حل کرنا مشکل ہے۔

اس جہنم کی آگ کو روکو

برلن کے محاصرہ سے کہیں زیادہ اہم مسئلہ ایٹمی طاقت کا ہے اس مسئلے کو حل کرنے کی کئی مرتبہ کوشش کی گئی لیکن جتنی کوشش کی گئی اتنا ہی اس میں الجھاؤ پیدا ہوتا گیا۔ یو این او کی پہلی جنرل اسمبلی میں روس کی یہ تجویز منظور کی گئی تھی کہ کوئی ملک ایٹم بم استعمال نہیں کرے گا۔ ایٹمی طاقت پر بین اقوامی کنٹرول اور اس سلسلے کے دوسرے مسائل پر غور کرنے کے لئے ایک اٹامک انرجی کمیشن بھی مقرر کیا گیا تھا، جو روس اور مغربی طاقتوں کی چپقلش کی وجہ سے اپنا کام جاری نہ رکھ سکا۔

اس وقت دنیا کی بڑی طاقتیں اس طرح دو کیمپوں میں بٹ گئی ہیں کہ ان میں بیچ بچاؤ کرنے والا کوئی نہیں رہا۔ ہندوستان کے اگرچہ مغربی جمہوریتوں کے ساتھ گہرے تعلقات ہیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ ان دونوں کیمپوں میں سے کلی طور پر کسی کے بھی ساتھ نہیں ہے۔ اس نے اپنی اس غیر جانبداری سے فائدہ اٹھا کر بیچ کی راہ نکالی تھی، لیکن اس کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہو سکی ۱۸ اکتوبر کو اس نے اپنی کوشش دوبارہ شروع کی ہے اور ہندوستانی نمائندہ کا بیان ہے کہ روس کے رجحانات میں بڑی حد تک نرمی اور لچک پیدا ہوگئی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر کمیشن نے دوبارہ کام شروع کردیا اور خلوص کے ساتھ کام کیا تو سمجھوتے کے امکانات کافی موجود ہیں۔ ہندوستان کی تجویز میں دو باتوں پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے:

(۱) کمیشن کی پہلی رپورٹ کی عام سفارشات کی بنیادی باتوں اور دوسری رپورٹ کی خاص خاص تجویزوں کو جنرل اسمبلی منظور کرلے۔

(۲) جنرل اسمبلی، کمیشن سے کہے کہ وہ اپنا کام دوبارہ شروع کرے اور جس قدر جلد ممکن ہو حفاظتی کونسل میں ان تجویزوں کو پیش کرے۔ جن پر سمجھوتے کا امکان ہو۔

غرض اس مسئلے میں بھی سمجھوتے کے امکانات پوری طرح موجود ہیں بشرطیکہ ایک دوسرے پر بھروسہ کیا جائے اور بے جا ڈر کو دل سے نکال دیا جائے، لیکن اس کی امید کم ہے، ہم جیسا کہ پہلے عرض کر چکے ہیں بڑی طاقتیں اس وقت اپنے آپ کو تیسری جنگ عظیم کے لئے تیار کرنے پر مجبور پاتی ہیں اور جس وقت کوئی فریق تیاری مکمل کرے گا تو ان ہی مسائل میں سے کوئی جنگ کا بہانہ بن جائے گا۔

ع، ل

بزم بے تکلف (بہ سلسلہ صفحہ ۳)

"آپ کا نفس مطلب صحیح ہے، اگرچہ انداز بیان غیر علمی ہے۔"

"جی جناب یہ علمی نہیں عملی بات ہے بڑے تجربے کے بعد آتی ہے، اگر آپ نے ٹکسالی خوب کہا۔ چوکھا مال کھرا سکہ، کھوٹ کپٹ کا نام نہیں ایک اور چیز ہے ٹکسالی لیڈر بھی ٹکسالی سکے کی طرح بغیر کسی کوشش کے چلتا ہے اور وہ بھی پورے سولہ آنے میں، یہ نہیں کہ اپنے کو دکان دکان لئے پھرے کہ کسی طرح چل جاؤں، چاہے کچھ بٹہ ہی لگ جائے۔"

"ماشاء اللہ آپ تو خود بڑے نقاد ہیں آپ کو کسی سے استفادے کی کیا ضرورت ہے اب مجھے اجازت ہو تکلیف تصدیع۔"

مکتوب کراچی (بہ سلسلہ صفحہ ۵)

اتفاق ہوا، ایک دن شہر کی سب سے بڑی شاہ راہ بندر روڈ پر کارپوریشن کے عالی شان دفتر کے سامنے فٹ پاتھ پر کوڑھ کی مریضہ بھکارن دھوپ میں پڑی ہوئی تھی (یہاں یہ عام بات ہے) دوپہر کا وقت تھا، میں ادھر سے گزرا تو دیکھنے کے لئے رک گیا، میری طرح دو تین اور صاحب بھی وہاں کھڑے ہوگئے۔ ایک صاحب بولے:۔

"واللہ یہ عجیب شہر ہے۔ ہم نے ایسی نامعقول حرکت اپنے لکھنؤ میں کبھی نہیں دیکھی۔"

دوسرے صاحب کہنے لگے:۔ "کراچی نویلا کسم (نئی قسم کا) شہر ہے، ہمارے جوناگڈھ میں ایسا گندگی کبھی نہیں ہوا، مگر یہاں سب چلتا ہے۔"

شاید اسی وقت کراچی کے سابق باشندے جوناگڈھ اور لکھنؤ کی کسی شاہ راہ پر کھڑے اسی قسم کے جملے کہہ رہے ہوں گے۔

بالفاظ مختصر کراچی آج کل ایک گنجان آباد ویرانہ ہے۔ نہ معلوم ایسے کتنے گنجان آباد ویرانے دنیا میں اور ہیں اور خدا معلوم کب اور کیوں کر یہ آباد ہوں گے۔

تذکرۃً یہاں یہ عرض کرنا خارج از دلچسپی نہ ہوگا کہ کراچی شہر کے رہنے والوں سے کسی سیاسی انقلاب کے پیش رو ہونے کی توقع کرنا قطعی فضول ہے۔ ہر ملک کے دار السلطنت اور خصوصاً فرانس کے دار السلطنت پیرس کے عوام نے اپنے ملک کی تاریخ اور سیاست عالم میں کئی بار جو فیصلہ کن کام سرانجام دیئے ہیں شاید پاکستان کا یہ دار السلطنت اس قابل رشک تمغہ سے ایک عرصہ دراز تک محروم رہے گا۔ کراچی کیا اس قدر مخلوط آبادی اور متضاد معاشرت ہے، اور بڑے کاروباری نہ ہونے کی وجہ سے معاشی مفاد کے ایک سے ہونے کے احساس کا اس قدر فقدان ہے کہ یہاں کے لوگوں میں ہم آہنگی خیال و عمل کا شبہ بھی نہیں ہو سکتا اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہمارے بعض سرمایہ دار کرم فرماؤں نے کراچی کو پاکستان کا جو دار السلطنت چنا تھا تو ان کا یہ انتخاب واقعی قابل تعریف تھا

(آفاق)

چلتے چلتے ایک کچی اور چرکی۔ مگر مولانا کہیں آپ برا نہیں مان گئے، دیکھئے بات یہ ہے کہ لیڈر جیسی جلتی رقم کی خاصیت تو کچھ ہم ہی کو خوب معلوم ہے اس لئے کہ ہم تو روز برتتے ہیں نہ، ہاں قسمیں اور ان کے نام آپ سے پوچھ لیتے ہیں، نام کے عالم آپ ہی اچھا تو آپ جا ہی رہے ہیں خدا حافظ کسی دن ہم

۲ دولت، زمانے پر حاضر ہو کر بیڈ کی اور قسمیں بھی لو جو ن گا۔

غزل

اثر ــــــــــــــ لکھنوی

عشق کیا ہے؟ ادب آموز فنا ہوجانا
اور فنا؟ قید تعین سے رہا ہوجانا

شوق بیتاب کو محروم تمنا کر دے
یونہی اس درد کا ممکن ہے دوا ہوجانا

ان کی پرسش ہی گوارا نگرِ غیرت عشق
تو ذرا دیر کو پہلو سے جدا ہوجانا

تم خزاں کہتے ہو؟ در اصل ہے تکمیل بہار
رنگ و بوئے چمنستاں کا ہوا ہوجانا

دیکھ کر غنچوں کو دل خون ہوا جاتا ہے
مسکراتا ہے لبِ زخم کا وا ہوجانا

عشق اک شورش بیگانہ مطلب ہوجائے
حسن کو آئے جو ناموس وفا ہوجانا

کھینچے یوں بھی ہیں بیتابیٔ دل کا نقشہ
موج سے موج کا مل مل کے جدا ہوجانا

کیا ملے بحر سے وہ قطرہ نہ آیا جس کو
اپنے ہی شوق کے طوفاں میں فنا ہوجانا

لطف جب ہے کہ جفا کو بھی وفا سے بدلو
شوخیوں کو تو سکھایا ہے حیا ہوجانا

کچھ نہ ہونے پہ محبت میں غنیمت ہے اثرؔ
کاہشِ درد کا اندوہ ربا ہوجانا

ٹوٹے تارے

باقر مہدی

حسن والے تھے روٹھے روٹھے سے
عشق کے انتخاب سے پہلے
کتنی بے کیف زندگانی تھی
دل خانہ خراب سے پہلے
ان کی آنکھوں نے کہہ دیا سب کچھ
ٹوٹے تار سے جواب سے پہلے
میں کہاں اور وصل یار کہاں
کیسی تعبیر خواب سے پہلے
دل میں اک جوش، ایک طوفاں تھا
لرزش کہ سیاب سے پہلے
بحر ظلمت میں موج طوفاں ہے
زندگی انقلاب سے پہلے

گیت

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

میں کیسے آنکھ اُٹھاؤں!
گر جائیں گے موتی سارے
کتنے چندر کتنے تارے
جن کو پلکوں میں اُلجھاؤں
میں کیسے آنکھ اُٹھاؤں!
غم جب کھیلتا ہے نس نس سی
بھر آتی ہے دُکھ کے رس سی
یہ نیلم پیالی!ــــ چھلکاؤں؟
میں کیسے آنکھ اُٹھاؤں!
دیا ندی تیری شرمائے
میری آنکھ اگر بھر آئے!
اس میں کل سنسار ڈباؤں
میں کیسے آنکھ اُٹھاؤں!

شام اودھ کی میرا جوبن
یوں ہی جلتا سا میرا من!

شام کی لمبی گہری سانسیں
میرے جیون کا سونا پن
شام کے پنچھی کا کچھ گانا
جیسے دل کی مدھم دھڑکن
شام کے آنچل میں کچھ تارے
تاروں سے پُر میرا دامن

شام اودھ کی میرا جوبن
مٹتا جاتا پل پل، چھن چھن!

عدا لمحہ بہ لمحہ

اجنتا کی طرف

خواجہ احمد عباس

ہو نہ ہو۔ یہ اجنتا کے سنگ تراش اور مصور، اس آخری غار کو ادھورا ہی چھوڑ کر چلے گئے۔ نہ جانے کیوں کیا واقعہ پیش آیا کہ آٹھ نو برس تک درجنوں نسلوں کی مسلسل محنت کے بعد اس غار کو وہ ادھورا چھوڑنے پر مجبور ہو گئے؟

"تمہارا کیا خیال ہے بھارتی ...."

پر بھارتی وہاں نہیں تھی۔ نہ گائیڈ تھا، کوئی نہیں تھا، نرمل کی آواز غار کی پتھریلی دیواروں سے ٹکراتی ہوئی، غلام گردش میں گھوم کر پھر واپس لوٹ آئی۔

شاید وہ اس اندھیرے، ادھورے غار کے کسی کونے میں اپنے خیالات میں گم ہو گیا تھا، اور بھارتی اور گائیڈ یہ سمجھ کر باہر چلے گئے تھے کہ ممکن ہے وہ تنگ آکر واپس چلا گیا ہو۔

اس کو اس غار میں گھومتے کافی عرصہ ہو گیا ہوگا کیونکہ دروازے کے باہر جو سامنے والی سرسبز پہاڑی نظر آتی تھی وہ کالی پڑ چکی تھی۔ غالباً آفتاب غروب ہو چکا تھا .... ایک بڑھتی ہوئی گھٹن کی طرح غار میں اندھیرا چھایا جا رہا تھا۔

نرمل باہر جانے کے لئے قدم بڑھا ہی رہا تھا کہ اس نے ایک مشعل کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اور وہ دیکھ کر متحیر رہ گیا کہ جو کوئی بھی یہ مشعل لئے آ رہا تھا وہ غار کے تنہا دروازے سے داخل نہیں ہوا تھا، بلکہ مخالف سمت سے آ رہا تھا، پھر اس نے سوچا کہ شاید گائیڈ اُسے ڈھونڈتے ہوئے غار کے کسی دوسرے اندھیرے کونے میں چلا گیا ہو، اور اب لوٹ رہا ہو۔

مگر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ مشعل ہاتھ میں لئے ہوئے جو آدمی گیروے رنگ کی کفنی پہنے ہوئے آیا تھا اس کو کسی کی تلاش نہیں تھی۔ اس نے ایک ادھورے ستون کے سہارے مشعل لگا دی اور اپنی کفنی کے کسی جھول میں سے ایک چھینی اور ایک ہتھوڑا نکال کر پتھر کو چھیلنے لگا۔

نرمل اس کی طرف بڑھنے والا ہی تھا کہ اس نے دیکھا کہ ویسی ہی گیروے رنگ کی کفنیاں پہنے، منڈے ہوئے سر کے درجنوں بھکشو مشعلیں لئے غار کے اندھیرے عقب میں سے نکلے چلے آ رہے ہیں۔

ان میں سے کسی نے بھی نرمل کی طرف توجہ نہیں دی سب اپنی اپنی چھینیاں اور ہتھوڑے نکال کر چھت اور دیواریں چھیلنے یا ستونوں کو گول بنانے میں مصروف ہوئے۔ چند دیوار پر مٹی کا لیپ کر کے اس کی سطح ہموار بنا رہے تھے تاکہ جب دیوار کھڑی ہو جائے تو مصور اپنی تصویروں کے رنگین نقوش بنا سکیں، اور غار پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آوازوں سے گونج اٹھا۔

چند منٹ تو نرمل اس پر حیرت منظر کو دیکھتا رہا پھر اس سے نہ رہا گیا، اور وہ اس سنگ تراش بھکشو کے پاس گیا جو سب سے پہلے غار میں داخل ہوا تھا۔

"معاف کیجئے میں آپ کے کام میں مخل ہو رہا ہوں، مگر مجھے آپ لوگوں کو مصروف دیکھ کر بڑا تعجب ہو رہا ہے۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ میں سمجھتا تھا کہ اس غار کی تعمیر ادھوری ہے اور یہ ادھورا ہی رہے گا۔"

"دنیا کی تعمیر بھی ادھوری ہے، انسان بھی ادھورا ہے مگر ان کی تکمیل ہونی ہی چاہئے۔"

اس جواب کو نرمل کچھ سمجھا، اور کچھ نہ سمجھا۔ پھر اس نے پوچھا۔

"آپ کب سے کام کر رہے ہیں؟"

"نو سو برس سے۔"

"نو سو برس؟ آپ کا مطلب ہے کہ آپ کی عمر..."

"میں اور مجھ سے پہلے میرا باپ، اور اس سے پہلے اس کا باپ اور اس سے پہلے اس کا باپ ایک نسل کے بعد دوسری نسل اور اس کے بعد تیسری نسل۔ آتما کے چکر کی طرح کام کا چکر تو چلتا ہی رہتا ہے۔"

"آپ کا نام؟" نرمل نے بات چیت کو ذاتی رنگ دینے کی کوشش کی۔

"میرا نام؟ کچھ نہیں۔ ہم سب بے نام ہیں۔"

اور نرمل کو یاد آیا کہ اس نے ان تمام غاروں میں کسی سنگ تراش یا کسی مصور کا نام کھدا ہوا یا لکھا ہوا نہیں دیکھا تھا۔

"پھر آپ کس لئے اتنا کام کرتے ہیں؟"

"کام کسی غرض سے نہیں کیا جاتا، انسان کام سے اپنی پیدائش کا مقصد پورا کرتا ہے۔"

"تو یہ کام کب ختم ہوگا؟"

"کون جانتا ہے؟"

"اس غار کو......."

"پورا ہونے میں دو برس لگیں گے، اس کے بعد دوسرا غار، اور اس کے بعد تیسرا......"

"تو کیا اجنتا کی تکمیل کبھی نہ ہوگی؟"

"ہوگی جب انسان کی تکمیل ہوگی۔"

نرمل کی شک پرستی اس کی حیرت پر غالب آئی اور اس نے کسی قدر تلخی سے پوچھا۔

"مہربانی کر کے مجھے سمجھائیے کہ ہزاروں برس سے جو آپ جیسے ہزاروں آدمی اتنی محنت کر رہے ہیں یہ کیوں اور کس لئے؟ یہ پہاڑ کی گود سے ترشے ہوئے غار، یہ مجسمے، یہ تصویریں، یہ صناعی، یہ مصوری؟ یہ کیوں اور کس لئے؟"

اس کی آواز میں تلخی کے بجائے جوش اور غصہ آ گیا۔

"بہتر ہوتا کہ اتنی محنت پتھروں میں گل کاری کرنے کے بجائے انسانوں کو انسان بنانے میں صرف کی جاتی تاکہ آج وہ ایک دوسرے کا خون نہ کرتے ہوتے آپ لوگوں نے سنگ تراشی اور مصوری کے یہ جادو گھر ہمیں دھوکا دینے کے لئے بنائے ہیں، یہ غار دنیا سے، اصلیت سے، سچائی سے فرار سکھانے کے لئے بنائے گئے ہیں۔"

سنگ تراش بھکشو کے چہرے پر ایک عجیب پرسکون مسکراہٹ تھی جس میں تلخی کا شائبہ بھی نہ تھا۔ صرف محبت اور رحم اور عمیق ادراک۔ اس نے اپنے کام سے نظر ہٹائے بغیر سر ہلا کر نرمی سے کہا۔

"نہیں۔"

نرمل کو اس آدمی کی مسکراہٹ، اس کے صبر اور سکون پر غصہ آ رہا تھا۔ اس نے چلا کر کہا۔

"تو پھر اجنتا کا کیا مقصد ہے؟ اجنتا کا کیا پیغام ہے؟"

"سنو۔" اور صرف اتنا کہہ کر وہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ غار میں مکمل خاموشی تھی، صرف پتھر پر لوہا پڑنے کی آواز۔

نرمل منتظر رہا کہ بھکشو اس کو اجنتا کا فلسفہ، اجنتا کا پیغام سنائے گا، مگر اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا صرف اس کی چھینی کی کھٹ، کھٹ، کھٹ، کھٹ اور پتھر کے پتلے پتلے پتر چھل کر فرش پر گرتے رہے۔

"تو کیا تم نہیں بتاؤ گے کہ اجنتا کا پیغام.......؟"

مگر دفعتاً نرمل کے اندھیرے دماغ میں سمجھ کی ایک کرن چمکی، اور اس کی زبان پر جملہ ادھورا رہ گیا۔

غار میں مکمل خاموشی تھی، صرف پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز ــــ یہی تھا اجنتا کا پیغام جسے وہ بھکشو نرمل کو سنانا چاہتا تھا۔

نرمل کی آنکھوں میں سمجھ کی نئی چمک دیکھ کر وہ راہب اپنی معصوم ادا سے مسکرا دیا۔ اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اور نرمل کو ایسا معلوم ہوا جیسے اُسے دفعتاً دنیا کا سب سے بڑا خزانہ مل گیا ہو۔ آب حیات، اکسیر، اس قیمتی نسخہ کے سامنے ہر چیز ہیچ تھی۔ اُسے اجنتا کا پیغام مل گیا تھا۔

نہ جانے کب تک وہ اس غار کے کونے میں بیٹھا ہوا پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آوازوں کو سنتا رہا۔

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ۔

اور ہر بار جب لوہے کی چھینی پتھر کی دیوار پر پڑتی تھی نرمل کو معلوم ہوتا کہ وہ زبانِ حال سے کہہ رہی ہے۔

عمل! عمل!! عمل!!! کام! کام!! کام!!! محنت! محنت!! محنت!!!

عمل سے پتھر موم کی طرح چھیلا جاتا ہے، عمل سے پہاڑ کی چٹانیں کاٹی جاتی ہیں۔ عمل سے پتھر میں گل کاری کی جاتی ہے۔ عمل سے تصویروں میں زندگی کا رنگ بھرا جاتا ہے عمل سے انسان انسان بنتا ہے، عمل ہی عبادت ہے، عمل خود عمل کا انعام ہے ....

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ

پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز آج نہیں تو کل سو برس میں نہیں تو ہزار برس میں، یہ پتھر ضرور چھل کر اور گھس کر سنگ تراشی اور مصوری کے نادر نمونے بنیں گے ایک دو کے ہاتھوں نہیں ہزاروں مل کر اُن کو تراشیں گے نسلوں کے بعد نسلیں اس کام کو جاری رکھیں گی، یہ کام کبھی ختم نہیں ہوگا، اس کی منزل کمال فن ہے۔

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ۔

امریکہ یا روس؟

پروفیسر آغا اشرف

آج سب سے اہم سوال جس پر دنیا کے مستقبل کا انحصار ہے روس اور امریکہ کے تعلقات کا ہے جب سے ان دونوں نے مل کر جرمنی کو شکست دی ہے وہ خلیج جو اُن کے درمیان موجود تھی وسیع ہوتی جا رہی ہے۔ اس لئے اس سوال کی اہمیت اس وجہ سے اور بھی زیادہ ہے کہ حالات دونوں میں سے ایک کا ساتھ دینے پر مجبور کر رہے ہیں یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ ملک دونوں جھگڑوں سے الگ رہ سکیں مگر اس وقت تو یہ بات بہت مشکل معلوم ہوتی ہے۔

موجودہ تہذیب کے بننے میں انقلاب فرانس اور صنعتی انقلاب کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ فرانس کے انقلاب نے یورپ میں سیاسی آزادی کی فضا پیدا کر دی اور صنعتی انقلاب نے معاشی آزادی دے کر زندگی میں کایا پلٹ کر دی۔ یہ سب کچھ انیسویں صدی میں ہوا۔ واقعات یہ شہادت دیتے ہیں کہ معاشی آزادی نے سیاسی آزادی کا گلا گھونٹ کر اس کو ایک ڈھکوسلا بنا کر اس نظام کی بنیاد ڈالی جسے ہم سرمایہ داری کہتے ہیں۔ اسی کی بدولت بڑی ترقی بھی ہوئی، مگر عوام کی زندگی پر یہ نظام کچھ ایسا چھا گیا کہ سیاسی آزادی کا دائرہ عمل بہت ہی محدود اور اکثر معدوم ہو گیا۔ فرانس کے مفکر روسو کا خواب جس کے نام پر فرانس کے انقلاب نے دنیا کو آزادی کا پیام سنایا تھا کتاب تک محدود رہا اور انسانیت گندے شہروں کی تاریک کوٹھریوں میں دم توڑنے لگی۔

ان حالات میں مارکس نے اپنا پیغام سنایا، مارکس اس بات کو خوب سمجھا تھا کہ متوسط طبقے کی نفع طلبی کی بدولت مزدور کیسے تباہ ہو رہے ہیں اور وہ برل فلسفہ کی آڑ میں کس طرح ان سے کھیل رہا ہے، سیاسی آزادی کے ساتھ مزدوروں کے لئے معاشی مساوات کا نسخہ پیش کیا گیا، اور یہ تحریک انیسویں صدی کی نصف آخر میں سب ہی ملکوں میں پھیلی۔

بیسویں صدی کے شروع میں اس تحریک نے روس میں زور پکڑا اور ۱۹۱۷ء میں مارکس کے خواب نے عملی جامہ پہنا۔ اشتراکیت اب ایک واقعہ بن گئی تھی، اور اسے محض اصولی بحث سے رد نہیں کیا جا سکتا تھا پچھلے تیس برس میں روس کے تجربے کو ناکام کرنے کے لئے جو کوششیں کی گئیں وہ انقلاب فرانس کے خلاف بھی کی گئی تھیں ان کی ناکامی اس حقیقت کا اعلان ہے کہ دنیا کی نئی اور انصاف پسند قوتوں کو فنا کر دینا یا بہت عرصے تک دبائے رکھنا ناممکن ہے۔

تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ فرانس نے انقلاب کے بعد نپولین کے ہاتھوں یورپ کے اکثر ملکوں کو فتح کر کے ان کی آزادی غصب کر لی تھی، یہ سب مل کر اسپین سے روس تک، نپولین کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کو شکست ہوئی۔ مگر اس شکست کے باوجود انقلاب کے اصول آہستہ آہستہ یورپ کے سب ہی ملکوں میں مقبول ہوئے، اور یوں آخری فتح ان کی ہوئی۔

آج تاریخ ایک ایسے ہی دور سے گذر رہی ہے روس میں جن اصولوں کی بدولت انقلاب ہوا، وہ اکثر ممالک کے بنیادی معاشی تناقض کو ختم کر سکتے ہیں۔ دنیا کی عام فضا اور رُخ کچھ اسی طرف مائل ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی پوری قوت اس وقت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ امریکہ میں دولت انفرادی آزادی اور بے پناہ وسائل کے ساتھ میکانکی جدت کمال کو پہنچ چکی ہے۔ روس میں ایک نیا ولولہ انسانوں کے اندر ایک اٹل اعتقاد اور اعتماد اور وہ طاقت جو اس سے پیدا ہوتی ہے دنیا کے لئے ایک نمونہ بن گئی ہے۔

اس تمہید کے بعد ہم ذرا غور سے دیکھنا چاہتے ہیں کہ دنیا کے وہ ملک جو الگ ہیں یا الگ رہنا چاہتے ہیں کیا کرتے ہیں یا کس طرف قدم بڑھاتے ہیں ان کا حقیقی فائدہ ہے۔

پہلے مشرقی یورپ کو لیجئے، یہاں پرانا نظام غائب ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے۔ ایک نئی زندگی اور ایک نیا جوش تعمیر نو میں مصروف ہے۔ یہ سب کچھ تو ہے مگر روس کے تجربے کی روشنی میں کام کر رہے ہیں اور اس کے زیر اثر ہیں۔ پولینڈ میں کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری الگ کر دئے گئے ہیں۔ حکومت میں ان کا ہاتھ اب بھی ہے۔ مگر ان سے جو شکایتیں تھیں وہ سب بند کی جا رہی ہیں، جب تک اشتراکیت کے اصولوں کو ہر ملک کے مخصوص حالات کے مطابق ڈھالنے کا اصول تسلیم کیا جاتا تھا۔ مسٹر گومل کا کی وفاداری پر شک نہیں کیا گیا تھا۔ اب ان پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ مارکس اور لینن کی تعلیم کو انھوں نے ادب آرٹ اور سائنس پر پوری طرح سے اثر انداز نہیں ہونے دیا، اپنی ملکی مصلحت کی بنا پر زراعت میں پوری تبدیلی نہیں کی، اور عام طور پر رجعت پسند قوتوں کے خلاف قدم نہیں اٹھایا۔ انگلستان کا ایک مشہور ترقی پسند اخبار لکھتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ انقلاب اپنے بہترین سپوتوں کو قربان کر رہا ہے اسی طرح یوگوسلاویہ کے لیڈر مارشل ٹیٹو کے خلاف روس میں سخت سخت الزام لگائے جاتے ہیں اور کومن فارم کے ذریعے ان مشرقی ممالک کے آزادی سے سوچ سمجھ کر اشتراکیت کو اپنانے میں رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں بس یوں سمجھئے کہ اشتراکیت اب روس کا ناقابل تقسیم اجارہ ہے۔ ... اس نسخے کو پڑھ سکتا ہے اور مریض کے لئے صرف اسی کے دواخانے سے دوا مل سکتی ہے جس طرح نپولین کے ہاتھوں روسو کا پیغام مسخ ہوا تھا، ویسے ہی خطرہ ہے کہ کہیں اسٹالن کے ہاتھ مارکس کا نسخہ مسخ نہ ہو جائے۔ شاید اشتراکیت روس کی قیادت ختم ہونے کے بعد جیسا کہ نپولین کی شکست کے بعد ہوا تھا سارے یورپ میں اپنائی جائے۔

آئیے ذرا دوسری طاقت کا بھی جائزہ لیں۔ امریکہ کے پاس نہ اصول ہے نہ کوئی پیغام ایک دولت مند ملک ہے جو اپنے ایک ایک ڈالر کے عوض میں کچھ نہ کچھ فائدہ چاہتا ہے۔ امریکہ جن ملکوں کی مشکل آسان کر رہا ہے، دراصل ان کو اور بے بس اور نکما بنانے کا سامان کر رہا ہے۔ اسے صرف روس کے خلاف ایک محاذ قائم کرنے سے مطلب ہے اور اپنی دولت کے بل پر وہ مغربی یورپ اور انگلستان تک کو استعمال کر رہا ہے۔ آئندہ موقع ملا تو اس سودے کے تہذیبی نقصانات بھی دکھانے کی کوشش کی جائے گی۔ اس وقت تو صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ دنیا کے بہت سے ملکوں کو روس کے خلاف استعمال کیا جا رہا ہے اور اگلی جنگ میں تو اور بھی زیادہ کیا جائے گا۔

امریکہ دولت کے نشہ میں چور ہے، اور روس اپنی قوت اور نئے جوش کی رو میں بہہ رہا ہے، ان دونوں کے درمیان جو ملک واقع ہیں وہ گویا چکی کے دو پاٹوں کے بیچ میں ہیں، فرانس میں حکومت آئے دن بدلتی رہتی ہے ایک حد تک تو یہ تلون ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے مگر آج کل اس وجہ سے بہت بڑھ گیا ہے کہ وہاں جو بھی حکومت بنتی ہے اس کی آنکھیں امریکن روپے کی طرف لگی ہوئی ہیں، روس سے دوستی کا تو کیا ذکر ہے، روس کے کسی اصول کو اپنانے سے بھی امریکن برہم ہو جاتے ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی سے کوئی مصالحت کرنے پر آمادہ نہیں حالانکہ اس کے بغیر معاشی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ امسال جو امریکہ کی طرف سے مارشل امداد مل رہی ہے اس میں فرانس کا سب سے زیادہ حصہ ہے، مگر اس سے بھی امید نہیں کہ معاشی بحران دور ہو سکے۔

ایشیا کے اکثر ملکوں کو بھی امریکہ اور انگلستان اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ چین میں چیانگ کائی شیک بھی امریکن روپیہ کے سہارے جی رہے ہیں۔ بہت بڑے ملکوں میں صرف ہندوستان باقی ہے اور سب کی نظر اس کی طرف ہے۔ ہمارے ملک کے سیاسی رہنماؤں کی آزمائش کا وقت ہے۔ امریکہ کی دولت کھینچ لے گئی تو اپنے مستقبل کو خود بنانے کی آزادی ختم ہو جائے گی اگر روس سے معاملہ کیا تو شاید ہماری سب سے بڑی اور بنیادی بیماری کا حل اس دوا سے جو روس کے دواخانہ میں ملتی ہے اور مفت ملتی ہے ہو جائے۔ مگر کبھی کبھی ایک بیماری کا علاج دوسری بیماری کا پیش خیمہ بھی بن جاتا ہے۔

ہماری رائے میں تو خود اپنے جمہور کی بے پناہ قوت پر اعتماد کر کے ہندوستان کی انتہائی ... جس میں نہ دولت کا نشہ ... نہ مذہب کا جنون زندگی ... معاشی جمہوریت، فرانس کی سیاسی آزادی، انگلستان کا اعتدال ان سب کو ... کے سلسلے میں ہندوستان ایک نئی زندگی کی تعمیر کر سکتا ہے۔ آج نہ تو اندھی تقلید سے اور نہ دنیا سے الگ ایک انوکھی دنیا بنانے سے کام چل سکتا ہے۔ ہماری نجات اس میں ہے کہ ہم اپنے اندر وہ اٹل اعتماد جو روس کی سب سے بڑی قوت ہے اور وہ کام کرنے کی دھن جو امریکہ کی سب سے بڑی دولت ہے پیدا کریں مگر نیا ہندوستان امریکہ یا روس کا ایک گھٹیا سا نمونہ نہ بن جائے بلکہ دنیا میں اپنی تہذیبی اور اخلاقی روح کو زندہ رکھ سکے کیا تعجب ہے کہ قدرت ہندوستان ہی کے ہاتھ سے یہ کام لے کہ روس اور امریکہ کے درمیان جو خلیج حائل ہے وہ دور ہو جائے اور جنگ کا خطرہ جس نے بدنصیب انسانیت کی نیند حرام کر رکھی ہے ٹل جائے۔

ترکی

ایک طائرانہ نظر

پریسیڈنٹ عصمت انونو

(ترجمہ از سید قاسم الحسنی)

پہلی عالمگیر جنگ ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی اور ۱۹۱۸ء کی خزاں میں ختم ہوئی۔ اور ۱۹۱۹ء و ۱۹۲۰ء میں سب قوموں سے صلح کے عہدنامے ہوئے صرف ترک باقی رہ گئے۔

اس جنگ میں ترکی نے سلطنت عثمانیہ کی حیثیت سے حصہ لیا۔ جب ۱۹۱۸ء اور ۱۹۱۹ء میں اتحادیوں نے ملک پر قبضہ کرنے کے لئے پہلے حملہ کیا تو ترک عوام نہایت جوش کے ساتھ فاتحین کے خلاف اپنے قومی وجود کی حفاظت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

یہ قومی جدوجہد جس کو ترک "جنگ آزادی" کہتے ہیں چار سال تک جاری رہی اور ترکی کے لئے پہلی فتح صلح نامہ لوزان کی تکمیل پر ۱۹۲۳ء میں ختم ہوئی۔

دس سال کی جنگ کے بعد ترکی اپنی سلطنت کھو چکا تھا اس کے سب سے زیادہ خوشحال علاقوں سے سخت نقصان اٹھایا تھا۔ اور ملک مادی حیثیت سے ختم ہو چکا تھا لیکن اس بات سے کہ تمام عالم کو اس کے قومی مقصد کو تسلیم کرنا پڑا ترکی نے عوام میں ایسی اخلاقی جرأت اور خود اعتمادی پیدا کر دی گویا کہ وہ فتحیاب ہوئے تھے۔

۱۹۲۳ء میں قوم کی قوت عمل اور عزم سے ترکی جمہوریت کا قیام عمل میں آیا۔ جمہوریت نے جو تبدیلیاں پیدا کیں محض ریاست کی شکل ہی تک محدود نہ تھیں، بلکہ انھوں نے قوم کی تمدنی اور سیاسی تنظیم کو بھی یکسر بدل دیا۔

سلطنت عثمانیہ کی بنیاد مذہب پر اور جبر کے قانون پر تھی۔ جدید ترکی ایک عوامی جمہوریت بن گئی۔ مسلسل اصلاحات کے بعد ایک ایسی ریاست وجود میں آئی جس میں جدید ترین اصولوں نے قرون وسطیٰ کے نظریات کی جگہ لے لی۔ افراد کے حقوق کے تعین کے لئے سوئس سول کوڈ اختیار کیا گیا۔

اب تک عورتیں قانوناً آزادی سے محروم تھیں۔ اب ان کو سماج میں مناسب جگہ ملی۔ ان کو مکمل حق انتخاب دیا گیا اس طرح سے وہ مجلس ملی کی رکن ہو سکتی ہیں۔

۱۹۲۸ء میں ترکی زبان لکھنے کے لئے عربی حروف کو چھوڑ کر لاطینی حروف اختیار کئے گئے۔ نمایاں تبدیلیوں اور اصلاحوں میں یورپین ہیٹ اختیار کیا گیا جس نے بیرونی دنیا کی نظر میں ترک کی ہیئت تبدیل کر دی

ترکی جمہوریت کے قیام نے چار پانچ سال کے اندر اندر ملک کی صدیوں پرانی روایات کو ختم کر دیا، اور ترکی کو اس مسئلے کا سامنا کرنا پڑا کہ ملک کی بحالی کے لئے اقتصادی اور تمدنی ضروریات کیسے پوری کی جائیں۔

ترکی جمہوریت کا رقبہ ۷۶۸۰۰۰ مربع کیلومیٹر ہے انقرہ جمہوریت کا صدر مقام ہے، استنبول ازمیر ادرنہ بروسہ، اسکی شہر، غازی عینتاب، قونیہ، سیواس، ارضروم قارص، دیاربکر، طرابزون اور سمسون اہم شہر ہیں۔

۱۹۳۵ء کی مردم شماری کی رو سے ملک کی آبادی ۱۶۰۹۱۸۸۶ ہے۔ ۱۹۴۰ء کی مردم شماری کی رپورٹ ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ لیکن ۱۹۳۵ء کی مردم شماری کی رو سے ترکی بولنے والی آبادی کا تناسب ۹۰ فی صدی تھا۔ اور مسلمانوں کا تناسب ۹۸ فی صدی تھا۔ ترکی کا یہ بنیادی قانون ہے کہ اقتدار اعلیٰ غیر مشروط طور پر جمہور کے ہاتھ میں ہے ترکی قوم کی کامل نمائندگی مجلس ملی کبیر کرتی ہے۔

ترکی جمہوریت میں مقننہ اور عاملہ کے اختیارات مجلس ملی کبیر کو حاصل ہیں۔ عاملی اختیارات کا استعمال مجلس وزراء کرتی ہے جس کو صدر جمہوریت نامزد کرتا ہے اور وہ خود مجلس (کابینہ) کے ذریعے منتخب ہوتا ہے مدت صدارت ۴ سال ہے۔ اور صدر ارکان مجلس میں سے منتخب ہوتا ہے مرد اور عورت ۲۲ سال ختم کرنے پر ووٹ دینے کا حق رکھتے ہیں۔ مجلس ملی کبیر کے انتخابات ہر چار سال بعد عمل میں آتے ہیں۔ ۱۹۲۳ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان مندرجہ ذیل صدر جمہوریت منتخب ہوئے کمال اتاترک (۲۹ اکتوبر ۱۹۲۳ء تا ۱۰ نومبر ۱۹۳۸ء) عصمت انونو (۱۱ نومبر ۱۹۳۸ء)

۱۹۳۷ء سے مندرجہ ذیل وزیر اعظم ہوئے جلال بایار (۲۵ اکتوبر ۱۹۳۷ء تا ۲۵ جنوری ۱۹۳۹ء) ڈاکٹر رفیق سیدام (۲۵ جنوری ۱۹۳۹ء تا ۸ جولائی ۱۹۴۲ء) شکری سراج اوغلو (۹ جولائی ۱۹۴۲ء تا ۷ اگست ۱۹۴۶ء) رجب پیکر (۷ اگست ۱۹۴۶ء تا ۱۰ ستمبر ۱۹۴۷ء) حسن ساکا (۱۰ ستمبر ۱۹۴۷ء ......)

داخلی سیاست کے میدان میں سب سے اہم تاریخی واقعہ ۱۰ نومبر ۱۹۳۸ء کو صدر اتاترک کی موت ہے۔ سب متمدن قوموں نے اتاترک کے لئے عزت اور احترام کا مظاہرہ کر کے ترکوں کے دل فخر سے معمور کر دئے۔ تمام دنیا کہتی تھی کہ اتاترک کی موت کے بعد ترکی تمدنی اور سیاسی میدانوں میں کس طرح ترقی کر سکے گا۔ مگر واقعات نے ایک دفعہ پھر ثابت کر دیا کہ جمہوریت کی بنیاد مستحکم ہے۔

ترکی جمہوریت کی بیرونی حکمت عملی کی بنیاد پر خلوص امن پسندانہ پالیسی پر رہی ہے جس کا مقصد اپنے ہمسایوں سے اچھے تعلقات قائم رکھنا ہے۔ یونان سے ۵۰۰ سال کی دشمنی کو ختم کر دیا گیا۔ عرب ملکوں اور ایران کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم کئے جیسے ہمسایوں میں ہونے چاہئیں بلغاریہ سے بھی خاصے اطمینان بخش تعلقات تھے۔

۱۹۳۷ء میں ترکی کی خارجی پالیسی کا نقشہ یہ تھا روس کے ساتھ دوستانہ تعلقات جاری رہے۔ برطانیہ عظمیٰ سے جو دشمنی جنگ آزادی کے دوران میں تھی اس کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا۔ اور دونوں ملکوں میں صریحاً دوستی ہو گئی

ترکی اور فرانس کے درمیان مسئلہ ہٹے پر نزاع تھی، جب یہ مسئلہ باہمی گفت و شنید سے طے ہو گیا دونوں ملکوں کے تعلقات بہتر ہونے لگے۔

ترکی جمہوریت اور اطالیہ کے درمیان تعلقات مختلف اوقات میں تبدیل ہوتے رہے یوں تو باہمی ملاقاتیں سرکاری طور پر جاری رہیں اور دونوں ملک مختلف اوقات میں باہمی دوستی کا اظہار کرتے رہے لیکن مسولینی کی توسیع مملکت کی پالیسی اور تسلط کی دور کی بلند بانگ تقریروں سے ترک دل میں کھٹکتے تھے۔ آخر ایک وقت دونوں ملکوں کا طرز عمل ایک دوسرے کے ساتھ یکایک معاندانہ ہو گیا۔ اور باہمی اعتماد ختم ہو گیا۔ جنگ حبشہ کے دوران میں ترکی نے اطالیہ کے خلاف کارروائی کرنے کی تجویز کے بارے میں اقوام عالم کے فیصلے کی تائید کی، اور برطانیہ عظمیٰ کے مجوزہ فوجی اقدام کی حمایت کی۔

۱۹۳۸ء تک جرمنی سے ترکی کے تعلقات زیادہ تر اقتصادی تھے۔ عظیم اقتصادی بحران کے بعد جو ۱۹۲۹ء میں شروع ہوا، اور اب تک جاری ہے۔ ترکی کو بھی دوسرے ملکوں کی طرح بیرونی تجارت کے بارے میں منصوبہ بندی کی پالیسی پر عمل کرنا پڑا اور بیرونی سکے کے حاصل کرنے میں اسے جن مشکلات کا سامنا ہوا، انھوں نے اسے جرمنی کے ساتھ اور زیادہ تجارتی تعلقات قائم کرنے پر مجبور کر دیا۔

ترکی کی ترقی اور ان اصلاحات کو جو اس نے نافذ کی ہیں ریاستہائے متحدہ امریکا ہمدردی کے ساتھ دیکھ رہا ہے۔ جمہوریت کے ابتدائی دور سے ہر امریکی سفیر جو ترکی میں ریاستہائے متحدہ امریکا کا نمائندہ ہو کر آیا ترکی عوام کی سی طرز زندگی کی تعریف کی ہے۔ اور ہر طرح ہماری ہمت افزائی کی ہے۔ امیرالبحر برسٹل، مسٹر گرو اور جنرل شیرل جیسے مدبروں کے نام سے ترک ہمیشہ ایک خاص مسرت محسوس کرتے ہیں۔

انجمن اقوام کے رکن کی حیثیت سے ترکی نے اجتماعی امن کی تجویز کو قابل عمل بنانے کے لئے نہایت سرگرمی سے کام کیا۔ ۱۹۳۴ء میں اس نے رومانیہ، یونان اور یوگوسلاویہ سے مل کر "وفاق بلقان" کی بنیاد ڈالی۔ ایک دوسرے کی سرحدوں کی حفاظت کرنا اور بلغاریہ کو دوست بنا کر اپنے ساتھ ملا لینا وفاق کا خاص مقصد تھا۔ لیکن جہاں تک بڑی طاقتوں سے تعلقات کا سوال تھا ارکان وفاق پر کوئی پابندی نہ تھی

مشرق وسطیٰ کے سیاسی معاہدات میں سے معاہدہ سعدآباد بھی جس میں ترکی ایران، عراق، اور افغانستان شامل تھے، خاص طور پر ذکر کا مستحق ہے۔ اس معاہدہ کا مقصد آپس میں دوستی قائم کر کے سیاسی اور تمدنی معاملات میں ایک دوسرے کو مدد دینا تھا مگر ایسی کوئی دفعہ شامل نہ تھی کہ معاہدہ کرنے والے ایک دوسرے کی فوجی امداد کے پابند ہوں۔

ترکی کے لئے ایک اہم سیاسی واقعہ ۱۹۳۶ء میں صلح نامہ مانتریو پر دستخط کرنا تھا۔ مانتریو میں اس صلحنامہ پر نظرثانی کی گئی جو آبنائے (دردانیال) کے بارے میں زبردستی ترکی کے سر منڈھ دیا گیا تھا۔ صلح نامہ کی رو سے دردانیال کو غیر مسلح کر دیا گیا تھا اور بحر روم کی ریاستوں کے جنگی جہازوں کو گزرنے کی اجازت تھی بشرطیکہ ان کا وزن بحر اسود کی سب سے زیادہ زبردست بحری طاقت سے زیادہ نہ ہو۔ روس نے اس صلح نامہ کی تصدیق نہیں کی تھی۔ اب صلح نامہ مانتریو سے جس نے

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

بچوں کا ملک

ثریا قمر

(آپ نے بہت سے ملک اور شہر دیکھے اور ان کے حالات پڑھے ہوں گے۔ لیکن ایسا ملک کم دیکھا اور کم پڑھا ہوگا جہاں صرف چھوٹے چھوٹے بچے بستے ہوں۔ ان ہی کا راج ہو۔ اور ملک کا سارا کاروبار وہ خود چلاتے ہوں۔ آئیے آج آپ کو ایسے ملک کی سیر کرائیں)

عجیب و غریب ملک بلگریڈ سے چھ میل کے فاصلے پر ایک سرسبز وادی کے دامن میں آباد ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں صرف ۶ سال سے ۱۴ سال تک کے بچے رہتے ہیں، اور اس کا نام بچوں کا ملک ہے۔ اس کی آبادی ۵ ہزار ہے۔ یہاں کے باشندے لکڑی کے چھوٹے چھوٹے خوش نما مکانوں میں رہتے ہیں اور سب سے عجیب بات یہ کہ یہ ننھے منے بچے اپنے ملک کے سارے کام خود ہی بڑے انہماک، خوش اسلوبی اور قابلیت سے انجام دیتے ہیں۔ چنانچہ روزمرہ کے معمولی کاموں کے علاوہ یہ اپنی ریلیں چلاتے ہیں وہ اپنی پولیس چوکی کا انتظام کرتے ہیں۔ شہر کے نظم و ضبط کو قائم رکھتے ہیں اور ڈاک تار کا بندوبست کرتے ہیں۔

بچوں کے اس ملک کو بلگریڈ سے ملانے کے لئے چھ میل لمبی ایک چھوٹی ریلوے لائن بنائی گئی ہے، جس پر ایک چھوٹی سی گاڑی چلتی ہے۔ اس گاڑی پر کام کرنے والے بھی یہی چھوٹے بچے ہوتے ہیں۔ ان کو ریل کے کام سے اتنی دلچسپی ہے کہ ہر ایک کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے لئے اسی کا انتخاب ہو جائے۔ چنانچہ ان میں اپنی اہلیت ثابت کرنے کے لئے خوب خوب مقابلہ ہوتا ہے۔

اس چھوٹے سے ملک کے آباد کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بلگریڈ کے یہ چھوٹے بچے شہر کی شدید اور مضر صحت گرمی سے محفوظ رہ سکیں، اور باہر کی کھلی فضا اور صاف ستھری ہوا میں آزادی سے سانس لے سکیں۔ چنانچہ جنگل کا ایک حصہ صاف کر کے سفید لکڑی کے مکانات بنائے گئے ہیں سڑکوں اور باغات کے نقشے خود بچوں نے اپنی پسند اور مرضی کے مطابق تیار کئے ہیں۔ اس ملک میں کوئی بے کار نہیں رہ سکتا۔ ہر ایک کو اپنی پسند کے مطابق کوئی نہ کوئی کام کرنا پڑتا ہے۔ یکسانی پیدا کرنے کے خیال سے کام کرتے وقت ہر بچہ ایک خاص قسم کی وردی پہنتا ہے۔

یہاں کے رہنے والے بچے ملک کا انتظام چلانے کے لئے اپنی مجلس عاملہ، مجلس مشورہ اور اپنے لیڈر خود چنتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ پوری تن دہی، ذمہ داری اور دیانت سے اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔

ان بچوں نے اپنے ملک میں ایک پکچر گیلری بھی بنا رکھی ہے، جہاں وہ اپنے ناموروں، ممتاز سائنس دانوں، اچھے کھلاڑیوں، اور ہونہار طالب علموں کی بڑی بڑی تصویریں اور دوسری نشانیاں رکھتے ہیں۔

قوم کی اس نئی پود کو صحیح زندگی سے روشناس کرانے کے لئے مل جل کر رہنے اور اتحاد کی فضا پیدا کرنے کی تعلیم ابھی سے دی جاتی ہے تاکہ یہ سب اوصاف ان کے دل و دماغ میں رچ بس جائیں اور یہ بڑے ہو کر ان کو حقیقی زندگی میں برت سکیں۔

بچوں کی اس قسم کی ذہنی اور عملی تربیت کے تجربے یوگوسلاویہ میں اب خاصے بڑے پیمانے پر ہو رہے ہیں۔ ملک کا ہر بچہ کم سے کم پندرہ دن کے لئے اس بچوں کے ملک میں ضرور بھیجا جاتا ہے جہاں وہ اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ مل جل کر زندگی گذارتا ہے۔ اور اس طرح اس کے اندر بچپن ہی سے تعاون کا جذبہ اور خلوص کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔

بچوں کے کاموں میں بڑے لوگ بالکل دخل نہیں دیتے، بلکہ ان کو پورا موقعہ دیتے ہیں کہ وہ اپنے سارے کام اپنی طبیعت اور پسند کے مطابق کریں۔ اس طرح ان میں خود اعتمادی اور کاموں کو سوچ سمجھ کر کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ ان میں سے کوئی انجینیری کے فرائض انجام دیتا ہے تو کوئی ڈرائیوری کے، کوئی گارڈ کا کام کرتا ہے تو کوئی مال افسر کا۔ کسی کے سپرد وزارت عظمیٰ کی ذمہ داریاں ہوتی ہیں تو کسی کو قلمدان نیابت ملتا، کوئی کوتوال ہوتا ہے تو کوئی تھانیدار۔ غرض شہر سے متعلق ہر قسم کے انتظامی، عاملانہ، اور

ص۔ رفاہی کام یہی چھوٹے بچے کرتے ہیں اور اتنی خوبی اور خوش اسلوبی سے کہ کسی ترقی یافتہ شہر کے مقابلے میں برا نہیں ہوتا۔ بلکہ نمونے کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

(ترجمہ)

انسانی زندگی کا مقصد

جیٹھانند

انسانی زندگی بے مقصد نہیں۔ اگر زندگی بغیر مقصد کے ہوتی تو روئے زمین پر انسان کی زندگی کا کوئی مطلب ہی نہ ہوتا اور اس دنیا میں پیدا ہونا نہ ہونا اس کے لئے ایک سا ہوتا۔ حیوان اور انسان کی زندگی میں بڑا فرق ہے۔ حیوان کے پاس فقط جسم ہے، دماغ نہیں۔ لیکن انسان کو خداوند تعالےٰ نے دونوں چیزیں جسم اور دماغ بخشے ہیں۔ حیوان کی زندگی کا دارومدار محض فطری جبلتوں پر ہے یعنی عقل وہاں بہت تھوڑا کام کرتی ہے۔ لیکن انسان میں عقل ہی سب کچھ ہے۔ یہی عقل اس کے دماغ کا بہترین حصہ ہے، اور اسی کی بدولت انسان اشرف المخلوقات ہے۔ بعض اوقات اس کا درجہ فرشتوں سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ دنیا میں تہذیب کی ساری برکتیں انسان کے دماغ کی اختراع ہیں

یوں دیکھنے میں انسان کی زندگی بھی اسی طرح بسر ہوتی ہے جیسے حیوانوں کی بچپن میں وہ کھیل کود کا شوقین ہوتا ہے۔ جب جوانی آئی تو اس کی خواہشات بھی جوان ہو جاتی ہیں۔ اور وہ گرہست آشرم میں اتنا مگن ہو جاتا ہے کہ اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہے۔ جیسے بھونرا کنول کے پھول پر اتنا مست ہوتا ہے کہ جب تک وہاں سے اٹھنے کا خیال کرتا ہے تو پھول بند ہو جاتا ہے اور بھونرا اس کے بیچ میں رہ جاتا ہے بڑھاپا آتا ہے۔ اعضا ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ جوانی کی شوخیاں اور امنگیں مفقود ہو جاتی ہیں، ہاضمہ خراب، حوصلہ پست آخر دنیا سے کوچ کر جاتا ہے۔ بس یہ انسان کی زندگی کا نقشہ ہے، لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد صرف یہی ہے تو واقعی اس میں اور دوسری مخلوق میں فرق نہیں، لیکن انسان سب سے افضل مانا گیا ہے۔ اس لئے اس کا مقصد بھی اعلیٰ اور افضل ہونا چاہئے۔ ایک مہذب انسان کا فرض ہے کہ وہ ذاتی فائدے کی بجائے جماعتی فائدے کو مطمح نظر بنائے۔ اس لئے اگر ہم اس سوال پر غور کریں۔ کہ انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے تو اس کے سوا کوئی جواب نہ ملے گا۔ کہ انسان کی خدمت ہی انسان کی زندگی کا واحد اور حقیقی مقصد ہے۔ دنیا میں انہی لوگوں نے کامیاب اور مطمئن زندگیاں بسر کی ہیں جنھوں نے اپنے ذاتی فائدوں اور ذاتی خواہشات کو پس پشت ڈال کر ابنائے جنس کی خدمت کو اپنا شعار بنایا۔ دوسروں کے آرام کو اپنے آرام پر مقدم سمجھا۔ دوسروں کی خوشی کو اپنی خوشی اور دوسروں کے غم کو اپنا غم خیال کیا جن شاعروں اور ادیبوں نے اپنی زندگی میں عالم گیر قبولیت حاصل کی اور مرنے کے بعد بقائے دوام کا تاج پہنا۔ یہی ایثار پسند اور اخلاق پیشہ ارباب فکر و نظر تھے جو سارے جہاں کے درد کو اپنا درد سمجھتے تھے کسی نے خوب کہا ہے ؎

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

خدا کے بندوں سے محبت کرنا ہی خدا سے محبت کرنا ہے۔ انسان کی فلاح و بہبود ہی ان بزرگوں کا نصب العین تھا۔ جنھوں نے آپ بیتی کا راگ الاپنے کی بجائے جگ بیتی کے نغمے گائے۔ اور اپنی خودی کو عالم انسانیت کی زندگی میں تحلیل کر دیا۔

سوامی رام تیرتھ صاحب بھی لکھتے ہیں۔ ایشور کا نظارہ اپنے جذبات میں ہو سکتا ہے۔ اگر انسان اس اصول کو سمجھتا۔ پہچانتا اور اس پر عمل کرتا ہو تبھی وہ انسان کہلانے کا حق دار ہے۔ یہی انسانی زندگی کا مقصد ہے۔

ادارۂ تحریر

ڈاکٹر سید عابد حسین - صالحہ عابد حسین - عبد اللطیف اعظمی

تاریخ اشاعت: یکم ، ۸ ، ۱۹۴۸ ، ۲۴

چندہ: سالانہ ۶ روپے، ششماہی للعہ

اجنتا کی طرف

(بسلسلہ صفحہ ۸)

پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز آج نہیں تو کل، سو برس میں نہیں تو ہزار برس میں انسان کی فطرت کے پتھر چھیل کر تراش کر حسن اور خوب صورتی، فن اور علم کے نادر نمونے ضرور بنیں گے۔ ایک دو کے ہاتھوں نہیں، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں، تمام نسلیں مل کر ان کو تراشیں گی۔ نسلوں کے بعد نسلیں اس کام کو جاری رکھیں گی اس کی منزل تکمیل انسانیت ہے۔

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ۔

پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز۔ نرمل نے دیکھا کہ راہب اپنے کام میں اتنا مستغرق تھا کہ اُسے معلوم بھی نہ ہوا کہ کب ہتھوڑے کی چوٹ اس کے انگوٹھے پر پڑ گئی۔ زخم سے لال لال لہو کی بوندیں ٹپک کر پتھر کے فرش پر گر رہی تھیں۔

دفعتاً نرمل کو وہ تمام تصویریں یاد آگئیں جو اس نے تمام غاروں میں دیکھی تھیں ہزاروں برس کے بعد بھی کتنے تازہ کتنے شاداب تھے ان کے رنگ۔ اور نہ جانے کیوں نرمل نے سوچا کہ ان تصویروں کی لالی میں انسان کے خون کا رنگ ہے۔ جبھی تو وہ اتنی جیتی جاگتی ہیں۔ جبھی ان میں اتنی زندگی ہے۔

شاید وہ سو گیا، شاید وہ اپنے خیالات میں کھو گیا۔

جب اس کو ہوش آیا تو غار طلوع آفتاب کی دھیمی دھیمی ترچھی کرنوں سے روشن ہو رہا تھا۔ مگر ہر طرف سناٹا تھا نہ وہ سنگ تراش تھے نہ مصور، نہ مشعلیں۔

تو کیا اس نے خواب دیکھا تھا؟ شاید ..... کتنا عجیب خواب!

اس نے سوچا

ہاں خواب ہی ہوگا۔ رات بھر اس ماحول میں گزار کر کوئی تعجب نہیں کہ میرے تخیل نے ایسی کیفیت پیدا کر دی ہو۔

مگر باہر جانے کے وقت جب وہ اس ستون کے قریب سے گزرا جس کو اس کے خواب کا راہب تراش رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ ستون پر ایک پھول کھدا ہوا ہے جو کل نہیں تھا، یا شاید یہ بھی اس کا واہمہ ہی ہو۔

پھر کچھ یاد آکر اس کی نظریں فرش پر گئیں، وہاں سرخ موتیوں کی طرح تازہ خون کی کئی بوندیں پتھر پر بکھری ہوئی تھیں۔

نرمل جیارتی سے ملے بغیر اسٹیشن پہنچ گیا، اگلے دن اتوار تھا، اور اُسے شانتی دل کے جلسے میں احمد کی تجویزوں کی حمایت کرنے کے لئے پہنچنا ضروری تھا۔ بمبئی سے فساد سے، زندگی سے فرار ملنا ہی نہیں ہوا۔

ریل میں ایک ہم سفر نے پوچھا۔

آپ شاید اجنتا ہو کر آرہے ہیں؟"

اور نرمل نے جواب دیا۔

"جی نہیں۔ میں اجنتا کی طرف جا رہا ہوں!" (زعفران کے پھول)

ترکی

(بسلسلہ صفحہ ۱۰)

روس نے بھی دستخط کر دیئے اور دردانیال کو قلعہ بند کرنے میں ترکی کے حق کو تسلیم کیا۔ تجارتی جہازوں کو آنے جانے کی عام آزادی دی گئی، زمانۂ امن میں بحر اسود کی بحری طاقتوں کے جنگی جہاز بغیر کسی وزن کی پابندی کے گذر سکتے ہیں۔ مگر دوسری طاقتیں زمانۂ جنگ میں کل .... ۳ ٹن سے زیادہ وزن کے جہاز گذارنے کا حق نہیں رکھتیں۔ اور ترکی کے غیر جانب دار ہونے کی صورت میں جنگ آزما ملکوں کے جہاز نہیں گذر سکتے۔ اگر ترکی شریک جنگ ہو یا اپنے کو زبردست خطرات یا جنگ کی زد میں محسوس کرے تو جنگی جہازوں کے گذرنے کا معاملہ حکومت ترکی کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دیا جائے گا صلح نامہ مانٹرو (نمبر ۲) میں ایک ضمیمہ کا اضافہ کیا گیا جس میں ۱۹۳۶ء کے لندن کے بحری صلحنامہ کے تمام ضروری نکات جوں کے توں شامل کر لئے گئے یعنی جنگی جہازوں اور معاون کشتیوں کے اوزان اور خصوصیات کا تعین کر دیا گیا۔ پھر بھی دوسری جنگ عظیم میں تفصیلات ناکافی پائی گئیں۔

ترکی روس اور برطانیہ عظمیٰ دونوں سے اچھے تعلقات رکھنے کو یکساں اہم سمجھتا تھا۔ ایک بات ترکی کے لئے باعث اطمینان تھی کہ ان دنوں برطانیہ عظمیٰ اور روس کے باہمی تعلقات بہتر ہو گئے تھے۔ ترکی کو یہ فکر تھی کہ کہیں چکی کے دو پاٹوں کے بیچ میں پس نہ جائے۔ اس لئے ۱۹۳۹ء کے معاہدۂ میونخ سے اُسے خاصی پریشانی ہوئی۔ لیکن ترکی کا خیال تھا کہ محوری طاقتوں کے خلاف روس، برطانیہ عظمیٰ اور فرانس نے جو محاذ بنایا ہے اس میں اس معاہدے سے کوئی اہم تبدیلی واقع نہیں ہوگی۔

بہار ۱۹۳۹ء میں ترکی اور بلقانی ملکوں میں اس خبر سے سخت بے چینی پھیلی کہ جرمنی نے چیکوسلوواکیہ پر اور اطالیہ نے البانیہ پر حملہ کر دیا ہے۔ جب جرمنی پر بالکل اعتماد نہیں رہا تو برطانیہ نے چھوٹی طاقتوں کی حفاظت کی ضمانت دینا چاہی جو مشرقی یورپ میں حملے کی زد میں تھیں۔ مگر سوا پولینڈ کے ان میں سے کسی نے مجوزہ ضمانتوں کے بارے میں آمادگی ظاہر نہیں کی۔ بلکہ کچھ چھوٹی طاقتوں نے تو ان کو منظور کرنے سے انکار کر دیا۔

اب ترکی برطانیہ عظمیٰ اور فرانس میں حفاظت کے سلسلے میں گفتگو شروع ہوئی ترکی نے شروع ہی سے روس سے تعاون پر زور دیا اور اسے یقین تھا کہ برطانیہ عظمیٰ اور فرانس بھی روس سے تعاون کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ترکی اور برطانیہ کے درمیان ۱۲ مئی ۱۹۳۹ء کو اور ترکی اور فرانس کے درمیان ۲۳ جون ۱۹۳۹ء کو ابتدائی معاہدوں پر دستخط ہوئے۔ مگر ان کی تکمیل اس تیزی سے نہ ہو سکی جس کی توقع تھی۔ اس عرصہ میں برطانوی اور فرانسیسی وفد ماسکو چلے گئے تھے انھوں نے روس کے ساتھ گفت وشنید شروع کر دی تھی۔

ترکی کو ۱۹۳۹ء میں روس اور مغربی طاقتوں کی گفت وشنید کی صحیح نوعیت معلوم نہیں تھی لیکن اسے پورا یقین تھا کہ یہ گفت وشنید کامیاب ہوگی۔ جن معاہدوں نے ترکی کو برطانیہ عظمیٰ اور فرانس کی صف میں شامل کر دیا ان پر جرمنی اور اطالیہ میں سخت ناراضی کا اظہار کیا گیا۔ ترکی کے خلاف سخت الزامات لگائے گئے اور دھمکیاں دی گئیں۔ یہ تھی وہ فضا جس میں برطانیہ عظمیٰ فرانس اور روس کی گفت وشنید کے نتیجے کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ دفعتہً گفت وشنید کے ٹوٹ جانے کا اعلان ہوا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ روس اور جرمنی کے مابین ایک معاہدہ پر دستخط ہوئے ہیں، پھر یکم ستمبر کو پولینڈ کی جنگ چھڑ گئی۔ ترکی جمہوریت کو سخت مایوسی ہوئی کہ روس اور برطانیہ کی دوستی کے بارے میں اس کی آرزوئیں مٹی میں مل گئیں۔ (باقی آئندہ)

طابع و ناشر: ... عبد اللطیف اعظمی، دہلی جامعہ

مطبوعہ جید پریس دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۱ ۔ نمبر ۲۰ | ۸ ر نومبر ۱۹۴۸ء | ایڈیٹر:۔ ڈاکٹر سیّد عابد حسین

محبّت کا قانون

مہاتما گاندھی

(سنہ ۱۹۳۱ء میں گاندھی جی گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے انگلستان جا رہے تھے۔ جہاز میں شام کی پرارتھنا کے بعد وہ مختلف مسئلوں پر گفتگو کرتے تھے اور لوگوں کے سوالوں کے جواب دیتے تھے۔ ایسی ہی ایک گفتگو کا خلاصہ یہ ہے)

"جان بوجھ کر یا بے جانے بوجھے ہم روزمرہ ایک دوسرے کے ساتھ عدم تشدد سے پیش آتے ہیں۔ میں نے اس حقیقت کا مشاہدہ کیا ہے کہ زندگی ہلاکت کے درمیان قائم رہتی ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہلاکت کے قانون سے برتر ایک قانون موجود ہے۔ اسی قانون کے ماتحت منظم معاشرے کا وجود ممکن ہے اور زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکتی ہے۔ جب قانونِ حیات یہی ٹھہرا تو ہمیں اپنی روزمرہ زندگی میں بھی اسی کی پابندی کرنا چاہیئے۔ جہاں کہیں کوئی نزاع پیش آئے، جب کبھی آپ کا کسی حریف سے مقابلہ پڑ جائے اس پر محبت کے ذریعے فتح حاصل کیجئے۔ میں نے بہت بھلے طریقے سے اپنی زندگی میں اس قانون پر عمل کیا ہے۔ اس سے یہ تو نہیں ہوا کہ میری ساری مشکلیں حل ہو گئی ہوں، مگر یہ میں نے ضرور دیکھا کہ محبت کے قانون سے جتنا کام چلتا ہے، ہلاکت کے قانون سے ہرگز نہیں چلتا۔ ہندوستان میں ہم نے اس قانون کی عمل درآمد بہت بڑے پیمانے پر اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ میرا یہ دعوےٰ نہیں کہ عدم تشدد کا پیام تیس کروڑ آدمیوں تک پہنچ چکا ہے، لیکن یہ میں کہہ سکتا ہوں کہ جتنی دور تک اتنے تھوڑے سے وقت میں یہ پیام پہنچا ہے اور کوئی آج تک نہیں پہنچا۔ ہم سب مساوی حد تک عدم تشدد کے پابند نہیں رہ سکے اور ہم میں سے بہتوں کے لئے یہ محض ایک طرزِ عمل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس پر بھی آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ ملک نے عدم تشدد کے سایۂ عاطفت میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔

ایک اور سوال کے جواب میں انھوں نے فرمایا "عدم تشدد کی ذہنی کیفیت پیدا کرنے کے لئے اچھی خاصی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے، اسے اپنی روزمرہ کی زندگی کا ضابطہ بنانا پڑتا ہے، خواہ دل چاہتا ہو یا نہ چاہتا ہو۔ اس کی مثال سپاہی کی زندگی کی سی ہے۔ البتہ یہ میں مانتا ہوں کہ جب تک خود ہمارا دل سچے دل سے ساتھ نہ دے، خالی خولی ظاہری عمل محض دھوکے کی ٹٹی ہے۔ اس سے انسان خود بھی نقصان اٹھاتا ہے، اور دوسروں کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔ کمال کا درجہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب دل اور جسم اور زبان میں جیسی چاہیئے ویسی ہم آہنگی ہو، لیکن اس میں ہمیشہ سخت ذہنی کشمکش کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً مجھے یہ نہیں کہ غصہ نہ آتا ہو مگر میں قریب قریب ہمیشہ اپنے جذبات کو ضبط کرنے میں کامیاب ہوتا ہوں۔ نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو مگر میرے اندر ہمیشہ یہ کشمکش موجود رہتی ہے کہ ہر لحظہ اور ساعت اپنے ارادے سے عدم تشدد کے قانون پر عمل کروں۔ ایسی کشمکش سے انسان کی قوت بڑھتی ہے، عدم تشدد قوی کا حربہ ہے، کمزور کے عدم تشدد میں تو یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں بناوٹ نہ ہو۔ خوف اور محبت میں تناقض ہے۔ محبت جو دیتی ہے آنکھ بند کر کے دیتی ہے۔ اسے اس کی پروا نہیں ہوتی کہ عوض میں کیا ملے گا۔ محبت ایک طرف ساری خدائی کا مقابلہ کرتی ہے دوسری طرف خودی سے لڑتی ہے اور آخر میں کل جذبات پر غالب آتی ہے۔ میرا اور میرے ساتھ کام کرنے والوں کا روزمرہ کا تجربہ ہے کہ ہر مسئلہ حل ہو سکتا ہے، بشرطیکہ ہم جی میں ٹھان لیں کہ حق اور عدم تشدد کے قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنانا چاہیئے۔ کیونکہ حق اور عدم تشدد میرے نزدیک ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔

محبت کا قانون کشش ثقل کے قانون کی طرح اپنا عمل کرتا رہتا ہے خواہ ہم اس کے قائل ہوں یا نہ ہوں۔ جس طرح ایک سائنس دان قوانینِ فطرت سے مختلف طریقے سے کام لے کر جادو کے سے کرتب دکھاتا ہے وہ شخص بھی جو قانونِ محبت سے عملی صحت کے ساتھ کام لے اس سے بڑھ کر حیرت انگیز کرشمے دکھا سکتا ہے کیونکہ عدم تشدد کی قوت فطرت کی مادی قوتوں سے کہیں زیادہ عجیب اور پر اسرار ہے۔ جن لوگوں نے ہمارے لئے محبت کا قانون دریافت کیا وہ آج کل کے سائنس دانوں سے بڑے سائنس داں تھے۔ البتہ ہماری تحقیق ابھی یہاں تک نہیں پہنچی کہ ہر شخص اس قانون کے عمل کا پورا مشاہدہ کر سکے، اگر اسے وہم کہئے تو میں تو اسی وہم میں مبتلا ہوں۔ جتنا میں اس قانون پر عمل کرتا ہوں، اتنی ہی مجھے اپنی زندگی اور کائنات کی ترتیب خوشنما اور خوشگوار معلوم ہوتی ہے۔ اس سے مجھے وہ سکونِ قلب اور اسرارِ فطرت کا وہ عرفان حاصل ہوتا ہے جسے میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔

فہرست مضامین

قیمت فی پرچہ ۳ر

کشمیر کا خط
نیا کشمیر (۳)

"سیلانی"

سری نگر

میں نے پچھلے خطوں میں بار بار "عوامی حکومت" اور "نیا کشمیر" کا ذکر کیا ہے۔ یہ دونوں اصطلاحیں یہاں عوام و خواص سب کی زبان پر ہیں، خواص کا لب و لہجہ ذرا طنزیہ ہوتا ہے اور عوام کا فخریہ۔

"عوامی حکومت" کا مطلب بیان کرنے کی ضرورت نہیں یہاں بھی غلبتاً راج: عوامی حکومت کا دور دورہ ہے۔ البتہ "نیا کشمیر" کیا ہے؟ اس کی وضاحت اس خط میں کروں گا۔ اس لئے کہ کشمیر کی عوامی حکومت کا یہی معاشی اور سیاسی پروگرام ہے، جس کی کامیابی یا ناکامی پر شیخ عبداللہ کی ترقی پسند عوامی حکومت کی کامیابی یا ناکامی کا دارو مدار ہے۔

شیخ صاحب اور ان کے رفقا ءکار نے ایک ایسے زمانے میں عوامی حکومت کشمیر میں قائم کی جب مہاراجا کی حکومت کا بوسیدہ نظام جبر و استبداد کی انتہا کو پہنچ کر لڑکھڑا رہا تھا، پورے کشمیر پر چاروں طرف سے پاکستانی قبائل کا خوں ریز اور تباہ کن حملہ ہو چکا تھا اور بلا تفریق مذہب و ملت ہر کشمیری کی جان و مال، عزت اور آبرو خطرہ میں پڑ گئی تھی۔ اس نازک زمانے میں خونخوار سرحدی قبائل کا مقابلہ شیخ صاحب کی قیادت میں نہتے اور کمزور کشمیریوں نے اس بہادری اور ہمت سے کیا کہ اس کی داد خود ان کے دشمنوں سے لینی چاہئے جنھیں کشمیر کو تاراج کرنے میں بالآخر ناکامی ہوئی۔

لیکن سرحدی قبائل کے ابتدائی حملے کی ناکامی کے بعد کشمیر کا مقابلہ "دنیا کی سب سے بڑی اسلامی حکومت" سے شروع ہوا، اور وہ ہنوز جاری ہے، اس جنگ کے زمانے میں ظاہر ہے کہ حکومت کشمیر کا اصلی کام اس جنگ کو جیتنا ہے۔ کشمیر کے خاص حالات میں اس جنگ کے خود بخود دو محاذ بن گئے ہیں۔ ایک "فوجی محاذ" ہے اور دوسرا "سیاسی محاذ"۔ کشمیر کی یہ خوش قسمتی ہے کہ شیخ عبداللہ کی قیادت کی بدولت حکومت ہند نے کشمیر کا الحاق منظور کر لیا اور کشمیر کا ساتھ دیا۔ چنانچہ کشمیر کا فوجی مورچہ اب حکومت ہند کا فوجی مورچہ بلکہ پورے ہندوستان کا قومی فوجی مورچہ بن گیا ہے۔

کشمیر کی یہ جنگ "مگر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی حکومت" سے ہے، جو کشمیر کے قومی اتحاد اور یک جہتی کو توڑنا چاہتی ہے، اور کشمیر کو بھی جو اس وقت سارے ہندوستان کے لئے ایک ترقی پسند عوامی حکومت اور متحدہ قومیت کا نمونہ بن گیا ہے فرقہ پرستی کے نام پر رجعت پسند پاکستانی ریاست میں زبردستی شریک کرنے کے لئے آمادۂ "جہاد" ہے۔

کشمیر کے لئے مگر فخر و مباہات کی بات یہ ہے کہ ہندوستان کی غلامی اور جہالت کے دور میں جب حکومت برطانیہ کی فرقہ وارانہ سیاست اور اس کی فرقہ نوازیوں کی بدولت پورا ہندوستان فرقہ پرستی کے مرض میں مبتلا ہو گیا تو صرف کشمیر ہی ایک ایسا خطہ تھا جہاں مہاراجا اور ان کے فرقہ پرست برہمنوں کے باوجود اور مسلم لیگ اور اس کی فرقہ پرست مسلم کانفرنس کی انتہائی مفسدانہ کوششوں کے باوجود شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس اور اس کا متحدہ قومی محاذ قائم رہا اور قوم پرستی کے مقابلے میں فرقہ پرستی کو شکست ہوئی۔

شیخ عبداللہ کی قیادت کا یہ ایک عظیم الشان کارنامہ ہے کہ انھوں نے ہندوستان کی فرقہ وارانہ سیاست کے تاریک ترین دور میں کشمیر کے ہندو مسلم عوام کا متحدہ قومی اور سیاسی محاذ قائم رکھا، اور ان کے حقیقی اور مشترکہ سیاسی اور معاشی مسائل کو عوام کے سامنے رکھ کر ان کی سیاسی رائے عامہ کی تربیت کی، اور انھیں فرقہ پرستوں اور رجعت پسندوں کے دھوکے اور فریب سے بچا لیا۔

چنانچہ عوامی حکومت کے قیام کے بعد عوامی حکومت نے عوام ہی کی فلاح و بہبود کی طرف سب سے پہلے توجہ کی۔ اور اپنا "نیا کشمیر" کا پروگرام پیش کر دیا جس کا خلاصہ یہ تھا:-

۱۔ زمینداری کا خاتمہ کیا جائے۔
۲۔ زمین پر کاشتکار کا حق ملکیت تسلیم کیا جائے۔
۳۔ صنعت اور زراعت میں امداد باہمی کے اصولوں کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جائے۔
۴۔ پوری مملکت میں اوپر سے لے کر نیچے تک پنچائتی راج قائم کیا جائے۔

لیجئے! ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی عوامی حکومت! اور پھر جنگ کا زمانہ! قبائلیوں کا حملہ! پاکستانیوں کا جہاد! اور عوامی حکومت کا یہ انقلابی اور اشتراکی پروگرام! ان طفلانہ تجویزوں کی خوب ہنسی اڑائی گئی۔ لیکن مذاق اڑانے والے ابھی تک جی بھر کے ہنسنے نہ پائے تھے کہ حکومت نے آرڈیننس اور کونسل آرڈر، قوانین اور احکامات کے ذریعے مجوزہ اصلاحات کا نفاذ مارچ اپریل ۱۹۴۸ء سے شروع کر دیا۔

سب سے پہلے "جاگیرداری" کے خاتمے کا اعلان کیا گیا۔ اور ساری معافیاں بحق سرکار منسوخ کر دی گئیں۔ ان معافیوں پر سب سے بڑی جاگیر چنینی کی تھی۔ اس کا رقبہ کوئی ۹۵ مربع میل اور آبادی بارہ ہزار تھی، اور جبر، ظلم، استبداد میں غالباً بدنام سے بدنام ریاستوں میں بھی یہ جاگیر اپنی آپ مثال سمجھی جاتی تھی۔

یہ اور اسی طرح کی اور بے شمار چھوٹی بڑی جاگیروں کے خاتمے سے عوامی حکومت کے خزانے میں تقریباً ۲ لاکھ کی آمدنی کا اضافہ ہو گیا۔ لیکن اصل فائدہ تو یہ ہوا کہ غریب کاشتکاروں کی گردن سے جاگیرداری کی غلامی کا طوق اتر گیا۔

جاگیرداری کے خاتمے کے بعد عوامی حکومت نے مقرریوں کو ختم کیا، یہ ایک قسم کی نقد جاگیر تھی جو کسی خدمت کے صلے میں یا کسی سابقہ جاگیر کے بالعوض عطا کی گئی تھیں، بالعموم یہ مقرریاں "سیاسی" خدمات اور سیاسی مصالح کے پیش نظر عطا کی جاتی تھیں، ان مقرریوں میں ایک بڑی ناانصافی کا طریقہ یہ رائج ہو گیا تھا کہ جاگیردار اگر چاہے تو وہ نقد رقم کی بجائے ایک مقررہ شرح یعنی ۱۲ روپے فی من کے حساب سے غلہ یا جنس کا مطالبہ اپنے کاشتکاروں سے کر سکتا تھا، خواہ بازار میں جنس کا نرخ دس روپے فی من ہو! ظاہر ہے کہ اس زمانے میں جب غلہ کا نرخ بہت زیادہ بڑھ گیا ہو تو جاگیردار بجائے نقد کے جنس وصول کرتا تھا، اور اس سے جو نقصان کسان کو ہوتا تھا وہ اس مثال سے بآسانی سمجھ میں آ جائے گا کہ ایک جاگیردار کی مقرری، ایک ہزار روپے ہے تو وہ اپنے کاشتکار سے اس کے بالعوض بشرح ۱۲ روپے فی من گیارہ سو من غلہ کا مطالبہ کر سکتا تھا، اور بازار میں اس کی قیمت بازار کے نرخ سے گیارہ ہزار روپے مل جاتی تھی۔

عوامی حکومت نے ان مقرریوں کو ختم کر دیا اور علاوہ اس فائدہ کے جو کسانوں اور کاشتکاروں کو اس سے ہوا، حکومت کو بھی تقریباً دو لاکھ کی بچت ہوئی۔

ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی طرح کشمیر میں بھی کسانوں اور غریبوں، مزدوروں اور کاریگروں کے سر پر مہاجنی قرضے کا ناقابل برداشت بوجھ لدا ہوا ہے، اور کسی مستقل انتظام سے پہلے فوری طور پر یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ اس مقروض طبقے کو تھوڑی سی مہلت مل جائے کہ وہ پیش نظر اصلاحات سے پورا فائدہ اٹھا کر اپنے اندر اتنی سکت پیدا کرے کہ آئندہ قرضوں کی ادائیگی کے لئے اگر کوئی منصفانہ قوانین بنائے جائیں تو یہ غریب طبقہ ان کی تعمیل بھی کرنے کے قابل ہو جائے۔ اس لئے حکومت نے ایک خاص حکم کے ذریعے کاشتکاروں اور کسانوں، جلاہوں اور پارچہ بافوں، بافندوں اور دستکاروں اور مزدوروں کے خلاف مقدمات قرض کی جملہ کارروائیوں کو ایک سال کے لئے روک دیا ہے۔

اس طرح کاشتکاروں کے خلاف بیدخلی کے مقدمات کی کارروائیاں بھی روک دی گئی ہیں۔

عوامی حکومت نے "مزید غلہ پیدا کرو" کی تحریک کے سلسلے میں یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ وہ تمام سرکاری اراضیات جو غیر مزروعہ اور بیکار پڑی ہوئی ہیں وہ سب بٹائی پر ان مزدور کسانوں کو دی جائیں جن کے پاس اپنی زمین نہیں ہے یا ان چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کو دی جائیں جن کی کاشتکاری قلت زمین کی وجہ سے نفع بخش نہیں ہے۔ امید ہے کہ کچھ عرصے میں اس طریقے سے چھ سات لاکھ کنال زمین زیر کاشت آ جائے گی، اور اس کی پیداوار میں بھی کم از کم بارہ لاکھ خروار کا اضافہ ہو جائے گا۔

کشمیر کی عوامی حکومت کا بنیادی اصول پنچائتی راج ہے لیکن اس جنگ کے زمانے میں عام انتخابات کے ذریعے نمائندہ حکومت کی تشکیل کا اس وقت موقع نہیں ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

پچھلا ہفتہ :— ۱۔ ہندوستان

افواہ بے بنیاد ہے

سردار ولبھ بھائی پٹیل جن کی چوہترویں سالگرہ ۳۱ اکتوبر کو سارے ملک میں بڑے زور شور سے منائی گئی ابھی حیدرآباد کے مستقبل کے متعلق فوجی گورنر میجر جنرل چودھری اور دوسرے ذمہ دار افسروں سے گفتگو کر رہے تھے اور وہ اب ختم ہو گئی ہے۔ اس کے بارے میں اخباروں میں یہ افواہیں آ رہی ہیں کہ حکومت ہند اعلیٰحضرت نظام کو معزول کر کے شہزادہ برار کو ان کا جانشین بنانے کے مسئلے پر غور کر رہی ہے لیکن شری وی پی مینن نے جو ریاستوں کے معاملات میں حکومت ہند کے مشیر ہیں، اس کی قطعی تردید کر دی ہے اور صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اس قسم کی کوئی تجویز حکومت کے پیش نظر نہیں ہے۔ حکومت کے باضابطہ اعلان سے کانفرنس نے فیصلوں پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ لیکن اندازہ یہ ہے کہ فوجی انتظام ابھی کچھ عرصے تک اور قائم رکھا جائے گا۔ اس عرصے میں رائے دہندوں کی فہرستیں تیار ہوں گی۔ آئین ساز اسمبلی کے انتخاب کے ابتدائی مرحلے طے کئے جائیں گے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ انڈین یونین اور حیدرآباد کے آیندہ تعلقات کے بارے میں آخری اور قطعی سمجھوتہ عوام کی نمائندہ آئین ساز اسمبلی سے کیا جائے گا۔ ادھر حیدرآباد میں اسٹیٹ کانگریس کے اندرونی جھگڑوں کو ختم کر کے اسے ایک مضبوط اور منظم پارٹی بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بلدے اور اضلاع میں مسلمان بھی بڑی تعداد میں اسٹیٹ کانگریس کے ممبر بن رہے ہیں۔ اب قریب قریب ساری ریاست میں کامل امن سکون کی فضا پیدا ہو گئی ہے اور لوگ عام طور پر فوجی حکومت کے رویے سے مطمئن ہیں اس بات کو لندن ٹائمز تک مانتا ہے جو حیدرآباد کے معاملے میں حکومت ہند پر بڑی سختی سے نکتہ چینی کرتا رہا ہے۔ اس نے اپنے یکم نومبر کے ایڈیٹوریل میں لکھا ہے کہ حیدرآباد کی فوجی حکومت بڑی سمجھداری سے کام لے رہی ہے۔ ریاست کے مسلمان اور ہندو ملازم اپنے اپنے کام پر واپس آ گئے ہیں اور نئی حکومت کے ساتھ پورا اعتماد عمل کر رہے ہیں۔ مسلمان یہ سمجھ گئے ہیں کہ انھیں ملک کے انتظام میں ہندوؤں کو شریک کرنا ہے اور ہندوؤں پر یہ حقیقت اچھی طرح کھل گئی ہے کہ حکومت ہند حیدرآباد میں نہ کسی فرقے سے انتقام لینا چاہتی ہے اور نہ کسی ایک کو دوسروں پر ترجیح دینا چاہتی ہے بلکہ اسے صحیح معنی میں غیر مذہبی جمہوری نظام قائم کرنا مقصود ہے۔ آہستہ آہستہ فوجی انتظام کی جگہ سول انتظام لے رہا ہے اور جنوب مشرق کے گوشے سوا جہاں کمیونسٹ اب تک شورش برپا کر رہے ہیں سب کہیں حالات سکون پر آ گئے ہیں۔

دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کی کشیدگی بظاہر اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ مستقبل قریب میں اس کے دور ہونے کی کوئی امید نظر نہیں آتی لیکن پاکستان میں ہند کے ہائی کمشنر شری پرکاش صاحب اور ڈپٹی ہائی کمشنر سردار سمپورن سنگھ صاحب جن سے زیادہ دونوں ملکوں کے حالات کا اندازہ بہت کم لوگوں کو ہوگا کہتے ہیں کہ ان کے باہمی اختلافات کا دور ہونا کچھ ایسا زیادہ دشوار نہیں۔ شری پرکاش صاحب فرماتے ہیں کہ دونوں حکومتیں اپنے اپنے ملک کی اقلیتوں کو مطمئن کرنے کی سچے دل سے کوشش کر رہی ہیں اگر عوام بھی ان کا ساتھ دیں تو یہ کوشش پوری طرح کامیاب ہو سکتی ہے مشرقی بنگال میں بھی حکومت نے حال میں تمام سرکاری افسروں کو تاکید کی ہے کہ اقلیتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے اور ان کی پریشانی اور خوف کو دور کیا جائے۔ سردار سمپورن سنگھ صاحب نے بھی جو ڈپٹی ہائی کمشنر کی حیثیت سے اپنی ایک سال کی مدت پوری کرنے کے بعد لاہور سے رخصت ہو رہے ہیں یہ امید ظاہر کی کہ جوں جوں ہندوستان اور پاکستان میں پناہ گزینوں کا مسئلہ حل ہوتا جائے گا غم و غصے کی وہ فضا جس میں مصلحت اور دوستی کا جذبہ پنپنے نہیں پاتا چھٹتی جائے گی لیکن ان کے نزدیک دونوں ریاستوں میں کشیدگی کی ذمہ داری سب سے زیادہ کشمیر کے مسئلے پر ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر دونوں حکومتیں چاہیں تو یہ مسئلہ بھی خوش اسلوبی سے طے ہو سکتا ہے۔ اس میں بس دونوں چاہیں کی شرط بڑی بے ڈھب ہے۔ اگر پاکستان کی حکومت نے یو این او کمیشن کی تجویز مان لی ہوتی تو یہ تجویز پوری ہو جاتی۔ اب بھی کچھ نہیں گیا ہے، صلح کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

گاندھی کا پیام نہرو کی زبان سے

پیرس کی خبروں سے معلوم ہوا تھا کہ یو این او اسمبلی کے صدر ڈاکٹر ایوٹ کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے اسمبلی کے جلسے میں پنڈت نہرو کی مجوزہ تقریر کا انتظام نہیں ہو سکے گا اور پنڈت جی ۳ نومبر کو قاہرہ روانہ ہو جائیں گے۔ اس سے اسمبلی کے ممبروں کو سخت مایوسی ہوئی اور انھوں نے بہت اصرار کیا کہ پنڈت جی چند روز ٹھہر جائیں اور صدر کی واپسی کے بعد کسی مناسب موقع پر اسمبلی کو اپنے خیالات سے مستفید کریں مگر موصوف نے اپنی دوسری مصروفیات کی وجہ سے اس کو منظور نہیں کیا۔ یکم نومبر کو ڈاکٹر ایوٹ کے پیرس واپس آنے کے بعد یہ تقاضا شروع ہوا ادھر اتفاق سے وہ امریکی جہاز جس پر پنڈت جی قاہرہ روانہ ہونے والے تھے موسم کی خرابی کی وجہ سے نہیں آ پایا چنانچہ پنڈت جی ایک دن اور ٹھہر گئے میکسیکو کے اس رزولیوشن کے پاس ہونے کے بعد جس میں دنیا کی سب قوموں سے باہمی اختلافات کو صلح و آشتی سے طے کرنے کی اپیل کی گئی ہے ہندوستان کے وزیر اعظم نے دنیا کی پارلیمنٹ سے خطاب کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت امریکہ کے انتخاب صدارت کا نتیجہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد آ رہا تھا جس کا ہر شخص کو انتہائی اشتیاق تھا لیکن سب لوگوں نے نہایت گہری توجہ اور دلچسپی سے اول سے آخر تک پوری تقریر سُنی اور اس سے بہت متاثر ہوئے پنڈت جی نے آزاد ہندوستان کی طرف سے یہ اعلان کرنے کے بعد کہ وہ ایشیا کے ایک ایک ملک کو بیرونی حکومت سے آزاد کرا کے اور نسلی تعصب کا خاتمہ کر کے رہے گا۔ گاندھی جی کے فلسفے کا نچوڑ ان الفاظ میں پیش کیا "میں ایک ایسے ملک سے آ رہا ہوں جس نے ایک طویل جدوجہد کے بعد اگرچہ وہ جدوجہد بامن تھی، اپنی آزادی حاصل کی۔ اس سارے عرصے میں ہمارے جلیل القدر رہنما کی تلقین یہ تھی کہ ہم صرف اپنے مقاصد ہی کو نہیں بلکہ ان ذریعوں کو بھی پیش نظر رکھیں جن سے آزادی حاصل کرنی ہے۔ وہ ہمیشہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ صرف مقصد کا اچھا ہونا کافی نہیں۔ یہ بات بھی اتنی ہی اہم ہے کہ اس مقصد کے حاصل کرنے کے ذریعے اچھے ہوں۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اچھے سے اچھا مقصد بھی اس طرح حاصل نہیں ہو سکتا کہ ہماری آنکھوں میں خون اترا ہوا ہو اور ہمارے دلوں پر غم و غصے کے بادل چھائے ہوئے ہوں ...... ہم نفرت اور تشدد کے چکر میں پڑ گئے ہیں اور خواہ کتنی ہی قابلیت اور ذہانت سے بحث کرتے رہیں اس چکر سے نہیں نکل سکتے جب تک کہ ہم دوسرے ذریعے نہ اختیار کریں۔ اگر یہ چکر چلتا رہا تو صرف یہی نہیں کہ دنیا میں ہولناک تباہی پھیلے گی بلکہ کوئی ایک ملک بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے گا ... یہ ضرور ہے کہ ہمیں ہر قسم کے جارحانہ اقدام کی مزاحمت کرنی چاہیئے اگر جارحانہ حملے کا اندیشہ ہو تو ہمیں مدافعت کرنی ہے۔ لیکن ایسا کرتے وقت ہمارا ذہن ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہونا چاہیئے۔"

پڑھے لکھے ..... (بقیہ صفحہ ۳)

حبیب جاہ کو تسکین نہیں ہوتی مگر تیمارداری کیسی؟ کیا ہر متروک لیڈر کا مریض ہونا لازمی ہے؟

"لازمی تو میں جانتا نہیں مگر ہوتا یہی ہے متروک لیڈر مریض بھی ہوتا ہے اور مجروح بھی۔ اس کے قلب میں حسد کا مرض ہوتا ہے خدا نے ایسی برکت دی ہے کہ کبھی کم نہیں ہوتا بڑھتا ہی رہتا ہے۔ اس کے سینے میں حسرت کے ناسور ہوتے ہیں جو کبھی بھرنے میں نہیں آتے۔"

"تو پھر ایسے مریض اور جریح کی تیمارداری کرنا بڑا ثواب ہے۔"

"ثواب نہیں مولانا سخت عذاب ہے تیمارداری تو اس کی ثواب ہے جو بیماری کی دوا چاہتا ہو جسے زخم کے مرہم کی تلاش ہو۔ جس شخص کو اپنے ناسور کی نمائش کرنے میں لطف آتا ہو، جو دوسروں کے کچوکے لگا کے خوش ہوتا ہو جسے زہر اگلنے سے تسکین ہوتی ہو۔ اس کی تیمارداری روح کو بیمار کر دیتی ہے۔"

"آپ اور یہ سنجیدہ گفتگو بڑے تعجب کا مقام ہے۔"

"معاف کیجئے، میں بھول گیا تھا کہ آپ سے باتیں کر رہا ہوں۔"

۲۔ پاکستان

(کسی ملک کی رائے عامہ کے رجحانات کو سمجھنے کے لئے وہاں کے اخبارات سے بڑی مدد ملتی ہے۔ اس بار ہم "نئی روشنی" میں پاکستان کے اخبارات سے اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ انتخاب میں ہم اس بات کو مد نظر رکھیں گے کہ ناظرین کو پاکستان کی صحیح کیفیت اور وہاں کے ترقی پسند عناصر کی رائے کا اندازہ ہو سکے۔)

برطانیہ اور پاکستان

معاصر محترم "ڈان" کا خیال ہے اور یہ خیال ہمارے نزدیک دور از قیاس بھی نہیں کہ پنڈت نہرو کی آج کل لندن میں جو آؤ بھگت ہو رہی ہے۔ اور موصوف کی تعریف میں برطانوی سیاست دان جس طرح سے رطب اللسان ہیں اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ پاکستان کو نظر انداز کرکے ہندوستان سے معاملہ کرنے کا سوچ رہے ہیں، نیز گذشتہ ایک سال میں ہندوستان نے پاکستان پر جو پے درپے زیادتیاں کی ہیں، برطانوی حکومت کو اس کا مطلق احساس نہیں اور وہ حسب عادت اس فریق سے سمجھوتہ کرنے کے لئے بیتاب نظر آتی ہے، جو مضبوط ہے، اور جس کی ناراضگی سے اُسے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

"ڈان" نے برطانیہ کی اس روایتی طوطا چشمی کا ذکر کرتے ہوئے اسے خوب سنائی ہیں اور آخر میں اہل پاکستان کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اب تک ہم برطانیہ کے ساتھ اپنے تعلقات کو ضرورت سے زیادہ "قدرتی" بتلاتے رہے۔ ہم نے ضرورت سے زیادہ بے خیالی سے برطانیہ کی دوستی یا اس کی غیر جانب داری کے دعاوی پر اعتماد کیا۔ ہم بڑی خوش فہمی سے اب تک یہ سمجھتے رہے کہ برطانیہ سے تعلقات رکھنا مفید رہے گا لیکن اب ضرورت ہے کہ ہم اپنے نقطۂ نظر کو بدلیں، اور خود اپنی آنکھوں سے ارد گرد کی دنیا کا جائزہ لیں اور اس سے اپنے حلیف ڈھونڈھیں۔" اس سلسلے میں "ڈان" کی رائے یہ ہے کہ پاکستان کو اپنے ہم سایہ روس سے تعلقات قائم کرنا چاہیئں اور اسے برطانیہ کی عینک سے نہیں، بلکہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اپنے دماغ سے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

"ڈان" کی اس رائے سے پاکستان کے بیشتر اخبارات نے اتفاق کیا ہے اور گذشتہ ایک سال سے برطانیہ کا پاکستان کے ساتھ جو رویہ رہا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے سب نے برطانیہ دوستی کے سلسلہ کو ختم کرنے کی رائے دی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں محض جذباتی طور پر غم و غصے کا اظہار کافی نہیں، بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ سب سے پہلے تو ہم اپنے قریبی ہم سایہ سے باقاعدہ سفارتی تعلقات قائم کریں، اور پھر ترکستان کی اشتراکی ریاستوں سے جن کی آبادی تمام کی تمام مسلمان ہے، ہمارے تمدنی اور ثقافتی تعلقات ہوں، اور ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ گذشتہ پچاس سال سے ہم جو برطانوی اثرات میں گھرے ہوئے ہیں اور انھوں نے ہمارے ہاں کے بعض لوگوں کی ذہنیت جس طرح بگاڑ دی ہے اس کا توڑ ہو سکے گا۔ اور ہم دنیا کو اپنی نظر سے دیکھنے اور اپنے مفاد کے لئے دوست اور حلیف چننے کے قابل ہو جائیں گے۔

واقعہ یہ ہے کہ مشرقی ممالک کے ساتھ تعلقات قائم کرنے میں ہندوستان سے کہیں زیادہ ہمیں آسانیاں میسر ہیں۔ لیکن ضرورت صرف نقطۂ نظر کے بدلنے کی ہے۔ خدا کرے "ڈان" کی تنبیہہ اس معاملے میں کار آمد ثابت ہو اور پاکستان اپنی آزادانہ خارجی پالیسی بنانے کی طرف توجہ کرے۔

آفاق سہ روزہ، لاہور

(مورخہ ۲۴ اکتوبر)

وزیر اعظم سرحد کا غیر دانشمندانہ رویہ

پیر صاحب مانکی شریف کے خلاف وزیر اعظم سرحد خان عبدالقیوم خان نے جو الزامات لگائے ہیں، ان کے جواب میں مولانا شبیر احمد عثمانی نے ایک بیان میں فرمایا ہے کہ:-

"مدت سے سننے میں آ رہا تھا کہ صوبہ سرحد میں پاکستان اور مسلم لیگ کے حامیوں کے درمیان پارٹی بندی زوروں پر ہے لیکن اس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ دھڑے بندی کا یہ طاعون اتنی خطرناک صورت اختیار کرے گا جو وزیر اعظم سرحد کے حالیہ بیان کے بعد سامنے آیا ہے۔ پیر صاحب مانکی شریف کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ قابل نفرت ہیں۔ ایک ذمہ دار آدمی سے ایسے غیر ذمہ دارانہ بیان کی اُمید نہ تھی۔ انتخاب اور استصواب رائے کے زمانے میں پیر مانکی شریف کی مساعی اور ان کی ان تھک کوششوں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا جس شخص نے سُرخ پوشوں کو شکست دے کر سرحد میں مسلم لیگ کا جھنڈا لہرایا اور جس کی بدولت آج خود مسٹر عبدالقیوم وزارت عظمٰی کی کرسی پر متمکن ہیں۔ آج اس کے خلاف الزامات لگائے جا رہے ہیں کہ وہ سُرخ پوشوں سے سفارش کرکے حکومت کا تختہ الٹنے کی فکر میں ہیں۔

پیر صاحب مانکی کا خلوص اور امانت و دیانت شک و شبہ سے بالا تر ہے اگر وہ اقتدار کے خواہش مند ہوتے تو وزیر مرتبہ وزارت کی پیش کش کو نہ ٹھکراتے۔ وہ ایک مقدس نصب العین سے کر لیگ میں شریک ہوئے ہیں، اور وہی مطمح نظر آج بھی ان کی ساری جدو جہد کا محور ہے تماشہ یہ ہے کہ جس وقت خان عبدالقیوم پیر مانکی شریف پر سُرخ پوشوں کے ساتھ سازش کرنے کا الزام عائد کر رہے ہیں عین اسی وقت پیر صاحب مانکی شریف سُرخ پوشوں کو دعوت دے رہے ہیں کہ وہ بلا شرط مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں۔

وقت اور حالات کا تقاضا یہ ہے کہ دشمنوں کو زیادہ سے زیادہ دوست بنایا جائے۔ نہ یہ کہ اپنے دوستوں کو کاٹ کر دشمنوں کی صفوں میں اضافہ کیا جائے میں مانتا ہوں کہ حکومت کے لئے احتیاط و تیقظ بھی بے حد ضروری ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ پارٹی کے مفاد کے سامنے مصالح عامہ کو بھلا دیا جائے یا لوگوں کے لئے توبہ کا دروازہ بند کر دیا جائے۔ اگر کانگریس اسمبلی پارٹی کا ڈپٹی لیڈر وزارت عظمٰی کی کرسی سنبھال سکتا ہے تو کسی سُرخ پوش شخص یا جماعت کو سبز پرچم کے نیچے آنے سے کون روک سکتا ہے؟ میں اُمید کرتا ہوں کہ خان عبدالقیوم خاں اپنی پالیسی پر نظر ثانی فرمائیں گے اور اس قسم کے غیر دانشمندانہ اور غیر سنجیدہ بیانات دے کر ایسے نئے فتنوں اور ہنگاموں کو دعوت نہ دیں گے جن پر قابو پانا بڑی سے بڑی طاقت کے لئے بھی سخت دشوار ہوتا ہے۔

پیر صاحب مانکی شریف سرحد کی ایک اہم طاقت ہیں۔ وہ چڑھتے سورج کے پجاری ہرگز نہیں۔ ان کا مشن تنفیذ قانون شریعت ایک مبارک اور مقبول مشن ہے جس کی تائید عامۃ المسلمین کرتے ہیں اور کسی فرد مسلم کی جرأت نہیں کہ اس سے صاف انکار کرے۔ اگر پیر صاحب پر اس قسم کے الزامات رکھ کر اس مشن کو کمزور کرنا مقصود ہے تو پھر یہ تمام فدا کاران آئین اسلامی کے لئے ایک کھلا ہوا چیلنج ہوگا۔ میں گمان نہیں کرتا کہ مسٹر عبدالقیوم جیسا ذمہ دار اور زیرک، دینی معاملے کو ایسی نازک حد تک لے جانا پسند کرے گا۔ صوبے کی بلکہ پاکستان کی، بہتری اسی میں ہے کہ ذمہ دار اور ملت کے با اثر خادم باہمی تعاون سے اسٹیٹ کا سب کاروبار چلائیں اسی میں اس کی جیت ہے اور اسی میں اس کی زندگی ہے۔"

نشان راہ ہفتہ وار کراچی

مورخہ یکم اکتوبر

مغربی پنجاب کی وزارتی ہوائیں

سندھ کی طرح مغربی پنجاب کے وزارتی معاملات بھی مدت سے پیچیدہ شکل اختیار کئے ہوئے ہیں اور اس میں رد و بدل کی افواہیں نئے دن اُڑتی رہتی ہیں۔

تازہ خبر ہے کہ خان افتخار حسین خاں ممدوٹ وزیر اعظم مغربی پنجاب کو مشورہ دیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی موجودہ وزارت میں رد و بدل کرکے اسے مضبوط تر اور معتمد علیہ بنانے کی کوشش کریں۔ لیکن وہ اس امر کا فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ حرم وزارت سے کس کس کو نکالیں اور کس کس کو لیں افواہ ہے کہ خان ممدوٹ میاں ممتاز محمد دولتانہ کو اپنے ساتھ لینے پر رضا مند ہیں لیکن میاں دولتانہ اپنے ساتھ ملک فیروز خاں نون کو بھی لانے کے خواہش مند ہیں اور ملک صاحب یہ چاہتے ہیں کہ بیگم شاہ نواز بھی ان کی رفیقۂ وزارت ہوں، لیکن خان ممدوٹ کے لئے یہ مشکل ہے کہ وہ میاں ممتاز دولتانہ کی خاطر کس کس کو بھرتی کریں۔ اور کس کس کو جواب دیں۔

پہلے کی طرح وزارتی الجھن کا یہ معاملہ پھر گورنر جنرل پاکستان کے سامنے پیش ہو رہا ہے۔ تاکہ اس گتھی کو جو مہینوں سے الجھی ہوئی ہے سلجھایا جا سکے۔ ہمیں ان وزارتی جھگڑوں سے جو اندر ہی اندر چل رہے ہیں کسی قسم کی دلچسپی نہیں۔ کیونکہ ہمیں معلوم نہیں کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے اور کس

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

مشرقی دنیا

برما کی شورش جاری ہے

برمی وزیر خارجہ نے جو فی الحال لندن میں تشریف رکھتے ہیں ارشاد فرمایا ہے۔ اگرچہ اس بات کا ثبوت نہیں ملتا کہ برما کے باغیوں کو کوئی مالی مدد بیرون ملک سے مل رہی ہے، لیکن اس کا پتہ چلا ہے کہ بیرونی "مشورہ" ضرور مل رہا ہے" بہت سے لوگوں کے نزدیک تو ان کا اتنی بات کہہ دینا باغیوں کا تعلق ایک بین الاقوامی سازش سے ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ لیکن ان لوگوں کو جو واقعات کو کوئی خاص عینک لگا کر دیکھنے کے عادی نہیں اس سے تشفی نہیں ہوگی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اب تک اس سلسلے میں جس فریق کا ذکر "مشیر کار" کی حیثیت سے آیا ہے وہ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی ہے جسے خود اپنے وطن میں چین سے بیٹھنا مشکل ہے۔ اس کی طرف سے یہ اندیشہ رکھنا کہ وہ دوسروں کے مسائل میں کوئی نمایاں حصہ لے سکتی ہے۔ ایسی بات ہے جو دل کو ذرا مشکل سے لگتی ہے۔ لیکن یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ خود برما کی حکومت اپنے شہریوں کو کچلنے کے لئے باہر سے مدد لے رہی ہے۔ پچھلے کچھ دنوں سے یہ افواہیں گرم ہیں کہ برمی حکومت نے برطانیہ سے برما کے باغیوں کو کچلنے کے نیک کام میں مدد مانگی ہے۔ برمی وزیر خارجہ صاحب نے اس سے تو انکار کیا ہے کہ برمی حکومت فوجیں مانگ رہی ہے، لیکن یہ تسلیم کیا ہے کہ اسلحہ کی درآمد کے ذریعے انھیں بیرونی امداد مل رہی ہے۔ یہی نہیں" برطانوی ملٹری مشن سے برمی حکومت کو "مدد اور فنی مشورے" مل رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اور اہم بات بھی وزیر خارجہ کے منہ سے نکل گئی ہے انھوں نے لندن کی اس پریس کانفرنس میں بتایا کہ برما میں معمولی حالات ایک سال کے اندر اندر پیدا ہوسکیں گے، یعنی باغیوں کی سرکوبی میں کم سے کم ایک سال لگے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ برما کے عوام حکومت کی سست رفتاری سے بددل ہوگئے ہیں۔ اور برما کی موجودہ صورت حال اس جانے بوجھے تاریخی سبق کا اعادہ ہے کہ جمہوریت کے نام لیوا اجتماعی اغراض کو اہمیت دینے لگ جائیں تو اس کے خلاف ردعمل ناگزیر ہے اس درد کا علاج برطانوی بندوقیں نہیں ہیں زیادہ وعدوں کا اعادہ اس سلسلے میں مفید ہوگا۔ وزیر خارجہ نے نئے انتخابات کا وعدہ کیا ہے جس کی تاریخ کا یقین نہیں انھوں نے برما کو اشتراکی جمہوریت بنانے کے ارادہ پر بھی زور دیا ہے۔

چین کی قومی حکومت ڈگمگا رہی ہے

چین میں چیانگ کائی شک کا ستارہ گردش میں ہے۔ تازہ ترین خبروں سے پتہ چلتا ہے کہ مکڈن پر چینی کمیونسٹوں کا قبضہ ہوگیا ہے۔ چینی حلقوں کا خیال ہے کہ منچوریا میں قوم پرستوں کی اس ناکامی سے چین کی خانہ جنگی کے فیصلے کے دن قریب آگئے ہیں۔ ایک خبر کی رو سے ان حالات سے گھبرا کر امریکہ میں یہ تجویز کیا جا رہا ہے کہ حکومت دریائے یانگ سی کے مغرب میں صوبوں کے گورنروں کو براہ راست مدد دی جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چیانگ کائی شک کا زوال اتنا قریب آگیا ہے کہ اب یہ سوچنا بھی ضروری نہیں رہ گیا ہے کہ اس اقدام سے مرکزی حکومت کو شدید دھچکا لگے گا۔ امریکہ کی صدارت کے امیدوار ڈیوی صاحب نے اعلان کیا ہے کہ ان کے برسر اقتدار ہونے کے بعد چین کو مزید مدد دی جائے گی (اب تک ۴۰ کروڑ ڈالر دیئے جاچکے ہیں!) کہا یہ جا رہا ہے قومی فوجیں دیوار چین کے قریب جنرل فو کی سربراہی میں کمیونسٹوں سے آخری لڑائی کے لئے جمع ہو رہی ہیں۔ جنرل سمو چیانگ کی مرضی سے یہ بات طے ہوچکی ہے کہ امریکہ سے جو اسلحہ اب آئیں گے، اب انھیں امریکن جہاز براہ راست شمالی چین تک پہنچا دیں گے، امریکہ کی نگرانی میں جو چینی فوجیں تربیت پا رہی ہیں ان سے بھی بہت کچھ امیدیں ہیں اس طرح کے دو ڈویژن جو ابھی شینشن وغیرہ پہنچی ہیں، ان کے متعلق بیرونی مبصروں کا خیال ہے کہ یہ چین کی بہترین اور سب سے زیادہ بہادر فوجیں ہیں؟ ایسی تربیت یافتہ فوجوں کا پچھلا تجربہ تو کچھ زیادہ شاندار نہیں ہے، لیکن اصل سوال یہ نہیں، اصل سوال یہ ہے کہ چین کی خانہ جنگی میں قوم پرستوں کی کامیابی کی ساری امید اب امریکہ سے کمک ملنے پر منحصر ہے۔ یہ مدد اگر دی گئی تو اسے جمہوریت کے نام پر جائز بتایا جائے گا۔ لیکن کیا یہ ایک ملک کے "اندرونی مسائل" میں مداخلت نہ ہوگی؟

کوریا کی "جبری جمہوریت"

مغربی جمہوریت نوازوں کو عام طور پر اور امریکہ کو خاص طور پر ایشیا میں اپنی جمہوریت دوستی کا ثبوت دینے کا ایک اور موقع مل گیا ہے۔ یہ نیا میدان عمل کوریا ہے۔ کوریا کی فتح کے بعد اس کے دو حصے کر دیئے گئے تھے ایک پر روس کی عارضی نگرانی تھی اور دوسرے پر امریکہ کی۔ اس عارضی نگرانی سے دونوں ملکوں نے مختلف قسم کے کام لئے۔ روس نے ایک ایسے نظام حکومت کی بنا ڈالنے میں عوام کی مدد کی، جس کی حفاظت کے لئے وہ خود تیار ہوجائیں۔ امریکی اقتدار نے رجعت پسندی کو شہ دی۔ انتخاب کا ایک ڈھونگ رچایا گیا جس کے متعلق یو این او کے کمیشن نے کچھ اچھی رائے ظاہر نہیں کی اور اس "نئے نظام" کی حفاظت کا فرض امریکہ کے سر آپڑا۔ اس لئے کہ اسے جنوبی کوریا کے عوام کا اعتماد حاصل نہ تھا۔ ۱۹ اکتوبر کو روسی فوجیں شمالی کوریا سے جانا شروع ہوگئیں۔ جمہوریت دوستوں نے شور مچایا کہ یہ بھی ایک روسی چال ہے گو اس کا کوئی جواب نہیں دیا گیا کہ ایسی چال وہ خود کیوں نہ چل سکے کہ جنوبی کوریا کے لوگ اپنی حفاظت آپ کر سکتے یا کم سے کم کرنے کی کوشش کرتے۔

کوریا کے قوم پرستوں نے ایک نئی حکومت بنائی ہے جس کے ممبر جنوبی کوریا سے تعلق رکھتے ہیں اور جمہوریت دوستوں کے ڈر سے اپنے وطن سے بھاگنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ جنوبی کوریا میں بغاوت پھوٹ پڑی ہے اور اس کا الزام روسیوں کے سر رکھا جا رہا ہے۔ "باغیوں" کے ساتھ امریکن علاقے کے بہت سے فوج اور پولیس کے سپاہی ہوگئے ہیں اور انھیں خاصی کامیابی ہوئی ہے۔ پریذیڈنٹ ری نے جنھیں امریکہ کی نگاہ کرم نے صدر بنوایا ہے جنوبی کوریا میں مارشل لا نافذ کر دیا ہے ظاہر ہے وہ مدد مانگیں گے اور یہ مدد انھیں ملے گی۔ روپے اور سیاست سے جو نہ ہوسکا وہ اب امریکہ کو فوجوں کی مدد سے کرنا ہوگا۔ اس لئے کہ یہ بات تو تصور میں بھی آ نہیں سکتی کہ کوریا کے بسنے والوں کو اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے گا۔ مگر اندیشہ یہ ہے کہ یہ فوجی کارروائی کامیاب ہوسکے گی۔ علاقہ بہت بڑا ہے۔ رسل و رسائل کی سہولتیں ناکافی اور امریکہ کو طویل عرصہ تک لڑائی لڑنے کے لئے فوجیں مہیا کرنے میں دقت ہوگی اور لارڈ اسٹرابو کے الفاظ میں امریکہ کو یہ طے کرنا ہوگا کہ حق خود اختیاری میں آزادی کا یہ تصور بھی شامل ہے یا نہیں کہ جو ملک چاہے سرمایہ داری کے خلاف یا سوشلسٹ حکومت بنا سکے" امریکہ کا فیصلہ معلوم ہے اور یہ بھی طے ہے کہ امریکہ کے دوست اس فیصلے کے جواز کی دلیلیں ڈھونڈھ ہی نکالیں گے۔

انڈونیشیا کو نیا خطرہ

ڈچ پارلیمنٹ میں ایک مسودہ قانون پر بحث ہو رہی ہے جس کی رو سے ڈچ حکومت کو انڈونیشیا میں اپنی نئی اسکیم پر عمل کرنے کا حق ہوگا۔ اسکیم یہ ہے کہ انڈونیشیا کی جمہوری حکومت کو نظر انداز کرکے باقی عناصر کی مدد سے ایک وفاقی حکومت قائم کی جائے مگر اس سیاسی چال کا دوسرا پہلو ذرا زیادہ خطرناک ہے۔ بٹاویا میں ڈچ فوجیوں نے شکایت شروع کر دی کہ وسط جاوا کے ڈچ اقتدار کے علاقہ میں باہر کے لوگ بہت آنے لگے ہیں۔ ڈچ وزیر خارجہ بٹاویا آتے ہیں۔ ان کی اس آمد کے دو مقصد بتائے گئے ہیں۔ جمہوری حکومت سے دوبارہ گفتگو شروع کرنے میں "اپنی موجودگی سے مدد دینا" جاوا کی "نازک صورت حال کا بچشم خود مطالعہ فرمانا" یہ شکایت اور یہ آمد شاید انڈونیشیا میں ڈچ پیش قدمی کا پیش خیمہ ہیں۔ ڈچ حکومت کے پیش نظر غالباً یہ اسکیم ہے کہ انڈونیشیا کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھایا جائے۔ حملہ کا پہلا نشانہ اگر کمیونسٹ ہوں تو لوگوں کو یہ یقین دلانا مشکل نہ ہوگا کہ یہ لڑائی دراصل جمہوریت کی خاطر ہے، ایسا حملہ جمہوری حکومت کے لئے بڑے امتحان کا وقت ہوگا۔ اگر اس نے اندرونی دشمن کے خوف سے بیرونی دشمن کو اپنے ملک میں گھسنے دیا تو مستقبل کا مورخ انڈونیشیا کی جنگ آزادی میں اسے غداری کا ملزم ٹھہرانے پر مجبور ہوگا۔ ادھر کمیونسٹوں کا بھی امتحان ہے کہ وہ ملک کی خاطر پارٹی کو تھوڑی دیر کے لئے بھول سکتے ہیں یا نہیں۔

چیانگ کائی شیک اب چلے؟

ادھر چین کی کینٹ نے استعفا دے دیا ہے ادھر مسٹر ڈیوی جن سے مدد کی بڑی امیدیں تھیں امریکہ کے صدارت کے انتخاب میں ناکام رہے اب جنرل سو چیانگ کا خدا حافظ۔ (ا،س)

منزل شوق

عبادت بریلوی

(۱)

یوں ہی جگ بیتے، مدتیں گذریں!
کاروانِ حیات چلتا رہا
نغمۂ شوق بھی مچلتا رہا
شاہ راہیں، اُداس اُداس، خموش
شوق سے منزلوں کو تکتی رہیں
منزلیں آئیں اور گذرتی گئیں
منزلِ شوق پھر بھی آئی نہیں!

(۲)

شاہ راہیں، اداس اداس خموش
آج بھی منزلوں کو تکتی ہیں!
بعد مدت کے کاروانِ حیات
ایک منزل پہ آج آیا ضرور
نغمہ اک آرزو نے گایا ضرور
منزلِ شوق پھر بھی آئی نہیں!
زندگی تشنہ کام و تشنہ دہن
خستہ حال و شکستہ پیراہن
شاہ راہوں پہ آج بھی ہے نڈھال
زخم خوردہ ہے کائناتِ حیات
زہر اگلتی ہے آج "شاخِ نبات"
نور کو تیرگی نے گھیرا ہے
موت کا ہر طرف بسیرا ہے
نور تو ہو گیا ہے جاں کو وبال
آج بھی طرح زندگی ہے وہی
سالہا سال مدتوں جو رہی
وجہ خوں گشتگیٔ فکر و خیال
باعثِ دل گرفتگیٔ و ملال
صبحِ صادق نظر جو آئی تھی
صبحِ کاذب کی روشنی نکلی
یہ زبوں حالی و پریشانی
زندگی کی فسردہ سامانی
خوں رُلاتی ہے شاہ راہوں کو!
اور منزل کو بھی ہے حیرانی

(۳)

شاہ راہیں اُداس اُداس، خموش
آج بھی منزلوں کو تکتی ہیں
ہے شب و روز ان کو بس یہ خیال
"اس اندھیرے میں یہ تھکے راہی
راہ کس طرح لیں گے منزل کی
منزلِ شوق و بزم کیف آگیں
آئے گی بھی کبھی نظر کہ نہیں"
ہے شب و روز ان کو بس یہ خیال
شاہ راہیں اداس، اداس، خموش
آج بھی منزلوں کو تکتی ہیں

(۴)

شاہ راہوں کی اس اُداسی میں
باوجودِ فضائے تاریکی
آج بھی مشعلِ جنوں کو لیے
عزم اور آرزو کی مے کو پیے
باصد "افسوں گری" و زندہ دلی
کاروانِ حیات چلتا ہے
نغمۂ شوق بھی مچلتا ہے
——نورِ ظلمت ہی سے اُبلتا ہے
چلتا جائے گا کاروانِ حیات
چلتے جائیں گے رہروانِ حیات
منزلِ شوق آ ہی جائے گی
منزلِ شوق کو تو آنا ہے
تیرگی کی فسردہ سامانی
خوں رُلاتی ہوئی سی ویرانی
لاکھ بن جائے سنگ راہ گذر!

افیون کی پینک

ڈاکٹر سید عابد حسین

جن بزرگ کی کتھا میں آج آپ کو سنانا چاہتا ہوں ان کا نام مجھے کیا کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ گاؤں بھر انھیں "تمھارے صاحب" کہتا تھا۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کو "تمھارے صاحب" کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے، یہی نہیں بلکہ انھوں نے اسے بات کی تکیہ کلام بنا لیا تھا۔ جہاں زبان رکی اور انھوں نے اس بات کا سہارا لیا، اس لئے ان کا یہی نام پڑ گیا تھا۔ ہاں جی چاہے تو ان کا تھوڑا سا حلیہ سن لیجئے۔ تھوڑا سا اس لئے نہیں کہ مجھے اختصار منظور ہے، بلکہ ان کا حلیہ تھا ہی ذرا سا ٹھنگنا قد۔ اکہرا بدن۔ دبلا چہرا، سانولا رنگ، خشخشی ڈاڑھی، سر پر پٹھے، اللہ اللہ خیر صلا۔ کپڑے بھی واجبی ہی پہنتے تھے۔ نیچا کرتہ، اونچا پاجامہ یا کبھی لنگی سر پر رومال لپٹا ہوا۔ آنکھوں میں سرمہ روز لگاتے تھے۔ سر میں تیل چوتھے دن ڈالا کرتے تھے۔

"تمھارے صاحب" کبھی ایک چھوٹے سے زمیندار تھے۔ قریب کے کسی گاؤں میں ان کی دو ڈھائی سو بیگھے زمین تھی، جو مقدمہ بازی میں ٹھکانے لگ گئی۔ اس وقت سے وہ ہمارے گھر میں کچھ عزیز اور کچھ نوکر کی طرح رہتے تھے۔ کام وہ صرف دو ہی کرتے تھے۔ ایک تو گھر کے بڑے بوڑھوں کو حقہ بھر کر پلانا، دوسرے بازار سے سودا سلف لانا۔ سودا چکانے میں ان کی انوکھی عادت یہ تھی کہ ہمیشہ دوکان دار کی سی کہتے تھے۔ مثلاً خربوزے والا آیا ہے اور زنانی ڈیوڑھی پہ اس سے بھاؤ چکایا جا رہا ہے۔ یہ حضرت بھی موجود ہیں، بیچنے والا سیر کے چار پیسے مانگ رہا ہے۔ خریدنے والے دو پیسے کہہ رہے ہیں۔ ان حضرت کا فیصلہ یہ ہوتا تھا "نہیں تمھارے صاحب یہ، یہ خربوزے تو چار ہی پیسے سیر کے ہیں"۔ اور جو کسی نے کہا کہ تم بیچ میں کیوں بولتے ہو تو بھولے پن سے فرماتے تھے "تمھارے صاحب وہ تو آپ ہی چار پیسے سیر کہہ رہا ہے، ہم نے کہا تو کیا برا کیا"۔ ان کی سادگی کا ایک اور ثبوت لوگ اس بات کو جانتے تھے، کہ آپس کے رشتے ان کی سمجھ میں نہیں آتے تھے، سچ پوچھئے تو ہمارے خاندانوں کے رشتے ہوتے ہی اس قدر پیچیدہ ہیں کہ اسی برس کی بڑھیوں کے سوا کسی کو زبانی یاد نہیں رہتے بڑے بڑے حسابیوں کو سلیٹ پنسل کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور نتیجہ پھر بھی صفر ہی نکلتا ہے۔ مگر تمھارے صاحب اس معاملے میں اوروں سے بڑھے ہوئے تھے کبھی کی خدیا ساس کو نانی اور بیوی کے بہنوئی کو نندوئی غرض اسی طرح الٹکل پچو رشتے بتا دیا کرتے تھے، ہم سب بچے ان کے پیچھے پڑ کر طرح طرح کے سوال پوچھتے تھے اور ان کے جواب سن کر ہنستے ہنستے لوٹ جاتے تھے

ایک بار ان سے پوچھا "کہ فلاں درزی کے سگے دادا کی سگی پوتی اس کی کون ہوئی۔ پہلے تو انھوں نے اس درزی کے دادا کا نام، ولدیت، سکونت، عمر کی تحقیق کی، پھر اس کی پوتی کا نام اور عمر پوچھی۔ یہ سب چھان بین کرنے کے بعد فرماتے ہیں "بھئی کسی کے گھر کا حال ہمیں کیا معلوم۔ اسی سے پوچھ لو"۔

شادی انھوں نے کم عمری کے زمانے میں کر لی تھی، بیوی تعداد میں ایک تھیں، مگر مقدار میں ان سے چوگنی، اور پھر تیز مزاج، اس لئے یہ ان سے بہت ڈرتے تھے، بال بچے تھے نہیں اور بیوی سے محبت کرنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی، اس لئے محبت کا جذبہ اور جانوروں کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ بکریاں، مرغیاں، ہدہلے، مینا، تیتر، بٹیر، غرض بیسیوں جانور پال رکھے تھے اور ان سے بہت مانوس تھے۔ کسی حکیم کا قول ہے، اور نہیں ہے تو ہونا چاہئے کہ انسان کو جس جانور سے زیادہ سابقہ رہے اس کی روح حیوانی اسی جانور کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھئے تو تمھارے صاحب کی روح چڑیا خانے سے کم نہ ہوگی۔

"تمھارے صاحب کی، رقت قلب، بھولے پن اور مسکینی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ افیون کا شغل کرتے تھے، دن میں دو وقت دوپہر کو اور رات کو گھلا کرتی تھی۔ اور ہمارے ہیرو دو ایک بے فکروں کے ساتھ افیون کی چسکیاں لیتے تھے، اور حقے کے دم لگاتے تھے۔ مگر ان کے ساتھی ہمیشہ نئے نئے ہوا کرتے تھے، ان کا قاعدہ تھا کہ "آس پاس کے گاؤں میں" جو شخص کہیں چیز کے قابل نظر آیا تو اسے چند روز اپنے پاس سے افیون پلاتے تھے اور جب وہ پکا ہو گیا تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتے تھے۔ یہ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ ان کے پاس افیون آتی کہاں سے ہے، اس لئے کہ خریدتے انھیں کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ ان سے پوچھئے تو مسکرا کر چپ ہو رہتے تھے کوئی بہت اصرار کرے تو ایک قطعہ پڑھ دیا کرتے تھے جو ٹھیک یاد نہیں، کچھ اس طرح کا تھا۔

اے کہ جاپان کے خزانے سے
چینیوں کو افیم دیتا ہے
دوستوں کو کرے گا کب محروم
دشمنوں کی خبر جو لیتا ہے

اس تعارف کے بعد میں آپ کو "تمھارے صاحب" کی ایک دن کی گفتگو سناتا ہوں جو میرا اصل مقصود ہے۔ اس سے آپ کو ان کی سیرت کا کچھ اندازہ ہو جائے گا، اور اگر آپ مختصر قصہ غم ہے کہ دل رکھتے ہیں تو آپ کو بڑی عبرت و بصیرت حاصل ہوگی۔

ہوا یہ کہ ایک دن "تمھارے صاحب" میٹھے ٹکڑے زیادہ کھا گئے، فصل تھی ملیریا کی، معدہ جو خراب ہوا تو جاڑے بخار نے آ دبایا۔ فصلی بخار کی بے چینی تو آپ جانتے ہیں، اچھے اچھوں کے چھکے چھڑا دیتی ہے، بیماری کے بڑے کچے تھے، سمجھے کہ بس اب چل چلاؤ ہے لوگوں کو پکارنے لگے کہ میرے پاس آکر میری آخری باتیں سن لو، گھر کے بڑوں نے اسے بخار کی بڑ سمجھ کر کچھ توجہ نہیں کی۔ البتہ بچے آن کر جمع ہو گئے۔ مگر ان کو انھوں نے ڈانٹ کر بھگا دیا، کچھ دیر کے بعد، ہمارے ایک عزیز دوسرے گاؤں سے آئے ہوئے تھے، بیمار کی یہ حالت دیکھ کر ان کو ترس آیا اور آکر بیٹھ گئے "تمھارے صاحب" تو موقع کے انتظار میں تھے، انھوں نے فوراً اس درد ناک لہجے میں جو افیونیوں سے مخصوص ہے اپنی کہانی شروع کر دی۔

"سنو تمھارے صاحب، آج ہم تم سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ہم نے آج تک کسی سے نہیں کہیں، ہماری عمر کچھ کم ساٹھ برس کی ہوئی، اگر بقرعید تک زندہ رہتے تو پورے ساٹھ برس کے ہو جاتے۔ جوانی میں ہم پر وہ مصیبت پڑی جس سے ساری زندگی برباد ہو گئی۔ ہمارا گھر قریب کے گاؤں میں تھا۔ جس کا نام ہم نہیں بتاتے۔ بزرگوں کے وقت سے گاؤں میں ایک پٹی چلی آتی تھی والد کے انتقال کے بعد اس کے مالک ہم تھے۔ چین سے اور آبرو سے بسر ہو رہی تھی۔ اتفاق کی بات گاؤں کے نمبردار سے ایک معاملے میں دشمنی ہو گئی۔ وہ اپنے زمانے کا پکا جعل ساز تھا۔ اس نے ہمیں دق کرنے کے لئے ایک جعلی دستاویز تیار کی اور اپنے ایک پٹھو سے ہم پر نالش کرا دی۔ یہ امید تو ہمیں بھی نہ تھی کہ ڈگری ہو جائے گی، مگر ڈگری ہوئی اور ہائی کورٹ تک بحال رہی۔ ہماری زمین گھر بار سب کچھ بک گیا، اور ہم روٹیوں کو محتاج ہو گئے۔ خدا بھلا کرے اس ڈیوڑھی کا جس نے ہمیں اس طرح رکھا، جیسے اپنوں کو رکھتے ہیں مگر کیا تم سمجھتے ہو کہ ہمارے دل سے ان مصیبتوں کا صدمہ خصوصاً زمین کے چھن جانے کا غم مٹ گیا توبہ کرو۔ تمھارے صاحب، تم بھی زمیندار کے بیٹے ہو اور زمین کی قدر جانتے ہو۔ اس دنیا میں جہاں کسی چیز کو دم بھر قرار نہیں ایک ہی چیز ہے جو سیکڑوں، ہزاروں سال باقی رہتی ہے۔ اور وہ زمین ہے۔ اسی پر ہم پیدا ہوتے ہیں اور اسی پر دفن ہوتے ہیں۔ زمین کی جو محبت انسان کے خصوصاً زمیندار کے دل میں ہوتی ہے اس کی تھاہ نہیں۔ مدت تک ہمارا یہ حال رہا کہ کھیتوں کی تصویر آنکھوں میں پھرتی تھی اور ہم انھیں یاد کر کے تڑپتے تھے۔ نمبردار سے اور اس کے پٹھو سے بدلہ لینے کی تدبیریں ہر وقت سوچا کرتے تھے، مگر لڑائی بھڑائی سے ہمیشہ ہمیں نفرت تھی اور طاقت بھی ان دونوں فدا الم تھی، یہی صورت سمجھ میں آتی تھی کہ ان کمبختوں پر آسمان پھٹ پڑے یا بجلی گر پڑے مگر یہ اپنے اختیار کی بات نہیں تھی۔

دوسرا ہوتا تو اس غم میں تمھارے صاحب، کھانا، پینا چھوڑ دیتا، مگر ہم بہت صبر سے کام لیتے تھے۔ اور گاؤں میں رہ کر دل بہلانے اور غم غلط کرنے کی جو تدبیریں ہو سکتی ہیں وہ کرتے تھے، مگر دل کی کلی کسی طرح نہ کھلتی تھی پیر خاکسار شاہ صاحب یہاں تشریف لائے، تو ہم ان کے مرید ہو گئے اور ان سے اپنا درد دل بیان کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ دنیا کو چھوڑ دو اور مولا سے لو لگاؤ۔ نماز روزے کی تاکید کے ساتھ انھوں نے چلہ کھینچنے اور پیر کے نام کا ورد کرنے کی ہدایت کی۔ نماز تو خیر ہم پڑھتے ہی تھے، مگر روزہ ہمیں کبھی راس نہیں آیا۔ جب

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

اہنسا اور مہاتما گاندھی

اثر لکھنوی

(پروفیسر این اے نکم کے مضمون کا خلاصہ)

گاندھی جی کی تعلیم عدم تشدد یا اہنسا کا آخری حصہ ابتدائی حصے سے نہ صرف مانوذ تھا بلکہ مبتدا کی نفی کرتا تھا، اور ان کی زندگی میں ناقابل فہم ہو گیا تھا۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ گاندھی جی کو اس دشواری کا علم یا احساس نہ تھا یا بلکہ حصۂ ثانی کا وجود میں آنا محض اتفاق تھا کیونکہ مدت ہوئی وہ کہہ گئے تھے۔

"میں نے ہندوستان کے سامنے اہنسا کی وہ شدید ترین صورت کبھی نہیں رکھی۔ آپ یہی فرض کر لیجئے کہ میں اپنے آپ کو اہنسا کی وہ قدیم تعلیم پیش کرنے کا اہل نہیں جانتا، گو میرے ذہن نے اس کا مکمل طور پر احاطہ کر لیا ہے اور اس کی اہم معنویت میری گرفت میں آگئی ہے، لیکن یہ تعلیم اب تک میری زندگی کا جزو نہیں بن سکی ہے۔ اور میری شکتی کا راز اسی میں ہے کہ میں جنتا سے وہ راہ اختیار کرنے کو نہیں کہتا جس کا میں نے خود بار بار تجربہ نہ کر لیا ہو"

(مہاتما گاندھی کی تقریریں اور تحریریں صفحہ ۱۰۷، طبع چہارم) ہمارا دعویٰ ہے کہ گاندھی جی نے اس شدید قسم کا اہنسا کا مظاہرہ دہلی کے برت میں کیا۔ جو لوگ کلکتہ والے برت کو بغور دیکھ چکے تھے تاڑ گئے تھے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ پھر بھی اس برت کے اچانک فیصلے سے بہتوں کو اچنبھا ہوا۔ ہم نے ٹھنڈے دل مگر جوش کے ساتھ اہنسا کی ابتدائی حالت کا معائنہ کیا تھا، اور یہ بھی معلوم تھا کہ جنوبی افریقہ میں اس کی پہل کیوں کر ہوئی لہٰذا ہم نے چون و چرا کے بغیر گاندھی جی کو اہنسا کا سچا عامل تسلیم کر لیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ ابتدائی تحریک عدم تشدد میں بھی تغیر ہوا تھا۔ پہلے یہ مجہول مقاومت تھی، پھر یہ پرامن مدافعت بن گئی۔ دونوں میں فرق ہے، نازک ہی سہی۔ اس پر بھی کوئی معترض نہ ہوا، اور ان کے حسب منشا طریق کار میں ضروری ترمیم کر لی۔ ابتدائی تعلیم کا لب لباب تھا کہ جو تمہارا ہے لو لیکن البتہ تشدد کو دخل نہ دو۔ لیکن اسی اصول کی شدید ترین تعلیم سے اکثر لوگ چکر میں پڑ گئے۔ بلکہ جز بز بھی ہوئے، کیوں کہ اس کا مقصد تھا کسی حالت میں تشدد نہ کرو، اور اس کا دستور العمل تھا "جو کچھ تمہارا ہے وہ بھی دے دو"۔ یہ مطالبہ تھا اس علو ہمتی، محبت اور سخاوت کا، ان صفات کا گاندھی جی کا ضمیر جن کا مندر تھا۔ گمان ہوتا ہے کہ دہلی کے برت کے وقت گاندھی جی کو یقین تھا کہ اب وہ اس قدیم پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کے قابل ہو گئے ہیں۔ افسوس ہم لوگ راستے میں تھک کر بیٹھ گئے اور اتنی دیر لگائی کہ ان کے ساتھ ان بلندیوں تک رسائی نہ ہو سکی۔

یہ بات نہ تھی کہ گاندھی جی واقعات کا کھوج لگانے میں ہم سے پیش پیش تھے بلکہ انہیں واقعات کو ان کے صحیح نتائج کی روشنی میں جانچنے کا ملکہ تھا۔ یہ امر بدیہی ہے کہ ہماری زندگی کو اجتماعی ہونا چاہیے۔ ہم سب مل کر ایک دنیا ہوں ورنہ ہمیں جینے کا کوئی حق نہیں۔ سائنس بھی اسی کی تائید کرتا ہے جس کے دریافت کردہ حقائق میں مستثنیات کو دخل نہیں، لہٰذا ہم یہ بہانہ نہیں کر سکتے کہ راستی مطلق اور مستقل اقدار کے [illegible] بیگانہ ہیں ......

یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ گاندھی جی نے سیاسیات اور مذہبیات کو گڈ مڈ کر دیا اور ان کی سیاسی تعلیم نے مذہب کو خطرے میں ڈال دیا۔ اگر انھوں نے دونوں کو سمونا چاہا تو اس امید پر چاہا کہ سیاسیات جسے افلاطون نے ذلیل ترین پیشہ یا مشغولیت قرار دیا تھا۔ اس کے پیرو [illegible] وہ پجاری بن جائیں اور سیاست کو مذہبی تقدس حاصل ہو جائے۔ گویا جو کچھ سیاست کے نام پر کیا جا رہا ہے خدا یا الشعور کی موجودگی میں اور اس کو حاضر و ناظر مان کر کیا جا رہا ہے۔ سچا مذہبی شخص بھی یہی کرتا ہے۔ یہ در اصل گاندھی جی کے مخالفین ہیں جنھوں نے مذہب اور سیاست کا غلط مبحث کیا ہے اور اپنے مذہبی معتقدات کو سیاست کے [illegible] سمجھتے ہیں۔

ایک عظیم روح فنائے جسم کے بعد پوری شان کے ساتھ اپنے مشن کی تکمیل کرتی ہے لوگوں کو رحم دلی کی طرف مائل کرتی ہے تاکہ ان کی زندگی مطلق یا اجتماعی بن جائے اور رحم دلی کے بغیر اس کیفیت کا ظہور پذیر ہونا محال ہے۔

گاندھی جی کی ہتیا کے سلسلے میں ہم یہ غور کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ تشدد کے امکانات کتنے وسیع ہیں۔ اسی کے ساتھ ان لوگوں پر جو اہنسا کے اصول کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے تھے واضح ہو گیا کہ عدم تشدد ہی واحد حقیقت اور راستی ہے اور اسی ڈگر پر چلنے سے حقیقت

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

"محبت اور نفرت"

باقر رضوی

انسان قدرت کا ایک ذی روح اور صاحب ادراک شاہکار ہے فطری تقاضے اور جبلتیں اس کے بیشتر افعال کا سرچشمہ ہیں۔ اسے بھوک لگتی ہے، پیاس معلوم ہوتی ہے جسمانی آرام کی خواہش ہوتی ہے کبھی کبھی اس پر ایک اضطراری کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ کچھ بگاڑے کچھ بنائے، اس کی تمنا ہوتی ہے کہ دوسروں کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرے، وہ اپنے جنسی جذبے کی تسکین ڈھونڈھتا ہے اس کے دل میں رقابت اور مسابقت کی آگ بھڑکتی ہے۔ ان تمام خواہشوں اور تقاضوں کی تسکین یا تکمیل مسرت کا اور عدم تکمیل غم کا باعث بنتی ہے۔

پھر انسان کے ذہن میں پچھلی یادیں اور پرانی باتیں محفوظ رہتی ہیں۔ ان یادوں کا دامن گذشتہ کامیابی و ناکامی اور فتح و شکست سے بندھا ہوا ہے اور فتح و شکست سے خوشی اور ناخوشی کا احساس وابستہ ہوتا ہے۔ یہ پچھلی یادیں اور پرانی باتیں امتداد زمانہ اور ماحول کے زیر اثر دوسرے جذبات سے ایسی خلط ملط ہو جاتی ہیں کہ ان کا تجزیہ سخت دشوار ہے۔

غیر شعوری طور پر گذشتہ واقعات کی یاد چھپائے رکھنے کے ساتھ ساتھ انسان شعوری طور پر تمناؤں کے خاکے بنا کر ان میں رنگ آمیزی کرتا اور آرزوؤں کا جال پھیلاتا ہے کہ مقصد برآری کے بعد شاد کام ہو سکے۔ تمناؤں کے پھول کھلنے کے ساتھ ہی ساتھ بیم و رجا کا کانٹا بھی اس کے دل میں کھٹکنے لگتا ہے۔ اسے یہ خیال آتا ہے کہ دیکھئے عنقریب [illegible] ہوتا ہے یا نہیں۔

ان مقدمات کے ساتھ یہ کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ انسان کے تمام [illegible] محبت اور نفرت ہی کی دو مٹی زمین سے اس کے تمام افعال [illegible] پھلتے پھوٹتے اور برگ و بار لاتے ہیں [illegible] اصول، جبلت اور خواہش کے زیر اثر جن [illegible] رغبت رکھتا یا [illegible] وہ اس کے حرکات و سکنات اور قول و فعل سے ظاہر [illegible] انسانی افعال کی تحلیل [illegible] کو آسانی معلوم ہو جائے گا کہ فلاں انسان کو کس لئے [illegible] رغبت اور فلاں چیز سے نفرت ہے، وہ کیوں بعض مسائل سے جی چراتا اور [illegible] برسر صف جنگ و مباحثہ کے لئے تیار رہتا ہے۔

انسانی زندگی مجموعہ ہے نسلی وراثت، گذشتہ تجربات، غیر شعوری تقاضوں، شعوری آرزوؤں اور محبت و نفرت کا۔ جذبات و احساسات حیات کا تانا بانا ہیں۔ یہی زندگی میں رنگ آمیزی کرتے اس پر نقش و نگار بناتے ہیں۔ مختصر یہ کہ حیات انسانی مرکب ہے تین چیزوں سے (۱) محبت (۲) نفرت (۳) وہ امور جو جذبات، نفرت کی تکمیل میں رخنہ اندازی کرتے اور شعور پر چھاپہ مارتے ہیں۔

نفرت کی حیثیت ثانوی، منفی اور سلبی ہے، یعنی یہ محبت کی عدم تکمیل سے وجود میں آتی ہے۔ اس طرح محبت کو جو اہمیت حاصل ہے اس میں مبالغہ آمیزی نہیں کی جا سکتی۔ انسان ابتداءً کسی چیز سے نفرت نہیں کرتا اسے ان چیزوں سے نفرت ہوتی ہے جو اس کی مطلوب و محبوب شے کے حصول میں رکاوٹ ڈالتی اور اس کی محبت کی بیل کو منڈھے چڑھنے نہیں دیتی، نفرت محبت کا رد عمل ہے۔

تخیل کی مدد سے انسان سابقہ تجربات کی روشنی میں مستقبل کی عمارت کی بنیاد ڈالتا ہے۔ انسان میں جو روحانی عنصر ہے وہ اخلاقی اقدار مرتب کرتا ہے وہ حسن، صداقت اور معدلت کے عینی تصورات قائم کرتا ہے اور ان اقدار کو قائم و دائم سمجھتا ہے۔ وہ اپنے ذہن میں ایک ایسی دنیا کی تصویر بناتا ہے جہاں حسرت ہی حسرت ہو اور جہاں انسانیت خلاقی اقدار کے اعلیٰ ترین مدارج پر فائز ہو۔ حکومت الٰہیہ کا تصور بھی اسی روحانی عنصر کی ایک شکل ہے۔ بعض لوگوں نے خدا کے روحانی تصور کو اپنے ذہن کی سرزمین سے جلاوطن کر کے انسانیت کو اس کی جگہ دی ہے اور دنیا کا ایک ایسا خاکہ بنایا ہے جہاں انسان مختار کل اور مالک اعلیٰ ہوگا۔ یہ لوگ صرف انسانی وحدت اور عظمت کے قائل ہیں۔ اس روحانی مابعد الطبیعیاتی اور عینی تصور کے لئے انسان اپنی ہستی قربان کرنے پر تیار ہو جاتا ہے اور اپنے ملک قوم، ذات الصفات حق اور انسانیت کے لئے جان دینے میں گریز نہیں کرتا۔ انسان کی پوری تاریخ تہذیب تمدن کا عروج و زوال۔ مذاہب کے خیرہ کن نشیب و فراز اسی تصور کو عملی جامہ پہنانے کی مختلف کوششوں کی تصویریں ہیں۔ انسان ہمیشہ ایک بہتر زندگی کا خواب دیکھتا رہا ہے دیکھئے یہ خواب کب شرمندۂ تعبیر ہو۔ خواب دیکھنے کی یہی خواہش اس کی روحانیت پر دلالت کرتی ہے۔ مارکس شیلر نے کیا خوب کہا ہے "انسان ایک مریض حیوان ہے، جانور کی حیثیت سے اس کا یہ مرض انسانی حقیقت ہے اس کی قسمت کی دلیل ہے۔"

ترکی

ایک طائرانہ نظر

(۲)

پریسیڈنٹ عصمت انونو

(ترجمہ از سید قاسم الحسنی)

ستمبر ۱۹۳۹ء میں اس وقت بھی جبکہ پولینڈ کی جنگ زوروں پر تھی، ترکی، برطانیہ اور فرانس کے درمیان ایک معاہدے کے لئے گفت و شنید کا آغاز کیا گیا جو تیزی سے جاری رہا۔ اس تجویز کی رو سے برطانیہ عظمیٰ اور فرانس نے یہ شرط منظور کی کہ ترکی کو طے شدہ مقدار میں سامان حرب مہیا کیا جائے اور یہ کہ اسے روس کے خلاف جنگ میں نہ گھسیٹا جائے اسی عرصے میں دوستانہ معاہدے کی تکمیل کی نیت سے روس نے ترکی وزیر خارجہ کو ماسکو مدعو کیا۔ ……

وزیر خارجہ ۲۵ ستمبر کو ماسکو پہنچے۔ اور ۱۷ اکتوبر کو واپس آئے۔ ابتدائی گفت و شنید بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہی، لیکن ترکی کے ساتھ معاہدہ دوستی کی تکمیل کرنے سے پہلے روسیوں نے یہ شرط پیش کی کہ برطانیہ کے ساتھ ترکی کا جو معاہدہ ہے اس میں کچھ ترمیم کی جائے۔ ترکی نے برطانیہ عظمیٰ اور فرانس سے مذکورہ بالا ترمیمات کے لئے کہا۔ طویل گفت و شنید کے بعد برطانیہ اور فرانس ان پر راضی ہوگئے۔

چنانچہ ترکی نے محسوس کیا کہ روس کے ساتھ معاہدے کی تمام شرائط پوری ہوگئی ہیں۔ اس وقت روس نے صلح نامہ مانٹریو کے سلسلے میں اپنے فائدے کی ایک ترمیم پیش کی علاوہ بریں اس نے جرمنی کے متعلق صلح نامہ میں ایک استثنا کو شامل کرنے کی خواہش کی۔ ان نکات کے منظور کئے جانے پر اس نے کہا کہ ابھی دو ایک باتیں اور بحث طلب ہیں اس بالکل نئی اور غیر متوقع صورت حال نے ترکی اور روس کے مابین صلح نامہ دوستی کی گفت و شنید میں رکاوٹ ڈال دی اور وزیر خارجہ سراج اوغلو ماسکو سے چلے آئے۔

۱۹ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو انقرہ میں ترکی برطانی فرانسیسی معاہدہ پر دستخط ہوگئے۔ سرکاری تقریروں کے ذریعے پتہ چلا کہ اس کی وجہ سے روس ناراض ہوگیا۔

سب جانتے ہیں کہ اس سال یعنی ۱۹۴۰ء کے دوران میں فرانس نے جنگ سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور برطانیہ عظمیٰ تنہا اپنی حفاظت کرنے پر مجبور ہوگیا۔ اسی سال رومانیہ نے اپنے دروازے جرمنوں کے لئے کھول دئے۔ فرانس نے برطانیہ عظمیٰ کے حلیف ترکی کے بعض مقبوضات پر قبضہ کر لیا اور شام پر اپنا اقتدار قائم رکھا۔ اسی زمانے میں راشد علی نے عراق میں بغاوت شروع کی اس طرح ترکی اپنی شامی اور عراقی سرحدوں پر مخالفوں میں گھر گیا۔ ترکی جمہوریت کے لئے سب سے اہم واقعہ جرمنی کا نہایت تہدید آمیز سیاسی حملہ تھا۔ فرانس پر قبضہ کرنے کے بعد جرمنی نے چند دستاویزات شائع کیں، جن کا مدعا یہ ثابت کرنا تھا کہ ترکی روس کی مخالفت میں فرانس اور برطانیہ کو مدد دے رہا ہے۔

روس فرانس، برطانیہ عظمیٰ اور ترکی کی دوستی پر پہلے ہی سے خفا تھا۔ اب جو جرمنوں نے فرانسیسی دستاویزات شائع کیں اس کے معنی یہ تھے کہ وہ ایک کشیدہ سیاسی حول میں نہایت سرگرمی سے ترکی اور روس میں جنگ کرانے کی کوشش کر رہے تھے، اور ترکی کو تنہا دیکھ کر انھیں یقین تھا کہ رومانیا کی طرح وہ بھی ہونے والے روسی حملے سے بچنے کے لئے ان کی طرف مائل ہوگا۔ ترکی نے ان حالات کا سکون سے مقابلہ کیا۔ اور روسیوں کو اطمینان دلایا کہ اس کی حکمت عملی پاک صاف ہے۔ شائع شدہ دستاویزات جعلی ہیں۔

جرمنوں کی توقعات کے خلاف ترکی ان کی طرف جھکنے پر آمادہ نہیں ہوا۔ روس کے برعکس اکتوبر ۱۹۴۰ء میں یونان پر اطالوی حملے کے بعد اس نے اپنی حکمت عملی کا اعلان تازہ عزم اور جرأت کے ساتھ کیا۔

یکم نومبر ۱۹۴۰ء کو ترکی کے صدر نے مجلس کبیر کے سامنے ایک تقریر میں برطانیہ عظمیٰ کے بارے میں مندرجہ ذیل بیان دیا: "یہ کہنا میرا عین فرض ہے کہ اس وقت جبکہ برطانیہ عظمیٰ مشکل حالات میں اپنی بقا کے لئے بہادرانہ جد و جہد کرنے پر مجبور ہے۔ دوستی کے وہ رشتے جنھوں نے ہمیں اس سے باندھ رکھا ہے مضبوط اور ناقابل شکست ہیں"

۱۹۴۱ء کی بہار میں، بلقان میں جرمن فوجیں داخل ہوگئیں اور یونان اور یوگوسلاویہ پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح ترکی سمندر اور خشکی پر جرمنی اور اطالیہ سے گھر گیا جرمنوں نے خشکی اور ہوا کے راستے ترکی سے گذر کر شام اور عراق کی مدد کے لئے پہنچنے کی انتہائی کوشش کی

اپریل ۱۹۴۱ء میں ترکی نے اپنی تمام فوجوں کو تیار کر لیا تھا اور اپنی قوت کو تھریس اور ایجین کے ساحل پر مجتمع کر دیا تھا، بلقانی ملکوں کی شکست کے بعد وہ صبر و استقلال کے ساتھ اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔ دریائے مرتیب پلوں کو اڑا کر اس نے اپنی فوجوں کو جو تھریس میں جمع تھیں اندر کی طرف دفاعی لائنوں پر پیچھے ہٹا لیا۔ یہ تھی فوجی صورت حال، تاہم اس نے جرمن مطالبات کے ماننے سے قطعاً انکار کر دیا۔ رومانیا کے قبضے کے بعد روس اور جرمنی کے عارضی دوستانہ معاہدے کے ختم ہوجانے کے آثار نظر آ رہے تھے۔ ۱۹۴۱ء کے سرما میں دونوں ملکوں کے سیاست دانوں نے ایک دوسرے سے تبادلہ خیالات کیا، اور ترکی کے خلاف خصوصیت سے افواہیں پھیلائی گئیں، فروری اور مارچ ۱۹۴۲ء میں روس اور بلغاریہ میں زور شور سے گفت و شنید ہو رہی تھی۔ سرکاری حیثیت سے چند روسی افسران کے بلغاریہ جانے کے بعد بلغاریہ میں ترکی کے خلاف بہت سے افسانے پھیلائے گئے۔ غرض ہر چیز سے ترکی پر حملہ کی تیاری کا پتہ چلتا تھا اس عرصہ میں انگریز شام اور عراق میں لڑ رہے تھے، اور کامیابی حاصل کر رہے تھے۔ اس خطرناک موقع پر جرمنوں نے یہ اعلان کیا کہ وہ ترکی پر حملہ نہیں کریں گے اور ایک عہد نامہ دوستی کی تجویز پیش کی۔ ترکی نے اعلان کیا کہ وہ اس معاہدہ پر راضی ہو جائے گا، اس شرط پر کہ برطانیہ عظمیٰ کے ساتھ اس کے معاہدہ دوستی میں خلل نہ پڑے

جرمنوں نے اس شرط کو منظور کر لیا۔ یہ سمجھ لیا گیا کہ جرمنوں نے ترکی پر اپنے حملے کو کسی آئندہ مناسب وقت کے لئے ملتوی کر دیا ہے۔ ترکی نے اپنی حفاظت اور اپنے دوستوں کے مفاد کے لئے مہلت حاصل کرنے کو غنیمت سمجھا۔

جب جرمن فوجیں روس پر مسلسل حملے کر رہی تھیں اور افریقہ میں مصر پر بڑھ رہی تھیں، اس سارے عرصے میں ترکی جرمنوں کو راستہ نہ دے کر اپنا فرض ادا کر رہا تھا۔ ترکی نے معاہدہ مانٹریو کے مطابق ایک طرف تو اطالوی بیڑے کو بحر روم سے بحر اسود میں جانے کی اجازت نہیں دی اور دوسری طرف اپنی تمام فوجوں کے ساتھ اچانک ہونے والے بری یا بحری حملے سے اپنی سرحد کی حفاظت کی رہیں اور برطانیہ عظمیٰ جرمن حملوں کو روکتے ہوئے عرب ملکوں کے ذریعے ایران تک اپنے آمد و رفت کے راستوں کی حفاظت کر رہے تھے اور دشمن کے خلاف جنگی محاذوں پر اپنی تمام قوتیں استعمال کر رہے تھے۔

۱۹۴۱ء کے آخر میں جب امریکہ پر حملہ ہوگیا تھا اور وہ جنگ میں داخل ہوچکا تھا تو تینوں بڑے حلیفوں نے ترکی کے معاملے میں دلچسپی لینی شروع کی اور وہ اس کے طرز عمل سے مطمئن تھے

۴ دسمبر ۱۹۴۱ء کو امریکن صدر نے بیان دیا کہ چونکہ ترکی کی حفاظت امریکہ کی جد و جہد میں مدد دے رہی ہے وہ اس کی ادھار پٹے سے مدد کرے گا۔ اور ۱۹ جنوری ۱۹۴۲ء کو حکومت روس نے انقرہ میں اپنے سفیر کے ذریعے ترکی حکومت کو ایک پیغام بھیجا کہ وہ ترکی کے طرز عمل سے مطمئن ہے اور اس کی رائے میں یہ طرز عمل قابل ستائش ہے۔ ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۳ء میں محوری ریاستیں ترکی کے بارے میں اپنے ارادوں پر متفق نہ ہوسکی تھیں۔ اطالیہ نے محسوس کیا کہ اس کی تمام مصیبت کی وجہ یہ ہے کہ محوری فوجیں ترکی کو روند کر خشکی سے عرب ملکوں میں نہیں گھسیں۔ جاپان بہت بے چین تھا کہ ترکی پر حملے کرکے جرمنوں کو جلد بحر ہند تک پہنچ جانا چاہیئے۔ العالمین کی جنگ کے زمانے میں یہ سمجھا جا رہا تھا کہ ترکی کو الٹی میٹم دینے پر سنجیدگی سے غور ہو رہا ہے۔ ان تمام منصوبہ بندیوں کا دارومدار ایک بات پر تھا اور وہ یہ تھی کہ محوری فوجیں زبردستی ترکی سے گذر سکیں مگر یہ نہ ہوسکا ترکی جمہوریت جنگ کے چوتھے سال میں اپنے محدود مالی ذرائع سے اپنے علاقے کی حفاظت کرکے بہت بڑی خدمت انجام دے رہی تھی جس کے لئے روس اور انگلستان کو مشکور ہونا چاہیئے۔

جرمن العالمین سے اور اسٹالین گراڈ سے پیچھے ہٹے۔ امریکی فوجیں افریقہ میں اتریں (نومبر ۱۹۴۲ء) اور اس طرح سے ۱۹۴۲ء ختم ہوا۔ جب ۱۹۴۳ء کے شروع میں مسٹر چرچل ادنہ آئے تو انھوں نے اس کا اعلان کیا کہ وہ ترکی کے طرز عمل کی تعریف کرتے ہیں۔ وہ صدر روزویلٹ سے مکمل سمجھوتہ ہونے پر کیسابلانکا سے آئے تھے۔

مسٹر چرچل نے ترکی کو کافی سامان حرب مہیا کرنے کا وعدہ کیا۔ ترکی نے مشرق کی طرف جرمنوں کی مزید پیش قدمی کو روک دیا تھا……

اتحادی مقاصد کی سب سے بڑی خدمت ترکی نے ۱۹۴۱ء کے شروع میں انجام دی۔ جرمن اور اطالوی جو یورپ پر قابض تھے مشرق وسطیٰ میں داخل نہ ہوسکے، سیاسی اور فوجی دونوں اعتبار سے اس نے جنگ کے نتیجے پر بہت بڑا اثر ڈالا۔

۱۹۴۲ء سے بحیرۂ روم اور روس کے محاذ پر اتحادیوں کی پیش قدمی شروع ہوگئی۔ بڑی طاقتوں کے رہنما بار بار ملاقاتیں کر رہے تھے ان میں سے ہر ملاقات میں ترکی کے مسئلے پر بھی بحث ہوتی تھی۔

۱۹۴۳ء کے اختتام پر طہران کی ملاقات میں فیصلہ ہوا کہ ترکی سے شریک جنگ ہونے کے لئے کہا جائے۔ اور اس فیصلے کو ترکی تک پہنچا دیا گیا۔ ترکی صدر کو قاہرہ میں مدعو کیا گیا اور وہاں اس نے اس موضوع پر صدر روزویلٹ اور برطانوی وزیر اعظم سے تبادلۂ خیالات کیا۔ ترکی اتحادیوں کی طرف سے جنگ میں شریک ہونے پر اصولاً متفق ہوگیا۔ اس نے پہلے ۲، ۳، ۱۰ کے اندر اندر سامان جنگ کی ایک مقررہ مقدار کا مطالبہ کیا تاکہ وہ جرمن بمباری متفقہ حملے کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوسکے۔

ایک برطانوی حربی وفد انقرہ آیا اور اس موضوع پر تفصیل سے تبادلۂ خیالات ہوا۔ انگریز ترکی کو وہ سامان جس کی اسے ضرورت تھی مہیا نہ کرسکتے تھے۔ جو کچھ وہ مہیا کرنے پر تیار تھے ترکی اسے کافی نہیں سمجھتا تھا جس انداز سے یہ گفتگوئیں ہوئیں وہ نہایت افسوسناک تھا۔

فروری ۱۹۴۴ء میں انقرہ کی گفت و شنید بغیر کسی نتیجے پر پہنچے ہوئے ختم ہوگئی۔ اور ترکی کے خلاف مغربی ملکوں کے اخبارات میں نکتہ چینی شروع ہوئی۔ گذشتہ ۵ سال بھلا دیئے گئے۔ اگست ۱۹۴۴ء میں برطانیہ عظمیٰ اور امریکہ نے ترکی سے جرمنی کے ساتھ سیاسی اور اقتصادی تعلقات منقطع کرنے کو کہا۔ ترکی نے منظور کرلیا بلکہ جنگ میں فوراً شرکت کی طرف بھی میلان ظاہر کیا۔۔۔

فروری ۱۹۴۵ء میں برطانیہ عظمیٰ اور ریاستہائے متحدہ کی درخواست پر ترکی نے جرمنی اور جاپان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ چنانچہ وہ اقوام متحدہ کا ایک رکن ہوگیا اور سان فرانسسکو کانفرنس میں شرکت کے لئے مدعو کیا گیا۔

ان سالوں کے دوران میں ترکی کا سب سے اہم مسئلہ روس کے ساتھ اس کے تعلقات کا رہا ہے۔ روس نے مارچ ۱۹۴۵ء میں ترکی کو اطلاع دی کہ دونوں میں ۱۹۲۵ء سے جو دوستانہ معاہدہ ہے اور نومبر ۱۹۴۵ء میں ختم ہونے والا ہے وہ موجودہ صورت حال کے مطابق نہیں ہے اور اپنی شرائط میں زبردست تبدیلیاں چاہتا ہے۔ ترکی نے اتفاق کیا لیکن یہ نئی شرائط ایک عرصے تک نہیں بتائی گئیں۔ آخرکار جون ۱۹۴۵ء میں زیر بحث شرائط کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوئی مگر وہ ترکی کے لئے بہت مایوس کن تھی۔ اس عرصہ میں روس نے ریڈیو پر ایک نفسیاتی جنگ چھیڑ دی۔ اتحادی مقصد کی جو خدمات ترکی نے انجام دیں اور جو قربانیاں اس نے جنگ میں کیں ان کا کوئی ذکر مئی اور جون ۱۹۴۵ء میں نہیں کیا گیا۔ یہ سب باتیں بالکل بھلا دی گئیں۔ ترکی نے غیر منصفانہ اور غیر ذمہ دارانہ الزامات کے اس طوفان کا جرأت کے ساتھ مقابلہ کرنے کی پوری کوشش کی۔ ۱۹۴۵ء کے موسم گرما میں تین بڑی طاقتوں نے صلح نامہ مانٹریو پر نظر ثانی کی غرض سے ترکی کے ساتھ گفت و شنید کرنے کا فیصلہ پوٹسڈام میں کیا برطانیہ عظمیٰ اور امریکہ نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا اور صلحنامہ مانٹریو پر نظر ثانی کئے جانے کی خواہش ظاہر کی۔

روس نے بھی اپنے ۷ اگست ۱۹۴۶ء کے مراسلہ میں اپنے نقطۂ نظر کو بیان کیا۔ اس نے ایک بالکل مختلف تجویز پیش کی اور وہ یہ تھی کہ دوسروں کو چھوڑ کر صرف بحر اسود کی طاقتیں آبنائے کے انتظام پر بحث کریں اور آبنائے کی حفاظت ترکی اور روس مشترکہ طور پر کریں۔ ایک دوسرے مراسلے میں روسیوں نے اس کی تصدیق کی ترکی نے ان مطالبات کو منظور نہیں کیا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ خود صلحنامہ میں تجویز کئے ہوئے طریقے کے مطابق نظر ثانی ہونا چاہیئے۔

یہ ہے روس اور ترکی کے تعلقات کی موجودہ صورت حال اور امید ہے کہ آئندہ سب معاملات اقوام متحدہ کے اختیار کئے ہوئے "امن اور صلح" کے مطابق طے ہوا کریں گے۔ ۱۹۴۷ء سے یورپ اور مشرق وسطیٰ کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اقوام متحدہ کے رکن کی حیثیت سے ترکی سلامتی اور استحکام کی ایک مفید قوت ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان ترکی سے دوستانہ تعلقات کی اہمیت کو اور اس کی خدمات کی قدر و قیمت کو دوسرے ملکوں کی بہ نسبت زیادہ سمجھتا ہے۔

امریکہ کو بھی ترکی کی حکمت عملی کے درست ہونے پر اب زیادہ اعتماد پیدا ہوگیا ہے۔ اقتصادی اور مالی نقطۂ نظر سے دوسری جنگ عظیم نے ترکی کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ ترکی نے اپنے تمدنی حالات درست کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ ابتدائی تعلیم سے لے کر اس نے تہذیب کے ہر میدان میں نئے ادارے قائم کئے ہیں اور وسیع پروگراموں کو عملی جامہ پہنایا ہے۔ اس نے جرأت کے ساتھ اراضی کے متعلق اصلاحات کی ہیں اپنی سیاسی زندگی میں اس نے بالواسطہ عام حق رائے دہی کو قبول کرلیا ہے، اور سیاسی جماعتیں وجود میں آگئی ہیں۔

ترکی اپنے مزدور طبقے کی تنظیم کی غرض سے دور رس اصلاحات نافذ کر رہا ہے۔ اس وقت تک مختلف قسم کے بیموں کو رواج دینے کے لئے قوانین نافذ کئے گئے ہیں اور کام کی تقسیم اور تنظیم اس طریقے پر ہو رہی ہے جیسی مغربی جمہوریتوں میں ہے۔

شرائط ایجنسی

۱۔ ایجنٹوں کو ۲۵ فی صدی کمیشن دیا جاتا ہے۔
۲۔ قیمت ہر حال میں پیشگی لے لی جاتی ہے۔
۳۔ غیر فروخت شدہ پرچے واپس نہیں لئے جاتے۔
۴۔ کم سے کم پانچ پرچوں پر ایجنسی دی جاتی ہے۔
۵ وی پی سے پرچے نہیں بھیجے جاتے

"منیجر"

کشمیر کا خط

(بسلسلہ صفحہ ۲)

پھر بھی چونکہ حکومت عوام ہی کے نمایندوں کے ہاتھ میں آگئی ہے اس لئے جہاں تک بآسانی ممکن ہے اوپر سے لے کر نیچے تک عوام کے ہی نمایندوں کو حکومت کے انتظام میں شریک کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

عوامی حکومت کے ایک خاص حکم کے ذریعے ہر تحصیل میں ایک تحصیل کونسل قائم کی جا رہی ہے تحصیل نیشنل کانفرنس کا صدر اس کونسل کا چیرمین اور تحصیلدار اس کا داعی مقرر کیا جاتا ہے چیرمین اور داعی کے علاوہ کونسل کے دیگر اراکین کی تعداد زیادہ سے زیادہ پانچ مقرر کی گئی ہے۔ اس کونسل کا کم از کم ایک جلسہ ہر مہینہ ہوتا ہے، اور اس کونسل کا اصلی کام یہ ہے کہ وہ ہر بات پر نظر رکھے کہ عوامی حکومت کے احکامات کی تعمیل اس کی پالیسی اور منشا کے مطابق ہوتی ہے۔

تحصیل کونسل کے اوپر ضلع کونسل قائم کی جاتی ہے ضلع کونسل کا چیرمین ضلع نیشنل کانفرنس کا صدر اور اس کونسل کا داعی وزیر وزارت ہوتا ہے۔ باقی ضلع کی جملہ کونسلوں کے چیرمین اس ضلع کونسل کے ممبر ہوتے ہیں۔

اس وقت تحصیل کونسل کے ممبران کا تقرر جنرل سکریٹری کشمیر نیشنل کانفرنس اور صدر صاحبان ضلع اور تحصیل نیشنل کانفرنس کی سفارشات پر وزیر مال کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ اس وقت تک حسب ذیل تحصیلوں میں کونسلیں قائم ہوچکی ہیں:

۱۔ اننت ناگ ۲۔ بارامولا ۳۔ پلوامہ
۴۔ کلگام ۵۔ ہندوارہ ۶۔ بڈگام

ایک اور اہم اصلاحی قدم جو اٹھایا گیا ہے وہ ذیلداروں اور نمبرداروں کا انتخاب ہے۔ ریاست کشمیر میں یہ اسامیاں ہر دیہات کے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہیں اور رفتہ رفتہ ان کی حیثیت زمینداروں اور جاگیرداروں جیسی ہوگئی تھی اور باپ کے بعد بیٹے کو یہ اسامیاں وراثتاً مل جاتی تھیں اور پھر یہ دونوں عہدہ دار اپنے افسران بالا کو خوش رکھ کر دیہاتوں پر بادشاہت کیا کرتے تھے۔

عوامی حکومت نے اب ذیلداروں اور نمبرداروں کا تقرر بھی دیہات کے عام انتخاب کے ذریعے کر دیا ہے۔ اس قرارداد نے پہلی بار دیہات دیہات عوام کو یہ محسوس کرا دیا کہ کشمیر میں سیاسی انقلاب ہوگیا ہے اور قوت، طاقت اور اختیارات سب عوام کے ہاتھ میں آگئے ہیں۔ یہی عوامی حکومت ہے۔ اور عوامی حکومت نئے کشمیر کی یہی اساس ہے۔ اسی لئے شیر کشمیر کا "نیا کشمیر" عوام کے لئے پیام زندگی ہے اور خواص کے لئے پیام موت! شیر کشمیر کی کمان میں یہی ایک تیر ہے جس سے وہ بیک وقت مہاراجہ بہادر اور پاکستان کے رجعت پسندوں اور مجاہدوں کا کامیابی سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ پس ماندہ عوام کو ان کے پیروں پر کھڑا کر رہے ہیں، ان کو طاقت اور قوت دے رہے ہیں۔ اور پھر یہی عوام عوامی حکومت زندہ باد، کشمیر زندہ باد! شیر کشمیر زندہ باد کے بے ساختہ نعروں سے اپنی قوت اور طاقت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اور شیر کشمیر کی قیادت کا اعتراف کرتے ہیں!

رجسٹرڈ نمبر ڈی ۲۰۰۰

ہفتہ وار نئی روشنی دہلی

ادارۂ تحریر

ڈاکٹر سید عابد حسین۔ صالحہ عابد حسین۔ عبد اللطیف اعظمی

تاریخ اشاعت: یکم ٨، ١٦، ٢٧

چندہ: سالانہ ے، ششماہی للعہ

افیون کی پینک

(بہ سلسلہ صفحہ ۸)

کبھی روزہ رکھا دن چڑھے سے پیٹ میں کچھ عجیب گھڑ بڑ سی ہونے لگتی تھی اور شام تک بڑھتی جاتی تھی، اس بیماری کی دوا کسی حکیم نے نہ بتائی۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ پیر صاحب کا نام خاکسار تھا جب اس کی رٹ لگاتے تو بڑی اوس سے زمین کا خیال آتا اور ہمارا زخم ہرا ہو جاتا۔ پیر جی سے عرض کیا تو وہ بہت خفا ہوئے اور ہمیں مردود شیطان کہہ کر نکال دیا۔ اس کے بعد تمھارے صاحب، تحصیل میں ایک قرق امین جو شاعر تھے، انھوں نے رائے دی کہ تم شعر کہا کرو۔ پھر دیکھنا کہ ان شعر کے سوا تمھیں زمین آسمان کی سدھ نہیں رہے گی شاعری کا مادہ تو ہم میں ہمیشہ سے تھا، چنانچہ لوگ کہا کرتے تھے کہ تم ہر بات میں شاعری کرتے ہو مگر موزوں شعر اب تک نہ کہا تھا اب جو کہنا شروع کیا تو بڑے جھگڑے پڑ گئے۔ لوگوں نے عجیب عجیب الزام لگائے۔ کہنے لگے تمھارے صاحب فلاں شعر جو ہے وہ سرقہ ہے، ایک شاعر اس مضمون کو انھیں لفظوں میں کہہ گیا ہے کوئی پوچھے تمھارے صاحب ہمارا اس میں کیا قصور ہے؟ شرارت اس شاعر کی ہے جس نے ہمیں پھنسانے کے لئے پہلے ہی سے یہ مضمون کہہ دیا اور پھر انھیں لفظوں میں۔ اب ایک ہی چیز باقی رہ گئی تھی یعنی عشق سو وہ بھی ہم نے کر دیکھا صبح شام پنگھٹ پر جاتے تھے اور گاؤں کی نازنینوں کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھا کرتے تھے، جیسا کہ عاشقوں کا قاعدہ ہے ہم کبھی آہ سرد بھرتے تھے، کبھی سسکتے تھے کبھی روتے تھے، کبھی جگر تھام کر بیٹھ جاتے تھے۔ مگر تمھارے صاحب ان نیک بختوں کا برتاؤ بالکل قاعدے کے خلاف تھا، انھیں چاہئے تھا کہ ہمیں ترچھی نظروں سے دیکھتیں، پلکوں کے تیز بھوؤں کی کٹاریں چلاتیں مسکراہٹ کی بجلیوں سے جلا دیتیں ہونٹوں کے امرت سے جلا دیتیں مگر یہ تو ہمیں دیکھ دیکھ کر قہقہے لگاتی تھیں اور ہمیں پانی کے چھینٹوں سے بھگو دیتی تھیں۔ خیر اس میں بھی ایک خاص لطف آتا تھا، اگرچہ جاڑوں میں ذرا تکلیف ہوتی تھی۔ جب تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ہماری طبیعت تھوڑی بہت بہلی رہی مگر تقدیر کو یہ بھی گوارا نہ تھا۔ "وہ" جو آئیں تو انھوں نے عشق کی قطعی ممانعت کر دی چلئے چھٹی ہوئی۔ اب تمھارے صاحب کو یہی حال ہو گیا۔ زمین کا غم پھر نشتر کی طرح چبھنے لگا اور دشمنوں سے بدلے کا خیال کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا، اب پھر ادھر کے چکر ہونے لگے۔ ہم اپنے کھیتوں کے پاس نہیں جاتے تھے، دور سے دیکھ دیکھ کر کڑھتے تھے۔ اگر یہ وحشت چند سال اور رہتی تو خدا جانے ہمارا کیا انجام ہوتا، مگر خدا کو کچھ اچھا کرنا منظور تھا کہ ایک باکمال جوگی ادھر آ نکلا، ہم تو ایسے لوگوں کی تلاش ہی میں رہتے تھے۔ فوراً اس کی خدمت میں پہنچے اس نے ہم کو دیکھ کر کہا۔ بابا تیرا دکھ بڑا بھاری ہے، اس کو جیون سنکٹ کہتے ہیں، یہ بیماری اس طرح ہوتی ہے کہ یہ جیون سنسار آدمی کے لئے سانپ کے منہ کی چھچھوندر ہو جاتا ہے کہ نہ اگلے بنے نہ نگلے بنے۔ جب ایک آدمی کی یا پورے سماج کی تن من کی طاقت گھٹ جاتی ہے اور دنیا کا بوجھ نہیں گھٹتا تو زندگی نہ سنبھالے سنبھلتی ہے اور نہ چھوڑے چھوڑی جاتی ہے اس کا علاج یا تو یہ ہے کہ اپنے میں اتنی شکتی پیدا کی جائے کہ جیون جیالا بن کر ہمارے آگے ڈنڈوت کرے، یا پھر اسے مایا کہہ کر چھوڑ دیا جائے اور اپنے لئے دھیان گیان کا ایک مندر بنا لیا جائے جس میں ہم بھول کو گیان سمجھتے ہوئے۔ نیند کو شانتی جانتے ہوئے ہنسی خوشی دنیا سے چلے جائیں۔ یہ باتیں تیرے سمجھنے کی نہیں، تو نہ تو شکتی رکھتا ہے اور نہ گیان کے قابل ہے اس لئے میں تجھے ایک گولا دیتا ہوں جس کے کھانے سے تو دم بھر میں اپنی زمین کیا ساری زمین کی فکر سے چھوٹ جائے گا اور تن کی دنیا کے جھمیلوں سے چھوٹ کر من کی دنیا کی سیر کرے گا، اور آپ ہی آپ مزے سے گا۔ یہ کہہ کر اس نے ہمیں ایک کالے رنگ کی چھوٹی سی گولی دی، جانتے ہو تمھارے صاحب، یہ کیا چیز تھی؟ یہ وہی تھی جسے دنیا والے افیم کہتے ہیں۔ مبارک تھی وہ گھڑی جب ہم نے "درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا"

وہ دن اور آج کا دن پھر کبھی ہمیں زمین کی یاد نے، بدلے کے خیال نے، غرض دنیا کی فکر نے نہیں ستایا، کبھی کبھار ذرا سی بے چینی ہوتی ہے مگر جہاں افیون حلق سے اتری اور ہمارے اندر آرام کی ہلکی ہلکی لہریں اٹھنے لگیں۔ چین کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے آنے لگے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی نرم نرم ہاتھوں سے آہستہ آہستہ جھولا جھلا رہا ہے پھر زمین سے آسمان تک خاموشی، سکون، امن دامان چھا گیا، ذرے ذرے میں صلح وآشتی اور محبت بس گئی۔ اور ہماری روح بے خودی کی آغوش میں پہنچ کر بے خبری کا لطف اٹھانے لگی۔ آج معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا وقت آن پہنچا ہے، اور روز روز کے سہنے جلنے، کڑھنے، اچھلنے سے نجات پا کر ہم ابدی نیند کے سمندر میں ڈوب رہے ہیں، اس لئے ہم نے تمھیں اپنی کہانی سنا دی کہ تم اسے سب ہندوستانی بھائیوں تک پہنچا دو اور انھیں وہ نسخہ بتا دو جس نے ہمارے سارے دکھ درد کو دور کر دیا اور ہماری زندگی کی مشکل کو حل کر دیا جسے عمر بھر ایک بار بھی یہ نعمت نصیب ہو گئی وہ قیامت تک اس کی لذت نہیں بھول سکتا۔ کیا خوب کہا ہے کسی نے ؎

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی پینک کے رات دن ۔۔۔ اونگھا کریں تصور جاناں کئے ہوئے

پاکستان

(بہ سلسلہ صفحہ ۵)

مقصد کی خاطر ہو رہا ہے۔ عوام اور پاکستان کی بہبود کے زاویہ نگاہ سے ضرورت اس امر کی ہے کہ مغربی پنجاب میں ایک مضبوط، با اثر اور فرض شناس وزارت قائم ہو جو صحیح طور پر صوبے کے نظم ونسق کو سنبھالنے اور چلانے کی اہلیت رکھتی ہو۔

ردو بدل کا مقصد اگر یہ ہے کہ بڑے آدمی عہدوں کی تقسیم پر بہ آسانی حصہ دار بن سکیں، تو ہمیں اس سے کسی قسم کی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ یہ صورت وزرا کی تعداد کو بڑھانے اور ان برائیوں کو جو موجود ہیں المضاعف کرنے پر منتج ہو کر رہے گی۔

مغربی پنجاب کی بدقسمتی ہے کہ یہاں وزارتی الجھنوں کا اونٹ کسی کروٹ بیٹھنے ہی میں نہیں آتا۔ (مغربی پاکستان روزنامہ لاہور۔ مورخہ ۳۰ نومبر)

"اہنسا اور مہاتما گاندھی"

(بہ سلسلہ صفحہ ۹)

کی منزل تک رسائی ہو سکتی ہے۔

یہیں سے گاندھی جی کی تکرار شروع ہوتی ہے۔ اس عہد زریں کا آغاز ہوتا ہے جس میں ہندو اور مسلمان بلا کسی تفریق اور امتیاز کے احترام کے ساتھ جمنا کے کنارے ان کی سمادھ کو خراج عقیدت پیش کریں گے۔ اس مقام پر جہاں سے وہ بہتی اور بل کھاتی ہوئی دوام سے ہم کنار ہونے کو بڑھتی ہے اور اس طرح ثابت ہوگا کہ گاندھی جی کے لئے کل انسانیت سوگوار ہے، سوگوار ہی نہیں بلکہ ان کی زیر بار احسان ہے۔

پرچہ نہ ملنے کی صورت میں

کاغذ کی قلت کی وجہ سے نئی روشنی کی زائد کاپیاں بہت کم تعداد میں چھپتی ہیں۔ اس لئے اگر اتفاق سے کوئی پرچہ کسی صاحب کو نہ ملے تو براہ کرم ایک ہفتہ کے اندر اندر اس کی دفتر کو اطلاع کر دیں۔ ورنہ ممکن ہے مطلوبہ پرچہ ان کو نہ مل سکے۔ "منیجر"

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
۱۶ نومبر ۱۹۴۸ء

امریکہ میں صدر کا انتخاب

۲ نومبر سے ۴ نومبر تک ساری دنیا کی نظریں امریکہ کے صدارتی انتخاب کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ مختلف زمانے میں مختلف اندازے کئے گئے تھے، ان کی بنا پر یہ بات یقینی معلوم ہوتی تھی کہ ریپبلکن پارٹی کے امیدوار مسٹر ڈیوی کثرت سے منتخب ہوں گے۔ مگر ۴ نومبر کو یہ تصور سن کر حیرت میں رہ گیا کہ ڈیموکریٹ امیدوار مسٹر ٹرومین کو تقریباً تیس لاکھ ووٹوں سے کامیابی ہوئی ہے۔ نہیں بلکہ دونوں آئین ساز مجالس میں ان کی پارٹی کو مستقل اکثریت رہی اور امریکہ کی ۴۸ ریاستوں میں سے ۳۰ میں ڈیموکریٹ گورنر منتخب ہوئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مسٹر ٹرومین کو اپنی پالیسی پر عمل کرنے میں جو آئینی رکاوٹیں پیش آرہی تھیں وہ دور ہو گئیں اور اب وہ زیادہ آزادی سے کام کر سکیں گے۔

اس حیرت انگیز واقعہ کی توجیہہ امریکہ کے اخبارات یہ کر رہے ہیں کہ روشن خیال تعلیم یافتہ طبقے، مزدور طبقے اور نیگرو جماعت کے علاوہ جن سے پہلے ہی سے امید تھی بہت سے زمیندار کسانوں نے بالکل خلاف توقع ڈیموکریٹ پارٹی کا ساتھ دیا۔ چونکہ مسٹر ٹرومین میں وہ غیر معمولی قابلیت اور ذاتی کشش جو روز ویلٹ آں جہانی میں تھی نہیں ہے اس لئے ان کا زراعتی طبقے میں سے کچھ لوگوں کی تائید حاصل کر لینا یقیناً یہی ظاہر کرتا ہے کہ یہ لوگ ان کی پالیسی کو پسند کرتے ہیں اور رجعت پسندی کا زور جو امریکہ میں پچھلے دو سال میں بہت بڑھ گیا تھا اب کچھ گھٹ رہا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ مسٹر ٹرومین کی پالیسی کیا ہے اور امریکہ کو وہ آئندہ چار برس میں کس راہ پر چلائیں گے۔

جہاں تک اندرونی معاملات کا تعلق ہے مسٹر ٹرومین اپنی پالیسی کا بڑی جرأت اور استقامت سے اعلان کرتے رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ زراعت، صنعت اور تجارت کی نگرانی میں، قیمتوں کے مقرر کرنے میں، درآمد اور برآمد کے ضبط میں ریاست کا کافی دخل رہے۔ اور سرمایہ داروں کے نفع خوری کی خواہش کو قابو میں رکھا جائے۔ ان کا اصرار ہے کہ نیگرو جماعت کو شہریت کے پورے حقوق حاصل ہوں اور سیاسی اور معاشرتی حیثیت سے اس کے ساتھ کامل مساوات کا برتاؤ کیا جائے۔ غرض عام طور پر وہ روز ویلٹ مرحوم کے نقش قدم پر چلنے کی آرزو رکھتے ہیں۔

البتہ بیرونی معاملات میں کچھ عرصے سے ان کا رویہ تلون کا رہا ہے۔ کبھی انہوں نے یہ سنسنی خیز اعلان کیا کہ جنگ کا فوری خطرہ ہے اس لئے بری، بحری اور ہوائی فوج میں بڑے پیمانے پر بھرتی شروع کی جائے گی اور کبھی یہ اطمینان دلایا کہ ابھی لڑائی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ آج روس کو دوستانہ گفتگو کا پیام دیا اور کل اس کی ایسی تاویل کر دی کہ ساری امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ ادھر اتحادیوں کے اور روس کے جھگڑے کو فیصلے کے لئے [illegible] پنچایت میں پیش کیا اور ادھر مارشل اسٹالن سے صلح کی گفتگو کرنے کے لئے اپنا ایک خاص ایلچی بھیجنے پر تیار ہو گئے۔ ان کی اس دو رنگی کی وجہ یا تو ارادے کی کمزوری ہو سکتی ہے یا کوئی سیاسی مصلحت۔ پہلی بات اس وجہ سے قرین قیاس نہیں کہ اگر ان کا ارادہ کمزور ہوتا تو ان کی اندرونی پالیسی اس قدر صاف اور [illegible] نہ ہوتی اس لئے یہی سمجھنا چاہئے کہ بیرونی پالیسی میں یہ [illegible] سیاسی مصلحت کا تقاضا ہے۔ [illegible] مسٹر ٹرومین بھی روز ویلٹ کی طرح اصولاً روس کے ساتھ [illegible] کے حامی ہیں لیکن [illegible] چونکہ عام طور پر [illegible] ہوتی تھی اور امریکہ میں الیکشن کے سلسلے میں خاص طور پر [illegible] اس پر مجبور تھے کہ ووٹ حاصل کرنے کے لئے کبھی کبھی جنگ کا نعرہ لگاتے رہیں۔ اب الیکشن کا بخار اترنے کے بعد امریکہ میں لوگوں کی طبیعت سکون پذیر ہو سکے گی اور مسٹر ٹرومین کو اپنا اصلی خیال ظاہر کرنے کا موقع ملے گا۔ اس وقت معلوم ہو گا کہ ہمارا حسن ظن ان کی صلح پسندی کے بارے میں صحیح ہے یا نہیں۔

بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ مجموعی طور پر دنیا میں مسٹر ٹرومین اور ڈیموکریٹک پارٹی کی کامیابی پر اطمینان ظاہر کیا جا رہا ہے۔ انگلستان کی لیبر حکومت کو جو فکر تھی کہ امریکہ میں قدامت پسند ریپبلکن پارٹی برسر اقتدار آگئی تو اس کے ساتھ کیسے نباہ ہو سکے گا، دور ہو گئی۔ مغربی یورپ کے ملکوں کا یہ اندیشہ جاتا رہا کہ امریکہ میں انقلاب حکومت کے بعد یورپ سے دلچسپی کم ہو جائے گی اور مسٹر مارشل کا یورپ کی معاشی امداد کا منصوبہ پورا نہ ہو سکے گا۔ ایشیائی ملکوں کی یہ خلش مٹ گئی کہ کہیں امریکہ کی ریپبلکن حکومت موجودہ حکومت سے بھی زیادہ نوآبادیوں کے معاملے میں سامراجی ریاستوں کی حمایت نہ کرے۔ یہاں تک کہ روس کو بھی جس کے نزدیک ڈیموکریٹ اور ریپبلکن ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں، انتخاب کے نتیجے سے خاصی خوشی ہوئی اس لئے کہ وہ کتنا ہی کہے کہ دونوں پارٹیاں بالکل ایک سی ہیں مگر دل میں ضرور سمجھتا ہے کہ ریپبلکن پارٹی جس پر بڑے سرمایہ دار حاوی ہیں ڈیموکریٹک پارٹی سے کہیں زیادہ اس کی دشمن ہے۔

صرف چین ایک ایسا ملک ہے جہاں چیانگ کائی شک اور ان کے ساتھیوں کو انتخاب کے نتیجے سے مایوسی ہوگی اس لئے کہ مسٹر ڈیوی نے شمال کے کمیونسٹوں کے مقابلے میں قومی حکومت کو براہ راست زیادہ سے زیادہ مدد دینے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اب مسٹر ٹرومین کے وزیر خارجہ مسٹر مارشل نے بھی یہ وعدہ کر لیا ہے کہ وہ بہت جلد کمیونسٹوں کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے چین کو پوری مدد دیں گے اور کوئی تعجب نہیں کہ وہ اپنا وعدہ پورا بھی کریں، یہ معلوم نہیں کہ وہ چیانگ کائی شک کی آمرانہ حکومت ہی کو قائم رکھنا پسند کریں گے یا زیادہ جمہوری اور ترقی پسند عناصر کو سہارا دے کر آگے بڑھائیں گے۔

غرض امریکہ کے انتخاب صدارت کے نتیجے نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ ہر سیاسی اور معاشی بحران کے باوجود جو پچھلی جنگ نے پیدا کر دیا ہے دنیا صحت عقل کی راہ سے زیادہ دور نہیں ہٹی ہے۔

بزم بے تکلف

"اچھا صاحب ایک ہوا مستند یا ٹکسالی لیڈر، ایک متروک لیڈر دوسرے وہ بھی [illegible]، اب آگے چلئے۔"

علیٰ ہذا القیاس

"دیکھئے مولانا آپ نے پھر دھاندلی کی۔ مولوی میں غرابت کی نہیں بدی تھی۔"

"آپ کے لئے تو عربی کا ہر لفظ لاحول ہے۔ خیر مطلب یہ ہے کہ تیسری قسم کو آپ غیر مانوس یا غریب کہہ سکتے ہیں۔"

"کیا واہ! کہاں غیر مانوس، کہاں غریب، آپ نے دونوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک دیا۔ غیر مانوس لیڈر تو اپنے محل میں سیر فرش کی طرح قالین پر دھرا رہتا ہے۔ غریب لیڈر بیچارا تو ہوں کی جھونپڑیوں میں ان کے ساتھ چٹائی پر بیٹھتا ہے۔"

"آپ سمجھے نہیں یہاں غریب عرفی معنی میں نہیں لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے۔"

"جی ہاں عربی، لغوی، سعدی، حافظ تو جانتا نہیں اتنا جانتا ہوں کہ غریب تو غالب ہی لکھ گئے جیسے چاہئے استعمال کیجئے۔"

"خیر اس نزاع لفظی کو چھوڑیے، آپ غیر مانوس کہئے اچھا لو غیر مانوس لیڈر۔"

"معاف کیجئے گا آپ دانستہ بیچ میں بیٹھنے کئے دیتے غیر مانوس لیڈر [illegible] جو دور سے سات پردوں کے اندر [illegible] بیٹھ کر دور سے اپنا کام کریں، اس کا سمرن بہت ہوتا ہے [illegible] کم۔ اس کا سکہ اس کے نام سے چلتا ہے [illegible]"

"آپ نے تو لیڈر کو بالکل [illegible] بنا دیا۔"

"تو یہ کیجئے [illegible] اس کی امت مار مار کے بھرکس نکال دے۔"

"ایسے لیڈر کے پیچھے زیرک دیو [illegible] ہو جاتے ہیں مولانا۔ جتنا وہ آپ کو دور کھینچتا ہے اتنے ہی اس کی طرف کھنچتے ہیں جتنا وہ دھتکارتا ہے، اتنی ہی دم ہلاتے ہیں۔"

"اور جو کہیں پردہ اٹھ جائے!!"

"تو بس قیامت ہی آ جائے۔"

پچھلا ہفتہ: ہندوستان

آخری مرحلہ

۴ نومبر سے مجلس آئین ساز کا اجلاس شروع ہو گیا ہے جس میں ہندوستان کے آئین کی منظوری کا آخری مرحلہ طے ہونے والا ہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے اپنی تقریر میں بڑی قابلیت سے حسب ذیل بنیادی اصول سمجھائے جن کو سامنے رکھ کر آئین کا مسودہ مرتب کیا گیا ہے:۔

۱۔ ہندوستان مختلف ریاستوں کا ایک وفاقی یونین ہوگا جس میں مرکز کے اختیارات بہت وسیع ہوں گے۔ یہ اختیارات ۹۱ مدوں پر مشتمل ہوں گے جن میں خاص خاص مدیں دفاع، مواصلات (ڈاک تار، ریل وغیرہ)، امور خارجہ، ہوں گے۔ اس کے علاوہ بعض مدوں میں اختیارات مرکز میں اور صوبوں میں (جو ریاستوں کے نام سے موسوم ہوں گے) تقسیم ہوں گے مثلاً عدالت۔ ریاستوں کی اپنی عدالتیں بھی ہوں گی مگر وہ مرکزی سپریم کورٹ کے ماتحت رہیں گی۔

۲۔ دیوانی فوجداری کے بنیادی قوانین اور شخصی قانون (پرسنل لا) میں سارے ملک میں یکسانی قائم رکھی جائے گی شہریت ریاستوں کی الگ الگ نہیں ہوگی بلکہ ہر ریاست کے باشندے کو پورے ہندوستان کی شہریت حاصل ہوگی۔

۳۔ سارے ملک کے لئے ایک مشترک سول سروس ہوگی۔

۴۔ طرز حکومت پارلیمنٹری یعنی وزرا پارلیمنٹ کے ممبر ہوں گے اور اس کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔

اب تک آئین کے مسودہ کے بارے میں عام بحثیں ہو رہی ہیں۔ سب سے پہلا اعتراض جو رد کر دیا گیا سوشلسٹ پارٹی کی طرف سے تھا کہ موجودہ اسمبلی جسے رائے دہندوں کی محدود تعداد نے منتخب کیا ہے پوری جنتا کی نمائندہ نہیں اس لئے اسے آئین بنانے کا کوئی حق نہیں۔ اس کے علاوہ مختلف اور متضاد اعتراضات کئے گئے مثلاً مرکز کے اختیارات بہت زیادہ ہیں یا بہت کم، اقلیتوں کے لئے تحفظات نہیں ہونے چاہئیں یا جتنے اب ہیں اس سے زیادہ ہونے چاہئیں۔ بظاہر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آئین کے بڑے بڑے اصولوں کے بارے میں زیادہ اختلاف نہیں ہوگا اور وہ بغیر کسی رد و بدل کے منظور ہو جائیں گے۔ البتہ ضمنی مسائل، مثلاً قومی زبان، صوبوں کی زبان کے لحاظ سے تقسیم اور اقلیتوں کے حقوق وغیرہ کے بارے میں بڑی گرما گرم بحثیں ہوں گی، اور ان کے طے کرنے میں بڑی دیر لگے گی۔ اس لئے یہ امید کہ آئین آخر دسمبر تک مکمل طور پر منظور ہو جائے گا کچھ موہوم سی نظر آتی ہے۔ زبان کا مسئلہ سب سے زیادہ معرکے کا معلوم ہوتا ہے جنوبی ہند کے ممبروں کا زور شور سے مطالبہ ہے کہ پندرہ سال تک مرکزی حکومت اور پارلیمنٹ کی زبان بدستور انگریزی رکھی جائے۔ ادھر ہندی ساہتیہ سمیلن کے ہم خیالوں اور ہندوستانی پرچار سبھا کے ہم خیالوں میں ہندی اور ہندوستانی کے لئے رسہ کشی ہو رہی ہے۔ اس وقت تو اسمبلی میں یہ بحث ملتوی کر دی گئی ہے اور دونوں فریق اسمبلی کے ممبروں میں اپنے خیال کی اشاعت کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہندی کے حامی چاہتے تھے کہ زبان کا مسئلہ پہلے ہی دن پیش ہو اور جو زبان قومی زبان قرار پائے اسی میں آئین کا مسودہ سنایا جائے۔ مگر اس کی اجازت نہیں ملی۔ اصل مسودہ انگریزی میں لکھا گیا ہے، اور اسی میں پڑھ کر سنایا جائے گا جب قومی زبان کی دفعہ کی باری آئے گی تو ہندی اور ہندوستانی کا معرکہ پھر گرم ہوگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جمہور کی بہت بڑی اکثریت یہ چاہتی ہے کہ ہندوستانی جو ناگری اور اردو دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی ہے ملک کی قومی زبان ہو، لیکن اس وقت تعصب کی فضا میں وہ طبقہ جس کے پاس لاؤڈ اسپیکر ہے جمہور کی آواز کو دبا سکتا ہے، اور دبا رہا ہے

یہ تو بہت اچھا ہی

آئین کے بارے میں ایک بڑی خلش یہ تھی کہ کہیں وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی واپسی کے بعد اس رزولیوشن میں جو آئین ساز اسمبلی نے جنوری ۱۹۴۷ء میں بنیادی مقصد کے بارے میں پاس کیا تھا، ترمیم کا قصہ نہ چھڑ جائے۔ اسمبلی نے یہ طے کر دیا تھا کہ ہندوستان ایک اقتدار اعلیٰ کی حامل آزاد ریپبلک کی حیثیت رکھے گا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ پنڈت نہرو نے کامن ویلتھ کے وزرا کی کانفرنس کے بعد جو بیان دیا تھا کہ ہندوستان کامن ویلتھ کے دوسرے ملکوں سے قریبی اور گہرے تعلقات رکھنے پر تیار ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ریپبلک نہیں رہ سکتا۔ ڈاکٹر امبیڈکر پہلے ہی تجویز کر چکے تھے کہ بنیادی مقصد کے رزولیوشن میں سے "ریپبلک" کا لفظ ہٹا کر اس کی جگہ "ریاست" کا بے رنگ لفظ رکھ دیا جائے۔ اس لئے ہر شخص بے چینی سے انتظار کر رہا تھا کہ دیکھیں پنڈت جی لندن سے واپس آ کر اس گفتگو کے بارے میں، جو وہاں ہندوستان اور کامن ویلتھ کے تعلقات کے مسئلے پر ہوئی کیا رپورٹ دیتے ہیں، اور اس کی بنا پر ہندوستان کے آئین میں ترمیم تجویز کرنی پڑتی ہے۔ شکر ہے کہ موصوف کی پہلی تقریر کے بعد جو ۸ نومبر کی اسمبلی کے سامنے ہوئی ساری خلش مٹ گئی۔ اس تقریر کے خاص نکتے جو مذکورہ بالا مسئلے سے تعلق رکھتے ہیں یہ ہیں:۔

۱۔ لندن کی کانفرنس میں ہندوستان اور کامن ویلتھ کے تعلقات کے بارے میں کوئی بحث نہیں کی گئی۔ البتہ برطانوی وزیر اعظم اور کامن ویلتھ کے دوسرے مدبروں سے نجی ملاقات میں گفتگو ہوئی۔

۲۔ یہ گفتگو تبادلہ خیالات تک محدود رہی، کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ فیصلہ خود اسمبلی کو مناسب وقت پر کرنا ہوگا۔

۳۔ ہندوستان اور کامن ویلتھ کے تعلقات کے مسئلے کو ہندوستانی آئین کے مسائل سے کوئی تعلق نہیں۔ آئین صرف اپنی اندرونی مصلحتوں کو مد نظر رکھ کر بنایا جائے گا۔ اسمبلی کو بنیادی مقصد کے رزولیوشن میں ترمیم کرنے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

اگر ہندوستان کی آزاد ریپبلک کی حیثیت میں کسی تبدیلی کا سوال نہیں ہے تو ہندوستان اور کامن ویلتھ کے تعلقات کا مسئلہ محض خارجی پالیسی کا مسئلہ رہ جاتا ہے جسے اسمبلی پنڈت جی کی رہنمائی میں بغیر ہیجان خیز اور طوفان انگیز بحثوں کے ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بعد طے کر سکتی ہے۔

کیا کچھ رنگ بدل رہا ہی

لیاقت علی خاں صاحب نے لندن سے واپسی کے بعد ۸ر نومبر کو جو تقریر کی اس کی ابھی تک صرف ایک مختصر سی رپورٹ آئی ہے۔ جہاں تک اس مجمل اطلاع سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کشمیر کے بارے میں ان کا لہجہ خاصا معقول اور معتدل ہے فرماتے ہیں "میں نے پنڈت نہرو اور دوسرے حضرات پر جن سے کشمیر کے بارے میں مجھ سے گفتگو کی اچھی طرح واضح کر دیا کہ اس مسئلہ کا منصفانہ فیصلہ صرف ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کشمیر کے لوگوں کا یہ حق تسلیم کر لیا جائے کہ وہ ہندوستان یا پاکستان میں شرکت کرنے کے بارے میں آزادی سے اظہار رائے کر سکتے ہیں۔ ہندوستان بھی جمہوریت کا قائل ہے اور پاکستان بھی۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ کشمیر کے لوگوں کو اپنے مستقبل کے بارے میں خود فیصلہ کرنے کی اجازت نہ دی جائے، کیا یہ بڑی بے انصافی نہ ہوگی کہ کشمیر میں لاکھوں انسانوں کی رائے کو نظر انداز کیا جائے اور انھیں اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا موقع نہ دیا جائے؟" اگر تقریر میں اس کے بعد "کشمیر پر پاکستان کے قدرتی حق" کا "بتیس لاکھ مسلمانوں" اور "دنیا کی سب سے بڑی ریاست" کا اور "خون کے آخری قطرے" کا کوئی ذکر نہیں ہے تو نہایت خوشی کی بات ہے کہ لیاقت علی خاں صاحب نے اب مصالحانہ لہجہ اختیار کر لیا ہے اور اس سے یہ امید ہوتی ہے کہ کشمیر کمیشن کی مدد سے یا اس کی مدد کے بغیر ہندوستان اور پاکستان میں کوئی سمجھوتے کی صورت نکل آئے گی، اس لئے کہ ہندوستان کی حکومت نے تو پہلے ہی دن کہہ دیا تھا اور آج تک اس پر قائم ہے کہ کشمیر کے معاملے کا آخری فیصلہ وہاں کے جمہور کی رائے سے ہوگا۔ لیکن لیاقت علی خاں صاحب کی معقول پسندی اور صلح جوئی کا صحیح اندازہ اس وقت ہوگا جب عام رائے شماری کی شرائط کا سوال اٹھے گا اگر انھوں نے اس وقت بھی کشمیر سے پاکستانی فوجوں کے ہٹانے سے انکار کیا اور ہندوستانی فوجوں کے ہٹانے پر اصرار کیا یا یہ شرط لگائی کہ کشمیر میں شیخ عبداللہ کی حکومت کو ہٹا کر یو۔ این۔ او۔ حکومت قائم کی جائے تو ظاہر ہو جائے گا کہ ان کی صلح کی باتیں محض باتیں ہی باتیں تھیں۔"

(ع، ح)

۲۔ پاکستان

قلم اور زبان کی بے احتیاطیاں

اس وقت بہت سے اکابر پاکستان کی جن میں وزراء بھی شامل ہیں، تقریریں اور تحریریں ہمارے سامنے ہیں۔ ان تقریروں کا ماحصل چند جملوں میں یہ ہے:

"ہم پنڈت نہرو کا چیلنج قبول کرتے ہیں ہم پاکستان کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ بہادیں گے۔ اگر کسی نے اس طرف آنکھ سے دیکھا، تو وہ آنکھ نکال دی جائے گی اور اگر کسی نے اس طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔"

ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ غلط انداز بیان کئی سال سے ہماری قوم میں جاری ہے۔ پہلے کہا گیا تھا کہ اگر پنجاب بنگال یا آسام کی ایک انچ زمین بھی ہندو کو دی گئی تو ہم اپنے خون کا آخری قطرہ تک اس کے لئے بہادیں گے۔ ایک انچ زمین کا اعلان تھا اور آدھے آدھے صوبے ہمارے ہاتھ سے نکل گئے لیکن "وہ خون کا آخری قطرہ" پھر بھی نہیں بہا۔ پھر کہا گیا اگر کسی نے تیز آنکھ سے جوناگڑھ کی طرف دیکھا تو وہ آنکھ نکال دی جائے گی۔ جوناگڑھ سارا ختم ہو چکا ہے، مگر ابھی تک آنکھ کسی کی نہیں نکلی۔ پھر حیدرآباد کے متعلق سرحد میں قبائلی علاقے میں اور بلوچستان میں ہر جگہ اعلان پر اعلان ہوتے رہے۔ اگر کسی نے حیدرآباد کی طرف ذرا بھی ہاتھ بڑھایا تو وہ ہاتھ کہنی سمیت توڑ دیا جائے گا۔ اس اعلان کا بھی وہی حال ہے، جو پہلے اعلانوں کا ہوا۔ حیدرآباد کی لاش سر میدان پڑی ہے مگر کسی قاتل کی انگلی تک کو خراش نہیں آئی۔ جناب قاسم رضوی صاحب اپنے ہر اعلان میں دہلی کے لال قلعہ پر نظام کا جھنڈا نصب فرمایا کرتے تھے۔ اس بے جا بول کا نتیجہ بھی جو کچھ ہوا وہ سب کے سامنے ہے ....

اگر کوئی مسلمان ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات پر کچھ لکھے تو مسلمان ایک تبلیغی مذہب کے پیرو کی حیثیت سے اپنے ضمیر سے پوچھنا چاہیئے "میری تحریر و تقریر نے اصول حق کے مطابق دونوں ملکوں کو باہم قریب کیا یا ایک دوسرے سے دور پھینک دیا ہے۔ ہمارے ممالک کی اصلاح بڑی حد تک اسی اصول کے تسلی بخش جواب پر منحصر ہے۔

عبدالمجید قرشی، مدیر "ایمان"

(بحوالہ روزنامہ امروز لاہور)

پاکستان کا اقتصادی نظام

مسٹر لیاقت علی خاں نے لندن کے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے سامعین کو یہ مژدہ سنایا کہ

پاکستان نہ تو ایک سرمایہ دارانہ مملکت ہوگی اور نہ کمیونسٹ۔ بلکہ اس کا اقتصادی نظام اسلامی اصولوں پر مبنی ہوگا۔ پاکستان معاشی [illegible] نہ ہوگا جس میں انسان کو انسانی [illegible] سمجھا جائے گا بلکہ انسانوں جیسا سلوک بھی کیا جائے گا ... صرف چند لوگوں کی مٹھی گرم کرنے کے لئے کام نہیں لئے جائیں گے بلکہ ان کا مقصد عوام الناس کی فلاح و بہبود ہوگا۔

یہ آواز اس قدر دلکش، سامعہ نواز اور امید افزا ہے جو خود غرضوں کو چھوڑ کر ہر پاکستان کے دل کی آواز ہے اور اگر پاکستان صحیح معاشرتی اور اقتصادی نظام قائم کر دکھائے تو یہ نوع انسانی کی بہت بڑی خدمت ہوگی، جو اس وقت ایک طرف امریکہ اور برطانیہ کے سرمایہ دارانہ نظام اور دوسری طرف روس کے جابرانہ اشتراکی نظام کے شکنجوں میں پسی چلی جا رہی ہے۔

مسٹر لیاقت علی خاں نے یہ کہہ تو دیا لیکن جب ہم پاکستان کے اندر ایسی علامات تلاش کرنے کے لئے نگاہیں دوڑاتے ہیں جو یہاں صحیح اسلامی نظام معاشرت قائم کرنے کی ہلکی سی ہلکی کوششوں یا خواہشوں کا اظہار کرنے والی ہوں، تو ہمیں مایوسی کے اندھیرے کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ہماری زندگی کا پہلا سال تو یہ ظاہر کر رہا ہے کہ پاکستان کے اکابر، پاکستان کے حکام، پاکستان کے ذمہ دار افراد اور قائدین کے سامنے چند لوگوں کی مٹھی گرم کرنے کے سوا اور کوئی نصب العین ہی نہیں اور بس

اکثر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ پاکستان بنایا ہی اس لئے گیا ہے کہ چند لوگوں کو اپنی مٹھیاں گرم کرنے اور کروڑ پتی بننے کے مواقع حاصل ہو جائیں۔ اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ مٹھی گرم کرنے کرانے کے اس شوق نے ان مقتدر اور معزز ہستیوں کو حلال و حرام کی اس تمیز سے بھی محروم کر دیا ہے جو اسلام نے انسانوں کو زر اندوزی کی لعنت سے بچانے کے لئے مقرر کر دی تھی جس ملک میں رشوت، خیانت، خویش پروری، زر اندوزی، غلط بخشی [illegible] کی دوکان سے داد ہی کی واقع پڑتے ہیں ایسے ایسے روشن ریکارڈ موجود ہوں جن پر چشم فلک بھی شرما جائے وہاں صحیح اسلامی نظام معاشرت کے قیام کی توقع کس طرح کی جا سکتی ہے [illegible] پاکستان کو ایسی لعنتوں سے بزور دست پاک کر دکھائے۔

(روزنامہ مغربی پاکستان لاہور)

پاکستان اور جنگ

پاکستان کی جغرافیائی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اسے آنے والی جنگ میں شامل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی اور کامن ویلتھ کانفرنس کی روئداد بغور پڑھی جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ دولت مشترکہ کے دفاع کے نام پر انگریز مدبر پاکستان کو بھی اپنے جنگی محاذ میں گھسیٹنا چاہتے ہیں۔ مغربی یورپ میں دفاعی کونسل بنائی جا چکی ہے، اور ان ملکوں سے مل کر مشترکہ کمانڈ کی تشکیل کی ہے۔ مشرق وسطیٰ میں گورا فوج مصر سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں۔ پھر فلسطین کا ایک حصہ تو "اسرائیل" کو مل چکا ہے۔ اب دوسرا حصہ عبداللہ کو سونپا جا رہا ہے۔ یہاں بھی گورا فوج اور انگریز افسر موجود ہیں۔ اب مسٹر بیون کی کوشش یہ ہے کہ پاکستان پر دباؤ ڈال کر اسے کشمیر کے معاملے میں ہندوستان کا نقطۂ نگاہ قبول کرنے پر مجبور کیا جائے ....

اب سوال یہ ہے کہ موجودہ حالت میں جبکہ ہماری اقتصادی حالت نہایت کمزور ہے اور بے شمار سیاسی اور اقتصادی مسائل ہماری توجہ، سرمایہ اور وقت کے مستحق ہیں۔ کیا ہماری نوزائیدہ مملکت ایک عالمگیر جنگ میں شریک ہو کر، جنگ کے ناقابل برداشت بوجھ کو برداشت کر سکتی ہے؟ .... یہ بات ہمیں ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ اگر ہم نے تباہی جنگ میں شرکت کی تو ہماری جغرافیائی حالت کچھ اس قسم کی ہے کہ کشت و خون، تباہی اور بربادی ہماری سرحدوں سے اب کی دفعہ دور نہیں رہے گی، بلکہ ہماری سرزمین فیصلہ کن جنگی معرکوں کے لئے میدان کارزار بن کر رہ جائے گی۔ ہماری اقتصادی حالت اور معاشی زبوں حالی ہمارے بے شمار اقتصادی اور سیاسی مسائل اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتے کہ ہم اپنے محدود وسائل کو جنگی تباہ کاریوں پر صرف کریں اور عالمگیر جنگ میں شریک ہو کر ہلاکت اور بربادی کو خود اپنے ہاتھوں دعوت دیں۔

(روزنامہ امروز لاہور)

کامن ویلتھ اور پاکستان

ہماری اپنی خواہش تو یہ ہے کہ پاکستان کسی صورت میں بھی کامن ویلتھ کا رکن نہ رہے۔ گذشتہ دو سو برس سے اسلامی دنیا کو بالعموم اور مسلمانان برصغیر کو خاص طور پر برطانیہ کے ہاتھوں جو مصائب اور ذلتیں برداشت کرنی پڑی ہیں، اور ابھی پچھلے سال تقسیم کے وقت برطانوی حکومت کے نمائندوں نے ہمارے ساتھ جو نارو سلوک کیا اس کو دیکھتے ہوئے ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ ہم کامن ویلتھ میں ایک منٹ کے لئے بھی رہنا گوارا نہ کریں، اور اگر آج کی دنیا میں ساتھیوں کے بغیر رہنا ناممکن ہی ہے، تو برطانیہ کے علاوہ دوسرے ساتھی ڈھونڈھیں اور ان سے معاہدہ کریں۔ ہماری پچھلی تاریخ کا تو یہی تقاضا ہے اور خود پاکستانی عوام کی اکثریت بھی شاید اسی کے حق میں ہو۔ چنانچہ کچھ دن ہوئے معاصر "ڈان" نے جب اس خیال کو پیش کیا تو لاہور کے تمام اخبارات نے اس کا خیر مقدم کیا، اور اس کی تائید میں پرزور مقالے لکھے لیکن جہاں تک ہم جان سکے ہیں، ایسا ہونے کا نہیں، وزیر اعظم پاکستان کے بیانات سے جو انھوں نے لندن کے قیام کے دوران میں دیئے ہیں یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ فی الحال کامن ویلتھ میں رہنا چاہتے ہیں، گو اس بارے میں قطعی فیصلہ [illegible] پاکستان کی مجلس [illegible]

پاکستان کا من ویلتھ میں رہے یا اس سے الگ ہو جائے، اس کا فیصلہ تو آگے چل کر مجلس دستور ساز ہی کرے گی لیکن ہمیں انتہائی دکھ کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس سلسلے میں پاکستان کی قیادت......

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

۳۔ باہر کی دنیا

چین کا نقشہ بدل رہا ہے

جو لوگ چین کی حالت سے واقف نہیں ہیں اور خانہ جنگی کے دونوں فریقوں کے فوجی نقشوں کو نقشے پر دیکھنے کی کوشش برابر نہیں کرتے رہے ہیں ان کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ چین کے شہر اور شاہراہیں پھیل گئے ہیں جن میں نیشنلسٹ اور کمیونسٹ فوجیں گھری ہوئی ہیں، اور جہاں لڑائیاں ہوتی ہیں اور اس کی خبر ہو جاتی ہے وہاں لڑنے لگتی ہیں۔ کچھ عرصے تک شاید حقیقت بھی یہی تھی، لیکن اب رفتہ رفتہ ملک دو بڑے حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ یانگ ٹسے پر اور اس دریا کے جنوب میں نیشنلسٹوں کا پورا قبضہ ہے، یانگ ٹسے اور ہوانگ ہو کے درمیان جو علاقہ ہے اس کے زیادہ بڑے حصے پر نیشنلسٹوں کا تسلط ہے، مگر اس کا ساحل تقریباً سارا کمیونسٹوں کے ہاتھ میں ہے، اور اس کے وسط میں وہ نانکنگ کی طرف بڑھ رہے ہیں، ہوانگ ہو کے شمال میں نیشنلسٹ فوجیں تین چار شہروں میں محصور ہیں، اور پائی پنگ اور تین تسن کا علاقہ اور ان کے گرد تھوڑا سا علاقہ ان کے پاس ہے، باقی سب کمیونسٹوں نے فتح کر لیا ہے۔ منچوریا پر پہلے ہی سے کمیونسٹوں کا روسیوں کی مدد سے قبضہ ہو گیا تھا، لیکن اس کے دارالسلطنت مکڈن میں نیشنلسٹ قدم جمائے ہوئے تھے۔ مکڈن اسلحہ سازی کا سب سے بڑا مرکز بھی ہے، اور چونکہ شروع میں سمندر سے مکڈن تک رستہ کھلا تھا نیشنلسٹ فوجیں اطمینان سے مقابلہ کر سکتی تھیں۔ لیکن یہ رستہ بند کر دیا گیا، ہوائی جہازوں کے ذریعے بہت بڑی فوج کے لئے جنگ کا سامان اور رسد پہنچانا نیشنلسٹ حکومت کے بس کی بات نہیں تھی، اور آخرکار مکڈن فتح ہو گیا۔ اب غالباً چین کا وہ پورا حصہ جو یانگ ٹسے کے شمال میں ہے نیشنلسٹ حکومت کے ہاتھ سے جلد نکل جائے گا۔

مارشل چیانگ کائی شک نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ مکڈن کا فتح ہو جانا نیشنلسٹ حکومت کے لئے ایک بھاری شکست ہے۔ مگر اب تک چین کی حالت کو درست کرنے کی صرف دو تدبیریں ان کی سمجھ میں آئی ہیں، ایک یہ کہ چین کی حکومت ان کے اپنے ہاتھ میں رہے، دوسری یہ کہ جس طرح بھی ہو سکے کمیونسٹوں سے لڑائی جاری رکھی جائے۔ کمیونسٹ مصالحت کی کوشش کر چکے ہیں، مگر مصالحت کے ذریعے وہ حکومت اور اس کی پالیسی میں کچھ تبدیلیاں کرانا چاہتے تھے، اور یہ مارشل چیانگ کو منظور نہ تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے چین کی حالت سدھارنے سے زیادہ انھیں اپنے شخصی تسلط کو قائم رکھنے کا خیال ہے، اور اسی کے لئے وہ کمیونسٹوں سے لڑ رہے ہیں۔

مارشل چیانگ کی پشت پر وہ زمیندار اور سرمایہ دار ہیں جو کمیونزم کے عروج سے پہلے چین کی معاشی اور سیاسی زندگی پر حاوی تھے، اور جو اب اپنی پونجی اور زمین اور حیثیت کو بچانے کے لئے کمیونسٹوں سے جنگ کرنے پر تلے ہوئے ہیں، چاہے اس میں ملک برباد ہو جائے۔ ان لوگوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جسے وہ مارشل چیانگ کی جگہ اپنا لیڈر بنا سکیں، اور ان کا پورا طبقہ ان اخلاقی خوبیوں سے خالی ہے جو ملک اور حکومت کو معاشی حالت سے بچانے کے لئے ضروری ہیں۔ چین کا چور بازار اس وقت مندا نہیں پڑا جب جاپان سے جنگ ہو رہی تھی، ملک کا تھوڑا ہی سا حصہ آزاد تھا، اور یہ بھی ہر چیز کے لئے دوسروں کا محتاج تھا۔ اس چور بازار کا کاروبار اب اور بھی فروغ پر ہے۔ چین کے پرانے سکے کی قیمت اس قدر گر گئی تھی کہ معاشی نظام کو سنبھالنے کے لئے ایک نیا سکہ جاری کیا گیا، مگر اس کی قیمت بھی گرنے لگی ہے۔ زندگی کی بنیادی ضرورتیں نفع اندوزی کا ذریعہ بنالی گئی ہیں، اور اخلاق اور سیاست کے کسی اصول میں اتنی بھی قوت نہیں ہے کہ نفع اندوزی کی بے پناہ ہوس کو انسانیت کی پابندیاں قبول کرنے پر آمادہ کر سکے۔ قومی معیشت کا اس طرح بگڑ جانا ممکن نہ ہوتا اگر حکومت ان خرابیوں کو گوارا نہ کرتی اور چور بازار کے فروغ کو اس انقلاب پر ترجیح نہ دیتی جس کا نمونہ کمیونسٹوں کی معاشی تنظیم میں نظر آ رہا ہے۔ چین میں شاید سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ نئی معاشی تنظیم کا کوئی خیال دل میں لایا اور زبان سے بیان کیا جائے۔ چین کے نوجوان جن کی ہمت اور استقلال نے جاپانیوں کو عاجز کر دیا تھا، اور جو جنگ کے بعد صرف اس کا مطالبہ کر رہے تھے کہ معاشی تنظیم میں قوم کے مفاد کو مقدم سمجھا جائے، خاموش کر دیئے گئے۔ اب نیشنلسٹ حکومت کی پشت پر سرمایہ داروں اور زمینداروں کے مفاد اور مارشل چیانگ کی مصلحتوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ مارشل چیانگ کا اب بھی یہ حوصلہ ہے کہ چین کے کمیونسٹوں کا نام و نشان مٹا دیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس میں آٹھ برس لگیں گے لیکن آٹھ برس میں چین کا کیا حال ہو جائے گا؟

انڈونیشیا میں پھر جنگ چھڑ رہی ہے؟

کمیونسٹوں پر ہمیشہ شبہہ کیا جاتا ہے کہ وہ روسی سیاست کا آلۂ کار ہیں۔ ایسے الزام لگانا آسان ہے، اور انھیں ثابت کرنا —— اور ان کا جواب دینا —— بہت مشکل ہے۔ کہیں کمیونسٹ ہی ایسی جماعت ہوتے ہیں جو رجعت پسندی اور خودغرضی کے مقابلے پر آتی ہے، کہیں کمیونسٹوں کی مصلحت یہ ہوتی ہے کہ رجعت پسندوں سے پہلے ان لوگوں سے لڑیں جو انقلاب چاہتے ہیں، مگر کمیونسٹ مارکس کا انقلاب نہیں چاہتے۔ انڈونیشیا میں کمیونسٹوں نے ایک بہت ہی نازک وقت پر قومی حکومت سے لڑنے کا ارادہ کیا۔ وہ اس جنگ میں کامیاب نہیں ہوئے، لیکن قومی حکومت کو انھوں نے بہت کمزور کر دیا۔ اب ڈچ حکومت پھر پیش قدمی کرنے والی ہے۔ اور پچھلی مرتبہ کی طرح اس دفعہ بھی وہ اسے پولیس کی کارروائی قرار دے گی۔ انڈونیشیا کی قومی حکومت نے یو، این، او سے مداخلت کی درخواست کی ہے، اور یہ کہا ہے کہ اگر وقت پر مدد نہ کی گئی تو انڈونیشیا سے ربڑ اور تیل ملنے کی کوئی امید نہ کرنی چاہئے۔ ڈچ حکومت نے اپنی طرف برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کی حکومتوں اور بڑے سرمایہ داروں سے کوئی معاملہ کیا ہوگا۔ اب تک وہ اپنا ہاتھ روکے ہوئے تھی اس لئے کہ مغربی دنیا کے حالات ایسے نہیں تھے کہ جنگ کا کوئی نیا منصوبہ شروع کیا جائے۔ جب برطانیہ نے ملایا میں کمیونسٹ گروہوں کے خلاف علانیہ فوجی کارروائی کی ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہولینڈ انڈونیشیا کی قومی حکومت سے نہ لڑے جو خودسری، شلزم کی طرف مائل ہے اور کسی وقت بھی بنیادی انقلاب پر کمربستہ ہو سکتی ہے۔

پریسیڈنٹ ٹرومین کی کرامات

امیدواروں کو اپنے اور اپنی ہردلعزیزی کے متعلق ہمیشہ مغالطہ ہوتا ہے اور جب کسی انتخاب سے ہزار ہا آدمیوں کی سیاسی ترقی وابستہ ہو تو اس کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ عام رائے کس کو عزت افزائی کا مستحق سمجھے گی۔ امریکہ کے انتخاب صدارت میں ایسا معلوم ہوتا تھا، سب مسٹر ڈیوی کے ساتھ ہیں۔ پریسیڈنٹ ٹرومین کو ان کی اپنی ڈیموکریٹک پارٹی کے وہ لوگ جو صدر کو ہرا سمجھتے تھے، گلے کا طوق سمجھتے تھے۔ پارٹی کے جلسے میں جب امیدوار کو منتخب کرنا تھا، انھوں نے بڑی بد دلی کر ہچکچاہٹ کے بعد پریسیڈنٹ ٹرومین کو نامزد کیا۔ جب امیدوار میدان میں آئے تو پریسیڈنٹ ٹرومین کی نااہلی کا چرچا کیا جانے لگا۔ تقریباً تمام بڑے رسالے اور اخبار، اور ڈاکٹر گیلپ جن کا پیشہ ہے کہ قوم کی نبض پر ہاتھ رکھ کر بتاتے رہیں کہ وہ کیا چاہتی ہے، گویا ہم زبان ہو کر کہنے لگے کہ پریسیڈنٹ ٹرومین کے لئے کوئی موقع نہیں ہے۔ انتخاب کا نتیجہ پریسیڈنٹ ٹرومین کے سوا سب کے اندازے کے خلاف نکلا۔ تب اس کی توجیہیں کی جانے لگیں۔ معلوم یہ ہوا کہ متحدہ ریاستوں میں "عام آدمیوں" کی اپنی رائے بھی ہے اور یہ اخباروں کی رائے سے ایک الگ چیز ہے۔ مسٹر ڈیوی کو بڑے سرمایہ داروں کی، اپنی پارٹی کی اور ممتاز اخباروں کی تائید حاصل تھی، عام آدمیوں کو جن میں بہت بڑا حصہ مزدوروں کا تھا، یہ شبہہ تھا کہ مسٹر ڈیوی مالدار طبقے کے اثر میں رہیں گے، انفلیشن کو دور کرنے کی خاص کوشش نہ کریں گے، اور مزدوروں کی مخالفت کریں گے۔ انھوں نے طے کیا کہ انھیں ایسا صدر نہیں چاہیے۔

پریسیڈنٹ ٹرومین اپنی ذاتی کوشش سے منتخب ہوئے ہیں۔ ان کی پارٹی کے ممتاز لوگوں کا ان پر کوئی احسان نہیں ہے جس کا بدلہ دینا پڑے۔ اس لئے وہ بہت آزاد ہو گئے ہیں، اور ان کی قسمت سے کانگریس میں بھی ڈیموکریٹک پارٹی کی اکثریت ہے۔ کوئی غیر معمولی صلاحیت کا آدمی ہوتا تو وہ اس موقع سے بہت فائدہ اٹھا سکتا تھا، لیکن اب تک پریسیڈنٹ ٹرومین نے اپنے وزیروں کے انتخاب میں کوئی بڑی غلطی نہیں کی ہے اور امریکہ کی سیاست اس وجہ سے کمزور نہ پڑے گی کہ اس کا کام کرنے والے اچھی قابلیت کے لوگ نہیں ہیں۔

"امریکہ کی آواز"

جب سے کانگریس کی ایک کمیٹی نے یہ رائے دی ہے کہ ریڈیو کے ذریعے پروپیگنڈا کرنے میں فائدہ ہے، کانگریس نے اس کام

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

چاندنی رات کا ایک منظر

اختر انصاری

دیکھ اگر ہے چشمِ بینا، دیکھ اے دنیائے دوں
یہ شبِ مہ کا نظارہ دیکھ اے دنیائے دوں

ڈھیر کوڑے کا ہے یہ، یعنی غلاظت کا جہاں
گندے پانی اور کیچڑ کی عفونت کا جہاں
اس کی رگ رگ میں بھری ہے کس بلا کی گندگی
سڑتی لاشوں میں نہ ہوگی اس بلا کی گندگی
گجگجاتے رینگتے ناپاک کیڑے بے شمار
دور سے بھی دیکھنا جن کا طبیعت کو ہے بار
اس غلاظت کی بتائے کوئی کیا تفصیل حال
مارے بدبو کے گزرنا بھی اُدھر سے ہے محال
یہ وہ شے ہے دھیان سے بھی جس کے اُبکائی سی آئے
خلد میں بھی سوچئے اس کے اُبکائی سی آئے
ڈھیر کوڑے کا ہے یہ یعنی غلاظت کا جہاں
گندے پانی اور کیچڑ کی عفونت کا جہاں

اس کو اپنے نور میں نہلا دیا ہے چاند نے
اس پہ حسنِ سیمیا برسا دیا ہے چاند نے
ہاتھ کرنوں کے بڑھا کر لے لیا ہے گود میں
بے تکلف پاس آکر لے لیا ہے گود میں

دیکھ اگر ہے چشمِ بینا، دیکھ لے دنیائے دوں
یہ شبِ مہ کا نظارہ دیکھ لے دنیائے دوں

رباعیات

معما؟

اضداد کا مجموعہ یہ عالم کیوں ہے؟
گلشن میں یہ امتیاز باہم کیوں ہے؟
غنچہ کیوں عمر بھر ہنسا کرتا ہے؟
سرتاپا المِ حیات شبنم کیوں ہے؟

وجہ تسکین

آئینۂ دل کو جگمگا کر دیکھو
اشکوں کو آنکھ سے گرا کر دیکھو
تسکین نہ ہو جائے تو میرا ذمہ
تاروں کو ذرا نظر اٹھا کر دیکھو

— باقر رضوی

ایک سوال

وجہ یاس و ملال کس سے پوچھوں؟
سوکھے پھولوں کا حال کس سے پوچھوں؟
دنیا میں بہار بھی کبھی آئے گی۔
چبھتا ہوا یہ سوال کس سے پوچھوں؟

انا للہ

اللہ سے کس نے واسطہ رکھا ہے
مذہب کا بس اک بت سا بنا رکھا ہے
سب کرتے ہیں نام کی اسی کے پوجا
اللہ کو طاق میں بٹھا رکھا ہے۔

— ڈاکٹر سعید بریلوی

اکبری نشتر

(۱)

کیا اکبر کا کلام باقی رہے گا؟

طالب الہ آبادی

اکبر الہ آبادی لسان العصر تھے، زمانے کی زبان۔ ان کا رنگ چوکھا تھا، ڈھنگ انوکھا۔ ان کی ظرافت خالی خولی ہنسی، دل لگی اور ٹھٹھول نہ تھی۔ وہ اشاروں ہی اشاروں میں بہت کچھ سمجھا دیتے تھے۔ ان کا رنگ اتنا مقبول ہوا کہ سیکڑوں شعر زبانوں پر چڑھ گئے دلوں میں اتر گئے۔ بھارت ورش کے کونے کونے میں مسکراہٹ کی لہریں دوڑ گئیں۔

ہمارے مورث بندر رہے ہوں یا نہ رہے ہوں یہ جھگڑے کی بات ہے مگر یہ بات سوا سولہ آنے ٹھیک ہے کہ ہم نقال ہیں۔ نقل کرنا ہماری گھٹی میں پڑا ہے عورتیں مردوں کی طرح بچے بوڑھوں کی اور بوڑھے نوجوانوں کی نقل کرتے رہتے ہیں۔ اکبر کے اچھوتے رنگ کی نقلیں بھی بڑی کمالی سے کاٹے پانی تک اور کلکتہ سے پشاور تک ہوئیں۔ مگر بندر بندر ہے مور مور۔

چلا جب چال کوا ہنس کی اپنی بھی چال بھول گیا

نقل تو ہو گئی مگر ظرافت یا تو کھسیانی ہنسی بن کر رہ گئی یا پوپلی عورت کی مسکراہٹ۔ شاعری کے اس میدان میں بڑے بڑے سورما خم ٹھونک ٹھونک کر اترے مگر لوٹے ہی لوٹے۔

مچھلی کے بچے کو تیرنا، چیونٹی کو پھدکنا اور کبوتر کو الٹی پلٹی کون سکھا سکتا ہے، دل لگی اور ہے دل کی لگی اور ایٹم کو ایتھر کی نزاکت، سینٹ کو پھولوں کی لطافت ملے تو کیسے!

ناکام نقالوں کی فہرست بڑی لانبی چوڑی ہے، آزادی سہی پھر بھی بات بات پر دفعہ ۱۴۴ لگائی جاتی ہے نگاہوں پر مہر ہوتی ہے، زبانیں کیلی جاتی ہیں ورنہ میں گنواتا جاتا، آپ گنتے جاتے۔

اکبری نشتر نے سماجی پھوڑوں کو چھیڑ دیا، ہلکی سی چبھن، میٹھی سی گدگدی ہوئی اور غدر ۱۸۵۷ء کے بہت پہلے سے جو مواد اور کالا خون جم چکا تھا وہ فوارہ بن کر پھوٹ نکلا۔ روگیوں کی آنکھیں کھل گئیں قدریں بدلنے لگیں۔ اکبر کا مزاحیہ کلام کاغذی نشتروں کا ایک چلتا پھرتا ہسپتال تھا جو زبان بہ زبان نگاہ بہ نگاہ بھارت کے گوشے گوشے میں پہنچ گیا۔

ان نشتروں میں کلوروفارم، ایتھر اور کوکین کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ چھیڑ چھاڑ میں ایسا جادو تھا کہ آپریشن ضرور ہوئے مگر نہ تو زخموں کے لئے مرہم ہی کی ضرورت پڑی نہ سفوف اور ٹنکچر کی، جراحی کے ساتھ ہی ساتھ زخم بھی بھرتے چلے گئے۔ اکبری نشتر آنکھوں سے دلوں میں اترتے چلے گئے محفلوں، صحبتوں، جلسوں، مکالموں، مباحثوں، گفتگوؤں رسالوں، مجلّوں، صحیفوں، اخباروں، اور جریدوں میں دھوم مچ گئی۔ ہزاروں شعر سینوں میں محفوظ ہو گئے زبانوں پر چڑھ گئے۔

اکبر اپنے زمانے میں جتنے مقبول ہوئے ویسی شہرت صرف اسّے گنے خوش نصیبوں کو ملتی ہے۔ یہ تو داتا کی دین ہے جسے چاہے دے، جب چاہے دے، کسی کا کیا اجارہ!

شاعری اور ہے تک بندی اور۔ شعر جنس گورکھ دھندے اور ہیں، فطری جوہر اور۔ یہ تو ایک وجدانی کیفیت ہے جو ہمیشہ ظرف کی مناسبت سے عطا ہوتی رہی ہے۔ یہ ملکی سماجی، مذہبی، مدنی، لونی، مکانی اور زمانی ہر قید سے آزاد ہے۔ اصلی شاعری جسم بدل سکتی ہے، لباس تبدیل کر سکتی ہے مگر مر نہیں سکتی مٹ نہیں سکتی۔ بھارت بڑا شاعر خیز ملک ہے۔ آج بھی بہت سے شہروں اور دیہاتوں میں مردم شماری سے زیادہ ناظم اور ٹھگ بند آپ کو مل جائیں گے۔

خم خانۂ جاوید یا اسی قسم کے دوسرے تذکرے اٹھا کر دیکھئے تو پورا صفحہ گورغریباں دکھائی دے گا جس میں ہزاروں ناظم آستانے سے مدفون نظر آئیں گے یہ ایک ایسا اتھاہ سمندر ہے جس کی لہروں میں، گردابوں میں، جوار بھاٹے میں کروڑوں تک بند روز ڈوب ڈوب کر تہہ نشین ہو جاتے ہیں۔

آپ ہی اپنے دل پر دایاں یا بایاں ہاتھ رکھ کر سچ بتائیے کہ آپ کو کتنے شاعروں کا کلام یاد ہے اور کتنا یاد ہے۔ کلام یاد رکھنے کلام یاد نہ ہونا کیول حافظے کی کمزوری نہیں صرف وہی کلام یاد رہتا ہے اور رہ سکتا ہے جس میں امرت رس بھرا ہوا ہو ورنہ دماغ تحت شعور کے گودام میں ہر قسم نقش کو بے کار نیچر کی طرح پھینکتا جاتا ہے۔

اکبر کا کلام فانی ہے یا باقی، مٹا جائے گا یا زمانے کے ساتھ ابھرتا آئے گا، اس کا سچا فیصلہ تو نہ آپ کر سکتے ہیں، نہ ہم۔ یہ بحث اور بات ہے، زمانہ اور کیول زمانہ مستقبل اور صرف مستقبل ہی آئینہ بن سکتا ہے، مگر قرینے، تیور، اور رنگ ایسے ہیں کہ ہمیں "ہاں" کہنا ہی پڑتا ہے۔

جو لوگ اکبری نشتروں کو فانی کہنے کی جسارت کرتے ہیں وہ سب سے بڑی دلیل یہ دیتے ہیں کہ اکبر نے موجودہ حالات کی کھوکھلی بنیادوں پر فلک بوس عمارتیں کھڑی کر لی ہیں، جہاں حالات بدلے نیوسر کی، بوجھ پڑا، اور پوری تعمیر تاش کے پتوں کے بنائے ہوئے محل کی طرح دھڑا دھڑ مٹی کا ڈھیر بن کر رہ جائے گی۔

یہ دلیل مضبوط بھی ہے وزنی بھی۔ مگر اکبری تعمیر میں بنیادیں، سائنٹفک ہیں، کھوکھلی سہی، کمزور نہیں ہیں۔ اکبری پل شکم کا پیپے والا پل نہیں کہ ٹکی سی باڑھ آئی اور جب بہہ گیا ذرا بوجھ پڑا اور لنقی ہو گئی۔ اکبری پل ہوڑہ کا آہنی پل ہی جس میں نہ تو کوٹھیاں گلائی گئی ہیں نہ ستون ہیں ایک میل لانبا پل ہوا میں معلق قائم ہے جس پر آدمی، گاڑیاں موٹر اور ٹرامیں ہر وقت اسی طرح اور اسی آسانی سے گزرتے رہتے جیسے اسفلٹ کی پختہ سڑک پر۔ اکبری نشتر حالات کا تجربہ ضرور تھا مگر حادثات کا اثر ان پر نہیں ہو سکتا۔

اگر اکبر آج سے سینکڑوں برس پہلے واقعات پر اپنی بنیادیں رکھتے تو وہی حشر ہوتا جو علم موسیقی سے واقف نہ ہونے والوں کا اس وقت ہوتا ہے جب وہ پکا گانا، راگ راگنیوں کی موشگافیاں سننے لگتے ہیں، یہی نہیں اگر اکبر مقامی حالات پر زور نہ دیتے تو ساری دل کشی دھری رہ جاتی۔

میرا خیال ہے اور بہت پختہ خیال کہ اکبری نشتروں میں عالمگیر صلاحیتیں ہیں۔ وہ باقی رہے گا مگر مجھے یہ اصرار نہیں کہ آپ بھی میرے ہم خیال بن جائیں۔ بس اتنی تمنا ضرور ہے کہ فہرست پڑھ کر کتاب پر تنقید نہ فرمائیں جوہری بن جائیں، اکبری جواہر پاروں کو کسیں، پرکھیں، تراش خراش، آب تاب، رنگ، ڈھنگ، سنگ، وزن، نور اور مادہ کی پوری پوری جانچ کر کے جو فیصلہ بھی چاہیں کریں، مگر دوسروں کو مجبور نہ کریں کہ یا تو آپ کی ہاں میں ہاں ملائیں یا جہنم میں جائیں۔ ہومر ہوں یا حافظ، بھرتری ہری ہوں یا فردوسی، میر ہوں یا غالب، انیس ہوں یا شیکسپیئر تلسی داس ہوں یا بالمیکی، ٹیگور ہوں یا اقبال، ہر لافانی شاعر کے کلام میں ماحول کی بجلیاں، موجودہ فضا کی ہوائیں اور حالات حاضرہ کے نقوش آپ کو حرفوں کے جوڑ بند میں دکھائی دیں گے۔ مگر ان سب کو منظم رکھنے والا جوہر وہی ہو جو سب میں مشترک ہے اور رہتی دنیا تک عالمگیر سچائی بن کر باقی رہے گی۔

مائی کو پوت کی اب مطلق خبر نہیں ہے
اسٹیمروں سے مل کر انداز گنگ بدلا

اکبر کی شاعری نے جب آنکھیں کھولیں تو ہماری سیاسی سماجی، مذہبی اور مدنی، وردھ بھی بچیاں بدلتی ہوئی فضا میں اور ڈھلتی ہوئی غلامی کی چھاؤں میں انگڑائیاں لے رہی تھیں۔ یورپ کا سیلاب تھا کہ امنڈتا چلا آ رہا تھا ہماری ہزاروں برس کی تہذیب تھی کہ مٹتی چلی جا رہی تھی، دنیا اور کشتی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اور رہے گا بالم ہو یا بجرا، بوٹ ہو یا اگن بوٹ چلتے ہیں چلتے رہیں گے۔ رہے انداز وہ بدلتے رہیں گے۔

جب تک گنگا میں پانی، پانی میں لہریں، لہروں میں روانی اور روانی میں ترنم رہے گا۔ اکبر کے اس شعر کا جادو بھی کسی نہ کسی روپ میں چلتا رہے گا۔

دیکھئے تو اس ترشے ہوئے ہیرے میں ہزاروں پہلو ہیں، اور ہر پہلو سے نور کی چھوٹ پڑ رہی ہے۔ جتنا سوچئے گا تو اتنا ہی مزہ آئے گا۔ گنگ، اسٹیمر، مائی اور پوت سب ہماری ہی دنیا کے ہیں، مگر نہ جانے کس ملک کے رہنے سہنے والے ہیں۔ کہاں سے آتے ہیں کہاں جا رہے ہیں

...... کون جانے؟

یہ نشتر سیاسی پلیٹ فارم بھی ہے، سماجی چمن بھی۔ جب کبھی دنیا میں کسی جگہ اسٹیمر اور گنگ والی کیفیت پیدا ہو گی، اکبری نشتر کے نقوش تازہ ہو جائیں گے۔ شیراز کے سحر کلام شاعر حافظ نے بھی انقلاب کی تصویر اپنے ماحول سے اتر کے کر آج سے چار سو برس پہلے کھینچی ہے، مگر آج بھی رنگ و روغن، اثر و گداز میں کوئی کمی نہیں پائی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دور میں شاعر نے ہمارے ہی سماج کے لئے پیشین گوئیاں کی ہیں۔ اصلیت صرف اتنی ہے کہ اکبر ہوں یا حافظ شاعر کسی زمانے میں ہوا اور کسی زبان میں کہے، عالمگیر سچائی کو نہ زوال ہے نہ فنا۔

اے کاش——

عبداللطیف اعظمی

مجھے بچپن سے تصویریں بنانے کا شوق تھا۔ اسکول کی عمارت میں، اچھی اچھی تصویریں دیکھتا، تو میرا شوق انگڑائیاں لیتا۔ جی چاہتا اے کاش میں بھی ایسی ہی تصویریں بنا سکتا۔

میرا شوق کچھ تو فطری تھا اور کچھ ماحول کا نتیجہ۔ میں جس فلیٹ میں رہتا تھا اس میں ایک آرٹسٹ بھی رہتے تھے وہ تھے تو ایک آفس میں ہیڈ کلرک مگر تصویریں اور کتابوں اور رسالوں کے لئے ڈیزائن بھی بنایا کرتے تھے اس سے ان کو کچھ زائد آمدنی ہو جاتی تھی اور اس بڑھتی ہوئی گرانی میں، اس سے بڑا سہارا ملتا تھا۔ ہمارے یہاں ان کا اکثر آنا جانا رہتا تھا، ان کی باتوں کو سن کر اور ان کی تصویروں کو دیکھ کر دل بے چین ہو جاتا کہ میں بھی کسی طرح مصور بن جاؤں۔ اور جب میں اسکول میں داخل ہوا تو اتفاق سے وہاں بھی تصویروں کی بڑی کثرت تھی۔ کمروں اور برآمدوں میں چھوٹے چھوٹے بچوں کی بنائی ہوئی تصویریں لگی ہوئی تھیں، جن پر ان کا نام، ان کی عمر اور کلاس لکھی ہوتی۔ یہ دیکھ کر میرا جی چاہتا کہ میری بھی یہاں بہت سی تصویریں لگی ہوں اور ان پر میرا نام ہو

میں جب ذرا بڑا ہوا اور ٹیڑھی سیدھی لکیریں کھینچنے لگا تو والدہ نے ایک دن میرے اس شوق کا جوزف صاحب سے ذکر کیا اور ان سے خواہش کی کہ وہ کبھی کبھی میری تصویروں کی اصلاح کر دیا کریں۔ انھوں نے اسی دن مجھے بلا بھیجا۔ پہلے تو اپنی سب تصویریں دکھلائیں اس کے بعد معاملے کی گفتگو آئی۔ انھوں نے سوال کیا "کیوں تم تصویروں کی تخلیقی نقل کر لیتے ہو؟"

"تخلیقی نقل؟! میں سمجھا نہیں" میں نے اپنی کم علمی کا اعتراف کیا۔

"یہی کہ تم کسی تصویر کو سامنے رکھ کر اس طرح بنا سکتے ہو کہ وہ نقل بھی ہو، اور اس میں اپج بھی ہو؟"

"ابھی میں بالکل مبتدی ہوں، صحیح طور پر نقل بھی نہیں کر سکتا اپج تو بڑی بات ہے۔ اور پھر میں تو پنسل سے کام کر رہا ہوں، آپ کی طرح آئل پینٹنگ کا کام کرنے کی کبھی ہمت نہیں ہوئی"

"پنسل کو تم حقیر نہ سمجھو، اس سے بڑے بڑے کام انجام دئے جا سکتے ہیں۔ خیر تمہارے پاس کوئی البم ہے؟ —— اچھا تو ایک البم بنا لو اور مشہور لوگوں اور اچھے اچھے مناظر کی تصویریں جمع کرو، اور ان کی نقل کرنے کی مشق کیا کرو"

"نقل کرنے کی؟!" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"ہاں، ہاں نقل کرنے کی، ابتدا میں اس کی سخت ضرورت ہے" ... اس کے بعد انھوں نے الماری میں سے ایک بڑا سا البم نکالا اور میرے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ "دیکھو، میں نے ان سے تصویر بنانا سیکھا ہے اور اب بھی ان سے بڑی مدد ملتی ہے"

"تو کیا آپ کا مطلب ہے کہ آپ ان سے نقل کرتے ہیں؟" میں نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

"ہاں، مگر تخلیقی نقل" انھوں نے تصحیح کرتے ہوئے کہا "بنانے وقت ان کو سامنے رکھتا ہوں، مگر دماغ صرف نقل نہیں کرتا، کچھ نئی چیزیں بھی پیدا کرتا ہے"

"لیکن" میں نے رکتے رکتے کہا "اچھے آرٹسٹ شاید ایسا نہیں کرتے؟" اس ڈر سے کہ کہیں میرے اس سوال سے ان کے جذبات کو ٹھیس نہ لگی ہو، میں نے کہا "میں اپنی رائے نہیں دے رہا ہوں بلکہ آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں"

"بھئی تم بہت ہی سادہ لوح ہو" انھوں نے ایک فرمائشی قہقہہ لگا کر کہا "سب ایسا ہی کرتے ہیں، صرف آرٹسٹوں پر موقوف نہیں، شاعر، افسانہ نگار، جرنلسٹ سب ہی کرتے ہیں۔ شاعر دوسروں کا دیوان سامنے رکھ کر شعر کہتے ہیں، اگر کسی نے اتفاق سے چوری پکڑ لی تو "توارد" کی آڑ میں بچ نکلیں گے۔ اچھے اچھے مصنف بے تکلف دوسری زبانوں کی کتابوں سے نقل کرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ دوسری زبان انھوں نے سیکھی ہی اسی لئے ہے، صحیفہ نگار تو اس معاملے میں سب سے آگے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ اخبار یا رسالے کی ترتیب کا گر اسی میں ہے کہ دوسروں سے چیزیں لے لی جائیں اور حوالے تک نہ دئے جائیں۔ پنجاب میں اس فن نے اس قدر ترقی کر لی ہے کہ اس کا باقاعدہ "قینچی سروس" نام پڑ گیا ہے اور ہر اخبار والا فخر یہ کہتا ہے کہ اس کی "قینچی سروس" بڑی کامیاب ہے۔ پھر اگر بچارے آرٹسٹ دوسروں کے خیالات اور تصورات کو چرا لیتے ہیں تو ان پر کیوں اعتراض کیا جائے۔ خیر بات لمبی ہو گئی، میرا مشورہ یہ ہے کہ اگر تم جلد ہی کامیابی اور شہرت چاہتے ہو تو قینچی سروس کی طرح "البم سروس" شروع کر دو۔ دیکھو کس قدر جلد تم ایک کامیاب آرٹسٹ ہو جاتے ہو!" مسٹر جوزف سے، ان کے مشورے پر عمل کرنے کا وعدہ کر کے چلا آیا، اور کچھ عرصے تک اس پر عمل کرنے کی کوشش بھی کی، مگر طبیعت کسی طرح اس پر تیار نہ ہو سکی۔ مجبوراً جوزف صاحب کی "تخلیقی نقل" کو چھوڑ کر، میں حسب معمول پھر پارک اور آس پاس کے دیہاتوں میں چلا جاتا، اور مختلف مناظر اور دیہاتی لڑکیوں کے اسکیچ بناتا۔

ایک روز حسب معمول، شہر سے باہر ایک بہت ہی دلکش پارک میں بیٹھا اسکیچ کر رہا تھا۔ میں اپنے کام میں کچھ ایسا مستغرق تھا کہ مجھے آس پاس کی بالکل خبر نہیں تھی، یکایک میرے پاس ایک سائیکل رکی "وِنڈسر پلیس کو کون سی سڑک جائے گی؟" ایک لڑکی نے سوال کیا۔

میرے کان میں آواز ضرور آئی۔ آواز کی شیرینی بھی محسوس ہوئی۔ مگر میں تصویر کے بنانے میں کچھ ایسا کھو گیا تھا، کہ مجھے خیال بھی نہیں آیا کہ یہ مجھ سے سوال کیا گیا ہے۔

"سنئے، میں آپ ہی سے پوچھ رہی ہوں" اس نے چند لمحے کے بعد پھر پوچھا "اگر زحمت نہ ہو تو ذرا بتا دیجئے کہ ونڈسر پلیس ——"

میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر ہی ایک طرف اشارہ کر دیا۔

"آپ بڑے کج خلق معلوم ہوتے ہیں" اس کے لہجے میں بڑی تلخی تھی۔

"اور آپ؟" میں نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا "آپ کو سجھائی نہیں دیتا ——"

میں نے اوپر نگاہ اٹھا کر دیکھا تو ادھا جملہ حلق ہی میں پھنس کر رہ گیا۔

"ہاں، ہاں فرمائیے، سجھائی نہیں ——"

"جی —— جی —— جی نہیں، میرا مطلب تھا —— ہاں تو آپ کو ونڈسر پلیس ——" پھر میں بیان پورا نہ کر سکا۔

"کیوں آپ کس سوچ میں پڑ گئے؟" گویا اس نے مجھے سوتے سے جگا دیا۔

"جی —— ہاں، میں سوچ رہا تھا —— معاف کیجئے گا —— اصل بات یہ ہے کہ میں نے کچھ دن ہوئے ایک تصویر بنائی تھی، وہ آپ سے ہو بہو ملتی ہے بس میں یہی سوچ رہا تھا —— معاف کیجئے گا اگر میں نے —— ——"

"جی نہیں، بھلا آپ کوئی غلط بات کہہ سکتے ہیں، آپ آرٹسٹ جو ٹھہرے —— ہاں ذرا اپنی ایک آدھ تصویر تو دکھائیے۔ کہئے اس میں تو آپ کو تامل نہیں ہے؟!"

"تامل کیا ہوگا۔ مگر تصویریں کچھ ایسی ہیں، کیا کیجئے گا دیکھ کر؟"

"اچھا! آپ تو تکلف میں شاعروں سے بھی دو قدم آگے نکلے۔ آخر کیوں نہ ہو، آرٹسٹ بھی تو بڑی حد تک شاعر ہی کی طرح نازک مزاج ہوتا ہے۔ اگر آپ کو تکلف ہے تو میں خود ہی دیکھے لیتی ہوں —— یہ ہیں تصویریں نا —— بھئی! یہ تو اچھی خاصی ہیں، لیکن —— اگر آپ اجازت دیں تو عرض کروں، کہ اگر آپ کسی اچھے آرٹسٹ کو دکھا دیں، تو ان میں جان پڑ جائے میرے پتا جی بڑے اچھے آرٹسٹ ہیں، اگر پسند کریں تو آپ ان کو دکھا دیجئے، وہ آپ کی مدد کر کے بہت خوش ہوں گے"

"بھلا مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ تصویریں اس قابل نہیں ہیں کہ کسی اچھے آرٹسٹ کو دکھائی جائیں"

"جی، چھوڑئے بھی ان تکلفات کو، آپ معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔ ذرا اپنی پنسل تو دیجئے اپنا پتہ لکھ دوں —— یہ لیجئے پتا، تو آپ آئیں گے نا؟ —— ہاں کل شام کو میں آپ کا انتظار کروں گی"

اچھا سے سنڈے!"

وہ آگے بڑھ گئی تو مجھے یاد آیا کہ راستہ تو میں نے بتایا ہی نہیں، میں نے دوڑ کر آواز دی، "ارے ذرا سنئے راستہ تو معلوم کر لیجئے"

"شکریہ! مجھے معلوم ہو گیا، آپ اپنی تصویر بنائیے بار اس کا خیال رکھئے گا، آپ کے خیالات میں پھر خلل نہ پڑے۔ ٹوٹے ہوئے تاروں کو پھر سے جوڑ لیجئے اور اپنی تصویر کو مکمل کر ڈالئے، اچھا ٹاٹا!"

اس کے جانے کے بعد میں سوچ میں پڑ گیا "کیا وہ تھی

رجسٹرڈ نمبر ڈی ۲۰۷

ادارہ تحریر
ڈاکٹر سید عابد حسین، صالحہ عابد حسین، عبداللطیف اعظمی

تاریخ اشاعت یکم ۔ ۸ ، ۱۹ ، ۴۸
چندہ ۔ سالانہ ۶ ششماہی ۳

حسین اور انسانیت

(بسلسلہ صفحہ ۲)

کی موت چاہتا ہوں، ظالموں کے ساتھ زندہ رہنا بجائے خود ایک جرم ہے، یہ شہید حق تاج و تخت کو لینے نہیں نکلا ہے۔ "تاج و تخت لینے والے لقاء الٰہی کی خواہش نہیں کیا کرتے" تاج و تخت چاہنے والے بیت ہوکر سے شہادت کا قصد کرکے نہیں نکلا کرتے۔ تاج و تخت کے طالب مٹھی بھر آدمیوں سے لشکر جرار کا مقابلہ نہیں کرتے۔ یہ شہید حق اس ہستی کامیابی کے لئے نہ نکلا تھا جو انسان کو اکثر سچائی اور اچھائی سے بے تعلق رہنے کا سبق دیتی ہے۔ کامیابی چاہنے والے اپنے گنے چنے ساتھیوں کو معرکے سے پہلے ساتھ چھوڑ سکنے کی رخصت نہیں دیا کرتے۔ وہ مقابلے سے پہلے کی شب میں ان سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ "کل میرا اور ان کا فیصلہ ہو جائے گا۔ میری رائے یہ ہے کہ تم خاموشی سے نکل جاؤ میں خوشی سے تمھیں رخصت کرتا ہوں" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہید اپنی شہادت کو انسانیت کے لئے اتنا صاف اور واضح بنانا چاہتا ہے کہ کسی کو سمجھنے میں ذرا دشواری نہ ہو۔ پھر جب وفادار ساتھی ساتھ نہیں چھوڑتے تو قربان گاہ تسلیم و رضا پر اپنی آنکھوں کے سامنے ان کی قربانی پیش فرماتے ہیں۔ ایک ایک کرکے وفادار ساتھی قربان کئے جاتے ہیں، عورت اور بچوں کو بے وارث ہوتے دیکھا جاتا ہے۔ جوان بیٹے کو اپنے آگے راہی عالم بقا کیا جاتا ہے، شیر خوار پیاس سے بلکتے بچے کو اپنے ہاتھوں میں دم توڑتے دیکھا جاتا ہے اور پھر اپنی جان کا ہدیہ جان آفریں کی بارگاہ میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ گویا حق کے لئے قربانی کا سبق دینے والا قربانی کی ہر دشوار سے دشوار اور دل شگاف سے دل شگاف شکل کی مثال بیک وقت پیش کر دینا چاہتا ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس راہ میں کوئی قربانی بھی ایسی ہے جو نہ کی جاسکے۔ قدرت کو بھی شاید اس سبق کی وضاحت منظور ہے۔ ادھر سے قوت و جبروت بھی اپنی سب عادتوں کا پورا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان بظاہر ناکام مخالفوں کے سر کاٹے جاتے ہیں۔ ان کی لاشیں روندی جاتی ہیں، ان کے خیمے جلائے جاتے ہیں، رسیوں سے باندھا جاتا ہے طوق پہنائے جاتے ہیں۔ ناکامی کی ہر ممکن شکل کا ظہور ہوتا ہے، تاکہ حق پرستی کا سب سے مؤثر سبق انسانیت کے ذہن نشین ہو جائے۔ حق کا ساتھ دینا جب کامیابی ہستی و فنی کامیابی اس کی جلد میں ہو کچھ بہت دشوار نہیں، اس کی راہ میں ناکامیوں کو سینے سے لگانا اور اس کی آخری فتح پر ایمان رکھنا حق کی حقیقی قوت کو آشکار کرتا ہے۔ یہی انسانیت کی ضمانت ہے، یہی شہادت حسین کا ماحصل ہے، اسی سے حسین انسانیت کے محسنین اعظم میں ہیں، اور ان کی شہادت کی داستان تاریخ انسانیت کا ایک نہایت قیمتی رنگین ورق۔

پاکستان

(بسلسلہ صفحہ ۵)

سیاسی تدبر سے زیادہ جذباتی خلوص سے کام لیا اور بجائے اس کے کہ وہ مجلس دستور ساز کے فیصلے کا انتظار کرتی، اس نے اپنے رجحانات کا اتنا واضح طور پر اعلان کر دیا ہے کہ اب اس کا اس سے رجوع ناممکن سا نظر آتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندوستانی لیڈروں نے اپنی پرانی عادت کے مطابق جو انگریزوں سے معاملہ کرنے میں ہمیشہ مفید رہی ہے دل کی بات دل میں رکھی اور اپنی قیمت بڑھانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ چنانچہ جہاں ایک طرف ہمارے وزیر اعظم نے کامن ویلتھ کے ساتھ تعلق رکھنے کے حق میں بہت کچھ کہہ ڈالا وہاں دوسری طرف ہندوستان کے وزیر اعظم بالکل خاموش رہے اور اس بارے میں کوئی واضح بات نہیں کہی۔ (آفاق ہفت روزہ، لاہور)

اکبری نشتر

(بسلسلہ صفحہ ۸)

دختراں را ہمہ جنگ است و جدل با مادر — پسراں را ہمہ بدخواہ پدر می بینم
اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالان — طوق زریں ہمہ در گردن خر می بینم

یا جیسا فردوسی کہتا ہے:-

پرستار زادہ نیاید بکار — اگرچہ بود زادۂ شہریار

فطرت کے نباض شاعر بہت دور تک دیکھتے ہیں۔ اکبر کا بھی یہی عالم ہے۔ الفاظ تو صرف سمجھانے کا ذریعہ اور لباس ہوتے ہیں۔ حقیقت چیزی اور ہے اپنے ہی جسم اور اپنی ہی مدح کو دیکھ لیجئے۔

باہر کی دنیا

(بسلسلہ صفحہ ۶)

کے لئے ضروری خرچ منظور کرنا شروع کر دیا، اور اب "امریکہ کی آواز" ساری مغربی دنیا میں گونج رہی ہے، اور ان ملکوں تک پہنچ رہی ہے جہاں کمیونسٹ حکومتوں کے سرکاری بیانات کے سوا اور کچھ سننے کی اجازت نہیں۔ روسی اپنی طرف بہت بڑے ریڈیو اسٹیشنوں سے دنیا کے دل اور دماغ کو فتح کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کا اندازہ کرنا ممکن نہیں کہ امریکہ کی آواز بھاری پڑ رہی ہے یا روس کی۔ غالباً دنیا والے دونوں کی باتیں سن کر کوئی ایسا فیصلہ کرتے ہوں گے جو کسی ایک کے حق میں نہیں ہوتا۔ البتہ یو۔ این۔ او میں روس کی ادا کچھ ناپسند کی جانے لگی ہے۔ موسیو ویشنسکی ذاتی طور پر خوش طبع اور ملنسار ہوں گے، اور خواہ مخواہ لوگوں کی توہین نہ کرتے ہوں گے۔ لیکن یو۔ این۔ او کے جلسوں میں وہ جس طرح گالی گلوچ کرتے ہیں اور متحدہ ریاستوں اور برطانیہ پر طرح طرح کے الزام لگا کر تجویزوں کو رد کرتے ہیں۔ اس سے غیر جانب دار قوموں کے نمائندوں کو کچھ یقین سا ہو گیا ہے کہ روسی کسی معاملے میں دوسری قوموں سے اتحاد عمل نہیں کرنا چاہتے اور بحثوں اور مشوروں میں صرف اس نیت سے شریک ہوتے ہیں کہ ان سے کوئی نتیجہ نہ نکلے۔ برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کے رہنما بھی ان پر یہی الزام لگاتے ہیں۔ روسیوں نے اپنا انداز نہ بدلا تو ممکن ہے غیر جانبدار قومیں متحدہ ریاستوں اور برطانیہ کی حمایتی بن جائیں اور روسی یو۔ این۔ او پر کوئی اثر نہ ڈال سکیں۔ یہ تو سب کو معلوم ہو گیا ہے کہ لڑائی بس زبانی ہے۔ لیکن جو اس لڑائی میں جیت جائے اس کا اصلی معاملوں میں بھی پلہ بھاری رہے گا۔

برلن میں کچھ نہیں ہو رہا ہے

موسیو ویشنسکی نے یو۔ این۔ او میں بیان کیا ہے کہ برلن کا بلوکیڈ نہیں کیا جا رہا ہے۔ یہ بیان صحیح ہے تو برلن کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہاں ہوائی جہازوں کے ذریعے سامان نہیں پہنچایا جا رہا ہے، اور آئندہ کے لئے تدبیریں کرنے کی ضرورت نہیں مگر اس کے باوجود متحدہ ریاستوں اور برطانیہ کے ہوائی بیڑے جاڑوں کے لئے انتظام کر رہے ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ ان کے لئے آزمائش کا وقت یہی ہے۔ وہ جاڑوں بھر برلن میں کھانے پینے کا سامان پہنچاتے رہے تو روسی مرعوب ہوں گے اور شاید کوئی سمجھوتہ کر لیں، ورنہ ان کی ہیکڑی اور بڑھ جائے گی، اور وہ برلن کو خالی کرائے بغیر نہ مانیں گے۔

م، م۔

نئی روشنی دہلی

NAI ROSHNI
DELHI

جلد ۱ | نمبر ۲۲ | ۲۴ر نومبر سنہ ۴۸ء | ایڈیٹر۔ ڈاکٹر سید عابد حسین

اخلاقی تصور اور اشتراکیت

جواہر لال نہرو

زندگی کا اخلاقی تصور میرے لئے بڑی کشش رکھتا ہی اگرچہ منطقی حیثیت سے اس کو صحیح ثابت کرنا مجھے مشکل معلوم ہوتا ہے۔ گاندھی جی کا صحیح ذرائع پر زور دینا مجھے پسند آیا اور میرے خیال میں ہماری عمومی زندگی کو اُن سے جو برکات حاصل ہوئیں ان میں یہ بہت بڑی برکت ہی ظاہر ہے کہ یہ خیال نیا نہیں لیکن ایک اخلاقی اصول کو عمومی زندگی میں اتنے بڑے پیمانے پر استعمال کرنا یقیناً ایک نئی چیز ہے۔ اس راہ میں بڑی مشکلات ہیں۔ دراصل ذرائع اور مقاصد ایک دوسرے سے الگ نہیں کئے جاسکتے بلکہ ایک جسم نامی کی طرح باہم وابستہ ہیں۔ آج کل کی دنیا میں جو صرف مقاصد کو پیش نظر رکھتی ہے اور ذرائع کو نظر انداز کردیتی ہے ذرائع پر اس قدر زور دینا ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ہندوستان میں یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوئی، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس نے لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد پر گہرا اور پائدار اثر ڈالا ہے۔

مارکس اور لینن کے مطالعے نے میرے ذہن کو بہت متاثر کیا اور اس کی وجہ سے میں تاریخ کو اور موجودہ واقعات کو ایک نئی روشنی میں دیکھنے لگا۔ تاریخ اور معاشرتی ارتقا کے طویل سلسلے میں ایک معنویت ایک ترتیب نظر آنے لگی، اور مستقبل کی تاریکی ایک حد تک دور ہوگئی۔ سوویٹ یونین کے اصلی کارنامے بھی بڑے شاندار ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ روس کی کوئی بات مجھے پسند نہیں آئی یا میری سمجھ میں نہیں آئی اور اس میں ابن الوقتی اور قوت پرست سیاست کا بہت گہرا رنگ دکھائی دیا، لیکن ان سب باتوں کے باوجود یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ ممکن ہے نوع انسانی کی فلاح و بہبود کا وہ جذبہ جو وہاں ابتدا میں موجود تھا اب کسی حد تک مسخ ہوگیا ہو۔ مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ انقلاب روس نے انسانی سماج کو ایک دم سے کہیں سے کہیں پہنچا دیا، اس میں وہ ولولہ پیدا کردیا جو کسی کے دبائے نہیں دب سکتا اور اس نئے تمدن کی بنیاد قائم کردی جس کی تعمیر ہونے والی ہے میں اس قدر انفرادیت پسند واقع ہوا ہوں اور شخصی آزادی کا اس قدر دل دادہ ہوں کہ مجھے حد سے زیادہ تنظیم اچھی نہیں لگتی، پھر بھی یہ مجھے ایک صریحی بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک پیچیدہ اجتماعی نظام میں انفرادی آزادی کو محدود کرنا ضروری ہی اور شاید فرد کو حقیقی آزادی اسی طرح حاصل ہوسکتی ہے کہ اجتماعی زندگی پر اس طرح کی پابندیاں عائد کی جائیں، جھوٹی آزادیوں کو اکثر جیسی آزادی پر قربان کرنا پڑتا ہے۔ مارکسی فلسفہ کی بہت سی باتوں کو میں آسانی سے قبول کرسکتا ہوں، مثلاً ذہن اور مادے کی وحدت، مادے کا حرکیاتی تصور، جدلیات کا یہ نظریہ کہ تغیرات کے سلسلے میں ارتقا اور طفرے، عمل اور رد عمل، علت اور معلول اثبات نفی اور ترکیب کا قانون کارفرما ہے یہ فلسفہ مجھے پوری طرح مطمئن نہیں کرسکتا اور ان سوالوں کا جو میرے دل میں پیدا ہوتے ہیں جواب نہیں دے سکتا۔ غیر محسوس طور پر میرا ذہن ایک تصوری نقطۂ نظر جو ویدانت کے نقطۂ نظر سے ملتا جلتا ہے، اختیار کرلیتا ہے مجھے مارکسی فلسفے سے جو اختلاف ہے وہ ذہن اور مادے میں فرق کرنے کی بنا پر نہیں بلکہ اس کا تعلق اس حقیقت سے ہی جو ان دونوں کے ماوراء ہے۔ اس کے علاوہ ہر چیز کو اخلاقیات کے پس منظر میں دیکھتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اخلاقی نقطۂ نظر تغیر پذیر ہے یعنی ذہنی نشو ونما اور تہذیبی ارتقا پر منحصر ہے۔ یہ زمانے کے ذہنی ماحول کے سانچے میں ڈھلتا رہتا ہے لیکن اس کی تہہ میں کچھ اور بھی ہے، بعض بنیادی رجحانات یا اصول جو بڑی حد تک پائدار ہیں ....

میں نے اشتراکی نظریے کے بنیادی اصول تو قبول کرلئے لیکن میں ان جزوی اختلافات کے چکر میں نہیں پڑا، جو اس نظریئے کے ماننے والے آپس میں رکھتے ہیں۔ میں ہندوستان کی اشتراکی جماعتوں کی اس بات سے بہت گھبراتا ہوں کہ وہ اپنی قوت کو نظری مسائل کی باریکیوں پر لڑنے جھگڑنے میں صرف کرتی ہیں۔ مجھے ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں، زندگی بہت پیچیدہ ہے اور جہاں تک ہم اسے اپنے موجودہ علم کے ذریعے سمجھ سکتے ہیں منطقی ترتیب سے خالی ہی اس لئے وہ کسی بندھے ٹکے نظریے کے چوکھٹے میں نہیں سما سکتی۔

میرے نزدیک حقیقی مسائل وہ ہیں جو ان چیزوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی، ساز ہستی کی ہم آہنگی، فرد کی داخلی اور خارجی زندگی کا توازن افراد اور جماعتوں کے باہمی تعلقات کی درستی، نوع انسانی کا روز بروز بلند تر اور برتر مدارج پر فائز ہونا جماعت کی مسلسل نشو ونما، فرد کی پیہم ترقی، ان مسائل کے حل کرنے میں سائنس کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے یعنی مشاہدے کا علم صحیح کا غور و فکر اور استدلال کا طریقہ۔ ممکن ہے کہ حق کی تلاش میں یہ طریقہ ہمیشہ کام نہ دے سکے۔ اس لئے کہ آرٹ، شاعری اور روحانی واردات کے بعض پہلو بظاہر کسی اور دنیا سے تعلق رکھتے ہیں اور سائنس کے معروضی طریقوں کی دسترس سے باہر ہیں۔ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ وجدان کو اور عرفان حقیقت کے دوسرے طریقوں کو ایک سرے سے رد نہ کریں۔ خود سائنس میں ان سے کام لینے کی ضرورت پڑتی ہے لیکن کسی حالت میں ہمیں اس صحیح معروضی علم کے لنگر کو نہ چھوڑنا چاہیئے جو عقل اور تجربے اور عمل کی کسوٹی پر کسا جاچکا ہے اور ہر وقت ہوشیار رہنا چاہیے کہ کہیں ہم تفکر کے اس بحر بے پایاں میں ڈوب کر نہ رہ جائیں جو زندگی کے مسائل سے اور انسانوں کی ضرورتوں سے بے نیاز اپنی رو میں بہتا چلا جاتا ہے۔ زندہ فلسفہ وہ ہے جو موجودہ مسائل سے تعلق رکھتا ہے۔

فہرست مضامین

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

سالک ہندی

وضع احتیاط

میں نے کسی گذشتہ اشاعت میں "دستور زبان بندی" کی مخالفت کی تھی۔ لیکن میں اب اس میں ایک چھوٹی سی ترمیم کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ہمارے سیاسی لیڈروں کی زبان بندی تو نہیں لیکن ان کے انداز بیان پر اور تقریروں، اعلانوں کی تعداد پر کچھ پابندیاں لگانے کی ضرورت ہے! یہ کہنا تو شاید صحیح نہ ہو کہ تقسیم ہند کی ذمہ داری محض بیان اور جواب بیان اور جواب الجواب کے ان سلسلوں پر ہے جو گذشتہ آٹھ دس سال سے ہمارے سیاسی حلقوں میں بہت مقبول ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ آپس کی مخالفتوں اور تلخیوں کو بڑھانے میں ان کا بھی بہت ہاتھ ہے اور میرے خیال میں سوائے مہاتما گاندھی اور مولانا آزاد کے ہمارا کوئی چوٹی کا لیڈر ایسا نہیں (قائدین کو چک کا تو کیا ذکر ہے!) جو اس بارے میں ضبط و اعتدال کی منزل سے آگے نہ بڑھا ہو۔ لیکن خیر جو ہونا تھا وہ ہو چکا، کم سے کم آئندہ کے لئے ہندوستان اور پاکستان دونوں کے لیڈروں کو وضع احتیاط کی ضرورت ہے، ممکن ہے اس سے بعض لیڈروں کا (بقول غالب) "دم گھٹنے لگے" لیکن ان کے ملک ذرا زیادہ اطمینان کے ساتھ سانس لے سکیں گے۔ اس زبان کی بے اعتدالی کی دو حالیہ مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

جنگ یا صلح

مولوی شبیر احمد صاحب عثمانی پہلے ہندوستان کے مذہبی اور سیاسی حلقوں میں بڑی اہمیت رکھتے تھے اب پاکستان میں ان کی حیثیت ایک نیم سیاسی نیم مذہبی لیڈر کی ہے۔ وہ جو بات کہتے ہیں اس کو وہاں کے لوگ اور حکومت بھی توجہ کے ساتھ سنتی ہے۔ ایک اخبار کی روایت ہے کہ حال میں انھوں نے ایک تقریر کے دوران میں فرمایا کہ "کشمیر کا مسئلہ مجلس اقوام میں طے نہیں ہو سکتا اس کا فیصلہ تو میدان جنگ میں ہوگا" کیا مولانا کو یہ اندازہ نہیں کہ آج کل کے زمانے اور آج کل کے حالات میں اس اطمینان کے ساتھ جنگ کی تلقین کرنا نہ انسان دوستی ہے نہ اسلام دوستی۔ نہ پاکستان دوستی ہے نہ کشمیر دوستی۔ عقل، مصلحت، اخلاق، مذہب سب کا تقاضا اور اصرار ہے کہ متنازع مسئلوں کو خوش اسلوبی کے ساتھ باہمی بحث کے ذریعے طے کیا جائے کیونکہ سر پھوٹنے اور خون بہنے سے کسی مسئلے کے حق و ناحق کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ کیا انھوں نے کبھی سوچنے کی زحمت بھی گوارا کی کہ اگر ہندوستان اور پاکستان میں واقعی ایک باقاعدہ جنگ چھڑ گئی تو اس کا اثر دونوں ملکوں کے باشندوں اور ان کے مستقبل پر کیا پڑے گا جن کی بھلائی وہ ایک مسلمان کی حیثیت سے یقیناً چاہتے ہوں گے؟ کیا ان جنگ کے شوقین سورماؤں کو (جو دونوں ملکوں میں زبان اور قلم سے جنگ کرنے میں مصروف ہیں) ان تمام تباہیوں اور مصیبتوں کا ابھی تک پوری طرح احساس نہیں ہوا جو تقسیم ہند اور اس کے ساتھ کے فرقہ وارانہ فسادوں کی وجہ سے پیش آ رہی ہیں کہ وہ میدان جنگ میں "بہادری" دکھانے کے خواب دیکھتے ہیں۔ کیا دو ہمسایہ قوموں کی لڑائی، جس کے لڑنے والوں میں بھی دونوں طرف سے مسلمان شامل ہیں، "جہاد" کا حکم رکھتی ہے؟ کیا ہم میں سے ہر ایک کو کبھی اپنے ہر قول و فعل کی کڑی جواب دہی کرنی نہ ہوگی؟

شیریں کلامی یا سخت زبانی

ابھی حال میں سردار پٹیل بمبئی گئے تھے وہاں انھوں نے کئی تقریریں کیں، اور عام طور پر ان کا لہجہ معتدل رہا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت کے تجربے نے ان میں ذمہ داری کا ایک نیا احساس پیدا کیا ہے لیکن اپنی ایک تقریر کے دوران میں انھوں نے (اخباروں کی رپورٹ کے مطابق) ایک ایسی بات کہی جس کو کسی طرح سراہا نہیں جا سکتا۔ انھوں نے پاکستان کی پالیسی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:۔

"ہم اپنے اندرونی معاملوں میں کسی قسم کی دخل اندازی گوارا نہ کریں گے خواہ اس کی وجہ سے ہندوستان ختم ہو جائے یا پاکستان ختم ہو جائے یا دنیا کا خاتمہ ہو جائے: ہاں اگر پاکستان اپنی قبر کھودنا چاہتا ہے تو اسے ایسا کرنے کی پوری آزادی ہے"۔

مجھے بہت افسوس ہے کہ ایسے الفاظ سردار پٹیل کی زبان سے نکلے۔ انھوں نے ملک کی بڑی سیوا کی ہے آزادی کے لئے قربانیاں کی ہیں حکومت سنبھالنے کے بعد ریاستوں کے مسئلے کو غیر معمولی تدبر کے ساتھ سلجھایا ہے۔ اس لئے اُن کی ملک میں بڑی پوزیشن اور اثر ہے انھیں اپنے ایک ایک لفظ کو تول کر استعمال کرنا چاہئے کیونکہ عوام پر اور ملک کی بین الاقوامی پوزیشن پر اس کا اثر پڑتا ہے لیکن ان کے اس بیان میں کئی باتیں ایسی ہیں جو قابل گرفت ہیں

۱۔ "اندرونی معاملوں میں دخل اندازی" واقعاً ایک بری بات ہے لیکن اس کے سلسلے میں اپنے ملک کی بلکہ ساری دنیا کی بازی لگا دینا احساس تناسب سے بعید ہے۔

۲۔ آج کل کی دنیا میں جب تک سب قومیں اپنے اختیار مطلق میں کچھ رد و بدل اور کمی کرنے کو تیار نہ ہوں گی، بین الاقوامی امن ناممکن ہے۔ اس لئے یہ "اندرونی معاملات" کا نشتر ذرا زیادہ نہیں جتنا چاہئے۔ اس لفظ کے پیچھے بڑی بڑی ہٹ دھرمیوں اور بے انصافیوں نے پناہ لی ہے۔ آخر جنوبی افریقہ کا عذر بھی اپنے ہندوستانیوں کے ساتھ بدسلوکی کے متعلق یہی ہے کہ یہ ہمارا "اندرونی معاملہ" ہے۔ دراصل کوئی معاملہ اندرونی یا بیرونی ہونے کی وجہ سے "محرمات" میں شامل نہیں ہو جاتا، دنیا میں اصل تقسیم ایک ہی ہے، یعنی فلاں بات قرین انصاف ہے یا خلاف انصاف؛ باقی تمام تقسیمیں نفس کا دھوکا ہیں۔

۳۔ پھر ایک اور سوال اٹھتا ہے، کیا ہم واقعاً بے تعلق رہ سکتے ہیں، اگر پاکستان اپنی قبر کھودنا چاہے؟ یا پاکستان بے تعلق رہ سکتا ہے، اگر ہندوستان اپنی قبر کھودنا چاہے۔ جب ہٹلر اپنی حرکتوں سے جرمنی کی قبر کھود رہا تھا تو بہت سے ملک اسی طرح اظہار بے تعلقی کرتے تھے لیکن اس کا خمیازہ ساری دنیا کو بھگتنا پڑا یا نہیں؟ آج تو ساری قومیں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح وابستہ ہیں جس طرح بدن میں خون پہنچانے والی شریانیں۔ کسی ایک کو کاٹ دیجئے اور پھر قانون قدرت کا تماشہ دیکھئے۔ اس لئے ہم تو اگر کسی قوم کو بھی اپنی قبر کھودتے دیکھیں گے خواہ وہ اپنی ہو یا دوسری تو اس کو روکنے کی، راہ راست پر لانے کی کوشش کریں گے اور ہمارا طریقہ کار ہوگا۔ وجا دلہم بالتی ہی احسن۔

بین الاقوامی تعلقات اور ذمہ داریوں کے بارے میں یہ میری ذاتی رائے نہیں بلکہ خوشی کا مقام ہے کہ ہمارے ملک کے بہترین سیاست دان بھی اس خیال کے ہم نوا ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی تقریروں میں خصوصاً مجلس اقوام کے سامنے اس بات کو بار بار واضح کر دیا ہے کہ باوجود مجلس اقوام کی ناکامیوں کے ہندوستان کو اس کے اصولوں اور آدرشوں پر عقیدہ ہے اور وہ اس کو مستحکم کرنے کے لئے پوری کوشش کرے گا۔ اسی طرح (یہ ایک دلچسپ حسن اتفاق ہے یا حسن تدبیر!) راجہ جی نے سردار پٹیل کو جو پیغام محبت ان کی سالگرہ کے روز بھیجا تھا (اور یہ شاید وہی دن ہے جب انھوں نے یہ تقریر کی) اس میں انھوں نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ان کو جو مشورہ دیا ہے وہ ہمارے لیڈروں کے لئے قابل توجہ ہے تاکہ ہندوستان کا نام قوموں کی محفل میں بلند اور نیک رہے۔

"آزادی مل جانے کی وجہ سے دنیا کی قوموں کو ہندوستان میں زیادہ دلچسپی اور تعلق خاطر پیدا ہو گیا ہے۔ جب یہاں انگریزوں کی مطلق العنان نوکر شاہی حکومت تھی تو یہاں جو کچھ ہوتا تھا اس کا زیادہ نوٹس نہیں لیا جاتا تھا۔ لیکن اب ہماری ہر بات پر دنیا کے سیاست دانوں اور اخبار نویسوں کی تنقیدی نظر ہے ...... ہمیں اپنی نئی اور آزاد حکومت کی تعمیر میں بہت سے پیچیدہ اندرونی معاملات کو حل کرنا ہے لیکن آج اس تمام کام میں ہمیں ایک سخت گیر بلکہ کسی حد تک معاندانہ بین الاقوامی سائے کے ساتھ سابقہ ہے ...... حکومت انگریزی کے خلاف مدتوں جد و جہد اور احتجاج کرنے کی وجہ سے ہم شیریں کلامی کی عادت کھو بیٹھے ہیں .... آپ کو اور ہمارے وزیر اعظم کو اس وجہ سے ایک کافی مشکل مرحلہ کا سامنا کرنا ہے ...."

میر کارواں

ہمیں امید ہے کہ شیریں کلامی اور معقول پسندی کا جو بلند معیار گاندھی جی نے قائم کیا تھا اور جو ہمارے گورنر جنرل نے ان سے ورثہ میں پایا ہے (بلکہ شاید

بقیہ صفحہ (۱۴)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
۲۴ نومبر ۱۹۴۸ء

ہندوستان اور پاکستان

اگلے مہینے ہند اور پاکستان کی حکومتوں کے نمائندے مل کر ان مسائل پر غور کرنے والے ہیں جن کا حل ہونا دونوں ملکوں کے تعلقات کو سدھارنے کے لئے ضروری ہے۔ اس سے تو کوئی معقول پسند آدمی انکار نہیں کر سکتا کہ موجودہ کشیدگی دونوں حکومتوں کے لئے نہایت مضر ہے بلکہ اگر یہی طرح بڑھتی رہی تو مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کشیدگی کی وجہ سے دونوں بہت سے تعمیری کاموں کو نظر انداز کر کے اپنی آمدنی کا بڑا حصہ جنگی تیاریوں پر صرف کر رہے ہیں۔ اسی کی وجہ سے دونوں کی باہمی تجارت بہت کم ہو گئی ہے اُدھر سے بہت سی ضروری چیزیں مثلاً غلے کے ادھر آنے میں رکاوٹ ہے ادھر سے دوسری ضروریات مثلاً کپڑے کے اُدھر جانے پر پابندیاں ہیں جس سے دونوں جگہ گرانی اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اسی کی وجہ سے امن سلامتی کا عام احساس جو صنعتی اور کاروباری ترقی کے لئے لازمی ہے پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ سے ایک کروڑ سے زیادہ پناہ گزینوں کی امداد اور جائداد کا مسئلہ جس کے طے ہونے پر ان کی بحالی موقوف ہے طے ہونے نہیں پاتا۔ غرض اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک نیزے کی دو نوکیں دو آدمیوں کے سینوں میں تو آمنے سامنے گڑے ہیں چبھ رہی ہوں اور ہر ایک اپنے اپنے سینے کا زور لگا کر دوسرے کو ڈھکیلنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کشیدگی کی وجہ کیا ہے؟ یوں تو بہت سے چھوٹے چھوٹے جھگڑے روز پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ مگر وہ آپس کی بات چیت سے بڑی جلدی سے طے ہو جاتے ہیں۔ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ بس ایک کشمیر کا جھگڑا جس کے طے ہونے کی کوئی صورت نہیں نکلتی باہمی تعلقات کو سدھرنے نہیں دیتا تو پھر یہ کشمیر کا جھگڑا کیسے طے ہو؟

یہ بات دونوں حکومتیں بار بار کہہ چکی ہیں کہ کشمیر کی قسمت کا فیصلہ وہاں کے باشندوں کی رائے سے طے ہونا چاہیے یہاں تک تو دونوں میں اتفاق ہے۔ اختلاف اس امر میں ہے کہ رائے شماری کا طریقہ کیا ہو۔ پہلے پاکستان یہ چاہتا تھا کہ ہندوستان کی فوجیں کشمیر سے واپس بلالی جائیں شیخ عبداللہ کی حکومت کو معزول کر دیا جائے۔ ریاست کو اقوام متحدہ کے نامزد کئے ہوئے لوگوں کے انتظام میں دے دیا جائے اور انھیں کی نگرانی میں رائے شماری ہو۔ ہندوستان کا مطالبہ یہ تھا کہ پہلے سرحدی قبائل کا لشکر اور پاکستانی فوج ریاست کی حدود سے ہٹالی جائے۔ اس کے بعد اقوام متحدہ کے ناظروں کی نگرانی میں رائے شماری کا مناسب انتظام کرنے پر غور کیا جائے۔ جب دو خودمختار ریاستوں میں اس طرح کا اختلاف ہو تو اس کا فیصلہ بین الاقوامی پنچایت کے سوا اور کون کر سکتا ہے؟ چنانچہ اقوام متحدہ کی حفاظتی کونسل کی طرف سے ایک کمیشن ہندوستان اور پاکستان دونوں کی رضامندی سے آیا اور اس نے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ تجویز کی کہ پاکستان اپنی فوج کشمیر سے ہٹالے باقی فوجیں لڑائی بند کر دیں اور پھر رائے شماری کی شرطیں طے کی جائیں۔ پاکستان نے پہلا ہی قدم اٹھانے سے انکار کر دیا۔ اس لئے سرے سے مفاہمت شنید ختم ہو گئی اور کمیشن ناکام واپس گیا۔ اب اگر ہندوستان اور پاکستان کی مجوزہ کانفرنس میں اس مسئلے پر کوئی نتیجہ خیز گفتگو ہو سکتی ہے تو اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ پاکستان کی حکومت رائے شماری کی کسی معقول اور قابل عمل تجویز کو مان لے اور ان مطالبات پر اصرار نہ کرے جنھیں کشمیر کمیشن رد کر چکا ہے۔

ہمارے خیال میں دونوں ملکوں کی باہمی کشیدگی کی ایک بہت بڑی وجہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ پاکستان ابھی تک اپنی اقلیت کو مطمئن نہیں کر سکا ہے۔ خصوصاً مشرقی بنگال کے ہندوؤں میں بڑی بے چینی ہے، اور وہ لاکھوں کی تعداد میں ترک وطن کر کے مغربی بنگال آ رہے ہیں جس سے ہندوستان کی حکومت کو بڑی دقتیں پیش آ رہی ہیں اور خود مشرقی بنگال کی معیشت کے تباہ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

پاکستان کا آئین ابھی تک نہیں بنا ہے۔ یہاں تک کہ ریاست کے بنیادی مقاصد اور اس کے شہریوں کے بنیادی حقوق بھی متعین نہیں ہوئے ہیں۔ ہر طرف اسلامی ریاست کا نام لیا جا رہا ہے اور اس کی مختلف تعریفیں کی جا رہی ہیں۔ کسی کو یہ معلوم نہیں کہ یہ اسلامی ریاست ترکی کی طرح ہوگی جہاں لوگ زیادہ تر مسلمان ہیں۔ مگر ریاست کا کوئی مذہب نہیں، شام، ایران اور مصر کی طرح ہوگی جہاں سرکاری مذہب اسلام ہے۔ لیکن غیر مسلموں کو مسلمانوں کے برابر حقوق حاصل ہیں یا نجد، حجاز اور یمن کی طرح ہوگی جہاں جمہوریت کے لئے کوئی گنجائش نہیں، اور غیر مسلموں کا تو ذکر ہی کیا خود مسلمانوں کو بھی مکمل بنیادی حقوق نہیں دئے گئے اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ پاکستان میں غیر مسلم شک اور شبہے کی حالت میں ہیں جو ذرا سی تحریک سے خوف کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور ان کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ ہم ہندوستان میں دیکھ چکے ہیں کہ ہندوستانی ریاست کے غیر مذہبی اور جمہوری ہونے کا اعلان کیا گیا مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے لئے اکثریت کے مساوی حقوق منظور کئے گئے اور ذمہ دار ارباب حکومت اور قومی لیڈر ایک عرصے تک ان کے شکوک و شبہات کو دور کرنے کی کوشش کرتے رہے تب جا کر ان کو کسی قدر اطمینان ہوا اور ان کے قدم اس ملک میں ٹکے۔ یہی طرز عمل پاکستان میں بھی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمیں سچے دل سے یقین ہے کہ ہندوستان کے باشندوں کی بہت بڑی اکثریت اور ہندوستانی حکومت یہ چاہتی ہے کہ دونوں ریاستوں میں اختلافی مسائل میں معقول اور باعزت سمجھوتا ہو جائے اور جلد سے جلد دوستانہ اور خوش گوار تعلقات قائم ہو جائیں۔ اگر پاکستان کے نمائندے بھی یہی خواہش دل میں لے کر آئیں تو مجوزہ کانفرنس ضرور کامیاب ہوگی اور ہندوستان پاکستان کو یہ موقع ملے گا کہ فرضی بیرونی خطروں کی طرف سے مطمئن ہو کر حقیقی اندرونی خطروں کا یعنی رجعت پرستی سیاسی اور معاشی بے انصافی استحصال اور نفع خوری کا مقابلہ کریں جو چپکے چپکے دونوں کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔

بزم بے تکلف

"بہت اچھا مولانا خدا آپ کو جنت نصیب کرے لگے ہاتھوں لیڈروں کی اور قسموں کے نام بھی بتا ڈالئے"

میری جان بخشی کیجئے، آپ تو تقاضائے مبرم کی طرح پیچھے پڑ گئے مجھے مدرسے کو دیر ہوتی ہے، طلاب منتظر ہوں گے"

"اجی طلاب کو تھلا ب پھر بیجئے گا، پہلے میری قضائے حاجت تو فرما دیجئے"

"بھئی الفاظ کی قسمیں تو بے شمار ہیں مجھ سے کیا حماقت سرزد ہوئی کہ الفاظ کے قیاس پر لیڈروں کی تقسیم شروع کر دتیا"

"مولانا حماقت نہیں، آپ سے عقل مندی سرزد ہو گئی، لفظوں اور لیڈروں میں بڑی مشابہت ہے۔ دونوں حرفوں کے ذہن میں جیز سنئے غیر مستند الفاظ کی دو اور بڑی قسمیں ہیں جو قابل ذکر ہیں، عامیانہ اور سوقیانہ، ان کے مقابلے میں غیر مستند لیڈروں کی بھی دو اور قسمیں عامی اور سوقی قرار دی جا سکتی ہیں"

"عامی تو میں سمجھ گیا یعنی ٹکسالی لیڈر کا خوردہ یا ریزگاری، مگر اس کو آپ نے غیر مستند کیسے کہہ دیا ہے وہ ٹکسالی کی طرح سولہ آنے لیڈر نہ سہی مگر ہے تو اسی کی کسر، آخر اٹھنی، چونی، دونی، اکنی، ادھنا، خالی پیٹ کا پیسہ۔ یہ سب بھی تو ٹکسال ہی میں گھڑے جاتے ہیں جیسے خردے کے بغیر عام ضرورت کی چیزوں کا ہاتھ آنا مشکل ہے اسی طرح عامی لیڈروں کے بغیر عوام کو ہاتھ میں لینا اور ہاتھ میں رکھنا دشوار ہے۔ آپ یوں سمجھ لیجئے کہ عامی لیڈر بڑے لیڈر کا بھونپو ہے جو اس کی آواز کو پھیلاتا اور پھیلاتا ہے"

"خیر یہ تو ہوا عامی لیڈر، مگر مولانا دوسری قسم کا نام آپ نے سوقی بتایا تھا، یہ سوقی کیا بلا ہے؟"

"سوقی وہی جسے آپ بازاری کہتے ہیں"

"یا اللہ تیری پناہ! بازاری لیڈر خطرۂ جان، خطرۂ ایمان خطرۂ ہندوستان خطرۂ پاکستان۔ آگ کھاتا ہے، انگارے اگلتا ہے۔ بس بوتا ہے، بس کے رکھوالے کا ہی نعرہ اس کا دعوے، گالیاں اس کی دلیل، بھڑکانا اس کا کام، لڑوانا اس کا کھیل، جان کی بازی لگاتا ہے، اپنی نہیں، دوسروں کی جان کی، سر کا سودا کرتا ہے، اپنے نہیں، دوسروں کے سر کا، کوئی جیتے یا ہارے اس کے پوبارے، کوئی جیے یا مرے، اس کے دام کھرے"

"ماشاء اللہ آپ تو جوش خطابت میں، شاعری فرمانے لگے خیر اب مجھے اجازت دیجئے، بہت دیر ہو گئی"

"مگر مولانا مقطع کا بند تو رہ گیا، لفظ کی ایک قسم مہمل بھی تو ہوتی ہے، اس کے مقابلے میں مہمل لیڈر ———"

"اسے اپنا تخلص سمجھ لیجئے۔ السلام علیکم"

پچھلا ہفتہ : ۱۔ ہندوستان

اس طومار سے کیسے نبٹیں

آئین ساز اسمبلی میں جیسا کہ ہمارا خیال تھا، جزوی اور ضمنی مسائل پر بڑے زور شور سے بحثیں ہو رہی ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ مختلف ممبر جو ترمیمیں پیش کرنا چاہتے ہیں ان کی مجموعی تعداد چار ہزار ہے۔ اگر سب نقادوں کو نکتہ سنجی کا پورا موقع دیا جائے تو اسمبلی کو اپنا اجلاس دو تین سال تک مسلسل جاری رکھنے کی ضرورت ہے اور جو بیچ میں وقفے ہوں جیسے کہ اب تک ہوتے رہے ہیں تو شاید دس بارہ سال لگ جائیں۔ وہ تو کہئے بڑی خیریت ہوئی کہ بنگال کے بارک بیں ممبر نذیر الدین احمد صاحب کی ایک ہزار ترمیموں کی پوٹ ریل کے سفر میں چوری گئی، ورنہ ترمیموں کی تعداد سوائی ہوتی۔ ایک صاحب نے تو اسمبلی میں کہہ دیا کہ ان چوروں نے ہم پر بڑا احسان کیا۔ کاش کچھ من چلے پروفیسر کے، ٹی، شاہ کا بستہ بھی غائب کر دیتے۔

اب یہ کوشش ہو رہی ہے کہ کانگریس پارٹی کے جلسوں اور دوسری نجی صحبتوں میں ترمیم پیش کرنے والوں کو سمجھا بجھا کر مکرر اور غیر ضروری ترمیمیں حذف کر دی جائیں۔ اُمید کی جاتی ہے کہ اس طرح ترمیموں کی تعداد تین سو اور چار سو کے درمیان رہ جائے گی، اور ان پر بحث کا سلسلہ ۱۵ر جنوری تک ختم ہو جائے گا۔ فرض کیجئے صرف تین سو ترمیمیں رہ جائیں۔ تب بھی یہ توقع خوش فہمی پر مبنی معلوم ہوتی ہے کہ اس سے اسمبلی اتنی جلدی نبٹ سکے گی۔

اب تک صرف ایک ترمیم ڈاکٹر امبیڈکر کی اسمبلی کے سامنے آئی جو کسی حد تک اہمیت رکھتی تھی اور وہ یہ تھی کہ کسی صوبے کے حدود میں کوئی تبدیلی کرنی ہو تو انڈین یونین کا صدر صوبے کی مجلس آئین ساز کی رضامندی سے کر سکے گا، اور کسی ریاست کی حدود میں رد و بدل کے لئے اُسے ریاست کی رضامندی حاصل کرنی ہوگی۔ بہت سے لوگوں نے صوبے اور ریاست میں فرق کرنے پر اعتراض کیا مگر ڈاکٹر امبیڈکر نے ان کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ ریاستوں سے جو معاہدے ہوئے ہیں ان کی رو سے ریاستوں کی حیثیت صوبوں سے الگ ہے۔ آخر ترمیم منظور ہو گئی۔

مگر زیادہ جوش و خروش کا اظہار اس قسم کی ترمیموں میں کیا گیا کہ انگریزی مسودے میں بھی ہندوستان کے لئے "اسٹیٹ" کے بجائے "پردیش" کا لفظ استعمال کیا جائے۔ "انڈیا" کے بجائے "بھارت" یا "بھارت ورش" رکھا جائے۔ "اسٹیٹ" کو تو وزیر اعظم نے بچا لیا مگر "انڈیا" پر بڑا سخت حملہ تھا اس کو پنڈت گووند ولبھ پنتھ نے اس وقت اس طرح ٹالا کہ پہلے ملک کے دستور منظور ہو جانے دیجئے نام پھر تجویز کر لیجئے گا۔

ابھی تک تو جتنی ترمیموں پر گرم جوشی سے بحث ہوئی ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری اسمبلی کے بہت سے ممبروں کو آئین کے مضمون سے زیادہ اس کی زبان سے ملک کے سیاسی اور معاشی نظام سے زیادہ اس کے نام سے دلچسپی ہے۔ ممکن ہے آگے چل کر انہیں اپنے اس خیال میں ترمیم کرنی پڑی۔

مشرقی بنگال کی پہیلی

مشرقی بنگال کی حکومت نے اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کی اپنی سی کوشش کی کہ وہاں کے ہندو باشندے بہت بڑی تعداد میں مغربی بنگال کی طرف ہجرت کر رہے ہیں۔ لیکن اب یہ چھپائے نہیں چھپتی۔ حال میں بی، بی، سی نے اپنے کراچی کے نامہ نگار کا بیان نشر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کی مرکزی حکومت یہ تسلیم کرتی ہے کہ مشرقی بنگال کے ہندوؤں میں بے چینی ہے اور لوگ بڑی تعداد میں ترک وطن کر رہے ہیں اس کا کہنا ہے کہ پچھلے مہینے دس لاکھ تو نہیں البتہ تین لاکھ آدمی مشرقی بنگال سے مغربی بنگال منتقل ہوئے ہیں مگر یہ تعداد بھی کچھ کم نہیں، اور پاکستان کی حکومت محسوس کر رہی ہے کہ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو مشرقی بنگال کی معاشی حالت جو پہلے سے خراب ہے نہایت ابتر ہو جائے گی اس لئے لیاقت علی خاں صاحب مشرقی بنگال کا دورہ کرنے کے لئے پہنچے ہیں۔ وہ ہجرت کے اسباب کی تحقیقات کریں گے اور اس کو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔

پہیلی جسے بوجھنا ہے دراصل یہی ہے کہ اب جبکہ سارے ہندوستان اور پاکستان میں فرقہ وارانہ فساد کا زور گھٹ چکا ہے اور خود مشرقی بنگال میں تو بالکل ہی ٹھنڈا پڑ گیا ہے وہاں سے لوگ کیوں بھاگ رہے ہیں۔ بی، بی، سی کے نامہ نگار کا یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ اس کی وجہ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کی کشیدگی ہے جو کشمیر کی جنگ کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے یہ کشیدگی تو سال بھر سے ہے پھر کیا وجہ ہے کہ اس کا اثر اس قدر شدت سے خاص اس وقت ظاہر ہو رہا ہے اور وہ بھی مشرقی بنگال میں جو کشمیر کے محاذ سے تقریباً دو ہزار میل دور ہے۔ دوسرے لوگوں نے اور کئی وجہیں بتائی ہیں یعنی معاشی حالت کی خرابی، گرانی، بدامنی اور وہ بے اطمینانی جو غیر مسلموں کو اپنے سیاسی اور معاشی حقوق کے معاملے میں ہے اس میں شک نہیں کہ یہ سب باتیں موجود ہیں اور ان کا ہجرت کے مسئلے سے تعلق ہے، لیکن یہ بھی نئی نہیں بلکہ بہت دن سے ہیں اور ان کے اثر سے جو ہجرت ہو رہی ہے وہ چھوٹے پیمانے پر آہستہ آہستہ ہو رہی ہے۔ اس بھگدڑ کا جو پچھلے مہینے سے مچی ہے کوئی نیا اور جداگانہ سبب ہونا چاہیئے۔ اس سبب کا تعین یقینی طور پر تو مقامی تحقیقات ہی سے ہو سکتا ہے لیکن جہاں تک باہر سے اندازہ کیا جا سکتا ہے مشرقی بنگال کے غیر مسلموں کے غیر معمولی خوف اور خفگی کی وجہ یہ ہے کہ کچھ دن سے فتنہ پرداز لوگ شری پیارے لال اور ان کے ساتھیوں کو جو نواکھلی کے علاقے میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں بھائی چارہ قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ستانے پر تل گئے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ ان حضرات پر مقدمے دائر کئے گئے ہیں جن میں شاید ایک مقدمہ قانون اسلحہ کی خلاف ورزی کے سلسلے میں ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ شری پیارے لال اور ان کے رفیق گاندھی جی کے ساتھ نواکھلی پہنچے تھے ایک عرصہ تک ان کی سرکردگی اور نگرانی میں کام کر چکے ہیں اور اس کے بعد بھی ان ہی اصولوں پر کام کر رہے ہیں۔ ان کی نیک نیتی، خلوص، ہمدردی، ایثار، اور انتھک محنت کو ہندو مسلمان سب سراہتے رہے ہیں اور خود مشرقی بنگال کی حکومت یہ اعتراف کرتی رہی ہے کہ انھوں نے فرقہ وارانہ اتحاد اور امن و سکون کے قیام میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں جب تک ناظم الدین صاحب وزیر اعظم تھے ان حضرات کے تعلقات حکومت سے بہت خوشگوار رہے اور فریقین ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے رہے معلوم ہوتا ہے کہ ناظم الدین صاحب کے ہٹنے کے بعد حکومت کی پالیسی یا طرز عمل میں کوئی ایسی تبدیلی ہوئی ہے جس کی وجہ سے یہ امن کے نقیب اپنا کام نہیں کر سکتے اور اس چیز نے مشرقی بنگال کے ہندوؤں میں جنھیں ان کی وجہ سے بڑا ڈھارس تھا مایوسی اور گھبراہٹ پیدا کر دی ہے۔

پس پردہ کچھ ہو رہا ہے

کشمیر کے بارے میں لیاقت علی خاں صاحب کی تقریر کے بعد جس کا ہم نے پچھلے پرچے میں ذکر کیا تھا یہ خبر آئی ہے کہ "آزاد کشمیر" کی حکومت کے صدر سردار ابراہیم اور صدر اعلیٰ چودھری غلام عباس صاحب نے کراچی پہنچ کر کئی روز تک لیاقت علی خاں صاحب سے گفتگو کی۔ اُدھر پاکستان کے اخبارات میں تقسیم کشمیر کی کچھ ساختہ عجیب ساختہ مخالفت بڑے زور شور سے ہو رہی ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تقسیم کی بنا پر سمجھوتے کی کچھ بات چیت ضرور ہو رہی ہے۔ حال میں ہندوستانی فوج کو کشمیر کے شمالی سرحدی علاقے میں بڑی کامیابی ہوئی ہے اور جنوبی مغربی سرحد کی طرف بھی اس کا دباؤ بڑھ رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حکومت پاکستان حفاظتی کونسل سے شکایت کرنے والی ہے کہ آپ کے اس اعلان کے باوجود کہ ہندوستان یا پاکستان کو کوئی ایسی کارروائی نہیں کرنی چاہیئے جس سے فضا اور بگڑے اور صلح کی گفتگو میں رکاوٹ پیدا ہو ہندوستان نے کشمیر میں اپنی فوجی تیاریاں بہت بڑھا لی ہیں اور اپنی سرگرمیوں میں بھی اضافہ کر دیا ہے۔ ظاہر ہے پاکستان کی یہ شکایت اس بات کو دیکھتے ہوئے کہ حفاظتی کونسل کے بھیجے ہوئے کمیشن کی صلح کی شرائط کو خود اسی نے رد کیا تھا، عجیب و غریب معلوم ہوتی ہے۔ مگر بہر حال یہ علامت اچھی ہے کہ پاکستان کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ فضا بگڑنے نہ پائے اور صلح کی گفتگو میں رکاوٹ نہ پڑے۔

---

۲ - پاکستان

ریاستوں کا اب تک وہی حال ہے

پچھلے دنوں آل پاکستان اسٹیٹس لیگ کا کراچی میں اجلاس ہوا۔ جس میں پاکستانی ریاستوں کی حالت اور ان کی اصلاح و ترقی کے متعلق بحث و گفتگو ہوئی۔ معاصر پاکستان ٹائمز، لاہور کے رپورٹر نے جو اُسے اطلاع بھیجی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اجلاس میں پاکستانی ریاستوں کی عام حالت کے متعلق انتہائی بے اطمینانی بلکہ تشویش کا اظہار کیا گیا۔ اس نے لکھا ہے کہ آزادی کو پندرہ مہینے ہو چکے ہیں، مگر پاکستانی ریاستوں کی کوئی پانچ ملین آبادی شخصی حکومت کے ماتحت ہے اور انھیں آزادی کی ہوا تک نہیں لگی ہے۔ پاکستان میں شامل ہونے والی دس ریاستوں میں سے ایک میں بھی عوامی وزارت نہیں ہے۔ وہاں کی میونسپلٹیوں تک میں عوام کے نمائندے نہیں ہیں۔ اسٹیٹس مسلم لیگ کے ذمہ دار حضرات کے بیان کے مطابق تمام ریاستوں میں حکومت کی طرف سے سیاسی اور سماجی کام کرنے والوں کی مخالفت کی جاتی ہے۔ سرحد کی ریاستوں میں لیگی رضاکاروں کو کام کرنے کی اجازت نہیں۔ بلوچستانی ریاستوں میں مزاحمتیں پیدا کی جاتی ہیں، بعض دوسری ریاستوں میں پاکستان نیشنل گارڈ کو مشتبہ نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور خیرپور میں پاکستان نیشنل گارڈ کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا ہے۔ اسٹیٹس لیگ کے سکریٹری محمد محمود صاحب نے فرمایا کہ ہماری آزادی کو پندرہ مہینے ہو چکے ہیں مگر ریاستوں میں ذمہ دار حکومت قائم کرنے کے بارے میں ہماری ریاستی وزارت کا طرز عمل بالکل وہی ہے جو برطانوی عہد حکومت میں تھا۔

چنانچہ ایک تجویز میں حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ سرحد کی ریاستوں میں جو زیادتیاں کی جا رہی ہیں ان کی تحقیق کے لئے ایک غیر سرکاری وفد بھیجا جائے۔ اسٹیٹس مسلم لیگ کے کاموں میں جو رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں، اور وہاں کے عوام پر جو مظالم ڈھائے جاتے ہیں ان پر بے اطمینانی کا اظہار کیا گیا ہے اور وزیراعظم پاکستان سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ ان خرابیوں کو دور کریں۔ ایک دوسرے ریزولیوشن میں ان تمام ریاستوں میں ذمہ دار حکومت کے قیام کے مطالبے کو دہرایا گیا ہے۔

عبدالقیوم خاں کی تازہ تصنیف

صوبہ سرحد میں قیوم خانی وزارت سے لیگی کارکنوں کو عام طور پر شکایت ہے اور ان کی بے اطمینانی مخالفت کی حد تک بڑھتی جا رہی ہے۔ ویسے تو لوگوں کی شکایتوں کی فہرست بہت طویل ہے مگر ان کی موٹی موٹی دو تین باتیں یہ ہیں۔ یہ وزارت صوبے کے مسائل خصوصاً غذا کی دقتوں کو حل کرنے سے قاصر رہی۔ وزارت کو برسر اقتدار رکھنے اور عوام کی بے اطمینانی اور بے اعتمادی کے ڈر سے مسلم لیگ کی ممبر سازی کو صرف وزارتی پارٹی کے حامیوں تک محدود رکھا گیا ہے۔ صوبے میں تحریر و تقریر کی آزادی کو بالکل کچل دیا گیا ہے۔ اس تیسری شکایت کے متعلق کچھ دن ہوئے پاکستانی معاصر امروز لاہور نے "سیفٹی ایکٹ اسمبلی میں" کے عنوان سے ایڈیٹوریل لکھا تھا، اس کا اقتباس ہم ذیل میں درج کرتے ہیں :-

"صوبائی اسمبلی میں وزیراعظم صوبہ سرحد نے پبلک سیفٹی ایکٹ کے حق میں جو دلائل دیئے ہیں۔ ان کا اجمال یہ ہے کہ خان عبدالغفار خاں پاکستان کے خلاف پروپگنڈا کر رہے تھے اور ان کی سرخ پوش جماعت ایک سوچے سمجھے ہوئے منصوبے کے بموجب پاکستان میں بے چینی اور بد امنی پھیلا رہی تھی۔ موجودہ حالات میں اس قسم کی سرگرمیاں مملکت کے لئے خطرناک اور ان کے محرک ملک و قوم کے دشمن ہیں، لہٰذا حکومت کو ان عناصر سے عہدہ برآ ہونے کے لئے غیر معمولی اختیارات اور ہنگامی قوانین سے مسلح ہونا چاہیئے ....

پبلک سیفٹی ایکٹ کے بارے میں ہمارا نقطۂ نگاہ مزید کسی وضاحت کا محتاج نہیں ہم نے بارہا لکھا کہ اجتماعی مفاد کے دشمنوں اور قوم و ملک کے خلاف سازش کرنے والوں کے خلاف یقیناً سخت اور عبرت آموز چارہ جوئی کرنی چاہیئے۔ لیکن یہ فیصلہ کہ فلاں فرد یا فلاں جماعت مجرم ہے، بالکلیہ پولیس کے حکام یا نظم و نسق کی مشینری پر چھوڑ دینا متمدن اور جمہوری ممالک کے مروجہ طرز حکومت اور خود ہماری روایات کے منافی ہے۔

ہماری رائے سے کوئی انصاف پسند اختلاف نہیں کر سکتا کہ کسی فرد کے جیل کے اندر یا باہر رہنے کا فیصلہ پولیس کے انسپکٹر کی بہ نسبت عدالت کا جج زیادہ صحت کے ساتھ کر سکتا ہے پھر یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ نظم و نسق کی جو مشینری ہمارے حصے میں آئی ہے اُسے ہمارے ملک کے غیر ملکی حاکموں نے اپنی مخصوص ضروریات کے پیش نظر بنایا تھا .... لہٰذا ایسی مشینری کو احتساب سے بے نیاز کر کے لامحدود خصوصی اختیارات سونپ دینا۔ اگر ایمانداری سے غور کیا جائے تو ملک و قوم کے لئے تخریبی عناصر کی آزادی سے کم خطرناک نہیں۔ جمہوریت اور شہری حقوق کی آڑ میں کسی فرد یا کسی جماعت کو مملکت کی جڑیں کھوکھلی کرنے کی آزادی ہرگز نہیں ملنی چاہیئے لیکن یہ بھی انصاف سے بعید ہے کہ حفاظتی تدابیر کے بہانے نظم و نسق کو کامل اختیار دے دیا جائے کہ جسے چاہے جیل میں ٹھونس دے اور اس کے خلاف کوئی داد ہو نہ فریاد۔

کشمیر کی تقسیم کا چرچا

یہ عجیب بات ہے کہ نہ تو کشمیر کے مسلم لیڈر شیخ عبداللہ نے کبھی کشمیر کی تقسیم کی تجویز پیش کی اور نہ ہندوستان کے کسی ذمہ دار شخص نے مگر پاکستان میں تقسیم کشمیر کی مخالفت میں آج کل زور شور سے آوازیں بلند ہو رہی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ حکومت پاکستان اب ساری جاتے دیکھئے تو آدھی دیجئے بانٹ کے اصول پر عمل کرنے کی فکر میں ہے۔ ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس کے بعد، لندن کے بعض حلقوں سے تقسیم کشمیر کے حق میں پیچ در پیچ طریقوں سے آوازیں بلند ہوتی سنائی دے رہی ہیں جن سے ہم نوٹس لئے بغیر صرف نظر نہیں کر سکتے۔

پاکستان کی افواج قاہرہ کے پہلے انگریز کمانڈر انچیف جنرل سر فرینک میسروی نے ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن لندن کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے اس رائے کا اظہار کیا کہ نسلی، مذہبی، معاشی اور جغرافیائی اعتبارات سے کشمیر پاکستان کا ایک حصہ ہے اور اگر وہاں آزادانہ استصواب رائے کرایا جائے تو وہاں کے باشندوں کی غالب اکثریت اپنے ملک کو پاکستان کے ساتھ شامل کرنے کے حق میں رائے دے گی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے صوبہ جموں کے جنوب مشرقی گوشے کو اپنی متذکرہ صدر رائے سے مستثنیٰ قرار دے کر تقسیم کشمیر کا شوشہ چھوڑ دیا۔ پاکستان کو جنرل میسروی کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ انھوں نے پاکستان کا حق نمک ادا کرتے وقت جموں کے جنوب مشرقی گوشے کو کشمیر سے الگ کر دینے کی ہانک لگا دی تاکہ تقسیم کشمیر کے حامیوں کے ہاتھ مضبوط ہو جائیں۔

صرف یہی نہیں بلکہ اس سے ایک دن پہلے بی بی سی پر ایک انگریز نے مسئلہ کشمیر پر تقریر نشر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ کشمیر کے ملک کو استصواب رائے عامہ کی خاطر پانچ حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ہر حصے سے جداگانہ طور پر دریافت کیا جائے کہ وہ کس ملک میں شامل ہونے کا خواہاں ہے۔

ہم ان شوشوں پر جو لندن کے فتنہ پسند حلقوں کی طرف سے چھوڑے جا رہے ہیں تشویش کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

(مغربی پاکستان لاہور)

وزارت کی جنگ زرگری

مغربی پاکستان کے تینوں صوبوں کی وزارتوں کے خلاف بڑی شدت سے ایجیٹیشن ہو رہا ہے۔ صوبہ سرحد کی وزارت کے متعلق "نئی روشنی" کی پچھلی اشاعت میں ہم ایک پاکستانی معاصر کا اقتباس پیش کر چکے ہیں اور اس مرتبہ بھی پیش نظر رہے ہیں۔ مغربی پنجاب کی وزارت کو پاکستان کے گورنر جنرل نے ہدایت کی تھی کہ میاں ممتاز دولتانہ اور ملک فیروز خاں کو کابینہ میں شامل کر کے اس کی بنیادوں کو مضبوط کرے۔ چنانچہ پچھلے دنوں مدوٹ وزارت مستعفی ہو گئی تھی اور خان ممدوٹ، دولتانہ صاحب اور نون صاحب سے گفت و شنید کر رہے تھے۔ مگر ایک دم سے انھوں نے نیا پینترا بدلا۔ لاہور کے پانچ اخبارنویسوں کے ایڈیٹروں کو اپنی شفاعت کے لئے ساتھ لے کر ہوائی جہاز سے کراچی پہنچے اور گورنر جنرل سے یہ حکم لے آئے کہ وہ نئی وزارت اپنی مرضی کے مطابق بنا سکتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے نئی وزارت کے ناموں کا اعلان کر دیا۔ یہ اس نے وزیروں میں صرف شیخ کرامت علی الگ کئے گئے

(بقیہ صفحہ ۶)

۳- باہر کی دنیا

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

چین کی خانہ جنگی اب تیزی سے خاتمہ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ اس سال کے ختم سے پہلے پہلے جیانگ کائی شک کی حکومت ختم ہو جائے گی جیانگ کائی شک کی فوج میں شکست خوردگی کے آثار پیدا ہو چکے ہیں، حوصلے چھوٹ چکے ہیں، کردار گر چکا ہے، عوام مایوس ہو چکے ہیں اور نظام کی کڑیاں قریب قریب ٹوٹ چکی ہیں۔ مارشل لا اور دوسری تعزیروں سے گرتی ہوئی دیواروں کو سہارا دیا جا رہا ہے، مگر کب تک ؟!

اب جنرل سمو کو میدانِ جنگ میں مات صاف دکھائی دے رہی ہے، اس لئے وہ میدانِ سیاست میں آ رہے ہیں۔ وہ بہت جلد یو، این، او میں یہ شکایت پیش کرنے والے ہیں کہ روس کمیونسٹوں کی فوجی امداد کر رہا ہے اور یہ بات چین اور روس کے معاہدہ ۱۹۴۵ء کے خلاف ہے جنرل سمو کو شاید امید ہے کہ اس طرح وہ شاید چین کی خانہ جنگی کو روس اور امریکہ کا مسئلہ بنانے میں کامیاب ہو جائیں۔ اگر یہ مسئلہ یو، این، او میں پیش ہوا تو ممکن ہے کہ روس اور امریکہ میں کچھ تلخی بڑھ جائے لیکن یہ لڑائی روس اور امریکہ کی لڑائی ہو جائے، اس کا بظاہر کوئی امکان نہیں۔

بہر حال چین کی اندرونی ابتری اور جنرل سمو کی فوج کی عام بے دلی کے پیش نظر اب باہری امداد، شاید بہت زیادہ کارگر ثابت نہیں ہو سکے گی۔ چیانگ کی فوجیں برابر پیچھے ہٹ رہی ہیں۔ منچوریا کی شکست کے بعد، کسی ایک جگہ بھی ان فوجوں نے ڈٹ کر مقابلہ نہیں کیا چنانچہ شمال کی طرف سے راجدھانی نانکنگ کمیونسٹ ۵۰ میل کے فاصلے پر رہ گئے ہیں سوچاؤ کے متعلق متضاد خبریں آ رہی ہیں، کمیونسٹ ریڈیو کا بیان ہے کہ اس پر ان کا قبضہ ہو چکا ہے اور چینی حکومت کے محکمہ اطلاعات کے ڈائریکٹر ڈاکٹر ہینگٹن ٹونگ نے اس کی تردید کی ہے، انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ نانکنگ کو فی الحال خالی کرنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں ہے" سوچاؤ پر واقعی کمیونسٹوں کا قبضہ ہو گیا ہے، تو نانکنگ پو ایک ایسا مقام رہ جائے گا جو نیشنلسٹ فوجوں کے ہاتھ میں ہے اور جہاں سے راجدھانی محض ۱۵۰ میل کے فاصلے پر ہے "تازہ خبر یہ ہے کہ ۸۰ ہزار کمیونسٹ فوج جنرل لو ہنگ کی سرکردگی میں نینگ پو کی طرف بڑھ رہی ہے اور ہونان کی سرحد تک جنگ دراصل ہونائی تک پہنچ گئی ہے۔ اس وقت سوچاؤ کے مشرق میں گھمسان کی جنگ ہو رہی ہے، اور امید ہے کہ اس جنگ کے نتائج دور رس ہوں گے۔

ہنوز روز اوّل

فلسطین کا مسئلہ مہینوں سے یو، این او میں پیش ہے مگر اب تک حل نہیں ہو سکا ہے اس درمیان میں بارہا عارضی طور پر

لڑائی بند ہوئی مگر عرب اور یہودی دونوں ایک دوسرے پر لڑائی جاری رکھنے کا الزام لگاتے رہے۔ متعدد تجویزیں پیش ہوئیں مگر دونوں نے یا دونوں میں سے کسی ایک نے نامنظور کر دیں۔ لڑائی پھر جاری ہو گئی۔

اب تک لڑائی میں یہودیوں کا پلہ بھاری رہا ہے۔ طاقت، تنظیم، جنگی چالیں، منصوبہ بندی، غرض ہر لحاظ سے نقیب اور بیر شعبہ عربوں کے ہاتھ سے نکل چکے ہیں اور فلسطین کے عرب حصے کا صدر مقام غازا اس وقت خطرے میں ہے۔ اگرچہ عرب بڑے جوش و خروش کا اظہار کر رہے ہیں مگر بدقسمتی سے ان کی اندرونی حالت قابلِ اطمینان نہیں ہے جن عرب ریاستوں نے فلسطین کے مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ ان میں یک جہتی اور اتحاد مفقود ہے۔ ان میں صرف نقطۂ نظر ہی کا اختلاف نہیں ہے بلکہ مقصد اور نصب العین میں بھی اختلاف ہے یہی وجہ ہے کہ اب تک نہ تو فوجی کارروائیوں میں کامیابی ہوئی اور نہ سیاسی کوششوں میں۔ اور ان پر فلسطین کے مہاجرین کا ایک ایسا بوجھ آن پڑا ہے جسے وہ تنہا نہیں اٹھا سکتیں۔ اس کو حل کرنے کے لئے بین اقوامی اعانت اور تعاون کی ضرورت ہے اور اب تک اس اعانت اور اشتراک کے حاصل کرنے میں عرب ناکام رہے ہیں، لوگوں کا خیال تھا کہ امریکہ کے صدارتی انتخاب کے بعد فلسطین کے بارے میں اس کے طرزِ عمل میں تبدیلی ہوگی اور شاید اس وقت یو، این، او اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے کوئی فیصلہ کن قدم اٹھائے مگر ابھی تک اس کے آثار نظر نہیں آتے

۱۶ر نومبر کو حفاظتی کونسل نے یہودیوں اور عربوں دونوں کو مستقل صلح کی گفتگو کرنے کا حکم دیا ہے۔ عرب ممالک مصر شام اور لبنان نے یہودیوں سے کسی قسم کی گفتگو کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ لبنانی ڈیلی گیٹ کے الفاظ میں وہ اس وقت تک کسی تجویز پر عمل نہیں کر سکتے۔ جب تک یہودی صلح نامہ کی پوری طرح تعمیل نہ کریں اور عارضی مصالحت کے زمانے میں انھوں نے جو جگہیں حاصل کر لی ہیں ان سے اپنی فوجیں ہٹا کر ابتدائی محاذوں پر واپس نہ لے جائیں۔ عرب نمائندوں نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ ہر اس تجویز کی مخالفت کریں گے جس میں کسی صورت میں بھی فلسطین کو تقسیم کیا جائے گا اور یو، این، او کے کسی حکم کو اس وقت تک تسلیم نہ کریں گے جب تک وہ فلسطین کی اکثریت کی رائے کو ملحوظ نہیں رکھے گا۔ دیکھئے حفاظتی کونسل کے اس حکم کا بھی وہی حشر ہوتا ہے جو اب تک ہوتا رہا ہے یا وہ دونوں حریفوں سے اس کی تعمیل کراتی ہے۔
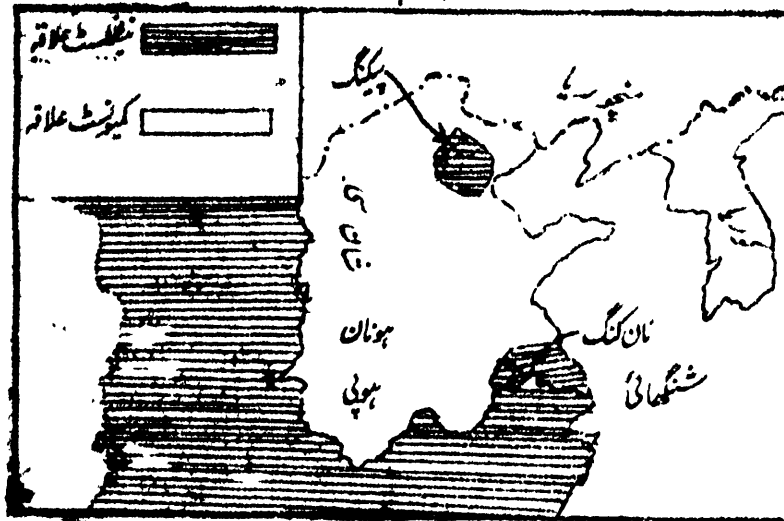
اس سے بھی کچھ نہ ہوا

۲۲ر اکتوبر کو یو، این، او کی سیاسی کمیٹی میں، میکسیکو کا ایک ریزولیوشن پاس ہوا تھا، جس میں بڑی طاقتوں سے اپنے اختلافات دور کرنے کی اپیل کی گئی تھی، اس کمیٹی میں روس بھی شریک تھا۔ اس کے بعد یو، این، او کے سکریٹری جنرل موسیو ٹرگوی لی اور پریذیڈنٹ ڈاکٹر ایوٹ کی مشترکہ اپیل شائع ہوئی جس میں برلن کے تعطل کو دور کرنے کے لئے از سرِ نو کوشش کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ روس نے ملاقات اور گفتگو کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کی شروع سے یہی خواہش ہے۔ چنانچہ اسی کے پیش نظر اس نے برلن اور اس کے ساتھ پوٹسڈم کے فیصلے کے مطابق جرمنی کے تمام مسائل پر بحث و گفتگو کے لئے وزرائے خارجہ کی میٹنگ کی تجویز کی تھی، لیکن روس جس طرح ان مسائل کو حل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے مغربی طاقتیں تیار نہیں ہیں، چنانچہ برطانیہ، امریکہ اور فرانس نے اب اپنے جواب بھیج دئے ہیں، اور تینوں نے تقریباً ایک ہی سی بات کہی ہے ان کا کہنا ہے کہ اس پیچیدہ مسئلہ کا بہترین حل یہ ہے کہ اسے حفاظتی کونسل پر چھوڑ دیا جائے" گویا اس طرح پانچ مہینے سے جو مسئلہ الجھا ہوا ہے اور حل ہونے میں نہیں آتا اس کی ذمہ داری حفاظتی کونسل پر آ گئی ہے دراصل مغربی طاقتیں اب تک اسی پر اڑی ہوئی ہیں کہ برلن کی ناکہ بندی ہٹانے کے بغیر مزید گفتگو نہیں ہو سکتی۔

پاکستان (بہ سلسلہ صفحہ ۵)

اور سب موجود ہیں، نئے وزیروں میں ایک چودھری فضل الٰہی ہیں اور دوسرے شیخ محمد حسن۔ شیخ محمد حسن جرمانے کی رقم ادا کرنے کے بعد چارج لے سکیں گے۔ ملک فیروز خاں نون نے اپنے تازہ بیان میں ممدوٹ صاحب کی بدعہدی کی شکایت کی ہے اور میاں دولتانہ نے پوری وزارت پر بدعہدی کے علاوہ نالائقی، بے اصولی اور کمزوری کے الزامات بھی لگائے ہیں۔ خان ممدوٹ ان کے جواب میں کہتے ہیں کہ یہ دونوں کیبنٹ میں اس کے اندر پھوٹ ڈالنے کی نیت سے شریک ہونا چاہتے تھے مگر ان کی یہ چال نہیں چل سکی غرض اس بحث نے بہت بھونڈی اور رکیک شکل اختیار کر لی ہے۔

حسینؑ
(سیّد الشہدا)

روش صدیقی

حجت الحق و شہید الشہدا ہست حسینؑ
مظہرِ عظمتِ آیات خدا ہست حسینؑ

جاں بہ معبود ہ سپردہ بہ سجودِ معبود
یعنی زندہ کنِ آئینِ وفا ہست حسینؑ

ذاتِ او، شاہد و مشہود و شہید یزداں
قبلہ و قبلہ گر و قبلہ نما ہست حسینؑ

اہرمن، کشتہ شد از ضربِ اِلّا اللہ اش
تو مپندار کہ مقتولِ جفا ہست حسینؑ

مشہدِ عشق بہ تسلیم و رضائش نازد
بالیقیں کعبۂ تسلیم و رضا ہست حسینؑ

اہل بیداد و جفا را، بہ دُعا یاد کنند
وارثِ اسوۂ محبوب خدا ہست حسینؑ

جز خدا، ہیچ نخواہد، بہ رہِ عشق خدا
بخدا، خاصۂ خاصانِ خدا ہست حسینؑ

عرش پرسید قرار دل کونین کجاست
کربلا گفت کہ "مصرفِ دعا ہست حسینؑ"

اے ملول شب عاشورہ بروں شو ز حجاب
پاک کن چشم کہ خود صبح بقا ہست حسین

برترم از فلک انجم و خورشید، رَوِش ؛ مسند آرائے حریم دل ما ہست حسینؑ

غزل

اثر لکھنوی

کیا زمانہ تھا کہ جب تم مجھ کو مضطر دیکھتے
تم کو رحم آتا، ضرور آتا، اگر پرسش کے بعد
ہوش میں کیا آئے وہ دیوانہ تم جس سے کہو
تیرے سجدے میں جو ہوتا کچھ بھی اے زاہد خلوص
دیکھنے والوں سے کہہ دو، دیکھنا آتا اگر
یاد ایامِ جنوں کا نام تھا ذوقِ خبر
اُن کے آنے کی بندھی تھی آس جب تک ہم نشیں
ہائے اُن کی شوخیاں اور شوق کی رسوائیاں

زیرِ لب کچھ کہتے چپ رہتے مکرر دیکھتے
شوق کی بے دست و پائی کا بھی منظر دیکھتے
"اب تو دل کڑھتا ہے تم کو خاک بر سر دیکھتے"
تم کو جھک جھک کر در و محراب و منبر دیکھتے
منظرِ ہستی سے بالا ایک منظر دیکھتے
ذرے ذرے میں ترا پیغام مضمر دیکھتے
صبح ہو جاتی تھی اکثر جانبِ در دیکھتے
دیکھتے تھے وہ ہمیں ہم ان کو کیونکر دیکھتے

اب دلِ مشتاق کو ان سے یہ شکوہ ہے اثرؔ
جب ادھر دیکھا ہم، تھا تو آنکھ بھر کر دیکھتے

غزل

مولانا حسرت موہانی

اس شوخ کو رسوا نہ کیا ہے نہ کریں گے
ہم نے کبھی ایسا نہ کیا ہے نہ کریں گے

محفوظ یہ ہے راز ترے لطفِ ستم کا
اغیار میں چرچا نہ کیا ہے نہ کریں گے

بولے تو یہ بولے وہ تقاضائے کرم پر
یوں ہی سہی اچھا، نہ کیا ہے نہ کریں گے

نسبت ہے تعارف کی جو اُن سے وہ رہے گی
تخصیص کا دعوےٰ نہ کیا ہے نہ کریں گے

اغیار کے قابو میں بھی یہ قول ہے اُن کا
[illegible] نہ کریں گے

اب تو جاپان کی جان چھوڑو

ترجمہ مشتاق احمد

امریکہ کی فوج اس وقت جاپان کے آٹھ کروڑ باشندوں کی قسمت کی مالک ہے۔ ایک ایسی قوم کی قسمت کی مالک جو انتہائی محنتی، کفایت شعار، اپنے لیڈر کے حکم کو آنکھ بند کرکے ماننے والی اور جس کے قبضے میں اس وقت روس کو چھوڑ کر ایشیا کے سب سے بڑے صنعتی کارخانے ہیں جہاں جاپان کی ایک نمائندہ حکومت قائم ہے اور پچھلی جنگ کے زخم تیزی سے بھر رہے ہیں۔

جاپانیوں کی ان خوبیوں کے علاوہ خود ان کا دیس اپنی جغرافیائی حیثیت کے لحاظ سے جنگی مقاصد کے لئے نہایت ہی اہم ہے۔ یورپ میں جو حیثیت انگلستان کی ہے وہی حیثیت ایشیا میں جاپان کی ہے، انگلستان نے اپنی اسی جغرافیائی حیثیت سے فائدہ اٹھا کر یورپ کی پچھلی لڑائی میں کامیابی حاصل کی اور جرمنی کو شکست دی۔ اسی طرح اگر خدا نخواستہ چین مع منچوریا دشمن کی جھولی میں جا پہنچا، اور ہمیں جاپان سے بھاگنا پڑا تو جاپان کا جزیرہ ہمارے لئے ناگزیر ہو جائے گا اسی کو اپنی بری اور بحری فوجوں اور سمندری بیڑوں کا ٹھکانا بنا کر ہم پوربی ایشیا کے ملکوں کے خلاف جو سب کے سب "ہنسیے اور ہتھوڑے" کے اثر میں ہیں، ہم فوجی کارروائیاں کرسکیں گے۔ امریکی فوجوں نے اس وقت تک کئی بڑے ہوائی اڈے بھی بنا لئے ہیں، جہاں بڑے بڑے بم بار جہاز اتر سکتے ہیں اور کافی مقدار میں جنگی سامان بھی جمع کر لیا ہے۔

جو طاقت بھی جاپان کی قسمت کی مالک ہوگی، اس میں کچھ زیادہ مبالغہ نہیں کہ وہ راتوں رات لاکھوں سیکھے ہوئے آدمیوں کی ایک فوج کھڑی کرسکتی ہے۔ یہ جاپانی افواج کے وہ آدمی ہوں گے جنھیں امریکی قبضہ آور افواج نے نہتا کر دیا ہے۔ ان تمام لوگوں کی فہرست مع نام اور پتہ ٹوکیو میں موجود ہے۔

جاپان کے ملک کی اہمیت اور جاپانیوں کے ان گنوں کا روسیوں کو پورا پورا علم اور احساس ہے۔ اسی لئے جاپانیوں کو اپنے ساتھ ملانے اور انھیں جیتنے کے لئے روسیوں نے ان تھک پروپگنڈا شروع کر دیا ہے۔

روسی اس حقیقت سے خوب واقف ہیں کہ جاپانیوں کو، جنھیں صدیوں سے یہ تعلیم ملتی رہی ہے کہ آنکھیں بند کرکے حکم کی پابندی کرو، امریکہ کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے جاپان پر قبضہ کرانے کے لئے انھوں نے اسی طرح کا سخت پروپگنڈا شروع کر دیا ہے، جیسا کہ چیکوسلوواکیہ، بلغاریہ، رومانیہ اور پولینڈ پر قبضہ کرنے سے پہلے انھوں نے شروع کیا تھا۔ سارے دن طاقت ور روسی ریڈیو امریکنوں کی برائیاں اور کمزوریاں نشر کرتے رہتے ہیں، اور اسی طرح جاپانیوں کے کان بھرتے رہتے ہیں۔ کوئی امریکن پروگرام ایسا نہیں ہوتا جس کی روسی فوراً کاٹ نہ کرتے ہوں۔ جاپان کی کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر "سان زو نازاکا" ہیں ایک پولیٹیکل ایجنٹ کی حیثیت سے روس کے اسکولوں میں ان کی بڑھیا تعلیم و تربیت ہوئی ہے۔ ہر مہینہ اسی خطۂ مردم خیز سے پچاسوں جاپانی تربیت یافتہ ایجنٹ جاپان پہنچتے رہتے ہیں، جہاں سان زو نازاکا ان کا سواگت کرتے ہیں، اور پھر انھیں اسی کام پر لگا دیتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ ماہرین فن پروپگنڈہ اور مزدور لیڈر تیار کریں۔

اس وقت جو جاپان کی سب سے بڑی مزدور سبھا ہے اس کے ممبروں کی تعداد پندرہ لاکھ ہے۔ یہ سبھا کمیونسٹ پارٹی کے اثر میں ہے۔

افواہ باز اور پمفلٹ باز دن رات اس دقیانوسی

> جو طاقت بھی جاپان کی قسمت کی مالک ہوگی وہی مشرق بعید کے ملکوں پر قبضہ رکھ سکتی ہے۔ ہمارے قبضے کے مضر اثرات سے فائدہ اٹھا کر روسی، جاپان میں اپنا قدم جما رہے ہیں، اگر ہم جاپان کو اپنے ہاتھ رکھنا چاہتے ہیں تو اسے فوراً خالی کرکے جاپانیوں کو پھلنے پھولنے کا موقع دیں، تاکہ جاپان سے معاشی بدحالی دور ہو۔ کمیونزم کے پھیلاؤ کو روکنے کا بس یہی ایک موثر طریقہ ہے۔

قصے کو دہراتے رہتے ہیں کہ امریکنوں نے جرمنی کے خلاف ایٹم بم صرف اس لئے استعمال نہیں کیا کہ وہ انھی کے بھائی بند سفید اقوام کے لوگ تھے۔ اور جاپان کے سر پر صرف اسی لئے یہ پہاڑ توڑا کہ انھیں "زرد قوم" کو فنا کرنا مقصود تھا۔ جاپانیوں پر جو روئے زمین پر سب سے زیادہ قومی حس رکھنے والے لوگ ہیں، آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس پروپگنڈے کا کیا اثر پڑ رہا ہوگا۔

روسیوں کے برخلاف امریکنوں کے حق میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جن سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے مثلاً امریکن قبضے کے ابتدائی زمانے میں کمیونسٹوں نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ شہنشاہِ جاپان کو پھانسی دے دی جائے۔ یہ ان کی ایک بڑی سیاسی بھول تھی۔ جاپانیوں نے اس مطالبے کے خلاف سخت احتجاج کیا تھا۔ جاپانیوں کے دلوں میں اس حقیقت نے بھی کانٹے بو رکھے ہیں کہ روسیوں ہی کے بغلی گھونسے نے انھیں ترقی کے آسمان سے تنزل کی زمین پر لا پٹخا ہے اگرچہ مک آرتھر کی روشن خیالی اور ان کے حسنِ انتظام نے بہت سے جاپانیوں کا دل موہ لیا ہے، اور ان کی ہمدردیاں امریکہ کے ساتھ ہو گئی ہیں۔

> فاضل مضمون نگار [illegible] جاپان امریکن چیمبر آف کامرس کے صدر ہیں۔ پچھلی جنگ میں مختلف حیثیتوں میں انھوں نے جاپان میں کام کیا ہے۔ جاپانی زبان پر انھیں دسترس حاصل ہے۔ اس طرح جاپانیوں اور اونچے امریکی افسروں سے ملنے جلنے اور ان کے رجحانات کو سمجھنے کا انھیں بہت زیادہ موقع ملا ہے۔

لیکن امریکہ ان حقیقتوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکا ہے انھی سب باتوں کو دیکھتے ہوئے، حالات کو سب سے زیادہ سمجھنے والے شخص جنرل مک آرتھر نے ایک برس ہوئے اعلان کیا تھا کہ جاپان پر قبضہ کا مقصد پورا ہو چکا ہے اس لئے اب جاپان کے ساتھ ہمیں فوراً سمجھوتہ کر لینا چاہئے وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم بوریا بستر باندھ کر جاپان سے چل دیں۔ لیکن سب سے زیادہ جان کار شخص کے اس اعلان کے باوجود ہمارا قبضہ بدستور جاری ہے۔ اس کی قیمت آپ کو معلوم ہے ہم کیا ادا کر رہے ہیں؟ ساڑھے سینتیس لاکھ روپے (۳۷۵۰۰۰۰ روپے) روزانہ! اور اس پر ستم یہ کہ اتنی زیادہ قیمت ادا کرنے کے باوجود ابھی جاپان میں وہ فضا قائم ہے جس میں کمیونزم کو سب سے زیادہ فروغ ہوتا ہے یعنی معاشی بدحالی اور حکمراں طاقت کی مخالفت!

جاپان بس ایک بھک منگوں کا دیس بن کر رہ گیا ہے اس کی زندگی کا سارا دارومدار اس خیرات پر ہے جو امریکہ سے اس کو ملتی ہے۔ سرکاری افسروں کی فوج کی فوج جاپانیوں کی سیاسی اور معاشی زندگی میں قدم قدم پر ٹانگ اڑانے کے لئے موجود ہے۔ ملک کا سارا نظام کنٹرول کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔ جاپان اس وقت ایسے ایسے کنٹرول اور معاشی تجربوں کا تختۂ مشق بنا ہوا ہے جن کے نام ہم نے امریکہ میں سنے بھی نہیں۔ یہی طرح طرح کے کنٹرول جاپانیوں کی معاشی ترقی میں سنگ راہ ہیں اور انھیں کسی طرح پنپنے نہیں دے رہے ہیں۔

ان تمام امریکی تاجروں کا جو اس وقت جاپان میں بیوپار کر رہے ہیں یہ متفقہ خیال ہے کہ ایک مضبوط اور دولت مند جاپان ہی کمیونزم کے پھیلاؤ کے خلاف بہترین ضمانت ہو سکتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر جاپان کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ بہت جلد اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے گا۔ شاید چند سال تک امریکہ کو جاپانیوں کی کھانے پینے کی چیزوں سے مدد کرنی پڑے۔ لیکن جاپان کچھ ہی عرصے میں صرف اپنی بیرونی تجارت کے نفع سے یہ قرضہ مع سود ادا کر دے گا۔

وہ لوگ جو اس بات سے خوف کھاتے ہیں کہ ایک مضبوط اور ترقی یافتہ جاپان امریکہ کے لئے خطرہ بن جائے گا انھیں یہ آسان اور سیدھی سادھی سی حقیقت سمجھ لینی چاہئے کہ اس زمانے میں کوئی قوم جنگ نہیں کرسکتی جب تک کہ اس کے پاس لوہا اور تیل نہ ہو، اور جاپان کے پاس ان دونوں میں سے ایک بھی نہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ جاپان کو سول ضرور توں

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

زبان کی بساط پر ایک چال

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

ہم اُردو رسم الخط نہیں چاہتے!

اردو والوں کے لئے یہ ایک نادر موقع ہے کہ وہ اپنے رسم الخط کی بازی لگا کر زبان کا میدان جیت لیں مجلس قانون ساز کے اُن تمام ممبروں کو جو اردو یا ہندوستانی کی ترقی یافتہ شکل سے دلچسپی رکھتے ہیں، چاہیے کہ منسٹر لسانی زبان کے ریزولیوشن میں اردو رسم الخط کی بجائے رومن کی پرزور سفارش کریں۔ ہندی والے شوق سے دیوناگری رکھیں۔ ہندیونین کی اُردو کے لئے رومن رسم الخط ہی پاس ہونا چاہیئے۔

بعض لوگ شاید اسے نعرۂ مستانہ سمجھیں لیکن یہ بساط زبان پر "دو سپ دہ دلآرام دہ" والی چال ہے۔ یہ ایک کھلی چال ہے، اس لئے ہندی والے بھی اسے مشتبہ نظروں سے نہیں دیکھیں گے۔ اس کا مقصد کسی خاص زبان کو بچانا مقصود نہیں بلکہ جن ترقی پسند لسانی رجحانات کی اردو زبان نمایندگی کرتی ہے۔ وہ صرف رومن رسم الخط اختیار کرنے ہی سے محفوظ کئے جا سکتے ہیں، دوسرے الفاظ میں ہندوستانی کے صحیح مفہوم کی ضمانت اسی طور پر ہو سکتی ہے، اور صرف اسی طرح ہم اپنی عام فہم زبان کو سنسکرتیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے بچا سکتے ہیں۔ نہ صرف سنسکرت، فارسی اور عربی کی دست اندازیوں کا بھی یہی واحد علاج ہے ہمیں یقین ہے رومن رسم الخط کی تائید جنوبی ہند سے بھی ہوگی، شاید اس طرح ہم وہ کام کر سکیں جس کا تصور ابھی پاؤ صدی تک پاکستان میں پیدا نہ ہوگا۔

ہندیونین کی اردو کے لئے رومن اختیار کر لینے میں کئی فائدے متصور ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ آپ غیر ترقی پسند لسانی رجحانات کا مقابلہ ڈٹ کر کر سکیں گے "رومن ہندوستانی" کی حیثیت نہ صرف ہندوستان بلکہ ممالک بیرونجات میں بہت بلند ہو جائے گی۔ اس کے فی الفور اختیار کرنے میں چنداں دقت بھی نہیں اُٹھانا پڑے گی ہماری موجودہ تعلیم یافتہ نسل رومن سے بخوبی واقف ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں جو اردو رسم الخط سے تو واقف ہیں اور رومن سے بالکل ناواقف۔ اس میں شک نہیں کہ آنے والی ایک اور نسل کو دونوں رسم الخطوں کا بار اُٹھانا پڑے گا لیکن چونکہ ہندوستان کی تعلیمی حالت ابھی خشت اول کے مدارج میں ہے کر اس لئے اس مشکل کو بھی آسان بنایا جا سکتا ہے۔

موجودہ اردو رسم الخط میں ادبی اور علمی سرمایہ اتنا زیادہ نہیں کہ اسے رومن میں منتقل کرنے کے لئے لامحدود ذرائع اور وسائل کی ضرورت پڑے۔ اردو زبان کی منتخب اور چیدہ کتب کو بآسانی رومن میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ رومن اختیار کرنے کے بعد طباعت اور اشاعت ٹائپ اور پریس کی غیر معمولی سہولتیں ہاتھ آ جائیں گی۔ جن کی موجودگی میں تبدیلی قالب کا یہ عمل بہت آسان ہو جاتا ہے۔ کتب کے روپ رنگ میں جو انقلاب پیدا ہوگا وہ علیحدہ۔ تعلیم کو عام کرنے کی جو سہولتیں پیدا ہو جائیں گی سو مزید۔

رومن کے راستے سے یورپی زبانوں کی علمی و سائنٹفک اصطلاحات کو بھی خوبی سے اپنایا جا سکے گا۔ یہ ایک قطعی امر ہے کہ ہندوستان انگریزی سے اپنا پیچھا بھی عرصے تک نہیں چھڑا سکے گا۔ شاید اعلیٰ تعلیم کے لئے اس کی ضرورت ہمیشہ محسوس ہو۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ رومن کے ذریعے ہمارا وقار علمی دنیا میں بھی بڑھ جائے گا۔

جس طرح بساطِ شطرنج پر کھلاڑی محض دو اور خلاف کرنے والے زیادہ جمع ہو جاتے ہیں۔ مجھے رہ رہ کر یہ گمان پیدا ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو لسانیاتی مسائل پر بھی دماغ سے زیادہ دل سے سوچنے کے عادی ہیں۔ اس تحریر پر جز بز ہوں گے میں اُن کے جذبات کا احترام کرتا ہوں اس لئے کہ کسی تمدنی مسئلے میں محض سائنٹفک ہونا بھی غضب ہے لیکن انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہم ایک انقلابی دور سے گذر رہے ہیں۔ اس وقت اُردو کیا عام فہم ہندوستانی کی بقا کا سوال ہے۔ پھر یہ کہ ایک انقلاب کا مقابلہ دوسرے انقلاب ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

بساطِ زبان پر ذرا غور تو کیجئے کہ آپ اپنے رسم الخط کے مُہرے کو پٹوا کر کیا کچھ بچا سکتے ہیں؟ درحقیقت مات بچا سکتے ہیں۔ اگر اردو والے اصلاح شدہ (اصلاح شدہ اس لئے کہ اس کو اپنے گُوں کا بتلانے کے لئے کچھ تبدیلیاں اور اضافے کرنا ضروری ہیں) رومن کو اپنا لیں تو صورتِ حال یہ ہوگی کہ اردو والوں کی تحریر کو وہ بڑا طبقہ بھی شوق سے پڑھے گا جو اردو رسم الخط سے بالکل ناواقف ہے لیکن رومن بخوبی جانتا ہے۔ اسی طرح آپ کی زبان کا دائرہ خود بخود وسیع ہو جاتا ہے۔ اس میں جنوبی ہند کے باشندے خاص طور پر آ جاتے ہیں۔ پاکستان والے شاید ابھی عرصے تک اپنے رسم الخط پر اڑے رہیں۔ لیکن وہاں بھی رومن رسم الخط سے واقف لوگوں کا ایک بہت بڑا طبقہ موجود ہے۔ ہنگامی اور اردو کی چپقلش کا منطقی نتیجہ بھی شاید رومن رسم الخط ہی کی شکل میں نکلے۔

ہندیونین میں دیوناگری کے مقابلے میں اس وقت اردو رسم الخط کس مپرسی کے عالم میں ہے۔ لیکن اردو رومن کا چولا اختیار کرکے ایک نئی توانائی حاصل کرے گی۔ اس وقت یہ دنیا والوں کے سامنے ہندوستان کی سب سے بڑی ترقی پسند زبان ہوگی۔ اندھی جذباتیت کے تحت شاید دیوناگری کے پجاری عرصے تک رومن کی اہمیت کو نہ پہچانیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ہندیونین کے اردو والوں نے اگر اس رسم الخط کو اختیار کر لیا تو وہ یہاں کی زبانوں کو ضرور متاثر کریں گے۔ ہندی کے لئے نہیں تو کم از کم اس ملک کی دوسری زبانوں کے لئے وہ یقیناً مشعل بردار بن جائیں گے۔

میری اس تجویز کا محرک نہ تو کسی قسم کا "بغض" ہے اور نہ "شان دار پسپائی" کا جذبہ۔ بساط زبان کی یہ کھلی چال تھی جو میں نے بیان کر دی جو "گنبھیر" ہیں وہ اسے گنبھیر معنی پہنانے کی کوشش نہ کریں اس سے کسی خاص فرقے یا مخصوص زبان کا مفاد مقصود نہیں۔ اگر کسی کو مات دینا پیش نظر ہے تو وہ غیر صحت مند لسانی رجحانات ہیں جو آج زبان کے ساگر کو متھ رہے ہیں جن کی مخالفت چاروں طرف سے ہو رہی ہے۔ ہمارا تو ایمان ہے کہ اردو ہو موجودہ روپ قائم رہ جائے گا تو ہندوستانی زبان کا صحیح کینڈا ابھی بن سکے گا۔ ہندوستانی اگر رومن اختیار کرے گی تو اس کی فرہنگ کا مسئلہ بھی طے ہو جائے گا اور اس طرح زبان کی گتھی تھوڑے عرصے کے اندر خود بخود سلجھ جائے گی۔

اب تو جاپان کی جان چھوڑ دو (بسلسلہ صفحہ ۸)

کے لئے بھی ہوائی جہاز کی آسانیوں سے محروم کر دیا ہے! بس مٹھی بھر بندرگاہ کے انسپکٹر اور جاپان کے مال کی رکھوالی کرنے کے لئے ہمارے چند جہاز اس بات کی کافی ضمانت ہو سکتے ہیں کہ جاپان امن کے لئے خطرہ کا باعث نہیں ہوگا۔

ان حالات میں اگر ہم چاہتے ہیں کہ جاپان کمیونزم کے پودے کے لئے جس کی جڑیں ابھی نازک اور کمزور ہیں زمیں شور بن جائے تو بس ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ پٹرل مک آرتھر کے خیال کے مطابق ہمیں جاپان کو فوراً آزاد کر دینا چاہیئے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ وہاں تھوڑی سی فوج محض یہ دیکھنے کے لئے چھوڑ دی جائے کہ جاپان جنگ کی تیاریاں تو نہیں کر رہا ہے جو لوگ اس پالیسی کی مخالفت صرف اس خیال سے کرتے ہیں کہ ہماری فوجیں ہٹ گئیں تو روسی فوجوں کو جاپان تک پہنچنے کی سپاٹ سڑک مل جائے گی۔ ان سے میرا کہنا صرف یہ ہے کہ اس وقت ہماری جتنی فوجیں جاپان میں موجود ہیں وہ روس کے کسی سخت حملے کو تو روک ہی نہیں سکتیں! ہاں بس اتنی خرابی اور ہوگی کہ وہاں جو اس وقت ۲۰ ہزار امریکن بچے اور عورتیں ہیں ان کی جان کے بھی لالے پڑ جائیں گے۔

ہم نے جاپان کو ایک جمہوری قانون دے دیا ہے، اور اس قانون کے اندر رہ کر ترقی کرنے کے مواقع بھی بہم پہنچا دئے ہیں۔ بس اتنا کافی ہے۔ اب جاپان کے سر سے دست شفقت اُٹھا لینا ہی جاپان پر احسان ہوگا۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم جاپانیوں کو اس کا موقع دیں کہ وہ اس قانون کے ڈھانچے کے اندر رہ کر اپنی قسمت خود بنائیں۔ ان کی کوششوں کا جو کچھ بھی نتیجہ نکلے گا، چونکہ وہ ان کی اپنی کوششوں کا نتیجہ ہوگا۔ اس لئے اسے دوام ہوگا۔

دیہی اور گھریلو صنعتیں

پروفیسر محمد عاقل

۴۔ اکھل بھارتیہ گرام ادیوگ سنگھ

نئی روشنی کی پچھلی اشاعت میں ہم نے چرخہ اور کھادی کی صنعت اور اکھل بھارتیہ چرخہ سنگھ کے بارے میں کچھ باتیں بیان کی تھیں۔ اس اشاعت میں ہم ایک اور غیر سرکاری ادارے یعنی گرام ادیوگ سنگھ کے بارے میں کچھ حالات پیش کریں گے۔ اس ادارے کو بھی گاندھی جی کی رہنمائی حاصل تھی اور یہ بھی کانگریسی خیال کے لوگ چلا رہے ہیں۔

کھادی کی ترقی کو گاندھی جی دیہات سدھار کی قومی تحریک کا ایک لازمی حصہ سمجھتے تھے۔ اس کے ذریعے وہ گاؤں کو یہ سکھانا چاہتے تھے کہ وہ اپنی مدد آپ کریں، اپنی ذات پر بھروسہ کریں، محنت کی عظمت کو پہچانیں اور سادہ اور ایماندارانہ زندگی کی قدر کریں۔ ان کی اسکیم میں چرخہ کی وہی جگہ ہے جو نظام شمسی میں سورج کی ہوتی ہے یعنی یہ کہ گاؤں کے سارے ہنر اور دھندے اسی کے گرد گھومتے ہیں۔ اسی بنا پر یہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ دستی چرخے کے جتنے لوازم ہیں انھیں دیہات ہی کے اندر فراہم کیا جائے اور اس سے متعلق جتنے بھی کام ہیں ان سب کو گاؤں کے اندر ہی کیا جائے تاکہ وہاں روزگار کو بڑھایا جا سکے لیکن چرخے کے علاوہ دوسری صنعتوں کو بھی اگر کسی علاقے کے مقامی حالات کے لئے موزوں ہوں ترقی دینی چاہئے۔ اس مقصد کو سامنے رکھ کر کانگریس نے ۱۹۳۴ء میں گاندھی جی کی مرکزی سرپرستی کے علاوہ ملک کی مختلف مرتبہ اور قریب المرگ صنعتوں کو دوبارہ زندگی دینے اور گرام سدھار کو ترقی دینے کے لئے اکھل بھارتیہ گرام ادیوگ سنگھ کو قائم کیا۔

اس سنگھ نے اپنے لئے جو فوری پروگرام بنایا اس میں اس نے اپنی توجہ صرف ان صنعتوں تک محدود رکھا جن کا اثر آبادی کی بڑی تعداد کی روزمرہ کی زندگی پر پڑتا تھا اور لوگوں کی غذا کی اصلاح کے کام کو بھی اپنے مشاغل میں داخل کر لیا۔

گرام ادیوگ سنگھ کا مقصد یہ ہے کہ مقامی کچے مال سے کام لیا جائے اور مقامی ہنر اور محنت کی مدد سے کس طرح سستی بنی ہوئی چیزیں تیار کی جائیں۔ اس غرض کو پورا کرنے کے سلسلے میں جن صنعتوں کی حوصلہ افزائی کی گئی ان کے کام کے مختلف طریقوں کی جانچ کارکردگی اور لاگت میں کمی پیدا کرنے کے امکانات کا جانچنا بھی ضروری ہوا۔ اس تحقیقات سے سنگھ کو یہ موقع ملا کہ وہ آٹے اور ہاتھ سے کٹے ہوئے چاولوں کی پیداوار کو بڑھانے کے لئے پبلک کے سامنے آٹا پیسنے کی دستی چکی اور دھان کوٹنے کی ترقی یافتہ نمونے پیش کر سکے۔ اس نے تیل نکالنے کے لئے روایتی کولہو کی بنیاد پر بہتر سیل سے چلنے والی گھانی کو ترقی دینے کے لئے جو تحقیقات کی گئی وہ خاص طور پر مفید ثابت ہوئی۔ اس سے ایک طرف تو کارکردگی بڑھ گئی ہے اور دوسری طرف بیل پر زور بہت کم ہو گیا ہے۔ سنگھ شکر کی جگہ گڑ استعمال کرنے کی سفارش کرتی ہے اور سنگھ نے تاڑ کے رس سے جیب کہ اس میں خمیر نہ پیدا ہوا ہو گڑ بنانے کی کوشش کی ہے اور اس غرض کے لئے بمبئی، مدراس، متوسط اور بہار کے صوبوں میں تحقیقاتی مرکز اور نمائش گاہیں قائم کی ہیں۔

سنگھ نے جن اور دوسری صنعتوں کی طرف توجہ کی ہے وہ یہ ہیں: دیسی چیزوں سے صابن بنانا، شہد کی مکھی پالنا، چمڑہ کمانا اور رنگنا اور کاغذ بنانا۔ سنگھ اور کانگریس سے تعلق رکھنے والے دوسرے اداروں کی طرف سے دستی کاغذ کی مانگ بڑھ جانے کی وجہ سے کاغذ بنانے کی صنعت کو گھریلو صنعت کی حیثیت سے ترقی کرنے کا خاصا موقع مل گیا ہے جو مانگ بڑھی ہے اس کے جواب میں پیداوار کو بڑھانے اور بہتر کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ اس کے لئے وردھا میں اور بعد میں صوبوں کی امداد کی وجہ سے دوسرے صوبائی مقامات میں بھی تجربے اور تحقیقاتیں کی گئی ہیں۔ دوسری بڑی جنگ کے شروع ہونے اور اس کی وجہ سے باہر سے آنے والے کاغذ اور لبدی کی درآمد میں کمی ہو جانے کی وجہ سے دستی کاغذ کی مانگ اور زیادہ بڑھ گئی اور ملک کے مختلف حصوں میں دستی کاغذ اور اس کی قسم کو بہتر بنانے کے لئے کوششیں کی گئیں۔ مقامی کچے مال سے لبدی کے تیار کرنے کے لئے سنگھ نے قدرتی طاقت سے چلنے والی مشینوں کے استعمال کو بھی اس شرط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے کہ اس سے صنعت کے اندر روزگار میں اضافہ ہوتا ہو اور مشینوں پر یا تو سرکار کا قبضہ ہو یا کسی ایسے ادارے کا جو نفع نہ کماتا ہو۔

چمڑے کی صنعت کو پہلے صرف گاؤں میں چلایا جاتا تھا لیکن اب چند سال سے اس کام کو مرکزی طور پر کیا جانے لگا ہے۔ سنگھ کا مقصد یہ ہے کہ گاؤں کے علاقے میں رنگنے اور چمڑا تیار کرنے کے جو مرکز تھے ان کو دوبارہ زندہ کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کا بھی انتظام کیا جائے کہ چمڑے کی تیاری میں بہترین سائنس کے طریقے اختیار کئے جائیں۔

سنگھ کے سامنے نصب العین یہ ہے کہ دیہات سدھار کے لئے تیز خاص خاص صنعتوں کے لئے مثلاً دستی کاغذ سازی، تیل نکالنے یا شہد کی مکھی پالنے کے لئے ماہر کارکن تیار کئے جائیں۔ چرخہ سنگھ کا بھی ایک مرکزی ودیالیہ سیوا گرام میں ہے۔ ریفریشر کورسوں اور چھوٹی مدت کے تربیتی دستوں کا انتظام کیا جاتا ہے۔

۵۔ سری نکیتن (وشوا بھارتی)

شاعر ٹیگور نے بھی اپنے خاص رنگ میں دیہی اور گھریلو صنعتوں کی طرف توجہ کی۔ لیکن ان کا انداز گاندھی جی سے مختلف تھا۔ گاندھی جی کے دل پر گاؤں کی غریبی نے گہرا اثر ڈالا تھا۔ لیکن شاعر ٹیگور کے لئے گاؤں کی زندگی اور اس کے گرد و پیش کی بدصورتی اور بے کیفی ایک سوہان روح بنی ہوئی تھی۔ دیہات خوش حال ہوں یا خوب صورت اس قسم کا سوال اگر ان سے کیا جاتا تو انھیں خوب صورتی کو ترجیح دینے میں کبھی بھی تامل نہ ہوتا۔ گاؤں کو خوب صورت بنانے کے لئے وہ عالموں، شاعروں اور صناعوں سب کو مل کر کام کرنے کی دعوت دیتے تھے اور اس مقصد کے تحت انھوں نے ۱۹۲۱ء میں بولپور وشوا بھارتی کے ساتھ ساتھ ایک دیہات سدھار کا ادارہ "سری نکیتن" بھی قائم کیا۔

اس ادارے کے کاموں کو چھ عنوانوں کے ماتحت جمع کیا جا سکتا ہے یعنی

۱۔ زراعت

۲۔ صنعت

۳۔ فلاح دیہات

۴۔ امداد باہمی

۵۔ اسکاؤٹوں کی تنظیم

۶۔ تعلیم

زراعتی شعبے کے ساتھ ایک ڈیری بھی قائم کی گئی۔ اسی طرح ایک مرغی خانہ بھی قائم کیا گیا۔ صنعتوں کے سلسلہ میں طلبا کو بننے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ بننے والوں کو ڈزائنوں کو بہتر بنانے، ترقی یافتہ کرگھوں پر بننا اور امداد باہمی کے ذریعے کچے مال کو خریدنا اور پیداوار بیچنا سکھایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ چمڑے کا کام، بڑھئی کا کام، مٹی کے برتن بنانا، جلد سازی، سوزن کاری، درزی کا کام وغیرہ بھی سکھایا جاتا ہے، دیسی رنگوں کے بارے میں بھی تحقیقات کی گئی ہے۔

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

(بسلسلہ صفحہ ۲)

ان کی طبیعت کی افتاد ہی ایسی ہے، ہمارے لیڈر اسی کا احترام کریں گے۔ اپنے جائز مطالبات کو مضبوطی کے ساتھ پیش کرنا بالکل مناسب ہے۔ لیکن ان کو زبان کی تیزی اور درشتی سے آلودہ کرنا ان کی قوت میں اضافہ نہیں کرتا بلکہ ان کو کمزور کرتا ہے۔

ہندوستان کا کارواں آج کل خستہ اور پاشکستہ ہے۔ وہ بھی نہایت سخت آزمائشوں سے گذر رہا ہے۔ اس کی منزل بہت دور ہے جس نے بڑوں بڑوں کے ایمان اور قدموں کو ڈگمگا دیا ہے۔ جو لوگ ہمارے "میر کارواں" بننے کا حوصلہ رکھتے ہیں، انھیں نگاہ بلند کا عصا، سخن دل نواز کا جادو اور جان پرسوز کی کلیمی لے کر کارواں کی راہبری کرنی چاہئے۔

وکٹوریا والا

منہاج محمد خاں

معلوم نہیں آپ نے بمبئی شہر دیکھا ہے یا نہیں۔ اگر آپ نے بمبئی دیکھا ہے تو اس کی سیاہ چوڑی اور صاف ستھری سڑکیں بھی دیکھی ہوں گی جن کی پشت پر پڑا ہوئے لوہے کی دو متوازی پٹریاں پیر تسمہ پا کی طرح سوار رہتی ہیں اور چھت پر بجلی کے کھمبے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے صلیب کی میخیں ہوں، جنھیں سڑکوں کے سینے میں ٹھونک دیا گیا ہو۔ اور پھر جہاں آپ نے ان پر موٹروں، بسوں اور ٹراموں کو چلتے دیکھا ہوگا وہاں گھوڑا گاڑیاں دیکھی ہوں گی، جن کے پچھلے پہیئے بڑے ہوتے ہیں اور اگلے پہیئے چھوٹے جیسے چلتا پھرتا مصنوعی رتھ، یا نفیس قسم کی اونٹ گاڑیاں۔ لیکن ان کے آگے اونٹ نہیں بلکہ ایک بڑا سا گھوڑا جوتا جاتا ہے بمبئی میں اسے وکٹوریا کہتے ہیں۔ وکٹوریا ایک انگریزی ملکہ کا بھی نام تھا لیکن ہمیں یہاں صرف گاڑی سے مطلب ہے اور خاص طور پر اس کے چلانے والے سے، جس کی وردی خاکی ہوتی ہے، جو بغیر پھندنے کی ترکی ٹوپی لگاتا ہے، جس کا رنگ سیاہی مائل سرخ ہوتا ہے بمبئی کے سارے وکٹوریا والے یہی وردی پہنتے ہیں پہلے پہل جب میں نے ان کو دیکھا تو سمجھا کہ بمبئی کے سارے وکٹوریا والے مسلمان ہیں۔ حالانکہ یہ خلاف واقعہ تھا۔ آج میں اسی وکٹوریا والے کی کہانی سنانا چاہتا ہوں۔

یہ ۱۹۴۴ء کے پہلے ہفتہ کا واقعہ ہے صحیح تاریخ مجھے یاد نہیں۔ جنگ کا پانسہ پلٹ چکا تھا اور فاشسٹ قوتیں پسپا ہو رہی تھیں۔ بنگال کے ہولناک قحط کو بھی ایک سال ہو چکا تھا۔ لوگ جنگ اور کشت و خون، چیزوں کی گرانی اور اشیائے خوردنی کے راشن سے تنگ آچکے تھے، اور جلد ہی کسی ایسی صبح کے منتظر تھے، جب سورج کی پہلی کرن کے ساتھ امن کا اعلان ہو، اور لوگ محسوس کر سکیں کہ آج ایک نئی زندگی شروع ہوئی ہے، جب غلامی، مفلسی اور جنگ و جدال عہد پارینہ کی باتیں ہو جائیں۔ .... میں اس زمانے میں کاٹن ٹیکسٹائل کے جنگی محکمے کے دفتر میں کام کرتا تھا، ایک کوڈنگ کلرک کی حیثیت سے۔ دفتر بالکل ساحل کے قریب تھا۔ ساحل اور دفتر کے درمیان بندرگاہ کی دیوار حد فاصل کا کام کرتی تھی۔ عمارت کی دوسری منزل سے سمندر کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ سمندر کی نیلی چھاتی پر بادبانی کشتیاں اور موٹر لانچیں ادھر سے ادھر تھرکتے رہتے تھے، کچھ دور پر بڑے بڑے جنگی جہاز پڑے ہوئے تھے اس دن مجھے ہلکا ہلکا بخار چڑھ رہا تھا۔ میں اپنی میز پر بیٹھا سمندر کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد میرا سر چکر کھا گیا۔ میں نے سپروائزر سے چھٹی مانگی، اپنا رسیدہ سا ہیٹ اٹھایا اور لفٹ سے نیچے اتر کر سڑک پر آگیا۔ سامنے ہی ایک وکٹوریا کھڑی تھی، اور وکٹوریا والا اپنی نشست پر بیٹھا اونگھ رہا تھا ــــ میری آواز پر وہ چونک پڑا، اور اتر کر لڑکھڑاتا ہوا میرے پاس آیا، جب میں نے اس کی شکل دیکھی تو میری طبیعت مالش کرنے لگی۔ وہ شکل مجھے اب تک یاد ہے بلکہ میرے ذہن پر نقش ہے جیسے ایلورا کے غاروں کی کوئی غیر فانی شکل جو پتھر پر کندہ ہو ــــ سیاہ جیسے پہاڑی کوا۔ موٹے موٹے ہونٹ، چوڑے کلے، بڑی بڑی خوفناک لیکن متوالی آنکھیں، چھوٹے چھوٹے گھنگریلے بال جو اس کی لال رنگ کی گندی ٹوپی کے نیچے سے جھانک رہے تھے۔ ٹوپی کے نچلے کنارہ پر جیسے کسی نے گندا خون تھوپ دیا تھا، خاکی کوٹ پر جا بجا آڑے ترچھے پیوند لگے ہوئے تھے۔ بغلیں کوٹ کی پھٹی ہوئی تھیں جن میں سے ایک دھاری دار قمیص نظر آرہی تھی۔ کوٹ کی ایک جیب بھری ہوئی سی تھی۔ خاکی پاجامہ نسبتاً اچھی حالت میں تھا، لیکن صفائی سے بھی نہیں چھو گئی تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی ہنسا، جس سے مجھے سخت کوفت ہوئی۔ "جاہل، ناشائستہ" میں نے اپنے جی میں کہا۔ اور اس نے کہا "آئیے بابو جی! بیٹھئے کہاں جانے کا ہے ــــ؟" میں نے کہا "سانکلی اسٹریٹ، بائیکلہ جاؤں گا اور صرف ایک روپیہ دوں گا ــــ"

ایک روپیہ بائیکلہ کے لئے بہت کم تھا وہ دو روپے سے کسی طرح بھی کم نہ لیتا تھا۔ پھر اس زمانے میں امریکنوں نے بھی اپنی فیاضی سے وکٹوریا کا کرایہ بہت بڑھا دیا تھا، لیکن نہ جانے اس وقت وکٹوریا والے کے دل میں کیا آیا کہ وہ ایک روپیہ لینے پر راضی ہو گیا ــــ "بابو جی جو جی میں آئے وہ دے دینا" اور پھر ــــ "کیا بابو جی کچھ بیمار ہو؟"

میں نے کہا "ہاں بخار آگیا ہے ــــ" یہ کہہ کر میں وکٹوریا میں بیٹھ گیا اور اس نے گھوڑے کو ہانک دیا۔ ابھی ہم پہلے موڑ تک بھی نہ جانے پائے تھے کہ وکٹوریا والے نے بیٹھے بیٹھے اور میری طرف دیکھے بغیر کہا "بابو جی، یہ افریقہ میں کالے اور گورے کی کیا گڑبڑ ہے" یہ سوال ایک وکٹوریا والے کی طرف سے بہت ہی غیر متوقع تھا۔ میں نے سادگی سے کہا "معلوم نہیں لیکن تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ وہاں کالے اور گورے کی گڑبڑ ہے"۔

کہنے لگا "جی ہمارا باپ بولتا تھا کہ ادھر گورے لوگ کالوں کے ساتھ بڑا ظلم کرتے، آج اخبار والا بھی یہی چیخ رہا تھا ...... جی بات یہ ہے کہ میرا دادا افریقہ کا تھا، حبشی اور ایک صاحب کے یہاں بیراگیری کرتا تھا۔ جب صاحب بمبئی آیا ــــ اور اسے جی زمانہ ہو گیا ــــ تو ہمارا دادا بھی اس کے ساتھ چلا آیا اور میرا باپ بھی، جو اس وقت لونڈا ہی تھا ــــ جی ہمارا باپ بولتا تھا کہ جب صاحب کے یہاں ہمارا دادا کام کرتا تھا، تو جی بڑے مزے آتے تھے، عیش تھا۔ ویسے تنخواہ تو معمولی تھی مگر اوپر سے خوب مل جاتا تھا .... اے ہیٹ والے بابو! دیکھ کے چلو نا ذرا !! .... روڈ کا ٹھیکہ کر لیا ہے کیا؟ .... فٹ پاتھ چھوڑ کر روڈ پر چلتا .... ہاں تو بابو ــــ"

وہ دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوا، پھر جیسے اسے چھینک آتے آتے رک گئی، اس نے ناس کی ڈبیا نکالی۔ دو چٹکیاں ناک میں ڈالیں اور پھر چھیں، چھیں، چھیں، چھیں۔ پھر اس نے بیڑی کا بنڈل نکالا اور پیچھے ہاتھ کر کے اور میری طرف دیکھے بغیر بنڈل پیش کیا۔ میں نے معذرت ظاہر کی ــــ "سگریٹ پیتے ہوگے؟" اس نے اپنی بیڑی جلاتے ہوئے کہا۔ میں نے کہا "میں کبھی کبھی پی لیتا ہوں"

"کبھی کبھی؟ کبھی کبھی تو میں بھی پی لیتا ہوں، ہی ہی، ہی، ہی۔ میرا مطلب ہے بابو، سگرٹ نہیں دارو .... ہائے کیا چیز ہے جالم ...... پر بابو مقدر والوں کو ملتی ہے، دارو پیتی کیا ہے ہر چیز ــــ سب اپنا دانہ پانی لے کر آتے ہیں ــــ اب میری جورو اور لڑکی ہی کو دیکھو نا، جب تک ان کا دانا پانی میرے پاس تھا، میرے پاس رہیں، جب اٹھ گیا، چلی گئیں۔ حرام زادیاں میں نے دو سال ہوئے انھیں گھر سے نکال دیا ......"

"گھر سے نکال دیا ...... ؟ مگر کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"اس زمانے میں میں مل میں کام کرتا تھا۔ رات پالی ..... میں ادھر رات کو کام پر جاتا، اور وہ ادھر اپنی کمائی کرتی تھیں۔ کمائی سمجھتے ہو نا بابو جی! ــــ میں تو شروع ہی سے تاڑ گیا تھا ...... دونوں کہتی تھیں، کپڑے بنا کر دو، تیل لا کر دو، پاؤڈر لا کر دو، میم بننا چاہتی تھیں سالیاں .... حبشنیں کہیں کی ــــ کپڑے بنا کر دو .... کپڑے کہاں سے بنا کر دوں۔ میں بولا میرے کپڑے دیکھو، سال بھر سے دو جوڑے استعمال کر رہا ہوں تم پاؤڈر منگاتی ہو، میں دو دو ہفتے داڑھی نہیں کھرچواتا ...... پھر لونڈیا تین مہینے کے لئے بستر پر پڑ گئی کہتی تھی مجھ سے چلا نہیں جاتا ــــ رات بھر کھوں کھوں کرتی تھی ــــ اب میں کہتا ہوں بابو جی یہ مقدر نہیں تو کیا ...... اور اب اگر میں کبھی کبھی دارو پیتا ہوں تو کون سا جرم کرتا ہوں .. اور دارو کون نہیں پیتا، چال میں سبھی پیتے ہیں .. مقدر کی بات ــــ آپ جیسے بابو لوگ اونچے اونچے فلیٹوں میں رہتے ہیں اور بڑھیا شراب پیتے ہیں ......"

میں نے جلدی سے کہا "میں اونچے فلیٹ میں نہیں رہتا ...... مجھے صرف ۵۵ روپے تنخواہ ملتی ہے، اور بڑھیا شراب کے کیا معنی مشکل سے گذر بسر ہوتی ہے ــــ"

"ارے بابو کیوں بنتے ہو۔ ہیٹ پہننے والوں کو ۵۵ روپے تنخواہ نہیں ملتی .... ہم سے پوچھو، دن بھر وکٹوریا چلاتا ہے، رات کو گھوڑے کی لید سونگھتا ہے اور ٹھرا دارو پیتا ہے اور مالک کی گالیاں سنتا ہے اور ......"

رجسٹرڈ نمبر ڈی ۲۰۷

ہفتہ وار
نئی روشنی دہلی

تاریخ اشاعت یکم ... ۲۴ء

ڈاکٹر سید عابد حسین۔ صالحہ عابد حسین۔ عبد اللطیف اعظمی چندہ ۔سالانہ ... فی پرچہ

ادارۂ تحریر

پاس سے گھڑ گھڑ کرتی ہوئی ایک ٹرام گذری اور اس کی آواز میں وکٹوریا والے کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ اب ہم کرافورڈ مارکٹ سے آگے نکل چکے تھے، یہاں پر دوسری سمت کو جانے والی ایک وکٹوریا والے کو چیاں نے اس وکٹوریا والے پر ایک فقرہ کسا " ادبے فارس روڈی، کدھر؟ جیب بے ہلکی کے ...... " اس نے بھی اتنی ہی بلاغت سے جواب دیا۔
مجھے اب وکٹوریا والے کی باتوں میں دلچسپی ہو چلی تھی، وہ یقیناً ایک عظیم الشان اور پراسرار شخصیت کا مالک تھا۔ میں نے سوچا اگر یہ وکٹوریا والا نہ ہوتا تو ایک زبردست ادیب ہوتا ——
" تم اپنے باپ دادا کی بات کر رہے تھے؟ میں نے اُسے دوبارہ گفتگو پر اکسانے کے لئے کہا۔
" ان کی ماں کی ...... "
میں سکتہ میں رہ گیا۔ میں نے سوچا کہ اب اس کے ادیب ہونے میں کوئی شبہ نہیں
ایک لمحے کے بعد اس کا غصہ اُتر گیا۔ اور اس نے قدرے نرم لہجہ میں مجھے اس طرح مخاطب کیا —— " بابو میرا رنگ کالا ہے، میرے باپ کا بھی کالا تھا اور میرا دادا تو خالص حبشی تھا۔ میں پوچھتا ہوں اس نے گورے کی نوکری کیوں کی؟ ...... افریقہ گوروں کا ملک نہیں، پھر گورے افریقہ کیوں آئے۔ اور انھوں نے میرے دادا کو نوکر کیوں بنایا ...... مگر جی میرا دادا ہی ذلیل ہوگا۔ اگر وہ گوروں کا بیرا نہ بنتا، اگر ہندوستان نہ آتا۔ اگر میرا باپ ہندوستان کی ایک رنڈی سے شادی نہ کرتا تو میں ...... فارس روڈی کیوں کہلاتا —— یہ جو، وکٹوریا والا جو ابھی گیا ہے بابو، ایک نمبر کا حرامی ہے۔ اس سے کئی دفعہ میری مار پیٹ ہو چکی ہے ...... مگر یہ ڈنک مارنے سے باز نہیں آتا —— کمینہ کہیں کا —— پر بابو جی میرا باپ بولتا تھا کہ ہماری سات پیڑھی، سب جنگلوں میں رہتی تھیں، سب برابر کے لوگ ہوتے تھے، جنگلوں میں آزاد پھرتے تھے، اور جانوروں کا شکار کرتے تھے، کسی کا دینا نہیں تھا، کسی کا لینا نہیں تھا۔ کسی گورے کی چاکری نہیں تھی —— پر میرا دادا ہی ذلیل تھا، کمینہ تھا وہ گورے کا بیرا کیوں بنا؟ —— آج مجھے یہ بات بار بار یاد آتی ہے پھر سوچتا ہوں کہ گورے ہی افریقہ کیوں آئے، ہندوستان کیوں آئے، انھیں کالوں کی بستی سے ایسا کون سا پریم ہوگیا؟ واہ رے مقدر، بٹیا دھیرے، بٹیا دھیرے، ٹک ٹک ٹک ٹک"
وہ مجھ سے باتیں کرتے کرتے گھوڑے سے باتیں کرنے لگا۔
" میں نے کہا " تم نے نہیں سنا۔ ہندوستان سونے کی چڑیا کہلاتا تھا اور افریقہ بھی ایک قیمتی چڑیا ہے۔ اور پھر چڑیا خواہ سونے کی ہو یا گوشت پوست کی، اُسی کی ہوتی ہے جس کے پاس جال ہو گوروں کے پاس ایسا ایک جال تھا، اسی لئے وہ افریقہ اور ہندوستان گئے۔ آج کل یہ جو جنگ چل رہی ہے نا۔ یہ بھی چڑی ماروں کی آپس کی جنگ ہے۔ اس سے پہلے ۱۹۱۴ء میں جو جنگ ہوئی تھی وہ بھی چڑی ماروں کی جنگ تھی بس مصیبت یہ ہے کہ اس جنگ میں ہم جیسے شریف لوگ بھی پھنس جاتے ہیں، اور پھنسے بغیر چارہ کار بھی نہیں —— "
بابو جی آپ تو لکچر دینے لگے۔ ہماری یونین کا سکریٹری بھی ایسا ہی لکچر دیتا ہے —— کہتا ہے کہ یہ بڑے بڑے پیٹ والے ہمارے دشمن ہیں یہی جنگ کر رہے ہیں اور پچھلے سال بنگال میں انھوں نے تیس لاکھ آدمیوں کو بھوکا مارا۔ مجھے تو یقین نہیں آتا، اپنے اپنے مقدر کی بات ہے " ایک فوجی لاری فراٹا بھرتی ہوئی پاس سے گذر گئی۔ جس میں کچھ انگریز فوجی تھے اور وہ سب مل کر کوئی کورس گا رہے تھے۔ وکٹوریا والے نے مجھے مڑ کر دیکھا اور مسکرا دیا۔ جواب میں میں بھی مسکرا دیا لیکن یک لخت اس کے ہونٹوں کا تبسم اُڑ گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک گہری سنجیدگی آگئی۔ اس نے چہرہ پھر سامنے کر لیا۔ بس تھوڑی دور اور رہ گیا ہے۔ اب دائیں ہاتھ کو موڑ لینا " میں نے اس کی توجہ کو ہٹانے کے لئے کہا

لیکن غالباً اس کے جذبات کا پیالہ اب لبریز ہو چکا تھا۔
" لیکن بابو جی، اب مجھے کسی بات کی پرواہ نہیں؟ اس نے اپنی پوری متانت لیکن مکمل بے فکری کے ساتھ کہنا شروع کر دیا۔ آجکل امریکنوں سے خوب ... اور چائے پانی میں اُڑا دیتا ہوں۔ بابو زندگی دو روزہ ہے۔ میں یہ ... . وہ ذلیل ہیں ...... کمین ہیں سالیاں ...... کو ڈبو دیا ...... میرے تین چھوٹے چھوٹے بچے بھی ہاتھ سے نکل گئے کتنے سندر بچے تھے بابو ...... اگر آپ کی مریا انھیں کچھ پڑھاتا تو کل کو وہ بھی بابو بن سکتے۔ مگر اب وہ دلالی کرتے ہیں۔ اپنی بہن کی دلالی، اپنی ماں کی دلالی ...... اور امریکیوں کو بلاتے ہیں، گوروں کو بلاتے ہیں۔ وہ گورے جنھوں نے میرے باپ دادا کے ملک پر قبضہ کیا۔ میرے دادا کو بیرا بنایا اور اسے ہندوستان لایا۔ ایک قید خانے سے دوسرے قید خانے میں ...... ایک ...... "
میں نے کہا " بس روک لو " پھر میں وکٹوریا سے نیچے آیا اور اسے بھی اترنے کو کہا، سانکلی اسٹریٹ کی وہ عمارت آچکی تھی جس میں میں رہتا تھا۔ میں نے اسے کرایہ دیتے وقت ہدایت کی —— " دیکھو اتنے زور زور سے باتیں نہیں کیا کرتے —— سارے راستے لوگ سنتے آئے ہیں " لیکن جیسے اُس نے میری بات نہیں سنی۔ وہ کسی اور ہی سوچ میں گم تھا۔ پھر یک لخت وہ میرے اور قریب آگیا، اور آہستہ سے بولا " بابو جی نمبر نوٹ کر لو۔ پندرہ ہے۔ نمبر پندرہ فارس روڈ "
چلتے وقت میری نظر اس کے کوٹ کی جیب پر پڑی جس میں سے ایک بوتل کا سر جھانک رہا تھا۔ بوتل غالباً شراب کی تھی۔

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۱ | نمبر ۲۳ | یکم دسمبر ۱۹۴۸ء | ایڈیٹر: ڈاکٹر سید عابد حسین

معلم ـــــ اور ـــــ مہاتما

(مہاتما گاندھی)

(جن دنوں گاندھی جی گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے لندن تشریف لے گئے تھے مشہور طریق تعلیم مانٹیسوری میتھڈ کی موجد مادام مانٹیسوری بھی وہاں موجود تھیں اور بچوں کا ایک چھوٹا سا مدرسہ چلا رہی تھیں۔ انھوں نے گاندھی جی کو بلا کر اپنا مدرسہ دکھایا تھا۔ اس موقع پر معلم اور مہاتما نے جو تقریریں کی تھیں ان کا خلاصہ ہم آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں)

مادام مانٹیسوری نے فرمایا :-

"میں اپنے شاگردوں کو اور دوسرے صاحبوں کو جو یہاں موجود ہیں، مخاطب کرنا چاہتی ہوں، مجھے آپ سے ایک بہت بڑی بات کہنا ہے۔ آج ہمارے درمیان گاندھی کی روح، وہ مہاتما جس سے ہر شخص خوب واقف ہے، مجسم موجود ہے۔ یہ آواز جسے سننے کا شرف ہمیں حاصل ہوگا وہ آواز ہے جو ساری دنیا میں گونجتی ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں محبت سے کہتے ہیں اور اپنا پیام صرف اسی آواز سے نہیں بلکہ اپنی ساری زندگی ہی ادا کرتے ہیں یہ انوکھی بات ہے کہ جب اس کا موقع آتا ہے تو ہر شخص کان لگا کر سنتا ہے۔"

"میرے محترم گرو! مجھے اس بات پر فخر ہے کہ وہ آواز جسے آج آپ کے خیر مقدم کا شرف حاصل ہوا ہے، لاطینی نسل کے ایک فرد کی آواز ہے۔ یہ اس عظیم الشان شہر روما کی آواز ہے جو مغرب کے مذہبی خیالات کا گہوارہ ہے۔ کاش میں یہاں مغرب کے افکار اور زندگی کو مجسم کر کے مشرق کی خدمت میں پیش کر سکتی! ....

مہاتما گاندھی نے اس کے جواب میں یہ تقریر کی :-

"خاتون محترم، آپ کے الفاظ نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ یہ بالکل سچ ہے۔ میں نہایت عاجزی سے اعتراف کرتا ہوں کہ میں اپنی ذات کو سراپا محبت بنانے کی بری بھلی کوشش جو مجھ سے ہو سکتی ہے کرتا ہوں میرے دل سے لگی ہے کہ اپنے خالق کی معرفت حاصل کروں میرے نزدیک وہ عین حق ہے اور مجھ پر اپنی زندگی کی پہلی ہی منزل میں یہ حقیقت کھل گئی تھی کہ اگر حق کی معرفت حاصل کرنا ہے تو مجھے چاہیے کہ محبت کے قانون پر چلوں، چاہے اس میں میری جان بھی کام آ جائے اور چونکہ خدا نے مجھے بچے بھی عطا کئے ہیں اس لئے مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ محبت کا قانون جیسی اچھی طرح چھوٹے بچوں سے سیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے کسی اور طریقے سے سمجھ میں نہیں آتا۔ مجھے کامل یقین ہے کہ بچوں میں خلقی طور پر وہ شرارت نہیں ہوتی جو بری کہی جا سکے۔ اگر والدین بچے کی نشو و نما کے زمانے میں یعنی اس کی پیدائش سے پہلے اور اس کے بعد اچھا سبھاؤ رکھیں تو یہ مانی ہوئی بات ہے کہ بچہ خود بخود حق کے قانون اور محبت کے قانون پر چلے گا۔ میں آپ کے سامنے یہ بیان نہیں کرنا چاہتا کہ میری پر شور زندگی میں کیا کیا حادثے گذرے ہیں۔ لیکن میں سچائی اور عاجزی سے اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ جس حد تک میں نے اپنی زندگی کے اندر خیال، قول اور فعل میں محبت کو برتا اسی حد تک مجھے وہ سکون قلب جو حد ادراک سے باہر ہے؛ حاصل ہوا میرے دوست اکثر میرے سکون قلب کو دیکھ کر حیران رہ گئے ہیں۔ وہ مجھ پر رشک کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ تم نے یہ انمول چیز کیسے پائی میں انھیں اس کا سبب سوائے اس کے اور کچھ نہیں بتا سکا کہ جو سکون آپ کو میرے دل میں نظر آتا ہے وہ میری اس کوشش کی بدولت ہے کہ محبت کے قانون پر جو ہماری فطرت کا سب سے برتر قانون ہے، عمل کروں۔

ہم بھی ہندوستان کے غریب سے غریب بچوں کی تعلیم کے تجربے کر رہے ہیں، معلوم نہیں کہ ہمیں کہاں تک کامیابی ہوگی۔ مقصد تو یہ ہے کہ ہندوستان کے ان بچوں کو جو چپے چپے سے بلوں میں رہتے ہیں سچی جان نثار تعلیم دی جائے مگر اس کے مادی وسائل ہمارے پاس کچھ بھی نہیں۔

لے دے کے ہمیں معلموں کی رضاکارانہ مدد کا آسرا ہے۔ لیکن جب میں معلموں کی تلاش کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ بہت کم ہیں خصوصاً اس قسم کے معلم جن کی ضرورت ہے کہ ہمدردی سے ہر بچے کی طبیعت کا مطالعہ کر کے اسے اپنے بل کھڑا کر کے اسے ذاتی عزت کا احساس دلا کر اس کی بہترین صفات کو ابھاریں۔ آپ یقین کیجیے سینکڑوں بلکہ ہزاروں بچوں کے تجربے سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ ان کے دل میں مجھ سے اور آپ سے زیادہ عزت کا احساس ہوتا ہے۔ اگر ہم عجز و انکسار سے کام لیں تو ہم زندگی کے بڑے بڑے سبق سن رسیدہ اور عالم فاضل حضرات سے نہیں بلکہ انھیں بچوں سے جو نادان کہلاتے ہیں سیکھ سکتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کے اقوال میں یہ قول سب سے بلند و برتر حقیقت رکھتا ہے کہ حکمت شیر خوار بچوں کی زبان سے ظاہر ہوتی ہے۔ میرا عقیدہ ہے اور میں نے خود تجربہ کیا ہے کہ اگر ہم شیر خوار بچوں کے سامنے عاجزی اور معصومیت کے ساتھ جائیں تو ہم ان سے حکمت کے نسخے سیکھ سکتے ہیں۔

اب آپ کا زیادہ وقت صرف کرنا مناسب نہیں میں نے آپ کے سامنے بس وہی بات کہی ہے جو اس وقت میرے دل میں چبھ رہی تھی یعنی اس نازک مسئلے کے انسانی پہلو کا ذکر کیا ہے کہ ان کروڑوں ہندوستانی بچوں کی بہترین صفات کس طرح ابھاری جائیں۔ لیکن اگر میں نے کوئی سبق سیکھا ہے تو یہ کہ جو چیز انسان کے نزدیک محال ہے وہ خدا کے آگے بچوں کا کھیل ہے ....

فہرست مضامین

قیمت فی پرچہ ۳؍

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

سالک ہندی

زبان کی جنگ

میں نے ہندی زبان کے مسئلے کا ذکر اس کالم میں ایک دفعہ سے زیادہ کیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس بارے میں بہت سے لوگ جو تنگ نظری اور عاقبت ناشناسی دکھا رہے ہیں اس کی وجہ سمجھ میں تو آتی ہے لیکن اس کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ اور اس بات سے دل کو بہت دکھ ہوتا ہے۔ یہ تو ایک ایسا صاف معاملہ ہے کہ اس بارے میں دانشمندی، رواداری، مصلحت شناسی اور انصاف سب کا ایک ہی تقاضا ہے۔ جب دیکھتا ہوں کہ اس میدان میں آکر اچھے اچھوں کے اور بڑے بڑوں کے قدم اکھڑتے ہیں اور ان کا دماغی توازن درہم برہم ہو گیا ہے تو علاوہ ذاتی رنج کے ملک کے مستقبل کی طرف سے فکر پیدا ہو جاتی ہے اور سوچتا ہوں کہ آخر ہم کدھر جا رہے ہیں؟

بنارس کے ڈاکٹر بھگوان داس ہمارے دیس کے بڑے قابل عزت بزرگوں اور بلند پایہ مفکروں میں سے ہیں جن کی شرافت، وسیع مشربی، سیرت کی مضبوطی اور مطالعے کی گہرائی کا سب اعتراف کرتے ہیں۔ اگر زبان کے معاملے میں ملک میں درجن بھر لوگوں سے بے تعصبی کی توقع ہو سکتی ہے تو ان میں سے ایک انہیں ہونا چاہئے لیکن ابھی حال میں ایک اخبار میں اس مسئلے پر ان کی رائے پڑھ کر ہمت کی کمر سی ٹوٹ گئی۔ اگر پراپگنڈے نے پریشان خیالی اور تعصب کا طوفان ڈاکٹر بھگوان داس کی عمر بھر کی ریاضت کو بہا کر لے جا سکتا ہے تو دوسروں سے کیا توقع کی جائے۔ ایک تعلیمی رسالے میں ان کے خیالات اس طرح چھپے ہیں:

"جب تک ہندوستان تقسیم نہیں ہوا تھا، میری رائے یہ تھی کہ ہماری راشٹر بھاشا میں ہندی اور اردو کا میل ہونا چاہئے، یعنی وہ ہندوستانی ہونی چاہئے۔ اور جہاں تک ممکن ہو ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں سب جاتیوں اور مذہبوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کو یہ زبان اور دونوں رسم خط سکھانے چاہئیں۔ لیکن اب کہ ہمارے ملک کی تقسیم ہو گئی ہے، میری استدلالی وثوق کے ساتھ یہ رائے ہے کہ ہماری تعلیم گاہوں میں خاص ہندی کو جو سنسکرت سے نکلی ہوئی ہے۔ صرف دیوناگری رسم خط میں تمام طلبہ کو لازماً پڑھانا چاہئے۔ ہندوؤں کے علاوہ دوسرے مذہب والوں کو اس کی پوری آزادی ہوگی کہ وہ اپنے گھروں پر اور اپنے خرچ پر بچوں کو کوئی دوسری زبان یا رسم خط سکھائیں"!!

ان چند سطروں میں اس درجہ پریشان خیالی، نامعقولیت اور تہذیبی فسطائیت کا اظہار ہے کہ پھر یقین نہیں آتا کہ یہ ڈاکٹر بھگوان داس کے الفاظ ہیں۔ اس لئے میری اس تنقید کا مخاطب عبارت کے مصنف کو سمجھئے اور دعا کیجئے کہ وہ ڈاکٹر صاحب نہ ہوں!

۱۔ تبدیلی رائے کی جو وجہ بتائی گئی ہے وہ سرے سے مہمل ہے۔ کیا ہندوستان کی تقسیم کی وجہ سے زبان، تہذیب، علم و ادب اور شرافت و معقولیت کے وہ اصول بدل جانے چاہئیں جن کو ہم نے سوچ سمجھ کر ٹھونک بجا کر اختیار کیا ہے؟

۲۔ کیا اس بٹوارے کی وجہ سے ان کروڑوں ہندوؤں اور مسلمانوں اور سکھوں کی زبان بدل جائے گی جو ہندوستانی ریاست کا ایک اٹل جزو ہیں اور جن کی زبان اردو ہے۔ کیا ان سب کو تقسیم ہند کے جرم کی یہ سزا دینا سیاسی معقول پسندی اور رواداری کا ثبوت ہے کہ ان کی زبان ملک بدر سمجھی جائے گی۔ اس کو سرکاری مدرسوں میں کوئی جگہ نہ ملے گی، بلکہ ملک کی مشترک زبان میں ان کا جو حصہ ہے اسے بھی نظر انداز کر دیا جائے گا؟ کیا ایسا کرنا ملک کے مجوزہ دستور کی خلاف ورزی نہیں جس میں ملک کی ہر زبان اور ہر رسم خط اور ہر لسانی اقلیت کے حقوق کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا ہے؟

۳۔ کیا ایسی پالیسی اختیار کرنا ہندوستانی تہذیب کے مستقبل کے ساتھ دشمنی اور پرائے شگون کے لئے اپنی ناک کٹانا نہیں ہے؟ کون پڑھا لکھا شخص اس حقیقت سے ناواقف ہے کہ موجودہ ہندوستان کی زبان اور ادب میں اردو لکھنے والوں کا جن کی صف اول میں ہر مذہب کے لوگ شامل ہیں، کس قدر نمایاں حصہ ہے اور اس کو اس طرح مٹانے کی کوشش نہ صرف انصاف کا خون کرنا ہے بلکہ ہندوستانی ادب اور تہذیب کے عزیز سرمائے کو کم مایہ بنانا ہے؟

۴۔ اور پھر یہ زبان کی "شدھی" کرنا، اس کو کسی خاص مذہب کے ساتھ وابستہ کرنا، کہاں کی سمجھداری ہے۔ ہندوؤں کے علاوہ دوسرے مذہب والوں کو آزادی ہوگی (یعنی ہندوؤں کی زبان تو اصولاً ہندی ہونا چاہئے ان کے لئے تو کسی دوسری زبان یا رسم خط سکھانے کا سوال ہی نہیں۔ (سرشار، چکبست، شرر، پریم چند، کرشن چندر، جواہر لال، تیج بہادر سپرو، سروجنی نیڈو، کشن پرشاد کول، فراق، پنڈت سندر لال وغیرہ یا تو ہندو نہیں ہیں یا انہیں گذشتہ گناہوں سے توبہ کر کے آئندہ کبھی اردو کو اپنی زبان نہ سمجھنا چاہیئے!) کم سے کم جن لفظوں میں یہ ڈورے ڈالا گیا ہے اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کسی ہندو کو اجازت نہ ہوگی کہ وہ اپنے بچوں کو کوئی دوسری زبان یا رسم خط (صرف اردو ہی نہیں!) سیکھنے دے۔

۵۔ کس قدر فراخ دلی اور فیاضی کے ساتھ یہ اجازت دی گئی ہے کہ دوسرے مذہب والے اپنے گھر پر اور اپنے خرچ پر کوئی دوسری زبان یا رسم خط سکھا سکتے ہیں! یعنی (بالفاظ دیگر) ہم ان تنگ دل لوگوں میں سے نہیں ہیں جو اپنے پورے اختیارات استعمال کر کے یہ حکم نافذ کریں کہ اگر کوئی شخص اپنے گھر پر اور اپنے خرچ پر کوئی دوسری زبان سکھائے گا تو ہم اسے پولیس کے سپرد کر دیں گے، ہم تو صرف یہ حکم سنا رہے ہیں کہ سرکاری مدرسوں میں اور حکومت کے خرچ پر (جس کی آمدنی غالباً سبھی جماعتوں سے وصول کی جاتی ہے) کوئی دوسری زبان نہیں پڑھائی جائے گی!

انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ایک طرف تو ہم ایک آزاد جمہوری غیر مذہبی ریاست قائم کرنے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں جس کے لئے ہمارے محبوب لیڈر گاندھی جی اور دوسرے لیڈروں نے جان کی بازی لگا دی ہے اور جن کے آدرشوں کا ہم دم بھرتے ہیں اور دوسری طرف زبان جیسے اہم اور جنتا کی دلچسپی کے معاملے میں تنگ نظری کی ایک ایسی مثال قائم کرنا چاہتے ہیں جس کی نظیر ہندوستان کی تاریخ میں نہ ملے گی۔ یہاں سینکڑوں برس مسلمانوں کی حکومت رہی، سو برس سے زیادہ انگریزوں کی حکومت رہی۔ ان میں سے کسی کو جمہوری ریاست ہونے کا دعویٰ نہ تھا۔ ان کی اپنی اپنی سرکاری یا درباری زبانیں تھیں جن کو انھوں نے نافذ کیا تھا لیکن مسلمانوں نے کبھی ہندی یا سنسکرت یا کسی دوسری زبان کے ساتھ بے انصافی کا یہ سلوک روا نہیں رکھا۔ انگریزوں نے باوجود اپنی تنگ نظری اور احساس برتری کے کبھی اردو یا ہندی یا گجراتی یا بنگالی کی تعلیم کی ممانعت نہیں کی سرے سے ان کے وجود سے انکار نہیں کیا (بعض اہل علم کا آج یہ کہنا ہے کہ اردو کوئی زبان ہی نہیں ہے۔ غالباً میر، غالب، انیس، اقبال، حالی، پریم چند سب ذہنی واہمے ہیں!) کیا ادب اور تہذیب کے میدان میں اس تنگ نظری کو اختیار کرنے کا شرف بیسویں صدی میں ہمارے ملک کے اعلیٰ ترین دماغوں کو حاصل ہوگا؟ مجھے کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ پاکستانی تحریک کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس کے سخت ترین مخالفوں نے فرقہ وارانہ علیحدگی اور تنگ نظری کی اس ذہنیت کو اپنا لیا جس کے خلاف وہ برسوں تک جنگ کرتے رہے تھے۔ ان دوستوں سے میری باادب درخواست ہے کہ "صاحب نظراں نشہ قوت ہے خطرناک" اس نشے میں کوئی ایسی بات نہ کیجئے جس سے بعد میں آپ کو بھی نقصان اور خفت ہو!

دِل نوازی کا سلیقہ

چند روز ہوئے لاہور ریڈیو اسٹیشن کھولا تو کوئی گانے والا اقبال کا یہ شعر پڑھ رہا تھا:

> مسلمانوں کے لہو میں ہے سلیقہ دلنوازی کا
> مروت حسن عالم گیر ہے مردان غازی کا!

شعر سن کر دل تڑپ اٹھا۔ کاش یہ محض خوش فہمی کا ادعا نہ ہوتا بلکہ حقیقت ہوتی۔ کاش پاکستان کے ارباب سیاست جو مسلمانوں کی سب سے بڑی حکومت کے خالق ہیں اپنے قول اور فعل سے "دل نوازی کے اس سلیقے" کا تھوڑا سا ثبوت دیتے۔ کاش وہ یہ جانتے کہ راہ حق کی طرف بلانے کے لئے بھی قرآن نے "موعظہ حسنہ" کی شرط لگائی ہے، "لغو کے پاس سے گذرنا ہو تو اس کے لئے "کرامت کے ساتھ گزر جانے کی" تلقین کی ہے اور حرف بد کو زبان پر لانے کی ممانعت کی ہے۔ لیکن انھوں نے تو زبان اور قلم کی تلوار کو کھڑکانا ہی جہاد سمجھ لیا ہے۔ دل نوازی نے ان کی سیاست کی اصطلاحات میں جگہ نہیں پائی۔

[illegible] میں یوم اقبال کے موقع پر تقریر کرتے

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

یکم دسمبر ۱۹۴۸ء

اقوام متحدہ کا ادارہ

انجمن اقوام (لیگ آف نیشنز) کی ناکامی کے بعد بہت سے لوگ یہ امید چھوڑ بیٹھے تھے کہ قوموں کے آپس کے جھگڑے پنچایت کے ذریعے سے طے ہو سکتے ہیں۔ مگر بعض سرپھروں کے سر میں یہ سودا باقی رہا، وہ بین الاقوامی پنچایت کے خیال کی اشاعت کرتے رہے اور اس کی تعمیر میں لگے رہے۔ چنانچہ دوسری عالم گیر جنگ کے دوران میں جب امریکہ اور انگلستان سب ملکوں کے لوگوں کو یہ دکھانا چاہتے تھے کہ وہ بین الاقوامی سیاست میں بھی جمہوری طریقہ برتنا چاہتے ہیں انھوں نے فسطائیت کی مخالف ریاستوں کی ایک برادری قائم کی اور اس نے رفتہ رفتہ ایک باضابطہ ادارے کی شکل اختیار کر لی۔ اس طرح زمانے کے تقاضے نے اور اینگلو سیکسن ریاستوں کی سیاسی مصلحت نے مل کر پرانی انجمن اقوام کو نئے سرے سے ایک نئی شکل میں جنم دیا۔ اس نئے ادارے کا حلقہ پرانی انجمن سے کہیں زیادہ وسیع ہے، اس میں روس، ریاستہائے متحدہ امریکہ اور ایشیا کی بہت سی قومیں بھی جو انجمن اقوام میں نہیں تھیں، شریک ہیں، یوں سمجھئے کہ جرمنی، اٹلی، اسپین اور چند چھوٹے چھوٹے ملکوں کو چھوڑ کر دنیا کے سبھی ملک اس کے ممبر ہیں۔ اس کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی ماتحت کمیٹیاں جو ممبر ملکوں میں سیاسی، معاشی، تجارتی، معاشرتی تعاون پیدا کرنے کے لئے بنائی گئی ہیں مستقل حیثیت رکھتی ہیں۔ ادارے کی عام مجلس (جنرل اسمبلی) کا اجلاس تو سال میں ایک بار دو تین مہینے کے لئے ہوتا ہے مگر کمیٹیاں برابر اپنا کام کرتی رہتی ہیں۔ ان میں حفاظتی کمیٹی (سکیورٹی کونسل) سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس لئے کہ ادارے کا اصل کام یعنی ملکوں کے باہمی جھگڑوں کو پنچایت کے ذریعے طے کرنا اسی کے سپرد ہے۔

اقوام متحدہ کے دوسرے ماتحت اداروں اور ایجنسیوں سے دنیا کی رائے عامہ بڑی حد تک مطمئن ہے لیکن سکیورٹی کونسل سے لوگ عام طور پر مایوس نظر آتے ہیں۔ اس پر سستی، کمزوری، قوت فیصلہ کی کمی کا الزام لگانے سے بھی نہیں چوکتے۔ اصل میں ہمیں اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ دوسرے اداروں کے اور سکیورٹی کونسل کے کام میں کیا فرق ہے اور اس کی راہ میں کیا مشکلات حائل ہیں ورنہ ہم خود بے انصافی کے مرتکب ہوں گے۔ دوسرے اداروں کا مقصد یہ ہے کہ سب ملکوں کے نمائندوں کو جمع کر کے تبادلۂ خیالات کا موقع دیں، آپس کے تجارتی، تہذیبی اور معاشرتی تعلقات کے بارے میں ایسے اصول طے کریں اور ایسی تجویزیں سوچیں جن میں سب کا بھلا ہو۔ لیکن سکیورٹی کونسل کو یہ ناگوار فرض انجام دینا پڑتا ہے کہ ریاستوں کی خودغرضی کی اور ان جارحانہ کارروائیوں کی جو ایک ریاست دوسری ریاست کے خلاف کر رہی ہو یا کرنے والی ہو روک تھام کرے۔ ظاہر ہے کہ ان اداروں کا کام آسان ہے اور اس کا کام نہایت مشکل ہے۔

اب ذرا اس کی ساخت اور آئین پر غور کیجئے اور یہ بتائیے کہ اگر اس کی کارروائی میں سستی تلون اور کمزوری نظر آتی ہے تو اس کا کیا قصور ہے۔ وہ گیارہ ملکوں کے نمائندوں پر مشتمل ہے جن میں سے کچھ ہر سال نکل جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے آ جاتے ہیں۔ صدر ہر مہینے بدلتا رہتا ہے۔ کسی تجویز کی منظوری کے لئے یہ ضروری ہے کہ گیارہ ارکان میں سے کم سے کم سات اس کی تائید کریں جن میں پانچوں بڑی طاقتوں روس، امریکہ، انگلستان، فرانس اور چین کے نمائندوں کا ہونا ضروری ہے۔ یعنی اگر ان پانچوں میں سے ایک بھی کسی تجویز کو رد کر دے تو وہ نامنظور سمجھی جائے گی، چاہے باقی دس اس کی تائید کریں۔ اس کو ویٹو کہتے ہیں۔ روس اسی شرط پر شریک ہوا ہے کہ اس کو ویٹو کا حق دیا جائے اور اس سے برابر کام لیتا رہتا ہے۔ اب آپ ہی سوچئے کہ جس مجلس میں ہر مہینے نیا صدر آئے۔ اس کی پالیسی میں تھوڑی بہت تبدیلی برابر ہوتی رہے گی یا نہیں، جس مجلس کو ہر معاملے میں ایسی راہ نکالنی پڑے جس پر پانچوں بڑی ریاستیں اور دو اور ریاستیں متفق ہو جائیں اس کی کارروائی سست ہوگی یا نہیں اور جس مجلس کے پاس اپنے فیصلوں کو نافذ کرنے کے لئے خود اپنی کوئی قوت نہ ہو اس کے طرز عمل میں قدرتی طور پر کمزوری ہوگی یا نہیں۔ اب رہی جانب داری اور بے انصافی تو یہ عیب سکیورٹی کونسل میں اتنے ہی زیادہ یا اتنے ہی کم ہیں جتنے انسانی فطرت میں ہیں۔ بے شک امریکہ اور انگلستان اس پر حاوی ہیں اور اس کو ہر معاملے میں ان کے مفاد کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ روس اور امریکہ کو بھی شرافت سے کسی نہ کسی حد تک اپنے مفاد کو مفاد عامہ کے لئے چھوڑنا پڑتا ہے۔

شاید آپ کہیں کہ ایسی بے جا شرطیں سکیورٹی کونسل کے دستور میں کیوں ہیں؟ بات یہ ہے کہ صرف ان ہی شرطوں پر پانچ بڑی ریاستوں کا خصوصاً روس کا اقوام متحدہ میں شریک کرنا ممکن تھا اور سب کو شریک کئے بغیر اندیشہ تھا کہ یہ بھی پرانی انجمن اقوام کی طرح بے کار ہو کر رہ جائے گی؟

آخر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر قیام امن کی اس سست اور کمزور مشین سے کیا فائدہ؟ اس نے اتنے دن میں انڈونیشیا، فلسطین، کشمیر، برلن کے مسائل میں سے کون سے مسئلے کو حل کر لیا ہے جو آئندہ کے لئے اس سے کوئی امید رکھی جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک سکیورٹی کونسل اب تک کسی مسئلے

(باقی صفحہ ۱۴ پر)

بزم بے تکلف

آئیے آئیے میر صاحب اب تو مہینوں کیا برسوں آپ کی صورت نظر نہیں آتی۔ پہلے آپ کو عید کا چاند کہتے تھے اب دم دار ستارہ کہنا پڑے گا۔

"یہ دُم دار ستارہ کیا معنی؟ جو منہ میں آتا ہے بک دیتے ہو۔ دیکھتے نہیں کہ ایک تو محاورہ غلط ہے دوسرے اس میں ذم کا پہلو نکلتا ہے؟"

"ارے توبہ معاف کیجئے گا۔ میں نے محاورہ سمجھ کر نہیں استعارہ سمجھ کر کہا تھا۔ مگر بڑا غضب تو یہ ہوا کہ ذم کا پہلو نکل آیا۔ اب کیا ہوگا! ذرا اچھی طرح دیکھ لیجئے کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کو دھوکا ہو گیا ہو!"

"دھوکا کیا ہوتا کھلی ہوئی بات ہے۔ ایک تو دُم کا لفظ ہی قبیح ہے اور پھر دم دار ستارے میں تو قباحت کے علاوہ نحوست بھی آ گئی۔"

"قباحت کو تو خیر صبر کر لیجئے۔ مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے۔ مگر یہ نحوست آپ کی میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"پھر وہی شرارت کی باتیں۔ میری نحوست کا ذکر ہے یا دم دار ستارے کی؟"

"توبہ کیجئے میر صاحب میری کیا مجال کہ آپ کی نحوست کو کچھ کہوں، میں تو دم دار ستارے کی نحوست سے انکار کر رہا ہوں۔"

"تمھارا کیا ہے، تم تو شیطان کی شیطنت سے بھی انکار کر دو گے۔ غضب خدا کا صریحاً دیکھ رہے ہو کہ ادھر دم دار ستارہ نکلا، ادھر بمبئی پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ وہ طوفان آیا وہ طوفان آیا کہ بس خدا کی پناہ۔ اور پھر بھی اس منحوس ستارے کی نحوست سے انکار کرتے ہو۔"

"قربان جائیے آپ کے اس بھولے پن کے۔ بمبئی کا طوفان آپ کے خیال میں دُم دار ستارے کا دم چھلا تھا۔ ستارہ تو ساری دنیا میں دیکھا گیا اور اس کی نحوست کی تان صرف بمبئی پر آ کر ٹوٹی۔ اور یہ جو ہندوستان و پاکستان میں ایک کروڑ آدمیوں پر خانہ بربادی کی قیامت ٹوٹی اور اب چالیس کروڑ آدمیوں پر مہنگائی اور بھوک کی قیامت ٹوٹ رہی ہے اور یہ جو یورپ کے اوپر جنگ کی قیامت ٹوٹی اور اب یونین فارم اور مارشل ایڈ کی قیامت ٹوٹ رہی ہے اسے بھی آپ دُم دار ستارے کی نحوست کہیں گے؟"

"تو پھر کیا کہوں؟"

"اپنے اعمال کی شامت کہئے، اپنی حماقت، جہالت اور وحشت کہئے۔ وہ دن گئے جب انسان اپنے کرتوت شیطان کے سر منڈھ دیا کرتا تھا یا دُم دار ستارے کی دم سے باندھ دیا کرتا تھا۔ اب قانون اور آئین کا زمانہ ہے سوچ سمجھ کر جو کچھ کہنا چاہئے اگر آپ نے شیطان پر یا دم دار ستارے پر ایسے بے سر و پا الزام لگائے تو وہ یونین بنا لیں گے، ازالۂ حیثیت عرفی کی نالش کر دیں گے اور چودھری ظفر اللہ کو اپنا وکیل بنا لیں گے بیٹھے بٹھائے ہم"

پچھلا ہفتہ: ۱- ہندوستان

یہی ٹھیک ہے

جب آئین ساز اسمبلی کے ذمہ دار ممبروں نے دیکھا کہ آئین پر بحث، شیطان کی آنت کی طرح بڑھتی ہی چلی جاتی ہے تو انھیں مجبور ہو کر عمل جراحی سے کام لینا پڑا۔ انھوں نے یہ تجویز سوچی کہ صدر کو اختیار دیا جائے کہ

(۱) جو ترمیمیں محض لفظی یا نحوی ہوں یا محض صورت سے تعلق رکھتی ہوں معنی پر اثر انداز نہ ہوتی ہوں انھیں پیش کرنے کی اجازت نہ دے

(۲) بحث کے لئے صرف ان ترمیموں کو منتخب کرے جو زیادہ جامع اور مناسب ہوں۔ بقیہ ترمیموں کے بارے میں بغیر بحث کے ووٹ لے لے۔ کئی ممبروں نے اس پر سختی سے احتجاج کیا خصوصاً نذیر الدین احمد صاحب نے جن کی ایک ہزار ترمیمیں چھوڑی جانے کے بعد بھی ڈیڑھ ہزار اور باقی ہیں اور پروفیسر کے ٹی شاہ نے جو بہ قول خود اپنی ترمیمیں ذہن کی تجوری میں محفوظ رکھتے ہیں۔ مگر اکثریت نے بے مروتی سے کام لے کر اس تجویز کو منظور کر لیا اس کے علاوہ اب اسمبلی کے اجلاس کا وقت بھی بڑھایا جا رہا ہے۔ اس لئے کچھ کچھ امید ہوتی ہے کہ شاید آئین کی سب دفعات پر بحث کانگریس اسمبلی پارٹی کی مقرر کی ہوئی تاریخ ۲۶ جنوری سے پہلے ختم ہو جائے جس دن بیس سال پہلے غلام ہندوستان نے جنگ آزادی کا علم اٹھایا تھا اسی دن آزاد ہندوستان اپنے قومی آئین کی پابندی کا عہد اٹھا سکے۔

آئین ہے یا ضابطہ قانون

کہا جاتا ہے کہ ہم ہندوستانیوں میں مذاق ظرافت بہت کم ہے۔ در اصل اس کی تہہ میں احساس تناسب کی کمی ہے جس کا اظہار ہماری زندگی کی بہت سی چیزوں میں ہوتا ہے کہ ہم کلیات اور جزئیات میں، اصول اور فروع میں فرق نہیں کرتے اور چھوٹی بڑی باتوں کو یکساں اہمیت دیتے ہیں۔ اس کا ثبوت پچھلے ہفتے اسمبلی کی بحثوں میں اچھی طرح مل گیا۔ ہندوستانی ریاست کی رہنمائی کے لئے جو اصول تجویز کئے گئے ان میں جہاں یہ اہم اور اساسی اصول ہے کہ معاشی جمہوریت قائم کرنے کی کوشش کی جائے اور نظم و نسق کی عمارت کا سنگ بنیاد گاؤں کی پنچایت کو سمجھا جائے وہاں یہ نیک ارادہ بھی تھی کہ نشہ بندی کی جائے۔ اس دفعہ میں لوگ اس کو عام سے الگ رکھا جائے ہماری اسمبلی یہ اضافہ کرنا چاہتی تھی کہ اس اصول کا نفاذ تین سال کے اندر کر دیا جائے۔ اس پر وزیر اعظم نے لوگوں کو سمجھایا کہ جزئیات کو آئین میں داخل کرنے سے اس کی عظمت و شان کم ہو جائے گی۔ ترمیم نامنظور ہو گئی۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ نشہ بندی نہایت ضروری ہے مگر اور بھی بہت سی ضروری چیزیں ہیں مثلاً جوئے اور سٹے کو روکنا نفع خوری اور چور بازاری کو روکنا۔ سود خواری کو روکنا۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں آئین میں نہیں آ سکتیں اور نہیں آنی چاہئیں۔ ان جزئیات پر اصرار کرنے کے بجائے اگر ہماری اسمبلی معاشی جمہوریت کی مبہم اصطلاح کی تھوڑی سی تشریح پر زور دیتی تو اچھا تھا۔ معاشی جمہوریت اور معاشی انصاف تو ہٹلر کی قومی سوشلسٹ پارٹی بھی تسلیم کرتی تھی مگر اس کی تعبیر جس طرح کی گئی وہ سب کو معلوم ہے۔ ہمارے ملک میں معاشی جمہوریت کی راہ میں جو دقتیں حائل ہیں ان میں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے علاوہ ہماری سیرت کا یہ عیب بھی ہے جسے ہم نے احساس تناسب کی کمی کہا ہے ہم چھوٹی چھوٹی چیزوں میں جن پر رسمی اخلاق و مذہب کا ٹھپا ہوتا ہے اس قدر محو ہو جاتے ہیں کہ مذہب و اخلاق کے اصل اصول کو بھول جاتے ہیں وہ اصول یہ ہے کہ سب انسان خدا کے بندے ہیں سب کو خدا کی زمین پر زندگی کی ضروریات میں سے اتنا حصہ ملنا چاہئے کہ وہ انسانوں کی طرح زندگی بسر کر سکیں۔ بے شک ہمارے آئین کے بنیادی حقوق کے باب میں اس مضمون کی ایک دفعہ موجود ہے۔ لیکن اصولی ہدایات کے سلسلے میں اس طرف بھی کچھ اشارہ ہونا چاہئے تھا کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ملک کے معاشی نظام کی کیا شکل ہوگی۔

بیا کہ نوبت صلح است و آشتی و صفا

ہندوستان اور برطانوی دولت مشترکہ کے تعلق کے مسئلے پر کانگریس ورکنگ کمیٹی غور کر چکی ہے۔ اور اسمبلی کی کانگریس پارٹی نے بھی اس پر بحث ہو چکی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس مسئلے کے حل کرنے کا ایک اصول طے ہو گیا ہے اور وزیر اعظم کو اختیار دیا گیا ہے کہ اس کی روشنی میں حکومت برطانیہ سے گفت و شنید کریں۔ امید ہے کہ دو ہفتے کے اندر اندر پنڈت نہرو آئین ساز اسمبلی کو وہ اصول بتائیں گے جس کی بنیاد پر برطانیہ سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں اور اس کی منظوری حاصل کریں گے۔ پھر وہ کانگریس کے اجلاس جے پور میں اس مسئلے پر تقریر کریں گے۔

اب تک جو اندازہ ہوا ہے وہ یہ ہے کہ پنڈت نہرو کے خیال میں ہندوستان کو برطانوی دولت مشترکہ سے کم و بیش وہی تعلق رکھنا چاہئے جو جاب ایرا (آئرلینڈ) کا ہوگا۔ ایرا کی مجلس قانون ساز نے ابھی ابھی اپنے آئین میں دو بڑی تبدیلیاں کی ہیں ایک یہ ہے کہ وہ ایک خود مختار ری پبلک ہوگا اور دوسری یہ ہے کہ بیرونی ممالک سے اس کے تعلقات برطانیہ کی معرفت نہیں بلکہ براہ راست ہوں گے۔ یہ سمجھئے کہ اس کے بعد آئرلینڈ اور برطانیہ میں کوئی رشتہ نہیں رہا۔ مگر اس کے باوجود وزیر اعظم مسٹر اٹیلی اور آئرش وزیر اعظم مسٹر کاسٹلو نے اعلان کیا ہے کہ ایک ملک کے باشندے دوسرے ملک میں غیر ملکی نہیں سمجھے جائیں گے بلکہ ان کو خاص حقوق حاصل ہوں گے اسی قسم کا تعلق آئرلینڈ کے ساتھ رکھنے کا اعلان ہندوستان اور نیوزی لینڈ کی طرف سے بھی ہوا ہے اور دولت مشترکہ کے دوسرے ملکوں کی طرف سے ہونے والا ہے اگر ہم اس تعلق کی نوعیت پر غور کریں تو در اصل یہ اس قسم کا دوستانہ معاہدہ ہے جیسا خود مختار ملکوں کے درمیان پہلے بھی ہوا کرتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے شہریوں کو خاص مراعات دیں گے ہمارے خیال میں اگر ہندوستان کا برطانیہ اور دوسرے ملکوں کے ساتھ جو دولت مشترکہ کے رکن ہیں اس قسم کا دوستانہ رشتہ مستقل طور پر قائم رہے تو کوئی حرج نہیں بلکہ بہت خوشی کی بات ہے ہندوستان کی بیرونی پالیسی یہی ہے اور یہی ہونی چاہئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ملکوں کے ساتھ رشتۂ محبت سے وابستہ ہو اگر اس کی ابتدا وہ برطانیہ اور اس کے ساتھی ملکوں سے کرتا ہے تو گویا اس کا ثبوت دیتا ہے کہ اس کے دل میں کینہ نہیں جو بد سلوکیاں اس کے ساتھ کی گئیں ان کی تلافی ہو جانے کے بعد وہ انھیں معاف کر سکتا ہے اور بھول سکتا ہے۔ البتہ ایک بات کا خیال رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس قسم کے معاہدے دولت مشترکہ کے ہر ملک سے الگ الگ کئے جائیں اور دو طرفہ ہوں، مثلاً جنوبی افریقہ کے ساتھ معاہدہ ہو تو صاف صاف یہ شرط کر لی جائے کہ ہندوستانی نسل کے لوگوں کے ساتھ جنوبی افریقہ میں کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے وزیر اعظم جنھیں ہندوستان کی عزت دل و جان سے عزیز ہے اس نکتے کو پیش نظر رکھیں گے۔

نیا رہبر، نئی منزل، نئی راہ

۲۸ نومبر ۱۹۴۸ء کو مسلم یونیورسٹی کے کورٹ نے بہ اتفاق رائے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو وائس چانسلر منتخب کیا۔ یہ ایک تاریخی فیصلہ ہے جس کی پوری اہمیت باہر سے دیکھنے والوں کو شاید اس وقت محسوس نہ ہو لیکن چند سال میں صریحی طور پر ظاہر ہو جائے گی۔ اس فیصلے کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کے رجعت پرست طبقے نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ برطانوی حکومت کا بند ٹوٹنے کے بعد وہ اب سیاسی، معاشی اور ذہنی ترقی پسندی کی رو کو علی گڑھ تک پہنچنے سے کسی طرح نہیں روک سکتا۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے جو اب سے بہت پہلے نظر آ جانی چاہئے تھی مگر دیا بہ غرض کو ان کی غرض اس طرح اندھا کر دیا کرتی ہے کہ اب بھی ہمارے ملک میں بہت سے لوگوں کو یہ کھلی ہوئی حقیقت دکھائی نہیں دیتی اور وہ ٹوٹے ہوئے بند کی جگہ مٹی کی دیواریں کھڑی کر کے سیلاب کو روکنا چاہتے ہیں۔ ہم مسلم یونیورسٹی کورٹ کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اس کی آنکھیں دیر میں سہی مگر کھل تو گئیں جہاں تک طلبہ اور اساتذہ کا تعلق ہے ان میں سے اکثر کے لئے یہ ایک دلی آرزو کی تکمیل ایک دیرینہ خواب کی تعبیر ہے۔ ان کو نیا رہبر، نئی منزل، نئی راہ مبارک۔

اقوام متحدہ کا ادارہ (بسلسلہ صفحہ ۳)

کو حل نہیں کر سکی لیکن اس کی وجہ سے کئی بار جنگ کے شعلے بھڑکتے بھڑکتے دب گئے اس کی وجہ سے متعدد مرتبہ دو حریفوں کو انتہائی اشتعال کی حالت میں جب وہ اعلان جنگ کا مہلک قدم اٹھانے والے تھے اور رکنے میں اپنی ذلت سمجھتے تھے، اس کا موقع مل گیا کہ اس کے روکنے سے عزت کو ہاتھ سے دیئے بغیر رک جائیں اور اپنے جھگڑوں کو پرامن طریقے پر حل کرنے کی کوشش کریں۔

کیا دو سال کی زندگی میں یہ کارنامہ کم ہے؟ انصاف سے کہئے؟

۲ - پاکستان

سندھ کی وزارت ابھی باقی ہے

مغربی پنجاب کے وزارتی جھگڑوں اور ضمناً صوبہ سرحد کی وزارت سے خانہ مسلم لیگ پارٹی کی بے اطمینانی کے متعلق "نئی روشنی" کی پچھلی اشاعت میں ہم روشنی ڈال چکے ہیں۔ اب رہی تیسرے صوبے ——— سندھ کی وزارت تو اس پر بھی وہاں کے عوام کو بھروسہ نہیں ہے۔ چنانچہ کافی دنوں سے اس کے خلاف لکھا اور کہا جا رہا ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اسے پاکستان کی مرکزی حکومت کی حمایت حاصل ہے۔ اس لئے باوجود عوام کی شکایتوں کے وہ ابھی تک باقی ہے۔ عرصہ ہوا، خواجہ ناظم الدین صاحب اور لیاقت علی خاں نے شکایتوں اور الزامات کی چھان بین کرنے کے لئے گورنر سندھ کو مقرر کیا تھا اور اس فیصلے کے فوراً ہی بعد وزیر اعظم سندھ پیر الٰہی بخش صاحب نے ایک بیان میں اس پر اطمینان اور گورنر سندھ پر اعتماد کا اظہار کیا تھا، آج کل گورنر سندھ، صوبے کے اہم مقامات کا دورہ کر رہے ہیں۔ معلوم نہیں وہ الزامات کی تحقیقات کر رہے ہیں یا وزارت کی مخالفت کو دور کرنے کی کوشش۔ وہاں کے وزارتی الجھاؤ کے سلسلے میں معاصر "پاکستان ٹائمز" کے نامہ نگار کراچی نے اپنے اخبار کو جو اطلاع بھیجی ہے وہ ملاحظہ ہو:-

"سندھ وزارت کے خلاف وہاں کے پریس نے جو جدوجہد شروع کی تھی وہ اسی جوش و خروش سے جاری ہے۔ جو اخبارات ابتدا میں الگ تھے، اب وہ بھی شریک ہو گئے ہیں، صرف سندھی "مجاہد" وزارت کی حمایت کر رہا ہے جس کے متعلق لوگوں کا خیال ہے کہ وہ وزیر اعظم پیر الٰہی بخش کا پروردہ ہے۔ سندھ گورنمنٹ کی اس وقت سب سے بڑی کوشش یہ ہے کہ وہ جلد سے جلد حیدرآباد سندھ منتقل ہو جائے۔ اس نزاع کی دو باتیں قابل لحاظ ہیں۔ ابھی تک سندھ اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی میں کسی قسم کا اختلاف ظاہر نہیں ہوا ہے اور سندھ کے وزیر اعظم روز بروز بڑھتے ہوئے الزامات کا جواب دینے کے بجائے سندھی عوام کی حمایت کا برابر دعوے کر رہے ہیں لیکن یہ صورت حال غالباً دیر تک باقی نہیں رہے گی۔"

سندھ میں پناہ گزینوں کی حالت زار

پچھلے دنوں مغربی پنجاب کے کیمپوں سے تقریباً دو لاکھ کے قریب پناہ گزین سندھ بھیجے گئے تھے۔ کراچی کے اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کی حکومت نے ان کی بحالی کے سلسلے میں اب تک کچھ نہیں کیا اور یہ بے چارے مارے مارے ادھر ادھر پھر رہے ہیں۔

پناہ گزینوں کی بحالی کا مسئلہ سارے پاکستان کا مسئلہ تھا، اور یہ کسی ایک صوبے کا مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حکومت سندھ نے اس معاملے میں اپنے فرائض کو صحیح طور پر سر انجام نہیں دیا۔ سندھ سے جو غیر مسلم گئے اور جو بھی وہ زمینیں اور جائدادیں چھوڑ کر گئے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ان میں پناہ گزینوں کو آباد کیا جاتا لیکن ہوا یہ کہ ان زمینوں اور کارخانوں کو وہاں کے بڑے بڑے زمینداروں نے ہتھیا لیا ہے۔ اور اب ان کی یہ کوشش ہے کہ وہ اس پر قابض رہیں اور پناہ گزینوں کو اپنے ہاں آنے نہ دیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ پناہ گزینوں کی آزادی کی راہ میں روڑے اٹکا رہے ہیں۔ اور ان کی بحالی میں نہ صرف یہ کہ کوئی مدد نہیں دیتے بلکہ الٹا ان کے خلاف منافرت کے جذبات پیدا کر رہے ہیں۔

مرکزی حکومت سے وزیر مہاجرین خواجہ شہاب الدین نے اپنے ایک بیان میں ایسے لوگوں کو متنبہ کیا ہے اور کہا ہے کہ جو شخص بھی خواہ وہ کتنے ہی بڑے عہدے پر کیوں نہ ہو، مہاجرین کی بحالی میں مخل ہوگا، اسے سختی سے کچل دیا جائے گا۔

دیکھنا یہ ہے کہ اس تنبیہ کا عملی نتیجہ کیا نکلتا ہے اور سندھ کے بڑے زمیندار اس معاملہ میں مرکزی حکومت کے ساتھ کہاں تک تعاون کرتے ہیں۔"

(آفاق، لاہور)

ملیریا سے تباہی

مغربی پنجاب کے ایک بہت بڑے حصے میں ——— مانٹگمری، سیالکوٹ، گوجرانوالہ، شیخوپورہ اور ملتان کے بعض علاقوں میں بہت شدید ملیریا پھیلا ہوا ہے اور معاصر "پاکستان ٹائمز" کے بیان کے مطابق "ہزاروں آدمی روزانہ مر رہے ہیں اور دیہاتوں کے لکھوکھا مریض دوا کے لئے ترس رہے ہیں۔" اس نامہ نگار نے یہ بھی لکھا ہے کہ بعض گاؤں ایسے بھی ہیں جہاں بغیر کسی مبالغے کے سب کے سب بیمار ہیں، نہ کوئی تیمارداری کرنے والا ہے اور نہ کوئی جانوروں کی دیکھ بھال کرنے والا ہے، اور سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ نہ تو دوائیں ہیں اور نہ ڈاکٹر اور نہ کمپونڈر۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مریضوں کا یہ سیلاب لاہور کی طرف منتقل ہو گیا ہے، لیکن یہاں کے ہسپتال بھی بھر چکے ہیں۔ نامہ نگار لکھتا ہے کہ روزانہ ۵۰ سے ۷۵ فی صدی مریض جنرل وارڈ سے مایوس اور ناکام واپس جاتے ہیں اور ٹی بی وارڈ سے ۹۰ فی صدی۔ اور یہ سب کے سب یا تو گھروں میں بغیر ڈاکٹر اور دوا کے مر رہے ہیں یا سڑکوں پر۔ مغربی پنجاب کی وزارت کے لئے یہ بہت ہی ابتلا اور آزمائش کا موقع ہے۔ دیکھئے وہ اس موقع کی نزاکت کو محسوس کر کے لوگوں کی قیمتی جانوں کو بچانے کی طرف فوری توجہ کرتی ہے یا اپنی وزارت کو مضبوط کرنے میں لگی رہتی ہے۔

فریاد!

"پاکستان کی خارجی پالیسی ایک معما بن گئی ہے۔ ایک ناقابل فہم راز ایک عقدہ لاینحل ——— موت و زیست کے دوراہے پر کھڑا ہوا ——— ہر پاکستانی متحیر ہے کہ بین الاقوامی دنیا میں پاکستان کا ہمدرد کون ہے؟ ایک سال سے زیادہ عرصہ گذر گیا پاکستان قائم ہوئے لیکن روس میں پاکستان کا سفیر ابھی تک مقرر نہیں ہوا ہے حالانکہ ہندوستان کا سفیر ایک مدت سے کام کر رہا ہے۔ پیرس میں نہرو نے وشنسکی سے ملاقات کی۔ لیکن مسٹر لیاقت علی کی وشنسکی سے ملاقات کی کوئی خبر نہیں آئی ہے ......

نئے خطرے سامنے آ رہے ہیں۔ منزل دور ہے اور سفر میں کوئی ساتھ نہیں ہے بین الاقوامی زمانے میں یہ تنہائی نہایت خطرناک ہے۔ وزیر اعظم پاکستان سے لندن میں ایک نامہ نگار نے سوال کیا کہ عرب ریاستوں کا ایک بلاک یا سلسلہ تعلق قائم کرنے کا کوئی سوال ہے؟ وزیر اعظم پاکستان نے جواب دیا کہ "پاکستان دولت مشترکہ کا ایک رکن ہے اور وہ ہرگز کوئی مسلم بلاک نہیں ہے۔ اگر آپ کا یہ مقصد ہے کہ ہم اسلامی ممالک سے کوئی سیاسی دھڑا بندی کرنا چاہتے ہیں تو اس وقت اس کا کوئی خیال نہیں ہے۔"

وزیر اعظم پاکستان کے اس بیان پر ہم خود کوئی تبصرہ نہیں کریں گے۔ لیکن لندن میں مسلم برادر ہڈ (اخوان المسلمین) نے وزیر اعظم پاکستان سے سوال کیا ہے جو حسب ذیل ہے:-

"جنوبی افریقہ جس نے دولت مشترکہ کے ممالک میں سب سے پہلے اسرائیلی حکومت کو تسلیم کیا، اور برطانیہ جو عربوں کے مصائب کا اول اور آخر ذمہ دار ہے اور دنیا کے دوسرے حصوں میں رہنے والے مسلمانوں کے مصائب کا بھی اور آسٹریلیا جہاں کوئی پاکستانی اپنے رنگ کی بنا پر شہری تک نہیں بن سکتا اور کنیڈا جو امریکی صیہونیت سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔ یہ سب کس طرح ایسی برادری قرار دئے جا سکتے ہیں جس کی رکنیت، پاکستان جو ایک اسلامی ملک ہے قبول کرے۔"

...... ان حالات میں پاکستان جس نازک مرحلہ پر کھڑا ہے، وہ فوری توجہ کا طلب گار ہے۔ ہمارا دل خون کے آنسو رو رہا ہے اور ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ پاکستان کی خارجی پالیسی کیا ہے؟!"

(روزنامہ انجام، کراچی)

روس کا گیہوں مشرقی پاکستان میں

مشرقی پاکستان کی غذائی حالت ویسے بھی قابل اطمینان نہیں ہے۔ مگر پچھلے مہینوں سیلاب کی وجہ سے کوئی بیس لاکھ ایکڑ کاشت کو نقصان پہنچا جس سے تقریباً ڈھائی لاکھ ٹن دھان تباہ ہو گیا۔ اس اچانک تباہی اور غیر متوقع نقصان سے اناج کی قیمت ایکدم سے کئی گنی بڑھ گئی اور عوام کی دقتوں میں کئی چند اضافہ ہو گیا۔ ابھی حال میں چار لاکھ من روسی گیہوں وہاں بھیجا گیا ہے اس سے اناج کی قیمتوں پر خفیف سا اثر پڑا ہے۔ حکومت پاکستان نے کراچی اور بعض دوسرے مقامات سے مزید گیہوں اور چاول بہت جلد بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔ امید ہے کہ اس طرح مشرقی پاکستان کا بہت بڑا خطرہ ٹل جائے گا۔

(ع، ل)

۳۔ باہر کی دنیا

مضطرب غیر دن یہ ہو جس کی اُمید

وزن بہلنے کی چھٹی منانے کے بعد پریذیڈنٹ واشنگٹن واپس آگئے ہیں جن اہم مسائل کا ان کو فیصلہ کرنا ہے ان میں چین کی مدد کرنے کا مسئلہ سب سے مقدم ہے واپسی کے بعد سب سے پہلے انھیں مسٹر کلارک کی رپورٹ ملی ہوگی، جسے انھوں نے چین کے دورہ کے بعد مرتب کیا ہے مسٹر کلارک کی چین کی امداد کے متعلق رائے سب کو معلوم ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر چین کو کمیونزم سے بچانا ہے تو ضروری ہے کہ (۱) فوراً اور وسیع پیمانے پر ہر قسم کے سامانِ جنگ اور ہتھیار سے براہ راست اس کی مدد کی جائے۔

(۲) اتنی مالی امداد دی جائے کہ اندرونی بجٹ کا بوجھ بڑی حد تک ہلکا ہو جائے اور سکہ کا اُتار چڑھاؤ کم ہو جائے۔

(۳) اخراجات کی دیکھ بھال اور سخت نگرانی کی جائے۔

لندن ٹائمز کے نامہ نگار، پیکنگ (چین) کی تازہ اطلاع یہ ہے کہ چین کی مزید امداد کے سلسلے میں جنرل میک آرتھر جنرل سیمو چیانگ کائی شیک سے گفتگو کرنے کے لئے جا رہے ہیں۔ وہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کمیونزم کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے کس قدر سامان جنگ اور رقم کی ضرورت ہوگی۔ امریکہ کے مدبرین کا یہ عام خیال ہے کہ چین کی ہوائی کمان امریکی افسروں کے ہاتھ میں ہونی چاہیے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو مشورہ کا کوئی موثر اور کارگر طریقہ اختیار کیا جائے۔ ورنہ امریکا کی امداد چین کے "مردِ بیمار" کو بچانے میں کامیاب نہیں ہو سکے گی۔

کانفرنس سے کام نہیں چلے گا

چین میں کمیونزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے جمہوری طاقتیں بڑی پریشان ہیں۔ وہ سوچتی ہیں کہ اگر چین میں کمیونسٹ راج قائم ہو گیا تو پھر جنوب مشرقی ایشیا کو کمیونزم سے بچانا ناممکن ہو جائے گا ملایا ابھی سے کافی متاثر ہو چکا ہے، ہانگ کانگ پر کمیونسٹوں کی نظریں لگی ہوئی ہیں، بنکاک کے تیس ہزار کمیونسٹوں کی وجہ سے سیام بھی خطرے میں ہے برما میں اگرچہ کمیونسٹ بڑی حد تک دبائے گئے ہیں مگر چین کی کامیابی سے یہاں کی شورش کو تقویت ملے گی، بلکہ ممکن ہے کہ وہ شمالی برما کا جسے چینی نقشے میں چین کا علاقہ دکھایا جاتا ہے مطالبہ کریں۔ فرانسیسی ہند چینی میں، کمیونسٹوں نے قومی تحریک پر قبضہ کر لیا ہے۔ انڈونیشیا میں بھی کمیونسٹ پارٹی ایک زندہ اور طاقت ور جماعت ہے غرض پورا جنوب مشرقی ایشیا کمیونزم کا گہوارہ بنتا جا رہا ہے اور اگر چین انھوں نے فتح کر لیا یا کچھ حصے میں بھی باقاعدہ اور مضبوط حکومت قائم کر لی تو پورا جنوب مشرقی ایشیا ایک مضبوط مرکز ہو جائے گا۔ انھیں باتوں پر سوچ بچار کرنے کے لئے ابھی حال میں سنگاپور میں برطانوی سیاسی مدبرین اور جنوب مشرقی ایشیا کے نوآبادیات کے گورنروں کی دو روزہ کانفرنس ہوئی تھی لیکن ظاہر ہے اب کمیونزم کے مسئلے کو کانفرنسوں سے حل کرنا مشکل ہے۔ اس کی جڑیں بہت گہری اور بڑی مضبوط ہیں۔ اس کا پھیلاؤ صرف جنوب مشرقی ایشیا ہی تک محدود نہیں ہے، دنیا کا بڑا حصہ اس کے زیرِ اثر ہے۔ اس لئے محض طاقت کی دھونس سے یا طاقت کے استعمال سے اسے دبانا ممکن نہیں ہے۔ عقلمندی اس میں ہے کہ جن بیماریوں کو دور کرنے کے لئے کمیونزم کی حد سے زیادہ تیز اور خطرناک دوا تجویز کی گئی ہے ان کا کوئی معقول اور معتدل علاج تلاش کیا جائے۔

روس کی نئی چال

روس نے جس غرض سے برلن کی ناکہ بندی کی تھی وہ بظاہر اب پوری ہوتی نظر نہیں آتی اور مغربی طاقتیں اس سردی میں بھی ہوائی جہاز سے ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے میں پچھلے سال کی طرح کامیاب رہیں تو روس کو بساطِ سیاست پر کوئی نئی چال چلنی پڑے گی۔ امریکہ کے "نیوز ویک" کا خیال ہے کہ روس مشرقی جرمنی سے بہت جلد اپنی فوجیں ہٹا لے گا اور اپنا علاقہ جرمن کمیونسٹوں کے حوالے کر دے گا۔ اس خیال کی ائید بھی تائید ہوتی ہے کہ جرمن کمیونسٹ پارٹی کے سرکاری اخبار "نیا جرمنی" نے ابھی حال میں لکھا تھا کہ "جرمن عوام اور دنیا کی امن کی خاطر سوویٹ ملٹری حکومت کو ختم کیا جا رہا ہے .... روسی قبضہ کی ضرورت دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے"۔

جرمنی کے برطانوی کمانڈر نے اس کی تصدیق کی ہے کہ روس جرمنوں کی کوئی چار لاکھ فوج تیار کر رہا ہے جو بکتر بند گاڑیوں اور بھاری مشین گنوں سے مسلح ہوگی۔ روس اپنی فوجیں ہٹاتے وقت اپنا علاقہ اُن کے حوالے کر دے گا۔ صرف ایک معمولی محافظ فوج برلن میں باقی رہے گی۔ لیکن اگر دوبارہ قبضہ کرنے کی ضرورت پڑی تو اس کی بھی پیش بندی کر لی گئی ہے۔ پولینڈ کی سرحد سے کم سے کم وقت میں بڑی سے بڑی فوج بھیجی جا سکے گی اس چال سے مغربی طاقتوں کے خلاف روس کا پروپگنڈا زیادہ کارگر ثابت ہو سکتا ہے اور جو مقصد برلن کی ناکہ بندی سے پورا نہیں ہوا تھا وہ شاید اس طرح پورا ہو جائے۔

ڈیگال کا زور بڑھ رہا ہے

ابھی حال میں فرانس کے ایوانِ اعلیٰ کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔ ان ۶۹ نشستوں میں سے جن کے لئے انتخاب ہو چکا ہے، ۹۹ جنرل ڈیگال کے حامیوں نے حاصل کی ہیں اور کمیونسٹوں کی تعداد ۵۰ سے گھٹ کر صرف ۱۶ رہ گئی ہے۔ نوآبادیوں کے نمائندے، جو ابھی منتخب نہیں ہوئے ہیں، کمیونسٹوں کی تعداد میں شاید ہی کوئی اضافہ کریں۔ ان میں سے بیشتر جنرل ڈیگال کے حامی یا ریڈیکل سوشلسٹ یعنی کسی قدر قدامت پسند ہوں گے۔ جنرل ڈیگال اب یہ خواب دیکھ رہے ہیں کہ وہ نیشنل اسمبلی کا بھی دوبارہ انتخاب کرائیں اور اس میں اتنی نشستیں حاصل کر لیں گے کہ ایک مضبوط اور دیرپا حکومت قائم کر سکیں۔

نیشنل اسمبلی کے مقابلے میں چیمبر (ایوان اعلیٰ) کے اختیارات بہت محدود ہیں، لیکن اگر کوئی تعطل پیدا ہوا، تو ممکن ہے وہ اسمبلی کو توڑ کر دوبارہ انتخاب کرانے میں کامیاب ہو جائیں۔ بہرحال آیندہ کے چند ہفتوں میں صحیح حالت کا اندازہ ہو سکے گا کہ نیشنل اسمبلی کے الیکشن کا سوال کیا صورت اختیار کرتا ہے۔ آیا ڈیگال کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوتی ہے یا موجودہ حکومت ہی کو جیسے تیسے کام چلانا ہوتا ہے فرانس کی وزارتیں بہت جلد جلد بدلتی رہتی ہیں مگر وزیر بیشتر وہی لوگ رہتے ہیں، جو یہ خطرہ پیدا ہوا تھا کہ کمیونسٹوں کی مخالفت حکومت کا کام بند کر دے گی وہ کسی حد تک دور ہو گیا ہے اور یہ بھی ایک بڑی بات ہے۔

کوئی خوش کوئی خفا

پریذیڈنٹ ٹرومین کی کامیابی پر مختلف ملکوں نے مختلف اور متضاد اثرات قبول کئے ہیں۔ امریکہ کے مشہور ہفتہ وار "نیوز ویک" نے اپنی تازہ اشاعت میں تمام اہم ملکوں کے ردعمل کی تفصیل شائع کی ہے۔ اس سلسلے میں برطانیہ کے متعلق اس نے لکھا ہے:۔

"منگل کی رات کو لندن کے عوام حسب معمول اپنے کام اور خرید و فروخت میں لگے تھے۔ امریکن کالونی میں صرف مٹھی بھر آدمی انتخاب کے نتیجے کے انتظار میں رات کو جاگتے رہے۔ بدھ کے دن سہ پہر کو یہ لوگ شراب میں مست، پریشان مو، خستہ حال، قہوہ خانوں میں دودھ اور برانڈی کے سہارے پر کان لگائے بی بی سی کی خبروں کے بلیٹن سن رہے تھے برطانوی حکومت کے ارکان امریکی رجعت پسندی کی شکست پر باغ باغ تھے ان کا خیال تھا کہ مغربی براعظم میں بائیں بازو کا زور بڑھ رہا ہے اور ۱۹۵۰ء کے الکشن میں، یہاں سوشلسٹوں کی کامیابی کے لئے یہ اچھا شگون ہے۔ لیبر لیڈروں نے یہ نتیجہ نکالا کہ امریکہ کے مزدور طبقے نے قیمتوں کے کنٹرول، مزدوروں کی پابندیوں کی تنسیخ، شہری حقوق اور سماجی تحفظ کے حق میں ووٹ دیا ہے۔ اور دل ہی دل میں فخر کرنے لگے کہ ہم نے امریکہ کو جمہوری اشتراکیت کا راستہ دکھایا ہے۔ قدامت پسندوں میں سے اکثر اپنی تشویش کو چھپانے میں ناکام رہے مگر بڑے بڑے سرمایہ داروں نے عام طور پر ضبط سے کام لیا، ایک کارخانے کے مالک نے اپنے ایک امریکن دوست سے کہا: مصیبت یہ ہے کہ تم امریکہ کے لوگ دراصل چاہتے ہی نہیں کہ کوئی حکومت ہو"۔

غریب ہنری والس کو سوائے کمیونسٹوں کے کسی نے نہیں پوچھا۔ سوائے ہوٹل میں ایک حجام نے ایک امریکن سے کہا "کوئی اور شخص بھی تو امیدوار تھا"۔ (ع، ل)

مہاتما گاندھی کی یاد میں

محمد یحییٰ اعظمی

صحیفِ دل کو ضبط کا یارا نہیں رہا
تسکینِ غم کا کوئی سہارا نہیں رہا

آنکھیں ہیں نم کہ آج اُٹھا محسنِ حیات
غم ہے کہ غمگسار ہمارا نہیں رہا

روشن تھا دہر جس سے وہ قندیل بجھ گئی
بھارت کی آنکھ کا تھا جو تارا نہیں رہا

خاکِ وطن تھی جس کی ضیاؤں سے جلوہ ریز
وہ حق کی روشنی کا منارا نہیں رہا

"بزمِ دعا" ہے دیر سے سونی پڑی ہوئی
روحانیت کا انجمن آرا نہیں رہا

اس بیسویں صدی میں مثلِ کرشن و بدھ
جس نے زمانہ اپنا گزارا نہیں رہا

صدقے تھا جس پہ حکمت و روحانیت کا درس
حق کا وہ اک لطیف اشارا نہیں رہا

حق کے لئے وطن کے لئے، قوم کے لئے
سب کچھ کیا تھا جس نے گوارا نہیں رہا

لاٹھی کو ٹیکتا ہوا سرتا قدم جہاد
تھا جو مصافِ حق میں صف آرا نہیں رہا

دنیا کی مشکلات و موانع کے سامنے
جو آج تک کبھی نہیں ہارا نہیں رہا

روکا تھا جس نے وقت کا طوفاں گزر گیا
پھیرا تھا جس نے دہر کا دھارا نہیں رہا

دے کر جہانِ عصر کو پیغامِ آشتی
خود جس نے بار بار پکارا نہیں رہا

اُجڑے چمن کو جس نے نویدِ بہار دی
خاکِ وطن کو جس نے سنوارا نہیں رہا

وہ جس کی رام دھن میں تھے وحدت کے زمزمے
وہ جس کو حق کا نام تھا پیارا نہیں رہا

دردا وہ حق شناس و حق آگاہ اُٹھ گیا
امن و سلامتی کا نقیب آہ اُٹھ گیا

مہمیز

باقر رضوی

جہانِ تیرہ و تاریک میں مہرِ مبیں ہوجا
کتابِ زندگی میں ایک حرفِ دلنشیں ہوجا

فزوں کرنا ہیں تجھ کو حسن کی رعنائیاں ہر دم
تبسم بن نہیں سکتا اگر چینِ جبیں ہوجا

مریضِ دہر کے منہ کا مزا تجھ کو بدلنا ہے
ہلاہل پی نہیں سکتی ہے دنیا انگبیں ہوجا

تجھے تخمِ محبت سے نئے پودے اُگانا ہیں
جلادے خرمنِ تہذیب برقِ آتشیں ہوجا

بساطِ قلب پر ہر روز تازہ انقلاب آئے
قدم سے نے کے سر تک لغزشوں کی سرزمیں ہوجا

جہاں میں اہلِ دل کچھ سوچ کر منتکشِ غم ہیں
خدا توفیق دے تجھ کو اگر اندوہگیں ہوجا

شکوک و شبہات رہبر ہیں گزرگاہِ تجسس میں
نہ ہو گر جرأتِ تشکیک محتاجِ یقیں ہوجا

غزل

سحر رامپوری

یہ اگر سچ ہے کہ دل اس غم کے شایاں ہوگیا
موت کہتے ہیں کسے جینے کا ساماں ہوگیا

جو بھی کچھ ہو، دیکھنا ٹھہرا ہی رنگِ داستاں
وہ پشیماں ہوگئے، یا میں پشیماں ہوگیا

پھول مہکے تھے کہ وہ یاد آگئے، دل رو دیا
مفت ہی میں اہتمامِ شامِ ہجراں ہوگیا

معترف ہوں، زندگی سے بڑھ کے کیا ہوگا کرم
منفعل ہوں، میں ہی ثابت تنگ داماں ہوگیا

جانے کیا دیوانگی میں کہہ گیا پھولوں سے میں
دیکھتا ہوں کچھ سے کچھ رنگِ گلستاں ہوگیا

ڈوبنے والے سے کچھ ہی دور تھا ساحل، مگر
دیکھتے ہی دیکھتے، موجوں سے طوفاں ہوگیا

میری شامِ غم کے بارے میں ستاروں سے کہو
دل کے داغوں نے جہاں کو دی، چراغاں ہوگیا

اکبری نشتر (۲)

اکبر ـــــــ اور ـــــــ انقلاب

طالب الہ آبادی

کہو یہ رندان ایشیا سے کہ بزم عشرت کے ٹھاٹھ بدلے
اٹھان کمبخت لا ہے اب سدیں کا کوئی پوسٹ جان کی وہ ڈولی

حریم ناز کی جگہ ڈرائنگ روم، چوپڑ کی جگہ پوکر، نرم نرم گل تکیوں اور زانو تکیوں کی جگہ کشن، پیچوان کی جگہ سگریٹ ہر چیز میں آسانیاں، ہر سامان تہذیب حاضرہ کا آئینہ دار، اور پھر تکلفات کے بجائے بے تکلفی ۔ نرمی و آہستگی کے بجائے تیز روی ۔ اگر اب بھی ایشیا والوں کی آنکھ نہ کھلی تو ظاہر ہے کہ یورپ والے ہمارے عشرت میں پرّاں نظر آئیں گے ۔ اور ایشیائی غریب انسان اپنی ہتھیلیوں پر تھ تھ کرتے دکھائی دیں گے ۔

جو گزرو گے ادھر سے میرا اُجڑا گاؤں دیکھو گے
شکستہ ایک مسجد ہے بغل میں گورا بارک ہے

گورے ہندوستان سے دو سو برس مہمان رہ کر رخصت ہو گئے ۔ مگر ان کے آثار و نقوش اب بھی باقی ہیں اور یہ نشتر تو آج سے ۲۰، ۲۵ برس پہلے کا ہے اس وقت تک تو کم و بیش ہر جگہ کا یہی عالم تھا ۔ انقلاب زندہ باد! مسجدیں پاکیزگی کا مخزن سہی، نور ربانی کا خزانہ سہی عمارت تو اینٹ، پتھر، لکڑی لوہے کا ہی مجموعہ ہے ۔ لوگوں کی بے نیازیوں اور زمانے کی چیرہ دستیوں کا مقابلہ کب تک ہو سکتا ہے ۔ نہ مرمت نہ دیکھ بھال ۔ لطف یہ ہے کہ ہمسایوں کو اپنی اپنی پڑی ہوئی ۔ ایسے میں یہی نتیجہ ہونا چاہیے تھا جو ہوا ۔

مغرب کی لیڈیوں نے اسٹیج کو سنوارا
بجنے لگا پیانو چپ ہو گیا چکارا

چکارا چپ ہوا تو دلارام سارنگی ستار، جل ترنگ اکتارہ بھی خاموش ہو گئے ۔ اب پھر بولنے لگے ہیں ۔ اور امید ہے کہ بہت جلد اپنی روحانی منزلوں تک پہنچ کر قوالی، سماع بھجن اور پرارتھنا کی زینت بن سکیں گے ۔

اکبری نشتر کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ نفس فسانہ نویس کی طرح وہ بھی صرف واقعات کی تصویر کشی کر کے خاموش ہو جاتے ہیں ۔ خود ساختہ مصلح کی طرح خواہ مخواہ ہر بات پر اچھائی برائی کی مہریں نہیں لگاتے ۔ روشن اور تاریک پہلو ایک ساتھ دکھا کر معنی خیز خاموشی اختیار کر لیتے ہیں تاکہ آپ خود سوچیں اور فیصلہ کر لیں ۔

عقل سپرد ماسٹر، مال سپرد آں جناب
جان سپرد ڈاکٹر روح سپرد ڈارون

تعلیم جیون کا سنگھار رہی، مگر اکبری نشتر اس دور کا مختصر ہے ۔ جب تعلیم کا مقصد صرف اتنا تھا کہ بدیسی حکومت کو برقرار رکھنے کے لئے اچھے دفتری منشی پیدا ہو سکیں ۔ حاکم ایک مٹھی سہی مگر سارے ہندوستان پر چھائے ہوئے تھے، اور ہر کلیدی نقطے پر جمے ہوئے تھے ۔

رہا مال وہ ہر دھیر مختلف ٹیکسوں کی نذر ہو کر بڑی حفاظت سے سرکاری خزانے کی زینت بن جاتا تھا ۔ مختلف منزلوں سے گذر کر چلتی پھرتی چھاؤں کی طرح کہیں کا کہیں پہنچ کر جذب ہو جاتا تھا ۔ رہی سہی صحت تھی اس کے ہر موڑ پر ڈاکٹر صاحب کے سہارے کی ضرورت پڑنے لگی، کھانسی آئی مکسچر تیار، بخار آیا گولی کی بھرمار، آیورویدک اور طب یونانی کو کون پوچھے؟

ہو چکا ہے آج تک ترسٹھ عناصر کا ظہور
آپ آب و باد و خاک و نار رہنے دیجئے

جان ڈاکٹر کے سپرد کیسے نہ ہو۔ جراحی کی چابکدستیاں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ دانت میں درد ہو تو دانت اور آنت میں الجھن ہو تو آنت نکال دیں ۔ آنکھ، غدود، گردے یا اسی قسم کی دُہری دُہری چیزیں جو فطرت نے جذبہ فیاضی میں فالتو بنا دی ہیں ان میں سے ایک ایک نکال کر کام چلا دیتے ہیں ۔ ایک پھیپھڑا خراب ہونے لگا تو فوراً ماؤف کر دیا ۔ آدمی بچ گیا ۔ ڈھچر ہو گیا مگر سانس لیتا رہتا ہے ۔ جان سب کو پیاری ہے ۔ ناک کٹ جائے تو پروا نہیں، اچھی سی سولتواں ناک جوڑ دی جائے گی ۔ آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے موتیوں کی لڑی مل جائے گی ہاتھ اور پاؤں بدل دینا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے ۔ روح البتہ بیچاری یوں ہی رہ گئی اور سچ پوچھئے تو دنیا میں اس کی ضرورت ہی کیا تھی ۔

غریب ہندوستانی روحانیت کے سہارے جی رہے تھے ۔ یورپ کی ستم ظریفی دیکھئے ۔ روح کا نام ہوا اسے محرک ہو گیا گھڑی کے پرزوں کی ترکیب سے جس طرح گھڑی میں جان آ جاتی ہے، اسی طرح ہمارے اعضائی ترتیب سے ہم میں روح موجود رہتی ہے ۔ ڈارون صاحب نے تو کمال ہی کر دیا، ایک حکیمانہ نظریہ ارتقا سے ثابت فرما دیا کہ ہمارے مورث اعلیٰ لنگور اور بندر تھے ۔

ڈارون صاحب حقیقت سے نہایت دور تھے
میں نہ مانوں گا کہ مورث آپ کے لنگور تھے

مگر خم خانۂ تہذیب کے دل دادہ اس نئی کشید کو اچھوتی کیوں کر رہنے دیتے ۔ یورپ سے آئی ہوئی اور آسمانوں سے اتری ہوئی ایک ہے ۔ یہ نظریہ بھی جست و خیز سے بھرا ہوا، سرعت اور رفتار میں سمویا ہوا تھا ۔ اب جوانی دیوانی نہیں ۔ بڑھاپا چھا رہا ہے ۔ چہرہ ڈھل رہا ہے مگر ٹھاٹھ وہی ہے، آن بان وہی اور ظاہر ہے کہ جب تک شیر، ہاتھی، شتر مرغ یا کوئی اور عظیم الجثہ جانور ہمارا مورث قرار نہ پائے بندر ہی بندر اسلاف میں نظر آئیں گے

جب ہر چیز دوسروں کے سپرد ہو گئی تو پھر
پڑھے گنگناتے تھے لالہ نرنجن

نہ آنکھوں میں اٹھان نہ دانتوں میں منجن
چھٹے ہم سے بالکل وہ اگلے طریقے
کہاں کھینچ لے جائے گا ہم کو انجن

قافیہ نمائی سمجھئے یا خیال آرائی ۔ شاعر کے پاس الفاظ کے سوا اور کوئی ذریعہ خیالات کے اظہار کا نہیں ہے ۔ انقلابی دور میں سب کو اپنی اپنی پڑی ہے ۔ لالہ نرنجن سے کوئی خاص ہستی مقصود نہیں، نہ ہو سکتی ہے ۔ نام تو محض مثالی طور پر ہوتے ہیں ۔ مولوی نظر ہوں یا منشی برق، پنڈت ترویدی ہوں یا ملا عالم ۔ نام پر نہ جائیے ۔ نگینہ پرکھئے ۔

ٹوتھ پیسٹ اور ٹوتھ پوڈر، سرمہ اور منجن کی جگہ، ٹوتھ پاؤڈر منجن کے بجائے استعمال ہوں تو سادگی اور بچپن کا زمانہ کیوں یاد نہ آئے، اور فضا میں "ٹھارہ" کیوں نہ سنائی پڑے ۔

حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا
پانی پینا پڑا ہے پائپ کا

پیٹ چلتا ہے آنکھ آئی ہے
شاہ ایڈورڈ کی دہائی ہے

جب سر پر آ جاتی ہے تو انسانی فطرت ہے کہ ہر مصیبت جھیل لی جاتی ہے ۔ مگر لسان العصر اکبر کی دور بین نگاہیں انقلاب کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی مدتوں پہلے امید کی روشن تصویریں دیکھ لیتی تھیں ۔

عزیزان وطن کو پہلے ہی سے دیتے ہوں نوٹس
چرٹ اور چائے کی آمد ہے حقہ پان جاتا ہے

ہم پر کچھ روز انگریزیت اور مسلط رہتی تو حقہ کا نام نہ رہ جاتا، پان ڈھونڈھے سے نہ ملتا، مگر وہ تو کہیے کہ ہم بال بال بچ گئے ۔

دیکھئے تو جہاں کوئی مزاحیہ پہلو کسی چیز میں نظر آیا اکبر اس سے خود بھی لطف اندوز ہوتے ہیں دوسروں کو بھی محظوظ کرتے ہیں ۔

یہ اتنی گو شمالی طفل مکتب کی نہیں اچھی
زباں آئی تو ہے اس کو سبق ہے لیکن کان جاتا ہے

سنتے ہیں مکتب کے مولوی بڑے تنگ دل ہوتے تھے، بچوں سے چلمیں بھرواتے، پاؤں دبواتے، پانی کھنچواتے اور جب غصہ آتا تو نیم کی پتلی قمچیوں سے زائد کھال ادھیڑ دیتے ۔ مگر شکنجہ میں بھی کچھ باقیات الصالحات ابھی تک ہیں جو کہنے کو تو انگریزی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں مگر طبیعت میں ہیمانہ جوش خونخواری اور مزاج میں بے جا تاناشاہی اب بھی موجود ہے لطف یہ کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ معصوم اور نادان بچوں کو پیٹنے کا نقصان ہی نقصان ہے تو ان کے گلے سے نیچے یہ بات اترتی ہی نہیں، اس کی وجہ کچھ تو افتاد طبیعت ہے اور کچھ جذبہ انتقام ایسے بے سلیقہ مولوی کی زندگی کا اگر جائزہ لیا جائے تو یقیناً وہ اپنے بچپن میں خوب پٹ پٹا کر بے حیا ہو چکے ہوں گے شکر ہے کہ محکمہ تعلیم نے بہ دیر سہی اکبری نشتر سے سبق لیا ہے اور اب بید بازی اور ڈنڈے بازی موقوف ہو گئی ہے ۔ بچوں کی تربیت کا اصلی راز تو یہ ہے کہ آپ ان کو ان کی سمجھ کے مطابق اچھائیوں کی طرف مائل کر دیجئے، ورنہ ممکن ہے گھونسے اور چپت سے آپ کے وحشیانہ جذبے کو تسکین ہو جائے مگر بچہ جسمانی اور روحانی طور پر ناکارہ ہو کر سماج پر ایک بوجھ بن جائے گا ۔

ایران کا تعلیمی نظام (۱)

عبد الحلیم ندوی

رضا شاہ پہلوی کے عہد حکومت سے پہلے دو سو برس صدی سے قبل، ایران کی تعلیمی دنیا پر پوری طرح غیر ملکیوں کا قبضہ تھا، خاص ایران میں جتنے بھی ترقی یافتہ اور نئی قسم کے تعلیمی ادارے تھے ان کی بنیاد انھیں لوگوں نے رکھی تھی، اور یہی ان کے کرتا دھرتا تھے۔ اس میں شک نہیں کہ رضا شاہ پہلوی نے برسر اقتدار آنے کے بعد بہت کچھ کیا لیکن پچھلی حکومت نے بھی اس سلسلے میں اپنی بساط بھر سرگرم قدم اٹھائے تھے۔ ۱۸۵۱ء میں دار الفنون جیسی مشہور یونیورسٹی کا قیام اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ ۱۸۸۲ء میں دوسرا مدرسہ تبریز میں حکومت نے اپنے صرفے سے قائم کیا جس میں ایرانی اور یورپی اساتذہ دونوں کام کرتے تھے، فوجی تعلیم کے لئے اب تک کوئی مدرسہ نہ تھا، چنانچہ حکومت نے ۱۸۸۳ء سے اس کی ابتدا کی اور اصفہان میں پہلا فوجی مدرسہ بنایا اور پھر دوسرا مدرسہ ۱۸۸۶ء میں طہران میں بنایا۔ لڑکیوں کی تعلیم کی طرف سے بھی اب تک غفلت سے کام لیا گیا۔ حکومت نے اس کو محسوس کیا اور ۱۸۹۵ء میں سب سے پہلا لڑکیوں کا مدرسہ آذربائیجان کے ایک مقام پر کھولا گیا ——— پچھلی حکومت نے اپنی بساط بھر ان سب کاموں کی ابتدا تو کی لیکن باقاعدگی اور منصوبہ بندی کے ساتھ نہیں۔ اس کام کو رضا شاہ پہلوی نے انجام دیا۔

رضا شاہ پہلوی نے زمام حکومت سنبھالتے ہی سب سے پہلے تعلیم کی طرف توجہ کی اور قومی مدرسوں کے لئے ایک مجلس تعلیمی تشکیل دی تھی جس میں اس زمانے کے اکثر مشاہیر اور ماہرین تعلیم شامل کئے گئے۔ اس مجلس نے اپنے اہتمام میں مدرسوں کے قیام کا سلسلہ شروع کیا اور دیکھتے دیکھتے ہی سارے ملک میں مدرسوں کا جال پھیلا دیا۔ ان میں سے بعض میں مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ اور بعض اقامتی تھے مجلس نے جو مدرسے قائم کئے ان میں سے اکثر خاص مضامین کی تعلیم کے لئے مخصوص تھے۔ چنانچہ اس قسم کا ایک مدرسہ تھا جہاں عربی، فارسی، حساب اور حروف تہجی کے لئے ایک ایک سال کی میعاد مقرر تھی، اس مدرسے میں چودہ استاد تھے، اور اوسطاً ڈھائی سو طلبا رہتے، ایک ڈاکٹر تھا جو ان کی طبی دیکھ بھال کرتا تھا۔ ان مدرسوں کے علاوہ وزارت خارجہ کی ہدایت سے پولیٹکل سائنس کے ایک کالج کا افتتاح ہوا، اور ۱۹۰۰ء میں زراعت کے اسکول کا جس میں بلجیم کا ماہر فن ڈائرکٹر کے فرائض انجام دیتا تھا۔

۱۹۰۶ء کے انقلاب میں تعلیمی میدان میں تو کوئی نمایاں کام نہ ہو سکا، البتہ جو کچھ پہلے کیا جا چکا تھا اس کی نئے سرے سے تنظیم کی گئی۔ ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۹ء کے درمیان جو تعلیمی قوانین بنے ان کی رو سے مدرسوں کی دو قسمیں کر دی گئیں۔ ایک تو عوام کے قائم کردہ، جس میں مکاتب قرآن شریف مذہبی درس گاہیں، قومی درس گاہیں اور مشن اسکول شامل تھے دوسرے وہ اسکول جن کو حکومت نے اپنے خرچ سے قائم کیا تھا اور وہی براہ راست ان کا انتظام کرتی تھی۔ ایسے مدرسوں کی اب تک ملک میں کمی تھی۔ مگر اب خاصی تعداد میں اس قسم کے مدرسے قائم کئے گئے۔ نئے قانون کی رو سے ابتدائی مدرسوں میں غیر ملکی اساتذہ رکھنے کی بھی ممانعت کر دی گئی (اور یہ قدم روس کے بڑھتے ہوئے اثرات سے بچنے کے لئے اٹھایا گیا تھا) البتہ ثانوی اور اعلی مدرسوں میں وہ برابر پڑھاتے رہے اور اب تک پڑھا رہے ہیں۔ نئی حکومت نے تعلیم کے مطالعہ کے لئے اس سال ۳۰ طالب علموں کو باہر بھیجا۔ ثانوی مدارس کا نصاب تعلیم اب تک پوری طرح مرتب نہیں ہوا تھا حکومت نے اس کام کو بھی پورا کیا۔

لڑکیوں کی تعلیم کی طرف سے پچھلی تمام حکومتیں غافل رہی تھیں، موجودہ حکومت نے ایران کی تاریخ میں پہلی دفعہ لڑکیوں کی تعلیم میں دلچسپی لی۔ چنانچہ ۱۹۱۰ء کے اعداد و شمار دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس سال ایران میں ۲۰۷ اسکول لڑکوں کے جن میں ۸۴۴۴ لڑکے تعلیم پاتے تھے اور ۴۷ اسکول لڑکیوں کے تھے جہاں ۲۱۸۷ طالبات تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ اسی سال حکومت نے لڑکوں کے لئے دو مزید ثانوی اسکول قائم کئے جن میں ۴۱۵ لڑکے پڑھتے تھے اور تین اعلی کلیات جہاں ۱۵۷ طلبا زیر تعلیم تھے۔

۱۹۱۰ء میں تعلیم کی رقم دوگنی کر دی گئی اور رضا شاہ پہلوی کی حکومت پر یہ ذمہ داری رکھی گئی کہ وہ تعلیم کو قومی نقطۂ نظر سے نئے سرے سے منظم کرے۔ اس تنظیم جدید میں عام رجحان یہ تھا کہ ملک کے سب مدرسوں کو براہ راست حکومت کے ماتحت کر دیا جائے۔ غیر حکومتی تعلیمی اداروں کو آزادانہ کام کرنے کی اجازت تھی۔ لیکن ان پر چند پابندیاں ضرور عائد کر دی گئیں۔ ایک تو یہ کہ ایسے مدرسوں کے اساتذہ کا معیار تعلیم حکومت کے مدرسوں کے اساتذہ سے کسی طرح کم نہیں ہونا چاہئے۔ دوسری یہ کہ ان مدرسوں کی عمارتوں، ساز و سامان اور فرنیچر کا معیار وزارت تعلیم کے اسکولوں کے معیار سے کم نہ ہونا چاہئے۔ اور تیسری پابندی یہ تھی کہ ان مدرسوں میں بھی وہی نصاب تعلیم پڑھایا جائے جو حکومت کے مدرسوں میں پڑھایا جاتا ہے، مثلاً فارسی، عربی، تاریخ ایران اور جغرافیہ ایران۔ نصاب کی یہ پابندی اس لئے عائد کی گئی تھی کہ ان مدرسوں کے لڑکے بھی ریاست کے امتحان میں بیٹھ سکیں۔

۱۹۲۳ء میں غیر ملکی ابتدائی مدرسوں میں ایرانی بچوں کا داخلہ قانوناً ممنوع قرار دیا گیا۔ اور تمام مدرسوں میں ذریعہ تعلیم فارسی زبان مقرر ہوئی۔ حکومت کو تعلیم قرآن کے مکتبوں پر قانونی پابندیاں عائد کرنے میں تو بہت زیادہ کامیابی نہ ہو سکی، لیکن اتنا ضرور ہوا کہ وہ حفظان صحت کے اصولوں کا، اور صفائی ستھرائی کا تھوڑا بہت خیال رکھنے لگے۔

ایران میں وزارت تعلیم ۱۹۱۱ء میں وجود میں آئی، اس کے نو مختلف شعبے تھے، اور سب سے اہم شعبے کے ذمہ ابتدائی ثانوی اور اعلی تعلیم کا انتظام تھا، ایک اور شعبہ مجلس تربیت جسمانی کے کام کی نگرانی کرتا تھا۔ اسی طرح قوم کی تعمیری اور تاریخی خزانوں کی حفاظت اور انتظام کی ذمہ داری کے لئے بھی ایک الگ شعبہ رکھا گیا۔

موجودہ زمانے میں سارے ایران کو ۳۲ تعلیمی صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے، ہر صوبہ میں وزارت تعلیم کا ایک منتظم رہتا ہے جس کا تقرر عموماً طہران سے ہوتا ہے۔

۱۹۲۲ء میں حکومت نے دس افراد پر مشتمل ایک تعلیمی بورڈ بنایا جس میں ثانوی اور اعلی مدرسوں کے اساتذہ اور صدر مدرسین شامل تھے۔

ایران میں چار قسم کے اسکول ہیں۔ ایک کنڈر گارٹن، دوسرے ابتدائی مدارس (دیہی اور شہری) تیسرے ثانوی مدارس اور چوتھے اعلی تعلیم کے مدرسے (کالج) حاضری سب اسکولوں میں لازمی ہے لیکن اوسط بہت کم رکھا گیا ہے چنانچہ قانون کی رو سے شہر کے طلبا کا اوسط ۵۰ فی صدی ہو تو کافی ہے۔ اور گاؤں کے طلبا کے لئے اس سے بھی کم۔ تعلیمی سامان یہاں کے سب مدرسوں میں بہت اچھا ہے۔ اور سب کے سب جدید قسم کے فرنیچر اور ساز و سامان سے آراستہ ہیں ان مدرسوں کے اپنے کتب خانے بھی ہوتے ہیں جن میں معیاری کتابیں اور مفید نقشے ہوتے ہیں۔

کنڈر گارٹن کی طرف حکومت کو ضابطہ تعلیم بناتے وقت توجہ کرنے کا موقع نہ مل سکا، یہاں سب سے پہلے ۱۹۱۸ء میں ایک کنڈر گارٹن کی ابتدا ہوئی تھی۔ اس وقت سے کر پورے پندرہ سال تک اس کے لئے کچھ نہ کیا جا سکا۔ البتہ ۱۹۳۳ء میں حکومت نے اس طرف توجہ کی سب سے پہلا کنڈر گارٹن اپنی نگرانی اور صرفے سے طہران میں بنوایا اور اب ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اور بچے قومی منصوبہ تعلیم کے ماتحت زیادہ سے زیادہ ان مدرسوں میں داخل کئے جا رہے ہیں۔ کنڈر گارٹن کا نصاب تعلیم ۴ سال کی عمر سے شروع ہوتا ہے اور ۷ سال کی عمر میں ختم ہوتا ہے۔ ان مدرسوں میں لڑکوں کو ۳ سے ۵ گھنٹے تک مشغول رکھا جاتا ہے اور انھیں ساز کی آواز پر موزونیت کے ساتھ حرکت کرنا، ورزش، گانا، ناچنا اور خوش الحانی سکھائی جاتی ہے۔ آخری سال میں پڑھنے کا معمولی نصاب شروع ہوتا ہے جس میں الف، بے سکھائی جاتی ہے اور آسان لفظوں کے ہجے یاد کرائے جاتے ہیں۔ سات برس کی یہ مدت پوری ہو جانے کے بعد لازمی تعلیم کی منزل شروع ہوتی ہے، اور لڑکا کسی ابتدائی مدرسے میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ ابتدائی مدرسوں کا نصاب تعلیم چھ سال کا ہے اور طلبہ کو ایک ایک سال ہر درجے میں پڑھنا پڑتا ہے۔ ایران کے مدرسوں میں چھٹیاں بہت ہوتی ہیں۔ ملک کے جن حصوں میں سردی بہت زیادہ ہوتی ہے وہاں سال بھر میں تقریباً ۲۰۰ دن پڑھائی ہوتی ہے اور جنوبی علاقے میں تو صرف ۱۰۰ دن کا تعلیمی سال پڑتا ہے طالب علموں کے لئے پڑھائی کے اوقات میں ۱۹۳۵ء سے ایک مخصوص وردی مقرر ہوئی ہے لڑکے بھورے رنگ کے فلالین کا سوٹ اور لڑکیاں خاص قسم کے بلاؤز پہنتی ہیں۔

(باقی آئندہ)

پناہ گزیں بچے

پروفیسر پس ام

قوموں میں باہمی جنگ چھڑ جانے، ایک ملک کے اندر خانہ جنگی کے حالات پیدا ہو جانے اور بنی نوع انسان میں نسلی امتیاز کا غیر معمولی احساس پیدا ہو جانے سے آج کروڑوں انسان اپنے آبائی مسکن سے اکھڑ کر نئے وطن کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ یہ حالات پاکستان اور ہندوستان میں تو سوا ڈیڑھ سال ہی سے پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن یورپ میں عام طور پر اور مشرقی یورپ میں خاص طور سے پچھلے دس سال کی بھگدڑ مچی ہوئی ہے اور بڑی بڑی آبادیاں ایک ملک سے دوسرے ملک میں منتقل ہو رہی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے سو ڈیڑھ سو سال کے مہذب انسان میں پھر سے خانہ بدوشی کی عادت واپس آگئی ہے۔ انسانی تاریخ میں خانہ بدوشی کا یہ نیا دور کب تک رہے گا؟ اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس سے انسان کے ماحول اور اس کے خیالات اور جذبات پر کیا اثر پڑے گا؟ اس انقلاب کے اندر قدرت کا کیا مقصد پنہاں ہے؟ یہ ایسے سوالات ہیں، جن کا صحیح جواب ڈھونڈنا ہمارے لئے اشد ضروری ہے اور اس سوال کا جواب تلاش کرنا محض ایک علمی اور عقلی دلچسپی نہیں ہے، بلکہ ان سوالوں کے صحیح جوابات ملنے پر ہی یہ بے وطن، بے گھر لوگ پھر سے اسی طرح بسائے جا سکتے ہیں۔

لیکن ان سوالوں کا جواب دینا کسی ایک آدمی کے بس کا کام نہیں ہے۔ اپنے مسکن سے اکھڑے ہوئے لوگوں میں ہر عمر اور ہر پیشے کے مرد اور عورت شامل ہیں۔ ان کی ذہنیت کا مشاہدہ سب لوگ نہیں کر سکتے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان میں ہر ایک قسم کے لوگوں کا توجہ اور تفصیل سے مشاہدہ کیا جائے اور ان مشاہدوں کو یک جا کر کے ان پر فلسفیانہ انداز سے غور کیا جائے، اور ان کی نوعیت کو سمجھا جائے۔

اس مضمون میں ہم بچوں کی ذہنیت کی ان اہم تبدیلیوں پر بحث کریں گے جو ان میں اپنے گھر، ماں باپ اور سکول سے زبردستی الگ ہو جانے پر پیدا ہو جاتی ہیں پچھلی جنگ عظیم کے دوران میں لاکھوں بچوں کو اپنے گھر چھوڑنے پڑے مثلاً پولینڈ کے بہت سے بچوں کو بام صاحب لانگرے اپنے یہاں پناہ دی۔ ہندوستان کے دوسرے بہت سے حصوں میں بھی ایسے بچے عارضی طور پر لائے گئے۔ لندن میں بم باری کا خطرہ ہونے کی وجہ سے کئی ہزار بچوں کو لندن سے باہر کیمبرج اور دوسری جگہوں پر بھیج دیا گیا تھا۔ معلموں، ڈاکٹروں اور علم نفسیات کے ماہروں نے ان بچوں کا بغور مطالعہ کیا اور اپنے مطالعے کے نتائج سے ان کی تعلیم و تربیت میں بڑی مدد لی۔ اس مضمون میں ہم انہیں کے مطالعے اور تحقیق کا خلاصہ پیش کریں گے۔

پناہ گزیں بچوں کی تربیت

سنہ ۱۹۴۰ء میں جب لندن چھوٹے بچوں سے خالی کرا دیا گیا، تو موسم سرما کے شروع ہوتے ہی ان بچوں نے لندن واپس جانے پر اصرار کرنا شروع کر دیا۔ حکومت کو بچوں کے اس اصرار سے تکلیف پہنچی۔ کیوں کہ ان بچوں کے لئے لندن واپس جانے میں خطرہ تھا، لیکن ان خطروں کا علم ہو جانے کے باوجود ۵۰ فی صدی بچے لندن واپس گئے۔ ان سے جب پوچھا گیا کہ لندن واپس جانے پر کیوں مصر ہو تو انھوں نے جواب دیا کہ سردی کے موسم میں بم باری نہیں ہو سکتی، وغیرہ۔ جب ان سے یہ دریافت کیا گیا کہ لندن سے دور چلے آنے پر تمھیں کن کن باتوں کی کمی محسوس ہوتی ہے، تو انھوں نے بتایا کہ کیمبرج میں وہ پالتو جانور، وہ مشاغل اور وہ دوست نہیں، جو لندن میں ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا کہ جب ایک سکول کا اسکول لندن سے باہر لے جایا گیا تو اس اسکول کے بچوں میں واپس جانے کا اشتیاق اتنا زیادہ نہیں تھا جتنا کہ ان بچوں میں جو انفرادی طور پر لندن سے باہر بھیجے گئے تھے عجیب بات یہ ہے کہ بم باری، مکانوں کے جلنے اور عام تباہی سے بچوں کے دل و دماغ بہت کم متاثر ہوئے۔ ڈاکٹر آر، پی گرد لندن کے اس حصے میں رہتے تھے جہاں بڑی کثرت سے بم باری کی گئی تھی۔ اس شدید بمباری کے زمانے میں وہ کوئی سولہ مہینے تک وہاں رہے۔ ظاہر ہے کہ وہاں کے لوگوں کو ہوائی حملے کے وقت تہ خانوں میں بارہا پناہ لینی پڑی ہوگی۔ مگر ان کا بیان ہے کہ جسمانی تھکاوٹ کے باوجود اس علاقے کے بچوں کے اعصاب پر بالکل اثر نہیں پڑا تھا۔ لیکن اس کے مقابلے میں وطن سے دور بھیجے جانے اور ماں باپ سے الگ کئے جانے پر بچے فساد اعصاب میں مبتلا ہو گئے تھے۔

ابتدا میں بچے کی دنیا صرف اس کی ماں ہوتی ہے اور وہ اسی دنیا میں مگن رہتا ہے، مگر جوں جوں وہ بڑھتا ہے ماحول اور آس پاس کی چیزوں سے اُسے دلچسپی ہوتی جاتی ہے اور عمر کے ساتھ ساتھ اس کی یہ دلچسپی بھی بڑھتی جاتی ہے، یہاں تک کہ جو محبت اور وابستگی ماں سے تھی وہی آس پاس کی مختلف چیزوں اور اس جگہ سے ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب اسے وہاں سے الگ ہونا پڑتا ہے تو اُسے وہی رنج اور دکھ ہوتا ہے، جو ماں سے جدا ہوتے وقت ہوتا ہے۔

چار پانچ مہینے کی عمر میں ماں سے بچے کا تعلق بہت گہرا نہیں ہوتا چنانچہ اگر اس کی عام ضرورتیں پوری ہوتی رہیں تو وہ کبھی نہیں روئے گا۔ اسی وجہ سے اس عمر کے بچے نئی جگہ اور نئے لوگوں میں بھیجے جائیں تو تھوڑی دیر تو وہ بے چین ہوں گے مگر بہت جلد مطمئن ہو جائیں گے۔ لیکن پانچ مہینے سے زیادہ عمر کے بچوں میں ماں کی محبت نسبتاً زیادہ اور ڈیڑھ سوا ڈیڑھ سال کی عمر میں بہت زیادہ ہوتی ہے، اور اس عمر میں ماں کی جدائی بچے کے لئے بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ چنانچہ اس عمر کے بچوں کو ان کی مائیں جدا ہوتے وقت کوئی کھلونا یا مٹھائی کا ٹکڑا یا رومال دے گئی تھیں، تو یہ بچے اسے اپنے ساتھ چمٹائے رکھتے تھے۔ اور جدا ہونے کے فوراً بعد جو انھوں نے رونا شروع کیا تو وہ گھنٹوں جاری رہا، اور اس جدائی سے ان بچوں کو جو صدمہ ہوا وہ بہت سخت تھا۔ لیکن بچوں میں جسمانی ضرورتوں کو پورا کرنے کی بے تابی بھی بہت ہوتی ہے چنانچہ ان بچوں نے کچھ گھنٹوں کے بعد نئی نرس یا عورت کے ہاتھ سے کھانا پینا وغیرہ قبول کر لیا۔ لیکن یہ بات ضرور تھی کہ وہ کھاتے وقت کھلانے والی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔ پھر بھی اس طرح بہل جانے اور نئے ماحول اور نئے لوگوں میں گھل مل جانے سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ بچوں پر ماں کی جدائی کا کوئی اثر ہی نہیں پڑتا، ان کا بار بار زکام، انفلوئنزا اور دوسری بیماریوں میں مبتلا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا دل اور جسم ماں کے متلاشی ہیں اور بیماری اس ابھرتے ہوئے جذبے اور ضرورت کی ناکامی کا اظہار ہے۔ اس عمر کے بچے جب لندن واپس بھیجے گئے تو ان کا رویہ اپنی ماں سے بالکل اجنبی لوگوں کی طرح تھا۔ اپنی کتابوں اور اپنی عام چیزوں کو پہچانتے، لیکن ماں سے گھلنے ملنے میں جھجک اور تامل ہوتا۔

ماں باپ سے جدا ہونے پر تین سال اور پانچ سال کے بچوں کا رویہ ڈیڑھ دو سال کے بچوں کے رویے سے ذرا مختلف تھا۔ اس عمر کے بچوں میں ماں باپ کے خلاف تھوڑا بہت کینہ ضرور ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ماں باپ کسی نہ کسی بات پر بچے کو ٹوکتے یا حکم دیتے ہیں اور حکم عدولی پر سزا دیتے ہیں۔ بچے ان سزاؤں سے بہت ناخوش ہوتے ہیں، اور ان کی دلی تمنا یہ ہوتی ہے کہ سزا دینے والا ختم ہو جائے۔ اس وقت انھیں ماں باپ کی محبت یاد نہیں رہتی۔ لیکن جو سزا انھیں دی جاتی ہے وہ یاد رہتی ہے اور اس سے بچے بہت ناراض رہتے ہیں۔ ماں باپ سے علیحدگی کے وقت اس قسم کے بچوں کو گناہ کا احساس پیدا ہونا شروع ہوتا ہے۔ وہ سوچتے ہیں کہ چونکہ میں نے ماں کے لئے دل میں بد دعا کی تھی اسی لئے ماں تو لندن کی بم باری میں مرنے چلی گئی ہے اور مجھے یہاں چھوڑ گئی ہے۔ کاش کہ میں یہ بد دعا نہ کرتا ———— یہ جدائی میرے بُرے خیالات کا نتیجہ ہے۔ کاش وہ مرنے کو نہ جاتی، بلکہ مجھے کچھ ہو جاتا ———— وغیرہ وغیرہ۔ ہر قسم کی باتیں بچے کے دل میں موجود ہوتی ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جب تک ماں غیر حاضر رہتی ہے بچے کے دل میں ماں کے متعلق بیماری اور موت کے وہم پیدا ہوتے رہتے ہیں اور وہ ان سے رنجیدہ ہوتا ہے۔ لیکن جب ماں پاس آ جاتی ہے تو اس سے بالکل بے تعلقی کا اظہار کرتا ہے اور پھر جب ماں ملنے کے بعد جدا ہونے لگتی ہے تو پھر رونا دھونا شروع کر دیتا ہے۔

یہ تو ہوئی بچوں کی جدائی کے فوراً بعد کی حالت۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وقت کے ساتھ اس حالت میں کوئی تبدیلی بھی پیدا ہوتی ہے؟

چھوٹی عمر کے بچے تو نئے حالات میں آہستہ آہستہ خوش اور بشاش نظر آنے لگتے ہیں اور اگر کچھ خلش اور بے چینی باقی رہتی ہے تو وہ نیند غائب ہو جانے اور زکام وغیرہ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے ذرا بڑی عمر کے لڑکے خیال پرست بن کر اکثر خیالی دنیا میں رہتے اور تاریخی [illegible]

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

ڈاکٹر شاردا

(۱)

احمد حسن عثمانی

کمرہ کی گھڑی نے بارہ بجائے۔ گھنٹے کی لرزتی ہوئی آواز کمرہ کی فضا میں ڈوب رہی تھی کہ شاردا اپنی کتاب بند کرتی ہوئی میز سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جہاں وہ بڑی دیر سے بیٹھی مطالعہ میں مشغول تھی۔

چاروں طرف مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی ——— صرف سڑکوں پر کبھی کبھی بیل گاڑی کے چلنے کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دیتی تھی اور گاڑی بانوں کے کیف پرور نغمے غبار آلود تھے، اس کے ساتھ مل کر ایک لطیف ہم آہنگی پیدا کر رہے تھے۔ شاردا کی ماں سیتا بغل کے کمرہ میں گہری نیند سو رہی تھی۔

شاردا سوچنے لگی۔ اسے بھی اب سو جانا چاہیئے اس وقت کافی دیر ہو چکی تھی ——— رات آدھی سے زیادہ آ گئی تھی، وہ کچھ دیر سوچتی رہی ———

دفعتاً اسے خیال ہوا کہ نیچے جا کر پھر ایک بار سونے سے پہلے اپنے مریضوں کو دیکھ لے۔ آخری کمرہ کی مریضہ کی حالت اس کے لئے فکر و پریشانی کا باعث تھی ——— اس کے آج ہی صبح کو بچہ ہوا تھا ... ہونے پر نگلیا تھا۔ ماں کی حالت بھی قابل اطمینان تھی۔ یہی سوچتے سوچتے شاردا نے ایک شال اوڑھی اور کمرہ سے باہر بالکنی پر آ نکلی۔

چیت کی حسین سرد رات تھی، چاند کا نقرئی گیند ساری کائنات کو اپنی دودھیا شعاعوں میں نہلا رہا تھا۔ شاردا مسحور ہو کر چند لمحے تک خاموش ساکت کھڑی رہی ——— اس کی آنکھیں اس نظر فریب گوشے کو گھور رہی تھیں جو صاف و شفاف نیلے سمندر میں بڑی شان سے تیر رہا تھا دم بھر میں ہزاروں خیالات اس کے ذہن میں آئے اور گذر گئے۔ نیچے نرسوں کے بولنے کی مدھم آواز چپ چاپ رات کی خاموشی کو چیرتی ہوئی اس کے کانوں میں آ رہی تھی۔

بارہ سال سے اس کے نفس کی گہرائی میں کچھ دلدوز تصورات رفتہ رفتہ گھر کر رہے تھے ——— جن کو آج شام کا ایک واقعہ بڑی بے دردی سے کرید کر سطح پر لے آیا۔ عہد رفتہ کے سارے واقعات اس کے ذہن پر چھا گئے اور وہ حسرت و کرب کے ملے جلے جذبات میں محو ٹھنڈی سانس لینے لگی۔

وہ سوچنے لگی ——— اس بے شمار دولت سے اسے کیا فائدہ؟ یہ تمام ساز و سامان اس کے کس کام کا جس پر بہت سی عورتیں رشک کرتی تھیں؟ اس کی تو پوری زندگی کو ایک شدید دھچکا لگ چکا تھا۔ اس جان فرسا واقعے سے جو بارہ سال پہلے ہوا تھا اور جس کی یاد آج شام سے پھر تازہ ہو گئی تھی ———

شاردا شعلہ پور کی مشہور و معروف ڈاکٹر تھی اور ایک جدید طرز کے خوب صورت نرسنگ ہوم کی مالک تھی، آس پاس کے علاقے میں دور دور تک اس کی پریکٹس کا سکہ جما ہوا تھا۔ خود اس کے اپنے ذاتی صفات ——— کیف پرور حسن، سحر طراز مسکراہٹ اور پرخلوص حسن اخلاق اپنے اندر ہزاروں مریضوں کے لئے بے پناہ کشش رکھتے تھے ——— دولت اس کے قدموں پر نثار تھی اور شہرت اس کے سر پر نچھاور۔ مگر اس کی زندگی میں کوئی کیف نہ تھا ——— اندر سے کھوکھلی تھی۔ ایک بیمار ناریل کی طرح جس کا گودا اندر ہی اندر سوکھ گیا ہو۔

شاردا نرسنگ ہوم کے بالائی منزل پر اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کے ساتھ ایک باورچی اور ایک نوکر بھی تھا۔ مگر یہ دونوں رات کو چلے جایا کرتے تھے۔ نرسیں اور مریض نیچے کی منزل میں رہتے تھے جو ایک جدید طرز کی وسیع عمارت تھی نیچے پندرہ کمرے ساز و سامان سے آراستہ تھے، ان میں کل ۳۰ مریضوں کی جگہ تھی اور دس نرسیں اور آیائیں بھی وہیں مریضوں کی خبر گیری کے لئے رہتی تھیں ———

گذشتہ شام کا واقعہ شاردا کی نظروں میں نئے سرے سے پھرنے لگا ...... ایک بج کر کچھ منٹ آئے تھے۔ صبح کے سب کاموں سے فراغت پا کر شاردا اپنے مشورہ کے کمرہ میں ایک نرس سے گفتگو میں مشغول تھی ——— ٹھیک اسی وقت ایک موٹر دھیمی رفتار سے پھاٹک پر آ کر رک گئی ———

شاردا نے نرس سے گفتگو ختم کرتے ہوئے کہا ——— "یہ کوئی نئی مریضہ معلوم ہوتی ہے" ——— وہ گھبرا رہی تھی کہ اسے کہاں رکھے گی۔ اس لئے کہ نرسنگ ہوم پہلے ہی سے بھرا ہوا تھا اور اب کوئی جگہ خالی نہیں تھی۔ ایک لمحہ بعد مریضہ خود کمرہ میں داخل ہوئی ———

ایک سن رسیدہ عورت کے ساتھ جو اس کی ماں یا ساس معلوم ہو رہی تھی ... مریضہ ایک حسین جوان عورت تھی مگر وہ حاملہ تھی اور اس کا حمل پورے دن کا معلوم ہوتا تھا جبھی تو وہ اتنی کمزور تھی کہ بغیر سہارے کے چلنا بھی محال تھا۔ شاید اس ضعیف عورت میں کافی طاقت نہ تھی اس لئے فوراً ہی ایک نرس آگے بڑھی اور اس نے سہارا دے کر مریضہ کو کرسی پر بٹھا دیا۔

شاردا نے اچھی طرح دیکھنے کے بعد بندھے ٹکے سوالات جو ڈاکٹر مریضوں سے کیا کرتے ہیں شروع کر دیئے۔ مریضہ نے ——— جو ایک تعلیم یافتہ لڑکی معلوم ہو رہی تھی ——— سوالات کا مفصل جواب دیا جن کو سن کر شاردا کا دل حسرت ناک تصورات سے اندر ہی اندر کانپنے لگا ———

"میرا نام سبھدرا ہے" لڑکی نے کہا۔ "اور میرا خاوند سری کرشن ایک ریلوے انجینیر ہے، اس کی بدلی یہاں کی ہو گئی ہے۔ ہم لوگ آج ہی پہنچے ہیں۔ ماتا جی مجھ کو بچے کی ولادت کے لئے مدراس لے جا رہی تھیں ——— مگر ہم نے یہاں کی تعریف سنی۔ اور میرے شوہر نے زور دیا کہ میں فوراً آپ سے ملوں ——— اسی لئے ہم لوگ یہاں حاضر ہوئے ہیں" اتنا کہہ کے وہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ خاموش ہو گئی ———

شاردا کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، ایک عجیب کرب سا محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن اس نے بھی کوشش کر کے مریضہ کی مسکراہٹ کا جواب ہنس کر دیا اور کہنے لگی ———

"آپ کی بڑی مہربانی ہے جو یہاں آئیں ——— آپ کو بچے کی ولادت کے لئے کوئی دو ہفتے میں میرے نرسنگ ہوم میں آ جانا چاہیئے ——— میں امید کرتی ہوں کہ ایشور کی کرپا سے سب کام اچھی طرح ہو جائے گا۔ آپ کا کیا خیال ہے" اس نے ضعیف عورت سے مخاطب ہو کر کہا ———

"جی ہاں! ڈاکٹر! آپ صحیح فرما رہی ہیں" ——— بوڑھی عورت نے ایک پوپلی ہنسی کے ساتھ جواب دیا ——— "یہ سبھدرا کی چوتھی اولاد ہے، اور ہر مرتبہ وہ مرتے مرتے بچی۔ اب کی بار میرا داماد اور میں خود بہت زیادہ پریشان ہوں ——— کھانا، پینا اور سونا مشکل ہو گیا ہے"

"کیا سب بچے زندہ ہیں؟" شاردا نے دریافت کیا۔

"نہیں ایک بھی نہیں۔" ضعیفہ نے حسرت بھرے انداز میں کہا ——— "میں چاہتی ہوں کم سے کم یہی بچ جائے ——— اور سب سے زیادہ تو مجھے سبھدرا کی فکر ہے۔ یہ کسی طرح اس مرحلے سے صحیح و سلامت گذر جائے ———"

"ایشور مدد کرے گا۔ آپ فکر نہ کریں" ——— شاردا نے کہا "میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھوں گی"

"آپ کا بہت بہت شکریہ ڈاکٹر! آپ کی ملاقات ہی سے ہمارے دل پر سے آدھا بوجھ اتر گیا"

یہ کہہ کر سبھدرا جانے کے لئے کھڑی ہو گئی "آپ کو کوئی خاص مرض نہیں ——— صرف کمزوری ہے، یہ ٹونک پیجئے اور ایک ہفتہ بعد پھر مجھ سے ملئے اور اگر اسی درمیان میں کوئی تکلیف محسوس ہو تو فوراً مجھے اطلاع دیجئے ——— میں حاضر ہو جاؤں گی ——— میرے خیال میں بچہ دو ہفتے کے اندر ہی ہو جائے گا ———"

شاردا نے نسخہ بوڑھی عورت کے ہاتھ میں دے دیا بڑی بی میز پر پانچ پانچ کے دو نوٹ رکھتے ہوئے بولیں ——— "فیس حاضر ہے ڈاکٹر"

"اتنی جلدی کیا ہے؟" شاردا نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا "میں اپنی فیس آپ کے ناتی کے ہونے کے بعد لے لوں گی" اور وہ بڑے دلکش انداز میں ہنسنے لگی۔

"جیسی آپ کی مرضی ڈاکٹر! مجھے بھی امید ہے کہ یہ ناتی ہی ہوگا" ضعیفہ نے نوٹ واپس لیتے ہوئے کہا اور دونوں موٹر کی طرف چل دیں۔ جاتے وقت ایک بار پھر ان لوگوں نے لیڈی ڈاکٹر پر جس نے ان کے دلوں کو مسحور کر لیا تھا مسکراہٹ بھری نگاہ ڈالی۔

شاردا موٹر کو تکتی رہی جب تک کہ وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی ——— اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور غم کا بوجھ دل میں لئے اپنے کمرہ میں چلی گئی ———

اس کے ذہن میں گذرتا ہوا زمانہ پھرنے لگا ——— سب بارہ برس پہلے کا زمانہ ......

شاردا کا باپ اس کو اور اس کی بیوہ ماں کو نہایت ہی ابتر حالت میں چھوڑ کر اچانک اس دنیا سے چل بسا تھا۔ اس وقت شاردا کی عمر ۱۶ برس تھی۔ وہ بھی ابھی

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

اِدارۂ تحریر:- ڈاکٹر سید عابد حسین۔ صالحہ عابد حسین۔ عبداللطیف اعظمی

تاریخ اشاعت:- یکم [illegible] ۱۹[illegible]
چندہ:- سالانہ ۶ے ششماہی للعہ

بائی اسکول سے فارغ ہوئی تھی۔ وہ اس وقت ایک کشیدہ قامت، دل کش اور نہایت حسین لڑکی تھی۔

اس کی ماں ستاما کا بھائی پشوپتی ایک دولت مند آدمی تھا ——— اس کے پاس کافی زرعی جائداد تھی ——— لیکن وہ اپنی بیوہ بہن اور اس کی لڑکی کی کفالت کا تو کیا ذکر ہے ذرا سی مدد کے لئے بھی تیار نہ تھا۔

شاردا شادی کی عمر کو پہنچ چکی تھی۔ اس کی ماں کا دل اپنی بے بسی اور بے چارگی پر خون ہو رہا تھا

پشوپتی کا لڑکا سری کرشن اس وقت بی اے میں تعلیم پا رہا تھا ستاما کی یہ کوشش تھی کہ اپنے بھائی کو شاردا اور سری کرشن کی نسبت پر تیار کرے۔

بے چاری شاردا اپنی شادی کے معاشی پہلو سے بے خبر تھی۔ وہ پہلے ہی اپنے ممیرے بھائی کو دل دے چکی تھی جو دولت و ثروت کے نشے میں چور اس کی معصوم محبت پر ہنستا تھا وہ بھی اپنے باپ کی طرح اپنی شادی کو نفع کا کاروبار بنانا چاہتا تھا۔

پشوپتی نے اس نسبت کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ پہلے تو وہ اس پر غور کرنے کے لئے بھی تیار نہ تھا کیونکہ وہ اپنی بہو ایسی لڑکی کو بنانا چاہتا تھا جو کم از کم دس ہزار کی تھیلی لے کر آئے لیکن کچھ دیر سوچ کر اس نے کہا کہ اپنی رانڈ بہن کی خاطر شاردا کو سری کرشن کی دوسری بیوی بنانے میں بغیر جہیز کے بھی اسے کوئی اعتراض نہ ہوگا"

ستاما کا خون کھولنے لگا ——— اس ذلت آمیز برتاؤ کی وجہ سے جس نے اس کے دل کے زخموں پر نمک پاشی کا کام کیا ——— وہ بغیر ایک لفظ کہے اس کے گھر سے نکل گئی اور اس نے عہد کر لیا کہ آج سے اس چوکھٹ پر قدم نہ رکھے گی اور واقعی اس نے پھر کبھی اپنے بھائی کی صورت نہ دیکھی

اس کے پاس جو کچھ زیور بچ رہا تھا سب بیچ ڈالا۔ اور ایک امیر گھرانے میں کھانا پکانے کی نوکری کر لی۔ اس طرح وہ اپنی لڑکی کی تعلیم جاری رکھنے کے قابل ہو سکی۔

اپنی ماں کی اس قربانی کا جو اس نے اپنی لڑکی کے لئے کیا تھا شاردا کے رو ئیں رو ئیں میں احساس تھا۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں نے اس کی آنکھیں کھول دیں اور وہ سخت مصیبتیں جھیلتے ہوئے بھی اپنی تعلیم میں جوش و خروش سے منہمک رہی ——— اسے بڑی شان دار کامیابی ہوئی شروع سے ہر امتحان میں اول آتی رہی۔

اب وہ ایک مشہور ڈاکٹر تھی جس کے گھر دولت بھی تھی اور شہرت بھی لیکن اس کے دل میں ایک اُجڑا ہوا ارمان ایک سوکھی ہوئی تمنا کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی، جس کے اظہار کا وہ کوئی راستہ نہ پاتی تھی۔ اسے زندگی بے کیف اور پھیکی معلوم ہوتی تھی ———

آہستہ آہستہ یہ احساس اور بڑھنے لگا ——— وہ بہت چاہتی تھی کہ اُسے ہوا دے، کچل ڈالے مگر اس کی ساری کوششیں بے سود ثابت ہوئیں ——— ایسے موقعوں پر جب اس کے احساس میں حد سے زیادہ تناؤ ہوتا ضبط و تحمل کا دامن اس کے ہاتھوں سے چھوٹ جاتا اور رات کی تنہائی میں اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے بند چشمے بے اختیار پھوٹ پڑتے ——— اور اس کا تکیہ تر بتر ہو جاتا ———

(باقی آئندہ)

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

(بسلسلہ صفحہ ۲)

ہوئے قائد اعظم نے کہا تھا "میرے پاس کوئی حکومت نہیں ہے لیکن اگر ہوتی اور کوئی شخص مجھ سے پوچھتا کہ تم اس حکومت کو چھوڑنا پسند کرو گے یا اقبال کو، تو میں ہرگز اقبال کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوتا۔ میں اپنے پاکستانی دوستوں کے سامنے یہ مشکل سوال نہیں رکھتا۔ وہ اپنی حکومت بھی رکھیں اور اقبال کو بھی رکھیں، اگر اقبال کسی کی ملکیت ہو سکتا ہے لیکن اس حکومت کو چلانے میں وہ اقبال کے کلام اور فلسفے سے جو اسلام کی بہترین تفسیر ہے کیوں سبق نہ لیں اور دوسری قوموں کے سامنے سیاست کی ایک بہتر مثال کیوں نہ پیش کریں!

پناہ گزین بچے

(بسلسلہ صفحہ ۱۰)

سے منصوبے سوچا کرتے ہیں۔ وہ اپنے خاندان کی بزرگی کا خیال اور ماں باپ کی خوبیوں کا تصور کر کے مسلسل ایسی خیالی دنیا میں رہنے لگتے ہیں اور نئی نرسوں یا دیکھ بھال کرنے والی خادماؤں سے گھل مل نہیں سکتے۔ لیکن ان کی یہ دبی ہوئی خواہش یا شکایت ان میں بہت سی ایسی عادتیں پیدا کر دیتی ہے جو عام طور پر پسند نہیں کی جاتیں۔ مثلاً سوتے میں بستر پر پیشاب کر دینا، ہکلا کر بولنا، دوسرے لڑکوں سے بات بات پر لڑنا جھگڑنا، بہت سی چیزیں جمع کرنے کا سودا وغیرہ اور جب جدائی کا صدمہ زیادہ ہوتا ہے تو باہر کی دنیا سے آنکھیں بند کر کے ہر وقت ماتم اور سوگ کرنے والوں کی شکل بنائے رکھنا بچوں میں عام پایا گیا ہے۔

مذکورہ خرابیاں صرف پناہ گزین بچوں ہی میں نہیں ہوتیں بلکہ کارخانوں میں کام کرنے والی عورتیں بھی اپنے بچوں سے لمبے عرصے کے لئے جدا ہوتی ہیں تو یہ طویل جدائی چھوٹے بچوں کے لئے مصیبت ہو جاتی ہے اور ان میں طرح طرح کی الجھنیں پیدا کر دیتی ہے۔ ان باتوں کا تعلق مستقبل کے تمدن سے بھی ہے جس میں عورتیں گھر سے باہر نکل کر کام کریں گی جس میں نرسری اسکول زیادہ تعداد میں ہوں گے سوال یہ ہے کہ پناہ گزین بچوں کے مشاہدے سے ہم چھوٹے بچوں کی تربیت کے متعلق کیا سیکھ سکتے ہیں؟

یہ بات تو صاف ظاہر ہے کہ بچے کے نشو و نما اور اس کی تربیت کے لئے ماں کا وجود اور اس کا قرب بہت ضروری ہے۔ اگر بچوں کو ان سے جدا ہونا بھی پڑے تو انھیں یک لخت جدا نہیں کرنا چاہئے۔ اگر یہ جدائی آہستہ آہستہ ہو تو بچے کی دنیا میں وہ زلزلہ نہیں آئے گا جو پناہ گزین بچوں کی دنیا میں آتا ہے۔ اگر کارخانوں میں عورتوں کو کام کرنا ہی ہے تو وہ غیر حاضر بچوں سے ملتے رہنے کا کوئی مناسب انتظام کریں اگر ان باتوں پر دھیان نہیں دیا گیا تو ان نتائج کے لئے تیار رہنا چاہیے جن کا ہم نے اس مضمون میں ذکر کیا ہے۔

مطبوعہ [illegible]

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی بی اے جامعہ

NAI ROSHNI
DELHI

جلد ۱ نمبر ۲۴ | ۸ دسمبر سنہ ۱۹۴۸ء | ایڈیٹر: ڈاکٹر سید عابد حسین

مذہب کے نام پر لڑنا حماقت ہے

شمس العلماء مولوی نذیر احمد

میرا خیال تو یہ ہے کہ دنیا میں کوئی مذہب بھی تلوار کے بل بوتے پر نہیں چلا۔ مذہب چلا ہے اور چلے گا تو صرف صداقت کے بل بوتے پر۔ یہ سن کر تو مسلمانوں کے کان کھڑے ہوئے ہوں گے اور نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ ہر مذہب کے لوگوں نے کہ آج تو دنیا میں اس کا عقیدہ کس پڑا کہ نفس مذہب کی نسبت کہتا ہے کہ مذہب چلا ہے اور چلے گا تو صداقت کے بل بوتے پر تو اس سے لازم آتا ہے کہ سب مذہب سچے اور برحق ٹھہریں۔ ہاں ہاں میں پکار کے کہتا ہوں کہ مذہب چلا ہے اور چلے گا تو صرف صداقت کے بل بوتے پر۔ اور میری مراد یہ ہے کہ دنیا میں کوئی مذہب نہیں جس میں صداقت کا انش یعنی جزو نہ ہو۔ جتنے مذہب دنیا میں ہیں وقت اور مقام کے لحاظ سے سب کے سب آدمی کی اصلاح اور اس کے فائدے کے لیے ہیں اور ہر ایک میں کچھ نہ کچھ فائدے اور صداقت اور نیکی کا انش ضرور ہے جو ان کو چلائے جاتا ہے مثلاً اگر ہندو اس ملک میں گائے کی تعظیم مذہباً کرتے ہیں تو اس میں یہ فائدہ مضمر ہے کہ اس ملک میں کوئی جانور گائے بیل سے زیادہ آدمی کو فائدہ رساں نہیں۔ گائے دودھ دیتی ہے جس سے گھی اور مکھن اور پنیر اور انواع و اقسام کی مٹھائیاں بنتی ہیں۔ بیل کے بدون کھیتی نہیں ہو سکتی مرے پیچھے بھی اس بچارے کی کھال کام دیتی ہے۔ کسی اور جانور کا نام تو جس سے آدمی کے اتنے سارے کام نکلتے ہوں۔ اس کی پوری پوری حفاظت ہو نہیں سکتی تھی۔ تاوقتیکہ مذہباً اس کو مقدس نہ مانا جائے۔ یا گنگا جمنا کی تعظیم بلکہ تمام دریاؤں کی کہ اُن سے زراعت کی آبپاشی ہوتی ہے۔ جان داروں کی زندگی پانی پر موقوف ہے وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ* ۔ لیکن یہ باتیں اس وقت سوجھتی ہیں۔ جب مزاجوں میں سازگاری ہوتی ہے۔ نہیں تو

چشم بداندیش کہ برکندہ باد
عیب نماید ہنرش در نظر ....

ہر ایک مذہب کے احکام اور قواعد وقت اور مقام کے لحاظ سے ضرور کسی نہ کسی مصلحت پر مبنی ہیں۔ دوسرے مذہب کے لوگ اس مصلحت پر نظر نہ کر کے ان سے پرخاش کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ ایک عجیب بات یہ دیکھی جاتی ہے کہ صرف لفظی اختلاف لوگوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے بس کرتا ہے ورنہ ہم بہت سی نیکیوں کو مذاہب میں باوجود اختلاف مشترک پاتے ہیں۔ خاص کر وہ جن پر تمدن کا مدار ہے جھوٹ بولنا، شراب پینا، جوا کھیلنا، چوری کرنا، لوگوں کو ناحق ستانا وغیرہ وغیرہ سب مذہبوں میں ممنوع ہیں۔ اور ممنوع نہ ہوں تو تمدن ایک دن قائم نہ رہے۔ مسلمانوں کی نماز، ہندوؤں کی پوجا پاٹ۔ ان کی زکوٰۃ، ان کا دان پن، اُن کے روزے، ان کے برت، ان کا حج، اُن کا تیرتھ۔ اُن کا رحم، ان کی دیا، کیا یہ مماثل نیکیاں نہیں ہیں۔ اور کیا ایک ہی تحریک ایک ہی ارادے ایک ہی قصد سے صادر نہیں ہوئیں۔ مگر ہندو مسلمان کی اذان سننا نہیں چاہتا۔ مسلمان ہندو کے سنکھ

* اور پانی سے تمام جان دار چیزیں بنائیں۔

برداشت نہیں کر سکتا سنو کان لگا کر سنو، میں اسی بات کو جو ابھی کہہ چکا ہوں پھر ایک بار اعادہ کرتا ہوں تاکہ تم لوگوں پر حجت الٰہی تمام ہو، اور میرا مطلب اچھی طرح لوگوں کے ذہن نشین ہو جائے غرض کسی مذہب کی کوئی بات لو اس کو پاؤ گے۔ وقت اور مقام کے لحاظ سے اس میں کچھ آدمی کا فائدہ ہے اس میں نیکی ہے۔ اس میں صداقت ہے۔ چونکہ لوگ اس رمز کو نہیں سمجھتے۔ اسی سے اختلاف پیدا ہوتے ہیں اسی سے مختلف مذاہب کے لوگ ایک دوسرے سے لڑتے مرتے ہیں وہ کیوں نہیں خیال کرتے کہ سب کی منزل مقصود ایک ہے اور رستے مختلف۔ ممکن ہے کہ کوئی ٹیڑھی اور غلط راہ چلتا ہو۔ مگر اس کی غرض و غایت تو وہی ہے جو سیدھی اور صحیح راہ پر چلنے والے کی ہے۔ پس بجائے اس کے کہ ہم اس سے ناخوش ہوں، اس سے عداوت کریں، اس کے آزار کے درپے ہوں ہم کو اس پر رحم کرنا چاہیے اور ظاہر ہے کہ ناخوشی اور رحم میں بہت بڑا فرق ہے۔ رحم کی شان ہی دوسری ہوتی ہے نہ تو تو میں میں اور گالی گلوچ اور لاٹھی پونگا اور لڑائی جھگڑا اور ہنگامہ و فساد جیسا کہ ہو رہا ہے یوں سمجھو کہ مثلاً دنیا میں ہر شخص معاش کا جویا ہے تو اس کے لیے کوئی نوکری کرتا ہے، کوئی تجارت، کوئی زراعت کوئی ایک پیشہ، کوئی دوسرا پیشہ، کوئی کچھ کوئی کچھ، لیکن لوہار درزی سے نہیں لڑتا کہ تو بھی آہنگری کیوں نہیں کرتا۔ زمیندار سوداگر کا دشمن نہیں کہ تو لگان کیوں نہیں لیتا۔ نوکری پیشہ سوداگر سے ناراض نہیں کہ تو نوکری کیوں نہیں اختیار کرتا۔ اسی طرح بعینہٖ اسی طرح مذہب کیا چیز ہے کہ ہر ایک شخص نجات چاہتا ہے، ایک ہندو دھرم ہے کہ وہ اسی کو مکش کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ کوئی مسلمان ہے، کوئی عیسائی ہے، کوئی یہودی لیکن معاش کے ذرائع کے اختلاف پر نہ لڑیں اور نجات کے ذرائع کے اختلاف پر لڑیں۔ یہ کیوں؟ فرض کرو کہ ایک شخص صریح غلطی پر ہے تو ہماری بلا سے اپنا سر کھائے۔ اور اگر انسانی ہمدردی چین سے نہیں بیٹھنے دیتی تو ایسے احمق کوئی اور ہوں گے جو اس عذر کو تسلیم کر لیں گے۔ ہمدردی کی یہی ایک علامت تو نہیں ہے اگر واقعی دل میں ہمدردی ہے تو وہ تمہاری تمام حرکات و سکنات سے ظاہر ہونی چاہیے کہ کسی کو ننگا بھوکا نہ دیکھ سکو۔ کسی کو مبتلائے مصیبت نہ دیکھ سکو نہ یہ کہ آپ پہنو شال دوشالے تمہارے پڑوسیوں کو کمبل بھی نصیب نہ ہو۔ تم ہر روز [illegible] اور بدہضمی کے علاج میں رہو، تمہارے ہمسائے اور جان پہچان بلکہ دور کے قرابت دار فاقے کریں۔ (لکچروں کا مجموعہ جلد دوم)

فہرست مضامین

قیمت فی پرچہ ۳ ر

جمہوریہ چین

(۱)

عبداللطیف اعظمی

سنہ ۱۹۱۱ء میں چین میں انقلاب آیا۔ کوئی چار ہزار برس کا بوسیدہ سامراجی نظام ختم ہوا، اور اس کی جگہ جمہوری حکومت قائم ہوئی۔ یہ انقلاب اس طرح کا نہیں تھا جیسا کہ روس میں ہوا، بلکہ بڑی حد تک انگلستان کے سنہ ۱۶۸۸ء کے انقلاب سے مشابہت رکھتا تھا، یہ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے خلاف نہیں تھا بلکہ ایک خاص قسم کے جاگیرداری نظام حکومت کے خلاف تھا جو چار ہزار سال سے چین میں قائم تھا۔ انقلاب کے بانی عوام نہیں تھے، بلکہ ملک کے سربرآوردہ سیاست داں جو جاگیرداری نظام کی جگہ ایک ایسے نظام حکومت کی طرح ڈالنا چاہتے تھے جس میں عوام کو بڑھنے، ترقی کرنے اور حکومت کے اہم معاملات پر اثر ڈالنے کے مواقع حاصل ہوں۔

اس انقلاب میں داخلی اور خارجی دونوں اسباب کام کر رہے تھے۔ داخلی اسباب دو تھے۔ پہلا سبب منچو خاندان کا زوال ہے چی ان ملن (سنہ ۱۸۶۱ء) کے بعد جتنے شہنشاہ ہوئے سب کے سب نااہل اور حکومت کے لئے بالکل ناموزوں تھے اس لئے حکومت کی ذمہ داریوں کو سنبھال نہ سکے، اور حکومت کا شیرازہ بکھر گیا۔ ٹیپنگ اور باکسر بغاوتیں ان کی نااہلی ہی کا نتیجہ تھیں۔ جن سے چین کے سامراجی نظام کی کڑیاں ایک دوسرے سے الگ ہو گئیں۔ دوسرا سبب سامراجی ملکوں کی لوٹ کھسوٹ ہے۔ اس کی وجہ سے چینیوں کے دل میں ان کے خلاف نفرت اور عداوت پیدا ہو گئی، اور جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اس میں اور شدت پیدا ہوتی گئی۔

خارجی اسباب میں اہم سبب یہ تھا کہ منچو حکومت، دوسرے ملکوں سے تعلقات قائم کرنے میں ناکام ثابت ہوئی۔ سلطنت کی وسعت میں برابر کمی ہونے لگی۔ خارجی ملکوں کو امتیازی حقوق دینے میں پوری فیاضی سے کام لیا گیا۔ اور حکومت کی کمزوری اور بد انتظامی سے عوام نہایت بددل اور پریشان تھے۔ یہ آثار ملک کے لئے بہت ہی خطرناک تھے۔ اس لئے محبانِ وطن کی ایک جماعت ان خرابیوں کی اصلاح کے لئے کمربستہ ہو کر میدان عمل میں آئی۔ اسی درمیان میں ٹھیکی جاپان کو روس کے مقابلے میں بڑی شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔ اس سے چین کے لیڈروں کو بڑی تقویت ملی اور عوام کے حوصلوں میں بلندی، اور ارادوں میں استحکام پیدا ہو گیا۔ انھوں نے سوچا کہ جاپان کی طرح وہ بھی اپنے یہاں کی سامراجی حکومت کے مقابلے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے حکومت سے داخلی اصلاحات کا مطالبہ کیا اور جب انھوں نے دیکھا کہ حکومت ان کو منظور کرنے کے لئے تیار نہیں ہے تو انھوں نے خفیہ انقلابی جماعتیں بنائیں۔

انقلابی جماعت کی تنظیم اور اس کی رہنمائی کا کام سن یات سین نے بڑی خوبی سے انجام دیا۔ انقلاب کے لئے ایک طرف تو ملک کے اندر لوگوں کو منظم کیا تو دوسری طرف ان چینیوں سے جو بیرونی ملکوں خصوصاً امریکہ اور جاپان میں تھے براہ راست تعلق پیدا کیا، اور جنگ آزادی کے لئے انھیں بھی آمادہ کیا اور یہ واقعہ ہے کہ سن یات سین کی یہ دور اندیشی بعد میں بڑی کام آئی۔ اور انقلاب کے دنوں میں ان سے بڑی مدد ملی۔

انقلابیوں نے کینٹن پر قبضہ کرنے کی کئی مرتبہ کوشش کی مگر کامیابی نہ ہو سکی، اور بغاوت کے جرم میں ان کو [illegible] کی سزا ملی۔ مگر محض ایک اتفاقی واقعہ سے انقلاب کی راہ کھل گئی اور حکومت کا تختہ الٹنے میں [illegible]

۹ اکتوبر سنہ ۱۹۱۱ء کو ووچنگ (صوبہ ہوپی) میں وائسرائے کے قتل کی ایک سازش پکڑی گئی۔ سازش کرنے والوں نے عجلت اور مایوسی میں بغاوت کر دی اور چند ہی گھنٹوں میں ان کا پورے شہر پر قبضہ ہو گیا۔ وائسرائے بھاگ گیا، اور صوبہ جاتی حکومت کا انتظام انقلابی جماعت کو مل گیا۔ اس کی اطلاع پاتے ہی شاہی حکومت نے جنرل ین چانگ کی سرکردگی میں تیس ہزار کی فوج روانہ کی۔ لیکن ان کے پہنچنے تک صوبہ کے بہت سے شہروں پر انقلابیوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور دوسرے اور بہت سے صوبے بھی بغاوت میں شریک ہو چکے تھے۔

حالات کی نزاکت اور انقلابیوں کی بڑھتی ہوئی کامیابی سے گھبرا کر پرنس ریجنٹ نے نامزد نیشنل کونسل کو بہت سے حقوق دے دئے۔ دستور کا اعلان کیا، جس میں شہنشاہ کے اختیارات کم کر کے اُسے محض برائے نام باقی رکھا گیا تھا، اور حکومت کے تمام اختیارات ایک منتخب مجلس آئین ساز کو دئے گئے تھے۔ اُس نے یان شی کائی کو جسے اسی سال وزارت امور خارجہ سے علیحدہ کیا گیا تھا دوبارہ وزیر اعظم مقرر کیا۔ اور خود الگ ہو گیا۔ یان شی کائی چین کی جدید فوج کا بانی تھا۔ اس لئے کمانڈر اور فوج سب کے سب اس کا بہت احترام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بہت سے صوبوں میں وہ وائسرائے کے منصب پر بھی فائز رہ چکا تھا اس لئے شاہ پسندوں کو توقع تھی کہ نئے وزیر اعظم کے ان اثرات کی وجہ سے عوام کا موجودہ جوش ٹھنڈا ہو گا، تو اُن کی بہت بڑی تعداد شاہی حکومت کی حامی ہو جائے گی۔

یان شی کائی جس وقت اپنے وطن ہونان سے پیکنگ پہنچا، تو انقلاب نازک صورت اختیار کر چکا تھا۔ تقریباً تیرہ صوبے بغاوت میں شریک ہو چکے تھے اور قریب قریب نصف سلطنت متاثر ہو چکی تھی۔ دریائے یانگ سی کے جنوب میں انقلاب بے قابو آگ کی طرح ایک ضلع سے دوسرے ضلع اور ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں تیزی سے پھیل رہا تھا۔ شنگھائی اور بہت سے شہروں کی عمارتوں اور دفتروں پر جمہوریت پسندوں کا جھنڈا لہرا رہا تھا، جن پر سونے کے حرفوں میں لکھا ہوا تھا:۔

"منچو شہنشاہیت کو ختم کر دو"

اگرچہ انقلابیوں کو بڑی شاندار کامیابی حاصل ہوئی تھی اور ملک کے بہت بڑے حصے پر ان کی حکومت تھی مگر فوجی اور مالی دونوں حیثیتوں سے وہ شاہ پسندوں کے مقابلے میں کمزور تھے۔ شمالی فوج جو اب بھی شہنشاہ یا نئے وزیر اعظم کی وفادار تھی، انقلابی رنگ روٹوں یا جنوبی فوج کے مقابل میں زیادہ منظم اور بہتر تربیت یافتہ تھی۔ چنانچہ جب ہانکو کے قریب ان دونوں فوجوں میں تصادم ہوا تو شاہی فوج نے ہانکو اور ہن یانگ پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور اس کا سبب یقینی ہو گیا تھا کہ ووچنگ بھی ان کا [illegible] اس سے انقلابیوں کی ہمت ٹوٹ گئی [illegible] صلح کی خواہش ظاہر کی گئی ۲ دسمبر سنہ ۱۹۱۱ء کو [illegible] [illegible] بھیجے گئے اور شنگھائی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] بحث سے [illegible] [illegible] اور طے پایا کہ طرز حکومت کا فیصلہ ایک نیشنل کنونشن کے ذریعہ کیا جائے۔

یکم جنوری سنہ ۱۹۱۲ء کو نانکنگ میں جمہوری حکومت کا اعلان ہوا۔ ڈاکٹر سن یات سین صدر بنائے گئے باغی صوبوں کے نمائندوں کی ایک اسمبلی بنائی گئی [illegible] کی حیثیت حاصل تھی اور ایک عارضی [illegible] کیا گیا اور اس کے سامنے منظوری کے لئے پیش کیا گیا۔ اس موقع پر یان شی کائی نے حسب ذیل اعلان کیا۔

"مجھے اس میں شبہ ہے کہ چین کے عوام اس وقت کسی جمہوری نظام کے لئے موزوں ہیں یا موجودہ حالات میں چینی عوام کو جمہوری حکومت دینا مناسب ہوگا...... محدود شاہی حکومت ہی موجودہ حالات پر زیادہ آسانی سے قابو پا سکتی ہے۔ کم وقت میں ایک مضبوط اور دیرپا نظام قائم کر سکتی ہے۔ بہ نسبت ایسے طرز حکومت کے جسے ابھی تجربے کی منزلوں سے گذرنا ہے اور جو کم از کم موجودہ حالات میں چین جیسے ملک کے لئے بالکل ناموزوں ہے .... میں موجودہ شہنشاہ کو باقی رکھنے کی حمایت محض اس لئے کر رہا ہوں کہ میں دستوری بادشاہت کا قائل ہوں مجھے یقین ہے کہ صرف شہنشاہ ہی ہم میں ایک ایسی ہستی ہے جس پر پوری قوم متفق اور متحد ہو سکتی ہے .... میں چاہتا ہوں کہ اس نازک موقع پر چین کو اس تباہی سے جس کی طرف وہ تیزی سے قدم اٹھا رہا ہے اور ان خرابیوں سے جو جمہوری نظام منظور کرنے کے بعد پیدا ہوں گی بچا لیا جائے۔"

مگر جمہوریت پسند اس اپیل کے بعد بھی اپنے مطالبے پر قائم رہے اور مکمل جمہوریہ سے کم پر کسی طرح تیار نہیں تھے۔ اس گفت و شنید میں جنوری (سنہ ۱۹۱۲ء) کا پورا مہینہ ختم ہو گیا۔ بالآخر یان اور جمہوریت پسندوں کے درمیان طے پایا کہ شاہی خاندان کو ...... ۴ لاکھ کی سالانہ پنشن ملا کرے گی، شہنشاہ کو پیکنگ کے شاہی محل میں رہنے کی اجازت ہوگی اور اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے گا۔

یہ انقلاب اگرچہ کامیاب رہا اور جمہوریت پسندوں کے رہنما اور انقلاب کے اہم بانی سن یات سین جمہوریہ چین کے صدر بھی چن لئے گئے، لیکن شمالی فوج شاہی خاندان کی وفادار تھی اور اس کے کمانڈر انچیف یان شی کائی شہنشاہیت کو بالکل ختم کرنے کے مخالف تھے۔ دوسرے وہ خود صدر بننا چاہتے تھے۔ اس لئے ان تمام کامیابیوں کے باوجود انقلابیوں کی راہ میں ایک "سنگ گراں" موجود تھا۔ اس "سنگ گراں" کو راہ سے ہٹانے کی کوئی صورت پیدا نہ ہوسکی، تو مجبوراً جمہوریت پسندوں کو یان شی کائی سے سمجھوتہ کرنا پڑا اور سن یات سین کی جگہ اسے صدر مقرر کیا گیا (۱۰ مارچ سنہ ۱۹۱۲ء)، مگر انھیں یقین تھا کہ یان شی کائی جمہوریت کا مخالف ہے اس لئے انھوں نے دستور میں ایسی قیدیں

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

ہفت روزہ
نئی روشنی
دہلی
۸ر دسمبر ۱۹۴۸ء

مسلم یونیورسٹی کا نیا دور

۲۸ر نومبر ۱۹۴۸ء سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی کتاب زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کا وائس چانسلر منتخب ہونا کوئی معمولی یا سطحی تبدیلی نہیں بلکہ یہ ایک گہری اصلی تبدیلی ہے۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے بانی سر سید احمد خاں اس تعلیم گاہ کو اصول و مصلحت کی مشترک راہ پر چلاتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد نصف صدی کے دوران میں وہ اصول کی سیدھی ڈگر سے دور ہٹتی گئی۔ یہاں تک کہ آخر میں یہ راستہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ اور وہ خالص مصلحت کی ٹیڑھی میڑھی راہوں سے بھٹکنے لگی۔ اب پورے پچاس برس کے بعد اسے ایسا رہنما ملا ہے جس کے بارے میں ہر شخص کو یقین ہے کہ وہ اسے نئے سرے سے اصول کی شاہراہ پر چلائے گا جس کے ساتھ مصلحت کی پگ ڈنڈیاں کہیں نہ کہیں آکر مل جاتی ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔ سر سید نے اس انقلاب کا جو ان کی آنکھوں کے سامنے ہندوستان میں ہو رہا تھا جائزہ لیا تو ان کو یہ نظر آیا کہ ہندوستان میں عہد وسطیٰ سلطنت مغلیہ کے ساتھ دم توڑ رہا ہے اور عہد جدید سلطنت برطانیہ کے ساتھ اس کی جگہ لے رہا ہے۔ ترقی پسند مصلح کی حیثیت سے انھوں نے عہد جدید کا اور مصلحت اندیش مدبر کی حیثیت سے برطانوی حکومت کا خیر مقدم کیا۔ عہد جدید سے ان کو یہ امید تھی کہ اس کی علمی اور افادی روح کی بدولت ہندوستان میں ذہنی اور مادی ترقی کی لہر دوڑ جائے گی اور برطانوی حکومت سے یہ توقع تھی کہ وہ ایک رعایا پرور اور روشن خیال حکومت ثابت ہوگی اور اس کے سائے میں ملک میں سیاسی وحدت، امن و امان اور خوش حالی کا دور دورہ ہوگا۔ اس لیے جب انھوں نے مسلمانوں کی زندگی کی تعمیر نو کے لیے علی گڑھ کالج قائم کیا تو اس کی بنا اصولاً ذہنی تجدید کی علم برداری پر اور مصلحتاً برطانوی حکومت کی وفاداری پر رکھی۔ مگر ان کے چند رفیقوں کو چھوڑ کر عام طور پر مسلمانوں کا اونچا اور متوسط طبقہ جس کے لئے اور جس کی مدد سے سر سید نے کالج بنایا تھا ان کے اصول کی ذرہ برابر پروا نہیں کرتا تھا۔ اسے تو صرف یہ مصلحت پسند آئی تھی کہ نئی تعلیم کے ذریعے مسلمان نوجوانوں کو حکومت کی خوشنودی اور قرب حاصل ہو اور ملازمتیں میسر آئیں۔ پھر بھی جب تک سر سید زندہ رہے اصلاح و ترقی کی مختلف تحریکیں ان کی ذات سے وابستہ رہیں اور ان کا اثر کالج پر بھی پڑتا رہا۔

سر سید کی وفات کے بعد علی گڑھ کالج کا رشتہ ان ترقی پسندانہ تحریکوں سے کٹ گیا۔ اس نے اپنے اصول کو یعنی ذہنی تجدید کی علم برداری کو ترک کر دیا۔ صرف مصلحت سے یعنی حکومت کی وفاداری سے سروکار رکھا۔ حالانکہ اب وہ امیدیں جو سر سید نے برطانوی حکومت سے باندھی تھیں غلط ثابت ہو چکی تھیں۔ اس نے سطحی سیاسی وحدت اور جبری امن و امان ضرور قائم کیا تھا، مگر خوش حالی تو در کنار اس کی معاشی پالیسی نے ہندوستان کی دستکاریوں کو برباد کر کے اسے اور خستہ حال کر دیا تھا، عام طور پر ملک کے متوسط طبقے نے بیرونی حکومت کے جوئے کو اتار پھینکنے کے لیے آزادی کی تحریک شروع کر دی تھی اور مہاتما گاندھی نے عوام کو اس میں شریک کر کے اسے جاندار اور پر زور قومی تحریک بنا دیا تھا۔ مگر مسلمانوں کے اس مخصوص طبقے نے جو علی گڑھ پر قابض تھا اپنے آپ کو اور اپنی تعلیم گاہ کو قومی زندگی کی عام رو سے الگ رکھا۔

خلافت اور عدم تعاون کی تحریک کے زمانے میں جب کالج کے جسم اجتماعی کے ایک بازو یعنی اس نئے خون کی گردش محسوس ہونے لگی جو ہندو اور مسلمان نوجوانوں کی رگوں میں گردش کر رہا تھا تو اس بازو کو کاٹ کر پھینک دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علی گڑھ کا قلب و دماغ ماؤف ہو کر رہ گیا۔ چونکہ باقی اعضا خصوصاً آلات ہضم اپنا کام کر رہے تھے۔ اس لئے بظاہر حیات جسمانی میں کوئی خلل نہیں پڑا۔

بغیر کسی اصول اور مقصد کے محض مصلحت کے سہارے علی گڑھ کی تعلیم گاہ تقریباً نصف صدی سے زندگی گزار رہی تھی۔ اس کی روح ٹھٹھر کر رہ گئی تھی، مگر مرنے نہیں پائی تھی، وہ بے مقصدی سے اتنی تنگ آ گئی تھی اور مقصد کے لئے اس قدر بے قرار تھی کہ جب مسلم لیگ کے ارباب سیاست نے سیاسی جنگ میں شکست کھا کر حرکت مذبوحی کے طور پر پاکستان کا نعرہ بلند کیا تو اس تعلیم گاہ نے جو اب یونیورسٹی بن چکی تھی بے سوچے سمجھے اسی کو اپنا مقصد بنا لیا۔ تھوڑے دن کے لئے اس کے اندر ایک عارضی ہیجان پیدا ہوا اور بڑھتے بڑھتے بحران کی حد تک پہنچ گیا۔ مگر تقسیم ہند کے بعد اس کی آنکھیں کھل گئیں اور اسے محسوس ہوا کہ یہ سارا جوش جنون محض سودائے خام تھا۔ اب رد عمل شروع ہوا اور ساری فضا میں مایوسی اور افسردگی چھا گئی۔

یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد نے دیکھا کہ مقصد تو کچھ راس نہیں آیا اس لئے پھر مصلحت کی طرف رجوع کیا اور نئی حکومت کے ساتھ پیمان وفا باندھنے کو تیار ہو گئے۔ مگر ان پر بہت جلد حقیقت منکشف ہو گئی کہ اب مصلحت کی کشتی بغیر اصول کے لنگر کے طوفان حوادث کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اب حکومت محض ملک و قوم کے عام مقاصد کا آلہ کار ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں جب تک ان مقاصد کا ساتھ نہ دیا جائے حکومت کے ساتھ تعاون ممکن نہیں اور اگر ہو بھی تو بے معنی اور بے کار ہے۔

اس لئے ۲۸ر نومبر ۱۹۴۸ء کو مسلم یونیورسٹی کورٹ نے یہ تاریخی فیصلہ کیا کہ یونیورسٹی کے ایک فرزند رشید ڈاکٹر ذاکر حسین کو جو ابتدا سے ملک و قوم کے عام مقاصد متحدہ قومیت اور سیاسی اور معاشی جمہوریت کے حامی ہیں وائس چانسلر بنایا جائے۔ ان کے علاوہ ذاکر صاحب کو سر سید کے تجدید و اصلاح کے مقصد، مولانا محمود الحسن کے دیانت و تقویٰ کے مقصد اور گاندھی جی کے حق اور عدم تشدد کے مقصد کی علم برداری کا فخر بھی حاصل ہے۔ انھوں نے جامعہ ملیہ کے چھوٹے سے معمل میں ان سب عناصر کو سمو کر ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم کا مرکب تیار کرنے کا تجربہ کیا ہے اور اس میں

اچھی خاصی کامیابی حاصل کی ہے۔ اس لئے ہماری یہ امید بے جا نہیں کہ ذاکر صاحب کی رہنمائی قبول کرنے کے بعد مسلم یونیورسٹی کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوگا اور اب وہ اپنی زندگی کی بنیاد عارضی مصلحت و منفعت کی جگہ پائدار اخلاقی اصول اور ذہنی اور روحانی اقدار کی چٹانوں پر رکھے گی جس سے مصلحت اور منفعت کے چشمے خود بخود پھوٹ نکلیں گے۔

بزم بے تکلف

ع اپنے سے کر، نہ غیر سے الفت ہی کیوں نہ ہو

معلوم نہیں غالب مرحوم کو یہ نصیحت کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس لئے کہ یہ تو ایک فرض ہے جسے عام طور پر لوگ آپ ہی آپ بڑے ذوق شوق سے ادا کرتے ہیں۔ اگر کچھ خدا کے بندے ایسے ہوں بھی جنھیں اس بارے میں تاکید کی ضرورت ہو تو ہمارے نہال صاحب ان میں سے نہیں ہیں۔ نہال صاحب کو اپنے آپ سے سچی اور گہری محبت ہے۔ وہ اپنی صورت کے عاشق زار ہیں۔ مگر غیرت مند [illegible] عاشقوں کی طرح اپنا راز محبت [illegible] پر ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ چھپ چھپ کر آئینے میں اپنی شکل دیکھتے ہیں اور خوش [illegible] ہیں۔ دوسروں کو [illegible] نظر کو ان کے چہرے میں سے [illegible] رنگت، فراخ [illegible] کشادہ [illegible] ناک اور بانکی ترچھی آنکھوں میں کوئی حسن دکھائی نہیں دیتا، [illegible] لیلیٰ را بچشم مجنوں باید دید۔ نہال صاحب کو آئینے میں انسان کا عکس نہیں بلکہ حسن و جمال کی پوٹ نظر آتی ہے۔ جسے دیکھ کر ان کا دل لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔

نہال صاحب کے کان بڑے حساس ہیں ہر آواز جو ذرا سی سخت یا کرخت، تیز یا بھاری، پھٹی ہوئی یا بیٹھی ہوئی ہو ان کو زہر لگتی ہے۔ مگر اپنی آواز کا زیر و بم، شدو مد، قبض و بسط انھیں اتنا پسند ہے کہ ہر وقت منہ ہی منہ میں گنگناتے رہتے ہیں، اور دل ہی دل میں مزے لیتے رہتے ہیں اور جہاں موقع مل جائے بے دھڑک گا پڑتے ہیں۔

رنگ روپ اور سر تال ہی پر موقوف نہیں وہ اپنی آن بان، سج دھج، چال ڈھال، غرض ایک ایک ادا پر سو سو جان سے قربان ہیں۔ مگر یہ نہ سمجھئے گا کہ نہال صاحب محض صورت کے بندے ہیں۔ وہ اپنے جمال ظاہری سے کہیں زیادہ اپنے حسن باطنی کی قدر کرتے ہیں۔ ان کی جوہر شناس آنکھ اپنی سیرت میں ایسی ایسی خوبیاں دیکھتی ہے جنھیں غیر کی نظریں مشکل سے پرکھ سکتی ہیں۔ مثلاً ان کا اپنے ساتھ حسن سلوک، اپنی ہمدردی، دل نوازی، دل داری، دل جوئی، اپنے عیبوں سے چشم پوشی اپنی خطاؤں سے درگذر، ہر مصیبت میں اپنا ساتھ دینا۔ ہر مشکل میں اپنے کام آنا۔ ان صفات حسنہ کی وجہ سے وہ اپنی پرستش اس خشوع و خضوع کے ساتھ کرتے ہیں کہ بالکل ع صنم، دیر ہم، بت خانہ ہم، بت ہم، برہمن ہم کے مصداق بن کر رہ گئے۔

نہال صاحب کے عشق مجہول کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ کسی کو ان سے رقابت نہیں، وہ بلا شرکت غیرے اپنے محبوب کے لطف و کرم سے بہرہ اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی اکتا کر یہ کہہ اٹھتے ہیں۔ ع کاش کوئی رقیب بھی ہوتا۔

پچھلا ہفتہ :- ا۔ ہندوستان

آئین سازی کا کام چل نکلا

معلوم نہیں آئین ساز اسمبلی کے نائب صدر نے جو آج کل صدارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اپنے نئے اختیارات برتنے یا نہیں برتتے۔ بہر حال اسمبلی کے کام کی رفتار اب اچھی خاصی ہو گئی ہے۔ مگر یہ اُمید چھوڑ دینی پڑی کہ پوری بحث ۲۶ جنوری تک ختم ہو جائے گی۔ اب یہ طے ہوا ہے کہ ۱۳ دسمبر سے ۲۳ دسمبر تک اسمبلی کا سیشن کانگریس کے سالانہ جلسے کی وجہ سے ملتوی رہے اس کے بعد تھوڑے دن اور کام کر کے وہ تین مہینے کے لئے ملتوی ہو جائے۔ بیچ میں یکم فروری سے شاید وسط اپریل تک اسمبلی مجلس وضع قوانین کی حیثیت سے کام کرے گی۔ یہ خیال ابھی تک باقی ہے کہ دستور کی منظوری کے بعد رائے دہندوں کے حلقے بنانے اور فہرستیں تیار کرنے کا عمل چار مہینے میں ختم ہو جائے اور نئے دستور کے مطابق انتخابات ۱۹۵۰ء میں جاڑوں سے پہلے کر لئے جائیں، لیکن غالباً اس پروگرام میں بھی ترمیم کرنی پڑے گی اور انتخابات ۱۹۵۱ء کے شروع میں ہوں گے۔

پچھلے ہفتہ اسمبلی نے بنیادی حقوق کی کئی اور دفعات پر بحث کی۔ دفعہ ۹ کے ذریعے سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہندوستان کے کسی باشندے کے ساتھ چھوت چھات نہیں برتی جائے گی۔ اور اس قسم کا برتاؤ قانونی قابل سزا جرم ہوگا جس کوشش میں گاندھی جی نے اپنی عمر صرف کر دی وہ اب جا کر پوری ہوئی دفعہ ۱۲ کے سلسلے میں یہ تجویز منظور ہوگئی کہ ہندوستان کی ریاست خود اپنے باشندوں کو خطابات تقسیم کرے گی اور نہ ان کو دوسری ریاستوں کے دئے ہوئے خطاب قبول کرنے کی اجازت ہوگی۔ صرف فوجی اور علمی اسناد اور اعزازی القاب کو اس قاعدے سے مستثنےٰ کیا گیا۔

دفعہ ۱۳ پر جس میں شخصی آزادی کا ذکر ہے بڑی گرما گرم بحثیں ہوئیں۔ ہتھیار رکھنے کی عام آزادی تجویز کی گئی مگر منظور نہیں ہوئی۔ ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ جن جرائم کی بنا پر فرد کی آزادی چھینی جا سکتی ہے ان میں سے سڈیشن (حکومت کے خلاف شورش انگیزی) کو خارج کر دیا گیا۔ اس طرح قومی حکومت نے اس ناپاک ہتھیارے کو جس کے ذریعے برطانوی حکومت اپنے مخالفوں اور نقادوں کا گلا گھونٹا کرتی تھی ہمیشہ کے لئے توڑ دیا۔

انیسویں دفعہ پر (جو مذہبی آزادی سے تعلق رکھتی ہے) بحث کے دوران میں یہ ظاہر ہوا کہ فرقہ پرستی کے ان ہولناک مظاہروں کی وجہ سے جو پچھلے دو سال میں ہمارے ملک میں ہوئے۔ کچھ لوگوں کو مذہب کے نام ہی سے نفرت ہو گئی ہے۔ چنانچہ ایک صاحب نے تو سچ مچ یہ تحریک پیش کر دی کہ اس دفعہ کو حذف کر دیا جائے یعنی آئین مذہب کے وجود کو تسلیم ہی نہ کرے کسی مذہب کے لوگوں کو مذہبی تبلیغ کا حق دینے کی کوئی ممبروں نے مخالفت کی ایک مسلم ممبر کی اس تجویز پر لوگ بہت محظوظ ہوئے کہ اس قسم کی سب علامات کو ممنوع قرار دیا جائے جن سے کسی شہری کا مذہب ظاہر ہوتا ہو۔ اس دفعہ پر رائے دہی شنبہ ۴ دسمبر کو لی جائے گی۔ لیکن اندازہ یہی ہے کہ پوری دفعہ جس کی رو سے ہر شہری کو مذہب کے معاملے میں عقیدے عمل اور تبلیغ کی اجازت دی گئی ہے بغیر کسی ترمیم کے منظور ہو جائے گی۔

صلح کی باتیں اور لڑائی کی گھاتیں

سرسری نظر سے دیکھنے میں یہ عجیب غریب بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک طرف پاکستان اور ہندوستان کی فوجیں کشمیر میں لڑ رہی ہیں اور اس لڑائی کے جلد ختم ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ دوسری طرف ۲ دسمبر سے دہلی میں پاکستان اور ہندوستان کے نمائندوں کی کانفرنس شروع ہو رہی ہے جس میں (مسئلہ کشمیر کے سوا) سب اختلافی مسائل کو دوستانہ بات چیت کے ذریعے سے طے کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ لیکن جن لوگوں نے صورت حال کا مطالعہ غور سے کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ دراصل کشمیر کی لڑائی کا فیصلہ ہو چکا ہے ہندوستانی فوج ریاست کے زرخیز اور آباد حصوں پر قبضہ کر چکی ہے اور مغرب میں سرحد سے پندرہ بیس میل کے فاصلے پر پہنچ گئی ہے۔

اس سے آگے بڑھنے کی کوشش وہ اس وجہ سے نہیں کرتی کہ کہیں جنگ کی باڑھ اسے پاکستان کی سرحد کے اندر نہ پہنچا دے اور وہ پاکستان پر جارحانہ حملہ کرنے کی ملزم نہ قرار دی جائے اب حکومت پاکستان نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ ہم کشمیر کے مسئلے کو رائے شماری کے ذریعے طے کرنا چاہتے ہیں اور ہندوستان اس کا فیصلہ فوجی طاقت سے کرنے پر تلا ہوا ہے پھر بھی وہ پاکستانی فوجوں کو کشمیر سے ہٹانے پر راضی نہیں ہوتی۔ یہ سمجھ کر کہ اس سے اس کا مقدمہ جو سیکوریٹی کونسل میں پیش ہے کمزور ہو جائے گا۔ اسے اب تک یہ امید باقی ہے کہ سیکوریٹی کونسل کشمیر کے مسئلے کا کوئی ایسا حل تجویز کر دے گی جس میں پاکستان کی بات رہ جائے۔

غرض کشمیر کی لڑائی اب لڑائی نہیں رہی بلکہ

ع۔ چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد

کا معاملہ ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے دونوں ریاستوں کے درمیان دوسرے مسائل کے متعلق دوستانہ گفتگو کرنے میں رکاوٹ نہیں پڑتی۔

کانفرنس میں جن چیزوں پر بحث ہونے والی ہے۔ ان میں غیر منقسم ہند کے سامان کی تقسیم۔ پناہ گزینوں کی املاک، تجارتی مال کی آمد و رفت اور اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کو خاص اہمیت حاصل ہے اور یہ مسائل وہ ہیں جن پر دونوں ریاستوں کی موجودہ اور آیندہ فلاح و بہبود کا دار مدار ہے۔ ہمیں امید ہے کہ دونوں طرف کے نمائندے وقتی سیاسی جذبات کے اثر سے آزاد ہو کر عقل و انصاف کی روشنی میں ان سب مسائل پر غور کریں گے۔ خوش قسمتی سے پاکستانی وفد کے لیڈر غلام محمد صاحب اور ہندوستانی وفد کے لیڈر گوپال سوامی آئنگر صاحب دونوں کی عملی اور ذہنی تربیت سیاست کی پر شور طوفانی فضا میں نہیں بلکہ نظم و نسق کی پرسکون فضا میں ہوئی ہے اس لئے اُمید ہے کہ ان کی رہنمائی میں یہ کانفرنس جس کے متعلق یہ اندازہ ہے کہ دو ہفتے تک چلے گی، ذمہ داری اور مصلحت بینی کے ساتھ کام کرے گی اور سب نزاعی امور کا معقول اور قابل عمل فیصلہ ہو جائے گا۔

صاف گوئی بہر حال اچھی ہے

کانگریس کے محترم لیڈر اور حکومت ہند کے ڈپٹی پرائم منسٹر سردار ولبھ بھائی پٹیل اپنی صاف گوئی کے لئے مشہور ہیں اس میں شک نہیں کہ عام طور پر ان کا لہجہ سخت اور تلخ ہوتا ہے اور اس سے ان لوگوں کو جو اس خاص موقعے پر ان کی تنقید کے موضوع ہوں قدرتی طور پر تکلیف پہنچتی ہے۔ لیکن مجموعی طور پر سب معقول اور منصف مزاج آدمی یہی کہتے ہیں کہ سردار کے الفاظ نرم اور معتدل ہوتے تو بہت اچھا تھا مگر ان کی یہ عادت بہر حال قابل قدر ہے کہ اپنی دل کی بات بے لاگ صاف صاف کہہ دیتے ہیں اور دوست دشمن کسی کو دھوکے میں نہیں رکھتے۔ تقسیم ہند سے کچھ دن پہلے سے گذشتہ ستمبر کے وسط تک ان کا یہ خیال تھا کہ ہندوستان کے بہت سے مسلمانوں کی مسلم لیگی اور پاکستانی ذہنیت ہندوستان کے امن اور سلامتی کے لئے خطرناک ہے اور اس کا اظہار وہ ہر موقعے پر کرتے رہتے۔ ہندو مہا سبھا اور آر، ایس، ایس کے بارے میں بہت دن تک ان کی رائے یہ تھی کہ ان انجمنوں کا مقصد محض ہندوؤں کے جان و مال کی حفاظت ہے اس لئے وہ ان کے طریق کار کی تو مذمت کرتے تھے مگر ان کے مقصد کو جائز قرار دیتے تھے۔ لیکن جب واقعات اور حقائق نے ان کو ان دونوں معاملوں میں اپنی رائے بدلنے پر مجبور کیا تو انھوں نے اس تبدیلی کا کھلم کھلا اعلان کر دیا۔ حیدر آباد کی مہم کے دوران میں ہندوستان کے مسلمانوں کا جو معقول طرز عمل رہا اس کو انھوں نے صاف اور واضح الفاظ میں سراہا اور اس کے بعد کئی تقریروں میں یہ اعتراف کیا کہ اب انھیں مسلمانوں پر شبہ نہیں رہا۔ اسی طرح انھوں نے یہ بھی مان لیا کہ آر، ایس، ایس اور ہندو مہا سبھا کے بارے میں ان کا حسن ظن غلط تھا۔

ابھی ۲ دسمبر کو گوالیار میں سردار نے عام جلسے میں جو تقریر کی ہے اس کے بعض فقروں سے ان کے موجودہ خیالات کا پوری وضاحت کے ساتھ اندازہ ہوتا ہے انھوں نے فرمایا "کانگریسی حکومت پر یہ الزام لگانے والے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ رعایت کرتی ہے ہندو مہا سبھا اور آر، ایس، لیس وغیرہ کے لوگ ہیں...... قاہرانہ حکومت کے حامیوں کا وہی انجام ہوگا جو راون کا ہوا۔ اگر کوئی مسلمان ریاست کا وفادار نہ ہو تو ریاست اس سے نبٹ لے گی۔ کسی فرد کو اس سے کوئی سروکار نہیں وفادار مسلمانوں کے ساتھ سگے بھائیوں کا سا برتاؤ کرو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تم وفادار مسلمانوں کو محض مسلمان ہونے کی وجہ سے ستایا کرو تو پھر اس آزادی پر حیف ہے۔ ہمیں ایسی فضا پیدا کرنی ہے جس میں ہر شخص اطمینان اور سلامتی کے ساتھ رہ سکے......

بعض لوگ کہتے ہیں کہ آر، ایس، ایس والے ستیاگرہ شروع کرنے والے ہیں۔ وہ ہرگز نہیں کر سکتے۔ جن کے دلوں میں زہر بھرا ہے وہ ستیاگرہ کیا کریں گے۔ ہم نے ان کے دلوں کو تسخیر کرنے کی کوشش کی مگر انھوں نے تشدد اور فریب کا راستہ اختیار کیا میں انھیں بتائے دیتا ہوں کہ ہمارے پاس اس دھمکی سے نبٹنے کے لئے سارے

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

۲۔ پاکستان

صنعتی ترقی کی رفتار خاصی ہی

پاکستان کی صنعتی ترقی کے متعلق وزیر صنعت فضل الرحمٰن صاحب نے کراچی کے مسلم چیمبر آف کامرس کو خطاب کرتے ہوئے جو کچھ فرمایا ہے۔ اس میں معاصر پاکستان ٹائمز کے الفاظ میں مشکلات اور دقتوں کا ذکر زیادہ ہے اور کامیابی کا بہت کم۔ پچھلے سال دسمبر میں صنعتی ترقی کے لیے جن منصوبوں کا اعلان کیا گیا تھا ان میں ہائیڈرو الکٹرک اسکیموں کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی تھی اور اسی معرفت پر بڑی خوش آیند توقعات قائم کی گئی تھیں لیکن اب ایک سال کے بعد وزیر صنعت فرماتے ہیں کہ وسائل اور ماہرین فن کی کمی کی وجہ سے یہ اسکیم کامیاب نہ ہو سکی۔ اس ایک سال میں صرف یہ ہوا ہے کہ ایک مشہور انجنیر کی خدمات حاصل کر لی گئی ہیں۔ وزیر صنعت کو یقین ہے کہ وہ بہت جلد چھوٹی مدت اور لمبی مدت کا منصوبہ تیار کر لیں گے۔ انھوں نے پاکستان کے لوگوں سے درخواست کی ہے کہ ابھی کچھ عرصہ اور مشرقی پنجاب کی بجلی کا محتاج رہنے پر صبر کریں۔

پاکستان کے قائم ہونے کے بعد ساڑھے نو مہینے میں ۱۲۱ کمپنیاں قائم کی گئیں جن کا منظور شدہ سرمایہ ۱۶۰،۴۷ کروڑ تھا۔ لیکن اس سرمایہ میں سے بہت کم استعمال میں آیا اور عام لوگوں سے جو رقم وصول کی گئی وہ ۵۰ لاکھ سے زیادہ نہیں تھی۔ پاکستان کے ایک "ماہر معاشیات" نے اس کا عذر یہ بیان کیا ہے کہ "یہ ابتدائی زمانہ تھا، اور زندگی بے سکون اور اطمینان بخش نہیں تھی۔ اس کے علاوہ مسلم مہاجرین کی کثرت اور غیر مسلم کارخانہ داروں کے چلے جانے کی وجہ سے صنعتی ترقی کی رفتار بہت سست رہی۔" یہ خیال اس لحاظ سے صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد کے تین مہینوں ——— جولائی، اگست اور ستمبر میں کافی ترقی ہوئی ہے۔ صرف سندھ میں ۱۹ نئی کمپنیاں کوئی ۴۹ ملین کے سرمایے سے قائم کی گئی ہیں۔ ان میں تین کپڑے بننے اور روئی اوٹنے کی کمپنیاں اور ایک طیارہ بازی کی کمپنی اور سات لوہے کے برتن بنانے کے کارخانے شامل ہیں۔ مغربی پنجاب میں ۴ ملین کے منظور شدہ سرمایے سے ۹ فیکٹریاں مشرقی بنگال میں ۱۳ ملین کے جاری شدہ سرمایے سے ۱۴ فیکٹریاں اور صوبہ سرحد میں ۲۵ لاکھ کے منظور شدہ سرمایہ سے ایک شکر کی فیکٹری قائم کی گئی ہے۔ اس ایک سال کی مدت میں یہ رفتار سست ضرور ہے۔ مگر کچھ بہت زیادہ مایوس کن نہیں۔ بشرطیکہ حکومت پاکستان کی توجہ اسی طرح برابر قائم رہے۔

ہندوستان اور ہم

ہمارے اکثر اخبارات اپنے پڑھنے والوں کے لئے جو ذہنی خوراک مہیا کر رہے ہیں، اس کا کچھ اندازہ آپ ذیل کی سرخیوں سے لگا سکتے ہیں:۔

۱۔ چین میں کومن ٹانگ پارٹی کی شکست اور اشتراکیوں کی فتح نے ہندوستان میں اشتراکیت اور سرمایہ داری کی کشمکش کے لئے راستہ صاف کر دیا۔

۲۔ ہندوستان میں سیاسی جماعتیں اس درجہ مختلف الخیال ہیں کہ ان میں اتحاد عمل پیدا کرنا عقلاً محال ہے۔

۳۔ ہندوستان کی اقتصادی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے اب اقتصادی حالت کو سنبھالنا دشوار ہے۔

۴۔ کشمیر میں ہندوستان کا جانی اور مالی نقصان اس کثیر پیمانے پر ہو رہا ہے کہ اسے ہندوستان زیادہ عرصے تک برداشت نہیں کر سکتا۔

۵۔ مشرقی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کے تعلقات اس قدر کشیدہ ہو چکے ہیں کہ ان میں مفاہمت پیدا کرنا ہندوستانی مدبروں کے لئے ناممکن ہے۔

یہ اور اسی طرح کی دوسری خبریں روزانہ ذرا الفاظ بدل کر، اور زیادہ سے زیادہ "سنسنی خیز" بنا کر قوم کے سامنے پیش کی جاتی ہیں اور اس فن میں ایک اخبار دوسرے اخبار کو مات دینے کی بیش از بیش کوشش کرتا ہے۔ اور سنا گیا ہے کہ جس روز اس قسم کی کوئی "سنسنی خیز" خبر اخبار میں موجود نہ ہو تو اس دن اس اخبار کی فروخت گر جاتی ہے۔ اور دوسری اشاعت کے لئے اس اخبار کے عملے کو ایسی خبریں ایجاد کرنے کے لئے زیادہ دیر تک شب بیداری کرنی پڑتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہمیں ہندوستان کی بدحالی سے اس قدر دلچسپی کیوں ہے؟ اگر ہندوستان میں اشتراکیت اور سرمایہ داری میں جنگ ہونے والی ہے تو اس چپقلش سے پاکستان کو کیا فائدہ ہوگا؟ ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کا اختلاف خیال اس درجہ شدید ہو گیا ہے کہ اب وہ متحد نہیں ہو سکتیں تو اس سے پاکستان کی سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی زندگی پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے؟ کیا پاکستان کی مالی خوش حالی کسی طرح بھی ہندوستان کی اقتصادی ابتری سے دور کا تعلق بھی رکھتی ہے؟ کیا جہاد کشمیر میں حصہ لینے والے مجاہدین صرف اس لئے جنگ جیت لیں گے کہ بعض اخباروں کی رائے میں کشمیر میں ہندوستانیوں کا جانی اور مالی نقصان کثیر پیمانے پر ہو رہا ہے؟ کیا مجاہدین کشمیر کے بازوؤں کو مضبوط کرنے کے لیے ان خبروں سے زیادہ کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں؟ اور کیا ہندوؤں اور سکھوں کے تعلقات کی کشیدگی ہمیں کسی طرح بھی فائدہ پہنچا سکتی ہے؟

یہ سوالات اخبار پڑھنے والے سنجیدہ طبقے کے ذہن میں قدرتاً پیدا ہونے چاہئیں اور اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ سب خبریں سچی ہیں۔ پھر بھی یہ ایک بدیہی امر ہے کہ پاکستان کا استحکام، اس کی ترقی اور اس کی خوش حالی ہندوستان کی داخلی چپقلش خانہ جنگی یا اقتصادی انتشار سے ہرگز وابستہ نہیں ہو سکتی۔ کسی ملک کی ترقی کی عمارت دوسرے ملکوں کی تباہی و بربادی کے خرابے پر تعمیر نہیں ہوا کرتی۔ اس کی ترقی یا تنزل کے اسباب خود اس ملک کے باشندوں کی اپنی سیرت و کردار، مقاصد اور ارادوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ہمیں یہ دیکھ کر روحانی تکلیف ہوتی ہے کہ ہمارے وہ ادارے جو عوام کی ذہنیت کو بنانے کا کام بڑی آسانی اور نہایت خوبی سے کر سکتے ہیں۔ عوام کو لوریاں دے دے کر سلا رہے ہیں اور تعمیر ملت کا کام التوا میں پڑ رہا ہے۔ ان خبروں کی بار بار اشاعت ایک طرف تو ہمارے ہم وطنوں کے دلوں میں یہ خیال پختہ کر دیتی ہے کہ ہمارا ہمسایہ ملک ہمارا ایسا ازلی دشمن ہے جس سے کبھی خوشگوار تعلقات ہو ہی نہیں سکتے اور ہمیشہ ہمیشہ اس کی تباہی و بربادی کی داستانیں سننے کے لئے منتظر رہنا چاہیے۔ حالانکہ پاکستان اور ہندوستان کے با اثر اداروں اور شخصیتوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ہمیشہ یہ کوشش کرتے رہیں کہ ان دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات روز بروز استوار سے استوار تر ہو جائیں اور یہ دونوں اچھے ہمسایوں کی طرح زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھیں، بھلائیاں پھیلانے میں ایک دوسرے کی معاونت کریں اور امن جیسی نایاب شے کو حاصل کرنے کے لئے دونوں مل کر جد و جہد کریں۔ اس کے برعکس ہو یہ رہا ہے کہ روز بروز یہ ملک بعض نادان دوستوں کی غلط روش کی وجہ سے ایک دوسرے سے بعید تر ہوتے جاتے ہیں۔ دوسری طرف پاکستان کے بسنے والے ہندوستان کی کمزوریوں کی داستانیں سن کر غیر شعوری طور پر اپنے آپ کو طاقتور سمجھ رہے ہیں، اور اپنے وطن کی فلاح و بہبود کی طرف سے مجرمانہ غفلت برت رہے ہیں۔

ہندوستان سے قطع نظر۔ یہ صورت حالات خود پاکستان کے لئے اچھے نتائج نہیں پیدا کر سکتی۔ ہمارے پریس کا فرض ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والوں کے لئے صرف سچی خبریں مہیا کرے۔ ہو سکتا ہے کہ شروع شروع میں بعض اخباروں کی اشاعت کم ہو جائے۔ مگر فطرتِ انسانی ابھی اتنی مسخ نہیں ہو گئی ہے کہ اس میں بھلے اور برے کی تمیز پیدا نہ ہو سکے اور یہ تمیز پیدا ہو جانے کے بعد کھوٹے سکے زیادہ دیر تک نہیں چل سکتے۔

(انشانِ راہ کراچی)

رائے عامہ کی کامیابی

مسلم لیگ کی موجودہ وزارتوں کی رجعت پسندانہ پالیسی کے خلاف، مغربی پنجاب کی رائے عامہ کو پچھلے دنوں بڑی شاندار کامیابی ہوئی ہے۔ مغربی پنجاب میں پراونشل لیگ کے صدارتی انتخاب میں وزارتی نمایندے علاء الدین صاحب صدیقی کے مقابلے میں میاں ممتاز محمد دولتانہ کامیاب ہوئے ہیں۔ معاصر روزنامہ "مغربی پاکستان" لاہور نے اس کامیابی پر لکھا ہے کہ "وزارتی پالیسی کی یہ شکست فاش ہمارے زاویہ نگاہ سے بہت مبارک فال ہے"

سندھ میں بھی وزارت کو ایک معاملے میں زک اٹھانی پڑی۔ جن پانچ اخبارات نے وہاں کی وزارت پر نا اہلی اور بد دیانتی وغیرہ کے الزامات لگائے تھے ان کی اشاعت صوبائی حکومت نے بند کر دی تھی مگر چودھری خلیق الزماں صاحب کی مداخلت سے حکومت کو اپنا حکم واپس لینا پڑا۔ سندھ کی وزارت کا دعویٰ ہے کہ عوام اس کے ساتھ ہیں اور اخبارات کی خصوصاً "ڈان" کی مخالفت صرف ذاتی اغراض کی بنا پر ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ واقعات اس کی تصدیق کرتے ہیں یا نہیں۔

ع، ل

۳ - باہر کی دُنیا

چین کا دیوالہ نکلنے کو ہے

پچھلے ہفتہ میں، چین کے متعلق بڑی متضاد خبریں آتی رہی ہیں ایک دن یہ خبر آتی کہ کمیونسٹ فوجیں فلاں مقام پر بہت آگے بڑھ گئی ہیں، تو دوسرے دن یہ اطلاع تھی کہ قومی حکومت نے کمیونسٹوں کو پیچھے ڈھکیل دیا ہے۔ ایک روز یہ معلوم ہوتا کہ قومی حکومت اپنی راج دھانی چھوڑ کر بھاگ رہی ہے تو دوسرے دن یہ کہا جاتا کہ نہیں یہ غلط ہے۔ لیکن قومی حکومت کی پریشانی نانکنگ اور شنگھائی میں عام دہشت، لوگوں کا بڑی تعداد میں جنوبی علاقوں میں بھاگ کر جانا اور مادام چیانگ کائی شک کا امریکہ پہنچنا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ اب قومی حکومت کے قدم بری طرح ڈگمگا رہے ہیں۔

اس وقت فوجی ناکامیوں سے بھی زیادہ سخت مصیبت قومی حکومت پر معاشی انتشار اور بدحالی کی ہے۔ ملک کا اقتصادی ڈھانچہ تقریباً ٹوٹ چکا ہے۔ گرتی ہوئی دیواروں کو تھامنے کے لئے نیا سکہ جاری کیا گیا تھا مگر یہ علاج بھی کارگر ثابت نہیں ہوا۔ گرانی بڑھتی جا رہی ہے۔ چور بازاری، نفع خوری اور ذخیرہ اندوزی میں کوئی کمی نہیں ہوئی ہے۔ اس کی وجہ سے بنگال سے کہیں زیادہ بڑے قحط کا اندیشہ بڑھتا جا رہا ہے۔ خود جنرل سیمو کے حوالی موالی جو بڑے بڑے سرمایہ دار اور جاگیردار ہیں ان حالات سے دل برداشتہ اور مایوس ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اب امریکہ کی امداد بھی چیانگ کائی شک کو بچانے میں کامیاب نہ ہو سکے گی۔ چنانچہ قومی حکومت کے وزیر اعظم ونگ وین ہو کو فوجی شکست سے زیادہ معاشی خرابیوں کی وجہ سے مجلس (لیجسلیٹو یان) کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

چین کے عام رجحانات کو دیکھتے ہوئے لندن ٹائمز کے نامہ نگار نے ایک اور خطرہ کی طرف اشارہ کیا ہے جو قومی مفاد کے لئے اس سے کہیں زیادہ مضر ہے کہ سارے ملک پر کمیونسٹوں کا قبضہ ہو جائے۔ ۱۹۱۱ء کے انقلاب سے پہلے پورا چین ایک مضبوط مرکزی حکومت کے ماتحت تھا، مگر انقلاب کے بعد ملک میں چھوٹی چھوٹی بہت سی نیم آزاد ریاستیں قائم ہو گئیں اور چین کی سیاسی وحدت ختم ہو گئی۔ چیانگ کائی شک نے اپنے دور میں جو اچھے کام کئے۔ ان میں ایک یہ بھی تھا کہ انھوں نے چین کو پھر سے کومنتانگ کے جھنڈے کے نیچے متحد کر دیا۔ اب اس اتحاد کی جڑیں پھر اکھڑ رہی ہیں۔ بعض سیاسی حلقوں کا خیال ہے کہ چاہے عارضی طور پر سہی، مگر ڈر ہے کہ چین بہت سی نیم آزاد ریاستوں میں بٹ جائے گا۔

غذا نہ ہوگی تو جنگ ہوگی۔

اگرچہ اس وقت عام خیال ہے کہ دنیا تیسری جنگ کی طرف قدم بڑھا رہی ہے مگر اسی کے ساتھ ہر ملک اور ہر شخص جنگ کی مخالفت بھی کر رہا ہے۔ لیکن یہ مخالفت اس وقت تک بے کار رہے جب تک ان اسباب کو دور نہ کیا جائے جو دنیا کو جنگ کی آگ میں ڈھکیل رہے ہیں۔ یہ اسباب اگر غور کیا جائے تو سیاسی سے زیادہ معاشی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب آدمی سے زیادہ دنیا فاقے کرے گی اور طرح طرح کی تکلیف اٹھائے گی تو جو ملک دولت مند اور خوش حال ہیں، وہ بھی چین کی زندگی بسر نہ کر سکیں گے۔ اس وقت مغرب کے چند گنے چنے ملکوں کے سوا ساری دنیا معاشی بدحالی میں مبتلا ہے اور ان میں ایشیائی ملکوں کی حالت خاص طور پر بڑی ہی قابل رحم ہے لیکن یورپ کے ان سرمایہ دار ملکوں نے انسانیت دوستی کے تمام دعووں کے باوجود ایشیا کی طرف ابھی تک کوئی خاص توجہ نہیں کی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ یو این او کی دو کمیٹیوں، غذا اور زراعتی کمیٹی (ایف، اے، او) اور معاشی کمیشن برائے ایشیا و مشرق بعید (ای، سی، اے، ایف ای) میں پچھلے دنوں اس مسئلے پر غور کیا۔ معاشی کمیشن میں مارشل ایڈ کی طرح "ماسٹر پلین" کے نام سے ایک پنج سالہ پروگرام منظور ہوا ہے اور طے پایا ہے کہ ایشیا اور مشرق بعید کی معاشی بحالی اور صنعتی ترقی کے لئے ۰۰۰ ملین ڈالر کا فنڈ جمع کیا جائے اسی طرح ایف، اے، او میں ایشیائی ممالک کو زراعتی پیداوار بڑھانے کے لئے زیادہ سے زیادہ سہولتیں بہم پہنچانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ایشیا کے بیشتر ممالک میں زراعتی پیداوار کے بڑھانے کے بہترین امکانات موجود ہیں۔ ان ملکوں میں صدیوں سے توسیع کاشت کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی ہے۔ اگر سائنٹیفک ذریعے استعمال کئے جائیں تو صرف یہی نہیں کہ ایشیا کی غذائی حالت درست ہو جائے گی بلکہ ایشیا یورپ کی غذائی حالت پر مقابل لحاظ شرح ہو گا۔ اسی کے ساتھ جیسا کہ ہندوستانی ڈیلیگیٹ نے کہا ہے کہ جنگ کے زمانے میں تقسیم غذا کا جو طریقہ اختیار کیا گیا تھا وہ بدستور جاری رہنا چاہیے اور اناج کے نرخ میں اتنی کمی کرنی چاہیے کہ غریب ممالک آسانی سے خرید سکیں۔

ویٹو کے چکر سے نکلنا محال ہے

یو، این، او میں روس کو بھی شریک کرنے کے لئے اس کی یہ شرط مان لی گئی تھی کہ اس کو اور چار بڑی طاقتوں کو ویٹو (تنسیخ) کا حق دیا جائے۔ اب محسوس ہو رہا ہے کہ بڑی غلطی ہوئی۔ اس حق سے فائدہ اٹھا کر روس جس کارروائی کو چاہتا ہے التوا کر دیتا ہے۔ اور مغربی طاقتیں خود اپنے بنائے ہوئے جال میں کچھ اس طرح پھنس گئی ہیں کہ بظاہر اب اس سے نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

جنگ کے ختم ہونے کے بعد سے اب تک ۲۸ مرتبہ روس نے ویٹو استعمال کیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کئی مرتبہ اس نے اس حق کو اپنی حفاظت میں استعمال کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے لئے اور کوئی چارۂ کار تھا ہی نہیں۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ بارہا اس نے اس حق کا بیجا استعمال کیا ہے اور اس کی وجہ سے دنیا کی رائے عامہ اس کے خلاف ہو گئی ہے اور لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ یو، این، او کی ناکامی کی بڑی وجہ روس کا ویٹو ہے۔ اگرچہ روسی نمائندے وشنسکی نے اس کا معقول جواب دیا ہے، اور انڈونیشیا اور فلسطین وغیرہ کی مثالوں سے اس الزام کی تردید کی ہے لیکن روس کے ویٹو سے، یورپ کے بڑے بڑے معاملات کے حل میں جو الجھنیں پیدا ہو گئی ہیں اور روس اور مغربی طاقتوں کے اختلاف کی خلیج جس قدر وسیع ہو گئی ہے اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ نیز ویٹو جمہوریت کی روح کے، جس کا علمبردار روس اپنے آپ کو کہتا ہے، سراسر خلاف ہے مثلاً پچھلی مرتبہ برلن کا مسئلہ پیش ہوا تھا، تو روس اور یوکرائن کے علاوہ تمام ممالک اس کے حق میں تھے مگر روس کے صرف ایک ویٹو نے تمام رایوں کو بے کار کر دیا۔ ریکا کا یہ اندیشہ صحیح ہے کہ یو، این، او میں مغربی طاقتوں کی بھاری اکثریت ہے مگر ویٹو کے قسم کی کوئی چیز نہیں ہوگی تو حفاظتی کونسل میں روس کی آواز، نقار خانہ میں طوطی کی آواز بن کر رہ جائے گی۔ ممکن ہے روسی نمائندے وشنسکی کا یہ الزام بھی صحیح ہو کہ یو، این، او میں روس کے خلاف پروپیگنڈا کیا جاتا ہے اور یہ ادارہ روس کے خلاف سازش کرنے والوں کا ایک اڈہ ہو گیا ہے اگر یہ شکایتیں صحیح ہیں تو روس کے لئے بہترین طریقہ یہ تھا کہ جہاں تک ممکن تھا کبھی کبھی دب کر بھی، بڑے بڑے مسئلوں کو حل کرنے میں پورے تعاون اور اشتراک عمل سے کام کرتا اور اگر واقعی مغربی طاقتیں محض اپنی اکثریت سے کام لیتیں، تو ایسے موقع پر روس الگ ہو جاتا تو دنیا کی اخلاقی حمایت اُسے حاصل ہوتی۔ مگر موجودہ صورت حال نہ تو روس کے لئے مفید ہے اور نہ یو، این، او کے لئے

ابھی حال میں یو، این، او کی چھوٹی پولیٹیکل کمیٹی میں چار بڑی طاقتوں کی یہ تجویز پاس ہو گئی ہے کہ ایسے مسائل میں جن کا تعلق طریق کار سے ہو، ویٹو کا استعمال نہیں ہو سکتا۔ ان مسائل کی تعداد بھی بتا دی گئی ہے جو ۳۵ ہے۔ لیکن ظاہر ہے یہ بھی اصل مسئلے کا حل نہیں ہے۔ حفاظتی کونسل میں جس وقت یہ مسئلہ زیر بحث لانے کی کوشش کی جائے گی تو روس ویٹو کا تبر لئے ہوئے خیر مقدم کے لئے تیار ہوگا۔ اب تو اس گتھی کو سلجھانے کی کنجی روس کے ہاتھ میں ہے مغربی طاقتوں کے لئے اس کنجی کو چھین لینے کی کوئی قانونی صورت نظر نہیں آتی۔

انڈونیشیا کی گفتگو ٹوٹ گئی

انڈونیشیا اور ڈچ حکومت کے درمیان سمجھوتے کی جو بات چیت ہو رہی تھی وہ ٹوٹ گئی۔ ریپبلکن وزیر اعظم ڈاکٹر ہٹا اور ڈچ نمائندوں میں تقریباً تمام اہم مسائل پر اختلاف تھا۔ لیکن سب سے زیادہ اختلاف ڈچ اور انڈونیشیا کی فوجوں کی مشترکہ کمان پر تھا۔ اور دراصل بات اسی پر ٹوٹی۔ ڈاکٹر ہٹا چاہتے تھے کہ انڈونیشیا کی ڈچ فوج بھی انڈونیشیا کی قومی حکومت کے مقرر کئے ہوئے کمانڈر انچیف کے ماتحت رہے۔ مگر ڈچ نمائندے اس کے لئے تیار نہیں تھے۔ اگرچہ ڈیلیگیشن کے لیڈر مسٹر سٹائین نے جاتے وقت امید ظاہر کی ہے کہ جلد ہی پھر گفتگو ہوگی مگر جب تک نقطۂ نظر کا یہ شدید اختلاف موجود ہے اس وقت تک کامیابی کی کم امید ہے۔ [illegible] سیاسی حلقوں کا خیال ہے کہ ڈچ حکومت [illegible] انڈونیشیا کے [illegible] ہی عبوری حکومت بنائے گی یا پھر وہ دوبارہ پولیس کارروائی کرے گی۔ ع۔ ل

مرحلے

روشؔ صدیقی

جہانِ آب و گل، اربابِ جاں کی آزمائش ہے
یہ بت خانہ ترے حسنِ گماں کی آزمائش ہے

ستاروں پر مدارِ رہبری تھا ظلمتِ شب میں
قریبِ صبح، خضرِ کارواں کی آزمائش ہے

سہارا لے لیا ہے زندگی نے فکرِ درماں کا
سکونِ دردمندانِ جہاں کی آزمائش ہے

حرم نادیدہ، بت خانہ گریزاں، برہمن رہبر
کسی آوارۂ کوئے بتاں کی آزمائش ہے

سنبھلنا اے دلِ حسرت زدہ، اب اس کی محفل میں
فغاں کے ساتھ، آدابِ فغاں کی آزمائش ہے

گوارا کر رہا ہوں، قیدِ زندانِ حوادث کو
سمجھتا ہوں دلِ بے خانماں کی آزمائش ہے

گریزاں ہو رہا ہے دامنِ شب، شمع لرزاں سے
کسی کے وعدۂ نامہرباں کی آزمائش ہے

زمانے کا تغافل ہو کہ خود اپنی کم آمیزی
بہ ہر صورت، خلوصِ دوستاں کی آزمائش ہے

بہار آتے ہی حسنِ لالہ و گل خود عیاں ہوگا
خزاں تک ہی نقابِ گلستاں کی آزمائش ہے

غمِ انساں، سکوتِ مرگ سے مانوس کیا ہوتا
خدا وندا! حیاتِ جاوداں کی آزمائش ہے

بہت الزام تھے اب تک مری پرہیزگاری پر
مگر اب دامنِ پیرِ مغاں کی آزمائش ہے

سمجھتا بھی ہے دردِ بے دلی کو دیکھنا ہے یہ
مرا خاموش رہنا، آسماں کی آزمائش ہے

تغافل کی حدوں سے بڑھ گیا ہے کوئی دیوانہ
تمھارے التفاتِ ناگہاں کی آزمائش ہے

بہت میں نے ستم ہائے جہاں کے ناز اُٹھائے ہیں
مری آشفتگی، سارے جہاں کی آزمائش ہے

بہت ہی ناتواں ہیں شعلہ ہائے شمعِ آزادی
روشؔ! اب دامنِ ہندوستاں کی آزمائش ہے

غزل

مرزا احسان احمد

حریمِ حسن میں رکھ کر قدم، دل پر نظر کیسی / جمالِ حق کے آگے نقشِ باطل پر نظر کیسی
یہاں ہر گام پر درکار ہے ایثار و جانبازی / جنونِ عشق میں یہ سود و حاصل پر نظر کیسی
خبر تجھ کو نہیں، ذوقِ طلب برباد ہوتا ہے / بڑھائے جا قدم اپنا، یہ منزل پر نظر کیسی
ترے ذروں میں گرم رقص ہے، خود برق لاہوتی / پریشاں ہو غبارِ قیس، محمل پر نظر کیسی
جمالِ گوہرِ مقصود کیا آئے نظر تجھ کو / سمٹتے ہیں یہ بازو کیوں یہ ساحل پر نظر کیسی
نگاہیں کر فروغِ جلوۂ بے رنگ سے روشن / یہ خورشید و مہ و انجم کی محفل پر نظر کیسی
سمجھ ان کے ز رہا رنگِ نوازش ہائے پنہاں کو / یہ حسرت سے شکستِ شیشۂ دل پر نظر کیسی
تری فطرت میں ہے سرمستی سیلِ رواں مضمر / خود اپنی راہ پیدا کر، وسائل پر نظر کیسی
یہ اہلِ ہوش و حکمت میکدے میں دیکھتے آ کر / کہ دیوانے بھی رکھتے ہیں مسائل پر نظر کیسی

رگِ جاں میں تری اک برقِ عالم سوز ہے پنہاں
یہ انبارِ خس و خاشاکِ باطل پر نظر کیسی

غزل

آلِ احمد سرورؔ

غمِ جاناں غمِ دوراں کے ہیں کتنے نشتر
لیکن اب بھی میرے سینے میں لہو باقی ہے

قیدِ گیسو کے سوا اور ہیں قیدیں کیا کیا
سرکشی کی ترے عشاق میں خو باقی ہے

جن کا تھا مجھ کو جنوں یہ وہ بہاریں تو نہیں
میری پلکوں میں ابھی اور لہو باقی ہے

آج شعلوں کی لپک ہے نہ شراروں کا وہ رقص
خاک میں میری مگر ذوقِ نمو باقی ہے

تلخیِ زیست کے باوصف یہ کیا ہے کہ سرورؔ
فکر میں مستیِ صد جام و سبو باقی ہے

عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیئے

مشتاق احمد

فساد ——— چیز بری تو ضرور ہے۔ لیکن اتنی پر ہول اور روح فرسا بھی نہیں اگر ڈھنگ اور سلیقے سے کی جائے اور اشتعال کے باوجود خوش مذاقی کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے ہم جو اس لفظ سے اتنے چونکنے اور خوف زدہ ہو جاتے ہیں اور چار کالموں پر "کلکتہ میں فساد" کی سرخی دیکھ کر، زخم خوردہ ہرن کی طرح چوکڑی بھرنے کی تیاریاں شروع کر دیتے ہیں تو اس کی وجہ کچھ یہ نہیں ہے کہ فساد خود اتنا خطرناک ہے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ جیسے ہماری زندگی کے روزمرہ کے کام مثلاً بحث مباحثے، مناظرے، شادی، بیاہ یہاں تک کہ آپس میں مصالحانہ گفتگو کے طریقے بھی شعریت، ڈھنگ اور سلیقے سے عاری ہیں۔ اسی طرح ہمارے فساد کرنے کا طریقہ بھی خوش مذاقی اور نفاست سے خالی ہے۔ جسے چاہا جہاں پکڑ لیا اور چھرا گھونپ دیا نہ اس کا خیال کہ شکار بوڑھا ہے یا جوان، بچہ ہے یا عورت، نہ اس کا پاس کہ ہم یہ حرکت اپنے محلے میں کر رہے ہیں یا "چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا" کی تفسیر کے مطابق شہر کے ہر محلے میں خدائی فوج دار بنے گھوم رہے ہیں پھر چھرا بھونکنے یا پتھر سے سر پھوڑنے میں انتہائی پھوہڑ پن اور بد مزاقی کا ثبوت دیتے ہیں۔ نہ آنکھ دیکھتے ہیں نہ کان، جہاں چاہا "دست شفقت" پھیر دیا۔ حالانکہ ہم میں سے ان لوگوں کو جنھوں نے آٹھویں جماعت بھی پاس کی ہے "فرسٹ ایڈ" کی تعلیم میں یہ بتایا گیا ہے کہ جسم کے جراحت پذیر حصے کون کون سے ہیں۔ لیکن انگریزی تعلیم کی یہی تو خرابی ہے کہ ضرورت کے وقت کام کاٹ جاتی ہے!

تو جیسا کہ میں نے کہا یہ لفظ اتنا پر ہول یوں ہو جاتا ہے کہ ہم اپنی قومی خصوصیت کے مطابق فساد کرتے وقت ذرا بہت ہی بے ڈھنگے پن اور بد مزاقی کا ثبوت دینے ہیں نازک سی چیز سر کو پھوڑنے کے لئے اینٹ کا ادھا کافی ہے لیکن جیس گے یہ گتے کا گما لے کر۔ مرغی کے ذبح کرنے کے لئے بھی چھری تیز کر لیں گے لیکن آدمی کو ذبح کرنے کی مہم پر اس شان سے روانہ ہوں گے کہ ہاتھ میں پرکھوں کے زمانے کی زنگ آلود تلوار اور بتیسی کے نیچے زنگ آلود چھری۔ بھلے آدمیوں سے اتنا بھی نہیں بن پڑتا کہ چلتے چلتے تو ذرا اسے تیز کر لیں۔ ابھی دہلی کے پچھلے فساد کا ذکر ہے کہ اتفاق سے میں کچھ ایسے ہی بھلے مانسوں کے نرغے میں گھر گیا۔ ایک صاحب جن کے چہرے سے وحشت نمایاں، زبان پر موٹی موٹی گالیاں، میری طرف تیزی سے جھپٹے اور چھرے کے پے بہ پے وار کرنے شروع کر دئے، آپریشن میرا ہو رہا تھا لیکن گھبراہٹ سے ہاتھ آپ کا بید لرزاں کی طرح کانپ رہا تھا۔ ایک وار بھی جو قاعدہ کا لگا ہو۔ پھر بھلا آدمی چھرا بھی ایسا چھانٹ کر لایا تھا جس کی نوک تک غائب تھی۔ وہ بدن میں ڈھنگ کے خوبصورت گول سوراخ کرنے کے بجائے بس گوشت کو اس طرح پھاڑ رہا تھا جیسے کوئی چاقو سے تربوز پھاڑے!

تو اگر اس مار پیٹ والے فساد میں ہم اتنی بد مذاقی، بد سلیقگی کا ثبوت نہ دیں تو اس لفظ کو سن کر رونگٹے کھڑے ہو جانے والی کیفیت جاتی رہے گی۔ کیونکہ ہلکے قسم کے اور ذرا ڈھنگ کے فساد تو ہماری زندگی میں روزانہ ہی ہوتے رہتے ہیں، جنھیں ہم "جھگڑا" یا "تو تو میں میں" کہتے ہیں مناظرے تو خیر اس کے لئے مخصوص ہیں ہی۔ لیکن کیا شادی بیاہ اور بحث مباحثے میں بھی فساد کی شان نہیں پائی جاتی؟ کیا مہر کی رقم طے کرتے وقت لٹھم لٹھا کی نوبت نہیں آتی۔ رشتے ملتے نہیں ٹوٹ جاتے۔ آئی بارات واپس نہیں چلی جاتی۔ کیا دلھن کی بدائی گاؤں کے نوجوانوں کے مضبوط بازوؤں اور لاٹھیوں کی مدد کے بنا ہی ہو جاتی ہے؟ یہی حال بحث مباحثہ کا بھی ہے۔ کیا اپنی زبان کی تیغ جوہر دار، اور تیز و تند الفاظ کی گولیوں کی بوچھار سے ہم مخالف کا سینہ چھلنی چھلنی نہیں کر دیتے؟ اپنے اعتقاد و یقین خیال، رائے۔ یہاں تک کہ اپنے شک و شبہات کے لٹھ سے دوسروں کے نفیس اور اعتماد کے ساغر کو چور چور نہیں کر دیتے؟ اپنی خداداد اور بے پناہ قوت تنقید سے بڑے بڑے آدمی کے کام کو چشم زدن میں خاک میں نہیں ملا دیتے؟ یہاں تک کہ دو آدمی آپس میں دوستانہ گفتگو بھی اتنے زور شور سے کرتے ہیں اور اس شد و مد سے ایک دوسرے کے خیال کی تائید کرتے ہیں کہ پڑوسیوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ میرے ایک دوست ہیں راجندر کمار صاحب وہ اتنے زور سے رازدارانہ گفتگو کرتے ہیں کہ آس پاس تماشائیوں کی بھیڑ لگ جاتی ہے۔ چند روز ہوئے وہ میرے ساتھ چاندنی چوک میں جا رہے تھے، انھوں نے مجھ سے ایک بالکل پرائیوٹ اور راز کی بات کہی لیکن اس بلند آہنگی کے ساتھ کہ راہ چلنے والوں نے گھبرا کر مڑ کر پیچھے دیکھا اور چوکڑی بھرنے کی تیاریاں کرنے لگے لیکن ہمارے ہاتھوں کو اینٹ کے گموں اور زنگ آلود تلواروں سے خالی دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔

مطلب یہ ہے کہ اس قسم کے فساد تو ہم اٹھتے بیٹھتے روز چھ آنے ہی کرتے رہتے ہیں۔ لیکن چونکہ اس میں اتنا بے ڈھنگا پن نہیں ہوتا، خوش مذاقی سے بالکل عاری نہیں ہوتے، نہ اتنے عالم گیر ہی ہوتے ہیں بلکہ ہر فریق اپنی اپنی برادری، فرقہ اور محلے کی حد میں رہتا ہے۔ اس لئے اس قسم کے فساد اتنے پر ہول اور رونگٹے کھڑے کرنے والے نہیں ہوتے، اور ہم انھیں جھگڑا یا بحث کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

لیکن دھنیہ باد ہو مصر کے فسادیوں کو کہ وہ مار پیٹ والے فساد میں بھی ڈھنگ، سلیقہ اور نفاست کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں سر پھوڑنے والے فساد بھی زندگی کے پر لطف جزو بن کر رہ گئے ہیں۔ قاہرہ کی ایک گلی میں فساد ہو رہا ہے اور قریب ہی دوسری گلی میں برقعہ پوش عورتیں اپنے بچوں کے لئے کھلونے اور باورچی خانے کے لئے پیاز، لہسن خریدنے میں مشغول رہتی ہیں، انھیں اس کا اطمینان ہوتا ہے کہ اس گلی والوں کو اس گلی میں فساد کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور اس کا بھی پورا یقین ہوتا ہے کہ فرانسیسیوں اور انگریزوں کی طرح اس گلی والے اتنی غیر شاعرانہ ذہنیت نہیں رکھتے کہ چونکہ اس گلی والے فساد کر رہے ہیں لہٰذا ہم بھی اس مشغل شروع کر دیں۔ فسادی اتنے باسلیقہ اور وقت کے پابند ہوتے ہیں کہ پہلے ہی سے اعلان کر دیتے ہیں کہ ہم فلاں وقت اور فلاں جگہ فساد کریں گے چنانچہ وقت کی پوری پابندی کے ساتھ مقررہ جگہ پر فساد شروع ہو جاتا ہے اور یہ نہیں کہ فساد شروع ہو گیا تو بس اس کی لاش گر کے ہی ہٹتے ہیں۔ کھانے کا وقت آگیا، اپنے اطمینان سے فساد کے پروگرام کو ختم کر ہوٹل میں گھس مرغے یا دنبہ کی روش سے چمٹ گئے۔

اتفاق کی بات ہے کہ ابھی کچھ ہی دن ہوئے ایک غیر ملکی صاحب کی ایک مصری فسادی سے مڈ بھیڑ ہوئی۔ انھوں نے اس فسادی کی ذہنی کیفیت کو بڑے پر لطف انداز میں بیان کیا ہے۔ بچارے غیر ملکی فساد کے پروگرام کی خبر تھی نہیں گھومتے پھرتے شام کے قریب ضلع عماد الدین کے ایک شہر میں جا نکلا۔ سر شام ہی اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ لگ بھگ ساری دکانیں بند ہیں، صرف مصریوں کی چند شراب کی دکانیں کھلی ہوئی ہیں۔ اتنے میں پولیس کا ایک جوان سر پر ٹین کا خود رکھے ایک ہاتھ میں ڈھال سنبھالے دوسرے میں لاٹھی تولتا ہوا ایک طرف کو تیزی سے لپکا۔

غیر ملکی صاحب کہتے ہیں کہ میں ایک گلی میں مڑا۔ گلی بالکل سنسان تھی، سوائے ایک بھلے مانس کے جو جسم پر ایک سفید چغہ ڈانٹے سر پر ترکی ٹوپی جمائے، ایک ہاتھ میں اینٹ کا ادھا لئے کچھ گھبرائے کچھ پریشان، نیم فیصلہ کن انداز میں گلی میں پریڈ کر رہے تھے۔

"سیدا" (آداب عرض) میں نے کہا۔

"سیدا" فسادی نے شرافت سے جواب دیا۔

وہ کچھ اُداس تھا اور اپنی تنہائی محسوس کر رہا تھا کہ میں نے سوچا کہ لاؤ اس کی کچھ مدد کر دوں۔

میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا "کس کی تاک میں ہیں آپ؟"

"کسی مخصوص آدمی کی نہیں" اس نے جواب دیا "بات یہ ہے کہ ......" میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ چنانچہ میں نے بات کاٹ کر کہا۔

"بات یہ ہے کہ "فساد" راستہ بھول گیا ہے۔ کیوں یہی بات ہے نا؟"

"اے وا" (بالکل یہی) اس نے نرمی سے جواب دیا۔

میرا دل ذرا نرم واقع ہوا ہے، مجھے یہ دیکھ کر رحم آیا کہ بے چارا فسادی فساد کی کھوج میں سرگرداں ہے اور فساد صاحب لاپتہ۔ غریب اس اینٹ کے ادھے کو مفت میں ڈھوئے ڈھوئے پھر رہا ہے۔

میں نے خوش ہو کر کہا "میرا خیال ہے کہ اس وقت سلیمان پاشا میں ضرور فساد ہو رہا ہوگا۔ اگر آپ وہاں تشریف ......"

اس نے انکار میں سر ہلایا، اور مجھ اجنبی پر ترس کھاتے ہوئے مسکرایا، گویا وہ بہ زبان خاموشی مجھ سے کہہ رہا تھا

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

مچھر

سبحی حسن نقوی

سب جانتے ہیں کہ موسیقی ایک جادو ہے۔ پھر ہندوستان کی موسیقی فنی اعتبار سے امتیازی شان رکھتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں ایسے استاد گذرے ہیں جنھیں اپنے فن میں اتنا کمال حاصل تھا کہ دیپک راگ چھیڑتے تو آگ لگ جاتی اور میگھ راگ الاپتے تو مینہ برسنے لگتا تھا۔ لیکن ہم بیسویں صدی میں رہنے والوں کو یہ سب باتیں افسانہ معلوم ہوتی ہیں۔ شاید اسی لئے کچھ لوگوں کا یہ خیال درست نہیں۔ ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ آج کل مذاق بدل گئے ہیں، لیکن یہ ہرگز تسلیم نہیں کرسکتے کہ موسیقی رو بہ زوال ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مذاق ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں اور اسی لئے یہ بھی ممکن ہے کہ آج کل لوگوں کا رجحان فنی موسیقی سے ہٹ کر فلمی گانوں میں محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ دراصل کسی فن کی ترقی بااثر سرپرستوں پر منحصر ہے جو خوش قسمتی سے فن موسیقی کو ہر زمانہ میں حاصل رہے۔ بہت پرانے زمانے میں گپت بادشاہوں نے اور درمیانی دور میں مغلوں نے اس فن کی سرپرستی کی۔ دور حاضرہ میں اس کام کو میونسپلٹیوں نے سنبھال لیا ہے چنانچہ آج کل کی موسیقی کا تان سین مچھر ہے جو اپنے گانے سے دن رات ہماری تواضع کرتا رہتا ہے۔ فرض کیجئے کسی وقت میں خدانخواستہ موسیقی کے اہل کا فقدان بھی ہو جائے تو گھبرانے کی بات نہیں۔ کیونکہ ماشاءاللہ استاد مچھر سین بہرحال کہیں جانے والے نہیں ہیں اور اب تو میونسپلٹیوں کے حسن انتظام سے ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

مچھر اپنا سریلا نغمہ رات کو سنانے کا عادی ہے۔ اول تو مچھر کئی کئی مچھروں کے ساتھ کورس میں گانا پسند کرتا ہے اور جب تنہا گاتا ہے تب بھی اس قدر خود اعتمادی کے ساتھ گاتا ہے جیسے کہ آپ بس اسی کا گانا سننے کے لئے گوش برآواز تھے۔ قدرت نے ہر ذی روح میں علیحدہ صلاحیت رکھی ہے۔ مچھر کو صرف کان میں گانے کا ملکہ عنایت کیا ہے۔ اس کے گانے کو ہم ایک کان سن کر دوسرے کان نہیں اڑا سکتے۔ کیونکہ جب ہم اسے ایک طرف سے رخصت کرنے کے لئے "شب بخیر" کہتے ہیں تو وہ جھٹ دوسرے کان میں آ کر وہ راگ الاپنے لگتا ہے۔ یہ پہچاننا بھی مشکل ہے کہ یہ وہی مچھر ہے یا کوئی اور۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ بعض اوقات کان کے دروازہ پر گانے والوں کی اتنی بھیڑ ہوتی ہے کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ گویا کان پور میں شادی رچائی جا رہی ہے اور باہر خاندان کا ناخواندہ گروہ انعام مانگنے کھڑا ہے۔

گانا بجانا مچھر کا ایک شوقیہ مشغلہ ہے جس سے وہ کبھی کبھی دل بہلایا کرتا ہے۔ ورنہ اس کا آبائی پیشہ سپہ گری ہے جو نسلاً بعد نسلٍ اس کے خاندان میں چلا آ رہا ہے۔ بے شک وہ ایک بہادر سپاہی کی طرح جان جوکھوں میں ڈال کر ہر وقت انسان جیسے قوی الجثہ دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ لیکن وہ عربی طرز کی انفرادی لڑائی کا قائل ہے۔ میدان میں آ کر رجز خوانی کے بعد فوراً مبارز طلبی کرتا ہے اور پھر جنگ میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اس کی ہمت، دلیری اور عالی ظرفی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ وہ ہمیشہ تنہا حملہ کرتا ہے اور وار کرنے سے پہلے ہمیشہ حریف کو خطرہ کی اطلاع دے دیتا ہے۔ دشمن کو آگاہ کئے بغیر حملہ کرنا وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے۔ اس کا حملہ نہایت خطرناک ہوتا ہے جس کا جواب دینا مذاق نہیں ہے۔

اچھے اچھے پہلوان اس کے سامنے کان ٹیک چکے ہیں۔ نہان تو خیر چیز ہی کیا ہے مچھر کی وہ ذات ہے جس کے مقابلے میں قیصر جیسا خونخوار درندہ پناہ مانگ چکا ہے۔ وہ چاہے تو آپ سے ناک رگڑوا سکتا ہے۔ کبھی آپ کو کان کھجانے پر مجبور کر دے کبھی ران، کبھی آپ داہنی کروٹ لیں، کبھی بائیں۔ اس کی مرضی ہو تو ذرا سی دیر میں آپ کو لہولہان کر دے۔ آپ سر سے پاؤں تک زخموں میں چور ہوتے ہی رہیں اور وہ آپ کی ہیئت کذائی پر قہقہے لگایا کرے۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ انسان بغیر ہاتھ پاؤں مارے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ اپنی سی وہ بھی کرتا ہے۔ جھنجھلا جھنجھلا کر مچھر پر وار کرتا ہے۔ لیکن مچھر ایک ماہر کھلاڑی کی طرح بپھرے ہوئے سانڈ کے حملے کو خالی دے کر اس طرح پینترا بدلتا ہے کہ وار خود اپنے اوپر جا پڑتا ہے۔ انسان کے لئے اس سے زیادہ شرمناک منظر کوئی نہیں۔

انسان اگر عاجز ہے تو مچھر کے مقابلے میں۔ آج انسان نے دنیا کی ہر چیز کو تسخیر کر لیا ہے، آگ، پانی، ہوا سب اس کے قبضہ میں ہیں نہیں تو مچھر۔ اب تک جو طریقے مچھر پر قابو پانے کے لئے ایجاد ہوئے ہیں وہ اس کو مارنے میں نہیں صرف دور بھگا دینے میں کامیاب ہوئے۔ تجربے سے ثابت ہو گیا کہ "فلٹ" قسم کی دوائیاں سب بیکار ہیں۔ ان سے مچھر چند گھنٹوں کے لئے ادھر ادھر چھپ جاتا ہے، مرتا نہیں ہے۔ "اگر" اور "لوبان" کی دھونی سے انھوں نے بھاگنا چھپنا بالکل چھوڑ دیا۔ کیونکہ آپ سمجھئے، پھر بھی ایٹم کے زمانے میں رہنے والا مچھر ہے اور ان دقیانوسی طریقوں سے کب کا واقف ہو چکا ہے۔ رہ گئی مچھر دانی اس کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ مچھر ہم سے دور رہیں۔ لیکن مچھر کو اس کے اندر گھسنے کا طریقہ ایجاد کئے عرصہ ہو گیا۔ ایک مرتبہ داخل ہونے کے بعد مچھر اس کے اندر ایسا پھنستا ہے جیسے چوہے دان میں چوہا۔ پھر جو مچھر ایک بار اندر چلا جاتا ہے وہ کاٹ کاٹ کر قیمہ ہی تو کر ڈالتا ہے۔ گویا مچھر دانی خود اپنے پھانسنے کا جال بن جاتی ہے۔ سنتے ہیں کہ حضرت سلیمان کے زمانے میں مچھر ہوا سے بھاگا کرتے تھے۔ لیکن آج کل کے مچھروں نے حفظان صحت کے جدید اصول پر کاربند ہو کر اپنا قد و قامت اور وزن اس قدر بڑھا لیا ہے کہ پچھتر فی صدی مچھر بہت تیز آندھی کا بڑی کامیابی سے مقابلہ کر لیتے ہیں۔ اگر آپ کو بہت موٹے تازہ مچھر دیکھنے کا اشتیاق ہو تو علی گڑھ چلے جائیے جہاں مچھروں کی پرورش کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ علوم کی طرح علی گڑھ بہترین قسم کے مچھروں کا مرکز اور یونیورسٹی مچھروں کا اعلیٰ ترین پہلوان بنانے کی بہترین نرسری ہے۔

اپنے پیدائشی قیام کو بھول جانا ایک کمزوری ہے جو انسان اور مچھر میں یکساں پائی جاتی ہے۔ مثلاً گاؤں کے کسی مفلس گھر میں پیدا ہونے والا آدمی جو کسی بڑے سے عہدے پر پہنچ جاتا ہے وہ اپنے گھر، عزیزوں، حتیٰ کہ ماں باپ تک کو بھول جاتا ہے۔ بعینہٖ یہی حال مچھر کا ہے۔ مچھر تھہ لی گ... نالیاں اور کوڑے گھروں میں جنم لیتا ہے۔ لیکن وہ بہت جلد اس گندہ جگہ کو چھوڑ کر عمدہ اور نفیس مکانوں میں رہنے لگتا ہے۔ اسے گندگی سے سخت نفرت ہے۔ اسے امیروں کے سجے سجائے عالی شان مکانوں پر قبضہ کرنے میں مزا آتا ہے۔ اگر آپ کو مچھروں کی کسی "نئی بستی" کی زیارت کرنی ہو تو کسی دن کھونٹی پر لٹکے ہوئے کپڑے کو معمولی سی جنبش دے دیجئے۔ مچھروں کا جم غفیر آپ کے استقبال کے لئے نکل کھڑا ہوگا۔

مچھر اور انسان کی دشمنی بہت پرانے زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ اس کی ذمہ داری مچھر پر ہے۔ لیکن مچھر کے نزدیک اس کا الزام انسان کی گردن پر ہے۔ مچھر کا کہنا ہے کہ اخباروں پر چونکہ انسان کا قبضہ ہے اس لئے اسے مچھروں کے خلاف پروپگنڈا کرنے کا خوب موقع مل گیا ہے۔ حالانکہ اس کی اصلیت کچھ بھی نہیں۔ اور انصاف کی بات تو یہ ہے کہ تالی کبھی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ اس میں تھوڑا تھوڑا قصور دونوں ہی فریق کا ہے۔ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو بہت سی مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ آخر مچھر ہمارا کیا بگاڑتا ہے۔ غالباً اس سے زیادہ تو اس کا قصور نہیں کہ وہ ہمارے خون کی ایک معمولی بوند نکال کر اپنے جسم میں ڈال لیتا ہے اور بس۔ سو یہ بہت سے انسان بھی کرتے ہیں بلکہ وہ تو اپنے بھائیوں کا خون چوس چوس کر ادھ مرا کر دیتے ہیں۔ ہر طاقتور کمزور کو دباتا ہے، امیر غریبوں پر ظلم کرتے ہیں۔ زمیندار کاشتکار کو ستاتے ہیں۔ سرمایہ دار مزدوروں کا گلا گھونٹتے ہیں اور ہم ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑتے۔ پھر مچھر بے چارے کی کیا شکایت!

اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی تو سوچنا ہے کہ ہمارے خون کا وہ معمولی قطرہ ہی اس کی واحد غذا ہے اسی کے سبب سے وہ جیتا ہے اور وہی اس کا سرمایۂ حیات ہے۔ نہ وہ بے ضرورت مانگتا ہے اور نہ ضرورت سے زیادہ مانگتا ہے۔ ایک بوند گھٹ جانے سے ہم دُبلے نہیں ہوتے۔ البتہ وہ موٹا ہو جاتا ہے۔ ہمارا وزن کم نہیں ہوتا اس کا بڑھ جاتا ہے۔ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اسے فائدہ پہنچ جاتا ہے۔ پھر باہمی مفاہمت کی اس سے بہتر کون سی تدبیر ہو سکتی ہے کہ ہم مچھر کے سامنے خاموشی سے سر تسلیم خم کر دیں۔ اگر ہم واقعی بڑے ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ اپنے طرز عمل سے ایثار کی تعلیم دیں۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ مچھر کے مقابلے میں غیرت اور وقار قائم رکھنے کی اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں۔

ہندوستان (بہ سلسلہ صفحہ ۴)

وسائل موجود ہیں۔

"اب میں مہاسبھا کی طرف آتا ہوں۔ گاندھی جی کے قتل کے بعد مہاسبھا کے چھکے چھوٹ گئے ......

اس نے یہ دانشمندانہ فیصلہ کیا کہ سیاست کو ترک کر دے اب ۸، ۱۰ مہینے بعد وہ پھر اپنا پروگرام بدل رہی ہے اور سیاست میں داخل ہونا چاہتی ہے ......

ہم یہ فیصلہ کر چکے ہیں فرقہ وارانہ جماعتوں کو سیاست کے میدان میں قدم نہیں رکھنے دیں گے ......

ہم ضرور چاہتے ہیں کہ ہر شخص اپنے ملک کی سیاست میں حصہ لے۔ مگر اس کا نقطہ نظر فرقہ پرستانہ نہیں بلکہ سیاسی ہونا چاہیئے۔

ع، ح

ایران کا تعلیمی نظام (۲)

عبدالحلیم ندوی

ایران میں مخلوط تعلیم کا سلسلہ پہلی مرتبہ ۱۹۳۵ء سے شروع ہوا، اور اب اس کا رواج بہت عام ہو گیا ہے۔ لیکن لڑکے اور لڑکیوں کے نصاب تعلیم میں تھوڑا سا فرق رکھا گیا ہے۔ چنانچہ لڑکے فارسی رسم خط، ریاضی، تاریخ اور جغرافیہ (خصوصاً ایران کا) اور ابتدائی عربی پڑھتے ہیں۔ لڑکیوں کے نصاب میں چند درسی مضامین کم ہیں اور ان کے بجائے سینا، پرونا اور ڈرائنگ سکھائی جاتی ہے۔ نصاب تعلیم میں جو کتابیں مقرر ہیں ان کو وزارت تعلیم اپنی نگرانی اور انتظام میں چھپواتی ہے اور یہی سارے مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں یہ اس لئے کیا گیا ہے تاکہ پورے قومی منصوبے تعلیم میں مکمل یکسانی ہم آہنگی اور اتحاد برقرار رہے اور اس اسکیم پر سختی سے عمل بھی کیا جاتا ہے۔

ہمارے ملک کے مدرسوں کی طرح ایرانی مدرسوں میں طلبہ کو سالانہ ترقی نہیں ملتی۔ بلکہ یہاں یہ طریقہ رائج ہے کہ جب طالب علم چھ سال کی مدت ان مدرسوں میں گزار لیتا ہے اور مقررہ نصاب تعلیم ختم کر لیتا ہے تو خود بخود آخری جماعت میں پہنچ جاتا ہے۔ اس جماعت میں پہنچنے کے بعد معمولی استعداد کے طالب علم کو بھی ثانوی کے داخلہ کے امتحان میں شریک ہونے کی اجازت مل جاتی ہے۔ جب تک کوئی طالب علم اس مدرسے کا سرٹیفکٹ نہ حاصل کرے اُسے کوئی بڑی ملازمت نہیں مل سکتی۔

بہ خلاف ابتدائی تعلیم کے ثانوی تعلیم لازمی نہیں ہے۔ ابتدائی مدارس سے صداقت نامے حاصل کئے ہوئے طلبہ کو بھی چھوٹی موٹی نوکریاں آسانی سے مل جاتی ہیں۔ ثانوی کا نصاب تعلیم ۱۹۲۸ء میں پہلے پہل مرتب ہوا۔ یہ نصاب چھ سال میں ختم ہوتا ہے۔ جب طالب علم یہ مدت پوری کر لیتا ہے تو یونیورسٹی میں داخل ہو جاتا ہے۔ لڑکیاں اگر یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہیں تو انہیں آخری سال "داخلہ یونیورسٹی" کا ایک خاص نصاب پڑھنا پڑتا ہے۔ ان مدرسوں میں شروع کے تین سال کا نصاب تو سب کے لئے عام ہے لڑکے لڑکیوں سبھی کو زبانیں، ریاضی، سائنس، جغرافیہ اور تاریخ پڑھائی جاتی ہے اور لازمی مضامین کے علاوہ لڑکوں اور لڑکیوں کو الگ الگ بھی کچھ مضامین پڑھائے جاتے ہیں، چنانچہ لڑکوں کو علم طبیعیات، علم کیمیا، اور اعلیٰ ریاضی پڑھائی جاتی ہے اور لڑکیوں کو بنیادی سائنس، تربیت اطفال اور سینا پرونا۔ خالی اوقات میں کھیل کود، موسیقی اور دوسرے تفریحی مشاغل کا پروگرام ہوتا ہے۔

ایران میں ثانوی تعلیم مفت نہیں دی جاتی، لیکن فیس بہت کم رکھی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ اساتذہ حکومت کے ادنیٰ ملازمین کے لڑکوں اور ابتدائی میں امتیاز سے امتحان پاس کرنے والے لڑکوں کو رعائتیں بھی دی جاتی ہیں۔ ثانوی کی اس ادنیٰ مدت تعلیم کو پوری کر لینے کے بعد طالب علم ثانوی اعلیٰ میں داخلہ لے سکتا ہے، کسی ٹکنیکل اسکول میں جا سکتا ہے یا اگر وہ ملازمت کرنا چاہے تو ادنیٰ درجے کی ملازمت بھی مل جاتی ہے۔

ثانوی اعلیٰ (آخری تین سال) درجہ تخصیص ہے۔ اس تین سالہ نصاب کا اہم مقصد یہ ہے کہ طالب علم یونیورسٹی یا پیشے کی تعلیم کے اعلیٰ مدرسے میں داخلہ کی تیاری کرے۔ اس کے علاوہ اس کی سند لینے کے بعد حکومت کی دوسرے درجے کی ملازمت کا بھی حق مل جاتا ہے اور جرمنی، فرانس اور بعض برطانوی اور امریکی یونیورسٹیوں میں داخلہ بھی ہو جاتا ہے۔ نصاب کو دو اہم حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک آرٹ کا حصہ دوسرا سائنس کا۔ ادب میں عربی، فارسی، غیر ملکی زبانیں، تاریخ، جغرافیہ اور فلسفہ پڑھایا جاتا ہے۔ دوسرے حصے میں ریاضی، علم طبیعیات، کیمیا، سائنس اور کسی غیر ملکی زبان کی زبان کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس تعلیم کو مکمل کر لینے کے بعد حصہ ادب کے طلبہ یونیورسٹی کے شعبہ ہائے ادب یا قانون میں داخلہ لے سکتے ہیں اور سائنس کے طلبہ شعبہ سائنس، ٹکنیکل یا میڈیکل شعبوں میں۔ یا اگر وہ چاہیں تو ان اعلیٰ مدارس میں داخلہ لے سکتے ہیں جن کا بنیادی اور اہم مقصد اساتذہ کی تربیت ہے۔ ثانوی کے ان مدارس کے علاوہ بعض دوسرے مخصوص قسم کے بھی الگ الگ مدارس ہیں۔ مثلاً کمرشیل اسکول، ٹکنیکل اسکول اور مذہبی مدارس۔ ان سب مدرسوں کا مقصد یہ ہے کہ وہ حسب صلاحیت اور رجحان طلبہ کو یونیورسٹی کے شعبوں کے لئے تیار کریں اور اسی کے ساتھ کسی نہ کسی پیشے کی صلاحیت پیدا کر دیں۔ لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کا مقصد صرف یہ ہے کہ ملک میں استانیوں کی تعداد بڑھائی جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے دو طریقے اختیار کئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ جب لڑکیاں فن تعلیم میں اختصاص اور نفسیات کی تعلیم مکمل کر لیتی ہیں تو ان کو مستند استانیاں مان لیا جاتا ہے دوسری صورت میں ان کو ایک خاص نصاب پڑھ کر "داخلہ یونیورسٹی" کا امتحان پاس کرنا پڑتا ہے یا کسی ٹریننگ ہائی اسکول سے ڈگری یا نرسنگ کے مختلف کالجوں کے امتحانات پاس کرنے پڑتے ہیں جو لڑکیاں اعلیٰ تعلیم کے لئے نہیں جانا چاہتیں ان کے لئے ابھی حال ہی میں ایک دو سالہ مخصوص نصاب مقرر کیا گیا ہے جس میں مقررہ مضامین کے علاوہ دستکاری، گھرداری، تربیت اطفال اور حفظان صحت کے مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔

طہران یونیورسٹی کا ضابطہ ۳۰ مئی ۱۹۳۴ء کو منظور ہوا ۱۵ فروری ۱۹۳۵ء کی مبارک تاریخ کو جو تمدن ایران کا ایک درخشاں دن ہے۔ رضا شاہ پہلوی نے اپنے ہاتھوں سے اس یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا اس وقت سے کہ آج تک اس کا "یوم تاسیس" پورے ملک میں تہوار کی طرح منایا جاتا ہے۔ یونیورسٹی کے بہت عمدہ اور عالی شان نقشے بنائے گئے اور شروع ادب، سائنس، علم الادویہ، قانون اور صنعت، ۵ شعبوں کی تعلیم کا بندوبست کیا گیا۔ پھر ایک چھٹے شعبے "دینیات" کا اضافہ مسجد سپہ سالار میں ہوا جس کی تعمیر ۱۸۸۲ء میں ہوئی تھی ساتواں شعبہ فنون لطیفہ کا ابھی حال ہی میں بڑھا ہے۔ شعبہ طب کی مرکزی عمارت کی تکمیل مارچ ۱۹۳۹ء میں اور شعبہ قانون کی ۱۵ مارچ ۱۹۴۰ء کو ہوئی۔ ان کے علاوہ دوسری عمارتیں جن میں طلبہ کے کلب کی عمارت، قہوہ خانہ اور دارالاقامہ کی عمارتوں کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ یونیورسٹی کے اہم شعبوں کے پاس اپنے کتب خانے ہیں جن میں ۵۰ ہزار سے زائد کتابیں رہتی ہیں۔ ان شعبوں کو اپنے نصاب کی کتابیں خود چھپوانے کی سہولتیں حکومت کی طرف سے مہیا کی گئی ہیں۔ یونیورسٹی کی نگرانی ایک بورڈ کرتا ہے جو پرنسپل، نائب پرنسپل، شعبوں کے صدروں اور شعبوں کے نمائندہ پروفیسر پر مشتمل ہوتا ہے اس بورڈ کے علاوہ ہر شعبہ کا اپنا الگ بورڈ بھی ہے جس میں اس شعبہ کے پروفیسر اور لیکچرر ہوتے ہیں یونیورسٹی میں چند غیر ملکی اساتذہ بھی ملازم ہیں۔ ایرانی اساتذہ تقریباً سب یورپ کے تربیت یافتہ ہیں۔ طلبہ میں ایرانیوں کے علاوہ عراق کے شہر نجف، استنبول، ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے شائقین علم بھی تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے ہیں۔ نادار طلبہ کو عموماً مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ ان کی خاصی بڑی تعداد دارالاقامہ میں رہتی ہے۔ طہران یونیورسٹی کے علاوہ صوبوں میں بھی یونیورسٹیاں قائم کرنے کی تجویزیں زیر غور ہیں۔

ادھر کچھ زمانے سے طہران میں دواسازی کے اسکولوں اور صنعتی کارخانوں کو بہت زیادہ اہمیت دی جانے لگی ہے چنانچہ دواسازی کے شعبہ میں داخلہ لینے کے لئے ایک الگ نصاب تعلیم مرتب ہوا ہے جس کی مدت تعلیم ایک سال ہے۔ اس مدت کے بعد اصلی نصاب تعلیم شروع ہوتا ہے جو پانچ سال میں ختم ہوتا ہے اسی اسکول میں نسخہ بندی اور دندان سازی کے اسکول بھی اب ملحق کر دئے گئے ہیں۔ فن صنعت کا نصاب چار سال ہے۔ اس میں کیمیا، مشینری، بجلی، سول انجینیرنگ اور کان کنی کی تعلیم دی جاتی ہے۔

شعبہ قانون کا نصاب تین سال میں ختم ہوتا ہے جس میں وہ تمام مضامین پڑھائے جاتے ہیں جو پہلے پولیٹکل سائنس کے کالج (۱۸۹۹ء) میں اور لا کالج (۱۹۲۱ء) میں اور کامرس کالج (۱۹۲۶ء) میں پڑھائے جاتے تھے۔ سائنس اور آرٹس میں (جو اعلیٰ استادوں کے مدرسوں سے ملحق ہیں) بالترتیب ۱۰ اور ۷ مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ سند حاصل کرنے کے لئے سائنس کے شعبوں میں تین مضامین کے اندر اور آرٹس میں چار مضامین کے اندر کامیابی حاصل کرنی ضروری ہے۔ فنون لطیفہ میں طلبہ کو اختیار ہے چاہیں تو فن تعمیر لیں، چاہیں ڈرائنگ یا نقاشی۔ آخر میں ایک تین سالہ دینیات کا بھی نصاب ہے جس میں فلسفہ، مذہب اور ادب کی تعلیم ہوتی ہے۔ یونیورسٹی کی سند حاصل کرنے کے بعد طلبہ تیسرے درجے کی ملازمت کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

جدید منصوبہ تعلیم سے پہلے جن طلبہ کو باہر تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا اب یونیورسٹی ان کی طرف خاص دھیان دے رہی ہے۔ چونکہ ایران میں ماہرین کی کمی بہت ہے اس لئے غیر ملکی تعلیم اب بھی بہت سے مضامین کے لئے ضروری اور اہم سمجھی جاتی ہے۔ انیسویں صدی کے وسط تک جو طلبہ یورپ میں تربیت کے لئے گئے، ان کے سامنے کوئی خاص اسکیم یا مقصد نہیں تھا۔ ۱۹۲۸ء میں اس طرف خاص توجہ دی گئی اور دس لاکھ ریال کی رقم صرف اس کام کے لئے منظور ہوئی۔ اس کے بعد چھ برس تک کے لئے اسی قدر رقم اور منظور ہوئی چنانچہ اس رقم سے ہر سال ۱۰۰ طالب علم ہر سال باہر بھیجے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ وزارت جنگ اور حکومت کے دوسرے شعبے بھی اپنے اپنے خرچ سے طلبہ کو بھیجتے رہتے ہیں اپنے ذاتی خرچ سے جانے والوں کی بھی تعداد خاصی ہوتی ہے۔

(باقی)

ڈاکٹر شاردا

(۲)

احمد حسن عثمانی

آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ تاریکی پھیلنے لگی تھی۔ شاردا اپنے مریضوں کو دیکھنے کے بعد اوپر اپنے کمرے میں آ چکی تھی اس نے کوٹ اتار کر کھونٹی پر ٹانگا اور گیلری میں آ گئی۔

ستارے ایک ایک کر کے چمکنے لگے تھے، اور ٹھنڈی ہوا کے جاں فزا جھونکے چل رہے تھے۔

نیچے کے کمرے سے کسی بچے کے رونے کی مدھم آواز اوپر پہنچ رہی تھی ساتھ ہی کبھی کبھی نرسوں کے بہلانے کی آواز بھی آ جاتی ——— لیکن یہ آوازیں کسی خواب پریشاں کی اڑتی ہوئی دھجیاں معلوم ہو رہی تھیں ——— اس غریب لڑکی کو جو منڈیر پر جھکی ہوئی خود اپنے جگر پاش تصورات کی تاریک دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔

وہ بڑی دیر تک یوں ہی بے حس و حرکت کھڑی رہی ——— بت کی طرح ——— اور اس وقت ہوش میں آئی جب کسی نرس کے قدموں کی تیز تیز چاپ نے اسے خواب سے بیدار کر دیا ———

"کیا ہے نرس؟ ——— کوئی ارجنٹ کیس ہے؟" اس نے ہانپتی ہوئی نرس سے دریافت کیا۔

"جی ہاں، ڈاکٹر! یقیناً کوئی ارجنٹ کیس ہی ہے۔ نیچے ایک صاحب موٹر لئے کھڑے ہیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ ان کی بیوی سخت علیل ہے"

"بہت اچھا، میں پانچ منٹ میں آئی۔ تم اوزار اور دوا اور سب سامان موٹر میں ٹھیک کر دو۔ تم کو میرے ساتھ چلنا ہوگا میری سے کہہ دو کہ وہ مریضوں کی خبرگیری کرے۔ آیائیں اور دو نرسیں بھی اس کی مدد کریں گی۔ انہیں تاکید کر دو کہ خوب ہوشیار رہیں۔ کہیں سو نہ جائیں"

جلد جلد یہ ہدائتیں دے کر شاردا اپنے کمرے میں تیار ہونے چلی گئی ——— اور نرس بھی "بہت اچھا" کہتی ہوئی نیچے اتر گئی۔

یہ واقعہ ایک ڈاکٹر کی زندگی میں انوکھا نہیں تھا۔ اس لئے شاردا نے اس پر کوئی خاص دھیان نہ دیا۔ اس نے اپنی ماں کو جگایا اور کہا کہ وہ ایک "ارجنٹ کال" پر جا رہی ہے ——— اور ہاتھ میں آلے لئے ہوئے نیچے اتر گئی۔

ایک شریف صورت انسان نیچے برآمدہ میں کھڑا ادھر نیچے تک رہا تھا۔ اس کا ہاتھ گھبراہٹ سے کانپ رہا تھا۔ چھت سے بجلی کی روشنی سیدھی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

اس پر نظر پڑتے ہی شاردا کا دل دھک سے ہو گیا۔ ایک لمحہ کے لئے اس کے قلب کی حرکت بند ہو گئی ——— وہ دل میں ایک ٹیس سی محسوس کرنے لگی اور دماغ پر ایک تکلیف دہ بوجھ۔

یہ وہی سری کرشن تھا ——— اس کا ممیرا بھائی ——— جس نے اس کے معصوم دل کو چھ ہزار روپے کی عقبہ رقم کے لئے کچل ڈالا تھا۔

شاردا چند لمحے خاموش ساکت کھڑی رہی ——— اپنے ہیجانی احساسات اور طوفانی جذبات کو ضبط کرنے کے لئے ——— اور جب وہ اچھی طرح ان پر قابو پا چکی تو اس نوجوان کی طرف بڑھی جس نے ابھی تک اس کو نہ دیکھا تھا۔

شاردا کے چہرے پر ضبط اور اطمینان تھا، جب اس نے سرد کاروباری لہجے میں کہا "میں تیار ہوں چلئے"

حیرت و استعجاب کی ملی جلی کیفیت میں وہ مڑ کر کہنے لگا ——— "ارے۔ معاف کیجئے گا۔ ڈاکٹر ——— میں نے آپ کو دیکھا نہیں ——— ہاں تشریف لے چلئے"

اس کی نگاہیں شاردا کے چہرے پر گڑ گئیں، اور اس کی آنکھوں میں پہچاننے کی کیفیت جھلک اٹھی۔ ملاقات کی اس غیر متوقع صورت نے اس پر بجلی سی گرا دی۔ اور وہ بے حس و حرکت رہ گیا۔

"تم ...... تم شاردا؟ ...... کیا تم شاردا ہو؟ ...... شاردا! ...... اس کی زبان سے یہ الفاظ گھٹتے ہوئے اور ٹوٹتے ہوئے لہجے میں ادا ہوئے۔ شاردا ایک حقارت آمیز انداز سے ہنسی۔

"ہاں" اس نے آہستہ سے مگر صاف اور سخت آواز میں کہا: "میں وہی غریب شاردا ہوں تمہاری پھوپھی کی لڑکی ——— افلاس کی ماری ——— جس سے تم صرف روپے کی خاطر نفرت کرتے تھے ——— خیر! یہ وقت ان فضول باتوں کا نہیں ——— موٹر میں آ جائیے۔ ہمیں چلنا چاہئے ———"

اس کے ساتھ ساتھ وہ موٹر میں ایک نرس کو لے کر بیٹھ گئی۔ سری کرشن بھیگی بلی کی طرح چپ چاپ ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھا۔ اور موٹر روانہ ہو گئی ———

دو ہفتے بعد ———

دوپہر کا وقت ہو رہا تھا۔ شاردا اپنے ٹیبل پر بیٹھی مریضوں کا نسخہ لکھ رہی تھی۔ ایک نسخہ اس نے میری کے سپرد کیا جو قریب ہی کھڑی تھی "میری" اس نے کہا "اگر کوئی سبھدرا کے گھر سے آئے تو اس کو یہ نسخہ اور یہ چٹ دے دینا۔ میں اوپر جا رہی ہوں"

وہ اوپر چلی گئی اور نہانے کے بعد ماں کے ساتھ کھانے پر بیٹھ گئی۔ اس وقت سیڑھی پر کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔

"پھوپھی" سری کرشن چلایا، جیسے ہی وہ کمرہ میں داخل ہوا شاردا کے غصہ اور نفرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے اس پر حقارت بھری نگاہ ڈالی ——— مگر پھر فوراً ہی اس نے اس کی طرف سے نظریں موڑ لیں ———

غریب ضعیف سیتا ماں آنکھیں پھاڑے تکتی رہی ——— اس نوجوان کی طرف جس نے اس کو "پھوپھی" کہہ کر پکارا تھا۔ گزشتہ ۱۲ سال میں سری کرشن بہت بدل گیا تھا۔ اسی لئے اس کی کمزور نگاہیں اسے فوراً پہچاننے سے قاصر تھیں ——— ———

"کیوں پھوپھی! .... کیا آپ مجھے نہیں پہچانتیں"

اور وہ خصوصیت کے انداز سے اس کے بالکل قریب بیٹھ گیا۔ مگر سیتا ماں کی آنکھیں اسے گھور رہی تھیں ———

"ارے .... ارے تم سری کرشن ہو؟ ......

ہاں ...... ہاں ...... میرے سری کرشن ہی تو ہو ...... بیٹا تم کو دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ شاردا! یہ تمہارے ماموں کے لڑکے سری کرشن ہیں۔ کیا تم انھیں نہیں پہچانتیں؟"

غریب بوڑھی سیتا ماں کا چہرہ مسرت آفریں مسکراہٹ سے کھل گیا۔ ماضی کے دل خراش واقعات کو وہ بھول چکی تھی۔ ——— اور سچ مچ سری کرشن کو دیکھ کر خوشی سے پھولی نہیں سمائی تھی۔

"میں اور سری کرشن کو نہیں جانتی ——— میں نے تو فوراً پہچان لیا" ——— شاردا نے حقارت اور طنز کے ساتھ جہاں تک اس سے ممکن تھا کہا ——— اور وہ کھانے کی میز سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

سیتا ماں اب بھی ہنس ہنس کر بول رہی تھی۔ شاردا نے ہاتھ دھویا اور کمرہ سے باہر نکل گئی ———

وہ ایک کتاب لے کر اپنے کمرہ کی کھڑکی پر چپ چاپ بیٹھ رہی۔ کتاب اس کی گود میں کھلی تھی اور اس کا ذہن ماضی کے کھر میں مصروف سفر تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے عہد رفتہ کے تمام واقعات سیلاب کی طرح امنڈنے لگے ——— اور اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے ———

چند منٹ بعد سری کرشن اپنی پھپھی سے باتیں کر کے باہر کے کمرہ میں آ گیا اور اس نے کہا "شاردا! یہ تمہاری فیس ہے" اور اس نے نوٹوں کا ایک تھوک اس کے سامنے بڑھایا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی، اور آنکھوں میں ایک اشارہ۔

شاردا زخمی شیرنی کی طرح اچھل پڑی اور آنکھوں سے گرم گرم آنسو بہاتے ہوئے صاف مگر سرد لہجے میں بولی ———

"شاردا ...... مجھے شاردا نہ کہو ——— میں نے یہ نام بہت ہی عزیز دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے مخصوص کر رکھا ہے ——— اور تم اس دائرہ سے باہر ہو ——— تمہارے لئے میں صرف ایک ڈاکٹر ہوں یاد کر لو ——— اور ہاں تمہارا روپیہ؟ ——— اسے اپنے ہی پاس رکھو۔ میں تمہارے روپے کو ہاتھ لگانا بھی پاپ سمجھتی ہوں تمہارا اور تمہارے روپے کا تصور ہی میرے لئے قابل نفرت ہے"

شاردا بول رہی تھی تو معلوم ہوتا تھا۔ بارہ برس کا دبا ہوا غم و غصہ پھوٹ پڑا ہے۔ اس کی آواز جذبات سے کانپ رہی تھی اور اس کا جوان جسم غصہ سے لرز رہا تھا ———

سری کرشن کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ وہ ایک منٹ تک بت بنا رہا۔ مگر فوراً ہی اس میں خود اعتمادی کا جذبہ لوٹ آیا اور وہ ایک معنی خیز ہنسی ہنسا ——— اور آہستہ سے بولا ———

"تو یہ کہئے ——— یہ اسی کا غصہ ہے۔ ہے نا؟ میں تمہارے جذبات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں ——— اب بھی تو وقت ہاتھ سے نہیں گیا ——— تم جوان ہو میں بھی جوان ہوں۔ اگرچہ میری شادی ہو چکی ہے ——— لیکن تم سے بھی شادی کر سکتا ہوں۔ میں" وہ جملہ پورا نہ کر سکا تھا کہ شاردا برس پڑی ——— اس کی آنکھیں غصہ سے چمک رہی تھیں ———

"بے شرم ...... بے حیا" وہ دانت پیستی ہوئی بولی ——— "تمہیں کچھ خبر ہے ——— کیا بک رہے ہو ——— اپنے ذہن میں یہ تخیل رکھتے ہوئے بھی شریف بنے پھرتے ہو۔ دنیا تمہارے جیون کو ڈھونے

رجسٹرڈ نمبر ڈی ۲۰۷

ادارۂ تحریر: ڈاکٹر سید عابد حسین ـ صالحہ عابد حسین ـ عبد اللطیف اعظمی

تاریخ اشاعت ـ یکم ـ ۱۵ ـ ۱۱ ـ ۶۲

چندہ: سالانہ ـ ششماہی

بھری ہے۔ اور ہماری پاگل سماج اور اس کے اندھے قوانین تمہیں اپنی پناہ دیتے ہیں۔ تم تو ذلت اور حقارت کی سطح سے بھی نیچے گر چکے —— دور ہو جاؤ —— تم نے روپے کے لئے میری زندگی ملیامیٹ کر ڈالی اور اب اس لڑکی کی زندگی بھی تباہ کرنی چاہتے ہو جس نے تمہارا گھر روپے سے بھر دیا —— اب تم کمینہ کھیل مجھ سے کھیلنا چاہتے ہو۔ ذلت و حقارت کے پتلے! ہٹ جاؤ میرے سامنے سے قبل اس کے کہ میرے ضبط کا بندھن ٹوٹے اور میں آپے سے باہر ہو جاؤں —— یہ کہہ کر اس نے منہ پھیر لیا اور دوسرے ہی لمحہ میں کمرہ سے باہر چلی گئی —— اس کا پورا جسم غصہ سے کانپ رہا تھا۔

سری کرشن اس ہیبت ناک غصہ سے چپ کر رہ گیا وہ خاموشی سے غم و غصہ کی کانپتی ہوئی تصویر کو آہستہ آہستہ دور ہٹتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے حواس درست ہوئے —— اور وہ خاموشی سے سر جھکائے سیڑھی سے نیچے اتر گیا ——

"سری کرشن" سیتا ملنے باورچی خانے سے پکارا "آج رات کے کھانے پر ضرور آنا دیکھو بھولنا نہیں"

بہت اچھا، پھپھی، بھتیجے نے موٹر میں داخل ہوتے ہوئے جواب دیا —— ایک منٹ بعد موٹر جا چکی تھی۔

شارما کھڑکی پر بیٹھی موٹر کو دیکھتی رہی —— جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ ایکا ایکی وہ اٹھی اور اوندھے منہ بستر پر جا کر گر گئی —— اس کا جوان تندرست جسم دبی ہوئی سسکیوں سے کانپ رہا تھا —— اور آنکھ سے آنسوؤں کے بھرنے تکیے پر جاری تھے۔

(ترجمہ)

عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیئے

(بسلسلہ صفحہ ۸)

بدھو تمہیں اتنا نہیں معلوم کہ وہ میرا فساد نہیں۔ میں دوسروں کے فساد میں کیوں ٹانگ اڑاؤں۔ یہ کیا نازیبا حرکت ہے۔"

"سرکار" کیا وقت ہے؟ اس نے مجھ سے پوچھا

میں نے اسے وقت بتایا۔ اب وہ بہت زیادہ پریشان اور بے چین نظر آ رہا تھا۔

میں نے اچانک پوچھا " اچھا آپ کا تعلق اس فساد سے تو نہیں جو قصر الاانیل میں ہو رہا ہے؟" اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ اس نے اینٹ کے ادھے کو سر تک بلند کیا اور مسرت سے بولا "ہاں، ہاں، (ہاں، ہاں)"

"وہ فساد تو کوئی دو گھنٹے ہوئے ختم ہو چکا" میں نے پرسکون انداز میں کہا۔

اس کا منہ لٹک آیا۔ چہرہ سے شادمانی کی دمک کافور ہو گئی۔ "افسوس میں وقت پر نہ پہنچ سکا اور فساد کم بخت مجھے جُل دے گیا۔ افسر اعلیٰ تک جب میری رپورٹ پہنچے گی تو خدا ہی بہتر جانتا ہے میرا کیا حشر ہوگا۔ کس منحوس کا منہ دیکھا تھا صبح صبح!"

میں نے شفقت سے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھا۔ اور ہنس کر کہا "خیر پھر سہی، غم نہ کھاؤ۔ آؤ چلو کچھ پیئیں پلائیں"

وہ فوراً راضی ہو گیا۔ ہم دونوں قریب ہی "پٹری بیوپار منڈل" کے صدر دفتر کے پاس ایک ہوٹل کی طرف بڑھے۔ ایک پولیس کے جوان نے ہم دونوں کو خوش خلقی سے سلام کیا اور ہم اندر جا کر بیٹھ گئے۔

میں نے آرڈر دیا "بہترین شراب کے دو گلاس" اور پھر بیرے سے کہا آپ کے ان اینٹ کے ادھے کو منیجر کے پاس جمع کر دو"

میں نے بغیر کسی استعجاب اور حیرت کے اینٹ کے ادھے کو ان شریف زادے کے ہاتھ سے لیا۔

دیکھا آپ نے وہاں کے فسادی خواہ مخواہ کا ہلڑ بونگ نہیں مچاتے بلکہ ڈھنگ، سلیقے کے اپنے بنائے ہوئے قاعدے قانون کی پابندی کے ساتھ فساد کرتے ہیں۔ اپنے مقررہ وقت میں وقت کی پوری پابندی کے ساتھ فساد کیا، فساد ختم ہو گیا، اپنے مزے سے کسی ہوٹل میں کھانا کھایا شراب پی اور پھر

دھوئے دھبے جامۂ احرام سے

جی ہاں، سلیقہ ڈھنگ اور خوش مذاقی غیر شائستہ کاموں میں بھی ایک شاعرانہ حسن پیدا کر دیتی ہے۔

جمہوریہ چین

(بسلسلہ صفحہ ۲)

اور پابندیاں لگانے کی کوشش کی۔ جن سے حکومت کے جو اختیارات پارلیمنٹ کو حاصل ہوں اور صدر مع کابینہ کے پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہو۔ یان شی کائی پورے اختیارات کے ساتھ ملک پر حکومت کرنا چاہتا تھا۔ ان تضادوں میں اور پارلیمنٹ میں کشمکش شروع ہو گئی اور اس کشمکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ شنگھائی میں علم بغاوت ہو گئی یا دوسرے لفظوں میں دوسرا انقلاب پھوٹ پڑا۔ لیکن شمالی فوج کی مدد سے بہت جلد بغاوت پر قابو پا لیا گیا اور تین مہینے کے اندر اندر امن ہو گیا اور زندگی معمول پر آ گئی۔ اس غیر معمولی کامیابی سے یان شی کائی کا رعب لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گیا اور پارلیمنٹ کے بہت سے ممبروں کو، جو بغاوت کے زمانے میں پیکنگ سے باہر چلے گئے تھے واپس آنے کی ہمت نہیں ہوئی، اور جنہوں نے بغاوت میں کھلم کھلا حصہ نہیں لیا تھا ان کے رویے میں اعتدال اور مزاج میں نرمی پیدا ہو گئی۔ یان شی کائی کو جب کسی شدید مخالفت کا اندیشہ نہیں رہا تو اس نے دستور کا محض وہ حصہ جو صدر کے انتخاب سے تعلق رکھتا تھا منظور کرا کر صدر کے انتخاب کا اعلان کر دیا اور ۶ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے مشترک اجلاس میں یان شی کائی کو جمہوریہ کا پہلا صدر چن لیا گیا۔

پرچہ نہ ملنے کی صورت میں کاغذ کی قلت کی وجہ سے "نئی روشنی" کی زائد کاپیاں بہت کم تعداد میں چھپتی ہیں اس لئے اگر اتفاق سے کوئی پرچہ کسی صاحب کو نہ ملے تو براہ کرم ایک ہفتہ کے اندر اندر اس کی دفتر کو اطلاع کر دی جائے ورنہ ممکن ہے پرچہ آپ کو نہ مل سکے "منیجر"

دفتر "نئی روشنی" جامعہ نگر دہلی

طابع و ناشر: عبد اللطیف اعظمی (بی اے جامعہ)

مطبوعہ: جید پریس، دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۲ | نمبر ۳ | ۱۶ جنوری سنہ ۱۹۴۹ء | ایڈیٹر: ڈاکٹر سید عابد حسین

صبح امید

مولانا ابوالکلام آزاد

انسان کی تمام اندرونی قوتیں اور جذبات خارجی محرکات کی محتاج ہوتی ہیں، اور ان کی مثال سوئے ہوئے انسان کی سی ہوتی ہے، جو گو زندہ ہے، مگر حرکت کرنے کے لئے کسی بیدار کن صدا کا محتاج ہو۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی تمام نشوونما ارتقائی قوتیں ابتدا سے خواب غفلت رہیں۔ ان کو کوئی جگانے والا ہاتھ اور کوئی ہشیار کرنے والی صدا نصیب نہیں ہوئی۔ قوموں کی زندگی کی اصلی قوت چند نفوس خاص کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ ان کی بیداری سے تمام ملت بیدار رہتی ہے، اور ان کی غفلت سے تمام ملت پر غفلت چھا جاتی ہے۔ لیکن بدبختی سے مسلمانوں کے رہنماؤں کا یہ حال رہا ہے کہ

او خویشتن گم است، کرا رہبری کند ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہندوستان میں گذشتہ نصف صدی کے اندر بیسیوں تغیرات ہوئے۔ تعلیمی رفتار کو خواہ کتنا ہی سست کہا جائے مگر ترقی رفتار سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ سب سے بڑی چیز شب و روز کے ساتھیوں کی حرکت تھی، اور کوئی نظر ایسی نہ تھی جس کے سامنے سے قافلے نہ گذرتے ہوں، اور شہسواروں کی اڑائی ہوئی گرد سے غبار آلود نہ ہوئی ہو۔ مقصود یہ تھا کہ غافل دلوں میں امنگ اور حرکت کی گدگدی پیدا ہوتی، اور ساتھیوں کو دوڑتا دیکھ کر بلا قصد بھی پاؤں حرکت کرنے لگتے۔ مگر بدبختی یہ تھی کہ لگام ان ہاتھوں میں تھی، جو لگام سے لگام کا نہیں بلکہ زنجیر کا کام لیتے تھے اور بیداری کے قدرتی ولولوں اور امنگوں کو ہمیشہ اپنی مصنوعی خواب مقناطیسی کے عمل سے دبا دینا چاہتے تھے۔ دلوں میں جوش اٹھتا تھا، اور آنکھیں راہ مقصود کو ڈھونڈتی بھی تھیں، لیکن جوش یا تو دبا دیا جاتا تھا یا اس کے لئے ایک غلط مصرف پیدا کر دیا جاتا تھا جس میں خرچ ہو کر، ضائع ہو جاتا تھا اور تلاش راہ کی خواہش کو یا تو بڑھنے سے روک دیا جاتا تھا یا پھر ایک پر پیچ و خم راہ ضلالت سامنے کر دی جاتی تھی، تاکہ جستجوئے منزل کا قدم اسی میں بھٹک کر رہ جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

لیکن ہم نے جاگنے میں دیر کی تھی، تو قدرت نے جگانے میں اور زیادہ دیر نہ کی۔ یکے بعد دیگرے چند واقعات و تغیرات نے بھی ظہور کر کے تنبیہہ اور غفلت شکنی میں مدد دی اور اگر چہ اب موجودہ حالات کو دیکھتے ہیں تو مایوسی کی جگہ امید کے اثر کو غالب پاتے ہیں، گو اب تک کوئی اصلی حرکت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ نہ تو پچھلی راہ سے پورے قدم ہٹے ہیں اور نہ آیندہ کے لئے کوئی نئی راہ متعین ہوئی ہے۔ اب تک جو تغیرات ہوئے ہیں، صرف ذہن اور دماغ تک محدود ہیں اور وہ بھی کوئی کامل تغیر نہیں، بلکہ صرف ایک جنبش ہے، جو دماغوں کے جمود نے محسوس کی ہے، اور پھر جو کچھ بھی ہے کسی متحد رشتے میں منسلک نہیں اور اب تک اتحاد اور مبادلۂ آراء کی قوت سے محروم ہے۔ تاہم ہر حرکت کی ابتدا اسی جنبش سے اور ہر عمل کا آغاز ذہن و خیال سے ہوتا ہے۔ برسوں کی نیند کے متوالے اگر ابھی کروٹ ہی لے رہے ہیں تو اٹھ کر بیٹھ جانے کے لئے جلدی نہ کرنی چاہیئے۔ شب کی سرمستیوں کا ابھی کچھ عرصہ تک تو خمار رہے ہی گا۔ عجب نہیں کہ نئے موسم کے آنے تک کچھ زمانہ تداخل کی بے عنوانیوں کا بھی گذرے۔ لیکن ہر حال میں عقل و ہوشمندی حزم و احتیاط اور اعتدال و توسط کے ساتھ نظر عواقب امور پر رہنی چاہیئے ۔ ۔ ۔

یہ حالات یقیناً امید افزا ہیں اور تغیرات نے نئی بنیادیں رکھنی شروع کر دی ہیں مگر اب سب سے مقدم بات یہ ہے کہ اس انقلاب و تغیر کی اہمیت و نزاکت کو نظر انداز نہ کیا جائے اور کمال حزم و احتیاط کے ساتھ آیندہ اقدامات کا ایک نقشہ مرتب ہو۔

پس گذشتہ افسانے کو ختم کر کے، آیندہ کی فکر کرنی چاہیئے۔ یہ اب ہر شخص محسوس کرنے لگا ہے کہ پچھلی راہ صحیح نہیں تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گو ایسے بھی ہیں جو اب بھی زبان سے اپنی پچھلی ضلالت کا اقرار کرتے ہوئے شرماتے ہیں، لیکن اگر دلوں کو ٹٹولا جائے تو کوئی بھی نہیں جو تزلزل اور جنبش محسوس نہ کرتا ہو۔ اس لئے اب تمام قوت غور و بحث اس میں صرف کرنی چاہیئے کہ آیندہ کے لئے کون سی راہ اختیار کی جائے اور اس کا نظام اور مقصد کیا ہوگا؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم اس نکتہ سے بے خبر نہیں ہیں کہ ہر اصلاح و تغیر کے لئے اصلی کام جنبش کا پیدا کر دینا اور گرفتاری کے قفس کا دروازہ کھول دینا ہے۔ جب حرکت پیدا ہوگی اور قفس کی قید سے باہر نکلیں گے، تو پھر خود ہی اپنے لئے کوئی نہ کوئی آشیانہ ڈھونڈھ لیں گے۔ یہ بالکل سچ ہے اور جو لوگ آج قوم میں حرکت پیدا کرنا چاہتے ہیں ان کو ہرگز اس کا ذمہ دار نہیں سمجھنا کہ وہ قوم کو گڑھے سے نکال کر اس کے لئے کوئی نیا محل بھی تیار کر دیں۔ یہ کام ان کا نہیں ہے۔ ان کا اصلی فرض یہاں تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے کہ پانی بند ہے، اس کا بند توڑ دیں، جب وہ چلے گا تو خود اپنا راستہ نکال لے گا۔ اور اگر خود نہ نکال سکے گا تو پھر انجینیر آئیں گے، اور اس کے لئے ایک مستقیم نہر کا خط کھینچیں گے۔

یہ اصلاح کے تقسیم عمل کا ایک سچا اصول ہے، مگر ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کے لئے وہ قومیں موزوں ہیں، جن کے یہاں تقسیم عمل کے لئے دماغوں اور ہاتھوں کی کمی نہیں ان کے یہاں ایک دماغ صرف نقادانہ ہوتا ہے جو صرف نکتہ چینی کرتا ہے اور بتلا دیتا ہے کہ عمارت کی دیواریں اس جگہ کجی ہے۔ پھر دوسری جماعت معماروں کی ہوتی ہے، وہ دیوار کو ڈھا کر از سر نو اٹھاتی ہے مگر مسلمانوں میں اصلی سوال دماغ اور رائے ہی کا نہیں، بلکہ آدمیوں کا ہے۔ بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہم میں آدمی نہیں اور آدمی مشینوں میں ڈھل نہیں سکتے، پس ہم کو ہمیشہ اپنی بے بضاعتی پر نظر رکھنی چاہیئے اور اس لئے ہر شخص کو صرف اپنا فرض ہی نہیں دیکھنا چاہیئے، (بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

فہرست مضامین

قیمت فی پرچہ ۳ر

۱۵ - دسمبر

علی گڈھ میں

(۴)

(ایک تماشائی کے قلم سے)

گورنر جنرل کو ڈاکٹر آف لاز کی ڈگری دی جا چکی۔ تو مہترس چانسلر نے کنووکیشن کے ختم ہونے کا اعلان کیا، اور اراکین اولڈ بوائز کی طرف سے ایڈریس پیش کرنے کی تقریب شروع ہوئی۔ گذشتہ کم و بیش ... سال میں اکابر کو بے شمار سپاسنامے دیئے گئے۔ لیکن یہ ایڈریس مخصوص نوعیت کا تھا۔ رسمی باتوں کا تذکرہ نہ تھا لہجہ سائلانہ یا انداز فدویانہ نہ تھا، کسی طرح کی ہائے وائے نہ تھی۔ ضرورتوں یا معذوریوں کی فہرست پیش نہیں کی گئی۔ اپنے حوصلوں اور اپنی ذمہ داریوں کو بتایا تھا۔ لیکن میں پیش بیانی سے بچ کر سپاسنامے کے مختصر اقتباسات دینا چاہتا ہوں، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علی گڈھ اپنے آپ کو کس سطح سے پیش کر رہا تھا اور کس سطح پر اس کی پذیرائی کی جا رہی تھی۔ اقتباسات یہ ہیں:-

"...... ہمیں اپنی ریاست کے شہریوں کو فکر و عمل کی نئی راہوں پر ڈالنا اور ان کی شخصیتوں کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنا ہے۔ ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ ہم اپنی ذمہ داریوں کے اہل ثابت ہوں گے اور ہم کو ملک کے بہترین عناصر کی تائید حاصل ہوگی۔ ہر قدم پر ہمارے دل میں حوصلہ اور ہمارے حوصلوں میں یہ احساس موجزن رہے گا کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ ملک کی اصلاح و فلاح کے لئے ہے اور اسی میں ہمارے عمل کی اہمیت و عظمت مضمر ہے۔ ملک کی تہذیبی ترقی میں اس ادارہ نے بڑا کام کیا ہے۔ یہ ادارہ آئینہ دار ہے سرسید اور ان کے رفقائے کار کی سرگرمیوں اور منصوبوں کا اور ترجمان ہے اس ترقی پذیر اور ترقی پسند تحریک کا جو "علی گڈھ تحریک" کے نام سے موسوم ہے۔"

"بانی اعظم نے اس ادارہ کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے اس کی غرض و غائت اور مستقبل کے بارے میں بجا طور پر فرمایا تھا کہ آج ہم نے جو بیج بویا ہے کیا معلوم کل وہی ایک تناور درخت ہو جائے جس کی شاخیں برگد کی طرح آہستہ آہستہ زمین کے سینے میں اپنا گھر کریں اور پھر ان کی جڑوں سے نئے اور جاندار پودے نکل آئیں۔ اُمید ہے وہ دن بھی آئے جب یہ کالج یونیورسٹی بن جائے اور اس کے نونہال ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل جائیں اور وطن کے کونے کونے میں بے لاگ تحقیق، وسیع رواداری اور بے لوث اخلاق" کے پیام بر بن جائیں۔"

"یہ ایک بلند مقصد تھا جو اس درسگاہ کے بانیوں کے پیش نظر تھا۔ لیکن اسے ایک ایسی سوسائٹی میں بروئے کار لانا آسان نہ تھا جو رسوم و قیود کی اسیر ہو چکی تھی اور اپنے تاریخی فریضے یا احساس کو یک قلم بھلا چکی تھی۔ بایں ہمہ علی گڈھ اپنے نصب العین کے لئے جد و جہد کرتا رہا اور بڑی حد تک کامیابی سے دوچار ہوا، لیکن غیر ملکی تسلط اور رجعت پسندی کے ان عوامل نے جو اس تسلط کے ساختہ پرداختہ تھے، جہاں ہمارے ملک کی پوری اداروی زندگی کو اپنی طرف کھینچا وہاں علی گڈھ بھی ان کی زد میں آیا اور یہ ادارہ ان راستوں پر جا پڑا جو اس کے بانیوں کے بلند نصب العین سے منحرف تھا۔ لیکن علی گڈھ کا "فضل و صلح" اپنے بانیوں کی توقعات سے ہمکنار ہونے اور رہنے میں ہمیشہ سرگرم رہا۔ علی گڈھ کو بہت نشیب و فراز سے گذرنا پڑا اور بہت سے خطروں اور رکاوٹوں کا سامنا رہا، لیکن ایسے مواقع پر ہمیشہ اس نے اپنے میں ایسی لچک اور دب کر اُبھرنے کی صلاحیت کا ثبوت دیا کہ اس کی کشتی صحیح و سالم ساحل مراد کی طرف چل نکلی۔"

"اگر اس یونیورسٹی کو آج اس آزمائش کا سامنا ہو کہ وہ اپنی قدروں اور اپنے طریق کار پر فراست و تدبر کے ساتھ نظر ثانی کرے تو ہم کو یقین ہے کہ علی گڈھ کی حقیقی روح اپنے آپ کو ایسی تبدیلیوں سے سازگار کر سکے گی جو آزادی کے فرائض اور ذمہ داریوں کا حق ادا کرنے میں معاون ہوں گی۔ اور اس طور پر ہماری قومی زندگی میں وہ مربوط، ہم آہنگ، حسین اور استعداد آفریں صلاحیتیں راہ پائیں گی جن سے ایک ایسی دنیوی ترقی پذیر جمہوری ریاست کی تشکیل ہوگی جس میں بے لاگ تحقیق، وسیع رواداری اور بے لوث اخلاق کا سہ گانہ نصب العین ظہور پائے گا اور برگ و بار لائے گا۔"

"سرسید اعظم جو کچھ کرتے تھے اس کا پورا حق ادا کرتے تھے۔ ان کے بیشتر کاموں کی یہ امتیازی خصوصیت تھی انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ مقصد کو وسیلہ مقصد سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ بے لاگ تحقیق کی روح کو بیدار کرنا چاہتے تھے، اور ایسی رواداری پیدا کرنا چاہتے تھے جس میں ذہن بے لوث ہو، اور جہاں شہریت کا شعور بروئے کار ہو اور ایسے اخلاق کی پرورش کرنا چاہتے تھے جو آزاد شخصیت اور روایتی خوبیوں کے سرچشمے سے پھوٹا ہو، وہ اس پر یقین رکھتے تھے کہ ان کا یہ نصب العین اس وقت تک کامیاب نہ ہوگا جب تک کہ ایک ایسا ادارہ قائم نہ کیا جائے جہاں بالارادہ ان مقاصد کے حصول کی کوشش کی جائے۔ سرسید نے آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیوں کا بچشم خود مطالعہ کیا اور بعض ضروری تبدیلیوں کے ساتھ انگریزی اقامتی نظام تعلیم کے بنیادی عناصر پر اس درسگاہ کی بنیاد رکھی جو آج مسلم یونیورسٹی ہے۔"

"یہ ایک کوشش تھی مشرقی تہذیب اور مغربی علوم و فنون کے بہترین عناصر کے ایک ایسی فضا میں امتزاج کی جہاں شخصیت کی ہمہ جہت پرداخت کو مرکزی حیثیت حاصل ہو۔ چنانچہ علی گڈھ نے ایسے نوجوان پیدا کئے جنھوں نے نہ صرف ملک کے نظم و نسق میں نام پیدا کیا بلکہ قومی زندگی کے ہر شعبہ میں اپنے نقوش چھوڑے۔ سرسید کی تعلیمی مساعی کی مستقل مشعل راہ ہندو مسلم یگانگت تھی۔ چنانچہ اس درسگاہ کے دروازے شروع ہی سے ہر ملت اور ہر فرقے کے لئے کھلے رہے۔ شاید یور اکسلنسی کو یہ معلوم کر کے مسرت ہوگی کہ اس درسگاہ کا پہلا گریجویٹ ایک ہندو نوجوان تھا۔"

آگے چل کر عرض کیا گیا تھا:۔

"ان باتوں کے گوش گذار کرنے سے ہمارا مقصد محض یہ نہیں ہے کہ یور اکسلنسی ہماری ضروریات سے ہماری قومی حکومت کو آشنا فرمائیں۔ حکومت کے وسائل پر ان دنوں جیسا فشار ہے اس کا ہم کو کامل احساس ہے۔ ہم کو یہ یقین دلانے کی بھی ضرورت نہیں کہ حکومت حتی الوسع علوم و فنون کی ترقی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھے گی۔ دراصل ہم ایک طور پر اس حقیقت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں کہ جمہوری معاشرے میں یونیورسٹی تعلیم کا جو مقصد ہے اس سے ہم پورے طور پر آگاہ ہیں۔"

"ہمیں اپنے نوجوانوں کی فطری صلاحیتوں کی تربیت و تہذیب کا سامان فراہم کرنا ہے تاکہ ہمارا ہر شہری ان مختلف النوع فرائض کو بحسن و خوبی انجام دے سکے جو اس پر عائد ہوں گے۔ ہم کو اس یونیورسٹی نیز ان نوجوانوں کے لئے جو اس کی امانت میں دیئے گئے ہیں اہلیت کا بلند ترین معیار قائم کرنا ہے ہم کو کارکردگی کے مقصد کو شخصیت کے بلند نصب العین سے ہم آہنگ کرنا ہے۔ انسان با مسرت اور با مقصد زندگی اسی وقت بسر کر سکتا ہے جب وہ ان صلاحیتوں کی تربیت و تہذیب اور اس کا اظہار کسی کارنامے کی شکل میں کر سکے جن سے فطرت نے اُسے بہرہ مند کیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کو اپنے آپ میں ایسا جذبہ بھی پیدا کرنا ہوگا جو ایسی قدروں کی پرورش و پیروی کر سکے۔ جن کا ان کے ذاتی مفاد سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو، جن کی زندگیاں اجتماعی و اخلاقی مقاصد کے حصول کا وسیلہ بن جائیں اور دولت کے در پے نہ ہوں، کمال کے متلاشی بنیں۔"

"تمام تعلیمی اداروں بالخصوص یونیورسٹیوں کے یہ فرائض میں سے ہے کہ وہ نوجوانوں میں طاعت و ضبط کا شعور پیدا کریں اور ان کے رگ و پے میں اس عینیت کی روح پیوست کر دیں جو ذہنی استعداد و شہری کو برگزیدہ انسانی مقاصد کا خدمت گذار بناتی ہے۔ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی پر یہ مزید ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ جس مذہب اور تہذیب کی نمایندگی سے ممتاز ہے اس کو نئے ہندوستانی شہریت اور جمہوریت میں سمونا اور جلوہ آرا کرنا ہے۔ ہم کو اس کا کامل یقین ہے کہ اس نئے ہندوستان کی تعمیر و تہذیب میں جو انسانی زندگی کی اعلیٰ قدروں کا علمبردار ہوگا ہمارا دین کسی تخریبی نقص کا باعث نہیں بلکہ اس سحر آگیں مہم کی تکمیل میں عزم و حوصلہ کا ایک فیضان جاریہ ثابت ہوگا۔"

"ہم یور اکسلنسی کو یقین دلاتے ہیں کہ یونیورسٹی اس شاندار اور شریفانہ مقصد کے لئے دل و جان اور صدق و صفا سے کوشاں رہے گی اور یہ درسگاہ دار العلوم

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
۱۶ جنوری ۱۹۴۹ء

کشمیر کی عارضی صلح

صلح کا پیام جو نیا سال کشمیر اور جموں کے چالیس لاکھ باشندوں کے لئے لایا ہے، در اصل ہندو پاکستان کے چالیس کروڑ باشندوں کے لئے زندگی کا پیام ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ دونوں ہمسایہ ملکوں میں دشمنی اور نفرت کی قوتوں کا زور گھٹ گیا ہے اور ان لوگوں کی بات سنی جانے لگی ہے جو شروع سے اس حقیقت کو سمجھتے ہیں اور سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہندو پاکستان کی لڑائی اسپین یا چین کی خانہ جنگی کی طرح ایک خوفناک وبا ہے جسے فوراً روک دینا چاہئے ورنہ قوی اور ضعیف، غالب اور مغلوب سب کو ہلاک کر کے اور سارے براعظم کو اجاڑ کر رہے گی۔

ہندوستان میں نفرت کی اندھی قوتوں کو مہاتما گاندھی نے اپنی جان دے کر اور جواہر لال نے اپنی جان کو، اور جان سے بھی زیادہ عزیز شہرت اور ہر دل عزیزی کو خطرے میں ڈال کر شکست دی۔ بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی کہ دسمبر ۱۹۴۸ء اور جنوری ۱۹۴۹ء کے دو مہینوں میں سخت یہ اندیشہ تھا کہ ہند اور پاکستان میں کھلم کھلا بڑے پیمانے پر جنگ چھڑ جائے گی۔ شروع دسمبر ۱۹۴۸ء میں صورت حال یہ تھی کہ ہندوستانی فوج کشمیر کی وادی کا بڑا حصہ حملہ آوروں سے خالی کرا چکی تھی، لیکن پھر بھی مخالف فوجیں اسے ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھیں۔ اسے جاڑے کے زمانے میں ہندوستان سے کمک اور سامان پہنچنا بہت مشکل تھا۔ مخالفوں کو پاکستان سے ہر قسم کی مدد آسانی سے پہنچ رہی تھی۔ اس بات کا قوی امکان تھا کہ پاکستان کی ایک بڑی فوج حملہ آوروں کے ساتھ مل کر ہندوستانی فوج کی عافیت تنگ کر دے گی۔ بظاہر ہندوستان کے لئے کشمیر میں شکست سے بچنے کی صرف یہی صورت تھی کہ وہ مغربی پنجاب پر حملہ کر دے تاکہ پاکستان کو اپنے بچاؤ کے لئے کشمیر سے ہٹنا پڑے۔ بعض مصلحت پرست ہندوؤں کی یہ رائے تھی کہ ہندوستان کشمیر کو حملہ آوروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اپنی جان چھڑا لے۔ بہت سے فرقہ پرست گروہ اور لوگوں کا اصرار تھا کہ ہندوستان پاکستان پر حملہ کر دے چاہے اس کے ساتھ خود بھی تباہ ہو جائے اور دنیا کی رائے عامہ کو اپنا مخالف بنا لے۔ مگر امن اور جمہوریت کے علم بردار جواہر لال نہرو نے ان دونوں راہوں کو چھوڑ کر تیسری راہ اختیار کی۔ انھوں نے کشمیر کے معاملے کو یو، این، او کے سامنے پیش کر دیا۔ اس میں بھی بڑے خطرے تھے۔ مگر جواہر لال کو اپنے حق بجانب ہونے پر اور انسانیت کی حق پسندی پر اتنا بھروسا تھا کہ وہ ان خطروں کو برداشت کرنے پر تیار ہو گئے۔ ان پر جنگ جو فرقہ پرستوں کی طرف سے جن کا اس وقت بڑا زور تھا اس قیامت کی لعن طعن ہوئی کہ دوسرا ہوتا تو گھبرا جاتا۔ مگر دھن کے پورے بات کے پکے جواہر لال نے اس کی کوئی پروا نہیں کی۔ ان کے اس دلیرانہ اقدام کا یہ نتیجہ ہوا کہ پاکستان کشمیر میں بڑے پیمانے کی فوجی کارروائی کرنے سے باز رہا اور ہند و پاکستان کی بڑی جنگ ٹل گئی۔ اس کے بعد وسط جنوری میں ایک اور نازک وقت آیا۔ ہندوستان مالی سمجھوتے کے ذریعے سے پچاس کروڑ کی جو رقم پاکستان کو ادا کرنے کا پابند تھا اس کی ادائگی میں تامل کرنے لگا۔ اس وقت پاکستان کی مالی حالت اس قدر ابتر تھی کہ اگر اسے یہ رقم نہ ملتی تو اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ یقینی تباہی سے بچنے کی خاطر موہوم کامیابی کی امید میں اپنی جان کی بازی لگا کر ہندوستان سے لڑ جائے۔ اس وقت گاندھی جی نے ہند کی عزت اور نیک نامی کی حفاظت اور ہند و پاکستان دونوں کو بڑے پیمانے کی جنگ کے مہلک خطرے سے بچانے کے لئے ہماری حکومت پر اثر ڈال کر پچاس کروڑ کی رقم ادا کرا دی اور اٹھتے ہوئے طوفان کو فرو کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے اپنی جان کی قربانی دے کر ہندوستان میں جنگ جو فرقہ پرستوں کے سارے طلسم ہی کو توڑ دیا۔

اس طرح ہندوستان میں نفرت اور دشمنی کی قوتوں کو ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو فیصلہ کن شکست ہو چکی تھی۔ مگر پاکستان میں ان کا ابھی زور تھا اور کسی کو ان کے مقابلے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ آخر گیارہ مہینے کے عرصے میں واقعات کی ٹھوس منطق نے پاکستان کے لوگوں پر اچھی طرح ثابت کر دیا کہ جس راہ پر جماعت کے ملک کے مذہبی اور سیاسی مجنوں اور مغربی ملکوں کے سرمایہ دار انھیں چلا رہے ہیں وہ سیدھی ہلاکت کے گڑھے کی طرف جاتی ہے اور وہ ان لوگوں کی باتوں پر کان دھرنے لگے جو کشمیر کے مسئلے کو پنچایت کے ذریعے سے پر امن طریقے پر طے کرنے کے حق میں تھے۔ عارضی صلح کا اعلان جو یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو ہوا ہے بجائے خود ایک مسرت افزا مژدہ ہے۔ لیکن سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ اس کے اندر پاکستان کی اخلاقی اور روحانی صحت کے آثار نظر آتے ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نفرت، جہالت، عناد، جنگ جوئی کا زہریلا مادہ کم ہو رہا ہے۔ دانشمندی، مصلحت بینی، صلح جوئی کا صالح عنصر ابھر رہا ہے۔

غالباً ابھی وہاں مرض اور صحت کی قوتوں میں ایک شدید کش مکش اور ہوگی جن لوگوں نے نفرت کا گیت گا کر لڑائی کا ڈنکا بجا کر قوت و اقتدار حاصل کیا ہے وہ صلح کی جڑ کاٹنے کے لئے ایک بار جان توڑ کر کوشش کریں گے لیکن اگر پاکستان کے صلح پسند لیڈروں نے ہمت اور استقلال سے کام لیا تو خدا ان کی مدد کرے گا۔ پاکستان کے عوام آخر میں ان کا ساتھ دیں گے اور وہ ان کوتہ اندیش کور باطن، خود پرستوں کو نیچا دکھانے میں کامیاب ہوں گے اور ایک دن وہ بھی ہر دل عزیزی حاصل کریں گے جو ان بد نصیبوں کو کبھی خواب میں بھی نصیب نہ ہوئی ہوگی۔

بزم بے تکلف

ہمارے خطیب صاحب باتیں کرنے کے قائل نہیں۔ جلوت و خلوت میں مستی و ہوشیاری میں، خواب و بیداری میں ہمیشہ تقریر فرماتے رہتے ہیں۔ بات اور تقریر میں جو فرق ہے وہ آپ اچھی طرح جانتے ہوں گے اور اگر نہ جانتے ہوں تو کسی پاکستانی قائد یا ہندوستانی نیتا کے پاس چلے جائیے اور کہئے "منہ سے مجھے بتا کریں"۔ مختصر یہ کہ بات کی جاتی ہے، تقریر چھانٹی جاتی ہے۔ بات کا سر پیر ہوتا ہے۔ تقریر کا نہ سر ہوتا ہے نہ پیر، بس دھڑ سے لڑھکتی چلی جاتی ہے۔ بات میں سے بات نکلتی ہے، تقریر میں سے کچھ بھی نہیں نکلتا بات اپنے پیٹ میں نہیں پچتی، تقریر دوسرے کو ہضم نہیں ہوتی۔

آپ لاکھ چاہیں کہ خطیب صاحب کو تقریر کا موقع نہ دیں، ایسا موضوع چھیڑیں جس میں پھیلنے کی گنجائش نہ ہو، مگر وہ پھیل ہی پڑتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ حضرت موسیٰ کے پیرو ہیں جن سے اللہ میاں نے صرف اتنی بات پوچھی تھی کہ موسیٰ تمھارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے" حضرت بجائے اس کے کہ عصا کا نام لے کر چپ ہو رہتے لگے "عصائیات" پر تقریر کرنے۔ آپ کی خطیب صاحب سے پہلی ملاقات ہو اور آپ انجان بن کر پوچھیں "آپ کا اسم شریف؟" کوئی دوسرا ہو تو اپنا نام اور ولدیت یا زیادہ سے زیادہ ولدیت کی ولدیت بتا کر بس کرے مگر ہمارے خطیب صاحب فرمائیں گے "جی کیا عرض کروں عرف میں تو میں خطیب کہلاتا ہوں مگر والدین کا رکھا ہوا نام نہیں مادر علمی کا بخشا ہوا لقب ہے، وہاں عجیب دستور ہے کہ لوگوں کو خصوصاً دلچسپ لوگوں کو ان کے اصلی نام سے نہیں پکارتے۔ بلکہ کسی صفت کی بنا پر جو اس میں واقعی موجود ہو یا خواہ مخواہ اس کی طرف منسوب کی جاتی ہو، اس کو ایک لقب سے ملقب کر دیتے ہیں اور ہمیشہ اسی لقب سے پکارتے ہیں۔ اصلی نام قلت استعمال سے متروک اور رفتہ رفتہ معدوم ہو جاتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ امر کہاں تک مناسب ہے۔ آخر نام رکھنے کی علت غائی کیا ہے...... " اللہ میاں کی طرح آپ کو بھی خلافاً ساری تقریر سننی پڑتی ہے بلکہ آپ کے لئے تو اور مشکل ہے کہ جب مقرر سے آنکھیں چار ہو جائیں تو سنجیدگی سے سر بھی ہلانا پڑتا ہے جب خطیب صاحب کا پہلا خطبہ سر ہو چکتا ہے تو آپ ڈرتے ڈرتے دوسرا سوال کرتے ہیں "دولت خانہ" بظاہر اس کا جواب کسی طرح ایک خانے سے زیادہ نہیں ہو سکتا، مگر خطیب صاحب پوری بساط کھول دیتے ہیں "ارے صاحب آپ نے بھی کیا بات پوچھی؎

گھر بار سے کیا فقیر کو کام
کیا لیجئے چھوڑے گاؤں کا نام

در اصل میرے بزرگ اکبر اعظم کے زمانے میں حکیم ابو الفتح شیرازی کی تحریک پر نیشاپور سے ترک وطن کر کے ہندوستان روانہ ہوئے......" آپ کا دم سوکھ جاتا ہے کہ الٰہی خیر خدا جانے مبتدا سے خبر تک کن کن منزلوں سے گذرنا پڑے۔ جب خطیب صاحب نیشاپور سے آگرے کی مسافت زمانی اور اکبر اعظم کے عہد سے

(بقیہ صفحہ ۴ پر)

پچھلا ہفتہ: ۱۔ ہندوستان

دیکھا اِس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

بمبئی کے ہردل عزیز لیڈر بمبئی کرانیکل کے ایڈیٹر سید عبداللہ بریلوی اتوار ۹ جنوری کو رات کے پونے ۹ بجے قلب کی حرکت بند ہوجانے سے رحلت کرگئے اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ دل کی بیماری انھیں ۱۹۴۲ء سے شروع ہوئی پچھلے سال کے وسط میں بہت شدید دورہ ہوا تھا، مگر یورپ سے واپسی کے بعد بظاہر ان کی صحت سنبھل گئی تھی اور وہ حسب معمول اپنی گوناگوں خدمات نہایت محنت اور انہماک سے انجام دے رہے تھے۔ ۸ جنوری کی رات تک بالکل اچھے تھے۔ ۹ کی صبح کو یکایک قلب کا دورہ پڑا۔ شام کو ۷ بجے گورنر جنرل کی پریس کانفرنس میں وہ خود شریک نہیں ہوسکے مگر ان کا لکھا ہوا خیر مقدم کا خطبہ ان کی طرف سے پڑھا گیا۔ اس کے پونے دو گھنٹے بعد اس دنیا کو خیرباد کہہ کر عالم آخرت کو سدھار گئے۔

۱۰ جنوری کی صبح کو زینت منزل کی سامنے صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ ہندوستان کے گورنر جنرل اور بمبئی کے وزیر اعظم تو مرحوم کے عزیزوں کو پرسہ دے کر چلے گئے مگر دوسرے وزرا ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اور بمبئی کے ہر طبقے اور ہر حلقے کے ممتاز لوگ، ہر سیاسی پارٹی، ہر پبلک ادارے کے نمائندے جو اپنے محبوب شہری کا آخری دیدار کرنے کو آئے تھے آخر تک ٹھہرے رہے اور جنازے کے ساتھ قبرستان کو گئے۔ جنازے کی شان دیکھنے کے قابل تھی، آگے آگے سیوا دل کے والنٹیر، اُس کے پیچھے محبت اور عقیدت کے پھولوں سے لدا ہوا تابوت اور پھر عزاداروں کا مجمع جس میں ہندو، مسلمان، پارسی، عیسائی سکھ کندھے سے کندھا ملائے جارہے تھے کوئی اجنبی دیکھتا تو سمجھتا کہ اگر یہ بادشاہ کا نہیں تو کم سے کم وزیر سلطنت کا جنازہ ہو لیکن وہ میت ایک غریب جرنلسٹ کی تھی جس کے پاس نہ قوت و اقتدار تھا، نہ مال و دولت، نہ جاہ و حشم، نہ کچھ ایسا علم و فضل بس ایک دل تھا نرم، رقیق، حلیم، شریف، درد آشنا، محبت بھرا دل، اور ایک قلم تھا سچا، کھرا، متین، محتاط، معتدل، متوازن قلم۔ اسی دل اور قلم کی طاقت سے اُس نے اپنے شہر اور اپنے ملک کو مسخر کرلیا تھا۔

خفتش بہ اتفاق متانت جہاں گرفت
خدا اس صاحب دل اور صاحب قلم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور اس کے بال بچوں، عزیزوں کو اور ان دوستوں کو جو اسے عزیزوں سے بڑھ کر عزیز رکھتے تھے صبر جمیل عطا فرمائے۔

کیا اتحادِ مشرق کی بنیاد پڑ رہی ہے؟

فروری ۱۹۴۷ء میں پنڈت جواہر لال نہرو کی کوشش سے نئی دہلی میں پہلی ایشیائی کانفرنس منعقد ہوئی تھی، مگر اس کا مقصد تہذیبی، معاشرتی اور کسی حد تک معاشی تھا۔ اس وقت تک یہ خیال نہ تھا کہ ایشیائی ملکوں کا کوئی سیاسی جتھا الگ بنا دیا جائے۔ لیکن جب انڈونیشیا میں ولندیزیوں نے بڑی دیدہ دلیری سے جمہوری حکومت کو کچل کر رکھ دیا اور اقوام متحدہ کی انجمن سوائے رزولیوشن پاس کرنے اور کاغذی گھوڑے دوڑانے کے کچھ نہ کرسکی تو ایشیا کے لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں اور انھیں اس کی شدید ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کے نمائندے مل کر بیٹھیں اور اپنی آزادی اور سلامتی کی تدبیریں سوچیں۔ ہندوستان نے پنڈت نہرو کی رہنمائی میں پھر پیش قدمی کی اور مشرقی ملکوں کی کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا، جو ۲۰ جنوری سے نئی دہلی میں شروع ہوگی اس میں قریب قریب تمام ایشیائی ملکوں کے نمائندوں نے شرکت کا وعدہ کیا ہے صرف تھائی لینڈ (سیام) کے مارشل سونگکرام کو یہ ڈر ہے کہ کہیں مغربی طاقتیں خفا نہ ہوجائیں کانفرنس میں شریک ہونے میں تامل ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس کانفرنس کی وجہ سے یو، این، او کی قوت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ ہندوستان کی حکومت کی طرف سے یہ اطمینان دلایا جاچکا ہے کہ ابھی تک اقوام متحدہ کے توسط کے بغیر کوئی عملی کارروائی کرنے کی تجویز پیش نظر نہیں ہے۔ دراصل اس کانفرنس کا مقصد صرف یہ ہے کہ دنیا کو بتا دیا جائے کہ انڈونیشیا کے جمہور اور ان کی جمہوری حکومت کا گلا گھونٹنے کی وجہ سے سارے ایشیا میں غم و غصے کا ایک طوفان اُٹھ رہا ہے اگر اس کے بعد یو، این، او کی رگ حمیت حرکت میں آئے۔ اس کے ٹھنڈے خون میں کچھ گرمی پیدا ہو، اور وہ ہالینڈ پر سیاسی اور معاشی دباؤ ڈالنے کے لئے کوئی عملی قدم اُٹھانا چاہے تو ظاہر ہے کہ اہل ایشیا کے اس جوش و خروش سے اسے اور تقویت پہنچے گی۔ لیکن اگر اس نے دنیا کی نصف آبادی کے شدید اور گہرے جذبات کی کچھ پروا نہ کی اور اسی طرح ہالینڈ کو ڈھیل دیتی رہی تو یقیناً ایشیائی قوموں کو یہ سوچنا پڑے گا کہ وہ اپنی بکھری ہوئی قوت کو چاہے وہ تھوڑی ہو یا بہت منظم کرکے اپنا ایک الگ سیاسی جتھا بنائیں اور اپنے آپ کو مغرب کی سامراجی قوتوں کے پنجۂ غضب سے بچانے کے لئے جان توڑ کر کوشش کریں۔ اس میں شک نہیں کہ ایشیائی قوموں کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے ان کا ایک ہم آہنگ سیاسی جتھا بننا بہت مشکل ہے، اور اگر بن بھی جائے تو کچھ زیادہ طاقت ور نہیں ہوگا۔ لیکن اگر یو، این، او کی بے نیازی یا بے بسی کا یہی حال رہا تو ایک نہ ایک دن یہ ہوکر رہے گا۔

انتخاب یا انقلاب؟

آئین ساز اسمبلی مجوزہ ریپبلک کے پریسیڈنٹ، وائس پریسیڈنٹ، مجلس وزرا، مرکز کے اور صوبوں کے ایوان زیریں اور ایوان بالا کے انتخابات کے متعلق کل دفعات کو منظور کرنے کے بعد ۸ جنوری سے ملتوی ہوگئی۔ فروری اور مارچ میں اس کا اجلاس قانون ساز مجلس کی حیثیت سے ہوگا۔ جس میں وہ ۱۹۵۰ء کے بجٹ پر اور مختلف قوانین کے مسودوں پر غور کرے گی۔ آئین سازی کے کام کے لئے اس کا آخری اجلاس ۱۵ مئی ۱۹۴۹ء سے شروع ہوگا۔ اُمید پرور لوگ کہتے ہیں کہ اسمبلی ۱۵ اگست تک آئین کے مسودے پر بحث ختم کرے گی اور آزادی کی دوسری سال گرہ کے دن ہندوستان کا نیا آئین مکمل ہوجائے گا، لیکن ہم جیسے شکی آدمیوں کو یقین نہیں آتا۔ ابھی تک آئین کی دفعات میں سے پاؤ منظور ہوئی ہیں اور پونے باقی ہیں۔ جن میں سے بعض پر معرکے کی بحثیں ہونے کا قوی امکان ہے۔ بھلا یہ قیل و قال تین مہینے کے اندر ختم ہوسکتی ہے، لیکن کچھ بھی ہو یہ بات طے ہوچکی ہے کہ نئے انتخابات آئندہ سال ضرور ہوں گے اور ۱۹۵۰ء کی کسی نہ کسی تاریخ کو ہندوستان کی نئی با اقتدار ریپبلک قائم ہوجائے گی۔ چونکہ آئین کا وہ حصہ جو انتخابات سے تعلق رکھتا ہے منظور ہوچکا ہے اس لئے اسمبلی نے ایک رزولیوشن کے ذریعے سے مرکزی حکومت اور صوبوں کی حکومتوں کو ہدایت کی ہے کہ رائے دہندوں کی فہرستیں تیار کرنے کا کام شروع کردیا جائے اور نئے انتخابات ۱۹۵۱ء میں جتنے سویرے ہوسکے کرلئے جائیں۔

اب ذرا یہ سوچئے کہ آنے والے انتخابات اپنے اندر کتنے انقلابی امکانات رکھتے ہیں۔ اب تک جن لوگوں کو صوبوں کے انتخابات میں رائے دینے کا حق ہے ان کی تعداد تک بھگ پونے دو کروڑ ہے۔ اب ہر عاقل، بالغ کو ووٹ دینے کا حق ہوگا یعنی تقریباً اٹھارہ کروڑ آدمیوں کو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ووٹروں کی تعداد دس گنی سے زیادہ ہوجائے گی۔ کون یقین سے کہہ سکتا ہے کہ یہ سولہ سترہ کروڑ ووٹر کس پارٹی کو ووٹ دیں گے۔ بے شک قیاس یہی کہتا ہے کہ باوجود ان شکایتوں کے جو عوام کو کانگریسی حکومت سے پیدا ہوگئی ہیں گاندھی جی، جواہر لال نہرو اور دوسرے محترم لیڈروں کے نام کی کشش سے کانگریس اب بھی بہت سے ووٹ کھینچ لے جائے گی۔ ہمیں ناموں کی تاثیر سے انکار نہیں۔ لیکن حقائق و واقعات کی تاثیر کو بھی ہم نظر انداز نہیں کرسکتے۔ جو قیامت کی گرانی آج کل ہے وہ ہر ہونے والے ووٹر کی زندگی پر اثر ڈال رہی ہے اور بعض کے لئے تو سوہانِ روح بن گئی ہے۔ لوگ عام طور پر کانگریسی حکومت کو کسی نہ کسی حد تک قصوروار سمجھتے ہیں کہ اس نے گرانی کو دور کرنے کی ہر ممکن تدبیر اختیار نہیں کی۔ اس کے علاوہ کانگریس کے بعض کارکن اور لیڈر اپنی مذموم حرکتوں کی وجہ سے اپنی ساکھ کھو چکے ہیں اگر کانگریس آنے والے انتخابات میں یقینی کامیابی حاصل کرنا چاہتی ہے تو اس کی حکومتوں کو گرانی اور بے روزگاری دور کرنے کے لئے کوئی عملی قدم اُٹھانا چاہئے اور اس کے پارلیمنٹری بورڈ کو اپنے اُمیدوار کو چھانٹنے میں انتہائی احتیاط سے کام لینا چاہئے اور جہاں تک ہوسکے کسی ایک فرقہ پرست یا بددیانت یا بدچلن آدمی کو کانگریس کا ٹکٹ نہیں دینا چاہئے۔

بزمِ بے تکلف (بہ سلسلۂ نمبر ۳)

قاسم رضوی کے عہد کا فصل زمانی طے* کرکے اپنے موجودہ وطن تک پہنچتے ہیں تو آپ میں کوئی اور سوال کرنے کی ہمت باقی نہیں رہتی اور آپ حیدرآباد والوں کی طرح "حاضر ہوتا ہوں" کہہ کر غائب ہوجاتے ہیں۔

مگر یہ تو سوچئے کہ جب خطیب صاحب کا خطبۂ نکاح پڑھا گیا ہوگا اور قاضی نے ان سے پوچھا ہوگا "مساۃ ——— بنت ——— کو بعوض ٭

٭ زرِ مہر سکۂ رائج الوقت آپ کے عقد میں دیا جاتا ہے۔ آپ کو منظور ہے؟ تو انھوں نے کیا جواب دیا ہوگا!

۴ - پاکستان

التوائے جنگ کا خیر مقدم

کشمیر کی جنگ کے التواء کا، پاکستان کے اخبارات نے عام طور پر خیر مقدم کیا ہے بعض اخبارات نے دبے لفظوں میں حکومت پاکستان پر تنقید کی ہے کہ اگر انہی شرطوں پر جن پر اب جنگ بند کرنے کا اعلان کیا گیا ہے صلح کرنی تھی تو اس سے بہت پہلے یہ صلح ہو جانی چاہئے تھی۔ بعض نے حکومت ہند کی نیت پر شبہ ظاہر کیا ہے، لیکن بیشتر اخبارات نے اس پر اطمینان اور خوشی ظاہر کی ہے۔ "پاکستان ٹائمز" نے اپنے اداریہ میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "کشمیر کی جنگ سے ہندوستان و پاکستان دونوں پر اقتصادی حیثیت سے بہت بڑا بوجھ تھا اور سیاسی نقطۂ نظر سے دونوں کے تعلقات دن بدن خراب سے خراب تر ہوتے جاتے تھے، اس لئے لازمی طور پر اس خبر سے دونوں ملکوں کے عوام کو خوشی اور اطمینان محسوس ہوا ہے۔" راولپنڈی کے ایک ہفتہ وار اخبار "بسنت" نے لکھا ہے:

"آخر وہ مبارک ساعت آپہنچی جبکہ ہندوستان اور پاکستان نے کشمیر کے مسئلے کو سلجھانے کے لئے پر امن وسائل اختیار کرکے ...... کشمیر میں لڑائی بند کر دی......

جنگ بند ہونے کی خبر سے دونوں ملکوں کے عوام کو بے پایاں خوشی ہوئی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہندوستان الٰہ آباد کے ایک عظیم الشان جلسے میں تقریر کر رہے تھے کہ آپ نے عوام کو کشمیر میں جنگ بند کرنے کی خبر سے مطلع کیا تو حاضرین نے بے پناہ خوشی کا مظاہرہ کیا۔ پاکستان میں بھی لڑائی بند ہونے کی خبر کو لوگوں نے خوشی سے سنا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کی لڑائی بعینہ ایسی ہی جیسے دو سگے بھائی دست و گریباں ہو جائیں جو کسی لحاظ سے بھی مستحسن نہیں ہے۔"

روزنامہ "مغربی پاکستان" لکھتا ہے:-

"ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں نے اقوام متحدہ کی حفاظتی کونسل کے حکم کا انتظار کئے بغیر باہمی رضامندی سے محاذ کشمیر کی تمام جنگی سرگرمیاں بند کر دیں، کیونکہ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ کشمیر کمیشن یا حفاظتی کونسل نے اس مسئلہ کو مصالحانہ طریق سے حل کرنے کے سلسلہ میں جو تجاویز وضع کی ہیں وہ منصفانہ ہیں اور فریقین انہیں آبرومندانہ طریق پر قبول کر سکتے ہیں۔ جہاں تک جنگی سرگرمیوں کے تعطل یعنی جنگ بند کر دینے کا تعلق ہے دنیا بھر میں اس خبر کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا اور کون ہے جو جنگ و جدال کی بندش کو برا کہنے کے لئے تیار ہو۔"

اس اخبار نے آگے چل کر لکھا ہے:

"اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پنڈت جواہر لال نہرو یو، این، او کے حلقوں سے اپنے اہم مطالبات منوانے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ پاکستان کو اپنی فوجیں باہر نکالنی پڑیں گی اور غیر ریاستی مجاہدین کو بھی ترغیب دینی ہوگی کہ وہ محاذ جنگ سے پیچھے ہٹ آئیں۔ لیکن ہندوستانی فوجوں کی ایک معین تعداد آخر دم تک ریاست میں موجود رہے گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کے مدبر یو، این، او کے حلقوں کو اس بات کا قائل نہیں بنا سکے کہ ریاست کے اندر ہندوستانی فوج اور ہندوستانی عناصر کی موجودگی بھی اسی طرح غیر آئینی ہے جس طرح پاکستان کی افواج اور غیر ریاستی مجاہدین کی موجودگی کو غیر آئینی سمجھا جا رہا ہے...... متعلقہ حلقوں کی طرف سے اس مطلب کی توقعات ظاہر کی جا رہی ہیں کہ کشمیر کی جنگ کا تعطل ہندوستان اور پاکستان کے باہمی تعلقات کو خوش گوار سے خوش گوار تر بنانے کے لئے سازگار فضا پیدا کر دے گا۔ ان توقعات کی کامیابی بہت کچھ اس نیت پر موقوف ہے جس کے ساتھ دونوں حکومتوں کے مدبر تعلقات کو بہتر بنانے کے لئے ساعی ہوں گے۔"

مشرقی بنگال میں انتقال اراضی

پچھلے سال کے شروع میں مشرقی بنگال کی اسمبلی میں ایک مسودہ قانون پیش کیا گیا تھا جس کا مقصد یہ ہے کہ ایک خاص حد کے اوپر جتنی "خاص" زمینیں ہیں۔ ان کو سرکاری طور پر حاصل کر کے کھیت مزدوروں اور کم زمین والے کسانوں میں تقسیم کر دیا جائے جب بڑے بڑے زمینداروں کو یقین ہو گیا کہ خاص زمینوں کا کافی حصہ ان کے ہاتھوں سے نکل جائے گا تو انھوں نے مقررہ حد سے اوپر کی زمینیں فروخت کرنی شروع کر دیں۔ یہ زمین وہ لوگ خریدنے لگے جن کے پاس تجارت اور دیگر ذرائع سے کافی روپے آتے ہیں یا وہ لوگ جن کی خاص زمینیں مقررہ حد سے کم ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جس وقت مجوزہ قانون منظور ہو کر نفاذ میں آئے گا اس وقت زرعی مزدوروں اور کم زمین والے کسانوں میں تقسیم کرنے کے لئے حکومت کے پاس بچنے سے بہت کم زمین ہوگی۔ گورنر مشرقی بنگال نے اب کہیں جا کر یعنی ۱۴ر دسمبر سے ایک آرڈیننس نافذ کیا ہے جس کی رو سے "خاص" زمینوں کی خرید و فروخت روک دی گئی ہے لیکن اس سے پہلے کافی زمینیں فروخت کی جا چکی ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت ایک اور آرڈیننس کے ذریعے ان تمام زمینوں کی خرید و فروخت کو ناجائز قرار دے دے جو پچھلے آٹھ نو ماہ میں بیچی گئی ہیں۔ ان زمینوں پر صرف کھیت مزدوروں اور کم زمین والے کسانوں کا حق ہے۔

بڑے بڑے زمینداروں نے حکومت کی مجوزہ اسکیم کو ناکام بنانے کے لئے اپنی خاص زمینیں فروخت کر دی ہیں۔ حکومت کا فرض ہے کہ ان کے خلاف اقدام کرے اور اس قسم کی تمام فروختوں کو ناجائز قرار دے دے۔ ورنہ وہ کھیت مزدوروں اور کم زمین والے کسانوں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے گی۔

روزنامہ نوائے وقت لاہور

تعلیم سے بے التفاتی

کسی ملک کی تعمیر کے لئے سب سے ضروری چیز اس کی آیندہ نسلوں کی تعلیم ہوتی ہے پاکستان کی بنیاد ایک نئے عقیدے اور نئے اصول کار پر رکھی گئی تھی۔ ضرورت تھی کہ اس عقیدے اور ان اصولوں کو لڑکوں اور لڑکیوں کے دل و دماغ میں سمونے کی کوشش کی جاتی تاکہ نئی قوم وجود میں آسکتی، اور پاکستان صحیح معنوں میں ایک نئی مملکت بن سکتا۔ کیونکہ جیسا کہ علامہ اقبال مرحوم نے فرمایا ہے:-

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

لیکن بدقسمتی سے اب تک ہمارے کارفرماؤں نے پاکستان کی تعلیم کی طرف مطلق توجہ نہیں کی۔ بس ایک آدھ کانفرنس ہو گئی ہے جس میں ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے بارے میں کوئی واضح پالیسی معین نہیں کی گئی اور نہ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اہل پاکستان کی آنے والی نسلوں کی ذہنی تربیت کن طریقوں پر کی جائے گی۔

اور تو اور تعلیمی مسائل کی طرف لوگوں کی عام دلچسپی بھی نہیں بڑھی، اور نہ اس سلسلے میں ذمہ دار اشخاص نے کوئی خاص کوشش ہی کی ہے، بلکہ نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ پہلے سے حالت زیادہ خراب ہو گئی ہے اور تعلیم کے مسئلے کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جا رہی ہے کراچی کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہاں تعلیمی درس گاہوں کو تجارتی کاروبار کی طرح چلایا جا رہا ہے، اور روپے والے نفع کی خاطر ان میں روپیہ لگاتے اور ان سے نفع کماتے ہیں اور حکومت کا یہ حال ہے کہ تمام سندھ میں صرف ایک ہی ٹریننگ کالج ہے اور اس میں طلبہ کی تعداد اتنی ہے کہ انھیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔

سنا ہے پشاور کا ٹریننگ کالج اس لئے توڑ دیا گیا ہے کہ وہاں ٹریننگ حاصل کرنے والے لڑکے نہیں تھے، اور مزید بدنصیبی کی بات یہ ہے کہ قوم کے نوجوان تعلیم کی طرف زیادہ راغب نہیں ہیں اور اس معزز پیشے میں ان کے لئے کوئی کشش نہیں رہی۔

جس ملک میں تعلیم کا یہ حال ہو، اور نوجوان معلمی کو اپنی شان سے گرا ہوا پیشہ سمجھتے ہوں، وہ ملک ترقی کر چکا، اور ان کی آیندہ نسلیں سنور چکیں۔ آج پاکستان کو سب سے زیادہ زور تعلیم پر دینا چاہیئے بلکہ سچ پوچھیے تو پاکستان کے بقا کا سارا دارومدار صحیح تعلیم پر ہے۔ تعلیم ہی وہ اساس ہے جس پر کسی ملک کی عمارت کو کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ خدانخواستہ اگر ہمارے کارفرماؤں نے تعلیم کے ساتھ اس طرح بے اعتنائی برتی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پاکستان ہمیشہ ایک پس ماندہ ملک رہے گا اور ہم مہذب اور ترقی یافتہ قوموں میں حقارت کی نظر سے دیکھے جائیں گے۔

ہفت روزہ آفاق، لاہور

مجلس قانون ساز کا التوا

پاکستان پارلیمنٹ کا اجلاس غیر معینہ مدت کے لئے ملتوی ہو گیا۔ اس مختصر سی مدت میں اس نے کئی اہم بل منظور کئے۔ ان میں کراچی میں مکانات کی راشن بندی اور چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی کے انسداد کے بل پر کافی گرما گرم مباحثے ہوئے۔ ایک بل کے ذریعے قانون کی توسیع و ترقی کا انتظام مرکزی حکومت کے سپرد کر دیا گیا اور فنانس کارپوریشن کے قیام کا بل اور اسٹیٹ ڈیٹی بل سلیکٹ کمیٹی کے سپرد کر دئے گئے۔

کراچی میں مکانات کی راشن بندی سے شہر کے ہر باشندے کو دلچسپی ہے اور اس کی طرف کراچی کے ایڈمنسٹریٹر مسٹر ہاشم رضا کئی ماہ قبل مبہم سا اشارہ کر چکے ہیں۔ یہ ابہام اب بھی قائم ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ

بقیہ صفحہ ۲۹۴ پر

۳ - باہر کی دنیا

مشرق وسطیٰ پر لڑائی کے بادل

فلسطین کے جنوبی علاقہ نقیب میں، مصری اور اسرائیلی حکومتوں میں عارضی صلح ہو جانے سے توقع پیدا ہوئی تھی کہ فلسطین کا مسئلہ شاید اب صلح و آشتی سے حل ہو جائے، مگر برطانیہ کے پانچ ہوائی جہازوں کو اسرائیلی حکومت نے گرا کر امن عالم کے لئے ایک نیا خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ برطانوی فوجیں حرکت میں آ چکی ہیں، اور فلسطین کی سرحد سے قریب شرق اردن کی بندرگاہ عقبہ میں ان کی لامعلوم تعداد موجود ہے، اور اسرائیلی علاقوں سے برطانوی باشندے منتقل کئے جا رہے ہیں۔ تل ابیب کی ایک اطلاع ہے کہ روس نے اسرائیلی حکومت کو فوجی امداد کی پیش کش کی ہے۔ غرض ایک بڑی جنگ کے تمام اسباب مہیا ہو گئے ہیں۔ اگر سیکورٹی کونسل نے فلسطین کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے کوئی فوری قدم نہ اٹھایا تو برطانیہ اور اسرائیل کے یہ اختلافات دور رس نتائج کے باعث ہوں گے۔

وفد پارٹی حکومت میں شریک ہوگی

مصر کی بڑھتی ہوئی دہشت پسندی اور فلسطین کی نئی صورت حال نے مصر کے رہنماؤں کو مجبور کیا کہ وہ آپس کے سیاسی اختلافات دور کر کے مصر میں مضبوط حکومت بنائیں۔ مصر کی سب سے بڑی سیاسی جماعت وفد پارٹی تقریباً پانچ سال سے وزارت میں شریک نہیں ہے اب اس نے بعض شرائط کے ساتھ حکومت میں شرکت کا وعدہ کر لیا ہے۔

وفد پارٹی کی مصر میں مقبولیت کے لحاظ سے تقریباً وہی حیثیت ہے جو کانگریس کی ہندوستان میں ہے۔ مصر کو جو کچھ بھی آزادی نصیب ہوئی ہے اس کے حصول میں وفد پارٹی کے رہنماؤں کا نمایاں اور ممتاز حصہ ہے۔ وفد پارٹی مصر کی سب سے زیادہ ترقی پسند اور سب سے بڑی عوامی جماعت ہے۔ اس کی شرکت کے بعد توقع ہے کہ مصر کی حکومت میں نئی جان اور نئی امنگ پیدا ہو جائے گی اور دہشت پسند عناصر کو دبا کر جہاں اندرونی امن و امان کے قیام میں سہولت پیدا ہوگی وہاں بین الاقوامی سیاست میں بھی ترقی پسندی کو راہ ملے گی۔ مشترک حکومت ہونے کی وجہ سے اگرچہ اس کی امید بہت کم ہے کہ وفد پارٹی کو اپنے ارادوں میں پوری پوری کامیابی ہوگی اور اس نے مصری قوم سے اب تک جو وعدے کئے ہیں انھیں پورا کر سکے گی۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ اس کے رہنما نحاس پاشا کے تعاون سے مصر کو بہت کافی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ امید ہے کہ نحاس پاشا نے جس طرح لڑائی کے زمانے میں مصر کی کشتی کی ناخدائی کی تھی اسی طرح آج بھی، جب کہ مصر کی کشتی طوفانی موجوں میں گھری ہوئی ہے۔ ساحل مراد تک پہنچانے میں کامیاب ہوں گے۔

سُرخ چین کی خارجی پالیسی

چیانگ کائی شیک مصالحت کے لئے کئی مرتبہ خواہش ظاہر کر چکے ہیں یہاں تک کہ ملک اور قوم کے مفاد کی خاطر، اس "بڑھاپے میں تیاگ" کے لئے بھی تیار ہو گئے ہیں، مگر کمیونسٹ ہیں کہ ان کی ان "قربانیوں" سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوتے اور برابر آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ سنا ہے کہ جنرل سیمو اب بوریا بستر باندھ کر فارموسا بھاگنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ نیشنلسٹ حلقوں کو موہوم سی امید ہے کہ ان کے چلے جانے کے بعد وزیر اعظم سن فو کو شاید سمجھوتے کی کوششوں میں کامیابی ہو۔ حالانکہ کمیونسٹ ریڈیو نے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ ایسی حالت میں جبکہ انقلاب کو کامیابی نصیب ہو رہی ہے کسی قسم کا سمجھوتہ کرنا چینی عوام کو دھوکہ دینا ہے اور چین کے رجعت پسندوں اور امریکہ کے سامراج پرستوں کو تقویت پہنچانا ہے۔ ظاہر ہے اس جواب کے بعد مصالحت کی امید کرنا سادہ لوحی سے زیادہ کچھ نہیں۔

چنانچہ سیاسی حلقوں میں یہ فرض کر کے کہ سمجھوتہ کا اب کوئی امکان باقی نہیں رہا چین کی سیاست کا اس نقطہ نظر سے جائزہ لیا جا رہا ہے کہ کمیونسٹ حکومت قائم ہونے کے بعد وہاں کے سیاسی رجحانات کس قسم کے ہوں گے؟ آیا نئی حکومت مکمل طور پر روس کے اثر میں ہوگی یا مارشل ٹیٹو کی حکومت کی طرح، چین کے قومی مفاد کو سامنے رکھ کر آزاد پالیسی پر کاربند ہوگی۔

بیشتر لوگوں کا خیال ہے کہ چینی کمیونسٹ کومن فارم کے زیر اثر ہیں اور شمالی یا چوریا کا گروپ اپنی جغرافیائی پوزیشن کی وجہ سے، روس کی قیادت اور پالیسی کے ماتحت ہوگا مگر کچھ بین اقوامی سیاست کے جانکار ایسے بھی ہیں جو اس خیال سے متفق نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ چین کے قومی مسائل کمیونسٹوں کو مجبور کریں گے کہ وہ روسی رہنمائی سے انکار کر کے، مشرق بعید کی قیادت خود اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ وہ اس کی حمایت میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اگرچہ چین میں کمیونسٹ پارٹی کو عظیم الشان کامیابی حاصل ہوئی ہے، مگر عوام کی بھاری اکثریت کمیونزم کے اصول اور نظریوں سے ناواقف ہے، اسے روس سے بھی کوئی گہری عقیدت نہیں۔ انھوں نے کومن تانگ کی سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ ذہنیت، حکومت کی نااہلی چور بازاری کی کثرت اور گرانی کی زیادتی سے اکتا کر کمیونسٹ پارٹی کا ساتھ دیا ہے۔ اس لئے کوئی ضروری نہیں کہ وہ روس کی ماتحتی بھی قبول کر لیں۔ نیز کمیونسٹوں نے اپنے مفتوحہ علاقوں میں جس طرح بیرونی سرمایہ کی حفاظت کی ہے اس کے پیش نظر بھی یہ خیال بعید از قیاس نہیں کہ سُرخ چین اپنی قومی اور بین اقوامی سیاست میں آزاد پالیسی پر کاربند ہوگا۔

پاکستان

بسلسلہ صفحہ

...راشن بندی کس اصول کے تحت ہوگی، نتیجہ یہ ہے کہ عوام میں راشن بندی سے ہمدردی کے ساتھ ہی خوف بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن بڑے بڑے فلیٹ اور حویلیوں کے رہنے والوں میں خوف کا یہ منظر خاص طور پر قابل دید ہے لیکن سچ پوچھئے تو دولت مندوں کا یہ خوف بالکل بے بنیاد ہے۔ انھوں نے جس طرح پگڑیاں دے دے کر مکانوں پر قبضہ کیا ہے اسی طرح وہ حکومت کراچی کی بد انتظامی اور اس کے عملے کی خود غرضی اور رشوت پرستی سے فائدہ اٹھا کر ان پر بلا شرکت غیرے قابض بھی رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ اس قانون سے اگر کسی پر ضرب پڑے گی تو وہ دوسرے ہی ہوں گے۔

پاکستان کی مجلس قانون ساز کے اجلاس کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ پہلے اجلاس کے بعد کسی اجلاس میں تمام ممبروں نے شرکت نہیں کی اور بعض اوقات تو ۲۰، ۵۰، ۷۰ سے زیادہ حضرات لبیک کہنے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے نمائندے مجلس قانون ساز اور مجلس دستور ساز کے اجلاس کو سیر و تفریح کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ نہ ان کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہے اور نہ ملکی اصلاح سے ان کو دلچسپی ہے۔ (آفاق لاہور)

تابش سہیل

اقبال احمد سہیل

ہوا اُن کے پرتوِ عارض سے اب یہ حال نظر
کہ وہ بھی محو ہوئے دیکھ کر جمالِ نظر

نظر ہی رہ گئی کیا ہو احتمالِ نظر
وہ خود سما گئے آنکھوں میں اب مثالِ نظر

وہ حسن ہے ہمہ تن آپ ہی سوالِ نظر
نہیں تو عشق کہاں اور کہاں مجالِ نظر

بس اک نظر نے یہ ساری قیامتیں ڈھا دیں
نظر کو ہائے اب آیا نظر مآلِ نظر

ہے ایک ذرۂ ناچیز مہر در آغوش
کمالِ جلوہ کہوں اس کو یا کمالِ نظر

تمہارے جلوۂ رنگیں کی سب ہیں تعبیریں
بہارِ جاں، چمنِ آرزو، جمالِ نظر

ستم یہ اور ستم حسن کی پشیمانی
نظر نے بڑھ کے کیا کیا دور انفعالِ نظر

مجھے تو دہر کی ہر شے حسیں نظر آئی
عمومِ حسن ہے یا پرتوِ جمالِ نظر

دیارِ حسن میں لفظوں کا انتظار ہے جرم
یہاں تو فرضِ محبت ہے امتثالِ نظر

وہ میری عرضِ تمنا پہ چینِ پیشانی
وہ میرے شکوۂ ہجراں پہ انفعالِ نظر

وہ اس جبیں کے تبسم پہ بیقراریِ شوق
وہ اس نگاہ کے ترنم پہ وجد و حالِ نظر

حریمِ راز کا ہر گوشہ چھان ڈالا ہے
جنونِ شوق میں اللہ رے کمالِ نظر

بس اک نگاہ کے بعد آج تک یہ عالم ہے
نظر تو کیا کبھی آیا نہیں خیالِ نظر

تمہارے خاک نشینوں کی شان کیا کہنا
فلک بھی کانپ اٹھے دیکھ کر جلالِ نظر

حیا کے ساتھ ہو شوخی، ادب کے ساتھ ہو شوق
کمالِ حسن و محبت ہے اعتدالِ نظر

انھیں کا فیضِ نظر ہے سر زمینِ غم میں
کہیں جمالِ نظر ہے کہیں جلالِ نظر

حجابِ قدس تک اب تو ترا گذر ہے سہیل
خدا نظر سے بچائے یہ زور بالِ نظر

ابھی تو تندیِ طوفاں

خلیل الرحمٰن اعظمی

ابھی غموں میں نمایاں ہے زندگی کا فریب
ابھی تو راہ میں حائل ہے ایک پردۂ رنگ
مگر یہ منزلِ جاناں، ہوائے وادیِ شوق
سکوت میں ہے لئے آج اک نیا آہنگ

دھوئیں کی گود میں سوتا ہے اب بھی رقصِ شباب
ہوس نے سازِ جوانی پہ گیت گائے ہیں
دعائے نیم شبی ہے یہ طلسم آہوں کا
ابھی تو ذہن پہ تاریکیوں کے سائے ہیں

فروغِ حسن، یہ صہبائے آتشیں کا گداز
ضیائے ماہ میں اب بھی نزولِ شبنم ہے
اگرچہ بدنی ہے گیسوؤں کی آرائش
مگر ابھی تو مری کائنات برہم ہے

مسرتوں کو نیا آئینہ دکھانا ہے
ابھی جہاں میں لہو کے چراغ جلنے دو
ان آنسوؤں ہی سے نکھرے گی شاہراہِ حیات
ابھی تو تند ہے طوفاں مجھے سنبھلنے دو

غزل

باقر مہدی

میکدے پر خون برساتی گھٹائیں چھا گئیں
زندگانی کی بہاروں کو نہ جانے کیا ہوا؟

درد و غم بھولے ہوئے شام و سحر [illegible]
آج تیرے غم [illegible] دوں کو نہ جانے [illegible]؟

کوئی شمع نو تمنا کے [illegible] کیا [illegible]
حسن کے رنگیں شراروں کو نہ جانے کیا ہوا؟

کوئی طوفاں بھی نہیں، کوئی تلاطم بھی نہیں
اپنے شوریدہ کناروں کو نہ جانے کیا ہوا؟

اک خلا ہی اور ہجومِ یاس کا عالم بھی ہے
اب جنوں کے ریگزاروں کو نہ جانے کیا ہوا؟

عشق کی پلکوں پہ خونِ دل لرزتا ہے ابھی
ٹوٹنے والے ستاروں کو نہ جانے کیا ہوا؟

اُردو ادب کی رفتار

جون تا ستمبر ۱۹۴۸ء

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

نقاد کا ایک قدم ادیب کے حجرے کے اندر ہوتا ہے، تو دوسرا اس کے باہر۔ ایک طرف وہ بیرونی ہواؤں کے رُخ کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے تو دوسری طرف اس ریشم کے کیڑے کی کشیدہ کاری کو بھی گوشۂ چشم سے دیکھتا جاتا ہے۔

ظاہر ہے تین مہینے کے مختصر عرصے میں کوئی نامحرم کیا بتا سکتا ہے کہ اس ریشم کے کیڑے پر کیا گذری، وہ تو اس کی ادبی تخلیق کے سہارے صرف اس قدر اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس کے ذہن کی کون سی چنگاریاں کن ہواؤں سے دہک اٹھیں اور کن سے کجلا گئیں۔

اس سہ ماہی میں سیاسی رہنماؤں کی تیز گامی کا ہر ادیب کو احساس رہا۔ قتیل شفائی کی چبھتی بات "یہی کفن اوڑھ لو!" ہمارے شاعروں کا عام جذبہ رہا ہے۔ ہزاروں انسانوں کو جلا وطنی، خانماں بربادی جو ابتدا میں گرم چوٹ کی طرح معمولی معلوم ہوتی تھی، سرد ہو کر ٹیس پیدا کرنے لگی ہے۔ پنجاب، بمبئی اور مخمل و کمخواب کے افسانے بننے کی بجائے اب مہاجرین کی ہجرت کی سچی کہانیاں بنتی جا رہی ہیں۔ ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کی پکاروں سے سینۂ ہل کے سونے والے چونک پڑے ہیں۔ سیاسی داؤں پیچ سے ہر صاحبِ دل متنفر ہے۔ شاعر پوچھتا ہے ع

مسعود باغِ ہند میں کیا آگئی بہار
ہم سے تو اس بہار میں گایا نہ جائے گا

رنگینئ غم، سلگتے آنسو، بھیگی پلکیں، ڈوبتی اُمنگیں اور ٹھنڈی چوٹیں شاعری کا موضوع بنی ہوئی ہیں، اسی ماحول میں ہمارا ادیب اور شاعر سانس لے رہا ہے۔ اسی کے خام مواد سے اپنے فن کی واردات انگیز کر رہا ہے۔ ادھر حوادث کے پہیوں کی رفتار تیز تر ہوتی جا رہی ہے، اور اس کی اُڑائی ہوئی دھول میں لپٹا ہوا شاعر ذروں میں آفتاب و ماہتاب ڈھونڈھ رہا ہے۔ زخم کو خندہ اور چوٹ کو مسکراہٹ میں تبدیل کر رہا ہے۔ زندگی کی راہیں اُلجھتی جا رہی ہیں، لیکن شاعر اُمید کے سہارے انھیں برابر سلجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ شاعری کے حق میں بس یہی ایک امید افزا بات ہے کہ جب دنیا پر گرد و غبار چھا جاتا ہے اور انسانی معاملات کو سلجھانے والے دیدہ ور تک بات کہنے لگتے ہیں تو اس وقت بھی چشمِ شاعر دھندلکے میں ستاروں کو ڈھونڈھتی ہے!

اردو کا شاعر پچھلے چند مہینوں میں سیاسی رستاخیز میں اپنے اس منصب سے بے خبر نہیں رہا اور بلا تفریق مذہب و ملت اس نے ہمیشہ خدا لگتی بات کہی۔ خالص سیاسی نقطۂ نظر سے بھی جس توازن اور ٹھیراؤ کا ثبوت ہمارے ادیبوں نے دیا ہے۔ اس سے سیاست داں بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اس سہ ماہی میں مجموعی اعتبار سے ادبی تخلیقات کی تعداد پچھلے سہ ماہی سے سوا رہی ہے۔ افسانہ کسی قدر کم اور شعر زیادہ مقبول رہا ہے۔ واقعہ سخت ہوتا ہے تو شعر ہی کام بھی آتا ہے۔ چیخ ہی نغمہ بن جاتی ہے۔ ان تین مہینوں میں خالص عشقیہ غزل کسی لائقِ اعتنا نوجوان شاعر کی نہیں دکھائی دی۔ پرانوں نے بھی لالہ و گل کے پردوں میں نہ جانے کیا کیا گل افشانیاں کی ہیں۔ اثر لکھنوی تک کی غزلوں سے دشنہ و خنجر اُٹھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لکھنوی غزل گو شمشیر ہاتھ میں لے لیں تو بڑی بات ہے۔ حضرت جگر کی "فکرِ جمیل" بھی آج کل "خوابِ پریشاں" بنی ہوئی ہے ع

یہ مرحلہ بھی مری حیرتوں نے دیکھ لیا
بہار میرے لئے اور میں تہی دامن!

آپ نے دیکھا تہی دامنی کا یہ احساس کس کس رنگ میں ہمیں ستا تا رہا ہے۔ اس کی تفصیل آپ کو ان نوجوان شعرا کے کلام میں مل جائے گی جو آپ کے دامن کو بھر دینا چاہتے ہیں۔ جنھوں نے جمال اور زندگی کا توازن عصرِ جدید کے نئے مذہب اشتراکیت میں ڈھونڈھا ہے۔ میری مراد مخدوم، فیض، علی سردار، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی اور تاباں فتح گڑھی سے ہے۔ مخدوم کبھی کے نیتاگیری کر شاعری سے کنارہ کش ہو چکے ہیں۔ فیض اشتراکیت کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔ اس کی دلکش شاعرانہ شخصیت کا یہ عجیب انداز محبوبی ہے کہ ہر ادبی ٹولی انھیں اپنا سمجھتی ہے۔ لیکن وہ کسی ایک کا نہیں بنتا۔ علی سردار، ساحر، کیفی اعظمی اور تاباں نے البتہ خود کو ایک خاص تحریک کے حوالے کر دیا ہے اس میں تاباں اور کیفی اس کے کشتہ بن کر رہ گئے۔ علی سردار اور ساحر کے یہاں البتہ خونِ جگر ملتا ہے۔ اس سہ ماہی میں اس ٹولی کی سب سے کامیاب نظم علی سردار کی "خون کی لکیر" ہے۔ علی سردار کی شاعری میں زیر و بم، سیاسی واقعات کے مد و جزر کے ساتھ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ وہ دبا دبا کام کرتے ہیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ اشتراکی رندوں میں سب سے بڑا رند یہی شخص ہے۔ وہ پچھلے چند سال میں اپنے ساتھیوں سے کئی زینے اوپر چڑھ چکا ہے۔

سیاسی واقعات کے ان تھپیڑوں سے ہمارے افسانہ نگار بھی غافل نہیں رہے۔ شاعری بہ نسبت افسانہ نگار کا میدان زیادہ وسیع اور اس کا مواد کثیر ذرائع سے فراہم ہوتا ہے۔ اسے فرصتِ کار بھی زیادہ حاصل ہوتی ہے اس سہ ماہی میں کرشن چندر، احمد عباس، عصمت اور اشک سبھی نے کچھ نہ کچھ لکھا۔ کرشن چندر کے یہاں طنز کا عنصر برابر بڑھ رہا ہے۔ احمد عباس اور اشک کی فن کارانہ صلاحیتوں میں حیرت انگیز پستی ہوئی ہے بحیثیت مجموعی اس سہ ماہی کے افسانے کی روح طنز ہی ہے جو موجودہ بے عقیدہ دور میں طنز کے لئے جس قدر یاس کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی ان میں موجود ہے۔

اس دوران میں بے شمار رسائل نے ۱۵ اگست کو آزادی نمبر بھی نکالے۔ ادبی اعتبار سے یہ زیادہ قابلِ اعتنا نہیں۔ ادب حادثات اور لمحات سے بحث نہیں کرتا۔ وہ تو محض لمحات جاودانی کو اپنی پلکیوں میں پکڑ لیتا ہے۔ اگر یہ صورت ظہور میں نہ آئے تو وہ صحافت کے چھپاؤ روپ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

صحافتی دنیا میں یہ واقعہ اہم ہے کہ پچھلے دنوں جوش ملیح آبادی نے آج کل کے مدیر کی حیثیت سے پاکستان کی اگست کے شمارہ میں تین گواہوں کے دستخطوں کے ساتھ اس رسالے کے بارے میں یہ اعلان کیا ہے "اگر میں آج کل کے باب میں بڑی بڑی اُمیدیں نہ دلاؤں اور بلند آہنگی کے ساتھ بڑے بڑے دعوے نہ کروں تو معذور سمجھ کر مجھے معاف فرمایا جائے۔"

میرے خیال میں اس قسم کے اعتذار کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ ہر شخص جانتا ہے کہ آجکل یا ماہ نو جیسے نیم ادبی رسائل سے ہم اور زیادہ توقع بھی نہیں کر سکتے، تاہم آجکل کے لئے جوش کا ورود اُن کے "ورودِ جاناں" سے کم نہیں۔

اسی سہ ماہی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے ماہنامے نیا ادب نے بمبئی سے دوسرا جنم لیا ہے۔ اس کے نکلتے ہی ہمارے ادبی اکھاڑے میں پھر جان سی پڑ گئی ہے، اور اس نے حسبِ معمول اپنے اداریہ میں رجعت پسند ادیبوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی ہے۔ یہ چھیڑ چھاڑ اردو ادب کے لئے عبرت آموز بھی ہے اور عبرت ناک بھی۔ عام طور سے اس قسم کے مسائل جو نیا ادب یا نظام کے پرچوں میں مسلسل نکل رہے ہیں، خالص علمی نقطۂ نظر سے گمراہ کن ہیں، دشنام طرازی ہی علمی سطح پر جا کر استدلال میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ان کا استدلال بھی دشنام سے مملو ہوتا ہے۔ اس کا ایک نہایت مذموم اثر یہ ہوا ہے، کہ ترقی پسندی اور رجعت پسندی کے مباحث اپنی تمام عفونت کے ساتھ پھر مہک اٹھے ہیں، دونوں گروہوں کے پہلوانوں کے پیچھے بڑھاوا دینے والے چھٹ بھیوں کے دل کے دل ہیں۔ کبھی نعرہ لگتا ہے کہ ادیب کے لئے کسی حد تک فاشسٹ ہونا ضروری ہے۔ تو کوئی دوسرے کے خیالات کو لایعنی، بے ہودہ سڑے ہوئے اور انحطاط پذیر (یہ الفاظ نیا ادب کے اداریہ سے لئے گئے ہیں) کہتا ہے۔ اشتراکی ادیبوں پر ایک اضطراری کیفیت طاری ہے۔ دوسری طرف غیر اشتراکی ایک انقباضی کیفیت میں اینٹھے پڑے ہیں۔ اس ادبی گروہ بندی نے ہمارے تنقیدی نقطۂ نظر کو بری طرح مجروح کیا ہے۔ عام رجحان بت شکنی کی طرف ہے یا پھر برادرانہ تنقید ہوتی ہے جس میں انجمن ستائش باہمی کا سا انداز دکھائی دیتا ہے۔ ادب میں بت شکنی کی ضرورت کو میں بھی محسوس کرتا ہوں اس لئے نہیں کہ میں زہرِ طنز کا شکار ہو گیا ہوں، بلکہ اس وجہ سے کہ ہمارے ادب میں بہت کچھ کرا ہے، جسے پھٹکنا اور چھاننا ہے۔ حلقۂ یاراں پر پیار بھری تنقید یا اپنے سے انصاف کرنا بہت آسان ہوتا ہے، لیکن کسی کی عظمت کو ناپنے کے لئے خود کو بن جانا بہت مشکل بات ہے

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

روزہ دار

سخی حسن نقوی

"دار" لفظ نہیں بہروپیہ ہے جو مختلف خاصیتیں رکھتا ہے اور نت نئے رنگ بدلتا رہتا ہے۔ ایک وہ "دار" جو اکیلا رہنے کا عادی ہے اور تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ انا الحق کا دعوے دار اسی دار پر چڑھایا گیا تھا۔ دوسرے وہ "دار" جو ساتھیوں کی جلو میں چلنا پسند کرتا ہے۔ یہ عربی الاصل ہے۔ دارالامن اور دارالعلوم کو اس نے اپنا گھر بنا لیا ہے۔ ایک ہندوستانی "دار" جو عربی "داروں" سے مختلف ہے۔ ہندوستان آکر اس کی عادتیں اور مزاج سب بدل گئے۔ نئے نئے ساتھی ملے اور نیا نیا ماحول۔ ہندوستانی تو بن گیا مگر کسی سے دب کر نہیں رہا۔ وطن میں ساتھیوں کے پیچھے پیچھے چلنے کا عادی تھا، یہاں آکر اکڑ کر چلنے لگا، اور ساتھیوں کو پیچھے دھکیل کر آگے بڑھ گیا۔ یہ خود اس کا زور تھا یا ساتھیوں کا کھوکھلا پن؟ اس کی گواہی تھانہ دار پہرہ دار دیں گے۔ نسلی اعتبار سے روزہ دار بھی انھیں کا بھائی بند ہے۔ لیکن قومیت کے لحاظ سے اس کی شان انفرادی حیثیت رکھتی ہے ہندوستانی "... داروں" اور ہندوستانی روزہ داروں میں عام خاص مطلق کی نسبت ہے۔ مثال کے طور پر تھانہ دار اور پہرہ دار کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ روزہ رکھیں۔ البتہ ہر روزہ دار بیک وقت پہرہ دار، تھانہ دار وہ سب کچھ ہو سکتا ہے جس میں لفظ پیچھے اور "دار" آگے ہو۔

سال گذشتہ کی مردم شماری کی رو سے ویسے تو ہندوستان کی ۲۵ فی صدی آبادی پر روزہ فرض کیا گیا تھا لیکن بدقسمتی سے اس میں سے رکھنے والوں کی تعداد گھٹ کر کوئی ۵ فی صدی یا اس سے بھی کم رہ گئی ہے۔ گویا باقی لوگوں پر روزہ معاف ہے۔ اگر معاف کیا نہیں گیا ہے تو انھوں نے خود معاف کر لیا ہے۔ بہرحال روزہ داروں کی تعداد میں روز بروز کمی آتی جا رہی ہے۔ اس کے کئی سبب ہیں۔ گرمی کا موسم، چلچلاتی دھوپ، پہاڑ جیسا دن، تن بدن میں آگ، چوٹی سے ایڑی تک پسینہ، پیاس کی شدت، اور نہ جانے کیا کیا۔ اس کے علاوہ رمضان میں بہت سی متعدی قسم کی بیماریاں پھیلنے لگتی ہیں۔ نزلہ زکام اور کھانسی تو خیر عام ہو جاتے ہیں، لیکن بعضوں کو درد سر اور درد گردہ کی شکایت بھی ہونے لگتی ہے کچھ لوگ عذر کرتے ہیں، روزے رکھے وہ جس کے پاس دودھ گھی کھانے کو پیسے ہوں کسی پر روزہ اس لئے معاف رہتا ہے کہ اس کے پاس ٹائم پیس نہیں جس کی مدد سے وہ سحر کو اٹھ سکے، لیکن علم لدنی رکھنے والے کہتے ہیں کہ ان تمام باتوں کی جڑ ایمان کی کمزوری ہے۔

جس طرح روزہ دار کے حروف ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ اسی طرح قسم کے اعتبار سے تمام روزہ دار ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ بعض روزہ دار عادتاً صرف روزہ دار ہوتے ہیں نمازی نہیں ہوتے ان کا کہنا ہے کہ روزہ اور نماز علیحدہ علیحدہ عبادتیں ہیں۔ روزہ کی حالت میں نماز پڑھنے سے روزہ بہلا رہتا ہے۔ لیکن بعض کی رائے میں نماز نہ پڑھنے سے روزہ ٹوٹتا نہیں البتہ جھوجھرا ضرور ہو جاتا ہے۔ کچھ روزہ دار "خاموشی زر ہے" کے اصول پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں تو کچھ "گویائی سیم ہے" کو نصب العین قرار دیتے ہیں بعض روزہ نہیں رکھتے، البتہ اوروں کے بندوں پر احسان کرتے ہیں۔ مزاج کے خلاف ذرا ذرا سی بات پر گھر والوں اور اڑوس پڑوس سے جھگڑا مول لینے کے لئے تیار رہتے ہیں اور بہت سے تو ریل گاڑی کے اس زریں اصول کو بھول بیٹھتے ہیں جس میں بالخصوص مسافروں کو اور بالعموم ہر شخص کو "اور اس میں روزہ دار کا بھی کوئی استثنا نہیں" یہ ہدایت کی گئی ہے "تھوکو مت اس سے بیماری پھیلتی ہے"۔

رمضان کی صبح عید کی شام کی طرح بے رونق اور اداس ہوتی ہے۔ رمضان کا دن رات میں، اور رات دن میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ روزہ دار، دن میں سونا اور رات میں جاگنا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن اصل میں وہ دن میں بھی سوتے نہیں سونے کا نام کرتے ہیں ان کے لئے خواب و بیداری ہم معنی بن جاتی ہیں۔ روزہ داروں کے سونے، اونگھنے یا جاگنے کی حالت میں روزہ خوروں کا فرض رہتا ہے کہ خود نہ سوئیں بلکہ روزہ داروں کو سلائیں یا دوسرے لفظوں میں کوے ہانکیں۔

البتہ رمضان کی شام اور عید کی صبح، رمضان کی صبح اور عید کی شام کا جواب ہوتی ہیں۔ عید کی صبح "صبح اودھ" کی طرح شگفتہ اور رمضان کی شام "شام بنارس" مانند پر کیف و پر بہار ہوتی ہے۔ رمضان میں شام کو روزہ دار طرح طرح کی افطاریاں کھاتے ہیں اور عید کی صبح کو نہا دھو کر نئے نئے کپڑے پہنتے ہیں، لیکن روزہ خور ان تمام نعمتوں سے محروم رہتے ہیں۔ وہ روزہ داروں کا منہ تکتے ہیں، خون جگر پیتے ہیں اور روزہ کھاتے ہیں۔

کھانے پینے کے معاملے میں روزہ دار عام طور پر نیت خراب ہو جاتے ہیں۔ افطار سے قبل روزہ داروں کی بدحواسی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ کھانے پر گریں گے تو تین دن کی غذا پیٹ میں ڈال لیں گے۔ پینے پر آئیں گے تو پیٹ کو مشکا بنا لیں گے اور رات بھر ڈکاریں لیا کریں گے۔ حقہ کے شوقین اس زور سے سلفہ کھینچیں گے کہ حقہ کے نشتوں پر دود آتش کے گھونٹوں کا شبہ ہونے لگے گا۔

روزہ داروں کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ بہت سے روزہ داروں کے ساتھ بیٹھ کر روزہ کھولنا پسند کرتے ہیں۔ اور جب بہت سے روزہ دار ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو آپس میں اس قسم کی بات چیت کرنے لگتے ہیں۔ ایک کہتا ہے "اف وہ! کس قدر سخت گرمی ہے"۔ دوسرا گویا ہوتا ہے "آج پیاس زیادہ رہی"۔ تیسرا ٹانگ اڑاتا ہے "آج کا روزہ سخت گذرا"۔ چوتھا رائے دیتا ہے "بارش کی سخت ضرورت ہے"۔ رند مشرب بول اٹھتا ہے "اگر یہی لیل و نہار ہیں تو بندہ کا کل سے استعفا"۔ مولوی صاحب فرماتے ہیں "کفر کفر! روزہ فرض ہے"۔

اس گھر سے بچنا چاہئے جس میں میاں بیوی دونوں روزہ سے ہوں۔ ذرا سی بات میں سارے محلہ کو سر پر اٹھا لیں۔ آن کی آن میں گھر کی چہار دیواری کو پانی پت کا میدان بنا دیں۔ معمولی سی شکایت پر میاں بیوی کے دل "ڈکیو اور سین فرانسسکو" کی دوری اختیار کر لیں ایک دوسرا منظر ملاحظہ ہو۔ بیوی کی آنکھیں سوجی ہیں، میاں کا منہ پھولا ہے۔ ایک طرف بیوی جلی ہوئی لکڑی بنی پلنگ پر پڑی ہیں دوسری طرف میاں جلا ہوا حقہ بنے کونے میں کھڑے ہیں۔ یا پھر، بیوی میکے جانے کی تیاری میں مصروف ہیں اور میاں پردیس بھاگنے کے لئے بستر باندھنے میں مشغول ہیں۔ لیکن یاد رکھئے جانے والا دونوں میں سے ایک بھی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے دونوں گھر چھوڑ دیں اور میاں محلہ والوں اور بی بی پڑوسنوں سے لڑنے کے لئے نکل جائیں۔ لیکن افطار تک روٹھے ہوئے ... من جائیں گے۔ نہ بی بی میکہ جائے گی نہ میاں پردیس کیسے اور کیوں کر منیں گے یہ میاں جانیں یا بی بی۔

روزہ داروں کی طرح روزہ کی بھی قسمیں ہیں۔ ایک روزہ ایک ڈاڑھ کا ہوتا ہے۔ اس میں دوسری ڈاڑھ سے کھانے پینے کی اجازت ہوتی ہے۔ اسے اکثر بچے رکھتے ہیں یا وہ بوڑھے اور جوان رکھتے ہیں جو ظاہر میں روزہ دار اور اصل میں روزہ خور ہوں، وہ بھی روزہ ہی ہوتا ہے جس سے ملکوں کو آزادی مل جاتی ہے۔ جیل جانے والے ستیہ گرہی اسے "مرن برت" کہتے ہیں۔ اس میں اور عام روزہ میں یہ فرق ہے کہ اس کا رکھنے والا عرف عام میں روزہ دار نہیں "لیڈر" کہلاتا ہے۔

جانکار لوگ کہتے ہیں روزہ مفید ہے۔ جس طرح سال کے سال مشینوں کی صفائی کی جاتی ہے اور تیل دیا جاتا ہے اسی طرح جسم انسانی کی مشین کو جہاد بالنفس کے ذریعے صاف کیا جاتا ہے اور روحانیت کا تیل دیا جاتا ہے۔ ممکن ہے اس قول میں سچائی کا بھی کوئی پہلو ہو، لیکن روزہ دار کا تجربہ بہرحال اس کے خلاف ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ روزہ دار کسی کام کا نہیں رہتا۔ اس سے بیٹھنے کو کہئے کھڑا ہو جائے گا ہنسانے کی کوشش کیجئے رو دے گا۔ کام لیجئے سو جائے گا بات کیجئے پھاڑ کھائے گا۔ اس کا قول تو یہ ہے کہ روزہ میں نیند اڑ جاتی ہے۔ عقل گم ہو جاتی ہے۔ معدہ سڑ جاتا ہے، وزن گھٹ جاتا ہے۔ وہ روزہ کی افادیت پر ایمان نہیں رکھتا اس کے نزدیک روزہ ... وہ روزہ رکھ کر کسی پر احسان نہیں کرتا اپنا ... کرتا ہے۔ وہ عبادت برائے عبادت کا قائل ہے۔ ... برائے جنت کا نہیں۔

تصحیح پچھلی اشاعت میں صفحہ ۰ پر مولانا حسرت موہانی کی غزل میں چند غلطیاں رہ گئی ہیں۔ ہم مولانا سے معذرت خواہ ہیں۔ صحیح شعر درج کئے جاتے ہیں، ناظرین ٹھیک کر لیں۔

ہر دل میں ہے خواہش تری ہر سر میں ہے سودا ترا
آئینہ دارِ عشق ہے، خود حسن بے ہمتا ترا
معذور ہے تابِ نظر، مجبور ہیں اہل بصر
مستور حق ہے سر بسر، اے نورِ جاں جلوا ترا
تیری جفا بھی ہے وفا، منظور اربابِ صفا
یعنی بہ فتوئے رضا جائز نہیں شکوا ترا

اندھی بچی (۱)

صالحہ عابد حسین

نذیر بڑا اچھا باورچی تھا۔ اسے ہندوستانی، انگریزی دونوں طرح کے کھانے پکانے آتے تھے۔ اس کے ہاتھ کا کھانا جس کے منہ کو ایک مرتبہ لگ گیا پھر کسی دوسرے کا پکایا ہوا کھانا اُس کے لئے بالکل پھیکا اور بے مزہ ہو جاتا تھا۔ مگر نذیر کا مزاج بہت نازک تھا، کسی کی کڑوی بات یا ٹیڑھی نظر وہ بالکل برداشت نہیں کر سکتا تھا، فوراً اپنا بوریا بستر باندھا اپنا حساب لیا چلتا بنتا۔ پھر چاہے کوئی کتنا ہی سمجھائے وہ کسی کی ایک نہ سنتا تھا۔ اسی لئے ہمیشہ اس کے مالک سب گھر والوں کو منع کرتے رہا کرتے تھے کہ دیکھو نذیر کو کچھ نہ کہنا۔ آپ جانئے زبان کا مزہ بڑی چیز ہے، انسان شاید اپنے پیٹ سے بھی زیادہ اپنی زبان کے ہاتھوں بے بس ہو جاتا ہے۔

جب نذیر کی پہلی شادی ہوئی تو وہ تیرہ چودہ برس کا کم عمر چھوکرا تھا۔ اور اس کی بیوی مشکل سے سات آٹھ سال کی بچی ہوگی۔ دونوں ہر وقت ساتھ کھیلا کرتے تھے اور آپس میں مار پیٹ روٹھنا، منانا ہوتا رہتا۔ نذیر کی بیوی راجو بڑی بھولی صورت کی بچی تھی اور جوان ہو کر تو ایسی خوب صورت نکلی کہ جو دیکھتا، دیکھتا کا دیکھتا رہ جاتا، اور نذیر تو دل و جان سے اس پر فدا تھا۔

نذیر کا باپ بھی باورچی تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو اپنا سورتی فن بڑی محنت سے سکھایا اور بیس اکیس سال کی عمر میں اُسے کھانے پکانے میں ماہر کر دیا۔

بیس برس کی عمر میں نذیر کے پہلا بچہ ہوا، خوب موٹا تازہ اور خوب صورت بالکل راجو کا ہم شکل۔ دادا دادی اس پر جان چھڑکتے تھے نذیر ہمیشہ سے بچوں کا دل دادہ تھا، اپنے بچے پر تو پروانہ وار نثار رہتا۔ دو سال بعد اس کے ایک لڑکی اور ایک سال بعد دوسرا لڑکا پیدا ہوا سب کے سب خوب صورت تندرست اور ہنس مکھ، نذیر کی خوشی کا کیا پوچھنا؟ وہ ایک "صاحب" کے ہاں نوکر تھا، اس کی ساری تنخواہ بچوں کے کھلونوں بچوں کے "بیبین اپیل" سوئٹروں اور ٹوپیوں اور بیوی کے زیور اور ریشمی کپڑوں میں صرف ہوتی تھی۔ کھانے پینے کا سب خرچ ماں باپ خود اُٹھاتے تھے وہ گھر کی سب فکروں سے آزاد بے فکری اور مسرت کی جنت میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ آٹھویں دن وہ "صاحب" سے ایک دن کی چھٹی لے کر گھر آتا، اور بیوی بچوں اور بڈھے ماں باپ سے جن کا وہ اکلوتا بیٹا تھا مل جاتا، اس ہنس مکھ اور خوش دل نوجوان کے آتے ہی گھر میں خوشی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی گھر والے چھ دن تک اُس کے آنے کی گھڑیاں گن گن کر کاٹتے۔

اچانک گاؤں میں فصلی وبا پھیلی اور تین چار دن کے اندر اندر اس کا باپ ماں اور بڑا لڑکا چٹ پٹ ہو گئے۔ نذیر کو خبر ملی تو روتا پیٹتا گھر آیا۔ راجو کا صدمے سے برا حال تھا پہلے بیوی سے مل کر خوب رویا۔ پھر اُسے تسلی تشفی دی، گھر بند کیا اور بیوی بچوں کو ساتھ لے کر اپنے "صاحب" کی کوٹھی پر آگیا جہاں اُسے ایک کوٹھری رہنے کو مل گئی۔

اب نذیر کے سر ساری ذمہ داریاں اور خرچ آ پڑے، اس پر ماں باپ اور بچے کا صدمہ سوہان روح، ہر وقت رنجیدہ اور متفکر رہتا۔ راجو کو بھی اب وہ آرام و بے فکری کہاں نصیب ہوتی، جو ساس سسر کے زمانے میں میسر تھی، دن بھر گھر کا کام، بچوں کی پرورش، کھانا پکانا اور رات کو جب تھکا ہارا نذیر بچا کھلا کر واپس آتا تو گھنٹوں اس کے پاؤں دبانا غرض اس طرح کی بہت سی ذمہ داریاں اس پر آ پڑی تھیں۔

راجو کے پیٹ میں پھر بچہ تھا............ اس کی صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ اُدھر دونوں بچے روز کچھ نہ کچھ بیمار رہنے لگے تھے۔ اسی حالت میں راجو کے مرا ہوا بچہ پیدا ہوا............ نذیر نے بہت دوڑ دھوپ کی "صاحب" نے ڈاکٹر کو بلا کر بھی دکھایا مگر راجو کی زندگی کے دن پورے ہو چکے تھے۔ سترہ، اٹھارہ سال کی عمر میں چار بچوں کی پیدائش نے یوں ہی حد سے زیادہ کمزور کر دیا تھا۔ اب جسم میں زہر پھیلنے کا بہانہ ہو گیا اور وہ ننھے ننھے بچوں اور عاشق زار شوہر کو تڑپتا چھوڑ کر ناشاد و نامراد دنیا سے چل بسی۔

نذیر بچارا اس صدمے سے سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ پہلے پانچ برس کی پلی پلائی لڑکی نمونیہ کی نذر ہوئی اور بیس پچیس دن بعد چھوٹا لڑکا چیچک کی بھینٹ چڑھ گیا۔ نذیر گنوار اور جاہل، بچے کا علاج، دوا کچھ نہ کیا، ٹونے ٹوٹکے کرتا رہا اور اس ڈر سے صاحب اور میم صاحب سے بھی چھپایا کہ وہ ڈاکٹر کو دکھائیں گے اور ڈاکٹر نے جیسے اس کی بیوی اور بچی کو مار دیا اس بچے کو بھی مار دے گا۔ بچے کے مرنے کے بعد اس کی حالت بالکل پاگلوں کی سی ہو گئی۔ کس کا پکانا کہاں کا کھانا۔ اس پر ایک مدہوشی کا عالم طاری رہتا تھا۔ سارے دن بیوی بچوں کی قبروں پر پڑا روتا اور سر دھنتا رہتا۔ میم صاحب نے ہفتہ بھر انتظار کیا کہ خانساماں کی حالت سنبھلے اور وہ پھر کام شروع کرے، آخر انھوں نے بیرے کو بلا کر نذیر کا حال پوچھا۔ بیرا مدت سے نذیر کا مخالف تھا نذیر ایمان دار تھا اور بیرے کو سودے میں روپیہ رکھنے کا موقعہ بہت کم دیتا تھا۔ اس نے میم صاحب سے کہا کہ "نذیر تو باؤلا ہو گیا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی جڑ دیا کہ اس کے بچے کو چیچک نکلی تھی، مگر اس نے آپ سے چھپایا۔ یہ سن کر میم صاحب کے حواس غائب ہو گئے۔ اوہ ان کے بنگلے میں چھوت والی بیماری سے موت ہو جائے اور وہ بے خبر رہیں؟ پہلے تو انھوں نے بیرے کو خوب ڈانٹا کہ تو نے ہمیں اطلاع کیوں نہ کی۔ بیرے کو الٹی اپنی فکر پڑ گئی بڑی مشکل سے جھوٹی سچی باتیں بنا کر اور ہاتھ پاؤں جوڑ کر معاملہ سیدھا کیا۔ میم صاحب نے نذیر کو قبرستان سے بُلایا اور اس کا حساب کر چلتا کیا اور اسی وقت ہیلتھ آفیسر کو بلا کر تمام کوٹھی اور شاگرد پیشہ کو "ڈس انفکٹ" کرایا۔ پھر بھی میم صاحب کئی دن تک بدحواس رہیں۔

نذیر نے لاپروائی بلکہ بے حسی سے برطرفی کا حکم سنا اور سلام کر کے وہاں سے اپنے گاؤں چلا آیا۔ وہ اب نوکری کرے تو کیوں اور کس کے لئے۔ وہ رات دن گھر میں منہ اوندھائے پڑا رہتا، اکثر گاؤں والے اُسے سمجھانے کی کوشش کرتے۔ کبھی کوئی بڑھیا آکر زبردستی کچھ کھلا پلا دیتی، کبھی خود نذیر دو ایک موٹی موٹی روٹیاں پکا کر پیٹ کے دوزخ کو بھر لیتا۔

کئی مہینے گذر گئے۔ نذیر کی پھوپی گاؤں میں سے کسی نے نذیر کا حال کہلا بھیجا۔ وہ بچاری بہت دور رہتی تھی مگر کسی طرح بھتیجے کے پاس پہنچی۔ اس کے ساتھ اس کی سوتیلی نواسی بھی تھی جس کی عمر کوئی ۱۷، ۱۸ سال کی ہوگی۔

پھوپی پہلے تو بھتیجے سے مل کر بہت روئی پیٹی پھر رفتہ رفتہ اُسے تسلی دلاسا دے کر اور سمجھا بجھا کر راہ پر لائی نذیر بھی اب اُکتا گیا تھا، اُجاڑ، تنہا زندگی سے اُکتا گیا تھا پھوپی کے آنے سے دل بہلا۔ بس پانچ دن پھوپی نے گاؤں کے بڑے بوڑھوں کو بلا کر ان کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا کہ اب نذیر کا دوسرا بیاہ ہو جانا چاہئے۔ نذیر پہلے تو انکار کرتا رہا مگر آخر میں سب کے سمجھانے بجھانے پر اس نے اپنی رضامندی دے دی۔ پھوپی نے زیادہ انتظار نہ کیا، اگلے ہی دن اپنی سوتیلی نواسی سے نذیر کا نکاح کر دیا۔ وہ بچاری بہت دنوں سے اس فکر میں تھی کہ کوئی بر ملے تو اس لڑکی کے ہاتھ پیلے کر دے مگر غریب لاوارث لڑکی نہ کچھ لینے کو نہ دینے کو بر کیسے جڑتا۔ اب ایسا موقع وہ کیوں ہاتھ سے جانے دیتی۔

نئی بہو ہنس مکھ محنتی اور اطاعت گذار لڑکی تھی سانولا رنگ، معمولی ناک نقشہ۔ نذیر کی نظروں میں راجو کی صورت بسی ہوئی تھی بھلا اس کی شکل اُسے کیا پسند آتی؟ پھر بھی اپنی بے کیف زندگی سے وہ اس قدر تھک گیا تھا کہ زندگی کی یہ نئی تبدیلی اُسے خوش گوار اور پرسکون محسوس ہوئی۔ پھر بہو خوب صورت نہ ہو مگر چڑھتی جوانی نے اُسے دل کش ضرور بنا دیا تھا۔ نذیر کچھ دن کے لئے اس میں کھو گیا۔ پھوپی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور بھتیجے کا گھر بسا کر اپنے گھر واپس چلی گئی۔

نذیر کا مزاج صدموں نے اب بالکل بدل دیا تھا وہ ذرا ذرا سی بات پر جھلاتا، مارنے پر تل جاتا، بیوی کو حکم تھا کہ اس کی بغیر اجازت کہیں آنا جانا تو کیا ہلے بھی نہیں۔ مگر بہو ایسی اطاعت گذار اور بے زبان لڑکی تھی کہ سب باتیں خاموشی اور خوشی سے برداشت کرتی اور شکایت کا ایک لفظ زبان پر نہ لاتی۔

کچھ دن بعد نذیر نے ایک جگہ نوکری کر لی اور بیوی کو ساتھ لے گیا۔

نذیر کی نئی بیوی کا نام کبھی کسی کو معلوم نہ ہوا اگر اس سے پوچھا جاتا تو وہ بڑی سادگی سے جواب دیتی "بیگم صاحب ہم کا جانیں ہمارا نام کا ہے؟ جب ہم لڑکوری رہن تو سب بٹیا بٹیا کہت رہن۔ جب شادی ہوئی تو سب بہو بہو کہن، اب خنساماں جی ہیں خنسامن کہت ہیں"۔ چنانچہ اُسے خود نذیر اور سب لوگ خنسامن بلکہ "کھنسامن" کہتے تھے۔

(باقی آئندہ)

صبح اُمید (بہ سلسلہ صفحہ ۱)

بلکہ اپنے امکان اور مقدور پر نظر رکھنی چاہئے............ اس وقت کام کرنے والوں کو خود ہی تجویز پیش کرنی چاہئے، خود ہی قوم میں اس کی دعوت پھیلانی چاہئے اور پھر کوشش کرنی چاہئے کہ ہو سکے تو خود ہی اس تجویز کو عمل تک پہنچائیں اور اگر نئی تلاش کی دعوت دی ہے تو خود ہی اس کو ڈھونڈ کر سامنے

رومی عورت

عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی جامعی

رومیوں نے اپنے سامراجی اور جمہوری، کسی دور میں بھی محبت کو پروان نہیں چڑھایا۔ ان کی عورتیں سوت کاتتی تھیں، گھر کی دیکھ بھال کرتی تھیں اور باپ کی طرح اپنے شوہروں کی تعظیم کرتی تھیں۔ ۲۳۰ء سے پہلے ان کے یہاں طلاق کا رواج نہیں تھا۔

رومی عورت ایک طرح سے اپنے شوہر کی تابع تھی مگر عملی حیثیت سے وہ یونانی عورت کے مقابلے میں کہیں زیادہ آزاد تھی اور اپنے شوہر سے اس کا تعلق کہیں زیادہ گہرا تھا۔ اس کا طرز معاشرت بالکل اپنے شوہر کا سا ہوتا، گھر میں وہ برابر کی شریک ہوتی، شوہر کے احباب کا خیر مقدم کرتی، اس کی تمام ضروریاتِ زندگی کا لحاظ رکھتی اور اپنے فرائض سے خوب واقف ہوتی بڑے ضبط و اعتدال و احتیاط سے زندگی بسر کرتی۔

رومی دولت کی بہت زیادہ پرستش کرتے تھے، ان کے نزدیک ہر چیز سے بلند مقام دولت کا تھا۔ ان کا فوجی اور مذہبی طبقہ اور تمام لوگ بڑی خشک اور عسرت کی زندگی گذارتے تھے۔ ان کی کفایت شعاری، کنجوسی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی، وہ صرف قوت کے سامنے سر جھکانا جانتے تھے، ان کے یہاں شاعر اور آرٹسٹ کا کہیں گذر نہیں تھا وہ محض مذہب، تنظیم اور جنگ کے دل دادہ تھے۔

آگے چل کر رومیوں نے یونانی اخلاق و عادات کو اپنایا، اور اس میں اس قدر غلو کیا کہ پھر یہی اخلاق و عادات ان کی تباہی و بربادی کا سبب بن گئے۔ روم میں شاعروں کا طبقہ اس وقت پیدا ہوا جبکہ وہ یونان پہ غالب آیا، اور یہ سب شعرا یونانی گلشن ادب کے خوشہ چیں تھے، اور آرٹسٹ تو سب کے سب یونانی نسل ہی کے تھے

رومیوں کا سب سے بڑا ہیرو قیصر جولیس خاندانی شرافت کا کوئی اعلیٰ نمونہ نہیں تھا اور اسی طرح انتھنی بھی کوئی اونچا انسان نہیں تھا۔ کلوپیٹرا جو ایک بے پناہ نسوانی سحر اور غیر مفتوح عقل و خرد کی مالک تھی، تھوڑے دنوں تک قیصر سے محبت کرتی رہی اور ایک طویل مدت تک اس نے مارک انتھنی کو اپنے اشاروں پر نچایا۔ دنیا جانتی ہے کہ اس حسین صید محبت کا کیا حشر ہوا؟ اور اس نے کس طرح کلیوپیٹرا کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیا، عزت و آبرو، ملک و وطن غرض اپنی ہر چیز محبت کی نذر کر دی۔

کلیوپیٹرا کا مشرقی سحر، اس کے چاہنے والے پر اس طرح چھا گیا کہ پھر اس کا کوئی اپنا ارادہ باقی نہیں رہ گیا۔ اس لئے کہ وہ اس فن سے خوب واقف تھی کہ کس طرح اس کی نگاہوں میں ہمیشہ نئی بنی رہے۔ اور محض اپنی ایک رات کے اندر اس کو نت نئے جلوے دکھاتی رہے۔

یہ تو مشرقی عورت کا انداز تھا، اور رومی عورت؟ اس میں بالکل سلیقہ نہیں تھا کہ مردوں کی باگ اپنے ہاتھ میں لے سکے۔

کلیوپیٹرا کے افسانے جب رومیوں تک پہنچے تو مشرقی عورت کے اخلاق کے متعلق غلط تصور قائم ہوا، رومی عورتوں نے سمجھا کہ مشرقی عورت محض اپنی جنسی خوبیوں کی بدولت اپنے مردوں پر چھائی ہوئی ہوتی ہے اور ان کا مطمح نظر لطف اندوزی کے سوا کچھ نہیں۔

مشرقی عورت کی بابت اس غلط بدگمانی نے خود رومی عورتوں کو گمراہ کر دیا اور اس غلط تصور کی تقلید میں وہ گھر کی چہار دیواری سے باہر نکل آئیں، عفت کو خیرباد کہا میاں بیوی کے فرائض کا مذاق اڑایا، اور اپنی قوم کے زوال کے لئے راہ صاف کر دی۔

قیصر اگسٹس کی لڑکی بے راہ روی میں ضرب المثل بن گئی، جس کی وجہ سے باپ نے اس کو شہر بدر کر دیا تاکہ خود اس کی عزت پر دھبہ نہ آئے۔

اس کے بعد آہستہ آہستہ بلند اخلاق کی ساری بنیادیں ایک ایک کرکے مسمار ہوگئیں۔ لوگوں کے عادات و اطوار خراب ہوگئے۔ خود اعتمادی کی روح مردہ ہوگئی، محاسن اخلاق کو برائیوں میں شمار کیا گیا۔ غرض کوئی ایسا نشانِ ہدایت باقی نہیں رہ گیا جسے دیکھ کر لوگ صحیح راہ پکڑ سکیں۔

اس طرح رومی سوسائٹی کے جسم میں زوال کے جراثیم گھس گئے، اور پوری سوسائٹی مریض ہوگئی۔ مصنفوں اور نقادوں نے آنے والے خطرے سے بار بار آگاہ کیا، مگر کسی نے کان نہیں دھرا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک روز علی الصباح رومیوں نے اپنی سرحدوں پر بربریوں کے ہتھیاروں کی جھنکار سنی، اور آن کی آن میں رومی شہنشاہیت ختم ہوگئی۔

(عربی سے ترجمہ)

۱۵ر دسمبر علی گڈھ میں (بہ سلسلہ صفحہ ۲)

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

نئے سرے سے اس نصب العین سے پیمانِ وفا باندھتی ہے اور اسے بروئے کار لانے کا عزم کرتی ہے جو اس کے بانیوں کے پیش نظر تھا یعنی ہندوستان رواداری، روشن خیالی آزادی اور حقیقی جمہوریت کی سرزمین ہوگی۔ یہ نصب العین ہمارا فرض بھی ہے اور ہمارے لئے بشارت بھی۔"

حاضرین نے یہ ایڈریس بڑے سکوت و احترام سے سنا۔ اور جب ختم ہوا تو ایسا معلوم ہوا جیسے ہر شخص نے یہ محسوس کیا ہو کہ علی گڑھ کی ترجمانی بڑی دیانت اور دلیری کی گئی تھی۔ سب سے عجیب لیکن خوش گوار بات یہ تھی کہ ہر شخص لطف و فراغت سے اپنی اپنی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کو یہ اندیشہ نہ تھا کہ ریلے میں اس کا پاؤں اکھڑ جائے گا یا گرد و پیش کے ہجوم میں آٹے کی طرح گوندھ ڈالا جائے گا۔ میں نے بعض بڑے لوگوں کو معمولی اور دور افتادہ جگہوں پر بیٹھے دیکھا۔ جن کے بشرے سے ہرگز یہ نہ معلوم ہوتا تھا کہ ان پر یہ حالت شاق گذر رہی تھی، اگر کوئی اور وقت ہوتا تو مجھے یقین ہے یہ لوگ یا تو منتظمین کو مار ڈالتے یا اپنے اپنے گھروں پر جا کر بیوی بچوں کو تہ تیغ کر ڈالتے۔ خواتین کافی تعداد میں موجود تھیں بالستر بھی اور بالجہر بھی۔ ایک دوست نے کہا "یہ کیا بات ہے آج خواتین کی طرف لوگوں کا دھیان کم معلوم ہوتا ہے" پاس ہی ایک سوکھے سلکھے بید مجنوں سے جو ایک کرسی پر نصب تھے آواز آئی "سورہ فاتحہ بھی تو ختم ہو، آمین کا

موقع کہاں سے آئے؟"

(باقی آئندہ)

اردو ادب کی رفتار (بہ سلسلہ صفحہ ۸)

(بہ سلسلہ صفحہ ۸)

اردو ادب کے اس سہ ماہی کی بات ادھوری رہ جائے گی، اگر ہم ہفتہ وار نئی روشنی کا ذکر نہ کریں جو ڈاکٹر سید عابد حسین کی ادارت میں دہلی سے نکلنا شروع ہوا ہے یہ کسی سیاسی گروہ کی پیروی نہ کرتے ہوئے سوشلسٹ نقطۂ نظر سے ہندوستانی سیاست پر تنقید کرتا ہے یہ ایک "اخلاقی سماج" کی داغ بیل ڈالنے کا دعوے دار ہے۔ اس کے اجرا پر کچھ لوگوں کا ماتھا ٹھنکا۔ بعضوں نے بغیر سوچے سمجھے اسے اپنے اوسط درجے کے ذہنی نحو کے مطابق نہ پاکر لغو اور مہمل بتایا۔ کچھ لوگوں نے کہا یہ جامعہ والوں کی غیر ضروری مفاہمت کا ... انھیں اس کا دھیما اور غیر جانب دارانہ انداز بالکل پسند نہ آیا، انھیں اس کی مفاہمت کی پالیسی میں کمزوری جھلکی جد و جہد میں انقلاب دشمنی اور نرم لب و لہجہ میں خود فریبی نظر آئی جس کا نام نہاد سوشلزم اکثر شکار ہو جاتی ہے۔

رفتہ رفتہ ایک دو تین چار پرچے نظر سے گذرے تو محسوس ہوا کہ کوئی ہمارے تلخ دہن میں نبات گھول رہا ہے، متزلزل عقیدوں کو پختہ کر رہا ہے۔ بات نیچے سروں میں لیکن سچے دل سے کہہ رہا ہے۔ وہ اوروں کی طرح انسان پرستی کے لئے واویلا نہیں کرتا، انسان دوستی کی کھری تعلیم دے رہا ہے۔ اس کا مقصد نفرت کے اس زہر کو خارج کرنا ہے جو پچھلے چند سالوں کی سیاست کے ذریعے ہماری رگوں میں سرایت کر چکا ہے۔ یہ زہر چاہے فرقہ وارانہ نفرت کا ہو یا طبقاتی نفرت کا۔ اگر فرقہ وارانہ نفرت پر قدغن کی جا سکتی ہے تو طبقاتی کا جواز کس لئے ڈھونڈھا جا رہا ہے؟ نئی روشنی اسی گہرے عقیدے کے ساتھ نکالا جا رہا ہے، نفرت سے مسئلے سر نہیں ہوتے، عزم سے ہوتے ہیں۔ یہ عزم حق بینی اور حق پرستی سے پیدا ہوتا ہے۔ نفرت کی آنچ سے گرمی پیدا ہو جاتی ہے اور روشنی نہیں ہوتی۔ اس عہد کو گرمی سے زیادہ روشنی کی ضرورت ہے۔

نئی روشنی سیاسیات میں نئی روشنی کے اجرا کی ادبی اہمیت بھی ہے۔ "بزم بے تکلف" میں ظرافت کا ایک مخصوص شگفتہ، فلسفیانہ انداز ملتا ہے۔ ہمارے مصلحین کی اگر یہ کار و کاوش بدستور جاری رہی تو ہمیں یقین ہے کہ سیاسی پاک بینی اور نظر کی وسعت کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں گرمی کی بجائے روشنی آ جائے گی ... کی کڑواہٹ اور دلوں کا غبار دور ہو جائے گا نفرت محبت میں تبدیل ہو جائے گی۔ وہ محبت جس میں توانائی بھی ہوتی ہے اور شوکت بھی جو کسی کمزوری کی بنا پر نہیں پیدا ہوتی بلکہ اعتماد اور یقین کے سرچشموں سے پھوٹتی ہے۔

(آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر ہوئی)

مژدہ مزدور کو کہ چھایا ہے
کشتِ ویراں پہ ابرِ گوہر بار
باغِ عالم بدلنے والا ہے
دیکھ یہ انقلاب کے آثار

اقبال

رجسٹرڈ نمبر ڈی ۲۰۷

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

تاریخ اشاعت یکم ۲۲، ۱۶، ۸۰
اِدارۂ تحریر:۔ ڈاکٹر سید عابد حسین۔ صالحہ عابد حسین۔ عبداللطیف اعظمی
چندہ سالانہ ششماہی

مطبوعہ:۔ جید پریس دہلی
طابع وناشر:۔ عبداللطیف اعظمی (دہلی جامعہ)

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۲ | نمبر ۸ | ۲۴ فروری ۱۹۴۹ء | ایڈیٹر:- ڈاکٹر سید عابد حسین

زبان کا مسئلہ

جواہر لال نہرو

میں یہ مضمون وزیر اعظم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مصنف کی حیثیت سے اور ایک ایسے شخص کی حیثیت سے لکھ رہا ہوں جسے زبان کے مسئلے سے بے حد دلچسپی ہے۔ میری یہ دلچسپی مسئلے کے سیاسی اور بدقسمتی سے، فرقہ وارانہ پہلوؤں کی وجہ سے ہے لیکن اس مسئلے کے وسیع تر تمدنی پہلو مذکورہ پہلوؤں سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ میں کسی زبان کا ماہر تو نہیں ہوں لیکن کسی زبان میں جو حسن ہوتا ہے، اس کی روزمرہ اور محاوروں میں جو موسیقی ہوتی اور الفاظ میں جو سحر اور طاقت ہوتی ہے اس کا دلدادہ رہا ہوں۔ میرے نزدیک کسی قوم کے کردار کا اندازہ جتنا اس کی زبان سے ہوتا ہے کسی دوسری چیز سے نہیں ہوتا اگر زبان پر زور اور جاندار ہے تو یہی خوبیاں اس کے بولنے والوں میں بھی پائی جائیں گی اور اگر زبان سطحی، بناوٹی اور الجھی ہوئی ہے تو یہی عیوب بولنے والوں میں نظر آئیں گے۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ قوم کے عیوب و محاسن زبان میں جھلکتے ہیں، کیوں کہ قوم ہی تو اپنی زبان بناتی ہے۔ تاہم اس میں بھی کچھ حقیقت ضرور ہے کہ زبان قوم کو اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہے۔ زبان با ضابطہ ہوگی تو لوگوں کی فکر میں باقاعدگی پیدا کرے گی۔ الفاظ کے معانی میں سستی اور با ضابطگی نہیں ہے تو خیال میں بے ربطی اور الجھاؤ پیدا ہوگا جس کا اثر افعال پر پڑے گا اور وہ بھی بے تکے ہوں گے۔

جو زبان ایک تنگ غلاف میں اس طرح منڈھی ہوئی ہے کہ اس کو نئی تبدیلیوں کی ہوا تک نہ لگ پاتی ہو، خواہ وہ کتنی ہی لطیف اور چست ہو، بدلتے ہوئے ماحول اور عوام سے دور ہو جائے گی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا زور جاتا رہے گا اور اس میں ایک قسم کی بناوٹ آ جائے گی۔ یہ صورت کسی زمانے میں بھی مفید نہیں ہو سکتی لیکن موجودہ ترقی پذیر زمانے میں تو جب کہ ہمارے گرد و پیش کی ہر چیز بدل رہی ہے یہ تنگ غلاف زبان کی جان ہی لے لے گا۔ عہد گذشتہ کی درباری زبانوں میں بہت سی خوبیاں ہیں لیکن اس جمہوری زمانے کے لئے جس میں تعلیم عام ہمارے پیش نظر ہے وہ بالکل نا موزوں ہیں اس لئے زبان کے اندر دو خصوصیتیں ضرور ہونی چاہئیں۔ ایک یہ کہ اس کی بنیاد اپنی قدیم اصل پر ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں اتنی لچک ہو کہ وہ بدلتے ہوئے حالات اور ضروریات کا ساتھ دے سکے اور بجائے ایک مخصوص طبقے کی زبان بن کر رہ جانے کے عوام کی زبان بن سکے۔ اس سائنسی صنعتی دور میں بین الاقوامی میل جول کے دور میں اس کی بھی ضرورت ہے کہ سائنس اور صنعت کی اصطلاحیں کم و بیش یکساں ہوں۔ اس لئے ایک زندہ زبان کی یہ بھی خصوصیت ہونا چاہئے کہ وہ دوسری زبانوں کے اصطلاحی الفاظ کو اپنے حالات کے لحاظ سے ضروری تراش خراش کے بعد اپنے دامن میں فراخ دلی کے ساتھ جگہ دے سکے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کلاسکی زبانیں انسانی سوسائٹی کی ترقی میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں لیکن اس کے ساتھ وہ عوامی زبان کی راہ میں رکاوٹ بھی رہی ہیں۔ جب تک پڑھے لکھے قابل لوگ کلاسکی زبان میں لکھتے اور اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہیں گے اس وقت تک عوامی باتیں آگے نہ بڑھ سکے گی۔ ہم دیکھتے ہیں سولھویں صدی تک یورپ میں لاطینی زبان یورپی زبانوں کی ترقی میں حائل رہی۔ بالکل اسی طرح ہندوستان میں سنسکرت کا اتنا اثر رہا کہ پراکرت جو بعد کو صوبائی زبانوں میں تبدیل ہو گئیں پنپ نہ سکیں۔ سنسکرت کے بعد اس کی جگہ فارسی نے لے لی اور پڑھے لکھے لوگوں نے اس کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنا لیا، اور عوامی بولیاں یتیمی کی زندگی بسر کرتی رہیں اور پروان نہ چڑھ سکیں۔

یہ صحیح ہے کہ ہمیں اپنی صوبائی زبانوں کو ترقی دینا ہے، لیکن اس کے ساتھ پورے ملک کے لئے ایک مشترکہ زبان کی بھی ضرورت ہے۔ جو ظاہر ہے کہ انگریزی یا دوسری بیرونی زبان نہیں ہو سکتی اگرچہ میں سمجھتا ہوں کہ انگریزی اپنی وسعت نیز ہندوستان میں اپنی مقبولیت کی بنا پر ہماری آیندہ سرگرمیوں میں کافی اہمیت رکھے گی لیکن اس کے باوجود وہ ملک کی زبان نہیں قرار دی جا سکتی، ملک کی زبان تو ہندی یا ہندوستانی یا اسے جو بھی کہا جائے ہو سکتی ہے۔

ہمیں اس اہم مسئلے پر غور کرتے وقت چند بنیادی باتوں کو ضرور پیش نظر رکھنا چاہئے۔ ہم جب اس مسئلے پر غور کریں تو اس کے بارے میں ہمیں کوئی فیصلہ عجلت کے ساتھ سیاسی اور وقتی اثرات اور جذبات کے ماتحت نہ کرنا چاہئے ورنہ وہ بہت مضر اور خطرناک ثابت ہوگا چونکہ ہمارے اس فیصلے پر آیندہ عمارت تعمیر کی جائے گی اس لئے اگر بنیاد رکھنے میں کوئی غلطی ہوگی تو اس کا اثر صرف زبان پر ہی نہ پڑے گا بلکہ ترقی و تمدن بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے گا۔ اس لئے اس معاملے میں عجلت سے کام لینا سست رفتاری کے مقابلے میں زیادہ خطرناک ہوگا زبان ایک لطیف اور نازک آلہ ہے جو نفیس اور اعلیٰ دماغوں میں ڈھلنے کے بعد عوام کی زبان پر چڑھ کر زور اور طاقت حاصل کرتا ہے۔ زبان ایک پھول کی مانند ہے جو مصنوعی آب و ہوا کے دباؤ سے مرجھا جاتا ہے یا پھر اس کی شاخیں دباؤ کے باعث ٹیڑھی ہو کر غلط رخ اختیار کر لیتی ہیں۔

اس کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں کہ ہم اپنی زبان کو ہندی کے نام سے یاد کریں یا ہندوستانی کے نام سے، بس اس کی اہمیت صرف یہ ہے کہ دونوں الفاظ اپنی ایک تاریخ رکھتے ہیں اور

فہرست مضامین

ایک مخصوص اور معین چیز کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کی بنا پر اس کے معنی محدود ہو جاتے ہیں۔ ہم کو اس معاملے میں زیادہ توجہ نام کے بجائے اس کے اندرونی ڈھانچے پر دینی چاہئے کہ وہ دنیا کو کس نظریے سے دیکھتی ہے۔ اس کے دروازے بند، اس کا دامن تنگ، اس کا طرز خود کفالتی اور اس کی طبیعت علیحدگی پسند ہے یا اس کے برعکس ہے ہمیں آزادانہ طور پر ایسی زبان بنانے کی کوشش کرنی چاہئے جس کا دامن وسیع ہو تاکہ وہ زیادہ مقبول اور ہر دلعزیز ہو سکے۔ انگریزی زبان بحیثیت زبان کے صرف اس لئے دنیا میں اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں وسعت، لچک اور بڑھنے کی اہلیت پائی جاتی ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ ہماری زبان انہی خصوصیات کی حامل ہو تاکہ دنیا کے مسائل سے دوچار ہو سکے۔

مجھے یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ زبان کے مسئلے پر ہمارے یہاں جب کوئی بحث ہوتی ہے تو اس میں نہ تو عالمانہ شان ہوتی ہے نہ تمدنی احساس، اور نہ دور اندیشی کی جھلک۔ عام طور پر زبان کو اخباری زبان کی حیثیت سے غلط قومی نقطہ نظر سے دیکھا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُسے زیادہ سے زیادہ تنگ اور محدود بنانے کی کوشش کی جاتی ہے اور ہر وہ اقدام جو اسے وسیع بنانے کے لئے کیا جاتا ہے اُسے قوم پسندی کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ زبان کی خوبی اور خوبصورتی خیال کی جاتی ہے کہ اس میں بلاوجہ بناؤ سنگار سے کام لیا جائے اور پیچیدہ اور لمبے جملے استعمال کئے جائیں اس میں نہ تو زور ہوتا ہے اور نہ شکوہ، صرف الجھاپن اور بناوٹ پائی جاتی ہے جس طرح شاعری صرف وزن اور قافیہ تک محدود نہیں اسی طرح زبان پیچیدہ جملوں اور سخت الفاظ کے استعمال سے نہیں بن سکتی۔ اس طرف انگریزی کے چالو الفاظ کا خواہ مخواہ ترجمہ کرنے کی جو کوشش کی گئی ہے اُسے سوائے خبط کے کیا کہا جا سکتا ہے۔ اگر یہ رجحان یوں ہی باقی رہا تو اظہار خیال کے ایک عمدہ وسیلے کا خون یقینی ہے۔

اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ ہندوستان کا سب سے زیادہ قیمتی خزانہ اور سب سے بیش بہا ترکہ کیا ہے تو میں بلا جھجک کہوں گا سنسکرت۔ سنسکرت اور اس کا ادب ہمارے لئے صرف ایک پرانا بہترین خزانہ ہی نہیں ہے بلکہ وہ زندہ روایات ہیں جو ہماری زندگی کو ہمیشہ متاثر کرتی رہیں گی ہمیں اس کا گہرا مطالعہ کرنا چاہئے۔ اس کے ادبی ذخیرے کو دنیا کے سامنے لانا چاہئے، جو نظروں سے چھپا ہوا پڑا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ لوگ اس معاملے میں زبان سے تو دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں اور اس کو سیاسی مقصد کے لئے استعمال بھی کرتے ہیں لیکن اس کی کوئی واقعی خدمت نہیں کرتے۔ سنسکرت ہو یا موجودہ ہندوستانی زبانیں ان میں تعمیری کام کرنے والے بہت کم نظر آتے ہیں، اور نہ آگے بڑھو اور نہ بڑھنے دو کی پالیسی پر زیادہ عمل کرتے ہیں، نہ تو خود کوئی کام کرتے ہیں اور نہ کرنے دیتے ہیں کوئی زبان قانون اور قرار دادوں کے بل بوتے نہیں بڑھتی، بلکہ اپنی اندرونی اہلیت اور خصوصیات کی بنا پر ترقی کرتی ہے اس لئے کسی زبان کی اصلی خدمت اس کو قابل استعمال اچھا اور شستہ بنانے کی کوشش ہے۔

سنسکرت [illegible] اور اس سے فائدہ اٹھانے کے معنی ہرگز یہ نہیں کہ وہ زندہ زبان کی حیثیت سے رائج کی جا سکتی ہے وہ [illegible] ایک سرچشمہ کی حیثیت سے ہندوستان کی بہت سی زبانوں کو سیراب کرتی رہے گی لیکن اُسے دوبارہ رائج کرنا نہ تو ضروری ہے اور نہ مناسب بلکہ اس سے خراب نتائج برآمد ہونے کا اندیشہ ہے۔

فارسی زبان کا اثر

پچھلی چند صدیوں میں ہماری کچھ علاقائی زبانوں خصوصاً ہندوستانی زبان کے بنانے میں فارسی نے بہت اہم حصہ لیا ہے۔ [illegible] ہوئی ہے جس سے ہمیں فائدہ پہنچا ہے اور ہمارا لسانی خزانہ زیادہ مالدار ہو [illegible]۔ یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ فارسی سے زیادہ کوئی [illegible]رت سے قریب نہیں ہے۔ ویدک سنسکرت [illegible] (فارسی) بہ نسبت بعد کی سنسکرت اور کلاسیکی سنسکرت کے زیادہ قریب ہیں اس لئے دونوں کی ملاوٹ آسان ہو اور کسی طرح ہمارے لسانی اور نسلی جوہر کے خلاف نہیں ہو۔ بہرحال چند صدیوں کی تاریخ اور عوام کی زندگی نے ہم کو موجودہ حالات تک پہنچایا، اور تاریخ کے اس کام کو مٹانے کی کوشش کرنا لغو اور ناسمجھی کی بات ہو۔ ثقافتی نقطہ نظر سے اس کو ختم کر کے پھر پیچھے لوٹنے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم اپنے آپ کو اس ثقافتی دولت سے محروم کر دیں گے جو ہماری ملکیت تھی۔ اور اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم خود ہی اپنے کو نادار بنا رہے ہیں۔ ہمیں ان تمام اثرات کو قبول کرنا چاہئے جو ہمارے ثقافتی سرمائے میں اضافہ کر سکیں۔ اس لئے ہم نے جو کچھ ابھی تک اپنی زبان میں ضم کر لیا ہے اس کو خارج کرنے کی کوشش ہر پہلو سے غلط ہوگی۔ اگر ہم ان باتوں کو پیش نظر رکھیں تو اس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ پورے ہندوستان کی زبان جو ہم بنانا چاہتے ہیں اس میں کافی وسعت اور گنجائش ہونا چاہئے جو ان تمام تمدنی خصوصیات کو قبول کر کے برقرار رکھ سکے جو اس نے پچھلے زمانے میں حاصل کئے ہیں۔ اس زبان کو لازمی طور پر پڑھے لکھے آدمیوں کے چھوٹے سے حلقے کی زبان نہیں بلکہ عوام کی زبان ہونا چاہئے اس کو باوقار اور زوردار ہونا چاہئے اور یہ کوشش کرنا چاہئے کہ اس میں تصنع اور بھاری پن نہ ہو۔ لازمی طور پر اس کی بنیاد اور اجزا ضروری میں کچھ سنسکرت کے الفاظ ہوں گے۔ لیکن اس میں دوسری زبانوں خصوصاً فارسی، انگریزی اور دوسری غیر ملکی زبانوں کے بھی الفاظ ہیں اور خیالات ہوں گے۔ جہاں تک فنی اصطلاحوں کا سوال ہے سب سے پہلے ہمیں مروجہ اصطلاحوں کو مان لینا چاہئے اور نئے الفاظ بنانے میں ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ وہ عام فہم ہوں اور مروجہ زبان سے قریب ہوں۔ فنی الفاظ میں جہاں تک ممکن ہو ہمیں اس عالمی زبان کے ساتھ سے الگ نہ ہونا چاہئے، جو آج کل ترقی پا رہی ہے۔

یہ بہتر ہوگا کہ پہلے بنیادی الفاظ جمع کر لئے جائیں دوان میں کہ تقریباً تین ہزار الفاظ ایسے ہیں، جو عام فہم الفاظ ہوں، اور جن کو عام طور پر لوگ استعمال کرتے ہوں۔ ان میں ایک ہی مطلب کے لئے دو الفاظ ہو سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ عام استعمال میں آتے ہوں۔ یہ ہماری زبان کا بنیادی ذخیرہ ہونا چاہئے جس کا علم ہر اس شخص کو ہونا چاہئے جو ہندوستانی کی زبان جاننا چاہتا ہو۔

اس کے بعد مندرجہ بالا معیار کے مطابق فنی الفاظ کی بھی ایک فہرست تیار ہونی چاہئے [illegible] بڑی تعداد میں کئی فنی اصطلاحیں ایسی ہیں جن کے بنانے میں غیر ضروری تصنع سے کام لیا گیا ہے۔ اور [illegible] کے لحاظ سے ان کا مطلب بالکل غلط ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ان کے پس منظر میں تاریخ کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ ایسے الفاظ [illegible] بہت [illegible] ہیں۔

اگر یہ دو فہرستیں تیار کر لی جائیں تو باقی زبان کے ارتقا پر چھوڑا جا سکتا ہے۔ کسی شخص کے [illegible] لکھنے پر پابندی نہ ہونا چاہئے۔ تعلیم کی ترقی سے پڑھنے والے بڑھیں گے جن کا زبردست اثر لازمی طور پر مصنفین اور مقررین پر پڑے گا، اور بے شک اس میں کوئی شک نہیں کہ رفتہ رفتہ ایک نفیس اور زوردار زبان پیدا ہوگی، اور وہ بھی کسی دباؤ کے بغیر وسعت پائے گی۔

یہ بات قابل حیرت ہے کہ ہم زبان کی بابت تو اس قدر جھگڑتے ہیں لیکن ہمارے پاس کوئی مکمل لغت نہیں ہے دنیا کی کسی بڑی زبان کو دیکھئے اس میں کتنی لغت اور انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ ہماری زبان کا معیار عدالتی زبان یا اسکول کی کتابوں کی زبان رہ گیا ہے۔ ہماری لغت بھی اسکول کے لڑکوں کے لئے ہوتی ہے، اس لئے سب سے پہلا قدم جو ہمیں اٹھانا چاہئے وہ مکمل اور عالمانہ لغات بنانے کے لئے ہونا چاہئے جو سنسکرت کے لئے بھی ہوں اور ہماری موجودہ زبانوں کے لئے بھی۔

جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے، کسی زبان کا نام اہم نہیں ہوتا بلکہ زبان کا سرمایہ اس کو اہم بناتا ہے جو کچھ کہ میں نے کہا ہے اور جو الفاظ کہ کل استعمال ہوتے ہیں ان کا لحاظ کرتے ہوئے میری نظر انتخاب ہندوستانی پر پڑتی ہے۔

رسم خط

جہاں تک رسم خط کا تعلق ہے یہ بالکل واضح ہے کہ ناگری رسم خط حاوی ہوگا۔ لیکن چونکہ میں تمدنی اور سیاسی نقطہ ہائے نظر سے تنگ نظری کی پالیسی کو غلط سمجھتا ہوں، اس لئے میری رائے ہے کہ اردو رسم خط کی جہاں ضرورت ہو اُسے تسلیم کیا جائے اور اُسے سکھایا بھی جائے۔ ہم عوام سے دونوں رسم خط سیکھنے کا مطالبہ نہیں کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ ان پر ایک بہت بڑا بوجھ ہوگا۔ لیکن ہمیں اردو رسم خط کو تسلیم کرنا چاہئے خصوصاً جہاں تک دستاویزات اور دوسرے کاغذات کے پیش کرنے کا تعلق ہے اس کے علاوہ ہمیں اردو رسم خط کے سکھانے کا بھی ان اسکولوں میں انتظام کرنا چاہئے جہاں کافی طلبہ اس کے سیکھنے کے خواہش مند ہوں۔

یہ طریقہ کار زبان کے بارے میں ہماری اس پالیسی کے عین مطابق ہے جس کا ہم کانگریس اور دستور ساز اسمبلی کے ذریعے اعلان کر چکے ہیں۔ یہ پالیسی یہ ہے کہ ہر بچے کو ابتدائی تعلیم اس کی مادری زبان میں دی جائے۔ بشرطیکہ ایک مخصوص علاقے کے بچے اس کے خواہش مند ہوں۔ اور اس پر آسانی سے عمل ہو سکے۔ اس طرح بھی [illegible]

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
۲۴ فروری ۱۹۵۰ء

زبان کا جھگڑا

اس پرچے میں آپ پنڈت جواہر لال نہرو کا مضمون زبان کے مسئلے پر پڑھیں گے۔ یہ مضمون خیالات کے لحاظ سے بھی قابلِ قدر ہے۔ لیکن اس سے زیادہ قابلِ قدر نقطۂ نظر اور اندازِ بیان کے لحاظ سے ہے۔ ہمارے ملک میں اس وقت ایک تو زبان کا "مسئلہ" ہے، جس پر ڈاکٹر تاراچند، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور پنڈت جواہر لال نہرو جیسے اہلِ نظر سکون اور سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں، اور جس کو ہندوستانی پرچار سبھا، اور ہندوستانی کلچر سوسائٹی کے اربابِ عمل خاموشی اور استقلال کے ساتھ حل کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، دوسرا "زبان کا جھگڑا" ہے جس کو غرض کے بندوں نے کھڑا کیا ہے اور جذبات کے بندے محض ضد اور تعصب کے جوش میں بڑھا رہے ہیں۔ مسئلے کا حل علمی دیانت اور تحقیق، غور و فکر اور صبر و تحمل چاہتا ہے۔ جو اس شورش اور ہنگامے کے زمانے میں کم یاب ہے۔ اس لئے اس میں دیر لگے گی۔ مگر کسی نہ کسی دن حل نکل آئے گا۔ اور وہ پائدار ہوگا۔ جھگڑے کا فیصلہ اس وقت کیا گیا تو فضا کی حالت کو دیکھتے ہوئے جلد بازی، تنگ نظری اور دھاندلی کا فیصلہ ہوگا۔ مگر یہ فیصلہ عارضی ہوگا اور بہت جلد منسوخ ہو کر رہے گا۔

ہمارے سامنے کئی ملکوں کی مثالیں ہیں، جن میں جرمنی کی مثال سب سے زیادہ سبق آموز ہے ۱۹۱۴ء سے پہلے جرمن زبان یورپ کی اور زبانوں کی طرح لاطینی اور یونانی لفظوں سے لدی ہوئی تھی اور عام طور پر رومن رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔ ملک میں تعلیم عام ہو گئی تھی اور عوام کے حلق میں ثقیل لاطینی اور یونانی لفظوں کا ٹھونسنا بہت وقت طلب تھا، اس لئے یہ کوشش کی جا رہی تھی کہ جہاں تک ہو سکے کلاسیکی زبانوں کے مشکل لفظوں کی جگہ ٹھیٹھ جرمن کے ہلکے پھلکے لفظ استعمال کئے جائیں۔ اتنے میں پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی۔ وطن کی اندھی محبت اور دوسری قوموں خصوصاً فرانسیسیوں کی شدید نفرت کے جوش میں جرمن زبان کو سہل بنانے کے بجائے اس کو شدھ بنانے پر زور دیا جانے لگا۔ چھوٹے چھوٹے سبک سادہ عام فہم الفاظ جرمن زبان سے محض اس جرم میں خارج کئے جانے لگے کہ وہ دراصل لاطینی یا یونانی ہیں اور ان کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے لمبے لمبے موٹے موٹے کڈھب اور کرخت مرکب الفاظ وضع کئے گئے جن میں سے ایک ایک لفظ بعض اوقات پوری پوری سطر گھیر لیتا تھا۔ اسی طرح رومن رسم الخط کی جگہ جو سارے یورپ میں عام تھا قدیم گاتھک رسم الخط کو جو اس سے کسی قدر مختلف تھا رواج دینے کی کوشش کی گئی۔ جب تک جنگ جاری رہی بناوٹی شدھ جرمن زبان کا ڈنکا بجتا رہا۔ لسانیات کے ماہر اور مبصر، صاحب ذوق شاعر اور ادیب جن کی [illegible] ظاہر ہے بہت کم تھی برابر سمجھاتے رہے کہ اس طرح [illegible] سے زبان بنتی نہیں بگڑتی ہے، پھیلتی [illegible] سکڑتی ہے مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون [illegible] تھا۔ ہاں جب جنگ کا طوفان فرو ہو گیا طبیعتوں کا ہیجان سکون پا گیا تو لوگوں کو محسوس ہوا کہ ان کی زبان اس طرح اینٹھ گئی ہے کہ ایک دوسرے کی بات اچھی طرح نہیں سمجھتا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ مصنوعی جرمن کی جگہ معمولی زبان جو صدیوں کی قدرتی نشوونما کے ذریعے سے بنی تھی بولی اور لکھی جانے لگی۔ یہ سات برس کے لسانی جہاد کا پائدار نتیجہ صرف یہ ہوا کہ گاتھک رسم الخط زیادہ مقبول ہو گیا مگر پھر بھی وہ رومن رسم الخط کو بے دخل نہ کر سکا۔

قومی زبان کے معاملے میں معقول اور منصفانہ رویّہ رکھنے والے لوگ اس مثال سے تسکین حاصل کر سکتے ہیں لیکن انھیں دو باتیں مدِنظر رکھنی چاہئیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ گو لسانی تعصب کے اس طوفان بے تمیزی کے فرو ہو جانے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ زمانے کی جس ہوا نے اسے اٹھایا تھا وہ بدل گئی، لیکن اس میں صحیح الذوق جرمن ادیبوں اور عالموں اور دوسرے بے تعصب اور انصاف پسند جرمنوں کی ہمت و استقلال اور ان کے سعی و عمل کو بھی بہت دخل تھا وہ عام رائے کے سیلاب کے ساتھ نہیں بہے بلکہ مضبوط چٹانوں کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہے۔ انھوں نے مخالفت اور طعن و تشنیع کے خوف سے حق کے دامن کو نہیں چھوڑا اور تعریف ہر دلعزیزی اور شہرت کی لالچ میں باطل کا ساتھ نہیں دیا۔ اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو نفرت اور تعصب کا سیلاب گذر جانے کے بعد بھی اپنے گہرے اثرات چھوڑ جاتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ انھوں نے زبان کے مسئلے کو سامنے رکھا۔ زبان کے جھگڑے میں نہیں پڑے انھوں نے تعصب اور ضد کا جواب تعصب اور ضد سے نہیں دیا۔ یعنی یہ نہیں کیا کہ زبان کو سہل بنانے کی کوشش چھوڑ دیں۔ اور شدھ جرمن کے حامیوں کی ضد میں خواہ مخواہ ثقیل یونانی اور لاطینی الفاظ استعمال کریں۔ یہ بھی نہیں کیا کہ گاتھک رسم الخط کی جو مروجہ شکست سے زیادہ مشابہ ہونے کی وجہ سے عوام کے لیے قابل قبول تھا مخالفت کریں یا اس کے

(بقیہ صفحہ ۴ پر)

بزمِ بے تکلف

"اسے بھئی کچھ اور بھی سنا۔ ٹیٹو دراصل ٹیٹو نہیں ہے۔"

"یادداشت! ذرا سانس لیجئے، حواس درست کیجئے۔ یہ ٹیٹو کیا بلا ہے؟ کوئی ٹوٹکا ہے، ٹوٹم ہے؟ آخر ہے کیا؟"

"اجی وہی مارشل ٹیٹو۔"

"اچھا وہ! یوگوسلاویہ کا راج پرمکھ؟"

"راج پرمکھ کی ایک ہی کہی۔ وہی تو ایک سچ مچ کا ڈکٹیٹر ہے۔"

"تو یہ سچ مچ کا ڈکٹیٹر جھوٹ موٹ کا ٹیٹو ہے؟ وہ کیسے؟"

"ابھی اخبار کی خبر سن کر آیا ہوں، ایک امریکی نامہ نگار نے پتہ چلایا ہے کہ ٹیٹو ٹیٹو نہیں ہے۔"

"امریکی نامہ نگار گھاس کھا گیا ہے۔ ساری منطق کا دار مدار اس قضیے پر ہے کہ الف الف ہے، بے بے ہے۔ تو پھر ٹیٹو ٹیٹو کیوں نہیں ہے؟"

"پوری بات تو سن لو۔ کہنے والا کہتا ہے کہ اصلی ٹیٹو جرمنوں سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ یہ ایک روسی فوجی افسر ہے جو ٹیٹو بن بیٹھا ہے۔"

"کہنے والا جھوٹ بولا، مگر بولنا نہ آیا۔ امریکی افسر کہا ہوتا تو ایک بات بھی تھی، بھلا روسی افسر روس سے یوں ٹرٹر کرتا جیسے یہ ڈکٹیٹر کرتا ہے؟ ہماری سدلی اور سیانی۔"

"تمھیں تو منطق چڑھ گئی ہے۔ سچی واقعہ ہے کہ خود ٹیٹو کے قریبی عزیز اس شخص کو نہیں پہچانتے، اور صاف کہتے ہیں یہ ہرگز ٹیٹو نہیں ہے، اور تم ہو کہ خواہ مخواہ منطق چھانٹ رہے ہو۔"

"کاش میرا بیل منطق پڑھا ہوتا! ارے بنکر ٹیٹو ذرا اپنے عقل کے ٹٹو کو ایڑ لگا اور اس بات پر غور کر۔ اگر یہ شخص بنا ہوا ٹیٹو ہوتا تو کس کس کو دھوکا دیتا اور کب تک دے سکتا؟ تمھارا وہ نیچیا نامہ نگار کہتا ہے کہ ٹیٹو کے عزیز اسے نہیں پہچانتے، اس کی یہ معنی ہوئے کہ یا تو اس کی شکل ٹیٹو سے نہیں ملتی یا اس کی حرکتیں، یا پھر دونوں ہی چیزوں میں وہ ٹیٹو نہیں بلکہ غیر ٹیٹو ہے، اب تمھیں بتاؤ کہ ٹیٹو پن کے بغیر ٹیٹو بن بیٹھنا کوئی ہنسی ٹھٹھا ہے۔"

"تمھاری ٹیں ٹیں سے تو جی گھبرا گیا۔ فرض کر دو تمھیں ٹھیک کہتے ہو۔ مگر آخر اس نامہ نگار کو جھوٹی خبر گھڑنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"قربان اس بھولے پن کے۔ حضرت کو آج تک یہی نہیں معلوم کہ اخبار والے جھوٹی خبریں کیوں گھڑتے ہیں۔ سنو، ایک اخبار نویس نے اس سوال کے جواب میں کہا ہے:

کبھی تن کی خاطر، کبھی وطن کی خاطر، کبھی من کی خاطر،
کبھی انجمن کی خاطر اور کبھی محض فن کی خاطر!"

"خدا پناہ میں رکھے اخبار والوں کے جھوٹ سے اور تمھارے پیچ سے، ان کے بے تکے پن سے اور تمھاری تک بندی سے!"

پچھلا ہفتہ: ہندوستان

ریل چل رہی ہے

ہندوستان کی پارلیمنٹ نے آٹھ دن کی بحث کے بعد بینک کمپنیوں کا قانون پاس کردیا اور ہندو کوڈ بل کے پیش ہونے کی منظوری دے دی۔ پچھلے ہفتے ہم نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ہندوستان میں معاشرتی قدامت پسندی کم سے کم تعلیم یافتہ طبقہ میں جس سے پارلیمنٹ کے ممبر تعلق رکھتے ہیں ختم ہو چلی ہے۔ لیکن ہندو کوڈ بل پر پہلے ہی دن کی بحث سے یہ ثابت ہو گیا۔ ع

جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے والے

وہ بل کو پاس ہونے سے تو نہیں روک سکتے ہیں لیکن اس کے پاس ہونے میں دیر لگا سکتے ہیں۔ اور اس پر تلے ہوئے ہیں کہ جتنی دیر لگا سکتے ہیں لگائیں گے۔ پنڈت ٹھاکر داس بھارگو اور چند حضرات نے پہلا اعتراض یہ لگایا، کہ بل جس شکل میں سلیکٹ کمیٹی نے مرتب کیا تھا اُسے ممبر قانون نے بدل دیا ہے اور یہ سخت قابل اعتراض بات ہے۔ مگر صدر نے رولنگ دی کہ ممبر قانون نے اسے باضابطہ شکل دینے کے لئے صرف معمولی اور اوپری تبدیلیاں کی ہیں جن سے نفس مطلب میں خلل نہیں پڑا اس لئے بل پیش ہو سکتا ہے۔ بل پر بحث آٹھ روز کے لئے اُٹھا رکھی گئی اس لئے کہ ریلوے بجٹ پر جلدی غور کرنے کی ضرورت تھی۔

۱۹۴۹-۵۰ء کا ریلوے بجٹ منگل ۱۵ فروری کو پیش ہوا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ آمدنی دو ارب ۱۰ کرور ہوگی۔ ایک ارب ۷۳ کرور کا خرچ نکالنے کے بعد ۳۲ کرور ۲۲ لاکھ بچت ہوگی۔ اس میں سے ۲۲ کرور ۸۰ لاکھ سود ادا کرنے کے بعد ۹ کرور ۴۲ لاکھ کا منافع ہوگا۔

ریلوے ممبر نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ ہندوستان کی سب ریلوں نے مل کر پچھلے سال کے مقابلے میں اس سال ۵۵ لاکھ میل فاصلہ زیادہ طے کیا جس کے معنی یہ ہیں کہ ٹرینوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا۔ اور مسافروں کی تعداد میں اضافہ کا تناسب اس سے زیادہ رہا۔ انھوں نے بتایا کہ مال گاڑیوں کی آمدورفت کی حالت پہلے سے کچھ بہتر ہے۔ لیکن ابھی تک وسائل ضرورت سے کم ہیں اس لئے پرائیرٹی ترجیح کا انتظام جاری رہے گا۔ انھوں نے مسافر گاڑیوں کے درجوں کی نئی تقسیم کا ذکر کیا اور یہ بشارت دی کہ چترنجن میں (جو آسنسول سے ۲۰ میل ہے) انجن بنانے کا کارخانہ قائم ہو رہا ہے جو ۱۹۵۱ء تک مکمل ہو جائے گا۔ ریلوں کے مزدوروں اور ملازموں کی شکایتوں کا ذکر کرتے ہوئے شری آئنگر نے اُن سے ہمدردی کا اظہار کیا اور یہ وعدہ کیا کہ وہ ان شکایتوں کو جہاں تک دور کر سکتے ہیں، کر دیں گے۔

پارلیمنٹ نے ریلوے ممبر کی رپورٹ کو ہمدردی سے سُنا۔ تنقید ضرور ہوئی مگر اسی کے ساتھ تعریف بھی ہوئی۔ تنقید میں زیادہ زور اس بات پر دیا گیا کہ ریلوے بچت عام آمدنی میں کیوں شامل کر لی جاتی ہے۔ اسے ریلوے کے انتظام کو بہتر بنانے خصوصاً تیسرے درجے کے مسافروں کے لئے سہولتیں بہم پہنچانے میں صرف کرنا چاہئے۔ تیسرے درجے کے مسافروں کی سب سے زیادہ پرجوش وکالت سیٹھ گوونداس نے کی۔ ان کی تقریر کا یہ نکتہ قابل غور ہے کہ وزیر اور بڑے حکام اب عام طور پر ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہیں۔ اس لئے انھیں ریل کے مسافروں خصوصاً تیسرے درجے کے مسافروں کی مصیبت کو دیکھنے کا موقع نہیں ملتا۔ اس لئے ان کی بے توجہی میں اور بھی زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔

واقعی جہاں تک تیسرے درجے کے مسافروں کا تعلق ہے ان کی مشکلوں میں قومی حکومت بننے کے بعد ذرا بھی کمی نہیں ہوئی۔ ان کے نقطہ نظر سے صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ غنیمت ہے ریل اب بھی چل رہی ہے۔ چند روز پہلے ریلوے ملازموں کی ہڑتال کی دھمکی سے اس میں شبہ پیدا ہو گیا تھا مگر ریلوے لیبر فیڈریشن نے ہڑتال کو ملتوی کر دیا ہے۔ اس لئے یہ خطرہ سر دست ٹل گیا ہے۔ ۲۱ فروری کو ریلوے ممبر نے وعدہ کیا کہ تیسرے درجے کی حالت کو سدھارنے کی مہم شروع کی جائے گی۔ دیکھنا ہے کہ یہ وعدہ کہاں تک پورا ہوتا ہے۔ اس وقت تو سب سے زیادہ ضروری ہے کہ ریلوے کے ملازموں خصوصاً مزدوروں کی شکایتوں کو جلد سے جلد رفع کیا جائے۔ پچھلے چند روز میں ایک ہزار کے قریب مزدوروں کے لیڈروں اور کارکنوں کی گرفتاری یہ ظاہر کرتی ہے کہ بے چینی بہت زیادہ ہے۔ اس قسم کی سختیوں سے ہڑتال کا خطرہ ٹل سکتا ہے، دور نہیں ہو سکتا۔

بخیر گذشت

دلی میں اکالی کانفرنس کے ہونے کی حکومت نے ممانعت کر دی تھی۔ اور مجلس استقبالیہ نے یقین دلایا تھا کہ کانفرنس نہیں ہوگی۔ مگر حکومت کا بیان ہے کہ ماسٹر تارا سنگھ صاحب کی تحریک سے چپکے چپکے کانفرنس کی تیاریاں کی گئیں اور کئی ہزار اکالی سکھ باہر سے آکر دلی میں جمع ہو گئے۔ خود ماسٹر تارا سنگھ ۱۹ فروری کو دلی آرہے تھے، مگر نریلے کے اسٹیشن پر اُتار لئے گئے اور پولیس کی حفاظت میں کسی نامعلوم مقام کو بھیج دئے گئے۔ اس پر دو دن تک دلی میں اکالیوں میں بڑی بے چینی رہی اور متعدد مظاہرے بھی ہوئے۔ مگر حکام نے اور سکھ لیڈروں نے بڑی موقع شناسی سے کام لیا اور اس بے چینی کو فساد کی صورت نہیں اختیار کرنے دی۔

ایک قرن کے بعد

مسلم یونیورسٹی میں مولانا آزاد کے ورود مسعود نے اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کر دیا کہ یونیورسٹی کی تاریخ کا وہ تاریک دور جو ۱۹۲۰ء میں شروع ہوا تھا ختم ہو گیا۔ اور اب ایک نئے تابناک دور کا آغاز ہے۔ آج سے کوئی ایک قرن پہلے مولانا، مہاتما گاندھی مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری کے ساتھ ترک موالات کی دعوت دینے کے لئے علی گڑھ تشریف لائے تھے جن کی اور دوسرے بزرگوں کی آواز پر کچھ معلم، بہتا دوں اور طالب علموں نے لبیک کہا تھا اور انھیں سے جامعہ ملیہ کی بنیاد پڑی تھی، لیکن مجموعی طور پر کالج نے جو قدر ریونیورسٹی بن گیا مولانا کی دعوت کو رد کر دیا تھا اور دروازہ اپنے دل کا دروازہ ان پر بند کر دیا تھا۔ اس انشراح قلب کی برکت ہے جو ملک کی آزادی کی بدولت یونیورسٹی کو حاصل ہوا ہے کہ وابستہ کھل گیا اور مولانا پھر علی گڑھ تشریف لائے۔ مگر اس مرتبہ ترک موالات کی نہیں بلکہ موالات کی دعوت دینے کے لئے۔ مولانا کے رسمی استقبال اور جلسہ تقسیم اسناد کی کارروائی ناظرین کو روزانہ اخباروں سے معلوم ہو گئی ہوگی۔ ہم آئندہ پرچہ میں ڈاکٹر ظفر حسین صاحب کی پرجوش اور پر خلوص تقریر جو موصوف نے مولانا کے خیر مقدم میں کی، اور مولانا کے کانووکیشن ایڈریس کے اہم اقتباسات پیش کریں گے اور اداریہ میں ان تاثرات کو بیان کرنے کی کوشش کریں گے۔ جو اس تاریخی تقریب نے سوچنے والے دماغوں میں پیدا کئے۔

زبان کا جھگڑا (بسلسلہ صفحہ ۳)

سیکھنے سے انکار کریں۔ وہ اعتدال اور سلامت روی کی راہ پر چلتے رہے، اس لئے ان کا اور شدھ زبان کے حامیوں کا اختلاف علمی اور ذہنی سطح پر رہا۔ جہاں تھوڑے آدمی بہت سے آدمیوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں، نفسیاتی سطح کی گہرائی میں نہیں اُترنے پایا جہاں اقلیت اکثریت کے سامنے بے بس ہو جاتی ہے۔

ان دو باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم جرمنی کی مثال سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اس میں شک نہیں کہ ہمارے ہاں لسانی تعصب کی شدت اس سے زیادہ ہے جتنی جرمنی میں تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ بے تعصب، معقول پسند صحیح مذاق اور منصفانہ طبیعت رکھنے والے لوگوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے، جن میں وزیر اعظم جواہر لال نہرو سب سے ممتاز ہیں۔ اس لئے یہ امید کرنا بے جا نہیں ہے کہ زمانے کی ہوا بدلنے پر جس کے آثار اب نظر آرہے ہیں یہ طوفان فرو ہو جائے گا۔ زبان کا جھگڑا مٹ جائے۔ اور زبان کا مسئلہ خوبی اور خوش اسلوبی سے حل ہو جائے گا۔

۲- پاکستان

سندھ کی نئی وزارت

یوسف عبداللہ ہارون جو سندھ اسمبلی کے ممبر نہیں ہیں۔ غلام علی تالپور کے مقابلے میں تین رایوں کی اکثریت سے سندھ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے لیڈر چن لئے گئے۔ اس کے بعد گورنر سندھ کی دعوت پر انھوں نے نئی وزارت قائم کرلی ہے جس کے ارکان کی فہرست اور ان کے محکموں کی تقسیم حسب ذیل ہے :-

یوسف ہارون۔ وزیر اعظم وزیر مالیات پولیٹیکل ملازمتیں اور عام نظم و نسق۔

قاضی فضل اللہ عبید اللہ۔ وزیر داخلہ تعلیمات، صحت، اور لوکل سلف گورنمنٹ۔

سید میران محمد شاہ۔ وزیر محصول اور مہاجرین کی آباد کاری۔

میر بندہ علی خاں تالپور۔ پبلک ورکس (مفاد عامہ)

نور محمد شاہ مراد علی۔ وزیر غذا، سول سپلائیز، انڈسٹریز اور قانون۔

حلف لینے کے بعد نئے وزیر اعظم نے صوبے اور عوام خصوصاً مہاجرین کی خدمت کا عہد کیا۔ پاکستان ٹائمز نے، یوسف ہارون کے اسمبلی پارٹی کے لیڈر منتخب ہونے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ابتدا میں تو بھی خدمت کا وعدہ کرتے ہیں، اس لئے ان وعدوں میں کوئی نئی بات نہیں ہے، دیکھنا یہ ہے کہ وہ کرتے کیا ہیں" اخبارات کا کہنا ہے کہ نئے وزیر اعظم کو اقلیتوں کا بھی اعتماد حاصل ہے۔

پاکستان کی صنعتی تعمیر کے منصوبے

گذشتہ ہفتے وزیر اعظم نے پاکستان کی صنعتی تعمیر کے سلسلے میں جو "پلاننگ (ایڈوائزری بورڈ)" بنا ہے، اس کے پہلے جلسے کا کراچی میں افتتاح کیا۔ اس ضمن میں موصوف نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ پاکستان کے صنعتی تعمیر کے سلسلے میں سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم پٹ سن تو پیدا کرتے ہیں لیکن اس کے کارخانے باہر ہیں، ہمارے ہاں کپاس کی افراط ہے۔ لیکن کپڑا ہم دوسرے ملکوں سے منگوا کر پہنتے ہیں۔ بلکہ چمڑے کی ہمارے ملک میں کمی نہیں۔ پر حالت یہ ہے کہ جوتوں کے لئے چمڑا ہمیں باہر سے منگوانا پڑتا ہے۔ الغرض پاکستان میں خام اجناس وافر ہیں، لیکن ان کو مصرف میں لانے کا کوئی انتظام نہیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم ان اجناس کو سستے داموں باہر بھیجتے ہیں، اور ان ہی سے بن کر جو چیزیں آتی ہیں ہم انھیں زیادہ دام دے کر خریدتے ہیں۔

آج ضرورت ہے کہ پاکستان میں جلد سے جلد ایسی صنعتیں جاری کی جائیں جن کے ذریعے ہماری خام اجناس خود ہمارے کام آسکیں اور جب تک یہ نہیں ہوگا، پاکستان کبھی ترقی یافتہ ملک نہیں بن سکتا۔ اب سوال یہ ہے کہ ان صنعتوں کا اجرا کیسے ہو؟ ہم بارہا عرض کرچکے ہیں کہ صنعتی تعمیر کا کام خود حکومت کو کرنا چاہئے۔ کیونکہ ہمارے ہاں وہ طبقہ موجود نہیں جو قومی تعمیر کے اس فریضے کو سرانجام دے سکے۔ تھوڑے، بہت جو روپے والے لوگ ہیں بھی وہ کارخانے قائم کرنے کی بجائے خام اجناس باہر بھیج کر زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس لئے ہونا یہ چاہئے کہ حکومت اس کام کو خود کرے۔

خوشی کی بات ہے کہ وزیر اعظم پاکستان نے اپنی تقریر میں اس امر کا یقین دلایا ہے کہ حکومت اس سلسلے میں مناسب کارروائی کررہی ہے، چنانچہ آیندہ پانچ دس سال کے اندر جو صنعتیں قائم کی جاسکتی ہیں، موصوف نے کہا کہ ان کے بارے میں منصوبے زیر غور ہیں۔ اس ضمن میں وزیر اعظم نے اس کی صراحت کردی ہے کہ پاکستان کی صنعتی تعمیر کا کام محض افراد کی خواہش پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔ البتہ ہم انفرادی طور پر افراد کو اس کا موقع ضرور دیں گے کہ وہ ایک حد کے اندر رہ کر جو صنعتیں قائم کرسکتے ہیں، کریں۔ صنعتوں کی تنظیم اور ان کی نگرانی حکومت اپنے ہاتھ میں رکھے گی۔

خدا کرے ہمارے کارفرما ان صنعتی منصوبوں کو جلد سے جلد عملی جامہ پہنانے کی طرف توجہ کریں۔ کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ آج پاکستان کے استحکام اور اہل پاکستان کی آسودگی کا تمام تر دارومدار صنعتوں کے قیام پر ہے۔ (آفاق، لاہور)

مسلمانان عالم کی کانفرنس

برطانوی پارلیمنٹ میں وزیر خارجہ مسٹر بیون نے فلسطینی پالیسی پر تقریر کرتے ہوئے یہ جملے کہے تھے کہ "مشرق وسطی کے مستقبل سے پاکستان کو گہری دلچسپی ہے اور اس علاقے کی سیاست میں جس میں افغانستان بھی شامل ہے، پاکستان جو فیصلہ کن پارٹ ادا کرے گا اسے نظر انداز کرنا انتہائی غیر دانشمندی ہے۔" ان فقروں کے غدا واسطے کے جلوں کی وجہ سے یہاں کے باخبر سیاسی حلقوں میں کافی چہ میگوئیاں ہورہی ہیں۔ یہ احساس کہ انگریز عالم اسلام کا دوست بن کر مشرق وسطی میں اپنی امارت کی آبیاری کرنا چاہتا ہے۔ دوروں میں سیاسی حلقوں میں شروع سے پایا جاتا تھا۔ لیکن مسٹر بیون کی حالیہ تقریر سے صاف واضح ہوگیا ہے کہ انگریز کی "اسلام دوستی" کی شکل کیا ہوگی، اس سلسلے میں یہاں کے جانکار سیاسی حلقوں کا کہنا ہے کہ سوائے مصر کے دیگر عرب لیگ کے ممالک میں جو طبقہ اس وقت برسر اقتدار ہے اس کی ذہنیت اس کے مفاد اور اس کا مستقبل انگریز اور صرف انگریز کے دامن ہی سے وابستہ ہے، اور کچھ بعید نہیں کہ عنقریب برطانیہ کے زیر سایہ اسلامی ممالک کے بلاک کی تجویز ہمارے سامنے آجائے۔ اس معاملے میں مصر کی وفد پارٹی اور جماعت اخوان المسلمین البتہ کافی رخنہ ثابت ہوسکتی ہیں۔ تاہم بڑی توقع ہے کہ بالآخر مصر بھی اس "دام" میں آہی جائے گا۔ قریب قریب یہی کیفیت ایران کی ہوگی۔ صرف افغانستان جس پر مسٹر بیون نے خاص زور دیا ہے شاید "ولایتی" جڑوں کے لئے کابلی اخروٹ ثابت ہو۔ لیکن آخر تابکے؟ اسی سلسلے میں یہ بھی کہا جارہا ہے کہ کراچی میں ہونے والی ورلڈ مسلم کانفرنس* اور بعد ازاں بین اسلامک انڈسٹریل کانفرنس جن کی تیاریاں سیٹھ یوسف ہارون کی سرکردگی میں یہاں زور شور سے ہورہی ہیں، اسی اسلامی بلاک کی تشکیل کی ابتدائی کڑیاں ہیں جن کو برطانوی وزارت خارجہ کا مکمل "آشیرباد" حاصل ہے۔

(آفاق، لاہور)

(یہ کانفرنس کراچی میں شروع ہوگئی ہے، مصر، افغانستان، عراق، سیلون انڈونیشیا، برما، سعودی عرب، ایران ٹیونس، یمن، سیریا، بخارا اور ملایا سے ڈیڑھ سو نمایندے شریک ہوئے ہیں۔ پروفیسر ابوبکر حلیم صاحب وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی نے ان نمایندوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے فرمایا کہ مسلمانوں کو فرقہ پرستی اور تنگ قومیت دونوں سے بچنا چاہیئے۔ ہم پاکستان کے رہنے والوں کو لیبیا، ٹیونس اور مراکو کا حال بہت کم معلوم ہے۔ اپنے پڑوسی وسط ایشیا کی جمہوریہ کا علم اس سے بھی کم ہے۔ یہ کانفرنس مختلف مسلم ممالک میں تجارتی اور سماجی تعلق پیدا کرنے کے لئے منعقد کی گئی ہے۔)

مسلم لیگ کے نئے صدر

۱۹ر فروری کو کراچی میں پاکستان مسلم لیگ کونسل کا جلسہ منعقد ہوا جس میں چودھری خلیق الزماں صاحب بالاتفاق مسلم لیگ کے صدر اور یوسف کھٹک صاحب بکثرت رائے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔ جنرل سکریٹری کے انتخاب میں بڑی ہماہمی رہی یہاں تک کہ صوبہ سرحد اور مشرقی بنگال کے وزیر اعظم اور مرکزی حلقوں کے دو وزیروں نے بھی کھٹک صاحب کی حمایت میں کھلم کھلا کام کیا۔ لیاقت علی خاں صاحب البتہ اس ہنگامہ سے بالکل الگ رہے اور پوری غیر جانبداری سے کام لیا۔ چودھری صاحب نے اپنے انتخاب سے قبل مسلم لیگ کے آرگنائزر کی حیثیت سے پچھلے سال کی رپورٹ پڑھی جس میں انھوں نے فرمایا کہ "اگرچہ پاکستان بالکل نئی حکومت ہے اور اس کا سیاسی تجربہ ابھی کچھ زیادہ نہیں ہے۔ مگر حکومت اور مسلم لیگ کا آپس کا تعلق عام طور پر اطمینان بخش رہا ہے" انھوں نے مزید فرمایا کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ایک پارٹی کی حکومت، ملک کی ترقی میں کچھ زیادہ ممد و معاون نہیں ہوتی جس وقت عوام کو اس خیال کی صحت اور سچائی کا احساس ہوجائے گا تو قدرتی طور پر دوسری سیاسی جماعتیں پیدا ہوجائیں گی لیکن جب تک ملک میں صرف ایک ہی جماعت ہے اس وقت تک جماعت کے عہدہ دار ایسے لوگوں کو منتخب کرنا چاہیے جو وزارتوں کے خواہش مند نہیں ہیں۔

* اس اجلاس کی ایک بات خاص طور پر قابل ذکر یہ ہے کہ اس کی پشت پر قائد اعظم محمد علی جناح کی تصویر کے ساتھ ساتھ مہاتما گاندھی کی تصویر کو بھی جگہ دی گئی تھی۔

۳ - باہر کی دنیا

شمالی اٹیلانٹک کی حفاظت

پریذیڈنٹ ٹرومین نے ۔ ۲۰ جنوری کو ایسے معاہدے کے امکان کا ذکر کیا تھا جس سے شمالی اٹیلانٹک کی حفاظت کا بہتر انتظام ہو سکے۔ اس وقت سے متحدہ ریاستوں کی وزارتِ خارجہ کینیڈا برطانیہ، فرانس، ہالینڈ اور بلجیم کی حکومتوں سے گفتگو کرنے میں مشغول ہے۔ اور حال میں ناروے کے وزیر خارجہ نے معاہدے کی شرطوں کو معلوم کرنے کے لئے امریکہ کا سفر کیا۔ متحدہ ریاستوں کی وزارت خارجہ ساری گفتگو کچھ اس طرح صیغہ راز میں کرتی اور مختلف ضروری مسئلوں خاص طور سے متحدہ ریاستوں کی ذمہ داریوں کو واضح کرنے سے کچھ اس طرح بچتی رہی کہ معاہدے کے چرچے سے اطمینان کے بجائے پریشانی میں اضافہ ہوا۔ کانگریس میں ممتاز سیاست والوں نے معاہدے کے بارے میں پوری معلومات حاصل کئے بغیر بحث کی تو متحدہ ریاستوں کے اعتبار کو خاصا نقصان پہنچا، اور وہ تمام موقعے یاد آ گئے جب وزارتِ خارجہ اور کانگریس کے اختلافات نے دنیا کو مصیبت میں ڈال دیا تھا۔ ناروے، ڈنمارک اور ہالینڈ جیسے کمزور ملک چاہتے ہیں کہ جب ان کی حفاظت کی تدبیریں کی جائیں تو انھیں کم از کم اتنا تو ضرور معلوم ہو کہ جب جنگ کا خطرہ پیدا ہوگا تو ان کا بچاؤ کیسے کیا جائے گا۔ اور اگر یہ نہ بتایا جا سکے تو وہ اپنے حق میں بہتر سمجھتے ہیں کہ انھیں کسی ایسی فرقہ بندی میں شامل نہ کیا جائے جو جنگ کے امکان کو نظر میں رکھ کر کی گئی ہو۔ ان کو سینیٹ کی خارجی تعلقات کی کمیٹی کے صدر مسٹر کونلی نے یہ کہہ کر بہت بھڑکا دیا کہ جنگ کا اعلان کرنا یا نہ کرنا کانگریس کے اختیار میں ہے اور کانگریس کسی ایسے معاہدے کی تصدیق نہ کرے گی جس کی رو سے خاص حالات کے رونما ہوتے ہی متحدہ ریاستیں خود بخود جنگ کی ایک فریق بن جائیں ۔ اس قول کی اور وضاحت مسٹر کونلی نے اس طرح کی کہ کانگریس کو ہر حالت میں یہ طے کرنے کا حق اور اختیار ہے کہ جنگ میں کون سا فریق حملہ آور ہے اور اس کے خلاف جنگ کا اعلان کیا جائے یا کوئی اور تدبیر آزمائی جائے۔ متحدہ ریاستوں کے دستور کے قاعدے سب کو معلوم ہیں اور در اصل مسٹر کونلی نے کوئی نئی بات نہیں کہی۔ مگر وہ ڈیموکریٹک پارٹی کے رکن نہ ہوتے بلکہ حکومت کے مخالف تو یہ سمجھا جاتا کہ وہ پریذیڈنٹ اور وزارت خارجہ کی تنبیہ کرنے میں صرف اپنی پارٹی کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ موجودہ صورت میں بھی وزیر خارجہ مسٹر ایکیسن کا یہ کہنا حقیقت کے خلاف نہیں کہ شمالی اٹلانٹک کے معاہدے کے بارے میں حکومت اور سینیٹ کی خارجی تعلقات کی کمیٹی میں کوئی اہم اختلاف نہیں ہے۔ مسٹر کونلی اور دو ایک اور کانگریسی لیڈروں کی تقریروں پر اخباروں نے جو رائے زنی کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاہدے کی مخالفت کا جو رنگ ان تقریروں میں تھا وہ توضیحی بیانوں کے ذریعے ہلکا کر دیا گیا، اور اب اس کی امید کی جا سکتی ہے کہ کانگریس معاہدے کی تجویز پر بغیر کسی مخصوص ذہنی کے غور کرے گی، اور اس کی تکمیل میں مدد دے گی۔

لیکن شاید اس سے بھی ان ملکوں کی زیادہ تسلی نہ ہو جن کی سلامتی کے لئے لازمی ہے کہ جنگ شروع ہوتے ہی متحدہ ریاستوں کی فوجیں اور ہوائی بیڑا فوراً مدد کو پہنچے۔ وہ جانتے ہیں کہ جنگ کے نئے طریقوں نے ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے کہ یورپ میں لڑائی ہو تو متحدہ ریاستیں غیر جانب دار نہیں رہ سکتیں ہیں۔ روس نے مغربی یورپ پر حملہ کیا تو متحدہ ریاستوں کو مجبوراً اس کے خلاف میدان میں آنا پڑے گا پھر اس کی کیا ضرورت ہے کہ متحدہ ریاستوں سے ایسا معاہدہ کیا جائے جس سے روس کے حملہ آور ہونے کا امکان بڑھ جائے اور متحدہ ریاستوں سے وقت پر مدد ملنے کی امید موہوم ہی رہے۔ شمالی اٹیلانٹک کا معاہدہ تو ہوگا، مگر اس میں اتنے ملک شریک نہ ہوں گے جتنے اس صورت میں ہوتے متحدہ ریاستیں فوجی امداد کی ذمہ داری لینا واضح طور پر قبول کرتیں۔

جاپان کا منصب

جاپان کی صنعت اور تجارت رفتہ رفتہ بحال ہو رہی ہے۔ پہلے صرف یہ کہا جاتا تھا کہ جاپان میں ایسی کوئی بھاری صنعت دوبارہ جاری کرنے کا امکان نہ رکھا جائے گا جو جنگ کے سامان تیار کرنے میں مدد دے سکے۔ اب یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ جاپان کو کسی منڈی میں تجارتی مال "ڈمپ" کرنے کی اجازت نہ دی جائے گی۔ معاشی اعتبار سے جاپانی اپنے پیروں پر کھڑے ہو رہے ہیں۔ اگرچہ ابھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ انھیں متحدہ ریاستوں کی معاشی امداد کی ضرورت نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہاں متحدہ ریاستوں کا قبضہ رہے یا نہ رہے، اور رہے تو کس منصب سے۔ پچھلے دنوں یہ خبر پھیلی تھی کہ متحدہ ریاستیں وہاں سے اپنی فوجیں ہٹانے والی ہیں، اور اس کا سبب یہ بتایا گیا تھا کہ روس کے مشرقی مرکز جاپان سے بہت دور ہیں، اور جنگ کا کوئی محاذ اس طرف قائم کیا گیا تو اس کی کوئی خاص اہمیت نہ ہوگی۔ پھر اس خبر کی تردید کی گئی۔ مگر اس طرح نہیں کہ عالمگیر جنگ کے نقشے میں جاپان کا مقام معلوم ہو جائے۔

ایک موٹی سی بات یہ ہے کہ متحدہ ریاستوں اور دوسرے جمہوری ملکوں کو اس کی کوشش کرنا چاہیئے کہ جاپان کو روس اور کمیونسٹ چین کی بڑھتی ہوئی طاقت کو رد کرنے کا ذریعہ بنائیں اور ایسی تدبیریں کریں کہ لڑائی ہو تو جاپان ان کا ساتھ دے۔ اس لئے ہمیں یہ فرض کرنا ہوگا کہ جاپانیوں میں اب عداوت کا جذبہ اور جمہوری ملکوں سے جنھوں نے مشرقی ایشیا میں ان کی حیثیت مٹا دی ہے بدلہ لینے کا کوئی خیال نہیں، اور جاپان میں ایسے لوگ نہیں ہیں جو جمہوری ملکوں کی سرپرستی کے بجائے روس اور کمیونسٹ چین کی ابھرتی قوت کو اپنی ترقی کا زیادہ آسان اور صحیح ذریعہ سمجھتے ہوں۔ لیکن اس سیاست کی شکست کے بعد جس کا نمونہ تانکا چین تھا اور جس کی پچھلی جنگ میں آزمائش کی گئی۔ اب جاپان میں کمیونسٹ پارٹی یا اسی کے سے مقاصد رکھنے والی کوئی اور پارٹی ہی اثر پیدا کر سکتی ہے۔ جاپان میں ایک کمیونسٹ پارٹی موجود ہے مگر متحدہ ریاستوں کی سیاست میں اتنی لچک نہیں ہے کہ وہ جاپان یا کسی اور مشرقی ملک کی انقلابی پارٹیوں کی حمایت کر کے اپنے آپ کو ان کے مقاصد سے ہم آہنگ کرے اور اس طرح جاپانی اور مشرقی کمیونزم میں اتحاد نہ ہونے دے۔ مٹھی بھر سرمایہ داروں کی سیاست قدرتی طور پر ہر جگہ زمینداروں اور سرمایہ داروں کی سرپرستی کرنے لگتی ہے اور ان طبقوں کو اپنا مخالف بنا لیتی ہے، جو حکومت اور زندگی کے نظام کی اصلاح کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ غالباً یہ خبر کہ امریکی فوجیں جاپان سے ہٹائی جانے والی ہیں اسی مصلحت سے پھیلائی گئی کہ جاپان کے امیر اور سرمایہ دار کمیونزم کے خطرے سے آگاہ کئے جائیں، اور ان پر ظاہر ہو جائے کہ اگر انھوں نے کمیونسٹوں کو قابو میں نہ رکھا تو امریکی فوجیں جاپان سے ہٹائی جائیں گی اور ان کی دولت اور معاشی اقتدار کے لئے کوئی سہارا نہ رہ جائے گا۔

چین میں صلح

اب پھر اس کی کچھ امید ہے کہ چینی کمیونسٹوں اور کومنتانگ کے درمیان صلح ہو جائے گی۔ کمیونسٹ لیڈروں کو یقین ہو جائے کہ مارشل چیانگ کائی شک پھر سیاست کے میدان میں نہ آئیں گے اور جو عداوت کمیونسٹوں سے اب تک برتی گئی ہے وہ دور ہو جائے گی تو ممکن ہے وہ چین کی تقسیم پر راضی ہو جائیں، اور جتنا ملک دریائے یانگ سی کے شمال میں ہے اُسے اپنے لئے کافی سمجھ لیں۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جنوبی چین کی کمیونسٹ تحریک خود بخود دب جائے گی یا اگر اسے دبانے کے لئے تشدد سے کام لیا گیا تو شمال کے کمیونسٹ اس سے اثر نہ لیں گے۔ نئے اور پرانے نظام زندگی میں اتنا فرق ہے اور پرانا نظام اتنا ناقص ثابت ہو چکا ہے کہ اب چین میں انقلابی تحریک کمیونسٹ اور کومنتانگ لیڈروں کے کسی سمجھوتے سے دبائی یا کمزور نہیں کی جا سکتی۔

م ۔ م

معذرت

آل احمد سرور

حسن کو مجھ سے گلہ ہے کہ بایں زعم وفا
میری الفت میں کبھی رنگ جنوں آ نہ سکا
شوق بے تاب سہی، پھر بھی گرفتار رہا
سخت زنجیر سہی، زنجیر کو ٹھکرا نہ سکا
چاندنی بکھری، بہار آئی، چمن جاگ اٹھے
نغمے ہونٹوں پہ بہت آئے مگر گا نہ سکا

دوست کہتے ہیں یہ نازک سے اشارے کب تک
نقطۂ نشتر سہی چلتی ہوئی تلوار نہیں
لالہ و گل کی پرستش کا زمانہ نہ رہا
آج وہ کون سی وادی ہے جو پر خار نہیں
خواب تیرے یہ حقیقت سے حسیں کیا ہوں گے
روزِ روشن شب انجم کا پرستار نہیں

میری محفل کو شکایت ہے مرے لہجے میں
صبح ہونے پہ بھی یہ رات کا ماتم کیوں ہے؟
نہ وہ سرشار ادائیں، نہ وہ بدمست جنوں
میرے ساغر میں مئے ہوش ربا کم کیوں ہو؟
پھول بس جائیں مگر قافلے رکتے تو نہیں
محفلِ عیش میں یہ نالۂ پیہم کیوں ہے

جلوۂ حسن سے گو آنکھ جھپک جاتی ہے
کیا کروں دل میں کوئی اور بھی غم رہتا ہے
ریت میں جذب ہوا جاتا ہے ہر قطرۂ خوں
چشم ساغر سے مگر پھر بھی لہو بہتا ہے
دن کے ہنگامے ہوں، یا رات کی خاموشی ہو
کہنے والے کو جو کہنا ہے وہی کہتا ہے

میرے خوابوں سے زمانے کے دئے روشن ہیں
حسن کا سحر بھی ہے، عشق کا اعجاز بھی ہے
ان اشارات کی بھرپور بلاغت کو تو دیکھ
پھول ہی روح چمن زمزمہ پرواز بھی ہے
دہر کے کرب کا آئینہ ہیں اشعار مرے
اور اس آئینے میں عکسِ نگہ ناز بھی ہے

گیت

ڈاکٹر مسعود حسین

آج سہی انکار!
لیکن کچھ تو بول
ان ہونٹوں کو کھول
جو کرتے ہیں پیار
آج سہی انکار!

کھول دے لال دوار
ہے بس اتنی چاہ
رکھ دے (کیا پرواہ)
ہر ہر بول پہ دھار
آج سہی انکار!

سب معنی بے کار
بولوں کو مت تول
ہوگا شر کا مول
مکھ کی بس جھنکار
آج سہی انکار!

غزل

تشنہ بریلوی

ساتھیو بے خطر ہے جادۂ شوق
اہتمام سفر ابھی نہ کرو
دل بہل سا گیا ہے نالوں میں
چرخ والو سحر ابھی نہ کرو
قافلے والے تھک رہے ہیں یونہی
چال کو تیز تر ابھی نہ کرو
منزل شوق آگئی ہے تو کیا
اختتام سفر ابھی نہ کرو
دیکھنے والے کیا سمجھ بیٹھیں
آنا جانا ادھر ابھی نہ کرو
ختم کرنا ہے دوستی اچھا
کچھ برا ہے اگر ابھی نہ کرو
وقت ہے اشک شعلہ بن جائیں
تشنہؔ ان کو گہر ابھی نہ کرو

۱۵ - دسمبر

علی گڈھ میں

ایک تماشائی (۷) کے قلم سے

وائس پریسیڈنٹ نے ہز اکسلنسی کے خیر مقدم میں بڑی موزوں اور برجستہ تقریر کی اور یونین کی آنریری رکنیت قبول فرمانے کی درخواست کی۔ موصوف نے دستخط کرنے شروع کئے تھے کہ ہال کی اونچی رنگین منقش چھت کے روشندان سے رنگ برنگ کے پھول برسنے لگے۔ جن لوگوں نے یہ سماں دیکھا ہے وہی اس کے لطف و دلکشی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ پھولوں کی رنگین نازک پنکھڑیاں روشنی میں نیچے سے اوپر تک ایک جھلملاتا ہوا استوان بن گئی تھیں۔ ہز اکسلنسی نے مہاتما جی کی تصویر کو بے نقاب کیا۔ تھوڑی دیر کے لئے سب کی نظر ہر طرف سے سمٹ کر اس پیکر صدق وصفا پر پڑی جس کی شبیہہ مصور نے بڑی چابک دستی سے تیار کی تھی۔ وہ چہرہ کیسی جگمگاتی شفاف و شگفتہ موجود تھی جس کو خاک و خون میں ملانے کی کوشش کی گئی تھی۔

موت زندگی کو کس طرح نابود اور ویران کرنے کے درپے رہتی ہے، لیکن موت کو نہیں معلوم کہ زندگی اس سے کتنا بھرپور انتقام بھی لیتی ہے۔ اور اس کی تباہ کاریوں سے اپنے حسن اپنی عظمت اور اپنے دوام کا طرح طرح سے اعلان و ابلاغ کرتی رہتی ہے۔ زندگی کے آلام اور ہوس کی الجھنوں نے ہمارے دل و دماغ کو اس درجہ ماؤف و مغلوب کر دیا ہے کہ ہمارے بڑے بڑے صاحبان فکر و نظر یہ کہنے لگے ہیں کہ انسانی جہد و فکر کا تمام تر ماحصل یہ ہے کہ انسان موت سے نجات کیوں کر حاصل کرے۔ یہ بات میری سمجھ میں تو آتی ہے لیکن دل اسے قبول نہیں کرتا۔ مجھے تو رہ رہ کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ موت نہیں زندگی اصل حقیقت ہے۔ اول و آخر ہے، ظاہر و باطن ہے، حق و قائم ہے۔

اس موقع پر مہاتما جی کی تصویر دیکھ کر کچھ کم سال بھر کا وہ حادثہ یاد آگیا جب ایک شام کو اسی وقت ان کے سینے کو گولی کا نشانہ بنایا گیا تھا، اس سینے کو جہاں ہم سب کے لئے ان کی گڑگڑاہٹیں دبا رکھی تھیں کیسی گڑگڑاہٹیں جن کے سامنے تاریک سے تاریک طاقت اور تعصب کی گونج اور گرج سرنگوں ہو گئی۔ دلی جس وقت ذبح ہو رہی تھی اور عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کی پیہم کرب و کراہ کا فرش سے عرش تک ایسا ہجوم تھا کہ کبھی کبھی نزول رحمت پروردگار بھی ناممکن سا معلوم ہونے لگتا تھا۔ صرف مہاتما جی کی گڑگڑاہٹ تھی جو دن رات گوشے گوشے میں سنائی دیتی تھی۔ اور سچا کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ کوئی اس کو اہمیت نہیں دیتا تھا کہ کہاں سے کسی فوج یا پولیس دلی میں آئی یا فوج یا پولیس نے کہاں قابو پالیا۔ کانوں اس پھسکے رہتے تھے کہ مہاتما جی نے کیا کہا، کس کے سر پر ہاتھ اور کس کے زخم پر مرہم رکھا۔ وہ سوتے بھی ہوں گے لیکن باہر والے یہی سمجھتے تھے کہ وہ بیدار ہیں اور بے اختیار ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ عزیزوں، دوستوں کی طرف سے تردد بڑھنے لگتا تو دل میں یہ بات آتی تھی کہ الحمد اللہ مہاتما جی دلی میں ہیں۔ ممکن ہے اب تک انھوں نے لوگوں کے دلوں پر قابو پالیا ہو، کیا تعجب کسی وقت ایسا ہو کہ لوگ ظلم اور زیادتی سے یک بیک ہاتھ کھینچ لیں اور مہاتما جی کے سامنے آکھڑے ہوں کہ ہم کو معاف کر دیجئے، اور ہم سے راضی ہو جائیے۔ ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت موجزن ہو گئی ہے۔ پھر ایک دن شام کو آج ہی کی طرح کی شام کو دلی سے بھونچال آگیا کہ مہاتما جی گولی کھا کر اور سلام کر کے رخصت ہو گئے!

برائی اور بھلائی کا یہ پہاڑ، اور گوشت پوست کا یہ پیکر نحیف جب نفرت اور درندگی کے سیلاب کو یہاں نہ روک سکا تو ان حزیں ارواح کی تسکین کے لئے دوسری دنیا کو رخصت ہو گیا جنھوں نے بلکتے بے بس و بے کس بچے چھوڑے جن کی لڑکیوں، بہنوں، بیویوں کی عصمت لوٹی گئی۔ جن کے بوڑھے ماں باپ کی آنکھوں سے روشنی اور دلوں سے ارمان و محبت کی تازگی اور گرمی چھین لی گئی تھی، اور جن کی حیثیت متحرک لاشوں کی رہ گئی تھی۔ خدا کی بے پایاں رحمتوں میں اس کے برگزیدہ بندوں کی رحمتیں بھی کتنا بڑا درجہ رکھتی ہیں!!

اس تصویر کو دیکھ کر مہرولی میں حضرت بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کا وہ عرس بھی یاد آگیا جو مہاتما جی ہی کی کوششوں اور اصرار سے بڑے خطرات میں جب دلی پر وحشت و دہشت برس رہی تھی منایا گیا تھا۔ مزار کے سامنے مہاتما جی گہری سوچ میں گردوپیش سے بالکل بے خبر سر جھکائے کھڑے تھے، خاموشی کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص اور ہر شے پر سکوت و سکون کے بت ہونے کا گمان ہونے لگا تھا۔ جیسے اس موقع کے احترام میں عوامل کائنات نے مقررہ وظائف روک دئے ہوں۔ کیسا عجیب یہ سماں تھا ایک نحیف نیم برہنہ ناقابل التفات سا انسان ایک معمولی سی لکڑی کے سہارے ایک فقیر کے مزار کے سامنے آنکھیں بند کئے جھکا ہوا کھڑا تھا، لیکن اس کے ساتھ اور اس کے سامنے ساری کائنات اپنے تمام طنطنہ اور تہلکہ کے ساتھ دم بخود تھی

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ دو بڑی روحیں ہم کو دور بہت ہی دور ابد کی کسی سنسان پر اسرار وادی میں ایک دوسرے سے ہم کلام ہیں۔ دیر تک مہاتما جی عالم استغراق میں رہے، پھر چونکے اور ایک خاص عالم میں دلی واپس آگئے۔

پھر میرے ذہن میں گاندھی جی کی ڈانڈی مارچ کا نقشہ تیزی سے سامنے آکر نکل گیا۔ مصور نے کس خوبی سے اس مارچ کو رنگ اور خطوط میں اسیر کیا تھا۔ تصویر کی جزئیات مجھے یاد نہیں رہیں لیکن اس کا سماں اور اس کی فضا شاید میرے ذہن میں ہمیشہ کبھی محو نہ ہو، گاندھی جی اپنے چند رفقا کے ہمراہ ایک ریتیلے میدان میں آگے بڑھ رہے ہیں جسم پر صرف لنگوٹی، اور ہاتھ میں ٹیڑھی میڑھی سی ایک لمبی لکڑی ہے۔ کہاں جا رہے تھے وہ ہندوستان کے کروڑوں ننگے بھوکے پامال کس مپرس، بیمار بیچارے غلاموں کو ان فراعنہ کے چنگل سے نجات دلانے جن کی تصرف میں وہ سب کچھ تھا جو زمینوں پر ہے اور زمینوں کے اندر ہے۔ سمندروں پر ہے اور سمندروں کے اندر ہے، فضاؤں میں ہے، ذہنوں میں ہے، کتابوں میں ہے اور علم و حکمت کے بطن میں ہے، یہاں تک کہ کچھ عجب نہیں کوئی یہ کہہ بیٹھے کہ جن کے قبضے میں شاید خود خدا تھا! تصویریں واضح نہ تھیں صرف سراپا کا دھندلکا فضا سے بڑی خوبی کے ساتھ ہم آہنگ تھا۔ اس تصویر کو دیکھ کر مجھے اقبال کے دو مصرعے بے اختیار یاد آئے ایک تو

منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی!

اور دوسرا

وہ حشر بے برگ و ساماں وہ سفر بے سنگ و میل!!

اس قافلے نے اس ریگستان میں کس کس طرح ہل چلائے اور راستے کیسے کیسے سراب و سموم سے سابقہ رہا سب جانتے ہیں۔ لیکن دھن کا پکا، اور محبت کا دھنی سردار اژدہے کے منہ میں اتر کر اس کے پیٹ کے اندر سے ہندوستان کو جیتا جاگتا باہر کھینچ لایا۔ ہندوستان آزاد ہو گیا، مگر سردار کو گولی مار دی گئی۔ پھر تردد پیدا ہونے لگا کہ سردار نے جس ہندوستان کو اژدہے کے پیٹ میں سے نکالا، وہ وہی ہندوستان تھا جس کو اژدہے نے نگلا تھا یا اس اژدہے کا بچہ تھا اور اصل ہندوستان اژدہے کے پیٹ میں ختم ہو چکا تھا۔

(باقی آئندہ)

کشکول محمد علی شاہ فقیر

چودھری محمد علی

(یہ شاہ صاحب میدان ادب کے ایک چابک دست شہسوار ہیں جن کا انداز قدر فقیری کے جامے میں بھی صاف پہچانا جاتا ہے۔)

یہ سبز تحفہ درویشں میں عجیب حکمت کا نسخہ پایا جاتا ہے۔ ہندوستان کے اطباء کو اس کے لئے جہاں تک سراہئے بجا ہے۔ پان کا بیڑا صرف ہندوستان نے اٹھایا ہے۔ سبز پان میں حسب ذیل چیزیں موجود ہیں جن پر زندگی کا مدار ہے۔ اور جن میں تفریح اور تقویت کا سامان ہے۔ ملاحظہ ہو۔

سبز پان کا پتا

پانی کا جز	۸۴٫۴
پروٹین (لحمیات) (جو جسم کی تعمیر کے کام آتا ہے)	۳۰٫۱
دہنیت	۰٫۸
معدنی اجزاء	۲٫۳
کاربوہائیڈریٹ (شکر وغیرہ کے اجزاء جو جسم کی بھٹی کا ایندھن ہیں)	۶٫۱
چونا	۰٫۲۳
ریشے	۲٫۳
فاسفورس	۰٫۰۰۴
لوہا	۵۰٫۷
کیلوریفک یعنی حرارت حیوانی	
سو گرام میں	۴۰
حیاتین الف	نہیں ہے
کروٹین جو حیاتین الف کی کمی کو پورا کرتی ہے۔	۹۶ (بین الاقوامی اکائی)
حیاتین ب	نہیں ہے
حیاتین ج	۵
کیلوری یعنی حرارت کی اکائی	
فی اونس	۳

ڈلی (چھالیہ)

پانی	۳۱٫۳
پروٹین	۴٫۹
دہنیت	۴٫۴
معدنی اجزاء	۱
ریشے	۱۱٫۲
کاربوہائیڈریٹس	۴۷٫۲
چونا	۰٫۰۵
فاسفورس	٫۱۳
لوہا	۱٫۵

حرارت حیوانی	ایک سو گرام میں	۲۴۸
کیروٹین	" "	۵
حرارت کا جز	فی اونس	۷۰

الائچی

پانی		۲۰
پیروٹین		۱۰٫۲
دہنیت		۲٫۲
معدنی جزو		۴٫۵
ریشے		۲۰٫۱
حرارت حیوانی کا جزو		۴۲٫۱
چونا		٫۱۳
فاسفورس		٫۱۶
لوہا		۵
حرارت حیوانی	فی سو گرام	۲۲۹
حرارت کی اکائی	فی اونس	۶۵

لونگ خشک

پانی		۲۳٫۵
پروٹین		۵٫۲
دہنیت		۸٫۹
معدنی جزو		۵٫۲
ریشے		۹٫۵
حرارت حیوانی کا جزو		۴۷٫۹
چونا		٫۷۴
فاسفورس		٫۱۰
لوہا		۴٫۹
حرارت حیوانی	سو گرام میں	۲۹۳
حرارت حیوانی کی اکائی	فی اونس	۸۳

کتھا

مدل ہے، قابض ہے۔ چونے کا فساد کہلاتا ہے۔ چونے سے مل کر سرخ ہو جاتا ہے۔ کیمیاوی اجزاء کا پتہ نہیں چلا سوا اس کے کہ ٹیننگ ایسڈ اس سے نکلتا ہے اور دست پیچش اور آنتوں سے خون آنے میں دیا جاتا ہے۔

چونا

یعنی کیلشیم کی خوبیاں جس ڈاکٹر سے چاہے پوچھ لیجئے۔ ہر کم ورآدمی جس کے پاس ڈاکٹر کو فیس دینے کے پیسے ہیں، اس کے فائدے سے واقف ہے سوا کتھے (سوا کتھے چونے کے اور سب حساب ہیلتھ بلیٹن نمبر ۲۳ گورنمنٹ آف انڈیا سے لیا گیا ہے مرتبہ ڈاکٹر ایکرائڈ، ایم، ڈی تنباکو اور کتھے کا حساب انسائیکلو پیڈیا برٹینکا سے لیا گیا ہے)

بدقسمتی سے تنباکو بھی پان کے ماتھے لکھ گئی ہے۔ اس کا ذکر اس سلسلے میں نہ کرنا ایسا ہے جیسے کسی کہانی میں سے اس حرام زادے آدمی کا حال نکال ڈالو جو عاشق معشوق کو ملنے نہ دیتا ہو۔ اس میں نکوٹین ہوتی ہے جو زہر ہلاہل ہے مگر غنیمت ہے کہ وہ بہت کم ہے اس کا زہر دور کرنے کے لئے مختلف چیزیں اس میں ملائی جاتی ہیں جو پرانے خیال کے موافق اس کا فاد سمجھی جاتی ہیں، جیسے زعفران وغیرہ، مگر آج کی کیمیاوی ترکیب ان کی قائل نہیں ہے۔ تنباکو میں مختلف نمک، نشاستہ شکر اور نہ معلوم کون کون خاک دھول الابلا ہوتی ہیں اس کا کھانا اس کے پینے سے زیادہ مضر ہے۔ کیونکہ نکوٹین دھواں پیدا ہونے کے پہلے ہی جل جاتی ہے اس کا زہر پانی میں ہی مل کر رہ جاتا ہے۔ اس لئے حقے میں تو ہر طریقے سے کم مضر ہے۔

اگر میں شاعر ہوتا تو گلوریوں کی تعریف میں قصیدہ لکھتا مگر مجبوری ہے۔ پان کی ایک معاشرتی خوبی ہے جس پر اکثر لوگوں کی نظر نہیں جاتی یعنی بار بار منہ چلانے سے آدمی باتیں کرنے کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ یہ معاشرتی فائدہ بہت بڑا ہے۔ جیسے بخار میں پاؤں میں جھانواں کرنے سے مصنوعی گرمی اصلی گرمی کی طرف لے جاتی ہے اور ٹھنڈے پاؤں گرم ہو جاتے ہیں، اسی طرح بار بار منہ کی حرکت سے موضوع دماغ میں آنے لگتے ہیں جو لوگ صحبت میں منہ باندھے بیٹھے رہتے ہیں ان کو پان کھلا کر آزمائیے۔ کھانے کے بعد پان منہ کو غذا کی بو سے خوب صاف کرتا ہے۔ پان کھانے سے منہ کے اندر کے ہزاروں غدود رستے ہیں جن سے ہضم غذا کا کام شروع ہوتا ہے، جو بہت مفید ہے۔ چہرے پر خون دوڑتا ہے۔ نہ اس قدر کہ دماغ پر دھکا لگے، بلکہ صرف اتنا جو دیکھنے والے میں خوش دلی پیدا کرے۔ کیونکہ صحت اور تندرستی کے آثار دیکھ کر قلب کو سکون ہوتا ہے۔ اعتدال ہر چیز میں ضروری ہے۔ پان کی زیادتی سے منہ کو اگالدان بنا دینا ایسا ہی ہے جیسے زیادہ پلاؤ کھا جاؤ اور تخمہ ہو جائے۔ دنیا لپ اسٹک کے لئے نہ معلوم کون کون زہریلی چیزیں اور اقتصادی تباہی اکٹھا کرتی ہے۔ ہماری لپ اسٹک یہی گلوری ہے۔ ہائے لا استاد کیوں کیسی کہی۔

میر۔ یوں کہئے، یوں کہئے، یوں کہتے جو یار آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

بیاں۔ جاتا ہے یار کچھ تو بیاں منہ سے بول لے
اے بے نصیب مانع گفتار کون ہے

مجنوں۔ بن کے سائل بھی نہ نکلا کوئی کام
در پہ پہنچا تو صدا بھول گیا

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

ہریجن کاست

سروودے کا تصور

ونوبا بھاوے

آج دنیا کی حالت فکر کے لائق ہے ۔ جدھر دیکھئے، لڑائی کا بازار گرم ہے ۔ فلسطین میں عربوں اور یہودیوں کی کش مکش چلی جا رہی ہے ۔ چین کی جنگ جس میں بھائی بھائی کا گلا گھونٹ رہا ہے انتہا کو پہنچ گئی ہے ۔ ڈچ حکومت نے بیٹھے بٹھائے انڈونیشیا پر حملہ کر دیا ہے ان بے جھگڑوں نے اس لڑائی کی یاد کو جو ابھی ختم ہوئی ہے تازہ کر دیا ہے ۔ جاپان میں عدالتی مقدموں کی لیلا رچنے کے بعد ان لوگوں کو جو جنگی مجرم کہلاتے ہیں موت کی سزا سنا دی گئی ہے ۔ اس سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ ایشیا میں امن توڑنے کا ذمہ دار صرف جاپان ہے اور جو لوگ اس کے لیڈروں کو قتل کی سزا دے رہے ہیں وہ امن کے پیام بر ہیں ۔ اور ان جنگی مجرموں کے مرتے ہی دنیا میں امن قائم ہو جائے گا ۔

خود ہندوستان میں بھی کشمیر کے معاملے میں ہتھیاروں سے کام لینے کی ضرورت پڑی ۔ یہ سوال الگ ہے کہ اس کی ذمہ داری کس پر ہے ۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ اس کشمیر کا مسئلہ اہنسا کے ذریعے طے نہیں ہو سکا ہندوستان میں سیاسی اتحاد بڑھتا دکھائی دیتا ہے چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ملا کر بڑے حلقے بنائے جا رہے ہیں، لیکن اتنا ذہنی اتحاد نظر نہیں آتا ۔ میں ایک مثال دیتا ہوں مدھیہ بھارت یونین قائم ہو گیا ہے مگر اس کی وجہ سے دو نئے جتھے بن گئے ہیں ۔ ایک اندور کا جتھا دوسرا گوالیر کا ۔ حیدرآباد کا مسئلہ وسیع معنی میں حل ہو گیا لیکن ریاست کے اندر کانگرس دو پارٹیوں میں بٹ گئی ہے غرض ہر طرف تفریق کا رجحان زور پکڑ رہا ہے مختلف سیاسی پارٹیوں میں طالب علموں کو ہاتھ میں لینے کے لئے مقابلہ ہو رہا ہے ۔ گویا وہ مچھلیاں ہیں جنھیں جال میں پھانسنا ہے ۔ مزدوروں سے بھی اسی طرح فائدہ اٹھایا جا رہا ہے اور اصل گتھی سلجھنے کی جگہ اور الجھتی جا رہی ہے ۔

لسانی صوبوں کا مسئلہ سیدھا سادہ تھا ۔ مگر اسے بھی پیچیدہ بنا دیا گیا ۔ کوئی شخص اس کے لئے تیار نہیں کہ دوسرے کی تجویز کو فوراً مان لے ۔ اگر ایک صوبے کے چند لاکھ آدمی دوسرے صوبے میں رہ جائیں تو کون سا غضب ہو جائے گا ؟ جب ساری طاقت مرکز کے ہاتھ میں ہے تو سرحد کے معاملے میں دوسرے فریق کی رائے مان لینے میں کوئی نقصان نہیں ۔ مگر لوگوں کی ضد اور بے لوچ رویے کی وجہ سے معاملہ اٹک گیا ہے اور کمیشن اور کمیٹیاں مقرر کی جا رہی ہیں

ہندی، ہندوستانی کا جھگڑا زبان کی شکل کے بارے میں اتنا نہیں جتنا نام کے بارے میں ہے ۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ آخر قومی زبان کا مقصد کیا ہے؟ یہی نا کہ قومی اتحاد ہو ؟ پھر اس میں جھگڑے کے شیطان کو بیچ میں کیوں آنے دیا جائے ؟ مگر ضد نے ہم سب کو اندھا کر دیا ہے ۔ لوگوں کی یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے اور اگر ہم اپنی قوت چھوٹی چھوٹی چیزوں پر ضائع کرتے رہے تو ہم میں بڑے مسئلوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رہے گی ....

حضرت عیسیٰ نے فرمایا ہے " اپنے مخالف کی بات کو محبت سے مان لو " اس قول پر اچھی طرح غور کیجئے ۔

ان سب باتوں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کے دل میں مایوسی کا جذبہ پیدا کیا جائے میں یاس پرست نہیں ہوں اس لئے کہ میں جانتا ہوں کہ روح ایک ہی ہے جس میں کامل ہم آہنگی ہے کوئی تفریق اور تقسیم نہیں ۔ یہ اختلاف اور جتھے بندیاں جو سطح پر نظر آتی ہیں دراصل بہت چھوٹی ہیں ، لیکن صاف ستھرے کپڑے پر ایک خفیف سے دھبے کی طرح وہ ہماری توجہ کو فوراً اپنی طرف کھینچتی ہیں ۔ میں تو اس وقت بھی پریشان اور مایوس نہیں تھا جب عالم گیر جنگ ہو رہی تھی ۔ میرا عقیدہ تھا اور ہے کہ عالم گیر لڑائیاں خدا کی طرف سے ہیں ۔ شاید یہ بلائیں انسان پر سزا کے طور پر نازل ہوتی ہیں ۔ مگر دراصل ان سے اس کی ترقی مقصود ہے ۔ یہ دیکھنے میں کتنی ہی بڑی معلوم ہوں مگر یہ اس ابدی روح میں ایک نقطے سے زیادہ نہیں جو تھوڑی دیر رہتا ہے ، اور پھر غائب ہو جاتا ہے ۔ میں ان باتوں کا ذکر اس لئے نہیں کرتا کہ آپ اپنا دل تھوڑا کریں بلکہ اس لئے کہ سوچیں مجھے تو اس کا حل سرودے کے تصور میں نظر آتا ہے لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ سرودے سماج کا نظام کیا ہے ؟ میں کہتا ہوں کہ یہ ایک انقلابی خیال ہے کوئی نظام نہیں ہے ۔ یہ ایک چیز ہے سوچنے کی اور برتنے کی ۔

" زیادہ سے زیادہ آدمیوں کا زیادہ سے زیادہ فائدہ " ایک مغربی تصور ہے جس کے اندر اکثریت اور اقلیت کے مسئلے کا بیج موجود ہے ۔ لیکن سرودے کا تصور جس کی تلقین گیتا نے کی ہے یہ ہے کہ اپنے آپ کو سب کی بھلائی میں کھپا دو ۔ ظاہر ہے کہ یہ ہم سے ستیہ اور اہنسا پر کامل عقیدہ چاہتا ہے ۔ ہمیں اپنی نجی اور عمومی زندگی میں اپنے کاروبار میں اور دوسرے مشاغل میں کبھی جھوٹ سے کام نہیں لینا چاہئے ہمیں انتہائی کوشش کرنی چاہئے کہ ہنسا (تشدد) کو اپنی زندگی میں راہ نہ پانے دیں ۔ ہمیں تعمیری پروگرام پر جو

سماج کے ادھار کے لئے بنایا گیا ہے جزوی یا کلی طور پر فرد کی حیثیت سے یا دوستوں اور رفیقوں کے ساتھ مل کر عمل کرنا چاہئے ، اور جہاں ضرورت ہو مقامی ادارے قائم کرنے چاہئیں ۔ ہمیں اس بڑی حقیقت پر غور کرنا چاہئے جو اس کی تہہ میں ہے ، اس کو اپنے عمل میں ظاہر کرنا چاہئے اور ہر وقت یاد رکھنا چاہئے ۔

اگر ہم چھوٹے بڑے سب کی توجہ اس عظیم الشان تصور پر جما دیں تو اس میں سے دنیا کے سب مسئلوں کا حل نکل آئے گا ۔ موجودہ سیاسی طریقوں سے جو دنیا میں آزمائے جا رہے ہیں کچھ کام نہیں چلے گا ۔

(انگریزی سے ترجمہ)

" کشکول محمد علی شاہ فقیر " (بسلسلہ صفحہ)

حالی ۔ مؤثر ہے بہت حالی ترا وعظ
کل اس کے سامنے بھی کچھ بیان ہو

جلال ۔ گئی تھی کہہ کے میں لاتی ہوں زلف یار کی بو ۔
پھری تو باد صبا کا دماغ بھی نہ ملا

غالب ۔ تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

حافظ ۔ صبا بلطف بگو آں غزال رعنا را
کہ سر بکوہ و بیاباں تو دادہٴ مارا

نواب سعادت علی خاں کے وقت میں ان کا ہاتھی ریزیڈنٹ کی چوکڑی سے آگے نکل گیا ۔ نواب نے کہاروں کو انعام دیا حالانکہ سعادت علی خاں سے یہ ذرا تعجب ہے ۔ کہار لوگ اس خوشی میں ناچے ۔ یہ ناچ کہروا کہلایا ۔ یہ ناچ دلی میں نہ تھا صرف لکھنؤ میں ایجاد ہوا ۔ اس کی لے ہے :۔

" دھن دھاگے ناتے تک ۔ دھن دھا ۔
تو دھا " پر سم ہے

عشق میں جی کو صبر و تاب کہاں
اس سے آنکھیں لگیں تو خواب کہاں

جاگ پڑی میں تو پیا کے جگائے
بھور ہوت جب پیا مورے آئے

ان نینن میں نیند کہاں ہے
جن نینن میں آپ سمائے

یہ ٹھمری عالی جاہا والا قدر نواب وزیر مرزا رحو کی والے کی ہے ۔ مرحوم نے اس کو تلنگ میں باندھا ہے ۔ مدرس صاحب اعتراض نہ فرمائیں کہ صبح کو نیند آگئی تو دوسرے مصرعے کا دعوےٰ غلط ہو گیا ۔ صبح کو ذرا سی آنکھ لگ جانا فطرت ہے ۔ مثل ہے کہ نیند تو سولی پر آ جاتی ہے ۔ مگر اس نیند کو نیند کون کہے گا ۔

اس محرومی پر تو نظر کیجئے کہ جس کی وجہ سے نیندیں اڑ گئیں اسی نے صبح ہوتے جگا یا ۔ وہ یہ سمجھ ہی نہ سکا کہ اس نے رات بھر تارے گنے تھے ۔

زندگی اور ادب کی تعمیرِ نو

(۱)

(ہندوستانی عورت کے نقطۂ نظر سے)

صالحہ عابد حسین

سائنس والے کہتے ہیں کہ ہر چیز کی فطری خاصیت یہ ہے کہ جہاں ہے وہیں بھی رہے، یا جس ڈگر پر چل رہی ہے اسی پر چلتی رہے۔ جب تک کہ باہر سے کوئی قوت اسے اپنی جگہ یا اپنا رخ بدلنے پر مجبور نہ کر دے۔ سچ پوچھئے تو انسان بھی اسی طرح لکیر کا فقیر ہے۔ جب تک کہ زمانے کا زبردست ہاتھ اسے جھنجھوڑ کر نہ جگائے وہ ایک ہی طرح کی زندگی میں مگن رہتا ہے اور اس میں کسی طرح کی تبدیلی محسوس نہیں کرتا۔ بچارے مشرق والوں کو تو ساری دنیا کہتی ہے کہ مدتوں سے غفلت کی نیند سو رہے ہیں، مگر خیر سے مغرب والے بھی اس صدی کے شروع میں علم، دولت اور حکومت سے سیر ہو کر اونگھنے لگے تھے۔ پچھلی جنگ عظیم نے انھیں کچھ ہوشیار کیا اور انھیں یہ احساس پیدا ہوا کہ زندگی کے نظام میں تغیر کی ضرورت ہے، مگر اکثر ملکوں نے اس ضرورت کو تھوڑی سی ادل بدل کر کے ٹال دیا اور پیٹ بھروں کی طرح پھر اونگھ گئے۔

۲۵ برس بعد یہ دوسری جنگ شروع ہوئی جس نے نہ صرف مغرب بلکہ ساری دنیا کو اس سرے سے اُس سرے تک ہلا دیا ہے۔ اور کچھ ہوا یا نہ ہو مگر ہر قوم اور ہر شخص کو یہ یقین ہو گیا کہ ہماری زندگی کی عمارت کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ اب محض لیپ پوت سے کام نہیں چل سکتا۔ بلکہ اسے نئے سرے سے بنانے کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر طرف تعمیرِ نو کی آواز گونج رہی ہے۔ سیاست، حکومت، صنعت، تجارت، علم، ادب، تعلیم سب کی تعمیرِ نو کے نقشے بنائے جا رہے ہیں۔

حکومت، سیاست، علم و ادب وغیرہ وغیرہ یہ سب زندگی کی عمارت کے حصے ہیں۔ کسی ایک حصہ کا نقشہ اس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک پوری عمارت کا نقشہ سامنے نہ ہو۔

میرے نزدیک ہندوستانی عورتوں کے ذہن میں نئی زندگی اور نئے ادب کا جو تصور ہے وہ میں آپ کے سامنے عرض کرتی ہوں۔ ممکن ہے اس کے جزوی پہلوؤں سے بعض بہنوں کو اختلاف ہو لیکن بنیادی خیال ہم سب کا کم و بیش یکساں ہے۔

اس پر تقریباً سب لوگوں کو اتفاق ہے کہ نئی زندگی آزادی اور مساوات پر مبنی ہونی چاہیے جس میں ہر ملک، ہر قوم، ہر طبقے اور ہر صنف کو پوری پوری آزادی حاصل ہو، اور ان کے ساتھ مکمل مساوات برتی جائے۔

پہلے میں آزادی اور مساوات کا مفہوم صاف کر دوں۔

آزادی کے لئے سب سے پہلی اور لازمی شرط یہ ہے کہ لوگوں کے ذہن میں وہ مقصد متعین ہوں جن کے حاصل کرنے کے لئے وہ آزادی چاہتے ہیں۔ مقصد کے تعین کے بعد یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کی راہ میں کیا کیا رکاوٹیں حائل ہیں۔ ان رکاوٹوں کا دور ہو جانا آزادی کہلاتا ہے۔ آزادی کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ اس میں کسی قسم کی پابندی اور بندش نہیں ہوتی۔ فرائض اور ذمہ داریاں نہیں ہوتیں۔ ضابطے اور قاعدے نہیں ہوتے، جس آزادی میں کوئی پابندی نہ ہو وہ خطرناک بلکہ مہلک ہے۔ ایسی آزادی انسانی سماج کو حیوانوں کے غول سے بدتر کر دے گی۔ آزادی کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان کو فطرت نے جو مختلف صلاحیتیں عطا کی ہیں، اسے ان کو بلا روک ٹوک نشو و نما دینے اُجاگر کرنے اور کام میں لانے کی آزادی حاصل ہو۔

اب مساوات کو لیجئے۔ مساوات کے بھی معنی یہ نہیں ہیں کہ ہر کوئی ایک ہی قسم کے کام کرے اور ہر ایک سے ہر بات میں یکساں برتاؤ کیا جائے ——— نہیں یہ مساوات کی غلط تعبیر ہے۔ خدا نے مختلف انسانوں میں مختلف قسم کی صلاحیتیں رکھی ہیں۔ ہر ایک کو اپنی فطری صلاحیتوں کو نشو و نما دینے کا پورا موقع ملنا چاہیے۔ خصوصاً حصولِ علم کا دروازہ ہر ایک کے لئے کھلا رہے، اور سب کو یکساں طور پر اس سے فیض یاب ہونے کا موقع ملے۔ کیونکہ یہی چیز انسان کی فطری صلاحیتوں کو چمکاتی اور اجاگر کرتی ہے۔

اس آزادی اور مساوات میں جو چیز بھی رکاوٹ ڈالے خواہ وہ حکومت ہو یا سرمایہ داری، قدامت پسندی یا رسم پرستی اسے راستے سے ہٹا دینا پڑے گا۔ جس سماجی نظام میں ایک بہت بڑا طبقہ حیوانوں سے بدتر زندگی بسر کر رہا ہو، اس کی ساری جسمانی اور دماغی قوتیں کسبِ معاش کی کوشش میں صرف ہوتی ہوں، اور پھر بھی پیٹ بھر روٹی نہ ملے جہاں ایک طبقہ دولت اور ثروت کی فراوانی کی وجہ سے بے حس اور بے عمل ہو گیا ہو۔ دولت کی کثرت اور عیش و عشرت نے اس کی دماغی اور ذہنی قوتیں سلب کر لی ہوں اسے بے درد، بے حس اور نفس کا غلام بنا دیا ہو جہاں حکومت اپنی طاقت کے نشے میں مصیبت زدہ اور فاقہ کش لوگوں پر بھی رحم کرنا نہ جانتی ہو اور اس کی غفلت کے سبب ہزاروں، لاکھوں آدمی بھوک سے تڑپ تڑپ کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے رہے ہوں اور اس کے کان پر جوں بھی نہ رینگتی ہو۔ جہاں ایک طبقہ دنیا بھر کی ضروریات کو حد سے زیادہ جمع کر کے منافع بازی کی خاطر لوگوں کو فاقے سے جان دیتے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہو۔ جہاں عورت کو اس قصور پر کہ وہ عورت ہے علم کی روشنی سے محروم رکھا یا مصنوعی اور نکمی تعلیم دے کر اور تیتری بنا کر چھوڑ دیا جاتا ہو کہ وہ محض سیرِ چمن کا لطف اٹھاتی رہے اور پھول پھولوں کا رس لیتی پھرے۔ ایسی سماج کو جس قدر جلد ختم کر دیا جائے بہتر ہے۔ نئی زندگی میں آزادی اور مساوات حاصل کرنے کے لئے اس قسم کی رکاوٹیں خواہ وہ پرانے زمانے کی مروجہ ہوں یا نئی تہذیب نے ہمارے سر پر لادی ہوں، بلا امتیاز ہٹا دینی چاہئیں

نئی زندگی اور نئے سماج میں عورت کو بھی پوری آزادی اور مساوات حاصل ہونا لازمی چیز ہے جس میں وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکے۔ اپنی فطری صلاحیتوں کو نشو و نما دے سکے، ان کو اُبھار کر اُن سے کام لے سکے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عورت کو جو آزادی اور مساوات کی خواہش ہے تو کس مقصد کے لئے؟ زیادہ ملکی، قومی اور سیاسی کاموں اور پیشوں میں مردوں کے دوش بدوش چلے اور برابر حصہ لے یا اس کا کوئی الگ مقصد اور مخصوص کام ہو؟ آج کل کے نوجوان اور جوشیلے طبقے کا خیال ہے کہ عورت محض چکی چولھے اور بچوں کی مصیبت بھرنے کے لئے نہیں پیدا کی گئی، اسے بھی مرد کی طرح عقل، سمجھ، ہاتھ پیر، آنکھ کان سب ملے ہیں وہ کیوں نہ ان سب سے کام لے کر مردوں کے برابر، ان کے ساتھ ساتھ ہر قسم کے کاموں میں حصہ لے۔ اور کیوں محض گھر اور خاندان کے لئے مر مٹے۔ مگر یہ لوگ ایسا کہتے اور سوچتے وقت خاندان کی اہمیت کا بھی پوری طرح اندازہ نہیں کرتے، اور اس پر بھی غور نہیں فرماتے کہ جہاں مرد اور عورت میں بہت سی باتیں مشترک ہیں وہاں قدرت نے دونوں کو کچھ الگ الگ صلاحیتیں بھی دی ہیں۔

عورت کو ایثار اور قربانی برداشت اور صبر، محبت اور خدمت، تہذیب اور تعمیر کا مادہ مرد سے زیادہ دیا گیا ہے، اور اس کا صحیح مصرف یہ ہے کہ وہ انسانوں کی فطری وحشت کو دور کر کے انھیں ایک دوسرے سے مانوس کرے، اور انھیں باہمی محبت کے رشتے میں مربوط کرے۔

(باقی آئندہ)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

ادارۂ تحریر:۔
ڈاکٹر سید عابد حسین۔ صالحہ عابد حسین
عبداللطیف اعظمی

زبان کا مسئلہ

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

میں اگر تامل بولنے والے بچوں کی کافی تعداد ہے تو انھیں اس کا موقع ملنا چاہیئے کہ وہ تامل میں اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کر سکیں۔ اسی طرح اگر ہندوستان کے کسی حصہ میں ایسے بچوں کی کافی تعداد ہے جن کی مادری زبان اردو ہے تو انھیں صوبائی زبان کے ساتھ اردو رسم خط بھی سکھانا چاہیئے۔ یہ اصول تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اور یہ بہت ضروری ہے کہ اس پر جلد سے جلد عمل شروع کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں بہت سی مشکلیں پیدا ہوتی ہیں۔ خصوصاً ان علاقوں میں جہاں دو صوبے ایک دوسرے سے ملتے ہیں یا دونوں صوبوں کی سرحد کے علاقہ میں دو زبانیں رائج ہیں اور دوسری جگہوں کے مقابلہ میں اس جگہ اس بات کی خصوصیت کے ساتھ ضرورت ہے کہ مادری زبان میں ابتدائی تعلیم دی جائے۔

میرا خیال ہے کہ ہم رومن خط کو وسیع پیمانے پر رائج نہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ رومن رسم خط فوج میں کامیابی کے ساتھ استعمال ہوتا رہا ہے۔ تجربہ نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اس کا سیکھنا بہت آسان ہے۔ اس کے ساتھ ہی کسی حد تک یہ فوج میں اتحاد قائم کرنے کا سبب بنا ہے۔ اس لئے رومن رسم خط کے استعمال کرنے کے امکانات پر غور کرنا چاہیئے، اور جہاں جہاں ضرورت ہو استعمال کرنا چاہیئے۔

مصنفوں سے

اس مضمون کے شروع میں میں نے لکھا تھا کہ میں یہ مضمون ایک مصنف کی حیثیت سے لکھ رہا ہوں۔ کیا میں یہاں مصنفوں خصوصاً ہندی اور اردو کے مصنفوں کو کچھ مشورہ دے سکتا ہوں؟ مجھے یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے کہ ہمارے بہترین مصنفوں کو ناشروں کے ہاتھوں کتنی تکلیفیں اٹھانا پڑتی ہیں اور اکثر صورتوں میں وہ کس طرح ان کے اغراض کا شکار ہو گئے ہیں۔ ایک طرف جرنلسٹ تو کامیاب زندگی بسر کرتے ہیں لیکن دوسری طرف اہلیت رکھنے والے حقیقی مصنفوں کو کامیابی کے بہت کم مواقع میسر ہیں۔ مجھے ایسے واقعات کا علم ہے جہاں ناشروں نے مبلغ کتابوں کے کاپی رائٹ چند ٹکوں میں خرید لئے ہیں۔ کیونکہ غریب مصنف فاقوں مر رہا تھا اور اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ یہ ناشر ان کتابوں کے ذریعے خوب روپیہ کماتے ہیں اور مصنف فاقوں مرتا ہے۔ میرے خیال میں یہ طریقہ بہت شرمناک اور ہماری کھلی ہوئی توہین ہے۔ میں ناشروں سے اپیل کروں گا کہ وہ مصنفوں سے ایسا ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں۔ ناشر بھی اسی صورت میں سرسبز ہو سکتے ہیں جب کہ مصنف بھی سرسبز ہو۔ اس کے علاوہ ناشر کے نقطۂ نظر سے بھی یہ ایک احمقانہ پالیسی ہے کہ وہ مصنف کو فاقوں مرنے دے اور اس طرح اسے اچھا کام کرنے سے روکے۔ لیکن قومی نقطۂ نظر سے یہ مسئلہ اور بھی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ کام قوم کا ہے کہ وہ اس کا خیال رکھے کہ ہمارے اہلیت رکھنے والے مصنفوں کو اچھا کام کرنے کے مواقع میسر ہیں۔

(ترجمہ قومی آواز، لکھنؤ)

تاریخ اشاعت:۔ یکم، ۸، ۱۶، ۲۴
چندہ:۔ سالانہ عہ ششماہی للعہ

دفتر "نئی روشنی" جامعہ نگر دہلی
طابع و ناشر:۔ عبداللطیف اعظمی (بی اے جامعہ)
مطبوعہ وحید پریس دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۲ | نمبر ۱ | ۸ مارچ سنہ ۱۹[illegible]ء | ایڈیٹر: سید عابد حسین

مشرق و مغرب

خالدہ ادیب خانم

جو لوگ مشرقی طبیعت کے دلدادہ ہیں، ان کا قول ہے کہ زندگی کی حقیقی قدریں اسی کے حصے میں آئی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مشرق کے انسان نے ان چیزوں کو چھوڑ کر زندگی کے اصل جوہر کو پا لیا ہے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ روحانی قدریں زیادہ اہم اور زیادہ قابل قدر ہیں مگر کیا مشرق کے متعلق یہ قول بالکل درست ہے؟ یہ تو ہم تب سمجھتے جب انسان مجرد روح ہوتا مگر چونکہ وہ روح اور جسم سے مرکب ہے اس لئے سارا زور روح پر صرف کر دینے سے آخر میں بہت افسوسناک نتائج پیدا ہوئے۔ مادی قدروں کو بالکل رد کر دینے کا انجام یہ ہوا کہ جب مشرق والے پہلے تو ان کے حکمرانوں نے اور پھر مادہ پرست مغرب نے دل کھول کر لوٹا۔ مشرق صرف اس پر رہ گیا کہ اور ملکوں کو سستے مزدور بہم پہنچائے۔ اپنی دولت ان کے حوالے کرے، اور ان کا مال خریدے۔ جب یہ صورت ہے تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مشرق میں کوئی نہ کوئی خرابی ضرور ہے۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ مشرق کا سب سے بڑا نقص انسان کے مادی اور روحانی وجود میں صحیح تناسب کا موجود نہ ہونا ہے۔

اب مغرب کو لیجئے۔ یہاں جلیل القدر بادشاہ اور عظیم الشان عمارتیں تاریخ پر چھائی ہوئی نظر نہیں آتیں۔ دنیا کے سات عجائبات میں سے کوئی بھی مغرب کا بنایا ہوا نہیں، مغربی تمدن اور مغربی انسان دونوں ابھی تھوڑے ہی دن پہلے صفحۂ تاریخ پہ نمودار ہوئے ہیں۔

مغرب نے اپنا مذہب مشرق سے پایا، حکمت و فلسفہ یونان سے حاصل کیا، اور حکومت کا نظام اور تمدن کا ظاہری ساز و سامان روما سے لیا۔ روما مغربی تمدن کا پہلا مظہر تھا جس کی عمارت مغرب کے لوگوں نے پہلے پہل مغرب ہی کی سرزمین پر تعمیر کی۔ اگرچہ اہل روما نے اپنے ذہن سے کوئی نیا تصور پیدا نہیں کیا۔ مگر موجودہ تصورات کی ترکیب انھوں نے کچھ اس طرح کی کہ ایک نیا تمدن بنا کر کھڑا کر دیا۔

سب سے پہلی اور سب سے بڑی چیز جو اہل روما نے خود اختراع کی وہ ان کا اصول قانون ہے۔ مشرق میں قانون خدا کا بنایا ہوا یا بادشاہ کا بنایا ہوا ہوتا تھا۔ روما میں وہ انسان کا بنایا ہوا ہوتا تھا اور جمہور کی مرضی سے بنایا جاتا تھا۔ غرض اس کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی مگر اس نے زندگی کا ایک نیا تصور پیدا کر دیا۔ فرد کی نظر میں قانون کا رعب اس حد تک نہ تھا کہ اسے تقدیر کے مانند اٹل سمجھتا۔ اس نے اپنے خیال کو معاشرت اور ریاست سے کبھی ہٹنے نہیں دیا اور ہمیشہ اس جد و جہد میں رہا کہ حکومت میں زیادہ سے زیادہ حصہ لے۔ ظاہر ہے کہ ایسی طبیعت کا آدمی تنہائی اور باطن میں محو نہیں ہو سکتا۔ اس کی توجہ کا مرکز ہمیشہ اس کا جسم اور دوسری مادی اشیاء ہوا کرتی ہیں، جن چیزوں کو وہ دیکھ سکتا ہے اور چھو سکتا ہے وہ اس کی نظر میں غیر محسوس چیزوں سے زیادہ قدر رکھتی ہیں۔ بعض مختصر زمانوں اور بعض مخصوص اشخاص سے قطع نظر کر کے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مغربی انسان صرف مادی قدروں کا قائل ہے۔ غور و فکر اس کے نزدیک بے معنی لفظ ہے۔ جد و جہد اور عمل حاصل زندگی ہے ....

اسی مادیت کی بدولت مغرب نے سائنس میں حیرت انگیز کرشمے دکھائے ہیں۔ اس نے فطرت کے اسرار کا پردہ چاک کر دیا ہے اور اس کی قوتوں سے کام لے کر انسان کی راحت و آرام کا سامان بہم پہنچایا ہے۔ جس طرح مشرق کے عارف نوع انسانی کی روحانی تسکین کی تلاش میں شہید ہو جاتے تھے اسی طرح مغرب کے عالم اس کوشش میں جان دیدیتے ہیں کہ اس دنیا کو اپنے بنی نوع کے لئے زیادہ آرام دہ بنا دیں، اور انھیں بیماریوں اور تکلیفوں سے محفوظ رکھیں۔

مگر مغرب کی یہ نعمت دنیا کے لئے مصیبت ہو گئی ہے۔ اس یک طرفہ اور خالص مادی ترقی نے مغرب کو اور اقلیتوں پر مسلط کر دیا ہے۔ چند صدیوں کے اندر ساری دنیا بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کے پنجے میں آ گئی ہے۔ نہ بڑے بر اعظم اور اس کے کروڑوں باشندے اب اسی کام کے لئے ہیں کہ اس چھوٹے سے خطے کی اطاعت میں سرگرم رہیں جو یورپ کہلاتا ہے اور جہاں مغربی انسان رہتا ہے۔

جو لوگ مغربی طبیعت کے دلدادہ ہیں وہ کہتے ہیں کہ زندگی کی حقیقی قدریں اسی کے حصے میں آئی ہیں۔ ان کا دعوےٰ ہے کہ زندگی کا اصلی جوہر انسان کی مادی فطرت ہے۔ کیا یہ دعوےٰ بالکل صحیح ہے؟ یہ تو ہم تب سمجھتے کہ جب انسان اپنی انسانیت یا یوں کہئے کہ روح کھو بیٹھتا۔ جانوروں کی طرح اس کی ضروریات اور خواہشات محض جسم تک محدود ہوتیں۔ مگر چونکہ وہ روح اور مادے سے مرکب ہے اس لئے مادے پر سارا زور صرف کر دینے سے بھی آخرکار افسوسناک نتائج پیدا ہوئے۔ ایسے آثار نظر آ رہے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کا تنزل بلکہ خاتمہ قریب ہے۔ اہل مغرب اپنے تمدن کی عمارت کو متزلزل دیکھ کر بہت ہراساں ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس مادی تہذیب کو قائم رکھنے کے لئے کون سی راہ اختیار کریں۔ قدیم مشرق کی طرح مغرب کو بھی گھن لگ چکا ہے۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ مغرب کا سب سے بڑا نقص انسان کے مادی اور روحانی وجود میں صحیح تناسب کا موجود نہ ہونا ہے۔

(جامعہ کے توسیعی خطبات ۱۹۳۵ء)

فہرست مضامین

قیمت فی پرچہ ۲ ر

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

(سالک ہندی)

مذہب، افراط اور تفریط

چند روز ہوئے بعض اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ ہندوستانی ہائی کمشنر مقیم پاکستان مسٹر سری پرکاش نے کراچی سے رخصت ہوتے وقت مہاتما گاندھی کے مجسمہ پر پھول چڑھانے کی رسم ادا کرنی چاہی تھی۔ لیکن وزیر خارجہ سر محمد ظفر اللہ خاں نے اس بنا پر اس کی ممانعت کردی کہ اس میں بت پرستی کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ اس پر حکومت ہند نے اپنے نمائندے کو ہدایت کی کہ وہ اس کے خلاف احتجاج کرے چنانچہ انھوں نے پاکستان کے وزیر اعظم کو اس طرف توجہ دلائی ہے۔

مجھے معلوم نہیں یہ خبر صحیح ہے یا غلط یا اصل میں واقعہ کچھ اور ہے اور خبر دینے والے نے اس میں جدت طرازی سے کام لیا ہے۔ مجھے اس کو صحیح سمجھنے میں تامل ہوتا ہے۔ کیونکہ ظفر اللہ خاں نے غالباً اسلام کی تعلیم کا مطالعہ کیا ہے اور انھیں اس کے سمجھنے کا دعویٰ ہے۔ ان کا ایسی حرکت کرنا قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتا بہر حال خبر غلط ہے تو اس کی سرکاری طور پر تردید ہونی چاہیے اور تعجب ہے کہ اب تک نہیں ہوئی۔ اور اگر صحیح ہے تو ―― سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں؟ اسلام کی تعلیم میں اس فعل کا جواز کس طرح مل سکتا ہے! کیا لکم دینکم ولی دین کا یہی مطلب ہے؟ پہلا سوال تو یہ ہے کہ پھول چڑھانا کس طرح بت پرستی ہے؟ خود سر محمد ظفر اللہ کے زندہ مجسمے پر بارہا پھول چڑھائے گئے ہوں گے۔ انھوں نے اسے کیوں نہیں روکا؟ قائد اعظم کے تابوت اور ان کی تربت پر ان کے ہزاروں عقیدت مندوں اور غیر ملکی نمائندوں نے پھول چڑھائے تھے وہ بت پرستی کیوں نہ تھی؟ سندھ اور پنجاب کے مسلمانوں میں پیر پرستی اور قبر پرستی بے روک ٹوک جاری ہے جس میں بوئے شرک آتی ہے۔ وہ تعلیم کے ذریعے اس کو روک کر خود مسلمانوں کو مسلمان بنانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ اور پھر اس سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ کیا پاکستان میں ان غیر مسلموں کو جو بت پرست ہیں اپنے طریقے پر عبادت کرنے کی اجازت نہ ہوگی؟ اور اس قسم کی ممانعت اس اعلان کے ساتھ کہاں تک ہم آہنگ ہے کہ پاکستان کے تمام باشندوں کو عقائد اور عبادت کے معاملے میں پوری آزادی حاصل ہوگی؟ میں ان سوالوں کا جواب چاہتا ہوں۔ اور یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام کے یہ نام نہاد علمبردار ایسی حرکتیں کیوں کرتے ہیں جو مذہب، مصلحت، تہذیب، اخلاق، معقولیت سب کو پس پشت ڈال دیتی ہیں؟ ……

ہندوستان کے جو معقول پسند لیڈر ہیں وہ شروع سے کہہ رہے ہیں اور حال میں نواب زادہ لیاقت علی خاں اور خود ظفر اللہ خاں نے اپنے پبلک بیانوں میں کہا ہے ہندوستان اور پاکستان کو دوش بدوش چلنا اور ایک دوسرے کے ساتھ عزیز ہمسایوں کا سا سلوک کرنا چاہیے۔ اس کے لئے رواداری اور ایک دوسرے کا دل رکھنے کی پالیسی شرافت اور مصلحت دونوں کی رو سے ضروری ہے۔ حسن اتفاق سے گاندھی جی کی ذات اور کام کا احترام ایک ایسی چیز ہے جس میں دونوں ملکوں کے باشندے کھلے دل کے ساتھ شریک ہوتے ہیں، اور اس طرح شبہ اور خوف اور مخالفت کے نامبارک چکر کو توڑ کر باہمی اعتماد اور دوستی کی عمارت بنا سکتے ہیں۔ اس لئے یہ ممانعت کا حکم خاص طور پر افسوسناک ہے بدقسمتی اس کے۔ ہندوستان میں ایک گروہ ایسا پیدا ہو رہا ہے جو مذہب کے معاملے میں ایک نہایت تنگ نظریہ اختیار کرنا چاہتا ہے۔ بعض سطحی اور عارضی چیزوں سے اور حال کے ناگوار واقعات سے متاثر ہو کر اسے سرے سے مذہبی قدروں سے انکار ہے۔ اس نے بغیر کافی غور و فکر کئے بغیر ذاتی تجربے کی اس تپش میں سے گزرے جس میں مذہب کی قدر اور ضرورت کا احساس پیدا ہوتا ہے، یہ طے کر لیا ہے کہ مذہب نہ صرف ایک بے کار بلکہ ایک مضر اور خطرناک چیز ہے۔ انھوں نے یہ تو دیکھا ہے کہ انسانی تاریخ میں مذہب کے نام پر بڑے بڑے ظلم اور زیادتیاں ہوئی ہیں لیکن شاید یہ نہیں سوچا کہ کون سی اچھی چیز ہے جس کا نام لے کر ظالموں نے ظلم نہیں کئے، قانون، انصاف، آزادی، جمہوریت، عوامی تحریک؟ اور یہ بھی نظر انداز کر دیا کہ دنیا کی تاریخ کے بہت سے بہترین اور شریف ترین انسانوں نے اس جذبے اور اس داخلی تجربے کی عظمت اور رفعت کا اعتراف کیا ہے، اور اس کی بنیاد پر اپنی مثالی زندگی کی عمارت کھڑی کی ہے۔ انھوں نے ایک غیر مذہبی ریاست کا مفہوم یہ نہیں سمجھا کہ ریاست مذہبی معاملات میں بالکل غیر جانب دار رہے گی اور ہر عقیدے کے لوگوں کو حقوق سیاست و شہریت کے لحاظ سے ایک نظر سے دیکھے گی، بلکہ وہ اس کی ترقی اور بقا کے لئے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اختلاف مذاہب کو بلکہ مذہب کے جذبے ہی کو ختم یا کم سے کم بہت کمزور کر دیا جائے! انگریزی عہد حکومت میں ہماری سیاست کی جو اقتادر ہی اس کی وجہ سے یہ بات یقیناً ضروری ہے کہ ملک میں سیاسی زندگی کی بنیاد مذہب پر نہ رکھی جائے اور اس وجہ سے اس بارے میں احتیاط کی ضرورت بھی سمجھ میں آتی ہے لیکن وقتی حالات کی بنا پر اپنے احساس تناسب کو کھو دینا اور مذہب کی ابدی قدروں کو سرے سے مسترد کر دینا عقل مندی نہیں ہے۔ ابھی حال میں ایک ممتاز مسلمان جرنلسٹ نے اس بات پر اندیشے کا اظہار کیا ہے کہ ترکی میں مذہبی احیاء کی ایک تحریک کا آغاز ہو رہا ہے اور وہاں پہلے کی طرح مذہب کی شدید مخالفت باقی نہیں رہی اور خود ہندوستان میں لوگوں نے مذہب کے ساتھ وابستگی کو ابھی تک نہیں چھوڑا۔ آخر اس میں اندیشے کی کونسی بات ہے؟ مذہب کا جذبہ انسانی فطرت کی گہرائیوں سے ابلتا ہے وہ بھی دوسرے جذبوں کی طرح) غلط شکلیں اختیار کرتا ہے۔ اسے بھی خود غرض اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں اس پر بھی تنگ نظری اور تعصب کے حملے ہوتے ہیں۔ لیکن وہ ان کو جھیلتا ہے، ان سے چھٹکارا پا کر انھی کے زیر اثر پھر سے سنورتا اور نکھرتا ہے۔ اس پر روایت پرستی اور تنگ نظری کے جو چھینٹے پڑ جاتے ہیں، وہ اس کی فطرت کا جزو نہیں بلکہ آئینے کی گرد ہے جس کو صاف کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے میرے خیال میں مذہب کو اس بے اعتنائی اور سطحی انداز میں مسترد کرنا اصل مسئلے کا حل نہیں بلکہ اس سے بچ کر نکلنے کی ایک ناکام کوشش ہے۔ ہندوستان میں جو لوگ بستے ہیں ان کی تہذیب اور ذہنی اور روحانی زندگی میں مذہب کا مقام بہت بلند اور اس کی جڑیں بہت گہری ہیں ہمیں اس کو ایک اچھی قومی اور انفرادی زندگی کی تشکیل کا ایک ذریعہ بنانا ہے۔ لہٰذا اس بات پر اعتراض کرنا، کوتاہ اندیشی ہے کہ مختلف لوگ اور جماعتیں اس حیات پرور جد و جہد کے لئے اپنے اپنے مذہب کی تعلیم اور قدروں میں سرچشمہ الہام تلاش کرتی ہیں۔ یہ بات نہ صرف ممکن بلکہ قرین عقل ہے کہ ایک ریاست غیر مذہبی ہو لیکن اس کے شہری مذہبیت کا صحیح جذبہ رکھتے ہوں۔ ابھی حال میں سر رادھا کرشنن نے بھی اپنی ایک تقریر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور اس سطحی ذہنیت پر اعتراض کیا تھا جو تصویر کے تمام پہلوؤں کو سمجھے بغیر مذہب کی قدروں میں تشکیک پیدا کرتی ہے۔

زبان کو سنبھالئے

پنڈت جواہر لال نے حال ہی میں ایک مضمون قومی زبان کے متعلق لکھا ہے۔ جس پر میں ان کو مبارکباد دینا چاہتا ہوں۔ ان کی ذہنی جرأت، دیانت داری اور حق گوئی کا ثبوت ہے کہ ایک ایسے وقت جب ملک کے بہت اچھے اور سمجھ دار لوگوں کا ذہنی توازن اس بارے میں ڈانواڈول ہو چکا ہے اور وہ انصاف اور عقل اور مصلحت کے تقاضوں کو پس پشت ڈال کر ایک محدود اور غیر فطری زبان کو راشٹر بھاشا بنانے پر تلے ہوئے ہیں انھوں نے صفائی اور سمجھ داری اور وسیع النظری کے ساتھ اس مسئلے پر روشنی ڈالی ہے اور ان اصولوں کو روز روشن کی طرح واضح کر دیا ہے۔ جن کے مطابق

(بقیہ صفحہ ۲ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

۸ مارچ ۱۹۴۹ء

بُلبلِ ہند مرگئی ہیہات

۲ مارچ کو صبح ۳ بجے ہوا کی لہروں نے یہ جان فرسا خبر نشر کی کہ ہز ایکسلینسی مسز سروجنی نائڈو گورنر یو پی کی شمع حیات پچھلے پہر جنبش دامان سحر سے بجھ گئی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحومہ صرف ہندوستان کے سب سے بڑے صوبے کی گورنر ہی نہ تھیں بلکہ ہر دل عزیز قومی لیڈر اور محبوب قومی شاعرہ بھی تھیں۔

گورنر کا جنازہ بڑی شان و شوکت سے لکھنؤ میں اٹھا جس میں ہندوستان کے گورنر جنرل، وزیر اعظم، وزیر تعلیم، صوبے کے وزراء اور اعلیٰ عہدہ دار شامل تھے گومتی کے کنارے چھتر منزل کے سامنے ان کا جسم خاکی تمام آداب و رسوم کے ساتھ سپرد آتش کیا گیا۔ سارے ملک میں سرکاری دفاتر بند رہے۔ سرکاری عمارتوں پر قومی جھنڈا نیم چوب لہرایا گیا۔ آئین ساز مجلسوں میں مرحومہ کو خراج عقیدت پیش کئے گئے۔

قومی لیڈر کا ماتم اس سے بھی زیادہ زور شور سے ہوا۔ کارخانے، مدرسے، بازار بند رہے، عام جلسے ہوئے نہ صرف کانگریس بلکہ ہر پارٹی کے لیڈروں نے تعزیتی تقریریں کیں اور پیام شائع کئے۔

مگر قوم کی محبوب شاعرہ "بلبل ہند" سروجنی کا سوگ سرکاری دفاتر اور کوچہ و بازار میں نہیں بلکہ دلوں کے خلوت خانوں میں، بانگ دہل سے نہیں بلکہ آہنگ خاموشی سے منایا گیا۔ دل ٹوٹ گئے اور ٹوٹنے کی صدا نہ آئی۔ جی بجھ گئے اور بجھنے کی آواز نہ نکلی۔ اہل درد کے پہلو میں بلبل ہند کی منظوم آہوں کے تیر پہلے ہی سے پیوست تھے اب وہ خود ہمیشہ کے لئے ان کے سینوں کے اندر دفن ہو گئیں۔

در سینہ ہائے مردم عارف مزار او

سروجنی دیوی ایک برہمن عالم پروفیسر اگھور ناتھ چٹوپادھیائے کی صاحبزادی تھیں جو مشرقی بنگال کے رہنے والے اور حیدرآباد دکن میں نظام کالج کے پروفیسر تھے وہ ۱۸۷۹ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئیں اور وہاں تعلیم پائی۔ سولہ برس کی عمر میں انگلستان گئیں اور تین برس لندن اور کیمبرج میں رہیں۔ ان کی سیرت میں دو نمایاں صفات تھیں جن کے سانچے میں ان کی ساری زندگی ڈھلتی رہی۔ رومانی محبت اور عملی بغاوت۔ ان کی محبت ایک قدرتی چشمے کی طرح سے تھی جو زمین کی گہرائیوں سے پھوٹ کر نکلتا ہے اور اپنے زور میں بہتا چلا جاتا ہے۔ ان کی بغاوت ایک جوئے شیر کی طرح تھی جو تیشۂ کوہکن کی جانفشانی سے پہاڑ کے جگر کو چیر کر نکالی جاتی ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں انھیں شاید شعر سے محبت ہو گئی اور اس کی خاطر انھوں نے رسمی تعلیم کے ضابطے سے بغاوت کی انگلستان میں ان کی پہلی محبت بھی سرسبز ہوئی اور ان کی بغاوت بھی۔ وہ تھوڑی سی مشق سے انگریزی میں بے تکلف شعر کہنے لگیں۔ اور انگلستان کے ادبی حلقوں میں ان کی دھوم مچ گئی۔ رسمی تعلیم کے بغیر انھوں نے اپنے لئے علم و فضل کے میدان میں وہ جگہ حاصل کر لی جو اونچی سے اونچی سند پانے والوں کو بھی مشکل سے نصیب ہوتی ہے۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد ایک غیر برہمن نوجوان ڈاکٹر نائڈو سے جن سے ان کو پہلے سے عشق تھا شادی کر لی اور اس طرح سماج اور اس کے قانون کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس معرکے میں بھی میدان ان کے ہاتھ رہا، اور اسی سماج نے جو انھیں ذات سے باہر سمجھتی تھی آخر ان کو آنکھوں پر بٹھایا۔ بیس سال کے عرصے میں مسز نائڈو کی نظموں کے تین مجموعے شائع ہوئے اور ہندوستان کے اندر اور باہر ان کی شاعری کا سکہ بیٹھ گیا۔

لیکن ۱۹۱۹ء میں ایک نئی محبت اور نئی بغاوت نے ان کی زندگی کا سارا نقشہ بدل دیا۔ وطن کے عشق، آزادی کے عشق نے انھیں گاندھی جی کے جھنڈے کے نیچے ستیہ گرہ کے لشکر میں شامل ہونے اور دنیا کی سب سے بڑی سلطنت سے بغاوت کرنے پر آمادہ کر دیا۔ بے مثال ہمت و استقلال سے وہ آزادی کی لڑائی لڑتی رہیں۔ قید فرنگ کی تکلیفیں اٹھاتی رہیں۔ اس راہ میں انھیں اپنا عیش و آرام، گھربار تجنا پڑا یہاں تک کہ اپنے فن کو بھی جو ان کو دل و جان سے عزیز تھا قربان کرنا پڑا۔ آخر یہ محبت بھی پروان چڑھی۔ اس بغاوت نے بھی فتح پائی۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی کی پرستار نے آزادی کے روئے زیبا کی پہلی جھلک دیکھی۔ اس علم بغاوت کو جو انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے بلند کیا تھا، حکومت کے قصر و ایوان پر لہراتا ہوا دیکھا۔

لیکن سروجنی نائڈو کے دل میں سب سے گہرا سب سے پرزور ایک اور محبت، ایک اور بغاوت کا جذبہ تھا۔ وہ ہندوستان کے سب فرقوں خصوصاً ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کی عاشق زار تھیں اور فرقہ وارانہ تعصب کے خلاف جو ایک عرصے سے ہمارے دلوں پر راج کر رہا تھا بغاوت کرنے میں انھیں سب پر یہاں تک کہ گاندھی جی پر بھی کم سے کم زمانے کے لحاظ سے تقدم حاصل تھا۔ اس میدان میں بھی انھوں نے بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔ ان کی آنکھوں نے گاندھی جی کے مقتول جسم اور غیر مقتول روح کے ہاتھوں فرقہ پرستی کی اخلاقی موت دیکھی۔ وہ دنیا سے خوش خوش اور خرم گئیں لیکن ہندوستان کو اپنے غم میں رنجیدہ اور دل گرفتہ چھوڑ گئیں۔

بزمِ بے تکلف

"خدا کے لئے اب اس سر چڑھے کو رشادو کب سے انتظار میں بیٹھی ہوں کہ تمھارے کان خالی ہوں تو میں بھی کچھ کہوں سنوں۔"

"تم بھی غضب کرتی ہو۔ بجٹ کے خلاصے کا سب سے مزے دار حصہ ہو رہا تھا کہ تم نے تحریک التوا کھینچ ماری۔ مگر یہ بیٹا فون کا نام سر چڑھا خوب رکھا۔ کیوں نہ ہو آخر کس کی بیوی ہو۔ اچھا اب میرے کان خالی ہیں۔ بہ شوق سے بولو۔ سر چڑھا ہٹ گیا۔ اب ناک چڑھی کی باری ہے۔"

"میں رہنے بھی دو سچ مچ کسی [illegible] کو چڑھتی سر پانا پڑتا تو قدر عافیت معلوم ہو جاتی اور میں کہتی ہوں یہ پرائے بجٹ کی رام کہانی سننے سے فائدہ کیا مل جائے گا۔ کچھ اپنے بجٹ کی بھی خبر ہے؟ مہینے میں تین دن باقی ہیں اور گھر میں برکت ہے نہ [illegible]"

"ہوا کیوں ہوتا؟ اپنے دیس کا بجٹ ہی، اور گھر کے بجٹ سے اسے بقول شخصے ناڑا ہوا سمبندھ ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ اس طرح کہ فرض کرو کہ ہماری آمدنی تین ہزار سالانہ سے زیادہ ہے اور ہم اب تک روپیے میں ایک آنہ ٹیکس دیتے تھے۔ اب ایک پیسے کی چھوٹ ہو جائے گی تو اس کا اثر ہمارے بجٹ پر پڑے گا یا نہیں؟"

"فرض کرنے کو جو چاہے کر لو، مگر تین ہزار کی آمدنی کس مہینے کی ہے۔"

"دیکھو ایسے غیر پارلیمنٹری لفظ نہ کہو۔ سنئے کو پارلیمنٹ کی زبان میں 'غیر سنجیدہ معزز ممبر' کہتے ہیں۔ خیر انکم ٹیکس سے نہ سہی دوسرے ٹیکسوں سے تو ہم کو تعلق ہے مثلاً لفافے کا ٹکٹ دو آنے کا اور پوسٹ کارڈ تین پیسے کا ہو جائے گا۔ تمباکو اور چھالیہ پر درآمد کا محصول بڑھ جانے کی وجہ سے یہ دونوں چیزیں مہنگی ہو جائیں گی۔"

"شاباش ان بجٹ سازوں کو۔ مرنے کو ماریں شاہ مدار اسی کو کہتے ہیں۔ اب تک مہینے میں تین دن برکت رہتی ہے تو اب چھ دن رہا کرے گی۔"

"پھر کچھ تخفیف مصارف کی تجویز سوچو یہ جو دن بھر پان کے نام سے چھالیہ پھنکتی ہے جیسے بھٹی میں ایندھن پھنکتا ہو، اس کو کم کرنا چاہئے۔"

"اور یہ جو دن بھر چائے کے بہانے شکر سڑکی جاتی ہے جیسے ریل کا انجن پانی سڑکتا ہے اسے بھی کم کرنا چاہئے۔"

"اچھا دونوں ترمیمیں بہ رضامندی فریقین واپس۔ میں نے ایک اور تجویز سوچی ہے جسے سن کر تم پھڑک جاؤ گی۔ یہ جو اخباروں اور رسالوں کو ٹکٹ لگا کر مضمون بھیجا کرتا ہوں اور وہ اکثر بیرنگ واپس آتے ہیں ان کی جگہ چھوٹے چھوٹے مضمون [illegible] پوسٹ کارڈ پر لکھ کر بھیجا کروں گا اور ایڈیٹر کو لکھ دیا کروں گا تاکہ اگر پسند نہ آئیں تو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیں۔ ایک تو جاتے میں پیسے کم لگیں گے۔ دوسرے واپسی میں بیرنگ نہیں ہونا پڑے گا [illegible]

پچھلا ہفتہ: ۱- ہندوستان

یہ متھائی کا بجٹ ہے یا چیٹی کا!

پچھلے سال جب شری شان مکھم چیٹی نے ہندوستان کا بجٹ پیش کیا تو عام طور پر یہ کہا جاتا تھا کہ فنانس ممبر سرمایہ دار طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے انھوں نے سرمایہ داروں کی محبوب کا بجٹ بنایا ہے۔ وہ ایک مردو تن آسان تھا تن آسانوں کے کام آیا مگر اس سال ہمارے فنانس ممبر مسٹر جان متھائی ایک سابق پروفیسر ہیں۔ جن کے متعلق یہ حسن ظن تھا کہ خود غریب نہیں تو کم سے کم غریب نواز ضرور ہیں۔ مگر جب ۲۸ فروری کو ان کا بنایا ہوا سنہ ۱۹۴۹ء کا بجٹ سامنے آیا تو حیرت ہوگئی کہ یا الٰہی یہ کیا اسرار ہے! یہ متھائی کے قالب میں چیٹی کی روح کہاں سے آگئی؟

بجٹ میں تین ارب پونے آٹھ کروڑ کی آمدنی، تین ارب ساڑھے بائیس کروڑ کا خرچ یعنی کوئی سوا پندرہ کروڑ کا خسارہ تھا۔ اس کے باوجود یہ ضروری سمجھا گیا کہ انکم ٹیکس کے معاملے میں متوسط طبقے کے ساتھ امیروں کو بھی رعایت دی جائے۔ اضافۂ سرمایہ کے ٹیکس اور سوپر ٹیکس میں تخفیف کی جائے۔ تلہن اور تیل کے برآمد کے محصول اور پکے مال کے درآمد کے محصول کو معاف کر دیا جائے۔ ہمارے فنانس ممبر اور ہماری کیبنٹ کی یہ سب عنایتیں کارخانوں کے مالکوں پر اس لئے ہیں کہ کسی طرح ان کو پرانے کارخانوں میں پیداوار بڑھانے اور نئے کارخانے قائم کرنے پر آمادہ کیا جائے مگر وہ ایسے روٹھے ہوئے ہیں کہ کسی طرح منتے ہی نہیں۔ ۴ مارچ کو ایوان صنعت و تجارت کے جلسے میں بجٹ کی تجویزوں پر خوشنودی کا اظہار کرنے کی بجائے ناخدایان صنعت نے طرح طرح سے مزید رعایتوں کا مطالبہ کر جیسے لاڈلے پالے بچے مچل مچل کے مٹھائی مانگتے ہیں۔ بھلا ان سے کیا امید ہو سکتی ہے کہ نفع خوری کی ہوس [illegible] کر کے ملک کی معاشی حالت کو سدھارنے میں حکومت کا ساتھ دیں گے۔

اب بجٹ کے دوسرے پہلو پر غور فرمایئے۔ خسارے کو پورا کرنے کے لئے بعض اشیاء پر ٹیکس بڑھانے کے ساتھ ساتھ اس قیامت کی گرانی میں ان ٹیکسوں میں اضافہ کیا گیا جن کی زد زیادہ تر غریبوں پر پڑتی ہے۔ مثلاً پوسٹ کارڈ اور لفافے کی قیمت میں اضافہ۔ کاغذ کی کسٹم ڈیوٹی اور شکر کی چنگی میں اضافہ باریک کپڑے کے علاوہ موٹے کپڑے پر ٹیکس۔

اسمبلی میں دو دن کی بحث میں بجٹ بے ضرر سے ہوئی اور ہونی بھی چاہئے تھی دو سال پہلے تک اسمبلی میں اعتراضوں کی بارش سب سے زیادہ زور شور سے محکمہ دفاع کے بجٹ پر چلتی تھی مگر اب یہ محکمہ اسمبلی کا منظور نظر بن گیا ہے۔ چنانچہ دفاعی امور کے ماہر پنڈت ہردے ناتھ کنزرو نے ایک ارب ساون کروڑ کے مجوزہ خرچ کو آج کل کے حالات میں بالکل جائز اور مناسب قرار دیا۔ ان کے اور دوسرے ممبروں کے اعتراضات کا نشانہ اب حکومت کی معاشی پالیسی ہے جس نے افراط زر اور گرانی کا واحد علاج اس بات کو سمجھ رکھا ہے کہ سرمایہ داروں کی دل جوئی کی جائے۔

اب تک اسمبلی کے بجٹ کا جو رنگ ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فنانس بل پیش کرتے وقت مسٹر متھائی کو موجودہ تجویزوں میں کافی ترمیم کرنی پڑے گی ورنہ اس سڑک پر بھی جو بظاہر بہت ہموار معلوم ہوتی ہے، گاڑی اٹک جائے گی۔

لانا ہے جوئے شیر کا

مسٹر ہور، اس مشن کے لیڈر ہیں جو ورلڈ بنک کی طرف سے ہندوستان بھیجا گیا ہے۔ انھوں نے یکم مارچ کو نئی دہلی میں ایک تقریر کی جس میں یہ امید ظاہر کی کہ یہ بنک ایشیائی ملکوں کی معاشی ترقی میں بہت اہم حصہ لے گا۔ لیکن جو شرطیں انھوں نے بنک کی طرف سے قرض ملنے کی بیان کیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مدد لینا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

انھوں نے فرمایا کہ بنک کسی ملک کو اس وقت تک قرض نہیں دے گا جب تک اسے ان تین باتوں کا اطمینان نہ ہو جائے:-

(الف) ملک کی عام معاشی پالیسی قابل اطمینان ہے۔

(ب) معاشی ترقی اور تعمیر نو کے کام اس طریقے سے کئے جا رہے ہیں کہ حکومت کی بنیاد کمزور ہونے کا اندیشہ نہیں بلکہ اور زیادہ مضبوط ہونے کی امید ہے۔

(ج) جن اسکیموں کو چلانے کے لئے قرض مانگا جاتا ہے وہ پوری صحت کے ساتھ تیار کی گئی ہیں اور معاشی حیثیت سے اور مالی حیثیت سے معقول ہیں۔

اس کے بعد بھی ورلڈ بنک سے قرض ملنا آسان نہیں بلکہ ایک دشوار اور دیر طلب عمل ہے۔

ان لوگوں کو جو ملک کی معاشی ترقی کے لئے بیرونی امداد کی آس لگائے بیٹھے ہیں مسٹر ہور کی تقریر غور سے پڑھنا چاہئے اور اس بات کو سمجھ لینا چاہئے کہ اگر وہ شبہ جو قدرتی طور پر دل میں پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب بین الاقوامی معاشی ادارے دنیا کے ملکوں کو اینگلو امریکن سیاست کے سنہری جال میں پھانسنے کے لئے بنائے گئے ہیں، بے بنیاد بھی ہو تب بھی یہ ادارے ہمارے مرض کی دوا نہیں ہیں۔ اس لئے کہ یہ ہماری مدد اسی وقت کریں گے جب ہم اپنی کوشش سے اپنی معاشی اور مالی حالت کو سدھار لیں اور ہم کو ان کی مدد کی کوئی خاص ضرورت نہ رہے۔

آوارۂ غربت نتواں دید صنم را

دہلی میں ۲۶، ۲۷ فروری کو ہندوستان اور پاکستان کے باشندوں کی ایک غیر سرکاری کانفرنس "پھر بساؤ کانفرنس" کے نام سے منعقد ہوئی۔ اس میں ہندوستان کے سب فرقوں کے تین سو سے زیادہ نمایندے جن میں صدر کانگریس اور دوسرے ممتاز لیڈر بھی تھے شریک ہوئے۔ پاکستان سے صرف پندرہ نمایند آسکے۔ البتہ سردار عبدالرب نشتر، محمد اسماعیل صاحب ہائی کمشنر، فیض احمد فیض صاحب اور کچھ اور بزرگوں نے ہمدردی کے پیام بھیجے۔ کانفرنس نے جو خاص رزولیوشن پاس کیا اس میں دونوں ملکوں کی حکومتوں سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ آوارہ وطن مہاجرین کو دوبارہ ان کے اصلی گھروں میں بسائیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ریل کی آمد و رفت پھر سے جاری کریں اور پرمٹ وغیرہ کی بندشیں ڈھیلی کر دیں۔

ہندوستان میں سرکاری اور غیر سرکاری طور پر اس کانفرنس کی تجویزوں کی زور شور سے حمایت کی گئی ہے۔ مگر پاکستان کے ارباب حکومت نے عام طور پر بے توجہی سے کام لیا ہے۔ اور وہاں کے زیادہ تر اخبار اصل تجویز کی کہ مہاجرین اپنے اپنے گھروں میں بسائے جائیں سختی سے مخالفت کر رہے ہیں۔ کاش وہ یہ سمجھیں کہ نہ صرف انسانی ہمدردی، رحم دلی، خدا ترسی کے جذبات اور عدل و انصاف کے اصول بلکہ دونوں ریاستوں کے اغراض و مصالح بھی اس پر مجبور کرتے ہیں کہ اگر سب نہیں تو بہت سے مہاجرین کو اپنے اپنے مقام پر واپس جا کر اپنے اپنے کام کرنے کا موقع دیا جائے اس کے بغیر دونوں ملکوں، خصوصاً پاکستان کی معیشت پوری طرح بحال نہیں ہو سکتی۔ یہ سب اخبار اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستان پاکستان میں دوستانہ تعلقات دونوں ملکوں کی ترقی بلکہ زندگی کے لئے ناگزیر ہیں۔ مگر تعجب ہے وہ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے کہ جب تک ہندوؤں اور سکھوں کے لئے مغربی پنجاب کو اور مسلمانوں کے لئے مشرقی پنجاب کو لوٹنا ممکن اور قابل عمل نہ بنا دیا جائے دونوں میں سچے دوستانہ تعلقات قائم کرنا ناممکن اور ناقابل عمل ہے۔

گاندھی جی کا چراغ جل رہا ہے

گاندھی جی کے تعمیری اداروں کے کارکن جو پچھلے سال شروع اپریل میں سیواگرام میں جمع ہوئے تھے، اس سال ۹ مارچ سے اندور کے قریب راؤ کے مقام پر آل انڈیا سروودے کانفرنس منعقد کر رہے ہیں۔ پچھلے سال ان لوگوں نے یہ طے کیا تھا کہ اپنی ساری کوشش فرقہ پرستی سے جنگ کرنے میں صرف کریں گے اور ایک برس کے اندر فرقہ وارانہ فضا کے بدل جانے میں ان کی جدوجہد کو بہت بڑا دخل ہے۔ امید ہے کہ وہ اس مبارک جہاد کو آیندہ سال بھی جاری رکھیں گے۔

۲- پاکستان

متوازن میزانیہ

غلام محمد صاحب وزیر فنانس نے، پاکستانی پارلیمنٹ میں جو میزانیہ پیش کیا ہے اس میں تقریباً چھ لاکھ کی بچت دکھلائی گئی ہے۔ وزیر موصوف نے بجٹ پیش کرتے ہوئے ایک لمبی تقریر کی جس میں پاکستان کے پچھلے سال کی مالی حالت پر سیر حاصل تبصرہ کیا، اور اس پر زور دیا کہ یہ متوازن اور غریبوں کا میزانیہ ہے انھوں نے فرمایا کہ کم تعداد پانے والوں کا اس میں بہت کافی لحاظ رکھا گیا ہے۔ فنانس منسٹر کی طویل تقریر کے اہم حصے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

گذرنے والے سال میں بعض ایسے واقعات پیش آئے۔ جن کا سیاسی اور معاشی زندگی پر بڑا

اب بھی ضرورت سے زیادہ ہے۔ اس کا خیال رکھتے ہوئے کہ ملک کی عام حالت پر کوئی اثر نہ پڑے، اس تعداد میں کمی کی جا رہی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ سال حالت نسبتاً تشفی بخش ہوگی۔ کوئلے کی کمی کی وجہ سے اس سال بڑی دقتیں اٹھانی پڑیں، اور بہت زیادہ قیمت پر باہر سے خریدنا پڑا۔ ہندوستان سے اس کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے۔ اس کے پیش نظر امید ہے کہ ہماری پوری ضرورت ہندوستان سے آئندہ سال پوری ہو جائے گی۔ اس درمیان میں، ہم تیل اور لکڑی کے ذریعے کام چلانے کا تجربہ کر رہے ہیں۔ اگر اس میں کامیابی ہوئی تو باہر سے امداد لینے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ ڈاک خانہ اور تار گھر کی ترقی و اصلاح کے سلسلے میں بھی بہت کچھ ہو رہا ہے۔ ایوان کو یہ سُن

میزانیہ ایک نظر میں

(آمدنی)

	پہلا اندازہ ۱۹۴۸-۴۹ء	نظر ثانی کے بعد ۱۹۴۸-۴۹ء	امسال کا میزانیہ ۱۹۴۹-۵۰ء
مالیہ	۴۱۱۰ لاکھ	۴۷۰۰ لاکھ	۵۵۴۳ لاکھ
ریلیں، ڈاک خانے اور تار گھر	۳۷۱۵ "	۳۷۶۵ "	۳۹۰۵ "
متفرق آمدنی	۱۱۴۸ "	۱۰۹۹ "	۱۳۷۱ "
میزان	۸۹۷۳ لاکھ	۹۵۶۴ لاکھ	۱۰۸۱۹ لاکھ

(خرچ)

	پہلا اندازہ ۱۹۴۸-۴۹ء	نظر ثانی کے بعد ۱۹۴۸-۴۹ء	امسال کا میزانیہ ۱۹۴۹-۵۰ء
فوج	۳۷۱۱ لاکھ	۴۰۲۸ لاکھ	۴۷۲۲ لاکھ
ریلیں، ڈاک خانے اور تار گھر	۳۷۱۵ "	۳۶۸۹ "	۳۷۹۰ "
متفرق اخراجات	۱۵۴۲ "	۱۸۰۴ "	۲۲۰۸ "
میزان	۸۹۶۸ لاکھ	۹۵۲۱ لاکھ	۱۰۷۲۰ لاکھ
بچت	۵ (جمع)	۴۳	۹۹ لاکھ (جمع)

گہرا اثر پڑا۔ مخصوص سیاسی حالات کے پیش نظر جن سے ہم سب بخوبی واقف ہیں۔ مدافعت کی طرف سب سے زیادہ توجہ کرنی پڑی، اور اس کی وجہ سے اخراجات میں غیر معمولی اضافہ کرنا پڑا۔ پاکستان کی تجارتی حالت، پہلے سے بہت بہتر ہے۔ برآمد کی ترقی کے ساتھ ساتھ درآمد میں بھی توسیع ہوئی اور درآمد کے متعلق حکومت کی آزاد پسند پالیسی کی وجہ سے ملک کے ذرائع نقل و حمل میں خاصی ترقی ہوئی اور ذرائع نقل و حمل کے بہتر ہونے کی وجہ سے تجارت کے حجم میں خاصی مدد ملی۔ پچھلے سال میں نے ریلوے کی بعض دقتوں کا ذکر کیا تھا۔ مثلاً ملک کی معاشی ابتری مہاجرین، بے ٹکٹ سفر کرنے والوں کی کثرت کوئلے کی کمی وغیرہ۔ اس کی وجہ سے امسال اندازہ سے کہیں زیادہ نقصان ہوا ہے۔ لیکن اب بڑی حد تک حالت بہتر ہو گئی ہے۔ ریلوے میں اسٹاف کی تعداد

کر خوشی ہوگی کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان اور انگلستان سے تعلقات پیدا کرنے کے لئے ریڈیو ٹیلیگراف کا امسال انتظام ہو گیا۔ توقع ہے کہ اس سال جلد ہی مشرقی اور مغربی پاکستان لندن اور لندن کے ذریعے امریکہ سے ریڈیو ٹیلیفون سے بھی تعلق ہو جائے گا۔"

جیسا پاکستان "ٹائمز" نے لکھا ہے ایک نئی ریاست کے لئے جسے بہت سے تعمیری کام کرنے ہوں اور اپنی پست معاشی سطح کو بلند کرنے کے لئے صنعتوں کو ترقی دینی ہو بجٹ کا توازن قائم رکھنا کچھ زیادہ خوشی یا فخر کی بات نہیں۔ اس کی کوشش تو یہ ہونی چاہیئے کہ اپنی آمدنی سے کہیں زیادہ رقم ملک کے اندر سے یا باہر سے قرض لے کر ایسے کاموں میں لگائے جن سے ہر قسم کی پیداوار بڑھے۔ لیکن اس بات کو نہ بھولنا چاہیئے کہ غیر معمولی افراط زر اور گرانی کی ۴

۴ حالت میں بجٹ کا توازن قائم رکھنا سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اس کے علاوہ صنعتوں کو ترقی دینے کے لئے اندر سے یا باہر سے کافی قرض ملنے کی لازمی شرط یہ ہے کہ ریاست متوازن بجٹ کے ذریعے اپنی ساکھ قائم رکھے۔ اس لئے مجموعی طور پر حکومت پاکستان کی پالیسی صحیح اور دانشمندانہ معلوم ہوتی ہے۔

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

قومی زبان کی تشکیل ہونی چاہیئے۔ (اب بھی اگر کوئی نہ سمجھے تو یہ اُن کا گناہ نہیں!) ہمیں سنسکرت کی اہمیت اور اس کی کلاسیکی عظمت کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف بھی ہے کہ عربی، فارسی، اردو، انگریزی وغیرہ نے ملک میں ایک جاندار اور مالا مال زبان بنانے میں ایک نمایاں حصہ لیا ہے۔ وہ ملک کی عام زبان کے خزانے میں سے اس دولت کو کھونے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ میری پیشین گوئی تو نہیں، لیکن امید ضرور ہے کہ تعصب اور تنگ نظری کے بادل چند سال کے اندر اندر چھٹ جائیں گے اور جو لوگ اس وقت فوری رنجش یا دل کی تنگی کی وجہ سے اس بارے میں غلط فہمی کا شکار ہیں وہ سیدھے راستے پر آ جائیں گے۔ جواہر لال نے اپنے مضمون میں ایک جگہ لکھا ہے خواہ اس عام زبان کا نام کچھ بھی ہو "ہندی یا ہندوستانی" یہ بات ایک طرح صحیح ہے۔ کیونکہ دونوں لفظوں کا مطلب ایک ہی ہے یعنی "ہندوستان کی زبان" بلکہ "ہندی" اس کا خالص فارسی اور زیادہ سہل نام ہے۔ لیکن میرے خیال میں اس وقت جو صورت حال ہے اس میں نام کے بارے میں سمجھوتا کرنا ٹھیک نہ ہوگا۔ اس وقت ان ناموں کے ساتھ خاص خاص معنی اور روایات وابستہ ہو گئی ہیں۔ "ہندی" کا مطالبہ اس وقت زیادہ تر وہ لوگ کر رہے ہیں جو قومی زبان کی بنیاد صرف سنسکرت پر رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر اس بارے میں رجعت پسندانہ ہے "ہندوستانی" کا نام ان لوگوں کے خیال کو ظاہر کرتا ہے جو قومی زبان میں وسعت پذیرائی اور کشادہ دلی کے حامی ہیں اور اس میں ان تمام لفظوں کو شامل کرنے کے لئے تیار ہیں جو زبان کی روح کے ساتھ ہم آہنگ ہوں۔ اس لئے جواہر لال اور دوسرے معقول پسندوں کو نام پر اصرار کرنا چاہیئے۔ کیونکہ جو لوگ نام تک کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں ان سے یہ توقع کیسے ہو سکتی ہے کہ وہ ہندی کی بوتل میں "ہندوستانی" شراب ڈالنے کے روادار ہوں گے؟ لہٰذا حق بات کو بے دھڑک کہنا چاہیئے، اور اس کے لئے کوشش کرنی چاہیئے خواہ بقول گاندھی جی کے انسان اس راہ میں بالکل اکیلا ہو، اور اُسے اس کوشش میں اپنی ساری عمر ختم کرنی پڑے۔

۳ - باہر کی دنیا

مشرق میں مطلع صاف ہو رہا ہے

پچھلے ہفتے کی خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایشیا کے آسمان سے جنگ کے بادل چھٹ رہے ہیں اور امن کے سورج کی ہلکی سی جھلک نظر آ رہی ہے۔

فلسطین میں مصر اور اسرائیل نے صلح نامے پر دستخط کر دئے ہیں اور دوسری عرب ریاستوں سے صلح کی بات چیت جاری ہے۔ بظاہر عرب حکومتیں اسرائیل کی ریاست کو ایک بلائے آسمانی سمجھ کر چار و ناچار تسلیم کریں گی۔ ایک طرف ان کی آپس کی پھوٹ۔ دوسری طرف اسرائیل کو روس اور امریکہ دونوں کی مدد ایسی صورت میں نتیجہ یہی ہو سکتا تھا جو ہوا اور ہو رہا ہے جب تک عرب ملکوں میں سیاسی اصلاحات نہ ہوں حکومت کو عوام کا اعتماد اور ان کی تائید نہ حاصل ہو اور ان میں باہمی اتحاد نہ ہو وہ اس طرح بڑی طاقتوں کی بساط سیاست کے مہرے بنے رہیں گے۔

انڈونیشیا کے معاملے نے ایک نئی کروٹ لی ہے۔ ڈچ حکومت نے اعلان کیا تھا کہ وہ انڈونیشیا کی جمہوری حکومت کے سب ارکان کو رہا کر دے گی، اور ان کو دوسری انڈونیشی حکومتوں (یعنی اپنے شہہ پروردوں) کے ساتھ گول میز کانفرنس میں جمع کر کے انڈونیشیا کی ایک وفاقی حکومت کا نقشہ بنائے گی۔ اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل اس کے متعلق یہ سمجھتی ہے کہ ڈچ اس کے مقرر کئے ہوئے کمیشن کو نظر انداز کر کے اپنے طور پر فیصلہ کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اس کے حکم سے صریحی سرتابی اور اس کی کھلی ہوئی توہین ہے۔ وہ اپنے آئندہ اجلاس میں اس معاملے کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرنے والی ہے۔ انڈونیشیا کی ہنگامی جمہوری حکومت پہلے ہی ڈچ گورنمنٹ کے اس اعلان کے خلاف احتجاج کر چکی ہے۔ مگر دراصل اب جھگڑا ڈچ گورنمنٹ اور سیکورٹی کونسل کے درمیان ہے۔ اس لئے امید ہے کہ وہ قانونی اور آئینی سطح پر رہے گا اور اسے چکانے کے لئے ہتھیاروں کی لڑائی سے کام نہیں لیا جائے گا۔

چین میں دریائے یانگ تسی کے شمال کے کل صوبوں پر قبضہ کرنے اور بہ قول اپنے چین کے ۴۵ کروڑ باشندوں میں سے ۲۰ کروڑ کو آزاد کرنے کے بعد اب کمیونسٹ حکومت چین کی قومی حکومت سے صلح کی بات چیت کرنے پر تیار ہو گئی ہے۔ قومی حکومت کے وزیر اعظم شون تونے جو خدا خدا کر کے کینٹن سے نانکنگ پہنچ گئے ہیں، اعلان کیا ہے کہ وہ دس آدمیوں کی ایک مجلس تشکیل مقرر کریں گے اور خود اس کے صدر ہوں گے۔ انھیں امید ہے کہ وہ کوئی دو ہفتے میں اپنی کمیٹی کے ساتھ ماؤ تسی تنگ کی حکومت سے صلح کی گفتگو کرنے کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔ ابھی تک یہ کہنا مشکل ہے کہ صلح کی بات چیت اس بنیاد پر ہوگی کہ دونوں فریقوں کی ایک مشترک حکومت قائم کی جائے یا کوئی اور نقشہ بنایا جائے گا۔

بہر حال چونکہ دونوں علاقوں میں تجارت اور کہیں کہیں ریلوں اور جہازوں کی آمد و رفت پہلے ہی سے شروع ہو گئی ہے۔ اس لئے آثار یہی ہیں کہ صلح کی کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔

برما میں ابھی تک خانہ جنگی اسی شدت سے جاری ہے لیکن نئی دہلی کی کانفرنس میں جس میں ہندوستان، انگلستان، سیلون، نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کے نمائندے شریک ہوئے تھے، یہ تجویز ہوئی ہے کہ برمی حکومت اور کرن قبائل میں سمجھوتا کرانے کی کوشش کی جائے۔ اب یہ بات صاف ہو گئی ہے کہ انگلستان میں کنسرویٹو پارٹی کرن قبائل سے ہمدردی رکھتی ہے غالباً اسی کے زور دینے سے برطانوی حکومت سمجھوتے کی کوشش کرنے پر آمادہ ہوئی ہے۔ برمی حکومت کے لئے مصالحت کی تجویز ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ کرن قبائل پر ان کے دوست اتنا اثر ڈال سکتے ہیں یا نہیں کہ وہ معقول شرائط پر صلح کرنے کی حامی بھر لیں۔

مغرب میں مورچہ بندیاں ہو رہی ہیں

واشنگٹن میں امریکہ، انگلستان، فرانس، کینڈا، ہالینڈ، بلجیم اور لکسمبرگ میں اتحاد اٹلانٹک کی بات چیت ہو رہی ہے۔ اب تک یورپ میں روس کے خلاف جمہوری ریاستوں کا ایک مشترک محاذ بنانے کی جتنی کوششیں ہوئیں — مارشل پلان، مغربی یونین، وفاق یورپ، سب کی بنیاد بہت کمزور تھی۔ اس لئے کہ یورپ کی ریاستوں خصوصاً فرانس کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ امریکہ کی جنگی امداد کے بغیر یورپ میں کوئی اتحاد اس قابل نہیں ہو سکتا کہ آئندہ جنگ میں روس کا مقابلہ کر سکے اور امریکہ کا یہ رنگ تھا کہ وہ یورپی ریاستوں کو صرف معاشی امداد دے رہا تھا اور ان سے یہ توقع رکھتا تھا کہ وہ محض اپنے بل پر روس کے خلاف مورچہ بنا لیں گی۔ مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کی سمجھ میں یہ بات آ گئی ہے کہ یورپ میں ایک مضبوط جنگی محاذ اس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک وہ خود مالی مدد کے علاوہ جنگی مدد کی ذمہ داری بھی اپنے سر نہ لے۔ چنانچہ اب اتحاد اٹلانٹک کی تجویز نکالی گئی ہے جس میں مغربی یورپ کی جمہوریتوں کے علاوہ امریکہ اور کینڈا بھی شامل ہو رہے ہیں۔ ڈنمارک، ناروے، سویڈن پر بھی ڈورے ڈالے گئے تھے۔ مگر سویڈن نے تو صاف انکار کر دیا اور ڈنمارک اور ناروے ٹال مٹول کر رہے ہیں۔ تازہ خبروں سے معلوم ہوا ہے کہ واشنگٹن کی گفتگو کامیابی سے جاری ہے اور امید ہے کہ بہت جلد عہد نامہ تیار ہو جائے گا۔ خیال یہ ہے کہ اس کی شرائط کا اعلان ابھی نہ کیا جائے بلکہ اس وقت جب اس پر سب حکومتوں کے دستخط ہو جائیں دیکھنا ہے کہ یہ نیا پیمان وفا حبیب کے وصل پر زیادہ زور دیتا ہے یا رقیب سے فصل پر۔

ع، ح

مختصر تبصرے

(بسلسلہ صفحہ ۸)

ہوتی ہیں۔ سخت تنقید کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ نئے، ابھرتے ہوئے ہونہار ادیبوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا جائے۔ اس کے برعکس نئے لکھنے والوں کی ابتدائی صلاحیتوں کو صحیح راہ نمائی سے تقویت پہنچانا اور عام پڑھنے والوں کو اس سے روشناس کرانا بھی اس کا کام ہے۔

بہر حال ہر کتاب کے لئے نہیں تو اکثر کتابوں کے لئے تبصرہ نگار کو فیصلہ کن انداز اختیار کرنا ہی پڑے گا کیونکہ اس کی رائے ایک ایسی کسوٹی ہے جس پر پڑے ہوئے نشانات ہی قارئین کے لئے جادہ یا راستہ بن سکتے ہیں۔ تبصرہ نگار سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ مصنف، اس کے ماحول، اس کے نقطہ نظر، اس کے اسلوب بیان، تصنیف کی عام خوبیوں اور خامیوں کے متعلق ایسے اشارے کرے گا جن سے کتاب کے متعلق اتنا معلوم ہو جائے گا کہ کتاب کو فوراً پڑھا جائے یا کسی خاص سلسلے میں کسی خاص موقعہ پر، اس کا پڑھنا اور نہ پڑھنا برابر ہے یا بالکل پڑھنا ہی نہ چاہئے۔ تبصرہ نگار چاہے یہ باتیں نہ لکھے، لیکن اس کے اشارے ایسا رد عمل ضرور پیدا کر سکتے ہیں۔ کتاب کے تبصرے اور اشتہار میں فرق ہونا چاہئے۔ اشتہار تجارتی چیز ہے اور تبصرہ ادبی۔ اشتہار کا کام ہر حالت میں گاہکوں کو گرفتار کرنا ہوتا ہے۔ تبصرہ کبھی کبھی اشتہار سے زیادہ نازک طریقے پر رستہ دکھا سکتا ہے اور کبھی ایک تجربہ کئے ہوئے شخص کا مشورہ بن کر دوسروں کو اس کے جال میں پھنسنے، اپنا وقت اپنا پیسہ اور دماغ ضائع کرنے سے باز رکھ سکتا ہے۔ اس طرح تبصرہ نگاری ایک نازک اور ذمہ دارانہ حیثیت رکھتی ہے۔

تبصرہ نگار مصنف اور قارئین کے علاوہ ناشر سے بھی واسطہ رکھتا ہے، کیونکہ کتاب کی قیمت میں اچھی طباعت وغیرہ سے بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اس لئے اسے کتاب کی ظاہری ہیئت پر بھی نگاہ رکھنا چاہئے تاکہ اس کے مشورے ناشروں کے لئے بھی مفید بن سکیں۔ یہ چند سطریں اس لئے لکھی گئی ہیں کہ کم سے کم نئی روشنی کے قارئین کتابوں کے مختصر تبصرے کو نہ تو کتاب کا اشتہار سمجھ کر پڑھیں اور نہ مصنف اور تصنیف کے متعلق حرف آخر بلکہ ایک تجربہ کار مشیر کی رائے سمجھیں جو غلط بھی ہو سکتی ہے اور نفسیاتی اختلافات کی وجہ سے ناقابل قبول بھی — لیکن جو پر خلوص طریقہ پر کتاب اور مصنف سے متعارف کر دیتی ہے۔

نسیمِ شوق

روشؔ صدیقی

وہ برقِ نازِ گریزاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
مگر شریکِ رگِ جاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہزار دل ہے ترا مشرقِ مہ و خورشید
غبارِ منزلِ جاناں نہیں تو کچھ بھی نہیں

سکونِ دل تو کہاں ہے مگر یہ خوابِ سکوں
نثارِ زلفِ پریشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

گزر چکی تری کشتی ہزار طوفاں سے
ہنوز حسرتِ طوفاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

بہارِ محفل گہِ ناز دل کشا ہے، مگر
نسیمِ شوق خراماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہے خلوتِ دلِ ویراں ہی منزلِ محبوب
یہ خلوتِ دلِ ویراں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہر ایک سانس ہو آتش کدہ تو کیا حاصل
گدازِ شعلۂ پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

بغیر عشق ہے روداد زندگی تاریک
یہ لفظ زینتِ عنواں نہیں تو کچھ بھی نہیں

بہت بلند ہے دل کا مقامِ خودداری
مگر شکست کا امکاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

سکونِ شوق ہو یا اضطرابِ شوق روشؔ
اگر بمنزلۂ جاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

غزل

باقر رضوی

شوقِ آزادی میں شاخِ بے ثمر ہوتی گئی
بلبلِ شوریدہ سر بے بال و پر ہوتی گئی

جس قدر دانائے رازِ خیر و شر ہوتی گئی
زندگانی اتنی ہی دشوار تر ہوتی گئی

گلشنِ ہستی میں فرقِ خار و گل بڑھتا گیا
رفتہ رفتہ چشمِ عالم بے بصر ہوتی گئی

چھٹتے چھٹتے چھٹ گئیں وہم و گماں کی بدلیاں
ہوتے ہوتے ہر حقیقت جلوہ گر ہوتی گئی

میرے ان کے درمیاں جتنا بڑھا میل اور ملاپ
گفتگو اتنی ہی اتنی مختصر ہوتی گئی

اتنے ہی ہم میری طرف سے بے خبر ہوتے گئے
جتنی ان کو میری جانب سے خبر ہوتی گئی

تم گئے کیا وقت کی گردش ٹھہر کر رہ گئی
گو بظاہر روز و شب شام و سحر ہوتی گئی

الاماں فرقت کی گرمی، الحذر ہجراں کی آگ
دل پگھل اس صورت سے پگھلا آنکھ تر ہوتی گئی

جو غمِ ہستی کو دل کی آنکھ سے دیکھا کیا
زندگی اس کے لئے دردِ جگر ہوتی گئی

غزل

محمد مثنیٰ رضوی

ابھی فضا میں جو پُر درد گنگناہٹ تھی
یہ میری روح کے تاروں کی تھرتھراہٹ تھی

زمانہ جاگ اُٹھا جس کے اک اشارے پر
وہ انقلاب کے قدموں کی صرف آہٹ تھی

فضائیں جس سے منوّر ہوئیں زمانے کی
ترے جمال کی پُر نور مسکراہٹ تھی

وہ جس سے جل اُٹھے لاکھوں کنول تصور میں
ترے خیال کی ہلکی سی گنگناہٹ تھی

وہ پچھلی رات ترا یاد آ کے رہ جانا
خنک خنک سی فضا میں عجب ادا ہٹ تھی

غزل

سحرؔ رامپوری

عجب دل کا عالم بنائے ہوئے ہیں
وہ پردے کہ جنبش میں آئے ہوئے ہیں

تعاقب نہ کرتی ہوں وہ مست نظریں
جو اپنے قدم ڈگمگائے ہوئے ہیں

مرے لب تھے اور اک حسیں بھول لیکن
وہ رخسار کیوں تمتمائے ہوئے ہیں

بچے رہ گئے ہیں جو دو چار تنکے
گلستاں کو کیا کچھ بنائے ہوئے ہیں

ہے جیسے محبت بھی فطرت کے تابع
وہ کیسا سحرؔ کو بھلائے ہوئے ہیں

مختصر تبصرے

سید احتشام حسین

"کتاب بظاہر کتنی معمولی اور مانوس سی چیز ہے، مگر دراصل یہ دنیا کا سب سے بڑا اور پراسرار معجزہ ہے۔ کاغذ کے ان ٹکڑوں سے جن پر سیاہ نقوش اُبھرے ہوتے ہیں ہماری آنکھیں نم ناک ہو جاتی ہیں یا ہمیں غصہ آنے لگتا ہے۔ کبھی ہم خوابوں کی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں، اور کبھی کھل کھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔" (میکسم گورکی)

میکسم گورکی ایک شفقت پسند طالب علم تھا جس نے کتابوں کو محض تفریح کے لئے نہیں پڑھا بلکہ اس کا اعتراف کیا ہے کہ ان بوں نے اس کے خیالات کی ترتیب میں اس کے نقطۂ نظر، فلسفۂ زندگی، جمالیات اور شعورِ حیات کی تشکیل میں بڑا حصہ لیا۔ اگر اس کی زندگی میں کتابوں کا اتنا حصہ نہ ہوتا تو وہ "دنیا کا سب سے بڑا اور پراسرار معجزہ" نہ کہتا لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ ہر کتاب معجزہ ہوتی ہے۔ سچے اور جھوٹے انبیاء ہوئے ہیں اور ان کے سچے جھوٹے معجزے۔ اچھے اور برے مصنف ہوئے ہیں اور ان کی اچھی بری کتابیں۔ ان میں تمیز کرنے کی ضرورت ہے، جتنی کتابیں لکھی جاتی ہیں اور شائع ہوتی ہیں وہ سب نہ تو پڑھی جا سکتی ہیں نہ پڑھنے کے قابل ہوتی ہیں۔ عام طور سے لوگ اپنے ذوق اور ضرورت کے مطابق کتابوں کا انتخاب کرتے ہیں، اور اس انتخاب میں مدد چاہتے ہیں۔ رسائل کے تبصرہ نگار اس سلسلے میں کتنی مدد کر سکتے ہیں، یہی ان سطروں کا موضوع ہے۔

رسائل اور اخبارات میں کتابوں پر مختصر تبصرے شائع ہوتے ہیں۔ ان مختصر تبصروں اور جامع تنقیدی مضامین میں محض اختصار اور طوالت کا فرق نہیں ہوتا بلکہ کیفیت اور کمیت میں وسعت اور مقصد میں بھی یہ مختلف ہوتے ہیں۔ مختصر تبصروں کے محدود ڈھانچے میں اہم تنقیدی مسائل، ادبی نظریات فنی تصورات کی بحثیں نہیں چھیڑی جا سکتیں، بلکہ عام ادبی نتائج کی بنیاد پر کسی کتاب کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ضرورت کے مطابق یہ تبصرے طویل بھی ہو سکتے ہیں، اور اگر ضرورت ہو تو ان میں اہم مباحث کے دروازے بھی کھولے جا سکتے ہیں، لیکن ان میں بھی اختصار مدِنظر ہوتا ہے تاکہ کم سے کم جگہ میں کتاب زیرِ تبصرہ کا تنقیدی اور بصیرت افروز تعارف ہو سکے۔ تعارف کا لفظ میں نے جان بوجھ کر استعمال کیا ہے۔ ہر کتاب کا کوئی موضوع ہوتا ہے اور اس کا کوئی پس منظر، ہر کتاب کا کوئی مصنف ہوتا ہے اور اس کا کوئی نقطۂ نظر۔ تبصرہ نگار اس کتاب کا مطالعہ اس نظر سے کرتا ہے کہ اسی موضوع پر لکھی ہوئی دوسری کتابوں کے مقابلے میں یہ نئی کتاب کیا حیثیت رکھتی ہے، اور مصنف نے زندگی کا کون سا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ اس طرح کبھی بحث کا موضوع کتاب بن جاتی ہے، کبھی مصنف، کبھی کتاب کا موضوع اور کبھی پیش کرنے کا طریقہ۔ لیکن جیسا کہ کہا جا چکا ہے، مختصر تبصرے میں کوئی بحث نہ طویل ہو سکتی ہے اور نہ قطعی۔ اس لئے تبصرہ نگار کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ ہر پہلو کی طرف مختصر مگر بلیغ اشارے کیا جائے۔ تاکہ اس کتاب کا مطالعہ کرنے والے کے دل میں کتاب کی خوبیوں اور خامیوں کے سمجھنے کی ذاتی خواہش بھی پیدا ہو جائے۔

ہر شخص ایسا بیدار ذہن نہیں رکھتا کہ ہمہ تن توجہ بن کر کتاب کا مطالعہ کرے۔ اچھا مطالعہ بذاتِ خود ایک فن ہے جو کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے، ایک صاحبِ ذوق انسان بھی اچھی خاصی ریاضت کے بغیر کتاب سے اچھی طرح لطف اندوز اور مستفیض ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ تبصرہ نگار سے کم سے کم یہ امید کی جاتی ہے کہ اس کا ذوق پختہ، اس کی نگاہ گہری، اور اس کا مزاج منصفانہ ہوگا۔ وہ موضوع سے اچھی طرح واقف، اور اندازِ بیان کی خصوصیات کا حقہ آشنا ہوگا، اور اس نے اپنے ذہن کو کھلا ہوا رکھ کر کتاب کے مطالعے کے دوران میں مصنف کو اپنے خیالات اور نقطۂ نظر کی وضاحت کا پورا موقع دیا ہوگا، اس کے بیان اور اندازِ بیان کو ہمدردانہ سمجھنے کی کوشش کی ہوگی اور اس کے بعد وہ جو نتائج اخذ کرے گا ان کو اپنے تبصرے میں پیش کرے گا۔ تبصرہ نگار کی ذمہ داری بہت زیادہ ہوتی ہے کیونکہ وہ مصنف یا کتاب اور قارئین کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک لحاظ سے اس کی رائے صرف ادبی نہیں، اس کاروباری زمانے میں تجارتی اہمیت بھی رکھتی ہے اس لئے یہ سوچنا کہ کوئی تبصرہ نگار صرف اپنی ذاتی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کے وقتی جذبے سے مغلوب ہو کر کسی کتاب کے متعلق کوئی رائے دے گا درست نہیں، یہاں بے لاگ رائے اور ذاتی پسندیدگی کا نفسیاتی مسئلہ بھی میرے پیشِ نظر ہے لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ اچھے تبصرہ نگار کتاب کے متعلق رائے دینے میں جہاں تک ممکن ہوتا ہے محض ذاتی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کو خیالات کی بنیاد نہیں بناتے بلکہ ملک کے ذوقِ مطالعہ، مصنف کی شخصیت، اہلیت اور رجحان، موضوع کی اہمیت اور مصنف کے متعلق دوسروں کی رایوں کو پیشِ نظر رکھ کر کوئی فیصلہ کرتے ہیں اور اس سے زیادہ کسی انسان کے بس میں نہیں۔

خیر، یہ تو سوال تھا، تبصرہ نگار کی ادبی دیانت داری اور وسعتِ نظر کا۔ تبصرے میں عام قارئین کے مطالبات بھی چھپے ہوتے ہیں۔ کتابوں کا اوسط درجے کا شائق ایک اچھے رسالے یا اخبار اور اس کے ذمہ دار تبصرہ نگار سے ایک کتاب کے متعلق کیا کیا جاننا چاہتا ہے۔ تبصرہ نگار کے پیشِ نظر یہ بات بھی ہوتی ہے۔ لیکن اس کی تفصیل یہاں ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ ہر موضوع ہی نہیں بلکہ ہر کتاب کے متعلق واضح کرنے والی باتیں مختلف ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر ایک ناول پر تبصرہ مقصود ہے تو اس کے پلاٹ کا خاکہ مختصر ترین لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے لیکن ایک مختصر افسانوں کے مجموعے کے ہر افسانے کا پلاٹ نہیں بیان کیا جا سکتا، ہاں کسی نمائندہ افسانے یا انوکھا یا اندازِ بیان رکھنے والے افسانے کا بیان ہو سکتا ہے۔ اسی طرح کسی سائنس کی کتاب کے مادّی مباحث کا خلاصہ نہیں پیش کیا جا سکتا، مگر نتائج اور ان نتائج کی صحت یا افادیت کے متعلق ضرور کم سے کم جگہ میں چند ضروری باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ ہر جگہ تبصرہ نگار کا طریقِ کار یکساں نہیں ہو سکتا اگر وہ اتنا ہی کر دے کہ پڑھنے والے کے لئے ایک ذہنی فضا تیار کر دے تو یہ بھی بڑی بات ہے۔

ہر تبصرے میں کم سے کم یہ تو ظاہر ہی ہو جانا چاہیے کہ کتاب کا موضوع کیا ہے۔ مصنف کے خاص خیالات کیا ہیں، وہ کن تحریکوں سے وابستہ ہے۔ کن کا مخالف یا موافق ہے۔ کن خیالات یا مصنفین سے متاثر معلوم ہوتا ہے۔ زندگی کے کن عناصر کو تقویت پہنچانا چاہتا ہے، اور حیاتِ انسانی کے حسن میں کس قدر اضافہ کرتا ہے۔ اُسے یہ بھی ظاہر کرنا چاہیے کہ کتاب عام کتابوں کی طرح ایک کتاب ہے، یا علمِ انسانی میں اضافہ کرتی ہے۔ نئی گتھیاں پیدا کرتی ہے یا گتھیوں کو سلجھاتی ہے۔ موجودہ دورِ تمدن بہت سی عقلی اور تجرباتی تحریکوں سے وجود میں آیا ہے اور اپنی بہت سی خامیوں کے باوجود اپنے طریقوں میں سائنٹیفک، اپنے عقائد میں عقل پرست، اور اپنے مقصد میں افادی ہے۔ یہ باتیں خود اپنی جگہ پر بحث طلب ہیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ عینیت پسند اور قطعیت پرست بھی اپنے دلائل کی عقلی اور اپنے وجود کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اربوں کتابوں کی اس دنیا میں ایسی کتابوں کا اضافہ جو کسی حیثیت سے مفید نہ ہوں ترقی کی دلیل نہیں۔ تبصرہ نگار کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ انسانوں کے ذہن اور علم کے لئے وہ چیزیں اپنی سنجیدہ رائے سے مہیا کرے جو سرمایۂ فکر میں اضافہ کا سبب بنتی ہیں؟ اور ان تصورات اور تخلیقات کی ہمت شکنی کرے جو مفادِ انسانی کے لئے کسی حیثیت سے مضر

(بقیہ صفحہ ۲۰ پر)

ہریجن کا سَنت

سروودے کی تکمیل

ونوبا بھاوے

(راج گھاٹ دہلی میں گاندھی جی کی پہلی برسی کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے اچاریہ ونوبا بھاوے نے گاندھی جی کے ستیہ اور اہنسا کے اصولوں کو سیدھے سادھے لفظوں میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا، اور گاندھی جی کی شہادت کی اہمیت سمجھائی۔ شری ونوبا نے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ گاندھی جی کا قتل ہم سب کے لئے ایک چیلنج ہے کہ ہم سرودے کے نصب العین کو پورا کریں۔)

ایک سال ہوا آج ہی کے دن اسی گھڑی وہ المناک واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے ہم کو ہمیشہ اپنا سر شرم سے جھکانا پڑے گا۔ لیکن یہی واقعہ ہمارے لئے ابدی فیضان کا سرچشمہ بھی ہو سکتا ہے۔ اسی نے ہمیں جسم اور روح کا فرق سمجھایا ہے۔

بہت سے لوگ پوچھتے ہیں کہ گاندھی جی کو جو سچے اللہ والے تھے اللہ نے کیوں نہیں بچایا۔ مگر میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ جیسی حفاظت قدرت کی طرف سے گاندھی جی کی ہوئی۔ اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے۔ ہم جو اس بات کو نہیں سمجھتے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا تعلق جسم سے دوسری قسم کا ہے۔ قرآن میں آیا ہے "جو لوگ خدا کی راہ میں شہید ہوئے انھیں مردہ نہ کہو وہ تو زندہ ہیں چاہے تم ان کو دیکھ نہ سکو" ایک اور جگہ ہے "خدا کی راہ میں موت بھی زندگی ہے اور شیطان کی راہ میں زندگی بھی موت ہے"۔ ساری عمر گاندھی جی کی سچائی اور نیکی کی راہ پر چلتے رہے۔ اسی کی وہ اپنی قوم کو تلقین کرتے رہے۔ اور اسی تلقین کی وجہ سے قتل کر دئے گئے۔ مبارک تھی ان کی زندگی اور مبارک تھی ان کی موت!

بہت سے ولیوں نے نیکی کی راہ کی طرف ہدایت کی ہے۔ پھر بھی انسان کو ابھی پوری طرح یقین نہیں آیا کہ بھلائی صرف بھلائی سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ اب بھی تجربہ کر رہا ہے کہ دیکھیں برائی سے بھی بھلائی نکل سکتی ہے یا نہیں۔ اُسے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ببول کے پیڑ سے آم کا پھل اور آم کے پیڑ سے ببول کا پھل کبھی نہیں پیدا ہو سکتا۔ شاید پرانے زمانے میں یہ بات بھی اس کے ذہن میں صاف نہ رہی ہو۔ لیکن اس عہد کے لوگوں کو یقین ہے کہ مادی دنیا کے لئے تو بیج اور پھل کے تعلق کا قانون ضرور صحیح ہے۔ البتہ اخلاقی دنیا میں وہ ابھی تک اس بارے میں اپنے شبہے کو دور نہیں کر سکا۔ اتنا تو وہ جانتا ہے کہ نیکی سے عام طور پر فائدہ ہوتا ہے لیکن یہ بات اس کے دل میں نہیں بیٹھی کہ خالص نیکی سے بھی بھلا ہو سکتا ہے۔

کچھ لوگ ہیں جو شخصی زندگی میں خالص نیکی کا اصول تسلیم کرتے ہیں۔ وہ اسے نجات حاصل کرنے کے لئے ضروری سمجھتے ہیں، لیکن جماعتی زندگی کے بارے میں ان کا یہ خیال ہے کہ تھوڑی سی بدی کی ملاوٹ کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کو حق و باطل کا ملا جلا اور اشتبہ راس آتا ہے۔ گاندھی جی نے اس نظریے کو کبھی نہیں مانا۔ انھوں نے ہم سے سماجی زندگی میں بھی ستیہ اور اہنسا کے اصولوں پر عمل کرایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیں جیسا تیسا سوراج مل گیا۔ جس حد تک ہم نے اُن کی ہدایتوں کی تعمیل کی اتنی تسکین قلب حاصل ہو گئی۔ رہا یہ کہ ہمارا سوراج ویسا نہیں جیسا ہونا چاہئے تھا اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کے اصول میں کوئی خامی تھی بلکہ یہ ہے کہ اس پر ادھورا عمل ہوا۔ ہندسے کا جو اصول ایک عام مثلث پر عائد ہوتا ہے اسے تین ضلعوں کی سب شکلوں پر عاید ہونا چاہیئے۔ اسی طرح اگر یہ صحیح ہے کہ کامل پاکیزگی شخصی اور نجی زندگی میں مفید ہے تو اسے اجتماعی زندگی میں بھی مفید ہونا چاہیئے۔

بعض کا خیال ہے کہ اگر ہمارے اغراض و مقاصد حق کے مطابق ہوں تو کافی ہے، چاہے ہم ان کے حاصل کرنے کے لئے کوئی ذریعے بھی استعمال کریں۔ گاندھی جی ہمیشہ اس نظریے کے مخالف رہے۔ وہ تو حق کی خاطر سوراج کو بھی قربان کرنے کو تیار تھے یہ بات نہیں تھی کہ وہ سوراج کے خواہاں نہ ہوں یا اس کو کافی اہمیت نہ دیتے ہوں جس چیز پر وہ زور دینا چاہتے تھے وہ یہ تھی کہ اس کے حاصل کرنے میں پاک ذریعوں سے کام لینا چاہیئے۔ ساری عمر وہ سوراج کے لئے کوشش کرتے رہے۔ مگر ہمیشہ یہ کہتے رہے کہ سوراج صرف ایسے ذریعوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے جو سچائی پر مبنی ہوں اور وہی سچا سوراج ہو گا۔

جو شخص کسی نصب العین کے حصول کی کوشش کرتا ہے اسے مقصدوں سے زیادہ ذریعوں کے معاملے میں احتیاط برتنی چاہیئے۔ اچھے ذریعے اختیار کرنا ہی درا صل مقصد کا حاصل کرنا ہے۔ اس لئے مقصد اور ذریعے کا فرق محض خیالی ہے۔ ذریعہ نہ صرف مقصد تک پہنچاتا ہے بلکہ اس کی شکل کو متعین کرتا ہے۔

سچ پوچھئے تو اپنے مقصد اور نصب العین کو ہر شخص اچھا سمجھتا ہے۔ اس لئے مقصد کی اچھائی کا دعویٰ کوئی خاص قدر و قیمت نہیں رکھتا۔ یہ خیال نیا نہیں ہے کہ ذریعے اور مقصد میں ہم آہنگی ہونی چاہیئے۔ لیکن جس پیمانے پر اس سے ہندوستان میں کام لیا گیا اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ کچھ اور لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ حق اور تقویٰ پر زور دینا اچھا ہے مگر عمل بہر حال زیادہ اہم ہے اگر تقوے پر زور دینے سے عمل میں رکاوٹ ہو تو نصب العین کو تھوڑا سا نیچا کر دینا چاہیئے۔ ان کے نزدیک بے عملی کا تو کبھی تصور ہی نہیں کرنا چاہیئے یہ بھی خبط ہے اور غلطی ہے۔ جب لوگوں کو مدت تک جیل میں رہنا پڑتا تھا تو وہ کہتے تھے "ہم جیل میں پڑے سڑ رہے ہیں" گاندھی جی ان کو یہ بتاتے تھے کہ ایک پاک آدمی کی بے عملی کے اندر بھی طاقت چھپی ہوئی ہے۔ گیتا نے اپنے بے مثل انداز میں کہا ہے "بے عملی میں عمل ہے" بے شک عمل بہت اہم ہے مگر حق اور تقوے اس سے بھی زیادہ اہم ہیں۔ عمل تو انسان خاص حالات میں ترک کر سکتا ہے مگر حق کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔

کچھ حضرات ہیں جو اپنے آپ کو "عملی آدمی" کہتے ہیں۔ وہ حق کو پسند کرتے ہیں مگر یہ سمجھتے ہیں کہ اس پر یکطرفہ عمل خطرناک ہے۔ انھیں یہ ڈر ہے کہ اگر ہم ستیہ اور اہنسا پر قائم رہے اور ہمارے حریفوں نے استیہ اور ہنسا سے کام لیا تو ہم کو نقصان پہنچ جائے گا۔ دراصل یہ لوگ سچائی کی قدر و قیمت نہیں جانتے ورنہ ایسی بات نہ کہتے۔ کیا وہ کبھی اس طرح بحث کرتے ہیں کہ اگر ہمارا حریف کھانا چھوڑ دے تو ہمیں بھی چھوڑ دینا چاہیئے؟ وہ جانتے ہیں کہ حریف چاہے کچھ بھی کرے غذا طاقت بخشنے والی چیز ہے۔ اگر وہ حریف کا خیال کئے بغیر کھانا کھا سکتے ہیں تو یک طرفہ سچائی اور یک طرفہ محبت سے کام نہ لینے کے کیا معنی؟ یہ بزدلی کا رویہ ہے اس طرح ایک منطقی دور پیدا ہو جاتا ہے اور بدی کا چکر بندھ جاتا ہے اسے توڑنے کے لئے انسان کو چاہیئے کہ ہمت کر کے محبت اور فیاضی سے کام لے، اور نتائج کا حساب نہ لگائے دراصل حق محبت اور نیکی مثبت اور حقیقی ہیں۔ باطل بغض، بدی منفی اور غیر حقیقی ہیں۔ یہ تو نور و ظلمت کی جنگ ہے۔ اس میں نور کو کاہے کا ڈر ہے؟

یہ ستیہ گرہ کے فلسفے کا تصور ہے جو میرے ذہن میں ہے۔ اس میں سب کا بھلا ہے اس لئے اسے سرودے کا فلسفہ کہتے ہیں۔

گاندھی جی کا قتل ہمارے لئے ایک چیلنج ہے ہم اس چیلنج کو اسی وقت قبول کر سکتے ہیں جب ہمیں حق پر کامل اعتماد ہو۔ اور اسے اپنی شخصی اور اجتماعی زندگی میں برتنے پر تیار ہوں۔ ورنہ صرف یہی نہیں کہ ہم کو اس چیلنج کو قبول کرنے کی ہمت نہیں ہو گی بلکہ شاید ہمیں چار ناچار گاندھی جی کے قاتل کے لشکر میں شامل ہونا پڑے۔

مجھے اُمید ہے کہ گاندھی جی کی اس جسم فانی سے رہائی ہمیں نئی طاقت بخشے گی اور ستیہ اور اہنسا پر دل و جان سے عمل کر کے ہم سرودے کے نصب العین کے موزوں خادم بن جائیں گے۔

پر جو سچے داتا ہیں ان کا سب سے ایک سلوک
پاپ کے بدلے پن کرنا اور بدے کرنا نیک سلوک
(گجراتی شاعر)

کھاج

سید سخی حسن نقوی

۱۹۴۷ء تک سلطنتِ انگلشیہ ہندوستان غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ لیکن رات کے بارہ بجتے غلامی کی منحوس زنجیریں ٹوٹ گئیں، اور ٹھیک بارہ بج کر ایک سکنڈ پر ہندوستانیوں نے آزادی کی پہلی سانس لیا۔ ہندوستان کی فضا میں پہلی بار آزاد ہوا کا پہلا جھونکا چلا۔ انسانوں نے بلا امتیاز مذہب و ملت و رنگ و نسل مسرت کا جشن منایا۔ خوشی کے نقارے بجے۔ شاندار جلوس نکالے گئے۔ اسکول کے ماسٹروں اور دفتر کے کلرکوں نے خوب تعطیلیں ماریں۔ بچوں نے مٹھائیاں، اور بڑوں نے رشوتیں اڑائیں۔ بے شک ذہنی آزادی ہوگیا لیکن ابھی بہارا کام ختم نہیں ہوا۔ بلکہ تعمیری کام کا دور اب شروع ہوا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ کر لیا، کچھ ہو رہا ہے۔ اور بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ جو کرنا باقی ہے اس میں اہم ترین کام جس کی طرف ہمارے ارباب حل و عقد کے ذہن منتقل ہی نہیں ہوئے یہ ہے کہ ان مصیبتوں کا جلد از جلد انسداد کیا جائے جو انگریزی سامراج نے ہمارے لئے چھوڑی ہیں۔ ان میں ایک دوسری ٹیکا عظیم ہے جس کی بدترین لعنت کھاج ہے جس کا آج سارے ملک میں راج ہے۔ افسوس ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے حکیموں اور ڈاکٹروں نے لاکھوں دوائیں ایجاد کیں لیکن کھاج کا ایسا تیر بہدف علاج ایجاد کرنے سے قاصر رہے جو ہمیں کھاج کے سامراج سے بھی خلاصی دے سکے۔

جس طرح سیاسیات میں اس مسئلہ پر کہ ریاست کا آغاز کیسے ہوا سیاسی مفکرین نے مختلف نظریات پیش کئے ہیں۔ روسو معاہدۂ عمرانی کا قائل ہے اور سر ہنری مینٹس نے اپنی تحقیقات کی روشنی میں پدری اور پسری پر زور دیا ہے اسی طرح علمِ خارش کے طالب علموں نے کھاج کے بارے میں اپنے تجربات کی بنا پر جدا جدا نظریات پیش کئے ہیں۔ بعض توہم پرست مریضوں کی رائے ہے کہ کھاج چونکہ مرض نہیں بلا ہے اس لئے پچھلے جنم میں اس کا چال چلن ضرور خراب رہا ہوگا۔ دلیل یہ ہے کہ کھاج انسان کے تمام جسم کو گھیر لیتی ہے اور سب سے زیادہ اسے وہ مقامات پسند ہیں جو جسمِ انسانی میں سب سے زیادہ گندے ہیں اور جنھیں وہ پوشیدہ رکھنا پسند کرتا ہے۔ اسی نظریے کے ماتحت وہ جادو اور ٹونے کے ذریعے سے کھاج کے قائل ہیں۔ نمک فروش پنساریوں کا خیال ہے کہ کھاج کا واحد سبب موجودہ زمانے کی شکر ہے جس میں خارش کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف شکر ملوں کے مالکوں کے نزدیک یہ آج کل کے نمک کی تاثیر ہے جو کھاج کے جراثیم کا حامل ہے۔ سیاسی سائنس دانوں کی رائے میں یہ سب نظریات غلط ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کھاج پھیلنے کا صرف ایک سبب ہے اور وہ ہے "ایٹم"۔ اس لئے وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ کھاج مشرق میں جاپان اور اس کے قرب و جوار میں پھیل رہی ہے اور مادرِ وطن چونکہ اس علاقے کے قریب ہے اس لئے وہ بھی کھاج میں مبتلا ہے۔ اسی سبب سے انھوں نے کھاج کے مرہم کا نام "ایٹم بم مرہم" رکھا ہے جس کا دعوےٰ ہے کہ جس طرح ایٹم بم چشم زدن میں لاکھوں آدمیوں کو ہلاک کر دیتا ہے اسی طرح یہ مرہم کھاج کے جراثیم کو تباہ کر ڈالتا ہے۔

آج کل دنیا میں کوئی سیاسی لیڈر اتنا مقبولِ خاص و عام نہیں جتنی کھاج ہے۔ کوئی گھر ایسا نہیں جس نے کھاج کو مہمان نہ رکھا ہو، گھر کی کوئی فرد ایسی نہیں جس نے اس کی دل کھول کر مہمان نوازی نہ کی ہو۔ جنھوں نے کھاج کی تاریخ اور سوانحِ حیات کا مطالعہ کیا ہے وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ پرانے اور اس زمانے کی کھاج میں بڑا فرق ہے۔ پرانے زمانے کی کھاج کو اس کا بڑا خیال آتا تھا کہ روز روز کسی کے گھر جانے اور آئے دن کی مہمان نوازی سے لوگ تنگ آ جاتے ہیں اور انسان ہم نشینوں کی نظروں میں گر جاتا ہے۔ اس اصول کے ماتحت جب وہ رخصت ہوتی تو جسم کو خیرباد کہہ کر چھوڑتی۔ مگر عصرِ حاضرہ کی کھاج جدت پسند ہونے کے ساتھ نہایت بے تکلف واقع ہوئی ہے۔ موجودہ زمانے کی کھاج نے اپنی پرانی ریت اور رسم بدل ڈالی ہے۔ اب صرف ایک دفعہ آکر اس کی تسکین نہیں ہوتی، اور جب ایک بار نازل ہو جاتی ہے تو اول تو جانے کا نام نہیں لیتی اور اگر بھول کر چلی جاتی ہے تو کئی کئی بار پھیرا لگاتی ہے۔ جسم کو چندن اور سرد کی بنانے کی بجائے مستقل طور پر روگی بنا دیتی ہے اور بعض کو مجسم کھاج۔

اگر کوئی پوچھے کہ آسمان میں کتنے تارے ہیں یا ہمارے سر میں کتنے بال ہیں تو جواب دینا اتنا دشوار نہیں جتنا یہ بتانا کہ کھاج کی کتنی دوائیں ہیں۔ اگر ہر مریض کو صرف ایک، دو کے حساب سے بھی یاد ہوتی تو سوال زیادہ بے ڈھب نہ ہوتا کیونکہ "جتنے منہ اتنی باتیں جتنے آدمی اتنی دوائیں" والا مضمون ہو جاتا اور معاملہ صاف تھا۔ لیکن یہاں تو یہ دقت ہے کہ ان دواؤں کی تعداد بتانا بھی مشکل ہے جو اکیلے ایک آدمی کو یاد ہوتی ہیں۔ کہیں بھولے سے تذکرہ کر بیٹھئے کہ آپ کھاج میں مبتلا ہیں پھر دواؤں کا ایسا پل بندھے گا کہ توڑا نہ ٹوٹے گا۔ ہر مریض اپنے اپنے تجربات بغیر پوچھے بیان کرنا شروع کر دے گا، اور ان تجربات اور تحقیقات کو اس قدر زور دے کر اور جوش و خروش کے ساتھ پیش کرے گا کہ جان چھڑانی دوبھر ہو جائے گی اور آپ کھاج کی تکلیف بھول کر یہ کہہ اٹھیں گے کہ کاش ہم کھاج میں مبتلا نہ ہوتے، یعنی اتنی تکلیف وہ خود کھاج نہ دیتی، جتنی وبالِ جان دواؤں کی تعداد بن جائے گی۔

کھاج کا ہر مریض علیحدہ دوا سے اچھا ہوتا ہے۔ یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ دو مریض ایک ہی دوا سے صحتیاب ہوئے ہوں۔ کھاج کا مریض جب شفا پاتا ہے تو وہ کم از کم بیس دوائیں استعمال کر چکا ہوتا ہے تب آخر میں کوئی ایک دوا کارگر ثابت ہوتی ہے۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ وہ دوا سے اچھا ہی نہیں ہوتا۔ وہ غسل کرتے کرتے اتنا عادی ہو جاتا ہے کہ اسے بھول کر غسلِ صحت بھی کر ڈالتا ہے یا دوسرے الفاظ میں کھاج اس سے بددل ہو کر خود بخود اس کا پیچھا چھوڑ دیتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے انگریزی سرکار نے ہندوستان کا چھوڑا۔

دنیا میں بے شمار بیماریاں ہیں۔ ان میں بعض معمولی بیماریاں ہیں۔ بعض پھیلنے والی اور مہلک۔ نزلہ زکام اور دمہ کسی معمولی بیماریوں کی فہرست میں آتی ہیں، ہیضہ طاعون، دق، متعدی اور مہلک بیماریاں ہیں۔ کھاج پھیلنے والی بیماری ہے مہلک نہیں۔ کھاج کا مریض کبھی مرتا نہیں، لیکن بیماری کی حالت میں ادھ مرا ضرور رہتا ہے۔ پرانے زمانے کی کھاج صرف جاڑوں میں ہوا کرتی تھی اور گرمی آتے ہی خود بخود اچھی ہو جاتی تھی۔ اب ہر موسم میں ہوتی ہے۔ ہیضہ اور طاعون موسمی بیماریاں ہیں۔ کھاج بارہ ماسی ہے۔

دق کی طرح کھاج کے بھی تین درجے ہوتے ہیں۔ پہلے درجے میں انسان ہاتھ کی گھائیوں اور دوسرے جوڑوں میں کھجانا شروع کرتا ہے۔ اس منزل میں مریض کے نفسیات یہ ہوتے ہیں کہ وہ اپنے مرض کو چھپاتا ہے، اگر کوئی پوچھ بیٹھے تو فی البدیہہ مدعی جست کر دے گا "جی نہیں"۔ اس منزل میں کھجانے میں بہت مزا آتا ہے، جی چاہتا ہے بس کھجائے جائے اور جب ہاتھ تھک جائیں تو دوسروں سے کھجوائیے۔ دوسرے درجے میں متاثر مقامات پر ننھے ننھے دانے پڑنے لگتے ہیں، ان میں پانی پڑ جاتا ہے۔ کھجلی میں بدستور مزا آتا ہے، بلکہ مزے کے ساتھ کھجلی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ کھجانے کے لئے ہر قسم کے آلات استعمال کرنا پڑتے ہیں۔ اور کھجانے کی خاطر نہایت ضروری کام کو ملتوی کر دینا پڑتا ہے۔ کھجانے کے لئے ناخنوں کو بڑھا رکھنے کی ضرورت پڑتی ہے لیکن افسوس ناخن گھستے گھستے آدھے رہ جاتے ہیں جسم کی کھال چھل جاتی ہے اور ننھے ننھے دانوں میں پیپ پڑنی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ گویا تیسرے درجے کی ابتدا ہوتی ہے۔ دوسرے درجے میں بھی مریض اپنا مرض چھپانے کی ناکام کوشش میں مصروف رہتا ہے اور خارش کے دانوں کو مچھر کا کاٹا بتاتا رہتا ہے، لیکن مرض اب چھپائے نہیں چھپتا اور بے چارے کو اقبالِ جرم کرنے سر جھکا کرنا پڑتا ہے۔ تیسرے درجے میں کھجلی اور مزے میں کمی، اور تکلیف میں زیادتی شروع ہو جاتی ہے۔

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

کشکول محمد علی شاہ فقیر

نئی روشنی کے پڑھنے جاننے اور لکھنے والوں کو بھائی بحرت کی خوشیاں نصیب ہوں، آمین اس محفل میں وہاں میں مخصوص گیت گائے جاتے ہیں۔ یہ کیوں؟ یہ اس لئے کہ

لالہ ساغر گیر و نرگس مست و بر ما نام فسق
داوری دارم بسے یارب کرا داور کنم

وقت کا تقاضا ہی یہ ہے۔ ارا را را کبیر

"ارے چپ، ارے چپ خبردار جو منہ سے کوئی بے ہودہ بات نکالی۔ مردود! اب تو یہاں بیٹھ کر شریف مرد آدمیوں میں کبیر گائے گا"

جی۔ کیا حرج ہے۔ ارا را را"

پھر بہی اٹھاتا ہوں جی۔

"دیکھئے، سن لیجئے، غصہ نہ کیجئے ہاتھ جوڑ کے یہ عرض کروں۔ مورخ الفنسٹن نے ہندوستان کی ذہنیت کے سلسلے میں" اس معصوم صاف دلی کا ذکر کیا ہے جس کے رو سے جو چیزیں بلا اعتراض ہو سکتی ہیں وہ بلا اعتراض بیان بھی کی جا سکتی ہیں۔ یہ سمجھتے ہی اس شاندار قدیم زمانے کا ذکر کرتے تھے جو گاؤں پنچایتوں کی وجہ سے واپس آ کر گذشتہ رونق بڑھا دے گا۔ یعنی وہ ہی معصومیت اور صاف دلی پھر جگمگا اٹھے گی"

"تو اس کے معنی یہ تم نے کہاں سے نکالے کہ تم کبیر گانے لگو۔ یو بارسٹے؟ لیسی ڈرا ماشٹ پہلے ہی فرما گیا ہے کہ وہ حماقت انگیز چیزیں جو نثر میں نہیں بیان کی جا سکتیں، نظم میں یا گا کر سنائی جاتی ہیں"

"جی ہاں، تو میں بھی تو لحن سے کلام موزوں کر رہا ہوں۔ ارا را را جیٹ پیٹ دھم، اچھا مولوی صاحب معاف کیجئے ایسا نہیں تو گاؤں گا"

(برٹرنڈ رسل کی ایک تقریر کا خلاصہ جو وہ یورپی لیسنرز سروس میں بولے تھے۔ اقتباس از ورلڈ ڈائجسٹ جون سنہ ۴۸ء)۔

الفاظ کے دو کام ہیں واقعات بیان کرنا اور جوش دلانا۔ دوسرا کام زیادہ قدیم ہے، جیسا کہ بچہ دینے کی فصل میں جانوروں میں ظاہر ہوتا ہے۔ تہذیب کی کوشش یہ کہ الفاظ معنی زیادہ بیان کریں اور جوش کم دلائیں۔ مگر پالیٹکس میں اس کے بر خلاف ہوتا ہے۔ گو الفاظ کے معنی لغت میں متعین ہیں مگر پالیٹکس میں آ کر بدل جاتے ہیں۔ اسی لفظ کے معنی مختلف خیال کے لوگوں کے نزدیک مختلف ہوتے ہیں۔ مگر جوش دلانے میں ایک ہی طرح کام آتے ہیں۔ آزادی کے معنی ہیں غیر کی حکومت کا فقدان" پھر اس کے معنی ہو گئے "بادشاہ کے اختیارات میں کمی" جب انسانیت کے حقوق کا مسئلہ نکلا تب اسی لفظ "آزادی" کے معنی ہو گئے "کن کن باتوں میں گورنمنٹ کی حکومت سے آدمی آزاد ہے" پھر ہیگل کے وقت میں آ کر اسی لفظ کے معنی ہو گئے کہ "آزاد آدمی کن کن باتوں میں اپنی مقرر کردہ پولیس کا حکم ماننے گا"۔ آج کل لفظ "ڈیماکریسی" بھی اسی طرح کے بیرن بدل رہا ہے۔ پہلے اس کے معنی تھے "جمہور کی حکومت" اور اس کے ساتھ فرد کی آزادی کا بھی کچھ خیال شامل تھا۔ پھر اس کے معنی ہو گئے غریبوں کی حکومت" کیونکہ غریب ہی ہر جگہ زیادہ تھے۔ پھر اس کے معنی نے نیا چولا بدلا، اور اس کے معنی ہو گئے" غریبوں کے نمائندوں کی رائے" فی الحال اس لفظ کے معنی مشرقی یورپ اور ایشیا کے بعض حصوں میں قرار پائے ہیں کہ" ان لوگوں کی جبریہ حکومت جو کبھی غریبوں کے نمائندے تھے۔ اور اب ان کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ دولت مندوں کو کھا جاؤ۔ سوا ان دولت مندوں کے جو ڈیماکریسی کے تازہ ترین معنی کو تسلیم کرتے ہیں" لفظوں کے معنی بدلتے جائیں۔ مگر الفاظ کا اثر وہی ہونا چاہیئے جو اصلی معنی کا ہوا تھا۔ بدلے ہوئے معنوں سے پولیٹکل جیب جانے پن کو اچھی خاصی مدد ملتی ہے۔ الفاظ کے نت نئے معنی کے ذریعے سے ان لوگوں کو چاند میں ہوا کے ذریعے سے آدمی بھیجا ہو تو یہ رضا کار یہ کہہ کر پکاریں گے کہ "وطن، وطن مالوف، وطن مالوفہ کو کون چلتا ہے"! (یعنی سلوگن وہی رہے گا، مگر مفہوم بدلتے رہیں گے اور کام چلتا رہے گا۔) سائنس اور سائنٹیفک فلاسفی کی تعلیم میں صحیح معنی پر بڑا زور دیا جاتا ہے۔ لڑکوں کو پڑھانے میں بھی اس کا پورا خیال رکھا جاتا ہے کہ نہ لفظوں کے معنی حسب ضرورت بدلے جا سکیں۔ نہ ان کا اثر اٹھا لیا جا سکے اور اس طرح تعلیم صحیح صورت میں پیش نظر ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ سائنٹیفک فلاسفی کی تعلیم اس احتیاط کو اچھی طرح سمجھے ہوئے ہے اور اسی غرض کو پیش نظر رکھ کر اس کو کامیابی سے برت بھی لیتی ہے (مگر پولیٹکل میدان میں وہی جذباتی معنی پیش پیش رہتے ہیں۔)

لڑائی شروع ہونے کے پہلے ایک سائنٹیفک فلاسفی کا جلسہ پیرس میں ہوا تھا، جہاں تمام ممالک کے بڑے پڑھے لوگ جمع ہوئے تھے، ان کی گورنمنٹیں ایک دوسرے پر اعتراض اور سخت گیری جیسا کہ دنیا کا قاعدہ ہے کرتی ہی رہتی تھیں۔ مگر یہ لوگ نہ صرف علمی سی معاملات پر صحیح رائے قائم کر لیتے تھے بلکہ ملکی جھگڑوں، آپس کی اکھاڑ پچھاڑ، رد و قدح کے نظریوں پر بھی دو ٹوک رائے قائم کر لیتے تھے اگر یہی لوگ عام ممالک کے کابینیوں میں وزارتیں پا جاتے تو شاید سب معاملات سلجھ جاتے مگر پولیٹکل چالیں اور ایمانداری الگ الگ چیزیں ہیں۔ بدقسمتی سے مدرسوں میں ایسی تعلیم نہیں دی جاتی۔ وہاں تو اس طرح کی تعلیم دی جاتی ہے کہ سیاسی جوش بڑھے لغت اور ایمانداری چاہے بھاڑ میں جائے مثال کے طور پر سن لیجئے۔ آیا آئرلینڈ کو یہ حق ہے کہ وہ برطانیہ سے علیحدہ ہو جائے؟ امریکہ کا ہر ریڈیکل کہے گا "ہاں" آیا ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہو جائے۔ وہیں نو ریڈیکل کہیں گے "نہیں"۔ میں یہ نہیں کہتا کہ صرف نظریہ ہی معاملات کو سدھار سکتا ہے، نہ صرف جوش ہی سدھار دے گا۔ لیکن اس نظریے کی تطبیق ایمانداری سے واقعات پر ضرور صحیح نتیجے پر پہنچا دے گی۔ اگر عام دنیا کے اسکول ایک بین الاقوامی ادارے کے تحت میں کر دئے جائیں۔ تو یہ بات حاصل ہو سکتی ہے۔

کھاج

(بہ سلسلہ صفحہ ۹)

کوئی بیٹھنے سے معذور ہو جاتا ہے کوئی اچھا خاصا ہوتے ہوئے لنگڑا ہونے کی مشق کرنے لگتا ہے، کسی کا ہاتھ مٹکا کا بھٹا ابن جاتا ہے۔ پھنسیاں اُبل پڑتی ہیں اور تمام جسم چیچک والے بچے کی طرح کھاج زدہ ہو جاتا ہے راتوں کی نیند اُڑ جاتی ہے، کم و بیش وہی تکلیف سہنی پڑتی ہے جو دق کے مریض کو۔ البتہ یہ اطمینان رہتا ہے کہ تکلیف سے مر رہے ہیں۔ سچ مچ نہیں۔

طب کے کئی مدرسے ہیں۔ ان میں دو خاص طور پر مشہور ہیں۔ ایک وہ جو علاج بالضد کے حامی ہیں اور وہ ایلوپیتھ کہلاتے ہیں مثلاً اگر آپ کا جسم سردی سے متاثر ہو گیا ہے تو وہ گرم دوا دیں گے تاکہ سردی کے اثرات دور ہو جائیں۔ دوسرے وہ ہیں جو علاج بالمثل کی سفارش کرتے ہیں اور وہ ہومیوپیتھ کہلاتے ہیں۔ مثلاً جمال گوٹا دست و قے لاتا ہے تو اگر کسی کو بدہضمی کی شکایت ہو تو وہ جمال گوٹا خورد بینی مقدار میں جسم کے اندر پہنچا کر آپ کی قوت حیات کو بیدار کر دیں گے۔ دیگر امراض کی طرح کھاج کا علاج دونوں مدرسوں کے ماہرین کرتے ہیں، اول الذکر کھاج کو نفاست پسند اور آخر الذکر غلیظ اور گندہ فرض کر کے ایسی دوائیں تجویز کرتے ہیں جن کو صفائی اور خوشبو سے عمر بھر کی دشمنی ہے علاج بالضد کرنے والے یونانی طبیب گندھک تجویز کرتے ہیں جس کی وجہ سے کھاج کے مریض کے پاس بیٹھنا گویا اپنی قوت شامہ کو سخت سے سخت امتحان میں مبتلا کرنے کے مترادف ہوتا ہے علاج بالمثل کرنے والے گائے کا پیشاب یا حقہ کا پانی اور گوبر وغیرہ تجویز کرتے ہیں کھاج کے مریض کے بستر اور کپڑے عجیب و غریب بو میں بسے رہتے ہیں، کھاج کی بہترین بو باس کو خوشبو کا نام کسی عنوان نہیں دیا جا سکتا، اور باوجود کوشش کے بدبو کے خانے میں

ہفتہ وار

نئی روشنی

دہلی

ادارۂ تحریر :-
ڈاکٹر سید عابد حسین ۔ صالحہ عابد حسین
عبداللطیف اعظمی

سکنا پڑتا ہے ۔ مریض خارش کا جسم ہر وقت بدعنی و عطر گندگی میں بسا رہتا ہے ۔ لہذا ہمارا آپکا اور ہر اس شخص کا جو کھاج میں مبتلا ہو چکا ہے یہ فرض ہے کہ اس محترم ایسے شخص کو جو کھاج میں مبتلا ہو ، دور سے سلام کریں ۔

بعض مریض جو کھاج کا علاج کرتے کرتے خود نیم حکیم کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں جو تجھ کی کیچڑ کو سب سے زیادہ مفید بتلاتے ہیں ۔ لیکن واہ ری کھاج کہ اس تمام گندگی کے باوجود گندہ پیشہ کرنے والوں کے قریب نہیں پھٹکتی ۔ آج تک یہ سننے میں نہیں آیا کہ کوئی بھنگی کھاج میں مبتلا ہوا ہو یا کسی چمار کو کھاج لپٹی ہو یا کسی کاشتکار کو کھاج نے آگھیرا ہو ۔ کھاج جب حملہ کرتی ہے تو سوتی توند والے بادشاہ ہو کار پر یا آرام طلب سکے اور عیش پسند زمیندار پر ۔ مزدور سے اسے خاص ہمدردی ہے ۔ کاش کہ یہ بد ذات بھیا کھاج ہی سے سبق سیکھ لیتی تو آج نہ جانے کتنی اقتصادی گتھیاں بیٹھے بیٹھے سلجھ جاتیں اور یہ آئے دن کے سیاسی ، مذہبی ، سماجی اور معاشرتی جھگڑے جن کی بنیاد اقتصادی اونچ نیچ پر قائم ہے بہت جلد ختم ہو جاتے ۔

دفتر "نئی روشنی" جامعہ نگر دہلی

طابع و ناشر :- عبداللطیف اعظمی بی اے جامعہ — مطبوعہ :- [illegible]

نئی روشنی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۲ | نمبر ۱۳ | یکم اپریل ۱۹۴۹ء | ایڈیٹر: ڈاکٹر سید عابد حسین

اخبار نویسی اور اس کے فرائض

خواجہ الطاف حسین حالی

ایک شخص نے گدھوں کے سوداگر سے جاکر کہا کہ مجھ کو ایک ایسا گدھا مطلوب ہے جو نہ بہت چھوٹے قد کا ہو نہ بہت بڑے قد کا۔ جب رستہ صاف ہو تو چلتا کودتا چلے اور جب رستے میں بھیڑ ہو تو آہستہ قدم اٹھائے نہ دیوار و در سے اڑ کر چلے نہ گنجان درختوں میں گھس جائے اگر چارہ کم کر دیا جائے تو صبر کرے اور پیٹ بھر دیا جائے تو شکر کرے۔ جب اس پر سوار ہوں تو چالاک بن جائے اور جب نکان پر باندھ دیں تو کان نہ ہلائے۔" سوداگر نے کہا" چندے روز صبر کر اگر خدا تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے قاضی شہر کو گدھا بنا دیا تو تیرا سوال پورا کر سکوں گا۔"

اگر آج کل کوئی کسی سے ایسا سوال کرے تو اس کو قاضی کی جگہ اخبار نویس کا نام لینا چاہئے۔ کیونکہ قاضی میں صرف دو صفتیں ہونی ضرور ہیں۔ ایک اس قانون کی واقفیت جس سے وہ فیصلے کرتا ہے، دوسرے انصاف، بخلاف اخبار نویس کے کہ اس میں اپنے فرائض ادا کرنے کے لئے بے شمار لیاقتوں کی ضرورت ہے۔ ہمارے نزدیک کسی کی نسبت یہ کہنا کہ وہ اخبار نویسی کی پوری لیاقت رکھتا ہے گویا اس بات کا تسلیم کر لینا ہے کہ اس کی ذات میں ہر قسم کی لیاقت اور فضیلت موجود ہے۔

اخبار نویس قطع نظر اس کے کہ قوم کا ناصح، ملک کا وکیل اور گورنمنٹ کا مشیر ہوتا ہے ایک قسم کا تاجر بھی ہے۔ جس کو کم از کم مصارف اخبار اور اپنے حوائج ضروریہ کے لئے محنت کا معاوضہ ملک سے وصول کرنا پڑتا ہے۔ پس جس طرح آزادی، انصاف اور دیانت اس کی ذات میں ہونی ضرور ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اس کے انداز بیان اور تحریر میں ایک قوت مقناطیسی کا ہونا بھی ضرور ہے جس سے وہ پبلک کے دلوں پر اثر کر سکے۔ مگر جہاں پبلک کے عام مذاق صحیح نہ ہوں۔ جہاں ظرافت اور مسخرگی اور نادر واقعات اور حقائق سے زیادہ مرغوب ہوں، جہاں معزز اور شریف لوگوں پر ہنسنا داخل حسن بیان سمجھا جائے۔ جہاں گورنمنٹ پر بے جا اور اندھا دھند نکتہ چینی کو آزادی رکھا جائے وہاں باوجود آزادی و انصاف و دیانت کے پبلک کو خوش کرنا قریب ناممکن کے معلوم ہوتا ہے۔

ہندوستان کے دیسی اخباروں کی عام حالت کیا گورنمنٹ کے نزدیک اور کیا شائستہ آدمیوں کے نزدیک اب تک بہت بری سمجھی جاتی ہے۔ لیکن جس طرح کسی شہر میں زیادہ تر بوسیدہ اور شکستہ اور کھنڈر مکانوں کا ہونا اس بستی کے افلاس کو ظاہر کرتا ہے یا کسی ملک کی شاعری میں زیادہ تر ہزل، جھوٹ اور بے تہذیبی کا ہونا اس ملک کے مذاق فاسد پر گواہی دیتا ہے۔ اسی طرح اخباروں کی بری حالت اخبار نویسوں کی بے سلیقگی کی نسبت زیادہ تر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ پبلک کا مذاق صحیح نہیں ہے باایں ہمہ اخبار نویسوں کو معذور نہیں سمجھا جا سکتا۔ کیونکہ ان کا پہلا فرض یہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنی جادو بیانی سے پبلک کے مذاق کو اگر وہ فاسد ہے تو صحیح اور اگر صحیح ہے تو اعلیٰ درجے کا صحیح بنا دیں۔ اخبار کے پست حالت میں رہنے کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں یا یہ کہ ایڈیٹر میں چلانے کی لیاقت نہیں ہے بلکہ اس نے صرف یہ دیکھ کر کہ بہت سے لوگ اخبار کے ذریعے سے آسودگی کے ساتھ بسر کرتے ہیں اخبار کو محض ایک حیلۂ معاش سمجھ کر جاری کر لیا ہے یا یہ کہ ایڈیٹر میں کافی لیاقت موجود ہے مگر چونکہ پبلک کا مذاق صحیح نہیں ہے اس لئے وہ اپنی اصلی لیاقت کو کام میں نہیں لاتا بلکہ زمانے کے تیور دیکھتا رہتا ہے کہ لوگ کس بات کو پسند کرتے ہیں اور کس بات کو ناپسند اور جو طریقہ ان کے مذاق کے موافق ہوتا ہے اس کو اختیار کر لیتا ہے۔ پہلی صورت میں سوا اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح ایک بدآواز مؤذن کو کچھ دے دلا کے اذان کہنے سے روکا گیا تھا۔ اسی طرح ایسے ایڈیٹر کے لئے لوگ چندہ کر کے کچھ تنخواہ اس شرط پر مقرر کر دیں کہ وہ مہربانی کر کے کبھی اخبار نہ نکالیں۔ انھوں نے اپنی طاقت کے اندازہ کرنے میں دھوکا کھایا ہے اور اپنے لئے پیشہ انتخاب کرنے میں ویسی ہی غلطی کی ہے جیسے کوے نے ہنس کی چال چلنے میں کی تھی۔ لیکن دوسری صورت میں ایڈیٹر سخت الزام کے قابل ہیں، وہ باوجودیکہ قوم کے ناصح ہیں اس کو گمراہ کرتے ہیں۔ وہ طبیب ہو کر لوگوں کو مہلک دوا دیتے ہیں ان کی مثال اس طبیب کی سی ہے جو بیماروں کو دوا اور پرہیز ان کی مرضی کے موافق بتاتا ہے، اور ان کو خوش رکھنا چاہتا ہے نہ کہ تندرست کرنا۔ ان کو یاد رکھنا چاہئے کہ ایک تماشاگر جو اچھا تماشا دکھاتا ہے، ایک خدمتگار جو ہوشیاری اور سلیقہ سے کام کرتا ہے، ایک طوائف جو اچھی طرح ناچتی گاتی ہے۔ ایک مسخرہ جو اپنے مسخرہ پن سے امیروں کو خوش کرتا ہے، روپیہ کمانے میں وہ علماء اور حکماء اور اہل کمال سے اچھے رہتے ہیں۔ پس ایڈیٹر جو ملک کا وکیل اور گورنمنٹ کا مشیر ہونے کا دعوے کرتا ہے اگر وہ بھی صرف روپیہ کمانے کے لئے اپنے اخبار کو پبلک کے مذاق فاسد کا تابع رکھنا چاہتا ہے تو وہ مذکورہ بالا اشخاص سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

(مضامین حالی)

فہرست مضامین

قیمت فی پرچہ ۴

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
یکم اپریل سنہ ۴۹ء

ہندوستانی مسلمان

(۳)

اوپر جو بحث ہو چکی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا مقصد غیر مذہبی جمہوری اشتراکی ریاست کے تصور کو جو ہند کے مجوزہ دستور میں پیش کیا گیا ہے عملی جامہ پہنانا ہے۔ اس لئے کہ صرف اسی ریاست کے اندر انصاف، آزادی اور رواداری کی فضا میسر آ سکتی ہے جس میں ان کی روح اور جسم دونوں پنپ سکیں، یعنی ایک طرف وہ اپنی مذہبی اور اخلاقی خصوصیات کو برقرار رکھ سکیں اور دوسری طرف ملک کی عام سیاسی، معاشی اور تمدنی زندگی میں برابر کا حصہ لے سکیں۔ اس مقصد کے لئے مذہب کی بنیاد پر الگ سیاسی پارٹی بنانا ہر صورت میں ایک خیال محال ہے۔ اور ایسی صورت میں جب کہ انتخاب مخلوط ہو ع

این خیال است و محال است و جنوں

کا مصداق ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو کسی غیر مذہبی سیاسی پارٹی میں شریک ہونا ہی جو اشتراکی جمہوری ریاست کی حامی ہو۔

اس کا فیصلہ کرنے سے پہلے کہ مسلمان کس پارٹی میں شریک ہوں ایک بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔ سیاسی پارٹیاں ایسے ادارے ہیں جن کے ارکین بلکہ مقاصد اور طریق کار بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے کسی فرد یا جماعت کی کسی سیاسی پارٹی میں شرکت دائمی اور غیر مشروط نہیں بلکہ موقت اور مشروط ہونی چاہیئے۔ مسلمانوں کو سیاسی پارٹیوں کی موجودہ تقویم پر ہر پہلو سے غور کر کے شرکت کا فیصلہ کرنا ہے ہمیشہ کے لئے نہیں بلکہ اس وقت تک کے لئے جب تک ان کی یہ تقویم باقی رہے۔ اصل مقصد جمہوری اشتراکی ریاست ہے۔ پارٹی محض ایک ذریعہ ہے اس کے حاصل کرنے کا۔ ہندوستانی ریاست کے ساتھ جو سیاسی اور معاشی جمہوریت کے نصب العین پر مبنی ہے ابدی وفاداری کا عہد کیا جا سکتا ہے کسی خاص پارٹی کے ابدی وابستگی کا عہد نہیں کیا جا سکتا۔

ہندوستان میں غیر مذہبی پارٹیاں جن میں ہر فرقے کے لوگ شریک ہو سکتے ہیں۔ اس وقت تین ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی، سوشلسٹ پارٹی، کانگریس پارٹی ان میں سے کمیونسٹ پارٹی میں مسلمانوں کے بہ حیثیت مسلمان شرکت کا کوئی سوال ہی نہیں ہے اس لئے کہ کمیونسٹ صرف ایک معاشی نظام کی حمایت کا نہیں بلکہ حیات و کائنات کے ایک خاص فلسفے یعنی تاریخی مادیت کے ماننے کا مطالبہ کرتے ہیں جو اسلام کے بنیادی عقائد کے سراسر منافی ہے۔ اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے اگر مسلمان کسی پارٹی کی طرف رجوع کر سکتے ہیں تو وہ سوشلسٹ پارٹی یا کانگریس ہے۔

سوشلسٹ بھی کمیونسٹوں کی طرح اشتراکیت کے حامی ہیں مگر ان کے اشتراکیت کے تصور کو جمہوریت کے تصور نے کسی قدر معتدل کر دیا ہے وہ ذاتی ملکیت کے مخالف نہیں صرف سرمایہ داری نظام کے مخالف ہیں۔ انھوں نے ہندوستان میں قومی حکومت قائم ہونے کے بعد تشدد کے طریق کار کو چھوڑ کر آئینی جدوجہد کا طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ ان کی قیادت مخلص اور عالی مرتبہ لیڈروں کے ہاتھ میں ہے جو مدت تک کانگریس کے دست و بازو رہے اور جنگ آزادی میں بے جگری سے گاندھی جی کے جھنڈے کے نیچے لڑتے رہے جمہوری اشتراکی ریاست کی منزل تک پہنچنے کے لئے ان کی رہنمائی پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

لیکن لیڈروں سے قطع نظر کر کے جب پارٹی کے ارکان پر نظر ڈالیے تو کانگریس کی طرح یہاں بھی بے میل مجمع نظر آتا ہے۔ کچھ سچے سوشلسٹ ہیں، کچھ فرقہ پرست محض کانگریس کی ضد میں سوشلسٹ پارٹی میں شریک ہو گئے ہیں، کچھ کانگریسی حکومت سے رعائتیں نہ ملنے کی وجہ سے خفا ہو کر یا اس پر دباؤ ڈال کر رعائتیں لینے کے لئے ادھر آ گئے ہیں۔ کچھ خلقی مخالفت پسند ہیں جو ہمیشہ اکثریت کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ خاص مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے سوشلسٹ پارٹی میں یہ نقص ہے کہ وہ فرقہ وارانہ مسئلے کی طرف سے آنکھیں بند رکھتی ہے اسے یہ احساس نہیں ہے کہ فرقہ پرستی اب تک ہمارے ملک میں عام ہے اسے دور کرنے کے لئے زبردست اور مسلسل جدوجہد درکار ہے۔ جب تک سوشلسٹ پارٹی ہندو مسلمانوں کے تعلقات کے مسئلے کو سمجھ کر اسے بے تعصبی اور فراخ دلی سے حل کرنے کی کوشش نہیں کرے گی مسلمان اس کی طرف پوری طرح نہیں کھنچیں گے آدھی دور بڑھ کر رہ جائیں گے۔

اب کانگریس رہ جاتی ہے جس میں اس وقت مختلف اور متضاد عناصر موجود ہیں جمہوری اشتراکیت کے علمبردار بھی ہیں اور لبرل جمہوریت کے حامی بھی جن کا سرمایہ داری نظام سے چولی دامن کا ساتھ ہے بے تعصب اور فراخ دل بھی جنھوں نے ساری عمر مسلمانوں کو اپنا سمجھ کر ان سے محبت اور دوستی کا سلوک کیا ہے متعصب اور تنگ دل بھی جو مسلمانوں کو ایک بدیسی تہذیب کے حامل جان کر "خالص دیسی تہذیب یعنی ہندو تہذیب میں جذب کرنا یا دبا کر اور گھونٹ کر رکھنا چاہتے ہیں یہ دونوں عناصر کانگریس کے اندر کشمکش میں مصروف ہیں مگر حالات کو دیکھتے ہوئے یہ امید ہے کہ صالح عنصر فاسد عنصر پر غالب آئے گا۔ اسی امید پر گاندھی جی کے خاص پیرو اب تک کانگریس کے ساتھ ہیں اسی امید پر جواہر لال اور آزاد

(باقی صفحہ ۱۰ پر)

بزم بے تکلف

"آپ نے کچھ اور بھی سنا؟ پہلے ولایت میں ہندوستان کے لئے بھرتی ہوا کرتی تھی اب ہندوستان میں ولایت کے لئے ہونے لگی"

"بس رہنے بھی دیجیے، آپ یوں ہی بے پر کی اڑایا کرتے ہیں، بھلا ہندوستان میں ولایت بھیجنے کے لئے کن کی بھرتی ہو گی، کسان، مزدور لیڈر، شاعر یہ چار قسم کی مخلوق ہمارے دیس کی زمین پر بستی ہے ان میں سے کون ایسا خوش نصیب ہے جس کی ولایت میں مانگ ہو"

"جی ایک اور مخلوق پیڑوں پر بستی ہے جسے بندر کہتے ہیں؟"
"تو کیا سچ مچ ہمارے ہاں سے بندر ولایت بھیجے جا رہے ہیں؟ اجی نہیں آپ مذاق کرتے ہیں"

"نہیں واللہ مذاق کی بات نہیں یہ بین الاقوامی معاملہ ہے، ابھی کچھ دن ہوئے برطانوی پارلیمنٹ میں اس پر بحث ہوئی تھی اور پرسوں ہماری پارلیمنٹ میں کامت صاحب اور فنانس منسٹر سے نوک جھوک رہی"

"آخر سیاست والوں کو اس مسئلے سے اتنی دلچسپی کیوں ہے۔ کیا بندروں کے ساتھ مداری بھی بلائے جا رہے ہیں؟"
"جی نہیں مداری اور ڈگڈگی کا کیا کام؟ وہاں ناچ ہندوستانی بندروں کا تھوڑا ہی ہوتا ہے، ان سے تو علمی تحقیقات میں مدد لی جاتی ہے"

"بہت معقول! کیا خوب محقق ڈھونڈھے ہیں! کیوں صاحب یہ بندر بتایا کیا نئی نکلی ہے جس کے ودوان ہندوستان سے بلانے پڑتے ہیں"

"آپ سمجھے نہیں بندروں سے مدد لینے کے معنی یہ ہیں کہ ان کو علمی تجربوں میں استعمال کیا جاتا ہے"

"میں خوب سمجھتا ہوں یہ علمی تحقیقات اور تجربہ تو ایک پردہ ہے۔ دراصل ان بندروں سے علم نظری کے نہیں بلکہ حکمت عملی کے گر سیکھے جاتے ہوں گے۔ ان میں بڑا بڑا استاد ہوتا ہے جس کی رگ رگ میں ڈپلومیسی کے سارے داؤ پیچ رچے ہوئے ہوتے ہیں۔ کبھی پھکی کبھی پھکی، کبھی آنکھیں نکالنا، کبھی کھسیں کاڑھ دینا، کبھی کھکھیا کر دوڑنا، کبھی جھجک کر پیچھے ہٹنا، کبھی اچانک دھم سے آ کودنا، کبھی یکا یک اچک کر چمپت ہو جانا، کبھی اس پیڑ سے اس پیڑ پر جست لگانا کبھی اس ڈال سے اس ڈال پر ہو رہنا، غرض اس کی ایک ایک ادا اپنی جگہ اور اپنے اپنے موقع پر ادا شناسوں کے لئے حکمت عملی کا ایک دفتر ہے۔ فرنگی کی فطرت دیکھیے کہ وہ ہزاروں میل سے لاکھوں روپے خرچ کر کے اس قدر کے استاد کو بلاتا اور اس کے آگے زانوئے شاگردی تہ کرتا ہے اور ہماری شامت دیکھئے کہ ہم نے اس کے سائے کے تلے رہ کر بھی کچھ نہ سیکھا مجھے شری کامت سے پورا اتفاق ہے کہ یہ مسئلہ ہمارے لئے قومی اہمیت رکھتا ہے۔ ہمیں اپنی آزاد با اقتدار حکومت کے سارے سیاسی کام لے کر بندروں کی ... کرنے کا بندوبست کرنا چاہئے۔"

پچھلا ہفتہ: ۱۔ باہر کی دنیا

اٹلانٹک اتحاد کا اثر

اٹلانٹک اتحاد کی طرف سے اطمینان ہو جانے کا جمہوری ملکوں پر بہت اچھا اثر پڑا ہے۔ متحدہ ریاستوں میں اس سے متعلق اندیشے ظاہر کئے گئے کہ اس سے متحدہ ریاستوں کی ذمہ داری نہ صرف بہت بڑھ جائے گی بلکہ مبہم بھی ہوگی، دوسرے ملکوں کو ڈر تھا کہ اتحاد صرف فرقہ بندی کا اعلان ہوگا اور اس سے ذریعے جمہوری ریاستوں میں اپنی حفاظت پیدا نہ ہو سکے گی جب تک ان کی معاشی تنظیم باہمی امداد کی شکل اختیار کرے اور ان کی فوجی قوت اسکانی خطروں کے لحاظ سے منظم کی جائے۔ یہ سمجھنا تو اب بھی صحیح نہ ہوگا کہ اٹلانٹک اتحاد کے مقصد پورے ہو جائیں گے۔ لیکن اندیشے اور بدگمانیوں کا دور ہونا بھی بڑی بات ہے۔ جمہوری ملکوں میں ایک خود اعتمادی سی پیدا ہو رہی ہے اور اگرچہ اٹلانٹک اتحاد کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ متحدہ ریاستیں جمہوری ملکوں کی سیاست پر اور زیادہ حاوی ہو جائیں گی لیکن لوگوں کو اب اس میں اتنا نقصان نظر نہیں آتا جتنا پہلے نظر آتا تھا۔

اٹلانٹک اتحاد ایک طرح کی فرقہ بندی ہے اور فرقہ بندی کا ایک پہلو انتخابی ہوتا ہے تو دوسرا مخالفت ہوتی ہے۔ اس لئے روسیوں کا یہ کہنا کہ اٹلانٹک اتحاد جنگ جوئی کا مظاہرہ ہے بے بنیاد نہیں یورپ کے جمہوری ملکوں کو اس کی فکر نہیں تھی کہ اس الزام سے بچیں۔ انھیں ڈر اس کا تھا کہ روسی ان پر جنگ جوئی کا الزام لگا کر کہیں خود حملہ نہ کر دیں۔ اب یہ ڈر نہیں رہا ہے۔ اور شاید اس وجہ سے جمہوری ریاستوں کا رویہ بدل جائے۔ لندن میں تین مہینے تک جلوس نکالنے کی ممانعت کر دی گئی ہے تاکہ فاشسٹ اور کمیونسٹ وہاں شہر میں فساد نہ کر سکیں۔ اس ممانعت سے جمہوری زندگی کا ایک بنیادی حق تین مہینے کے لئے منسوخ ہو جاتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے ایسا کوئی حکم جاری ہوتا تو بہت سے لوگ اسے [illegible] سمجھ کر اس کی مخالفت کرتے [illegible]

تمام لیڈر اور اخبار جو فاشسٹ یا کمیونسٹ نہیں ہیں اس معاملے میں حکومت کی تائید کرتے ہیں۔ اس سے کہ یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ فاشسٹ اور کمیونسٹ عادتاً گڑبڑ اور شورش پسند ہیں جو ڈال کر اس کے اختیار [illegible] کرنا چاہتے ہیں، ان کا مقصد فساد کی حالت پیدا کرنا ہے [illegible] فاشسٹ اور کمیونسٹ جمہوری حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں اور جمہوریت کے ستون [illegible] ہونے پر تیار ہیں۔ اگر دست بردار [illegible] فاشسٹ اور کمیونسٹ پارٹیوں کو قابو میں رکھنے کے لئے ضروری ہے۔

امن کی کانفرنس

نیویارک میں [illegible] اور سائنس دانوں کی ایک کانفرنس ہونے والی ہے جس کا مقصد دنیا میں امن قائم رکھنا بتایا گیا ہے۔ کانفرنس کمیونسٹوں کی تحریک پر کی جا رہی ہے اور جو لوگ اس میں شریک ہوں گے وہ کم و بیش کمیونسٹ خیال کے ہوں گے۔ متحدہ ریاستوں کی وزارت خارجہ نے ان نمائندوں کو آنے کی اجازت دے دی ہے جو کمیونسٹ ملکوں سے آ رہے ہیں۔ جن ملکوں کی حکومت جمہوری ہے ان کے نمائندوں کو ویزا دینے سے انکار کیا گیا ہے۔ اس رویے کی مصلحت سمجھنا ذرا مشکل ہے۔ کمیونسٹ حکومتیں جسے چاہتی ہیں ملک میں آنے اور ٹھہرنے کی اجازت دیتی ہیں جسے چاہتی ہیں نہیں دیتی ہیں۔ متحدہ ریاستوں میں کمیونسٹ ملکوں کے نمائندوں کو آنے کی ممانعت کر دی جاتی تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ برطانیہ کے نمائندوں کو ویزا دیا اور پھر منسوخ کر دیا گیا۔ فرانس، اٹلی اور جنوبی امریکہ کے کمیونسٹوں کو ویزا نہیں دیا گیا۔ اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ کمیونسٹ ملکوں کے کمیونسٹ تو اس کے حق دار مانے گئے کہ متحدہ ریاستوں میں جا کر اپنی رائے ظاہر کریں، مگر جمہوری ملکوں کے کمیونسٹوں [illegible] کا کام صرف [illegible] نہ ہوگا اس لئے [illegible] نہ ہو سکیں تو [illegible] جمہوری ملکوں

کے کمیونسٹ پورے شہری بھی نہیں مانے جائیں گے، اس لئے کہ وہ روس کے معتقد ہیں اور ہر حال میں روسی سیاست کی حمایت کرنے کا ارادہ ظاہر کر چکے ہیں۔

جنوبی ایشیا اور بحر الکاہل کا اتحاد

ایک تجویز سننے میں آئی ہے کہ اٹلانٹک اتحاد کے نمونے پر دوسرے اتحاد بھی ہوں اور جیسے یورپ کو روس اور کمیونزم سے محفوظ کیا جا رہا ہے ویسے ہی ایشیا کو بھی محفوظ کیا جائے۔ فی الحال اس میں دو بڑی رکاوٹیں ہیں۔ ایک [illegible] کا ارادہ کہ جس طرح بھی ہو سکے [illegible] پر قبضہ کر لیا جائے۔ دوسری جنوبی افریقہ کی کوشش کہ ہندوستانیوں کو [illegible] تمام حقوق سے محروم رکھے اور [illegible] تو انھیں ملک سے نکال دے۔ [illegible] اور جنوبی افریقہ وہ رویہ [illegible] تو ایشیا والوں کو مغربی جمہوریت پر ذرا بھی اعتبار نہ رہے گا اور کمیونزم کا زور نہ ہو تب بھی مغربی سیاست کی ہر طرح سے مخالفت کی جائے گی۔ [illegible] اور جنوبی افریقہ کے معاملے طے ہو گئے تو یہ سوال ہوگا کہ متحدہ ریاستوں اور برطانیہ کی سرپرستی قبول کی جائے یا نہ کی جائے۔ یورپ اور امریکہ کی تنظیم کا نقشہ ایک سا ہے۔ ہندوستان اور جنوب مشرقی ایشیا کے ملک متحدہ ریاستوں کا اس طرح سہارا لینے سے [illegible] جیسے کہ یورپ کے جمہوری ملک لے رہے ہیں۔ یہاں متحدہ ریاستوں کی سرپرستی معاشی حکومت کی شکل اختیار کرے گی، اور یہ آزادی کی نئی فضا میں ناقابل برداشت معلوم ہوگی۔

م، م

جنگ کی آگ بجھ رہی ہے

پچھلے سال مغربی ملکوں میں تو صرف سیاسی اور اعصابی کشمکش ہو رہی تھی مگر ایشیا کے کئی حصوں میں لڑائی کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ اب یہاں بھی لڑائی رفتہ رفتہ ٹھنڈی پڑ رہی ہے اور اس کی جگہ سیاست اور حکمت عملی کا مقابلہ شروع ہو رہا ہے۔ فلسطین میں امریکہ کی سیاست فی الحال کامیاب ہو گئی ہے۔ عرب ریاستوں نے اسرائیل کی جداگانہ ریاست کو ایک ناگوار حقیقت سمجھ کر مان لیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک ایک کرکے صلح کے معاہدے کر رہی ہیں۔ انڈونیشیا کے معاملے میں انگلستان اور امریکہ، یو این او کے پردے میں ولندیزیوں کی رضا جوئی کے ساتھ ساتھ انڈونیشیوں کی تالیف قلوب کر رہے ہیں۔ ولندیز نے ہیگ میں گول میز کانفرنس کی جو تجویز پیش کی تھی اسے یو این او نے اس ترمیم کے ساتھ مان لیا ہے کہ کانفرنس اس کے مقرر کئے ہوئے کمیشن کی نگرانی میں ہوگی۔ لیکن ولندیز نے ابھی تک یو این او کی اس ہدایت پر عمل نہیں کیا کہ انڈونیشیا کی جمہوری حکومت کے ارکان کو رہا کر دے اور ان کا علاقہ ان کو واپس کر دے۔ ولندیز کے ارباب حل و عقد انڈونیشیا کے بارے میں آپس میں متحد نہیں ہیں اس لئے کوئی فیصلہ کن بات نہیں [illegible]، ٹال مٹول کر رہے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ یو این او ان سے اپنی شرطیں منوانے، اور انڈونیشیا کے ساتھ انصاف کرنے کے لئے کیا قدم اٹھاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی [illegible] ہالینڈ کی رضا جوئی پر مجبور کرتی ہیں لیکن آخر دنیا کو دکھانے کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے۔

چین میں نئی قومی حکومت کے اور کمیونسٹ حکومت کے درمیان صلح کی بات چیت شروع ہو رہی ہے۔ چیانگ کائی شک اور سن فو کے پیچھے ہٹ جانے کے بعد بظاہر کمیونسٹوں کو اطمینان ہو گیا ہے کہ ان کے جانشینوں کی طرف سے صلح کی پیشکش محض فریب نہیں بلکہ نیک نیتی پر مبنی ہے۔ یہ خیال اگر صحیح ہے کہ دونوں فریق دل سے صلح چاہتے ہیں تو مفاہمت کی کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔

ع ، ح

ہندوستانی مسلمان (دیکھئے سلسلہ صفحہ ۲)

پرانے لیڈر کانگریس کے اندر ہیں ہمارے خیال میں اس وقت مسلمانوں کو بہ حیثیت جماعت کانگریس ہی میں جانا چاہئے۔ اس لئے کہ ان کے جتنے سچے ہمدرد اور دوست ہیں قریب قریب سبھی کانگریس میں ہیں۔ اس صالح عنصر کو جو اشتراکی جمہوری ریاست کا اتحاد، رواداری اور انصاف کا حامی ہے مسلمانوں سے بڑی تقویت پہنچے گی اور اس کا فاسد عنصر پر غالب آنا یقینی ہو جائے گا۔

ہندوستان

پارلیمنٹ کی کارگزاری

پارلیمنٹ کی سب سے بڑی کے منظور ہو جانے کے بعد فنانس بل سلیکٹ کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ اس نے بعض معمولی ترمیموں کے بعد بل کے پاس ہونے کی سفارش کر دی ہے۔ ان میں سے ایک ترمیم میں عجیب ستم ظریفی کی گئی ہے۔ بہت سے ممبروں نے یہ اعتراض کیا تھا کہ معمولی ڈاک اور ائیر ڈاک دونوں کا محصول ہم مقرر کیا جائے نا انصافی ہے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ معمولی ڈاک کے خطوں کا محصول نہ بڑھایا جائے سلیکٹ کمیٹی نے انصاف کی یہ صورت نکالی ہے کہ معمولی خط کے لئے ڈیڑھ آنے کے اضافے کو بحال رکھا ہے مگر ہوائی ڈاک کے خط میں جو دو پیسے کی تخفیف کی گئی تھی اُسے منسوخ کر دیا ہے۔ شکایت کرنے والے سمجھتے ہوں گے کہ یہ تو اور الٹی آنتیں گلے پڑ گئیں۔

۲۳ مارچ کو پارلیمنٹ نے وزیر صنعت کا یہ رزولیوشن منظور کر لیا کہ کھانے پینے کی چیزوں، اونی اور سوتی کپڑے، کاغذ، پٹرول، لوہے اور فولاد، ابرک اور موٹروں کے پرزوں کا کنٹرول ایک سال تک اور قائم رکھا جائے۔ اسی طرح وزیر ریلوے کا یہ رزولیوشن بھی منظور ہو گیا کہ ریلوے کے لئے بجٹ کا پرانا طریقہ ایک سال اور جاری رہے۔ دوسری کارروائیوں میں قابل ذکر یہ ہے کہ شکر کی صنعت کو مزید ایک سال تک اور ۷ اور صنعتوں کو جن میں بائیسکل، سینے کی مشین، مٹی کے تیل کے لیمپ، مصنوعی ریشم کی صنعتیں اور بعض کیمیاوی صنعتیں شامل ہیں دو سے لے کر تین سال تک کے لئے تحفظ دینے کا فیصلہ کیا گیا۔

ہندو کوڈ بل کے موجودہ سیشن میں منظور ہونے کی اُمید نہیں نظر آتی۔ بعض قوم پرست اصلاح پسندوں کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ حکومت اس کے لئے پارلیمنٹ کا ایک خاص سیشن بلائے گی، لیکن ایسی صورت میں کہ مئی سے پارلیمنٹ آئین سازی کا کام شروع کرنے والی ہے یہ خیال ناقابل عمل معلوم ہوتا ہے۔ اس اثنا میں ہندوؤں کے رجعت پسند طبقے اس کی کوشش کر رہے ہیں کہ رائے عامہ کو بل کی اصلاحی تجویزوں کے خلاف ابھاریں۔

خدا کی قدرت ہے!

برطانیہ کی کنسرویٹو پارٹی کے ڈپٹی لیڈر مسٹر ایڈن جو چیمبرلین وزارت اور چرچل وزارت میں وزیر خارجہ رہ چکے ہیں۔ کامن ویلتھ کے بعض ملکوں کا دورہ کرتے ہوئے ہندوستان تشریف لائے تھے اور تین دن تک دہلی میں رہ کر پاکستان تشریف لے گئے۔ انڈین کونسل آف ورلڈ افیرس (ہندوستان کی امور خارجہ کی انجمن) کے اہتمام میں ۲۲ مارچ کو کانسٹی ٹیوشن کلب میں ان کی ایک تقریر ہوئی۔ بڑا دلچسپ منظر تھا کہ آزادی ہند کا ایک بڑا مخالف آزاد ہند کو دوستی کا پیام دے رہا تھا۔ مسٹر ایڈن کے اس دورے کے کئی مقصد سمجھے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ برطانیہ اور کامن ویلتھ کے دوسرے ملکوں میں باہمی ربط کے رشتے کو اور مضبوط کریں، دوسرے یہ کہ ان ملکوں میں قدامت پرست عناصر کو ابھاریں، تیسرے کنسرویٹو پارٹی کے آئندہ لیڈر کی حیثیت سے کامن ویلتھ کے مدبروں سے روشناس ہوں، اس لئے کہ عام خیال ہے کہ مسٹر چرچل کے بعد پارٹی کے لیڈر وہی ہوں گے بلکہ کوئی تعجب نہیں کہ مسٹر چرچل کی زندگی ہی میں ان کو یہ ڈھیل کر دیں۔ بہرحال اور ملکوں میں وہ جس مقصد سے بھی گئے ہوں ہندوستان آنے کی غرض جہاں تک ان کی تقریر سے اندازہ ہو سکا یہ تھی کہ ہندوستان کو کامن ویلتھ میں شریک رہنے پر آمادہ کریں۔ ان کی تقریر کے قابل قدر نکتے یہ ہیں:-

(۱) اقوام متحدہ کا ادارہ (یو این او) ابھی تک کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں کر سکا، لیکن اس کی طرف سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے، قوموں کی پنچایت کی حیثیت سے وہ قابل قدر چیز ہے۔

(۲) چونکہ یو، این، او کے پاس کوئی ایسی طاقت نہیں جس کے بل پر وہ دنیا میں امن قائم کر سکے، اس لئے دنیا کے مختلف حصوں میں قوموں کو باہمی حفاظت کی ضمانت کے لئے علاقہ وار اتحاد قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ ویسٹرن یونین اور اٹلانٹک یونین [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible] ابھی [illegible] [illegible] جنگ شروع [illegible] [illegible] نہیں [illegible]

(۳) انگلستان کے لوگوں کے دل میں ہندوستان کے ساتھ ہمدردی اور دوستی کا بہت گہرا جذبہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان باہر کے ملکوں سے اپنے تعلقات کا فیصلہ کرنے میں بالکل آزاد ہے، لیکن برطانیہ کے لوگوں کی دلی خواہش یہی ہے کہ ان کے اور ہندوستان کے درمیان گہرے تعلقات قائم رہیں۔

مسٹر ایڈن کی شیریں زبانی اور موقعہ شناسی کی داد دینا چاہیئے کہ تقریر کے بعد حاضرین کے طنز آمیز اور چبھتے ہوئے سوالات کا جواب انھوں نے ایسے انداز میں دیا کہ ذرا سی بھی تلخی اور ناگواری بھی نہیں پیدا ہونے پائی۔ رات کو کانسٹی ٹیوشن کلب کے ڈنر میں پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی تقریر میں ایک بار پھر اس بات کو صاف کر دیا کہ ہندوستان سب ملکوں سے عام طور پر اور برطانیہ سے خاص طور پر دوستانہ تعلقات رکھنا چاہتا ہے مگر اس سے زیادہ توقع اس سے نہیں کرنی چاہیئے۔ خدا جانے مسٹر ایڈن کو اس تقریر سے خوشی ہوئی یا مایوسی۔ یہ اس پر موقوف ہے کہ وہ کیا توقعات لے کر آئے تھے۔

کشمیر کا معاملہ صاف ہو گیا

کچھ عرصے سے اس قسم کی افواہیں سننے میں آ رہی تھیں کہ کشمیر میں رائے شماری نہیں ہو گی بلکہ ہندوستان اور پاکستان آپس کے سمجھوتے سے ریاست کو تقسیم کر لیں گے۔ تقسیم کی نوعیت کے بارے میں مختلف باتیں کہی جاتی تھیں لیکن عام خیال یہ تھا کہ جو حصہ اس وقت جس فریق کے قبضے میں ہے اسی طرح رہے گا۔ معلوم نہیں ان خبروں کی کوئی اصلیت تھی یا نہیں۔ لیکن اگر اس قسم کی کوئی گفت و شنید فریقین میں ہو بھی رہی تھی تو غالباً ناکام رہی ہو گی اس لئے کہ یو، این، او کے کشمیر کمیشن کی تازہ رپورٹ سے یہ بات صاف ہو گئی ہے کہ رائے شماری ضرور ہو گی اور اس کے نتیجے کے طور پر پوری ریاست ہندوستان میں یا پاکستان میں شامل ہو جائے گی۔ رائے شماری کا انتظام کرنے کے لئے یو، این، او نے بہ فریقین کی رضامندی سے [illegible] [illegible] [illegible] لیا [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] شروع [illegible] جارہی [illegible]

کی [illegible] اندر اپنے عہدے کا چارج لے لیں گے۔ لیکن کشمیر کمیشن کی رپورٹ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ رائے شماری کی تیاریاں اسی وقت شروع ہو سکتی ہیں جب عارضی صلح کی شرطیں طے ہو جائیں۔ ان میں دو شرطوں پر ابھی تک اختلاف ہے۔ ایک یہ کہ "آزاد کشمیر" کی فوجوں کو موقوف اور منتشر کر دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ علاقے کا انتظام جو آج کل برائے نام سردار ابراہیم کی حکومت کے اور دراصل پاکستان کے ہاتھ میں ہے کشمیر کمیشن کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ حکومت ہند کا نقطۂ نظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں باتیں پہلے ہی طے ہو چکی ہیں۔ "آزاد کشمیر" کے قائد اس سے انکار کر رہے ہیں اور حکومت پاکستان بظاہر خاموش ہے۔ ارباب خبر کا اندازہ اب تک یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ گتھی بھی سلجھ جائے گی اور رائے شماری کے لئے فہرستیں تیار کرنے اور ان لوگوں کو جو آزاد کشمیر کو چھوڑ کر چلے آئے ہیں ان کے گھروں میں بسانے کا کام جلد شروع ہو جائے گا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سال بھر میں یہ دونوں کام ختم ہو سکتے ہیں لیکن حقیقت میں مدت کا کوئی اندازہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کام شروع نہ ہو جائے اور کچھ دن تک اس کی رفتار نہ دیکھ لی جائے۔

کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

پارلیمنٹ میں وزیر بحالی شری موہن لال سکسینہ نے ان مشکلات کا ذکر کیا جو شرنارتھیوں کو پھر سے بسانے میں پیش آ رہی ہیں۔ یہ مشکلیں چار قسم کی ہیں:-

۱۔ بغیر منصوبہ بنائے ہوئے کام ٹھیک نہیں ہو سکتا، اور منصوبہ بنانے میں بڑی دیر لگتی ہے

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

جبرِ حیات

اختر انصاری

یہ چاہتا ہوں کہ کچھ دیر کے لئے ہمدم!
تجھے بھی دل سے بھلاؤں میں، خود کو بھی بھولوں
اُڑوں لگا کے تخیل کے پر زمینوں سے
کمند پھینکوں فلک پر ستاروں کو چھولوں

مچاؤں دھوم کبھی کہکشاں میں، اور کبھی
دھنک کو گود میں لے کر گھٹاؤں میں جھولوں
بلند ہو کے بہار و خزاں کے عالم سے
ریاضِ انجم و مہتاب میں پھلوں پھولوں

مگر اُڑان کی قیمت کہاں سے دوں گا میں
فلک سے گر کے بھلا کس طرح جیوں گا میں

غزل

چودھری عشرت حسین

ان آنکھوں نے عجب نیرنگِ گلزارِ جہاں دیکھا
جہاں گل زیبِ دامن تھے وہیں دورِ خزاں دیکھا

کہیں کیا ہم نے جو کچھ انقلابِ آسماں دیکھا
تن ہی کے ہر تنکے کو برقِ آشیاں دیکھا

ہر اک کوشش کو گلزارِ جہاں میں رائگاں دیکھا
نہ کوئی لطفِ تکمیل بنائے آشیاں دیکھا

لکھا قسمت کا یا تیرا ستم اے باغباں دیکھا
کہیں کیا ہم نے کس حالت میں اپنا آشیاں دیکھا

یہ ٹکڑے دل کے ہیں ان کو نہ ٹھکراؤ حقارت سے
کہ ان میں ہم نے اکثر جلوۂ کون و مکاں دیکھا

ابھی برگِ خزاں دیدہ کے آثار پریشاں سے
مری نظروں نے رمزِ فطرتِ ہستی عیاں دیکھا

وہ تنکے آشیاں کے جو سکونِ جانِ بلبل تھے
قیامت ہے خزاں آتے ہی ان کو رائگاں دیکھا

کسی کی یاد میں تسکین دل کی اب یہ صورت ہے
اک آہِ سرد کھینچی اور سوئے آسماں دیکھا

اُسے غفلت کہوں اپنی کہ عجلت جلنے والوں کی
کھلی جب آنکھ نظروں نے غبارِ کارواں دیکھا

یہ قسمت کا کرشمہ ہے کہ عشرت جب بہار آئی
ہوا کے دوش پر ہم نے چمن میں آشیاں دیکھا

مسیح و خضر کے نام

خلیل الرحمن اعظمی

ابھی اُفق پہ وہی تیرگی کے پردے ہیں
مگر چراغ ترے جھلملائے جاتے ہیں
ہر ایک گام پہ سراب تو منزلوں کا گماں
غبارِ راہ کا یہ ایک آسرا تو نہیں
اجل سے لڑتے ہوئے غم کے کاروانوں کا
نشانِ زیست کہیں آج مٹ گیا تو نہیں
مری حیات کا شیرازہ منتشر تھا مگر
یہیں سے آئے تھے یہ آگہی کے افسانے
اٹھا کے ہاتھ میں اپنے لہو کا یہ پرچم
تمام رات تو جلتے رہے ہیں پروانے
ہزار کھلتے رہے پھول رہگزاروں پر
یہ ظلمتوں کا تبسم کبھی نہ راس آیا
رکی نہ گردشِ دوراں، نہ لڑکھڑائے قدم
تھکے ہوؤں کو نہ اندازِ بے حسی آیا،
مگر یہ آج کسی کی ادائے لغزش پر
ستارے ڈوبتے جاتے ہیں، شمعیں بجھتی ہیں
مرے جہاں میں یہ چارہ گری نہ کام آئی
وہ دیکھ مٹتی ہیں راہیں، وہ نبضیں تھمتی ہیں

ہریجن کا ست

ک۔ ج۔ مشروالا

اُردو سے بیر

کیا ریلوے کی وزارت نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اردو رسم خط کو ریلوے کے اعلانات کی تختیوں اور نام کی تختیوں سے خارج کر دیا جائے۔

مارچ کو مجھے اکولہ (برار) سے ریل میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ بیٹ فارم سے گذرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ سائن بورڈ سے اسٹیشن کا اردو نام مٹا دیا گیا ہے اور وہ کونا خالی ہے۔ سامنے کے پلیٹ فارم کے سائن بورڈ پر نظر ڈالی تو یہ دیکھنے میں آیا کہ اردو حرفوں کو مٹا کر ان کی جگہ ناگری لکھ دی گئی ہے حالانکہ ناگری کا نام دوسرے کونے پر پہلے ہی سے موجود تھا۔ آخر ایک ہی تختی پر ناگری میں دو جگہ نام ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ حرفوں کی شان کو دیکھا تو ایک کونے پر अ بمبئی کی طرز میں اور دوسرے پر یو پی کی طرز میں تھا۔ کیا ناگری نام دو جگہ لکھنے سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ایک زبان مرہٹی ہے اور دوسری ہندی۔

بات اپنی جگہ بہت چھوٹی سی ہے مگر اس سے بہت اہم سوالات پیدا ہوتے ہیں؟ کیا وجہ ہے کہ مرکزی حکومت کے ایک محکمے میں موجودہ طریقے میں تبدیلی کی گئی ہے کہ حکومت نے ابھی تک رسم خط کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے؟ غالباً ریلوے کے وزیر کو اس تبدیلی کی خبر تک نہ ہوگی۔ لیکن اس حکم سے چاہے وہ کسی نے دیا ہو ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تہ میں رجعت پسندانہ روح کام کر رہی ہے۔

آگے چل کر چاہے جو فیصلہ ہو مگر اس افسر کو جس پر یہ حکم دینے کی ذمہ داری ہے کوئی حق نہیں تھا کہ فیصلے سے پہلے عمل شروع کر دے۔ اس کو یہ بھی نہیں کرنا چاہیے تھا کہ अ کی اور ناگری کے چند اور حرفوں کی شکل بدل کر یہ ظاہر کرے گویا یہ کوئی دوسری زبان ہے۔ مجھے امید ہے ریلوے منسٹر یہ حکم جاری کریں گے کہ ریلوے لائنوں پر جہاں کہیں اردو نام مٹا دیے گئے ہیں انھیں دوبارہ لکھا جائے۔

گاندھی نگار خانہ

شری کنو گاندھی نے یہ بیان شائع کیا ہے:۔

"میری بڑی خوش قسمتی تھی کہ پچھلے چودہ برس میں نے گاندھی جی کے ساتھ گذارے۔ اس عرصے میں ان کے مختلف کام کرتے ہوئے اور مختلف صحبتوں اور حالتوں میں دیکھا ۱۹۳۸ء میں میں نے ان کے فوٹو لینے شروع کئے میرا خیال تھا کہ اس طرح لوگوں کو گاندھی جی کے ان حرکات و سکنات اور قلبی کیفیات کی جیتی جاگتی تصویریں دکھاؤں جو سب سے زیادہ موثر ہوں اور ان کی سیرت پر سب سے زیادہ روشنی ڈالتی ہوں۔ بار بار ان کو ہر کے کام میں گرفتار کرنا مشکل تھا۔ لیکن جب کبھی موقع ملا میں نے اس کی کوشش کی۔

میں فوٹوگرافر نہیں تھا اور مجھے اتنی فرصت بھی نہیں ملتی کہ فوٹوگرافی سیکھوں۔ میں تو باپو کے ساتھ ان کا ذاتی کام کرنے کے لئے رہتا تھا۔ انھوں نے مجھے فوٹو کھینچنے کی اجازت اسی شرط پر دی تھی کہ میرے فرائض میں خلل نہ پڑے اور خود ان کے کام میں ہرج نہ ہو اور ان کی توجہ نہ بٹے۔ ان پابندیوں کی وجہ سے اکثر تصویر کھینچنے کے اچھے موقعے ہاتھ سے نکل جاتے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں اُن کی نواکھالی کی مہم شروع ہونے کے بعد مجھے مشرقی بنگال کے ایک گاؤں میں کام کرنے کے لئے بھیجا گیا اور اس طرح میں ان کے آخری وقت تک ان سے جدا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی زندگی کی آخری اور سب سے بڑی مہم کے دوران میں جو انھوں نے کلکتے، بہار اور دہلی میں ہندو مسلم اتحاد کے لئے شروع کی میں ان کی کوئی تصویر نہ لے سکا۔

تصویروں کے علاوہ میرے پاس کوئی ۱۶ ملی میٹر کے فلم بھی ہیں جن میں باپو کی زندگی دکھائی گئی ہے۔ میرے پاس ہر طرف سے ان تصویروں کی مانگ آئی تھی ان کی وفات کے بعد یہ مانگ اور بڑھ گئی ہے۔ صوبوں کی حکومتوں، میونسپلٹیوں، اسکولوں اور عام لوگوں کی فرمائشیں آ رہی ہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ان سب کو باپو سے کتنی عقیدت ہے اور وہ مجھ سے اس ذخیرے کی وجہ سے جو میرے پاس ہے کیا توقعات رکھتے ہیں۔

ان فرمائشوں کی تعمیل کرنے اور ان توقعات کو پورا کرنے کے لئے میں نے اگست ۱۹۴۸ء سے گاندھی چترالیہ کے نام سے ایک نگار خانے کی بنا ڈالی ہے۔ اس کے مقاصد یہ ہیں:۔

۱۔ گاندھی جی کی بعض سب سے اچھی تصویروں کو جو میرے ذخیرے میں ہیں بڑے سائز پر شائع کرنا۔

۲۔ ان کی اچھی اور سستی تصویروں کے بیچنے کا انتظام کرنا تاکہ کم آمدنی کے لوگ خرید سکیں۔

۳۔ جو متحرک فلم میرے پاس ہیں ان کے دکھانے کا انتظام کرنا اور اگر ممکن ہو تو ان کی کاپیاں فروخت کرنا۔

۴۔ کتابوں وغیرہ کے لئے تصویروں کی کاپیاں یا بلاک مناسب قیمت پر مہیا کرنا۔

۵۔ گاندھی جی کی ان تصویروں اور فلموں کے حاصل کرنے اور دکھانے کا انتظام کرنا جو دوسروں کے پاس ہیں۔ (مثلاً راج کوٹ کے شری تیج پال نے ازراہ مہربانی وہ فلم عنایت فرمایا ہے جو انھوں نے گاندھی جی کے ۱۹۳۹ء میں راج کوٹ جانے کے وقت لیا تھا۔)

یہاں یہ ظاہر کر دینا مناسب ہوگا کہ میرا کبھی یہ ارادہ تھا اور نہ اب ہے کہ گاندھی جی کی ان تصویروں فلموں وغیرہ سے جو میں نے خود تیار کئے ہیں، یا دوسروں نے، اپنے لئے روزی کماؤں۔ مجھے گاندھی جی کی تصویروں سے ان کی زندگی میں جو کچھ نفع ہوتا تھا وہ میں ان کے حوالے کر دیتا تھا یا ان کی رضامندی سے یا ان کی ہدایت کے مطابق کسی پبلک فنڈ کو دے دیتا تھا۔

باپو کی ہمت افزائی سے اور ان کی نگرانی میں مجھے بعض ٹریننگ کیمپ چلانے کا موقع ملا۔ میرا خیال تھا کہ اسی کام کو بڑے پیمانے پر کروں۔ بعد میں نے اس کے متعلق ایک اسکیم کا مسودہ گاندھی جی کو دیا تھا، اور ان کو اس سے اتفاق کر لیا تھا کہ ان کی تصویروں سے جو آمدنی ہو اس کو اس کام میں خرچ کروں۔ اس کے بعد بھی میرا ارادہ ہے کہ اس رقم کو سب سے پہلے اسی طرح صرف کروں۔ اس کے بعد جو کچھ بچے وہ تعمیری پروگرام کی دوسری مدوں میں بھی خرچ کیا جا سکتا ہے۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اب جب کہ گاندھی جی موجود نہیں ہیں ایک مجلس مشورہ مقرر کر دی جائے جو اس کام میں میری رہنمائی کرے اور اس کام میں میری مدد کرے تاکہ مجھے پہلے کی طرح لوگوں کی خدمت کرنے کی فرصت مل سکے۔ یہ بورڈ چترالیہ کا انتظام کرے گا۔ اس کا حساب رکھے گا۔ اور اس کے بارے میں سب مسئلوں کا فیصلہ کرے گا جن میں یہ بھی شامل ہے کہ اس کی آمدنی کیونکر خرچ کی جائے۔

میں نے یہ بیان جلد شائع کر دیا ہے اس لئے کہ بورڈ کے مقرر ہونے میں کچھ دیر لگے گی۔"

شری کنو گاندھی کو ان کے کام میں شری جمنا داس گاندھی سے مشورہ ملا کرتا تھا۔ جب سے ان کے ذہن میں وقف کرنے کا خیال آیا ہے وہ مجھ سے بھی ربط ملتے رہتے ہیں۔ انھوں نے اس تجویز کو عمل میں لانے کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی ہے۔ ان کا یہ بیان اس وجہ سے شائع کیا گیا ہے کہ پبلک کو ان ارادوں سے اور مقصدوں سے واقفیت ہو جائے۔

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

(بسلسلہ صفحہ ۲)

کے نہایت سہل الحصول ہے اور جس کی شاعری نہایت لطیف اور شگفتہ اور فصاحت و بلاغت سے لبریز ہے اسے بھی وہ عموماً بیگانہ وار نظروں سے دیکھتے رہے حالانکہ جو اردو ان کو اس قدر عزیز ہے اس کی گرامر کا دار مدار بالکل بھاشا یا سنسکرت کی گرامر ہے۔۔۔۔۔ اور زبان کا جو ہندی بھاشا کو مطلق نہیں جانتا اور محض عربی فارسی کے تان گاڑی چلا جاتا ہے وہ گویا اپنی گاڑی بغیر پہیوں کے منزل مقصود تک پہنچاتی چاہتا ہے۔

حالی پر جنبہ داری یا خوشامد یا سیاسی مصلحت بینی کا الزام نہیں لگایا جا سکتا، ان کا یہ مشورہ ان سب کی توجہ کے قابل ہے جو اردو کو قائم رکھنا اور ہندوستانی کو مضبوط بنانا چاہتے ہیں

کشکول محمد علی شاہ فقیر

سائیں کی جھولی میں بندے کا دیا، اللہ کا دلوایا کیا کچھ نہیں نکلتا۔ ایک شعر استاد جرأت کا سناتا ہوں۔ یہ ایرسٹا کریٹک شعر نہ روس والا کہہ سکتا ہے نہ امریکہ والا۔ یہ ہندوستان جنت نشان ہی کی سرزمین ہے، جہاں یہ پروا اُگتا ہے، پھپکتا ہے

نالہ، آہ و فغاں سب مرادم بہت ہیں
آپ کا جان کے سب مجھ پہ کرم کرتے ہیں

"ویدی ناچت ہیں منہوں پھیوں" (میری بڑی بہن ناچتی ہے میں بھی ناچوں گی) ارے صاحب وہ جوان ہے، اس کے دل میں جوانی کا جوش ہے۔ یہ سن کا تقاضا ہے۔ اُمنگ ہے، ترنگ ہے۔ آپ چیاں ریزی کس برتے پر ناچیں گی۔ نہ چھب نہ تختی۔ گات نہ گولائی۔ کیا سبزہ روئیدہ اُبھرے گا۔ کیا تو ڑالیں گی مگر نہیں ناچیں گی ضرور۔ اچھا ناچو خوش رہو یا باہم اللہ کے فقیر ہم کو اس سے واسطہ؟

ہل انسان کی قدیم ترین ایجاد ہے۔ لیکن زمین ہل ایجاد سے پہلے بھی جوتی جاتی تھی اور اس وقت تک وہ سلسلہ جاری ہے کاشتکار کی مدد میں کیچوے خاک آج بھی اپنا کام کئے جاتے ہیں۔ دریائے نیل کے سیلاب میں نباتات بہہ کر آتے ہیں ان کو کیچوے کھا جاتے ہیں اور سیخال بہترین ہانس بن جاتی ہے۔ انگلستان میں رومیوں کے زمانے کے آثار اس طرح باقی رہے کہ کیچوے اپنی مٹی سے اپنی اوپر کی زمین بنایا کئے اور قدیم آثار نیچے دبے پڑے رہے۔ پتھر وغیرہ کے ریزے بھی اسی طرح نیچے دب جاتے ہیں۔ کیچوؤں کی پیدائش زیادہ کی جائے تو زمین زرخیز ہو جائے امریکہ میں تجربے کئے جا رہے ہیں۔

ورلڈ ڈائجسٹ اگست ۱۹۵۰ء

سودا

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

سوز

یاریوں دور جا بسے اللہ
کیا زمانے کا انقلاب ہوا

کدر پیا

موری انکھیاں ڈھونڈھ رہی ہیں
کدر پیا جن کا تم چاہت سے
نا جانے کرتے اور ترسیں
موری انکھیاں .... (پیلو)

کہانی میں جیسے راجہ کی بیٹی بال بال گیج موتی پرو کر بھیسار کو جاتی ہے۔ اسی طرح ہندوستان کے دریا پہاڑ، ہوائیں، فصلیں، کہیں پھول، اناج

گھاس پھوس، درپھے، چرندے، پرندے، بھارت ماتا کی لٹوں میں بندے ہیں۔ ان جھاڑیوں میں صرف کیتکی چمپا کے پھول ہی نہیں ہیں ان میں مگر کھڑیال بھی ہیں۔ انگریزی مثل ہے۔ مجھ کو چاہتے ہو تو میرے کتے کو بھی چاہو۔ اسی طرح جو کوئی اس ملک کو چاہے اس کی ہر چیز کو چاہے۔ اگر تم نے کوئی چیز چھوڑ دی تو اس معشوق کا سنگار کم ہو گیا۔ اگر ہم کو پیار کرتے ہو تو ہماری ہر بات تم کو پیاری ہو۔ معشوق کی یہی آن ہے۔ اور یہی بھارت ماتا کی آن ہے۔ بارہ ابرن سولہ سنگار میں سے کچھ کم ہو گیا تو ماتا رانڈ ہو گئی۔

خلاف طور ہر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

سیفو کا ایک شعر

محبت کا زمانہ گزر چکا۔ بہار کب کی جا چکی بادل گرجے ہوؤں کو اسو برس گزر ہوئی ہے تو یقین رکھ تیری معشوقہ موت کی نیند میں بھی تیرے میٹھے سپنے دیکھتی ہے۔

ایک جاپانی عورت کا شعر

جیسے گہرے سمندر کا پہاڑ ہوتا ہے کہ جوار میں بھی پانی کی تہہ میں رہتا ہے اور بھاٹے میں بھی۔ اسی طرح میری آستین ہمیشہ آنسوؤں سے تر رہتی ہے۔

سات اور جاپانی اشعار

۱۔ اے شبنم ستقطرو۔ لاؤ میں اپنی مصیبت زدہ زندگی کے دھبے تم سے دھولوں۔

۲۔ راستے میں جو پھول کھلا تھا کہ مسافروں کو دیکھے گا۔ گدھا آیا اور اس کو چر گیا۔

۳۔ پیاری چھوٹی ٹڈیا یہ ننھی منی مکھی بھوروں کے بیچ میں ملکن ہے اکو کیا کرو گی کھا کے۔

۴۔ دور دراز کی جھیل۔ مدتوں سے سکون کی نیند سو رہی تھی۔ نہ لہر نہ ہچکولا۔
اے لو ایک اس میں کود پڑا

۵۔ لڑائی کا میدان ہزاروں کے خون سے رنگین بنا آج بہار کے پھولوں سے بھرا پڑا ہے۔ شکست و فتح کے خوابوں کی تعبیر ہے۔

۶۔ بوڑھے سفر لوں والے کا جنازہ باپ دادا کی ہڑواڑ میں ہے۔ جو زندہ ہیں لٹھیا پر ٹیک لگائے کھڑے ہیں۔

۷۔ باغ کی گھاس میں ارے ابھی تو تو چوں چوں کر رہا تھا۔ کون کہہ سکتا کہ تو یک بارگی چپ ہو جائے گا۔

اے ہے ان ارے توغم کے بادل چھا گئے۔ میری محفل سے رنجیدہ گئے۔ ایک ہولی سن نیچے

اور خوش خوش گھر جاتے، نہیں تو پھر گھر میں مشکل ہو گی۔
ساری ڈار دینو موہے رنگ کی گگر
پیلا ہو کر دیا میں تو موہے کو کیکن لاگی ادھر
ساری ڈار دینو ....
بن رنگ ڈارے میں جانے نہ دوں گی
جانے کہاں لاؤ گذر
ساری ڈار دینو ....

(ڈکانی)

ہندوستان (بسلسلہ صفحہ ۸)

۲۔ صوبوں کی اندرونی سیاست کی وجہ سے اور اس دہشت کی وجہ سے جو لوگوں کو چھپیوں سے ہوتی ہے ہر جگہ مقامی آبادی کا شرنارتھیوں کو بسانے یا مدد دینے کے بجائے اور روڑے اٹکاتی ہے۔

۳۔ خود شرنارتھیوں کو دور دراز شہروں اور صوبوں میں جانے اور نئے پیشے اختیار کرنے میں تامل ہوتا ہے۔

۴۔ شرنارتھیوں کے لیڈروں کا یہ رویہ بھی بحالی کے کام میں حائل ہوتا ہے۔ وہ حکومت پر حد سے زیادہ ذمہ داری ڈالتے ہیں، اور لوگوں کو یہ سمجھاتے ہیں کہ حکومت کا اخلاقی اور قانونی فرض ہے کہ جو املاک وہ پاکستان میں چھوڑ کر آئے ہیں انھیں اس کا معاوضہ دے اور کاروبار شروع کرنے کے لئے روپیہ قرض دے۔

وزیر بحالی نے جو مشکلیں بتائیں ان میں سے پہلی بہرحال حل ہو چکی ہے۔ منصوبے جو کچھ بن سکتے تھے بن گئے ہیں اب رہی مقامی آبادی کی شرنارتھیوں سے اور خود شرنارتھیوں کی اجنبی شہروں اور صوبوں سے دہشت اور اس کو دور کرنے کے لئے حکومت کو اور ملک کے بڑے لیڈروں کو ایک زبردست مہم شروع کرنے کی ضرورت ہے۔ اس وقت دہشت کا مقابلہ کرنا اور اس پر غالب آنا دراصل متحدہ قومیت کی تعمیر کا سب سے اہم فرض ہے جو ہمیں بہرحال ادا کرنا ہے۔ اگر ہم پنجاب کے رہنے والوں کو مدراس یا اڑیسہ میں بنگال کے رہنے والوں کو سی پی یا بمبئی میں نہ کھپا سکے تو کس منہ سے یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ صوبائی اختلافات کے باوجود ہماری تہذیب اور معاشرت کی بنیادیں ایک ہیں۔

سب سے کڑی دراصل چوتھی مشکل ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب تک اس املاک کا مسئلہ طے نہ ہو جائے گا جو پاکستان سے آنے والے وہاں چھوڑ کر آئے ہیں ان کی بحالی کا کام کسی طرح انجام نہیں پا سکتا اور وہ کبھی چین سے نہیں بیٹھ سکتے۔ یہ توقع رکھنا کہ پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کے باہمی مشورے سے یہ حد سے زیادہ پیچیدہ گتھی سلجھ جائے گی بے جا امید پروری ہے۔ یونان اور ترکی کے درمیان اس سے کہیں کم تعداد میں تبادلہ آبادی ہوا تھا جتنی تعداد میں ہمارے ہاں ہوا ہے لیکن املاک کے مسئلے کو طے کرنے کے لئے مجلس اقوام کا کمیشن مقرر کرنا پڑا اور اس نے کئی سال میں فیصلہ کیا۔ ہماری رائے میں حکومت ہند اور پاکستان کو چاہیے کہ جلد سے جلد اس معاملے کو مجلس اقوام متحدہ

مختصر تبصرے

نظموں کے تین مجموعے

سید احتشام حسین

۱۔ سازِ نو ۔ از مجازؔ ۔ ملنے کا پتہ :- کتابی دنیا، نظیر آباد، لکھنؤ ۔ مجلد قیمت عہ
۲۔ تلخیاں ۔ از ساحر لدھیانوی (طبع سوم) ملنے کا پتہ :- نیا ادارہ ۔ لاہور ۔ مجلد قیمت عہ
۳۔ خم کاکل ۔ از سیف الدین سیف ۔ ملنے کا پتہ : نیا ادارہ لاہور ۔ مجلد قیمت عہ

۱۔ سازِ نو

مجاز کا پہلا مجموعہ بھی ہے اور چوتھا بھی۔ دس سال پہلے مجاز کی نظمیں آہنگ کے نام سے لکھنؤ سے شائع ہوئی تھیں۔ پھر یہ مجموعہ کچھ نئی نظموں کے اضافے کے ساتھ اسی نام سے دوبارہ لاہور سے شائع ہوا۔ ان دونوں ایڈیشنوں میں سجاد ظہیر کا دیباچہ شامل تھا۔ ۱۹۴۵ء میں بہت سی نظموں کا اضافہ کر کے ہندوستانی پبلشرز دہلی نے مجاز کا مجموعہ شب تاب کے نام سے شائع کیا۔ اس میں سجاد ظہیر کے دیباچے کے علاوہ ایک مختصر سا تعارف فیض احمد فیض کے قلم سے بھی ہے۔ سازِ نو ابھی شائع ہوا ہے۔ اس میں جنوری ۱۹۴۸ء تک کی نظمیں اور غزلیں شامل کر لی گئی ہیں۔ دونوں دیباچے نکال دیے گئے ہیں کیونکہ اب مجاز کی شاعری کو تعارف کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن یہ بات ضرور تعجب خیز ہے کہ اس کے ساتھ نظموں کی فہرست بھی الگ کر دی گئی ہے اور نظموں کے نیچے تاریخ تصنیف نہ ہونے کی وجہ سے مجاز کے ذہنی ارتقاء کا پتہ چلانا بھی مشکل ہے۔

مجاز کی شاعری ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ پروان چڑھی ہے۔ اس میں اس تحریک کی ہر منزل تلاش کی جا سکتی ہے۔ مجاز کی شاعری ایک جوان سال آتش نفس مغنی کے دل کی آواز ہے۔ اس میں محبت کا رومان بھی ہے اور رندی کا بانکپن بھی۔ اس میں ایک باغی کے عزم بغاوت کا جلال بھی ہے اور ترانہ سنج شاعر کے مترنم نغموں کا جمال بھی۔ "نورا" "آوارہ" اور میراجی "کہ شاعر جب" "فکر" اور "جشنِ آزادی" لکھتا ہے تو ہمیں اس کے ذہنی ارتقاء ہی کا پتہ نہیں چلتا بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی شاعری نے جو سمت معین کی تھی وہ نہیں بدلی ہے۔ پہلے جوش، جذبہ، الجھن، بے صبری اور جلد بازی کا پتہ چلتا تھا اب سنجیدگی، گہرائی، واقفیت اور بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن اندازِ بیان کی لطافتوں میں کمی نہیں ہوئی ہے، بلکہ ان میں وسعت اور گہرائی آ گئی ہے۔ مجاز کی شاعری ابہام اور بے اثری کا کبھی شکار نہیں ہوئی انھوں نے لاشعور کی دھند کی [illegible] بھی نہیں کی۔ بغاوت کے تجربوں میں اپنی طاقت [illegible] نہیں ہونے دی بلکہ اپنے موضوع کو مناسب [illegible] رنگینی [illegible] حسین و جمیل لفظوں میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے جس طرح زندگی کے اثباتی اور اہم موضوعات پر شاعری کی ہے اسی طرح ان کا اسلوب بھی واضح اور روشن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ زندگی اور ادب کو ساتھ لے کر چلنے والے نقاد کی کسوٹی پر پورے اتر رہے تو شاعری کا جمالیاتی نظر سے مطالعہ کرنے والا بھی ان کے جادو میں گرفتار ہو جائے گا۔

مجاز کم کہتے ہیں۔ لیکن جب کہتے ہیں تو ایک بار پھر یقین دلا دیتے ہیں کہ وہ ابھی تھکے نہیں ہیں وہ دم لینا نہیں چاہتے اور اپنی زندگی کی آخری سانس تک اپنی شاعری کے ذریعے سے اپنے مقصد کے لئے جدوجہد کرنا چاہتے ہیں

وہ مقصد ہے ایک آزاد جمہوری سماج جس میں انسان انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے ترقی کے تمام ذرائع کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھتا ہو اور اپنی تقدیر آپ بنا سکے۔ اس لئے وہ موجودہ آزادی کو انقلاب نہیں، انقلاب کا مژدہ قرار دیتے ہیں اور مہوش بنت کائنات کے لئے اپنا خرمن دل تک نچھاور کر دینے کی تمنا رکھتے ہیں۔ اس تصور میں رومان بھی ہے اور حقیقت کا ادراک بھی، خواب بھی ہے اور خواب کی تعبیر بھی۔ مجاز کا لاابالی پن سازِ نو کی ترتیب میں بھی ظاہر ہو رہا ہے۔ نئی پرانی نظمیں گڈمڈ ہو گئی ہیں اور کسی قسم کی کوئی ترتیب نہیں ہے۔ جہاں اس معاملہ میں شاعر بے پروا ہو وہاں ناشر کو ہوشیار رہنا چاہیے۔

۲۔ تلخیاں

ساحر لدھیانوی کا مجموعہ کلام ہے۔ میرے سامنے اس کا تیسرا ایڈیشن ہے اور پچھلے دو ایڈیشنوں سے بھی زیادہ خوب صورت اور دیدہ زیب ہے۔ ساحر اور مجاز میں کئی باتیں مشترک ہیں جن کا پتہ موضوعات اور اندازِ بیان دونوں میں چلتا ہے لیکن جو چیز دونوں کو ایک دوسرے سے بالکل قریب لاتی ہے وہ زندگی اور انسان کے متعلق [illegible] کا نظریہ ہے دونوں افق پر نگاہ جما [illegible] [illegible] اور بہتری کی [illegible] تلاش میں [illegible] رہتے ہیں دونوں کے [illegible] میں بڑی حد تک [illegible] ہے اس لئے دونوں کا ساتھ مطالعہ [illegible] ساحر کی پڑھنے سے ہمیشہ اس بات [illegible] معلوم ہوتا ہے کہ محبت کی ناکامی نے ان کے ذہن کو سماجی عدمِ توازن کی جانب پھیر دیا اور بجائے اس کے وہ اپنا گریبان پھاڑتے ان طاقتوں سے جنگ کرنے پر آمادہ ہیں جو ان کی اور ان کے سے ہزارہا جوانوں کی راہ میں حائل ہیں۔ میں نے تلخیاں کے دوسرے ایڈیشن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "ساحر کے پاس ایک فلسفۂ کائنات ہے اور اس سے ان کی وابستگی اتنی شدید ہے کہ وہ اس کو برقرار رکھنے کے لئے اپنا فن تک قربان کرنے پر آمادہ ہیں......." وہ اپنے گیت کو مزدوروں اور کسانوں کا گیت بنانا چاہتے ہیں :

آج سے اے مزدور کسانو! میرے راگ تمہارے ہیں
فاقہ کش انسانو! میرے جوگ بہاگ تمہارے ہیں
جب تک تم بھوکے ننگے ہو یہ شعلے خاموش نہ ہوں گے
جب تک بے آرام ہو تم یہ نغمے راحت کوش نہ ہوں گے
مجھ کو اس کا رنج نہیں ہے لوگ مجھے فن کار نہ مانیں
فکر و سخن کے تاجر میرے شعروں کو اشعار نہ مانیں
میرا فن میری امیدیں، آج سے تم کو ارپن ہیں
آج سے میرے گیت تمہارے دکھ اور سکھ کا درپن ہیں

یقیناً ادیبوں اور ناقدوں کا ایک گروہ ایسا ہے جو بڑی آسانی سے شاعری پر پروپیگنڈے کا الزام لگا دیتا ہے۔ لیکن اب حالات بدل رہے ہیں اور مواد و ہیئت کی ہم آہنگی ہی کو فنکاری سمجھا جا رہا ہے۔ انسانیت کے درد سے لبریز موضوع کوئی بھی ہو، اگر شاعر کے قلم میں یہ جادو ہے کہ وہ اسے حسین پیکر میں ڈھال سکے تو فن کی قدریں مجروح نہ ہوں گی۔

تلخیاں کے تیسرے ایڈیشن نے ان الفاظ میں اور جان ڈال دی ہے۔ وہ آٹھ دس نظمیں جو اس ایڈیشن میں بڑھا دی گئی ہیں نہ صرف ساحر کی نظریاتی زندگی کو واضح کر رہی ہیں بلکہ ان کے فن میں پختگی، گرمی، بے باکی اور خود روش پیدا کر رہی ہیں۔ انھوں نے پوری طاقت سے ادب کو ایک بہتر زندگی کا آلۂ کار بنانے کا ارادہ کیا ہے اور ان کا احساسِ جمال، شعورِ فن، خلوص، استعاروں کی جدت اور لفظوں کا انتخاب ان کے معاون ہیں۔ ساحر کا مجموعہ یقیناً جدید اردو شاعری میں ایک اہم اضافہ ہے۔

۳۔ خم کاکل

نسبتاً ایک نئے شاعر کا پہلا مجموعہ ہے جو پہلی بار شائع ہوا ہے، لکھائی چھپائی قابلِ رشک حد تک دیدہ زیب ہے۔ سیف الدین سیف کو شاعری دنیا میں داخل ہوئے ابھی زیادہ دن نہیں گزرے لیکن ان کی چھوٹی چھوٹی غزلوں اور نظموں نے کچھ دنوں سے لوگوں کو متوجہ کرنا شروع کر دیا تھا اور یہ مجموعہ ان لوگوں کے لئے ایک خوش گوار استعجاب کا حامل ہو گا جنھوں نے سیف کی نظمیں اس سے پہلے نہیں [illegible] تھیں۔ ۱۲۶ صفحوں [illegible] خوب صورت مجموعے [illegible] نظمیں، گیت [illegible] [illegible] ہیں۔ دو آخر [illegible] اضافہ [illegible] [illegible]

NAI ROSHNI
DELHI

جلد ۳۲ | نمبر ۸ | ۲۲ر اگست ۱۹۴۹ء | ایڈیٹر:۔ ڈاکٹر سید عابد حسین

ہندوستان کی صحت عامہ

راج کماری امرت کور

ذیل میں راج کماری امرت کور، وزیر صحت عامہ حکومت ہند کی ایک انگریزی تقریر کا خلاصہ جو آل انڈیا ریڈیو دلی سے نشر ہوئی تھی، رسالہ آج کل کے شکریے کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

سالہا سال میری سرگرمیاں فلاح عامہ کے کاموں سے وابستہ رہی ہیں۔ مجھے کئی سال تک مہاتما گاندھی کی خدمت میں گذارنے اور ان کے ساتھ مل کر کام کرنے کے بے بہا موقعے میسر آئے۔ اس طرح مجھ پر یہ حقیقت پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ واضح ہو گئی کہ ہندوستان میں خدمت خلق کا میدان بہت وسیع ہے جس طرح تپتی جھلستی دھرتی بارش کے جاں بخش چھینٹوں کی منتظر ہوتی ہے۔ اسی طرح مادر وطن اپنے بچوں کی مخلصانہ خدمت گذاری کے آب حیات کا انتظار کر رہی ہے۔

تعلیم اور صحت عامہ کے شعبوں میں قومی تعمیر کے لئے طویل اور فوری معاونت کی منصوبہ بندیوں اور ان پر عمل درآمد کے امکانات خاص طور پر بہت زیادہ ہیں۔ ہمیں ہر شعبے میں قریباً الف بے سے آغاز کرنا ہوگا، کیونکہ جب تک ہندوستان کی دیہاتی زندگی کی کایا پلٹ نہ ہو جائے ہم اپنی کوششوں کو پوری طرح کامیاب نہیں سمجھ سکتے۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے ۸۵ فی صدی ہم وطن دیہات میں رہتے ہیں۔ یہ سیدھے سادے دیہاتی زیادہ تر کھیتی باڑی کا کام کرتے ہیں اور ان کی زندگی انتہائی مفلسی اور جہالت میں بسر ہوتی ہے۔ لیکن ہماری زندگی کا دارومدار بہت بڑی حد تک انہی لوگوں پر ہے کیونکہ یہ ہمارے لئے خوراک پیدا کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ہم انھیں اب تک نہ تو تعلیم دے سکے ہیں اور نہ موزوں مکانات۔ صفائی اور طبی امداد کے بارے میں وہ سہولتیں ہم پہنچا سکے ہیں جن کے یہ مستحق ہیں۔

کوئی دس سال ہوئے جب ہمارے وزیر اعظم انڈین نیشنل کانگریس کے صدر تھے تو انھوں نے ایک منصوبہ بندی کی کمیٹی بنائی تھی۔ اس کمیٹی کے سپرد زندگی کے ہر شعبے سے متعلق تجاویز مرتب کرنے کا کام تھا تاکہ ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد یہاں کی قومی حکومت ان پر عمل درآمد شروع کر دے۔ کمیٹی تمام تجاویز مرتب کر چکی ہے۔ لیکن ہمیں آزادی بہت مہنگی پڑی۔ اس کی قیمت ہم نے اپنے ملک کی تقسیم کی صورت میں ادا کی اور اس تقسیم کے باعث ملک بھر میں ایک قیامت سی برپا ہو گئی جس کے باعث ہماری تمام سرگرمیاں خدا کے لاکھوں ناخلق [illegible] بے یار و مددگار پناہ گزینوں کی امداد اور بحالی تک محدود رہی ہیں۔ اور ہم کسی اور کام پر کچھ قابل ذکر توجہ نہیں کر سکے۔

جہاں تک صحت عامہ کا تعلق ہے بلاشبہ ہمارا مطمح نظر یہ ہونا چاہیئے کہ ایک ایسا جامع اور مستعد نظام قائم کر دیا جائے جو ہر مرد عورت اور بچے کی ضرورتوں کا کفیل ہو سکے۔ بڑے بڑے شہروں کے بسنے والے اور دور دراز دیہات کی جھونپڑیوں میں رہنے والے طبی خدمات کا معاوضہ ادا کرنے کی استطاعت رکھنے والے اور غریب نادار سب کے سب اس سے یکساں مستفیض ہو سکیں۔ حفظ ماتقدم ہر صورت میں علاج سے بہتر ہوتا ہے اور میرا عقیدہ ہے کہ اگر رہنے کے لئے مکانوں کا ایسا انتظام ہو جائے کہ لوگوں کو تنگ و تاریک کوٹھریوں میں گھس بیٹھ کر زندگی کے دن پورے کرنے کی ضرورت نہ رہے۔ کوڑے کرکٹ اور گندے پانی کے نکاس کے لئے نالیاں اور بدرویں موجود ہوں جس سے غلاظت اور تعفن کا خاتمہ ہو جائے لوگوں کو صحت کے اصولوں کی باقاعدہ تعلیم دی جائے جس سے وہ صاف ستھرے رہنے اور مفید صحت خوراک کھانے کے فن سے آگاہ ہو جائیں اور سب سے بڑھ کر ہر جگہ کھانے پینے کی چیزیں دودھ اور پانی کافی مقدار میں میسر آ سکیں تو ہماری اسّی فی صدی بیماریاں خود بخود ختم ہو جائیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بات بھی پلک جھپکنے میں نہیں ہو سکتی بعض دوسرے ملکوں کی طرح ہمیں بھی اشیائے خوردنی کی قلت، بہم رسانی آب کے مناسب انتظام کی قلت، تعمیری مصالحہ کی قلت، ہسپتالوں کی قلت۔ ڈاکٹروں اور طبی خدمات انجام دینے والوں کی قلت، ذرائع رسل و رسائل کی قلت، اور ان سب سے زیادہ روپے پیسے کی قلت کا سامنا ہے لیکن ہم نہ تو ان قلتوں سے گھبرا کر جی چھوڑ بیٹھے ہیں اور نہ یہ بات ہمارے لئے وجہ مایوسی ہے کہ ہمارے منصوبے بڑی دھیمی رفتار سے پورے کئے جا رہے ہیں۔ منزل مقصود کی طرف معمولی سے معمولی اقدام بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ پھر یہ بات بھی نہایت حوصلہ افزا ہے کہ لوگوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ کسی شخص کو کسی چیز کی ضرورت کافی شدت سے محسوس ہو تو عام طور پر وہ اس کے حصول کے لئے ہاتھ پاؤں (بقیہ صفحہ ۶ پر)

فہرست مضامین

ہریجن کا ست

سچی لگن

کشوری لال مشروالا

بھولیکم اگست لوکمانیہ تلک کی اور ۱۵ اگست مہادیو ڈیسائی کی یاد دلاتی ہے ان دونوں نے ملک و قوم کی خدمت میں اپنا دھن، من، تن سب کچھ لگا دیا۔ لوکمانیہ تلک کی موت کے ساتھ عدم تعاون کی تحریک کا آغاز ہوا، اور اس تحریک کے ساتھ [illegible] اپنا وہ پیدائشی حق حاصل کرنے کی سرگرم جدوجہد شروع کر دی جس کے لئے لوکمانیہ برسوں سے جدوجہد کرتے آئے تھے۔ یہ تحریک منزل بمنزل ہوتی ہوئی سنہ ۴۲ء کی "ہندوستان چھوڑ دو" والی تحریک سے جا ملی جس کی سب سے بڑی قربانی مہادیو بھائی کی موت کی صورت میں دی گئی اور ہندوستان کی آزادی کی تاریخ ان کی موت کی تاریخ ٹھہری۔

مہادیو بھائی ۱۹۱۷ء میں گاندھی جی کے ساتھ ہوئے۔ اس سال اور بھی کئی اشخاص گاندھی جی کے ساتھ ہوئے، لیکن ہم میں سے کوئی بھی یہ نہ سمجھ سکا کہ آخر کس چیز نے انھیں گاندھی جی کے ساتھ ہونے پر مجبور کیا۔ ہم سب کے دماغوں میں ملک کی خدمت کا کوئی نہ کوئی خاکہ ضرور موجود تھا، خواہ وہ واضح ہو یا دھندلا۔

ایک بار میں نے مہادیو بھائی سے دریافت کیا کہ آخر کس چیز نے انھیں گاندھی جی کے ساتھ ہو جانے کی ترغیب دی؟ کیا وہ ہوم رول، قومی تعلیم، سودیشی اور عدم تعاون کی تحریک سے متاثر ہوئے ہیں یا محض مذہب اور صحافت نگاری کے لگاؤ سے گاندھی جی کے ساتھ ہوئے ہیں؟ مہادیو بھائی ڈیسائی نے اس کے جواب میں بلا تامل کہا کہ جس چیز نے ان کے دل میں یہ جذبہ پیدا کیا وہ خود گاندھی جی کی ذات ہے۔ انھیں گاندھی جی سے مل کر ایسا معلوم ہوا کہ وہ ان کے آقا ہیں جن کے لئے ان کی ساری زندگی وقف ہے۔ اس دنیا میں ان کا مقصد سوائے اس کے کچھ اور نہ تھا کہ وہ اپنی زندگی باپو کے چرنوں میں گذار دیں۔ انھیں کسی ایسی ذات کی لگن تھی جس پر وہ اپنا جسم و روح قربان کر سکیں۔ یہ ذات انھیں گاندھی جی کے روپ میں مل گئی اور انھوں نے باپو کی خدمت اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔

ہم سب جانتے ہیں کہ مہادیو بھائی ڈیسائی کس وفاداری اور لگن سے آخر وقت تک باپو کی خدمت کرتے رہے۔ وہ مرے بھی ان حالات میں کہ خود باپو کو ان کی کریا کرم کرنا پڑی جس کی عام طور پر ایک ہندو باپ اپنے بیٹے کے ہاتھوں توقع رکھتا ہے

مہادیو بھائی ڈیسائی کو گاندھی جی کی غلاظت تک دھونے سے کوئی پرہیز نہ تھا۔ وہ ان کے کپڑے دھوتے۔ خطوط نقل کرتے، ان کا اسباب لاد کر لے جاتے۔ دوسروں کو خواہ کوئی چھوٹا ہو یا بڑا گاندھی جی کا پیغام پہنچاتے۔ ان کے رسالے مرتب کرتے۔ ان کے مضامین کا ترجمہ کرتے۔ ان کے خیالات و نظریات کی ترجمانی اور [illegible] کرتے۔ نازک سیاسی مسائل کے متعلق ان کی طرف سے گفت و شنید کرتے۔ غرض مہاتما گاندھی جو خدمت بھی ان کے سپرد کرتے یہ بخوشی اسے انجام دیتے اور ایک منٹ کے لئے بھی یہ خیال دل میں نہ لاتے کہ یہ کام تو ایسا ہے کہ گاندھی جی کو مجھ سے نہ لینا چاہئے تھا۔

جیسا کہ گاندھی جی نے خود ۱۸ اگست ۱۹۴۲ء کے ہریجن میں لکھا تھا "مہادیو ڈیسائی کا سب سے بڑا کردار جو میری نظر میں ہے وہ یہ ہے کہ وہ موقع پڑنے پر اپنے کو صفر تک گھٹا کر لا سکتے تھے" اور باپو ان کو کس قسم کے کام سپرد کرتے تھے؟ باپو کے کہنے پر انھوں نے الہ آباد میں پنڈت موتی لال نہرو کے اخبار کی ایڈیٹری کی جس کے لئے انھیں جیل جانا پڑا، باردولی بورسد میں سردار ولبھ بھائی پٹیل کے سکریٹری رہے۔ بیماری کے بعد آرام کی مدت میں انھوں نے دیولالی میں متھرداس ترکم جی کی رفاقت کی۔ مریضوں کی دیکھ بھال کی۔ لڑکوں، بوڑھوں دونوں کو ابتدائی تعلیم دی۔ ہر مختلف موضوع پر گاندھی جی کی طرف سے خط و کتابت کی۔ گاندھی جی اور ان کے ملاقاتیوں کے درمیان گفتگو کی رپورٹیں تیار کیں اور اگر ملاقاتی بطور مہمان آئے تو ان کی تواضع بھی کی — ان کو اسٹیشن لاتے یا رخصت کرنے گئے۔ مہینوں وہ واردھا سے سیواگرام تک پیدل آتے جاتے رہے۔ اپنے خلاف ان لوگوں کی شکایات پیش کیں جن کو ان کے متعلق ایک مغرور سکریٹری ہونے کی شکایت تھی۔ کیونکہ انھوں نے شکایت کرنے والے کے خط کا جواب گاندھی جی کی طرف سے نہیں بھیجا تھا، یا گاندھی جی سے ملنے والے کی ملاقات نہیں ہونے دی تھی اور گاندھی جی بھی کوئی ایسے مالک نہ تھے جو آسانی سے خوش کئے جا سکتے۔ ان کی سختی ان لوگوں پر اور بھی زیادہ ہو جاتی تھی۔ جو ان کے پاس رہنا چاہتے تھے۔ گاندھی جی ان کو رلا بھی سکتے تھے اور ہنسا بھی سکتے تھے، اور مہادیو بھائی ان باتوں سے مستثنیٰ نہیں تھے۔

لیکن انسان اپنے جسم کے ساتھ کیا کر سکتا ہے جن کی صحت مندی سے خوشی اور جن سے تکلیف ہوتی ہے؟ یہی تعلق گاندھی جی اور مہادیو بھائی کا جسمانی طور پر تھا۔ مہادیو بھائی باپو کے [illegible] آنکھ اور کان تھے، [illegible] باپو کے جذبات و خیال کی جھلک ہوتی تھی، لیکن روحانی طور پر یہ تعلق برعکس تھا۔ مہادیو بھائی کے لئے باپو سب کچھ تھے۔ وہ باپو کو چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ ایک آدھ مرتبہ جب انھوں نے [illegible] اور عاجزی سے یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ باپو کی خدمت کے لائق بالکل نہیں ہیں ان کو چھوڑنے کی [illegible] کی تو وہ بالکل ناکامیاب رہے۔ گاندھی جی کو چھوڑنا ان کے لئے ایسا ہی تھا جیسے کہ کوئی شخص ہوش میں اپنی کھال کھنچوا لے۔ اگر گاندھی جی کوئی ایسا [illegible] کا اشارہ بھی کرتے جس سے ان کی صحت یا [illegible] کا خطرہ ہوتا تو مہادیو بھائی کے لئے یہ ناقابل برداشت ہو جاتا۔ [illegible] باپو کی جان یا صحت کے لئے کوئی خطرہ ہوتا تو پھر عقلی دلائل کا کوئی سوال نہ رہتا۔ یہ مہادیو بھائی کے خلوص اور محبت کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ سنہ ۴۲ء میں گاندھی جی کو برت رکھنے سے روکنے اور جنگ کے خلاف بجائے راست اقدام کے انفرادی ستیہ گرہ پر راضی کرنے میں کامیاب ہوئے۔ جو لوگ مہادیو ڈیسائی کے قریب تھے وہی سمجھ سکتے ہیں کہ ۹ اگست [illegible] تک لیڈروں کی گرفتاری سے پہلے وہ رات دن کیسے بے چین رہتے تھے۔ کیونکہ اس بات کا امکان تھا کہ گاندھی جی گرفتاری کی صورت میں برت شروع کر دیں حالانکہ گاندھی جی نے ان کو اور اپنے ساتھیوں کو یقین دلایا تھا کہ انھوں نے اس وقت اس ارادہ کو ترک کر دیا ہے، مہادیو بھائی پر جو ذہنی بار بہت دنوں تک پڑا تھا اس سے وہ بالکل چور ہو گئے اور ایک ہفتہ کے اندر وہ ایسے اچانک مرے کہ باپو باوجود قریب کے کمرے میں موجود ہونے کے بھی ان تک نہ پہنچ سکے۔

دنیا میں کسی ملک سے ایسا لگاؤ کمیاب ہے۔ دنیا میں گرو نایاب نہیں ہیں خصوصاً ہندوستان میں لیکن مہادیو ایسا چیلا بہت ہی نایاب ہے۔ اور گاندھی جی کو جو نقصان پہنچا وہ ناقابل تلافی تھا۔ یہ بات ہر اس شخص پر واضح تھی جو ان کے ساتھ کام کرتا تھا اور جس نے ان کی رہائی کے بعد ان کو برابر دیکھا تھا۔ جیسا کہ شری راج گوپال آچاریہ نے مہادیو ڈیسائی کی موت کے چار سال بعد لکھا تھا .... ہم لوگ ابھی تک اس رنج و نقصان کو نہیں بھول سکے ہیں۔ گاندھی جی ہماری موجودہ زندگی میں ایک ضروری ہستی ہیں اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ ان کا ایک عضو بے کار ہو گیا ہے۔ ہمارا کوئی دن بھی ایسا نہیں گذرتا جس میں کوئی چیز مہادیو کی یاد ہمیں شدت سے نہ رلاتی ہو۔ وہ ایسے شخص تھے جن کی جگہ پر کرنے کی امید نہیں ہو سکتی۔ لیکن عام حالات میں ہم کام کرنے والوں کے درمیان پڑ کر مرنے والوں کو بھول جاتے ہیں لیکن گاندھی جی کی خدمت کے ناتے مہادیو ڈیسائی کی پبلک خدمات ایسی تھیں جن کی جگہ پر نہیں کی جا سکتی۔"

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

ہفتہ وار

نئی روشنی

دہلی

یکم ستمبر ۱۹۵۹ء

"نئی روشنی" کے قدر دانوں سے

پچھلے پرچے میں "تکلف برطرف" کے عنوان سے ہم نے یہ اطلاع دی تھی کہ شاید مالی دقتوں کی وجہ سے اخبار کو بہت جلد بند کرنا پڑے۔ اس پر دور کے دوستوں کا ردعمل تو ابھی تک معلوم نہیں ہوا مگر قریب کے احباب نے بڑی شد و مد سے اصرار کیا کہ چاہے جو کچھ بھی ہو اخبار کو ضرور جاری رکھا جائے اگرچہ ان کے اصرار سے ہماری مشکلات میں کوئی کمی نہیں ہوئی پھر بھی اس خیال سے ہمت بڑھ گئی کہ کچھ لوگوں کو "نئی روشنی" سے اتنا انس ہو گیا ہے کہ اس کی جدائی کا تصور ان کے لئے تکلیف دہ ہے۔ ان حضرات سے یہ عرض کرنا ہے آپ اطمینان رکھئے ہم ان مشکلوں سے جو ہماری راہ میں حائل ہیں آسانی سے ہار ماننے والے نہیں ہیں اور اپنی پوری قوت سے ان کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ مگر اس مقابلے میں آپ کی مدد کی بھی ضرورت ہے

سب سے بڑھ کر ہم آپ سے قلمی امداد چاہتے ہیں ہماری تجویز یہ ہے کہ اخبار کے ذہنی اور اخلاقی معیار کو نیچا کئے بغیر اسے زیادہ دلچسپ اور عام پسند بنائیں آپ میں سے جو اہل قلم ہیں ان سے یہ درخواست ہے کہ عام علمی اور ادبی مسائل ہندوستان اور دوسرے ملکوں کی سیاست اور معیشت، سماجی زندگی کی تنقید اور اصلاح، سیاسی، ذہنی اور روحانی رہنماؤں کی سیرت اور تعلیم کے بارے مختصر مضامین، سادہ اور سلیس زبان، دل کش اور شگفتہ انداز میں خود لکھ کر یا دوسری زبانوں سے ترجمہ کر کے ہمیں عنایت فرماتے رہیں۔ ترجمے کے سلسلے میں ان حضرات سے جو اردو، ہندی کے علاوہ ہندوستان کی اور زبانیں یا جرمن فرانسیسی، اطالوی وغیرہ جانتے ہیں خاص طور پر گذارش ہے کہ "نئی روشنی" کے پڑھنے والوں کو ان ذہنی خزانوں سے جو ان کی دسترس سے باہر ہیں فائدہ اٹھانے کا موقع دیں، غزلیں، نظمیں اور افسانے بھی شکریے کے ساتھ قبول کئے جائیں گے جن احباب کو مضمون لکھنے کی فرصت نہ ہو وہ مسائل حاضرہ پر خطوط کی شکل میں اظہار رائے کر سکتے ہیں۔

اردو، ہندی اور انگریزی کی نئی مطبوعات میں سے بعض منتخب کتابوں پر مختصر تبصروں کی بڑی ضرورت ہے اس کے علاوہ آپ ہماری دستگیری اس طرح کر سکتے ہیں کہ اپنے حلقہ اثر میں اخبار کی اشاعت بڑھانے کی کوشش کریں۔ کم سے کم ہم کو اپنے شہر یا قصبے کے ان حضرات کے نام اور پتے ضرور بھیج دیجئے جن کے متعلق یہ خیال ہو کہ وہ نئی روشنی کو پسند کریں گے تاکہ انھیں نمونے کے پرچے بھیجے جا سکیں۔

اگر آپ میں سے کسی صاحب کا تعلق کسی صنعتی کارخانے یا تجارتی کاروبار سے ہو تو آپ سے یہ التجا ہے کہ اپنے اخبار کو اشتہار شائع کرنے کے لئے دلوائیے۔ چونکہ کئی بڑی بڑی اور مشہور و معروف کمپنیوں کے اشتہار پہلے ہی "نئی روشنی" میں شائع ہو رہے ہیں اس لئے مزید اشتہاروں کے حاصل کرنے میں غالباً کچھ زیادہ دقت نہیں ہو گی۔

غرض ہم آپ سے ہر قسم کی امکانی مدد کے لئے اپیل کرتے ہیں لیکن یہ واضح کئے دیتے ہیں کہ آپ سے اس طرح مدد کی درخواست کرنا ہمارے لئے بہت تکلیف دہ ہے یہ درخواست مجبوری سے صرف ایک مرتبہ کی جا رہی ہے۔ بار بار دہرائی نہیں جائے گی۔

اس سلسلے میں یہ بھی عرض کرنا ہے کہ اگلے پرچے سے اخبار کے مضامین کی ترتیب کچھ بدل دی جائے گی اور بعض اور ترمیمیں بھی ہوں گی۔ ہندوستانی رہنماؤں کے خیالات کے لئے پہلا صفحہ مخصوص نہیں رہے گا بلکہ اس سلسلے کے مضامین ضرورت اور مناسبت کے لحاظ سے کسی اور جگہ شائع ہوا کریں گے۔ ہم یہ بھی سوچ رہے ہیں کہ اس سلسلے کو صرف بزرگان ہند تک محدود نہ رکھیں بلکہ کبھی دوسرے ملکوں کے عہد قدیم اور عہد جدید کے مشاہیر کے زرین خیالات بھی نقل کیا کریں "ہریجن" کے مضامین کو نقل کرنے کی پابندی اب ہم نہیں رکھیں گے اس لئے کہ اب "قومی آواز" اور دوسرے اخباروں کے ذریعے سے اردو جاننے والوں میں ان مضامین کی اشاعت ہو رہی ہے۔ البتہ جب کبھی ہریجن کے کسی خاص مضمون کی طرف "نئی روشنی" کے پڑھنے والوں کو توجہ دلانے کی ضرورت محسوس ہو گی تو اسے اپنے ہاں دے دیا کریں گے۔ اداریے کے لئے دو کالم کی قید نہیں رہے گی بلکہ حسب ضرورت چھوٹے بڑے مضمون یا شذرات کی صورت میں لکھا جائے گا۔ بزم بے تکلف کے بارے میں بہت سوچ کر یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ مزاحیہ رنگ پیدا کرنے کا خاص اہتمام نہ کیا جائے بلکہ ہلکی پھلکی دلچسپ شگفتہ گفتگو ہوا کرے۔ اب اگر اس میں بے تکلف مزاحیہ رنگ آ جائے تو کیا کہنا۔ واقعات حاضرہ پر تبصرہ تین صفحوں کے بجائے صرف دو کالم کے ایک صفحے پر ہوا کرے گا جس میں ایک کالم سے ہندوستان پر ہوگا، اور دوسرا باری باری سے پاکستان اور باہر کی دنیا پر۔ نظم کے لئے ایک پورا صفحہ وقف نہیں رہے گا بلکہ حسب ضرورت کم و بیش جگہ دی جائے گی۔ اس طرح جو صفحات خالی ہوں گے ان میں کئی مختصر اور دلچسپ مضمون دئے جائیں گے۔ غرض ہم اپنی سی کوشش کریں گے کہ عامیانہ یا سوقیانہ

بزم بے تکلف

غضب خدا کا بھلا اس دھاندلی کا کچھ ٹھکانا ہے"
"کیسی دھاندلی، کس کی دھاندلی، کچھ بتائیے تو سہی شیخ جی؟"

شیخ جی۔ تمہارے نئی روشنی والوں کی اور کس کی بڑی مشکل سے تو تھوڑا ردو اس اخبار میں کٹا تمہارا کب اخبار آئے اور بزم بے تکلف میں سر دھرتے اور انھوں نے "تکلف برطرف" لکھ مارا سارا مزا کرکرا ہو گیا۔"

ہم۔ تو پھر اس کا کچھ تدارک کیجئے نا شیخ جی۔ یہ تو بڑی بری بات ہے۔

شیخ جی۔ تدارک کیا کروں دلی دور ہے، بس دل میں گھٹ کر رہ جاتا ہوں۔

ہم۔ ہم بتائیں، آپ اس معاملے کو سیکورٹی کونسل میں پیش کر دیجئے۔

شیخ جی۔ کون وہ اقوام مختلفہ والی حفاظتی کونسل؟ سبحان اللہ کیا بات کہی ہے روز تو وہاں چودھری ظفر اللہ خاں پیش آیا کرتے ہیں۔ بھلا ہماری پیشی کی کیا نوبت آئے گی اور جو آئی بھی تو سوا اس کے کہ بس دو پیش میں پڑ کر رہ جائیں نتیجہ کیا ہوگا؟

ہم۔ سچ ہے۔ ع
پیش آتی ہے وہی جو کچھ کہ پیشانی میں ہے
مگر یہ بتائیے کہ آپ نے "تکلف برطرف" کا صرف عنوان ہی پڑھا یا مضمون بھی ملاحظہ فرمایا۔

شیخ جی۔ مضمون کیا پڑھتا اس بد عنوانی کو دیکھ کر جی جل گیا اور میں نے پرچہ اٹھا کر طاق پر رکھ دیا۔ سوچا کہ جب عنوان یہ ہے تو مضمون بھی واہیات ہوگا۔

ہم۔ آپ آگے پڑھتے تو معلوم ہوتا ع نئی روشنی کا ہوا تیل کم۔
چراغ جھلملا رہا ہے ہوا تیز ہے۔ ڈر ہے کہیں بجھ نہ جائے۔

شیخ جی۔ خدا نہ کرے، ایسی کم ہمتی کی باتیں نہیں کیا کرتے۔ یہ مشکل بھی کوئی مشکل ہے بس تھوڑا سا حوصلہ چاہیے۔ اور تھوڑا سا استقلال۔

ہم۔ اور تھوڑا سا روغن۔ مگر شیخ جی جب آپ اس اخبار کے لئے رسیا ہیں تو پھر کچھ مدد کیجئے نا۔

شیخ جی۔ ضرور ضرور، ع سخنے قدمے، قدمے سخنے طرح حاضر ہوں۔

ہم۔ کیا کہنا ہے، دامے، درمے کو کس صفائی سے کھا گئے۔ آپ کی سخن سازی اور قدم بازی میں جو شبہ کرے وہ کافر مگر کچھ تیل کی بات چیت بھی تو کیجئے۔

شیخ جی۔ ارے بھائی تم جان بوجھ کر ایسی باتیں کرتے ہو۔ دیکھتے نہیں ہن کی کھیتی ماری گئی۔ تیل کس کے گھر سے لاؤں؟

ہم۔ تو یوں کہئے نا کہ ان تلوں تیل ہی نہیں تو پھر "نئی روشنی" کو صبر کر لیا جائے؟

شیخ جی۔ میاں صاحب ذرا سے ابھی تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو نئی روشنی کا گل ہونا کچھ ہنسی کھیل ہے ملا نخواستہ جو کہیں بزم بے تکلف کا چراغ بجھ جائے تو
ع۔ محفل۔ اہل بصیرت میں نہ اندھیرا ہو جائے۔

پچھلا ہفتہ :-

۱۔ ہندوستان

بات بنتے بنتے بگڑ گئی

جب سے کشمیر کمیشن کو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان یہ جھگڑا چکانے میں کامیابی ہوئی کہ یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو التوائے جنگ کے وقت دونوں فوجوں کے درمیان کون سے خطوط حد فاصل تھے، اس وقت سے کمیشن کے اور عام طور پر سب صلح پسندوں کے حوصلے بڑھ گئے تھے اور یہ اُمید قوی ہو گئی تھی کہ بہت جلد عارضی صلح کی شرطیں طے ہو جائیں گی۔ اس طرح دائمی صلح کے لئے زمین ہموار ہو جائے گی برابر خبریں آ رہی تھیں کہ کمیشن کے ممبر اور ہندو پاکستان کے نمائندے نئی دہلی میں جمع ہو کر ایک گول میز کانفرنس منعقد کرنے والے ہیں۔ کانفرنس کا ایجنڈا دونوں حکومتوں کے علم میں آ چکا ہے، اور انھوں نے منظور کر لیا ہے فضا بہت خوش گوار اور ساز گار ہے کمیشن کے ممبروں کو یقین ہے کہ کوئی معقول تصفیہ ہو جائے گا۔ امریکا میں ایڈمرل چیسٹر نمٹز تنے کے لئے پا بہ رکاب بیٹھے ہیں تاکہ رائے شماری کی تیاریاں کریں۔ آخر کانفرنس کے شروع ہونے کی تاریخ بھی قطعی طور پر ۲۲ اگست مقرر ہو گئی۔ دونوں طرف کے ڈیلی گیٹوں کے نام غیر سرکاری طور پر اخباروں میں آ گئے۔ نئی دہلی میں اجلاس کے سب انتظامات مکمل ہو گئے یکایک صفحۂ اخبار پر کیا ظاہر ہوتا ہے کہ کانفرنس کا خیال ترک کر دیا گیا اور اس کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ ایجنڈا کے بارے میں دونوں حکومتوں میں اتفاق رائے نہیں ہو سکا۔

اس ٹائیں ٹائیں فش کے معنے پر غور کرتے ہیں تو اس کے سوا کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یا تو فضا خوش گوار ہونے کی محض مصلحت کی بنا پر ہوا باندھی جا رہی تھی یا پھر دفعتہً کوئی ایسا واقعہ ہوا جس سے بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ زیادہ قرین قیاس دوسری صورت معلوم ہوتی ہے۔ پاکستان کی بیرونی پالیسی آج کل برسات کے موسم کی طرح نت نیا رنگ بدلتی رہتی ہے۔ آج یہ بتانا کہ کل اس کا رنگ کیا ہوگا خود کراچی کے محکمہ خارجہ کے امکان سے باہر ہے۔ بظاہر حکومت پاکستان آج کل اقوام متحدہ سے اور خصوصاً انگلستان اور امریکہ سے بہت ناراض ہے اور اس ناراضگی کے اظہار کی ایسی صورتیں تلاش کرتی رہتی ہے جس سے یہ دونوں ملک متاثر ہوں مگر یہ نہ ہو کہ وہ پاکستان سے ناراض ہو جائیں شاید گول میز کانفرنس کے بارے میں اس کی موجودہ پالیسی بھی خفگی کے اظہار کا ایک طریقہ ہے۔ بہر حال ابھی یہ دیکھنا ہے کہ کشمیر کمیشن اس گتھی کو سلجھانے کی کون سی نئی تدبیر اختیار کرتا ہے۔

آر۔ ایس۔ ایس کا نیا ٹھاٹھ

شری گوالکر قید سے رہا ہونے کے بعد پہلی بار دہلی آئے ہیں اور ان کے پیرو دلوں کی طرف سے ان کا شاندار استقبال ہو رہا ہے۔ ابھی تک وہ اپنی تقریروں میں سیاسی بحثوں سے پرہیز کر رہے ہیں اور "ہندو قوم" کی اصلاح و تنظیم اور تعمیر سیرت پر زور دے رہے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ زیادہ غلط پیدا کرنے کی مہم حکومت کا ہاتھ بٹانے کو تیار ہیں۔ مبصروں کا اندازہ ہے کہ در اصل وہ آئندہ انتخابات میں آر۔ ایس۔ ایس کو جداگانہ سیاسی حیثیت سے کھڑا کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے زمین تیار کر رہے ہیں۔ ابھی وہ ہندوستان کا دورہ کر کے یہ پتہ چلانا چاہتے ہیں کہ جمہور کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے آج کل کون سا نعرہ سب سے زیادہ کام دے گا۔ شاید مسلمانوں کی طرف انھیں اب زیادہ توجہ نہیں رہی، کچھ تو اس وجہ سے کہ مسلمان اب صید زبوں کی حیثیت رکھتے ہیں، اور کچھ اس لئے کہ اب ایک اور حریف پیدا ہو گیا ہے جو ان کے طبقے کے مفاد کے لئے مسلمانوں سے کہیں زیادہ خطرناک ہے یعنی کمیونسٹ۔ یہ خبر بہت گرم ہے کہ انھوں نے حکومت کے ساتھ مل کر کمیونسٹوں کو کچلنے کی پیش کش کی ہے۔ یہ تو کچھ ایسی دور از قیاس بات نہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حکومت نے اس پیش کش کو منظور کر لیا ہے۔ یہ افواہ کتنی ہی بے بنیاد کیوں نہ ہو لیکن آر۔ ایس۔ ایس اور کمیونسٹ پارٹی دونوں کا اس جھگڑے میں فائدہ ہی اس لئے کہ اس کی وجہ سے دونوں کی مقبولیت اپنے اپنے حلقے میں بڑھ سکتی ہے۔

اتحادِ مشرق کی ایک نئی کڑی

۱۹۴۷ء میں جبکہ ہندوستان آزاد قوموں کی صف میں قدم رکھنے والا تھا اس نے مشرقی ملکوں میں اتحاد اور یک جہتی پیدا کرنے کی کوشش بڑی سرگرمی سے شروع کر دی تھی ایشیائی کانفرنس کا اجلاس جو فروری ۱۹۴۷ء میں نئی دہلی میں ہوا دنیا کی تاریخ میں سب سے پہلا موقع تھا جب تقریباً کل مشرقی ملکوں کے نمائندے اتحادِ مشرق کے تصور کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اکٹھے ہوئے۔ لیکن اس کانفرنس میں زیادہ تر تجارتی صنعتی اور عام طور پر اقتصادی معاملات میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کے مسئلہ پر بحث ہوئی تھی۔ علم و تعلیم، تہذیب و تمدن کے میدان میں مل جل کر کام کرنے اور آپس میں ربط و ضبط بڑھانے کے مسئلے پر کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی۔ اب اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ہندوستان کے اہل علم نے مولانا آزاد کی سرکردگی میں عملی قدم اٹھایا ہے۔ ۲۱ اگست کے مولانا کی دعوت پر سو سے زیادہ حضرات جن میں ایشیائی ملکوں کے سفیروں کے علاوہ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی، ڈاکٹر پٹابھی ستیا رمیہ، دہلی یونیورسٹی، جمعیۃ العلماء اور جامعہ ملیہ کے نمائندے اور دوسرے ارباب فضل شامل تھے۔ کونسل آف اسٹیٹ کے ہال میں جمع ہوئے تاکہ انڈین کونسل آف کلچرل کوآپریشن (تہذیبی تعاون کی ہندوستانی مجلس) کے نام سے ایک انجمن کی بنا ڈالیں۔ مولانا آزاد نے اپنے خطبے میں انجمن کے مقاصد کا ایک خاکہ پیش کیا۔ مصر، ایران، سریا، انڈونیشیا اور چین کے سفیروں اور ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی اور ڈاکٹر پٹابھی ستیا رمیہ نے ان مقاصد کی حمایت میں تقریریں کیں اور ان کو حاصل کرنے کی تدبیریں بتائیں آخر میں خواجہ عبد المجید صاحب اور ہمایوں کبیر صاحب نے دو رزولیوشن پیش کئے جو بہ اتفاق رائے منظور کئے گئے، ان کی رو سے انجمن کے قیام کا فیصلہ کیا گیا اور اس کے دستور مرتب کرنے کے لئے پندرہ اصحاب کی ایک سب کمیٹی مقرر کی گئی جو وسط اکتوبر تک اپنی رپورٹ تیار کر لے گی۔ آخر اکتوبر میں ایک اور کانفرنس ہوگی جس میں یہ دستور منظور کیا جائے گا اور نومبر میں اس کے ماتحت قائم کی ہوئی انجمن کا پہلا جلسہ منعقد ہوگا۔ ہمیں امید ہے کہ یہ انجمن مشرقی ملکوں میں ذہنی اور روحانی اتحاد پیدا کرنے میں کامیاب ہوگی جس کے بغیر سیاسی اور اقتصادی اتحاد محض ایک بے جان پیکر ثابت ہوگا۔

قرعۂ فال.......

پناہ گزینوں کو جو مصیبتیں ہندوستان اور پاکستان میں اٹھانی پڑ رہی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ جو لوگ ابھی تک کیمپوں میں رہتے ہیں ان کے بچوں کی تعلیم کا کافی اور معقول انتظام نہیں۔

ہندوستان کی حکومت ایک مدت سے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور وزارت تعلیم اور وزارت بحالی میں خط و کتابت اور ردّ و قدح ہو رہی تھی لیکن اس کا کوئی عملی نتیجہ نہیں نکلا تھا آخرکار اب وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے یہ تجویز سوچی کہ شرنارتھی بچوں کی تعلیم کا کام ہندوستانی تعلیمی سنگھ اور جامعہ ملیہ کے سپرد کر دیا جائے۔ چنانچہ ایک کانفرنس ہوئی جس میں وزارتوں کے تعلیمی سنگھ اور جامعہ ملیہ کے نمائندے شریک تھے اور اس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ شرنارتھی بچوں کو بنیادی تعلیم کے اصولوں پر پڑھایا جائے اور ان کی تعلیم کا سارا انتظام تعلیمی سنگھ اور جامعہ ملیہ کی مدد سے انجام دے۔ تعلیمی سنگھ نے ستمبر میں بنیادی تعلیم کے کارکنوں کی ایک کانفرنس بلائی ہے تاکہ سارے ہندوستان کے شرنارتھی بچوں کی پڑھائی کے لئے ایک جامع اسکیم بنائی جائے، اور اسی کے ساتھ یہ طے کیا ہے کہ تجربے کے طور پر راجپورہ کیمپ کی تعلیم کا کام شری منی اشا دیوی سکریٹری تعلیمی سنگھ کی نگرانی میں اور فرید آباد کیمپ کی تعلیم کا انتظام شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی ناظم تعلیم و ترقی (جامعہ ملیہ) کی نگرانی میں جلد سے جلد شروع کر دیا جائے۔

ان دونوں تعلیمی اداروں کے لئے یہ بڑے امتحان کا وقت ہے اگر یہ شرنارتھی بچوں کی تعلیم کے مسئلے کو جس نے دو برس سے حکومت کو پریشان کر رکھا ہے حل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو پھر اُمید پیدا ہو جائے گی کہ ہندوستان کی عام ابتدائی تعلیم کا ہفت خواں بھی جو آج ناقابل تسخیر معلوم ہوتا ہے ایک نہ ایک دن سر ہو جائے گا۔

(ع، ح)

۳- باہر کی دنیا

جرمن قومیت زندہ ہو رہی ہے

مغربی جرمن ریپبلک کے ایوانِ زیریں کے حالیہ انتخاب سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی ہے کہ جرمن قوم میں ہٹلر نے قومی برتری کا جو احساس پیدا کیا تھا وہ اب بھی اس کے دل و دماغ میں اسی طرح جاگزیں ہے۔ جمہوری قومیں ہٹلر کی شکست سے اب تک برابر جرمن قوم کو یہ باور کرانے کی پوری کوشش کر رہی ہیں کہ شکست اور موجودہ مصیبت کی تمام تر ذمہ داری ہٹلر پر ہے۔ مگر انھیں اپنی اس کوشش میں ذرا بھی کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ انتخابی تقریروں میں نہ صرف یہ کہ اتحادیوں نے جرمن قوم پر جو لاکھوں اور کروڑوں روپے صرف کئے ہیں ان کا ذکر نہیں کیا گیا، بلکہ تمام پارٹیوں نے انھیں برا بھلا کہا اور موجودہ بڑھتی ہوئی بے کاری کا انھیں ذمہ دار ٹھہرایا۔

اس انتخاب سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ مغربی جرمنی میں کمیونسٹ پارٹی کا تھوڑا بہت جو اثر تھا وہ روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے پچھلے صوبجاتی الکشن میں اسے ہر دس ووٹ میں سے ایک ووٹ ملا تھا۔ مگر اس مرتبہ ہر انیس ووٹ میں سے ایک ووٹ ملا اور کل ۱۹ نشستیں ملی ہیں۔

اس انتخاب میں سب سے زیادہ ووٹ کرسچین ڈیموکریٹس کو ملے ہیں جو آزاد تجارت کے حامی ہیں اور سماجی سیاسی اور معاشی مسائل کو مسیحی تعلیمات کی روشنی میں حل کرنے پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ اس کے بعد دوسری بڑی پارٹی سوشل ڈیموکریٹس کی ہے۔ پہلی پارٹی کو ۴۰۲ نشستوں میں سے ۱۳۹ ملی ہیں اور دوسری کو ۱۳۱۔

ان کے علاوہ دوسری اہم پارٹیوں کی پوزیشن حسب ذیل ہے

فری ڈیموکریٹس (لبرل)	۵۲ نشستیں
بویرین پارٹی	۱۷ "
سینٹر پارٹی	۱۰ "
اکنامک ری کانسٹرکشن پارٹی	۱۲ نشستیں
جرمن پارٹی	۱۷ "
جرمن رائٹ پارٹی	۵
ساؤتھ شلیسوگ ایسوسی ایشن	۱ نشست
آزاد	۳ نشستیں

سیاسی حلقوں کا خیال ہے کہ کرسچین ڈیموکریٹس اور فری ڈیموکریٹس، داہنے بازو کی کسی ایک اور پارٹی کو ملا کر حکومت بنائیں گے اور کرسچین ڈیموکریٹس کے لیڈر ڈاکٹر ایڈینائر جنھیں برطانوی فوجی حکومت نے ۱۹۴۵ء میں سیاست میں حصہ لینے سے روک دیا تھا، مغربی جرمن ریپبلک کے پہلے چانسلر مقرر ہوں گے۔

یورپ کی کونسل

یورپ کا اتحاد بہت پرانا خواب ہے جسے بارہا عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی۔ مگر صحیح معنی میں کبھی بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ کمیونزم کے سیلاب کو روکنے کے لئے یورپ کے اتحاد کی طرف پھر توجہ کی گئی ہے۔ چنانچہ یورپ کی کونسل قائم کی گئی ہے جس کے آج کل یورپ کے وسط میں رائن کے ایک قدیم شہر اسٹراس برگ میں اجلاس ہو رہے ہیں۔ اس اسمبلی کے دو ایوان ہیں ایک ایوان اعلیٰ جسے وزیروں کی کمیٹی کہا جاتا ہے۔ اور جو ممبر ملکوں کی حکومتوں کے نمایندوں پر مشتمل ہوگا۔ دوسرے ایوان زیریں جسے مشاورتی اسمبلی کہتے ہیں اور جس میں ممبر ملکوں کی سیاسی پارٹیوں کے نمایندے شریک ہوں گے۔

اسمبلی میں اس وقت دس ملک شریک ہیں۔ برطانیہ، فرانس، اٹلی، بلجیم، ہالینڈ، سویڈن، ڈنمارک، آئرلینڈ، ناروے اور لکسمبرگ۔ ترکی کو ابھی حال میں اس کا ممبر چنا گیا ہے اور مغربی جرمنی پرتگال، آسٹریلیا، آئس لینڈ اور یونان کے داخلے ابھی زیر غور ہیں

یورپ کے اتحاد کی یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوگی۔ اس کے متعلق فی الحال کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ لیکن حالات بہرحال سازگار نہیں ہیں۔ یہ یقین ہے کہ مشرقی یورپ اس میں شریک نہیں ہوگا ایسی صورت میں اس کونسل سے زیادہ سے زیادہ جو فائدہ نکل سکتا ہے، تو وہ یہ کہ کمیونسٹوں کے خلاف ایک مضبوط جتھا قائم ہو جائے گا جس طرح کمیونسٹ اثرات کی روک تھام کے لئے اور لڑائی کی صورت میں روس کے خلاف موثر کارروائی کرنے کے لئے بعض علاقہ وار جماعتیں بنائی گئی ہیں۔ مثلاً ایٹلانٹک پیکٹ اور بحر الکاہل کی یونین وغیرہ، اسی طرح یہ کونسل بھی کمیونسٹوں اور روس کے خلاف مغربی یورپ کے لئے ایک مؤثر بلاک کا کام دے گی اور غالباً اس کے قائم کرنے والوں کا اس سے زیادہ کوئی اور مقصد نہیں ہے۔

شام کا انقلاب

شام میں ابھی چند روز ہوئے جو انقلاب ہوا ہے اس میں قومی اور بین اقوامی دونوں سیاستیں کام کر رہی تھیں۔ کرنل حسنی زعیم جب برسر اقتدار آئے تو انھوں نے حالات کا اندازہ کئے بغیر ایک ساتھ بہت سی اصلاحات کرنی چاہیں۔ مثلاً سرمایہ داری پر بھاری ٹیکس عاید کئے۔ بڑے بڑے زمینداروں پر پابندیاں لگائیں اور سماجی اصلاحات خاص طور پر عورتوں کی آزادی کے لئے سخت قوانین بنائے اور ان اصلاحات کے نفاذ میں قوم کا مزاج دیکھے بغیر انتہائی سختی سے کام لیا چنانچہ وہ اپنی انھی خصوصیات کی وجہ سے "شامی اتاترک" مشہور تھے۔ اس کے علاوہ فوج میں بھی اس سخت گیر پالسی پر عمل کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام اور فوج دونوں ان کے خلاف ہوگئے اس عام بیزاری سے فائدہ اٹھا کر ایک فوجی افسر نے کرنل زعیم اور وزیر اعظم کو گرفتار کر کے موت کی سزا دلا دی۔

بعض سیاسی حلقوں کا خیال ہے کہ اس انقلاب میں برطانیہ کا بھی ہاتھ ہے۔ کرنل زعیم کی خارجی پالسی برطانیہ کے مفاد سے ٹکراتی تھی۔ اس لئے اس حکومت کو ختم کرنا مشرقِ وسطیٰ کی آیندہ اسکیم کو کامیاب بنانے کے لئے وہ ضروری سمجھتا تھا۔ اس کے علاوہ عراق اور شرق اردن کے حکمران بھی کرنل زعیم کی حکومت سے مطمئن نہیں تھے اور ان کے ارادوں کو شک اور خوف کی نگاہ سے دیکھتے تھے غرض اندرونی اور بیرونی بہت سے م

م سیاسی اسباب اس انقلاب کے محرک ہوئے اور دیکھتے دیکھتے کرنل زعیم کی چار ماہ کی آمریت ختم ہوگئی

(ع۔ل)

ہندوستان کی صحت نامہ

(بسلسلہ صفحہ ۱)

مارتا ہے اور آخرکار اُسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ حال سے اپنا کام بے حد دلچسپ اور خوشگوار معلوم ہوتا ہے، اور مختلف مسائل کی چھان بین نیز انھیں حاصل کرنے کے لئے صحیح قدم اٹھانے میں بڑی مسرت ہوتی ہے۔

مہاتما جی کی ساری زندگی نوع انسانی کی خدمت کے لئے وقف رہی جب انھیں اس معمے کی حقیقت و صداقت کا احساس ہوا کہ انسان کی زندگی کا مقصد محض خود فروشی پر نہیں ہے وہ پورے انہماک سے بنی نوع انسان کی خدمت میں مشغول ہو گئے۔ پھر چونکہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ جب تک سماج کی بنیادیں سچائی اور عدم تشدد پر استوار نہ کی جائیں زندگی کا قیام ناممکن ہے۔ اس لئے ان کی زندگی کا واحد مقصد یہ بن گیا کہ ہر قسم اور نوعیت کے تشدد سے جنگ کی جائے اور اپنے گردوپیش سے باطل کی تاریکی کو یکسر مٹا دیا جائے، ہم میں سے جن لوگوں کا اس نسل سے تعلق ہے جسے مہاتما جی کے چرنوں میں علم و آگہی حاصل کرنے کا خداداد موقع ملا، ان کے لئے اعلیٰ عہدے سے حاصل ہونے والے رتبہ منزلت اور اختیارات کا مطلب صرف یہ ہے کہ ان کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں اور انھیں اپنے فرائض بیش از بیش تندہی اور خلوص سے انجام دینے چاہئیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ احساس عمر بھر میرا ساتھ دے گا۔ یکایک آزادی حاصل کر لینا بہت بڑی بات ہے لیکن اس سے بھی بڑی چیز یہ ہے کہ ہم اس آزادی کے ابتدائی سالوں میں پوری تندہی اور خلوص نیت سے کام کریں۔ تاکہ ہندوستان کو ایک ایسا ملک بنا سکیں جو مہاتما جی کے محبوب اصولوں پر عمل کرتے ہوئے اس پریشان حال دنیا کو امن کی شاہراہ پر گامزن کر دے۔

آج کی رات

شمیم کرہانی

(۲۲ جولائی ۱۹۵۹ء کو آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے عید کے موقع پر نشر ہوئی)

آج تاریک فضاؤں میں چراغاں کر دو!

دور ہوتا نہیں احساس کے ماتھے سے غبار
زیست کے رخ پہ ریاضت کا دھواں ہے کب سے
پاس آتی نہیں مستوں کی گلابی منزل
قافلہ زہد کی وادی میں رواں ہے کب سے
زندگی، نقطۂ تاریک ہے، وقدی کے سبب
ایسی اک راہ میں عمر گزراں ہے کب سے

راہ کی گرد کو اب غازہ و افشاں کر دو

آج تاریک فضاؤں میں چراغاں کر دو

زندگی وقت کی ظلمت سے ہم آغوش سہی
ہے فضاؤں میں تبسم کا اثر آج کی رات
نور کا جال اندھیرے میں بچھے جاتا ہے
ابر کی تہہ سے ابھرتا ہوا فانوس حیات
غم کے پھیلے ہوئے سایے کو سرکنا ہوگا
چاند نکلا ہے لئے ساتھ میں تاروں کی برات

غمِ دوراں کو نثارِ رہِ جاناں کر دو

آج تاریک فضاؤں میں چراغاں کر دو

کس قدر بیش بہا ہے وہ خوشی کا لمحہ
بچ گیا ہے جو زمانے کے غم پیہم سے
اک کرن کا بھی مٹھی میں جو کر لی ہے اسیر
ہوتی جاتی ہے وہ ہر آن گریزاں ہم سے
دل میں سہمے ہوئے احساسِ مسرت کو لئے
سوئے ساقی نگراں، رند ہیں چشم نم سے

ساتھیو! مشعلِ مینا کو فروزاں کر دو

آج تاریک فضاؤں میں چراغاں کر دو

نغمۂ آزاد

سیدہ فرحت

حسن کے ذوق سے عاری نہیں فطرت میری
ہر حسیں چیز کو حاصل ہے محبت میری
شعر و نغمہ سے ہے مانوس طبیعت میری
بزم تخئیل کو اکثر ہے سجایا میں نے
لطف رنگین و حسیں خوابوں میں پایا میں نے

جاگ اٹھے ہیں مگر اب مرے ادراک و شعور
اب نہیں میری نگاہوں سے حقیقت مستور
قلب ہستی میں جو رستے ہیں ہزاروں ناسور
دیکھ کر ان کو پلٹ آئے نظر نا ممکن
ہو غم و درد کا دل پر نہ اثر نا ممکن

گیت کی لے میں کراہوں کو دباؤں کیسے
خوش نما پردوں میں زخموں کو چھپاؤں کیسے
بزم ماتم میں بھلا جشن مناؤں کیسے
موسم گل نہیں کہہ سکتا خزاں کو کوئی
روک سکتا نہیں بلبل کی فغاں کو کوئی

پیٹ کی آگ جھلستی ہے غریبوں کے بدن
آتشِ ظلم کی ہوں نذر ہزاروں خرمن
تابشِ حسن ہو لیکن مرا موضوعِ سخن
میرا احساس نہ دے گا یہ اجازت ہرگز
کر سکے گی نہ یہ منظور طبیعت ہرگز

شاعرہ ہوں مرا دل درد سے محروم نہیں
رگِ احساس مرے قلب سے معدوم نہیں
فکر آزاد ہے فطرت مری محکوم نہیں
آنکھ جو دیکھے گی آئے گا زباں پر وہ ضرور
اپنے جذبات کی توہین نہ ہوگی منظور

بند کر سکتا نہیں کوئی بھی شاعر کی زباں
کیسے ممکن ہے لگے آگ اور اٹھے نہ دھواں
چور زخموں سے ہو دل اور لہو ہو نہ رواں
گلۂ جور نہ ہو شکوۂ بیداد نہ ہو
آنکھ نم ناک نہ ہو لب پہ بھی فریاد نہ ہو

چوس لیں خون غریبوں کا یہ دولت والے
پیس دیں چٹکی سے کمزور کو طاقت والے
ظلم کرتے رہیں جنتا پہ حکومت والے
قلبِ شاعر ہو فگار اور وہ خاموش رہے
اپنے خوابوں کی حسیں وادی میں روپوش رہے

ساتھیو! نغمۂ آزاد سنانے اٹھو
انقلابات کے طوفان اٹھانے اٹھو
زور سرمایہ پرستی کا گھٹانے اٹھو
ہو کے بے خوف سناؤ وہ دہکتے نغمے
جن سے لو دینے لگیں سرد دلوں میں شعلے

اب ہر انسان کو دکھ درد سے آزاد کرو
آج تک جو رہے ناشاد انھیں شاد کرو
نئے انداز سے دنیا نئی آباد کرو
کر دو ہر سمت مساوات کا اونچا پرچم
سر نہ انسان کا انساں کے آگے ہو خم

چند پھولوں ہی پہ موقوف نہ ہو شانِ بہار
بات تو جب ہے خس و خار پہ آ جائے نکھار
کہیں باقی نہ رہیں دورِ خزاں کے آثار
فرض ہے پہلے تو تزئینِ گلستاں کرنا
بلبلِ فکر کو پھر اپنی غزل خواں کرنا

ہندو مسلم تعلقات

انیسویں صدی اور اُس کے بعد

ڈاکٹر سید محمود

ترجمہ: مشتاق احمد

(۳)

مسٹر ماریسن مسٹر بیک کے قائم مقام مقرر ہوئے اور انھوں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ مسلمانوں کو ہر قسم کی سیاسی تحریک سے الگ رکھا۔ انھی کے تقرر کے زمانے میں لارڈ کرزن کے اشارے سے اس کی کوشش کی گئی کہ مسلمانوں کی توجہ کو ہندوستان سے ہٹا کر کسی اور طرف منتقل کرا دیا جائے۔ دوسرے ممالک مثلاً ایران وغیرہ میں گروہ روانہ کئے گئے تاکہ وہاں کے دولت مند نوجوانوں کو ورغلا کر علی گڑھ لانے پر آمادہ کریں۔

اس کے بعد مسٹر آرچی بالڈ پرنسپل مقرر ہوئے انھوں نے بھی اپنی ملازمت کے دوران (۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۹ء) میں مسلمانوں کی سیاست میں نہایت اہم حصہ لیا۔ جس وقت وہ علی گڑھ تشریف لائے ملک میں لارڈ کرزن کے خلاف سخت بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے حکومت اعتدال پسندوں اور جی حضوریوں کو اپنے گرد اکٹھا کر رہی تھی۔ اس سلسلے میں پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ کونسل میں توسیع کی جو تجویز تھی اُسے عملی جامہ پہنایا گیا۔ حکومت ہند اور مسلمان لیڈروں کے درمیان مسٹر آرچی بالڈ واسطہ بنے۔ وہ شملہ میں وائسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری سے ملے اور ان سے طے کیا کہ مسلمانوں کا ایک ڈیپوٹیشن وائسرائے بہادر سے ملے۔ انھیں ایک ایڈریس پیش کرے اور اس میں یہ درخواست کرے کہ نئے آئین میں مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق دیا جائے۔ اس ڈیپوٹیشن کی تفصیل اور اس کے نتائج جو سر آغا خاں کی رہنمائی میں گیا تھا سب کو معلوم ہیں۔ اس لئے یہاں دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ مسٹر ڈی۔ ڈسول کے الفاظ میں صرف یہ کہنا کافی ہوگا کہ "بالآخر فرقہ پرستوں کی جیت ہوئی اور ... زمینداروں، تاجروں اور مسلمانوں کو خاص نمایندگی کا حق دیا گیا اور ... بنیاد باندھی گئی کہ یہ اقدام "پیشہ ور شورش پسندوں" کا توڑ ثابت ہوگا۔" لیڈی منٹو نے اپنے شوہر کی سوانح عمری میں جداگانہ نمایندگی کی تجویز کے متعلق ہندوستان کے افسروں کے احساسات کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں "جس شام کو لارڈ منٹو مسلم لیگ سے خطاب کرنے والے تھے اسی شام کو انھیں ایک افسر کا خط ملا، اس میں لکھا تھا کہ میں حضور والا سے یہ گذارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ آج ایک بہت ہی اہم واقعہ ہوا ہے۔ راج نیتی کی یہ ایک ایسی چال ہے جس کا اثر ہندوستان اور اس کی تاریخ پر برسہا برس تک پڑے گا۔ اس اقدام کا یہ اثر ہوگا کہ ۶ کروڑ ۲۰ لاکھ انسانوں کا گروہ (مسلمان) باغیوں کی جماعت سے (کانگریس) یک سر الگ ہو جائے گا۔"

اس سلسلے میں اگر ایک ذاتی واقعہ کا ذکر کر دوں تو نامناسب نہ ہوگا۔ جس وقت بمبئی میں نواب محسن الملک مرحوم اس ڈیپوٹیشن کا انتظام کر رہے تھے میں علی گڑھ میں پڑھتا تھا۔ میں ماریسن ہوسٹل میں نواب صاحب کے ہی ساتھ رہتا تھا اور وقتی طور پر ان کے ایک سکریٹری کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ تمام خط و کتابت میرے ہی ذریعے ہوتی تھی۔ میں ... صاحب سے اکثر احتجاج کرتا رہتا تھا کہ اس پالیسی کا اثر ملک پر اور آخرکار خود مسلمانوں کے حق میں مہلک ثابت ہوگا۔ نواب صاحب کبھی تو مجھے جھڑک دیتے اور کہتے اپنے کام سے کام رکھو، اور کبھی مجھ کو اپنے ساتھ سیر کو لے جاتے۔ اس وقت مسلمانوں کی خستہ حالت کا نقشہ کھینچتے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ میں کسی طرح ہار نہیں مانتا تو ایک روز طیش میں آکر کہنے لگے چونکہ میرے ایک ہی بھتیجا ہے اس لئے تم مجھے کمزور سمجھتے ہو لیکن تم یہ بھول جاتے ہو کہ اگر میں برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کا جھنڈا اونچا کروں تو مسلمان میرا ساتھ نہیں دیں گے، تم یہ بھی بھول جاتے ہو کہ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی حالت بہت خراب ہو گئی ہے اور وہ ہر طرف سے مصیبتوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ جب ان کی حالت اچھی ہو جائے گی۔ اس وقت بغاوت کرنا مناسب رہے گا، لیکن فی الحال حالات اس کی اجازت نہیں دیتے۔"

... فرقہ پرستی کا بیج بویا جا چکا تھا ... کی جڑیں پھیل رہی تھیں۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم ہوئی اور اس کے ... ذیل تین مقاصد قرار پائے:۔

(۱) مسلمانوں میں برطانوی حکومت کے لئے وفاداری کے جذبات پیدا کرنا۔ اور حکومت کے خلاف غلط فہمیوں کو دور کرنا۔

(۲) مسلمانوں کے سیاسی حقوق اور مفاد کی نگرانی کرنا اور ان کی ضروریات کی طرف حکومت کو دھیان دلانا۔

(۳) لیگ کے مقاصد کو نقصان پہنچائے بغیر ایسے خلافانہ تعلقات کو پیدا ہونے نہ دینا جو دوسرے فرقوں کے لئے نقصان کا باعث ہوں۔

اسی سال ہندو مہاسبھا بھی لاہور میں قائم ہوئی، اور اس نے بھی فرقہ پرستی کو اپنا مطمح نظر قرار دیا۔ یعنی یہ کہ ہندوؤں کے مفاد اور حقوق کی نگرانی کرنا۔ مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا دونوں کا ساتھ ساتھ جنم قابل غور ہے۔

مسلمانوں کی پالیسی کا سارا دارومدار ۱۹۱۱ء تک کی زبوں حالی اور مجبوریوں کی بنیاد پر تھا۔ ان کے دلوں میں پہلا ڈر تو یہ تھا کہ حکومت کی نظریں دوبارہ نہ پھر جائیں اور جو ساسامان انھیں ملے ہیں وہ جاتی رہیں۔ دوسرا ڈر جس کے بیج شروع سے ان کے دلوں میں بوئے گئے تھے یہ تھا کہ ہندو چونکہ سیاست کے میدان میں ان سے آگے ہیں اس لئے انھیں ہڑپ کر جائیں گے۔ اس ڈر کی آبیاری انگریزوں نے جتنی سوچ سمجھ کر کی، ہندوؤں نے بھی بغیر سوچے سمجھے اس سے کچھ کم نہیں کی۔

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کس طرح اس صدی کے شروع ہی میں سرکاری ملازمتوں کی خواہش اور ایک دوسرے سے ڈرنے، جوان کے دل و دماغ میں سمو دیا گیا تھا، دونوں فرقوں کے درمیان اختلاف کی ایک وسیع خلیج حائل کر دی۔ لیکن ان چالوں کا اثر تمام مسلمانوں پر نہیں پڑا تھا۔ اس کا ثبوت اکبر کے ان اشعار سے ملتا ہے جو انھوں نے اسی زمانے میں کہے تھے:۔

کٹی رگ اتحادِ ملت وہاں ہوئے خونِ دل کی موجیں
وہ سمجھے ... اس کو آبِ صافی نہار ہے ہیں کھڑے ہیں
قفس ہے کم ہمت ... پڑے ہیں کچھ دانہ ہائے تسخیر
انھیں پر مائل ہے طبع شاہیں نہ بال اب ہیں نہ پر رہے ہیں

چند سال تک مسلمانوں کی سیاست اسی ڈھرے پر چلتی رہی، لیکن آخرکار خود ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے حالات نے اس میں تبدیلی کی۔ ۱۹۱۱ء میں بنگال کی تقسیم جس کے لئے اس قدر شور و ہنگامہ تھا ترک کر دی گئی۔ ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان نے مسلمانوں کے دلوں میں ایک آگ لگا دی اور ڈاکٹر انصاری کی رہنمائی میں ترکی کی مدد کے لئے ایک وفد بھیجا گیا۔ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم چھڑ گئی اور ترکی نے انگلستان کے دشمنوں کا ساتھ دیا۔ ان واقعات کا اندر عام بیداری کا مسلم عوام پر زبردست اثر پڑا اور ان میں ... بہتیرے مسلم لیگ کی اس پالیسی پر شک و شبہے کی نظر سے دیکھنے لگے جس پر وہ ۱۹۰۶ء سے عمل کر رہی تھی۔

آخرکار بے چین دلوں میں ایک زبردست تبدیلی پیدا ہوئی۔ ۱۹۱۳ء میں لکھنؤ کے سالانہ جلاس میں مسلم لیگ نے بھی ہندوستان کے لئے حکومت خود اختیاری کو اپنا مقصد قرار دیا اور اس طرح کانگریس کے پہلو بہ پہلو آ گئی۔ ۱۹۱۵ء میں لیگ کا

(بقیہ صفحہ ... پر)

اصغر گونڈوی اور جدید تنقید

ڈاکٹر مسعود حسین

مجھ کو نہیں ہے تابِ خلش ہائے روزگار

بیسویں صدی کی "خلش ہائے روزگار" میں اصغر کی شاعری ایک "لغزشِ مستانہ" کا حکم رکھتی ہے۔ لیکن اس شاعری کی افادیت معدوم۔ جدید تنقید، سماجی علوم پر اس قدر سہارا لئے ہوئے ہے کہ وہ "جہان راز" کی کلکاریوں سے کتراکر چلتی ہے۔ اصغر کی شاعری پر تنقیدی سرمائے کے فقدان کا ایک سبب یہ بھی ہے۔

اصغر ایک غلط زمانے میں پیدا ہوئے جب وہ اپنی تیم صوفیانہ شاعری میں مشغول تھے۔ زمانہ تیزی سے کروٹیں بدل رہا تھا اس لئے اصغر کا اجتماعی شعور "خطاب بہ مسلم" سے آگے نہ بڑھ سکا۔ شاعری میں یہ فرقہ پرستی اقبال کی پھیلائی ہوئی وبا تھی، اس میں کبھی کبھی اصغر اور جگر جیسے غزل گو بھی مبتلا نظر آتے ہیں۔ لیکن اس سے کہیں صالح اور صحت مند اجتماعی احساس حسرت کے یہاں "چکی کی مشقت" اور "قید فرنگ" میں نظر آتا ہے۔

اصغر کی شاعری کے اصل ماخذ ہماری سماجی زندگی کے تڑپتے ہوئے مسائل نہیں۔ اس کے سرچشمے اس انفرادیت پسند ذہن سے پھوٹتے ہیں جس کے پس منظر میں ولی، خواجہ میر درد، میر، آتش اور غالب کے افکار تھے۔ اور زیادہ تلاش و جستجو کیجئے گا تو ایرانی خون کی وہ بے پناہ تڑپ ملے گی جس کا ہر قطرہ انا البحر پکارتا ہے۔

اصغر نے دو عظیم جنگوں کے درمیان شاعری کی ہے۔ اردو ادب کے لئے یہ زمانہ کئی لحاظ سے اہم ہے۔ اس دور میں ہماری شاعری کے قلب و قالب دونوں بدلے ہیں۔ تغزل بھی ایک نئے درسے سے آشنا ہوگیا۔ لیکن اصغر کے ماحول اور ان کی یک طرفہ علمیت اور یک طرفہ طبیعت نے شاعری اور زندگی کے درمیان ہمیشہ ایک خلیج حائل رکھی ہرچند اصغر اس کے ذمہ دار نہیں ٹھہرائے جاسکتے۔ لیکن عہد جدید کا نقاد ان سوالات کو چھیڑے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔ سوالیہ نشان قائم کرنے کے بعد ہی اس زمانے میں ماورائی شاعری کا جواز ڈھونڈا جاسکتا ہے۔

میں نے اصغر کی شاعری کو ماورائی بالقصد کہا ہے۔ صوفیانہ شاعری ہو کہ عشقیہ، اصغر کہیں بھی واردات میں مبتلا نظر نہیں آتے۔ ایک فاصلہ بھر جمان کے اور واردات کے درمیان ضرور نظر آئے گا اسی فاصلے کی وجہ سے ان کے کلام میں

دل ہے نزاکتِ غمِ لیلیٰ لئے ہوئے

کمال درجہ کی شگفتگی آگئی ہے۔ یہ شگفتگی براہ راست اس بے لاگی سے پیدا ہوتی ہے جو شاعر اور اس کی واردات کے مابین ہیں۔ حکیمانہ بصیرت کا راز بھی یہی ہے کہ انسان اپنے جذبات پر ناقدانہ نظر ڈال سکے۔ بات بہت زیادہ ہوائی ہوئی جارہی ہے اس لئے مثالوں سے واضح کرتا ہوں۔ تیسویں ہی صدی کے غزل گو شعرا کو لیجئے۔ حسرت مبتلائے واردات ہیں۔ فانی کشتہ واردات۔ جگر اس سے مخمور ہیں۔ لیکن اصغر محض چٹخارے لیتے ہیں۔ اور دور کھڑے رہتے ہیں۔ وہ حسن و عشق کی دنیا پر بھی عارفانہ نظر رکھتے ہیں۔ یہ نظر کبھی کبھی ناقدانہ بھی ہو جاتی ہے۔

وہ شوخ بھی معذور ہے مجبور ہوں میں بھی
کچھ فتنے اٹھے حسن سے کچھ حسن نظر سے

یہ تو ہوئی اصغر کے شاعرانہ ذہن کی بات۔ اب یہ کہ وہ کس طرح تخلیق فرما ہوتا ہے۔ شاعر کے موضوعات کا جائزہ لیجئے تو وہ بھی ایک محدود اور مخصوص دنیا ہے۔ جیسے کہ پہلے عرض کرچکا ہوں۔ اصغر کی غزل "خلش ہائے روزگار" کی متحمل نہیں، وہاں تو غم دوراں کو غم جاناں میں تبدیل کرلیا جاتا ہے اس لئے اب کی شاعری پر عہد جدید کا [illegible] لگایا جاسکتا ہے۔ اب کی شاعری یا تو عہد قدیم کی یادگار سمجھی جائے گی یا دورِ کے دورِ مستقبل کی بہار۔ دور کے مستقبل کی بات ذرا چونکا دینے والی ہے۔ معاشری مسائل ہماری تمام تر توجہ پر حاوی ہیں جن کی وجہ سے زندگی کی دوسری اقدار پس پشت ڈال دی گئی ہیں۔ لیکن پیٹ اور پیٹھ کا مسئلہ جب عمومی طور پر حل ہوجائے گا تو کیا "جہان راز" کی بات پھر نہ چھڑے گی، یہاں ملتا ہے آپ کو اصغر کی بظاہر بے افادہ شاعری کا جواز۔

اصغر کے شاعرانہ ذہن کی یہ کارفرمائی اگر سمجھ لی جائے کہ وہ واردات کا ایک خاص فاصلے یا بلندی سے مشاہدہ کرتے ہیں تو ان کے ذہن کے عام میلانات کو بھی متعین کیا جاسکتا ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ ان کے کلام میں نفسانیت کیا حسیت تک نہیں ملتی۔ بوسہ و لب ان کے یہاں معدوم ہے صرف رنگ رخسار کا تذکرہ ہے۔ ممکن ہے یہ لکھنوی انداز شاعری کے خلاف ردعمل ہو جس کا آخری بانکپن حسرت کے کلام میں آنکھ مچولی کھیلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس رجحان کو مزید تقویت اصغر کی صوفیانہ طبیعت سے ملی ہے جو بے حجابی کو بھی حجاب بنا لیتی ہے۔

بہرحال جب غزل میں حسن و عشق کی رسیلی باتوں کو بھی نہ آنے دیں اور غم روزگار سے بھی اجتناب کریں تو اس میں عارفانہ انداز کا آجانا لازمی بات ہے۔ یہ عارفانہ انداز نظر کبھی کبھی خشک حکیمانہ اور زاہدانہ بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن اصغر اس سے بچ نکلے اس لئے کہ وہ مجاز کی راہوں سے گذر چکے تھے۔ ان کے سوانح نگار کا بیان ہے کہ "اصغر عشق و محبت کی ایک ایک غزل سے عملاً واقف تھے" اس کا ایک دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ اس زمانے میں ادب لطیف کی تحریک نے لوگوں کو بات کرنے کا سلیقہ سکھا دیا تھا۔ اصغر کے اشعار پر غور کیجئے۔ انھیں کی فرہنگ میں وہ ذوق، سلیقہ، لطافت، رنگینی و رعنائی اور معتدل جذبات سے مرکب ہیں۔ ان کے یہاں تخیل اور جذبہ میں قوس و قزح کے رنگوں کا سا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان کے یہاں جگر اور حسرت کی بہ نسبت فکر کا عنصر زیادہ ہے وہ فانی سے دور ہوتے ہوئے بھی ان سے قریب ہیں، وہ اس لئے کہ ایک باقیات سے بحث کرتا ہے اور دوسرا نشاطِ روح اور سرود زندگی سے۔ نشاط اور موت یہی وہ الفاظ ہمارے مرتے ہوئے سماج کے آئینہ دار ہیں۔

اصغر کی شاعری اس لئے بھی اہم ہے کہ وہ کیا کہتے ہیں، لیکن اس سے کہیں زیادہ اہم اس لئے ہے کہ وہ کس طرح کہتے ہیں۔ یہ ان کا اسلوب ہی ہے جو انھیں دوسرے ہم عصر شعرا سے ممتاز کرتا ہے۔ اس اسلوب کی تشکیل خود ان کے معتدل صوفیانہ مزاج سے ہوئی ہے۔ یہ حسن خیال، حسن نظر اور حسن بیان سے عبارت ہے۔ اصغر نے غزل کی فرہنگ میں کوئی خاص اضافہ نہیں [illegible] پر اپنے تخیل کے ان چھپے پہلوؤں کو اردو غزل میں شاید پہلی بار اجاگر کیا ہے۔ ان کے اسلوب کی سب سے بڑی خصوصیت جس کی طرف نظر کم جاتی ہے الفاظ کا صوتی اور صوری حسن ہے۔ ہر صاحب ذوق اس کو محسوس کرتا ہے، لیکن ادا نہیں کرپاتا۔ اصغر حسرت کی طرح اساتذۂ قدیم کے الفاظ سے نہیں چونکاتے۔ وہ موسیقی سے بھرے ہوئے الفاظ کو پاس پاس اس طرح بٹھا دیتے ہیں کہ ذہن خود بخود گنگنا اٹھتا ہے۔ الفاظ کے صوری حسن کا تعلق فردوسِ گوش سے نہیں بلکہ جنتِ نگاہ سے ہے یہ بھی فن شعر کا ایک زیور ہے۔ خاص طور سے اس زمانے میں جب کہ شاعری پڑھی زیادہ جاتی ہے سنی کم۔

غالب کے بعد رنگ قدیم میں صرف اصغر کا کلام فن کار طبیعتوں کے لئے بادۂ خوش رنگ کا حکم رکھتا ہے۔ دونوں عوام کے نہیں خواص کے شاعر ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ غالب کے یہاں زیر و بم زیادہ پایا جاتا ہے۔ اصغر کے یہاں اعتدال

اور یکسانیت ہے۔ وہ عرش و فرش کے درمیان ایک خاص رابطہ رکھتے ہیں۔ لیکن جب کبھی بحث پڑتے ہیں تو جلوۂ عام کا تذکرہ چھوڑ کر کسی شوخ کو ہم شکل تمنا بھی دیکھ لیتے ہیں۔ "رقص تمنا" "رنجش بے جا" اور بتوں کی صورت زیبا کا بھی ذکر کر لیتے ہیں۔

عارضِ نازک پہ اُن کے رنگ سا کچھ آگیا ان گلوں کو چھیڑ کر ہم نے گلستاں کر دیا

تمنا اُٹھے وہ عارضِ میرے عرضِ شوق پر حسن جاگ اٹھا وہیں جب عشق نے فریاد کی

پہلی نظر بھی آپ کی اُف کس بلا کی تھی ہم آج تک وہ چوٹ ہیں دل پر لئے ہوئے

کیا مرے حال پہ سچ مچ انھیں غم تھا قاصد تو نے دیکھا تھا ستارہ سرِ مژگاں کوئی

کچھ تو کہو یہ کیا ہوا تم بھی تھے ساتھ ساتھ کیا غم میں یہ کیوں سرور تھا درد نے کیوں مزا دیا

لیکن اصغر اصل میں فرش کے نہیں عرش کے شاعر ہیں۔ اس رفعت مکانی کی وجہ سے مجاز کی عشقیہ واردات بھی ایک بلند اور ارفع انداز میں پیش کی جاتی ہے۔ اصغر ہمیشہ ایک خاص سطح سے بات کرتے ہیں۔ وہ صرف آسمان ہی کی بات نہیں کرتے۔ زمینی باتوں میں بھی انھیں مزا آتا ہے۔ لیکن اپنی سطح سے نیچے کبھی نہیں اُترتے۔ اسی لئے ان کی شاعری چیخ نہیں بن جاتی، ہمیشہ نغمہ اور نما زمزمہ ہے۔ اس میں حسن و عشق سے متعلق بیانات میں ایک عمومیت پائی جاتی ہے۔ اس عمومیت کی وجہ سے انداز مفکرانہ ہو جاتا ہے۔

ردائے لالہ و گل پردۂ مہر و انجم جہاں جہاں وہ چھپے ہیں عجیب عالم ہے

میری نِدائے درد پر کوئی صدا نہیں بکھرا دئے ہیں کچھ مہ و انجم جواب میں

یہ ارفع سطح محض اصغر کے صوفیانہ مذاق کی بدولت ہے۔ اسی سے ان کا شاعرانہ لب و لہجہ متعین ہوتا ہے۔ اسی میں ان کی مخصوص انفرادیت پائی جاتی ہے۔

پہلی بات کو آخر میں دہراتے ہوئے میں پھر کہوں گا کہ اصغر کی شاعری پر جدید تنقید کی کمند نہیں ڈالی جا سکتی۔ جدید تنقید سماجی علوم پر مبنی ہے اور انھی کی روشنی میں وہ فنی شاہکاروں کو پرکھتی ہے۔ لیکن اصغر کی شاعری کی گرہیں فقط نفسیاتی اور فنی تنقید سے کھولی جا سکتی ہے۔ اور اس کی قدر و قیمت کا تعین سابقہ یا آئندہ معیاروں سے کیا جائے گا۔ ہم اپنے سماجی مسائل میں اس وقت بُری طرح پھنسے ہوئے ہیں۔ ان سے فرار بے ایمانی بھی ہے اور بزدلی بھی لیکن اسے زندگی کی ایک مستقل کروٹ سمجھنا یہ بھی ایک خود فریبی سے کم نہیں۔ اصغر کی شاعری نشاط روح کی شاعری ہے۔ یہ ذوق نظر کا تحفہ ہے۔ جس نے اردو غزل کو غازہ بخشا۔ لطافت اور رنگ بخشا۔ اصغر نے مریض ذہن کی خستگی اور شکفتگی کو مزاج غزل سے نکال باہر کیا۔ پژمردگی کی جگہ فکر و تخیل سے رنگین بنایا، باغ و بہار بنایا۔ اسی طرح کہ آتش گل کی طرح رنگ اور آنچ کا فرق ہی مٹا دیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ معلوم اور نامعلوم کے درمیان جو خلا ہے اُسے پر کیا۔

ہم نے سماجی ارتقار کے اصولوں کا کم و بیش اسی طرح احاطہ کر لیا ہے جس طرح طبعیات نے مادّہ کے بعض افعال و خواص کا لیکن دونوں علوم کے انکشافات نامعلوم کی اس دلکشی کو کم نہ کر سکے جو ہر لحظہ تاریکیوں میں پیچھے کی طرف ہٹتی جاتی ہے۔ یہ کہہ کر تصوف کا جواز ڈھونڈھنا مقصود نہیں۔ لیکن علم کے خالص سائنٹفک نقطۂ نظر کے بعد بھی یہ سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ ذہن انسانی کلی طور پر حقیقت بسیط کا احاطہ کر سکے گا یا نہیں۔ اگر نہیں کر سکتا تو اصغر جیسوں کی شاعری ہمیشہ "جہان راز" کی تعبیر کرتی رہے گی۔ دوسری صورت میں جہان فرداکو شاعری کی ضرورت محسوس نہ ہوگی۔

بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو
دہلی

ہندو مسلم تعلقات

(بہ سلسلہ صفحہ ۸)

سالانہ اجلاس کانگریس کے ساتھ ساتھ بمبئی میں منعقد ہوا اس کی کوشش کی گئی کہ لیگ کا اجلاس بمبئی میں نہ ہونے پائے۔ لیکن حکومت کی مخالفت کے باوجود اجلاس منعقد ہوا۔ لیگ کا خطبہ صدارت کانگریس کے خطبۂ صدارت سے کہیں زیادہ انتہاپسند اور تنقیدی تھا۔ مولانا مظہر الحق نے جو راہ دکھائی تھی اس پر لیگ کی سیاست ایک عرصے تک چلتی رہی ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کا لکھنؤ میں ملا جلا اجلاس ہوا جس میں مشہور میثاق لکھنؤ پر دستخط ہوئے۔ اس کا فوری اثر ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کے شاہی فرمان کی شکل میں ظاہر ہوا جس میں ہندوستان میں ذمہ دار حکومت کے قیام کا وعدہ کیا گیا۔ لیکن جیسے ہی جنگ عظیم ختم ہوئی حکومت کی صلح جویانہ پالیسی جبر و تشدد میں تبدیل ہو گئی۔ رولٹ بل پاس کیا گیا اور ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ کا قتل عام پیش آیا۔ معاہدۂ سیورس کی وجہ سے، جس میں ترکوں پر بڑی کڑی شرطیں لگائی گئی تھیں، برطانیہ کے خلاف مسلمانوں کے جذبات اور زیادہ بھڑک اُٹھے۔ تین چار سال تک ہوم رول اور خلافت کے لئے ہندو اور مسلمان مل کر برطانیہ سے ٹکر لیتے رہے۔ بدقسمتی سے جیسے ہی عدم تعاون کی تحریک ملتوی ہوئی ہندو مسلم اتحاد کی کمر ٹوٹ گئی۔

اتحاد کا محل جسے گاندھی جی نے اتنی جان فشانیوں کے بعد کھڑا کیا تھا زمیں بوس ہو گیا۔ بڑی ہی مستقل مزاجی اور ہوشیاری کے ساتھ اس محل پر سیاسی حملے ہوتے رہے یہاں تک کہ ملک دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا ——— یہ تھا اس پالیسی کا منطقی اور قدرتی نتیجہ جس پر پوری انیسویں صدی میں اور اس کے بعد بھی عمل ہوتا رہا تھا۔

یوپی میں پنچایت راج

ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو

(ہمارے ہندوستان میں پنچایتوں کے قیام کے سلسلے میں جو کوششیں ہو رہی ہیں اس کے متعلق ہم ایک مضمون پچھلی اشاعت میں شائع کر چکے ہیں۔ اس مرتبہ یوپی میں پنچایت راج کے متعلق ہیں کا ۱۵ر اگست کو باقاعدہ افتتاح کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر کاٹجو گورنر مغربی بنگال کے ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ معاصر "روزنامہ ہند" سے شکریے کے ساتھ درج کرتے ہیں)

۱۵ر اگست ۱۹۴۹ء کو آزادی کی دوسری سالگرہ کے موقع پر ہندوستان بھر میں بہت کچھ کہا اور لکھا جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ اس موقعہ پر گذری ہوئی باتوں اور ملک کی موجودہ ابتر اقتصادی حالت کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ میں یہ بھی امید کرتا ہوں کہ لوگ آزادی کو ترازو میں تولنے کی انتہائی معقولیت بلکہ خطرناک حالت کی طرف بھی اشارہ کریں گے محض یہ نہ کہ کسی ملک کی سیاسی آزادی تولنے کی چیز یا کسی بھی شکل میں ترتیب دی جانے والی چیز نہیں ہوا کرتی کسی ملک کی سیاسی آزادی بجائے خود بڑی شاندار اور میں ایک الگ حیثیت رکھتی ہے۔ جیسا کہ ویدوں میں کہا گیا ہے۔ کہ کسی بھی آریہ کے لئے ایک ایسی سرزمین میں رہنا عقیدہ اور دھرم کے خلاف ہے۔ جہاں کسی ظالم بدیشی کی حکومت ہو۔ اگرچہ ویدوں کے یہ الفاظ اپنی قومی بدقسمتی کے باعث کئی سو برس ہوئے ہم فراموش کر چکے ہیں۔ پھر بھی ان الفاظ کا مفہوم بالکل صاف اور واضح ہے اور اس کی کسی تفسیر کی ضرورت نہیں آج کل کے کٹھن زمانے میں جب زندگی تقریباً ایک ناقابل برداشت بوجھ بنتی جاتی ہے۔ انسان کا دماغی سکون درہم برہم ہو سکتا ہے۔ ٹھیک جس طرح ایک مایوس مریض کسی بھی عطائی حکیم کے پاس پہنچ سکتا ہے جو اس کے مرض کو فوراً اچھا کر دینے کا دعویٰ کرے۔ چاہے اس عطائی حکیم کے علاج سے اس کا ایک اہم عضو بھی کیوں نہ ضائع ہو جائے۔ ٹھیک اسی طرح آج ضابطہ حیات کے ان اصولوں اور فلسفوں سے بھی خطرہ درپیش ہے جو کم سے کم وقت میں اقتصادی بدحالی کے انسداد کی امید دلاتے ہیں۔ خطرہ یہ ہے کہ گھبراہٹ اور جلد بازی میں کہیں ہم اپنی سیاسی آزادی کو خطرہ میں نہ ڈال دیں۔

حقیقی آزادی

بہرکیف صوبہ متحدہ میں آزادی کی یہ دوسری سالگرہ دیہاتوں کے لئے حقیقی آزادی کا پیش خیمہ ہوگی۔ طوطے کی طرح ہم مہاتما گاندھی کے اس قول کو دہراتے رہتے ہیں کہ "ہندوستان کی اصل زندگی دیہاتوں میں ہے"۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ بہت سے لوگ دیہاتی باشندوں کی ستائش میں صرف زبانی جمع خرچ کیا کرتے ہیں کہ انہیں بھی ووٹ دینے کا حق ہے۔ مگر دیہاتوں کو جاہل، ان پڑھ، توہم پرست اور پرانے زمانے کی بوسیدہ یادگار کہہ کر پکارنا آج کل کچھ فیشن سا ہو گیا ہے۔ لیکن میں اس نظریہ کی کبھی بھی حمایت نہیں کروں گا۔ چاہے وہ ایک کسان ہو یا کھیتوں میں کام کرنے والا مزدور یا ایک دیہاتی دستکار میں نے بہرحال ہمیشہ اسے انتہائی عزت کی نظر سے دیکھا ہے۔ بہ حیثیت ایک ماہر کاریگر کے بھی اور بہ حیثیت ایک انسان کے بھی۔ اس کے اپنے دائرہ عمل میں اسے ایک محنتی ایماندار کشادہ دل اور ایک حقیقی انسان تصور کرتا ہوں ہم اس سے جو نام نہاد برائیاں منسوب کرتے ہیں مثلاً یہ کہ وہ بدترین قسم کی گاؤں پرستی کا شکار ہے یا یہ کہ وہ عدالتوں میں یا عدالت کے باہر کسی بھی بااختیار شخص کے سامنے جھوٹ بولنے پر ہر دم تیار رہتا ہے۔ میری نظر میں اس کی غلطی کا نتیجہ نہیں ہیں۔

اس میں برائیاں پیدا ہونے کا سبب یہ ہے کہ گذشتہ دو برس کے عرصے میں اسے انتہائی سنگدلی سے لوٹا کھسوٹا جاتا رہا۔ تاآنکہ مہاتما گاندھی ہمدردی شفا اور دوستی کا پیغام لے کر گئے۔ دیہات جاکر دیہاتیوں سے تعلقات پیدا کرنے والے ہر شخص کا مقصد صرف یہ ہوا کرتا تھا کہ ہر ممکن طریقے سے چاہے جائز ہو یا ناجائز، قانون کے سہارے ہو یا زبردستی، جعل و فریب سے ہو یا دھوکہ بازی سے بہرصورت اس کی ذات سے روپیہ پیدا کرے۔ جس سماجی نظام میں وہ زمانہ دراز سے رہتا چلا آرہا تھا اسے انگریزوں نے تباہ کر کے گاؤں پنچایت کی جگہ دیہاتیوں پر ایک ایسا مرکزی نظام لاد دیا جسے وہ بڑے بڑے خوش کن ناموں سے پکارتے تھے۔ اس وقت انہوں نے سوچا اور نہ سمجھا کہ ایک گاؤں والے کو کسی معمولی سے زمینی جھگڑے کے تصفیہ کے لئے اس کے گاؤں سے کافی فاصلے پر بڑی عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹانے کے لئے مجبور کرنا بے رحمی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا اس کا مطلب اس کی بربادی کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔

دراصل ایک دیہاتی بالکل سادہ دل اور امن پسند ٹھہرا ہوتا ہے۔ وہ سوائے ان لمحات کے جب اس کے جذبات میں اشتعال پیدا ہو جائے ہر وقت قانون کا احترام کرتا ہے۔ ہندوستان کے دیہاتوں میں جرائم کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔

سماجی انقلاب

مجھے بھروسہ ہے کہ ہمارے دیہاتوں میں پنچایت راج کا آغاز جس کا ایک عظیم الشان تجربہ یوپی میں کیا جا رہا ہے۔ ایک نیا سماجی انقلاب لائے گا۔ ہم اپنے محدود ذہن میں اس سماجی انقلاب کی وسعت اور ہمہ گیری کا اندازہ نہیں کر سکتے ہیں اس کا اندازہ تب ہی ہوگا جب آئندہ چند سال میں پنچایت راج کے نتائج ہمارے سامنے آئیں گے۔

کتنے تعجب کا مقام ہے کہ ایک طرف ہم ایک دیہاتی کو اس کا اہل سمجھتے ہیں کہ ملک کے وسیع تر مفاد اور نظم و نسق کے لئے اس کی رائے بنیاد ہی مانی جاتی ہے۔ یعنی اس کے ووٹ پر ملک کا نظم و نسق چلانے والے منتخب ہوا کریں گے۔ لیکن دوسری طرف ہم اسے اس کی بھی اجازت دینا گوارا نہیں کرتے کہ وہ اپنے گاؤں کا بالکل سادہ انتظام خود کرے۔ ضرورت اس کی ہے کہ اس کے روزمرہ کے کاروبار کے چلانے کے لئے اور انصاف حاصل کرنے کے لئے ساری ذمہ داری اسی کے سپرد کر دی جائے۔ جب تک کہ اپنی ذمہ داری کا احساس نہ ہوگا اس کی حالت اور اس طرح ہمارے ملک کی حالت سدھر نہیں سکے گی۔ اور اسی وقت دیہاتوں کی دولت میں بے پناہ اضافہ ہو سکے گا۔ دیہاتی باشندے کی ضروریات پوری ہونے کے لئے اس کے پاس بافراط روپیہ ہوگا، اور اسے احتیاج کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ احتیاج سے آزادی ہی سوراج کا اصل مقصد ہے۔

ہریجن کا ست

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

گاندھی جی نے اس کو برداشت کر لیا، کیوں کہ ان کا لگاؤ دوسری طرف بھی اسی طرح تھا جس طرح مہادیو بھائی کا باپ سے تھا۔ یہ ہندوستان کے عوام تھے اور ہندوستان کے ذریعے انسانیت و زندگی سے لگاؤ تھا۔ گاندھی جی، ہندوستان کے غم اور خوشی کے شریک دار تھے۔ وہ ہندو، مسلمان، عیسائی، سکھ، برہمن اور بھنگی کے درمیان امتیاز نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی زندگی سوراج کے لئے وقف ہو چکی تھی۔ وہ سوراج جو سب کے لئے تھا، اسی لگن سے وہ آخر تک کام کرتے رہے۔ اور اپنی جان دی

ہماری آزادی اسی طرح کے زبردست تیاگ سے حاصل ہوئی ہے اور اس کے ذریعے ہم اسے برقرار بھی رکھ سکتے ہیں۔

ترجمہ
"قومی آواز" لکھنؤ

نئی روشنی ماہانہ — دہلی

ادارۂ تحریر:
ڈاکٹر سید عابد حسین ۔ صالحہ عابد حسین
عبداللطیف اعظمی

تاریخ اشاعت: یکم [illegible]
چندہ [illegible] سالانہ [illegible] ششماہی [illegible]

شرح چندہ غیر ممالک

ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دوسرے ملکوں کے لئے "نئی روشنی" کا چندہ حسب ذیل ہے:

سالانہ ... ... دس روپے
ششماہی ... ... ساڑھے پانچ روپے
فی پرچہ ... ... چار آنے
(منیجر)

شرح اشتہارات:

ڈھائی روپے فی انچ سنگل کالم
(ایک صفحہ میں چار کالم ہوتے ہیں)

دفتر نئی روشنی ماہانہ
جامعہ نگر، دہلی

طابع و ناشر عبداللطیف اعظمی (بی اے) جامعہ
چھپا جامعہ پریس
مطبوعہ جید برقی پریس دہلی

NAI RASHNI

جلد ۳ نمبر ۹ | یکم ستمبر سنہ ۱۹۴۹ء | ایڈیٹر ۔ ڈاکٹر سید عابد حسین

عبادت اور آشرم

(مہاتما گاندھی)

اگر سچائی پر اصرار، آشرم کے جڑ کی حیثیت رکھتا ہے تو اس جڑ کی نشو و نما خاص طور سے عبادت سے ہوتی ہے۔

میرا اپنا خیال ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں ایک شخص جتنے ہی سویرے اُٹھتا ہے اتنا ہی بہتر ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ لاکھوں آدمیوں کو سویرے اُٹھنا ہی چاہیئے۔ اگر کسان دیر میں اُٹھتا ہے تو اس کی فصل کو یقیناً نقصان پہنچے گا۔ صبح ہی کے وقت جانوروں کی دیکھ بھال ہوتی ہے اور گائیں دوہی جاتی ہیں جب صورتِ حال یہ ہو تو پھر سچ کی بقا کے خواہش مندوں، عوام کے خادموں یا راہب اور تارک الدنیا کو ۲ یا ۳ بجے اُٹھ جانا چاہیے۔ اگر یہ لوگ سویرے نہیں اُٹھتے ہیں تو حیرت انگیز بات ہے دنیا کے تمام ملکوں میں عبادت گزار بندے خدا کا نام لیتے ہیں اور کسان کھیتوں میں کام کر کے خود اپنی اور ساری دنیا کی خدمت کرتے ہیں میرے نزدیک تو دونوں ہی عبادت گذار ہیں اور کسان اپنی محنت کے ذریعے غیر شعوری طور پر خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی محنت کی بناء پر دنیا کا وجود قائم ہے۔ اگر وہ کھیتوں میں کام کرنے کے بجائے مذہبی مراقبہ کے عادی بن جائیں تو وہ اپنے فرائض سے منہ موڑیں گے اور خود کو اور اپنے ساتھ ساتھ ساری دنیا کو موت کے غار کی طرف لے جائیں گے۔

ہم کسانوں کو عبادت گذار سمجھیں یا نہ سمجھیں، لیکن جہاں کہیں کسان مزدور، اور دوسرے لوگوں کو چار ناچار صبح کو اُٹھنا پڑتا ہے۔ بھلا وہاں سچائی کے قدردان اور خواہاں یا عوام کے خادم دیر میں کیسے اُٹھ سکتے ہیں، پھر ایک اور بات ہے اور وہ یہ کہ ہم آشرم میں عبادت اور کام میں ایک ربط اور یکجہتی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس بنا پر میری رائے ہے کہ آشرم کے تمام تندرست آدمیوں کو سویرے اُٹھنا چاہیئے، خواہ اس میں ان کو کچھ تکلیف ہی کیوں نہ ہو۔

پھر ہم کو چند مسائل کے بارے میں فیصلہ کرنا تھا۔ عبادت کہاں ہونا چاہیئے؟ عبادت کے لئے کوئی مندر بنانا چاہیئے یا کھلے میدان میں عبادت ہونی چاہیے پھر یہ کہ ہم کو کوئی چبوترہ بنانا چاہیئے یا زمین پر بیٹھ کر عبادت کرنی چاہیئے۔ آخر میں ہم نے یہ طے کیا کہ ہم آسمان کے نیچے زمین پر بیٹھیں گے شبیہہ نہیں بنائیں گے۔ آشرم میں غربت کی ہر جگہ جھلک دکھائی دینی چاہیئے آشرم کو لاکھوں غربت زدہ انسانوں کی خدمت کے لئے کھولا گیا ہے۔ اس میں غریبوں کے لئے دوسرے سے کم گنجائش نہیں۔ ہے اس کے دروازے ہر اس شخص کے لئے کھلے ہوئے ہیں جو قواعد کی پابندی کر سکیں۔ ایک ایسے ادارے میں عبادت گاہ کو اینٹوں اور چونے گارے سے کیوں کر تیار کیا جا سکتا ہے۔ شروع میں ایک چبوترہ بنانا طے کیا گیا تھا۔ لیکن بعد میں ارادہ بدل دیا گیا۔ بعد کے تجربے نے بتایا کہ چبوترہ نہ بنانے کا فیصلہ صحیح اور مناسب تھا۔ عبادت میں آشرم کے باہر کے لوگ بھی شامل ہوتے ہیں اور بعض وقت مجمع کو بڑے سے بڑے چبوترے پر نہیں بٹھایا جا سکتا۔ جو اس وقت موجود ہوتا ہے۔

چونکہ آشرم کی عبادت کی دوسری جگہ نقل کی جا رہی ہے اس لئے ایسی کھلی جگہ پر عبادت کا فائدہ اب ثابت ہو رہا ہے، جہاں کہیں جاتا ہوں صبح اور شام کی عبادت ہوتی ہے۔ شام کی عبادت میں خاص طور سے اتنا مجمع ہوتا ہے کہ عبادت صرف کھلی ہوئی جگہ میں ہو سکتی ہے۔ اگر میں کسی عبادت کے کمرے میں عبادت کرنے کا عادی رہا ہوتا تو میں اپنے دورے کے دوران میں کبھی عام عبادت کا تصور بھی نہ کر سکتا۔

اصلی سوراج کیا ہے؟

"حقیقی سوراج چند افراد کے سوراج حاصل کر لینے سے نہیں بلکہ اس وقت ملے گا جب ساری قوم میں یہ صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ اقتدار کے ناجائز استعمال کو روک سکیں، دوسرے لفظوں میں سوراج اس طرح حاصل ہوگا کہ عوام کو تربیت دے کر ان میں اقتدار کی نگرانی کرنے اور حکومت کو قابو میں رکھنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔"

"میرے تخیل کے سوراج میں نسل یا مذہب کا کوئی امتیاز نہیں ہوگا اور نہ یہ صرف پڑھے لکھوں یا دولت والوں کی املاک ہوگا۔ سوراج سب ہی کا ہوگا جس میں امیر اور اہل علم بھی شامل ہیں، لیکن زیادہ حق دار اپاہج، اندھے، فاقہ کش عوام ہیں۔"

"کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کا سوراج اکثریت والے فرقے یعنی ہندوؤں کی حکومت ہوگی۔ اس سے زیادہ فاش غلطی کوئی نہیں ہو سکتی اگر ایسا ہوتا تو میں اُسے

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

فہرست مضامین

اب نظر کاہے کو آئیں گی یہ تصویریں کہیں

خواجہ غلام السیدین

میں جب اپنے بچپن کے زمانے کو یاد کرتا ہوں، جس کو اب تیس سال ہو چکے ہیں تو بہت سی تصویریں میری آنکھوں کے سامنے آتی ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک تصویر ایسی ہے جو سب سے زیادہ صاف اور سب سے زیادہ روشن ہے۔ میری اماں کی تصویر۔ یوں تو میں نے بچپن میں بہت سے عزیزوں اور بزرگوں کی محبت اور مثال سے فائدہ اٹھایا اور ان سے بہت کچھ سیکھا (مثلاً اردو کے مشہور شاعر حالیؔ میرے نانا تھے، اور ان کے پاس بیٹھ کر، اُن کی شریف اور نورانی صورت دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دل اور دماغ میں چراغ روشن ہوتے ہیں۔) لیکن میرے بچپن کی سب سے خوش گوار یاد میری اماں کی ذات ہے جس میں خدا نے دنیا بھر کی خوبیاں اور نیکیاں جمع کر دی تھیں۔ میں چند لفظوں میں اُن کی سیرت کی تصویر کس طرح کھینچوں؟ انھوں نے اپنی مثال سے مجھے (اور میرے بھائی بہنوں کو) سکھایا کہ زندگی کو ایک قیمتی فرض سمجھنا چاہیے۔ اور دکھایا کہ اس فرض کو کس طرح ادا کرنا چاہیے۔ وہ صبح کو چار بجے اٹھتیں۔ نماز اور عبادت سے فارغ ہوتیں پو پھٹنے سے پہلے ہمیں جگاتیں، اسکول کے لئے تیار کرتیں، ناشتہ کراتیں اور اس وقت سے لے کر رات کے سونے کے وقت تک برابر اپنے کاموں میں لگی رہتیں۔ اور وہ اُن کے کام کیا دوسروں کے کام ہوتے جن کو وہ اپنا سمجھ کر کرتیں۔ میں نے انھیں ہمیشہ پڑوسیوں، غریبوں، محتاجوں، فقیروں کی مدد اور ان کا کام کرتے دیکھا، بیماروں کی دیکھ بھال کرتے دیکھا، لوگوں کے قضیے، جھگڑے چکاتے دیکھا، گھر کے، محلّے کے، نوکروں کے بچوں بچیوں کو پڑھاتے۔ انھیں اچھی باتیں اور گھرداری کے کام سکھاتے دیکھا۔ اُن کے دل میں اپنے پرائے کا کوئی بھید بھاؤ نہ تھا بلکہ اگر ہم میں سے کسی کا جھگڑا کسی دوسرے کے بچے کے ساتھ ہوتا تو وہ ہمیشہ اپنوں کو روکتیں اور ٹوکتیں۔ اور دوسروں کا زیادہ خیال رکھتیں۔ تاکہ انصاف کا پلڑا برابر رہے۔ میں نے یہ انمول سبق انھیں کے قدموں کی برکت سے سیکھا کہ چاہے جو کچھ ہو جائے سچ اور انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔

میرے بچپن میں بچوں کو اتنی آزادی نہ تھی جتنی آج کل انھیں حاصل ہے۔ وہ دراصل ڈسپلن کا زمانہ تھا ہم اپنے بڑوں سے پوچھے بغیر کوئی کام نہ کر سکتے تھے مثلاً مجھے سائیکل چلانے کا بہت شوق تھا۔ لیکن جب تک اپنے چچا سے اجازت نہیں لی (اور وہ بھی زبانی نہیں، ایک خط لکھ کر!) اس کو سیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی! میری دنیا زیادہ تر اپنے گھر، اسکول اور چند غریبوں کے گھروں تک محدود تھی۔ گلی یا سڑک پر دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنا بہت برا سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ اسکولوں میں بھی کھیل کا زیادہ رواج نہ تھا جب کھیل ہوتے تو ماں باپ کی اجازت اور استادوں کی نگرانی میں ہوتے۔ معلوم ہے ہماری بہت بڑی سیر یا ایکسکرشن کیا ہوتی تھی؟ گھر سے دو میل دور ہمارا ایک باغ تھا جس میں انار اور امرود کے بہت اچھی قسم کے پیڑ تھے اور اس سے ایک میل آگے ایک نہر تھی جو دریائے جمنا سے نکالی گئی تھی کبھی کبھی اتوار کے دن چند دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ کبھی بڑی نگرانی میں ہم باغ اور نہر کی سیر کو جاتے تھے۔ خود تیرنا آتا نہ تھا اس لئے کاغذ کی کشتیاں بنا کر انھیں نہر میں ڈالتے اور اس طرح اپنا دل خوش کر لیتے تھے!

میرا پہلا اسکول بھی ہمارے آج کل کے اسکولوں سے مختلف تھا، اس میں استاد استاد تھے شاگرد شاگرد۔ (انھیں پڑھاتے لکھاتے، نصیحت کرتے ڈانٹ ڈپٹ کرتے نگران کے ساتھ مل جل کر دوستوں کی طرح نہیں رہتے تھے۔ ایسا کرنا استاد کی شان کے خلاف سمجھا جاتا تھا! مجھے یاد ہے کہ اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہمیشہ ایک ہلکے بادامی رنگ کی پگڑی باندھا کرتے تھے۔ میں نے برسوں تک انھیں کبھی اس کے بغیر نہیں دیکھا، شاید میرا یہ خیال تھا کہ وہ اسی طرح سر پر پگڑی باندھے پیدا ہوئے ہوں گے۔ اسی لئے جب ایک دفعہ میں نے انھیں گھر پر ننگے سر دیکھا اور ان کی صاف چندیا پر نظر پڑی تو مجھے ایسا اچنبھا ہوا جیسے ہندوستان کے شمال سے ہمالہ پہاڑ غائب ہو گیا ہو.........

اس اسکول میں صرف کتابی تعلیم ہوتی تھی، کوئی ہاتھ کا کام نہ کرایا جاتا تھا، کیونکہ اُسے بے کار وقت ضائع کرنا سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جب میں ۱۲ سال کی عمر میں اپنے اور مرے (حالی) اسکول میں داخل ہوا تو وہاں کی فضا دوسری قسم کی تھی۔ ہیڈ ماسٹر ایک قابل نوجوان گریجویٹ تھے جو ہمارے کھیلوں میں شریک ہوتے تھے ہم سے دوستوں کی طرح بات چیت کرتے، کلاس میں خوش مزاجی کے ساتھ پڑھاتے اور مذاق کرتے۔ اس لئے جہاں ہم پہلے ہیڈ ماسٹر کی عزت کرتے تھے اور ان سے ڈرتے تھے وہاں ان کے لئے دل میں محبت اور دوستی اور بھروسا تھا۔ جب میں اس نئے اسکول میں داخل ہوا تو اس کی عمارت پوری طرح نہیں بنی تھی، کام جاری تھا ہمارے ہیڈ ماسٹر اور سکریٹری دونوں تعلیم کے گر اچھی طرح جانتے تھے۔ اس لئے انھوں نے بہت سمجھداری کے ساتھ کام لے کر ہم سب کو بھی اجازت دے دی کہ خالی وقت میں مزدوروں کے ساتھ مل کر کام کیا کریں۔ ہم اینٹیں ڈھوتے تھے۔ گارا تیار کرتے تھے۔ ریت اور سمنٹ ملاتے تھے اور ہمارے ہیڈ ماسٹر وغیرہ بھی اس میں ہمارے ساتھ رضاکارانہ حیثیت سے شریک ہوتے تھے میں کیا بتاؤں کہ اس خیال سے کیسی خوشی ہوتی تھی کہ یہ ہمارا اسکول ہے! ہم نے اس کو بنایا ہے! پھر اسکول میں باغ لگانا تھا۔ اس کے لئے ہم لوگ کنوئیں پر باری باری رہٹ چلاتے اور پانی نکالتے اور اپنی بنائی ہوئی کیاریوں کو سیراب کرتے اور جب زمین سے چھوٹے چھوٹے پودوں کو سر نکالتے دیکھتے تو ایسی خوشی ہوتی جیسی کسی چترکار کو اپنی بنائی ہوئی خوب صورت تصویر دیکھ کر۔ میں جو آج کل تعلیم میں ہاتھ کے کام پر اتنا زور دیتا ہوں اس خیال کا بیج شاید میرے دل میں اسی زمانے میں بویا گیا ہو۔

میرے بچپن کے زمانے میں ہندوؤں، مسلمانوں سکھوں کے اتنے جھگڑے بالکل نہ تھے، جیسے آج کل ہم لوگوں نے دیکھے اور سنے ہیں۔ میں نے تو اپنے قصبے میں ہمیشہ انھیں دوستوں اور پڑوسیوں کی طرح رہتے دیکھا۔ وہ دل کھول کر ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں، شادی بیاہ میں، بیماری اور غمی میں شریک ہوتے، اور ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ شادی کا موقع ہوتا تو ہندو دوست مسلمانوں کے گھر آ کر اور مسلمان دوست ہندوؤں کے گھر جا کر ہر طرح کا انتظام کراتے اور چاہے وہ ایک دوسرے کے ہاں کا کھانا نہ کھائیں، لیکن دل میں عزیزوں کی سی محبت رکھتے تھے! میرے ایک چچا، جو بہت بڑے مولوی اور عالم تھے، شہر کے اسکول میں پڑھایا کرتے تھے، اور ان کے سیکڑوں بلکہ ہزاروں ہندو شاگرد تھے جنھوں نے اسکول سے نکل کر اپنی دکانیں اور کاروبار کر لئے تھے۔ جب کبھی میں اُن کے ساتھ شہر کے بڑے بازاروں میں سے گزرتا تو دیکھتا کہ ان کے یہ پرانے شاگرد ان کو دیکھتے ہی کام چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے اور انھیں پرنام کرتے یا اُن کے چرن چھوتے اور خود میرے چچا کی آنکھوں میں محبت کی ایسی جھلک پیدا ہو جاتی جیسے کوئی باپ اپنے بیٹوں کو کامیاب دیکھ کر خوش ہوتا ہے........ کبھی تو ان آنکھوں نے یہ خوش گوار منظر دیکھا تھا، اور پھر اس عمر میں نہ جانے کیا کیا دیکھا! میری دعا ہے کہ ہمارے سب بچے جو ہندوستان کی اُمیدیں ہیں۔ آپس میں اس دوستی اور پریم کے ساتھ رہنا سیکھیں اور اپنی محبت اور ایکتا سے اپنے دیس کو صرف طاقت ور ہی نہیں بلکہ سچائی اور انصاف اور شانتی کا گڑھ بنا دیں!

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو، دہلی)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

یکم ستمبر ۱۹۵۹ء

دیکھئے اس بحر کی تہہ سے اُچھلتا ہے کیا (اقبالؔ)

آج مسلمان تقریباً دنیا کے ہر حصے میں معاشی اخلاقی اور ذہنی پستی میں گرفتار ہیں۔ یہ ایک ناگوار حقیقت ہے جسے ماننے کو کسی طرح جی نہیں چاہتا مگر ماننی پڑتی ہے اس کا سبب باہر سے دیکھنے والے کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید مسلمانوں کا مذہب نئے زمانے کا ساتھ نہیں دیتا۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ ایک مدت سے مسلمانوں نے اپنے اونچے اور متوسط طبقے کے سیاسی اور معاشی مفاد کو اپنا مذہب بنا لیا ہے۔ حقیقی مذہب کو کئی کئی جزدانوں میں لپیٹ کر اس طرح رکھا ہے کہ اسے صدیوں سے دھوپ اور ہوا نصیب نہیں ہوئی۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں بڑے بڑے انقلاب کبھی کسی نئے مذہبی عقیدے کی برکت سے آئے ہیں اور کبھی نئے فلسفیانہ سیاسی یا معاشی عقیدوں کی بدولت جب کسی نئے مذہب کا ظہور ہوتا ہے جس میں حرکت اور قوت ہو تو جہاں جہاں وہ پہنچتا ہے وہاں فلسفہ، سیاسیات اور معیشت سب اپنے آپ کو کم و بیش اس کے مطابق بنا لیتے ہیں۔ اسی طرح نئے سیاسی اور معاشی عقیدے جب دنیا میں قبول عام پا لیتے ہیں تو مذہب کو بھی ان سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے نئے حالات کی روشنی میں اپنے بنیادی اصولوں کی نئی تعبیر کرنی پڑتی ہے۔ اس سے اس کے فرسودہ قالب میں نئے سرے سے جان پڑ جاتی ہے اور وہ لوگوں کے قلب و دماغ پر اپنی حکومت قائم رکھنے کے قابل ہو جاتا ہے تاریخ اسلام میں آپ کو اس کی مثال یہ نظر آتی ہے کہ جب یونانیوں کے عقلی فلسفے نے اسلامی ملکوں میں مقبولیت حاصل کر لی تو مذہبی فلسفیوں نے اسلام کی عقلی تاویل کر کے اس میں تازگی اور قوت پیدا کر دی، تاریخ یورپ میں، لوتھر، کیلون اور دوسرے بزرگوں کی مثالیں موجود ہیں جنھوں نے عیسائی مذہب کی تعلیم کو عہد جدید کے سانچے میں ڈھالا۔ خود ہمارے ملک میں بہا تما گاندھی نے ہندو مذہب کی تعبیر زمانے کی ضرورتوں کے مطابق کر کے اس میں ایک نئی روح پھونک دی؛ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کی ذہنی زندگی کو عہد جدید کے مطابق بنانے کی دو کوششیں ہوئیں۔ ایک سید احمد خاں نے ہندوستان میں کی، دوسری مصطفےٰ کمال نے ترکی میں سید احمد خاں نے مذہب اسلام کی نئی تعبیر کی طرف قدم بڑھایا مگر مخالفت سے ڈر کر پیچھے ہٹ گئے اور انھوں نے اپنی توجہ زیادہ تر اوپر کے طبقے کے لئے تھوڑے سے سیاسی اور معاشی فوائد حاصل کرنے کی طرف موڑ دی۔ سر سید کے جانشینوں نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ ان کا دین و ایمان یہی ہے کہ وہ اوپر کے طبقے کے لئے زیادہ سے زیادہ حقوق حاصل کریں۔ یہی عقیدہ تھا جس نے بڑھتے بڑھتے تحریک پاکستان کی شکل اختیار کر لی۔ مصطفےٰ کمال شروع سے مذہب سے دور بلکہ اس کے مخالف رہے۔ انھوں نے چاہا کہ ترکی کو لامذہبیت کے راستے سے عہد جدید میں داخل کریں جس میں کچھ عارضی کامیابی ہوئی، مگر ان کے بعد ترکوں کو یہ محسوس ہو رہا ہے کہ مذہب کی قوت کو ساتھ لئے بغیر زیادہ دور نہیں جا سکتے لیکن مذہب میں زندگی کی قوت پیدا کرنے کے لئے اُسے زمانے کی روشنی میں سمجھنا اور وقت کی اصلاح میں سمجھانا ضروری ہے۔

در اصل اس ضرورت کو ساری دنیا کے مسلمان بڑی بے چینی سے محسوس کر رہے ہیں جو اضطراب اور التہاب اس وقت مسلمان ملکوں میں مصر سے پاکستان تک نظر آ رہا ہے اس کی تہہ میں یہی آرزو ہے کہ اپنے مذہبی عقیدے کو عہد حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے اس کے اندر ایک انقلابی قوت پیدا کریں اور اس قوت کے بل پر تجدد اور ترقی کی راہ میں قدم بڑھائیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ہر ملک میں حکمران گروہ ان کے سچے اور گہرے مذہبی جوش کو انقلاب کے رخ سے ہٹا کر رجعت کی طرف ڈھکیل رہا ہے اور ان کو یہی تعلیم دے رہا ہے کہ دین ایمان، تہذیب تمدن جو کچھ ہے وہ اوپر کے طبقے کا سیاسی اور معاشی مفاد ہے۔ اس کے مٹتے ہی اسلام مٹ جائے گا اسے انگریزوں، امریکیوں، یہودیوں، ہندوؤں یا کمیونسٹوں کی طرف سے شدید خطرہ لاحق ہے۔ اس کی حفاظت ان غیر مسلموں کے ہاتھ سے ایک مقدس فرض ہے جس کے لئے ہر مسلمان کو اپنا جان و مال قربان کر دینا چاہئے۔

ان سب ملکوں میں تعلیم یافتہ اور سوچنے والے لوگ بہت کم ہیں اور اگر ہیں بھی تو اوپر کے طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں یا ان کے ساتھ گہرے رشتوں سے وابستہ ہیں۔ اس لئے یہ اُمید نہیں ہوتی کہ مذہبی جوش کے ہیجان کو ایک مدت تک سچے تجدد یا ترقی پسندی کی انقلابی شکل میں اُبھرنے دیا جائے گا۔ وہاں اب تک ایک نعرہ تکبیر ایک فتویٰ جہاد ترقی پسندانہ تحریک کو ختم کرنے کے لئے کافی ہے۔ صرف ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں مسلمانوں میں اوپر کے طبقے قریب قریب ختم ہو گئے ہیں۔ تقسیم سے ہندوستانی مسلمانوں کو جہاں بے شمار اور بے اندازہ نقصان (بقیہ صفحہ ۱۴ پر)

بزم بے تکلف

(نئی دہلی میں پارلیمنٹ کی عمارت کے سامنے موٹروں کے احاطے کے اندر بزم بے تکلف کا نقشہ جما ہوا ہے دوب کے نرم اور سبز فرش پر آنریبل ممبروں کے ہانکنے والے (ڈرائیور) چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بیٹھے لیٹے ہوئے گپ ہانک رہے ہیں۔ ایک چوکڑی جس میں ہر ایک الگ کھیت کا معلوم ہوتا ہے کسی اہم واقعے پر اس قدر برجستہ رائے زنی کر رہی ہے کہ دور سے دیکھنے والے کو لکمد زنی کا شبہہ ہوتا ہے۔ آپ کا نامہ نگار ذرا باہر تحمل کے کان لگائے سُن رہا ہے۔ پارلیمنٹ کے اندر نئی مخالف پارٹی کا قیام موضوع بحث معلوم ہوتا ہے)

ا - ارے یار چھوڑو اس گل کو۔ نہ سٹھ نہ پنجہ۔ بارہ کی پارٹی کیا تیر مار لے گی؟

ب - ارماں کیا تھڑدوں کی باتیں کرتے ہو۔ بارہ کیا کم ہوتے ہیں۔ ان کانگریس والوں کو ناکوں چنے نہ چبوا دیں تو میرا نام بدل دینا۔

ج - تیرا نام بدلے پیچھے اپنے کو کیا مل جائیں گا؟ ہم بیٹ (شرط) کرنا منگتا۔

ب - ابے تو تو سدا کا منگتا ہے، مگر یہاں کوئی دانا آنکھ کا اندھا گانٹھ کا پورا نہیں ملنے کا۔ گھڑدوڑ میں بازی لگاتے لگاتے جوئے کا ایسا اپکا ہو گیا ہے کہ جب دیکھو شرط بدنے کو موجود۔ اور یہاں بد کے پاس نہیں کھڑے ہوتے۔

د - مگر تین سو ممبر کا شومنے بارہ کیا کر سکتا؟ آمی یہ نہیں شومجھا۔

ب - تمی آج تک کوئی بات سمجھا ہے جو یہ سمجھے گا۔ سچ کہتا ہوں ایسے ایسے جانگلوؤں سے سابقہ پڑا ہے کہ جی چاہتا ہے کپڑے پھاڑ کر جنگل کی راہ لوں، بات کرنے کی تمیز نہیں ہے اور چلے ہیں سیاست میں ٹانگ اڑانے۔ ارے بھلے آدمیو۔ سمجھنو! ذرا کان کھول کے منہ پھیلا کے میری بات دھیان سے سنو۔ یہ تو ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ بارہ آدمی چاہے وہ سب کے سب سردار حکم سنگھ کی طرح تگڑے کیوں نہ ہوں تین سو کو کشتی میں نہیں ہرا سکتے اور پھر یہاں تو ان بارہ میں ہمارے پروفیسر کے، ٹی شاہ اور مولانا حسرت موہانی جیسے سینکیا پہلوان ہیں جن سے اپنا لنگر آپ نہیں سنبھلتا۔ مگر اس گول اکھاڑے کے اندر جسے اسمبلی کہتے ہیں کچھ ہاتھ پاؤں یا تیر تلوار کی لڑائی تھوڑی ہوتی ہے یہاں تو زبان کی کاٹ کا مقابلہ ہوتا ہے اور اس میں ہمارے یہ دونوں بوڑھے ساونت کسی سے کم نہیں۔ ویسے تو پالا کانگریس والوں کے ہاتھ ہے، اور جب تک دوسرے انھیں چناؤ میں جیت نہ کر لیں راج پر بندھ میں ان ہی کی چلتی رہے گی، پر جنتا راج کا قاعدہ ہے کہ ایک مخالف دل ہونا چاہئے جو حکومت والوں کو جھاڑتا اور

(بقیہ صفحہ ۱۴ پر)

پچھلا ہفتہ :-

ا۔ ہندوستان

آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں

آئین ساز اسمبلی آئین کے مسودے کی دوسری پڑھائی ۱۵ اگست تک ختم نہیں کر سکی اہم مسائل میں اب صرف حق ملکیت کا مسئلہ اور ملک کے نام اور قومی زبان وغیرہ کے مسئلے باقی رہ گئے ہیں لیکن اسمبلی کے بعض ممبروں کو خدا نے "واعظ کی زبان" عطا کی ہے جس کی شاعر کو تمنا تھی اور جس کی تعریف میں اس نے کہا ہے

عجیب چیز ہے یہ طول مدعا کے لئے

اس لئے اسمبلی کا اجلاس ہے کہ کھچتا چلا جاتا ہے۔ دیر کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قومی زبان اور صوبوں کی زبانوں کے بارے میں جن دفعوں کا مسودہ کے۔ ایم۔ منشی اور شری گوپالا سوامی آئنگر نے مل کر تیار کیا ہے، ان پر اسمبلی کی کانگریس پارٹی تین چار روز کی گرما گرم بحثوں کے بعد بھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکی ہے۔ ان دفعات میں زبان کے پیچیدہ مسئلے کا معقول حل تجویز کیا گیا ہے جس میں ضمناً اردو زبان کے تحفظ کی بھی اچھی خاصی صورت نکل آئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اختلاف صرف اشارہ گیا ہے کہ جنوبی ہند کے ممبر اور ان کے ہمدرد قومی زبان میں انگریزی ہندسوں کے استعمال پر زور دے رہے ہیں اور ہندی کے حامی اس کے خلاف ہیں۔ ابھی تک مصالحت کی کوئی صورت نہیں نکلی ہے شاید سردار ولبھ بھائی پٹیل کی واپسی کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ بہرحال ہندسوں کا معاملہ جزوی ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ سب فریقوں نے اس اصول کو تسلیم کر لیا ہے کہ قومی زبان کو عام بول چال کی ہندوستانی سے دور نہیں ہٹنا چاہئے، اور صوبوں کی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان اور رسم خط کو بھی حکومت کی حمایت حاصل ہونی چاہئے۔ مجوزہ دفعات کے پاس ہو جانے کے بعد ہم ان کو نقل کر کے ان پر تفصیل سے تبصرہ کریں گے۔

ننگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

یہ خطرہ بہت سے لوگوں کے دل میں اس وقت سے پیدا ہو گیا ہے جب سے یہ خبر آئی کہ ہندوستان کو ورلڈ بینک سے پہلی قرضے کی رقم ریل کے انجن اور دوسرا سامان خریدنے کے لئے مل ہے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ وادی دامودر، بھکرا اور ننگل کی پن بجلی کے منصوبوں کو عمل میں لانے کے لئے کروڑ ۱۰ لاکھ ڈالر (تقریباً ۲۸ کروڑ روپے) کے مزید قرضے کی گفتگو اسی بینک سے ہو رہی ہے۔ اس کے بعد ہیرا کنڈ کے زبردست منصوبے کے لئے ایک نئے قرضے کی درخواست کرنے کی تجویز ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ سب منصوبے جن کے لئے قرض لیا جا رہا ہے ہندوستان کی زراعت اور صنعت کی ترقی کے لئے بہت ضروری ہیں اور ان سے ملک کی خوش حالی میں بہت جلد نمایاں اضافہ ہو جائے گا۔ یہ بھی مسلم ہے کہ ان منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جو سامان درکار ہے اس کا بہت بڑا حصہ صرف امریکا ہی سے مل سکتا ہے۔ اور اس کے خریدنے کے لئے ڈالر صرف قرض ہی کے ذریعے سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ پھر بھی اس بات کو دیکھتے ہوئے کہ آج کل کوئی ملک دوسرے ملک کو محض خلوص نیت سے یا صرف سود کی خاطر قرض نہیں دیا کرتا بلکہ اس کے ذریعے سے اس ملک میں اپنا سیاسی اثر قائم کرنا ہے اور اس سے اپنے مقاصد کے لئے کام لیتا ہے، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں اس قرض کی کیا قیمت ادا کرنی پڑے گی شاید یہ کہا جائے کہ یہ قرض کسی خاص ملک سے نہیں بلکہ ایک بین الاقوامی ادارے سے لیا جا رہا ہے۔ لیکن اس سے شبہہ کرنے والوں کو اطمینان نہیں ہوتا اس لئے کہ ان اداروں پر امریکا کا جس قدر تسلط ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ اگر حکومت لوگوں کے دل سے اس خلش کو مٹانا چاہتی ہے تو اسے ان شرطوں کو تفصیل سے شائع کرنا چاہئے جن پر قرض لیا گیا یا لیا جا رہا ہے۔

بڑی چوکسی کی ضرورت ہے

وزیر بحالی شری موہن لال سکسینہ نے ۲۹ اگست کو نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو اس ضابطے سے پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں جو تارکین وطن کی املاک کو حکومت کے انتظام میں لینے کی متعلق جاری کیا گیا ہے یہ صرف ان لوگوں کی املاک کے لئے ہے جو ہندوستان سے ترک سکونت کر کے پاکستان چلے گئے ہیں

یہ بات تو ظاہر ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جو پالسی اس وقت مہاجروں کی جائداد کے بارے میں اختیار کی گئی ہے وہ قانونی نہیں بلکہ انتظامی ہے اور صرف اس وقت تک کے لئے ہے جب تک کہ دونوں ملکوں کی باہمی گفت و شنید یا بین الاقوامی عدالت کے ذریعے سے اس مسئلے کا کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو جائے، لیکن اس عارضی پالسی کے غلط استعمال سے لوگوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے اور بعض صورتوں میں پہنچ رہا ہے اور ان کی شکایتیں اور شبہے اس طرح کے اعلانوں سے دور نہیں ہو سکتے دونوں حکومتوں کو انتہائی چوکسی کی ضرورت ہے کہ نیا ضابطہ مقامی افسروں اور پولیس کے ہاتھوں میں بے گناہوں کو لوٹنے اور ستانے کا ایک نیا آلہ نہ بن جائے۔ ایک تو اس ضابطے کے عمل درآمد پر حکومت کو خود کڑی نگرانی رکھنی چاہئے، دوسرے ہر صوبے میں خاص عدالتیں مقرر ہونی چاہئیں جن میں ان شکایتوں کی جو لوگوں کو اس سلسلے میں پیدا ہوں جلد اور آسانی سے دادرسی ہو سکے۔

دیکھئے
اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا

(بہ سلسلہ صفحہ ۳)

ہوئے ہیں، وہاں ایک فائدہ بھی ہوا، اور وہ یہ ہے کہ ان کی مذہبیت کے سینے سے اوپر کے طبقے کے سیاسی اور معاشی مفاد کا کابوس ہٹ گیا اور اب ان کے مذہبی احساس کو آسانی سے سانس لینے کا اپنے آپ کو پہچاننے کا اور حقیقی راہ عمل ڈھونڈھنے کا موقع ملا ہے اور اب ان غریب بے مایہ مسلمانوں کو جو ہندوستان میں باقی رہ گئے ہیں سرمایہ پرستی کی کسی کھلی یا چھپی ہوئی صورت کے متعلق یہ یقین دلانا کہ یہی تمہارا مذہب ہے قریب قریب ناممکن ہے۔ اب صرف ترقی پسند تحریکیں ان کو اپنی طرف کھینچیں گی۔

یہ وقت ہے کہ ہندوستان کے مسلمان دنیا کے مسلمانوں کی سچی اور گہری قلبی آرزو کو پورا کریں یعنی اپنے مذہب کو آج کی روشنی میں سمجھیں اور آج کی اصطلاح میں سمجھائیں اور اسے ایک بار پھر دنیا کے لئے امن و ترقی کی زبردست قوت بنا دیں۔ اگر انھوں نے اب بھی اس میں غفلت کی تو وہ ترقی پسند تحریکوں کے دھارے میں ذی ارادہ تیراک کی طرح تیرنے کے بجائے بے حس اور بے جان تنکوں کی طرح بہتے چلے جائیں گے۔ لیکن اگر انھوں نے اسلام کی حقیقی تعلیم کو سمجھ کر اسے عہد حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ بنا لیا تو شاید وہ انقلابی تحریکوں کو اپنے شعور، ارادے اور مقاصد کے سانچے میں ڈھال سکیں اور ان میں وہ روح معنی اور سوز باطن پیدا کر سکیں جن سے وہ اب تک محروم ہیں۔

مختصر یہ کہ اگر سب کچھ کھو کر وہ اپنی روح کو، روح اسلام کو پالیں تو سودا کچھ مہنگا نہیں رہے گا۔

بزم بے تکلف

(بہ سلسلہ صفحہ ۳)

جھنجھوڑتا رہے، نہیں تو طاقت کا نشہ ایسا برا ہوتا ہے کہ اچھے بھلے آدمی کی مت ماری جاتی ہے۔ اب تک تو یہ تھا کہ اکا دکا کسی نے حکومت کو ٹوکا بھی تو نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا تھا، پر اب بارہ توتے مل کر ٹیں ٹیں کریں گے تو نقارچی کے کان تک بھی کچھ نہ کچھ آواز پہنچ ہی جائے گی کہو کچھ آیا سمجھ میں؟

ا۔ آہو سائنو سمجھ آ گئی

ب: بڑی جلدی آ گئی۔۔ تم کچھ ماسٹر؟

ج۔ برابر بات ہے؟

ب۔ ہے نہ بالکل چورس؟ اور تم بابو؟

د۔ آمی کھوب شو مجھ گیا۔

ب۔ بوش پھر کیا ہے! تم شب کو شنا دو۔

ہم "نئی روشنی" کے پڑھنے والوں سے معافی چاہتے ہیں کہ اخبار کی نئی ترتیب جس کا ہم نے اعلان کیا تھا اس بار عمل میں نہ آ سکی، ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ۸ یا ۱۶ ستمبر کے پرچے سے ضرور شروع ہو جائے

(ادارہ)

۲- پاکستان

مغربی پنجاب کی سیاست میں نیا موڑ

سردار عبدالرب نشتر گورنر مغربی پنجاب کو عوام کا اعتماد حاصل کرنے میں خاصی کامیابی حاصل ہوئی ہے اور عام طور پر یہ امید ظاہر کی جا رہی ہے کہ صوبے کی پیچیدہ اور الجھی ہوئی سیاست کو سلجھانے میں بھی وہ کامیاب رہیں گے ان کی مدد کے لئے لیاقت علی خان صاحب بھی لاہور تشریف لائے تھے، ان کی اس آمد کو سیاسی حلقوں میں بڑی اہمیت دی گئی اور ان کے پانچ روزہ قیام سے وہاں کی سیاست میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی۔

مغربی پنجاب کا — بلکہ کہنا چاہئے کہ پورے پاکستان کا آج کل سب سے اہم مسئلہ گورنر کے مشیروں کا تقرر ہے۔ ممدوٹ کی علیحدگی اور پاکستانی گورنر کے تقرر سے۔ میاں عبدالباری صدر مسلم لیگ مغربی پنجاب کے مخالفین کو کام کرنے کا نیا اور مناسب موقع مل گیا ہے چنانچہ ۸۰ ممبروں نے مشیروں کے تقرر پر غور کرنے کے لئے، کونسل کو بلانے کی درخواست کی ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ موجودہ بدلے ہوئے حالات میں کونسل کو اپنے پچھلے فیصلے پر نظرثانی کا موقع دینا چاہیے۔ بعض سیاسی حلقوں کا خیال ہے کہ اگر یہ مسئلہ دوبارہ زیر غور آیا تو اکثریت مشیروں کے تقرر کے خلاف رائے دے گی اور بہت ممکن ہے کہ میاں عبدالباری کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک بھی پیش ہو۔

اقتدار کی جنگ

میاں دولتانہ کے استعفے کے بعد باتفاق رائے جب میاں عبدالباری پاک پنجاب صوبہ مسلم لیگ کے صدر چنے گئے تو لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا کہ خدا کا شکر ہے مسلم لیگی قیادت کے آپس کے جھگڑے ختم ہوئے اور امید ہے وہ اب تعمیری کاموں کی طرف توجہ کر سکے گی اور عوام مسلم لیگ سے جو توقعات وابستہ کئے بیٹھے ہیں وہ پوری ہو جائیں گی اور اس صوبے کے دن پھر جائیں گے۔

میاں عبدالباری نے تعمیری کام کے ابھی کچھ خانے ہی بنائے تھے کہ وہ "موچیا کو ہٹاؤ" کی بحث میں پھنس گئے۔ یہ بحث جس طرح اٹھی اور اس کے اٹھانے میں جو ذہنیت پیش پیش تھی اس سے لوگوں میں خواہ مخواہ غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں اور مسلم لیگی قیادت بھی دو دھڑوں میں بٹ گئی اور صوبہ مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری، جائنٹ سکریٹری اور مجلس عاملہ کے چند ارکان مستعفی ہو گئے۔ ممدوٹ کے جانے سے یہ ناخوشگوار بحث ختم ہو گئی چنانچہ ۱۱ اگست کو مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا جس میں جنرل سکریٹری اور دوسرے عہدہ داروں کا باتفاق رائے انتخاب عمل میں آیا اور ایک بار پھر امید بندھی کہ مسلم لیگی رہنما مل جل کر اور متحد ہو کر صوبے کی قیادت کو سنبھال لیں گے اور اس وقت صوبے کے اندر جو خلفشار برپا ہے اس کو دور کرنے کا سوچیں گے۔

لیکن یہ جان کر کتنا دکھ ہوتا ہے کہ ۱۱ اگست کو تو ہمارے یہ لیگی رہنما بالاتفاق رائے عہدہ داروں کو منتخب کرتے ہیں لیکن دوسرے ہی دن ان میں ایک دوسرے کو زک دینے کے لئے دھڑے بندیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ ایک گروہ سمجھتا ہے کہ چونکہ میری پسند کے لوگ عہدہ دار منتخب نہیں ہو سکے اس لئے دوسرے گروہ سے ٹکر لئے بغیر چارہ نہیں۔ چنانچہ اس کے لئے حلیف ڈھونڈے جا رہے ہیں مختلف اغراض والوں کو اکٹھا کیا جا رہا ہے۔ اندر ہی اندر جوڑ توڑ ہو رہے ہیں۔ سازشیں کی جا رہی ہیں۔ کہیں زمینداری کی حفاظت کا نام لیا جاتا ہے اور کہیں سابقہ "غداریاں" یاد دلا کر ڈرایا جا رہا ہے، الغرض ایک چکر ہے جو صوبے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چل رہا ہے، تعمیری کاموں کو سب بھول گئے ہیں۔ اور اپنے گروہ کے لئے اقتدار حاصل کرنا ہر شخص کا مقصد بن گیا ہے۔ اندیشہ یہ ہے کہ جوں جوں انتخابات کے دن قریب آئیں گے، یہ چکر زیادہ وسیع اور زیادہ تیز ہوتے جائیں گے اور ممکن ہے ہماری ساری سیاست انہی چکروں میں مٹ کر رہ جائے اور کسی کو صوبے اور عوام کا خیال تک نہ رہے۔

(آفاق، لاہور)

مغربی پنجاب میں انتخابی تیاریاں

پاک پنجاب میں آئندہ انتخابات کی تیاریاں بڑے وسیع پیمانے پر شروع ہو رہی ہیں۔ چونکہ رائے دہی کا معیار بدل جانے سے حلقوں کی توسیع ہو گئی ہے، اس لئے نئے حلقوں کی حد بندی کے سلسلے میں مختلف اصحاب دوڑ دھوپ کر رہے ہیں، ان کی کوشش ہے کہ حلقے اس ترکیب سے بنائے جائیں کہ ان کی یا ان کے امیدواروں کی کامیابی یقینی ہو جائے۔ چنانچہ انتخابی کمیٹی کے صدر کے بنگلے پر اچھا خاصا ہجوم رہتا ہے۔ اگرچہ صاحب صدر محض سفارشات ہی کریں گے اور ان کا خیال ہے کہ سفارشات میں اہم اور مقدم چیز صوبے کا مجموعی مفاد اور امیدواروں کے لئے اصطلاحی "سہولتوں" کا خیال ہوگا۔ تاہم میری کے امیدوار اور ان کے لگے بندھے اپنا اپنا نقطہ نظر بیان کرنے کی دھن میں ہیں پرانے یونینسٹ بھی پر پرزے نکال رہے ہیں بعض اصحاب کی کوشش ہے کہ ان کی اپنی برادریوں یا برادری کی اکثریت کے مطابق حلقے بنیں اس سارے ہنگامے میں بیچارے مہاجر اپنی تقدیر کا تماشا دیکھ رہے ہیں اور مہاجرین کی طرف سے انتخابی تحقیقاتی کمیٹی میں مولانا غلام بھیک نیرنگ کی نامزدگی بھی تضحیک بنا دی گئی ہے۔ کیونکہ مہاجر ابھی نہ معاشی طور پر بحال ہوئے ہیں نہ انھیں اپنے آئینی حقوق کے متعلق کوئی اطمینان ہے۔ حلقوں کی تقسیم اس بارے میں نہایت اہمیت رکھتی ہے، لیکن اب تک حلقوں کی جس ترتیب کا پتہ لگتا ہے وہ مہاجرین کے ساتھ انصاف نہیں کرتی خصوصاً ضلع کے وہ علاقے جہاں مہاجرین کی اکثریت ہو سکتی ہے۔ ابھی تک معرض بحث میں ہیں اور ان کے متعلق اطمینان انگیز فیصلہ نہیں ہوا۔ حلقوں کی تقسیم میں مہاجرین کی اکثریت کا خیال بہت اہم چیز ہے۔ کیونکہ محض ایک تعداد ہی ان کے پاس رہ گئی ہے اور اگر بروقت ادھر توجہ نہ دی گئی تو دوڑ دھوپ کرنے والے حضرات بہرحال فائدے میں رہیں گے صاحب صدر کو یہ متاثر نہ بھی کر سکیں تو بھی ان کا اپنے معاشی، ورثائی حقوق کے متعلق اطمینان ان کی کامیابی کا ضامن ہوگا۔

(سفینہ، لاہور)

کپڑا سستا مگر بے روزگاری کا خطرہ

کپڑے اور سوت پر سے کنٹرول ہٹا لینے سے پاکستان میں کپڑے کی قیمتیں بہت گر گئی ہیں اور عوام پر اس کا نہایت خوشگوار اثر پڑا ہے۔ مگر اس کی وجہ سے دیسی پارچہ بافی کی صنعت کو سخت نقصان پہنچا ہے اور اگر یہی کیفیت رہی تو بقول مختیار صدر فیڈریشن آف مغربی پنجاب ٹکسٹائل اینڈ ہوزری ہینڈ لوم ایسوسی ایشن کے بیان کے مطابق مغربی پنجاب کے ساڑھے تین لاکھ افراد بیکار ہو جائیں گے اور اس کا کوئی ۱۳ لاکھ پر اثر پڑے گا۔ اس صنعت میں تقریباً ڈیڑھ کروڑ کا سرمایہ مہاجرین کا بھی ہے۔ اس لئے اس صنعت کی تباہی سے مہاجرین کو بھی بہت سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ انہی اسباب کی بنا پر مختیار صاحب نے حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا ہے کہ بدیسی کپڑے اور ہوزری کے سامان کی درآمد بالکل بند کر دی جائے۔ اور سوت پر دوبارہ کنٹرول لگا دیا جائے۔ انھوں نے یہ بھی تجویز کی ہے کہ حکومت مغربی پنجاب کی چار ٹکسٹائل ملوں پر قبضہ کرے اور ان کو تین پالیوں (شفٹ) میں چلائے۔ اس طرح انھیں امید ہے کہ مغربی پنجاب میں ہاتھ کے کپڑے کے لئے جس قدر سوت کی ضرورت ہو گی وہ ان ملوں سے پوری ہو جائے گی۔

تعلیمی معیار

پاکستان کے قیام کے بعد تعلیمی معیار بلند ہونے کی بجائے گر رہا ہے۔ اس کا اندازہ اسکولوں کی حالت سے لگایا جا سکتا ہے۔ جہاں ابھی تک استادوں کی کمی ہے اور [illegible] بکثرت ہے۔ مگر ان کے پڑھانے کے لئے استادوں کی کمی ہے استادوں کی کمی اس لئے ہے کہ انھیں تنخواہیں کم ملتی ہیں کئی مدرس ہیں جو لوکل بورڈوں کی تحویل میں ہیں انھیں دو تین ماہ تک تنخواہیں نہیں ملتیں۔ معائنہ کنندگان [illegible] کا یہ حال ہے کہ وہ کئی اسکولوں میں دو دو تین تین سال سے معائنہ کے لئے تشریف ہی نہیں لے گئے۔ روزنامہ سعادت، لائل پور

۳ - باہر کی دُنیا

انڈونیشی یونین کیسی ہو؟

ہیگ میں گول میز کانفرنس اطمینان بخش طریقے پر ہو رہی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ہر دو فریق سنجیدگی سے ساتھ اختلافی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

انڈونیشیا کا مقدمہ اب تک کامیابی کے ساتھ اس لئے چل رہا ہے کہ ریپبلکن اور فڈرلسٹ پارٹی میں پائدار اتحاد ہے، لیکن تفصیلات میں آنے کے بعد بعض مسائل میں دونوں پارٹیوں کی رایوں میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے، اختیارات کی منتقلی کے بارے میں دونوں متفق ہیں مگر یونین کے ڈھانچے کے بارے میں اب تک اتفاق رائے نہیں ہے ریپبلکن ہالینڈ سے محض برائے نام تعلق رکھنا چاہتے ہیں، ٹھیک ویسا جیسا ہندوستان کا برطانیہ سے ہے۔ برخلاف اس کے فڈرلسٹ بہت پائدار اور گہرا تعلق رکھنے کے حق میں ہیں۔ بالکل یہی خیالات ہالینڈ کے نمائندوں میں بھی ہے قدامت پسند جن کی رہنمائی پروفیسر کارل روم کیتھولکس کر رہے ہیں، گہرا تعلق رکھنے کے حامی ہیں اور لیبر لیڈر موسیو وان ٹرس کا خیال ہے کہ یونین جس قدر کمزور ہوگی انڈونیشیا اور ہالینڈ کے تعلقات اسی قدر زیادہ اچھے اور پائدار ہوں گے بہر حال یہ اختلاف رائے اس حد تک نہیں ہے کہ یہ کانفرنس ناکام رہے یا ریپبلکن اور فڈرلسٹ کا اتحاد ٹوٹ جائے۔ مگر اس کی وجہ سے یہ خدشہ ضرور پیدا ہو گیا ہے کہ ہالینڈ کو اپنی شرطیں منوانے میں آسانی پیدا ہو جائے گی۔

مشرق وسطیٰ میں فوجی تیاریاں

انجمن اقوام متحدہ نے جون ۱۹۴۸ء میں مشرق وسطیٰ کو ہتھیار بھیجنے پر جو پابندی لگائی تھی اس کے اُٹھ جانے سے برطانیہ کو عرب ریاستوں کو مسلح کرنے کا بہت اچھا موقع مل گیا ہے چنانچہ آج کل عرب ریاستوں کی فوجوں میں نہایت تیزی کے ساتھ توسیع ہو رہی ہے اور جدید تربیت

ان کو دیں کیا جا رہا ہے

مصر میں سب سے بڑی فوج تیار کرنے کی اسکیم بنائی گئی ہے اسی سلسلے میں بجٹ میں ۹ کروڑ ۰ لاکھ مصری پونڈ مدافعت کے لئے، تین لاکھ مصری پونڈ جدید ہتھیار کے لئے، اور ایک کروڑ مصری پونڈ جنوبی فلسطین کی مصری فوج کے لئے منظور کئے گئے ہیں۔ شام میں مرحوم حسنی الزعیم کا اس سال کے آخر تک ۱۲ ہزار کی ایک بہترین فوج تیار کرا لینے کا ارادہ تھا اس کے لئے انھوں نے بہت سے افسر ٹریننگ کے لئے فرانس بھیجے تھے اور خود شام میں بہت سے ٹریننگ سنٹر قائم کئے تھے۔ اسی طرح لبنان میں بھی بہت تیزی سے تیاریاں ہو رہی ہیں۔ جبری بھرتی کا قانون اس وقت زیر غور ہے۔ ہوائی فوج جدید طریقوں پر تیار کی جا چکی ہے اور وزیر مدافعت ماجد ارسلان نے اعلان کیا ہے کہ فوج کو جدید طریقوں پر ٹریننگ دینے کا کام بہت جلد شروع ہونے والا ہے۔ شرق اردن کی فوج کا مشرق وسطیٰ کی بہترین فوجوں میں شمار ہوتا ہے مگر پھر بھی اس میں مزید توسیع کی جا رہی ہے اور برطانیہ سے بہت کافی ہتھیار بہت جلد پہنچنے والا ہے غرض تمام عرب ریاستیں روس اور اسرائیل کے مقابلے کے لئے اپنی فوجی طاقت کو بڑھانے اور اس کو بہتر بنانے کی پوری کوشش کر رہی ہیں اور برطانیہ ان کی دل کھول کر مدد کر رہا ہے۔

اسرائیل کی جوابی کارروائی

ظاہر ہے اسرائیلی حکومت ان تیاریوں سے بے خبر نہیں ہے بلکہ وہ تو پہلے سے چیکوسلوواکیہ کی معرفت باہر سے ہتھیار منگاتی رہی ہے۔ اس کے علاوہ خیال ہے کہ پانچ چھ مہینے میں ایران اور سعودی عرب سے برطانیہ اور امریکا کا تیل خلیج عقبہ سے حیفہ تک ایک نئی پائپ لائن کے ذریعے لایا جائے گا۔ ایسی صورت میں نہر سویز کی موجودہ اہمیت جاتی رہے گی اور اسرائیلی حکومت کی سیاسی اہمیت بہت بڑھ جائے گی۔

خیال

تیغ الٰہ آبادی

اُف یہ صدیوں کا دل یہ بارِ گراں
اونگھتے پیڑ، سرنگوں کلیاں
مضمحل نور، مضمحل خوشیاں

اَن گنت خواب، اَن گنت ارماں
اَدھ کھلے پھول اَدھ کھلی کلیاں
غمِ دوراں نہیں — غمِ جاناں
بادشاہوں کا قصّۂ من و تو
تیرہ سِکّوں کا تیرہ تر جادو
سُرخ تاریکیاں، سیاہ لہو
منتشر وقت، منتشر گیسو
بے اثر آہ، بے اثر آنسو
غمِ جاناں نہیں — غمِ دوراں
ذہن کی قبر، دِل کا ویرانہ

فکرِ روزی، تلاشِ میخانہ
مارکس بے تاب، قیس دیوانہ
تلخ تحقیق، تلخ افسانہ
مردہ تنویر، مردہ پروانہ
غمِ جاناں ہے اور غمِ دوراں
الغرض، اِک نہ اِک غمِ گل وخار
فلسفے کا خمار، عِشق کا بار
دِل کی بے چارگی، دِماغ کی ہار
حسرتِ صلح، حسرتِ پیکار
کبھی تریاقِ غم، کبھی تلوار
صیدِ ابلیس، کشتۂ یزداں
حیف صد حیف حضرتِ انساں

ساحرِ فن

علی حمّاد عباسی

اپنے سینوں میں سمیٹے ہوئے تاریکیٔ شب
نور کی سمت نہ جانے کی قسم کھائے ہوئے
خشک ہونٹوں پہ لئے تشنہ لبی کی لعنت
کتنے ہی جام تصوّر کے ہیں چھلکائے ہوئے
شدّتِ درد کی بے کیف گراں باری میں
اپنے انفاس کے ہر تار کو اُلجھائے ہوئے
کوئی خواہش، نہ تمنا، نہ کوئی جوشِ عمل
روز و شبِ زیست کے ہنگاموں سے اکتائے ہوئے
کسی اُجڑے ہوئے مہجور پرندے کی طرح
غم کو سمجھے ہوئے، پرکھے ہوئے اپنائے ہوئے
انھی رزاتوں کے گراں بارِ سلاسل کے تلے
بنتے ہی جاتے ہیں موہوم اُمیدوں کا کفن
اُن کے خوابوں میں بھی آئی نہ سحر کی تصویر
اب بھی کھوئے سے ہیں ویرانوں میں یہ "ساحرِ فن"
اُن کے احساس کے تاریک صنم خانوں میں
فہم و ادراک و توازن کی جلا کر قندیل

ان کو معلوم نہیں رقصِ فضا ہے کیا چیز؟
پھول کھلتے ہیں کہاں، آتی ہے کب فصلِ بہار؟
مُسکرا اُٹھتے ہیں کِس طرح شہابی چہرے؟
آنکھیں ہو جاتی ہیں کیوں شرم و حیا سے سرشار؟
دور تک پھیلے ہوئے غم کے شبستانوں میں
صبحِ اُمید ہوا کرتی ہے کیسے بیدار
ہو کے مزدورِ طربنائیٔ فردا میں مگن
کیوں نہیں کرتا کبھی اپنی شِکستوں کا شُمار؟
کتنے آلام و مصائب کے تلے دب کر بھی
نوعِ انسان نہ ہوئی کیسے ہزیمت کا شکار؟
کتنے ہی اُلجھے ہوئے درد ہیں انسانوں کے
جن کی پہنائی سے ہیں اُن کے یہ نغمے محروم
اُن کے گیتوں میں سسکتے ہوئے ارماں بھی ہیں
آتے ہی جلتے یہاں ڈوب گئے کتنے نجوم
کوئی نقطہ مرے [illegible] سے اتنا
نورِ تنقید [illegible] اجالا

غالب کے اردو کلام میں فارسی عنصر

عبدالقادر، میسور یونیورسٹی

جیسے جیسے اردو شاعری کا ذوق لوگوں کے دلوں میں بڑھتا جا رہا ہے، اسی قدر غالب کی ہردلعزیزی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اردو کے شاعر کی حیثیت سے غالب کی شہرت تمام تر اس کے مختصر دیوان پر مبنی ہے جس میں درج شدہ غزلوں کی تعداد دو ڈھائی سو سے زیادہ نہیں۔ اس مختصر دیوان کی کئی شرحیں چھپ چکی ہیں اور نہیں معلوم کتنی اور چھپیں گی۔ اس کے ساتھ ساتھ غالب کے کلام پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے محاسن اور معائب گنائے گئے ہیں، مگر اب تک شاید ہی کسی کی نظر اس کے اردو کلام میں پائے جانے والے فارسی عنصر کو ڈھونڈ نکالنے پر پڑی ہو۔

یہ بات مسلم ہے کہ غالب فارسی کا ایک جید عالم تھا اور اس کو اپنی فارسی پر ناز تھا۔ اس صورت میں اردو شاعری کی طرف جب اس کی طبیعت نے رخ کیا تو کیا یہ بات بعید از قیاس ہے کہ اس کی فارسی کا اثر اس کی اردو پر نہ پڑا ہو۔ اردو شاعری خصوصاً اردو غزل گوئی کی تاریخ پر خامہ فرسائی کرنے والے تقریباً سب کے سب اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ اس کی بنا ڈالنے والے اور پرداخت کرنے والے فارسی گو شعرا تھے، اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ اردو شاعری فارسی کی بیٹی ہے۔ فارسی شاعری کا اثر اردو شاعری پر کتنا پڑا، اس پر بحث کرنا موضوع سے خارج ہے۔ لیکن اتنا کہے بغیر بھی نہیں رہا جاتا کہ بقول پروفیسر سید سری "اگر اردو زبان کو یا یوں کہیے اردو شاعری کو اس کے نشوونما کے ابتدائی مرحلے پر فارسی کا سہارا نہ ملتا تو یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کو اس قدر جلد ترقی نصیب ہوتی" (اقتباس از اردو مثنوی کا ارتقا، صفحہ ۳۲)

کہا جاتا ہے کہ فارسی گو شعرا اپنے تفریح خاطر کے لیے یا تفنن طبع کے لئے اردو اشعار لکھ لیتے تھے چنانچہ امیر خسرو جن کو اردو شاعری کا باوا آدم تصور کیا جاتا ہے اُن کے متعلق بھی یہی خیال ہے کہ وہ خاقانی، نوری، فردوسی وغیرہ مستند شاعروں کی زبان کو چھوڑ کر جب ہندی فارسی آمیز پہیلیاں، کہہ مکرنیاں وغیرہ لکھتے تو اپنی طبیعت بہلانا ان کا مقصد ہوتا تھا۔ امیر خسرو کے بعد جس اردو شاعر نے فارسی کا زیادہ اثر قبول کیا وہ ولی اورنگ آبادی تھا جس کے اردو دیوان کا اثر دہلی کے شعرا پر بھی پڑا اور سب نے فارسی الفاظ اور تراکیب کو ملا کر فارسی اوزان میں غزل لکھنا شروع کیا۔ پروفیسر وحید الدین سلیم نے "ایہام" ولی کے زمانے سے میر کے زمانے تک بلکہ آگے چل کر غالب کے زمانے تک شعرا برابر اس بات کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ فارسی زبان کی ترکیبوں اور محاوروں کا ترجمہ اپنی زبان میں کریں اور اس طرح اردو میں نئی ترکیبوں اور نئے محاوروں کا اضافہ کیا جانے لگا۔

دوسرے شاعروں کو چھوڑ کر ہم صرف غالب کو لیتے ہیں جس کے ابتدائی کلام میں فارسی کا غلبہ اتنا ہے کہ اس کے دوست احباب اس سے سلیس عبارت میں لکھنے کی درخواست کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں انھوں نے خاموشی اختیار کی۔ اس پر بھی لوگ انھیں تنگ کرنے لگے تو انھیں لکھنا پڑا۔

"گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل"

اور اپنے زمانہ اور معاصرین کے نہ سمجھنے کا اس طرح شکوہ کیا ہے۔

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

اس کے بعد زمانے کو آسان اور سہل مضامین کی طرف دیکھ کر سیدھے اور صاف شعر کہنے لگے تو افسوس کے طور پر انھیں لکھنا پڑا ؎

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد
کھلا کہ فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں

غالب کا خیال اپنے اس کلام اردو کے متعلق جس میں فارسی کا غلبہ ہے مذکورۂ ذیل شعر سے واضح ہوتا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

اس شعر سے صاف پتہ چلتا ہے کہ غالب کو اپنی فارسی پر جتنا ناز تھا اتنا فخر ان کو اردو شاعری پر ابتداءً نہیں تھا لیکن اردو شاعری کی روزافزوں مقبولیت نے انھیں یہ شعر کہنے پر مجبور کیا تھا کہ

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

غالب کے پرستاروں نے ان کی اردو شاعری کی اتنی قدر کی اور ابھی کر رہے ہیں کہ آج سوائے اردو غزلوں کے فارسی کلام کا مطالعہ گنتی کے چند افراد ہی کرتے ہوں گے اور پھر ان کے کلام اردو میں جس قدر جدت، شیرینی اور تناسب ہے اس کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ فارسی کے بے بدل ماہر تھے اور اگر وہ فارسی کے بلند پایہ ادیب نہ ہوتے تو یہ باتیں اُن کے کلام میں شاید نہ شامل ہوتیں۔

غالب کے اردو کلام میں پائے جانے والے فارسی عنصر کے سلسلے میں سب سے پہلے ہمارے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ تقریباً سب غزلیں فارسی بحروں میں کہی گئی ہیں۔ اس کے بعد فارسی ترکیبیں، فارسی بندشیں، فارسی الفاظ اور محاورات کثیر تعداد میں مستعمل ہیں۔ اکثر شعر ایسے ہیں جن میں سوائے ایک فعل کے باقی سب کلمات فارسی کے ہیں اور اس ایک فعل کو اگر بدل دیا جائے تو بجائے اردو کے وہی مصرع یا شعر فارسی کہلایا جائے گا۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہوں۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسد
سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

دوسرے مصرعہ میں "تھا" کی جگہ "بود" لکھ دیا جائے تو یہی مصرعہ فارسی کہلائے گا۔

ایک اور شعر

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

اس شعر میں سوائے ایک فعل "پسند آیا" کے باقی سب الفاظ اور ترکیبیں فارسی کی ہیں۔ ایسی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

غالب کی ابتدائی غزلوں میں اکثر ایسے شعر ملتے ہیں جن کے پہلے یا دوسرے مصرعے کے بغیر کسی تبدیلی کے فارسی کہلا سکتے ہیں۔ مثلاً

(۱) بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل — پہلا مصرعہ
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

(۲) بنالہ حاصل دل بستگی فراہم کر
متاع خانۂ زنجیر جز صدا معلوم — دوسرا مصرعہ

(۳) دشنۂ غمزہ جاں ستاں ناوک ناز بے پناہ — پہلا مصرعہ
تیرا ہی عکس رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

(۴) رشک ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگ حزیں — پہلا مصرعہ
نالۂ مرغ سحر تیغ دودم ہے ہم کو

غالب کے ابتدائی کلام کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہے کہ اس نے اپنے اسلاف کے کلام سے بھی استفادہ کیا۔ اس کی مثالیں ہمیں اس کے دیوان کے کئی اشعار میں ملتی ہیں چنانچہ غالب کے اردو دیوان کا پہلا شعر ملاحظہ ہو۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

غالب کے اس شعر کو بعض لوگ بے معنی سمجھتے ہیں اور ایسا اعتراض کرنے والا طبقہ وہ ہے جو فارسی سے نابلد ہے کیونکہ کاغذی کپڑے پہن کر حاکم کے آگے جانے کا خیال فارسی کے دو ایک شاعروں کے کلام میں ہمیں ملتا ہے۔ مثال کے طور پر لیجیے بابا فغانی کہتے ہیں

تا کہ دست قرار ز دست تو بہ بود قلم
کاغذیں پیرہن از دست قدر یا دوسرا

ایک اور شعر کمال اسمٰعیل کا ہے۔

کاغذی جامہ بپوشید و بدرگاہ آمد
زادۂ خاطر من تا بدہی داد مرا

غالب کا ایک مشہور شعر ہے

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

اس شعر کا مقابلہ خواجہ حافظ شیرازی کے مذکورۃ الذیل شعر کے ساتھ کیجئے

مرا از قدح بادۂ سرمدیست
وزیں بادہ مقصود من بے خودیست

غالب کے پرستار بار بار اس بات پر زور دیتے ہیں کہ یہی وہ شاعر تھا جس نے پہلی مرتبہ اردو شاعری کو بھی نئی ترکیبوں سے مالا مال کیا، لیکن ان نئی ترکیبوں پر جن کے سبب سے غالب کی غزل کو شعراء سے بڑھ کر درجہ عطا کیا جاتا ہے۔ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ سب فارسی بندشوں سے ملو ہیں۔ مثال کے طور پر یہاں چند ترکیبیں بیان کی جاتی ہیں: سوئے آتش دیدہ صبر گریزپا۔ غنچۂ ناشگفتہ، آب ہفت دریا۔ خندہ دنداں نما شانہ کشش وغیرہ۔

مضمون کے طویل ہو جانے کے خوف سے ایسے اشعار جن میں یہ ترکیبیں استعمال ہوتی ہیں نقل نہیں کئے جاتے

لفظ "وے" لیکن کے معنی میں الفاظ "بس کہ" اور "ازبس کہ" وغیرہ کا استعمال بھی غالب کے اشعار میں نظر آتا ہے مثلاً

(۱) ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں وے اُن کی تمنا نہیں کرتے

(۲) لیتا ہر نیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
وے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

"ازبس کہ" کا استعمال:۔

زبس کہ مشق تماشا جنوں علامت ہے
کشادہ دست مژہ سیلی ندامت ہے

"ازبس کہ" کا استعمال:۔

جلوہ ازبسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

"بس کہ" کا استعمال:۔

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

فارسی میں "مگر" معنی "شاید" استعمال ہوتا ہے۔ غالب نے "مگر" کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو

پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال
دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

غالب کے کلام میں مہینوں کے فارسی نام دہرانے والے اور گذرے ہوئے دن کے لئے "فردا و دی" کا بھی ہمیں ملتے ہیں مثلاً

(۱) فردا و دی کا تفرقہ اک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی

(۲) شادی سے گذر کہ غم نہ ہووے
اردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے

(اردی بہار کا موسم اور دے جاڑے کا مہینہ جس میں خزاں ہوتی ہے۔)

تلمیحات سے کسی شاعر کا کلام خالی نہیں، تلمیحات کے استعمال سے شاعری میں اختصار ہوتا ہے اور وہ موثر بھی ہو جاتی ہے۔ غالب کا تعلق ہندوستان سے تھا، ہندوستان کے بادشاہوں اور نوابوں کے دربار میں اس کی رسائی تھی۔ دن رات ان کو ہندوستان کے رسوم نظر آتے تھے۔ اُن کی آنکھوں کے سامنے ہندوستان کے اٹل پہاڑ تھے، وسیع میدان اور کشادہ دریا اپنا نظارہ پیش کر رہے تھے۔ ہندوستان کے گلزاروں میں قسم قسم کے پھول کھلتے تھے اور گوناگوں پرند چہچہے لگاتے تھے۔ ان سب کو دیکھتے ہوئے غالب کو کبھی اپنی اردو شاعری میں انھیں داخل کرنے کا خیال نہیں آیا اس کے برعکس جب کبھی ان کا ذکر کیا جاتا تو وہ ایران کی سرزمین سے تعلق رکھنے والی چیزیں ہوتی ہیں۔ مختصراً اتنا کہا جا سکتا ہے کہ تلمیحات کا استعمال جہاں کہیں غالب کے کلام میں ہوا ہے اس میں ہندوستان کی جھلک نام کے لئے بھی دکھائی نہیں دیتی، بلکہ فارسی گو شعراء کے کلام میں استعمال شدہ تلمیحات ہی نظر آتی ہیں، مثلاً چند شعر ملاحظہ ہوں۔

(۱) میرے شاہ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالب
فریدون و جم و کیخسرو و داراؔ و بہمن کو

(۲) عشق و مزدوریٔ عشرت گہ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامی فرہاد نہیں

(۳) اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

قدر گیسو میں قیس و کوہ کن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

لیلیٰ اور مجنوں کا تعلق سرزمین ایران سے نہیں بلکہ عرب سے تھا۔ لیکن ان ناموں کو مانوس کرانے والے عرب نہیں تھے۔ عربوں کے کلام سے براہ راست یہ نام ہم تک نہیں پہنچے بلکہ ان کا تعارف کرانے والے فارسی گو شعراء تھے اس لئے جہاں لیلیٰ و مجنوں کے نام آئے ہیں اس کو سمجھنا چاہیئے کہ یہ بھی فارسی کے اثر ہی کا نتیجہ تھا۔ غالب نے بھی کئی جگہ لیلیٰ و مجنوں کے نام استعمال کئے ہیں مثلاً

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

تخت سلیمان اور روح عیسیٰ جس کا ذکر ہمیں فارسی گو شعراء کے کلام میں ملتا ہے ہم غالب کو بھی استعمال کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ مثلاً

اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

ایران کے بادشاہ خسرو پرویز کا ایک مطرب جو فن موسیقی میں کامل تھا باربد نام رکھتا تھا۔ دیکھئے غالب نے اس نام باربد سے کیسا فائدہ اُٹھایا ہے لکھا ہے

خامہ میرا کہ وہ ہے باربدِ بزمِ سخن
شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

غالب کے اردو کلام کا بغور مطالعہ کیا گیا تو ہمیں اور بھی ایسی بے شمار مثالیں ملیں گی جن پر فارسی عنصر غالب ہے۔ اسی فارسی عنصر کے غلبے کی لوگ شکایت کرتے تھے، اور جب یہ ترکیبیں عام ہوگئیں تو اس کی شاعری کو مستند قرار دیا جا رہا ہے، اور یہاں تک لوگ کہنے پر اُتر آئے ہیں کہ جدید اردو شاعری کی ایک جھلک ہمیں غالب ہی کے کلام میں ملتی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ فارسی عنصر کے غلبے کے باوجود بھی ایک باکمال شاعر کا اردو کلام مقبول ہو سکتا ہے۔

بچہ کی پہلی جھلک

(بہ سلسلہ صفحہ ۱۰)

ہلکے ہلکے آپ کی انگلی کو اپنی طرف کھینچنے لگے گا، اور اس طرح تھوڑی سی دیر میں وہ "چوسنے" کی لذت سے آگاہ ہو جاتا ہے۔

اس شعوری عمل یعنی چوسنے سے ہم نوزائیدہ بچے کی ذہنی بیداری کا اندازہ لگاتے ہیں۔ یہی چوسنا پھر دودھ پینے میں بدل جاتا ہے۔ سنتے بچے تیں بالکل ابتدا میں دیکھنے، سننے اور سمجھنے کی قوتیں بیدار نہیں ہوتیں وہ صرف قوت لمس ہی سے یہ دیکھتا، سنتا اور سمجھ لیتا ہے کہ اس کے پاس کیا چیز ہے؟ کیسی ہے؟ اور کیا کر رہی ہے۔ منہ میں پستان کا آنا اور نکل جانا وہ صرف انھی دو افعال سے باصرہ، سامعہ اور شامہ کی قوتوں سے آگاہ ہو جاتا ہے۔

لیکن یہ خیال کرنا غلط ہے کہ نوزائیدہ بچے میں (فہم و فراست) کی قوت اس وقت تک بیدار ہی نہیں ہوتی جب تک وہ باصرہ، سامعہ، شامہ وغیرہ سے آشنا نہ ہو جائے۔ ماں اس بات کو اچھی طرح سمجھ سکتی ہے۔ دودھ پلانے میں جب بچے کے منہ سے وہ پستان نکال لیتی ہے تو مطمئن بچہ گھبرا جاتا ہے تو پہلے آہستہ آہستہ منہ بسور رہتا، اور پھر رونا شروع کر دیتا ہے اور جب تک ماں دوبارہ یہ نعمت ادا نہیں کر دیتی وہ چپ نہیں ہوتا ——— اپنی اسی فہم و فراست سے وہ اپنی ضرورت اور حاجت کے مقررہ اور معینہ اوقات سے اچھی طرح واقف ہو جاتا ہے۔

اصلی سوراج کیا ہے؟

(بہ سلسلہ صفحہ ۱)

سوراج نہ کہنا، اور اپنی پوری قوت سے اُسے رد کرنے کی کوشش کرتا، اس لئے کہ میرے نزدیک ہند سوراج تمام قوم کی حکومت ہے .... اس حکومت کے وزیر خواہ ہندو ہوں یا مسلمان یا سکھ .... انھیں ہر حال میں پورا پورا انصاف کرنا ہوگا۔

(مہاتما گاندھی)

بچّہ کی پہلی جھلک

سید محمد حسنین

بچہ پیدائش سے وقت زندگی کا پہلا تجربہ حاصل کرتا ہے۔ رحمِ مادر کی پراسرار دنیا، یک دنیا میں وہ ایک عجیب اور خاموش زندگی گذارتا ہے۔ وہاں کسی روشنی کا گذر نہیں ہوتا۔ گرمی، سردی کی دھوپ چھاؤں سے اور ماں کے مسلسل تنفس سے وہ ایک مدھم سی آواز سے آشنا ہوتا ہوگا پر یہ ہمارا قیاس ہی قیاس ہے کہ عالمِ حیات میں آنے سے پہلے بچہ کسی قسم کا تجربہ حاصل کرلیتا ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ عالمِ وجود میں آتے وقت اُسے چند شدید قسم کے تجربے حاصل ہو جاتے ہیں؟ ایک سخت دباؤ یا کسی موقع پر کشش کی وجہ سے وہ اپنی محدود سی اندھیری دنیا سے باہر آتا اور ہوا کی لہروں کی کھلی ہوئی سرد اور روشن دنیا میں داخل ہوتا ہے۔ جہاں نت نئی تبدیلیاں اور طرح طرح کی آوازیں ہیں۔ ماحول کی اس ناگہانی تبدیلی سے دوچار ہوتے ہی وہ مدافعت کے طور پر سہمے، جھجکتے، کانپتے ہوئے فوراً صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ ہوا کی لہریں اس نتھنوں اور پھیپھڑوں میں داخل ہو جاتی ہیں قلب کی دھڑکن بیدار ہو جاتی ہے اور ننھا زندگی کا پہلا سانس لیتا ہے اور زچہ خانہ اس کی نرم اور شیریں آوازوں سے گونجنے لگتا ہے۔ آنکھوں میں آنسو نہیں ہوتے البیلے چہرے پر ملال نہیں ہوتا، پر یہ اپنے چھوٹے چھوٹے بازوؤں، ٹانگوں اور سرخ ملائم انگلیوں والی ہتھیلی کو اپنی پوری طاقت سے سکیڑتا اور بند کرتا ہے۔ اس نئی دنیا میں آتے ہی زور زور سے رونے لگتا ہے۔

پیدا ہونے کے بعد بچے کی حرکتیں بہت کم اور بے معنی سی ہوتی ہیں۔ زبان سے لبوں کو ہلکے ہلکے چوسنا سانسوں سے نتھنوں کو پھلانا اور سکیڑنا۔ رونے میں حلق سے آواز نکالنا، بازوؤں اور ٹانگوں کو سمیٹنا، مٹھیوں کو بھینچنا۔ انگلیوں کو ایک ایک کرکے آہستہ آہستہ کھولنا اور پھر بند کر لینا اور سر کو ادھر ادھر جنبش دینا۔ الغرض نوزائیدہ بچے کی یہ حرکتیں ہمیں صاف نظر آتی ہیں وہ اپنی بند آنکھوں کو جلد نہیں کھولتا، جیسے جیسے ان ناگہانی تبدیلیوں میں ٹھہراؤ ہونے لگتا ہے، آلائش سے پاکیزگی گود کی گرمی اور پوری سکون اُسے میسر ہو جاتا ہے۔ اور ڈھکے ہوئے کپڑوں کے اندر وہ چپکے چپکے اپنی بند آنکھیں کھول کھول کر اپنے عطا کردہ چین و اطمینان کی جھلکیاں لینے لگتا ہے کسی کو متوجہ یا ہم کلام دیکھتے ہی وہ فوراً بڑی آہستگی سے اپنی آنکھیں موند لیتا ہے، جیسے "جائیے یہاں سے، مجھے آپ بالکل پسند نہیں"!

بچے کی پیدائش کا وقت حاملہ ہماری اولین توجہ کی مستحق ہے ایک شمع دوسری کو باسانی روشن کر دیتی ہے، لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اس وقت شعلے کے سانسوں کی ایک خفیف سی تیزی بھی شمع کی لو کے لئے موت کا سبب بن سکتی ہے اور نور ظلمت میں منتقل ہو جاتا ہے۔ ماں اپنی قوتِ حیات سے ایک حیاتِ نو کی تخلیق کرتی ہے۔ یہ مقام بڑا نازک ہے ہی دیکھ بھال کرنے والی کی ایک بھول زچہ بچہ دونوں کے لئے خطرناک نتائج کا سبب ہو سکتی ہے۔ اس متمدن دور میں بھی جب ہمیں ہر قسم کی سہولتیں میسر ہیں ہمارے بیشتر بدنصیب گھرانوں سے ولادت اور موت کی خبریں اکثر ایک ساتھ ہی ملا کرتی ہیں، عورتوں کو دائی گیری کی تعلیم ضرور حاصل کرنی چاہیے۔ یہ علم ان کے لئے اسی قدر ضروری ہے جس قدر خانہ داری، سلائی یا کشیدہ کاری۔

انسان قدرت کی نگاہ میں ایک 'حیوان' ہے لیکن اس کا درجہ حیوان سے بالاتر ہے انسان کی حیوان پر برتری یا فضیلت اُسی وقت صاف دکھائی دیتی ہے جب پیدا ہونے کے بعد ہی بچے کی صورت پر ہماری نگاہ پڑتی ہے۔ انسانی اور حیوانی نومولود میں اگر ہم موازنہ کریں تو یہ بات صاف معلوم ہوگی کہ اول الذکر مادرانہ توجہ و نگرانی کا ثانی الذکر سے بہت زیادہ محتاج ہوتا ہے، اور یہ بھی کہ انسان کا بچہ حیوان کے بچہ کی بہ نسبت فہم و فراست سے جلد قریب ہونے لگتا ہے یہی برتری قانونِ قدرت میں تخلیق، تسویہ اور تقدیر کے بعد وہ چوتھا زینہ یا مرتبہ ہے جسے قرآن حکیم نے ہدایت سے موسوم کیا ہے۔

الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی

میرا مطلب یہ ہے کہ نوزائیدہ کو "محض ایک بچہ" تصور کرنا دانش مندی نہیں۔ اس میں فہم و فراست کا خلقی مادہ ہوتا ہے جس کی نمو اس کی تقدیر کے مطابق عمر کے ساتھ ساتھ اور منزل بمنزل بڑھتی چلی جاتی ہے۔ حیوان میں یہ ایک خاص حد پر آکر تھم جاتی ہے۔ مگر انسان کی تقدیر میں اس طرح کی کوئی حد مقرر نہیں۔ اسے ہدایت کی قوت ودیعت کی گئی ہے اور ذہنِ انسانی ایک قانونِ ارتقاء کے تحت روزِ ازل سے بلند ہوتا چلا آرہا ہے اور ابد تک اُسی طرح بلند ہوتا ہی چلا جائے گا۔

چرند یا پرند کے کسی نوزائیدہ بچے کو دیکھیے، یہ اپنی ضرورتوں اور حاجتوں کو فراہم اور رفع کرنے میں مادرانہ توجہ کا بہت زیادہ طالب نہیں ہوتا، مرغی کا بچہ انڈے سے باہر نکلتے ہی ماں کو کٹ کٹ کرکے کھاتا دیکھ کر فوراً خود بھی ننھے ننھے دانوں پر چونچ لگانے لگتا ہے انسان کے بچے میں وہ حالت جب وہ دوسروں کا محتاج نہ رہے بہت جلد نظر نہیں آتی۔ ننھا بچہ گویا تالاب کا کنول ہوتا ہے جو پانی سے نکلتے ہی کھلا جاتا ہے، ماں میٹھا تالاب ہوتی ہے اور گہوارہ اور نرم سطحِ تالاب پر بہنے والی نرم رو لہریں جو ہر گھڑی کوملیدہ و شگفتہ تر کرتی رہتی ہیں، بچے کی حالت و کیفیت کو ہمیں ان خصوصیات کی روشنی میں دیکھنا چاہیے تاکہ بچہ آغازِ ہستی سے ہی ماں کی رحمتوں سے زیادہ سے زیادہ فیض یاب ہو سکے

انسان کے بچے کا کسی نوجوان شخص سے موازنہ کیجئے اور دیکھئے کہ دونوں ایک ہوکر بھی ایک دوسرے سے کتنے مختلف ہیں، ان میں نہ صرف جسامت و قامت میں کھلا فرق ہے بلکہ تناسب کے مطابق بھی دونوں ایک دوسرے سے بہت دور ہیں۔ نوزائیدہ کا سر نوجوان کے سر سے تقریباً تین گنا چھوٹا ہوتا ہے، اس کے دونوں بازو اور ٹانگیں بلکہ پورا قد نوجوان کے ایک بازو کا نصف ہوتا ہے اس عدم تناسب کو دیکھتے ہوئے بھی آپ تین چار برس کے ننھے بچے پر اس لئے برس پڑتے ہیں کہ وہ ۱۹، ۲۰ برس کے نوجوان کی سوجھ بوجھ نہیں رکھتا؟

طبعی طور پر پیدائش کے وقت بچے کا اوسط وزن ۷ پونڈ اور قد ۱۹ انچ قرار دیا گیا ہے عموماً ایک صحت مند بچے کا جسمانی تناسب اسی قاعدے مطابق ہوتا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ کسی بچے میں یہ تناسب نہ ہو اور وزن اور قد مختلف ہو

تین چار برس کی عمر میں بچے کی ذہنی کیفیت کا پتہ لگانا جس کے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے بہت دشوار ہے۔ ہماری اس کاوش میں ننھے کی خاموشی سدِ راہ ہوتی ہے۔ باتیں نہ کرسکنے کی وجہ سے ہم اس کی داخلی کیفیت کا اندازہ جلد نہیں لگا سکتے۔ عالمِ وجود میں آتے ہی وہ چند شدید قسم کے تجربوں سے دوچار ہوتا ہے جن کی نوعیت کا ہم کچھ اندازہ کر لیتے ہیں اور ہماری پہلی کوشش یہی ہوتی ہے کہ بچے کے لئے سکون اور اطمینان کی فضا پیدا کریں۔

نوزائیدہ بچے کو فوراً غذا نہیں دی جاتی بلکہ اس میں کافی توقف کرتے ہیں فروع شروع میں ہم بچے کو اپنی انگلی یا کپڑے کی بتی میں شہد یا انگور کا رس لگا کر چٹاتے ہیں۔ یہ جب بچے کے منہ میں پہنچتی ہے تو گویا اُسے سب سے پہلا سبق ملتا ہے اپنے منہ میں دوسرے کی انگلی پاکر بچہ حیرانی، جھجک اور خوف محسوس کرتا ہے۔ منہ میں انگلی ڈالتے ہی آپ غور کریں کہ اس کی عجیب کیفیت ہو جاتی ہے اپنا منہ بسورے گا۔ اپنے لبوں سے ہولے ہولے آپ کی انگلی کو دبائے گا۔ گویا کہتا ہے چھی چھی! آپ نے میرے منہ میں یہ کیا دے دیا؟ اس کی ننھی زبان کبھی انگلی سے چھوئے گی، کبھی ادھر ادھر منہ میں گھومتی ہوئی تالو سے مس ہوگی، اور کبھی نیچے کے ہونٹ سے، پھر شیریں یا انگلی کو چاٹنے لگے گی تنفس کی اندرونی کشش سے پھر اس کے ہونٹوں پر ایک نرم سا دباؤ پڑے گا اور [illegible]

(بقیہ صفحہ [illegible])

ہریجن کا ست

عوام کی کانگریس سے برگشتگی

اس خطرناک حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ عوام روز بروز کانگریس سے بیگانہ و برگشتہ ہوتے جا رہے ہیں، اور کانگریس روز بروز ایک بڑے کاروبار کرنے والے تجارتی ادارہ کا ایک ایسا جزو بنتی جا رہی ہے جس نے خود کو لائسنس پرمٹ تقسیم کرنے کے کام تک محدود کر لیا ہے۔ پنڈت جی نے کہا ہے کہ عوام کو حکومت سے صرف اپنی مشکلات کا حل ڈھونڈ نکالنے کی امید نہیں رکھنی چاہئے۔ ان کی یہ بھی خواہش ہے کہ عوام حکومت کے ساتھ اشتراک کریں۔ ہندوستان اب ایک ایسا ملک نہیں رہ گیا ہے جس پر غیر ملکی پولیس کی حکومت ہو۔ اب وہ ایک سماجی خدمت انجام دینے والا ملک بن گیا ہے۔ اب حکومت نے عوام کے لئے غلہ و کپڑا مہیا کرنے کی خدمت کا بیڑا اٹھایا ہے، اور اس کوشش میں کہ یہ خدمت انجام پائے وہ عوام کا روپیہ نہایت ہی فیاضی کے ساتھ صرف کر رہی ہے جس ملک کے باشندوں نے غلہ کی فراہمی کی ۱۰ فی صدی کمی کو پورا کرنے کے لئے ایک ارب تیس کروڑ اور راشننگ کے مہنگے نظام اور صوبائی غلہ، کنٹرول، زیادہ غلہ پیدا کرو کی مہم کے لئے ... کروڑ حکومت کو دئے، انھیں یقیناً قانونی اور اخلاقی طور پر مطالبہ کرنے کا حق ہے کہ غذا اور کپڑے سے متعلق ان کی مشکلات کو ختم کرنے کے لئے ان کے سامنے کوئی حقیقی حل پیش کیا جائے۔ ہر جمہوری ملک میں عوام کو یہ اخلاقی حق حاصل ہے کہ جب حکومت نے کسی وعدے کو پورا نہ کیا ہو تو وہ اس کے ساتھ اشتراک عمل کرنے سے انکار کریں۔

غلہ کے نقل و حمل کی خرابی کی وجہ کسانوں کی پریشانیاں عام بد معاملگی اور بد دیانتی، کھلے بازار کی قیمتوں کے مقابلے میں غلہ کی کم قیمتیں کانگریسی رکنوں کی ایک بڑی تعداد کی چور بازاری اور بد دیانتی کی سرگرمیوں میں شرکت کی وجہ سے ایک ایسی صورت حال پیدا ہو گئی ہے، جو کمیونزم کو سر اٹھانے کا بہت اچھا موقع دیتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان سب برائیوں کا علاج کیا ہے اس میں شبہ نہیں کہ ان برائیوں کا علاج آسان نہیں ہے لیکن انھیں لا علاج بھی نہیں کہا جا سکتا ہمارا خیال ہے کہ اگر مندرجہ ذیل تدابیر اختیار کی جائیں تو کانگریس کے لئے مفید ہوں گی۔

(۱) مرکز کی مدد سے راشن غلہ کی مقدار اور نوعیت کو کسی نہ کسی طریقے سے بہتر بنایا جائے (۲) کانگریس سول افسران کے سرمایہ داروں کے ذریعے جو چور بازاری اور تجارتی سامان کی ناجائز آمد و رفت ہوتی ہے اسے روک دیا جائے (۳) تجارتی ٹھیکوں اور لائسنسوں کے دینے میں کانگریسی اور غیر کانگریسی میں جو فرق ہے وہ مٹا دیا جائے (۴) جب کسی چور بازاری کرنے والے کے خلاف واقعی جرم ثابت ہو جائے تو اسے قانون کی خامیوں سے فائدہ اٹھا کر سزا سے بچ نکلنے کا موقع نہ دیا جائے اور اس طرح بد دیانتی کے خلاف ایک نفسیاتی فضا پیدا کی جائے، نظم و نسق کو اس طرح اخلاقی بنایا جائے کہ نظم و نسق میں مکمل تبدیلی کی جائے اور پولیس صوبائی ٹیکس اور ریاستی تجارت کے شعبوں کے نا اہل اور بد دیانت افسروں کو نکال دیا جائے۔ اگر نظم و نسق کو سنبھالنے والے موجودہ بڑے افسروں کے گزشتہ ریکارڈ کی تحقیقات کی جائے تو معلوم ہوگا کہ رشوت ستانی، قربا پروری اور بد دیانتی کے طفیل موجودہ صورت حال رونما ہوئی۔ اگر پارٹی کے لیڈران بد کرداری کے افعال سے نہ باز آئیں تو ان کے خلاف سخت کارروائی کئے جانے کا انتباہ کیا جائے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اب کانگریس اپنے اخلاقی اقتدار کے احساس کو کھو دینے کے خطرے سے دو چار ہے۔ پارٹی بندی نے تمام پرانی روایات کا گلا گھونٹ دیا ہے، اور اس کی موجودہ سیاست تمام اصولوں اور عقیدوں کو ... پرستی کا تابع کر دے گی۔ اور اقتصادیات سے متعلق تمام سوالات کو پس پشت ڈال دے گی۔ بد قسمتی سے زیادہ تر صوبوں میں یہ قبیح مرض ملک کی قوت حیات کو ختم کر رہا ہے۔ اس مرض کا علاج ہمارے لیڈروں کے ہاتھ میں ہے۔

کشوری لال مشروالا

آزادی کے بعد کے کام

ہمارے مقاصد ہی نہیں بلکہ حصول مقاصد کے طریقے بھی صالح ہونے چاہئیں اور ہمیں جھوٹ اور تشدد کو کسی صورت میں روا نہیں رکھنا چاہئے اس لئے ہمیں یہ قطعی طور پر طے کر لینا چاہئے کہ ہم جو خدمت بھی انجام دیں گے۔ صحیح طریقے سے اور سچائی اور محبت کے ساتھ انجام دیں گے، نہ ہم دوسروں کو دبائیں گے اور نہ دوسروں کو یہ اجازت دیں گے کہ وہ ہم کو دبائیں نہ ہم خود دوسروں پر ظلم کریں گے اور نہ دوسروں کے ظلم کے سامنے سپر انداز ہوں گے۔ اگر اس بات کا مصمم ارادہ کریں تو پھر ہمارے لئے خدمت کا ایک بہت وسیع میدان پیدا ہو جائے گا۔ راستے کے تمام روڑے ہٹنے کے بعد دیکھئے ہمارے جا رہے ہیں، راجوں اور مہاراجوں کا مسئلہ تقریباً طے ہو چکا ہے۔ اب رہ گیا۔ صوبے کی زبانوں کی تشکیل کا مسئلہ۔ یہ بہت ضروری مسئلہ ہے تاکہ حکومت کا کاروبار کسانوں کی زبان میں جاری رکھا جا سکے۔ اس سے کسان مزدور راج پیدا ہوگا جس میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ توجہ کسانوں پر کرنا ہوگی اس لئے کہ سوسائٹی کی بنیاد ہی ان کے وجود پر قائم ہے۔ کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ مختلف زبانوں کے معاملے میں اختلاف اور حسد سے کام لیا جائے۔ لسانی بنیاد پر صوبوں کی تشکیل کا مقصد بھی باشندوں کی بہتری ہے۔ یہ مقصد غیروں سے نفرت یا محبت پیدا کرکے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی مقصد غلط طریق کار اختیار کرکے حاصل کیا گیا ہے تو نتیجہ اچھا ہونے کے بجائے برا ہوگا۔ اس لئے کہ ہم کو صحیح طریق کار اختیار کرنا چاہئے۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو ہماری بہت سی گاڑیں دور ہو جائیں گی۔

ہمیں یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ ملک کا بنیادی مسئلہ غربت ہے اور یہ اس وقت تک حل نہیں ہو سکتی جب تک ہم اپنی پیداوار میں اضافہ نہ کریں لیکن میں تو یہاں تک کہنے کے لئے تیار ہوں کہ صرف اضافہ شدہ پیداوار ہی کا مسئلہ طے نہیں ہو جائے گا مسئلہ کے طے ہونے کا انحصار بہت کچھ اس طریقہ پر ہے جسے ہم پیداوار بڑھانے کے سلسلے میں کام میں لائیں گے۔ آج ہماری سوسائٹی پیدا اور غیر پیدا کرنے والوں میں بٹ جائے گی۔ پیدا کرنے والوں کو بہت سخت محنت کرنا پڑتی ہے۔ پھر بھی ان کی بہت سی ضرورتیں خاطر خواہ پوری نہیں ہوتیں۔ نہ پیدا کرنے والے، اگرچہ وہ بھی کچھ نہ کچھ خدمت انجام دیتے ہیں، پیدا کرنے کے کام میں ہاتھ لگاتے ہیں۔ جسمانی محنت ایک شریف آدمی کے وقار سے گری ہوئی چیز سمجھی جاتی ہے۔ اس کے برعکس کسان مزدوروں اور صناعوں کو جو سوسائٹی کے لئے ناگزیر خدمت انجام دیتے ہیں۔ پست اور کم تر طبقے کا سمجھا جاتا ہے۔ اس رویہ سے نتیجہ ہمارے ملک کے تنزل کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے۔ محنت کرنے والوں اور نہ محنت کرنے والوں کی یہ تقسیم ہمارے ملک کے مفاد کے خلاف ہے۔ محنت کا سارا بار پست طبقے پر پڑتا ہے محنت کرنے والے اگرچہ بھوکے نہیں لیکن انھیں کھانے کے لئے کافی نہیں ملتا۔ نہ محنت کرنے والوں کے پاس ذرائع ہیں۔ لیکن ان کو اشتہا نہیں۔ اس طرح دیکھئے تو دونوں کے دونوں تباہ ہو رہے ہیں میں نوجوانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ خود کو جسمانی محنت کا خوگر بنائیں، اگر وہ کسی انقلاب کے صحیح معنی میں خواہاں ہیں۔

کام عبادت کا درجہ رکھتا ہے اور اس سے ملک کی سچی خدمت انجام دی جا سکتی ہے۔ پیدا کئے بغیر کھانا گناہ سے کم نہیں ہے۔ گیتا میں ایک جگہ کہا گیا ہے کہ جو جسمانی محنت کے بغیر کھاتا ہے وہ چور ہے چونکہ

رجسٹرڈ نمبر ڈی ۲۰۷

۱۲

یکم ستمبر

ہفتہ وار
نئی روشنی

ادارۂ تحریر:-
ڈاکٹر سید عابد حسین ۔ صالحہ عابد حسین
عبداللطیف اعظمی

جامعہ نگر دہلی
تاریخ اشاعت: یکم [illegible]

چندہ: سالانہ للعہ ششماہی للعہ

هم نے خدا کے اس بڑے حکم کی خلاف ورزی کی ہے اس لئے آج ہم مصیبت میں مبتلا ہیں۔ سوسائٹی کی محنت کرنے اور محنت نہ کرنے والوں میں تقسیم ختم ہو جانا چاہیے۔ اور پروفیسروں، طالب علموں، عملوں، وکیلوں، تاجروں اور تعلیم یافتہ اشخاص کو اس نکتہ کو سمجھ لینا چاہیے اور کچھ نہ کچھ جسمانی محنت کرنے کا اپنے کو عادی بنانا چاہیے۔

اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو میں نے آپ کے سامنے جو بات رکھی ہے وہ ایک انقلاب انگیز بات ہے۔ اگر آپ اس پر دھیان دیں اور اس کو برتیں بھی تو محنت اور سرمائے کے ہمارے سارے مسائل طے ہو جائیں گے اور آسودگی اور فارغ البالی کی راہ کھل جائے گی (دنوبا بھاوے)

ترجمہ:- قومی آواز لکھنؤ

دفتر نئی روشنی جامعہ نگر دہلی

طابع و ناشر:- عبداللطیف اعظمی (بی اے جامعہ)

مطبوعہ:- جید پریس دہلی

جلد ۳ نمبر ۱۰ | ۸ر ستمبر ۱۹۴۹ء | ایڈیٹر:- ڈاکٹر سید عابد حسین

کشمیر اور ہم

ڈاکٹر ذاکر حسین

جو رشتے آپس کے رہن سہن، میل جول، مل کر کچھ بنانے، یا مل کر کچھ بگاڑنے، مل کر سوچنے، مل کر کام کرنے، مل کر سیکھنے سکھانے سے پیدا ہوتے ہیں، وہ سچے رشتے ہوتے ہیں، پائدار رشتے ہوتے ہیں، اور جب صدیوں تک یہ رشتے اور بڑھتے رہتے ہیں، تو پھر یوں جڑتے ہیں جیسے گوشت سے ناخن جڑا ہوتا ہے۔ کشمیر اور ہندوستان کے باہمی رشتے ایسے ہی رشتے ہیں.....

ہندوستانی تمدن کے جمود کو حرکت دینے، اس کو سیاسی اور تمدنی وحدت بخشنے کے لئے جب قدرت نے اسلامی عنصر کو ہندوستانی زندگی کا جزو بنایا، تو کشمیر بھی اس کے اثر میں آیا اور اثر پذیری اور اثر اندازی کا لین دین، علم و عمل فن و ہنر میں سیکھنے سکھانے کا بیوپار صدیوں جاری رہا۔

دوستو کشمیر سے ہمارے قدرتی رشتے کو یہ کیسے گنوائے؟ جس ساتھ پر صدیوں بیت گئی ہیں، جو ساتھ خالی جغرافی ساتھ نہ ہو، خالی حکومت کا ساتھ نہ ہو، بلکہ جس میں ہم دونوں کی، ہندوستان اور کشمیر کی تمدنی زندگی کا رواں رواں بندھا ہوا ہو، جو خوشی اور رنج، آرام اور مصیبت، سکھ دکھ کا ساتھ ہو، اس کی تفصیل چند منٹوں میں کیسے بیان ہو جائے؟ ہمیں خالی کہنا کہ رشتہ خالی جغرافی رشتہ نہیں ہے، جغرافی رشتے قدرتی تو ہوتے ہیں، مگر اتفاقی بھی ہوتے ہیں۔ آدمی کے ارادے کو اس میں کچھ دخل نہیں ہوتا، قدرت شیر اور بکری کو ایک ہی جنگل میں پیدا کر دیتی ہے اور زور اور کمزوری کے مقابلے کا تماشا دیکھتی ہے، اور اس تماشے میں اخلاقی اصولوں کی پابندی کا بھی خیال نہیں کرتی، آدمی کا خاصہ ہے کہ اپنی سوجھ بوجھ سے ایسے مسئلوں کا حل نکالتا ہے، ناکام ہوتا ہے تو پھر سے کوشش کرتا ہے۔ ایک ڈھنگ سے یہ حل نہیں ہوتے تو دوسرے ڈھنگ سے آزماتا ہے اور اسی ادھیڑ بن میں تمدنی زندگی کی بنیادیں ڈال لیتا ہے، تمدنی [illegible] میں بندھے ہوئے آدمی، آہنی زنجیروں میں نہیں جکڑے ہوتے، ریشمی ڈوروں [illegible] ہوتے ہیں۔

پھر حکومت کا رشتہ بھی زیادہ توجہ کے قابل رشتہ نہیں، یہ ضروری ہے کہ حکومت انسانی تمدن کا جوہر ہے، مگر اس کا کام کبھی کبھی خالی زور پر بھی چلتا [illegible] اور یوں میں تو حکومت ضرور اچھے تمدن کی ضمانت ہوتی ہے، مگر آدمی کا حال تو آپ [illegible] ہیں، اچھا ہے تو فرشتوں سے اونچا ہے جہاں گرا تو جانوروں سے نیچے جا پہنچا، چنانچہ کبھی حکومت کے رشتے غلامی کے رشتے بھی بن جاتے ہیں۔ آقا اور غلام کو ایک دوسرے سے جوڑنے والے رشتے یعنی ایسے رشتے جو انسان کی شرافت، انسان کی خودداری، انسان کی آزاد روح کی نظر میں بس توڑ پھینکنے ہی کے رشتے ہوتے ہیں، ہاں جو رشتے آپس کے رہن سہن، میل جول، مل کر کچھ بنانے، یا مل کر کچھ بگاڑنے، مل کر سوچنے، یا مل کر کام کرنے، مل کر سیکھنے سکھانے سے پیدا ہوتے ہیں، وہ سچے رشتے ہوتے ہیں، پائدار رشتے ہوتے ہیں اور جب صدیوں تک یہ رشتے بنتے اور بڑھتے رہتے ہیں تو پھر یوں جڑتے ہیں جیسے گوشت سے ناخن جڑا ہوتا ہے۔ کشمیر اور ہندوستان کے باہمی رشتے ایسے ہی رشتے ہیں۔

اس کا تو اب وقت نہیں کہ کشمیر اور ہندوستان کے ان رشتوں کی فہرست پیش کروں جو اس طرح ان دونوں کو جوڑے ہوئے ہیں۔ مگر یہ بات ظاہر ہے کہ تاریخ کے دھندلکے سے لے کر حال کے روز روشن تک جہاں نظر ڈالئے یہ رشتے موجود ہیں۔ ویدک عہد میں دیکھئے جو تصور کائنات، جو فلسفۂ حیات ہندوستان کے اچھوں اور نیکوں میں رائج تھا۔ اس میں کشمیر کے اچھے بھی ہمارے شریک تھے۔

اللہ واحد، ایکم، ایشر، وشوا کرمن، پرجاپتی، تد کے سامنے اس کی اور ہندوستان کی گردن ساتھ ساتھ جھکتی ہے۔ نظام عالم میں، قانون اخلاق کے کامل تسلط پر یہ دونوں ہم نوا ہیں، اس دنیا کو دونوں مرضی الٰہی کے ظہور کا میدان مانتے ہیں اور اسکے قانون محکم پر ساری کائنات کو جکڑا ہوا جانتے ہیں، قدرت کے کرشموں، دیوتاؤں کی ہستیوں، رسوم اور عبادتوں سب کو دونوں اس عالمگیر قانون کا پابند سمجھتے ہیں۔ جیسے ہم ویسے وہ۔ جب ہم ہندوستان والوں نے قانون کے تقاضوں کو اپنی سمجھ کے مطابق سماج کی زندگی پر لاگو کیا اور سماج کی چارگانہ تقسیم کی تو یہ ورن آشرم دھرم ہندوستان کی طرح کشمیر کا بھی اجتماعی نظام بن گیا۔ ہم نے بے لاگ عمل اور نتیجوں سے نظر ہٹا کر فرض کو انجام دینے کا مسلک اختیار کیا تو کشمیر نے بھی اسی کو اپنایا۔ جب ہم نے ایک زندہ عقیدے کو رسم و رواج کی پست سطح پر پہنچا دیا، اور اپنی ذمہ داریوں کا جوا پجاریوں کی گردن پر رکھ دیا، تو اس روگ میں بھی کشمیر ہمارا ساتھی رہا۔ جب ہمارے اس روگ کو دور کرنے کے لئے

فہرست مضامین

قیمت فی پرچہ ۳ر

گوتم بدھ نے اپنا پیام دیا تو کشمیر نے بھی جوش کے ساتھ اس کو لبیک کہا۔ صدیوں ہندوستان کی طرح گوتم بدھ کا مظفر بجوش رہا، جو بودھ سیاح ہندوستان کی زیارت کرنے آئے تو وہ بھی کاشی اور گیا ہی میں نہیں، کشمیر کو نہیں بھولے اور پھر اس کی دل فریبی کو کیا کہئے کہ یہاں برسوں کو رہ بیٹھے ہیں۔ اور ایک صاحب تو مہلاتی تک رہیں پھر نہیں لگے کیاس" ماہر کے ہاتھی سدھانے کا کام کرنے لگے ہیں۔ ہم بودھ مت کو بدلتے ہیں تو یہ بھی اس کی شکل بگاڑتا ہے۔ اس کی اصلی روح کو مسخ کرتا ہے منتر کو پھر کر جھلکے کے پیچھے پڑتا ہے، اس کے صاف شفاف پانی میں توہم پرستی کا میل ملاتا ہے تو پھر اصلاح شدہ ہندو مت کا دور شروع ہوتا ہے، یہاں بھی، وہاں بھی، پرانک کے میدانوں میں ہرش وردھن، بودھ، سوریہ اور مہیشور کی پوجا ساتھ ساتھ کرتا ہے تو کشمیر کی وادی میں بھی بودھ آراموں کے پہلو بہ پہلو ہندو دیوتاؤں کے مندر بھی بنتے ہیں۔ ہندو مت پھر ابھرتا ہے، یہاں بھی، وہاں بھی شری شنکر اچاریہ نے سارے ہندوستان کو اپنے گیان کی گہرائی اور اپنے ویدانتک فلسفہ کے پھیلاؤ سے فیض پہنچایا، تو کشمیر کی فضا میں بھی ان کی آواز گونجی۔ شری رامانج نے جب ویدانت میں بھگتی کا پیام سمویا اور ادب میں غیر ویدک پنچ راتر کو ملایا، آچاریہ ابھینو گپت نے شیو کا راستہ دکھایا، تو وہ بھی اپنا تحفہ ہندوستان کو دے کر نہیں رک گئے۔ کشمیر کی یاترا انھوں نے بھی کی جنوبی ہند میں شیوائی مسلک پھیلا تو اس کے رشتے بھی صاف کشمیر سے جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

ہندوستانی تمدن کے جمود کو حرکت دینے اس کو سیاسی اور تمدنی وحدت بخشنے کے لئے جب قدرت نے اسلامی عنصر کو ہندوستانی رنگ کا جزو بنایا، تو کشمیر بھی اس کے اثر میں آیا اور اثر پذیری اور اثر اندازی کا لین دین، علم و عمل میں، فن و ہنر میں، سیکھنے سکھانے کا بیوپار صدیوں جاری رہا۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ کچھ کا رشتہ کبھی کبھی خالی زور کا رشتہ بھی ہوتا ہے اور اس حالت میں تمدنی اعتبار سے بنجر کی سی حیثیت رکھتا ہے لیکن جب یہ اونچی قدروں کا حامل اور سیوک بنتا ہے تو ساری تمدنی کوششوں کو اس سے چار چاند لگ جاتے ہیں۔

تاریخ پر نظر ڈالئے تو پندرھویں صدی میں ایک شخصیت کشمیر میں دکھائی دیتی ہے جو ہندوستان کے مستقبل کے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے جس نے ۵۰۰ برس پہلے وہ کرنا چاہا جو کشمیر کے دو سپوت جواہر لال نہرو اور شیخ عبداللہ آج کرنا چاہ رہے ہیں۔ یہ شخصیت ہے سلطان زین العابدین کی جسے کشمیر کا بچہ بچہ آج بھی بادشاہ کی حیثیت سے نہیں فقیر و ولی کی حیثیت سے یاد کرتا ہے اور سلطان زین العابدین کہہ کر نہیں، بڈشاہ کہہ کر پکارتا ہے۔ ہندو مسلم کو ایک ریاست میں ایک سیاسی زندگی دینے کا کام اس فقیر سلطان نے کیا تھا اور بڑی خوبی اور کامیابی سے انجام دیا تھا۔ ابھی کشمیر پر وہی [illegible] ہوا تھا، وہی اہم مسئلے کے حل کی تلاش میں تھا حکومت کی نیو کر اور کی جگہ عوام کی مرضی پر چلنے کا مسئلہ، ہندو مسلم کی تفریق مٹا کر باہمی یک جہتی پیدا کرنے کا مسئلہ ہماری سیاست کا سب سے اہم مسئلہ تھا۔ اس سلسلے میں سب سے اہم کارنامہ تاریخی اعتبار سے ایک عہد آفریں کارنامہ اسی سلطان زین العابدین کا ہے۔ یوں تو وہ ہر لحاظ سے بڑا بادشاہ تھا اس نے کشمیر کے مادی وسائل منظم طور پر بڑھائے، کاغذ بنانے کی صنعت شروع کرائی ہندوستان کے قلمی کتابوں کے ذخیرے اس فیض کو ظاہر کرتے ہیں جو اس صنعت نے علم کو پہنچایا۔ ریشم کی صنعت کو فروغ دیا، شال بافی کی بنا ڈالی ہندوستان کے ہر خوش حال گھر میں کشمیری شالوں کا کوئی نہ کوئی تحفہ اس فقیر بادشاہ کی یاد آج تک تازہ کرتا رہتا ہے۔ طرح طرح کے میوہ دار درخت باہر سے منگا منگا اس نے کشمیر میں لگائے، نہریں کھدوائیں اور ان مادی برکتوں کے ساتھ ساتھ اس نے مذہبی یکجہتی اور رواداری کی وہ روایتیں قائم کیں جو آج بھی ہندوستانی سیاسی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہیں۔ جب یہ تخت پر بیٹھا ہے تو اس کے پیش رو سکندر کے ظلم و ستم سے ڈر ہو کر برہمنوں کی ایک بڑی تعداد کشمیر چھوڑ کر باہر جا چکی تھی، اس نے ان کے دلوں کو موہ لیا۔ سرکاری عہدوں اور کاموں میں اس نے دین و مذہب کا فرق بالکل مٹا دیا۔ پھر تو پنڈتوں نے فارسی اس وجہ سے سیکھی کہ شاعری، انشا پردازی، لغت نویسی میں آج تک فارسی پڑھنے والے ان کے زیر بار احسان ہیں فارسی ایسی عام ہوئی کہ سارے ملک کی تہذیبی زبان بن گئی۔ ذہنی طور پر ہندو مسلمانوں قریب لانے کے لئے اس نے بہت سی سنسکرت کتابوں کے ترجمے فارسی میں کرائے، موسیقی کے بڑے بڑے ماہر ہندو اور مسلمان دور دور سے آکر اس کے دربار میں جمع ہوگئے اور سچ ہے کہ اس نے اس کام کا آغاز کیا جو بعد کو زیادہ بڑے پیمانے پر اکبر اعظم نے کرنا چاہا اور جو آج بھی ہندوستانی سیاست کا مرکزی اور بنیادی تصور ہے۔

جب کشمیر مغلوں کو ملا تو اس کے ساتھ ساتھ رواداری اور بے تعصبی، ہنر پروری اور علم دوستی کی یہ دائمی بھی انھیں ورثہ میں ملیں، کشمیر نے مغلوں کے زمانے میں بھی ہندوستان سے بہت کچھ پایا اور ہندوستان کو بہت کچھ دیا مادی وسائل کو ترقی دینے کا کام برابر جاری رہا، پھل کے درخت، خوش نما اور خوشبودار پھول جگہ جگہ سے لائے گئے

بھانت بھانت کے نئے نئے کام شروع ہوئے جگہ جگہ سے کاریگر لاکر بسائے گئے۔ علم و ہنر کی ہمت افزائی دل کھول کر کی گئی، آئین اکبری میں اکبری دربار کے مصوروں کے نام پڑھو، تیمور نامہ کے باتصویر والے نسخہ میں مصوری کے شاہکاروں پر مصوروں کے نام تلاش کرو تو ایک دو نہیں بہتیرے کشمیری نام پاؤ گے۔ اس کے بعد جہانگیر تو کشمیر پر عاشق سا تھا اس سرزمین کا چپہ چپہ اس کا ایک ایک درخت ایک ایک پھول، ایک ایک چڑیا، اس کا ایک ایک دلکش منظر، اس کی حسن شناسی میں نقش سا تھا۔ تھا کہ کس جگہ کا منظر کس وقت بہترین ہوتا ہے اور ابھی تک، اچھابل، نسیم باغ، شالامار، آج بھی اس کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مرتے وقت بھی وہ کشمیر کو یاد کرتے ہوئے مرا۔ اس محبت اور انہماک سے کشمیر کے علم و فن کو چار چاند لگائے تھے۔ اور شاعری میں، نقاشی میں، خطاطی میں، گلکاری میں، سونے چاندی کے کام میں، کپڑے اور لباس کے معاملے میں کشمیر سارے ہندوستان کے لئے معیار بن گیا تھا۔ اپنی بدکرداریوں، غفلتوں اور آسانیوں اور بد پاشیوں سے جب آزادی کی دولت ہماری قوم نے کھو دی اور ہمارا ملک غلامی کی زنجیروں میں جکڑا گیا تو اس ذلت کی گھڑی بھی ہم سب نے اور کشمیر نے۔ ایک سی جھیلی۔ شمع آزادی کے گل ہونے کے بعد کیسی بھیانک رات تھی وہ، غلامی کی ذلت اور کیسی لمبی رات تھی وہ، اخلاقی پستیوں کی کیسی گھٹا جمی ہوئی تھی سروں پر اس رات میں، وطن فروشی کی عفریتوں، خود غرضی کے ہنگوں سے کیسی بھری ہوئی تھی وہ گھٹا ٹوپ رات، جھوٹ فریب، نفاق کی کیسی بھری ہوائیں پھیلی ہوئی تھیں اس رات میں، اٹک رہی نہ رات، مگر آدم کی اولاد پر راتیں بھی آتی ہیں اور وہ انھیں جیسے تیسے سحر کرتی ہے، لیکن اس رات کی سحر اپنے آپ نہیں آتی۔ اس کے سوتوں کو سورج نے آکر خود نہیں جگایا، انھیں جاگ جاگ کر اسے سحر کرنا ہوتا ہے۔ بہت تو سوتے ہیں پر کچھ جاگتے ہی رہتے ہیں اور انھی کو اپنے دل کے ٹمٹماتے ہوئے چراغوں سے اس کی اندھیاری میں روشنی پیدا کرنی ہوتی ہے اور اس دھیمی لو کو تو طوفان سے بچانے کے لئے جان جوکھوں میں ڈال کر جتن کرنے ہوتے ہیں، ہندوستان کے سپوتوں نے اپنے دیس کی اس رات کو اپنا تن، من، دھن سب کچھ تج کر سحر کیا تو کشمیر والوں نے بھی اس میں کسر نہیں کی۔ بلکہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں جو کام کانگریس نے کیا اور سچ تو یہ ہے کہ سب کچھ اس نے کیا، اس میں بھی کشمیر کا حصہ، حصہ رسدی سے زیادہ ہی ہے۔ کانگریس کی صدارت کی کرسی پر جو لوگ رونق افروز ہوئے یعنی جن بزرگوں کے سر پر یہ کانٹوں کا تاج رکھا گیا ان میں سے آٹھ میں سے ایک کشمیری ہوا ہے۔ کشمیر اور ہندوستان دونوں جگہ سیاسی قیادت کا فرض کشمیر ہی کے دو سپوت انجام دے رہے ہیں، اور اس طرح انجام دے رہے ہیں کہ دونوں اس پر جتنا ناز کریں کم ہے۔ ایک کشمیری ہی آج ہندوستان کا وزیر اعظم ہے، اس دیس میں سب کی آنکھ کا تارا ایک نئی ابھرتی جمہوریت میں مساوات کا سہارا، سچ کی کڑواہٹ سے نہ گھبرانے والا اور دنیا میں سچے کام آنے والا، وہ جس کی بے لاگ صفائی جس کی بے باک سچائی، اچھائیوں کے لئے جس کی بے چینی، برائیوں سے جس کی بیزاری، جس کی دیانت، جس کی دلیری ہمارے دیس کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ ساتھ کشمیر نے خود اپنے لئے پیدا کیا ہے، ایک قائد خدمت گزار شیخ عبداللہ جیسا جس نے کشمیریوں کو ایک امید بخشی، ایک آئیڈیل دیا، ان میں خود اعتمادی پیدا کی، ایک دلولہ

(بقیہ صفحہ ...)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
۸ ستمبر ۱۹۵۱ء

کدھر چلے
ہند اور پاکستان

محمد علی جناح صاحب کہا کرتے تھے کہ ہندوستان کو ہند اور پاکستان میں تقسیم کر دو۔ اس کے بعد دیکھنا دونوں ریاستوں کے تعلقات کتنے اچھے ہوتے ہیں۔ منطق کی رو سے ان کا یہ کہنا بالکل بجا تھا۔ عقل و تدبیر، ضرورت و مصلحت سب کا یہی تقاضا تھا کہ ایک جسم نامی کے یہ دونوں ٹکڑے کم سے کم اندرونی معشیت، بیرونی تعلقات اور دفاع کے بارے میں خیال اور عمل کا اتحاد رکھیں، جیسے امریکا اور کنیڈا سیاسی حیثیت سے ایک دوسرے سے بے تعلق ہونے کے باوجود رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ دونوں کی سلامتی آزادی اور خوش حالی ایک دوسرے کے ساتھ ایسے رشتوں سے وابستہ ہے جو کسی طرح کاٹے نہیں کٹ سکتے۔ اگر آسام میں باہر سے کوئی خون خوار دشمن گھس آئے یا اندر سے کوئی وبا پھیل جائے تو آسام کے ساتھ ساتھ مشرقی پاکستان بھی ہلاکت سے کسی طرح نہیں بچ سکتا۔ اسی طرح اگر مغربی پاکستان پر بیرونی حملے یا اندرونی بیماری کی مصیبت آئے تو دہلی سے بمبئی تک کم سے کم آدھا ہندوستان ضرور اس کی لپیٹ میں آ جائے گا۔ اسی طرح اگر دونوں ریاستوں میں سے کسی ایک میں کوئی اجنبی طاقت اس حد تک دخیل ہو جائے کہ اس کی آزادی کو سلب کر لے تو دوسری کی آزادی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اب رہا معاشی مفاد کا سوال تو ایک کی روئی اور پٹ سن دوسرے کے کارخانوں کی اور دوسرے کا لوہا اور کوئلہ پہلے کی فیکٹریوں کی غذا ہے۔ اس لئے اگر باہمی تجارت میں رکاوٹ پڑتی ہے تو دونوں کا شدید نقصان ہوتا ہے۔ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ پاکستان سے روئی جوٹ ہندوستان میں نہ ہونے سے یہاں حد سے زیادہ مہنگائی ہے اور وہاں غلہ گوداموں میں سڑ رہا ہے، اور اس کے دام دیہات میں اس تیزی سے گر رہے ہیں کہ غریب کاشتکار مرا جا رہا ہے۔ لیکن جناح صاحب کا اندازہ منطق کی رو سے کتنا ہی صحیح کیوں نہ ہو، انھوں نے نفسیات کو جو انسانوں خصوصاً جاہل انسانوں کے عمل پر بہت زیادہ اثر ڈالتی ہے بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ تقسیم ہند کی تحریک کے پیچھے جو قوتیں کام کر رہی تھیں، انھوں نے نفس انسانی کے سب سے قوی اور سب سے غیر معقول جذبے یعنی جذبۂ خوف کو اس شدت سے ابھارا تھا کہ وہ عقل و تدبیر، ضرورت و مصلحت، سب پر غالب آ گیا تھا۔ ہندو مسلمان دونوں کو اپنی اپنی جگہ یقین ہو گیا کہ دوسرا فریق اس کو تہس نہس کرنے پر تلا بیٹھا ہے اور اس نے اس کے لئے وسائل فراہم کر لئے ہیں۔ خوف کی آنکھوں سے ان کو ایک دوسرے کی طاقت اصل سے سو گنی نظر آتی تھی۔ اسی اندیشے بے تھاہ بے پناہ خوف نے ہندوستان کا بٹوارہ کرایا، اور اس بٹوارے کے دوران میں قتل و غارت فتنہ و فساد کی آگ بھڑکا دی۔ ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء کے ہولناک فسادات کے محرکوں پر غور کیجیے تو تعصب، نفرت لالچ کے جذبات بھی نظر آتے ہیں، لیکن سب سے قوی محرک جس نے عقل کو بالکل معطل کر دیا تھا اور وحشت اور درندگی کو بے لگام چھوڑ دیا تھا، خوف کا جذبہ تھا۔ یوں تو یہ سیلاب خوف، تباہی اور بربادی پھیلاتا ہوا چند مہینے میں گذر گیا، لیکن اس کی بہت سی لہریں ہندو پاکستان میں سطح زمین کے اندر جذب ہو کر رہ گئیں۔ اسی زیر زمین خوف کے اثرات ہیں جن کی وجہ سے دونوں ریاستوں کے دل ایک دوسرے سے کسی طرح صاف نہیں ہوتے اور ان کے باہمی تعلقات رہ رہ کر بگڑ جاتے ہیں۔

اس وقت سب سے بڑا نزاعی مسئلہ ہند و پاکستان کے درمیان کشمیر کا ہے۔ اسی کی وجہ سے دونوں کے تعلقات بے حد کشیدہ ہو گئے ہیں۔ دونوں اپنی آمدنی کا بہت بڑا حصہ فوجی تیاریوں پر صرف کر رہے ہیں جس کا افسوس ناک نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں تعمیر نو کے منصوبے رک گئے ہیں، اور پاکستان میں ان کے شروع ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ بہت سے معاملات جن کو مل کر طے کرنے میں اور آسانی سے طے ہو گئے ہیں۔ ضد اور غصے کی وجہ سے الجھ کر رہ گئے ہیں جس سے دونوں ملکوں میں ڈیڑھ کروڑ پناہ گزینوں کو سخت تکلیف پہنچ رہی ہے، کاروبار اور صنعت پر تباہ کن اثر پڑ رہا ہے، اور معاشی حالت سنبھلنے میں نہیں آتی۔

اس کشمیر کے مسئلے کی تہہ میں یوں تو اصول اور اغراض کی گوناگوں کشمکش ہے، لیکن پاکستان کی طرف سے جو سب سے قوی دلیلیں اس دعوے کی تائید میں پیش کی جاتی ہیں کہ کشمیر اُسے ملنا چاہئے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں بھی فساد کی جڑ وہی خوف کا جذبہ ہے۔ پاکستان کو یقین ہے کہ اگر کشمیر ہندوستان کے پاس رہا تو صوبہ سرحد اور مغربی پنجاب جنگی نقطہ نظر سے غیر محفوظ ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ ہندوستان جب چاہے گا مغربی پنجاب کے دریاؤں کا جو کشمیر سے نکلتے ہیں پانی روک کر اس کی ساری زراعت کو برباد کر دے گا۔ اس استدلال سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان کے ارباب حل و عقد کے دل میں یہ خیال جما ہوا ہے کہ ہندوستان ان کی نئی ریاست کو تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے اور موقع پاتے ہی یہ کر گذرے گا۔ اِدھر ہندوستان کو پہلے ہی دن سے پاکستان کی خارجی پالیسی کا رنگ دیکھ کر یہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ جس طرح اس نے سرحدی قبائل کو اکسا کر کشمیر پر حملہ کرا دیا شاید اسی طرح ایک دن زیادہ قوی اور زبردست حملہ آوروں کو ہندوستان پہنچنے کے لئے راستہ دے دے۔ اگر کشمیر پر پاکستان کا قبضہ ہو گیا تو خطرہ اور زیادہ بڑھ جائے گا۔ پاکستان کا بیرونی ملکوں میں خصوصاً مسلمان ملکوں میں ہندوستان کے خلاف شدید پروپیگنڈا کرنا، اس کا اس خیال سے کہ ہندوستان برطانوی کامن ویلتھ سے بالکل الگ ہو جائے گا، خود کامن ویلتھ میں شریک ہونے کے لئے انتہائی بے تابی کا اظہار کرنا اور اس خیال کے غلط ثابت ہونے کے بعد کامن ویلتھ سے روٹھ کر روس سے لگاوٹ شروع کر دینا ان شبہات کو اور تقویت پہنچاتا رہا۔

اس خوف اور بدگمانی میں جو دونوں کو ایک دوسرے کی طرف سے پیدا ہو گئی ہے، بہت بڑے خطرے پنہاں ہیں۔ موجودہ حالت کے تین نتیجے ہو سکتے ہیں

(۱) پاکستان روس کی طرف جھکتا چلا جائے اور ہندوستان کو انگلو امریکن بلاک کی طرف اور زیادہ جھکنا پڑے۔

(۲) ہندوستان روس سے لگاوٹ کرنے میں پاکستان کو مات دے دے اور پاکستان مجبوراً انگلو امریکن بلاک کا سہارا لے۔

(۳) دونوں انگلستان اور امریکا کی خوشنودی حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کریں۔

ان تینوں صورتوں میں ہند و پاکستان دونوں کی حقیقی آزادی کا خاتمہ ہو جائے گا اور وہ دوسروں کی بساطِ سیاست کے مہرے بن جائیں گے۔ ان کے تعلقات بدستور کشیدہ رہیں گے اور یہ اندیشہ رہے گا کہ کسی دن بین الاقوامی سیاست کا بے درد ہاتھ ان کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر تباہ نہ کر دے۔

اس لئے ہند و پاکستان کو ابھی سے آنکھ کھول کر دیکھنا چاہئے کہ اُن کے خوف اور بدگمانی کے جذبات انھیں بے خبری میں ادھر لے جا رہے ہیں جدھر وہ ہوش و حواس کی حالت میں ہرگز نہ جاتے۔ انھیں باہمی خوف اور بدگمانی کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے۔ جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے یہ مطالبہ بالکل ناجائز ہے کہ ۴۰ لاکھ آدمیوں کو کسی کا خوف یا بدگمانی دور کرنے کے لئے بھیڑ بکریوں کی طرح ادھر سے اُدھر ہنکا دیا جائے۔ اس مسئلہ کا فیصلہ تو خود اہل کشمیر کی مرضی اور (بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

دُنیا کی رفتار

ہندوستان

نئی دہلی۔ ۲۹ اگست۔ خیال کیا جاتا ہے کہ کشمیر کمیشن نے ہند اور پاکستان کو صلح کی نئی تجاویز کے سلسلے میں یہ رائے دی ہے کہ وہ ثالثی پر راضی ہو جائیں۔

لکھنؤ۔ ۲۹ اگست۔ شری موہن لال سکسینہ وزیر بحالی نے کہا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ضبطی جائداد کے آرڈیننس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

نئی دہلی۔ ۳۱ اگست۔ ہند کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے پاس پریسیڈنٹ ٹرومین کا ایک ذاتی پیام پہنچا۔ اس کا مضمون صیغۂ راز میں ہے مگر خیال ہے کہ اس میں انہوں نے کشمیر کے جھگڑے کو جلد ختم کرنے کی اپیل کی ہے۔

لیک سکسیس۔ ۲ ستمبر۔ مستند ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ مسٹر ٹرومین اور مسٹر اٹیلی نے ہند اور پاکستان دونوں سے اپیل کی ہے کہ ایڈمرل نمٹز کو کشمیر کا جھگڑا چکانے کے لئے غیر جانبدار ثالث مان لیں۔

پونا۔ ۴ ستمبر۔ شری بی۔ جی کھیر وزیر اعظم بمبئی صوبے کی اسمبلی میں یہ رزولیوشن پیش کرنے والے ہیں کہ مرکزی اسمبلی سے درخواست کی جائے کہ وہ صوبے میں تارکین وطن کی املاک کے انتظام کے بارے میں قانون بنا دے۔

الہ آباد۔ ۱ ستمبر۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک عام جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا "مجھے کشمیر کے معاملے میں پریسیڈنٹ ٹرومین اور اٹیلی کی مداخلت سے حیرت ہے .... جھگڑے کے بنیادی سبب کو چھوڑ کر ضمنی مسئلے اٹھانا مناسب نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمیں اس صورت حال سے الجھن ہوتی ہے۔"

پاکستان

لاہور۔ ۲۷ اگست۔ پنجاب مسلم لیگ کونسل کے ۸۰ ممبروں نے لیگ کے ایک جلسے کا مطالبہ کیا ہے تاکہ پاکستانی گورنر کے تقرر کی وجہ سے حالات میں جو تبدیلی ہوئی ہے اُسے مدنظر رکھ کر گورنر کے مشیروں کے مسئلے پر از سر نو غور کریں۔

کراچی۔ ۲۷ اگست۔ سکریٹری جنرل مسٹر محمد علی ہندی تعلقاتی ڈیلی گیشن کے صدر مسٹر ایراہین سے ملے۔

کراچی۔ ۲۹ اگست۔ پاکستان مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے یہ رزولیوشن پاس کیا کہ موروثی جاگیروں کو فوراً بغیر کسی معاوضے کے ختم کر دیا جائے اور اس بات کو بھی اصولاً تسلیم کر لیا کہ بڑی زمینداریاں کو ختم کر دینا چاہیے۔

کراچی۔ ۳۰ اگست۔ مشرقی بنگال کے وزیر اعظم نور الامین صاحب نے بتایا کہ ان کے صوبے میں تنسیخ زمینداری کا قانون اس سال دسمبر کے آخر تک پاس ہو جائے گا۔

کراچی۔ یکم ستمبر۔ اسمٰعیل چندریگر صاحب جو کابل میں پاکستان کے سفیر ہیں ۲ ستمبر کو کراچی واپس آ رہے ہیں تاکہ افغانستان اور پاکستان کے تعلقات کے بارے میں اپنی حکومت کو رپورٹ دیں، اور ہرجانے کی رقم کے بارے میں جو افغانستان کو بمباری کے واقعے کے سلسلے میں ادا کی جائے گی گفتگو کریں۔

سری نگر۔ ۲ ستمبر۔ رائٹر کی ایک رپورٹ کے مطابق پریسیڈنٹ ٹرومین اور مسٹر اٹیلی نے ہند اور پاکستان سے اپیل کی ہے کہ کشمیر کے جھگڑے کو طے کرنے کے لئے ایڈمرل نمٹز کو حکم مان لیں۔

کراچی۔ ۳ ستمبر۔ پاکستان کی کیبنٹ کشمیر کے جھگڑے کو طے کرنے کے لئے ایک غیر جانبدار ثالث مقرر کرنے کی تجویز پر غور کر رہی ہے۔ ابھی تک اس نے کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔

لاہور۔ ۳ ستمبر۔ پاکستان ٹائمز کے نامہ نگار کے بیان کے مطابق میاں عبدالباری صدر پنجاب مسلم لیگ نے میاں ممتاز دولتانہ پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ اُن کو صوبائی لیگ کی صدارت سے ہٹانے کے لئے سازش کر رہے ہیں۔

پچھلے ہفتے ہندوستان میں، ملک کی توجہ زیادہ تر دو چیزوں کی طرف رہی ، مسئلۂ کشمیر اور تارکین وطن کی املاک کا ضابطہ

نئی کروٹ کشمیر کے مسئلے نے غیر معمولی اہمیت اس وجہ سے حاصل کر لی ہے کہ دنیا کی دو بڑی حکومتوں انگلستان اور امریکہ کے سرداروں نے اس میں بہت گہری دلچسپی لینی شروع کر دی ہے۔ ان دونوں کے خطوں کا مضمون صیغۂ راز میں رکھا گیا ہے۔ پھر بھی لیک سکسیس کی خبر سے اتنا معلوم ہو گیا کہ اس میں ہند اور پاکستان سے یہ درخواست کی گئی ہے کہ کشمیر کے جھگڑے کو حل کرنے کے لئے ایڈمرل نمٹز کو جو رائے شماری کے ناظم مقرر کئے گئے تھے ثالث مان لیا جائے۔ ان حضرات کا یہ اقدام عام دستور کے خلاف اور بالکل غیر متوقع ہے اس لئے پنڈت نہرو کی حیرت اور الجھن بجا ہے۔ پاکستان کی حکومت کا ردعمل بھی کچھ اسی قسم کا معلوم ہوتا ہے۔ پھر بھی ہندوستانی حکومت تجویز کو رد کرنے سے پہلے اس پر اچھی طرح غور کر رہی ہے۔ آج ۵ ستمبر کو پنڈت نہرو سردار پٹیل سے ملنے کے لئے بمبئی جا رہے ہیں۔ چونکہ شیخ عبداللہ بھی ساتھ ہیں اس لئے خیال ہے کہ کشمیر کے مسئلے پر بھی گفتگو ہوگی۔ غالباً ہندوستان کی حکومت کی طرف سے اسی ہفتے کے اندر کوئی جواب بھیج دیا جائے گا۔

یہ بات معقول ہے تارکین وطن کی املاک کے ضابطے سے نہیں بلکہ اس پر اندھا دھند عمل درآمد ہونے سے جو بے چینی ہندوستان کے مسلمانوں میں پیدا ہو گئی ہے وہ شری موہن لال سکسینہ کے تسلی آمیز الفاظ سے دور نہیں ہو سکتی۔ لیکن شری بی جی کھیر جو تجویز پیش کر رہے ہیں وہ بہت معقول ہے۔ اگر مرکزی اسمبلی اس بارے میں قانون بنا کر راہ عمل کو صاف اور متعین کر دے تو مقامی حکام اور پولیس کو من مانی کارروائی کرنے کا موقع نہیں رہے گا اور جو شکایتیں روزانہ سننے میں آ رہی ہیں اُن کا انسداد ہو جائے گا۔

کوئی اُمید بر نہیں آتی لاہور میں لیاقت علی خاں صاحب کے آنے سے جو اُمید بندھی تھی کہ شاید مسلم لیگ کے دونوں گروہوں میں جو ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں صلح ہو جائے وہ پوری نہیں ہوئی۔ میاں عبدالباری اور میاں ممتاز دولتانہ کی کشمکش جاری ہے۔ دولتانہ پارٹی کوشش کر رہی ہے کہ صوبے کی لیگ ان ناموں کو جو میاں عبدالباری نے گورنر کے مشیروں کے عہدوں کے لئے پیش کئے ہیں واپس لے تاکہ ایک طرف میاں عبدالباری کی سبکی ہو اور ان کو استعفا دینا پڑے۔ اور دوسری طرف میاں ممتاز دولتانہ کو اس کا موقع ملے کہ اپنے جتھے کے لوگوں کے نام مشیروں کے عہدوں کے لئے پیش کریں۔ میاں عبدالباری نے ایک تازہ بیان میں یہ شکایت کی ہے کہ میاں ممتاز دولتانہ نے اس وعدے کے باوجود کہ وہ اقبال چیما صاحب کو صوبائی لیگ کے سکریٹری کے عہدے کے لئے کھڑا نہیں کریں گے، چپکے چپکے سازش کر کے ان کو سکریٹری منتخب کرا دیا اور یہ ساری کارروائی میاں عبدالباری کو صدارت سے ہٹانے کے لئے کی گئی۔

اطمینان کی لہر کشمیر کمیشن کی نئی تجویز اور پریسیڈنٹ ٹرومین اور اٹیلی کی اپیل سے کراچی کے سرکاری حلقوں میں بظاہر اطمینان کی لہر دوڑ گئی ہے غالباً حکومت پاکستان یہ سمجھ رہی ہے کہ اس کی روس کی طرف جھکنے کی دھمکی رنگ لائی۔ وہ اس کا اندازہ کر رہی ہے کہ مسٹر ٹرومین اور مسٹر اٹیلی نے جو کشمیر کا مسئلہ دوبارہ اُٹھایا ہے اس سے پاکستان کی بگڑی ہوئی بات کے بنانے میں کسی حد تک مدد مل سکتی ہے۔ روس کے تجارتی ڈیلی گیشن سے کھل مل کر باتیں ہو رہی ہیں مگر آنکھیں اور کان لندن، واشنگٹن اور نئی دہلی کی طرف لگے ہوئے ہیں۔

غزل

سیّد اختر علی تلہری

اک نظر اور تجھے ذوقِ تماشا کی قسم
ذوقِ جلوہ کی قسم ذوقِ تجلّی کی قسم

عربدہ جو سہی تو ہی مری ہستی کا نظام
ذوقِ حسرت کی قسم ذوقِ تمنا کی قسم

ہاں مرے دل کو بنا عشق کے جلووں سے بہشت
تجھ کو اپنے ہی جمالِ رُخِ زیبا کی قسم

ہیں چمن تیرے شہیدوں کے لہو سے شاداب
گُلِ رعنا کی قسم لالۂ حمرا کی قسم

میری نظروں میں ساقی نہیں جنت کی شراب
ساغرِ گُل کی قسم آبِ مصفا کی قسم

ہو تصور سے ترے دل چمن آرائے نشاط
روئے زیبا کی قسم زلفِ چلیپا کی قسم

ہو تری مست نگاہی سے زمانہ مخمور
مئے گلگوں کی قسم ساغر و مینا کی قسم

حسنِ خودبیں کی ہی شوخی کا کرشمہ دُنیا
گوشِ شنوا کی قسم دیدۂ بینا کی قسم

جلوۂ حسن کی ہوتی نہیں ہر آنکھ حریف
طورِ سینا کی قسم برقِ تجلا کی قسم

عشق معشوق میں کر لیتا ہی جلیسے پیدا
چشمِ مجنوں کی قسم عارضِ لیلا کی قسم

پاکبازانِ وفا کے لئے زنداں ہی بہشت
حسنِ یوسف کی قسم عشقِ زلیخا کی قسم

حوصلے آج بھی دل کے ہیں مرے عرش مسیر
مہرِ رخشاں کی قسم عقدِ ثریا کی قسم

کوئی سمجھا نہیں اب تک ترے اختر کا جنوں
ہوش و وحشت کی قسم دانش و سودا کی قسم

بھڑک رہے ہیں چراغ

باقر رضوی

جو راز دہر کو اک خلدزار کر دے گا
خِرد کی فکرِ رسا سے ملا ہی اُس کا سُراغ
بنے گا رشکِ جناں یہ خرابۂ دُنیا
ہر ایک ذرۂ خاکی کا عرش پہ ہی دماغ
جلائی جائیں گی شمعیں سیاہ خانوں میں
بنے گا سروِ چراغاں ہر اک دل کا داغ
چمن رہے گا نہ وقفِ تصرفِ شاہیں
بنیں گے سب کے نشیمن وہ ہوں سغن یا زاغ
خیال ناوک و پیکاں، نہ ذکر و فکرِ خزاں
چہک رہے ہیں عنادل پھبک رہا ہی باغ
مہک رہی ہیں ہوائیں، کھلا ہی مے خانہ
بہک رہے ہیں شرابی، کھنک رہے ہیں ایاغ
نئے اُفق سے نیا آفتاب نکلے گا
لرز رہے ہیں ستارے، بھڑک رہے ہیں چراغ

بزم بے تکلّف

فاضل مقرر کا اصلی نام تو مرزا فہیم بیگ ہے۔ مگر لوگ ان کو مرزا گھن گرج کہتے ہیں۔ بڑے ڈیل ڈول کے آدمی ہیں، پر لمبائی چوڑائی مٹاپے سے شرما کر کچھ ٹھگنا سی گئی ہے۔ گول مٹول دھڑ پتلی سی لمبی گردن اور تنگ دہانہ۔ جب پالتھی مار کر تخت پر بیٹھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کسی نے کھڑا ڈھول رکھ کر اس پر لاؤڈ اسپیکر لگا دیا ہے۔ آنکھیں کسی قدر چھپلی اور چندھی اور چہرہ لرسد اور بے رونق ہے عام طور پر ایسا لگتا ہے جیسے اس مٹی کے ناسور میں جان ہی نہیں۔ جہاں کسی نے رکھ دیا رکھا ہوا ہے مگر جہاں ہونٹوں کو جنبش ہوئی اور

ع ۔ نقارۂ وغا پہ لگی چوٹ ناگہاں

دور دور تک زمین ہل جاتی ہے اور سننے والوں کے دل دہل جاتے ہیں۔

ہم نے جو مرزا صاحب کو فاضل مقرر کہا اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ وہ عام جلسوں میں جا کر تقریریں کرتے ہیں۔ گو قانون کی اصطلاح میں انھیں جائداد غیر منقولہ نہ کہہ سکیں مگر بیچارے کشش ثقل کے ہاتھوں ایسے مجبور ہیں کہ نقل و حرکت ان کے لئے محال عقلی ہو کر رہ گئی ہے۔ ہم نے تو جب دیکھا انھیں ان کے مکان کے احاطے میں ایک بڑے سے تخت پر جسے لوگ اُن کا پایۂ تخت کہتے ہیں، نصب پایا، وہیں تیسرے پہر سے آس پاس کے بے فکروں کا مجمع ہو جاتا ہے اور رات گئے تک رہتا ہے۔ گلی کی موریوں کی عفونت سے کر بحر الکاہل کی سیاست تک کوئی موضوع نہیں جس پر طبع آزمائی نہ ہوتی ہو۔ اور سب باتوں کو تو مرزا صاحب سکر کے عالم میں چپ چاپ سنتے رہتے ہیں۔ مگر مسلمان ملکوں کا نام آتے ہی ان پر سکرات کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ گلے سے ایک روح فرسا گڑگڑاہٹ پیدا ہوتی ہے۔ جس سے ناواقف چونک پڑتے ہیں کہ شاید معدی کرب دم توڑ رہا ہو مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ محض کہ مرزا گھن گرج کے کھنکارنے کی آواز ہے اس کے بعد فوراً طوفان پھٹ پڑتا ہے " یہ تم لوگ کیا فلسطین کے بارے میں عقلی گدے لڑایا کرتے ہو، ہم سے پوچھو جو تحریکِ خلافت کے زمانے میں برسوں اس دشتِ پر آشوب کی سیاحی کر چکے ہیں اور اپنی وحشت دل کے بل پر دنیا میں اس سرے سے اس تک ہلچل ڈال چکے ہیں۔

ع ۔ زلزلے عالم میں تھے جب دل مرا بیتاب تھا

کیا کہا نتیجہ اور فائدہ؟ تمھیں شرم نہیں آتی، نبیوں کی طرح سود و زیاں کا حساب کرتے ہو۔ مسلمان، مجاہد، غازی، مردِ خدا، مردِ مومن، مردِ حُر، کہیں نتیجے اور فائدے کو دیکھتا ہے۔

ع ۔ بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

یہ کون بولا کہ خود نہیں کودا دوسروں کو ڈھکیل دیا؟ نعوذ باللہ یہ شیطان کی آواز ہے جو مردِ مومن کے دل میں وسوسہ پیدا کر دیتی ہے۔ مسلمانوں میں من تو کا فرق کرنا کفر ہے۔ میں نہ سہی تم سہی، اصل چیز تو آتشِ نمرود میں کودنا ہے، متاعِ زندگی، دولتِ ہوش و خرد، سرمایۂ راحت و عافیت لٹانا ہے۔ خیر تو میں کہہ رہا تھا کہ

ع ۔ کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے

ہم جانتے ہیں کہ جزیرۃ العرب میں فتنۂ یہود کے سر اٹھانے کا سبب کیا ہے صرف یہ ہے کہ عرب کے مسلمان میں غیرت و حمیت نہیں رہی، شجاعت و بسالت نہیں رہی اس کے دل میں درد کی لذت نہیں رہی، عشق کی حرارت نہیں رہی۔

ع ۔ بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے ۔ مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

مانا کہ یہودیوں کی فوج بہت منظم تھی، مانا کہ ان کو روس اور امریکہ دونوں کی مدد سے زبردست مالی اور جنگی وسائل حاصل تھے۔ یہ بھی تسلیم کہ لڑائی کے جاری رکھنے میں عرب ملکوں کے لئے ہلاکت کا خطرہ تھا۔ لیکن مردِ حر کہیں ہلاکت سے ڈرتا ہے وہ تو اس کی دال روٹی اس کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اب یہ میاں شرق اردن صاحب انگریزوں سے سازباز کر کے شام اور عراق سے مل کر ایک متحدہ

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

آدمی کھائے تو کیا کھائے

ایک زمانہ تھا کہ کھانے پینے کی احتیاط کو ہم لوگ پرانی قسم کے طبیبوں کا خبط سمجھتے تھے۔ اب کچھ دن سے جدید طب نے غذائیات کی طرف توجہ کی ہے تو پھر اتنی کی ہے کہ زندگی دشوار ہو گئی ہے۔ شاید ہی کوئی کھانے پینے کی چیز ایسی ہو جسے کوئی نہ کوئی ماہر فن زہر نہ بتاتا ہو۔ جو لوگ اس چکر میں پڑے ہوئے ہیں ان کو یہ مضمون غور سے پڑھ کر لذت اور احتیاط کے درمیان اعتدال کا نقطہ تلاش کرنا چاہئے۔

کہتے ہیں کہ کھانا صرف زندہ رہنے کے لئے ہے یہ نہ سمجھو کہ زندگی کھانے کے لئے ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کون سی چیزیں ہیں جن کو کھا کر آدمی کچھ دن زندہ رہ سکتا ہے، اور کون سی ایسی ہیں جن کو کھاتے ہی چل چلاؤ لگ جاتا ہے۔ پہلے زہر کی چند قسمیں مقرر تھیں اب اس ترقی کے زمانے میں ہزاروں قسم کے زہر نکل آئے اور ہر کھانے کی چیز میں کسی نہ کسی طرح گھس بیٹھ کر پہنچ جاتے ہیں۔

میں نے تو کھانا کھانا ہی چھوڑ دیا ہے، کون اپنی جان جوکھم میں ڈالے۔ جتنی چیزیں میرے لئے مفید ہیں وہ دراصل سخت مضر ہیں، یقین نہ ہو تو سائنس والوں سے پوچھ لیجئے۔

مثلاً شکر ہے اس سے جسم میں فوری چستی پیدا ہوتی ہے۔ ڈاکٹر پال مائیکل کا تجربہ ہے کہ جن گولف کھیلنے والوں نے دوپہر کے کھانے میں میٹھی چیزیں کھائیں وہ سہ پہر کو بہت اچھا کھیلے

مگر مشکل یہ ہے کہ شکر میں کاربو ہائیڈریٹ بہت زیادہ ہے اور اس سے دانت خراب ہوتے ہیں۔ جانس ہاپکن کے، ای، وی میک کولم صاحب فرماتے ہیں کہ اگر ہم شکر کم کھائیں تو دانتوں کو کیڑا لگنے کا اندیشہ بہت کم ہے۔

اچھا تو صاحب شکر چھوڑ دی جائے۔ مگر ذرا ٹھہرئے گا۔ اگر میرے خون میں شکر بہت کم ہوئی تو ڈر ہے کہ میں جھلا اور چڑچڑا ہو جاؤں گا، بلکہ کوئی تعجب نہیں کہ جرائم کا ارتکاب کرنے لگوں مجرموں کے جسم میں شکر کی کمی پائی گئی ہے۔

پس بہتر ہے کہ ایک کھانے اور دوسرے کھانے کے بیچ میں مصری کی ڈلیاں چباتا ہوں، کسی طرح ارتکاب جرم کی خواہش تو رکے۔ مگر یہ تو بتائیے کہ اگر میرے جسم میں سرطان کے خلیے موجود ہوئے تو کیا ہوگا؟ کہا جاتا ہے کہ شکر کی زیادتی اُن کی نشو و نما کے لئے نہایت سازگار ہے، اور پھر یہ بھی سوال ہے کہ میں شکر کھا کے موٹا ہو گیا تو جب قلب کا پہلا دورہ پڑے گا تو اتنے وزن کے ساتھ اس کا مقابلہ کیسے کروں گا۔

اب آپ سمجھے کہ میں پریشان کیوں ہوں؟ یا پالک کو لے لیجئے، چاہے اس سے پٹھوں کو قوت نہ پہنچے، لیکن اس میں صحت بخش فولاد اور کیلسیم کثرت سے ہوتا ہے اور اکثر بچوں کے لئے اس کا کھانا لازمی ہے۔

لیکن مسوری یونیورسٹی کے دو حضرات فرماتے ہیں کہ میں اس فولاد کا جو پالک میں موجود ہے صرف ۲۰ فی صدی ہضم کر سکتا ہوں۔ اس سے بڑھ کر غضب یہ ہے کہ پالک میں ایک ایسا چرچرا تیزاب ہے کہ وہ نہ صرف پالک سے بلکہ جو کچھ میں کھاؤں سب کے اندر سے کیلسیم چرا لیتا ہے۔ میں تو لٹ جاؤں گا!

جب میں گاجر کھاتا تھا، تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ صحت بڑھتی پڑ رہی ہے۔ میں جانتا تھا کہ اس میں کیروٹین ہے، جس سے میرا جسم وٹامن الف کا امرت بناتا ہے۔ مگر نئی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ میرا جسم اس کام میں اتنا تیز نہیں جتنا سمجھا جاتا تھا، سیروں گاجر کھاؤں تب جا کر کافی وٹامن بنے

جب ترکاریوں کی پول کھل گئی تو میں نے حیوانی غذا کی طرف توجہ کی، مثلاً انڈا، انڈے سے بڑھ کر بے ضرر اور کیا چیز ہو سکتی ہے؟

کہیں اس دھوکے میں نہ رہئے گا! راک فیلر انسٹیوٹ کے ایک محقق فرماتے ہیں کہ کچا انڈا سب سے زیادہ دیر ہضم ہے وٹامن ہے، پھر اگر اس میں ڈھیروں وٹامن بھی ہوں تو کیا فائدہ؟ اور سنئے کہ اس کی زردی میں ایک ایسی چیز ہے جس سے شریان سخت پڑ جاتے ہیں۔

خیر اسے بھی جانے دیجئے، کافی کی ایک پیالی پینے میں تو کوئی حرج نہیں، کہتے ہیں چوہوں کو اتنی کیفین روز دی گئی جتنی کافی کی ۱۲۰ پیالیوں میں ہوتی ہے اور وہ انھیں خوب راس آئی۔

وہ حرج کیوں نہیں! کافی سے معدے میں چھالے پڑ جاتے ہیں اور اعصاب اتنے کمزور پڑ جاتے ہیں کہ ذرا سی بات میں آدمی چونک پڑتا ہے خیر اعصاب کی کمزوری سے بچنے کے لئے تو تھوڑی سی شکر ملانے سے کام چل سکتا ہے۔ مگر شکر؟ مگر یہ تو پھر وہی قصہ آ گیا۔

تنگ آ کر یہ سوچا ہے کہ صرف ڈبل روٹی اور پانی پہ گذارہ کروں، ظاہر ہے گیہوں کی روٹی بہتر ہے جن چوہوں کو یہ کھلائی جاتی ہے وہ نمونیہ کے جراثیم کی زیادہ مزاحمت کر سکتے ہیں۔

مگر یہاں بھی "مگر" کی گنجائش ہے۔ پکی ہوئی روٹی میں گیہوں کی چکنائی، پروٹین اور وٹامن کا بڑا حصہ ضائع ہو جاتا ہے اور اگر کہیں ڈبل روٹی کے صاف کرنے میں نائٹروجن ٹرائی کلورائڈ سے کام لیا گیا ہو تو بڑی مشکل پڑ جائے گی، میرے جسم میں ایسی تبدیلیاں ہوں گی کہ شراب کی ہوس بڑھ جائے گی۔ اس میں شک نہیں کہ خمیر میں وٹامن (ب) ہوتی ہے مگر وہ جراثیم بھی ہوتے ہیں جو ہر قسم کے وٹامن کو کھا جاتے ہیں۔

خدا کے لئے یہ بتلائیے۔ پانی میں تو کوئی نقصان نہیں، پیٹ نہیں بھرے گا تو نہ سہی۔

بس اتنا نقصان ہے کہ صرف پانی پینے سے جسم ضروری معدنی اجزا سے محروم رہے گا، تکان کی حالت میں بہت سا پانی پی گئے تو بدن اکڑ جائے گا اور کہیں میرے میں لوٹے کے لوٹے چڑھا گئے تو سرسام سے بدتر حالت ہو جائے گی۔

اب آپ سمجھے کہ میں نے کھانا پینا کیوں چھوڑ دیا ہے؟

دو دن کسی نہ کسی طرح گذر گئے۔ پھر یہ خیال آنے لگا کہ کہیں میں نے جلد بازی سے تو کام نہیں لیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ سائنس والوں کے مضامین کے صرف عنوان پڑھ لئے، اُن کی تفصیلات پر غور نہیں کیا؟ بہر حال اس طرح ہوا پھانکنے سے تو کام نہیں چل سکتا۔

آپ دیکھئے تو سہی۔ پانی میں کیا برائی ہے۔ معدنی اجزا نہیں ہیں نہ سہی کسی اور چیز سے حاصل ہو جائیں گے۔ تکان کی حالت میں ذرا سا نمک ملا لیا۔ چلئے بدن کے اکڑنے سے بچ گئے۔

اور ڈبل روٹی بھی کچھ ایسی خطرناک نہیں۔ گیلے خمیر سے بے شک وٹامن ضائع ہو جاتے ہیں مگر سوکھے سے نہیں ہوتے۔ جن چیزوں کی روٹی میں کمی ہے وہ دوسری چیزوں سے پوری ہو جاتی ہے اب رہا نائٹروجن، ٹرائی کلورائڈ تو اس سے آج تک کسی انسان کو نقصان نہیں پہنچا۔ دوسرے اب وہ عام طور پر روٹی کے صاف کرنے میں استعمال بھی نہیں ہوتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ کافی بھی شروع کر دینی چاہئے میرے تو آج تک چھالے پڑے نہیں، جن لوگوں کے کافی پینے سے معدے میں چھالے پڑتے ہیں ان کا اوسط سو میں دس ہے۔ میں ان نوے میں سے ہوں، جن کو یہ شکایت نہیں ہوتی۔ اب رہا اعصاب کا معاملہ۔ یہ محض خیال ہے لوگوں کو بغیر کیفین کی کافی دی گئی، ان کو رات بھر نیند نہیں آئی، الٹا ہی کو دودھ میں سے چپکے سے بہت سی کیفین ڈال کر پلا دی اور وہ مزے میں رات بھر سوتے رہے۔

کچا انڈا ممکن ہے کسی قدر دیر ہضم ہو

آپ کا عشقِ و محبت کا نظریہ کیا ہی!

واقعیت پسندی یا رومان پرستی

واقعیت پسندی کا تعلق دماغ سے ہے۔ رومان پرستی کا دل سے۔ اگر دونوں میں صحیح توازن ہو تو آپ زندگی کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور اُس سے لطف اُٹھا سکتے ہیں۔ ذیل کے سوالوں کے جواب سوچ سمجھ کر دیانت داری سے کاغذ کے ایک پرچے پر لکھتے جائیے۔ جواب صاف ہونا چاہئے۔

ہاں یا نہیں۔

۱۔ کیا تھیٹر یا سنیما میں عشقیہ سین دیکھ کر آپ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ آپ پر گذر رہی ہی؟
۲۔ کیا وہ افسانے جن میں عشق و محبت کا ذکر نہ ہو آپ کے لئے بے کار ہیں؟
۳۔ کیا آپ کے لئے شادی کی تقریب ایک دلچسپ فلم سے زیادہ دل کش ہے؟
۴۔ کیا آپ کو عشق کے خیالی نقشے بنانے کا شوق ہے؟
۵۔ کیا آپ کے نزدیک عشق کا تجزیہ کرنے سے اس کی دل فریبی جاتی رہتی ہے؟
۶۔ کیا آپ کا عقیدہ ہے کہ قدرت نے ہر مرد کے لئے ایک خاص عورت اور ہر عورت کے لئے ایک خاص مرد کو پیدا کیا ہے؟
۷۔ کیا آپ اسے شرطِ محبت سمجھتے ہیں کہ محبوب کے عیبوں سے آنکھ بند کر لی جائے؟
۸۔ کیا دوسروں کو محبت کرتے دیکھ کر آپ کا دل پھڑک اُٹھتا ہے؟
۹۔ کیا آپ کے نزدیک سچا عشق ایک نظر میں ہو سکتا ہے، اور اسی وقت محسوس بھی ہو جاتا ہی؟
۱۰۔ کیا آپ کو شادیاں ٹھہرانے کا شوق ہے؟
۱۱۔ کیا آپ یہ اکثر سوچا کرتے ہیں کہ کہیں آپ نے محبوب کے انتخاب میں غلطی تو نہیں کی؟
۱۲۔ کیا آپ محبوب سے ملنے سے پہلے ملاقات کا سارا نقشہ اپنے ذہن میں کھینچا کرتے ہیں؟
۱۳۔ کیا آپ ملاقات کے بعد دیر تک اس کی یاد سے لطف اُٹھایا کرتے ہیں؟
۱۴۔ کیا آپ اکثر عشقیہ شعر گایا یا گنگنایا کرتے ہیں؟
۱۵۔ کیا وہ جگہیں جہاں آپ محبوب کے ساتھ رہے ہوں، آپ کی نظر میں ایک خاص طلسمی کیفیت رکھتی ہیں؟
۱۶۔ کیا آپ کے خیال میں یہ ہو سکتا ہے کہ محبت دم بھر میں ہو جائے اور دم بھر میں جاتی رہے؟
۱۷۔ کیا آپ کو بڑی تمنا تھی یا ہے کہ کسی سے عشق ہو جائے؟
۱۸۔ کیا وہ شخص جس سے آپ کو محبت ہے کم سے کم آپ کے لئے ایک مکمل انسان بن جاتا ہے؟
۱۹۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ شادی کے بعد عمر بھر میاں بیوی میں رومانی معاشقہ جاری رہنا چاہئے؟
۲۰۔ کیا آپ عشق کی راہ میں جاہ و منصب، مال و دولت سے ہاتھ دھونے کو تیار ہیں؟

بزمِ بے تکلف

(بہ سلسلہ صفحہ ۵)

ریاست یہودیوں کے مقابلے کے لئے بنانا چاہتے ہیں۔ کوئی پوچھے بھلا یہ واویلا مسلمان کو زیب دیتے ہیں، اور پھر انگریز سے مدد لینا۔

ع۔ حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است

کاش ہم کو جزیرۃ العرب کے دورے کا موقع مل جائے۔ کیا فرمایا آپ نے؟ جی ہاں اس تختِ سلیمانی پر بیٹھ کر کچھ اجارہ ہے آپ کا؟ بس جہاں سے گذر ہوا ایک ہوئے قلندرانہ ایک نعرۂ مستانہ

ع۔ جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے

یہ کس بدتمیز نے ہانک لگا دی

ع۔ جو ذہن کو الجھا دے جو عقل کو چکرا دے

بس اب حد ہو گئی۔ تم لوگوں کے سامنے تقریر کرنا بھینس کے آگے بین — — لاحول ولا قوۃ!

ان بدتمیزوں کے چکر میں پڑ کر ہم خود چکرا گئے۔

مگر میں اسے ذرا سا پکالوں گا، اور خوب چبا کر کھاؤں گا۔ اب رہا شریانوں کا سخت ہو جانا ۔۔۔ تک محض ایک نظریہ ہے اور پھر مجھے کوئی انڈوں سے پیٹ تھوڑی بھرنا ہے۔

گاجر میں تھوڑی سی وٹامین (الف) تو ہوتی ہی ہے۔ اتنی نہ سہی، جتنی کلیجی اور مکھن میں ہے اور ذرا سی پالک میں اتنا زیادہ تیزاب نہیں ہو سکتا کہ وہ اتنی اچھی متوازن غذا کو خراب کر دے۔

مانا کہ شکر میں وٹامین وغیرہ نہیں ہیں، مگر اس کے فائدے تو ہیں۔ دانتوں کو رگڑ کر بار بار صاف کر لیا کروں گا تو کیڑا نہیں لگنے پائے گا۔

ہاں، دو کھانوں کے بیچ میں مصری کی ڈلیاں نہیں چباؤں گا۔ ارتکابِ جرم کے رجحان سے کسی نہ کسی طرح نپٹ لوں گا۔ آخر ضبطِ نفس بھی کوئی چیز ہے مگر سرطان، مٹاپا اور قلب کا دورہ، خدا کی پناہ! اگر زیادہ مٹھائی کھانے کی یہ قیمت ہے تو سودا بڑا مہنگا ہے۔

مختصر یہ کہ میں تو اپنی وہی متوازن غذا کی پرانی ترکیب شروع کرتا ہوں۔ مجھے شکاگو کے جید محقق ۔۔۔ اکارسن کے یہ الفاظ یاد ہیں "اپنی معمولی غذا میں بہت زیادہ تبدیلی نہ کرو، سوا ان چند لوگوں کے جن کا مزاج انوکھا ہوتا ہے۔ ہر غذا ہر شخص کے لئے صحت بخش ہے........ انسانی غذا کی سب سے محفوظ شکل یہ ہے کہ نباتی اور حیوانی دونوں قسم کے اجزا ہوں"!

سچی بات یہ ہے کہ بے کھائے پئے رہنے کا نسخہ ہے خوب، مگر وہ جو پیٹ میں ایک کھرچن سی ہوتی ہے اس کا کیا علاج؟

(ماخوذ)

کشمیر اور ہم

(بہ سلسلہ صفحہ ۱)

کو گرما دیا، اپنے خلوص، اپنی قربانی، اپنی ہمت اور اپنی محنت خدمت گذاروں کا ایک گروہ اپنی قوم میں تیار کر دیا جس نے اپنی سعی پیہم سے قوم کو اس آئیڈیل کے حصول کے روبرو لا کھڑا کیا۔ ان دونوں جواں ہمت شخصیتوں کا باہمی ربط و اعتماد، ان کا اشتراکِ افکار اور اشتراکِ عمل اس وقت کشمیر اور ہندوستان کا سب سے قوی رشتہ ہے، جس کا پرتو ہر ہندوستانی اور کشمیری کے دل و دماغ پر پڑ رہا ہے۔ یہ دونوں اپنی اپنی جگہ ہماری سیاسی زندگی کے بنیادی مسئلے کو حل کر رہے ہیں۔ یعنی ایک عمومی جمہوریت کے قیام کے لئے جس میں مذہب کا فرق، حقوقِ شہریت پر اثر انداز نہ ہو، وہ کر رہے ہیں، جو قوموں کے بڑے بڑے معمار کیا کرتے ہیں۔ ان کی کامیابی ہماری قومی زندگی کی سب سے عظیم الشان کامیابی ہوگی۔ ہر ہندوستانی اس مقصد کے حصول میں ان کا ساتھی ہے

بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو دہلی

جامنی رائے

ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی

جامنی رائے کی مصوری کا مقصد ہی سرے سے یہ نہیں کہ جلتی پھرتی زندگی کی مایا کو پیش کرتے پھریں بلکہ یہ ہے کہ اس کی گہرائیوں کو سطحی گوناگونی سے آزاد کر کے آسان سے آسان نقشوں میں حل کر دیں۔ جامنی رائے صورت اور زندگی کو اس طرح پرکھتے اور سمجھتے ہیں جس طرح ایک بچہ دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ جس کی آنکھیں بھرپور کھلی ہوتی ہیں اور جو اللہ کی پیاری دنیا کی ایک ایک چیز کو اس حیرت، محبت اور اچنبھے سے دیکھتا ہے کہ جو زندگی کی الجھنوں میں رفتہ رفتہ بالکل کھو جاتا ہے۔

آرٹ اور کلاکاری کو سمجھنے پرکھنے اور اس سے مزہ لینے اور سر دھننے والوں کی تعداد ہمیشہ سے بہت محدود رہی ہے، لیکن رنگوں اور لکیروں کے اس گورکھ دھندے کو سمجھنے والے جس کو نئے آرٹ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور بھی کہیں کم ہیں۔ بہرحال جامنی رائے ہندوستان میں اسی نئے آرٹ کے پیمبر کہے جا سکتے ہیں اور اس وقت انھیں کی کلاکاری اور زندگی کا ذکر آپ سے کرنا ہے اور اس اُمید میں کرنا ہے کہ سننے والوں میں سبھی ایسے ہوں گے کہ اگر ان کی کلاکاری کا کوئی گہرا اثر دل پر نہیں لے پاتے تو اس سے کچھ نہ کچھ آشنا ضرور ہوں گے، کیونکہ بات ساری یہ ہے کہ تصویر دیکھنے کی چیز ہے سننے کی نہیں اور جس نے دیکھا نہیں ہے اس کے لئے لاکھ کچھ کہئے "ٹیڑھی کھیر" والی مثل کا حساب رہے گا۔

جامنی رائے کی زندگی کا مختصر معاملہ یہ ہے کہ انھوں نے ۱۸۸۷ء میں پچھمی بنگال کے ایک گاؤں بیلیاتور میں معمولی کھاتے پیتے گھر میں جنم لیا اور اسی گاؤں میں جو بانکڑہ ضلع میں بہار اور بنگال کی سرحد پر واقع ہے ان کا بچپن گذرا۔ کلاکاری اور مصوری سے طبیعت کا رجحان ایسا کچھ تھا کہ سولہ برس کی عمر میں وہ گھر سے کلکتہ کے گورنمنٹ آرٹ اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیج دیئے گئے۔

کلاکاری میں جتنا کچھ سیکھنے بھر کو ہوتا ہے وہ انھوں نے نہیں سیکھا اور نہیں وہ مہاراج ابندر ناتھ ٹیگور کی شاگردی میں رہے، جن کے دم سے ہندوستان میں نئے سرے سے کلاکاری کا چرچا ہوا اور جنھوں نے کلا کی ایک نئی ریت ڈالی جو بنگال اسکول کے نام سے مشہور ہے

لیکن جامنی رائے نے کچھ ایسی گھڑی جنم لیا تھا اور ایسی بے چین طبیعت پائی تھی کہ ان کے لئے کسی اور کی ڈالی ریت پر چل کر آرام اور اطمینان کی زندگی گذارنی ممکن نہ تھی اور اس لئے ہوا یہ کہ بنگال اسکول کے پھیکے پھیکے رنگ اور ان رنگوں میں ہلکی ہلکی باریک لکیروں کا بہٹارہ جن میں کچھ چین جاپان کچھ اجنٹا کچھ مغل اور راجپوت اسکول کے پرانے چراغ نئے کر کے پیش کئے جاتے تھے۔ جامنی رائے کی جان کو اجیرن ہوتے گئے اور وہ بنگال اسکول اور بنگال اسکول کے برتنے والوں سے منہ موڑ کر کلاکاری میں ایک نئی راہ اور نئی منزل کی تلاش میں لگ گئے۔ جان کے اس جھگڑے میں جامنی رائے نے جو مصیبتیں اٹھائی ہیں اور جس ثابت قدمی کے ساتھ اپنے پرائے سے بیر لے کر مدتوں گمنامی اور مفلسی میں انھوں نے مصوری کی نئی راہیں ڈھونڈھی ہیں اس کی مثال انیسویں صدی کے تین مصوروں کی زندگی میں ملتی ہے جن سے یورپ کے نئے آرٹ کی بنا پڑی، یعنی سیزان، فان گوخ اور گوگان سے۔ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ یہی ہوا کہ دانے دانے کو ترس کے انھوں نے دن گذارے اور زندگی میں ان کی وہ تصویریں کوڑی مول بکیں جو آج ہزاروں میں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ تک پہنچتی ہیں، انھوں نے بھی یورپ کی مصوری کی پرانی راہوں کو چھوڑ کر اپنے اپنے رنگ میں ایک نئے انداز کی بنیاد ڈالی۔ فرق یہ ہے کہ انھوں نے اس راہ میں بڑی حد تک افریقہ اور ایشیا کی پرانی بت تراشی اور مصوری کی بنیادوں پر اپنی تصویروں کے رنگ روپ اور نقشے قائم کئے اور جامنی رائے نے سبھی کچھ دیکھا سمجھا اور کیا لیکن آخر میں اپنی طرز کی بنیاد ان سیدھے سادے نقشوں کو قرار دیا جو بنگال کے گاؤں میں صدیوں سے مٹی کے برتنوں، دیواروں اور کھلونوں پر بنتے چلے آتے ہیں۔ کیونکہ جامنی رائے کی کلاکاری کسی ایک طرز پر محدود نہیں رہی ہے اور کبھی کبھی انھوں نے بیسیوں تصویریں اسی انداز میں بھی بنائی ہیں کہ ان پر فان گوخ، اترلو، سکلے اور یورپ کے دوسرے نئی ریت کے مصوروں کا گمان ہو۔ لیکن ان کا اپنا انداز وہی ہے جو ان کی موٹی موٹی سیدھی سادھی چند لکیروں کے گھیر کے اندر خاکے یا تصویر کی صورت میں پیش ہوتا ہے اور جس پر بنگال کی دیہاتی کلاکاری کا اثر نظر آتا ہے۔ پھر اسی دیہاتی کلاکاری کا اور زیادہ گہرا اثر ان کی ان رنگوں میں ڈوبی ہوئی تصویر نسل میں ملتا ہے، جنھوں نے ان کے بعد کے کام کو رفتہ رفتہ بالکل ہی گھیر لیا ہے۔ جامنی رائے کے اس آخری طرز پر جو کلا کی ایک نئی ریت ایک نئے اسکول کی حیثیت اختیار کرنا چاہتا ہے۔ اکثر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اس میں رنگوں کا نظام کتنا ہی خوب صورت اور ساتھ ہی ساتھ اچانک بے دھڑک اور زوردار ہو لیکن اس میں کم و بیش ایک جیسی سانچوں میں ڈھلی کٹ پتلیاں اتاری جاتی ہیں جس کا زندگی اور زندگی کی خوشیوں اور بربادیوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اور جو صرف خوب صورت کھلونوں یا آرائش ساری سجاوٹ کے نمونوں کی حیثیت رکھتی ہیں یہ اعتراض ایک حد تک صحیح ہی ہے اور غلط بھی غلط یوں کہ جامنی رائے کی مصوری کا مقصد ہی سرے سے یہ نہیں کہ چلتی پھرتی زندگی کی مایا کو پیش کرتے پھریں بلکہ یہ ہے کہ اس کی گہرائیوں کو سطحی گوناگونی سے آزاد کر کے آسان سے آسان نقشوں میں حل کر دیں جامنی رائے صورت اور زندگی کو اس طرح پر دیکھتے اور سمجھتے ہیں جس طرح ایک بچہ اسے دیکھتا اور سمجھتا ہے، جس کی آنکھیں بھرپور کھلی ہوتی ہیں، اور جو اللہ کی پیاری دنیا کی ایک ایک چیز کو اس حیرت، محبت اور اچنبھے سے دیکھتا ہے جو زندگی کی الجھنوں میں رفتہ رفتہ بالکل کھویا جاتا ہے۔ بات ساری یہ ہے کہ کلاکار ہوتا وہی ہے کہ جس کی نظروں میں اس طرح کھوٹ نہ پڑ جائیں اور جس کی تحیر اور اچنبھے کی حسین سن نہ ہو سکیں۔ بھرپور کھلی آنکھوں کے ذکر پر جامنی رائے کی انھیں تصویروں کی لمبی لمبی آنکھوں کا خیال آتا ہے جن کے لئے پورے چہرے کی چوڑان بھی پوری نہیں پڑتی اور جو اس طرح پر کھلی ہوتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے ساری دنیا کو اپنے اندر سمیٹ لیں گی۔

تنقید کے دوسرے حصے پر کوئی آٹھ دس سال ہوئے میری اپنی ایک موقع پر ان سے بات چیت ہوئی تھی، یعنی جیسی کچھ بھی بات وہ ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں مجھ سے کر سکے اس طرح میں ان تک اپنے مطلب کو پہنچا سکا۔ وہ یہ کہ جب مصور کسی ایک چربے یا سانچے پر آکے ٹک جاتا ہے تو پھر وہ مصوری نہیں رہتی تصویر سازی اور کرخنداری ہو جاتی ہے۔ مجھے یاد ہے اس پر انھوں نے کچھ کہہ کر اور کچھ ہاتھ سے معانی کا اشارہ دے کر یہی بتلایا کہ یہ بھی ایک منزل ہے۔ کچھ دنوں کا ٹھکاؤ۔ آگے کچھ اور ہوگا۔ کچھ اور آئے گا۔

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

ہندسوں کا جھگڑا

مشتاق احمد

کانگریس اسمبلی پارٹی نے تقریباً یہ طے کر لیا ہے کہ ملک کی قومی زبان دیوناگری رسم الخط ہندی ہوگی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک معزز ممبر نے ہندی کی جگہ ہندوستانی کا لفظ رکھنا چاہا تھا لیکن ان کی اس تجویز کو شرف قبول نہیں بخشا گیا۔ یہ اصول مان لیا گیا ہے کہ زبان کو عوام کی بول چال سے قریب ہونا چاہیئے، لیکن اگر آل انڈیا ریڈیو کے جوتشی سے ہم اس اصول کی تقدیر معلوم کرنا چاہیں تو وہ یہی بتائے گا کہ ستارہ گردش میں ہے۔

ہندی کے حامیوں نے اس زبان کو پورے ملک کے سر پر تھوپنے کی جان توڑ کوششیں کی ہیں، پریس کے ذریعے پروپیگنڈا تقریریں کر کے مضامین لکھ کر، ہندی کے لئے مناکرت مرنے کی دھمکی دے کر غرض کوئی طریقہ اٹھا نہیں رکھا ہے۔ ہندی کی حمایت میں ان کا کہنا ہے کہ یہ اکثریت کی زبان ہے اس لئے اسے ملک کی قومی زبان ہونا چاہیئے، ان کے ایک گروہ کا دعویٰ ہے کہ ہندوستان کی چونکہ تمام زبانیں سنسکرت سے نکلی ہیں اس لئے اسی کو قومی زبان ہونا چاہیئے۔ ہندوستانی یعنی عوام کی زبان کے وہ بہت ہی خلاف ہیں۔ ان کی دلیلوں کو ذرا سیدھے سادے آسان لفظوں میں بیان کیا جائے تو ان کا کہنا یہ ہے کہ بھلا ایسی زبان بھی ملک کی قومی زبان ہو سکتی ہے جسے سب سمجھ لیں۔ ملک کی قومی زبان کو تو سنسکرت ہونا چاہیئے جس کی بنیاد پر ساری زبانوں کی عمارت تعمیر ہوئی ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ اس عمارت میں اس زبان کا گارا چونا کچھ اس طرح رل مل گیا ہے کہ اس کی ہیئت پہچانی نہیں جاتی۔ اور وہ عمارت اپنی الگ حیثیت رکھنے لگی ہے۔

ہندی کے حامیوں کا پروپیگنڈا کچھ اتنا شدید تھا کہ کسی جماعت نے کوئی قابل ذکر مخالفت نہیں کی پنڈت جی کا یہ خیال تھا کہ زبان کو تو عوام خود بناتے ہیں۔ اس لئے کسی ایسی زبان کو عوام کے سر تھوپنا نہیں چاہیئے جسے وہ سمجھ نہ سکتے ہوں لیکن آخر میں انھیں بھی اس پروپیگنڈے کے آگے سر خم کر دینا پڑا۔ ہاں انھوں نے اتنی بات کے لئے ضرور زور دیا کہ جہاں تک ہندسوں کا سوال ہے وہ بین الاقوامی ہندسے ہونے چاہئیں۔ اپنی اس تجویز کی حمایت میں انھوں نے بہت سی دلیلیں پیش کی ہیں۔ ایک تو یہی کہ یہ ہندسے تمام دنیا میں مروجہ ہیں، پھر ہم کیوں نہ استعمال کریں۔ اعداد و شمار میں ان ہندسوں سے بڑی آسانی ہوگی۔ دکھنی ہندوستان کے لوگ بھی پنڈت جی کی اس تجویز کی حمایت میں تھے۔ ان کی زبانیں الگ الگ ہیں۔ لیکن انھوں نے بین الاقوامی ہندسوں کو اپنا لیا ہے اس لئے ان کا کہنا ہے کہ زبان کے معاملے میں تو ہم طرح دے گئے لیکن ہندسوں کے معاملے میں ہم بالکل نہیں دبیں گے

"یہ شگوفہ سونی صدی ہندی کے حامیوں کے لئے سنگ آمد سخت آمد والی بات ہوئی وہ تو ہندی اور صرف ہندی چاہتے ہیں۔ بین الاقوامی ہندسوں کی مخالفت میں جنھیں انگریزی میں عربی ہندسے کہتے ہیں جب انھیں کوئی معقول دلیل نہیں ملی تو انھوں نے نفرت کے آزمائے ہوئے بان کو سر کیا۔ سارے ملک میں ڈھنڈورا پیٹ دیا کہ یہ بین الاقوامی ہندسے تو عربی الاصل ہیں۔ "عربی" ہندسے اور ہندوستان میں چلیں ہوں؟

اس موقع پر سنسکرت کی ایک کہانی یاد آتی ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک نوجوان برہمن اپنے کندھے پر ایک نو عمر بچھڑا لادے چلا آ رہا تھا، راستے میں اسے تین بدمعاش ملے۔ بدمعاشوں نے بچھڑے کو دیکھا تو ان کے منہ میں پانی بھر آیا اور تینوں نے صلاح کی کہ کسی طرح برہمن دیوتا کو اس بچھڑے سے محروم کرنا چاہیئے۔ چنانچہ تینوں راستے میں تھوڑی تھوڑی دور جا کھڑے ہو گئے۔ جب برہمن ایک کے قریب پہنچا تو اس نے بڑھ کر حیرت سے کہا "ارے مہاراج یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ برہمن ہو کر آپ ایک کتے کو اپنے کندھے پر لادے چلے جا رہے ہیں۔ اسے جلد پھینکئے یہ آپ کو ملیچھ کئے دے رہا ہے، برہمن بے چارہ یہ سن کر بھونچکا سا رہ گیا۔ پھر اس نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو ڈھارس دی کہ یہ یونہی بک رہا ہے اور آگے بڑھ گیا۔ کچھ ہی آگے گیا ہوگا کہ اسے دوسرا بدمعاش ملا اور اس نے بھی یہی کہا۔ اب برہمن دبدھے میں پڑ گیا اور سوچنے لگا کہ شاید کسی بدروح نے میرے ساتھ یہ دھوکا کیا ہے۔ لیکن اسے ایک بہت ہی شریف اور ایماندار آدمی نے یہ بچھڑا دیا تھا اس لئے وہ جلد کوئی فیصلہ نہ کر سکا اور آگے بڑھ گیا۔ اب اسے تیسرا بدمعاش ملا اور دیکھتے ہی چلا دیا "مہاراج پھینکیے، پھینکیے آپ نے اپنے کندھے پر ایک مرے کتے کو لاد رکھا ہے" اب برہمن کو یہ یقین ہو گیا کہ میرے ساتھ دھوکا ہوا، اور اس نے بچھڑے کو اپنے کندھے سے اتار پھینکا۔

یہ ہندسے جسے آج ساری دنیا استعمال کر رہی ہے ہندوستانی ہندسے ہیں کیا بہ اعتبار ایجاد اور کیا باعتبار شکل و صورت۔ یہ ہمارا ایک ایسا نمایاں کام ہے جس نے بغیر خون بہائے ساری دنیا کو جیت لیا ہے لیکن چونکہ یورپ والے اسے عربی ہندسے کہتے چلے آئے ہیں اس لئے آزاد بھارت آج یہ سوچ رہا ہے کہ کیا ہم ان عربی ہندسوں کو برداشت کر لیں؟ آزادی کے بعد بھی ایسی باتیں؟

تحریر اور تقریر کے ذریعے اس کے خلاف اتنا زبردست محاذ کھڑا کر دیا گیا ہے جو اس سے ٹکرائے گا اپنا سر پھوڑے گا۔ ہر دیش سیوک یہ کہتا ہے "کیا آپ اب بھی آپ اپنے پوتر کندھوں پر ہم اجنبی زبان کا بوجھ لادیں؟ اسے تو اتار ہی پھینکنا چاہیئے۔ ہاں اس میں ہیر پھیر کیسی؟

ان کا مخرج

چھاپے کی ایجاد سے پہلے رسم الخط کی طرح ہندسے بھی ہندوستان میں ہاتھ ہی کے ذریعے لکھے جاتے تھے جب چھاپے کی ایجاد ہوئی اور اس کی برکتیں یہاں بھی پہنچیں تو لوگوں نے حرفوں اور ہندسوں میں تبدیلیاں شروع کیں۔ ان میں یکسانی پیدا کی گئی۔ اور انھیں سہل بنانے کی طرف لوگوں نے دھیان دینا شروع کیا۔ ہمارے کتنے ہی حروف ابھی عیسائی مبلغین کی وجہ سے آج تک زندہ ہیں۔ جنھوں نے مقامی زبانوں میں بائبل چھاپنے کی غرض سے ان حرفوں کو بنایا سنوارا اور ان میں یکسانی پیدا کی۔ ان عیسائی مبلغین نے چھاپے حرفوں کی جو شکل بھی بنا کر پیش کر دی ہم نے اسی کو اختیار کر لیا۔ اور آج ہم یہ جانتے تک نہیں کہ ان کی اصلی شکل کیا تھی۔ بین الاقوامی ہندسوں کی شکل و صورت میں بھی چھاپے کی ایجاد کے بعد بہت کچھ رد و بدل ہوا۔ تب کہیں جا کر ان کی موجودہ شکل متعین ہو سکی۔ یورپ میں یہ عربی ہندسوں کے نام سے جانے جاتے ہیں لیکن اس میں کوئی شبہہ کی گنجائش نہیں کہ یہ ہندوستان کی چیز ہے۔

آٹھویں صدی عیسوی میں عرب ان ہندسوں کو ہندوستان سے بغداد لے گئے اور اسی صدی میں عربوں کے ذریعے یہ ہندسے یورپ میں پہنچے اس لئے یورپ والے ان کو عربی ہندسے کہنے لگے۔ یہ ہندوستانی ناگری ہندسے ہی ہیں جنھوں نے موجودہ بین الاقوامی ہندسوں کی شکل اختیار کر لی ہے اور آج ساری دنیا میں مروج ہیں۔ دنیا کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک یہ ہندسے کتابوں اعداد و شمار اور مستقل حیثیت رکھنے والے حوالے کے دستاویزوں میں استعمال ہوتے ہیں، انھیں صرف اس بنا پر رد کر دینا کہ ان کا نام "عربی ہندسے" ہے حماقت کی انتہا ہے۔ یہ ہندسے ہندوستان میں برابر استعمال ہوتے رہتے ہیں ہندسے۔ 6، 4، 1، اشوک کے کتبوں میں پائے جاتے ہیں ہندسے 2، 4، 6، 7 اور 9 ناناگھاٹ کے کتبوں میں موجود ہیں۔ 7، 6، 5، 4، 3، 2 اور 9 ناسک کے غاروں میں کھدے ہوئے ہیں۔ آٹھویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے علم نجوم کے زائچے بغداد میں عربی میں ترجمہ کئے گئے، اور اس طرح عرب عالموں کو ان ہندسوں کا علم ہوا۔ ۸۲۵ء میں ابو جعفر محمد بن موسیٰ خوارزمی نے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی تھی جس کا ۱۱۲۰ء کے لگ بھگ ایڈی لارڈ نے لاطینی زبان میں ترجمہ کیا تھا اسی نے اس کا نام "الخوارزمی کی کتاب ہندی ہندسوں کے متعلق" رکھا۔

ان انکشافات کے بعد اس میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ یہ ہندسے ہندوستان کی اپنی چیز ہیں آج بھی ہم تقریباً سو برس سے ان کو جانتے اور استعمال کرتے رہے ہیں، پھر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ انھیں کیوں رد کر دیا جائے۔ اس وقت جو ہندسے مختلف صوبوں میں جاری ہیں، انھی کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں پھر یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہو کہ وہ چیز جو سب کی ملکیت ہو چکی ہے ہم اس سے منہ موڑنے کی ٹھانے ہوئے ہیں۔ ہم چاہے کچھ بھی فیصلہ کریں لیکن ہمارے آس پاس کے دیسوں میں اور ساری دنیا میں یہ ہندسے استعمال ہوتے رہیں گے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم کم از کم اس معاملے میں اس چیز کو استعمال نہ کریں جو ہماری اپنی ہے۔ اور آج ساری دنیا میں استعمال ہو رہی ہے یا ہم اپنے حساب اور اعداد و شمار کے لئے ایسی علامتیں اختیار کریں جنھیں دنیا میں نہ کوئی سمجھ سکے اور نہ اختیار کر سکے دنیا تو دنیا خود ہندوستان میں بہت سے لوگوں کی سمجھ سے باہر ہو اور وہ بے چارے صرف اس لئے قبول کرنے پر مجبور کئے جائیں کہ اکثریت کا راج ہے۔

(ماخوذ)

ہند اور پاکستان

(بہ سلسلہ صفحہ ۳)

مصلحت کے مطابق ہو جانے اور ہمارے خیال میں ہر حال فساد کی جڑ یعنی خوف اور بدگمانی کشمیر کے ادھر رہنے یا ادھر رہنے سے دور نہیں ہو سکتی اس لئے کہ اس کے ریشے سالہا سال کے زہریلے پراپیگنڈا کی بدولت دلوں کی گہرائی میں دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اسے اکھاڑ پھینکنے کا طریقہ یہی ہے کہ اس وقت بین الاقوامی ثالثی سے فائدہ اٹھا کر یو، این، او کی ضمانت میں ایسے معاہدے ہو جائیں جن سے دونوں ریاستوں کو ایک دوسرے کی طرف سے جارحانہ حملوں کا اندیشہ نہ رہے۔

کاش وہ لوگ جن کے ہاتھ میں دونوں ملکوں کی سیاست کی باگ ہے اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ خوف ایک مہلک مرض ہے اور متعدی۔ اگر ایک فریق دوسرے سے بہت زیادہ خائف ہے تو۔

ع۔ از آں کس تو ترسد بترس اے حکیم

کے حکم کے مطابق دوسرے کو بھی اس سے ڈرنا چاہئے اور یہ دو طرفہ خوف جنگ و جدل کی زہریلی بیل کا بیج ہے جو ہرے بھرے پودوں کو دم بھر میں جلا دیتی ہے۔ جب تک اس بیج کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر برباد نہ کر دیا جائے امن و امان خوش حالی اور ترقی کے باغ کا پھولنا ممکن نہیں ہے۔

جامنی رائے

(بہ سلسلہ صفحہ ۸)

اس کو یوں سمجھئے کہ جامنی رائے دنیا کے ان مصوروں میں بڑا اونچا درجہ رکھتے ہیں جن کو تجربہ باز کہا جاتا ہے اور پکاسو کے سوا شاید کسی نے بھی مصوری میں اتنے تجربے نہیں کئے جتنے انھوں نے۔ اسی وجہ سے پکاسو کی طرح ان کی مصوری کا بھی کوئی ایک رنگ اور ایک انداز نہیں ہے اس واسطے اگر کوئی امرت شیر گل، مانیش یا وان گوخ کے لئے پوچھے کہ آپ کو پسند ہے تو کہہ سکتے ہیں کہ ہاں یا نہیں لیکن جامنی رائے اور پکاسو پر بھی یہی بھونڈا سا سوال کیا جائے تو اس سوال پر جواب نہیں بلکہ ایک دوسرا سوال لازم آئے گا کہ ان کا کون سا انداز۔

بات میں بات نکلتی ہے اور جامنی رائے کلاکار کی منزلوں میں ایسی منزل ہیں، خاص کر ہندوستان کی کلا کاری کی ایسی منزل ہیں کہ چند منٹ کی مدت میں طے نہیں ہو سکتے۔ پھر بھی اس موقع پر بات ختم کرنے سے پہلے دو ایک باتیں اور کہنے کی ہیں کلا کی کوئی بھی شاخ ہو یعنی ادب اور ساہتیہ، موسیقی، رقص، مصوری، بت تراشی، ان میں سے ہر ایک کے اندر دو چیزیں دیکھنے کی ہوتی ہیں، ایک تو کہنے کا انداز جو بہت کچھ سیکھنے اور محنت مشقت سے آتا ہے اور دوسرے یہ کہ کہنے والے کے پاس کہنے کو ہے کیا اور یہ چیز کچھ خداداد ذہن ہوتی ہے اور بہت کچھ زندگی سے لگے رہنے کے نتیجے میں آتی ہے۔ جامنی رائے نے اپنے فن کے اندر کوئی محنت مشقت اٹھا نہیں رکھی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ جو پختگی ان کی ڈرائنگ اور لکیروں کی بول چال میں ملتی ہے وہ ہندوستان میں کسی اور کے یہاں نہیں ملتی اور ہندوستان کے باہر بھی کم ہی کم۔ رنگوں کے استعمال میں بھی جس کے اندر جامنی رائے باہر سے آئے ہوئے نہیں بلکہ اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے دیسی رنگ برتتے ہیں ان کو بڑا گیان حاصل ہے، لیکن اتنا کہنا پڑتا ہے کہ ان کے رنگ لکیروں کے گھیرے میں الگ الگ بند رہتے ہیں۔ ایک دوسرے سے بہتے نہیں جیسے امرت شیر گل کے رنگ، اور جہاں یہ نہیں ہوتا وہاں تصویر تصویر کم رہ جاتی ہے اور رنگین ڈرائنگ زیادہ۔

اب رہی یہ بات کہ ان کے پاس کہنے کو کیا ہے اسے سمجھنے کے لئے تھوڑا سا امرتا شیر گل سے موازنہ کرنے میں آسانی رہے گی۔ امرتا شیر گل کے پاس کہنے کو ہیں ہاتھی، گھوڑے، اونٹ، مل مل کے بیٹھے ہوئے لڑکے، لڑکیاں، سنورتی ہوئی دلہنیں، چکی پیستی ہوئی عورتیں، بازار کو جاتی ہوئی نرناریوں کے جھرمٹ قشقہ کھینچے ہوئے برہمہ چاری۔ ننھی عمر کی بیاہی بچی اور یہ سب کچھ اس طرح کا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی یہ سب صورتیں یہ سارے معاملے پہلی بار نظر سے گذرے ہوں

جامنی رائے کے یہاں زندگی کے یہ بھی معاملے کہلتے ہیں۔ ان کے یہاں کہنے کے لئے ہے "رام بن باس" سیتا کی ستی، رادھکا رانی، کرشن لیلا، شری چیتنیا، کرشنا بلرام، اور یہ سارے مضمون زندگی سے الگ کی زندگی کو تصویر کے گھیرے میں باتی ہے اور لکیروں اور رنگوں کے تال سُر سے اس میں یقین نہ کرنے والوں کو بھی یقین کروا جاتی ہیں۔

اسی انداز سے ہیں ان کی کرافٹس، ٹمڈنا اور بچے کے مضمون کی تصویریں جنھیں انھوں نے سو سو طرح سے برتا ہے اور بات کہنے کی یہ ہے کہ اس زمین میں جو صدیوں سے یورپ کی مصوری کی جیتی زمین رہی ہے، جامنی رائے نے جس طرح جڑیں پکڑی ہیں اور ان جڑوں کو جس طرح اپنے جی جان سے سینچا ہے وہ بہت ہی کم مصوروں کی قسمت میں آیا ہے۔ کہتے ہیں کہ آدمی جب سے تک سکے اور سیکھ سدا لی جب تک دل میں نہیں اُتر لی اس وقت تک یہ سب کسی کے پلے نہیں پڑتا اور جامنی رائے پر اس ماتا سے بھری خون سے سینچی کہانی کا بہت ہی گہرا اثر معلوم ہوتا ہے۔

وقت پورا ہو گیا اور بات پوری کہاں؟ آدھی بھی نہ ہونے پائی، لیکن جو کچھ بھی اس وقت کہا گیا ہے اس سے شاید جامنی رائے کی ہندوستان اور دنیا کی کلا کاری میں جو منزل اور جو درجہ ہے اس کا کچھ اندازہ ہو سکا ہو۔ ایک حد تک شاید یہ بھی کہ جامنی رائے کی تصویروں میں جتنا پہلے نظر آتا ہے اس سے کچھ زیادہ نظر آنے لگے، کیونکہ اگر یہ کہو ہوا تو سارا کہا سنا بے کار رہا۔

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو، دہلی)

آپ کا عشق و محبت کا نظریہ

(دیکھو صفحہ ۷)

اب یہ دیکھئے کہ آپ نے کتنے سوالوں کے جواب میں "ہاں" لکھا ہے اگر ۱۵ بار یا اس سے زیادہ لکھا ہو تو آپ بڑے رومانیت پرست ہیں ممکن ہے کبھی کبھی اس میں آپ کو کچھ تکلف آتا ہو مگر اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے جذبات میں بڑی شدت ہے، آپ کے دل پر بڑی جلدی چوٹ لگتی ہے۔ اور آپ آسانی سے رنج و مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں ذرا دیکھ بھال کے قدم اٹھایا کیجئے۔ خیال اور عمل میں زندگی کے ٹھوس واقعات کو پیش نظر رکھا کیجئے۔

۱۱ سے ۱۴ تک "ہاں" کے جواب یہ ظاہر کرتے ہیں کہ دل تو آپ کا رومانیت پرست ہے لیکن واقعیت کا تقاضا بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں اس لئے آپ نے اپنے جذبات پر ایک طرح کا مضبوطی کا پردہ ڈال رکھا ہے۔ لیکن وقت پر آپ رومانیت ہی کے پرستار نکلیں گے۔

۸ سے ۱۰ تک "ہاں" یہ ثابت کرتے ہیں کہ آپ کی طبیعت میں اچھا خاصا توازن ہے اور اگر کبھی کشمکش ہو تو آپ واقعات اور حقائق کی طرف جھکتے ہیں، آپ کی عقل سلیم خیال پرستی اور خیال آرائی کی باگیں تھامے رہتی ہے اور ذوق صحیح جذبات پر کڑی نگاہ رکھتا ہے اور انھیں قابو سے باہر نہیں ہونے دیتا۔

۷ یا اس سے کم "ہاں" ہوں تو آپ [illegible] پرست ہیں مگر بنے ہوئے۔ آپ نے محبت سے [illegible] گرد ایک حصار کھینچ رکھا ہے شاید آپ کو تلخ تجربہ ہوا ہے۔ اب اس کی سخت ضرورت ہے کہ کبھی کبھی خواب و خیال کی دنیا کی ایک جھلک نظر آئے اور آپ [illegible] طاری کرنے کی وجہ سے جو کھچاؤ اعصاب میں پیدا ہو گیا ہے وہ ڈھیلا ہو۔

"نئی روشنی" کے پروانے

۱۶ اگست کے پرچے میں "تکلف برطرف" کے عنوان سے جو نوٹ لکھا گیا تھا اس کے سلسلے میں ہمارے قدردانوں اور کرم فرماؤں کے بہت سے خطوط آئے ہیں ان میں سے چند کا خلاصہ یہ ہے:-

(۱)

سال بھر سے کچھ اوپر ہوا ملک کے مشہور ادیب اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے دیرینہ رفیق ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب (پی، ایچ، ڈی) نے تہذیب الاخلاق اور "عزم" کی طرح کا "نئی روشنی" کا چراغ جلایا تھا۔ اب تک جو تہذیبی و تمدنی مضامین یہ ہفتہ وار حامل رہا ہے محتاج بیان نہیں۔

لیکن پچھلے ہفتے "بزم بے تکلف" کی محفل اُٹھا کر "بزم برطرف" کے میدان میں بڑے درد بھرے اور ارمان بھرے لفظوں سے آگاہ کیا ہے کہ اب مالی خسارہ "نئی روشنی" کو نہ چلنے دے گا

ماتم ہے ہند کے مسلمانوں کے ذوق پر۔ دیکھ لیا اپنے جذبۂ شوق کو، ملاحظہ کر لیا اپنے احساسِ فرض کو، ہمدردی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمدردی تو غیر کا نقصان دیکھ کر ہوتی ہے۔ اپنے نقصان پر تو سر پیٹ لیا جاتا ہے۔ اف! اس قوم کو کیا ہو گیا ہے۔ اپنے سود و زیاں کا خیال نہیں، اپنی آپ حفاظت نہیں ہوتی۔ ہم شاکی ہیں، حکومت اردو کو مٹا رہی ہے، اردو دفاتر سے خارج ہو رہی ہے، تعلیمی نصاب سے نکالی جا رہی ہے۔ یہ سب درست۔

لیکن ذرا سوچئے تو سہی۔ بلا سرکاری سرپرستی کے زبان یا رسم الخط باقی رہتا ہے یا خود پڑھنے لکھنے والوں کے ذوق و شوق اور فکر و تدبر پر زبان اور رسم الخط کی بقا و ارتقا کا انحصار ہے۔ فرض کر لیجئے۔ حکومت سے آپ کی باتیں مان لیں۔ ہو گئی اردو داخل دفتر۔ گذرنے جانے لگیں عرضیاں بزبان اردو اور بخط اردو تو آپ نے اب یقین کر لیا کہ آپ کی زبان محفوظ ہو گئی۔ اور پہنچ گئی ترقی کی معراج پر، بعض ماہر لسانیات اور علم و دانش کے جاننے والے اس سے انکار کرتے ہیں۔

اس کے خالق آپ ہیں، اس کے محافظ آپ ہیں۔ اوج ثریا پر لے جانے والے آپ ہیں موجودہ دور بے حد انتشاری اور ہیجانی کا ہے، کل کے غلام آج آزادی کے آسمان پر ہیں۔ پیچھے دکھائی نہیں دیتا ...... حق و انصاف کے طالبو! تمہاری تقدیر کے آسمان پر گھنے بادلوں سے بارش بہاماں بھی ہوگی، لیکن بربادی کی بجلیاں بھی گر سکتی ہیں۔

ہمارے شوق کا عالم یہ ہے کہ اردو رسالے کتابیں خریدنا تو درکنار سفر و حضر میں پڑھنا اپنی کم عقلی کا ثبوت دینا ہے۔ اس کی سرپرستی و اعانت کجا۔ اُچٹتی نظر بھی نہیں ڈالتے، تو کیا آسمان سے فرشتوں کا نزول ہوگا اور وہ اردو لکھیں گے پڑھیں گے، اور اس کی ترقی میں اپنا سر کھپائیں گے۔ ہماری روز مرہ کی زندگی میں کچھ نہ کچھ فضول خرچی ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن سال چھ ماہ کے لئے دس بیس روپے اخباروں رسالوں کے لئے خرچ کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ حالانکہ اس کو فضول خرچی سے کوئی لگاؤ نہیں اگر یہی چلن ہمارے رہے تو جینے کی تمنا سے باز آئے۔ دوستو! نصیحت نہیں ہے دل کی آواز ہے قوم کا درد ہے۔ یہ باتیں فلسفے کی نہیں ہیں، جو فلسفی ہی اگر سمجھ لے تو اس کی باریکیاں ذہن میں سمجھ میں آسکتی ہیں، ہم اگر ہوش میں آجائیں ہمارا احساس جاگ اُٹھے، ہماری فکر جلا پا جائے ہم اپنی زندگی کا راز سمجھ لیں، ہم اپنی لو تیز بڑھانا چاہیں تو یقین کیجئے۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمارے چراغ حیات کو نہیں بجھا سکتی۔

ہم جئیں گے۔ پھولیں گے، پھلیں گے۔ ہماری زندگی کی روشوں میں رنگ ہائے رنگ کے گل ہوں گے، اور ان گلوں کی خوشبوؤں سے سارا چمن مہکتا ہی رہے گا۔

کاش ہم میں احساس ہوتا۔ احساس ایک طاقت ہے، بہت بڑی طاقت۔ آئیے اسی احساس کے بل پر "نئی روشنی" کو زندہ رکھیں۔

کلکتہ علی احمد صدیقی

مکرمی، تسلیم

۱۶ راگست کے "نئی روشنی" میں تکلف برطرف کرکے جو باتیں آپ نے صاف صاف کہی ہیں وہ نئی روشنی کے پرستاروں کے لئے دلی تکلیف کا باعث ہیں .... نئی روشنی کو نکال کر جو فرض آپ نے اپنے ذمہ لیا ہے اس کی اہمیت سے بھی مجھے یقین ہے کہ آپ اچھی طرح واقف ہوں گے۔ غالباً اسی فرض شناسی کا جذبہ تھا جس نے آپ کو تکلف برطرف کرکے صحیح حالات نئی روشنی کے پڑھنے والوں کے سامنے بلا کم و کاست رکھنے پر مجبور کیا۔ مجھے آپ کی دقتوں کا احساس ہے۔ زمانے کی ناسازگاری بھی پوشیدہ نہیں۔ اس سے آپ شاید پہلے ہی دن سے واقف تھے۔ ان حالات کے باوجود جس طرح مردانہ وار آپ نے اس میدان میں قدم رکھا تھا۔ اس سے ہمیں یقین تھا کہ جو قدم آگے بڑھ چکا تھا وہ پیچھے نہیں ہٹے گا۔ زمین ٹل سکتی تھی، آسمان حرکت کر سکتا تھا مگر آپ کے عزم و استقلال میں تزلزل ہو ہمیں گمان بھی نہ تھا کہ ایسا ہو سکے گا۔

مگر آپ کا ۱۶ راگست والا مضمون شاید ایک ایسی ذہنیت کا علمبردار ہے جو مسلسل دقتوں اور غالباً آپ کے بستر جراحت کی آئینہ دار ہے .... معاف کیجئے گا، میں نے آپ کے عزم و استقلال پر شک کیا ہے، در اصل مجھے یقین ہے کہ نہ آپ کے ارادہ میں تزلزل ہو سکتا ہے اور نہ آپ کی اپیل پڑھنے والوں پر رائگاں جا سکتی ہے۔ نئی روشنی نے پڑھنے والوں کے دلوں میں اپنا گھر کر لیا ہے، اور ہم میں سے کوئی ایسا نہیں جو آپ کے چیلنج کو قبول نہ کر سکے، اور نئی روشنی کو باقی رکھنے کے لیے سعی الامکان کوشش نہ کرے۔

نئی روشنی کا جاری رہنا ہر لحاظ سے ضروری ہے، جو دقتیں اس کی راہ میں حائل ہیں ان سے آنکھیں بند کر لینا، اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے آپ نے کھلے الفاظ میں حالات کا اظہار کیا ہے، اب یہ فرض "نئی روشنی" کے خریداروں کا ہے کہ وہ ان دقتوں کے لئے حل فراہم کریں۔

مجھے پرچے کی مالی حالت کا اس سے زیادہ اندازہ نہیں کہ خراب ہے، کس حد تک خراب ہے میں نہیں جانتی۔ اس لئے ممکن ہے کہ جو تجویز میں پیش کر رہی ہوں وہ کافی نہ ثابت ہو۔ پھر بھی میرا خیال ہے کسی بڑی حد تک وہ آپ کو مطمئن کر دے گی۔ ہم میں سے ہر شخص اگر ایک سال کا چندہ بطور عطیہ اس وقت دیدے تو موجودہ مشکلیں شاید رفع ہو جائیں، لیکن خاص چندوں سے یا عطایا سے اخبار کو جاری رکھنا امکان سے باہر ہے۔ اس لئے اس کی بھی ضرورت ہے کہ ہم میں سے ہر خریدار اس کی کوشش کرے کہ کم از کم ایک نیا خریدار پرچے کے لئے حاضر کیا جائے۔ اگر ہمارے کرم فرماؤں کو ۵۰ فی صدی بھی کامیابی ہوئی تو نئی روشنی پھر گل ہونے سے بچ جائے گی۔

ابتدا میں خود کرتی ہوں، منی آرڈر سے آج ہی کی ڈاک سے آٹھ روپے آپ کو بھیج رہی ہوں۔ اس کے علاوہ آپ کے لئے ایک نئے خریدار کا نام بھی بھیجتی ہوں۔ آپ پرچہ ان کے نام جاری کر دیجئے، اور چندہ کی رقم بذریعہ وی، پی وصول کر لیجئے۔

خدا کرے کہ بستر جراحت کی مجروح ذہنیت آپ سے کوسوں دور رہے۔

نیازکیش

فیض آباد شہر حسنہ

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

ادارۂ تحریر:-
ڈاکٹر سید عابد حسین ۔ صالحہ عابد حسین
عبداللطیف اعظمی

تاریخ اشاعت - یکم ۸ ، ۱۴ ، ۴۰
چندہ - سالانہ ۵ ششماہی ۳

دفتر :- نئی روشنی جامعہ نگر دہلی

ناشر :- عبداللطیف اعظمی بی اے جامعہ

مطبوعہ جید پریس دہلی

نئی روشنی

NAI RASHNI

DELHI

جلد ۳ نمبر ۱۱ | ۱۶ · ۱۱ر ستمبر ۱۹۳۹ء | ایڈیٹر۔ ڈاکٹر سید عابد حسین

کیا آپ
چست اور تندرست ہیں؟

ان سوالوں کے صاف اور قطعی جواب دیجیے
"ہاں" یا "نہیں"

۱۔ کیا آپ اس بات کا خاص اہتمام کرتے ہیں کہ گہرا سانس لیں؟

۲۔ جب آپ بیٹھ کر کام کر رہے ہوں، کھڑے ہوں یا چل رہے ہوں تو آپ کی کمر بالکل سیدھی رہتی ہے؟

۳۔ کیا آپ روز کھلی ہوا میں تھوڑی سی ورزش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، چاہے وہ محض چہل قدمی ہو؟

۴۔ کیا آپ ہر موسم میں کمرے کی کھڑکیاں کھول کر سوتے ہیں؟

۵۔ کیا آپ کی دیکھنے، سننے، سونگھنے اور چکھنے کی حِسیں اچھی طرح کام کرتی ہیں؟

۶۔ کیا آپ کے پاؤں ہمیشہ ٹھیک رہتے ہیں؟

۷۔ کیا آپ کو سر کا درد بہت ہی کم ہوتا ہے؟

۸۔ کیا آپ قبض سے محفوظ ہیں؟

۹۔ کیا آپ کھانا عموماً وقت کی پابندی سے کھاتے ہیں؟

۱۰۔ کیا آپ کی غذا میں تنوع ہوتا ہے اور آپ ہر نوالے کو اچھی طرح چباتے ہیں؟

۱۱۔ کیا آپ رات کو سونے سے پہلے اور صبح بستر سے اٹھ کر دانت مانجھتے ہیں؟

۱۲۔ کیا آپ حتی الامکان مسکّن اور خواب آور دواؤں سے بچتے ہیں؟

۱۳۔ کیا آپ شراب اور تمباکو سے دور رہتے ہیں یا کم سے کم ان کے استعمال میں نہایت اعتدال سے کام لیتے ہیں؟

۱۴۔ جب آپ کو مسلسل درد رہے یا طبیعت خراب ہو جائے تو آپ فوراً کسی ماہر معالج سے رجوع کرتے ہیں؟

۱۵۔ کیا آپ اس کا خیال رکھتے ہیں کہ اتنا زیادہ کام یا اتنی زیادہ ورزش نہ کریں جس سے جسم بالکل شل ہو جائے؟

۱۶۔ کیا آپ کو اس کا ڈھب آتا ہے کہ جب چاہیں جسم اور دماغ کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دیں؟

۱۷۔ کیا آپ معمولاً رات کو سات گھنٹے سے لے کر دس گھنٹے تک سو لیتے ہیں؟

۱۸۔ کیا آپ ہفتہ میں کم سے کم ایک بار ضرور نہا لیتے ہیں؟

۱۹۔ کیا آپ ہر معقول احتیاط رکھنے کے بعد پھر اس فکر میں نہیں پڑتے کہ مجھے کچھ ہو نہ گیا ہو یا ہو نہ جائے؟

۲۰۔ کیا آپ کو روز کسی نہ کسی وقت ہنسنے کا موقع مل جاتا ہے؟

ہر "ہاں" کے ۵ نمبر رکھیے۔ ۸۰ سے ۹۰ تک اوسط درجے کے نمبر ہیں مگر آپ کو اس وقت تک مطمئن نہ ہونا چاہیے جب تک ۹۰ نمبر نہ ہو جائیں۔ یقین مانیے آپ کا چست اور تندرست ہونا بہت کچھ آپ کے اختیار میں ہے۔

فہرست مضامین

قیمت فی پرچہ ۳ر

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

سالک ہندی

ارباب پاکستان کو یہ مشورہ ضرور دینا چاہتا ہوں کہ انھیں سختی کے ساتھ اس نامبارک ذہنیت کے خلاف جہاد کرنا چاہئے جس کی بدولت ۱۵ اگست کو کراچی میں جھنڈے کا ناگوار واقعہ پیش آیا .... یاد رکھئے کہ جو سیاسی لیڈر حق کی خاطر دریا کی رو کے خلاف نہیں چل سکتا اور اخلاقی قدروں کی خاطر اپنی سیاسی پوزیشن کو خطرے میں ڈالنے کے لئے تیار نہیں ہے، وہ ہرگز اپنے ملک کی سچی خدمت نہیں کر سکتا۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی بہت بڑی اکثریت ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں جیسا پنڈت جواہر لال اپنی حق پرستی کی بدولت بار بار کہہ چکے ہیں کہ اکثریت اور اقلیت کے لئے دو مختلف قانون یا اصول یا ترازو استعمال کئے جائیں .... ہمیں یقیناً ہر مذہب کے عقیدوں، بزرگوں دیوتاؤں کا احترام کرنا چاہئے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سرکاری اور سیاسی امور میں کسی خاص مذہب سے تعلق رکھنے والی چیزیں جگہ پائیں اور دوسری وہاں بار نہ پاسکیں

اسلامی ریاست

سب معقول لوگ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں اور زیادہ تر سیاسی لیڈر کہتے بھی رہتے ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے، میں بھی نئی روشنی میں اس پر بار بار زور دے چکا ہوں لیکن آئے دن کوئی نہ کوئی واقعہ ایسا ہوتا رہتا ہے جو تلخی اور مخالفت کی چنگاری کو بھڑکا دیتا ہے، اور مصالحت کی ذہنیت پژمردہ ہو کر رہ جاتی ہے ایک طرف تو کئی اخلاقی مسئلے مستقل طور پر سنگ راہ بنے ہوئے ہیں، مثلاً کشمیر کا معاملہ، ترک وطن کرنے والوں کی جائداد، دریاؤں کا پانی وغیرہ، لیکن ان کے بارے میں تو کہا جا سکتا ہے کہ ساری دنیا کی سیاست اسی طرح چلتی ہے لیکن دوسری طرف جو خواہ مخواہ کی نوک جھوک چلی جاتی ہے، وہ تو سراسر عقل کے ساتھ دشمنی اور عاقبت ناشناسی ہے، مثلاً پاکستان کے وزیر اعظم کو کیا سوجھی تھی کہ عید کے مبارک موقع پر جب ایک سچے مسلمان کے دل میں صرف مسلمانوں ہی کی طرف سے نہیں بلکہ ساری دنیا کی طرف سے خیر شناسی کے جذبات ہونے چاہئیں (کیونکہ رمضان کے روزوں کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ روزہ داروں کے دل تمام بدخواہی اور دل آزاری کے جذبات سے پاک ہو جائیں) انھوں نے بیٹھے بٹھائے ہندوستان کے مسلمانوں کو غلام قرار دے دیا! کیا ان کی ہمدردی، سمجھداری سے اتنی بے تعلق ہے کہ وہ اس کا اظہار اس قدر بے ڈھنگے طریقے سے کریں کہ اس سے نہ صرف مسلمان کی بلکہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی پوزیشن خراب ہو جائے؟ خیر، اس بارے میں ان پر کافی دے دے ہو چکی ہے اور میں اس کو دہرانا نہیں چاہتا، لیکن نہایت ادب اور دلسوزی کے ساتھ ارباب پاکستان کو یہ مشورہ ضرور دینا چاہتا ہوں کہ انھیں سختی کے ساتھ اس نامبارک ذہنیت کے خلاف جہاد کرنا چاہئے جس کی بدولت ۱۵ اگست کو کراچی میں جھنڈے کا ناگوار واقعہ پیش آیا، حکومت نے اس بارے میں جو فوری تعزیری کارروائی کی وہ ضرور قابل تعریف ہے، لیکن کافی نہیں، انھیں اس کے ساتھ ساتھ تعلیمی پراپگنڈا کے تمام ذرائع اختیار کر کے لوگوں کے دلوں سے اس نفرت اور تعصب کو دور کرنا ہے جو موقع پاکر ایسی ناگوار صورتیں اختیار کر لیتا ہے۔ اس قسم کی تنگ دلی خواہ وہ پاکستان میں ہو یا ہندوستان میں، دوسرے ملک سے زیادہ خود اس ملک کے لئے خطرناک ہے کیونکہ کسی قوم کی ترقی یا اتحاد کی بنیاد نفرت اور تخریب کے جذبے پر نہیں رکھی جا سکتی بلکہ شاید مجھے یہ کہنا چاہئے کہ رکھی تو جا سکتی ہے (اور تاریخ میں بار بار ایسا ہوا ہے) لیکن اس کا نتیجہ ہمیشہ بہت عبرتناک ہوتا ہے۔ پاکستان کے وزیر اعظم نے اس موقع پر اپنی تقریر میں کہا کہ اگر پاکستان کے جھنڈے کی حفاظت کا وقت آئے گا تو میں سب سے پہلے اپنی جان قربان کر دوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ اہل پاکستان اس وعدے کو یاد رکھیں گے اور مناسب موقع پر اس کی یاد دہانی کریں گے، لیکن بحیثیت ایک مسلمان کے میرا سر فخر سے بلند ہو جاتا اگر لیاقت علی خاں اس موقع پر یہ کہنے کی ہمت کرتے کہ اگر پاکستان میں کسی قوم کے جھنڈے کی ناجائز بے حرمتی کی گئی تو میں اس کے لئے اپنی جان قربان کر دوں گا۔ انھیں یاد رکھنا چاہئے کہ پاکستان کا جھنڈا کسی قوم یا کسی خاص ملک [illegible] کا جھنڈا نہیں بلکہ حق و انصاف [illegible] صداقت کا جھنڈا ہے، رواداری [illegible] [illegible] [illegible] ان قدروں کی حفاظت [illegible] اس قسم کے جلسے کا محسوس کرنا آسان نہیں اور ایک سیاسی لیڈر کے لئے اس کا اظہار بہت مشکل ہے۔ کیونکہ موجودہ فضا میں ان چیزوں کا اثر دلوں کی اتنی گہری پر پڑتا ہے! لیکن یاد رکھئے کہ جو سیاسی لیڈر حق کی خاطر [illegible] اور اخلاقی قدروں کی خاطر اپنی سیاسی [illegible] میں ڈالنے کے لئے تیار نہیں ہے وہ ہرگز [illegible] کی سچی خدمت نہیں کر سکتا۔ کیا گاندھی جی نے مسلمانوں کی حمایت میں بار بار نہیں کہا تھا کہ جب تک ہندوستان میں ایک مسلمان بھی ایسا ہے جو دوسرے شہریوں کی طرح محفوظ اور باعزت زندگی بسر نہیں کر سکتا میرے نزدیک ہندوستان کا آزاد ہونا بے معنی ہے؟ اور کیا وقت آنے پر انھوں نے اس اصول کی خاطر اپنی جان نہیں دی؟ اور کیا جواہر لال نے اس مقصد کی خاطر گذشتہ دو سال میں اپنی جان اور اپنی پوزیشن دونوں کو خطرے میں نہیں ڈالا؟ پاکستان کو ایک اسلامی ریاست ہونے کی امنگ یا کم سے کم اس کا دعویٰ ہے۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ وہ زبانی دعوے ذرا کم کرے اور دنیا کے سامنے عملی نمونہ زیادہ پیش کرے، خون جو رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے آنکھ سے بھی ٹپکے!

غیر مذہبی ریاست

جس طرح پاکستان پر اسلامی ریاست ہونے کی وجہ سے خاص ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اسی طرح ہندوستان کو غیر مذہبی ریاست ہونے کی وجہ سے بہت سے معاملات میں خاص احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس وقت ہندوستان میں بعض رجحانات ایسے پائے جاتے ہیں کہ اگر اس کی روک تھام نہ کی گئی تو ہمارا غیر مذہبی ریاست ہونے کا دعویٰ باطل ہو جائے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی بہت بڑی اکثریت ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں جیسا پنڈت جواہر لال نہرو اپنی حق پرستی کی بدولت بار بار کہہ چکے ہیں کہ اکثریت اور اقلیت کے لئے دو مختلف قانون یا اصول یا ترازو استعمال کئے جائیں۔ انھوں نے ابھی حال میں الہ آباد کی تقریر میں ان لوگوں پر کڑی تنقید کی ہے، جو ہندوستان کو صرف ہندوؤں کا ملک یا ہندو تہذیب کا گہوارہ بنانا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں بعض چھوٹی چھوٹی باتیں بھی اہم ہوتی ہیں مثلاً جب ہندوستان کے آزاد ہونے کی رسم منائی گئی اور پنڈت جی نے بڑے وزیر کے عہدے کو سنبھالا تو اس وقت بعض مذہبی رسمیں ادا کی گئیں حالانکہ اس وقت ایک غیر مذہبی ریاست کی صدارت کو ہاتھ میں لے رہے تھے وہ ان کی کوئی ذاتی تقریب نہ تھی، خیر تو یہ پرانا واقعہ ہے لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ ابھی حال میں جو ڈاک کے ٹکٹ شائع کئے گئے ہیں ان میں سے ایک پر شری گنیش کی تصویر ہے، آخر اس کا کیا جواز ہو سکتا ہے؟ ہندوستان میں کروڑوں مسلمان اور عیسائی بھی ہیں

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

۱۶ ستمبر ۱۹۴۹ء

ایمان یا موت

اس وقت دنیا میں کئی قوتیں ہیں جو نوعِ انسانی کو ہلاکت کے گڑھے میں ڈھکیلنے کی کوشش کر رہی ہیں ——— سرمایہ داری، آمریت، نسل پرستی، مذہبی مادیت، کھوکھلی روحانیت، انسان کو اپنی زندگی اور اپنی تہذیب کی سلامتی کے لئے ان سب کا مقابلہ کرنا ہے اور وہ جیسے تیسے کر رہا ہے۔ لیکن ایک تخریبی قوت اور ہے جو ان سب سے زیادہ مہلک ہے جو چپکے چپکے اس کے جسم و روح میں زہر پھیلا رہی ہے اور اس کے جوہرِ حیات کو فنا کر رہی ہے۔ یہ یاس پرستی یا قنوطیت کی کیفیت ہے جو دوسری جنگ عظیم کے بعد صرف مفتوح قوموں میں نہیں بلکہ فاتح قوموں میں بھی پیدا ہوگئی ہے اس لئے کہ اس جنگ میں فاتحوں کو بھی بڑا شدید نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ کم سے کم ان کے دل و دماغ اور اعصاب کو بڑا سخت دھکہ لگا ہے۔

اس عام مایوسی اور بے دلی کے کئی پہلو ہیں لیکن اس کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ انسان کے دل میں ایمان کا جذبہ اس قدر کم زور ہوگیا ہے کہ نہ ہونے کے برابر ہے ایمان دراصل مذہب کی اصطلاح ہے اور اس کے معنی ہیں خدا پر یعنی ایسی ذات پر جو سرچشمۂ حقیقت اور سرچشمۂ خیر ہے اعتقاد رکھنا، لیکن جو لوگ مذہب کے قائل نہیں ہیں وہ بھی دماغی صحت کی حالت میں کسی نہ کسی اخلاقی قدر یا متعدد قدروں پر کچھ ایسا عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس کی عقلی اور علمی توجیہہ نہیں ہوسکتی اور اسے ایمان کے سوا کسی اور نام سے نہیں پکار سکتے مجھے یہاں ایمان کے جس جزے بحث کرنا ہے وہ مذہب کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں میں مشترک ہوتا ہے یعنی انسانیت پر ایمان۔ دونوں انسان کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خواہ وہ کتنا ہی پست اور گمراہ کیوں نہ ہو اس کے اندر ابھرنے اور سیدھی راہ اختیار کرنے کی صلاحیت کبھی فنا نہیں ہوتی اس عقیدے کے بغیر ہماری دنیا میں جو اب تک جہالت اور وحشت، لالچ اور خود غرضی تعصب اور نفرت ظلم اور استبداد سے خالی نہیں ہے اور بظاہر ایک مدت تک نہیں ہوگی، کوئی شخص خوش نہیں رہ سکتا بلکہ سچ پوچھئے تو زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کہ اگر اسے انسانوں کی طرف سے مایوسی ہوجائے تو یا تو وہ نوعِ انسانی کو ہلاک کرنے پر تل جائے یا پھر اس کے سعی و عمل کا کوئی محرک باقی نہ رہے اور اسے کامل بے عملی اور بے حسی کی زندگی اختیار کرنی پڑے جو کسی طرح موت سے کم نہیں۔

یہی افسوسناک مایوسی آج کل دنیا میں بہت سے لوگوں پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے، ان میں بعض تو کارزارِ حیات سے کنارہ کش ہوکر عیش و عشرت یا ترک و تجرد یا بیزاری اور بے عملی کی زندہ موت کے دامن میں پناہ لے رہے ہیں اور بعض یہ سمجھتے ہیں کہ جب انسانوں کی یا کم سے کم ان کے مخالفوں کی اصلاح کی کوئی صورت باقی ہی نہیں رہی تو پھر انھیں ایٹم بم یا زہریلے جراثیم کے ذریعے سے جلد سے جلد ختم کردینا چاہیئے۔

ہندوستان بھی ضعفِ ایمان کے اس عالمگیر مرض میں مبتلا ہے۔ جو ہلاکت اور تباہی جنگ عظیم اور اس کے بعد تقسیم ہند کے نتیجے کے طور پر اٹھانی پڑی اس کی بدولت ہندوستانیوں کا عقیدہ عام طور پر انسان کی انسانیت سے اٹھ گیا ہے۔ جغرافی علاقے، مذہبی فرقے سیاسی پارٹیاں غرض وہ سب جو ایک دوسرے سے اپنے حقوق و مطالبات منوانا چاہتے ہیں۔ دوسروں سے مایوس ہیں کہ وہ ان کی معقول باتوں کو ہرگز نہیں مانیں گے اور اپنے آپ سے مایوس ہیں کہ سمجھانے بجھانے سے اور اخلاقی اثر ڈالنے سے اپنے جائز مطالبوں کو کسی طرح نہیں منوا سکیں گے۔ اس لئے ان میں سے کچھ لوگ اہل مغرب کی طرح اس چیز کو جسے وہ حق سمجھتے ہیں تلوار کے زور سے حاصل کرنے کا منصوبہ باندھ رہے ہیں اور کچھ ہمت ہار کر سپر ڈالنے پر آمادہ معلوم ہوتے ہیں

بظاہر ہندوستانی مسلمان اس وقت ان سپر ڈالنے والوں کے زمرے میں شامل ہیں ان کے ضعفِ ایمان کا یہ حال ہے ساڑھے تین یا چار کروڑ کی تعداد کے باوجود وہ اپنے مستقبل سے اس سے زیادہ مایوس ہیں جتنے مٹھی بھر عیسائی یا پارسی انھیں یقین ہے کہ ان کے خلاف نفرت اور تعصب کی عام فضا جو ان کے اور دوسروں کے مشترک قصور سے پیدا ہوئی ہے ہمیشہ اسی طرح باقی رہے گی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ساری ذہنی اور معاشی قوتیں جو قدامت پرستی اور فرقہ پرستی کے مقابلے میں صف آرا ہیں ناکام رہیں گی۔ باہر کی وسیع دنیا سے، عالمگیر ذہنی اور سیاسی تحریکوں سے سابقہ پڑنے کے بعد بھی ہندو اکثریت کی تنگ نظری کا یہی حال رہے گا اور وہ مسلمانوں کو محض مسلمان ہونے کی وجہ سے دبانے کی کوشش کرتی رہے گی۔ رہے خود بے چارے مسلمان تو وہ اب انگریز کے جانے کے بعد کیا کر سکتے ہیں جب حکومت کا تقرب حاصل نہ رہے، خدا کے حفظ و امان پر اپنی روحانی اور اخلاقی صفات پر اپنی محبت اور مروت، دیانت اور محنت، قابلیت اور لیاقت پر کیا بھروسا کیا جا سکتا ہے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد اخلاقی کشش روحانی تسخیر تدبیر، مصلحت سب بے معنی الفاظ ہوگئے ہیں!

ہمیں یہ امید کرنی چاہیئے کہ یہ ایک عارضی نفسی کیفیت ہے جو رفتہ رفتہ دور ہو جائے گی، لیکن خدا نخواستہ اگر یہ ایمان کی کمزوری یہ مایوسی اور ناامیدی مستقل حالت بن کر رہ جائے گی تو وہ قوتِ زندگی، جوہرِ حیات کو فنا کردے گی اور مسلمان عیش و عشرت ترک و تجرد ایسی اور بے زاری میں مبتلا ہو جائیں گے جن میں سے ہر ایک موت کے برابر ہے۔ یہ خطرہ اتنا ہولناک ہے کہ وہ لوگ جن کے دل میں مسلمانوں کا درد ہے ان کی موجودہ حالت کی اصلاح کو محض بخت و اتفاق پر نہیں چھوڑ سکتے بلکہ انھیں شعوری اور ارادی کوشش کے ذریعے سے مسلمانوں میں سچا ایمان یعنی خدا پر، انسانی ص

دنیا کی رفتار

ہندوستان

نئی دہلی، ۸ ستمبر۔ ہندوستان کی طرف سے پریسیڈنٹ ٹرومین اور مسٹر اٹیلی کے پیغامات کا جواب بھیج دیا گیا ہے۔ اس میں تفصیل سے سمجھایا گیا ہے کہ ہندوستان نے کشمیر کے معاملے میں ثالثی کی تجویز کو کن وجوہ سے رد کر دیا۔

کلکتہ، ۱۰ ستمبر۔ مغربی بنگال کی کانگریس اسمبلی پارٹی نے ۱۴ کے مقابلے میں ۳۲ ووٹ سے ڈاکٹر بی سی رائے پر اعتماد کا رزولیوشن پاس کیا اور کانگریس ورکنگ کمیٹی سے درخواست کی کہ انٹیرم منسٹری کے بارے میں اپنے فیصلے پر دوبارہ غور کرے۔

نئی دہلی، ۱۲ ستمبر۔ کچھ معمولی تبدیلیوں کے بعد وہ رزولیوشن جو وزیر اعظم نے جبری حصول املاک کے بارے میں پیش کیا تھا پاس ہو گیا۔

نئی دہلی، ۱۳ ستمبر۔ مغربی بنگال کی حکومت نے پنڈت نہرو کی اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کی یہ تجویز مان لی ہے کہ مغربی بنگال میں عام انتخابات کرائے جائیں، غالباً یہ انتخابات جنوری ۱۹۵۰ء میں ہوں گے، مرکزی حکومت کا خیال ہے کہ ان میں مشترک حلقہ ہائے انتخاب ہوں، لیکن مسلمانوں اور اچھوتوں کے لئے ان کی آبادی کے تناسب سے نشستیں محفوظ کر لی جائیں۔

پچھلے ہفتہ وہ الجھن جو کشمیر کے معاملے میں مسٹر ٹرومین اور مسٹر اٹیلی کے پیغامات سے پیدا ہو گئی تھی ختم ہو گئی، زمین اور دوسری املاک کی ضبطی اور معاوضے کا معرکۃ الآرا مسئلہ جو مدت سے چھڑا ہوا تھا طے ہو گیا، بنگال کی پرانی گتھی کے سلجھنے کی ایک صورت نظر آنے لگی۔

باہر کی دنیا

اسٹراس بورگ، ۹ ستمبر۔ یورپی مشاورتی کمیٹی نے یورپ کے لئے ایک اسمبلی کے قیام کا فیصلہ کیا ہے۔

بلغراد، ۸ ستمبر۔ اطلاع ہے کہ امریکہ نے بہت جلد یوگوسلافیہ کو کومن فارم کے معاشی بلاکیڈ کے مقابلے کے لئے ۲۰ ملین ڈالر کا قرضہ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

بون، ۷ ستمبر۔ آج مغربی جرمنی کی نئی پارلمنٹ کا افتتاح عمل میں آیا اور ایوان اعلیٰ کے ۴۳ نامزد ممبروں اور ایوان زیریں کے ۴۰۲ منتخب ممبروں کی موجودگی میں جرمن جمہوریہ کی شاندار تقریب منائی گئی۔

بائیں بازو کے ایک پرجوش نوجوان کارل آرنولڈ ایوان اعلیٰ کے صدر منتخب ہوئے اور کرسچین ڈیموکریٹک پارٹی کے لیڈر کونراڈ اڈیناؤ کا نام وزیر اعظم کے عہدے کے لئے تجویز ہوا ہے۔

بون، ۱۲ ستمبر۔ فری ڈیموکریٹک پارٹی (لبرل) کے لیڈر ڈاکٹر تھیوڈور ہیوس نئے جرمنی کے پہلے صدر منتخب ہوئے ہیں۔

ہیگ، ۱۲ ستمبر۔ انڈونیشی گول میز کانفرنس کی سست رفتاری سے ری پبلکن لیڈر اکتا گئے ہیں، کانفرنس اب چوتھے ہفتہ میں داخل ہو گئی ہے مگر انڈونیشی اور ڈچ نمائندوں کی رایوں میں اتنا بڑا اختلاف ہے کہ موجودہ رفتار کو دیکھتے ہوئے دو مہینے سے قبل نتیجہ نکلنے کی امید نہیں۔

واشنگٹن، ۱۲ ستمبر۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ، برطانیہ اور کینیڈا کے فنانس منسٹروں نے آج اعلان کیا کہ انھوں نے متفقہ طور پر ایسی تجویزیں مرتب کر لی ہیں جن سے برطانیہ کا ڈالر کا خسارہ ۱۹۵۲ء تک پورا ہو جائے گا۔

کشمیر

ہندوستان میں جو عام خفگی اس غلط فہمی کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی کہ امریکا اور انگلستان کشمیر کے معاملے کو طے کرانے کے لئے مداخلت کرانا چاہتے ہیں یا کسی قسم کا دباؤ ڈالنا چاہتے ہیں وہ دور ہو گئی، دونوں نے اس بات کو صاف کر دیا کہ وہ محض دوستانہ مشورہ دینا چاہتے ہیں، ہندوستان کی حکومت کی طرف سے جو جواب دونوں صاحبوں کو بھیجے گئے ہیں ان کا مضمون معلوم نہیں لیکن اندازہ یہ ہے کہ ان سے مشوروں کا شکریہ ادا کیا گیا ہے ان کو ساری صورت حال تفصیل سے سمجھائی گئی ہے اور نرمی سے مگر نہایت مضبوطی سے ثالثی کو قبول کرنے سے انکار کیا گیا ہے۔ پاکستان کی حکومت نے یہ معلوم کرنے کے بعد کہ اب ثالثی کی تجویز منظور ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ اس کے بارے میں اپنی رضامندی کا اظہار کیا ہے مگر پاکستان کے اخباروں نے اور رائے عامہ کے دوسرے نمائندوں نے ثالثی کی تجویز کو نہایت خطرناک قرار دیا اور بڑی شدت سے مخالفت کی۔

ضبطی اور معاوضہ

ہندوستان کے مسودہ دستور میں جو دفعات اس مطلب کی رکھی گئی ہیں کہ ریاست اجتماعی مفاد کے پیش نظر، کارخانوں، زمینوں اور ہر قسم کی شخصی املاک کو مناسب معاوضہ دے کر ضبط کر سکتی ہے۔ اس کی مخالفت سرمایہ داروں خصوصاً زمینداروں کی طرف سے بڑی شدت سے ہو رہی تھی اس لئے کہ زمینداری کے معاوضے کے بارے میں تجویز یہ تھی کہ مجلس آئین ساز کا فیصلہ قطعی سمجھا جائے اور زمینداروں کو عدالت سے رجوع کرنے کا حق نہ ہو۔ مہینوں کی کشمکش کے بعد یہ دفعات منظور ہو گئی ہیں، اور صوبوں کی حکومتوں کو زمینداری کے ختم کرنے میں جو دقتیں پیش آ رہی تھیں، ان میں سے ایک بڑی دقت دور ہو گئی ہے۔

مغربی بنگال کی خانہ جنگی

مغربی بنگال میں پارلیمنٹری کانگریس پارٹی اور صوبے کی کانگریس کمیٹی ایک مدت سے آپس میں دست و گریباں ہیں مرکزی حکومت اور کانگریس کمیٹی کی ساری کوششیں دونوں فریقوں میں سمجھوتہ کرانے کے بارے میں ناکام ثابت ہوئیں مجبوراً یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ جلد سے جلد عام انتخابات کرائے جائیں اور موجودہ وزارت کو توڑ کر ایک نئی انٹیرم وزارت بنائی جائے جس میں کانگریس کے ہر گروپ کی نمائندگی ہو۔ اب تک وزارتی گروپ ڈاکٹر بی سی رائے کی سرکردگی میں اس فیصلے کو ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا، اب اس نے رائے عامہ کے دباؤ سے مجبور ہو کر نئے انتخابات کی تجویز کو مان لیا ہے مگر کیبنٹ میں تبدیلی کا کچھ ذکر نہیں، غالباً اس معاملے میں ورکنگ کمیٹی کو مداخلت کرنی پڑے گی۔

ایشیا

چین کی جنگ بدستور جاری ہے، کینٹن کے قریب نیشنلسٹ فوج کا مقابلہ کچھ سخت ہو گیا ہے چونکنگ میں چیانگ کائی شیک بیٹھے ہوئے ایسی چالیں چل رہے ہیں کہ جنوبی اور مغربی چین کے کچھ حصے کو کمیونسٹوں سے بچا لیں اور ایک چھوٹی سی ریاست بنا کر اچھے وقت کے انتظار میں دن گزارتے رہیں، امریکہ کو معلوم ہوتا ہے جاں بلب نیشنلسٹ حکومت میں پھر کچھ زندگی کے آثار نظر آنے لگے ہیں اس لئے کہ اس نے حکومت کو اچھی خاصی رقم امداد کے طور پر دینے کا فیصلہ کیا ہے، دیکھنا ہے کہ اس انجکشن سے مریض میں کتنی طاقت آتی ہے اور وہ کتنے دن جیتا ہے۔

انڈونیشیا کے نمائندے ہیگ کی گول میز کانفرنس میں ڈچ حکومت سے گفت و شنید کر رہے ہیں، بوڑھا سامراج نوجوان تحریک آزادی کو آئینی گورکھ دھندوں میں الجھا کر ناگزیر فیصلے کو ٹالنا چاہتا ہے لیکن شاید زیادہ دن نہیں ٹال سکے گا،

یورپ

یورپ کی قوموں کا جو اجتماع اسٹراسبرگ میں ہوا تھا وہ ایک یورپی اسمبلی قائم کر کے ختم ہو گیا ہے، متحدہ یورپ اور مشترک پارلیمنٹ کے خواب کی جو مسٹر چرچل نے دیکھا تھا، ابھی تک صرف اتنی تعبیر نظر آئی ہے کہ جمہوری یورپی حکومتوں کا ایک سیاسی کلب بن گیا ہے۔ اس سے آگے قدم بڑھانے کے لئے ابھی قومیت کے پرستار راضی نہیں۔

بلقان میں یوگوسلافیہ اور کومن فارم کی اعصابی جنگ جاری ہے اور جب سے روس نے ٹیٹو کی حکومت کو کھلم کھلا اپنا دشمن قرار دیا ہے۔ یہ جنگ اور بھی تیز اور شدید ہو گئی ہے۔ امریکہ معاشی امداد کے نام سے یوگوسلافیہ کو ہر قسم کی مدد دے رہا ہے۔ امریکی اخباروں کے نامہ نگار یوگوسلافیہ پر روس کی چڑھائی کی افواہیں اڑاتے رہتے ہیں۔ مگر خود مارشل ٹیٹو نے ان خبروں کو بے بنیاد قرار دیا ہے۔

مغربی جرمنی کے انتخابات میں قدامت پسندوں کو توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی ہے۔ سوشلسٹ اپنی جگہ پر قائم ہیں اور کمیونسٹ بہت پیچھے ہٹ گئے ہیں، صدارت کے منصب پر ایک لبرل کا انتخاب یہ ظاہر کرتا ہے کہ جرمنی جمہوریت کی راہ پر چلنا تو چاہتا ہے مگر بہت آہستہ آہستہ سوچ سمجھ کر اور دیکھ بھال

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

بزم بے تکلف

"کہیے میر صاحب یہ جو ہندسوں کی لڑائی ہو رہی ہے اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"
"ہندسوں کی لڑائی یعنی چہ؟ کیا خدا نخواستہ بی اے کی، ورنی دھائی میں ہاتھا پائی کی نوبت آگئی یا طاق اور جفت میں گتھم گتھا کی ٹھہری؟"
"بھئی قبلہ آپ کس دنیا میں رہتے ہیں؟ آئین ساز اسمبلی سے لے کر اخباروں کے صفحوں تک جہاں عبارت کا بدھ چھڑا ہوا ہے اور آپ کو خبر ہی نہیں۔ یوں تو قومی زبان کے بارے میں بھی ستیرے اعتراض تھے پر زبان سی بن ہی گئی تھی مگر جب سے ہندسوں کے متعلق منشی کا فارمولا ——————"
"ذرا ٹھہرئیے گا۔ یہ فارمولا کہیں بارہ مولا کے قریب رہتے ہیں؟"
"معاف کیجئے گا، میں آپ کو انگریزی داں سمجھتا تھا؟"
"نہیں ہم انگریزی داں نہیں تو ہم کچھ ایسے نادان بھی نہیں ہیں۔ مگر ان حضرت کا ربیلا سے کبھی ملاقات کا اتفاق نہیں ہوا؟"
"فارمولا تجویز کو کہتے ہیں۔ آپ نے کرپس فارمولا تو سنا ہوگا؟"
"اچھا یہ وہ بزرگ ہیں۔ سننے کی آپ نے ایک ہی کہی۔ ان کو تو آج تک یک قلم رہے ہیں اور کرپ کی جان کو دعائیں دے رہے ہیں۔ مگر یہ کرپ بے بلا کا اکال آپ کی ہندسوں میں چار سو بیس کا فارمولا نکال رہا ہے۔"
"نہیں میر صاحب کرپس سے کیا واسطہ؟ یہ تجویز منشی اور شری آئنگر کی ہے کہ قومی زبان میں وہی ہندسے استعمال کئے جائیں جو انگریزی میں اور دنیا کی بہت سی زبانوں میں استعمال ہوتے ہیں مگر ہمارے ٹنڈن جی اڑے ہوئے ہیں کہ نہیں ہندسے بھی دیوناگری کے ہوں گے۔"
"ارے میاں ان باتوں میں کیا رکھا ہے، کیوں خواہ مخواہ تین پانچ کرتے ہیں، وہ ناگری دیو کے ہندسے ہوئے تو کیا اور سفید دیو کے ہوئے تو کیا؟"
"ان کا کہنا ہے کہ ہندی عبارت کے بیچ میں انگریزی ہندسے اچھے نہیں لگیں گے۔"

"بھئی کیوں نہیں لگیں گے، ان سے کہئے کہ اگر آپ کے نام بڑا سا منی آرڈر آئے اور اس میں رقم انگریزی ہندسوں میں لکھی ہوئی ہو تو پھر کو ان ہندسوں پر پیار آئے گا یا نہیں؟ لیکن انکم ٹیکس کی رقم دیوناگری کیا دیوبانی ہندسوں میں بھی لکھی ہوئی ہو تو ایک ایک ہندسہ [illegible] آنکھوں میں کھٹکے گا۔ یہ ہندی، انگریزی کا نہیں لیکھے جوکھے کا معاملہ ہے۔"
"ٹنڈن جی یہ بھی کہتے ہیں کہ بدیسی چیز کو قومی زبان میں کیوں خواہ مخواہ ٹھونسا جائے ایک تو انگریزی کے ہندسے، دوسرے عرب سے گئے ہوئے اور عربی کہلانے والے۔ بہ قول شخصے ایک تو کریلا کڑوا دوسرے نیم چڑھا!"
"ہونہہ! جو کریلا عمر بھر کھاتے چلے آئے ہیں اس کی اب کڑواہٹ کیسے پڑے گی ہیں، رہا نیم سو نیم کا کیا کہنا، بس ایک بار آنکھیں بند کر کے نگل جائیے۔ یہ آپ کا سارا فساد خون دور نہ ہو جائے تو کہئے گا۔ آخر منشی جی کیا کہتے ہیں؟"
"وہ کہتے ہیں کہ یہ ہندسے بدیسی نہیں ہندوستان سے عرب گئے تھے، اور وہاں سے دوسرے ملکوں میں پھیلے۔"
"بالکل ٹھیک کہتے ہیں، اگر ہند سے نہ گئے ہوتے تو ہندسے کیوں کہلاتے؟"
"سبحان اللہ میر صاحب، یہ دلیل کسی کو نہیں سوجھی تھی۔ بس اب منشی جی نے پالا مار لیا۔"
"اچھا یہ تو بتلائیے آئنگر صاحب کیا فرماتے ہیں؟"
"ان کا استدلال یہ ہے کہ جنوبی ہند کی چاروں زبانوں میں سو سال سے یہ انگریزی یا بین الاقوامی ہندسے استعمال ہو رہے ہیں۔ جنوب کے لوگ آپ کی خاطر ہندی کو مان رہے ہیں۔ آپ ان کی خاطر کم سے کم ان ہندسوں ہی کو مان لیجئے۔"
"خیر بھئی کچھ بھی ہو اب کی ٹنڈن جی کو پالا بے ڈھب حریفوں سے پڑا ہے، یہ چودھری خلیق الزماں نہ باشد کہ ہندی کا حملہ ہوا تو جوش شجاعت میں فراری جہاد فرمایا۔ چاہیدن؟"

داغ انسانیت

سروش عسکری طباطبائی

لیجئے فقیر دیکھے کچھ رینگتے زمیں پر
جو داغ بن گئے ہیں تہذیب کی جبیں پر
آبا کی لغزشوں کی عبرت بھری نشانی
امراض کا خزانہ، ادبار کی جوانی
اعضا شکستہ ان کے، سینے فگار ان کے
دھوپ، اوس اور بارش تیماردار ان کے
عمریں طویل ایسی گویا کہ غیر فانی
شرما رہی ہے خود ان سے سخت جانی
جسموں سے ان کے عاجز قدرت کی تیغ بُرّاں
سینوں پہ ان کے ضائع موسم کا تیر باراں
اللہ ری بے نوائی، اللہ ری بے پناہی
موت اور زیست دونوں کترا کے ان سے جائیں
دکھیاروں کا جہاں میں ہونا بھی ہے نہ ہونا
ہنسنا نہ ان کا ہنسنا رونا نہ ان کا رونا
کوئی بھی مسرت بہلا سکے نہ ان کو
کوئی کڑی مصیبت تڑپا سکے نہ ان کو
صحت مہیب ان کی، حالت سقیم ان کی
ہستی عذاب ان کی، دنیا جحیم ان کی
پھیلا سکی یہ جھوٹی دنیا نہ جال ان پر
دا شفاخانہ ان پر، بند اسپتال ان پہ

معراج ارتقا کے یہ دل شکن نظارے!؟
ٹوٹے پڑے ہوئے ہیں کس عرش کے یہ تارے!؟

یہ مختصر عقوبت اور کس کے گھر بپا ہے
خاک وطن کا جس کی ہر ذرہ دیوتا ہے
وہ خاک جس میں چاندی سونے کی لاکھوں نہریں
لیتی ہیں ٹھاٹھ جس پر گنگ و جمن کی لہریں
کشمیر مانگ جس کی، سورج جبیں جس کی
سونا اگل رہی ہے اب تک زمین جس کی
اپنے ہی جانتے ہیں انھوں سے جو کیا ہے
غیروں کا جس نے دامن پھولوں سے بھر دیا ہے
پیرے ہوئے ہیں نشتر احساس کی رگوں میں
زخم آ گئے ہیں اب تو ادراک کی تہوں میں

کاش ان مصیبتوں کا کچھ انتظام ہوتا!
بجلی نہیں تو گرتی، قصہ تمام ہوتا!

۲ جنوبی زبانوں کے نمائندے اور ماخذ [illegible]

اسلامی ممالک کا تنزل

سید شاہ حسین

ماضی قریب کے اسلامی مفکروں یعنی جمال الدین افغانی اقبال اور شکیب ارسلان نے اسلام کے زوال کے اسباب کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ انھوں نے نتیجے کو سبب سمجھا اور سارے علیت پرست اور تخیل پسند مفکروں کی طرح ترقی اور تنزل کی ان مادی بنیادوں کو پیش نظر نہیں رکھا جن سے قومیں بنتی اور بگڑتی ہیں۔۔۔۔ مجھے اکثر خیال ہوتا ہے کہ خودی کے بلند کرنے کا نعرہ مسلمانوں کے لئے صحیح نعرہ نہیں تھا۔۔۔۔۔۔ سیدھی بات یہ تھی کہ اسلامی ممالک صنعتی دور میں شامل ہوں۔۔۔۔۔۔

محترمی تسلیم

ابھی نئی روشنی کا تازہ پرچہ ملا، اداریہ پڑھ کر بعض خیالات کے اظہار کو جی چاہا۔ اس خط کا مقصد اداریہ کی تنقید نہیں، بعض خیالات کا اظہار ہے جو بہت دنوں سے میرے ذہن میں کسی قدر واضح شکل میں چکر لگا رہے ہیں۔

اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ اس وقت وہ سارے ممالک جنھیں اسلامی کہا جاتا ہے پستی اور تنزل کی اس منزل میں ہیں جس میں آزادی اور غلامی کی حد فاصل بھی قائم نہیں رہ جاتی۔ اس کے کیا اسباب ہیں؟ جب تک اس سوال کا صحیح جواب نہ مل سکے صورت حال کا بدلنا ممکن نہیں ہے۔ بعض مفکرین اسلام کے نزدیک خلافت راشدہ کے بعد کا سارا زمانہ اسلام کے زوال کا زمانہ ہے اور ان مفکروں میں اقبال بھی شامل ہیں۔ گو وہ کبھی کبھی صقلیہ کے عروج، غرناطہ اور قرطبہ کے اسلامی دور "شوکت شام" اور "بغداد" سے بھی متاثر معلوم ہوتے اور ایک ایسی ذہنی ثنویت کا شکار ہو جاتے ہیں جو نیچے اتر کر امان اللہ، محمد نادر شاہ اور ظاہر شاہ کے شکوہ خسروی سے بھی اسلام کی امیدیں وابستہ کر دیتی ہے۔ اس لئے عروج اور زوال کی حدیں معین کرنا دشوار معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تک ہمارے ذہن میں مادی اور روحانی ترقی کے الگ تصورات ہیں اس وقت تک اس طرح کی پیچیدگیاں باقی رہیں گی۔ مسلمان بادشاہ کسی مبدع کے لئے "ہیروز آف اسلام" بن جائیں گے اور کسی کے لئے شاہی اور جاگیردارانہ نظام کے نمائندے، جن کو خاص طور سے مذہبی اور روحانی عروج سے وابستہ کرنا زیادہ صحیح نہ معلوم ہوگا۔ اس لئے میں ان صورتوں میں الجھے بغیر بعض باتیں کہنا چاہتا ہوں

میرے الفاظ ایک بہت ہی جری، علان ہی نہیں بلکہ چھوٹا منہ بڑی بات کے مصداق بھی نظر آئیں گے، لیکن میرا خیال ہے کہ ماضی قریب کے اسلامی مفکروں یعنی جمال الدین افغانی، اقبال اور شکیب ارسلان نے اسلام کے زوال کے اسباب کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ انھوں نے نتیجے کو سبب سمجھا، اور سارے علیت پرست اور تخیل پسند مفکروں کی طرح ترقی اور تنزل کی ان مادی بنیادوں کو پیش نظر نہیں رکھا جن سے قومیں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ اس کا یہ مقصد نہیں کہ افغانی اور اقبال اسلامی ممالک کے مادی زوال سے واقف نہیں تھے۔ بلکہ کہنا یہ ہے کہ انھوں نے تاریخ کی اس مادی تعبیر، واقعات کی اس جدلیت کو سامنے نہیں رکھا جس سے یہ بات واضح ہو جاتی کہ تاریخ کے موجودہ دور میں اسلامی ممالک ترقی کی دوڑ سے کیوں دور رہیں، کیا واقعی تقدیر امم "شمشیر و کتاب اول، طاؤس و رباب آخر" کے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے؟ کیا ضمیر کے انقلاب سے ملکوں میں انقلاب ہو سکتا ہے؟ کیا مذہب کی بنیاد پر ممالک کے اتحاد سے مخصوص قسم کی جارحانہ مادی قوتوں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے؟ کیا سماج کے اندرونی طبقاتی تضاد کو ختم کئے بغیر ایک پائدار اور مضبوط نظام زندگی کی تشکیل ممکن ہے؟ ریاستوں اور قوموں کی ابتدا اور عروج، مذاہب کی پیدائش اور ان کے اثرات طبقاتی کش مکش ذرائع پیداوار اور ان کی ملکیت —— تاریخی طور پر انھیں سمجھے بغیر اسلامی ملک کے عروج و زوال کا راز سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

اسلام دنیا میں آیا تو ایشیا کے اکثر ممالک غلامی کے دور سے نکل چکے تھے اور بادشاہتیں قائم ہو چکی تھیں، مسلمان تھوڑی ہی مدت میں تاریخی تقاضوں کا ساتھ دے کر، اتحاد اور ترقی کے نئے ولولے سے معمور ہو کر آگے بڑھتے گئے۔ بادی النظر میں یہ مذہب کا عروج تھا لیکن تاریخی حیثیت سے شاہی نظام کا استقلال تھا۔ ذرائع پیداوار پر مطلق العنان حاکموں کا قبضہ تھا اور محنت کش طبقہ دبا ہوا پڑا تھا۔ جاگیردارانہ تمدن نے اپنی برکتوں اور لعنتوں کے ساتھ اپنا جال پھیلا لیا، اور عروج کے اس نقطۂ آخر پر پہنچ گیا جہاں مذہب کا سہارا لے کر پہنچ سکتا تھا۔ چنانچہ پندرھویں سولھویں اور سترھویں صدی میں ہندوستان، ایران، ترکی نے غیر معمولی ترقی کی۔ اس سے پہلے اموی عباسی اور فاطمی حکومتوں نے بھی اعلیٰ مطلق العنان بادشاہتوں کی حیثیت سے جو نظام پیدا کیا تھا، سترھویں صدی کے بعد سے یورپ کا معاشی نظام آہستہ آہستہ بدلنے لگا۔ وہاں کی تجارتی تنظیم نے صنعتی [illegible] پیدا کیا۔ سرمایہ داری کا نشوونما ہوا اور [illegible] نظام نے جاگیردارانہ نظام سے ٹکر لینا شروع کیا، یہاں تک اٹھارھویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے جاگیردارانہ تمدن پسپا ہو گیا۔ اس نے ایسی صورت حال پیدا کر دی تھی کہ نئے پیداوار کی شکل بدل رہی تھی اور کسان اپنے کھیتوں سے الگ نہ پا سکنے کی وجہ سے دستکاری اور مزدوری کی طرف جا رہے تھے، پھر صنعتی انقلاب ہوا اور سرمایہ داری اپنے عروج کے نقطۂ آخر پر پہنچ گئی۔ جاگیردارانہ اور شاہی زندگی کے قصیدے بے جوڑ معلوم ہونے لگے یہی نہیں بلکہ ان میں زندگی کو آگے بڑھانے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہ گئی اور ملک میں اس دور کے بچے کھچے عناصر مضحکہ خیز بن گئے۔

صنعتی سرمایہ داری نے غیر ترقی یافتہ (صنعتی حیثیت سے) ملکوں کو بازار بنا لیا، اور نوآبادیوں میں تبدیل کر لیا۔ اسلامی ممالک میں کوئی ایسی بات نہیں ہوئی۔ مصر، ایران، ترکی، عرب، افغانستان سب اسی زمانہ زندگی سے چمٹے رہے۔ نہ صرف ان کی ذہنیت جاگیردارانہ اور شاہی پسند بنی رہی بلکہ وہ صنعتی دور میں بھی داخل نہیں ہوئے۔ انھوں نے سائنس اور ایجادات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، گویا دنیا تاریخی طور پر جس دور میں داخل ہو رہی تھی اس میں داخل ہونے سے انھوں نے انکار کیا۔ نتائج آمد و رفت کی آسانیاں دنیا کے ہر خطہ کو ایک رشتے میں منسلک کر رہی تھیں اور وہ اس سے علیحدہ ہو کر ایک بچھڑے ہوئے نظام سے وابستہ رہنے کے معنی غلامی تھے۔ چنانچہ سارے اسلامی ممالک کسی نہ کسی شکل میں ترقی یافتہ یورپی ممالک کے زیر اقتدار آ گئے اس کی توجیہ اور طرح کرنا غیر تاریخی اور غلط ہوگا۔ اسی لئے مجھے اکثر خیال ہوتا ہے کہ خودی کے بلند کرنے کا نعرہ مسلمانوں کے لئے صحیح نعرہ نہیں نہیں تھا اور اگر صحیح تھا تو بہت گھما پھرا کر، سیدھی بات یہ تھی کہ اسلامی ممالک صنعتی دور میں داخل ہوں، نہ داخل ہونے کا نتیجہ یہ تھا کہ نام نہاد آزادی کے باوجود ان کے تیل کے چشموں پر دوسروں کا قبضہ ہے، اور وہ اپنے اندرونی معاملات میں بھی آزاد نہیں۔

قدیم نظام زندگی سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اسلامی ممالک میں کوئی مضبوط عوامی تحریک بھی نہیں ہے اور برسر اقتدار طبقہ اپنی موت کے ڈر سے بیرونی سامراجی اور سرمایہ دارانہ طاقتوں سے ساز باز رکھنا ضروری سمجھتا ہے۔ خودی کا جذبہ زوال پذیر خواص اور اعلیٰ طبقے میں اب نہیں لوٹ سکتا ہے۔ صرف عوامی قوتوں کے مضبوط اور منظم ہونے کا سوال ہے۔

اسلامی ممالک کی سیاست پر نگاہ ڈالئے تو اب بھی یہی نظر آتا ہے کہ وہاں کے برسر اقتدار طبقے بیرونی طاقتوں کی مدد سے اپنی زندگی باقی رکھنے ہی کو سب سے بڑا فرض تصور کرتے ہیں۔ مصر، ترکی عرب، عراق ایران، افغانستان اور انڈونیشیا، پاکستان ہر

(بقیہ صفحہ پر)

فرار

باقر رضوی

زندگی کے تلخ حقائق سے بچنے، خارا شگاف مشکلات کی بادِ سموم سے محفوظ رہنے اور مہمات کی کڑی دھوپ سے منہ چھپانے کے لئے ہم تخیل کی دنیا میں پناہ لیتے ہیں اور خواب کے سنہرے جزیرے میں جا بستے ہیں کہ وہاں شہد کی شیرینی، حریر کی نرمی اور فردوس بہشت کے سایہ کی خنکی ملتی ہے۔

اکتاہٹ پیدا کرنے والے یک رنگ میکانکی معمولات اور زندگی کی ناگوار سرگرانیوں سے نجات حاصل کرنے کی خاطر ناول پڑھتے ہیں، شعر گنگناتے ہیں اور جذباتی تقریریں سنتے ہیں، ہم بعض وقت تصور میں پورے نظام شمسی کا ایسا آفتاب بنا چاہتے ہیں کہ تمام ستارے سیارے ہمارے چاروں طرف گردش کریں اور ہم سب کا مرکز ثقل ہوں۔

اگر یہ گریز اور فرار عارضی اور وقتی ہو اور مناسب حدود میں رہے تو کوئی مضائقہ نہیں، ماہرین نفسیات نے تو اعصابی آرام و سکون کے لئے نیند کے علاوہ جاگتے میں خواب دیکھنے کی ضرورت پر بھی زور دیا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق ہیجان پرور، پر آشوب اور شور انگیز زندگی میں اس عارضی فرار کی اہمیت کو کم نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہی دلچسپیاں اگر زندگی کا ایک مستقل اور لاینفک جز بن جائیں اور "جائے فرار" ایک مستقل "جائے قرار" کی حیثیت اختیار کرے تو انسان ایک ذہنی مرض کا شکار ہو جاتا ہے، ایک خیالی اور طلسمی دنیا کا باشندہ بن جاتا ہے۔ اسے حقیقی زندگی کے کھلے میدان میں آتے اور معمولی باتوں کا سامنا کرتے جھجک معلوم ہوتی ہے۔ اسے سینما کے تماشے میں ایسا مزا آئے گا کہ زندگی کے ڈرامے میں خود ایک چابک دست اداکار نہ بن سکے گا۔ ایسا آدمی کارزارِ حیات میں دلیرانہ اور مردانہ پیش قدمی تو کجا کامیابی کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے بھی قابل نہیں رہ جاتا۔ وہ شانتی دار اور سکون بخش سپاہی کو تیغ زنی اور تیغ آزمائی پر ترجیح دے گا اور ایک سپر انداختہ اور نکمہ سپاہی ثابت ہوگا۔

بعض لوگ اپنی خیالی اذیتوں یا حقیقی تکلیفوں کا علاج "مئے دو سالہ و محبوب چاردہ سالہ" میں تلاش کرتے ہیں۔ شراب و شاہد سے نشاط حاصل کرنا ان کا مقصد نہ سہی، انھیں یک گونہ بے خودی کی خواہش ضرور ہوتی ہے۔ یہ بے خودی کی چار دیواری میں قلعہ بند ہو کر خود کو زندگی کے سیلاب سے محفوظ خیال کرتے ہیں، ممکن ہے دل کی دیرینہ بیماری اور "ناکامی" میں اس "آبِ نشاط انگیز" اور "شاہدِ ہوش ربا" سے وقتی افاقہ ہو جاتا ہو، مگر یہ "آتشِ سیال" اور "آتشِ مجسم" دونوں مل کر زندگی کو "آتشِ جہنم" میں ڈھکیل دیتی ہیں، جہاں امن و سکون ہی نہیں خرمن ہستی بھی خاکستر ہو جاتا ہے۔

ہم اپنی بعض خواہشوں، تمناؤں اور مشکلوں کو غیر شعوری طور پر دبا لیتے ہیں یا جان بوجھ کر انھیں بھول جانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی یاد ہمیں بار خاطر ہوتی ہے۔ ہم اس پر خوش ہوتے ہیں اور بزعم خود یہ سمجھتے ہیں کہ اب یہ ہماری پریشانی دل کا باعث نہ ہوں گی، لیکن یہ تمام خواہشیں، تمنائیں اور مشکلیں ہمارے تحت شعور کے تہہ خانے میں دفن رہتی ہیں "ممی" کی طرح ان کے خد و خال میں بھی فرق نہیں آتا۔ یہ ان دیکھے بھوت ہماری زندگی پر اپنا منحوس سایہ ڈالتے رہتے ہیں۔ پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ موقع مناسب پا کر یہ تحت شعور کے تہہ خانے سے شعور کی سطح پر رینگ آتی ہیں۔ ہمارا ذہن ایک میدان حشر بن جاتا ہے۔ جہاں ہر مردہ خواہش اپنا اعمال نامہ لے کر دوبارہ زندہ ہوتی ہے۔ یہ دبائی ہوئی خواہش اور پس پشت ڈالی ہوئی باتیں ہمارے حرکات و سکنات کا جز بن جاتی ہیں اور ہمارے شعور کی صحت بخش فضا کو مسموم بناتی ہیں۔

> اگر یہ گریز اور فرار عارضی اور وقتی ہو اور مناسب حدود میں رہے تو کوئی مضائقہ نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "جائے فرار" ایک مستقل "جائے قرار" کی حیثیت اختیار کرے تو انسان ایک ذہنی مرض کا شکار ہو جاتا ہے ایک خیالی اور طلسمی دنیا کا باشندہ بن جاتا ہے اسے حقیقی زندگی کے کھلے میدان میں آتے اور معمولی باتوں کا سامنا کرتے جھجک معلوم ہوتی ہے۔

مشکلوں سے بچنے اور حقائق سے روگردانی کرنے کے لئے بعض لوگ بیمار بن جاتے ہیں لیکن اس سے خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوتا، کیونکہ جو قوت تعمیری سرگرمیوں میں صرف ہونا چاہئے تھی وہ مجہولیت کا لبادہ سنبھالے رہنے میں ضائع ہوتی ہے۔ تعمیری قوتوں کا آئینہ زنگ آلود ہو کر رہ جاتا ہے اور مصائب کے پہاڑوں کو کاٹ کر "جوئے شیر" لانے کے قابل نہ رہ کر زندگی ایک "سنگ گراں" بن جاتی ہے۔

ماضی کی مرمریں شہ نشینوں اور مستقبل کے ہوائی قلعوں میں پناہ گزیں ہونے سے معمولات اور مہمات کا مقابلہ کرنے کی سکت باقی نہیں رہتی۔ کامیابی کے ساتھ ان کو حل کرنے کی قوت زائل ہو جاتی ہے۔ انسان یا تو "رجعت پسند قنوطی" بن جاتا ہے، یا "تخیل پسند رجائی"۔ زمانہ شناس اعتدال پسند نہیں رہتا۔ یہ دونوں کیفیتیں انسان کی نفسیاتی صحت مندی کے لئے مضر ہیں۔

زندگی جد و جہد کا نام ہے۔ جمود و سکوت موت ہے۔ قدرت کا اٹل قانون ہے کہ انسان میں مقابلہ اور مسابقت کی قوت بڑھتی رہے۔ حقائق اور مہمات و مشکلات کا صحیح حل ان کو نظر انداز کرنے اور پس پشت ڈالنے میں نہیں، روگردانی، فرار اور پسپائی میں نہیں۔ مردانہ وار مقابلہ کر کے ان پر فتح حاصل کرنے میں ہے۔

اسلامی ممالک کا تنزل

(بہ سلسلہ صفحہ ۶)

ایک اینگلو امریکی بلاک میں شامل ہے اور اپنی قدیم جاگیردارانہ ذہنیت سے باہر نکلنا نہیں چاہتا۔

میرا خیال ہے کہ اس انحطاط کی اصلاح مذہبی اصلاح سے نہیں ہو سکتی، یہ کوئی باطنی یا داخلی قسم کا زوال نہیں ہے، خالص مادی ہے اور یہی روحانی زوال کا بھی سبب ہے۔ اسلامی ممالک کے اضطراب کو مذہبی اصلاح کے سانچے میں ڈھالنا اس وقت پھر انھیں بے اثر کر دینا ہوگا۔ وہاں صرف ان جمہوری عناصر کو تقویت دینا چاہئے جو ذرائع پیداوار کو بیرونی سامراجی طاقتوں اور اوپر کے طبقوں کے ہاتھوں سے نکال کر عوام اور جمہور کے ہاتھوں میں پہنچائیں۔

باہر کی دنیا

(بہ سلسلہ صفحہ ۴)

جن لوگوں کو انتخاب کے نتیجے سے یہ اندیشہ ہو کہ فسطائیت اور عسکریت جرمنی میں پھر سے زندہ ہو رہی ہے وہ بے جا خیال آرائی سے کام لے رہے ہیں، واشنگٹن میں برطانیہ، کینیڈا اور امریکہ کی مالی گفت و شنید کی کامیابی سے لندن میں خصوصاً لیبر پارٹی کے حلقوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی ہے اس لئے کہ برطانیہ کو ایک بار پھر اپنی مالی حالت درست کرنے کی مہلت مل گئی، عام خیال یہ ہے کہ اس سے لیبر حکومت کی گرتی ہوئی ساکھ پھر بڑھ جائے گی۔ ایک افواہ یہ بھی ہے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر لیبر حکومت اس سال کے ختم سے پہلے عام انتخابات کرانا چاہتی ہے مگر یہ بات ابھی تک تصدیق طلب ہے۔

"نئی روشنی" کے پروانے

(۲)

سلام مسنون

"نئی روشنی" کے گل ہو جانے کی اختتامی خبر آپ نے بڑی سنائی، آپ کا یہ "بزم بے تکلف" کا کالم واقعی روشنی کا ایک مینار تھا اور میں اسی ایک کالم کو پڑھتا تھا ....

"تم تھیں اس اردو کو ترس رہی تھیں، جسے کہ تھوڑا بہت سیکھا تھا، سرشار، رسوا، سجاد حسین، مرزا ریاض اب جہاں کہیں ان مرحومین کی کچھ بو باس بھی محسوس ہوتی ہے، بس وہاں سے ہٹنے کو جی نہیں چاہتا ....

ردولی بارہ ضلع بارہ بنکی　　　عبدالماجد

محبی، تسلیم

میں نے "تکلف برطرف" پڑھا۔ اب ایسی خبروں پر حیرت نہیں ہوتی، رنج ضرور ہوتا ہے، شاید عادتاً ...... مجھے اب تک کبھی کبھی یہ خیال ہوتا تھا کہ غالباً اس کے خریداروں کی تعداد بڑھ چکی ہوگی ورنہ ایسے اطمینان سے کیسے نکل رہا ہے۔ لیکن اپنے اس خیال پر یقین نہیں آتا تھا۔ کوئی مصور فلمی ہنگامہ خیز اخبار ہوتا جیسے کہ گرسڑکوں پر چلا چلا کر بیچے جاتے تو شاید اس کی نکاسی بھی ہو جاتی! یہاں سنجیدہ رسائل کی قدر کہاں! بہرحال بند ہوا تو رنج ہوگا ......

کاش کوئی معقول مشورہ ہی دے سکتا۔

لکھنؤ　　　احقر۔ احتشام حسین

اورنگ آباد، گیا

محترمی اعظمی صاحب، السلام علیکم!

نئی روشنی بابت ۱۶ر موصول ہوا بزم بے تکلف میں "تکلف برطرف" کی سچی اور کڑوی بات سن کر تردد ہوا۔ رسالے کی اشاعت کو موقوف کر دینا میرے خیال میں اس وقت ہرگز مناسب نہیں یا بلکہ مجھے کہنے دیجئے، یہ شکست خوردہ ذہنیت کا اظہار ہوگا جس سے تمام شائقین نئی روشنی سخت متاثر ہوں گے۔ موجودہ صورت حال میں ایک اردو رسالہ کو نشر و اشاعت میں جو دشواریاں حائل ہو رہی ہیں اسی کا مجھے اعتراف ہے، پھر عزیز محترم! ایک بلند عزم کے ساتھ سرگرم عمل ہوتے ہوئے ہمیں سپر ڈال دینا ہرگز زیب نہیں دیتی۔

براہ مہربانی اشاعت موقوف کرنے کا خیال نہ لائیے۔ رسالہ کی مالی الجھنوں کو سلجھانے کی سعی کیجئے، سرکاری و نیم سرکاری اشتہارات فراہم کیجئے، شعبۂ تعلیم سے تمام اداروں میں رسالہ کی خریداری قبول کرنے کی اپیل

کیجئے، فرض ممکنات سے پرہیز نہ کیجئے

سید محمد حسنین

مکرمی، تسلیم

"نئی روشنی" میں یہ پڑھ کر افسوس ہوا کہ بعض مالی دشواریوں کی وجہ سے اس کا احتمال پیدا ہو گیا ہے کہ مجبوراً اسے بند کر دینا پڑے، خدا کرے یہ اس مرحلے سے عہدہ برآ ہو سکے، میں حتی المقدور اس کے لئے اپنی بڑی چھوٹی ادبی خدمات سے گریز نہ کروں گا۔

لکھنؤ　　　نیاز مند
　　　　　باقر رضوی

مکرمی ایڈیٹر صاحب، نئی روشنی، دہلی

سلام مسنون!

۱۶ر اگست کے "نئی روشنی" میں آپ کا مضمون "تکلف برطرف" پڑھ کر نہ جانے کیوں دل بیٹھ سا گیا۔ شروع میں میں نے نئی روشنی کا مطالعہ اپنے ایک دوست کے کہنے سے شروع کیا تھا، لیکن کچھ تو کچھ تو اپنی تعلیمی مصروفیات اور کچھ خانگی کاموں کی زیادتی کی بنا پر میں زیادہ توجہ و غور سے نئی روشنی کو ابتدا میں نہ پڑھ سکا۔ دھر چند مہینوں سے میں نے نہایت غور اور توجہ سے اس کا مطالعہ شروع کیا ہے اور اس چیز کا قائل ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ واقعی نئی روشنی موجودہ ماحول میں خاموشی اور مستقل مزاجی کے ساتھ بہت ٹھوس اور جائز مقاصد کو پیش نظر رکھ کر چل رہا ہے۔ مجھے اس کے مطالعہ سے نہ صرف بے لاگ اور صحیح خبریں معلوم ہوئیں بلکہ آپ کے ادارتی کالم سے بہت استفادہ حاصل ہوا ہر بچن کوست، بزم بے تکلف بھی آپ کی خوب ہے۔

یہ جو دیکھا کہ "تکلف برطرف" پر نظر پڑی تو طبیعت بے اختیار چاہی کہ اخبار بند نہ ہو۔ آپ کی پریشانی اور مالی دشواری بالکل حق بجانب ہے اور واقعی یہ ماحول صحافت کے لئے موزوں نہیں لیکن پھر بھی میری ناقص رائے اس ضمن میں یہ ہے کہ آپ اسے بند نہ کریں بلکہ کسی نہ کسی صورت میں اسے جاری رکھیں۔ مالی حل کے سلسلے میں میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ اس کی قیمت ۳ر کے بجائے ۴ر کر دیجئے۔ جن لوگوں نے اس کا مطالعہ ایک بار کر لیا ہے مجھے امید ہے کہ وہ ضرور اس اضافہ کو منظور کر لیں گے۔ جب آپ اس قابل ہو جائیں کہ ۳ر میں خسارہ نہ ہو تو دوبارہ آپ نرخ گھٹا سکتے ہیں۔

ہندو یونیورسٹی بنارس　　　مہدی حسن

مکرمی جناب عبداللطیف صاحب، السلام علیکم

۱۶ر اگست کا اخبار مجھے آج ۲۴ر اگست کو ملا چونکہ یہ کوئی نئی بات نہیں اس لئے مجھے اس کے بارے میں کچھ کہنا بھی نہیں ہے۔ یہ خط اس لئے لکھ رہا ہوں کہ اخبار کھولتے ہی حسب معمول "بزم بے تکلف" کی سرخی پر نظر پڑی جو غائب تھی، اور اس کے بجائے "تکلف برطرف" کا عنوان نظر آیا، پڑھا اور دوبارہ پڑھا، کچھ ایسا محسوس ہوا کہ گویا یہ نعوذ باللہ نئی روشنی کا الوداعی پیام ہے۔ ہمیں نئی روشنی سے کتنی محبت ہے آپ کو کیا بتاؤں ہاں اگر مولوی حامد علی خاں صاحب کہیں آس پاس ہوں تو وہ آپ کو ہمارے لگاؤ کی داستان شاید سنا سکیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اخبار کے بقا کے لئے کیا تدبیر سوچتے ہیں شاید ہم بھی اس وقت کسی کام آ سکیں۔

بمبئی نمبر ۴　　　مہر محمد خاں شہاب

محترمی عبداللطیف صاحب، سلام مسنون

نئی روشنی کی گذشتہ اشاعت میں بزم بے تکلف کی بجائے بعنوان تکلف برطرف ڈاکٹر عابد حسین صاحب کا مضمون نظر سے گذرا جس میں نئی روشنی کی طرف سے مایوسی کا اندازہ ہوا، خدا نہ کرے کہ ایسا ہو، میں اس قدر شرمندہ ہوں کہ ایک خریدار بھی فراہم نہ کر سکا۔ میری تجویز ہونے والی لائبریری کمیٹی کے سامنے پیش ہو جائے گی اور نئی روشنی کی خریداری مکٹ لائبریری منظور کرے گی۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ امام المدارس بھی خریدار بن جائے جس کی امسال قوی امید ہے۔ اگر خدانخواستہ نئی روشنی بند ہو گیا تو مجھے اتنا ہی رنج ہوگا جتنا کسی عزیز کی موت کا۔ اس وقت نئی روشنی جیسے پرچہ کی سخت ضرورت ہے۔ خدا کے لئے جلد ایسی تدابیر اختیار کیجئے کہ پرچہ اس تباہی سے محفوظ ہو جائے۔

امروہہ　　　مرتضیٰ حسن

واجب الاکرام جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ ۱۶ر اگست کا نئی روشنی نظر نواز ہوا، اس سے آپ کی علالت اور اخبار کے مسلسل خسارہ کا حال معلوم ہوا۔ آپ نے معقول آمدنی کے ذرائع نہ ملنے پر اخبار کے بند ہو جانے کے جو اندیشے ظاہر فرمائے ہیں ان کو پڑھ کر دلی افسوس ہے، ہندوستان اور پاکستان کے اس نازک ترین اور تاریک دور میں "نئی روشنی" فی الحقیقت "نئی روشنی" بن کر افق ادب و صحافت پر نمودار ہوا تھا۔ ہمیں یہ دیکھ کر کہ آپ جیسے حضرات جن کی عمر کا بیشتر حصہ قوم کی مخلصانہ خدمت اور اس کی ترقی کی سعی میں بسر ہوا ہے، اپنے محدود دائرے کو چھوڑ کر اصلی تعمیری کاموں میں لگ گئے ہیں کچھ اطمینان سا ہو گیا تھا مگر آپ کے ۱۶ر اگست کے "تکلف برطرف" کو پڑھ کر جو قلبی تکلیف محسوس کر رہا ہوں وہ احاطۂ الفاظ سے باہر ہے، میری دلی دعائیں آپ کے

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

چولے

سید سفارش حسین

(۱)

ایک تھا محنتی، ایک تھی محنتن......

کیا کہا؟...... ایک تھا راجہ......

ایک تھی رانی...... ٹھیک ہے، ہماری کہانیاں تو راجہ رانی سے شروع ہوتی ہیں، پر یہ کہانی تو اس وقت کی ہے جب راجہ تھا ہی نہیں۔ دنیا میں بس محنتی تھے کام کرنے والے، محنت کرتے اور پیٹ بھرتے۔

مزدور؟ نہیں اس وقت بھاڑے کے ٹٹو ہو کر کام کرنے کے مزدور بھی نہ تھے۔ یوں سمجھ لو کہ سب محنتی تھے کالے، گورے، لال، پیلے، سارے کے سارے محنتی۔ پر محنت کرتے تو اپنی اور کام کرتے تو اپنا۔ اپنی زمینیں تھیں، کام کرنے کے اوزار اپنے تھے، ڈھور ڈنگر اپنے تھے، زندگی کا سارا سامان اپنا تھا، سارا جیون اپنے لئے تھا، جیتے تو اپنے لئے اور مرتے تو اپنے لئے......

تو یہ محنتی اور محنتن اپنے گھر میں رہتے، کرائے کے گھر تو اس وقت تھے نہیں، اور ان کا گھر تھا بھی تو بہت بڑا، اولاد بھی تو بہت تھی، وہ جنھوں لڑکے اور لڑکیوں کی تو کچھ مت پوچھو، بے گنتی تھیں، بے گنتی، اور پھر ڈھور ڈنگر بھی تو اسی میں رہتے۔

صبح سویرے، سورج نکلنے سے پہلے کچھ کھیتوں پر چلے جاتے، کچھ ڈھور ڈنگروں میں لگ جاتے، جو بچ رہتے وہ گھر کا کام دھندا سنبھالتے۔ اس طرح سب محنت کرتے، جب فصل پک جاتی تو بچے، جوان، بوڑھے، عورت، مرد سب ہی کھیتوں میں گھر جاتے۔ سانس لینے کی مہلت نہ ملتی، فصل کاٹتے، گاہتے، اور اناج سمیٹ کر گھر لاتے پر یہ سب کچھ یوں ہی نہ ہو جاتا، محنت کا پھل دیکھ کر محنتیوں کا دل بلیوں اچھلنے لگتا، بال کے بوجھ سے جھکے ہوئے گیہوں کے سنہرے پودے کو ہوا کے ساتھ ناچتے دیکھا تھا۔ صبح سویرے اٹھ کر پنچھیوں کو گاتے سنا تھا۔ محنتیوں کے دل میں بھی امنگ اٹھتی، وہ گیہوں کے پودوں کی طرح ناچتے، پنچھیوں کی طرح گاتے اور یہ ناچ گانا اس وقت تک ہوتا جب تک ناچ اٹھ کر گھر میں نہ آ جاتا۔ پھر آم کے بور کی خوشبو سے کوئل مست ہو جاتی، بے خود ہو کر کسی کو پکارتی، کبھی اس ڈال پر کبھی اس ٹہنی پر، پپیہا اس پکار کو سنتا تو دوڑا ہوا آتا، دونوں مل کر ناچتے، گاتے۔ گرمیوں کے دن کوئل کو پیاس لگتی، ادھر ادھر دیکھتی تو زمین بالکل سوکھی، پانی کا نام تک نہیں، تال تلیا سب خشک، پپیہے سے کہتی "مجھے پیاس لگی ہے"

وہ چیخ چیخ کر اس کو بلاتا، چلا چلا کر آسمان سر پر اٹھاتا تو ایک طرف سے کالے کالے بادل، ہاتھی جیسے بھاری بھرکم، جھومتے جھامتے اندھیری چھائے کرتے اور دم کے دم میں سارے جل تھل بھر جاتے کوئل پیاس بجھاتی اور پھر دونوں ناچنے گانے لگتے۔

پپیہا ان کی آواز میں ایک درد سا ہوتا، جس سے ٹیس سی اٹھتی۔ بھولوں کے دلوں پر چوٹ لگتی، من میں ہوک سی اٹھتی اور کوئی نیم تلے اور کوئی پیپل کے نیچے اور کوئی برگد کے سایے میں کھڑی ہو جاتی، اور دل ہی دل میں جانے کیا سوچتی، من ہی من میں کچھ ٹٹولتی، اور بار بار ادھر ادھر گردن پھرا کر کسی کو ڈھونڈھتی اتنے میں کوئی آ جاتا، پیروں کی آہٹ سے یہ ڈر سی جاتی بدن سن سے ہو جاتا۔ دمکتے مکھڑے اور چمکتی آنکھوں کا رنگ اڑ جاتا، مگر تُرت ہی اڑا ہوا رنگ اور کھوئے ہوئے حواس پلٹ آتے۔ اب گالوں پر سرخی نہ جانے کہاں سے آ جاتی، ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی۔ جب لمبے اور بھرے بھرے بازو پھیلتے تو جیسے انگور کی بیل انار کے درخت پر چڑھ جائے۔ یہ نویلی ماں سے کہتی "ماں! گھر بنائیں گی۔" اب کیا تھا دھوم دھڑکا شروع ہو جاتا ایک اور گھر بننے کی تیاری، آس پاس، ادھر ادھر کے لوگ جمع ہوتے، جو آتا پوچھتا، "چین بھیا کیا حال چال ہے؟" چین ہنس کے جواب دیتا۔ "بھیا سکھ دیکھے تو چین ہی چین ہے۔ پر نہ جانے کیوں کچھ چنتا سی رہتی ہے، تم کہو؟" وہ کہتا "ویسے تو سکھ ہی سکھ ہے پر چنتا نہ جانے کیوں رہتی ہے؟"

اتنے میں ایک اور آ جاتا اور وہ سب ہی سے کہتا "کہو چین بھیا کیا حال چال ہیں؟" یہ جواب دیتا "آنند بھیا چین ہی چین ہے پر......" وہ بیچ میں بول اٹھتا "آنند ہوتے ہوئے بھی یہ چنتا نہ جانے کیوں رہتی ہے؟"

نیا گھر بننے کی تیاریاں پوری ہو جائیں تو ناچ رنگ کی محفل جم جاتی، نئے گھر کے سنگھی ساتھی بیچ میں بیٹھتے یہ ناچ گانا فصل کے ناچ گانے سے مختلف ہوتا ابلائیں آنکھوں میں کامنائیں لئے ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ کے ساتھ نرم نرم شاخوں کی طرح لچکتیں۔ نازک نازک ٹہنیوں کی طرح جھومتیں یا جوانوں کے قوی بازو لہروں سے ہم آغوش ہونے کے لئے جب ساحل کی طرح پھیلتے تو یہ موجوں کی طرح اپنا دامن بچا کر نکل جاتیں مگر دل میں کسک سی ہوتی۔ ناچ رنگ ختم ہوتا، سنگھی ساتھی کھڑے ہوتے، پہلے سنگی ساتھی سے کہتا۔

"تو نے جوبن میں جوت جگائی ہے اسے کبھی نہ بجھنے دول گا۔"

> ہرے بھرے کھیت پھر لہلہائے، چاند ہنسا، تارے مسکرائے، سورج کھلکھلایا، ہوا اٹکھیلیاں کرنے لگی۔ ندی گنگنائی آبشاروں کی تان اونچی گئی، اور زندگی میں پھر سے بہار آ گئی۔ آم میں بور آیا، نیم میں کھڑی پھولی کوئل کی پکار اور پپیہے کی رٹ سے کان پٹی آواز نہ سنائی دیتی۔ گیہوں کی بال سونے سے بھر گئی پر نہ جانے کیوں محنتیوں کے دل بیٹھے بیٹھے سے، جی کچھ بجھا بجھا سا رہتا۔

اب ساتھی سنگی سے کہتی۔

"تو نے دل میں امید کا جو دیا جلایا ہے اسے سدا روشن رکھوں گی۔"

اور پھر جیسے گنگا جمنا مل گئی ہوں، چین سکھ اور آنند ایک طرف بیٹھے چنتا کا کھوج لگا رہے تھے......

رات دن پلٹا کھاتے رہے، وقت گزرتا رہا مگر چنتا کا کھوج نہ لگنا تھا نہ لگا، ایک دن آندھی آئی کالی پیلی آندھی، ایسی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے، بھونچال آیا، ایسا بھونچال جیسے اس زمین کے پر لگ گئے ہوں۔ اور یہ اڑ کر سورج سے چمٹ جائے گی، مینہ برسا بالکل لال لال جیسے خون، ساری زمین جو خون خون ہو گئی، آدمی، جانور، پیڑ، پنچھی سب خون کے دریا میں بہہ گئے، پھر آہستہ آہستہ آندھی چھٹی، بھونچال تھما اور بارش رکی جب سکون ہوا۔ اور اطمینان ہو گیا کہ آئی ٹل گئی اور مصیبت ہٹ گئی تو پھر لوگ ادھر ادھر سے آ کر جمع ہونے مگر حال سب کا پتلا تھا، بس ہڈی اور کھال سوکھ کے کانٹا ہو گئے تھے۔ سینے کی چوڑائی سمٹ سمٹا کر پسلیوں میں آ گئی تھی۔ گال پچک گئے تھے، بھرے بھرے بازو، چوڑی چوڑی کلائیاں، موٹی موٹی رانیں اور گتھی ہوئی پنڈلیاں بالکل ایسی ہو گئی تھیں جیسے بانس کی چھڑ، گھر چلے آ رہے تھے گھسٹتے ہوئے رینگتے ہوئے، لڑکھڑاتے، ڈگمگاتے، گرتے پڑتے اٹھتے بیٹھتے گھر چلے آ رہے تھے اور یہ خبر تک نہ تھی کہ جا کدھر رہے ہیں اور نہ یہ معلوم تھا کہ جانا کہاں ہے۔ آخر چلتے چلتے ایسی جگہ پہنچے جہاں سے دو رستے ہو گئے تھے، یہاں پہنچ کر سب رک گئے کہ کیا کریں کدھر جائیں؟ کون سی راہ اختیار کریں؟ سب اسی سوچ بچار میں تھے کہ چین آگے بڑھا اور ایک طرف چل دیا، پھر تو جدھر جس کا منہ اٹھا چل کھڑا ہوا۔ چین ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اسے ایک آدمی کچھ اونچی سی جگہ بیٹھا دکھائی پڑا، ذرا اور آگے بڑھا تو دیکھا کہ کچھ لوگ پیچھے کھڑے ہیں، وہ بھی ان میں مل گیا، اونچی جگہ بیٹھا ہوا آدمی کہہ رہا تھا۔

"دیکھو بیٹا جو کچھ ہونا تھا سو تو ہوا، اب آگے کی سوچو اور وہ صورت نکالو کہ اگر ایسی مصیبت پھر آئے تو ہم تم یوں تباہ نہ ہوں۔"

بات چھوٹی سی تھی اور جلد ہی ختم بھی ہوگئی۔ چین نے برابر والے سے اور بیٹھنے والے کا نام پوچھا تو اس نے بتایا "چین سکھ" اور جب اس کا نام پوچھا تو کہا "سکھ آنند"۔

چین کو نام اچھے سنائی سے لگے۔ پر تھے ذرا بدلے ہوئے سے، اس نے سوچا شاید انتظام کے لئے ایسے ہی نام ہوں۔

سننے والوں میں سے ایک نے پوچھا "تو کریں کیا؟"

چین سکھ نے جواب دیا "یہی کہ جو پیدا کرو اس میں سے تھوڑا وقت بے وقت کے لئے نکال کر الگ رکھ دو، تھوڑا تھوڑا بہت ہو جاتا ہے، اس لئے ایک آدمی اس کی دیکھ بھال کر لیا کرے۔" ایک نے دوسرے کو دیکھا، کچھ سوچا پھر سکھ آنند بولا، "چین سکھ تم ہی یہ کام کرو اور کون اس کھٹراگ میں پڑے گا ہم تو اپنا حصہ تمہارے آگے ڈال دیا کریں گے۔" چین سکھ نے کچھ سوچا، پھر سنبھل کے بیٹھا اور بولا "جو تمہاری ایسی مرضی ہے تو میں تم سب کے کہنے سے باہر نہیں ہوں پر مجھے اپنے کام کاج سے مہلت کہاں ملے گی؟"

پھر ایک نے دوسرے کو دیکھا، کچھ سوچا، سوچ بچار ہو ہی رہا تھا کہ ایک بولا "چین سکھ کا حصہ بھی نکالو جو اُسے کام دھندے سے چھٹکارا ملے۔"

یہ بات سب نے مان لی۔

ہرے بھرے کھیت پھر لہلہائے، چاند ہنسا، تارے مسکرائے، سورج کھل کھلایا، ہوا اٹکھیلیاں کرنے لگی، ندی گنگنائی، آبشاروں کی تان اونچی ہوئی اور زندگی میں پھر سے بہار آگئی۔ آم میں بور آیا، نیم میں کھوڑی پھوٹی، کوئل کی پکار پپیہے کی رٹ سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی، گیہوں کی بالیں سونے سے بھر گئیں پر نہ جانے کیوں محنتیوں کے دل بیٹھے بیٹھے سے، بجھے بجھے سے، کچھ سہما سہما سا رہتا۔ بادل آتے، بارش ہوتی مگر نہ جانے کیوں ابلائیں بادل کی گرج سے سہم جاتیں، بجلی کی کڑک سے ڈرتیں اور جب بارش ہوتی تو وہ ادھر ادھر چھپتی پھرتیں، دل میں ٹیس اٹھتی، دب دب سی جاتی من میں ہوک اٹھتی اور گھٹ سی جاتی۔ ہاں جب پورن ماشی کا چاند نہا دھو کر سولہ سنگھار کر کے نکلتا تو یہ گھنٹوں اُسے تکتیں اور ایسا لگتا جیسے اس سے باتیں کر رہی ہوں۔

پھر ایک دفعہ یہ ہوا کہ کسی کے ہاں پیداوار کم ہوئی اور جب اس میں سے حصے نکل گئے تو ان کے پاس بہت تھوڑا ناج بچا، اتنا تھوڑا کہ گزر مشکل ہوگئی۔ وہ کہ کچھ پڑوسی کے چھپر پرانے ہوگئے تھے اور اپنے گھر کی دیواریں بھی اونچی کرانی تھیں۔ ایسے کاموں میں اب اس کا جی نہ لگتا، اس نے ان سے کہا کہ میرا کام کر دو میں تمہیں ناج دوں گا۔ ایک کا ناج بالکل ختم ہو گیا تھا۔ وہ برابر والے کے گھر پہنچ گیا اور ضرورت بھر ناج نکال لایا۔ سب سوچنے لگے کہ کیا کریں، آخر سب چین سکھ کے پاس گئے، وہاں پہنچا تو دیکھا کہ پہلے ہی سے بہت محنتی اکٹھے ہیں اور یہی بات چیت ہو رہی ہے، بہت سوچ بچار کے بعد چین سکھ نے کہا "دیکھو بھئی، جو کسی سے کام لے تو بدلے کا ناج دے، کتنا، یہ وہ آپس میں طے کر لیں، جو کسی کے گھر سے ناج نکالے گا وہ چور رہے گا اور سزا پائے گا۔"

محنتیوں نے چین سکھ کی باتیں سنیں تو وہ چپ سے ہوئے، پھر ایک نے دوسرے کو دیکھا اور کچھ سوچا، ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ جو محنتی ناج نکال کر لایا تھا بولا "جس کا ناج نبڑ جائے اسے جمع کئے ہوئے ناج میں سے ملنا چاہئے۔" چین سکھ جلدی سے بولا "نا بھائی وہ تو وقت بے وقت کے لئے ہے، کیسی بھئی محنتیو کیا کہتے ہو؟" سب بول اٹھے "چین سکھ کی بات پکی ہے، وہ تو وقت بے وقت کے لئے ہے۔"

اب دنیا میں مزدور بھی ہونے لگے اور چور بھی۔ چین پر کیسے اپنے کھیتوں اور ڈھور ڈنگروں میں مگن رہتا، سدا چین کی بنسی بجاتا، اب چنتا اور بپتا کے جال میں ایسا پھنسا کہ سارا چین بھول گیا۔ جب بیتے دن یاد آتے تو راتوں کی نیند اڑ جاتی، کھانا پینا حرام ہو جاتا اور اس کا جی چاہتا کہ گزرے دن پھر لوٹا لائے، کیسے؟ یہ اس کی سمجھ میں نہ آتا۔

چین سکھ کے پاس اب روز کئی کئی چوری کے مقدمے جاتے، مزدوری کے جھگڑے پہنچتے، اور لوٹ مار کی وارداتیں آتیں، اس نے بھی اپنا کاروبار بڑھا لیا تھا، اب وہ راجہ ہو گیا تھا اور سکھ آنند اس کا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔ بہت سی باتیں تو سکھ آنند ہی نپٹا دیتا اور کئی تو اس تک بھی نہ پہنچتیں، سنتری اور رکھوالے ہی چکا دیتے، پھر بھی لوگوں کی چنتا دور نہ ہوئی۔

چین اب گھر کے دروازے پر آنکھیں بند کئے گہری سوچ میں بیٹھا تھا بہت گہرے خیال میں شاید وہ سوچ رہا تھا کہ بیتے دن کبھی لوٹیں گے بھی؟ بیٹھے بیٹھے اسے اونگھ آگئی ہو، لیکن فوراً ہی گھبرا کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ سامنے لمبی جٹا والے باباجی کھڑے ہیں، باباجی بولے "بھگوان کا نام لے بیٹا۔ بھگوان کا نام لینے سے دھرمی بن جاؤ گے بھگوان تمہاری چنتا مٹا دیں گے۔"

باباجی نے جو کچھ کہا، چین کی سمجھ میں کچھ نہ آیا پھر بھی "چنتا مٹا دیں گے" یہ الفاظ اس نے دو تین مرتبہ اپنے دل میں دہرائے، اس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا، اس کے جی میں آیا باباجی سے چمٹ جائے انہیں گود میں اٹھا کر ناچنے لگے، اس نے زور سے کہا "چنتا مٹا دیں گے؟" اور وہ باباجی کی طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ باباجی نے بڑے پریم سے کہا "ہاں بیٹا، چنتا مٹا دیں گے۔"

چین نے گھٹنے رگڑے، جھجکتے جھجکتے کہا۔ "بھگ...... وان"

اب تو جدھر دیکھو لوگ بھگوان، بھگوان پکارتے کالے، گورے، لال، پیلے سب کے سب بھگوان کے نام کی مالا جپتے اور مگن رہتے، بھگوان سب کی رکشا کرتے ہیں، بھگوان چنتا مٹاتے ہیں، یہی رٹ لگی رہتی [illegible] اور چوروں کی تعداد بڑھتی ہی گئی۔

چین سکھ کو اب کوئی نام نہ لیتا، سب اُسے راجہ کہتے، اس کی چوپال پر میلہ سا لگا رہتا، ٹھٹ کے ٹھٹ بیٹھے رہتے، کچھ مزدور، کچھ بے کار، کچھ بھکاری، کبھی انہیں راجہ کے گھر سے کچھ مل جاتا، کبھی راجہ کہیں سے دلا دیتا اور کبھی یہ خود مار کھاتے۔ اس طرح یہ اپنے دن بتاتے اور اس کے گن گاتے۔ راجہ بھی بڑا کائیاں ہو گیا تھا اس نے تاڑ لیا تھا، اس لئے وہ بے سہولت کے لئے انہیں لگائے رکھتا۔ دوسرے راجہ کی گھوڑی پر اس کا دانت تھا اور وہ تھی بھی ایسی ہی، گھوڑی کیا تھی پری تھی پری۔ اس نے بڑی کوشش کی، ہزاروں اپائے کئے، لاکھوں جتن کئے پر اس راجہ کو گھوڑی دینی تھی نہ دی۔ یہ بھی گھات میں لگا رہا اور ٹھان لی کہ گھوڑی نہ لی تو میرا بھی نام نہیں، پر ایک مشکل تھی وہ تھا لال راجہ اور تھا بھی بڑا سیانا۔ اس نے اس راجہ کے تیور بھانپ لئے تھے، گھوڑی کی طرف سے اُسے بھی کھٹکا تھا اس لئے وہ سدا چوکنا رہتا، انتظام بھی اس نے اچھا خاصا کر لیا تھا، سارے راج کی ناکہ بندی کر رکھی تھی کیا مجال کہ غیر آدمی بغیر روک ٹوک گزر تو جائے، اور گھوڑی کو تو ایسی جگہ رکھا تھا کہ پرندہ پر بھی نہ مار سکے۔ پر یہ راجہ بھی کچھ کم نہ تھا، اس نے لال راجہ کو پھانسنے کی ترکیب نکالی، اس کی ایک بیٹی تھی بہت حسین، بڑی ہی سندر، جیسے چاند کا ٹکڑا، چاروں طرف اس کی خوبصورتی کی دھوم تھی۔ اس نے لڑکی کے بیاہ کا ڈھنڈورا پٹوایا، بیاہ کے دن بہت سے راجہ آئے، پر لال راجہ نہ آیا، اُسے پہلے ہی اس کا اندازہ تھا کہ لال راجہ نہ آئے گا، اس لئے اس نے لال راجہ کی مورتی بنوا کر محفل میں کھڑی کر دی تھی راجاؤں نے پہلے تو اپنی بہادری کے کرتب اور ہتھیار کے جوہر دکھائے۔ پھر محفل میں آئے تو لال راجہ کی مورتی دیکھ کر کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ بھید کیا ہے لیکن جب لڑکی نے مالا اس مورتی کے گلے میں ڈالی تو یہ راز کھلا۔

بات یہ تھی کہ اس زمانے کا قاعدہ تھا کہ لڑکی جس کے گلے میں مالا ڈال دے، اُسے لڑکی سے بیاہ کرنا پڑتا اگر کوئی موجود نہ ہو یا نہ آسکے تو اس کی مورتی رکھوا دیتے۔ اگر کوئی بیاہ کرنے سے انکار کر دے تو یہ لڑکی کی بڑی بے عزتی سمجھی جاتی۔ لال راجہ کو جب اس کی خبر ملی تو وہ بہت گھبرایا، وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے لڑکی سے شادی کی تو اُسے تحفہ دینا پڑے گا۔ اس چال سے وہ سمجھ گیا تھا کہ لڑکی تحفہ میں گھوڑی ہی مانگے گی اور گھوڑی وہ دینا نہ چاہتا تھا سوچتے سوچتے ایک ترکیب اس کی سمجھ میں آئی، اس کے راج میں ایک بھگوان سیوک بھی تھے وہ ان کے پاس گیا اور نہ جانے کیا پٹی پڑھائی کہ وہ اس کے ساتھ ہو لئے۔ پیچھے جٹائیں زمین پر گھسٹتے

تھیں۔ ڈاڑھی ناف تک دستِ صاف کرتی چلی رہی تھی اور پلکیں گھٹنوں کی گرد جھاڑ رہی تھیں۔ راجہ کے ساتھ بھگوان سیوک کو دیکھ کر خلقت اُمڈ آئی۔ آدمیوں کے جلسے دل ٹوٹے پڑتے تھے، عورت، مرد، بوڑھے، بالے سب ہی آ رہے تھے، پہنے والی لال۔ ایک جگہ بھگوان سیوک رک گئے اور اوپر کی پلکوں کو اٹھایا، پلکوں کا اٹھانا تھا کہ سب نے بے کار دھڑا دھڑ زمین پر گرنا پڑے۔ راجہ نے بھی گردن جھکا لی۔ بھگوان سیوک نے پہلے سب کو آشیرباد دی، پھر ٹھہر ٹھہر کے بولے "بھگوان کا ایک روپ ہے، اس کا حکم ماننا دھرم ہے" اور انھوں نے پلکیں گرا دیں۔ زمین پر پڑے ہوئے لوگ جب اٹھے تو انھوں نے دیکھا راجہ ہی راجہ ہے۔ بھگوان سیوک نہیں ہیں، لوگ زور زور سے چلانے لگے "بھگوان کی جے، راجہ کی جے"۔

ادھر مہاتما جب اپنا جاؤں خالی جاتے دیکھا تو ایک نیا پینترا بدلا، بھگوان سیوک درشن دیں گے، اب کیا تھا جسے دیکھو درشن کرنے چلا آ رہا ہے کسے پر چادر، ایک کرتے میں ستر پیوند ہے ہیں۔ منہ گرد سے اٹا ہوا، کچھ لوگ کئی کئی دن چل کر آئے تھے، آدمیوں کی کچھ مت پوچھو میلوں سر ہی سر دکھائی دیتے، تھالی پھینکو تو سر ہی سر پر چلی جائے، یوں سمجھ لو کہ آدمیوں کا سمندر ٹھاٹیں مار رہا تھا، پاس ہی ایک چھوٹا سا ٹیلا تھا، بھگوان سیوک کو لے کر راجہ اس ٹیلے پر چڑھ گیا، جب بھگوان سیوک نے پلکیں اُٹھائیں تو سب زمین پر گر پڑے۔ راجہ بھی زمین پر گر پڑا، مگر گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھتا جاتا، وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا "بھگوان چنتا مٹاتے ہیں" بھگوان سیوک نے سب کو زمین پر پڑا دیکھا تو اس کا چہرہ چمکنے سا لگا۔ انھوں نے سب کو آشیرباد دی اور بہت تھم تھم کر کہا "ابلا کی بے عزتی سب سے بڑا پاپ ہے۔ دھرم کا پہلا کام پاپ کو مٹانا ہے"۔ بات ختم ہوئی اور لوگوں نے زمین سے سر اٹھایا تو دیکھا کہ بھگوان سیوک ہوا میں اڑے جا رہے ہیں، اب کیا تھا لوگ پاگل سے ہو گئے، زور زور سے چلانے لگے "بھگوان کی جے، راجہ کی جے"۔

(باقی آئندہ)

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

بلکہ بہت سے ہندو بھی ایسے ہیں جو ایک غیر ملکی ریاست کے باشندے کی حیثیت سے اس انتخاب پر اعتراض کر سکتے ہیں۔ ہمیں یقیناً ہر مذہب کے عقیدوں، پیغمبروں، دیوتاؤں کا احترام کرنا چاہیئے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سرکاری اور سیاسی امور میں کسی خاص مذہب سے تعلق رکھنے والی چیزیں جگہ پائیں اور دوسری وہاں بار نہ پا سکیں۔ اگر ہمارے ٹکٹوں پر گنیش کی تصویر بنائی جا سکتی ہے تو کیا منطق اور انصاف کی رو سے حکومت اس بات کے لئے تیار ہو گی کہ بعض ٹکٹوں پر حضرت عیسیٰ کی تصویر بنائے اور بعض پر کلمہ لا الٰہ الا اللہ لکھے؟ آخر مسلمان اور عیسائی بھی تو اس حکومت میں برابر کے شریک ہیں اور اس کے پورے شہری ہیں، لیکن اگر وہ اس کے لئے تیار نہیں تو ان کو احتیاط کرنی چاہیئے کہ وہ کسی گروہ کے ساتھ خواہ وہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو کسی قسم کی پاسداری جائز رکھیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہندو یا مسلمان یا سکھ یا عیسائی یا پارسی پوری آزادی یا دوسرے لوگوں کے احترام کے ساتھ اپنے مذہبی اعمال اور عبادات کو پورا نہ کریں لیکن وہ ان کی ذاتی زندگی کا دائرہ ہے، سیاسی زندگی سے ان کا کوئی رشتہ نہیں ہے........ مگر میں کسی طرح یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ اگر کسی پبلک بات کا تعلق ہندو مذہب یا تہذیب سے ہو تو وہ جائز ہے اور اس کا کوئی خاص نوٹس نہیں لینا چاہیئے، لیکن اگر اسی قسم کی کوئی چیز کسی دوسرے مذہب سے متعلق ہو تو اس کو قابلِ اعتراض قرار دیا جائے، ہندوستان، پاکستان بلکہ ساری دنیا میں اکثریت کو بڑی رواداری اور دلنوازی کا سلیقہ سیکھنے اور برتنے کی ضرورت ہے۔ اسی میں امن اور سلامتی اور شریفانہ زندگی کا بھید چھپا ہے۔

خط لکھتے وقت، خریداری نمبر لکھنا، نہ بھولئے
(منیجر)

"نئی روشنی" کے پروانے

(بہ سلسلہ صفحہ ۸)

آپ کے بلند مقاصد کے اور آپ کے پرچے کے ساتھ ہیں۔ میں آپ کے پرچے کے خریدار زیادہ سے زیادہ پیدا کرنے کی انتہائی کوشش کروں گا اور مالی امداد بھی انشاء اللہ ضرور کی جائے گی، کارِ لائقہ سے ضرور بالضرور یاد فرمائیں

فقط آپ کا ایک دور افتادہ ہمدرد

کراچی (پاکستان)　　　　عزیز الکلام

جناب منیجر صاحب، تسلیم

گذارش ہے کہ ۱۹ اگست کے پرچے میں "نئی روشنی کے قدردانوں سے" ایڈیٹوریل پڑھا، عزم بالجزم کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ بہرحال جب سے میں نے نئی روشنی کے بند ہونے کے بارے میں پڑھا بہت افسوس ہوا کہ آج کل ہمارے ملک کو ایسے نادر و کمیاب رسالوں اور اخباروں کی ضرورت ہے جو ملک کو صحیح راستے پر تعمیر کی طرف لے جانے والے ہوں۔ بلاشبہ "نئی روشنی" ان میں سے ایک ہے اور اس کا بند ہونا ملک کی تعمیر میں کمی پیدا ہونا ہے، بہرحال جس طرح بھی ہو نئی روشنی کو بند نہ کیا جائے، میں بہت شرمندہ ہوں کہ آپ کی مالی امداد کے قابل نہیں اب سے ایک سال پہلے اس قابل تھا کہ کافی مدد کر سکتا تھا مگر اب زمانے کے انقلابات نے اس قابل بھی نہیں چھوڑا کہ کوئی امداد کر سکوں، میرے لئے یہ نئی روشنی کا زرِ چندہ بھی بارِ گراں اور اپنا پیٹ کاٹنا ہے

میں کچھ اخلاقی امداد اس طرح کر رہا ہوں کہ چند پتے لکھے دیتا ہوں، پوری امید ہے کہ یہ آپ کے خریدار ضرور بنیں گے۔

میرٹھ　　　　نور الدین احمد

ادارہ تحریر

ڈاکٹر سید عابد حسین ۔ صالحہ عابد حسین

عبداللطیف اعظمی

تاریخ اشاعت: یکم [illegible]

چندہ سالانہ ۱۰ ششماہی ۵

شرح چندہ غیر ممالک

ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دوسرے ملکوں کے لئے نئی روشنی کا چندہ حسب ذیل ہے

سالانہ ... ... دس روپے

ششماہی ... ... ساڑھے پانچ روپے

فی پرچہ ... ... چار آنے

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۳ نمبر ۱۲	۲۴ ستمبر ۱۹۴۹ء	ایڈیٹر: ڈاکٹر سید عابد حسین

اپنا قصور دوسروں کے سر

(اپنا قصور دوسروں کے سر منڈھ دینا بچپن کا فطری تقاضا ہے۔ اس سے بچے کو زندگی کی مشکلیں سہنے میں مدد ملتی ہے لیکن اگر انسان بڑا ہونے کے بعد بھی یہ حرکت جاری رکھے تو یہ مالیخولیا کی علامت ہے اگر وہ اس پر قابو پائے تو اس کی اخلاقی اور ذہنی ترقی رک جاتی ہے اور تنزل شروع ہو جاتا ہے۔)

ایک چھوٹے سے بچے کے ہاتھ سے اس کا محبوب کھلونا ٹوٹ جاتا ہے وہ کیا کرتا ہے کہ جو کوئی اس کے پاس ہو اسے مارتا ہے، نوچتا ہے یا اس سے چمٹ کر رونے لگتا ہے۔ چاہے وہ کہے یا نہ کہے مگر اس کا مطلب یہ ہوتا ہے "تم نے مجھ سے یہ کھلونا تڑوا دیا"!

ایک خاصی بڑی عمر کے بزرگ چھوٹی سی ہتھوڑی ہاتھ میں لئے تصویر کے فریم میں کیلیں ٹھونک رہے ہیں۔ مگر اُن کا ذہن برسرِ حکومت سیاسی پارٹی کی اصلی اور فرضی خامیوں کے تصور میں محو ہے۔ ہتھوڑی والا ہاتھ ذرا بہکتا ہے دوسرے ہاتھ کے انگوٹھے اور کلمے کی انگلی پر زور کی چوٹ پڑتی ہے۔ آنکھوں میں تارے چمک جاتے ہیں اور زبان سے بے ساختہ نکل جاتا ہے "ہائے تیری گورنمنٹ کی ایسی تیسی!" اس سے انھیں کچھ تھوڑی سی تسکین ضرور ہوتی ہے، مگر وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ قصور ان کا اپنا ہے۔ مگر ایک مالیخولیا کا مریض جسے یہ خبط ہو کہ ساری دنیا اس کی دشمن ہے بچوں کی طرح خیال اور واقعے میں فرق کرنے سے معذور ہوتا ہے۔ وہ سچ مچ اپنی خطا کو دوسروں کی خطا سمجھتا ہے، اپنے عیب دوسروں میں دیکھتا ہے

ایک بیوی اس وہم میں مبتلا ہیں کہ ان کی سہیلیاں اُن کے میاں پر مرتی ہیں اور خود ان سے جلتی ہیں کہ کم بخت کو ایسا اچھا شوہر کیوں ملا۔ یہ خیال اُن کے دماغ پر اس طرح مسلط ہے کہ ہر وقت غریب شوہر کی نقل و حرکت کی نگرانی کرتی رہتی ہیں اور اس غریب کی زندگی دشوار کر دی ہے۔ دراصل ان خاتون کو اپنی کم تری کا بہت زیادہ احساس ہے اور وہ خود اپنی سہیلیوں سے (جو ان سے کم عمر ہیں اور ان کے خیال میں مردوں کے لئے زیادہ کشش رکھتی ہیں) جلتی ہیں اور انھوں نے غیر شعوری طور پر اپنے احساس کم تری کو اپنی سہیلیوں کی طرف منتقل کر دیا ہے

کبھی کبھی ایک پوری قوم یا جماعت اپنے احساس کم تری کو دباتے دباتے اس طرح کے مالیخولیا میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ جرمن قوم ۱۹۱۸ء کی شکست کے بعد عقدہ کم تری کے پیچ میں ایسی الجھی کہ یہودیوں سے نفرت کرنا اور ان کو ستانا اس کی قومی پالیسی بن گئی اسے دل سے یقین ہو گیا تھا کہ یہودی بہ حیثیت جماعت سچ مچ نفرت اور حقارت کے قابل ہیں۔ وہ اس نفسیاتی حقیقت سے آشنا نہیں تھی کہ صرف انھیں لوگوں کو جو اپنے آپ کو حقیر سمجھتے ہیں اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ دوسروں کی تحقیر کریں، باقی سب لوگ دوسروں کے ساتھ رواداری اور انصاف کا سلوک کرتے ہیں۔

فرض کیجئے ایک شخص دوسرے کو قتل کر دیتا ہے۔ بہت سے لوگ اس کی اس حرکت کو برا سمجھتے ہیں اور اسے سزا کے قابل جانتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ انھیں افسوس بھی ہوتا ہے کہ اس کم بخت نے یہ کیا کر دیا، دوسرے کی جان لی اور اپنی جان کھوئی۔ مگر بعض لوگوں کو اس قدر طیش آتا ہے کہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں، ان کا بس نہیں چلتا کہ قاتل کو کچا چبا جائیں۔ اگر آپ تحقیق کریں تو معلوم ہوگا کہ ان حضرات کے دل کی گہرائی میں خود قتل کی خواہش چھپی ہوئی ہے۔

معقول آدمی جو اپنی خواہشوں اور کمزوریوں کا پورا احساس رکھتے ہیں اور ان کو قابو میں رکھ سکتے ہیں، دوسروں کی بری حرکتوں سے آگ بگولا نہیں ہو جاتے۔ وہ نہ تو ان کی حرکتوں کو جائز قرار دیتے ہیں اور نہ خواہ مخواہ ان پر لعن طعن کی بوچھار کرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح ہم اپنے عمل میں آزاد ہیں اسی طرح دوسروں کو بھی آزادی ہے کہ اپنی راہ عمل خود متعین کریں۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنے سامنے بڑا اونچا اور سخت اخلاقی معیار رکھتا ہے، اور اپنے دامن کو خفیف سے خفیف آلودگی سے بچانے کی انتہائی کوشش کرتا ہے لیکن اخلاقی کمال کی راہ بال سے زیادہ باریک ہے۔ کبھی اس کے قدم کو لغزش بھی ہو جاتی ہے۔ بس پھر (بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

فہرست مضامین

قیمت فی پرچہ ۳

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

سالک ہندی

سیاست کا فیصلہ تو ہوگیا۔ لیکن وقت اور قانون قدرت کا فیصلہ ابھی باقی ہے۔ قانون قدرت تو یہ ہے کہ کسی ملک اور قوم کی زبان آسانی سے بدلی نہیں جا سکتی ......

آخر میں جیت تعصب اور تنگ دلی کی نہیں ہوگی رواداری اور فراخ دلی کی ہوگی۔ اگر ہم ان ذہنی اور اخلاقی ہتھیاروں کو اپنالیں تو باوجود اکثریت کی قوت کے میدان ہمارے ہاتھ رہے گا

قومی زبان کی جنگ

قومی زبان کی جنگ جو ہندوستان میں برسوں سے چھڑی ہوئی تھی، گاندھی جی کی برکت سے بہت مدھم پڑ گئی تھی اور ان کی زندگی کی آخری حصے میں اس بات کی اُمید بندھ گئی تھی کہ مختلف پارٹیاں اُن کے حق شناس فیصلے کو تسلیم کرلیں گی اور ہندوستانی ہندوستان کی زبان بن جائے گی، لیکن لیگ اور کانگریس کے جھگڑوں نے اس جھگڑے کو اور بڑھایا۔ تنگ خیال اور متعصب لوگوں کی بن آئی۔ اردو اور ہندی کی رسہ کشی میں ہندوستانی کے جان کے لالے پڑ گئے، اتنے میں ملک تقسیم ہوگیا۔ بٹوارے جس کی وجہ سے سارے ہندوستان میں غم اور غصّے کی ایک لہر دوڑ گئی، ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات خراب ہوگئے اور ہندوستانی کے دشمنوں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھاکر نہ صرف اردو بلکہ ہندوستانی کی مخالفت بھی زیادہ زور کے ساتھ شروع کردی، اردو کا تو یہ قصور تھا کہ وہ مسلمانوں کی زبان ہے" (ایسے وقت میں تاریخ اور واقعات کی چھان بین کون کرتا ہے، الزام لگاکر دہرا دیے جو تو بہت سے لوگ اس کو ٹھیک سمجھنے لگیں گے۔) اور ہندوستانی کا یہ قصور کہ اس میں اردو اور فارسی کا حصہ بھی ہے، مسلمانوں کی تہذیب اور تمدن کی جھلک بھی پائی جاتی ہے! اگر گاندھی جی زندہ رہتے تو وہ باوجود اس طوفانِ مخالفت کے اپنے استقلال سے، جو پہاڑ کی مانند تھا، اور اپنی شیریں زبانی کو جو نسیم بہار کی یاد دلاتی تھی انصاف کی لاج رکھ لیتے اور ہندوستانی اپنا پد سنبھال لیتی، لیکن جب وہ خدا کو پیارے ہوئے تو بہت سے وہ لوگ بھی جو برسوں تک ہندوستان کی حمایت کرتے رہے تھے یا ووٹ حاصل کرنے کی رو میں بہہ گئے اور تعداد کی اکثریت نے معقولیت اور حق پسندی پر فتح پائی۔ نہ پنڈت جواہر لال نہرو، بابو راجندر پرشاد اور مولانا آزاد جیسے بلند پایہ لیڈروں کی پیروی کام نہ آئی نہ آچاریہ ونوبا کاکا کالیلکر اور مشروالا جیسے گاندھی بھگتوں کا اعلان حق سر تیج بہادر سپرو کی وصیت اور وہ زبان جس کی گود میں حالی اور رتن ناتھ سرشار، پریم چند، اقبال اور چکبست، نظیر اکبر آبادی اور فراق گورکھپوری کے ادب نے پرورش پائی تھی، جس کو پنجاب کے لاجپت رائے، دہلی کے کیفی، الہ آباد کے موتی لال نہرو اور پنڈت مدن موہن مالویہ اور بہار کے سچدا نند سنہا اور بنگال کے سبھاش بوس اپنی ہی زبان جان کر بولتے تھے، جس میں آج بھی مشرقی پنجاب کا ہر ہندو اور سکھ اور دہلی، یو، پی، بہار، سی، پی اور راجستھان کا ہر پڑھا لکھا اور جاہل آدمی بات چیت کر سکتا ہے جسے بمبئی کے سردار پٹیل اور مرار جی ڈیسائی اپنی پبلک تقریروں میں استعمال کرتے ہیں، جس کے ذریعے کانگریس کے صدر پٹابھی اپنا مطلب سارے شمالی ہندوستان والوں کو سمجھاتے ہیں اور جس میں مہینوں تک ہمارے محبوب لیڈر کی شیریں، بھولی بھالی اور دل لگتی آواز دہلی کے ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوتی رہی — اس زبان کا یہ حق تسلیم نہیں کیا گیا کہ وہ قومی زبان بنائی جائے! فیصلہ آپ سن چکے ہیں۔ زبان ہندی ہوگی اور رسم خط دیوناگری۔ ہندوستانی کے لفظ سے ان اہل بصیرت کو "مانس گند" آتی ہے! لیکن بہرحال کانگریس پارٹی اور اسمبلی میں بعض حق پسند ایسے ہیں جن کی بدولت دبی زبان سے اس بات کو مانا گیا ہے کہ اس "ہندی" میں ملک کی دوسری زبانوں کا حصہ بھی ہوگا (محض بنارس کے سنسکرت دانوں کی شہنشاہی نہ ہوگی) اور ان زبانوں اردو زبان کو بھی ایک زبان تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ بات اس وجہ سے قابل ذکر ہے کہ ہمارے ملک میں بعض جید ادیب اور عالم ایسے بھی ہیں جو اردو کو ایک زبان ہی تسلیم نہیں کرتے (خواہ وہ اس کو خاصی فصاحت کے ساتھ بولتے ہوں!) اگر تعصب عقل کے دروازے اور دماغ کی آنکھ کو بند نہ کر دیتا تو غالباً کسی پڑھے لکھے تعلیم یافتہ شخص کو اس قسم کی بات کہنے کی جرأت نہ ہوتی! بہرحال موجودہ صورت یہ ہے کہ سیاست کا فیصلہ تو ہوگیا لیکن وقت اور قانون قدرت کا فیصلہ ابھی باقی ہے، قانون قدرت تو یہ ہے کہ کسی ملک اور قوم کی زبان آسانی سے بدلی نہیں جا سکتی۔ ممکن ہے آپ سرکاری کاغذات اور محنت سے تیار کی ہوئی "سنواد" کی تقریروں میں ایک مصنوعی زبان استعمال کر سکیں۔ لیکن بول چال کی زبان اور قبول عام ہی کی زبان ہوتی ہے۔ اس کو آپ ہندی کا نام دیں لیکن وقت کا تقاضا ہے کہ وہ ہندوستانی ہی رہے گی اور اس میں اردو کا جو حصہ ہے اس کو حکومت کے احکام اور اسمبلی کے ریزولیوشن بھی نہیں مٹا سکتے۔ لیکن ہمیں بھی اس معاملے میں وقت اور قوانین قدرت کی دستگیری کرنی ہوگی، جو لوگ ہندوستانی زبان کے حامی ہیں اور اردو کی ادبی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے نسقے اس وقت ایک اہم اور کٹھن فرض ہے انھیں ہندوستانی کی خدمت کو اپنے ذمے لینا چاہیے اور اس کو بڑھانے اور پھیلانے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔ یہ سمجھنا غلط ہے کہ بات ہمیشہ کے لئے بگڑ چکی ہے، گاندھی جی کے خاص حلقے میں ایسے لوگ ہیں جو اپنی کوشش کو جاری رکھیں گے۔ ہمیں اُن کے ہاتھ مضبوط کرنے چاہئیں اور یہ اُمید رکھنی چاہیے کہ جب ملک کی سیاسی فضا بہتر ہوگی تو حکومت اس بارے میں ایک زیادہ مناسب پالیسی اختیار کرے گی۔ ہمیں اس سلسلے میں دو باتیں کرنی ہوں گی۔ ایک تو اردو کو زیادہ آسان بنانا ہوگا تاکہ روزمرہ کے استعمال میں وہ ہندوستانی زبان کے تصور کے زیادہ قریب آسکے (ادب عالیہ اور شاعری کے متعلق میں مجھے زبردستی کی ٹھونس ٹھانس اور پابندیاں پسند نہیں) اور اس غرض سے ہندی اور دوسری ہندوستانی زبانوں کے مناسب اور قابلِ قبول لفظوں کو کھلے دل کے ساتھ اپنانا ہوگا۔ دوسرے ہمیں (یعنی ان لوگوں کو جو صرف اردو لپی جانتے ہیں۔ لیکن دیوناگری سے ناواقف ہیں) دیوناگری لپی کو سیکھنا چاہیے اور اس کے ذریعے اردو اور ہندوستانی کی اچھی اچھی چیزوں کو ملک میں پھیلانا چاہیے۔ ملک کے بہت سے حصوں میں اکثر لوگ صرف دیوناگری لپی ہی جانتے ہیں اور آگے چل کر سرکار کی نئی پالیسی کی وجہ سے یہ اور زیادہ پھیلے گی۔ اس لئے اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس زبان کو پھیلائیں اور مقبول بنائیں جو ہمارے نزدیک ملک کی عام زبان ہے، تو ہم اپنے رسم خط کی حفاظت کے ساتھ ساتھ دیوناگری میں بھی اسی زبان کے نمونے شائع کر سکتے ہیں جس میں اردو، ہندی اور ہندوستانی کی حدیں آکر مل جائیں، اور اس طرح ان ناداں دوستوں کے مقابلے میں ہم ہندی کی بھی بہتر سیوا کر سکتے ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

۲۴ ستمبر ۱۹۴۹ء

جذبات کا سیلاب اور حقیقت کی چٹان

عوام ہر ملک میں، کم و بیش جذبات پرست ہوا کرتے ہیں مگر ہمارے ملک میں "خواص" یعنی وہ لوگ بھی جنھیں علم اور عقل میں تھوڑا بہت حصہ ہے۔ اکثر عقل سے کم اور جذبات سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ مسلمان تو اس معاملے میں ہمیشہ سے بدنام ہیں مگر غیر سے دوسرے کبھی کبھی ان سے بھی دو ہاتھ آگے بڑھ جاتے ہیں۔ دو تین سال سے زبان کا مسئلہ یو، پی، بہار اور ان سے زیادہ یو پی میں جذبات کا ایک تیز اور تند سیلاب بن گیا ہے جس میں اچھے اچھے لوگ عقل و انصاف، تدبیر و مصلحت کے ساحل سے دور بہے چلے جاتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ یوں تو تعصب اور تنگ نظری کی سبھی قسمیں ہندوستان کی وحدت اور سلامتی کے لئے خطرناک ہیں لیکن لسانی تعصب زہر میں بجھی ہوئی تلوار ہے جو ایک دن ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہلاک کر سکتی ہے۔

ہندی کے حامیوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کی کہ ان تینوں صوبوں میں ایک، دم سے سنسکرت سے لدی ہوئی ہندی کو سرکاری زبان بنا دیں بلکہ مشرقی پنجاب میں جہاں مردوں میں ہندی جاننے والے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں اسے سرکاری زبان بنانے کا فیصلہ کرا دیا، جس کا پوری طرح نفاذ تو نہ ہوا اور نہ ہو سکتا تھا، لیکن اس کی وجہ سے سکھوں اور ہندوؤں میں پنجابی اور ہندی کی نزاع چھڑ گئی اور ایک نیا شور و شر برپا ہو گیا۔

اسی کے ساتھ مرکز میں ہندی کو دیوناگری رسم خط میں سرکاری زبان بنانے کی مہم شروع ہوئی اور مطالبہ کیا گیا کہ ملک کا آئین ہندی میں لکھا جائے اس کی ایک ایک دفعہ پہلا آئین ساز اسمبلی میں بحث ہو اور منظور ہونے کے بعد اسی کو مستند مانا جائے۔ نیتیجاً ایک طرف ہندوستانی کے حامیوں نے اور دوسری طرف انگریزی کے حامیوں نے جن میں زیادہ تر جنوبی ہند کے لوگ ہیں اس تحریک کی شدید مخالفت کی۔ یہ زبان کا جھگڑا اتنا بڑھ گیا کہ چند روز پہلے تک اندیشہ تھا کہ کہیں اس کی وجہ سے آئین ساز اسمبلی میں اور خود کانگریس پارٹی میں پھوٹ نہ پڑ جائے اور ان کا سارا شیرازہ بکھر کر نہ رہ جائے، مگر آخر میں زیادہ عقلمند اور دوسرے ذمہ دار لیڈروں کی کوششوں سے جوش جذبات کو بڑی حد تک ٹھوس حقیقت سے مصالحت کرنی پڑی یہ اصول تو مان لیا گیا کہ ہندی دیوناگری رسم خط میں مرکزی حکومت کی زبان ہوگی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ہندی میں ہندوستانی اور دوسری زبانوں کا ذخیرۂ الفاظ جو قبول عام کی سند پا چکا ہے شامل رہے گا اور اس میں دیوناگری ہندسوں کی جگہ بین الاقوامی ہندسے استعمال ہوں گے۔ آئین کا انگریزی مسودہ جس شکل میں وہ بحث اور ترمیم کے بعد منظور ہوا ہے مستند مانا گیا اور پندرہ برس کے لئے انگریزی کو مرکز کی سرکاری زبان اور مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں باہمی خط و کتابت کی زبان قرار دیا گیا۔ صدر جمہوریہ کو مجاز کیا گیا کہ اس مدت کے بعد بھی جن مقاصد کے لئے وہ مناسب سمجھے انگریزی کے استعمال کو قائم رکھے۔ تیرہ زبانیں جن میں ہندی اور اردو بھی شامل ہیں باقاعدہ ہندوستانی زبانیں تسلیم کی گئیں اور صدر کو اختیار دیا گیا کہ اگر کسی صوبے میں ان میں سے کسی زبان کے بولنے والے معقول تعداد میں موجود ہوں تو ان کی خواہش پر ان کی زبان کو بھی اس صوبے کی سرکاری زبان قرار دے۔

اس قرارداد میں جو بڑے معرکوں کے بعد منظور ہو کر ملک کے آئین میں شامل کی گئی ہے، ان ٹھوس حقیقتوں کا اعتراف موجود ہے:-

(۱) ہندوستانی کا ذخیرۂ الفاظ قبول عام حاصل ہو چکا ہے اس لئے جس زبان کا نام ہندی رکھا گیا ہے، اسے بلا تفریق اپنانا چاہیے

(۲) انگریزی ہندوستان میں مضبوطی سے جڑ پکڑ چکی ہے اور بین الاقوامی زبان کی حیثیت سے ہمارے لئے ناگزیر ہے۔ ایک مدت تک ہماری زندگی میں اس کا بہت بڑا حصہ ہوگا اور کچھ نہ کچھ حصہ ہمیشہ رہے گا۔

(۳) اردو کئی صوبوں میں بہت سے لوگوں کی زبان ہے ان لوگوں کی خواہش پر اسے ان صوبوں میں سرکاری زبان قرار دینا چاہیے

اگر ہندی کے حامیوں نے آئین ساز اسمبلی کے اس فیصلے کو ان حقیقتوں کے پیش نظر سچے دل سے مانا ہے تو یہ امید کی جا سکتی ہے کہ کچھ دن کے بعد جب جذبات کا سیلاب گذر جائے گا، زبان کا مسئلہ عقل و انصاف اور تدبیر و مصلحت کے مطابق خوش اسلوبی سے طے ہو جائے گا۔ یعنی قومی زبان سے ذخیرۂ الفاظ کے انتخاب میں لفظوں کی نسل، مذہب، رنگ سے قطع نظر کر کے صرف رواج عام اور قبول عام کو دیکھا جائے گا۔ قومی زبان کے دونوں رسم خط تسلیم کئے جائیں گے اور اسے ان صوبوں پر جہاں ترقی یافتہ مقامی بولیاں موجود ہیں زبردستی مسلط نہیں کیا جائے گا بلکہ تبلیغ کے ذریعے آہستہ آہستہ رواج دیا جائے گا۔

لیکن اگر ہندی والوں نے اس وقت آئین ساز اسمبلی کے فیصلے کو محض جبراً قہراً مانا ہے اور آگے چل کر اس کو توڑنے کی نیت رکھتے ہیں تو انھیں صرف اتنی کامیابی ہو سکتی ہے کہ ہندی کو بلا شرکت غیرے تین صوبوں کی سرکاری زبان بنا دیں۔ اسے سارے ہندوستان کی قومی زبان نہیں بنا سکتے اور یہ کامیابی بھی اس قیمت پر حاصل ہوگی کہ مختلف جماعتوں اور علاقوں، خصوصاً شمال اور جنوب میں دار و گیر کا ایسا شدید ہنگامہ برپا ہو جائے گا کہ ہمیں اپنی آزادی کے بلکہ جان کے لالے پڑ جائیں گے، اس کا کچھ تھوڑا نمونہ ہندی کے نمائندے پچھلے چند ہفتے میں آئین ساز اسمبلی کے اندر و باہر دیکھ چکے ہیں اس لئے امید ہے کہ اب جو کچھ کریں گے آنکھیں کھول کر کریں گے۔

سوال یہ ہے کہ ان کروڑوں آدمیوں کو جن کی مادری زبان اردو ہے، اس صورتِ حال میں کیا کرنا چاہیے یہاں سب سے پہلے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی ضرورت ہے، جس میں بہت سے لوگ مبتلا ہیں کہ اردو اب صرف مسلمانوں کی زبان رہ گئی ہے واقعہ یہ ہے کہ بہار، سی پی اور یو، پی میں اب بھی ایسے ہندو اور عیسائی خاندان موجود ہیں جو اردو کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ وہ زمانے کا رنگ دیکھ کر خاموش ہیں، مگر اپنے بچوں کو مدرسے میں یا کم سے کم گھر پر اردو پڑھاتے ہیں۔ دہلی اور مشرقی پنجاب میں یہ اب تک بہت سے ہندوؤں اور سکھوں کی، دفتری اور باقی سب کی ادبی زبان ہے عدالتوں اور مدرسوں میں بدستور جاری ہے، اخبار اور کتابیں عام طور پر اردو ہی میں شائع ہوتی ہیں عام فضا سے متاثر ہو کر دہلی اور پنجاب کے غیر مسلم بھی ہندی یا پنجابی کا مطالبہ کر رہے ہیں مگر ان میں ایسے باہمت لوگوں کی کمی نہیں جو اردو کی حمایت کھلا اور شدت سے کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ زمانے کی ناسازگاری کی وجہ سے ان کی آواز ان کے حلقے سے باہر نہیں پہنچتی۔ بہر حال چاہے آگے چل کر کچھ بھی ہو، اب تک کروڑوں غیر مسلموں کی مادری زبان یا ادبی زبان اردو ہے اور ان میں سے لاکھوں اس پر آشوب زمانے میں بھی اس کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں، اس لئے اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان کہنا اب بھی حقیقت اور انصاف کے خلاف ہے، اچھا تو پھر اردو کے حامی مسلم اور غیر مسلم کیا کریں! ہماری رائے یہ ہے کہ ملک کے آئین کی ان دفعات کا جو زبان کے بارے میں منظور ہوئی ہیں اور ذریعہ تعلیم کے متعلق کانگریس ورکنگ کمیٹی اور حکومت ہند کے فیصلوں کا جن میں اردو کی حفاظت کی بہت کافی گنجائش ہے، بہت غور سے مطالعہ کریں۔ اس کے بعد انجمن ترقی اردو کے پلیٹ فارم پر جمع ہو کر ان حقوق کو جنھیں آئین اور حکومت نے اصولاً تسلیم کیا ہے عملاً حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ آئینی تحفظات اپنی جگہ پر بہت ضروری ہیں، مگر کافی نہیں۔ اگر ہم عزم و استقلال تنظیم و تدبر کے ساتھ ان پر عمل کرانے کی کوشش کریں تو وہ سب کچھ اور اس سے زیادہ حاصل کر سکتے ہیں جس کا ہمیں مستحق قرار دیا گیا ہے۔ ورنہ کاغذ پر لکھے ہوئے الفاظ کوئی نقش یا تعویذ نہیں جو [illegible] بخود تاثیر پیدا کر سکیں ؎

دنیا کی رفتار

ہندوستان

بازی گروں کی قلا بازی

۱۸ر ستمبر کو دنیا کی تماشا گاہ میں ایک دم سے سنسنی پھیل گئی۔ حکمت عملی کے سمجھانے ماہر سر اسٹیفرڈ کرپس نے جن کی ثقہ صورت کو دیکھ کر ان جان لوگوں کو گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ بزرگ بازی گری کے کرتب بھی دکھا سکتے ہیں، ایسی قلا بازی کھائی جسے لوگ دیکھتے رہ گئے۔ بار بار یقین دلانے کے بعد کہ وہ اسٹرلنگ کی قیمت ہرگز کم نہیں کریں گے انھوں نے اٹھارہ ستمبر کو اعلان کر دیا کہ ڈالر کے مقابلے میں اسٹرلنگ کی قیمت ۳۰ فیصدی کم کی جاتی ہے۔ استاد کے ساتھ شاگردوں یعنی کامن ویلتھ کے اکثر ملکوں نے جن میں ہندوستان بھی شامل ہے اپنے سکوں کی قیمت اسی نسبت سے کم کر کے اس کرتب کو دہرایا۔

پہلے پہل ہندوستان میں مالیات کے ماہر اس اچانک تبدیلی سے ایسے چکرائے کہ ان کے الجھے ہوئے اور متضاد بیانات سے غیر ماہروں کو اس بات کے سمجھنے میں کوئی مدد نہیں ملی کہ اس کا اثر ہندوستان میں کاروبار کی حالت پر اور قیمتوں پر کیا پڑے گا۔ مگر اب اہل الرائے حضرات کی رائے معین اور واضح ہوتی جاتی ہے کہ اس تبدیلی کے نتائج ہندوستان کے حق میں حسب ذیل ہیں:-

۱۔ ہندوستان کے اسٹرلنگ قرضے کی قیمت ڈالروں میں ۳۰ فی صدی کم ہو جائے گی۔ لیکن امید ہے کہ امریکہ کے کارخانے کچھ دن میں رفتہ رفتہ اپنے مال کی قیمتیں بھی کم کر دیں گے۔ اس لئے اسٹرلنگ کی قوت خرید پھر اتنی ہی ہو جائے گی۔ اس درمیان میں ہندوستان جتنا مال امریکہ سے خریدے گا اس میں ضرور نقصان رہے گا۔ حکومت ہند یقین دلا رہی ہے کہ وہ امریکہ سے چند ضروری چیزوں کے سوا جن کی مجموعی قیمت بہت کم ہوگی کچھ نہیں خریدے گی۔ سب سے بڑی مد غلے کی تھی سو اس سال کا غلہ آ چکا ہے۔ آیندہ سال بہت کم باہر سے منگانے کی ضرورت پڑے گی اور وہ ڈالر کے علاقے سے نہیں منگایا جائے۔

۲۔ ہندوستان سے پٹ سن، چائے وغیرہ جو مال امریکا جاتا ہے اس کی قیمت ڈالر میں کم ہو جائے گی، لیکن قوی امید ہے کہ اس مال کی مانگ بہت بڑھ جائے گی اس لئے مجموعی طور پر ہندوستان کو فائدہ رہے گا ظاہر ہے کہ فائدہ تھوڑے ہی دن رہ سکتا ہے، کیونکہ رفتہ رفتہ دوسرے ملک بھی جو اس قسم کا مال امریکہ بھیجتے ہیں اپنے مال کے دام کم کر دیں گے اور ہندوستان کے مال کی اتنی مانگ نہیں رہے گی۔

ہمارے ملک کے اندر اشیا کی قیمتوں پر کوئی اثر نہیں پڑنا چاہیئے اس لئے کہ امریکے سے عام ضرورت کی کوئی چیز نہیں آتی، اگر دوکانداروں نے شرارت سے چیزوں کے دام بڑھائے تو حکومت سختی سے اس کا تدارک کرے گی۔

پہلی دو باتوں کو تو ماہر فن جانیں لیکن تیسری بات کے بارے میں ہمیں اپنے تجربے کی بنا پر بہت شبہہ ہے۔ ایسے موقع سے دوکاندار فائدہ اٹھا کر قیمتیں بڑھا دیتے ہیں اور حکومت ان کو کم کرانے کی کوشش یا تو محض دکھا دے کے لئے کرتی ہے۔ اس میں اس کی اہلیت اور ہمت نہیں کہ اپنی پالیسی کو نافذ کرنے کی مناسب تدبیر اختیار کرے۔

کچھ شنوائی تو ہوئی

حکومت ہند نے تارکین وطن کی جائداد کے بارے میں جو ضابطہ جاری کیا تھا اس پر عمل درآمد کرنے میں کسٹوڈین کے محکمے نے اور پولیس نے جا بجا بڑی سختی، بے اصولی اور بے انصافی سے کام لیا۔ اس کی طرف ہم پچھلی دو اشاعتوں میں توجہ دلا چکے ہیں جمعیۃ علمائے ہند نے اور کچھ اور ہمدردوں نے مسلمانوں کی شکایتوں کو حکومت ہند تک پہنچایا اب حکومت نے کسٹوڈین جنرل اور صوبوں کے کارکنوں کے نام ایک گشتی حکم جاری کیا ہے جس میں بڑی سختی کے ساتھ ہدایت کی ہے کہ جائدادوں کے ضبط کرنے میں من مانی یا سرسری کارروائی نہ کی جائے بلکہ پوری احتیاط، چھان بین اور ذمہ داری سے کام لیا جائے۔

پاکستان

بہ خیر گذشت

مسلم لیگ مغربی پنجاب کے صدر میاں عبدالباری اور میاں ممتاز دولتانہ کے درمیان، جو کچھ عرصے سے سیاسی رسہ کشی ہو رہی تھی اس کا بالآخر پچھلے اتوار کو فیصلہ ہو گیا اور اس رسہ کشی میں میاں عبدالباری کی جیت ہوئی، تین گھنٹے کی بحث کے بعد بالآخر ۱۳۰ کے مقابلے میں ۱۵۲ ووٹوں سے کونسل نے اپنے ۲۰ر جولائی کے فیصلے کی جس میں میاں عبدالباری کو گورنر کے مشیروں کے نام پیش کرنے کی اجازت دی گئی تھی تصدیق کر دی۔

کونسل کے پچھلے جلسے کے مقابلے میں یہ جلسہ نسبتہً پرسکون فضا میں منعقد ہوا تھا، مگر پھر بھی جلسے سے قبل جلسے کے درمیان اور جلسے کے بعد خاصہ ہنگامہ رہا، اور دولتانہ اور ان کے حامی سردار شوکت حیات خاں، بیگم شاہ نواز اور بیگم فاطمہ کے ساتھ مجمع کا رویہ نہایت توہین آمیز رہا۔ شوکت حیات خاں تو قریب قریب بے ہوش ہو گئے تھے اور لیگ کے رضاکاروں نے ان کو مشتعل مجمع کے نرغے سے نکال کر [illegible] پہنچایا۔

مگر کونسل [illegible] فیصلے سے مغربی پنجاب کا ایک اہم [illegible] مسئلہ ختم ہو جائے گا اور غالباً مشیروں کے تقرر میں اب کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئے گی، مگر جب تک مغربی پنجاب میں نئے انتخابات نہیں ہو جاتے ان دونوں پارٹیوں کی خود غرضیاں کوئی نہ کوئی فتنہ برپا کرتی رہیں گی بہت سے معقول اور سمجھدار لوگ اس خانہ جنگی سے تنگ آ کر چاہتے ہیں کہ ایک تیسری پارٹی کی بنیاد پڑے جو بڑے زمینداروں کے اثر سے آزاد ہو۔ "آزاد پاکستان پارٹی" اسی مقصد کو سامنے رکھ کر قائم کی گئی ہے۔ لیکن ابھی تک پاکستان کے اہل الرائے اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

سرحد میں سطحی سکون

صوبہ سرحد کی سیاست میں کچھ دن سے سکون پیدا ہو گیا ہے۔ مگر سطح کے نیچے ہیجان اور اضطراب کی کیفیت ابھی بدستور باقی ہے۔ عوامی لیگ کی مقبولیت رفتہ رفتہ بڑھ رہی ہے اور عبدالقیوم خاں کی وزارت سے لوگ روز بروز مایوس ہوتے جاتے ہیں۔ تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ پیر مانکی شریف کے مردان میں دو ماہ کے لئے تقریر کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ مغربی پنجاب کے کئی با اثر اخبار "قیومی وزارت" کی شدید مخالفت کر رہے ہیں اور ان کا داخلہ صوبۂ سرحد میں بند کر دیا گیا ہے۔ بظاہر جب تک نئے انتخابات نہیں ہوں عبدالقیوم خاں مرکزی حکومت کی پشت پناہی سے اپنے عہدے پر جمے رہیں گے۔

سول اینڈ ملٹری گزٹ پر شرفہ

کچھ دن ہوئے پاکستان کے اخبارات میں ایک خبر نکلی کہ نیو یارک کے کلار پبلشنگ کارپوریشن نے ہند اور پاکستان وغیرہ میں کئی اخبار جاری کرنے کا ارادہ کیا ہے اور سول اینڈ ملٹری گزٹ کو خرید لیا ہے اب کیا تھا پاکستان کے اخباروں میں غیر ملکی اخباروں کے اخلاف ایک زبردست مہم شروع ہو گئی۔ امریکی سفیر نے فوراً اس خبر کی تردید کی اور یہ کہا کہ کلار پبلشنگ کارپوریشن کے نام کی کوئی فرم امریکہ میں نہیں ہے۔ مگر اخباری ہنگامہ جس کا اصلی مقصد سٹیٹ مین اور ڈالمیا کے اخبار کی مخالفت ہے بدستور جاری ہے بلکہ اس کی شدت اور بڑھ گئی ہے۔

صلائے عام

کپڑے کے معاملے میں پاکستان کو جو مشکلیں پیش آ رہی ہیں ان کو دور کرنے کے لئے وہ خود اپنے ہاں کپڑے کی صنعت کو فروغ دینا چاہتا ہے کراچی میں ایک کپڑے کا مل جو پاکستان بننے کے بعد اپنی قسم کا پہلا کارخانہ ہے، قائم ہوا ہے۔ پچھلے ہفتے لیاقت علی خاں صاحب نے اس کا افتتاح کیا موصوف نے اپنی تقریر میں صنعت پر بڑا زور دیا اور فرمایا کہ "دفاع کے بعد حکومت کی سب سے زیادہ توجہ صنعت کی طرف ہے اور حکومت صنعت کی ترقی کے لئے ہر طرح کی مدد دینے کو تیار ہے

بزمِ بے تکلف

(ریل کے دوسرے درجے میں دو شخص آمنے سامنے سیٹوں پر بیٹھے ہیں۔ قد و قامت کے لحاظ سے ایک کو قلمی اور دوسرے کو تخمی کہہ سکتے ہیں۔ کیسے پیٹھے کا اندازہ آپ کو ان کی گفتگو سے ہوگا)

تخمی۔ (اخبار پڑھتے پڑھتے) سیٹھ جی اجازت ہو تو ایک بات پوچھوں، آپ کھاتے کیا ہیں؟

قلمی۔ (کھنکار کر) جی نفع کھاتا ہوں، بیاج کھاتا ہوں، چور بازار کی کمائی کھاتا ہوں، پھر کسی کے باپ کا اجارہ ہے؟

تخمی۔ ارے رے رے سیٹھ جی آپ خفا ہو گئے۔ میں نے تو یونہی پوچھ لیا تھا۔ بھلا آپ کو کیا طعنہ دوں گا۔ میں خود لختِ جگر کھاتا ہوں اور خونِ دل پیتا ہوں۔ دونوں حرام چیزیں! میں نے ایک وجہ سے یہ سوال کیا۔ اس اخبار میں ایک بڑے مزے کا خط چھپا ہے، کسی پنجابی بھائی نے لکھا تھا کہ حکومتِ ہند کی ملازمتوں پر تو آپ مدراس کے برہمن اور کشمیر کے کول اور مکسر قبضہ کئے بیٹھے ہیں۔ اس پر ایک طالب علم جنہوں نے اپنے لئے چھپا لیا (یعنی بدذوقی سے چھپا لیا) کا لقب پسند کیا ہے لکھتے ہیں کہ بھائی جی شکایت کی کوئی بات نہیں۔ یہ سارا کھیل غذا کا ہے۔ آدمی کا جسم کیا ہے ایک کیمیا کی بھٹی ——

قلمی۔ (سنبھل کر) کیا کہا کیمیا؟

تخمی۔ سیٹھ جی وہ کیمیا نہیں جس میں سدا ایک آنچ کی کسر رہ جاتی تھی۔ آج کل کیمیا کیمسٹری کو کہتے ہیں، جس میں بنولے کا گھی۔ رائی کا پربت، بات کا بتنگڑ بن جاتا ہے، ہاں تو ان طالب علم کے خط کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کے جسم کی بھٹی میں چاول سے اسٹارچ بنتا ہے جسے بدن میں جستی ——

قلمی۔ انگریز ہندوستان سے چلا گیا، مگر انگریزی ہمارے بھگتنے کو چھوڑ گیا۔ یہ اسٹارچ کیا بلا ہے؟

تخمی۔ سچ کہا آپ نے انگریز کا سکہ ہندوستان سے اٹھ گیا اور امریکہ میں گر گیا مگر انگریزی کا سکہ دونوں جگہ اسی ٹھاٹھ سے چلتا ہے۔ اسٹارچ وہ ہے جس سے کلف بنتا ہے۔ بڑی اچھی چیز ہے۔ جس طرح کلف سے کپڑا اسی طرح اسٹارچ سے آپ کا بدن کرارا ہوتا ہے۔ مگر زیادہ نہ ہو نہیں تو بیٹھ کر رہ جائے گا۔ انگریزی معاف ایک اور جز پروٹین ہے جو گیہوں میں بھی پایا جاتا ہے، لیکن گوشت وغیرہ میں بھی کم ہوتا ہے جس سے دماغ پرورش پاتا ہے۔ بقول بچھ لئے کے مدراس کے برہمن اتنے تیز اسی وجہ سے ہوتے ہیں وہ چاول نرکا ہی، دہی کے علاوہ جانوروں کی ... استعمال کرتے ہیں کول اور مکسر ان سے بھی چوکھے ہیں، ان کی غذا ہیں چاول روٹی گوشت ترکاری اور پھل غرض وہ سب چیزیں ہیں جن سے جسم اور دماغ کو قوت پہنچتی ہے پھر بتلائیے کہ دال روٹی کھانے والے کیا کھا کے ذہانت میں ان مدراسیوں اور کشمیریوں کا مقابلہ کریں گے۔

قلمی۔ ابھی بس رہنے بھی دو، ہم نے بھی بہت سنا ہے کہ یہ کھاؤ اور وہ کھاؤ۔ آدمی کھائے تو سب کچھ، مگر ہضم بھی ہو، یہاں معمولی پوری کچوری، ترکاری مٹھائی تو پچتی نہیں، یہ سب الم غلم کھا کر کیا حال ہوگا۔

تخمی۔ سیٹھ جی آپ خفا نہ ہوں تو عرض کروں کہ تلی ہوئی چیزیں اور کھوئے کی مٹھائی ہضم کرنے کے لئے ایڑی سے چوٹی تک پسینہ بہانے کی ضرورت ہے جو دن بھر آلتی پالتی مارے بیٹھا رہے اسے تو ہوائے مال کے سوا کچھ بھی ہضم نہیں ہونے کا۔

قلمی۔ پھر وہی پاجی پن کی بات، بدتمیز کہیں کا سوشلسٹ ——

تخمی۔ بس بس سیٹھ جی، سوشلسٹ ہی تک رہنے دیجئے آگے نہ بڑھئے گا نہیں ایسا تقبل ہم لقمہ آ جائے گا جو کسی چورن سے نہیں پچتا۔

غزل

گوپی ناتھ امن لکھنوی

ہم کہاں حبِ جاہ رکھتے ہیں
بہت اونچی نگاہ رکھتے ہیں

سینے میں دودِ آہ رکھتے ہیں
قدرتِ بے پناہ رکھتے ہیں

اُن کو اپنی نظر پہ ناز بجا
ہم بھی اپنی نگاہ رکھتے ہیں

غیر سے رسم و راہ کیا معنی
آپ سے رسم و راہ رکھتے ہیں

نہ کرو ذکر دوزخ و جنت
ابھی تابِ گناہ رکھتے ہیں

آپ کے دِل کا حال جان لیا
کہئے کیسی نگاہ رکھتے ہیں

دِل تو رکھتے ہیں اپنے سینے میں
ہاں بحالِ تباہ رکھتے ہیں

آپ کی موت اس کی روزی

(دیدہ چالاک نائٹ معالج اور اشتہاری دوا فروش کی روزی کا سہارا ہماری خوش اعتقادی ہے۔ اگر اس کی بدولت ہم جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں تو کون سا غضب ہو جائے گا! آخر ایک دن مرنا ہی ہے مرتے مرتے کسی کا بھلا تو کر جائیں)

افسوس ہے کہ ۹۰ ڈالر کا آلہ اسپکٹرو کروم جس سے طرح طرح کی روشنیاں نکال کر دنیا بھر کی بیماریوں کا علاج کیا جاتا تھا اب نہیں مل سکتا۔ اس کے موجد ڈاکٹر گھڈیالی کو اپنا کاروبار بند کرنا پڑا۔ ع

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

اور دو ہزار ڈالر والا سلوئڈ تھرم خریدنا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے جو بجلی کا "شاک" پہنچا کر بیمار کو تندرست کر دیتا ہے اس لئے کہ عدالت نے اس کی فروخت کو ممنوع قرار دے دیا ہے۔

یہی نہیں بلکہ اب سرکے اور شورے سے مرکب سے جو ۳۰ ڈالر فی گیلن کے حساب سے بکتا تھا ذیابیطس کے علاج کا موقع بھی جاتا رہا اس لئے کہ وہ محسن خلائق جو یہ آب حیات بیچا کرتے تھے، جیل بھیجے جا رہے ہیں۔

مگر گھبرائیے مت، ابھی آپ اس پر مجبور نہیں ہیں کہ باقاعدہ ڈاکٹروں کے لمبے علاج کی زحمت اٹھائیں۔ ابھی بہت سے لوگ یہ دعوےٰ کر کے آپ سے روپیہ وصول کرنے کو موجود ہیں کہ آپ کو چٹکی بجاتے اچھا کر دیں گے۔

اگر آپ کو سرطان کی شکایت ہو تو گلوکسی لائڈ یعنی گلوکسیلک ایسڈ کا ہائیڈرائڈ" ۳۰۰ ڈالر فی آونس کی شرح سے خریدیئے مگر کسی علم کیمیا کے ماہر سے یہ نہ پوچھ بیٹھئے گا کہ یہ کیا چیز ہے ورنہ وہ بغلیں جھانکنے لگے گا۔

آپ کو ذیابیطس کی شکایت ہو یا آپ انسولین سے اور اسی کے ساتھ زندگی سے تنگ آ چکے ہوں تو دو ہزار ڈالر خرچ کر کے ایک بھاپ کا حمام منگا لیجئے جو آپ کو خوشبودار آبخرات سے نہلائے گا۔ اگر ان ابخرات سے آپ کی ذیابیطس دور نہ ہو تو یہ کیا کم ہے کہ آپ کی لاش ایسی معطر ہوگی جیسی شاید بڑے سے بڑے بادشاہ کی بھی نہ ہوئی ہو......

پھر ایک سیمنٹ کی ٹکیہ ملتی ہے جسے پانی میں ڈال دیتے ہیں۔ اس سے طلسمی شعاعیں نکلتی ہیں جن کی عجیب و غریب تاثیر ہے۔ اس کی بدولت آپ کی گائے دودھ دوہتے وقت چپ چاپ کھڑی رہے گی، آپ کا ملیریا جاتا رہے گا۔ غرض آپ کی ہر طرح کی مشکل حل ہو جائے گی......

ان دغابازوں، جعلسازوں کا جو آپ سے بھرپور رقمیں لے کر آپ کو تندرست کر دینے کا ٹھیکہ لیتے ہیں امریکہ میں ایک لشکر کا لشکر موجود ہے اور یہ سب دونوں ہاتھوں سے روپیہ بٹور رہے ہیں جو حضرت گلوکسی لائڈ بیچتے ہیں ان کی آمدنی ساڑھے تین لاکھ روپے سال ہے۔ مگر ان کا شمار اس برادری میں تھڑ پونجیوں میں ہے۔ سرکے اور شورے سے ذیابیطس کا علاج کرنے والے بزرگ کی آمدنی دو کروڑ دس لاکھ روپئے سال تھی۔ اسپکٹرو کروم کے موجد کا کاروبار بند ہو چکا ہے۔ مگر انھوں نے اتنا کما لیا ہے کہ اب بھی کروڑ پتیوں کی صف میں شامل ہیں۔ ایک نیویارک کی خاتون نے ایک مسیحائے زماں کو جو صرف پاؤں کے انگوٹھے کو دبا کر علاج کرتے تھے چودہ ہزار روپے دئے تھے۔

ان کے علاوہ اور بھی کئی رقم کے مسیحا موجود ہیں۔ ایک وہ ہیں کہ آپ ان کو جاذب کے ٹکڑے پر اپنے خون کے چند قطرے بھیج دیجئے، وہ نہ صرف آپ کا مرض بلکہ آپ کا مذہب بھی تشخیص کر دیں گے۔ یہ اور بات ہے کہ بے چارے کبھی کبھی دھوکا بھی کھا جاتے ہیں، ایک بار ایک ڈاکٹر نے انھیں ایک تندرست اور پاکباز مرغے کے خون کا نمونہ بھیج دیا۔ انھوں نے جھٹ پٹ ملیریا اور سوزاک تشخیص کر دیا۔ ایک اور بزرگ دستخط دیکھ کر بیماریاں تشخیص کیا کرتے ہیں۔

مگر ان سب کے ایسے ایسے معتقد موجود ہیں کہ ان کے ایمان کو کوئی چیز متزلزل نہیں کر سکتی۔ عدالت میں ایک شخص نے حلف اٹھا کر کہا کہ اسپکٹرو کروم سے اس کی مرگی بالکل جاتی رہی۔ ان الفاظ کے کہتے ہی اس پر مرگی کا دورہ پڑ گیا اور وہ زمین پر گر کر لوٹنے لگا۔

جب "طلسمی ٹکیہ" کا فریب کھلا تو ہزاروں آدمیوں نے مل کر اس کے موجد کے فارم پر ہلہ بول دیا۔ مگر اسی ہنگامے میں ایک اخبار کا رپورٹر جو اس ٹکیہ کا مذاق اڑایا کرتا تھا اس پر ایمان لے آیا۔ ایک بڑی کیمیکل کمپنی کا منیجر اس کاروبار میں روپیہ لگانے پر تیار ہو گیا۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ سیمنٹ کی ٹکیہ

[illegible] بھی فرق نہیں آیا۔

لیکن ایک دن آتا ہے جب ان کو سخت نقصان اٹھانے کے بعد [illegible] بدعقیدہ ہو جاتے ہیں اور [illegible] رہ جاتے ہیں۔ بات عدالت تک [illegible] ہے کہ ان کے استعمال سے کتنے [illegible] گئی اور کتنے زندگی بھر کے لئے [illegible] ان واقعات کا ذکر ہے جو عدالت تک پہنچتا ہے۔ ان کے علاوہ ہزاروں المناک نتیجے ہیں جن کی سزا بھگتنے والوں کے کسی کو خبر تک نہیں ہوتی۔

شاید آپ کو یہ خیال ہو کہ اس قسم کی دغابازی کو عدالتی کارروائی کے ذریعے آسانی سے ختم کیا جا سکتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسے مقدمے برسوں چلتے رہتے ہیں اور اکثر ملزموں کو اتنی کافی سزا نہیں ملتی جس سے دوسروں کو عبرت ہو۔

اس کے علاوہ جیسے ہی ایک فریب پکڑا جاتا ہے کوئی دوسرا ڈھونگ شروع ہو جاتا ہے اور آنکھ کے اندھے گانٹھ کے پورے اس کے شکار ہونے لگتے ہیں۔ جب تک عام لوگوں میں اتنی عقل نہ ہو کہ جاہلوں اور دغابازوں کو پہچان سکیں ان چیزوں کو پوری طرح روکا نہیں جا سکتا۔

امریکہ میں لوگ اتنا تو سمجھنے لگے ہیں کہ شدید بیماریوں میں اتائیوں کا علاج کرانا اور اس طرح کے ڈھکوسلوں کا استعمال کرنا خطرناک ہے، لیکن جہاں تک پرانی بیماریوں کا تعلق ہے جن کے علاج میں علم طب نے اب تک بہت کم ترقی کی ہے، بہت سے لوگ اب بھی بے وقوف بننے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ بے چارے گنٹھیا کے، پرانے ناسور کے اور دوسری بیماریوں کے مریض جن کا علاج بہت دیر طلب ہے جب ڈاکٹروں کے پیچھے پھرتے پھرتے تھک جاتے ہیں اور ان کی نظر اخبار میں "شرطیہ علاج" یا "حکمی علاج" کے اشتہار پر پڑتی ہے تو ان سے رہا نہیں جاتا۔ ذیابیطس اور سرطان کے مریضوں کا معاملہ اور بھی مشکل ہے۔ ذیابیطس والا انسولین کے انجکشنوں سے اور پرہیز سے عاجز آ جاتا ہے۔ اس کا دل ایسے شخص کو ڈھونڈھتا ہے جو دعوے سے کہے "انجکشن پر لعنت بھیجو اور جو جی چاہے کھاؤ پیو، میں تمھارا علاج کرتا ہوں"۔ اسی طرح سرطان کے مریضوں کو جب آپریشن کی یا ایکس رے کے علاج کی بشارت دی جاتی ہے اور پھر بھی سو فی صدی فائدے کا یقین نہیں دلایا جاتا تو وہ خود بخود اس شخص کی طرف کھنچتے ہیں جو آسان اور حکمی علاج کا مدعی ہے۔

(ماخوذ)

مشرقی یورپ لڑائی کے بعد

ابوسالم

لڑائی سے پہلے مشرقی یورپ کے ملکوں کا حال، غربت اور افلاس کے لحاظ سے ہمارے ہندوستان جیسا تھا۔ ہنگری، پولینڈ، بلگیریا، چیکوسلوویکیا، یوگوسلیویا میں کسانوں کا معیارِ زندگی بہت ہی پست تھا، لاکھوں کھیت اتنے چھوٹے چھوٹے تھے کہ کسان ان سے کسی طرح پیٹ بھر روٹی حاصل نہیں کر سکتا تھا اور فصل سے پہلے کے چند مہینے فاقہ مستی میں گزارنے پر مجبور ہوتا تھا۔ ان علاقوں میں بھی جہاں پیداوار مقابلتہً زیادہ ہوتی تھی بے زمین مزدوروں کی بڑی بھاری تعداد ہوتی تھی، یہی نہیں یہ معیارِ زندگی لڑائی سے پہلے ہی اور بھی گرنے لگا تھا اس افلاس کے کچھ اسباب تو ثانوی تھے۔ مثلاً ۱۹۳۰ء کی کساد بازاری نے زرعی پیداواروں کے دام بہت گرا دیئے تھے اور اس سے لازمی طور پر دیہات کی آبادی کو بڑی مالی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا تھا، لیکن اصل اور بنیادی سبب، جو خود ہمارے ملک میں کارفرما ہے، یہ تھا کہ کھیتوں پر کام کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، زیادہ اس معنی میں کہ اگر ان سے کھیت پر کام نہ لیا جاتا تو اس سے زرعی پیداوار میں کمی کا کوئی خطرہ نہیں تھا، معاشیات کی اصطلاح میں یہ کثرتِ آبادی کا شکار تھے۔ ایک اندازہ یہ ہے کہ ان چھ ملکوں میں چھ کروڑ مجموعی آبادی میں کوئی ۲ کروڑ انسان اس معنی میں غیر ضروری تھے کہ کھیتی باڑی کو ان کے وجود سے کوئی فائدہ نہ تھا اور کھیتی باڑی کے علاوہ ان ملکوں میں اور کوئی ذریعہ معاش نہ تھا۔

لڑائی کے بعد ان ملکوں کے سیاسی نقشے میں تبدیلی ہوئی، یہاں عوامی جمہوریتوں نے جنم لیا اور ان ملکوں میں ترقی پسند حکومتیں قائم ہیں (شاید یوگوسلیویا کو اس فہرست میں شامل نہیں کرنا چاہیئے۔ ٹیٹو کی حکومت نے حال میں امریکہ سے قرض مانگا ہے اور دنیا کے موجودہ سیاسی پس منظر میں اس طرح کا قرض سیاست کے متعلق ایک خاص نظریے کے بغیر نہیں ملتا)، ان ملکوں کے سامنے تعمیر کا کام کتنا کٹھن تھا۔ اس کا اندازہ کچھ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے اپنے ملک میں ان مسائل کو حل کرنے میں ابھی تک کوئی قابلِ لحاظ کامیابی نہیں ہوئی ہے۔

جنگ کے ختم ہونے کے بعد ان سب ملکوں نے پہلا اہم معاشی فیصلہ یہ کیا کہ قومی تعمیر کا کام انفرادی کاروبار کی برکتوں سے چھٹکارا حاصل کئے بغیر نہیں چل سکتا، اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے ان معاشی منصوبے تیار کئے اور ان میں صنعتی تعمیر پر خاص طور سے توجہ دی گئی کیونکہ یہی فلاح کا اکیلا راستہ تھا۔ صنعتوں میں زراعت سے فاضل آبادی کو نکالے بغیر بہتری کی امید فضول تھی، صنعت میں توسیع کے بغیر زرعی ترقی بھی ممکن نہ تھی، اس لئے کہ روزگار کے دوسرے مواقع بہم پہنچائے بغیر زرعی تنظیم از سرِ نو نہیں کی جا سکتی تھی۔

ابتدائی منصوبوں کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ساری فاضل زرعی آبادی کو صنعت میں کھپا دیا جائے۔ یہ پہلے منصوبے تھوڑی تھوڑی مدت کے لئے بنائے گئے تھے۔ پولینڈ کا منصوبہ ۱۹۴۷ء سے شروع ہوا، اور اس سال کے آخر میں ختم ہو جائے گا۔ باقی اور کئی ملکوں کے منصوبے دو دو سال کے لئے تھے دو تین سال کی چھوٹی سی مدت میں ظاہر ہے اتنا بڑا کام انجام دیا بھی نہیں جا سکتا تھا، اس لئے ان منصوبوں کو اس بڑے مقصد کے لئے پہلا قدم سمجھنا چاہیئے ان سبھی ملکوں کا مقصد یہ تھا کہ جنگ سے پہلے کے حالات دوبارہ پیدا کر لئے جائیں، لیکن صنعتی پیداوار میں اضافوں کی تجویزیں ہیں۔ چیکوسلوویکیا کے منصوبے میں صنعتی پیداوار میں دس فی صدی، ہنگری میں ۲۷ فی صدی اور بلگیریا میں ۶۵ فی صدی کے اضافے کا پروگرام ہے۔ زرعی ترقی کی رفتار سست ہوگی کیونکہ لڑائی کے دوران میں ان ملکوں کو بعض ایسے نقصان پہنچے ہیں، جن کی تلافی فوراً نہیں ہو سکتی مثلاً منصوبہ بندی دو برس میں جانوروں کی تعداد میں اضافہ نہیں کر سکتی اور لڑائی کی بدولت ان کی تعداد بہت کم ہو گئی ہے۔

صنعتی پیداوار میں اضافے کے لئے ضروری ہے کہ صنعتوں میں سرمایہ زیادہ لگایا جا سکے۔ ہمارے ملک میں صنعتی پیداوار کے نہ بڑھنے کا ایک بڑا سبب یہی ہے کہ دیس کے سرمایہ دار اپنا سرمایہ نہیں لگا رہے ہیں مشرقی یورپ کے ان ممالک کی غربی کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ان کے ہاں بھی سرمایہ کی کمی کا سوال لازمی طور پر ہونا چاہیئے تھا، اور ہے، لیکن انھوں نے قومی آمدنی کا بیس فی صدی سالانہ بچا کر معاشی تعمیر کے لئے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ بچت کا یہ تناسب حیران کر دینے والی بات ہے۔ خصوصاً جب یہ یاد رکھئے کہ ہمارے ہاں اس معاملے میں ۶ فیصدی سے زیادہ کا ذکر کم سننے میں آتا ہے۔ اس صورت حال کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ ان ملکوں کو آج تھوڑی سی قربانی کرنا پڑے گی، اور جان بوجھ کر اپنی زندگی کے معیار کو تھوڑے دنوں اور نیچا رکھنا ہوگا، لیکن ایک مرتبہ صنعتیں وجود میں آگئیں تو انھیں چلنے والے دلوں میں یہ یقین ہے گا کہ ان کا معیارِ زندگی بدل جائے گا۔ مغربی یورپ میں مشرقی یورپ کے بعض "دوست" اس نادانی پر خندہ زن ہیں ایسا اس لئے ہے کہ مغربی یورپ اپنا مستقبل ڈالر کے ہاتھوں بیچ رہا ہے اور حال کو پا نہیں سکتا۔ دوسروں کے متعلق اس بات کا یقین اُسے آسانی سے نہیں ہو سکتا کہ وہ مستقبل کو اپنا رہے ہیں۔

اوپر میں نے کہا ہے کہ بچت کی اونچی شرح سے معیارِ زندگی فوراً نہیں بدل سکے گا۔ اس میں تھوڑی سی اور ترمیم کی ضرورت ہے۔ ان منصوبوں میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ جو غریب ترین طبقے ہیں ان کے معیارِ زندگی کو ضرور بدلا جائے۔ اور اس مقصد کے پیش نظر ان معاشی علاقوں کو جو بد حالی کا شکار رہے خاص طور سے توجہ کا مرکز بنایا گیا ہے۔ ہر منصوبے میں ان علاقوں میں خاص طور سے سرمایہ لگانے کا پروگرام بنایا گیا ہے جہاں کی آبادی جنگ سے پہلے فاقے کا شکار ہونے پر مجبور تھی۔

اب آیئے ان منصوبوں کے نتائج پر ایک نظر ڈال لیں۔ مشرقی یورپ میں صنعتی تعمیر کی رفتار مغربی یورپ کے مقابلے میں تیز ہے ۱۹۴۸ء کے وسط ہی میں یہ ممالک صنعتی لحاظ سے لڑائی کے پہلے کے مقابلہ میں زیادہ پیدا کرنے لگے تھے۔ ان سب میں ترقی کی رفتار چیکوسلوویکیا میں سب سے زیادہ سست تھی اور اس کا سبب ہمارے لئے اہم ہے۔ منصوبے کے پہلے سال میں چیکوسلوویکیا میں اتنا سرمایہ کاروبار میں نہیں لگایا گیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت نے وہاں صرف بڑے بڑے کارخانوں پر قبضہ کیا تھا۔ سرمایہ داروں نے نفع کی لالچ میں سرمایہ تھوک پر مال بیچنے اور اس طرح کے دوسرے کاموں میں لگانا شروع کر دیا۔ اس لئے کہ یہاں نفع کا امکان زیادہ تھا۔ ہمارے اپنے ملک میں بھی سرمایہ کا رُخ اس طرح کے کاموں کی طرف ہے جس سے نفع زیادہ ہوتا ہے ظاہر ہے جلد تعمیر کا کام تو اس طرح نہیں ہو سکتا تھا

ان بہتر نتائج کے متعلق اہم بات یہ نہیں ہے کہ ترقی کی رفتار تیز رہی ہے بلکہ ان ملکوں میں یہ بھی ہوا ہے کہ یہ ترقی مہنگائی کے بغیر حاصل ہوئی ہے، اس کے برخلاف مغربی یورپ کے ملکوں میں صنعتی بحالی کا کام اس طرح انجام پایا ہے کہ چیزوں کے دام بڑھ گئے ہیں اور اس طرح مالکوں کو زیادہ نفع کمانے کا موقع دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس مشرقی یورپ کے ملکوں میں مزدوروں کی حقیقی اجرت میں اضافہ ہوا ہے۔

اور اب یہ ملک صنعتی توسیع کے وسیع تر پروگرام بنا رہے ہیں۔ چیکوسلوویکیا میں ایک نیا منصوبہ ترتیب دیا گیا ہے جس میں انجینیرنگ صنعتوں کو ترقی دینے کی خاص طور پر کوشش کی جائے گی۔ ۱۹۴۹ء سے لے کر ۱۹۵۳ء تک چار سال میں صنعتی صلاحیت میں ۱۰ فیصدی کے اضافے کی کوشش کی جائے گی۔ پولینڈ سے ایک نیا منصوبہ بنایا جا رہا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ چھ سال میں صنعتی پیداوار میں دگنا اضافہ کیا جائے۔ سہ شلسٹ منصوبہ بندی نے چھوٹے ۴ سے عرصے میں تعمیر اور بحالی کا کام پورا کر دیا ہے۔ اس لئے یہ توقع غلط نہیں ہوگی کہ یہ بھی اصولوں پر چل کر ترقی کے [illegible]

(نیا مخزن)

مولانا مدنی

بذاتِ خود ایک ادارہ

ضیاء الفاروقی

حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی زندگی، ہر روز کا معمول اور "حق المعاد و حق العباد" کی پورے طور سے ادائیگی مجھے مجبور کرتی ہے کہ میں ان کی شخصیت کو بذاتِ خود ایک ادارہ سمجھوں۔ قحط الرجال کے اس پر آشوب دور میں اسلامی ہند کی یہ شخصیت ہم بھولے اور بھلائے ہوئے مسلمانوں کے لئے ایک شمعِ ہدایت ہے، اُن کی محبت کا ہر لمحہ ایمان کو تازہ کرتا ہے اور ان کی ہر جنبشِ نظر یقین و عمل کی پیغامبر ہے، ایسے ہی لوگ ہوں گے جن کے متعلق اقبال لاہوری نغمہ سرا ہوا تھا۔

کہاں آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی
"بیاباں"

اسلامی دینی علوم کی یہ ایک شان رہی ہے، اگرچہ اس کی تیرہ سو سالہ زندگی میں بڑے بڑے انقلاب آئے مگر وہ اپنی پوری آن بان سے اب تک قائم ہے۔ خود مسلمانوں میں امارت اور دنیاوی جاہ حشم کا انقلاب۔ بنی امیہ کی دینی و دنیوی ملی جلی حکومت، عباسیہ خلافت کا بنی امیہ کے خاندان اور اس کی تمام روایات سے دشمنی اور کینہ پروری تاتار کا خونی طوفان، اسلامی دنیا کی انتشار پسندی خود مختار حکومتوں کا وجود میں آنا اور ایک ایک کا مرکز سے الگ ہو جانا۔ سامانیوں سلجوقیوں اور غزنویوں کا عروج و زوال، ترکوں کا اقبال اور منگولوں کا خروج۔ یہ سب کیا تھا اور اس کے کیا نتائج ہوئے؟ مورخین اسلام نے ان انقلابات اور حادثات کو ایک ایک کر کے جانچا اور تولا ہے، ایک ایک حالت کا جائزہ لیا ہے، اور اس پر فلسفۂ تاریخ کی بنیاد ڈالی ہے۔ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں یہاں یہ دیکھنا ہے کہ واقعات کی دوا دوش، انقلابات کا ایک مسلک سلسلہ اور قومی حادثات کی ایک مستقل رو، کس طرح شاہی خاندانوں کے عروج و زوال کا باعث ہوتی رہی، دنیا کی آنکھوں نے دیکھا کہ شاہی ایوان ان تغیرات کے سامنے نہ ٹھیر سکے اور بادشاہوں کی جگمگاتی ہوئی محفلیں ویران ہو کر رہ گئیں، مگر وہ علمائے سلف جو دینی علوم کو سینے سے لگائے رہے اور اسی کی روشنی میں باطل اور اس کی تمام ضلالتوں کا مقابلہ کرتے رہے، کس گوشت و پوست کے انسان تھے۔ کتب سیر شاہد ہیں کہ ان علماء کی بے لوث زندگیوں کے سامنے دنیا کی کوئی قوم اپنے اچھے سے اچھے افراد کو پیش کرنے سے قاصر ہے۔ علامہ احمد بن حنبلؒ علامہ ابو حنیفہؒ، امام غزالیؒ، علامہ ابن تیمیہؒ، شیخ المجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہؒ، شاہ عبدالعزیزؒ، سید احمد بریلویؒ اور اسمٰعیل شہیدؒ یہ ان ہزاروں بے نظیر انسانوں میں سے چند ہیں جنہیں معمولی پڑھا لکھا انسان کسی حد تک جانتا ہو۔

موجودہ دور میں اس سلسلے کی ایک کڑی مولانا مدنی ہیں۔ یہ مبالغہ نہیں، جن لوگوں نے ان کو قریب سے دیکھا ہے اور انصاف و وسیع النظری کی دولت سے مالا مال ہیں انھیں مجھ سے اتفاق کرنے میں کوئی پس و پیش نہ ہوگا، یہ وہ ہستی ہے جو ایک مستقل نصب العین رکھتی ہے اور جس کا کیریکٹر زمانہ کی ساز باز اور حالات کی ریشہ دوانیوں سے اثر پذیر نہیں ہو سکتا۔ یہ وہ ذات ہے جو صرف اللہ کے نام کی بلندی اسلام کی عظمت اور مسلمانوں کی خدمت کے لئے جیتی ہے، جو قائم اللیل اور صائم النہار ہے جس کے دن "امر بالمعروف" اور جس کی راتیں "نہی عن المنکر" کی فکر میں گذرتی ہیں۔ سیاسی انقلابات اس شخص کے دامن کو آلودہ نہیں کر سکتے، یہ اس لئے کہ اس کے اعمال غرض کے شائبہ سے پاک ہیں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کا انقلاب ہندوستان کی کسی اور قوم کی تاریخ میں ممکن ہے کوئی بڑا انقلاب ہو، مگر مسلمانوں کی تاریخ ایسے سیکڑوں انقلاب اپنے صفحات میں پوشیدہ رکھتی ہے۔ دہلی کا ہنگامہ بغداد کی تباہی کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ تاریخ کے اوراق بتلاتے ہیں کہ وہ علمائے سلف جن کی عظمت نیک نیتی، بے لوث زندگی اور ایثار و قربانی سے متاثر ہو کر یہ "مجاهد" اپنے کو "ننگِ اسلاف" لکھتا ہے کس دل و دماغ کے انسان تھے نہ حکومت کے ظلم و ستم کے سامنے ہتھیار ڈالتے تھے اور نہ دنیاوی حرص و طمع سے مغلوب ہوتے تھے، صرف حق کی خاطر جیتے تھے اور حق کی خاطر مرتے تھے۔ حسین احمد ایسے لوگوں کی زندگیاں سامنے رکھتا ہے اور انھیں کے اصولوں پر عمل کرتا ہے، پھر کیسے ممکن ہے کہ اس کے پیروں کو لغزش ہو جائے اور اس کی نیت میں فتور آ جائے چاہے وہ مالٹا کی جانکاہ اسیری ہو یا ۱۵ اگست کا انقلاب ہو

.... موجودہ دور میں اس سلسلے (علمائے سلف) کی ایک کڑی مولانا مدنی ہیں .... یہ وہ ہستی ہے جو ایک مستقل نصب العین رکھتی ہے اور جس کا کیریکٹر زمانے کی ساز باز اور حالات کی ریشہ دوانیوں سے اثر پذیر نہیں ہو سکتا۔ یہ وہ ذات ہے جو صرف اللہ کے نام کی بلندی، اسلام کی عظمت اور مسلمانوں کی خدمت کے لئے جیتی ہے جو قائم اللیل اور صائم النہار ہے جس کے دن امر بالمعروف اور جس کی راتیں نہی عن المنکر کی فکر میں گذرتی ہیں ....

یہ شخص اپنی قوتِ عمل اور کیریکٹر کی بلندی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا، اور دنیاوی ہنگاموں سے اپنا دامن یوں بچائے جاتا ہے جیسے کہ کوئی بات نہیں کل اگر کوئی دوسرا طوفان آتا ہے تو یہ ہستی اسی طرح اٹل رہے گی جیسے سمندر کے تھپیڑوں کے سامنے سخت چٹان۔

وہ ادارہ جہاں مولانا کی ہوش و آگہی کا کم و بیش، سارا زمانہ گذرا اپنے اندر چند خصوصیتیں رکھتا ہے اور ان سے ہر باخبر شخص واقف ہے۔ یہ ادارہ آزاد ہے۔ اس کی روح آزاد ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں کا ہر طالب علم دنیاوی جاہ و حشم سے بے نیاز ہو کر اسلام کا فدائی ہو کر نکلتا ہے۔

حامد قلندر جو چودھویں صدی عیسوی کے درمیان میں پھلا پھولا اور خیر المجالس جیسی مشہور کتاب کا مصنف ہے، لکھتا ہے چشتی سلسلے کے صوفیائے کرام بادشاہوں کے درباروں اور امرا کی محفلوں سے گریز کرتے تھے مولانا کے موصوف کو بھی چشتی سلسلے میں اجازت ہے اور اس سلسلے کے بزرگوں کا فیض ہے کہ مولانا سیاسی جاہ و حشم اور حکومت کے طمطراق سے دور رہتے ہیں اور حضرت علامہ نظام الدین اولیاؒ کے مشہور قول "من بندۂ فقیرم مرا از شاہاں چہ کار" پر عمل پیرا ہیں۔

اس زیرِ بحث "ادارہ" میں مجھے ایک خامی نظر آتی ہے۔ چھوٹا منہ بڑی بات ہے مگر کیا کروں بات اپنی جگہ پر ہے اور یہ میری آزادانہ رائے ہے، بہت ممکن ہے کہ میری رائے صحیح نہ ہو۔ اصحاب علم سے اُمید ہے کہ وہ اصلاح فرمادیں گے۔

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

چولے

سید سفارش حسین

(۲)

چین یہ ساری باتیں دیکھ رہا تھا، پر تھا حیران اس کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ یہ سب کیا اور کیوں ہو رہا ہے؟ اس کا دل تو ڈوبا جا رہا تھا، وہ سوچتا جیسے دن بلٹ جائیں تو کیا اچھا ہو! اس خیال ہی سے اس کا چہرہ چمک اٹھتا۔ رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگتا اور اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ ہوا میں اڑا جا رہا ہو، جیسے گذرے دن سچ مچ لوٹ آئے ہوں، پھر وہ ایک دن چونک پڑتا، جیسے سوتے سوتے خواب میں ڈر کر کوئی چونک پڑے، پھر اس کا جی اداس ہونے لگتا۔

ایک دن بہت سے ڈھول زور زور سے بجے، اتنے زور سے کہ کان کے پردے پھٹنے لگے لوگ کام چھوڑ کر گھروں میں گھس گئے، کنڈیاں بند کر لیں، تالے ڈال لئے، مگر ڈھول بجتے ہی رہے ڈھول بجے جب دیر ہوئی اور کہیں سے چیخ چلانے کی آواز نہ آئی تو لوگ گھروں سے باہر نکلے اور انھیں پتہ چلا کہ راجہ نے سب کو بلایا ہے۔ سب میدان میں جمع ہوئے۔ راجہ ٹیلے پر چڑھ کر بولا "پاپ کو مٹانا دھرم کا پہلا کام ہے۔ ہم نے قسم کھائی ہے کہ ہم پاپ کو مٹا کر رہیں گے، تم بھی قسم کھاؤ کہ یا تو پاپ کو مٹاؤ گے یا مر جاؤ گے۔" راجہ جی کی بات ختم ہوئی تو لوگ زور زور سے چیخنے لگے۔ شور کے مارے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ چین گھبرا گھبرا کر ایک ایک کا منہ دیکھ رہا تھا، اس کا سر چکرانے لگا۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ اب گرا جیسے اس کے پیروں میں جان ہی نہ ہو۔

اگلے دن باجا ایسا بجا کہ سنتے ہی سب مست ہو گئے۔ چین بھی کام چھوڑ کر باجا دیکھنے گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ سجیلے جوان سینہ تانے، مونچھیں چڑھائے ہتھیار چمکاتے چلے جا رہے ہیں انھیں دیکھ کر چین بہت خوش ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی، اور جب کسی نے کہا کہ وہ پاپ مٹانے جا رہے ہیں تو اس کا منہ پیلا پڑ گیا جیسے اس کے بدن میں خون ہی نہ ہو، اس کا سر چکرایا، وہ گرنے ہی کو تھا کہ ایک نوجوان نے بڑھ کر سنبھال لیا، چین کو اس پر بہت پیار آیا اس نے نوجوان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پوچھا "کہاں جا رہے ہو بیٹا؟" نوجوان نے اسے تعجب سے دیکھا اور کہا "تمھیں پتہ نہیں بابا، ہم سب پاپ مٹانے جا رہے ہیں،" چین ٹھنڈی سانس لے کر بولا "پاپ کیسے مٹاؤ گے بیٹا؟" جواب میں نوجوان نے اپنی تلوار چمکائی۔ چین نے پھر پوچھا "تو اس سے پاپ مٹاؤ گے؟" نوجوان نے گردن ہلائی، چین ایک گہرے سوچ میں پڑ گیا۔

سنتے ہیں کہ ایسا رن پڑا کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے، خون کے دریا بہہ گئے، سر زمین پر ایسے لڑھکتے پھرتے جیسے خزاں میں ہوا کے ساتھ درختوں کی گری ہوئی پتیاں، پھر بھی گھوڑی نہ ہاتھ آتی تھی نہ آئی، لال راجہ نے جب یہ دیکھا کہ دشمن کا پلہ بھاری ہے، اس کے آدمی گاجر مولی کی طرح کٹ رہے ہیں۔ تو اس نے اصطبل میں جا گھوڑی کے چاروں پیر کاٹ دیئے۔ اور خود بھی میدان میں مارا گیا، اس کا مرنا تھا کہ بھاگڑ پڑ گئی، جدھر جس کا منہ اٹھا بھاگ گیا پھر پکڑ دھکڑ شروع ہوئی، ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لال آدمیوں کو لاتے اور قیدی بناتے۔ راجہ تو مہاراجہ ہو گیا، پر آدمی محنتی سے مزدور۔ مزدور سے چور اور چور سے بندے بن گئے، چین نے جو دیکھا تو اس کے ہوش اڑ گئے، بدن میں کپکپی پیدا ہو گئی اور ایسا لگا جیسے اس کا دم نکل رہا ہو، وہ بے ہوش ہو گیا۔

اب تو روز خبریں آتیں، یہ راجہ اس راجہ پر دوڑا اس راجہ نے اس مہاراجہ کو مار بھگایا اور خود مہاراجہ بن گیا۔ محنتی کم ہونے لگے۔ مزدور زیادہ اور غلاموں کی اونچ نیچ کی تو کچھ پوچھو ہی مت، جدھر جاؤ دو چار مل جاتے، جدھر دیکھو دس پانچ نظر آ جاتے چین کو ایسا لگا جیسے دنیا دوزخ بن گئی، اس کا جی نہ لگتا، اس نے سوچا اس سے تو مرنا ہی اچھا ہے۔ رات ہو چکی تھی، چاند نکل آیا تھا، چاند کی ٹکیہ بالکل گول تھی، موٹی اور گول جیسے کسی محنتی کی روٹی، اس نے سوچا ندی میں ڈوب مرے، وہ ندی کے پاس پہنچا تو اسے ایسا لگا جیسے چاندی بہہ رہی ہو، چاند کی کرنیں لہروں سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ پانی کی تہہ میں چاند چمک رہا تھا، کانپتا، ٹھٹکتا سا۔ چین کو ایسا معلوم ہوا جیسے چاند بھی دکھی ہو رہا تھا۔ وہ ندی میں پیر لٹکا کر بیٹھ گیا۔ موجیں اس کے پیروں میں لوٹنے لگیں، جیسے منت کر رہی ہوں۔ "چین خودکشی مت کر، جان مت دے، دھیرج رکھ، ہمت باندھ اور کوشش کر۔" پھر اس کے کان میں آواز سی آئی "ارے بس ہو گیا، آس چھوڑ بیٹھا۔ کیا اس سے پہلے مصیبت نہیں آئی تھی، آفتیں نہیں پڑی تھیں، خون خرابے نہیں

رات ہو چکی تھی چاند نکل آیا تھا، چاند کی ٹکیہ بالکل گول تھی موٹی اور گول جیسے محنتی کی روٹی۔ اس نے سوچا ندی میں ڈوب مرے وہ ندی کے پاس پہنچا تو اسے ایسا لگا جیسے چاندی بہہ رہی ہو۔ چاند کی کرنیں لہروں سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ پانی کی تہہ میں چاند چمک رہا تھا، کانپتا، ٹھٹکتا سا، چین کو ایسا معلوم ہوا جیسے چاند بھی دکھی ہو رہا تھا وہ ندی میں پیر لٹکا کر بیٹھ گیا موجیں اس کے پیروں میں لوٹنے لگیں جیسے منت کر رہی ہوں چین خودکشی مت کر، جان مت دے، دھیرج رکھ، ہمت باندھ اور کوشش کر۔

ہوئے تھے۔ دنیا دوزخ نہیں بنی تھی۔ آج تجھے کیا ہو گیا۔ شاید تجھے اپنے پر بھروسا نہیں رہا، تیرا یقین جاتا رہا، اعتماد اٹھ گیا، ایمان کمزور ہو گیا، جان دے رہا ہے؟ مرنے کے بعد پھر؟ کیا یہ دنیا جنت بن جائے گی، سکھ چین پھر پلٹ آئیں گے؟ اگر ایسا ہے تو مر جا، ڈوب جا، جان دے دے۔" پھر جیسے کوئی زور سے ہنسا۔ کسی نے ٹھٹھا لگایا۔ چین کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا جیسے سینے میں سے نکل بھاگے گا۔ اس کے کان گرم ہو گئے تھے۔ بھویں پسینے سے تر تھیں۔ پھر جیسے کوئی کان میں سے کہہ رہا تھا "پاپی، بے دھرم، جس پانی نے تیرے کھیت سینچے، سوکھے حلق کو تری پہنچائی، اسے گندہ کرے گا، اپنا پاپ اس میں گھولے گا کہ پھر پانی کھیت نہ سینچے، کسی کی پیاس نہ بجھائے، اور اس طرح ساری دنیا اَن اور پانی کو ترس ترس کر مر جائے۔"

چین نے ایک پھریری لی، پھریری لیتے وقت اس کی گردن جھکی اور پانی میں اس نے اپنا چہرہ دیکھا بالکل بھوت جیسا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ ندی میں جا پڑا۔

چین کی آنکھ کھلی تو اسے آدمی کچھ نئے سے دکھائی پڑے، ان کا قد کچھ اور سا تھا اور رنگ بھی۔ ویسے وہ تھے بالکل اسی جیسے جب اس نے آنکھیں کھولیں تو ان کے چہرے خوشی سے چمک اٹھے، کوئی دوڑ کر دودھ لایا اور کوئی شربت۔ دودھ تو اتنا اچھا اور ایسے مزے کا تھا کہ اس کے جی میں آیا اور مانگے پر وہ چپ ہو رہا۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے ان کی باتیں سننے کے لئے اس نے آنکھیں بند کر لیں وہ کہہ رہے تھے "دنیا میں ظلم، زیادتی اور بے انصافی بڑھ بھی تو بہت گئی تھی، آدمی آدمی کے خون سے ہولی کھیلتا اور خوش ہوتا، انسان انسان پر ظلم توڑتا اور ہنستا۔ دھرم کا تو نام مٹ ہی گیا تھا۔"

ایک بولا "دھرم؟ پگلا کہیں کا!"

دوسرا بولا "اور راجاؤں کی تو کچھ پوچھو ہی مت، رات دن لڑائی جھگڑا، آئے دن لٹھم لٹھا اور روز روز قتل غارت!"

ایک اور بولا "پر وہ بھی تو راجہ کا بیٹا ہے۔ اس نے راج پاٹ چھوڑ کر یہ نروان کا کھٹ راگ کیسا پھیلایا، اس میں کوئی نہ کوئی بھید ہے۔"

پہلا بولا: "تو تو بالکل گاؤدی ہے گاؤدی ارے مورکھ یہی تو بھگوان کی لیلا ہے۔"

اس پر سب نے مل کر بھگوان جی کا نعرہ لگایا، اور چین جو اب سو سا گیا تھا، چونک پڑا۔

چین گھر آیا تو اسے رنگ ہی بدلا ہوا ملا۔ نقشہ ہی پلٹ گیا تھا جسے دیکھو پریم کی باتیں کر رہا ہے ایک دوسرے سے میل محبت ایسی جیسی سگے بھائیوں میں، دکھ درد تو نام کو نہ تھا۔ اونچ نیچ، چھوت چھات کا تو پتہ بھی نہ لگا کدھر گئے۔ سب اپنے اپنے کاموں میں مگن اور اپنی اپنی کرنی میں مست نہ وہ کسی کا برا چاہتے نہ کوئی ان کا، نہ وہ کسی کو دکھ دیتے، نہ کوئی انھیں۔ نہ وہ کسی سے اونچ بنتے، اور نہ کوئی انھیں نیچ سمجھتا، جو جیسے کرم کرتا ویسے پھل پاتا۔

یہ پیغام دیس دیس پہنچا۔ دور دور ملکوں میں گیا، اور ایسا لگا جیسے یہ دنیا بالکل جنت بن گئی ہو۔ کھیتوں میں پودے پھر ناچنے لگے۔ پودوں کی بالیاں گاگریں سر پر لئے کھیتوں میں کھڑی تھیں کھڑے کھڑے تھک گئیں تو ذرا دم لینے کے لئے جو ایک طرف کمر جھکائی تو دوسری کھیتوں میں کھڑے شریر پودوں نے اپنا منہ بالکل ان کے منہ پر رکھ دیا۔ انھوں نے گھبرا کر جلدی سے منہ دوسری طرف پھیرا، ادھر بھی کچھ شیطان تاک میں کھڑے تھے موقع پاتے ہی انھوں نے بھی وہی حرکت کی۔ بالیوں کو بڑا غصہ آیا۔ وہ لال پیلی ہو گئیں پر کرتیں کیا بوجھ کے مارے قدم زمین میں گڑ گئے تھے، چلنا ناممکن تھا کھیت کی مینڈھ پر کھڑی ہوئی ایک ابلا نے یہ سب دیکھا اور مسرت اور امید کے رنگ کی ملی جلی تصویر اس کی آنکھوں میں کھنچ گئی۔

چین کو اپنی پچھلی بات جب یاد آئی تو وہ دل ہی دل میں شرمندہ سا ہوتا، جھینپ سا جاتا، اور گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا پھر اسے ہنسی آتی اور وہ آپ ہی آپ ہنسنے لگتا۔ اور دل ہی میں خوش ہوتا کہ اپنی آنکھوں سے سنسار میں سکھ اور شانتی دیکھ رہا ہے۔

دن بیتنے لگے، مہینوں، برسوں، اور برس صدیوں میں بدلنے لگے، آہستہ آہستہ نیا پیغام پہنچانے والے پرانے پڑ گئے اور آپس میں جھگڑنے بھی لگے۔ ان کی ٹولیاں بن گئیں، ان ٹولیوں نے پیغام کو چھوڑ دیا اور لگے ایک دوسرے کو جھوٹا بنانے۔ جھوٹ سچ کا یہ جھگڑا چلا تو لوگ پھر سیدھا رستہ چھوڑ ادھر ادھر بھٹکنے لگے۔ دنیا میں پھر اندھیرا چھا گیا۔ پچھلی باتیں پھر لوٹنے لگیں اور ایسا معلوم ہوا جیسے یہ دنیا برے دنوں میں پھر پلٹ جائے گی، پھر وہی مار دھاڑ، پھر وہی لوٹ کھسوٹ، پھر وہی ظلم، پھر طاقتور کمزوروں کو پچھاڑتے، زبردستوں کا ٹھینگا سروں پر ناچنے لگا جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا قانون لاگو ہو گیا۔ پھر آدمی آدمی کو ذلیل کرتا اور خوش ہوتا، پھر انسان انسان سے جانور کا برتاؤ کرتا اور ہنستا۔ چین کو پھر بے چینی شروع ہوئی پھر اس کا سانس چڑھا اس کی بائیں آنکھ پھڑکی اور اس نے سمجھ لیا کہ ہو نہ ہو کوئی بات ہے، کوئی نئی مصیبت آنے والی ہے، اور یہ دنیا پھر اندھیرے گڑھے میں گرے گی۔ بھگوان سیوکوں نے بھی تو کچھ نہیں کیا بیٹھے بیٹھے ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے رہے، کوئی کوئی تو بھگوان ہی بن بیٹھا۔

ہونے والی بات ہو کر رہی، دنیا پھر ایک دفعہ پاپ کے جال میں پھنس گئی اور ایسی پھنسی کہ سب نے سمجھ لیا کہ اب اس کا سنبھلنا مشکل ہے اور تھا بھی اب تو آدمیوں کی بھی ٹولیاں بن گئی تھیں اور آدمیوں کے چھاپ بھی لگ گئی تھی۔ اب آدمیوں کو ٹولیوں سے پہچانتے یا چھاپ سے یا پھر رنگ سے۔ آدمی کو آدمی کی حیثیت سے کوئی نہیں پہچانتا تھا۔

انسان نیچے گرا اور اتنا نیچے گرا کہ جانوروں کے برابر آگیا۔ جیسے وہ جانور ہی ہو گیا تھا، اس کے لئے بڑے بڑے اکھاڑے بنائے گئے، انسان انسان کو ذلیل سمجھتا، نیچ جانتا اور اس میں اپنی اونچائی اور بڑائی ڈھونڈھتا۔ چین کو یقین ہو گیا کہ اب یہ دنیا چلی، یہ سنسار مٹ کے رہے گا۔ یہ دنیا برباد ہو کے رہے گی، اسے خواب بھی تو ایسے ہی نظر آتے۔ آگ، بہت بڑی، بڑے زور کی دہکتی ہوئی آگ اور ساری دنیا جیسے اس آگ میں جل رہی ہو۔ آندھی بڑے زور کی اور پھر گھپ اندھیرا۔ گھبرا کر اس کی آنکھ کھل جاتی۔ بدن پسینے میں شرابور، بدن ایسا گرم جیسے ابھی بھٹی میں سے نکلا ہو۔ ایک دن نہ جانے اسے کیا سوجھی، وہ گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اسے آدمی کی صورت سے ڈر لگنے لگا تھا، انسانوں سے وہ ایسا بھاگتا جیسے بھیڑئیے سے بکری۔ اسی لئے وہ چھپتا چھپاتا، نظریں بچاتا، کبھی رکتا، کبھی چلتا، کبھی ٹھہرتا اور پھر چلنے لگتا، گرمی کے مارے اس کا دم نکلا جا رہا تھا دھوپ کی تیزی بھیجا پگھلا رہی تھی، پیاس سے زبان پر کانٹے پڑ گئے تھے ہونٹ خشکی سے تڑخنے لگے تھے، لیکن پانی کا کہیں نام بھی نہ تھا۔ اس نے ایک ڈگر پکڑ لی اٹھتا بیٹھتا، گرتا، پڑتا، اس پر چلا جا رہا تھا، تھوڑی دور گیا تھا کہ ایک کٹیا نظر پڑی، چھوٹی سی مگر خوبصورت کٹیا کے پاس پہنچ کر اس نے بند دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے کسی نے سخت اور کرخت لہجے میں جواب دیا "چلے جاؤ! دور ہو جاؤ یہاں سے، گندے انسان ہمیں ویرانوں میں بھی چین نہیں لینے دیتے، ہم نے دنیا چھوڑ دی، سنسار تیاگ دیا، سکھ چین تج دیا، پھر بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتے اپنے پاپ میں ہمیں بھی سانا چاہتے ہیں، اپنے گناہوں میں ہمیں بھی شریک کرنا چاہتے ہیں۔ چلے جاؤ........ چلے جاؤ........ چلے جاؤ" چین کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کا سر چکرانے لگا، آنکھوں میں اندھیرا سا آگیا اور اس اندھیرے میں دو لفظ "پاپ"........ "گناہ" ناچ رہے تھے، گلا سوکھ گیا تھا، زبان اینٹھ رہی تھی اس سے بولا نہ گیا مگر بڑی کوشش کے بعد کچھ لفظ اس کے منہ سے نکلے۔ پیاس........ مرا........ پانی، دیوار کے سوراخ میں سے ایک ہاتھ باہر نکلا مٹی کا برتن پانی سے بھرا ہوا۔ چین نے جلدی سے پانی لیا، اس کے ہاتھ بالکل قابو میں نہ تھے، اس کا بس نہ تھا کہ آنکھوں ہی آنکھوں میں سارا پانی چڑھا جائے، دیکھتے ہی دیکھتے برتن خالی کر دے کپکپاتے ہاتھوں سے پانی لے کر سوکھے ہونٹوں تک پہنچاتے پہنچاتے نہ جانے کتنی بار اس نے برتن خالی کیا جب برتن اس کے ہونٹوں سے لگا تو جیسے سارا پانی ایک دم چڑھا جائے گا۔ اس نے پانی منہ میں انڈیلا کچھ گرا، کچھ پھیلا، کچھ اس نے پیا، پیتے پیتے جیسے حلق میں کوئی چیز اڑ گئی ہو، اس کا دم گھٹا، سانس بند ہو گئی، پھندا لگا اور برتن اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا۔ برتن ٹوٹتے ہی اندر سے آواز آئی "پاپی........ گنہگار"

چین کو ایسا لگا جیسے بچھو نے کاٹ لیا ہو، بدن میں مرچیں سی لگ گئیں، منہ لال اور کنپٹی سرخ ہو گئی، پیاس تھوڑی بہت بجھی پر سینے میں آگ بھڑک اٹھی، اس آگ میں جلتا اور اس کے شعلوں میں بھنتا۔ چین وہاں سے چل پڑا۔ اسے غصہ آ رہا تھا۔ آپ ہی آپ وہ خفا ہو رہا تھا اور کس پہ اس کا اسے پتہ نہ تھا۔ اور اس کا ان جانے ہی پر وہ جھنجھلا بھی رہا تھا، مگر چلا جا رہا تھا شاید اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ چلتا ہی رہے گا، نہ کہیں رکے گا، نہ کہیں ٹکے گا اور نہ کسی سے بات کرے گا۔ بھوک پیاس میں بھی وہ کسی سے کچھ نہ کہے گا بس چلتا ہی رہے گا، یہاں تک کہ چلتے چلتے پیر چلنا چھوڑ دیں، بھوک سے وہ مر ہی کیوں نہ جائے پیاس سے اس کا دم ہی کیوں نہ نکل جائے۔ مگر وہ چلتا ہی رہے گا، چلتا ہی رہے گا اور چلتا ہی رہے گا۔ یہی سوچتا۔ دل میں خیال کے ایسے ہی گھروندے بناتا اور بگاڑتا، چین اپنی دھن میں چلا جا رہا تھا کہ انجیر کے پیڑ کے نیچے اسے کچھ آدمی دکھائی پڑے۔ اس نے سوچا، پلٹ جائے راستہ بدل دے، ان کی طرف دیکھے بھی نہیں۔ وہ آدمی سے خفا تھا، انسان سے بدک گیا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں مگر چلتا رہا۔ آواز اس کے کانوں میں آنے لگی، پر وہ چلتا ہی رہا۔ اب کچھ باتیں سنائی دیں، وہ رک گیا۔ اس نے سنا "آدمی پاپی ہے، جنم پاپی، پاپ میں لتھڑا ہوا۔ اسے پھر سے پیدا ہونا ہے میں بھگوان کا بیٹا ہوں، آدمی کے روپ میں آیا ہوں اپنی قربانی دوں گا کہ آدمی کے پاپوں کا بدلہ ہو جائے پھر یہ دنیا انسان کی دنیا بن جائے گی۔ سنسار میں سکھ چین پلٹ آئیں گے۔" چین نے گھبرا کر

آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا تو وہ اس کے پاس ہی کھڑا تھا، بھگوان جیسے کہ اس نے دیکھا، کیسا سندر کیسا بھولا، اس کے دل میں پریم کا ساگر موجیں مارنے لگا۔ غصہ، دشمنی اور جھنجھلاہٹ سب کافور ہوگئے جیسے وہ پھر سے پیدا ہوگیا ہو۔ خدا کا بیٹا بولا "تم پریم کروگے، سب سے پریم" ایسا پریم جیسے تم اپنے آپ سے کرتے ہو۔ کسی کو ستاؤ گے نہیں، تکلیف نہیں دوگے۔ ایذا نہیں پہنچاؤ گے، کوئی تمہارے تھپڑ مارے تو تم دوسرا گال بھی سامنے کردوگے، تم اس کے لئے تیار ہوجاؤ، برداشت کی اتنی طاقت تم پیدا کرلو، پریم کی اتنی شکتی تم میں آجائے تو یہ دنیا پھر انسانوں کی دنیا بن جائے گی۔ کام ذرا کٹھن ہے۔ آسان نہیں۔ مارنے سے مار کھانے میں، پیٹنے سے پٹنے میں، ظلم کرنے سے ظلم سہنے میں، زیادہ طاقت اور زیادہ قوت چاہئے۔ نفرت کا جواب محبت سے دینا۔ ستانے والے سے محبت اور ظلم کرنے والے سے پریم کے ساتھ پیش آنا کوئی سہل کام نہیں، اس میں بدن کی طاقت، بازوؤں کا بل کام نہیں دیتا۔ آتما کی شکتی اور روح کی طاقت چاہئے۔"

اوروں کی طرح چین بھی ان باتوں کو سنتا رہا جیسے چھوٹے بھائی کہانی سنتے ہیں۔ پھر ایک بولا: بات تو ٹھیک ہے پر ہے ٹیڑھی کھیر۔ اس کے لئے تو سچ مچ آدمی کو پھر سے پیدا ہونا چاہئے۔" بھگوان کے بیٹے کا یہ پیغام چاروں طرف پھیل گیا۔ لوگ نئے پیغام کے بھوکے تھے، اس لئے جس نے سنا۔ ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس طرح بگڑی دنیا پھر سنور گئی۔ اجڑے کھیت اور سوکھے چمن ہرے ہوگئے، پھول کھلے، کھیت اناج سے بھر گئے درخت میووں سے لد گئے اور زندگی پھر سے جوان ہوگئی۔ جوانی آئی۔ ایسی جوانی جسے دیکھ کر زندگی کو بھی پیار آگیا۔ دنیا پریم سے بھر گئی، دکھ درد، رنج و غم مٹ گئے، اور ہر طرف چین کی بنسی بجنے لگی۔ چین کو بھی چین نصیب ہوا۔ اس کے دئے جلے یاس کی اندھیاری دور ہوئی امید کی روشنی نا امیدی کی سیاہی پر ایسی پھر گئی جیسے کالی دیوار پر چونے کی سفیدی، مگر پاپ کا دھبہ کلنک کا ٹیکہ بن کر ایسا لگا کہ چھٹائے نہ چھٹا۔ ہزاروں جتن کئے، لاکھوں ترکیبیں نکالیں مگر کسی کے کئے کچھ نہ بنا اور ٹیکا جوں کا توں۔ آخر تنگ آکر ایک دن اس نے تیاگ کی ٹھانی اور موقع پاکر گھر سے نکل گیا نکلنے کو تو چین گھر سے نکل گیا، مگر دل وہیں اٹکا رہا، کبھی گھر یاد آتا، کبھی گھر کی چیزیں، کبھی کھیت کبھی ڈھور ڈنگر۔ رفتہ رفتہ اور آہستہ آہستہ یاد دھندلی پڑتے پڑتے بالکل مٹ گئی اور اب چین گیان دھیان میں لگ گیا۔ آبادی سے دور، آدمیوں سے الگ اس نے ایک کٹیا بسائی یہی اس کی دنیا تھی، اسی میں وہ آتما کا سکھ اور روح کا چین تلاش کرتا۔ وقت گذرا، سورج نکلتا اور چھپتا رہا، چاند گھٹتا اور بڑھتا رہا، لو چلی، بارش آئی، پھول کھلے، پت جھڑ ہوا، چین نے سرد گرم دیکھا، مگر وہ اپنے ارادہ پر ڈٹا اور اپنے خیال پر اڑا رہا۔ آخر سچائی اور پکا پن رنگ لایا اور چین جیسے دیوتا بن گیا ہو۔ آتما کی شکتی اس کے چہرے پر نور بن کر چمکنے لگی۔ روح کی طاقت نے اس کی آنکھوں میں جلال بھر دیا، وہ ہلکا پھلکا تو ایسا ہوگیا کہ پھریوں میں تول لو اور بھاری بھرکم ایسا کہ اونچے اونچے پہاڑ تھرا جائیں اور کلنک کا ٹیکہ تو ایسا گیا کہ جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ وہ چپ رہتا تو چپ ہوکے رہتا اور جو کرتا تو لوگ حیران ہوجاتے کہ کیسے ہوگیا وہ چپ ہی رہتا، بولتا تو کبھی کبھار اور وہ بھی ایک دو لفظ، اکثر تو وہ اشارے ہی کردیا کرتا اور دیکھنے والے سمجھ لیتے، اس کی کٹیا کے سامنے لوگوں کا ٹھٹ لگا رہتا، کچھ بیمار، کچھ اپاہج، کچھ غرض مند اور کچھ عقیدت مند سب کے سب گھنٹوں کھڑے رہتے۔ صبح سے شام کردیتے چین جب کٹیا سے نکلتا تو وہ آنکھیں بچھاتے، مرادوں کے دامن پسار لے اور امیدوں کے ہاتھ پھیلائے چین جس کی طرف دیکھ لیتا، دلدر دور ہوجاتے دنیا سنور جاتی۔ عقبیٰ درست ہوجاتی، مگر بہتیرے نامراد ہی لوٹ جاتے اور پھر مقدر آزماتے۔

(باقی آئندہ)

مولانا مدنی

(بہ سلسلہ صفحہ)

یہ ادارہ "نئی بصیرت" کا قائل نہیں۔ موجودہ زمانے کے نت نئے تقاضے جو چار دانگ عالم میں ایک ہنگامہ برپا کئے ہوئے ہیں، اس جماعت پر تو کوئی اثر نہیں ڈال سکتے، مگر قوم کے نوجوان افراد کی گمراہی اور اسلامی عقائد کا تمسخر کسی تاریک زمانہ کی خبر دے رہا ہے۔ زمانہ حال کا مقابلہ ہم گیارھویں صدی عیسوی کے زمانے سے کرسکتے ہیں۔ وہ زمانہ جبکہ بنی عباس اور ترکی النسل بادشاہوں کے اقتدار نے یونان اور عجم کے جاہل فلسفیوں کو چولی توں ہے کہ مسلمانوں میں پھیلا دیا تھا اور دنیوی اقتدار کی باگیں جن لوگوں کے ہاتھ آئیں وہ علوم دینی سے بالکل ہی کورے تھے۔ یونانی فلسفے کی اشاعت سے عقائد کی بنیادیں ہل گئیں۔ محدثین و فقہا علوم عقلیہ کے ناواقف تھے، اس لئے نظام دین کو مقتضائے زمانہ کے مطابق معقول انداز سے نہ سنبھال سکتے تھے اجتہاد کے چشمے خشک ہوگئے تھے، تقلید کا دور دورہ تھا۔ نئے نئے فرقے پیدا ہوئے اخلاقی انحطاط نے تمام اسلامی دنیا کو چھا لیا۔ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر قرآن اور سنت کا کوئی اثر نہ رہا۔ بادشاہوں کی عیاشانہ زندگی اور امراء جاگیردار طبقوں کے اسراف نے رعایا کا حال تباہ کردیا غرض عام تباہی کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ یہ حالات تھے جب امام غزالی پیدا ہوئے۔ انھوں نے علوم عقلیہ پر عبور حاصل کیا۔ پھر اسی میدان میں پہنچے جہاں کے لئے تیار ہوئے تھے۔ دنیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی "نظامیہ بغداد" کے ریکٹر مقرر ہوئے۔ وقت کی سیاسیات میں حصہ لیا، اور دنیاوی اعتبار سے ترقی کے اعلیٰ ترین مدارج پر پہنچ گئے۔ مگر گردوپیش کے حالات اور مسلمانوں کے اخلاقی انحطاط نے اُن کے اندر بغاوت کا جذبہ پیدا کیا اور آخرش دنیاوی بندشوں کو توڑ کر نکلے اور پھر وہ تجدیدی کام کیا جس کی وجہ سے انھیں "حجتہ الاسلام" کا خطاب ملا۔

ایسے ہی نازک دور سے مسلمان گذر رہا ہے پھر میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ وقت کے جاہلی فلسفوں اور بار دینی پھیلانے والے عقائد کے خلاف اعلانیہ جنگ کیوں نہیں کی جاتی، یہی ادارہ نئے حالات نئے دور اور اس کے کوائف کے خلاف جنگ کرسکتا ہے اور مسلمانوں کو تباہی سے بچا سکتا ہے۔

دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ مولانا وقت کے ہنگاموں سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کا کوئی خاص طریق کار نکالیں اور دیوبند کے آزاد اداروں میں کچھ چیدہ افراد کو اپنے طرز خاص پر تعلیم و تربیت دے کر تیار کریں تاکہ اُن کی یہ کوشش کوئی بڑا انقلاب انگیز کام کرسکے۔

مولانا کے عقیدت مندوں کو میں نے تنقیدی نظر سے دیکھا ہے، میرا یقین ہے کہ وہ ایک اصحاب ایسے موجود ہیں جو زمانے کی نیرنگیوں کو دیکھ کر یہ محسوس کرسکتے ہیں ؎

گنبد نیلو فری رنگ بدلتا ہے کیا

ہم کدھر جا رہے ہیں

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

لیکن یہ بات کا یہ [illegible] اسی وقت بن سکتا ہے جب ہم [illegible] کا [illegible] کو تیار ہوں اور [illegible] کے بارے میں [illegible] سے کام لیں [illegible] تعصب اور [illegible] کی نہیں ہوگی رواداری اور فراخ دلی کی ہوگی اور اگر ہم ذہنی اور اخلاقی ہتھیاروں کو اپنا لیں تو باوجود اکثریت کی قوت کے میدان ہمارے ہاتھ رہے گا۔ پانی کا جھاگ دیکھتے دیکھتے غائب ہوجاتا ہے۔ لیکن جو چیزیں حق اور عوام کے فائدے پر مبنی ہوتی ہیں وہ باقی رہتی ہیں ❊

ناشروں سے

براہ کرم مفصل تبصرہ کے لئے کتاب کے دو نسخے بھیجیے

(ایڈیٹر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

ادارۂ تحریر:-
ڈاکٹر سید عابد حسین ۔ صالحہ عابد حسین
عبداللطیف اعظمی
جامعہ نگر (دہلی)

اپنا قصور دوسروں کے سر (بسلسلہ صفحہ ۱)

کیا ہے ۔ قیامت سی آجاتی ہے ۔ اُسے خود اپنی کمزوریوں سے جو شدید نفرت محسوس ہوتی وہ غیر شعوری طور پر دوسروں کی طرف سے منتقل ہو جاتی ہے ۔ اب اس کی زبان کی کٹار سے کسی کو پناہ ملنا مشکل ہے ۔

یہ انتقال قصور نوع انسانی کے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے ، سماج کی نشوونما کی ابتدائی منزلوں میں انسان اپنے قصور دیوتاؤں کے سر تھوپ دیا کرتا تھا ، پھر ذرا گھما پھرا کر تقدیر کو اور شیطان کو کوسنے لگا ۔ یہاں تک اس نے خدا کو بھی نہیں چھوڑا ۔ اس کی مثالیں کم نہیں کہ مایوسی یا ناکامی کے بعد لوگ خدا سے بیزار یا باغی ہو جاتے ہیں ۔

عقل و دماغ کی پختگی کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس عمل انتقال کو ترک کر دیں اور اپنی بھلائیوں اور برائیوں کو اپنے ہی اندر ڈھونڈیں ۔ مگر یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ یہ عمل ہماری نشوونما کا ضروری جز ہے ۔ بلوغ اور پختگی کی ایک سیڑھی ہے ۔ مشکل اس وقت ہوتی ہے جب ہم اسی سیڑھی پر رک جائیں اور اوپر کی سیڑھیوں پر چڑھنے سے انکار کریں ۔

(ماخوذ)

تاریخ اشاعت :- یکم ، ۸ ، ۱۶ ، ۲۴

چندہ :- سالانہ ہے ششماہی للعہ

دفتر "نئی روشنی" جامعہ نگر دہلی

طابع و ناشر :- عبداللطیف (نائب جامعہ)

مطبوعہ :- حیدری پریس دہلی

NAI ROSHNI
DELHI

جلد ۳ نمبر ۱۳ | یکم اکتوبر ۱۹۴۹ء لنہ ۶ | ایڈیٹر:- ڈاکٹر سید عابد حسین

آپ میں خلوص کتنا ہے

(اصل خلوص دنیا میں ایک نایاب چیز ہے۔ ہم میں سے اکثر لوگوں میں کچھ نہ کچھ ظاہر داری اور بناوٹ ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کی شکلیں الگ الگ ہیں۔ بعض صورتوں میں ظاہر داری سے کچھ زیادہ ہرج نہیں ہوتا۔ لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے ہمیں اپنی ذہانت اور فراست، جس سے مفید کام لیا جاسکتا تھا، بے کار ملمع سازی میں ضائع کرنی پڑتی ہے۔ اگر آپ کو اس کی جانچ کرنا ہے کہ آپ میں کتنا خلوص ہے تو ذیل کے سوالوں کے جواب "ہاں" یا "نہیں" ایک کاغذ پر لکھتے جائیے اور پھر صفحہ ۱۰ کا نوٹ پڑھیے۔)

---

۱ - کیا آپ اس اصول کے پابند ہیں کہ دوسروں کے بارے میں ایسی باتیں نہیں جو آپ ان کے منھ پر نہ کہہ سکتے ہوں ؟
۲ - کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ کبھی کبھار "بے ضرر جھوٹ" بول دینا بھی جائز نہیں ؟
۳ - جب آپ سے کوئی غلطی ہوجائے تو آپ اس کا الزام دوسروں کے سر منڈھنے کے بجائے اپنے سر لینے پر تیار ہوجاتے ہیں ؟
۴ - کبھی آپ نے اپنے اصول کی خاطر اپنے مادی فائدے کو قربان کیا ہے ؟
۵ - کیا آپ اس کا اہتمام کرتے ہیں کہ کسی سے اس وقت تک کوئی وعدہ نہ کریں، جب تک آپ کو اس کے پورا ہونے کا یقین نہ ہو ؟
۶ - کیا ایسے موقعے بہت شاذ ہوتے ہیں جب آپ خوشامد سے کام لیں۔
۷ - کیا آپ کاروباری معاملات میں بھی وہی معیار اپنے سامنے رکھتے ہیں جو دوستانہ تعلقات میں آپ کے پیش نظر رہتا ہے ؟
۸ - کیا آپ بڑے آدمیوں کے ساتھ اپنے گہرے تعلقات کا ذکر کرنے میں اصلیت سے تجاوز نہیں کرتے ؟
۹ - کیا آپ اپنی مالی حالت کے بارے میں صاف گوئی سے کام لیتے ہیں۔ تعداد اپنی آمدنی بڑھاکر یا گھٹاکر نہیں بتاتے ؟
۱۰ - کیا عام طور پر لوگ آپ کے بارے میں یہ خیال رکھتے ہیں کہ آپ جو کہتے ہیں دل سے کہتے ہیں ؟
۱۱ - کیا آپ اکثر اپنے مقدور سے زیادہ خرچ کرتے ہیں، تاکہ دوسروں کی برابری کرسکیں ؟
۱۲ - کیا کبھی آپ دوسروں کو ایسا مشورہ دیتے ہیں جس پر آپ کو خود یقین نہیں ہوتا ؟
۱۳ - کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ سے خیرات مانگی جائے اور آپ جھوٹ موٹ کہیں کہ کھلے ہوئے روپے یا پیسے موجود نہیں ؟
۱۴ - کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ آپ اپنا مطلب نکالنے کے لئے بیمار بن گئے ہوں ؟
۱۵ - کیا کام کرتے وقت آپ کبھی جان کر اس کی کوشش کرتے ہیں کہ ادھورا یا ناقص کام کر کراکے سستے چھوٹ جائیں ؟
۱۶ - کیا ایسا شاذونادر ہی ہوتا ہے کہ آپ کو کسی شخص سے کسی بات میں اختلاف ہو ؟
۱۷ - کیا آپ اس بات کو چھپاتے ہیں کہ آپ اپنی روزی کس طرح کماتے ہیں ؟
۱۸ - کیا آپ اکثر مبالغے سے کام لیتے ہیں ؟
۱۹ - کیا آپ میں اس کا مادہ ہے کہ دوسروں کے خلوص پر شبہہ کریں اور ان کے ہر فعل میں کوئی نہ کوئی غرض چھپی ہوئی سمجھیں ؟
۲۰ - کیا آپ کو لوگوں سے پائدار دوستی کا رشتہ قائم کرنے میں مشکل پیش آتی ہے ؟

فہرست مضامین

قیمت فی پرچہ ۳ر

کاہن اعظم کی پیشین گوئی

مشتاق احمد

ہندوستان کے اتر میں ہمالیہ پہاڑ کے بیچ میں سطح سمندر سے ۱۸ ہزار فٹ کی بلندی پر تبت کا پراسرار ملک واقع ہے، دلائی لاما کی یہ مملکت کوہ کنلن اور ہمالیہ کے بیچوں بیچ پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا ایک سرا پچھم میں کشمیر سے جا ملتا ہے تو اس کا دوسرا سرا پورب میں چین کی سرحد کو چھوتا ہے۔ سارے ملک میں اونچے اونچے پہاڑ غرور سے سر اٹھائے کھڑے ہیں۔

ابھی حال میں ایک روز کیا دیکھتے ہیں کہ برفیلے پہاڑوں کے پیچ اور پیچ راستوں سے ۱۴ ویں دلائی لاما کے سفیر لمبی لمبی رنگین قبائیں پہنے سر پر تاش کے جوکر جیسی گز بھر لمبی ٹوپیاں اوڑھے، نی چنگ کی خانقاہ کی طرف بڑھے چلے جا رہے ہیں، خانقاہ میں پہنچ کر سفیروں نے تبت کے کاہن اعظم سے سوال کیا۔ اے دیوتاؤں کے محبوب! سرخ خطرہ بڑھا چلا آ رہا ہے۔ تبت اس کم بخت مارے سے بچنے کی کیا تدبیر کرے؟

کاہن اعظم جو اپنی عمر کے ۵۰ ویں حصے میں قدم رکھ چکے ہیں ایک گول مٹول سی ہستی ہیں، پیلے کپڑوں میں لپٹے ہوئے ایک گوشۂ تنہائی میں پڑے رہتے ہیں

ہیں گو دنیا سے الگ اک گوشۂ عزلت میں رہتا ہوں

پھر بھی ان کی قوم مشکل کشائی کے لیے ان کے کنج تنہائی میں قدم دھر ہی دیتی ہے۔ دلائی لاما کے سفیروں کا سوال سن کر کاہن اعظم پر ایک بے خودی کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ وہ غیبی طاقت سے دلائی لاما کے سوال کا جواب پوچھنے کے لیے ذری ذری سی دیر بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ اتنے میں ان کے چیلے پراچین کال کی کتابوں کو الٹ پلٹ کرتے رہتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد انھیں ہوش آتا ہے وہ معرفت کے سمندر میں ڈوب کر موتی نکال لائے، سوال کا جواب مل گیا۔ قافلہ واپس ہوتا ہے اب سب لوگ لہاسا کے بتدریج بلند ہونے والے اونچے اور سفید قصر پوٹالا کی طرف بڑھتے ہیں۔

قافلے کے آگے آگے کاہن اعظم ہیں اور پیچھے پیچھے [illegible] کاہن اعظم آخر کار وہ لمبے چوڑے کمرے کے پاس پہنچتے ہیں، جہاں وہ ذات متبرک سراپا شفقت، وہ قاعدہ کلام [illegible] مالک دین و دنیا، بحر بے پایاں ۱۴ ویں [illegible] مقدس دلائی لاما اپنے تخت پر بیٹھا [illegible] یوگ اور تپ میں مشغول رہتا ہے، کاہن اعظم تین دفعہ جھک کر آداب بجا لایا، ایک قبا کے ریشمی [illegible] چڑھائی اور گویا ہوا۔

اس کے الفاظ تبت کی تنہا ٹیلی گراف لائن کے ذریعے جس کا ایک سرا شمالی ہند کے شہر کلمپونگ میں واقع ہے۔ بھنبھناتے ہوئے فوراً ساری دنیا میں پھیل گئے۔ ارشاد ہوا "تبت کا سکھ اس کا امن چین، اس کی تنہائی ملیا میٹ ہو جائے گی اگر کافروں (آپ کی مراد چینی کمیونسٹوں سے تھی) کے بڑھتے ہوئے طوفان کی فوری روک تھام نہ ہوئی۔ تبت کے مذہبی راج کو کمیونزم کا مقابلہ کرنا چاہیے۔"
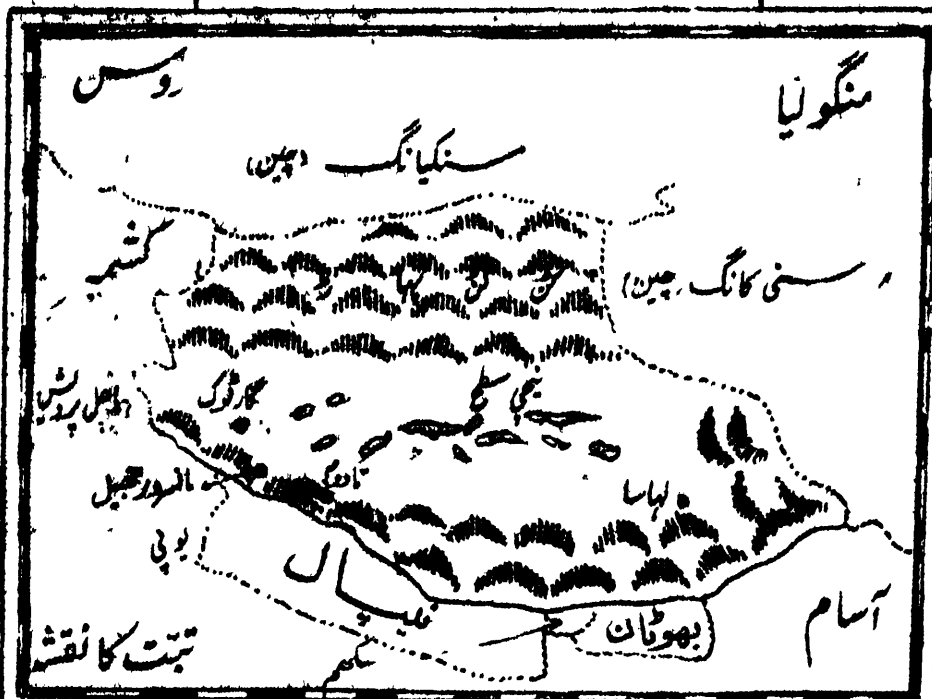
روس
منگولیا
سنکیانگ (چین)
سی کانگ (چین)
کشمیر
ہماچل پردیش
گارٹوک
تبتی سطح
مانسرور جھیل
یوپی
لہاسا
نیپال
بھوٹان
سکم
آسام
تبت کا نقشہ

دلائی لاما کا حکم صادر ہوتا ہے کہ فوراً تین ہزار خواندہ لاما تمام خانقاہوں میں پھیل جائیں جو سارے چین میں سنکیانگ سے لے کر پی کنگ کے دروازوں تک بکھری پڑی ہیں اور کاہن اعظم کی یہ پیشین گوئی بچے بچے کے کان میں ڈال دیں۔

کاہن اعظم کی اہمیت

تبت کے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ رحم کا خدا دلائی لاما کے روپ میں جنم لیتا ہے۔ جب ایک دلائی لاما مر جاتا ہے تو پھر وہ کسی دوسرے جسم کی تلاش کرتا ہے، عموماً یہ جسم ایک ایسے لڑکے کا ہوتا ہے جو دلائی لاما کی موت کے وقت پیدا ہوا ہو [illegible]

[illegible] ۱۴ ویں دلائی لاما کو آگے بڑھایا [illegible] سر پر آ رہا ہے [illegible] سال کی تھی اس وقت [illegible] کاہن اعظم [illegible] کے دو سبب بتائے جاتے ہیں۔

(۱) دلائی لاما اور ان کے مشیر [illegible] لاماؤں میں اپنے کھوئے ہوئے اثرات کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے ہیں۔

(۲) ۱۹۵۰ء میں چین کے حملے کی وجہ سے ۱۴ ویں دلائی لاما کو اپنا وطن چھوڑ کر ہندوستان میں پناہ لینی پڑی تھی، اسی وقت سے تبت والوں کے دلوں میں چینیوں کی طرف سے [illegible] پہنچی ہے۔ قصر پوٹالا کے با اثر امیر چینیوں کے سخت خلاف ہیں۔ چینی اب تک تبت کو اپنی سلطنت کا ایک حصہ کہنے سے باز نہیں آتے اور حال میں تبت میں ان کی کارستانیوں سے خاص بے چینی رہی ہے

تبت کا مختصر حال

تبت کا رقبہ کوئی چار لاکھ ستر ہزار مربع میل ہے، اور آبادی ۳۰ لاکھ کے لگ بھگ (ہندوستان کا رقبہ ۱۲ لاکھ ۱۹ ہزار مربع میل اور آبادی ۳۶ کروڑ ہے۔ پاکستان کا رقبہ ۳ لاکھ ۶۴ ہزار مربع میل اور آبادی ۷ کروڑ ہے) راج دھانی کا نام لہاسا ہے

۷ ویں اور ۸ ویں صدی میں یہ ملک اتنا گمنام اور پس ماندہ نہیں تھا جتنا آج ہے۔ تبت سے ہو کر چین اور نیپال کو ایک باقاعدہ راستہ گزرتا تھا، ۷ ویں صدی میں یہ ایک زبردست سلطنت تھی۔ یہاں تک کہ چین بھی اس کا باج گزار رہا۔ شہنشاہ سانگ سین گم پو نے تبت میں بدھ مذہب کا پرچار کیا اور ایک رسم الخط کی بھی ابتدا کی جس کی بنیاد سنسکرت پر تھی اس طرح ہندوستان کی بدھ مت کی کتابوں کا تبتی زبان میں ترجمہ ہوا۔ اس کے ایک ہزار سال بعد یعنی ۱۸ ویں صدی میں ساتویں دلائی لاما کی گدی نشینی کے موقع پر منگولوں اور تبت والوں میں تکرار ہوئی۔ اس جھگڑے سے فائدہ اٹھا کر سلطنت چین [illegible]

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

نئی روشنی

دہلی

یکم اکتوبر ۱۹۴۹ء

امن کا امکان کچھ بڑھ ہی گیا

پریسیڈنٹ ٹرومین کا یہ اعلان کہ پچھلے ہفتے میں روس میں ایک ایٹم بم پھٹا ۔ بجائے خود ایک چھوٹا سا ایٹم بم تھا جس نے ساری ہی دنیا میں خصوصاً شمالی امریکا اور مغربی یورپ میں ہل چل ڈال دی ۔ اس بات پر سب متفق ہیں کہ روس کے پاس ایٹم بم موجود ہونے کی خبر دنیا کے لئے بہت بڑی اہمیت رکھتی ہے اور اس سے بین الاقوامی سیاست کی صورت حال بالکل بدل جائے گی ۔ لیکن اس تبدیلی کی نوعیت کیا ہوگی؟ اس بارے میں دو بالکل متضاد رائیں ہیں ۔

بعض کا خیال ہے کہ اب امریکی بلاک اور زیادہ تیزی اور شدت کے ساتھ جنگ کی تیاریاں کرنے لگے گا اور اس کی وجہ سے روسی بلاک میں بھی سلاح بندی کی رفتار بڑھ جائے گی اور تیسری عالم گیر جنگ جس کا چھڑنا یقینی ہے اور بھی جلدی چھڑ جائے گی ۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ اب جب دونوں فریقوں کو یکساں خطرہ ہوگا کہ ایٹم بم کی لڑائی سے کہیں دوسرے کے ساتھ خود ان کا بھی نام و نشان بھی صفحۂ ہستی سے نہ مٹ جائے تو پھر دونوں لڑائی کو ٹالنے کی کوشش کریں گے ۔ ایک تیسری درمیانی رائے یہ بھی ہو کہ لڑائی تو جلدی ہی ہوگی مگر اب اس میں ایٹم بم استعمال نہیں ہوگا ۔

اس کا فیصلہ کرنے کے لئے ان دونوں تینوں رایوں میں سے کون سی صحیح ہے، ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ آخر پچھلے دنوں لڑائی کی یہ ساری ہماہمی کیوں تھی؟ یوں تو دو ملکوں کو ایک دوسرے سے جنگ پر اُبھارنے والی بہت سی چیزیں ہوتی ہیں، لیکن لڑائی چھڑنے کے قطعی سبب دو ہی ہو سکتے ہیں، ایک دوسرے کی اغراض میں شدید تصادم یا ایک دوسرے کا شدید خوف ۔ جہاں تک اغراض کا سوال ہے اس وقت امریکہ اور روس میں براہِ راست کوئی ٹکر نہیں ہے ۔ روس کو سب سے زیادہ اور سب سے پہلے اپنی معاشی تعمیر نو کی ضرورت ہے اور اس میں امریکہ کسی طرح حائل نہیں ہو سکتا امریکہ البتہ یہ چاہتا ہے کہ دنیا میں پھیلا کر اپنا اثر بڑھانا چاہتا ہے ۔ اس میں روس کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا ۔ اس میں شک نہیں وسطی یورپ ، بلقان ، مشرقِ وسطیٰ ، ہند و پاکستان اور مشرقِ بعید میں دونوں اپنے اپنے حلقۂ اثر کو بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن یہ حکمتِ عملی کا مقابلہ طاقت ور قوموں میں ہمیشہ ہوتا ہی رہتا ہے ۔ محض اس کی وجہ سے ان میں لڑائی نہیں چھڑا کرتی ۔ لڑائی تک نوبت اس وقت پہنچتی ہے جب اس مقابلے کی تہہ میں دونوں فریقوں کی فوری اور شدید اغراض ہوں جو بظاہر اس وقت موجود نہیں ۔ اب خوف کا معاملہ رہ جاتا ہے حقیقت میں پچھلے دنوں لڑائی کے چرچے اور لڑائی کی تیاریوں کا محرک خوف کا جذبہ تھا اور جہاں تک ہم اندازہ کر سکتے ہیں روس میں ایٹم بم تیار ہو جانے سے باہمی خوف کی شدت کم ہو جائے گی اور اسی کے ساتھ لڑائی کا امکان بھی گھٹ جائے گا ۔

اس باہمی خوف کی ابتدا اس طرح ہوئی تھی کہ جیسے ہی ایٹم بم کے دو دھماکوں نے ناگاساکی اور ہیروشیما کو تباہ کر کے جاپان کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا کہ یہ آوازیں سنائی دینے لگیں کہ امریکہ کے بعض فوجی ماہر اپنی حکومت کو یہ رائے دے رہے ہیں کہ لگے ہاتھوں روس سے بھی نبٹ لیا جائے اس لئے کہ کبھی نہ ایک دن تو نبٹنا ہی ہوگا ۔ اس کے بعد بار بار امریکہ کے اخباروں میں یہ اندازے چھپنے لگے کہ روس کو ایٹم بم بنانے میں اتنے سال لگ جائیں گے اور اس کے ساتھ یہ اشارے بھی کہ اس کے بعد روس سے جنگ کرنا مشکل ہو جائے گا ۔ اس وقت بہت آسان ہے ۔ اب چاہے ان حرکتوں کا مقصد واقعی امریکی حکومت کو فوری لڑائی پر آمادہ کرنا ہو یا محض روس کو دھمکانا تاکہ وہ بعد جنگ مسائل کی بحث میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں سے دبا رہے ۔ بہر حال روس میں اس کی وجہ سے خوف کی لہر دوڑ گئی اور اس نے تعمیر نو کے بہت سے ضروری کاموں کو ملتوی کر کے اپنی جنگی مشین کو اور زیادہ طاقت ور بنانے کے لئے پورا زور لگا دیا ۔ روس کی تیاریوں کی خبریں بڑھا چڑھا کر امریکہ اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں شائع ہونے لگیں جس سے وہاں بھی خوف کا جذبہ ابھرا ۔ اور جنگ سے پسی ہوئی مخلوق مکھن کی جگہ توپوں کا مطالبہ کرنے لگی ۔ جنگی بجٹ بڑھنے لگے ۔ ایٹم بم کے دھماکوں کے مظاہرے ہونے لگے ، آپس میں فوجی مشورے اور معاہدے کئے جانے لگے ۔ اس سے روس اور خوف زدہ ہوا اس نے اپنی تیاریوں کی رفتار اور بڑھا دی اور جیسا کہ خوف میں اکثر ہوتا ہے دھمکی کا جواب دھمکی سے دینے لگا ، غرض جنگ کی تیاریوں اور دھمکیوں کا ایک چکر بندھ گیا جو کسی طرح ٹوٹنے میں نہیں آتا تھا ۔

لیکن اب جب یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ روس نے بھی ایٹم بم بنا لیا امریکہ میں ان لوگوں کو جو اس معاملے میں روس کی بے بسی سے فائدہ اٹھا کر چاہتے تھے کہ لڑائی جلدی سے جلدی چھڑ جائے ۔ اتنی زیادہ عجلت نہیں رہے گی ۔ بعض فتنہ انگیز یہ کہہ رہے ہیں کہ ابھی روس ایٹمی اسلحہ کے مکتب میں مبتدی ہے ۔ اس نے جو بم بنایا ہو وہ زیادہ سے زیادہ ہیروشیما کے بم کے برابر طاقت رکھتا ہوگا مگر امریکہ اس سے کہیں زیادہ زوردار بم بنا چکا ہے ۔ پھر اس کے پاس بموں کی جتنی تعداد ہے روس کے پاس اس کا دسواں حصہ بھی نہ ہوگا ۔ اس کے علاوہ امریکہ کے پاس مہلک جراثیم کا ہتھیار ہے جو روس کے پاس نہیں ہے ان سب میں یہ اشارہ موجود ہے کہ کچھ ایسی دیر نہیں ہوئی ہے اگر فوراً لڑائی چھیڑ دی جائے تو امریکہ فائدے میں رہے گا ۔ لیکن بہتوں کے دلوں میں اب شبہہ پیدا ہو گیا ہے کیا معلوم شاید موسیو مولوٹوف کا یہ دعوے صحیح ہو کہ روس نے ۱۹۴۷ء ہی میں ایٹم بم بنا لیا تھا ؟ شاید اس کے پاس بھی اچھی خاصی تعداد میں بم تیار ہوں ؟ شاید اس نے بھی مہلک جراثیم چھپا کر رکھے ہوں ؟ اور یہ سب نہ سہی ۔ اگر روس کے پاس کم سے کم ہیروشیما ٹائپ کے دو چار بم بھی ہوں تو امریکہ کے چند بڑے شہروں یا چند ریاستوں یا مغربی یورپ کے ایک حصے یا انگلستان کے بہت بڑے حصے کو تو تباہ کر ہی سکتا ہے ۔ جس بجلی کے متعلق یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کدھر گرے گی وہ ساری دنیا کو چوکنا رکھنے کے لئے کافی ہے ۔

اس لئے قرین قیاس یہ ہے کہ خود امریکہ میں جنگ کے اکثر حامیوں کا جن کا جوشِ شجاعت ایٹم بم کے یکطرفہ استعمال پر منحصر تھا ، ارادہ ڈانواں ڈول ہو جائے گا ۔ رہے برطانیہ اور مغربی یورپ کے ملک وہ تو اب لڑائی کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھیں گے ۔ روس کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے لیکن جہاں تک اندازہ کیا جا سکتا ہے اس پر وہ خود اعتمادی جو ایٹم بم کی دریافت کے بعد اس کے اندر پیدا ہوگئی ہے اچھا اثر ڈالے گی ۔ ممکن ہے حکمت عملی کے میدان میں اس کی نازک مزاجی اور بڑھ جائے لیکن اب اُسے لڑائی کی دھمکیوں کی جن سے وہ اپنے خوف کو چھپانے کے لئے کام لیا کرتا تھا ، ضرورت نہیں رہے گی ۔

صورت حال کا صحیح اندازہ آئندہ دو تین مہینے کے اندر ہوگا جو اس وقت تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ روس میں ایٹم بم بن جانے سے دنیا میں امن قائم ہونے کا امکان کم نہیں ہوا بلکہ کچھ بڑھ ہی گیا ۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کے قائم ہونے کا اعلان جو آپ اس پرچے میں پڑھیں گے اردو کے شیدائیوں کے لئے برسوں بعد اُمید کی پہلی نوید ہے جو سنائی دی ہے ۔ روشنی کی پہلی کرن ہے جو نظر آئی ہے اردو کی محبت کا دعوےٰ کرنے والوں کے لئے امتحان کا وقت آ گیا ہے ۔ زبان کے تحفظ اور ترقی کی راہ میں آہ و بکا ، نالہ و فریاد

(بقیہ صفحہ ۳ پر)

دُنیا کی رفتار

ہندوستان

روپے کی قیمت ڈالر کے مقابلے میں کم ہوجانے کا اثر اب تک صرف امریکی چیزوں پر پڑا ہے، خصوصاً امریکہ سے آنے والی دواؤں پر سونے کی قیمت بھی کچھ خفیف سی بڑھی ہے۔ لیکن پاکستانی روپے کے مقابلے میں ہندوستانی روپے کی قیمت چوالیس فی صدی کم ہوجانے کی وجہ سے دونوں ملکوں میں روپے کی آمد و رفت اور تجارتی کاروبار عارضی طور پر بند ہوگیا ہے اور آثار کچھ ایسے نظر آتے ہیں کہ جب تک پاکستان اپنے روپے کی قیمت یا اپنے مال کی قیمت میں کافی کمی نہیں کرے گا قریب قریب بند ہی رہے گا۔ امریکہ اور انگلستان کے مالی حلقوں کا خیال عام طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان اپنے روپے کی موجودہ قیمت کو زیادہ دن قائم نہیں رکھ سکتا اسے بہت جلد اس کی قیمت گھٹانی پڑے گی۔ پاکستان اسٹیٹ بنک کے گورنر زاہد حسین صاحب نے بڑی شد و مد سے کہا ہے کہ پاکستانی روپے کی قیمت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ لیکن سر اسٹیفرڈ کرپس کی بدولت اس قسم کے بیانات کی کوئی قیمت نہیں رہی۔

وزیر اعظم جواہر لال نہرو مشرقی پنجاب اور کشمیر کے دورے کے بعد دہلی واپس آگئے ہیں۔ مشرقی پنجاب میں انھوں نے دو باتوں کی اچھی خاصی کامیاب کوشش کی، ایک تو عام لوگوں کی اس غلط فہمی کو جو پاکستانی اخباروں کے بیانات سے پیدا ہوگئی تھی دور کیا کہ پاکستان اور ہندوستان میں جنگ چھڑنے والی ہے اور اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان کشمیر کے مسئلے کا فیصلہ پر امن طریقے پر کرنا چاہتا ہے دوسرے کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کے دونوں جتھوں کو سمجھایا کہ آپس کے اختلاف دور کرکے ایک متحد جماعت کے طور پر کام کریں۔ کشمیر میں پنڈت نہرو کا بڑا شاندار خیر مقدم ہوا اور پچھلے دو سال میں تیسری بار سری نگر میں ان کا دریائی جلوس دھوم دھام سے نکلا جسے دیکھنے کے لئے قریب قریب سارا شہر جو دریائے جہلم کے دونوں کناروں پر بسا ہوا ہے اُمڈ آیا۔ پنڈت جی نے نیشنل کانفرنس کے اجلاس میں جو ۲۶ ستمبر سے سری نگر میں ہو رہا ہے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہندوستان کی حکومت قبائلیوں کے حملے سے پہلے اعلان کر چکی ہے کہ کشمیر کے لوگ اپنی قسمت کا فیصلہ خود کریں گے اور وہ اپنی اس بات پر قائم ہے لیکن اس کا یہ وعدہ اہل کشمیر سے ہے۔ پاکستان یا دنیا کے کسی اور ملک سے نہیں اس لئے وہ صرف اہل کشمیر کے سامنے جواب دہ ہے۔

نیشنل کانفرنس کے صدر شیخ محمد عبد اللہ صاحب نے اپنے خطبۂ صدارت میں اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان اور پاکستان میں صلح کا معاہدہ جس کی پریسیڈنٹ ٹرومین اور مسٹر اٹیلی کو بڑی فکر ہے انھیں شرطوں پر ہونا چاہیے جن میں کشمیر کے ساتھ پورا انصاف ہو اور اس کی خواہشوں کا پورا احترام کیا جائے۔ ان شرطوں کا تعین کوئی بیرونی ثالث نہیں بلکہ اہل کشمیر کر سکتے ہیں۔

کانفرنس کے پہلے اجلاس میں جو جموں اور کشمیر کے دو سو نمائندوں اور ہزاروں مہمانوں پر مشتمل تھا دو رزولیوشن پاس ہوئے، ایک میں ہندوستانی فوج کی شجاعت و بسالت کی تعریف کی گئی اور دوسرے میں صوبہ سرحد کے لوگوں سے جو شہری آزادی اور جمہوری حقوق کے لئے اپنی حکومت سے آئینی جنگ کر رہے ہیں ہمدردی کا اظہار کیا گیا۔ اس اجلاس کا خاص رزولیوشن جس میں ہندوستان کی حکومت سے درخواست کی گئی ہے کہ یو، این، او سے اپنا مقدمہ واپس لے لے اور جموں اور کشمیر کے بقیہ حصے کو بھی دشمنوں سے آزاد کرانے سبجکٹس کمیٹی میں پاس ہو چکا ہے اور عام اجلاس میں پیش ہونے والا ہے۔

کشمیر کمیشن اپنی صلح کی کوششوں میں ناکام ہو کر یورپ واپس چلا گیا ہے اس کے ممبر کچھ دن کے بعد جنیوا میں جمع ہو کر اپنی رپورٹ کو مکمل کریں گے اور پھر اسے لیک سکسس میں سکیورٹی کونسل کے سامنے پیش کریں گے۔ شاید اکتوبر کے آخر تک اس کونسل میں کشمیر کے معاملے پر غور کیا جائے۔ اس عرصے میں کمیشن کے فوجی مشیر بدستور کشمیر میں رہیں گے تاکہ اس کی نگرانی کرتے رہیں کہ ہندوستان اور پاکستان کی فوجیں اپنی اپنی حدود سے آگے نہ بڑھیں کشمیر میں جنگی کارروائی کو رکوا دینا کشمیر کمیشن کا بہت بڑا کارنامہ ہے اور وہ چاہتا ہے کہ کم سے کم اس کو ضائع نہ ہونے دے۔ اس بات کی قوی امید ہے کہ ۴

۴ چاہے ہند و پاکستان کے سیاسی تعلقات آیندہ چند مہینے میں کتنے ہی کشیدہ کیوں نہ رہیں مگر کشمیر میں جنگی کارروائی شروع نہیں ہوگی ٭

باہر کی دنیا

اسٹرلنگ کی قیمت گر جانے سے یورپ اور امریکہ کے معاشی حلقوں میں جو بے چینی پیدا ہوگئی تھی وہ سکون پا چلی تھی کہ پریسیڈنٹ ٹرومین نے روس میں ایٹم بم کے دھماکے کی خبر سنائی جس سے پھر ایک ہل چل مچ گئی۔ امریکی حکومت اور دوسری اتحادی حکومتوں نے ابھی سرکاری طور پر اپنا ردِ عمل ظاہر نہیں کیا ہے مگر اخباروں میں اس قسم کی خبریں آرہی ہیں کہ برطانیہ بڑے پیمانے پر ایٹم بم بنانا شروع کردے گا اور اس نے پرتگال سے کسی زبردست ہتھیار کے خریدنے کے بارے میں خفیہ معاہدہ کیا ہے۔ سب سے معقول رویہ اس بحران کی حالت میں روس کے نائب موسیو وشنسکی کا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ روس میں ایٹم بم بنانے کی تجاویز نہیں ہو وہ تو سلسلے سے بن رہا ہے۔ لیکن یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں روسی حکومت اس بات پر راضی ہے بلکہ مصر ہے کہ بین الاقوامی قانون کے ذریعے سے ایٹمی قوت کے استعمال کی نگرانی کی جائے، اور ایٹم بم کے استعمال پر پابندی عائد کی جائے ہندوستان کے نمائندے سر بی، این راؤ یو، این، او میں یہ تجویز پیش کرنے والے ہیں کہ ایٹمی قوت کے کنٹرول کا معاملہ پولٹیکل کمیٹی سے نکال کر بین الاقوامی لا کمیشن کے سپرد کیا جائے جو سیاست دانوں پر نہیں بلکہ قانون دانوں اور ججوں پر مشتمل ہے۔

مغربی جرمنی میں ڈاکٹر آڈے ناور کی حکومت نے اپنا کام شروع کر دیا ہے اور اس کا پہلا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مشرقی جرمنی سے جو روس کے قبضے میں ہے تجارتی معاہدہ کر لیا ہے۔

ہیگ میں گول میز کانفرنس کے کام میں کچھ رکاوٹ پڑ گئی ہے۔ انڈونیشیا میں بعض حلقے اس گفت و شنید سے جو اب تک ہو چکی ہے مطمئن نہیں ہیں چنانچہ نیشنل مسلم پارٹی کے نمائندے ڈاکٹر سکیمان ہیگ سے واپس بلائے گئے ہیں تاکہ اپنی پارٹی کو ساری کارروائی جو اب تک ہو چکی ہے سمجھائیں۔ انڈونیشی ڈیلیگیشن کے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ڈاکٹر سکیمان سے جو شروع سے یونین کی تجویز کے مخالف تھے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنے ہم وطنوں کو صحیح صورت حال سمجھا سکیں، دراصل اس کام کے لئے ڈاکٹر محمد حتے کو خود جانا چاہیے تھا، لیکن اگر وہ جاتے تو کانفرنس کا کام بالکل ہی رُک جاتا۔ ڈچ اس فکر میں ہیں کہ اگر انڈونیشیوں میں پھوٹ پڑ جائے تو اس سے فائدہ اُٹھائیں، لیکن بٹاویا میں انڈونیشی لیڈروں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ڈاکٹر سکیمان کے واپس آنے سے گول میز کانفرنس کی کامیابی کے لئے کوئی خطرہ پیدا نہیں ہوتا۔ ان کی پارٹی کو یونین کی اسکیم پر بعض اعتراضات ہیں وہ ان سے صحیح صورت حال معلوم کرکے ان کو نئی ہدایات دے گی۔

چین میں نیشنلسٹ حکومت کی طرف سے کمیونسٹوں کے حملے کی مزاحمت زیادہ تیز اور سخت ہوگئی۔ ہونان اور کوانٹنگ کے صوبوں میں اس وقت کمیونسٹوں کی پیش قدمی رُکی ہوئی ہے، اس کی دو وجہیں بتائی جاتی ہیں۔ ایک یہ ہے کہ اب نیشنلسٹ ایک چھوٹے سے محاذ پر اپنی ساری قوت کو جمع کرکے لڑ رہے ہیں۔ دوسرے جنرل لن کو جو کینٹن کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہ فکر ہے کہ پہلے دو لاکھ نیشنلسٹ فوج کو جو اب تک ان کے عقب میں موجود ہے صاف کر لیں تب آگے بڑھیں اور شاید وہ اچھے موسم کا انتظار کر رہے ہیں جو دو مہینے بعد شروع ہونے والا ہے۔

لیکن ہمارے خیال میں کمیونسٹوں کی پیش قدمی رُک جانے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ کمیونسٹ مفتوحہ علاقے میں اپنی قوت کو مضبوط کرنے اور نظم و نسق کو بہتر بنانے میں مصروف ہیں۔ خیال ہے کہ ۱۰ اکتوبر کو کمیونسٹ چین میں نئی حکومت کے قائم ہونے کا اعلان کر دیں گے جس کے صدر ماؤزے تنگ ہوں گے اور صدر کے چار نائبوں میں سے ایک مادام سن یات سین بھی ہوں گی۔

سُنا گیا ہے کہ برطانیہ چین کی نئی حکومت کو جلد سے جلد تسلیم کرنے کے مسئلے پر

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

ہندوستان کے قدیم باشندے

مشمی

سید سخی حسن نقوی

ہندوستان کے لوگ" قوموں کا عجائب خانہ کہتے ہیں۔ جس طرح عجائب خانہ میں رنگ برنگ کی چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ اسی طرح ہمارے دیس میں رنگ برنگے لوگ نظر آتے ہیں۔ اگر آپ کو ملک میں ادھر ادھر گھومنے کا موقع ملے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہاں کتنی قومیں آباد ہیں، اور ان کے رہنے سہنے کا طریقہ کیا ہے۔ اگر کوئی گورا ہے، تو کوئی کالا کسی کی ناک لمبی ہے، تو کسی کی چپٹی، کسی کی موٹی۔ کوئی ہندوستانی بول رہا ہے، کوئی بنگالی، کوئی پنجابی غرض جدھر جائیں ادھر نیا رنگ۔ زبان سنئے وہ علیحدہ رہنے سہنے کا طریقہ دیکھئے وہ جدا۔ رسم و رواج پر نظر کیجئے وہ مختلف اور نرالے ہوئے۔

گھومتے گھامتے جب آپ دریائے برہمپترا پار کرکے شمالی آسام کے پہاڑوں میں پہنچیں گے تو آپ کو مشمی قوم کے لوگ ملیں گے۔

مشمی قوم کے لوگوں کے متعلق ہم ٹھیک ٹھیک نہیں کہہ سکتے کہ وہ کب آئے اور ملک کے کس حصے میں آباد ہو گئے لیکن اس میں شک نہیں کہ مشمی ہندوستان کے قدیم باشندے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان کی ایک بڑی تعداد شمال کی طرف سے ملک میں داخل ہوئی اور ایک تبت کی طرف سے آئی اور آسام کے پہاڑوں میں بس گئی۔

مشمیوں کے رہنے سہنے کا طریقہ، ان کے رسم و رواج اور ان کے عادات و اطوار کا مطالعہ بڑا دلچسپ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ پہاڑی لوگ بڑے طاقت ور ہوتے ہیں۔ مشمی بھی پہاڑی ہیں، اس لئے مشمی بڑے مضبوط، جفاکش اور تندرست ہوتے ہیں۔ لیکن مثل مشہور ہے کہ پانچوں انگلیاں یکساں نہیں ہوتیں اس لئے مشمی بھی دیگر قوموں سے شکل و صورت میں مختلف ہیں۔ ان کا سینہ چوڑا، سر گول، ناک چپٹی اور آنکھیں سیاہ ہوتی ہیں۔ رنگ عام طور سے اجلا بلکہ اکثر سرخ ہوتا ہے اور سر کے بال سیدھے کھڑے ہوتے ہیں۔ ماتھے پر بالوں کو وہ چوکھونٹا کٹواتے ہیں، اور گدی پر چٹلا باندھے ہی رہتے ہیں۔

ان کے مذہبی عقائد بھی بڑے دلچسپ ہیں مشمی لوگوں کا خیال ہے کہ یہ تمام دنیا ایک باپ اور ماں کی اولاد ہے، جن کے پانچ بیٹے تھے۔ ان میں سے دو بیٹیوں کی اولاد میں مشمی ہیں۔ سورج اور چاند کے متعلق ان کا عقیدہ بہت عجیب ہے، ان کا خیال ہے کہ سورج اور چاند میاں بیوی تھے۔ سورج میاں اور چاند بیوی۔ کچھ عرصے بعد ان میاں بیویوں میں لڑائی ہو گئی اور بیوی چاند نے میاں سورج سے کہا کہ اپنی روشنی اور چمک میں تھوڑا حصہ مجھے بھی دو۔ میاں سورج نے کہا۔ بیوی اگر میں گرمی تمہیں دے دوں گا تو اپنے بچوں کے یعنی انسانوں کے لئے کیا رکھوں گا۔ پھر سورج نے غصے میں اپنی بیوی کو ایک تالاب میں یا دلدل میں پھینک دیا۔ بیوی چاند جب تالاب سے باہر نکلیں تو ان کے چہرے پر کیچڑ کے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ چاند کے چہرے پر آج تک جو داغ نظر آتے ہیں انھیں دھبوں کا نتیجہ ہیں اس لئے چاند بے چارہ سورج سے ڈرتا ہے۔ اور آسمان میں اس وقت آنے کی جرأت کرتا ہے جب سورج ڈوب کر دوسری طرف چلا جاتا ہے۔ اس سے ہم اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کے مذہبی عقائد میں لڑائی جھگڑے کو کس قدر دخل ہے۔

ان کے رسم و رواج میں بھی عجیب خصوصیات ہیں مشمی لوگ آپس میں شادیاں کرتے ہیں دوسری قوم کے لوگوں سے شادیاں نہیں کرتے۔ ایک آدمی ایک وقت میں کئی کئی بیویاں رکھ سکتا ہے، غریبوں کو تو بھلا ایک سے زیادہ شادی کرنے کا موقع کہاں ملتا ہوگا۔ البتہ مالدار لوگ کئی کئی شادیاں کرتے ہیں۔ لیکن ان کے یہاں ایک عجیب دستور یہ ہے کہ شوہر کے مرنے کے بعد تمام بیویاں سب سے بڑے لڑکے کو مل جاتی ہیں سوائے اس بیوی کے جو اس کی ماں ہوتی ہے۔ وہ بیوی اس چھوٹے لڑکے کو مل جاتی ہے یہ لوگ اپنے مردوں کو دفن کرتے ہیں۔ قبر کی گہرائی تین فٹ تک ہوتی ہے ان کے قبرستان عام طور سے آبادی کے نزدیک ہوتے ہیں۔ یہ لوگ مردوں کو خوب کپڑے پہنا کر اور ہتھیار لگا کر دفن کرتے ہیں، اور ان کے ساتھ قبر میں روپیہ پیسہ، کھانا، برتن، وغیرہ بھی رکھ دیتے ہیں، پھر قبر کو تختوں سے ڈھک دیتے ہیں۔ اس کے بعد اوپر پتھر چن دیتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ زمین کے نیچے ہر مردے کو گھر ملتا ہے۔ اسی لئے یہ لوگ قبر میں کھانے وغیرہ رکھ دیتے ہیں۔ مشمیوں کے تمام خاندان اپنے مردوں کو دفن کرتے ہیں، لیکن دو خاندان ڈگارو اور تیجہ پانچ دن کے بعد مردے کو اکھاڑ کر جلا دیتے ہیں۔

مشمی لوگوں کے پاس گانے بجانے کے سامان میں ڈھول کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہوتی۔ ان کا ڈھول چھپکلی کی کھال سے منڈھا جاتا ہے۔ ہتھیاروں میں ہتھیار تیر کمان ہے۔ لیکن یہ لوگ تیروں کو زہر میں بجھائے رکھتے ہیں۔ بعض مشمی سر پر بید کا بنا ہوا خود پہنتے ہیں۔ مشمی لوگوں کے طاقت ور ہونے میں کوئی شبہ نہیں، لیکن یہ اپنی تمام طاقت آپس میں لڑنے جھگڑنے میں صرف کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کی جان لینا ان کے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اگر ایک خاندان کا آدمی کسی دوسرے خاندان کے آدمی کو مار ڈالتا ہے تو پشتوں تک یہ دشمنی باقی رہتی ہے۔ اور برسوں تک بدلہ لینے کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ اپنا سردار یہ اسی کو بناتے ہیں، جو کھاتا پیتا آدمی ہوتا ہے اور سرداری نسلاً بعد نسلاً چلتی ہے۔ یہی ان کا حاکم ہوتا ہے اور ان کے آپس کے جھگڑوں کا فیصلہ کرتا ہے لیکن سردار کے اختیارات بہت محدود ہیں۔ جب کوئی قتل ہوتا ہے تو قاتل کو اپنے ہاتھ سے سزا دیتے ہیں یا تو مار ڈالتے ہیں یا قاتل کے خاندان کے کسی آدمی کو قید کر لیتے ہیں

یہ لوگ آپس میں تو ضرور لڑتے رہتے ہیں لیکن دوسری قوم کے لوگوں سے بڑی [illegible] پیش آتے ہیں اور اپنے [illegible] کی بڑی خاطر مدارات کرتے ہیں [illegible] تہذیب کے لحاظ سے یہ لوگ ہندوستان کی دیگر [illegible] بہت پیچھے ہیں۔ لیکن تہذیب کے اثرات کو [illegible] روک سکتے۔ آہستہ آہستہ یہ لوگ تہذیب [illegible] ہیں اور میل جول مہذب لوگوں سے ان کا [illegible] بڑھتا جا رہا ہے وہ زیادہ مہذب اور [illegible] ہوتے جا رہے ہیں اور وہ دن کچھ دور نہیں جب مشمی قوم کے لوگ ہندوستان کی دوسری قوموں کے دوش بدوش چل رہے ہوں گے۔

> ......مشمی بڑے مضبوط، جفاکش اور تندرست ہوتے ہیں......
> ان کا سینہ چوڑا۔ سر گول، ناک چپٹی اور آنکھیں سیاہ ہوتی ہیں۔ رنگ عام طور سے اجلا بلکہ اکثر سرخ ہوتا ہے اور سر کے بال سیدھے کھڑے ہوتے ہیں۔ ماتھے پر بالوں کو وہ چوکھونٹا کٹواتے ہیں۔ اور گدی پر چٹلا باندھے رہتے ہیں......

مختصر تبصرے

دو کتابیں

سید احتشام حسین

۱۔ **اور انسان مر گیا**۔ از رامانند ساگر۔ ناشر :۔ نو ہند پبلشرز لمیٹڈ۔ عبدالرحمن اسٹریٹ بمبئی ۳۔ قیمت للعہ
۲۔ **عرفانِ اقبال**۔ از بشیر مخفی القادری۔ ناشر :۔ کتاب منزل کشمیری بازار لاہور ۔ ۔ ۔ ۔ ے روپے

۱۔ رامانند ساگر کے دو مجموعے میرے علم میں شائع ہو چکے ہیں "اور انسان مر گیا" ان کا پہلا ناول ہے جس میں پنجاب کے گذشتہ فرقہ وارانہ فسادات کا آنکھوں دیکھا حال ایک کہانی کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ شروع میں خواجہ احمد عباس کا لکھا ہوا ایک دیباچہ ہے جس نے ناول سے زیادہ شہرت حاصل کر لی۔ اس مقدمے پر اتنی بحثیں ہو چکی ہیں اور ہو رہی ہیں کہ اس جگہ اس کا ذکر کرنا ناول سے دور کر دے گا۔ اس لئے اس مقدمے کے متعلق صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اس میں ہندوستان کی سیاست، آزادی، فسادات، فطرتِ انسانی کے متعلق جو رائیں دی گئی ہیں، اُن سے اختلاف تو ہو سکتا ہے لیکن اُسے پڑھ کر احمد عباس کو "بدنیت" نہیں کہا جا سکتا۔ دیباچے کے بعد رامانند ساگر نے "عذرِ گناہ" کے عنوان سے ایک طویل سوانحی مضمون لکھا ہے جس کے مطالعے سے ان کے نقطۂ نظر اور تصورِ حیات کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں، اور اصل قصہ پڑھتے ہوئے جگہ جگہ ساگر خود ناول کے ہیرو آنند کی جگہ لیتے ہوئے معلوم ہونے لگتے ہیں۔

فرقہ وارانہ فسادات بہت سے لوگوں کی نظروں میں اب کا موضوع ہی نہیں ہیں۔ بعض حضرات اُسے صرف طنزیہ فقرہ بازی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ بعض کے لئے یہ ایک جذباتی اور رومانی موضوع ہے جس سے دلکش فسانے تیار کئے جا سکتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو فسادات کے متعلق لکھنا بڑی ذمہ داری کا کام سمجھتے ہیں، کیونکہ اس کا تعلق بہت جلد جذبات سے ہو جاتا ہے اور لکھنے والوں کی نگاہ سطح ہی پر الجھ کر رہ جاتی ہے۔ ان محرکات تک نہیں جاتی جنھوں نے انسانوں سے اُن کی انسانیت چھین لی۔ رامانند ساگر کا ناول بھی جذباتی، مثالی اور رقت پسندانہ انداز رکھتا ہے۔ اس کا ہیرو آنند ایک شاعرانہ مزاج کا تخیل پرست انسان ہے جو اس سارے طوفان میں محض چند خیالات کے سہارے اہم کردار بننے کی کوشش کرتا ہے۔ اس اخلاقی احساس و تصور کی قوت سے جسے وہ عمل کے اُن مواقع پر بھی استعمال کرنا چاہتا ہے، جہاں محض خیال آرائی سے کام نہیں چل سکتا۔ مگر پھر بھی رامانند ساگر نے نہ جانے اس میں کیا دیکھا ہے کہ اُسے اہم بناتے چلے گئے ہیں مولانا کی نظر میں وہ گاندھی جی سے کسی طرح کم نہیں، نرملا اُٹھتے بیٹھتے اُسے دیوتا کہتی ہے، اندر کشن چند مرتے مرتے اس کی خدمت اور حفاظت کی وصیت کر جاتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ بھی ختم ہو گیا تو انسانیت ختم ہو جائے گی۔ آنند اس قدر اہم کیسے بن جاتا ہے۔ یہ بات ناول سے سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ ایک سچے جذبات کا انسان ہے جسے لاکھوں لاشوں اور جلتے ہوئے مکانوں میں اپنی محبوبہ کا خیال آتا ہے اور جو ہر قدم پر مایوسی کا شکار ہو کر متضاد باتیں کرتا ہے۔ چونکہ پوری کہانی میں آنند ہی کو مرکزی جگہ حاصل ہے اس لئے وہی نظریاتی الجھن اور جذباتیت پوری کہانی پر غالب آ گئی ہے۔

رامانند ساگر نے عذرِ گناہ میں، مولانا، اوشا، آنند وغیرہ کے کرداروں کے حقیقی ہونے کی بحث کی ہے اور اس سلسلے میں انسان دوستی کے جذبات کا ذکر کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ساگر نے تمام باتیں ہمدردی کے جذبے سے معمور ہو کر لکھی ہیں لیکن یہ کردار انسانیت کے ان بھرپور تقاضوں کے ترجمان نہیں بنتے جس کے لئے فنکار محنت کرتا ہے۔ ان فسادات کے اسباب کیا تھے، ان کی تہہ میں کون سے معاشی، سیاسی، نفسیاتی جذبے کام کر رہے تھے، ان میں کن قدروں کی زندگی خطرے میں تھی۔ کن عناصر نے شر کی طاقتوں کو ہوا دی، کن طاقتوں نے اس آگ کو بجھایا؟ جب تک نگاہ یہاں تک نہ پہنچے کردار کمزور اور بے روح ہوں گے۔ جہاں تک اول الذکر باتوں کا تعلق ہے ساگر کے یہاں ان کی جھلک مل جاتی ہے۔ لیکن مایوسی، خیال آرائی، بے دلی کے گہرے اثرات میں روشنی کی کرن کہیں نظر نہیں آتی اور خاتمے تک پہنچتے پہنچتے اس مایوسی کا منطقی نتیجہ آنند کے پاگل پن میں نظر آ جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ساگر نے جو کچھ آنکھوں سے دیکھا اور آگ اور خون کے جس کھیل سے وہ خود گذرے وہ بہت ہمت شکن تھا۔ لیکن ایک ذمہ دار فنکار کی حیثیت سے ان کا انھیں حالات میں الجھ کر رہ جانا حقیقت نگاری کا ایک غلط تصور معلوم ہوتا ہے۔

رامانند ساگر کی یہ تخلیق زندگی کی جدوجہد میں نہ تو کوئی سہارا دیتی ہے اور نہ کسی سہارے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس میں انسان دوستی کے جذبات کی فراوانی ہے۔ لیکن اُن کے پیچھے کوئی نظریاتی طاقت نہیں ہے۔ ناول کا انداز بیان دلکش اور پراثر ہے۔ لیکن اس کا پراثر ہونا ہی پڑھنے والے کو بھی غلط راہوں پر ڈال سکتا ہے۔ کہانی کہنے کی جو صلاحیت ساگر میں ہے اس سے منفی کیفیات کے اظہار کے بجائے مثبت کیفیات کی ترجمانی کے کام لینا چاہئے تھا اور تھوڑے سے ضبط اور تھوڑے سے غور و خوض سے یہ ناول رجعت پرستی فرقہ واریت اور مایوسی کے خلاف ایک اچھا حربہ بن سکتا تھا۔ اس حالت میں تو ایک غیر تنقیدی نظر رکھنے والا قاری انسانیت اور انسانوں کے مستقبل ہی سے مایوس ہو جائے گا۔

۲۔ **عرفانِ اقبال** :۔ یہ کتاب اقبال پر لکھی ہوئی کتابوں میں سے ذرا ایک الگ انداز رکھتی ہے، کیونکہ اس میں بشیر مخفی القادری نے یادداشت اور ذاتی معلومات کی روشنی میں اقبال کی صوفیانہ حیثیت متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ شروع میں "تبرکاتِ مغموم" کے نام سے سیٹھ محمد اسماعیل میمن مدراسی کی ایک نظم ہے جو انھوں نے ۱۹۲۵ء میں اقبال کے ورودِ مدراس کے زمانے میں لکھی۔ یہ ایک معتقدانہ مسدس کی شکل میں ہے اور اسے اسی نظر سے دیکھنا چاہئے۔ اس کے بعد "التماس" کے نام سے ایک طویل مضمون ہے جس میں اقبال کے تصوف کو سلسلہ قادریہ کے صوفیانہ معتقدات اور مسلک کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بشیر مخفی کا تعلق بھی اسی سلسلے سے ہے اور اُن کا خیال ہے (جس کے لئے انھوں نے بہت سے حوالے دئے ہیں اور بہت سی تصوف کی کتابوں سے اقتباسات پیش کر کے ثابت بھی کیا ہے) کہ اقبال سلسلۂ قادریہ سے متاثر تھے۔ اس کے بعد کے مضمون "افشائے راز" میں بھی اقبال کے تصوف کی بحث ہے اور ان کے تصوف کو خالص اسلامی تصوف بتایا گیا ہے۔ بیچ بیچ میں عجمیت، خودی اور تصور امارت وغیرہ کے متعلق دلچسپ مگر غیر واضح بحثیں بھی ملتی ہیں۔ آخری مضمون "افاداتِ نیازی" ہے جس میں کلام اقبال کی ادبی اور فقہی حیثیت کے متعلق دلچسپ بحث آ گئی ہے۔

اس طرح ان تینوں مضامین میں اقبال کے صوفیانہ خیالات کے ماخذ کے متعلق کافی معلومات اکٹھا ہو جاتی ہے اگرچہ اس میں زیادہ تر قیاسی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال نے تصوف اسلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا لیکن ان کی تنقیدی نظر نے انھیں اس میں سے کتنا قبول کرنے اور کتنا رد کر دینے پر مائل کیا تھا۔ یہ ایک گہری نظر اور زبردست مطالعے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اقبال ایک طرف تو صوفیوں کی بے عملی خانقاہیت، رہبانیت اور کشاکشِ حیات سے دوری کو غلط اور غیر اسلامی ظاہر کرتے ہیں دوسری طرف بعض صوفیوں سے گہری وابستگی اور اثر پذیری کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے خیالات کی روشنی میں اسلامی نقطۂ نظر سے تصوف مختلف مسالک میں سے بعض مسالک محل نظر معلوم ہونے لگتے ہیں اور اقبال خود ایک طرح کے تصوف جدید کے بانی بن جاتے ہیں جس کی روح رومی کے شعلۂ تخیل سے غذا پاتی ہے

(بقیہ صفحہ ۱۴ پر)

چوہے

سید سفارش حسین

(۳)

زمین گھومتی رہی، چاند، سورج چکر کھاتے رہے، راتیں بٹتی ہوئیں، پھر دن بڑھتے، مگر وقت کا پہیا چکر کھا کر ایک جگہ جھک سا گیا، زندگی ٹھہر سی گئی، اور جب زندگی ٹھہری تو ٹھہرے ہوئے پانی کی سی خرابیاں اس میں بھی پیدا ہو گئیں۔ دھرم بیلوں کی لڑیاں بن گئیں اور ایک نے دوسرے کو مٹانے اور ختم کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، دھرم کے نام پر انسان نے آدمی پر وہ ظلم توڑے، وہ قیامتیں ڈھائیں کہ آدمیت شرما گئی۔ زندگی کو گھن لگنے لگی۔ خدا کے بندے، خدا کا نام جپنے والے بندے خدا کے بچاروں کے حلقے سے باہر ہو گئے۔ زندگی حرام اور جینا اجیرن ہو گیا۔ انسان زندگی سے اکتا گیا اور زندگی کیا تھا اس کے نام سے ڈرنے لگی، زمین کا گولا پیچھے لڑھک گیا۔

وہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں چین ہی چین ہے۔ اب جو آنکھیں کھلیں تو اور ہی دنیا دکھائی پڑتی، اس کی دنیا سے کتنی بدلی ہوئی، کتنی مختلف۔ اس کا جی بے چین ہو گیا، دل رو اٹھا۔ انسان کا خون! اس کی آنکھوں سے خون بہنے لگا۔ اس کے جی میں آیا اپنی آنکھیں پھوڑ ڈالے انسان کی درد بھری چیخیں اس سے نہ سنی گئیں، دل میں آیا کان پھوڑ لے۔ پر اس کی آتما میں شکتی تھی، روح میں طاقت تھی، اس نے سہارا دیا اور وہ پاگل پن سے بچ گیا۔ مگر دل میں کھٹک رات دن چین نہ لینے دیتی۔ کسی پہلو قرار ہی نہ آتا۔ ایک چبھن سی ایک تھکن سی جس نے اس کا قرار کھو دیا۔ وہ پاک صاف تھا، گناہوں سے، برائیوں سے، مردم آزاری سے، اس کے دل میں پریم تھا، انسان کی محبت تھی، سیوا کا جذبہ تھا، مگر اس کے چاروں اور تو اندھیرا تھا۔ تمام لوگ تو ویسے کے ویسے ہی تھے، پاپی گناہگار مردم آزار، وحشی، درندے، جانور سے بدتر۔ کیا کرے؟ زندگی میں نفسا نفسی، انسانوں میں خود غرضی، ایک دوسرے سے بے تعلقی، نہ مجھے تیری فکر، نہ تجھے میرا خیال، ایک ہی زمین پر بسنے والے ایک ہی آسمان کے نیچے رہنے والے، ایک ہی ہوا میں سانس لینے والے اور یہ دوری۔ یہ منافرت کہ ایک کی ایک کو خبر تک نہیں، اب کیا ہو؟ گھبرا کے باہر نکلا، ایسے کہ کوئی دیکھے نہیں۔ نظریں بچاتا، جنگل کی طرف نکل گیا، جیسے ایسی دنیا میں رہنا ہی نہیں، وہ ایک بیابان میں پہنچا، ریت کے ٹیلے، کانٹے دار جھاڑیاں، درخت کے نام تک نہیں کہیں کہیں کھجور کے پیڑ اور بس۔ اس صحرا میں ہوا بھی تو بہت تیز چل رہی تھی اور گرم جیسے بھٹی میں سے آ رہی ہو، سورج بھی تو سوا نیزے پر آ گیا تھا جیسا بھگو جا رہا تھا اور پیاس کے مارے برا حال، آہستہ آہستہ نکلا تو اور آدھر ہی کی سمت بڑھا جس نے بانہہ دھر لی۔ آبادی میں پہنچا ایک آدمی ملا اس سے پانی مانگا، وہ مٹی کے برتن میں دودھ لایا، اس نے پیا کچھ نمکین نمکین سا۔ پیاس نہ بجھی۔ وہ آگے چلا، ایک اور آدمی ملا۔ اس سے بھی پانی مانگا، پھر وہ بھی دودھ ہی لایا۔ اس نے پینے سے انکار کیا میزبان نے وجہ پوچھی، اس نے بتایا کہ ایک آدمی اس کو دودھ پلا چکا ہے، اس کی آنکھیں لال ہو گئیں گھر و اونٹ لایا اور چین کے سامنے اس کا پیٹ پھاڑ کر اس میں سے پانی نکالا اور آگے دیا۔ چین اس آدمی سے ڈر سا گیا تھا۔ پانی سے گھن آتی پر ڈر کے مارے پی گیا اور آگے چل دیا۔ تھوڑی دور ہی گیا تھا تو دیکھا کہ کچھ لوگ بیٹھے ہیں، ایک شخص کچھ کہہ رہا تھا، یہ پاس پہنچا، وہ سب سے پوچھ رہا تھا۔

"تم مجھے کیا جانتے ہو؟" سب نے جواب دیا "سچا"۔ اس نے پھر پوچھا: "مجھ پر بھروسہ ہے؟" سب نے کہا "ہاں"۔ وہ بولا: "میں جو کہوں اسے یقین کر لوگے؟" سب نے اقرار کے لئے سر ہلائے تو اس نے پہاڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا "اس پہاڑی کے پیچھے سے بہت بڑا طوفان آنے والا ہے، ایسا کہ دنیا کی آنکھ نے آج تک نہ دیکھا ہو، عقل مند وہ جو برسات سے پہلے گھر کی مرمت کرے، تم بھی طوفان سے پہلے اپنے بچاؤ کا انتظام کر لو کہ وقت پر پچھتانا نہ پڑے، کام کچھ ایسا مشکل بھی نہیں کہ تم کو لوہے کے چنے چبانا ہیں۔ بس یہی کہ کچھ بری باتیں چھوڑ دو، اچھی باتیں سیکھو۔ تم نے تو دنیا الگ بنا لی ہیں، اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ کر لیا ہے، یوں کام نہیں چلے گا۔ آدمی ایک ہیں تو راگ بھی ایک ہی ہونا چاہئے۔ نہ کوئی بڑا، نہ کوئی چھوٹا۔ نہ کوئی اونچا نہ کوئی نیچا۔ نہ لال پیلے سے اچھا نہ سفید کالے سے بہتر۔ سب انسان ہیں اور سب برابر ہیں۔ اب تک تم نے ایک دنیا میں الگ الگ دنیائیں بنائیں۔ اب سب مل کر ایک دنیا بناؤ۔ ایک سکھی ہو تو سب سکھی نہیں ہوتے۔ ہاں سب سکھی ہوں تو ایک بھی سکھی ہو جاتا ہے۔ سب کا سکھ ایک، سب کا دکھ ایک، [illegible] ایک، [illegible] کسی کو بھی فکر نہ ہوگی، [illegible] انتظام کرو، اور [illegible] میں [illegible] آ جانا، عقل [illegible] کام لیا اور [illegible] سمجھنا، کام [illegible] آپس میں [illegible] اور بس۔ تم اچھے برے [illegible] سب سے [illegible] اس عیب کو نکال دو تو [illegible] بچو گے بچے ہار۔

[illegible] میں بہت [illegible] چڑھائی، منہ بنایا، [illegible] کی بات مان لی۔ [illegible] ان میں سب [illegible] مرض کا علاج اور بیماری کی دوا مل گئی۔ [illegible] وہ بے چین تھا۔ مارا مارا پھرتا [illegible]

زندگی اپنی فرصت خود پوری کر لیتی ہے، [illegible] بات [illegible] واسطے تو [illegible] آپ [illegible] طرف یہ [illegible] جاتے ہیں مگر [illegible] سب [illegible]

.... تھوڑی دور ہی گیا تھا تو دیکھا کہ کچھ لوگ بیٹھے ہیں۔ ایک شخص کچھ کہہ رہا تھا، یہ پاس پہنچا۔ وہ سب سے پوچھ رہا تھا۔
"تم مجھے کیا جانتے ہو؟" سب نے جواب دیا "سچا"۔ اس نے پھر پوچھا: "مجھ پر بھروسہ ہے؟" سب نے کہا "ہاں"۔ وہ بولا "میں جو کہوں اسے یقین کرو گے؟" سب نے اقرار کے لئے سر ہلائے تو اس نے پہاڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا "اس پہاڑی کے پیچھے بہت بڑا طوفان آنے والا ہے ایسا کہ دنیا کی آنکھ نے آج تک نہ دیکھا ہو عقل مند وہ جو برسات سے پہلے گھر کی مرمت کر لے، تم بھی طوفان سے پہلے اپنے بچاؤ کا انتظام کر لو کہ وقت پر پچھتانا نہ پڑے۔

چھٹکارا نہیں، چنانچہ یہی ہوا۔ نہ ماننے والے نئی بات سے ڈرنے والے۔ پرانی پر اڑنے والی، گھوم پھر کر اسی راستے پر آ گئے۔ اب کیا تھا۔ انسانیت ہوش میں آئی، اخوت و مساوات کے بادل چھائے تو رحمت کی بارش ہونے لگی۔ سوکھی کھیتیاں ہری ہو گئیں اجڑے گھر بس گئے۔ بگڑے سنور گئے تو انسانیت نے ایک خواب دیکھا، نرالا، انوکھا، جس میں انسان کی حسرتوں، آرزوؤں اور صدیوں کی تمناؤں نے رنگ بھرا، دکھی انسان کے دل کی تڑپ نے نقاشی کی اور ان سب نے مل کر انسان کے اجتماعی عروج کی تصویر بنائی۔ ایسی تصویر جسے دیکھ کر فرشتوں نے بھی شرم سے گردن جھکا لی۔ اس خواب کی تعبیر سنسار نے بھی پایا، دنیا نے کروٹ بدلی، چھوٹے بڑے، امیر، غریب، کالے، گورے، لال، پیلے سب ایک صف میں کھڑے ہو گئے۔ ایک دسترخوان پر بیٹھ گئے۔ سب میں برابری، سب ایک دوسرے کے برابر۔ دکھ ہوتا تو سب مل کر بانٹ لیتے، سکھ ہوتا

تو سب مل کر بنانے۔ جو سب سے زیادہ سیوا کرتا وہ سب سے بڑا کہلاتا اور دلوں میں جگہ پاتا، پھر کچھ نے الف دیا جلایا۔ ایک شمع روشن کی، اس کی روشنی دور دور پہنچی۔ اس دئیے کے لئے تیل بھی تو دور دور سے لاتے تھے، پورب سے پچھم سے۔ اس شمع کی تیاری کے لئے موسم بھی تو جہاں تہاں سے اکٹھا کر لیا تھا۔ اب تو یہ دیا سورج کو شرمانے لگا اس شمع کی روشنی سے خورشید ماند پڑ گیا۔ دنیا اس روشنی سے جگمگا اٹھی۔ چاروں طرف اجالا ہی اجالا ہو گیا اور انسان نے اس روشنی میں اپنی حقیقت کو پہچانا، اپنی منزل دیکھی اور اپنا مقام جانا، اس حقیقت کو جان کر اس منزل اور اس مقام کو دیکھ کر انسانیت مسکرا دی، آدمیت کی باچھیں کھل گئیں، صدیوں کے بندھن ٹوٹ گئے۔ ہزاروں برس کی تفریق مٹ گئی۔ انسان انسان بن گیا، آدمی آدمی ہو گیا۔

رات گئی، دن آیا، موسم بدلے، ہوا پلٹی، چاند سورج آنکھ مچولی کھیلتے رہے، گھڑی پل بیتے، مہینے سال اور صدیاں آئے اور گئے، فصلیں آئیں اور چلی گئیں، درختوں میں پھل آئے پکے اور گرے، پر کون جانتا تھا اور کسے معلوم تھا کہ آدمی خود اپنے پیر میں کلہاڑی مارے گا۔ نقصان میں اپنا نفع تلاش کرنے لگے گا اور برباد ہونے کے بعد بھی اپنی عقل کو کام میں نہ لائے گا، بلکہ دوسروں کے کہنے کو اپنا سوچا سمجھنے لگے گا، اور یوں سیدھے رستے سے بھٹک کر ادھر ادھر مارا مارا پھرے گا۔ مگر ایسا ہوا کچھ بکریوں نے بھیڑیوں کا روپ بھر لیا اور انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح اپنی ڈگر پر ڈال دیا اپنے نفع کے رستے پر ہانک دیا اور آدمی بھی تو کان لپیٹے گردن جھکائے اُن کے اشاروں پر ناچنے لگے ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی طرح ناچنے لگے اور اسی کو دین ایمان سمجھنے لگے۔ مگر کاغذ کی ناؤ چلتی کے دن، پاپ کا گھڑا تو پھوٹنا تھا۔ پہلے پہل تو بھیڑیوں کی خوب بنی، پھر آپس میں چھڑی اور بے زبان بکریاں کٹیں۔ کبھی کبھی کچھ بھیڑیے بھی کام آ جاتے۔

دھرم کے نام پر آدمی کا خون پھر بہا۔ مذہب کے نام پر انسانیت کی قبا پھر چاک ہوئی اور ایسی کہ دھجیاں اڑ گئیں۔ پھر آدمی آدمی کو کھانے لگا۔ پھر انسان انسان کا لاگو ہو گیا۔ دئیے کی روشنی دھیمی اور شمع کی روشنی مدھم پڑ گئی اور ایسا معلوم ہوا کہ دیا بجھ جائے گا۔ شمع گل ہو جائے گی اور دنیا پر ایک دفعہ پھر اندھیرا چھا جائے گا۔ وہ تو کہو لال آدمیوں کو عقل آ گئی۔ انھوں نے دیا سنبھال لیا، شمع اٹھا لی اور پھر تیل موم اکٹھا کیا۔ انھوں نے دئیے کی لو تیز کی شمع کو لے کر ساری دنیا میں پھرے۔ روشنی تھی تیز اس لئے وہ دیس بھی نظر آ گئے جو اب تک اندھیرے میں پڑے تھے۔ اب تو انھیں بڑی خوشی ہوئی۔ ساری دنیا چھان ماری، سمندر کھنگال ڈالے مٹی کا ایک ایک ذرہ اور پانی کا ایک ایک قطرہ

اُن کی جانچ پڑتال سے نہ بچا اور مٹی پانی ہی کیا انھوں نے تو ہوا تک میں گرہ لگا دی، اس کے کندھے پر بھی چڑھ گئے۔ پر دھن کا روگ اور قوت کا مرض انھیں ایسا لگا کہ انسانیت کی جان ہی لے کر چھوڑی، انسان مر گیا، انسان جیسا جانور رہ گیا۔ اس جانور جیسے انسان نے انسانوں کو جانور سمجھا، جانوروں کا سا برتاؤ کیا اور جہاں موقع لگا انھیں جانور بنا بھی دیا۔ اور ان بننے والوں کو تو دیکھو، اچھے خاصے انسان، صورت دیکھو تو بھلے آدمیوں کی، پھر جہاں ان لال انسان جانوروں اور جانور انسانوں کی آنکھ لڑی پھر اور یہ جانور بنے۔ پر انسان کو جانور بنانا کوئی ہنسی کھیل نہیں آدمی خود بھی جانور بن جاتا ہے۔ یہ بھی جانور بن گئے اور لگے جانوروں کی طرح لڑنے، اور لڑائی ہوتی تو اس بات پہ کہ کون زیادہ آدمیوں کو جانور بنائے یہ جانور بنانے کے بھی تو بڑی ترکیب سے تھے آدمیوں کو پتہ بھی نہ چلتا کہ وہ جانور بن رہے ہیں بلکہ الٹا یہی سمجھتے کہ آدمی بن رہے ہیں۔ لال جنھیں جانور بناتے اُن کی دیکھ بھال بھی کرتے، انھیں دھوپ، سردی اور بارش سے بچاتے۔ پر کھانے کو اتنا دیتے کہ پیٹ نہ بھرے اور پہننے کو اتنا کہ تن نہ ڈھکے

چین اس نئی مصیبت کو دیکھ کر بہت گھبرایا، اس کی عقل کچھ کام ہی نہ کرتی۔ وہ دیکھتا، اچھے خاصے آدمیوں کی مت ماری گئی ہے، اُسے دکھ ہوتا اس نے دیکھا ایک بہت بڑا برگد کا پیڑ ہے، اتنا بڑا کہ آج تک دنیا میں کسی نے دیکھا نہ سنا۔ اس برگد کے پیڑ کے نیچے کروڑوں آدمی ہیں پھر بالکل دیکھنے کے، صورت شکل کے آدمی باقی بالکل جانور برگد کے سائے میں یہ موسم کی تکلیفوں اور دنیا کی مصیبتوں سے بالکل نچنت ہوکے رہتے، نہ کوئی کھٹکا، نہ کسی کا ڈر، ہاں اتنی بات تھی کہ انھیں روٹی پیٹ بھر کے نہ ملتی، اور نہ کپڑا پورا تن ڈھکنے کو ملتا۔ یہ تب بھی خوش تھے، پھر کبھی کبھی خالی پیٹ ان کے معدے میں درد اٹھتا اور ننگے بدن جب گرم یا ٹھنڈی ہوا انھیں تکلیف دیتی تو یہ اپنا غصہ ایک دوسرے پر ہی اتار لیتے اور بس۔ چین سے انسانوں کی یہ حالت دیکھی نہ گئی۔ پر بچارا کرتا کیا، یہ تو بالکل جانور ہو گئے تھے اور جو سچ پوچھو تو جانوروں سے بھی برے، اُن سے بھی بدتر۔ چین کو اُن پر بڑا ترس آیا، اُسے دکھ ہوا کہ آدمیوں کی اتنی بڑی تعداد اور یوں جانور بن جائے۔ اس نے اُن کے سدھار کی ٹھانی اور طے کر لیا کہ جو ہو سو ہو پر ان کو انسان ضرور بناؤں گا۔ اس نے اپنا کام شروع کیا۔ بڑی ہوشیاری سے۔ بہت سمجھ کے ساتھ کہ کہیں ان لال آدمیوں کو بُرا نہ لگے۔ لال آدمی اس وقت آپس میں لڑ رہے تھے، چین نے موقع غنیمت سمجھا اور وہ ڈھب اختیار کیا کہ لال آدمی برا ماننے کی جگہ اور خوش ہوئے اور اس سے بہت سے وعدے کئے۔ پر تھے سب جھوٹے اور وقتی۔ جب ان کا کام

نکل گیا اور آپس کی مار دھاڑ ختم ہوئی تو انھوں نے وعدے توڑے سو توڑے پیچھے اور آدمیوں کو جانور بنانے والی ترکیبوں کو اور کڑا کر دیا۔ جن زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا انھیں اور سخت کر دیا اس پر چین کو بڑا دکھ ہوا، اس سے یہ زیادتی دیکھی نہ گئی۔ وہ لال آدمیوں کو انسان سمجھتا تھا پر وہ تو جانور سے بھی بدتر نکلے۔ نہ کہنے کا خیال، نہ بات کا پاس نہ دنیا داری کا لحاظ۔ ادھر زنجیریں جو کڑی ہوئیں تو جانور بنے ہوئے انسان بھی ہیچ اٹھے۔ اور ایک دفعہ انھوں نے ارادہ کیا کہ زنجیروں کو توڑ ہی ڈالیں گے یہ غصے میں آپے سے باہر تھے اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہتے تھے پر چین نے روکا، انھیں بتایا۔ اینٹ کا جواب پتھر نہیں، انھیں بتایا کہ جھوٹ کا جواب سچ ہے۔ انھیں سمجھایا تم اینٹ کا جواب پتھر سے دو گے، پتھر کا جواب گولی گولی کا جواب گولا اور گولے کا جواب ایٹم بم۔ یعنی بڑھتی ہی جانے لگی، تشدد ترقی کرتے رہے گا، بات ایسی کرو جس کا جواب ہی نہ ہو۔ اہنسا کا جواب کیا ہے۔ پھر ایک دفعہ سب نے مل کر سچ اور اہنسا کا تماشہ دکھایا، ایسا تماشہ کہ لال آدمیوں کے چھکے چھوٹ گئے اور ایسا لگا کہ وہ بھاگ نکلیں گے پر کام پہلا پہلا تھا اس لئے پوری طرح ہوا نہیں۔ اب لال آدمیوں کی بن آئی، انھوں نے دل کے پھپھولے خوب پھوڑے، خوب حوصلے نکالے، ایک باغ میں اکٹھا کر کے خوب گولیاں برسائیں اور آخر میں ان جانوروں کو آپس میں لڑوا دیا، اور شکر منایا۔ یہ منتر انھیں خوب یاد تھا، اس کام میں بڑے ماہر تھے۔ یہ منتر انھیں خوب آتا تھا، اور سچی بات تو یہ ہے کہ اسی منتر سے تو انھیں جانور بنایا تھا۔ یہی ہتھیار پھر اُن کے کام آیا اور بات آئی گئی ہو گئی، پھر چین کو قرار کہاں سے تو چیٹک لگی ہوئی تھی۔ ارادہ پکا تھا۔ وہ ڈٹا رہا۔ لال آدمیوں نے بہت سی ترکیبیں کیں، کئی پھندے ڈالے، پر اس نے اپنی ہٹ نہ چھوڑی۔ اب لال آدمیوں کی آنکھیں کھلیں، انھوں نے زنجیریں ڈھیلی کیں۔ ایک آدھ جو پرانی ہو گئی تھی توڑ بھی ڈالی مگر چین کو اطمینان نہ ہوا۔ اس نے لوگوں کو ہوشیار کر لیا تھا اور وہ بھی ایسے کہ دیکھنے والے دانتوں میں انگلیاں دے گئے۔ لال آدمیوں نے بھی پورا زور لگایا۔ کبھی جیل بھیجتے، کبھی گولیاں چلاتے اور کبھی پھانسی دیتے غرض تشدد اور سختی کے سارے کام کرتے مگر ادھر سے سب کا جواب ایک اہنسا۔ آخر لال تھک گئے، تنگ آ کر انھوں نے اور کام تو کئے بند اور اپنا پرانا ہتھیار سنبھالا۔ لوگوں کو آپس میں لڑا دیا، ان کا سر انھیں سے پھڑوا دیا۔ آپس کی اس مار کٹائی نے لال آدمیوں کا بوجھ بہت ہلکا کر دیا۔ وہ تو بس منتر لگا دیتے اور تماشا دیکھتے۔ چین نے آپس کی مار دھاڑ روکنے کی بڑی کوشش کی،

جلد ۳ نمبر ۱۲ | ۸ر اکتوبر ۱۹۴۹ء | ایڈیٹر: ڈاکٹر سید عابد حسین

کامن ویلتھ کا معمہ

(پروفیسر محمد مجیب صاحب انڈین کاؤنسل آف ورلڈ افیرس کی طرف سے کامن ویلتھ کانفرنس میں اور حکومتِ ہند کی طرف سے یو، این، او کے اجلاس میں شریک ہونے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ آنھوں نے وعدہ کیا تھا کہ اس سفر کے حالات و مشاهدات سے نئی روشنی کے ناظرین کو محظوظ کرتے رہیں گے۔ یہ ایفائے وعدہ کی پہلی قسط ہے۔)

۱۸ر ستمبر
ٹورونٹو

برادرم عابد صاحب،

السلام علیکم - پُرانی دنیا کی ایک جھلک دوبارہ دیکھنے اور نئی دنیا پر نظر دوڑانے کے بعد آپ سے اپنے تاثرات بیان کرنا چاہتا تھا، مگر آپ تو جانتے ہیں کہ یہاں آنے کا مقصد کامن ویلتھ کانفرنس میں شرکت کرنا تھا۔ نہ کہ دنیا دیکھنا۔ لندن میں صرف ایک دن ذرا گھومنے کا موقع ملا۔ نیویارک کے ہوائی اڈے کے باہر قدم رکھنے کی نوبت نہ آئی، ٹورونٹو شام کو پہنچا اور دوسرے دن سویرے نمائندوں کے قافلے کے ساتھ بگوِن ان کے لئے روانہ ہو گیا۔ آج سہ پہر کو وہاں سے واپس آیا ہوں اور کل نیویارک جا رہا ہوں۔ ایسے سفر میں آدمی کیا دیکھ سکتا ہے۔ بس اسباب سمیت منزلِ مقصود تک وقت سے پہنچ جانے کی فکر میں پڑا رہتا ہوں۔

کانفرنس میں ہر ممکن مسئلے پر بحث اور گفتگو ہوئی، اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ہم کسی نتیجے پر پہنچیں، چنانچہ ہم سب نے دس دن بحثیں کرنے کے بعد خلوص کے ساتھ ایک دوسرے سے کہا کہ کانفرنس بہت ہی نتیجہ خیز تھی۔ اس سے ہماری معلومات میں بہت اضافہ ہوا، اور مختلف قسم کی باتیں سننے سے ہمارے دماغوں میں وہ ہل چل گیا جو فکر کی زمین کو زرخیز بناتا ہے، لیکن اس وقت آپ کے لئے کانفرنس کی روداد کا خلاصہ لکھنے بیٹھا ہوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں۔

کامن ویلتھ کا رشتہ ایسا ہے کہ اگر اس کی تعریف کی جائے یعنی اس کی نوعیت کو بیان کرنے کی کوشش کی جائے تو اندیشہ ہے کہ وہ ٹوٹ جائے گا۔ پہلے کہا جاتا تھا کہ یہ رشتہ اینگلو سیکسن نسل کی ریاستوں کا، جو برطانیہ کے بادشاہ کو اپنا بادشاہ مانتی ہیں، ایک طرح کا خاندانی رشتہ ہے۔ ہندوستان کو کامن ویلتھ میں شامل کرنے کے لئے خاندانی کا لفظ کاٹ دیا گیا۔ مگر کانفرنس میں پاکستان کے نمائندے شریک تھے۔ اگرچہ پاکستان نے ابھی طے نہیں کیا ہے کہ وہ کامن ویلتھ میں شامل رہے گا یا نہیں، اور اس میں آئرلینڈ کے نمائندے خاص طور سے کوشش کر کے بلائے گئے، اگرچہ آئرلینڈ کامن ویلتھ میں شامل نہیں ہے۔ بحثوں میں متحدہ ریاستوں کا ہر وقت اور ہر طرح سے ذکر آتا رہتا تھا، گویا کامن ویلتھ کا سب سے اہم رکن وہی ہے، مگر اسے دعوت نہیں دی جا سکی۔ اس لئے کہ قوموں کی اس برادری میں اسے کسی محسوس رشتے کی بنا پر شامل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کانفرنس کا مقصد بڑی حد تک اس سے معلوم کیا جا سکتا تھا کہ برطانیہ کی طرف سے اس میں کون کون شریک تھا۔ برطانیہ کے نمائندوں کے لیڈر مسٹر بٹلر تھے۔ ان کو قدامت پسند پارٹی کے لیڈروں میں مسٹر ایڈن کے بعد سب سے بڑا درجہ دیا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ برطانیہ کی لبرل پارٹی کے مشہور لیڈر مسٹر اسکوئتھ کی لڑکی لیڈی بونہم کارٹر تھیں۔ لوئڈ جارج کے لڑکے میجر لوئڈ جارج، سرمایہ دارانہ معیشت کے حامی اور مالیات کے ماہر لارڈ برینڈ، معاشیات کے مشہور عالم پروفیسر روبن سن، لیبر پارٹی کے دو نوجوان مگر بہت ممتاز مفکر ڈینس ہیلی اور مورس ویب، مسٹر لایونل کرٹس، جنھوں نے ہندوستان میں ۱۹۱۹ء میں دو عملی قائم کرائی تھی اور جو اب جمہوری دنیا کو ایک فیڈریشن بنانے کے خیال میں ڈوبے رہتے ہیں، اور بڑے جوش کے ساتھ اس کا پرچار کر رہے ہیں، سر ولیم فزجرلڈ جو فلسطین اور وسطی افریقہ میں جج رہ چکے ہیں اور نوآبادیوں کے مسئلوں سے بہت اچھی واقفیت رکھتے ہیں، پروفیسر مین سرگھ جو کامن ویلتھ کی تاریخ اور اس کے سیاسی اور معاشی تعلقات پر کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ فن جنگ کے ماہر جنرل جیکب اور سنڈے ٹائمز کے مددگار ایڈیٹر مسٹر ای اے ہوڈسن جن کو برطانوی سیاست (بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

فہرست مضامین

قیمت ڈیڑھ آنہ

اقبال کی وطن دوستی

غلام السیدین

.... اعتراض یہ ہے کہ اقبال کی شاعری کے دورِ اوّل کا کلام تو قومیت اور حبِ وطن کے جذبے سے بھرا ہوا ہے اور ہندوستانی تہذیب اور قومی جذبات کا علمبردار ہے۔ لیکن اس کے دورِ آخر میں قومیت کی جگہ اسلامیت نے لے لی اور حبِ وطن کا اس میں کہیں پتہ نہیں چلتا .... اقبال کو اپنے ملک کی تہذیب اور تمدن کے بہترین عناصر سے محبت ہے۔ اس کے بہترین مفکرین اور شریف انسانوں سے عقیدت ہے اور اس وسیع حلقے میں بھرتری ہری اور گوتم بدھ سے لے کر عارف ہندی (جہاں دوست) اور گرو نانک تک سب آجاتے ہیں۔ لیکن اقبال اس اندھی وطن پرستی اور مبالغہ آمیز قومیت سے بیزار ہے جو نسل اور رنگ اور جغرافیہ کی بنا پر انسانوں کی عالمی وحدت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے ....

اردو زبان کے کسی شاعر کو اپنی زندگی میں وہ ہردل عزیزی اور مقبولیت نہیں ہوئی جو اقبال کے حصے میں آئی ہے۔ بلکہ دوسری زبانوں میں بھی اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ عام طور پر دنیا شاعروں ادیبوں مصنفوں، مفکروں کی صحیح قدر اس وقت کرتی ہے جب یہ ان کے وجود سے خالی اور وہ خود اس کے اعتراف سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ اقبال کی عالمگیر مقبولیت کے کئی سبب ہیں۔ ایک سبب تو یہ ہے کہ فنی اعتبار سے اس کا مقام بہت بلند ہے۔ اس کی زبان میں شیرینی اور زور اور اس کے انداز بیان میں ندرت ہے جس سے وہ لوگ بھی لطف لے سکتے ہیں اور لیتے ہیں جو اس کے پیغام کو، اس کے دماغ کی پرواز کو اس کے دل کی تڑپ کو نہیں سمجھ سکتے۔ الفاظ کی موسیقی اور ان کا جادو ان پر اثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ اقبال کو اپنے ایسے عقیدت مندوں سے شکایت ہے۔

> کم نظر بیتابیٔ جانم نہ دید
> آشکارم دید و پنہانم نہ دید
>
> او بہ سوزِ دلبری خواہد زمن
> آب و رنگِ شاعری خواہد زمن
>
> من نشکوہِ خسروی او را دہم
> تاجِ کسریٰ زیرِ پائے او نہم

لیکن یہ شکایت اس اقبال کی ہے جو فلسفی اور مفکر اور عالم انسانیت کی اصلاح کا مجاہد ہے۔ شاعر اقبال کو اس چیز کی شکایت کیوں ہو کہ اس کے کلام کا حسن کم نظروں کے دل پر بھی وار کر جاتا ہے؟ کون کافر ہے جس کو ایسے اشعار کے کیف اور سرور سے انکار ہوگا؟

> صورت نہ پرستم من، بت خانہ شکستم من
> آں سیلِ سبک سیرم ہر بند گسستم من
>
> در دیر نیاز من، در کعبہ نماز من
> زنار بدوشم من، تسبیح بدستم من
>
> سرمایۂ درد تو غارت نتواں کرد
> ...

افسانۂ کہ از دلِ خیزد ندیدہ شکستم من!

دوسری طرف وہ ۔ نسبتاً کم لوگ ہیں جو اقبال کے فکری بلندی اس کے پیغام کی جدت اور اس کے حیات آفریں فلسفے کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور یہ ان کا خیال ہے رکھتے ہیں! اقبال نے فرد اور ملت کی زندگی کے متعلق اپنے فکر روشن کے نتائج کو ایک ایسے وقت پیش کیا جب نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام عالم اسلام اور دنیائے مشرق کی قوموں کی صحت مضمحل ہو چکی تھی اور ان کا عزم اور ولولہ سرد ہو گیا تھا۔ اس کی نگاہِ حقیقت شناس نے جو نقشہ دیکھا اسے ایک جگہ یوں بیان کیا ہے۔

> تمدن، تصوف، شریعت، کلام
> بتانِ عجم کے پجاری تمام
> حقیقت خرافات میں کھو گئی
> یہ امت روایات میں کھو گئی
> وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد
> محبت میں یکتا حمیت میں فرد
> عجم کے خیالات میں کھو گیا
> یہ سالک مقامات میں کھو گیا
> بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
> مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

اس صورتِ حال کو فلسفی کی نگاہ نے دیکھا۔ شاعر کے دل پر اس کی چوٹ لگی اور مفکر نے اس کی اصلاح کے لئے اپنا پیغامِ عمل پیش کر دیا۔ یہ وجہ ہے کہ بزم میں "اہلِ نظر" اور "تماشائی" دونوں اقبال کے معترف اور عقیدت مند ہیں۔

لیکن یہ تصویر کا ایک رخ ہے۔ اقبال کے معترض اور نقاد بھی ہیں اور یہ بات بجائے خود بری نہیں بلکہ ضروری ہے۔ ہر ادبی، فکری، جمالی تحریک اور ہر کارنامے کی قدر کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے جرأت کے ساتھ بیگانہ وار تنقید کی ضرورت ہے۔ اس لئے مجھے اقبال کے نقادوں سے کوئی گلہ نہیں، لیکن شرط ضرور ہے کہ جب وہ مخالف یا موافق تنقید کریں تو اس کی بنیاد ان حقائق پر رکھنی چاہیے جو اس کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ ہر ایک حق پسند نقاد کو آزادیٔ رائے کا پورا اختیار حاصل ہے لیکن بے جا دعاوی کی اجازت نہیں! آج میں ان اعتراضات میں سے ایک اعتراض سے بحث کرنا چاہتا ہوں جو بعض حلقوں کی جانب سے اقبال پر وقتاً فوقتاً کیا گیا ہے اور اب بھی گاہ بگاہ کیا جاتا ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ اقبال کی شاعری کے دورِ اوّل کا کلام تو قومیت اور حبِ وطن کے جذبے سے بھرا ہوا ہے اور ہندوستانی تہذیب اور قومی جذبات کا [illegible] لیکن اس کے دورِ آخر میں قومیت کی جگہ اسلامیت نے لے لی اور حبِ وطن کا اس میں کہیں پتہ نہیں چلتا! میرے خیال میں یہ الزام لفظی اور معنوی دونوں اعتبار سے بے بنیاد ہے۔ اور جو لوگ اس اعتراض کو اٹھاتے ہیں وہ نہ اقبال کے دورِ آخر کے کلام سے پوری طرح واقف ہیں نہ حبِ وطن اور قومیت کے تصور کو صحیح طور پر سمجھتے ہیں۔ ان کی غلط فہمی سے بحث کرنے سے پہلے آئیے مدعی کا دعویٰ سن لیں۔

مدعی کا بیان ہے کہ اقبال نے اپنے دورِ اوّل میں ایسی نظمیں لکھیں جن کو پڑھ کر وطن پرستوں کے خون میں تیزی اور حرارت پیدا ہو جاتی ہے مثلاً "ہمالہ" کا گیت

> چشتی نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا
> نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
> تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
> جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
> میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے!

یا قومی اتحاد کے نشاۃِ ثانیہ کی وہ دعوت جو "نیا شوالہ" کے نام سے موسوم ہے، جو برہمن کو اس کے پرانے بتوں کی یاد دلا کر

> سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
> تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

یہ اعلان کرتی ہے کہ

> پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
> خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

اور اس کی التجا کرتی ہے کہ غیریت کے پردوں کو اٹھا دے، نقشِ دوئی کو مٹا دے اور جو دل ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ہیں ان کو پھر سے ملا دے۔

یا وہ شیریں ترانہ جو ہندوستان کا قومی ترانہ ہوتا اگر باہمی مخالفتوں اور تعصب نے ملک کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہوتا۔

> سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
> ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

ان کا کہنا یہ ہے کہ ان تمام جذبات اور خیالات کا اظہار کرنے کے بعد اقبال نے وطن پرستی کا راستہ چھوڑ کر ملت کی راہ اختیار کی اور مسلمانوں کے خاص مسائل اور ان کی تہذیب و تمدن، ان کے فکر و عمل کے مختلف گوشوں کو اپنے ذہن کی جولانگاہ بنا لیا۔ اقبال اس دور میں یہ دعا مانگتا ہے

> یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
> جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے

بقیہ صفحہ

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
۸ راکتوبر ۱۹۴۹ء

ایثار و قربانی میں کتنی بڑی قوت ہے

پچھلے ہفتے ہمارے ملک کے لوگ عید قربان اور دسہرے کے مذہبی تہوار اور گاندھی جینتی کا قومی تہوار منا رہے تھے۔ جن حضرات نے ان تقریبوں کی ظاہری اور رسمی حیثیت سے قطع نظر کر کے ان کے معنی اور مقصد پر غور کیا ہوگا انھیں ان میں یہ بات مشترک نظر آئی ہوگی کہ یہ تینوں انسان کے ایثار و قربانی کی نشانیاں ہیں اور اس حقیقت کو ثابت کرتی ہیں کہ ایثار و قربانی سے بڑھ کر کوئی قوت خلق خدا کے قلوب کو تسخیر کرنے والی نہیں۔

عید قربان خدا کے ایک محبوب اور برگزیدہ بندے سے نسبت رکھتی ہے جو اس کی خوشنودی کے لئے اپنے لخت جگر کا خون بہانے پر تیار ہو گیا۔ اس کے اس ایثار نے دوسری صفات حسنہ کے ساتھ مل کر اس کا روحانی مرتبہ اس قدر بلند کر دیا کہ تین بڑے مذہب جن کے پیرو دنیا کی آدھی سے زیادہ آبادی پر مشتمل ہے اُسے خدا کا اولوالعزم پیمبر اور اپنا محترم پیشوا مانتے ہیں۔ ان میں سے ایک مذہب کے لوگ یعنی مسلمان ربع مسکون کے ہر حصے میں اس بے مثل کارنامے کی یاد کو تازہ رکھتے ہیں۔

دسہرہ ایک اطاعت شعار بیٹے کی نشانی ہے جس نے باپ کے حکم کی تعمیل میں برسوں تک بن باس کی مصیبت اُٹھائی اور اس قربانی کے ذریعے سے صفحۂ تاریخ پر اپنی عظمت کی مہر ثبت کر دی یہاں تک کہ کروڑوں انسان اپنے عقیدے کے مطابق خدا کی شان جمالی کا مظہر سمجھنے لگے اور اس کی یادگار کو مقدس تہوار کی حیثیت سے منانے لگے۔

گاندھی جینتی ہمارے زمانے کے ایک حق پسند حق شناس حق گو مرد خدا کی پیدائش کا دن ہے جس کی زندگی ایثار کا صاف اور شفاف آئینہ اور موت قربانی کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ اس نے اپنے ۳۲ کروڑ ہم وطنوں اور دوسرے ملکوں کے بہت سے باشندوں کے دل پر عقیدت اور محبت کا ایسا گہرا نقش بٹھا دیا کہ اس کا یوم ولادت ہندوستان کا قومی جشن بن گیا جو صرف اس کی حدود کے اندر ہی نہیں بلکہ دنیا کے متعدد بڑے بڑے شہروں میں منایا جاتا ہے اور جس میں ان شہروں کے رہنے والے بڑے خلوص سے ہندستانیوں کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔

جب گاندھی جی کے سچے عقیدت مند ان کی ولادت کے دن بیٹھ کر یہ سوچتے ہیں کہ وہ کون سی قوت تھی جس کی بدولت اس بے نوا فقیر نے دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کا مقابلہ کر کے اُسے اخلاقی اور سیاسی شکست دی اور اپنے ملک کو اس کے پنجے سے آزاد کرایا تو ان کی بہت سی صفات سامنے آتی ہیں — ان کا عزم و استقلال اُن کی تنظیم اور تدبیر، اُن کی معاملہ فہمی اور بیدار مغزی اُن کی موقع شناسی اور مصلحت بینی — لیکن سب سے بڑی چیز جس میں ان کی زبردست قوت کا سارا راز پوشیدہ ہے ایثار اور قربانی کی صفت ہے۔

مگر یہ یاد رہے کہ گاندھی جی کے ہاں ایثار اور قربانی کی قدر و قیمت اور تاثیر و قوت اس پر موقوف ہے کہ اس کی بنا حق اور عدم تشدد پر ہو یعنی وہ انسان جس مقصد کے لئے قربانی کرے وہ بے شک و شبہہ حق ہو اور وہ جس طرح پیش کرے وہ نفرت اور دل آزاری سے پاک ہو۔ پہلی شرط تو آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے اس لئے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ بعض اوقات افراد اور جماعتیں اپنے ناجائز مقاصد کے حاصل کرنے کے لئے بھی بڑی بڑی قربانیاں دیتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان قربانیوں کی وجہ سے چاہے فوری کامیابی حاصل ہو جائے مگر ان کا کوئی پائدار اخلاقی اثر باقی نہیں رہتا۔ اخلاقی قوت اُسی قربانی میں ہوتی ہے جس کا مقصد اپنوں اور غیروں سب کے نزدیک جائز اور معقول ہو۔ لیکن دوسری شرط کسی قدر تشریح چاہتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان ایک ایسے مقصد کے لئے جو بجائے خود نیک اور جائز ہے اپنے اوپر تکلیفیں اُٹھاتا ہے لیکن اس کے دل میں ان لوگوں کی طرف سے جن سے وہ اس مقصد کو منوانا چاہتا ہے نفرت اور بیزاری رچی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کی نفس کشی اور ستم کشی کا انداز جارحانہ ہوتا ہے اور وہ اپنے مخالفوں کے جذبات کو متاثر نہیں بلکہ مجروح کرنا چاہتا ہے۔ گاندھی جی کے اخلاقی معیار کے مطابق ایسی قربانی ہنسا یا تشدد کی ایک شکل ہے اور تشدد ہر شکل میں اخلاقی تاثیر سے خالی ہوتا ہے۔

آج دنیا میں اور خاص کر ہمارے ملک میں جس نے ابھی صرف باہر سے جمہوریت کا روپ دھارا ہے اندر سے اس کی روح کو جذب نہیں کیا، حق تلفی نا انصافی اور جور و ستم کی بہت سی مثالیں نظر آتی ہیں۔ گاندھی جی اپنی زندگی کے آخری سانس تک ان زبردستیوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ ان کی سب سے بڑی آرزو تھی کہ ہندوستان کے ہر فرد اور جماعت میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ چُپ چاپ ظلم سہنا، اپنے جائز حقوق کو پامال ہوتے دیکھنا اور دم نہ مارنا، مظلومی نہیں بلکہ ظلم طلبی ہے۔ اہنسا نہیں بلکہ ہنسا کی اعانت ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ جس پر ظلم ہو وہ اپنی حفاظت کے لئے، جس کی حق تلفی ہو وہ اپنے حق کے لئے اہنسا کے ہتھیار سے ہنسا کا مقابلہ کرے۔

بہت سے لوگ جن میں حق کی حمایت کا جوش ہے یہ سمجھتے ہیں کہ ناحق کا مقابلہ صرف جسمانی طاقت ہی سے ہو سکتا ہے۔ ان سے ہمیں اس کے سوا کچھ نہیں کہنا ہے کہ اکثر صورتوں میں فریق مظلوم کو طاقت سے کام لینے کا مقدور نہیں ہوتا اور جب ہو بھی تو اس کی کامیابی عارضی یعنی صرف اس وقت تک کے لئے ہوتی ہے جب تک فریق ظالم اور زیادہ طاقت نہ اکٹھی کر لے لیکن جو حضرات گاندھی جی کی تعلیم سے متاثر اور اس کے قائل ہیں کہ ظلم اور نا انصافی کا مقابلہ اپنے اوپر تکلیف اُٹھا کر اور قربانی دے کر کرنا چاہئے۔ ان کو ہم متنبہ کرتے ہیں کہ گاندھی جی کے اصول کے مطابق حق کے لئے مقابلہ یا "ستیاگرہ" کرنے سے پہلے ایک تو اس بات کا یقین کر لینا چاہئے کہ ہم جس مقصد کو لے کر اٹھے ہیں اس کا حق ہونا اس قدر صاف اور واضح ہے کہ کوئی غیر جانبدار شخص بلکہ کوئی انصاف پسند مخالف بھی اس کی حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا۔ دوسرے یہ ارادہ کر لینا چاہئے کہ "جہد للحق" یا "ستیاگرہ" میں اپنے دل کو شخصی عداوت اور نفرت سے اور اپنے طرز عمل کو سختی اور رعونت، ضد اور ہٹ دھرمی، دل خراشی اور دل آزاری سے پاک رکھیں گے۔ ایثار اور قربانی اگر نیک اور پاک مقصد کے لئے ہو اور صلح و آشتی و صفا "عجز و انکسار، معقول پسندی اور سلامت روی کے ساتھ کی جائے تو اس میں مخالفوں کے دلوں کو تسخیر کرنے، باطل کا سر نیچا اور حق کا بول بالا کرنے کی بے پناہ قوت ہوتی ہے۔ یہ سب سے بڑی حقیقت تھی جس کی شہادت گاندھی جی نے اپنی زندگی اور موت سے دی اور سب سے اہم سبق ہے جو ہم ان کی زندگی اور موت سے حاصل کر سکتے ہیں۔

پاکستان

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

شراب بندی

پاکستان میں شراب بندی کا بہت دنوں سے مطالبہ ہو رہا ہے۔ مگر بہت سی دقتوں کی بنا پر ابھی تک اس مطالبے کو پورا نہیں کیا جا سکا تھا کچھ عرصہ پہلے مغربی پنجاب میں مسلمانوں کے لئے شراب ممنوع قرار دی گئی تھی مگر لاہور ہائی کورٹ نے اس حکم کو خلاف قانون قرار دے دیا تھا پچھلے ہفتہ دیکم اکتوبر سے اب دوبارہ شراب نوشی ممنوع قرار دے دی گئی ہے لیکن بقول معاصر پاکستان ٹائمز کے اس ممانعت میں ایسی گنجائش موجود ہے جس سے لوگ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں مثلاً ہر رجسٹرڈ ڈاکٹر کو طبی ضرورت پر شراب پینے کے لئے سرٹیفکٹ دینے کی اجازت ہے اس کے علاوہ غیر مسلموں کو شراب نوشی کی عام اجازت ہے اس لئے شرابی مسلمان اس سے بھی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

آئندہ را احتیاط

کل پاکستان مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری محمد یوسف کھٹک نے پاکستان ٹائمز کے نمائندے سے یہ امید ظاہر کی ہے کہ چند مہینوں میں پاکستان کی لیڈر شپ میں بہت بڑی تبدیلی ہوگی۔ ان کا خیال ہے کہ اگلے الیکشن میں جو جنوری کے آخر میں یا فروری کے شروع میں منعقد ہوگا عوام کو اپنے صحیح نمائندے چننے کا پورا پورا موقع ملے گا اور اس مرتبہ پچھلی غلطیاں دہرائی نہیں جائیں گی۔ موصوف نے اس کا بھی انکشاف کیا کہ انھوں نے پیر صاحب مانکی شریف سے عوامی لیگ کو ختم کرنے اور آئندہ الیکشن میں ۴

م حصہ لینے کے لئے مسلم لیگ میں شریک ہونے کی درخواست کی ہے۔

ہندوستان — دنیا کی رفتار — پاکستان

سکے کی پالیسی پر مہر تصدیق

۵ ۔ اور ۶ ۔ اکتوبر کو ہندوستانی پارلیمنٹ کا خاص اجلاس اس غرض سے منعقد ہوا کہ حکومت ہند کے جس فیصلے کی رو سے روپے کی قیمت ڈالر کے مقابلے میں ۴۴ فی صدی کم کردی گئی ہے اس پر غور کرے اس غور و فکر کا نتیجہ تو پہلے ہی معلوم تھا کہ تھوڑی بہت قیل و قال کے بعد حکومت کے فیصلے کی تصدیق کردی جائے گی۔ لیکن بحث کے دوران میں وزیر مالیات ڈاکٹر متھائی اور وزیر اعظم پنڈت نہرو نے بعض دلچسپ باتیں کہیں جن سے ہماری معاشی حالت اور ہمارے دولت مشترکہ کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے ڈاکٹر متھائی نے کہا کہ اسٹرلنگ کی قیمت کم کرنے کا فیصلہ برطانیہ نے دولت مشترکہ کے دوسرے ارکان سے مشورہ کئے بغیر کرلیا پچھلی دولت مشترکہ کانفرنس میں سر اسٹیفورڈ کرپس کو کچھ ہدایات دی گئی تھیں مگر انھوں نے ان کی حدود سے بہت آگے قدم بڑھا کر اپنے رفیقوں کو بڑی مشکل میں ڈال دیا۔ ہندوستان دو وجہ سے اس پر مجبور ہوگیا کہ اسٹرلنگ کے مقابلے میں روپے کی قیمت کو پہلی سطح پر رکھے یعنی ڈالر کے مقابلے میں گرادے ایک تو اس کی ۵۰ فی صدی تجارت اسٹرلنگ علاقے کے ملکوں سے ہے اور اسے قائم رکھنے کے لئے اسٹرلنگ کے ساتھ ساتھ روپے کی قیمت کو گھٹانا ضروری تھا ورنہ ان ملکوں کو ہندوستان کا مال مہنگا پڑتا اور وہ اسے خریدنا چھوڑ دیتے دوسرے دولت مشترکہ کا رکن ہونے کی وجہ سے ہندوستان برطانیہ اور دوسرے رفیقوں کا ساتھ دینے پر مجبور تھا۔ پنڈت نہرو نے اپنی تقریر میں اس پر زور دیا کہ ہندوستان اپنی موجودہ معاشی حالت کے لحاظ سے دوسرے ملکوں کا اتنا زیادہ پابند نہیں جتنا اسے نہ ہونا چاہیئے انھوں نے فرمایا کہ یہ حقیقت ابھی تک اس قدر واضح نہ تھی مگر اب اسٹرلنگ اور ڈالر کے قضیے کی وجہ سے اچھی طرح سے روشن ہوگئی ہے۔ اس سے ہماری آنکھیں کھل جائیں گی اور ہم اپنی حالت کو سدھارنے کی کوشش کریں گے۔

ظاہر ہے کہ عام لوگوں کی اس بحث سے جو دلچسپی تھی وہ یہ تھی کہ روپے کی قیمت بدلنے کی وجہ سے عام طور پر اشیاء کی قیمتیں بڑھ جانے کا خطرہ ہے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے حکومت کیا تدبیر کرے گی۔ اس سلسلے میں متھائی صاحب نے آٹھ باتیں بتائیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ حکومت کفایت کی پالیسی اختیار کرے گی جس سے باہر کے سکوں کا خرچ کم ہوجائے اور ایسے قانونی اور انتظامی قدم اٹھائے گی جن سے ملک کے اندر اشیاء کی قیمتیں نہ بڑھنے پائیں مگر افسوس یہ ہے کہ ان میں سے اکثر قانونی اور انتظامی قدم وہ ہیں جو حکومت ایک مدت سے اٹھا رہی ہے مگر اب تک اپنی جگہ سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھی۔ مثلاً یہ تجویز کہ جن لوگوں نے جنگ کے زمانے میں بے تحاشا روپیہ کمایا اور انکم ٹیکس ادا نہیں کیا ان سے انکم ٹیکس وصول کیا جائے۔ اس میں حکومت کو اب تک کوئی قابل ذکر کامیابی نہیں ہوئی۔ وزیر اعظم نے اپنے ۴ اکتوبر کے براڈکاسٹ میں پھر ایک بار نفع خوروں سے اپیل کی ہے کہ ٹیکس ادا کریں اور انھیں اطمینان دلایا ہے کہ اگر وہ خود ہی ادائگی کردیں گے تو ان کو کسی قسم کی سزا نہیں دی جائے گی۔ لیکن ظاہر ہے کہ جب حکومت کی مشینری ان لوگوں کو گرفت میں نہیں لاسکتی تو اس قسم کی اپیلوں کا کیا اثر ہوسکتا ہے۔

بنگال کی گتھی کسی طرح نہیں سلجھتی

کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ۵ ، ۶ ۔ اکتوبر کے جلسے میں پھر ایک بار بنگال کے جھگڑے کو نپٹانے کی کوشش کی اور پھر ناکام رہی۔ جھگڑا یہ ہے کہ بنگال میں اسمبلی کی کانگریس پارٹی میں ڈاکٹر بی سی رائے اور ان کی وزارت کے حامی اکثریت میں ہیں اور صوبے کی کانگریس کمیٹی میں وزارت کے مخالفوں کا زور ہے کانگریس کمیٹی چاہتی ہے کہ وزارت بدلی جائے اور وزیروں کا اصرار ہے کہ کانگریس کمیٹی کا انتخاب نئے سرے سے ہو دونوں فریق ایک دوسرے پر طرح طرح کے الزام لگا رہے ہیں لیکن ان الزاموں کا کوئی قطعی اور واضح ثبوت نہیں دے سکتے اس لئے کانگریس ہائی کمانڈ کے لئے دونوں میں سے کسی کے مطالبے کو منظور کرنا ممکن نہیں ہے جنوری ۵۰ء کے آخری ہفتہ میں اسمبلی کا نیا الیکشن ہونے والا ہے۔ حال کے اجلاس میں ورکنگ کمیٹی نے دونوں فریقوں کے نمائندوں کو بلوا کر ان پر زور ڈالا کہ آپس میں مصالحت کرلیں مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں ہوا۔ اب دیکھنا ہے کہ بنگال کے کانگریسی آپس کے شدید اختلافات کے باوجود الیکشن میں اپنے طاقتور مخالفوں کا مقابلہ یک جہتی کے ساتھ کرسکتے ہیں یا نہیں۔

روپے کی قیمت اور پاکستان کی مشکلات

شروع شروع میں تو پاکستانی اخبارات نے حکومت پاکستان کو بڑی شاباشی دی کہ اس نے اپنے سکے کی قیمت نہ گھٹا کر دنیا کی نظروں میں اپنا مرتبہ بہت بڑھا لیا ہے، مگر اب آہستہ آہستہ انھیں ان مشکلات کا احساس ہوتا جارہا ہے جو روپے کی قیمت نہ گھٹانے کی وجہ سے انھیں اپنے پڑوسی ملک ہندوستان اور اسٹرلنگ کے علاقوں سے تجارت کو قائم رکھنے میں پیش آئیں گی پاکستان کی دو اہم پیداوار یعنی جوٹ اور روئی کی سب سے زیادہ کھپت ہندوستان کی منڈی میں تھی مگر موجودہ تعطل کی وجہ سے ان دونوں کی فروخت کا مسئلہ پاکستان کے لئے بڑی مشکلات کا باعث بن گیا ہے۔ اگرچہ حکومت پاکستان دوسرے ملکوں سے اس سلسلے میں بات چیت کررہی ہے مگر یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان سے بہتر اس کو کسی اور ملک میں منڈی ملنا بہت مشکل ہے۔ اسی طرح اس تعطل کی وجہ سے پاکستان کی بہت سی دیہی صنعتیں بھی بڑے خطرے میں پڑ گئی ہیں اور بے روزگاری بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ مثال کے طور پر چمڑے کی صنعت کو لیجئے پاکستان میں بہت کافی چمڑا پیدا ہوتا ہے، اور مغربی پنجاب کے پانچ چمڑا صاف کرنے والے کارخانے صرف اپنے ہی صوبے کی ضروریات کو پورا کرسکتے ہیں۔ اس لئے دوسرے صوبوں کے کچے چمڑے کی نکاسی ہندوستانی منڈیوں میں ہوتی ہے۔ اب موجودہ تعطل کی وجہ سے کچے چمڑے کی فروخت کے لئے کوئی اور منڈی نہیں رہی اور چمڑے کی مصنوعات کے لئے صاف کیا ہوا چمڑا نہیں رہا چنانچہ ابھی حال میں ان لوگوں نے جو چمڑے سے جوتے اور دوسری چیزیں بناتے ہیں ایک یادداشت میں مرکزی حکومت کے سامنے اپنی مشکلات اور آئندہ کے خطرات پیش کئے ہیں اور پاکستان ٹائمز (لاہور) کے معاشی نامہ نگار نے لکھا ہے کہ چار پانچ کارخانوں کے سوا چمڑے کا سامان بنانے والی تمام فیکٹریاں بند پڑی ہیں اور جوتا بنانے والوں کو بہت سخت نقصان ہو رہا ہے۔ یہی حال چمڑے سے تعلق رکھنے والی دوسری صنعتوں کا بھی ہے۔ مثلاً سیالکوٹ میں کھیل کا سامان تیار کرنے والے کارخانوں میں بھی بہت کم مال تیار ہو رہا ہے جس کی وجہ سے یہ صنعت بہت بڑے خسارے سے دوچار ہے۔

ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے بعض معاشی ماہرین نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ (۱) دیہی صنعتوں کی حفاظت کے لئے اسٹرلنگ علاقوں کی مصنوعات کی درآمد پر بہت بھاری محصول لگایا جائے۔

(۲) صنعتی خام اشیا مثلاً کوئلہ، لوہا، اور اسٹیل وغیرہ کی درآمد پر کوئی محصول نہ لگایا جائے۔

(۳) ڈالر کے علاقوں سے جو مشینیں وغیرہ منگائی جائیں ان کو محصول سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔

(۴) ان ڈالر کے علاقوں میں جانے والے پاکستانی مال پر جہاں ہندوستان بھی اپنا مال بھیجتا ہے کسی قسم کا محصول برآمد عائد نہ کیا جائے۔

مختصر یہ کہ روپے کی قیمت نہ گھٹا کر حکومت پاکستان بڑے آزمائشی دور سے گذر رہی ہے اور صرف ہندوستان کے اخبارات ہی نہیں یورپ اور امریکا کے اخبارات کا بھی یہ کہنا ہے، جن میں لندن کا مشہور ہفتہ وار "اکانومسٹ" بھی شامل ہے کہ پاکستان اپنے اس فیصلے پر بہت عرصے تک قائم نہیں رہ سکے گا۔

موڈی کے بعد ڈرنگ کی باری ہے

پاکستان کے لوگوں کو جن میں مسلم لیگی کارکن اور رہنما بھی شامل ہیں یہ عام شکایت ہے کہ پاکستانی ریاستوں میں آزادی بالکل مفقود ہے اور ظلم و زیادتی بدستور باقی ہے خاص طور پر ریاست بھاولپور کے متعلق لوگوں کو بہت سخت شکایتیں ہیں اس سال جو ہاں انگریز وزیر اعظم کرنل ڈرنگ کے خلاف مظاہرے ہوئے ہیں اور ان کو لمبی قید سے ختم کیا جارہا ہے۔ اگرچہ پاکستان کی ریاستوں کا نظام اب بھی ویسا ہے جیسا ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے قبل تھا اور دوسری ریاستوں میں اس قسم کی تحریکیں نہایت آسانی سے دبادی جاتی ہیں مگر بھاولپور میں چونکہ مطالبہ ایک انگریز کے نکالے جانے کا ہے اس کی ...

(بقیہ صفحہ ۳ پر)

بزمِ بے تکلف

(اتوار کا دن، چھ بجے شام کا وقت، نہر کے کنارے سیلانیوں کا جمگھٹا۔ ہر طرف چہل پہل نظر آرہی ہے۔ ایک طرف ایک بنچ پر چار حضرات جنھیں آپ سفید پوش نہ کہیں تو بُرا مان جائیں گے۔ بیٹھے گپ شپ کر رہے ہیں۔ اُن میں سے ہر ایک کا خاصا چٹ پٹا ہے، بلکہ کبھی کبھی مرچ اور کھٹائی اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ گپ شپ پر اُگل خیپ کا دھوکا ہونے لگتا ہے، تیسرے اور چوتھے صاحب اس چٹنی میں تھوڑی سی مٹھاس ملا کر نورتن کا مزہ پیدا کر دیتے ہیں)

ا۔ کیا کہنا ہے اس آزادی کا۔ نہ رکھی جائے نہ اُٹھائی جائے۔ چور بازاری اور مہنگائی ہے کہ روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ گیہوں پہلے ہی شکر کے بھاؤ ہو گیا تھا۔ اب شکر کھی کے بھاؤ بکنے لگی۔ بس ایک آزادی سستی ہے

جگ جگ جیو۔ آزادی گھول کر پیو

ب۔ تم جیسے چٹوروں کو آزادی ناحق ملی۔ اس کا ہمیں بھی افسوس ہے۔ تمھیں تو انگریز کی جوتیاں چاٹنے میں قند مکرر کا مزہ آتا تھا۔ غضب خدا کا! آزادی کا مقابلہ کرانے سے کرنے چلے ہیں۔ ارے ناشکرے کہیں آزادی شکر سے تولی جاتی ہے۔

(ج سے مخاطب ہو کر) کیوں بھئی مصری لال سچ بتاؤ تمھیں آزادی پیاری ہے یا شکر

ج۔ ارے بھیا۔ ہماری بھی چلائی، ہمارے تو دونوں ہی میٹھے۔ شکر سے تو کھیا بھرے۔ آزادی سے پیٹ بھرا، اور اس میں جھگڑا کاہے کا؟ شکر ملے شکر سے آزادی ملے آزادی سے

ا۔ ہم سے پوچھو نا، مصری لال سے کیا پوچھتے ہو۔ پیٹ بھروں کی آزادی کا پیمانہ تجوری کی روکڑ سہی، مگر غریبوں کی آزادی بے نمک اسی گڑ شکر آٹے سے، سی نون، تیل، لکڑی تولی اور ناپی جاتی ہے، جس آزادی سے بھوکوں کا پیٹ نہ بھرے وہ ہمارے کس کام کی؟ تم اسے بنیو تجوری کر چاٹا کرو۔ اب رہی انگریز کی غلامی تو ہم تو خیر غلام تھے ہی تم کون سے آزادی کی دم بن گئے ہو؟ یہی نا کہ پہلے شکاری نے پنجرے میں بند کر رکھا تھا، اب پر قینچ کر کے چھوڑ دیا ہے۔

ب۔ اجی کیوں بے پر کی اُڑاتے ہو؟ ابھی ہم نے پر پُرزے نکالے ہی کہاں ہیں جو کوئی ہمیں پر قینچ کرے گا۔ مگر ہماری آزادی میں کیا کسر رہ گئی ہے؟ آئین اپنا حکومت اپنی، جھنڈا اپنا، سکّہ اپنا اور آزاد قوموں میں کون سا سُرخاب کا پر لگا ہوتا ہے؟

ج۔ بس رہنے بھی دو، اور لو اور سکّے کو بھی اپنا کہنے لگے۔ شرم تو نہ آئی ہوگی؟ جو سکہ اسٹرلنگ کی دم سے بندھا ہو، اور اس کے ساتھ کھچا کھچا پھرے اُسے کوئی آزاد کہے گا؟ انگریز کو تو خیر اپنا مال امریکہ کے سر منڈھنا ہے اور ڈالر بٹورنے ہیں، مگر تم نے کیوں بیٹھے بٹھائے اپنے سکّے کو بٹہ لگا دیا۔ یہ ڈالر کی غلامی نہیں تو اور کیا ہے؟

د۔ بھئی واہ! بات شکر رنجی سے شروع ہوئی اور ڈالر رنجی تک پہنچ گئی۔ اگر ہماری بات مانو تو اس ڈالر کے پھیر میں نہ پڑو، اس میں بڑے بڑے گھن چکر بن جاتے ہیں۔

ب۔ ارے میاں کیوں ڈر کے مارے مرے جاتے ہو ہم سکّے کے بیوپار میں اناڑی سہی، مگر پھر بنئے ہیں۔ کچھ پائیں گے تو پاکر سیکھیں گے، کھوئیں گے تو کھو کر سیکھیں گے۔ آزادی اس کے سوا کچھ نہیں کہ آدمی کو آزما کر، سیکھنے کا بڑھ کر چلنے کا، گر کر سنبھلنے کا موقع ملے۔ ہم ڈالر کے غلام ہیں نہ اسٹرلنگ کے اپنی غرض کے بندے ہیں۔

ج۔ اور اس سے کوئی غرض نہیں کہ اس سکّہ بازی کی مشق میں کس پہ کیا گذر جائے گی

کون گھائل ہوا خبر ہی نہیں
آپ کی مشق ناز کیا کہنا

نو بہ نو

سیّدہ فرحت

ہو چکے ہیں یہ ترے گیت پرانے اب تو
نہ سُنا یہ گل و بُلبل کے ترانے اب تو
ختم کر حسرت و حرماں کے فسانے اب تو
مطربہ! چھیڑ نیا راگ نیا ساز کوئی

دم گھٹے جس میں وہ میخانے کی محبوس فضا
وہی ٹوٹا ہوا ساغر وہی در کا شیشا
بادہ خواروں کا یہ مجمع ہے کہ کنگالوں کا
بزمِ ساقی کا نیا اب تو ہو انداز کوئی

چین لینے نہیں دیتا دلِ شوریدہ مزاج
ہو تنوع جو طبیعت میں تو کیا اس کا علاج
زیست اور موت کے کچھ اور ہی ہوں رسم و رواج
اے فلک اب تو نیا دور ہو آغاز کوئی

اور کر کشت کو سیراب کہ حاصل یہ نہیں
چھوڑ کشتی کو نہ اپنی ترا ساحل یہ نہیں
راہ رو اور بڑھ آگے تری منزل یہ نہیں
دور سے دیتا ہے جیسے مجھے آواز کوئی

حوصلے کی ہے کمی پاؤں کی تیرے زنجیر
کر وہ تدبیر، بدل جاتی ہے جس سے تقدیر
خوفِ صیاد سے آزاد ہو اے مرغِ اسیر
چھین سکتا نہیں تجھ سے پرِ پرواز کوئی

خود فراموشی پہ مجبور رہے گا کب تک
خاک اُفتادہ و رنجور رہے گا کب تک
حسن کے سحر سے مسحور رہے گا کب تک
جذبۂ عشق دکھا تو بھی تو اعجاز کوئی

بہ سلسلہ صفحہ ۴

پھر وادیٔ فاراں کے ہر ذرے کو چمکا دے
پھر شوقِ تماشا دے، پھر ذوقِ تقاضا دے
محرومِ تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے
دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے
وسعت میں مقاصد کو ہم دوشِ ثریا کر
خودداری ساحل دے، آزادیٔ دریا دے!

یا وہ کہتا ہے :-

نہ تخت و تاج میں، نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل
یہ نکتہ وہ ہے جو پوشیدہ لا الہ میں ہے!

یا اس کو اپنے زمانے سے یہ شکایت ہے۔

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات
عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات!
صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

آئیے ذرا اس تنقید کو عقل کی کسوٹی پر پرکھیں، یہ تو بعد میں دیکھیں گے کہ اقبال کے آخری کلام میں حب وطن کا جذبہ پایا جاتا ہے یا نہیں، لیکن پہلا سوال (جس کی فنی اور ذہنی لحاظ سے بڑی اہمیت ہے) یہ ہے کہ اگر کوئی شاعر یا ادیب اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کرنے اور ان کی تشریح و تلقین کے لئے کسی خاص تہذیب یا ملت کو اپنا مخاطب بنا لیتا ہے تو کیا ایسا کرنے سے اس کی اہمیت کم ہو جاتی ہے یا اس کے جذبۂ حب وطن پر حرف آتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہر بڑا فن کار اپنے فن کے کمال کو اسی وقت پہنچ سکتا ہے جب وہ ان خاص قومی اور ملی اقدار میں پوری طرح ڈوب کر انھیں اپنا لے جن کی آغوش میں اس نے تربیت پائی ہے۔ اقبال کو اپنا پیغام اور فلسفہ دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے سب سے زیادہ موزوں اور مناسب سانچہ علاوہ اسلامی تہذیب کا سانچہ تھا جس کی بعض خاص اقدار میں اسے زندگی کے ان اصولوں اور مقصدوں کی جھلک نظر آئی جن کو وہ محض مسلمانوں کے لئے بلکہ تمام عالم انسانیت کی فلاح کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔ اقبال نے خود ایک موقع پر اس قسم کے ایک جواب کے اعتراض میں لکھا تھا۔

"میری فارسی مثنویوں کا مقصد اسلام کی وکالت کرنا نہیں ہے۔ دراصل مجھے ایک بہتر معاشرتی نظام کی تلاش میں دلچسپی ہے لیکن اس تلاش میں یہ امر بالکل ناممکن ہے کہ میں ایک ایسے نظام معاشرت کو بالکل نظر انداز کر دوں جس کا سب سے بڑا مقصد نسل، رنگ اور ذات پات کے خطرناک امتیازات کو مٹانا ہو"

چونکہ اقبال کے نزدیک دورِ حاضر میں انسانیت کی نجات کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ مصنوعی امتیاز کی ان دیواروں کو گرا دے جو خدا کے بندوں کی یک جہتی کو ٹکڑے ٹکڑے کرتی ہیں، اور جن کو انسانوں نے بت بنا کر پوجنا شروع کر دیا ہے، اس لئے وہ بار بار اپنی شاعری کی ان سچی اسلامی قدروں پر زور دیتا ہے جو انفرادی زندگی میں اپنی اور دوسروں کی خودی کے احترام اور افراد کے تعلقات میں رواداری کی تعلیم دیتی ہیں۔ دراصل عام دنیا کے لئے قابل غور امر یہ نہیں کہ اقبال کے فکر و جذبات کا سرچشمہ کیا ہے بلکہ یہ حقیقت کہ اس خزانے سے وہ جو جواہرات نکال کر ان کے سامنے پیش کرتا ہے، ان کی قدر و قیمت کیا ہے؟ اس بارے میں ایک دفعہ سر تیج بہادر سپرو نے ایک پتے کی بات کہی تھی۔ انھوں نے لکھا تھا کہ بعض لوگ اقبال پر اس وجہ سے اعتراض کرتے ہیں کہ وہ ایک اسلامی شاعر ہے۔ یہ اعتراض نہایت مہمل ہے اگر شیکسپیر کی عالم گیر اہمیت اس وجہ سے کم نہیں ہوئی کہ وہ انگریز ہے اور انگریزی تہذیب و تمدن کی ترجمانی کرتا ہے، اگر گوئٹے باوجود مغربی تمدن اور مسیحی تہذیب کا علم بردار ہونے کے ادب عالم کے باوجود ساری دنیا کے لئے لطف و مسرت کا سرچشمہ ہے تو اقبال کے لئے یہ جرم کیوں ہے کہ وہ اسلامی تہذیب کی باتیں اور محاورے استعمال کرتا ہو اور اس کی قدروں کی اہمیت پر زور دیتا ہو تہذیب کی زبان اور محاورے استعمال کرتا ہے اور اس کی قدروں کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔

لیکن اس کے علاوہ ایک اور امر بھی ہے جس کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ اقبال کا حب وطن اس سطحی اور نام نہاد قوم پرستی سے بہت مختلف ہے جس کی تسکین نعرے لگانے سے، اپنی قوم کی جا اور بے جا حمایت کرنے سے اور دوسری قوموں کی تحقیر کرنے سے ہوتی ہے۔ اقبال کو اپنے ملک کی تہذیب اور تمدن کے بہترین عناصر سے محبت ہے اس کے بہترین مفکرین اور شریف انسانوں سے عقیدت ہے اور اس وسیع حلقے میں بھرتری ہری اور گوتم بدھ سے لے کر عارف ہندی، جہاں دوست اور گرو نانک تک سب آ جاتے ہیں، لیکن اقبال اس اندھی وطن پرستی اور مبالغہ آمیز قومیت سے بیزار ہے جو نسل اور رنگ اور جغرافیہ کی بنا پر انسانوں کی خدا داد وحدت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔ اور انسانیت کے بہترین اصولوں کو ان نامبارک بتوں کی بھینٹ چڑھا دیتی ہے۔ اس بارے میں اقبال نے کبھی اپنے خیالات کو نہیں چھپایا۔ ان پر مصلحت اندیشی کا فریب دینے والا پردہ نہیں ڈالا اور اگر یہ جرم ہے تو اس جرم میں نہ صرف دورِ حاضر کے بہترین ادیب اور مفکر مثلاً ٹیگور، شا اور ویلز اور رومان رولاں اور سنکلیر شریک ہیں، بلکہ اسلام کی بین الاقوامیت، حضرت عیسیٰ کی انسان دوستی، مہاتما بدھ کی عالمگیر محبت اور دردمندی جو قوموں کی تمیز کو فراموش کر دیتی ہیں، ان سب پر بھی یہی الزام عائد ہوتا ہے اور اقبال اس الزام کو بخوشی قبول کرنے کو تیار ہے! دورِ حاضر پر اقبال کی سب سے سخت تنقید یہی ہے کہ اس نے قومیت کی خاطر انسانیت کو قربان کر دیا ہے۔ سنئے۔

آں چناں قطع اخوت کردہ اند — بر وطن تعمیر ملت کردہ اند
تا وطن را شمع محفل ساختند — نوع انساں را قبائل ساختند
مردمی اندر جہاں افسانہ شد — آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت و ہفت اندام ماند — آدمیت گم شد و اقوام ماند

ابھی تک میں نے اعتراض کو صحیح فرض کر کے اس کا جواب دیا ہے۔ مگر حقیقت میں اعتراض بے جا ہے، کہا جاتا ہے کہ اقبال کا آخری کلام حب وطن کے جذبے سے خالی ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ حب وطن کی صحیح تفسیر اور اس کا جوش جیسا ان دوروں میں ملتا ہے اور ان نظموں کے مقابلے میں جو [illegible] اور فارسی کلیات [illegible] معلوم ہوتی ہیں۔ اقبال کی نظر میں وطن کے ساتھ غداری اس قدر زبردست جرم ہے کہ اس نے "جاوید نامہ" میں دوزخ کا سب سے شدید عذاب بنگال کے میر جعفر اور دکن کے میر صادق کے لئے تجویز کیا ہے، کیونکہ انھوں نے اپنے ملک کی آزادی کو غیر ملکیوں کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن — ننگ آدم ننگ دیں ننگ وطن

اور جب دوزخ نے بھی ان غدار روحوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو اس نے ان کو فلک زحل کے قلزم خونیں میں اچھال دیا۔

جاوید نامہ ہی میں ایک مقام پر زندہ رود اور [illegible] میں گفتگو ہوتی ہے اور اس وقت اقبال حب وطن کے جذبے کو اس خلوص اور جوش کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ اس کے سامنے تمام بلند بانگ دعوے کرنے والے ماند پڑ جاتے ہیں

باز گو از ہند و از ہندوستاں — آنکہ با کاہش نیرزد بوستاں
آنکہ اندر مسجدش ہنگامہ مرد — آنکہ اندر دیر او آتش فسرد
آنکہ دل از بہر او خوں کردہ ایم — آنکہ یادش را بجاں پروردہ ایم
از غم ما کن غم او را قیاس — آہ از اں معشوق عاشق ناشناس

اور آخر میں اقبال کی ہند دوستی کے سلسلے میں ضربِ کلیم کی اس چھوٹی سی نظم کے چند اشعار سن لیجئے جس کا عنوان "شعاعِ امید" ہے۔ اور جس میں اقبال نے ایک شوخ کرن کی زبانی وطن کی خدمت کا ایک بہت بلند اور پُر جوش پیغام پیش کیا ہے۔

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواصِ معانی
جن کے لئے ہر بحرِ پر آشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے شرمندۂ مضراب
بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب
مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر!

یہ ہے اقبال، حب وطن سے سرشار، اس کی سرزمین کو اپنے اشکوں سے سیراب کرنے والا، اس کی گذشتہ عظمت کا معترف، اس کی سونی محفل کا مرثیہ خواں، اس کے سوتے ہوئے برہمن اور روتے ہوئے مسلمان سے بیزار، اس کی خدمت اور بیداری کے لئے کمر بستہ، لیکن اس تنگ نظری اور جغرافیہ پرستی سے بلند جو خدمت کے جذبے کو مشرق اور مغرب، اپنے اور پرائے، کالے اور گورے، ہندو اور مسلمان کی بندشوں میں اسیر کرنا چاہتی ہے، اگر یہ سچی وطن دوستی اور وطن کی محبت نہیں ہے تو پھر اعتراض کرنے والے خرد کو جنوں اور جنوں کو خرد سمجھتے ہیں اور اس وجہ سے شاید قابلِ درگذر نہیں لیکن یقیناً قوم اور ملک اور انسانیت کے لئے خطرناک ہیں ❊

جرائم کس طرح روکے جائیں

نفسیاتی نقطۂ نظر سے (۱)

خواجہ جلیل احمد

انسداد جرائم کا مسئلہ کسی نہ کسی صورت میں ہر حکومت کے پیش نظر رہا ہے۔ نظریاتی حیثیت سے کوئی حکومت خواہ سوشلسٹ ہو یا کمیونسٹ، جمہوری ہو یا مطلق العنان حتیٰ کہ ابتدائی غیر منظم قبائل تک، کچھ ایسے قوانین ضرور وضع کرتے ہیں جن کا مقصد افراد کو نیک چلنی کی طرف مائل کرنا اور بد چلنی اور دوسرے جرائم سے باز رکھنا ہوتا ہے۔ ان قوانین میں بیشتر تعداد ایسے احکامات کی ہوتی ہے۔ جن کا مقصد جرائم کے ارتکاب کے بعد مجرمین کو سزا دینا ہوتا ہے۔ حکومت کی ابتدائی زندگی میں قوانین کا مقصد عام طور سے یہی رکھا جاتا تھا۔ بعد میں کچھ سوچ بچار کے بعد مجرمین کی اصلاح اور ذہنی تربیت پر زور دیا جانے لگا۔ لیکن یہ نفسیاتی علاج بھی زیادہ مفید ثابت نہیں ہوا کیونکہ عام طور سے مجرمین پختہ عمر کے ہوتے تھے جن کی مخصوص عادات اُن کی زندگی کا جزو بن چکی ہوتی تھیں، اور کسی بھی قسم کی تربیت ان عادات کو یک سر دور کرنے سے قاصر رہتی تھیں۔ چنانچہ پرانے لوگوں کا مقولہ کہ چور چوری سے گیا تو کیا ہیرا پھیری سے بھی گیا۔ اسی نفسیاتی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر چور کی عادت چوری کرنے کی پڑ چکی ہے اور کسی طرح آپ نے اس کے دل میں یہ بات پیدا کر دی کہ چوری بری چیز ہے پھر بھی چیزوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کی جو عادت جڑ پکڑ چکی ہے وہ قائم رہتی ہے۔ چنانچہ یہ کہاوت ایک واقعے سے ماخوذ ہے جس میں ایک چور نے چوری سے توبہ کی تھی لیکن پھر بھی لوگوں کی چیزوں کو ایک جگہ سے اُٹھا کر دوسری جگہ رکھ دیتا تھا۔ جب لوگوں نے اعتراض کیا تو اس نے کہا کہ "کیا اب میں اس سے بھی باز رہوں یہ تو ناممکن ہے۔"

بظاہر یہ کہاوت بالکل معمولی سی ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو بہت گہری بات اس میں پوشیدہ ہے اور اس خبر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ حکومت اور افراد اور دونوں ہی کو ابتدائی عمر میں عادات کی درستگی کی طرف زور دینا چاہیئے۔ ورنہ بعد میں عادت کے جڑ پکڑ لینے پر اس کا ختم کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوگا۔ غرض یہی اور اسی قسم کی دوسری مثالیں تھیں جنھوں نے ماہرین نفسیات کو سوچنے پر مجبور کیا اور بعد غور و خوض کے انھوں نے طے کیا کہ مجرمین کو سزا دینے اور دلانے والے قوانین سے زیادہ "انسداد جرائم" کا مسئلہ اہم ہے۔ "نفسیات کا اہم استعمال قانون" میں اسی جگہ سے شروع ہوتا ہے۔

مختلف ممالک کی قانونی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے پہل مقدمات کے فیصلے کرنے کے لیئے جج مقرر کیئے جاتے تھے اُن کے سامنے مجرم لایا جاتا تھا۔ اور وہ اس کے جرم کے مطابق جو سزا مناسب سمجھتے تھے دیتے تھے یعنی بالفاظ دیگر مختلف جرائم کی خصوصی سزائیں مقرر نہیں تھیں اس کا نتیجہ ظاہر ہے بُرا ہوتا تھا کیونکہ اکثر و بیشتر جج کے فیصلے اس کی جذباتی اور ذہنی کیفیت کے آئینہ دار ہوتے تھے اور اکثر معمولی جرائم پر بے انتہا سخت سزائیں اور کبھی کبھی انتہائی نرم سزا دی جاتی تھی اور بعض دفعہ تو مجرم قطعاً بری کر دیا جاتا تھا۔ یہ حالت عام طور سے شخصی حکومتوں میں

> مجرمین پر جرم کی ذمہ داری عائد کرنے کے سلسلے میں نفسیات کا قطعی فیصلہ یہ ہے کہ مجرم کی حرکات لاتعداد اندرونی اور بیرونی حالات سے متاثر ہوتی ہیں اور اکثر اس کو اپنے افعال پر قدرت حاصل نہیں ہوتی اور اس طرح اندرونی ماحول کا لحاظ رکھتے ہوئے مخصوص حالات میں وہ بالکل اسی طرح کی حرکات کرتا ہے جیسا کہ عام حالات میں کسی صحیح الدماغ آدمی سے سرزد ہوتیں اس لئے اس کو اپنے ہر فعل کے لئے سراسر ذمہ دار قرار دینا حماقت ہوگی۔

پائی جاتی تھی چنانچہ مثال کے طور پر ایسے بادشاہوں، امیروں اور رئیسوں کے فیصلے سبھی نے سنے ہوں گے جس میں کسی برجستہ جواب پر قاتل کو رہا کر دیا گیا اور کبھی کبھی صرف معمولی سی بے باکی پر جان لے لی گئی، یہی حالات تھے، شاید جن کے مشاہدے کے بعد شیخ سعدی نے کہا تھا کہ بادشاہوں کی نوکری بڑی خطرناک چیز ہے وہ کبھی گالی پر انعام دیتے ہیں اور کبھی تعریف پر گردن زدنی قرار دیتے ہیں۔

لیکن یہ حالت عرصے تک قائم نہیں رہی کیونکہ انسان نے بعد میں ایسے قوانین وضع کئے جن میں ہر جرم کی ایک مخصوص سزا قرار پائی لیکن اس طریقہ کار میں بھی بے انصافی کی گنجائش ہے کیونکہ اس میں جج کی نظر صرف جرم پر رہتی ہے، مجرم پر نہیں مطلب یہ ہے کہ مجرم کی انفرادیت پر قطعی غور کئے بغیر صرف جرم کی نوعیت پر حکم لگایا جاتا ہے حالانکہ ہونا یہ چاہیئے کہ عدالت اس بات پر بھی غور کرے کہ مجرم نے کیوں جرم کیا۔ اس کے نفسیاتی اسباب کیا تھے؟ پھر یہ کہ وہ بچہ ہے یا جوان، نوجوان ہے یا ضعیف یا ادھیڑ عمر کا آدمی، عورت ہے یا مرد وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ان تمام طبقوں میں اپنی اپنی انفرادیت پائی جاتی ہے اور جرم کی نوعیت اور اس کی سنگینی کا احساس ان کی انفرادی حیثیت پر غور کرنے سے بالکل مختلف ہو سکتا ہے۔ مثلاً وہ جرائم جو جذباتی حالت میں سرزد ہوتے ہیں۔ مختلف لوگوں میں مختلف صورتوں اور اشتعال انگیز حالات میں پیدا ہوتے ہیں ایک شخص اگر یہ دیکھتا ہے کہ کوئی غنڈہ اس کی بہن، بیٹی یا بیوی کو اغوا کرنے کی فکر میں ہے اور معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ وہ عنقریب اسے لے کر زبردستی بھاگنے والا ہے اور غصہ کی حالت میں وہ اس کو گولی مار دیتا ہے تو اس کے جرم کی نوعیت یقیناً بدل جائے گی، کیونکہ وہ حالات اوروں سے مختلف تھے اور ان میں اس کو اپنے ہوش و حواس پر قابو حاصل نہیں تھا۔ لہٰذا اس کو عام قانون کے ماتحت قتل کی سزا دینا ناانصافی ہوگی۔ اب اسی نوعیت کے واقعہ قتل کو ایسی سوسائٹی (مغربی سوسائٹی) میں فرض کیجئے جہاں پر عصمت کا اتنا احترام نہیں کیا جاتا، جتنا ہم مشرقی کرتے آئے ہیں یا ہماری اکثریت اب بھی کرتی ہے۔ تو وہاں پر یقیناً قاتل کو قتل کی سزا دینی ہوگی۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اس قسم کے واقعات اس کو کبھی مشتعل نہیں کر سکتے اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ اس مرتبہ اُس نے ذاتی مفاد کی بنا پر صرف حالات سے فائدہ اُٹھانے کے لئے گولی چلائی ہے۔

علاوہ ازیں ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیئے مجرم بچہ ہے یا جوان، کیونکہ اگر بچہ ہے تو پھر یقیناً اس کا حشر نوجوانوں جیسا نہیں ہونا چاہیئے۔ اور نوجوانوں اور جوانوں میں بھی اس کا فرق ضرور معلوم کر لینا چاہیئے کہ آیا اس قسم کے جرم کا ارتکاب مجرم نے پہلی دفعہ کیا ہے یا عادی مجرم ہے۔ یہ سب واقعات یقیناً ایسے ہیں جن سے سزاؤں کی نوعیت اور مدت میں تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے اکثر مہذب ممالک میں بچوں اور عورتوں کی عدالتیں علیحدہ ہوتی ہیں جن میں بچے کی نفسیات کے ماہرین اس بات کا فیصلہ کرتے ہیں کہ آیا مجرم کی اصلاح ہو سکتی ہے یا نہیں اور اگر ہو سکتی ہے تو اس کو کس قسم کی پابندی میں رکھا جائے اسی طرح عورتوں کے کچھ خاص مسائل ہوتے ہیں جن میں وہ مردوں سے مختلف ہوتی ہیں مثلاً رقابت کے مسئلے کو لیجئے۔ لوگوں کا عام خیال ہے کہ عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے لیکن سوتن کی اُسے تاب نہیں اب اس خاص کیفیت کے ماتحت اگر وہ اپنی سوتن کو زہر دے دیتی ہے تو پھر اس کو کتنی سزا دینا مناسب ہے وغیرہ وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن کے فیصلے کے لئے علیحدہ عدالتوں کی سخت ضرورت ہے۔ اسی طرح عادی مجرموں کو لیجئے۔ نفسیات کے ماہرین کہتے ہیں۔ کہ عادی مجرمین کی عادات کافی پختہ ہو جاتی ہیں اور ان کے جرم چھوڑ دینے کے امکانات یقیناً کم ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

آخر یہ مذہب و سیاست ہیں کیا!

مہر محمد خاں شہاب

جس "مذہب" یا "سیاست" کی بنیاد رنگ، نسل، وطن، مخصوص زبان یا تہذیب یا رسم و رواج کی برتری یا فوقیت پر ہوگی، کہ ہم حکومت کرنے کے لئے ہیں "دوسرے" محکوم رہنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اتنا ہی وہ مذہب تنگ نظر ہوگا اور وہ "سیاست" تنگ دلی اور خود غرضی کی طرف لے جائے گی۔ اور جس "مذہب" یا "سیاست" کی نگاہ میں ان امتیازوں کو دخل نہ ہوگا اور "انسان" خواہ کسی رنگ، کسی نسل، کسی شکل، کسی رسم و رواج کا پابند یا ناپابند اور کسی سرزمین کا رہنے والا ہو، وہ ان تمام اختلافوں کے ہوتے ہوئے۔ انسان ہی سمجھا جائے گا۔ اور اس کے انسانی حقوق مسلم اور اس کی جان و مال و عزت اور عقیدوں کا احترام مانی ہوئی بات تسلیم کیا جائے گا وہ مذہب اور وہ سیاست اپنے حقیقی مفہوم کے زیادہ قریب ہوں گے

۱۶ ستمبر [illegible] کا "نئی روشنی" میرے سامنے ہے۔ اس میں کئی مضمون خاص توجہ کے مستحق ہیں۔ جناب "سالک ہندی" کی گفتگوئے سلوک و معرفت "ہم کدھر جا رہے ہیں؟" کے عنوان سے، "اکان یاموت" کے عنوان کا اداریہ، "اسلامی ممالک کا تنزل" کے عنوان سے سید احتشام حسین صاحب کا مضمون۔ ان میں سے ہر ایک پڑھنے والے کو زندگی کے کسی نہ کسی ماضی و حال کے سوال کی طرف توجہ دلاتا ہے، لیکن بنیادی طور پر ان مضمونوں کو پڑھ کر جو بات سامنے آتی ہے وہ مسلم اور غیر مسلم سے برتاؤ کا سوال، اسلامی حکومت کا ذہنی اور تاریخی تصور اور غیر مذہبی حکومت کا مفہوم اور روش اور اسلامی ممالک کہلانے والے ملکوں کی موجودہ پست حالت اور ان کی گزشتہ تاریخ۔ اور ہندوستانیوں میں سے مسلمان کہلانے والے ہندوستانیوں کا خوف زدہ ہونا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ان مسئلوں پر غور کرتے ہوئے بنیادی طور پر جو سوال آتے ہیں کہ آخر "مذہب" ہو یا "سیاست" ان کا مدعا کیا ہے؟ ان دونوں باتوں کا انسانی زندگی سے کیا تعلق ہے؟ "تاریخ" کے نام سے جو طومار کے طومار "واقعات و حقائق" یا خرافات اور افسانوں سے بھرے پڑے ہیں۔ کیا ان کی روایتوں کی روشنی میں ماضی کی صحیح تصویر ہمارے سامنے آسکتی ہے۔ آج ہمارے زمانے میں "روایت" کا حقائق سے جو تعلق ہے وہ ہم سے چھپا ہوا نہیں۔ اگر اسی پر ماضی کی روایات کو قیاس کر لینا ممکن سمجھا جائے تو میں نہیں جانتا کہ پرانی تاریخ کی تصدیق و تردید کا معیار سوائے ہماری ذاتی یا جماعتی پسند اور ناپسند کے کیا رہ جائے گا اور ہماری پسند و ناپسند ماشاء اللہ ہمارے لئے خوش کن ہو تو ہو دوسروں کے لئے محض بے سند چیز ہے، یعنی اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ میں کہتا رہوں اور آپ ہی آپ جھومتا رہوں، اور دوسرے اپنی اپنی ادا پاکریں اور آپ ہی اپنی داد دیا کریں۔

ظاہر ہے کہ "مذہب" سے بیزار لوگ ماضی و حال کے تمام شر و فساد اور قتل و غارت اور خوں خرابے کا ذمہ دار مذہب کو ٹھہرا دیا کرتے ہیں، لیکن ماضی کو چھوڑئیے، آج دنیا دیکھ رہی ہے یا کم از کم ہمیں نظر آرہا ہے کہ بے چارے خونی "مذہب" نے تو جتنی خونریزی کی ہوگی اس کا ریکارڈ مشتبہ ہی، لیکن نام نہاد معصوم "سیاست" کے نام سے جو خون کی ہولی ہو گئی ہے اور ہوتی رہتی ہے اور اس کا ریکارڈ دنیا کے ہر گوشے میں صاف صاف اور کھلا پڑا ہے۔ جو ناروا داری "مذہب" کی طرف منسوب کی جاتی رہی ہے۔ "سیاست" کی ناروا داریوں کے سامنے اس کا نام لینا خود شرما جانے کے لئے کافی ہے۔

اوپر کے اشاروں کی روشنی میں اگر میں مذہب و سیاست اور ان کے ملحقات کی حقیقت پر غور کرتا ہوں تو میری سمجھ میں تو کچھ یوں آتا ہے کہ تمام تحریکیں "انسان" کی بھلائی کے لئے تھیں اور ہیں جتنا ہمارا "انسان" اور انسانیت کا تصور وسیع ہوگا اتنا ہی ہمارا مذہب اور ہماری سیاست کا تصور وسیع ہوگا۔ اور جتنا ہمارا "انسان" اور انسانیت کا تصور تنگ ہوگا اتنا ہی ہمارا مذہب اور ہماری سیاست تنگ نظری لئے ہوئے ہوں گے۔ اس کو یوں سمجھئے کہ جس "مذہب" یا "سیاست" کی بنیاد، رنگ، نسل، وطن مخصوص زبان یا تہذیب یا رسم و رواج کی برتری یا فوقیت پر ہوگی کہ ہم حکومت کرنے کے لئے ہیں۔ دوسرے محکوم رہنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ اتنا ہی وہ مذہب تنگ نظر ہوگا۔ اور وہ سیاست تنگ دلی اور خود غرضی کی طرف لے جائے گی۔ اور جس "مذہب" یا "سیاست" کی نگاہ میں ان امتیازوں کو دخل نہ ہوگا۔ اور "انسان" خواہ کسی رنگ، کسی نسل کسی شکل، کسی رسم و رواج کا پابند یا ناپابند اور کسی سرزمین کا رہنے والا ہو وہ ان تمام اختلافوں کے ہوتے ہوئے۔ انسان ہی سمجھا جائے گا، اور اس کے انسانی حقوق مسلم اور اس کی جان و مال و عزت اور عقیدوں کا احترام مانی ہوئی بات تسلیم کیا جائے گا۔ وہ مذہب اور وہ سیاست اپنے حقیقی مفہوم کے زیادہ قریب ہوں گے

اگر اس نقطے سے "مذہب" کو دیکھا جائے، تو کسی مذہب نے انسان انسان میں دوئی نہیں برتی۔ مذہبوں اور دھرموں کا جو روپ اور نقشہ آج ہمیں نظر آتا ہے وہ رنگ و روپ اس مذہب کے ماننے والوں نے اپنی کوتاہ نظری، اپنی کمزوری اور خود غرضی کی وجہ سے اپنے مذہب کی بنیادی اصولوں کو دے دیا ہے۔ کیونکہ جو امتیاز اخلاقی اور صفاتی تھا اور جس کا ظہور صرف افراد کے کردار سے ہوتا تھا اُسے رنگ، نسل، کردار کی بجائے کچھ ناموں اور لباسوں اور کچھ ظاہری رسموں اور رواجوں کی پیروی کی طرف منسوب کر دیا۔ ہماری کمزوری یہ ہے کہ ہم ان چھوٹے چھوٹے تنگ دائروں سے نکلنا نہیں چاہتے، اور تھوڑا بہت جی چاہتا ہے بھی تو ہمت کرکے نکلنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ "سیاست" بھی یہی تھی کہ "حق" کی تائید کی جائے اور "باطل" کی تردید کی جائے۔ مگر ہماری تردید نے جو بے جا خوف کا نتیجہ ہوتی ہے "حق" کو اپنے وسیع معنوں سے ہٹا دیا۔ ہم نے اپنے اوہام خام اور محدود ذاتی فائدوں کو "حق" کی گدی پر بٹھا دیا اور باطل کو اپنی کمزوریوں میں پہچاننے کی بجائے صرف نصیب دشمناں مان لیا۔ نتیجہ اس کمزوری یا کوتاہ نظری کا دنیا کے سامنے ہے۔ کہ نام مذہب اور سیاست کا ہے اور ڈھنگ اغراض اور کمزوریوں اور خود غرضیوں اور وہموں کی ہے۔ اور انسان انسان کو لوٹ رہا ہے۔ قتل کر رہا ہے۔ اور مٹا رہا ہے اور رٹ یہی لگائے جا رہا ہے کہ "حق" میرے ساتھ ہے۔

میرے ناقص خیال میں کچھ اتنا ہی آتا ہے کہ بہر حال اور ہر خطرے کے مقابلے میں "حق" کی پیروی اور پابندی اپنے پورے معنوں کے ساتھ سچا "مذہب" اور حقیقی "سیاست" ہے۔ جہاں تک میری محدود نظر ہے کسی آسمانی کتاب نے اس کا انکار نہیں کیا بلکہ اسی حق کے قائم کرنے پر زور دیا ہے۔ ہر دور میں ہر ملک میں اعلیٰ درجے کے انسان اپنی اپنی روشنی کے مطابق اسی ایک "حق" کے جام حیات بخش سے زندہ ہوئے ہیں اور دوسروں کو زندہ کیا ہے۔ جس فرد نے حق کی جتنی پابندی کی اتنا ہی وہ اونچا ہو گیا اور جتنی کمزوری دکھائی اتنا ہی وہ نیچا رہ گیا۔ اگر ہم "حق" کی حد بندیاں کرنا چھوڑ دیں۔ تو یقین کیجئے کہ ہمیں "گھریوں" میں "ناستکوں" تمام مذہبوں اور دھرموں کے نام لیواؤں میں، تمام مختلف الخیال سیاسی جماعتوں میں علیٰ قدر مراتب ایسے افراد ملیں گے جن کی نگاہیں اسی نقطہ روشن کی طرف لگی ہوں گی اور جن کے قدم اسی کعبۂ مقصود کی طرف بڑھتے نظر آئیں گے۔ اس وقت (بقیہ صفحہ [illegible]

فکر و عمل

ضیاء الفاروقی

کیا خوب کہا کسی مردِ آزاد نے خدا اُس کا بھلا کرے زندگی جب مصائب و آلام کی شدت سے زیادہ دردناک ہو جاتی ہے تو اپنی حقیقتوں اور اخلاقی قدروں سے زیادہ قریب ہو جاتی ہے۔ مجھے یاد ہے میرے ایک استاد نے ہارڈی کا مشہور ناول THE RETURN OF THE NATIVE پڑھاتے ہوئے ایک موقع پر فرمایا تھا SUFFERING IS PURIFICATION اقبال کے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے۔

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے
ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے

انسان اگر غور و فکر کرے۔ اپنے گرد و پیش سمجھنے کی کوشش کرے، اپنے دماغ کو سوچنے کی عادت ڈالے تو اس کے مصائب و آلام اس کے حوصلوں کو پست نہیں کر سکتے۔ ماضی کا بیش بہا خزانہ اس کی نظر تصور کے سامنے ہوتا ہے۔ حال اپنی پوری بوقلمونیوں کے ساتھ اس کے ہمراہ ہوتا ہے۔ وہ انسان جس کی فطرت بے چین ہوتی ہے اور جو حالات کی ناسازگاریوں کے سامنے ہتھیار ڈالنا نہیں جانتا، ماضی کے دفتر کو کھنگالتا ہے، حال کا جائزہ لیتا ہے اور بڑے غور و فکر کے بعد مستقبل کی تعمیر میں لگ جاتا ہے۔ سچا انقلابی ماضی کی میراث میں جو کچھ حوصلہ بخش اور امید افزا ہے اسے لے لیتا ہے اور حال کی بھی کسی ایسی چیز کو نہیں چھوڑتا جو مستقبل کی تعمیر میں کام آ سکے۔ ماضی کو حال سے ربط دینا اور مستقبل سے ملانا اس کے بے ربط اجزاء کو رد کر دینا اور اس ترکیب سے فکر و عمل کے لئے جاندار اور متحرک مواد حاصل کرنا اسی کا نام زندگی ہے۔ فکر و عمل ایک دوسرے سے جدا نہیں کئے جا سکتے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا اچھی بات کہی ہے "ایک مدت سے عمل کا تقاضا میرے دل میں فکر سے جدا نہیں ہوتا بلکہ خود عمل فکر کے سلسلے کی کڑی بن جاتا ہے۔ شاذ و نادر کوئی لمحہ ایسا بھی آ جاتا ہے کہ ان دونوں میں کامل ہم آہنگی ہوتی ہے۔ فکر عمل میں آ کر تکمیل کو پہنچتی ہے اور عمل فکر کو حقیقت سے قریب تر کر دیتا ہے۔ وجود کے اس لمحہ میں مجھے بھرپور زندگی کا، بصیرت اور قوت کا احساس ہوتا ہے۔"

اگر ہم ایک فرد کی تنگ حدود سے نکل کر افراد کو لیں اور پھر پوری قوم پر یہ کلیہ عاید کریں تو رشتے کی ساری کڑیاں مل جاتی ہیں۔ قوم کی بنیاد افراد پر ہے اس طرح ایک قوم جو قعر مذلت میں گر گئی ہو جس کو اپنا مستقبل تاریک نظر آ رہا ہو، جس کا حال ناخوشگوار اور درماندہ ہو، غور و فکر اور عمل کی ہم آہنگی سے بڑے سے بڑا انقلاب پیدا کر سکتی ہے۔

اگر کسی قوم پر اچانک یاس اور حرماں نصیبی کے بادل چھا جائیں۔ حالات کی ناسازگاریاں اس قدر بڑھ جائیں کہ زندگی کے سارے آثار ختم ہو چکے ہوں موت کا سا جمود طاری ہو، پھر بھی اس میں چند افراد ایسے ہوتے ہیں جو زمانے کے ظلم و ستم سہتے ہیں مگر خاموشی سے تعمیری کام میں لگے ہوتے ہیں وہ نہ تو زمانے کی شکایت کرتے ہیں اور نہ وقت کی اندھیاریوں سے خوف زدہ ہوتے ہیں، وہ قدم اٹھائے رہتے ہیں کیونکہ بغیر قدم اٹھائے وہ نہیں رہ سکتے۔ تاریخ کا کوئی باب ایسا نہیں ملے گا جہاں انسانیت کے امتیازی اوصاف کو رچانے والے اور زندہ رکھنے والے یکسر معدوم ہوں۔

اب اگر کوئی قوم جو بالکل مردہ نہیں ہوتی ہے اور جس کی اخلاقی قدروں کے چراغ گو مدھم ہی سہی مگر ٹمٹما رہے ہیں اپنے ان خونِ جگر پینے والے افراد کو انھیں چراغوں کی روشنی میں پہچان لیتی ہے پھر کیا ہوتا ہے؟ ساری قوم کا جمود ختم ہو جاتا ہے۔ ایک لہر سی دوڑ جاتی ہے۔ زندگی کی صبح طلوع ہوتی ہے حیات کی ساری بصیرت افروزیاں کروٹ لیتی ہیں اور تاریکیاں رخصت ہونے لگتی ہیں۔

غور و فکر کی معجز نمائیاں یہیں ختم نہیں ہو جاتیں وہ آگے بڑھتی ہیں۔ قوم کے افراد کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ ایسی ہستیوں کو اپنا رہبر بنا لیں۔ فکر قوم کا تلوّن ختم کر دیتا ہے۔ وہ ایک نصب العین دیتا ہے، حوصلہ دیتا ہے اور پھر یہ کیفیت باقی نہیں رہتی۔

جاتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

ظاہر ہے کہ جب نصب العین کا پتہ چل گیا تو یقیناً اس کے حصول کی تمنا ہوتی ہے۔ عمل کے تقاضے شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر راہ کی دشواریاں دامن گیر ہوتی ہیں، طرح طرح کی رکاوٹیں قدم روک لیتی ہیں مگر فکر و عمل کی آمیزش سے جو شراب تیار ہوتی ہے اس کا سرور کوہ و بیاباں کو پرکاہ سمجھتا ہے اور سمندر کی چھاتیوں پر دندناتا ہوا دوڑتا جاتا ہے۔ زندگی کے دروازے کھل جاتے ہیں اور اس کی تمام حقیقتیں اجاگر ہو کر سامنے آ جاتی ہیں۔ علامہ اقبال نے زندگی کی تعریف ایک مصرعہ میں کر دی ہے۔

جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

"جوئے شیر" کوہکن کا نصب العین تھا "تیشہ" اس کا جذبۂ عمل "سنگِ گراں" کو راہ کی دشواریوں سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہی زندگی کی حقیقت ہے، جو کوہ ہستیوں سے ٹکرانے والے کے جذبۂ صادق سے آشکارا ہے۔

جرائم کس طرح روکے جائیں

(بسلسلہ صفحہ)

بہ نسبت ان لوگوں کے جنھوں نے جرم کا ارتکاب پہلی مرتبہ اور وہ بھی خاص حالات کے ماتحت کیا ہو۔ غرضیکہ یہ سب صورتیں اسی حالت میں پیدا ہو سکتی ہیں جبکہ "انفرادیت" کا تعین نفسیاتی طریقے سے کیا جائے۔ چنانچہ جرائم کی خصوصی سزائیں ملتوی کرنا، ضمانت پر رہا کرنا، چال چلن کی نگرانی کرنے کا طریقہ اسی نفسیاتی اصول کے ماتحت رائج کیا گیا ہے۔ لیکن یہ سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا چنانچہ جہاں پر جیوری سسٹم رائج ہے، ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ حضرات جیوری کی نفسیاتی قابلیت کتنی ہے حالات کو سمجھنے کی ان میں کتنی اہلیت ہے اور کسی مخصوص رکن کا ذاتی اثر دوسرے ارکان جیوری پر کہاں تک کام کرتا ہے وغیرہ وغیرہ

بحرمیں پر جرم کی ذمہ داری عائد کرنے کے سلسلے میں نفسیات کا قطعی فیصلہ یہ ہے کہ مجرم کی حرکات لاتعداد اندرونی اور بیرونی حالات سے متاثر ہوتی ہیں اور اکثر اس کو اپنے افعال پر قدرت حاصل نہیں ہوتی اور اس طرح اندرونی حالات کا لحاظ رکھتے ہوئے مخصوص حالات میں وہ بالکل ہی طرح کی حرکات کرتے ہیں جیسا کہ عام حالات میں کسی صحیح الدماغ آدمی سے سرزد ہوتیں اس لئے اس کو اپنے ہر فعل کے لئے سراسر ذمہ دار قرار دینا حماقت ہوگی اسی طرح اس کی اصلاح میں بھی انھیں باتوں کا خیال رکھنا چاہئے۔ اصلاح دو طریقوں سے کی جا سکتی ہے۔ ایک تو ذہنی طور پر اس کے دل میں یہ خیال پیدا کر دینا چاہئے کہ خواہ حالات کتنے ہی غیر معمولی کیوں نہ ہوں اس کو ایک مقرر شدہ حد سے آگے تجاوز نہ کرنا چاہئے اور دوسری طرف اس کی کوشش ہونی چاہئے کہ وہ حالات جن کی بنا پر اس نے جرم کا ارتکاب کیا تھا آیندہ نہ پیدا ہونے پائیں ورنہ باوجود ضبط کی تعلیم کے "قانونِ عادت" کے تحت وہ جرم کرنے پر مجبور ہوگا۔

موجودہ قانون عام طور سے مجرم کی ذمہ داری اور اس کو مناسب سزا دینے پر زیادہ زور دیتا ہے حالانکہ ان اسباب کا روکنا جو جرائم کے ارتکاب کا باعث ہوتے ہیں زیادہ ضروری چیز ہے۔ "سزا" کا مقصد بہرصورت یہی ہوتا ہے کہ لوگوں کو مجرم کی حالت دیکھ کر عبرت ہو اور وہ دوبارہ جرم کا ارتکاب کرنے سے نہ صرف خود پرہیز کرے بلکہ اور لوگ بھی خوف کی بنا پر اس سے باز رہیں۔ یہ نقطۂ نگاہ بالکل اس قدیم نظریۂ تعلیم سے ملتا جلتا ہے جس میں بچوں کو جسمانی سزا دے کر سبق یاد کرایا جاتا تھا، یعنی بالفاظ دیگر دلچسپی یا شوق کی بنا پر تعلیم نہیں ہوتی تھی اب جبکہ مہذب حکومتیں "جسمانی سزا" کو طریقۂ تعلیم سے علیحدہ کر چکی ہیں جرائم کے مسئلے میں لکیر کا فقیر رہنا کچھ بعید از فہم قسم کی بات معلوم ہوتی ہے۔ علاوہ اس کے ایک بات اور قابل غور ہے اور وہ یہ کہ مجرمین کو لمبی مدت تک محبوس رکھنے سے "نظریۂ عبرت" کا اصل مقصد بھی فوت ہو جاتا

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

منتظر!

(ایک فرانسیسی افسانے کا انگریزی سے ترجمہ)

محمد معین موجد بی اے

ان دونوں کی مجموعی عمر پوری ڈیڑھ صدی کے برابر تھی۔ الگ الگ ان میں سے کوئی نہ جانتا تھا کہ ان کو دنیا میں آئے ہوئے کتنی مدت گذری۔ انھوں نے برسوں سے اس کا حساب رکھنا ترک کر دیا تھا۔

وہ ایک معمولی چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے اپنی عمر کا بڑا حصہ انھوں نے اسی مکان میں گذارا تھا۔ اگر انھیں کوئی بتا دیتا کہ وہ ہمیشہ سے ایک دوسرے کے ساتھ اسی طرح وابستہ نہ تھے تو یقیناً انھیں اس بات پر حیرانی ہوتی۔

جاڑا ان دنوں بوڑھوں پر کس قدر نامہربان تھا۔ سرد ہواؤں کے جھونکے ان کے پھیپھڑوں کے لئے ناقابل برداشت تھے، ان کی جھکی ہوئی کمریں سردی کی شدت سے سیدھی نہ ہو سکتی تھیں اور اس نامہربان موسم میں ان کے چہرے پر افسردگی چھائی جاتی تھی بوڑھے دھوبی کی نگاہ روز بروز کم ہوتی چلی جا رہی تھی اور اس کی سن رسیدہ بیوی کو دوران سر کی شکایت تھی۔ موسم سرما گذر گیا۔ گرمی آگئی لیکن وہ ابھی تک غیر مطمئن تھے۔ مئی میں بھی نہ سایہ ان کی طبیعت کے لئے سازگار تھا اور نہ دھوپ ان کو پسند۔ ان کے لئے زندگی گذارنی۔ روزی کمانے کی محنت سے زیادہ مشکل ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زندگی گویا ان کے لئے محنت شاقہ تھی جو سویرے شروع ہوئی اور شام کو ختم۔

ایک روز جبکہ بوڑھا دھوبی اپنے مکان کے باہر خلاف معمول بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا اس کی سن رسیدہ بیوی خرگوشوں کے لئے چارہ لینے باہر چلی گئی، دروازے سے نکل کر سانس لینے کے لئے وہ قدرے ٹھہر گئی۔ یہ اس کی مہم کی پہلی منزل تھی۔ تھوڑی دیر آرام کے بعد اس نے ہمت کر کے سڑک پر چلنا شروع کر دیا۔ بوڑھا دھوبی اپنی نشست گاہ پر اسی طرح ایک سلیقہ مند بچے کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ اگرچہ اس کی کمزور نگاہ بڑھیا کو دیکھنے سے مجبور تھی۔ مگر پھر بھی وہ اس کے پاؤں کی آہٹ سن رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں، لیکن اس کے بشرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ گویا وہ اس کو دیکھ رہا ہے۔

ابھی وہ نزدیک کے چوک میں پہنچی تھی کہ اس کے حواس منتشر ہونے لگے۔ پھر ایک بار اپنی آنکھیں اچھی طرح سے کھولیں اور زمین پر گر پڑی۔ بڑھیا نے اپنا آخری لمحہ نہایت خاموشی سے گذار دیا۔

بے جان قالب کو دیکھ کر ایک راہ گیر ٹھہر گیا۔ ایک ننھی لڑکی بھی دوڑتی ہوئی آگئی۔ ایک نیک دل عورت اور ایک دوکان دار بھی آ پہنچے۔ سب نے ترس کھا کر ایک چارپائی پر ڈال دیا۔

موت کی خبر سن کر لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے دیکھتے ہی دیکھتے آدمیوں کی بھیڑ سے راستہ رک گیا۔ اس کا پیلا اور زرد چہرہ ایک گداز کی تصویر معلوم ہو رہا تھا۔

مجمع میں کسی نے پکارا۔ "بوڑھے دھوبی کو اطلاع دینا ضروری ہے۔"

پھر کسی نے کہا "نہیں پہلے بوڑھے کی بہو مارگریٹ کو خبر کرنا چاہئے۔"

وہ کھڑی ہے ———! مارگریٹ، جلدی آؤ!

مارگریٹ قریب آ پہنچی ——— لیکن گھبرائی ہوئی، اس کا ڈھیلا اور آلودہ لباس کندھوں پر سے نیچے لٹک رہا تھا۔ سخت محنت کی وجہ سے اس کے گال سیاہ اور خشک ہو رہے تھے۔ ہاتھوں پر آبلے پڑے ہوئے تھے اور وہ انھیں لٹکائے ہوئے تھی۔

جب اس نے اپنی ساس کی نعش دیکھی ——— اس کا خاوند مدت ہوئی مر چکا تھا۔ اور مارگریٹ قریب قریب اس کو بھول چکی تھی۔ اس کا سارا بدن کانپنے لگا۔ ہاتھ سفید پڑ گئے ——— آنکھیں حیرت کا مرقع بن گئیں۔ اس نے اپنی اونی قمیص سے آنکھوں کو پونچھا اور آہستہ سے کہا "آہ غریب بڑھیا!"

وہ وحشت کی حالت میں مجمع سے مخاطب ہوئی اور نیچی نگاہ سے التجا کی۔ کہ یہ بات کسی طرح بوڑھے دھوبی تک نہ پہنچے۔ وہ خود اس کو اطلاع کرے گی۔

مجمع اِدھر اُدھر ہونے لگا اور ذرا سی دیر میں راستہ صاف ہو گیا۔

مارگریٹ نعش اٹھوا کر اپنے مکان لے آئی اور جلد ہی بستر ٹھیک کر کے بوڑھے کے پاس پہنچی۔ وہ اس وقت تک اسی جگہ برآمدے میں بیٹھا چشم براہ تھا جونہی کھڑکی کا دروازہ کھلا۔ اس نے چونک کر اپنا سر اٹھایا۔

"مارگریٹ تم ہو!" اتنا کہا اور پھر بت بن گیا۔ مارگریٹ نے قدرے تامل کے بعد کہا "وکٹر! چلو اب شام ہو گئی۔ اندر چل کے بیٹھنا چاہئے۔"

بوڑھے نے ایک دردناک آہ کھینچی۔ وہ اٹھا اور کراہا۔ اس نے بار بار سامنے پھیلائے اور ان کو اوپر نیچے جنبش دی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں کوئی چیز چمک رہی ہے۔

مارگریٹ سکتے کے عالم میں بالکل خاموش کھڑی رہی بے شک یہ محض اس کی روح کی پاکیزگی تھی جس نے اس کو ان تمام تکالیف کے برداشت کرنے کی قوت عطا کی۔ اس نے بوڑھے کا ہاتھ پکڑا اور دھیرے دھیرے اس کی رہبری کرتی گئی۔

بے کس بوڑھا بہت دیر کے بعد باورچی خانے تک پہنچ سکا۔ اس نے ہاتھ سے کرسی کو ٹٹولا اور بیٹھ گیا۔ لیکن اس کی سانس کی آمد و رفت ابھی معمول پر نہ تھی۔ ایک طویل آہ کھینچ کر وہ اپنی مصیبت پر کراہنے لگا۔ جب اسے کسی قدر سکون ہوا تو مارگریٹ نے اس کی بیوی کی موت کا حال بتانا چاہا۔ لیکن اس پر پھر رقت طاری ہو گئی اور مجبوراً اسے اس جانکاہ خبر کی اطلاع دینا ملتوی کرنا پڑا۔ پھر دفعتہ چیخ اٹھا "آہ میری آنکھیں کیا میں اب کبھی نہ دیکھ سکوں گا؟"

کئی گھنٹے متواتر اس نے سوچنے کے سوا کچھ نہ کیا۔ اسی دوران میں اس نے صرف ایک دفعہ اپنی بیوی کے متعلق دریافت کیا "بوڑھی عورت کدھر ہے؟ وہ اب کیا کر رہی ہے؟" اس آہ و بکا میں تھوڑی دیر بعد پھر ایک لمحہ ایسا آیا کہ وہ اپنے کو درست کر کے اپنی بیوی کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک نہ رہی۔ اس ناامیدی میں وہ اپنا حوصلہ کھو بیٹھا۔ وہ سخت ہراساں اور پریشان ہو چکا تھا۔

بہت سے لوگ اس سے ملنے کے لئے آئے کچھ اس کے سرہانے کھڑے رہے۔ کئی ایک کھڑکی سے اندر جھانکتے رہے لیکن کوئی بھی اس سے بات کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔

کبھی کبھی مارگریٹ اس کو اکیلا چھوڑ جاتی۔ اور بے روح ہوئی نعش کو دیکھنے چلی جاتی۔ واپس آتی تو اِدھر اُدھر کے کاموں میں مشغول ہو جاتی، اس کی توجہ ایک ہی وقت میں کئی طرف منعطف تھی۔ تمام زندگی کے تفکرات سے پریشان۔ مصائب سے دست و گریباں لیکن غیر مغلوب اور بہادر عورت ہر طرف دوڑتی پھرتی تھی۔ وہ رنج اور مصیبت کی عادی تھی اور سمجھتی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔

مارگریٹ پھر شام اور رات کے درمیانی وقفہ میں بوڑھے کے پاس آئی۔ اب اس کی طبیعت کسی قدر سنبھلی ہوئی تھی۔

مارگریٹ نے ایک چھوٹا سا اسپرٹ لیمپ روشن کیا۔ اور اس کو میز پر رکھ دیا۔ پھر اس نے سوچا کہ اب بوڑھے کو اس کی بیوی کی موت سے آگاہ کر دیا جائے وہ بوڑھے کی کرسی کے سامنے بیٹھ گئی۔ سر سے پاؤں تک اس کا جسم کانپ رہا تھا اور وہ اپنے سر کو جھکائے ہوئے تھی، جیسے کوئی عرق ندامت سے پانی پانی ہو رہا ہو۔ اس نے جرأت کی اور

لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا "وہ اب کبھی واپس نہ آئے گی! وہ اب واپس آ ہی نہیں سکتی!! ـــــ وہ یہاں سے کہیں دور جا چکی ہے!!!

بوڑھا بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس نے نقاہت سے مارگریٹ کے الفاظ پر کوئی دھیان نہ دیا۔ ایک لمحہ بعد اس پر کسی قدر بیداری کے آثار نمایاں ہوئے اور اس نے مارگریٹ کو پکارا۔ وہ اس کے اتنے قریب جا کھڑی ہوئی کہ وہ اپنی انگلیوں سے اس کو چھو سکتا تھا۔

"سنو! پیاری لڑکی ادھر آؤ اور سنو! بڑھیا واپس آگئی ہے، وہ یہیں ہے میں نے اس کو ابھی یہاں دیکھا ہے۔ بالکل اسی جگہ پر جہاں تم اب کھڑی ہو۔ اس نے منتشر چیزوں کو پھر ترتیب دیا اور واپس چلی گئی۔ میں دیدہ و دانستہ ساکت اور خاموش بیٹھا رہا۔ سنو! میں نہیں چاہتا کہ اس کو میری بینائی کے ضائع ہونے کا علم ہو جائے ـــــ میں ہرگز ایسا نہیں چاہتا۔ یہ صدمہ اس کے لئے ناقابل برداشت ہوگا۔ میں ایسا کبھی نہ ہونے دوں گا۔ اس کو کچھ عرصے باہر رہنے پر مجبور کرو۔ حتیٰ کہ میری بینائی پھر عود کر آئے۔ خدارا کوئی ایسا طریقہ دریافت کرو۔"

اسی دوران میں اس نے اپنی جگہ پر پہلو بدلا، ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ٹوٹی ہوئی کرسی سے بھی درد و کرب کی آوازیں نکل رہی ہیں۔

"اس کو دور سے جاؤ ـــــ اس کو کچھ عرصے کے لئے کہیں باہر بھیج دو۔"

"بہت بہتر! ـــــ اگر ممکن ہو تو اس سے کہو کہ وہ چند روز باہر رہے۔" "بہت بہتر! ڈاکٹر میں اس کا انتظام کر دوں گی۔ میں یقین سے کہتی ہوں اس کو تمہاری تکلیف کی کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ میں قسم کھاتی ہوں۔"

بوڑھے آدمی نے کسی قدر مطمئن ہو کر کہا "تم بہت نیک دل لڑکی ہو" اور پھر ساکت ہو لیا۔

دوسرے دن مارگریٹ نے بوڑھے دھوبی کو بتایا کہ بڑھیا کو اس کے کسی رشتہ دار کے گھر بھیج دیا گیا ہے۔ بوڑھا دھوبی ان تمام باتوں کو کہ کس طرح بڑھیا اپنے رشتہ دار کے پاس چلی گئی اور کس طرح وہاں وقت گذار رہی ہے بچوں جیسی دلچسپی سے بغور سنتا رہا۔ لیکن جب مارگریٹ اپنی کہانی ختم کر چکی تو کسی قدر غیر مطمئن لہجہ میں بول اٹھا "میں جانتا ہوں کہ گذشتہ شب جب میں سو رہا تھا وہ یہاں آئی تھی میں نے اس کے پاؤں کی چاپ سنی تھی۔"

مارگریٹ نے نہایت نرم لہجے میں کہہ کر ٹال دیا کہ "ہاں وہ آئی تھی۔ لیکن پھر واپس چلی گئی۔"

اسی طرح دو دن گذر گئے، بڑھیا کو دفن کرنے کے دو دن بعد ڈاکٹر نحیف و زار بوڑھے کو دیکھنے آیا۔ معائنہ کے بعد اس نے کہا "خلاف امید اس کی حالت بہتر ہے۔ بخار قطعاً نہیں اور ورم آہستہ آہستہ کم ہو رہا ہے۔ کل تک اس کی آنکھیں درست ہو جائیں گی۔"

مارگریٹ ایک گوشے میں سہمی ہوئی کھڑی تھی اس نے اپنی تاریک روح کی گہرائیوں میں دہرایا۔ "کل! ـــــ کل وہ اپنی آنکھیں کھولے گا، لیکن حقیقت سے بے خبر اپنی رفیقہ کو اپنے نزدیک نہ پائے گا۔ کل اس کی غریب اور بیکس تیمار دار اپنی خاموشی کی وجہ سے اپنے آپ سزا پائے گی۔ بالکل ایسی ہی سزا جو دُ راز کے افشا کرنے پر پاتی۔"

جرائم کس طرح روکے جائیں

(بہ سلسلہ صفحہ ۹)

ہے کیونکہ بعض اوقات قتل کے مجرموں کو اتنے عرصے بعد فیصلہ سنایا جاتا ہے جبکہ پبلک اس واقعہ کو بھی بھول چکی ہے۔ اس لئے اگر اسی فرسودہ نظریہ ہی کو جاری رکھنا ہے تو حکام کا فرض ہے کہ وہ مجرمین کو جلد از جلد سزائیں دیں تاکہ فیصلہ کے اشتہار کے بعد پبلک کے جرائم پیشہ افراد کے دل میں ہیبت پیدا ہو۔ حالانکہ بنیادی طور پر یہ نظریہ غلط ہے اصل طریقہ تو یہ ہونا چاہئے کہ مجرم کے ماحول کو درست کیا جائے اور اس کو ایسی تربیت ذہنی اور عملی دونوں ہی دی جائیں جن سے اس کے دل میں جرائم کی طرف سے نفرت پیدا ہو جائے۔

(باقی آئندہ)

کامن ویلتھ کا معمہ

(بہ سلسلہ صفحہ ۱)

کی فیاضی اور انصاف پسندی کا مثالی نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ نمائندے سب آزادی کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کرتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ دوسرے لوگ یہ سمجھ ہی نہیں سکتے تھے کہ برطانوی حکومت یا قوم کی کیا رائے ہے، اور اسی وجہ سے بحث لا حاصل رہتی تھی۔ آخر میں جب سیلون، ہندوستان اور پاکستان کے نمائندوں نے بہت کہا کہ اگر ہمیں معلوم نہ ہوا کہ کامن ویلتھ کیا ہے تو اس میں شریک ہونے سے ہم کو کوئی فائدہ نہ پہنچے گا تو ان مسئلوں پر الگ سے رائے زنی ہوئی کہ کامن ویلتھ کی کوئی مشترک سیاسی یا معاشی پالیسی ہو سکتی ہے یا نہیں اور سب کی رائے تھی کہ نہیں ہو سکتی، گویا کامن ویلتھ کی کیفیت معلوم کرنے کے بعد ہم بھی اس رائے کے ہو گئے کہ اسے قائم تو رہنا چاہئے مگر اس کا کسی قوم کے فکر اور عمل پر اثر نہ پڑنا چاہئے۔

شاید بحثوں میں سب سے زیادہ لمبی اور لا حاصل معاشی مسائل پر گفتگو تھی۔ کینیڈا کے متحدہ ریاستوں سے ویسے گہرے معاشی تعلقات ہیں کہ وہ برطانیہ کی معاشی کشتی میں بیٹھنا ڈوب جانے کے برابر سمجھتا ہے۔ اور اسے یہ بھی گوارا نہیں کہ متحدہ ریاستوں پر کسی قسم کے معاشی یا سیاسی اعتراض کئے جائیں۔ برطانیہ یورپ سے اور اپنی نوآبادیوں سے معاشی معاملات میں الگ نہیں ہونا چاہتا مگر یہ بھی چاہتا ہے کہ کینیڈا اور متحدہ ریاستوں میں اس کا مال زیادہ خریدا جائے تاکہ ڈالروں کی جو کمی رہتی ہے وہ پوری ہو جائے۔ کامن ویلتھ کے ایشیائی ممبروں کا مطالبہ تھا کہ کامن ویلتھ ان کی معاشی زندگی کی تعمیر میں مدد کرے۔ اس مطالبے کو پہلے ٹالنے کی کوشش کی گئی، پھر جب یہ ظاہر ہو گیا کہ اگر کامن ویلتھ نے کوئی ذمہ داری نہ لی تو متحدہ ریاستوں کی صنعت اور تجارت کا ہر جگہ قبضہ ہو جائے گا تو یہ بات اصولاً مان لی گئی کہ کامن ویلتھ کو ایشیائی ممبروں کی کچھ سامان اور کچھ صنعتی ماہروں کے ذریعے مدد کرنا چاہئے۔

جن مسئلوں پر غور کیا گیا، ان میں سے ایک نسلی تعصب بھی تھا، لیڈی بونہم کارٹر نے اس مسئلے پر ایک بے مثل تقریر کی اور کہا کہ جنوبی افریقہ نے اس معاملے میں اپنا رویہ نہ بدلا تو وہ مٹ جائے گا۔ جنوبی افریقہ کے نمائندوں کے لیڈر ڈاکٹر مالرب بہت ہی شائستہ اور انصاف پسند آدمی ہیں۔ انھوں نے اپنے ملک کی موجودہ حکومت کی ذرا بھی حمایت نہیں کی بلکہ یہ ثابت کیا کہ وہ اکثریت کی رائے اور خواہش کے خلاف عمل کر رہی ہے اور ایسا ہرگز نہ ہو سکتا اگر ساری دنیا نے جنوبی افریقہ کو تھڑی تھڑی کر کے وہاں کے متعصب لوگوں کو اقتدار حاصل کرنے کا موقع نہ دیا ہوتا۔ بہرحال جنوبی افریقہ کے لوگ اپنی ذمہ داری کو محسوس کر رہے ہیں۔ افریقی آبادی کی تعلیم اور تندرستی اور سیاسی تربیت کی طرف خاص توجہ کی جا رہی ہے اور امید ہے کہ نسلی تعصب رفتہ رفتہ مٹ جائے گا۔ لیڈی بونہم کارٹر سے زیادہ جوش اور خلوص کے ساتھ تقریر کرنا مشکل تھا، ڈاکٹر مالرب کا انداز معذرت اور انتہائی صلح جوئی کا تھا اس لئے یہ بحث جلد ختم ہو گئی ہم لوگوں کو سر ولیم فٹز جیرلڈ سے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ وسطی افریقہ کی برطانوی نوآبادیوں کے لوگ تعلیم اور تجارت میں تیزی کے ساتھ ترقی کر رہے ہیں اور ان کو جلد سیاسی اصلاحات کے ذریعے حکومت کے سارے نہیں تو بیشتر اختیارات دئے جانے والے ہیں۔

مجھے ذاتی طور پر شروع سے اندیشہ تھا کہ کانفرنس ہندوستان اور پاکستان کی لڑائی کا میدان بنائی جائے گی۔ پہلے ہی جلسے میں کانفرنس کے رکارڈر پروفیسر سوورڈ نے ان رسالوں کا خلاصہ بیان کرتے وقت جو کامن ویلتھ کے ممبروں نے تیار کئے تھے ایسی باتیں کہیں جن سے ہندوستانیوں کو خواہ مخواہ غصہ آگیا، اور بحثوں کے دوران میں مسٹر ہوڈسن نے ہر ممکن طریقے سے ہندوستان اور پاکستان کو بھڑانا چاہا۔ مجھے اپنی طبیعت پر بھروسہ نہیں ہے اور یہ بھی معلوم تھا کہ ڈاکٹر راو کمزاج کے کسی قدر تیز ہیں، لیکن یہ دیکھ کر کہ پاکستانی نمائندوں کے لیڈر بخاری صاحب اور ڈاکٹر راؤ دوسرے کی غلطی فوراً پکڑتے ہیں مگر بات ہمیشہ بہت سلیقے اور مصلحت سے کرتے ہیں۔ مجھے کسی قدر اطمینان ہو گیا، پھر بھی یہ کیسے ممکن تھا کہ

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

ایڈیٹرز: ڈاکٹر سید عابد حسین، صالحہ عابد حسین
عبداللطیف اعظمی

تاریخ اشاعت: یکم [illegible]
چندہ: سالانہ [illegible] فی پرچہ [illegible]

ہماری کانفرنس جو تماشا دیکھنا چاہتی ہو وہ نہ دکھایا جائے۔ کشمیر کے بہانے سے ایک جنگ ہوئی اور پھر مجاہدین صاحب نے ہندوستانی مسلمانوں کا اس طرح سے ذکر کیا کہ جیسے بھی دیا گیا۔ یہ بات البتہ خوشی کی ہے کہ لڑائی کے بعد ہندوستانی اور پاکستانی باشندوں کے تعلقات میں پہلے کے بہ نسبت بجائے بڑھ گئی اور شاید خلوص کا بھی کچھ رنگ آگیا۔
امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔

آپ کا مخلص
محمد مجیب

آخر یہ مذہب و سیاست ہیں کیا! (بہ سلسلہ صفحہ ۹)

جنھیں ہم غیر سمجھتے ہیں وہ غیر نہیں معلوم ہوں گے بلکہ ان میں قابل نمونہ اور قابل محبت انسان دکھائی دیں گے۔ اور خود اپنے "ہمیں اور اپنوں" کے اندر اتنی کمیاں اور کمزوریاں دکھائی دیں گی کہ اگر خود سے نفرت نہ ہوگی تو اپنی زبوں حالی پر رحم ضرور آئے گا۔

فرد ہوں یا جماعتیں، پھر وہ اہل مذہب ہوں یا اہل سیاست سب موحد اور حق پرست ہونے کے ادعا کے بل پر جیتے ہیں۔ حکیم شیراز سعدی علیہ الرحمۃ نے توحید اور حق پرستی کا ایک معیار بتایا ہے جو میرے دلی مفہوم کو ٹھیک ٹھیک ادا کرتا ہے۔ اس کو سامنے رکھا جائے اور زندگی کے ہر موڑ اور ہر قدم پر پیش آنے والے ہر چھوٹے بڑے مسئلے کو اسی معیار پر جانچا جائے تو ہمارے "مذہب" اور ہماری "سیاست" کا "حق" یا باطل پر ہونا خود بخود کھل جائے گا۔ اور ہم خود دیکھ لیں گے کہ کون کتنا موحد ہے اور کون کتنا حق پرست۔ فرماتے ہیں:-

موحد چہ در پائے ریزی زرش   چہ شمشیر ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نباشد ز کس   بر ایں است بنیاد توحید و بس

ظاہر ہے کہ یہ مقام خالی باتیں بنانے سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ ہر لمحہ ہم جو کچھ کرتے ہیں اس میں کہاں تک ہم نے "باطل" سے پاک اور لالچ سے بے لاگ رہنے کی متواتر کوشش کی۔ اس کے شعور سے حاصل ہوتا ہے۔

دفتر نئی روشنی جامعہ نگر دہلی
طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی بی اے، جامعہ
مطبوعہ: جید پریس دہلی

NAI ROSHNI
DELHI

جلد ۳ نمبر ۱۵ | ۱۶ر اکتوبر سنہ ۴۶ء | ایڈیٹر:- ڈاکٹر سید عابد حسین

زرا اپنی جمہوریت کو جانچئے

(ہم آپ یہ دعوے کرتے ہیں کہ ہم جمہوریت کے حامی ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ سب کے ساتھ انصاف کیا جائے اور ہر شخص کو خواہ وہ کسی نسل، مذہب یا طبقے کا ہو انسان کی حیثیت سے عزت کی نظر سے دیکھا جائے۔ اگر کوئی ہمارے ساتھ ذلت یا حقارت کا برتاؤ کرتا ہے تو ہمیں سخت ناگوار ہوتا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اسے جمہوریت چھو بھی نہیں گئی۔ مگر ہم نے کبھی یہ بھی سوچا کہ جو برتاؤ ہم دوسروں کے ساتھ کرتے ہیں وہ کہاں تک جمہوریت کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ آیئے آج اس کا جائزہ لیں۔ ذیل کے سوالات کو اچھی طرح پڑھ کر ہر ایک کا "ہاں" یا "نہیں" لکھتے جایئے اس کے بعد صفحہ ۱۰ ملاحظہ کیجئے)

۱- کیا آپ دیانت داری کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ اپنے کو اکثر آدمیوں سے جنھیں آپ جانتے ہیں ... میں اونچا نہیں سمجھتے؟

۲- کیا آپ دوسروں کے مقابلے میں اپنی برتری جتانے کی خواہش کو ضبط کر سکتے ہیں؟

۳- کیا آپ کا برتاؤ ایسا ہے کہ چھوٹے بڑے سب آپ سے بے جھجک مل سکیں؟

۴- کیا آپ کے طرز عمل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اور سب لوگوں کو اتنا ہی اہم سمجھتے ہیں جتنا اپنے آپ کو؟

۵- کیا آپ ایسی بات کہنے یا ایسا کام کرنے سے پرہیز کرتے ہیں جس سے دوسروں کو اپنی کم تری کا احساس ہو؟

۶- کیا آپ اس کا لحاظ رکھتے ہیں کہ دوسروں کی غلطیوں کو درست کرتے وقت ان کی تضحیک نہ کریں یا ان کا مذاق نہ اڑائیں؟

۷- کیا آپ میں اتنا ظرف ہے کہ دوسروں کو اپنے سے زیادہ خوش حال دیکھ کر جلیں نہیں؟

۸- کیا آپ کا یہ معمول ہے کہ دوسروں کے خیالات، چاہے وہ آپ کو سخت ناپسند ہوں توجہ سے سنیں اور ان پر ٹھنڈے دل سے غور کریں؟

۹- اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ زیادتی کرے، یا اس کی بات نہ پوچھے یا اسے جھڑک دے تو آپ کو تکلیف ہوتی ہے؟

۱۰- کیا آپ کا دل ذات پات کے تعصب سے پاک ہے؟

۱۱- کیا آپ اپنے عمل سے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ "انسان بہرحال انسان ہے" چاہے اس کی تعلیم تنخواہ اور سماجی حیثیت کتنی ہی کم حیثیت کیوں نہ ہو؟

۱۲- کیا آپ اپنے دوستوں کا انتخاب ان کے سماجی مرتبے سے قطع نظر کر کے محض ان کی ذاتی صفات کی بنا پر کرتے ہیں؟

۱۳- کیا آپ اپنے پرانے دوستوں سے جن سے اب آپ کا درجہ اونچا ہو گیا ہے اسی طرح ملتے ہیں؟

۱۴- کیا آپ کسی کلب، انجمن وغیرہ میں شریک ہوتے وقت محض دلچسپی کو مد نظر رکھتے ہیں۔ اس کا خیال نہیں کرتے کہ اس سے آپ کی سماجی حیثیت بڑھ جائے گی؟

۱۵- کیا آپ ایک معقول حد تک اس کے لئے تیار ہیں کہ ہر شخص کے ساتھ ہر جگہ چلے جائیں اور اس کی پروا نہ کریں کہ لوگ آپ کو ایک چھوٹے آدمی کی صحبت میں دیکھ کر کیا کہیں گے؟

۱۶- کیا آپ اس کا اہتمام کرتے ہیں کہ ہر شخص کے ساتھ اخلاق اور مہربانی سے پیش آئیں؟

۱۷- کیا آپ کا یہ معمول ہے کہ جو شخص تعریف کے قابل ہے اس کی تعریف کریں؟

۱۸- کیا آپ اپنے ماتحتوں، نوکروں اور عام طور پر ان سب لوگوں کی دلجوئی کا خیال رکھتے ہیں جو آپ کی کوئی خدمت انجام دیتے ہیں؟

۱۹- اگر آپ کو کسی جگہ اپنی باری کا انتظار کرنا پڑے تو آپ بغیر جھلاہٹ یا جھنجھلاہٹ کے انتظار کر سکتے ہیں؟

۲۰- کیا آپ اس پر قناعت کرتے ہیں کہ دنیا میں تھوڑی سی فراغت اور تھوڑی بہت عزت میسر ہو؟

فہرست مضامین

مختصر تبصرے

دو کتابیں

سید احتشام حسین

(۱) تحلیل نفسی :۔ از حزب اللہ ایم اے۔ ناشر:۔ کتاب منزل لاہور۔ قیمت آٹھ روپے

(۲) مضامین عابد :۔ از ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ناشر:۔ کتابی دنیا لمیٹڈ، دہلی۔ چار روپے مجلد

۱۔ اردو میں تحلیل نفسی یا تجزیہ نفس پر ابھی اتنا کم لکھا گیا ہے کہ بہت سے لوگوں کے لئے اگر یہ لفظ نہیں تو ان کا مفہوم اور مقصود مزید اجنبی ہوں گے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی حصے میں جس طرح کارل مارکس کے فلسفہ مارکسزم نے دوسرے معاشی اور تاریخی نظریات کو پس پشت ڈال دیا اسی طرح نفسیات کے میدان میں تحلیل نفسی نے نفسیات کے دوسرے مکاتب کی چمک دمک ماند کر دی، لیکن دونوں میں کوئی قابل ذکر ربط نہیں ہے بلکہ فلسفیانہ اور علمی نقطۂ نظر سے مارکسزم سائنس ہے اور تجزیہ نفس بہت مفروضات کا مجموعہ۔ زیر نظر کتاب ساڑھے سات سو صفحات میں تحلیل نفسی کے اہم مباحث پر تفصیلی مواد پیش کرتی ہے۔ کتاب میں گیارہ ابواب ہیں جن میں لاشعور، خواہشات اور قوت نفسی، ارتقائے شہوانیت جنسی تہیجات و مقاصد، آبائی الجھاؤ، نرگسیت خواب ذہنی بیماریاں، تحلیل نفسی کی تکنیک اور جبری اعصابی خلل کے عنوانات قائم کرکے ہر مسئلہ کی تشریح کی گئی ہے۔ کتاب کے مصنف حزب اللہ کا انداز بیان شاعرانہ لیکن مشکل ہے۔ گو انھوں نے مثالوں کی مدد سے اپنے خیالات کو زیادہ سے زیادہ واضح بنانے کی کوشش کی ہے، لیکن تحلیل نفسی کے متعلق معمولی معلومات رکھنے والوں کو اس کتاب کے سمجھنے میں دشواریاں پیش آئیں گی، میرا خیال ہے کہ اس کتاب کے شروع میں تجزیہ نفس کے متعلق عام فہم زبان میں ایسی باتیں لکھنے کی ضرورت تھی جن سے اس علم کی ابتدا اور فرائڈ کی زندگی پر روشنی پڑتی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مولف نے اسے عام فہم بنانے کا خیال ہی نہیں رکھا اصطلاحوں کے ترجمے بھی آسان ہو سکتے تھے۔

تحلیل نفسی نے مذہب اخلاق، نفسیات، ادب اور فن طب وغیرہ کو اس طرح متاثر کیا ہے کہ جب تک اس کے متعلق تھوڑی بہت واقفیت نہ ہو جدید ادب کے ایک بڑے حصے کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے تحلیل نفسی کا بنیادی عقیدہ حقیقتاً لاشعور اور جنس کے گرد گھومتا ہے جن سے بہت سے ذہنی عارضے پیدا ہوتے ہیں، اور انسان خود اپنی کشمکش کے سمجھنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ فرائڈ کا خیال تھا کہ انسانی شعور کے علاوہ تحت شعور اور لاشعور بھی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ شعور تو بہت کم انسانی ذہن پر اثر انداز ہوتا ہے تحت شعور اور لاشعور اس کی زندگی بناتے اور بگاڑتے ہیں۔ لاشعور میں جنسی دباؤ کی وجہ سے یادوں کا خزانہ جمع ہوتا رہتا ہے اور یہی زندگی کی پرسکون راہ میں روڑے اٹکاتا ہے، جنسی اور شہوانی جذبہ بچے میں پیدائش سے پہلے ہی شروع ہو جاتا ہے اور خاندان، سماج، خوف وغیرہ کے ڈر سے چھپ کر یا دب کر رہ جاتا ہے، کبھی کبھی بھیس بدل کر زندگی میں الجھنیں پیدا کرتا ہے کبھی بلند ہو کر انسان کو شاعر، مصور، لیڈر یا کچھ اور بنا دیتا ہے۔ اس طرح یہ ساری نفسیات بیمار یا کم سے کم غیر معتدل انسانوں سے تعلق رکھتی ہے اور توجہ کا اصل مرکز فرد یا اس کی جنسی الجھنیں، اس کے خواب اور خواہش بن جاتی ہیں، اس کا علاج یہ ہے کہ ایسے ذہنی بیماروں کو اپنا حال بیان کرنے پر آمادہ کیا جائے وہ کھل کر بیان تو نہیں کرے گا لیکن تحلیل نفسی کا ماہر اس کی زندگی کے واقعات کو ایک رشتے میں پرو کر یہ بتا دے گا کہ اس کا ذہن کیوں بیمار ہے، لاشعور میں کون سا چور چھپا بیٹھا ہے اور جیسے ہی لاشعور کو شعور میں تبدیل کیا جائے گا، بیمار کا ذہن صحت مند ہو جائے گا۔ یہ ایک بہت ہی ناقص خاکہ ہے تحلیل نفسی کے مباحث کا۔ فرائڈ اس کے بعد یونگ اور ایڈلر وغیرہ نے اس علم میں بڑی موشگافیاں کیں اور اب دنیا کا کوئی ملک ــــ روس کے سوا ــــ ایسا نہیں ہے، جہاں اس سے دلچسپی نہ لی جا رہی ہو۔ روس میں اس کی جگہ اس لئے نہیں ہے کہ ایک صحت مند اشتراکی سماج میں ایسی ذہنی بیماریوں اور نفسیاتی کیفیتوں کا گذر نہیں۔ تحلیل نفسی کی بنیاد یقیناً تجربات پر ہے لیکن اس میں جبلت اور فطرت انسانی کے متعلق جو باتیں فرض کر لی گئی ہیں اور فرد کو اس کی سماجی زندگی سے جس طرح الگ کر لیا گیا ہے اس سے یہ علم ایک مضحکہ خیز شکل اختیار کر لیتا ہے۔ حزب اللہ نے تحلیل نفسی کی تنقید جدید سائنس اور جدید نفسیاتی تجربات کی روشنی میں نہیں کی ہے۔ مگر یہ بات بھی قابل قدر ہے کہ انھوں نے ایسے اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور بہت سا مواد اردو میں اکٹھا کر دیا ہے اگر ان کا انداز بیان سادہ ہوتا اور وہ تھوڑی سی کوشش کرتے تو کتاب اور زیادہ دلچسپ اور عام فہم بن سکتی تھی، اس حالت میں بھی تجزیہ نفس سے دلچسپی لینے والوں کے لئے اس میں اتنا مل جائے گا جتنا وہ بہت سی مغربی تصانیف سے اکٹھا کرتے۔ کتاب صاف ستھری اور مجلد شائع ہوئی ہے اور اردو زبان میں ایک اہم اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

۲۔ جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے۔ مضامین عابد ڈاکٹر سید عابد حسین کے مختلف اوقات میں لکھے ہوئے ادبی اور طنزیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ جن لوگوں نے ڈاکٹر عابد حسین کے ترجمے، تصانیف اور فلسفیانہ مضامین دیکھے ہیں انھیں اندازہ ہوگا کہ ان کا انداز نظر کتنا غیر مبہم، سادہ، بناوٹ سے پاک اور منصفانہ ہے۔ یہی خصوصیتیں ان کے مضامین میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مضامین عابد میں آٹھ ادبی اور آٹھ طنزیہ مضامین شامل ہیں۔ ادبی مضامین بھی اہم ہیں۔ پہلا مضمون "اقبال کا تصور خودی" ہے۔ اقبال پر سیکڑوں مضامین ایسے لکھے گئے ہیں جن میں خودی کا ذکر کیا گیا ہے لیکن یہ مضمون ان سب سے زیادہ واضح اور جامع شکل میں اقبال کے خیالات کی تشریح کرتا ہے اور انھیں ترتیب دے کر پیش کرتا ہے۔ اس مضمون میں یہ کمی ضرور ہے کہ اس میں تصور خودی کی داخلیت اور تصور محض ہونے یا نہ ہونے کی توضیح اور تنقید نہیں کی گئی ہے، اگر اقبال کی خودی اپنی منطقی حد پر جا کر حقیقت کا جامہ پہن لے تو سماج کی کیا شکل ہوگی؟ اگر بہت سے افراد کی خودی مکمل ہو جائے تو نیابت الٰہی کے مستحق کتنے ہوں گے اور معاشرہ کی تنظیم کس طرح ہوگی؟ حصول خودی کے مادی ذرائع کیا ہیں اور معاشرہ میں اس کی جدوجہد کیسی مادی یا طبقاتی کشمکش پیدا کرے گی، ان باتوں کی توضیح بھی نہیں ہوتی، تاہم اقبال کا تصور خودی سمجھنے کے لئے اس سے واضح مضمون یا مقالہ میں نے نہیں پڑھا ہے، اسی طرح اقبال پر دوسرا مضمون "عقل و عشق اقبال کی شاعری میں" نہایت سادگی سے، اقبال کے خیالات کی تشریح تصورات جدیدہ کی روشنی میں کرتا ہے۔

سر راس مسعود، مولانا عبدالحق اور حکیم اجمل خاں کے مختصر خاکے ان بزرگوں کی سیرت اور کردار کو اس خوبی سے روشن کرتے ہیں کہ تفصیلات اور زندگی کے حالات و واقعات کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر عابد حسین نے ۱۹۳۶ء میں حالی صدی کے موقع پر رسالہ جامعہ کے لئے جو مضمون لکھا تھا وہ بھی اس مجموعے میں شامل ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین حالی کو نہ صرف اچھی طرح جانتے ہیں بلکہ سیرت میں بھی ان سے مشابہ ہیں اس لئے انھوں نے حالی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ محض تذکرہ یا خاکہ نہیں ہے بلکہ اعلیٰ پائے کا علمی اور تنقیدی کارنامہ ہے۔ چند صفحوں میں حالی کی سیرت، شاعری، تنقید سوانح نگاری ہر چیز کی اساسی حیثیت نمایاں ہو گئی ہے "برنارڈ شا" اور "ڈراما کیا ہے" دو اور ادبی مضامین ہیں جو دقت نظر اور وسعت مطالعہ کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہیں۔ برنارڈ شا پر اردو میں بہت کم لکھا گیا ہے لیکن اب جو شخص بھی قلم اٹھائے گا اسے نہ صرف اس مضمون سے مدد ملے گی بلکہ اس منزل اور معیار سے آگے بڑھنے میں دشواریاں پیش آئیں گی۔ ڈرامے پر جو مضمون ہے وہ بھی بہت

بقیہ صفحہ ۴۴

ہفتہ وار
نئی روشنی
لکھنؤ

۱۶ اکتوبر ۱۹۴۹ء

ذمہ دارانہ مخالفت

جمہوری ملکوں میں حکومت کی ذمہ داری اس پارٹی پر ہوتی ہے جو عام انتخابات میں اکثریت حاصل کرکے یہ ثابت کر دے کہ ملک کا ارادہ عامہ اس کے ساتھ ہے۔ دوسری پارٹیاں جنھیں اکثریت کی پارٹی پروگرام سے اتفاق نہیں ہوتا، عام طور پر مل کر ایک متحدہ محاذ بنالیتی ہیں جسے اپوزیشن یا مخالف پارٹی کہتے ہیں۔ مخالف پارٹی کا کام زیادہ تر منفی ہوتا ہے یعنی حکومت کی پالیسی پر تنقید کرنا اس کے نظم و نسق کی کمزوریوں، غلطیوں اور ناانصافیوں کا پردہ فاش کرنا۔ قدرتی طور حکومت کرنے والی پارٹی پر ذمہ داری کا بوجھ زیادہ ہوتا ہے یا ہونا چاہیئے اس لئے کہ قوم نے اسے ایک مقررہ مدت کے لئے اپنے اقتدار اعلیٰ کا امین بنایا جائے اور اس سے یہ توقع رکھتی ہے کہ ملک کی حفاظت کرے گی، امن و امان عدل و انصاف قائم رکھے گی۔ جمہور کی مادی فلاح اور اخلاقی صلاح کے لئے قانون بنائے گی اور ان کی تعمیل کرائے گی لیکن مخالف پارٹی بھی ذمہ داری سے بری نہیں ہوتی گو اسے فی الحال اصولی یا عملی وجوہ سے ارادہ عامہ حکومت کے قابل نہ سمجھے مگر اس کا اہل ضرور سمجھتا ہے کہ وہ مجلس قانون ساز کی اکثریت اور اس کی نمائندہ حکومت کے کاموں پر کڑی نگرانی رکھے اور اس کی کوتاہیوں سے جمہور کو آگاہ کرتی رہے۔ اس لئے حکومت نیکی یا بدی کے آئین کی رو سے اس بات پر مجبور ہوتی ہے کہ بڑے بڑے پالیسی کے معاملات میں مخالف پارٹی سے مشورہ لیتی رہے چاہے پھر اس مشورے کو قبول کرے یا نہ کرے۔ حکومت کا یہ بھی فرض ہوتا ہے کہ اپنی سب کارروائیوں اور سرگرمیوں سے کسی نہ کسی منزل پر مخالف پارٹی کو مطلع کرے۔ اس کی تنقید اور اعتراض کو سنے اور اس کا جواب دے۔

غرض مخالف پارٹی بھی کسی نہ کسی حد تک ارادۂ عامہ کی امین اور اس کی طرف سے ذمہ داری کی حامل ہے۔ اس کی حیثیت امیدوار کی سی ہوتی ہے جسے کوئی بڑا کام سپرد کرنے سے پہلے امتحان کے طور پر کوئی چھوٹا سا کام کرنے کو دیا جاتا ہے۔ مگر ہمارے ملک میں آزادی سے پہلے قانون ساز مجلسوں میں مخالف پارٹی کی یہ حیثیت نہ تھی۔ کانگریس کو جو بعض اوقات اکثریت میں ہونے کے باوجود حکومت سے محروم اور حزب مخالف بننے پر مجبور ہوتی تھی مخالف پارٹی کا اصلی منصب اور اس کے حقوق حاصل نہیں تھے اور باتوں کا تو کیا ذکر ہے۔ بڑے سے بڑے اندرونی اور بیرونی معاملات یہاں تک کہ جنگ اور صلح کے معاملے میں بھی اس سے رائے نہیں لی جاتی تھی۔ کانگریسی ممبر صوبائی اور مرکزی مجلسوں میں تماشائیوں کی طرح شریک ہوتے تھے جنھیں صرف اسٹیج کی سرگرمیاں نظر آتی تھیں۔ پردے کے پیچھے کا حال کچھ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ انھیں اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے ظاہر کرنے کا حق حاصل تھا، مگر اسی حد تک جتنا ہر تماشے میں تماشائیوں کو ہوتا ہے۔ اس حق سے وہ خوب خوب کام لیتے تھے۔ مہاتما گاندھی کی اخلاقی تعلیم کا اتنا اثر ضرور تھا کہ وہ اپنی تقریروں میں نفرت اور عداوت بغض اور کینے کی جھلک نہیں آنے دیتے تھے۔ مگر غم و غصے کے جذبات کو جو مایوسی اور بے بسی کی حالت میں لازمی طور پر پیدا ہوتے ہیں دبانا ان میں سے اکثر کے بس کی بات نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ چار بڑے بڑے آدمیوں کو چھوڑ کر جو اس حالت میں بھی ذمہ داری کا پورا احساس رکھتے تھے عام طور پر کانگریسی ممبروں کی تقریریں معاندانہ اور غیر ذمہ دارانہ ہوتی تھیں۔ وہ انسانی فطرت کی کمزوریوں سے کر قدرتی حادثوں تک ہر چیز کا الزام برطانوی حکومت پر رکھتے تھے اور کبھی بھولے سے بھی اس کے کسی کام کی تعریف نہیں کرتے تھے۔

ماضی قریب کی ان روایات کی وجہ سے ہماری نئی جمہوریت کے لئے دوہرا خطرہ ہے۔ ایک طرف یہ کہ کہیں اکثریت یا حکومت کرنے والی پارٹی حزب مخالف کو اسی طرح دودھ کی مکھی نہ سمجھے جیسے برطانوی حکومت کانگریس کو سمجھتی تھی اور دوسرا یہ ہے کہ کہیں مخالف پارٹیاں حکومت پر اعتراض اور تنقید کرنے میں اتنی یا اس سے بھی زیادہ غیر ذمہ داری نہ برتیں جتنی پہلے کانگریس کے بہت سے ممبروں کی تقریروں میں ہوا کرتی تھی۔

آئین ساز مجلسوں میں تو اس وقت دراصل کسی قابل ذکر مخالف پارٹی کا وجود ہی نہیں ہے لیکن ان کے باہر کانگریس کی کئی مخالف پارٹیاں یا حلقے موجود ہیں۔ جہاں تک کانگریس کا تعلق ہے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مخالفت کو بالکل محسوس نہیں کرتی یا اس سے متاثر نہیں ہوتی، لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ احساس اور تاثر ان ہی پارٹیوں کے مقابلے میں ہے جو اس وقت طاقت ور سمجھی جاتی ہیں۔ اس رویے پر ہمیں اعتراض ہے کہ مخالف حلقوں کی اہمیت کا معیار طاقت کو نہیں بلکہ حق کو چاہیئے۔ جن مخالفوں کا اعتراض یا شکایت بے جا ہو کانگریس جیسی جماعت کو جو مہاتما گاندھی کا نام لیوا ہے ان کی مطلق پروا نہیں کرنی چاہیئے چاہے وہ آج کتنی ہی طاقت ور نظر آتے ہوں، لیکن جن لوگوں کی مخالفت حق پر مبنی ہے، انھیں حقیر سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے وہ آج کمزور ہیں تو کل نہیں رہیں گے۔ حق میں بے پناہ طاقت ہے۔

اب کانگریس کے نقادوں کو لیجیئے جن میں بعض کانگریسی بھی شامل ہیں تو ان کا طرز عمل عام طور پر بہت افسوسناک ہے۔ ان میں سے اکثر لوگوں کی نکتہ چینی تنقید نہیں ہوتی بلکہ تنقیص ہوتی ہے اور وہ بھی غیر ذمہ دارانہ، تخریبی، ذاتیات اور شخصیات پر مبنی اور کبھی کبھی بالکل بے بنیاد۔ ان حضرات کی مخالفت کا رنگ دیکھ کر طبیعت پر مایوسی چھا جاتی ہے کہ شاید ہماری سیاست میں ایک عرصے تک صحت مند اور ذمہ دار مخالف پارٹی نہیں بن سکتی۔

لیکن اس تاریکی میں روشنی کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔ سوشلسٹ جماعت جو پہلے کانگریس کا ایک جاندار عنصر تھی اور پچھلے سال سے کانگریس کو چھوڑ کر ایک مستقل پارٹی بن گئی ہے، ہمت اور استقامت کے ساتھ جمہوریت کی راہ پر چل رہی ہے اور اس سے امید کی جا سکتی ہے کہ اگر اسے آئندہ انتخابات میں تھوڑی بہت کامیابی ہوئی تو مرکزی پارلیمنٹ اور صوبوں کی مجالس میں مخالف پارٹی کے فرائض پوری ذمہ داری کے ساتھ ادا کرے گی۔ پچھلے دنوں یو۔پی میں یہ شکایت سننے میں آئی تھی کہ سوشلسٹ حکومت کے غلہ جمع کرنے کے کام میں اور زمینداری ختم کرنے کی مہم میں روڑا اٹکاتے ہیں۔ اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی تھی کہ دوسری پارٹیوں کی طرح جو کانگریس کی مخالف ہیں، سوشلسٹ پارٹی بھی محض رقابت ضد اور غصے کے جذبات سے متاثر ہے اور تعمیری تنقید کی جگہ حکومت کو جا اور بے جا بدنام کرنے اور اس کے اچھے برے سب کاموں میں رکاوٹ ڈالنے پر اتر آئی ہے لیکن سوشلسٹ پارٹی کی جنرل کاؤنسل کے اجلاس نے جو حال میں بنگلور میں منعقد ہوا تھا، یہ ثابت کر دیا ہے کہ چند افراد جو کچھ بھی کر رہے ہوں سوشلسٹ پارٹی بہ حیثیت جماعت ہرگز یہ تخریبی پالیسی نہیں رکھتی بلکہ جمہوری حزب مخالف کا سچا نمونہ بن کر دکھانا چاہتی ہے۔ اس نے ایک بار پھر اس کی وضاحت کر دی کہ جب تک ملک میں ذمہ دار حکومت رہے گی وہ سیاست میں پرتشدد انقلابی طریقے کے بجائے پرامن جمہوری طریقے سے کام کرے گی (جس میں سول نافرمانی، ستیاگرہ اور ہڑتال شامل ہیں) اس کے علاوہ سوشلسٹ پارٹی کے ممتاز لیڈر جے پرکاش نرائن نے یہ اعلان کیا کہ غذا کی پیداوار بڑھانے کی مہم میں ان کی پارٹی ہر طرح حکومت کا ہاتھ بٹانے کو تیار ہے۔ ملک کی سیاسی صورت حال کی رپورٹ میں جو انھوں نے کاؤنسل کے سامنے پیش کی جہاں کانگریسی حکومت کی پالیسی پر بہت سے اعتراضات ہیں وہاں اس حقیقت کا اعتراف بھی ہے کہ حکومت نے ہندوستانی ریاستوں کو انڈین یونین میں

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

دُنیا کی رفتار

ہندوستان

تلاشِ امریکہ

وزیر اعظم پنڈت جواہرلال نہرو ۶ اکتوبر کو بمبئی سے روانہ ہوئے اور لندن میں مسٹر اٹلی اور سر اسٹیفورڈ کرپس سے مل کر امریکہ کے پریسیڈنٹ ٹرومین کے خاص ہوائی جہاز میں جو انہیں لینے کے لئے لندن بھیجا گیا تھا واشنگٹن پہنچ گئے۔ جیسے ہی پنڈت جی نے پہلی بار امریکہ کی سرزمین پر قدم رکھا، ۱۹ توپوں کی سلامی ہوئی۔ پریسیڈنٹ ٹرومین نے معزز مہمان کا خیر مقدم کیا اور اپنی کیبنٹ کے وزرا اور مجلس مقننہ کے ممبروں کو ان کی خدمت میں پیش کیا۔ پریسیڈنٹ ٹرومین نے جو الفاظ خیر مقدم کے طور پر کہے ان میں ایک بڑا ادبی شان رکھتا تھے "قسمت کو یہ منظور تھا کہ آپ کے ملک تک پہنچنے کے لئے ایک نئی راہ کی تلاش کے سلسلے میں ہمارا ملک دریافت ہو جائے۔ لیکن مجھے امید ہے کہ آپ کی تشریف آوری بھی ایک لحاظ سے امریکہ کی دریافت ثابت ہوگی۔" واقعی پنڈت جی کے سفر امریکہ سے جو مفید نتیجہ یقینی طور پر حاصل ہوگا وہ یہ ہے کہ ہمیں پہلی بار ایک ذی علم، وسیع النظر، باریک بین، انصاف پسند ایشیائی مدبر کے تاثرات نئی دنیا کے بارے میں معلوم ہوں گے اور جو بدگمانی ہمیں امریکہ والوں سے ہے وہ کسی حد تک دور ہو جائے گی بلکہ پنڈت جی کی ملنسار طبیعت کے واسطے سے ہم میں اور ان میں دوستی کا رشتہ قائم ہو جائے گا۔ پنڈت جی کے شاندار اور پرجوش استقبال کی خبروں سے جو روز آ رہی ہیں اس امید کو اور زیادہ تقویت پہنچتی ہے لیکن اس کے علاوہ جتنی امیدیں اس سفر سے باندھی جا رہی ہیں کہ امریکہ سے ہندوستان کو صنعتی ترقی کے لئے قرضہ، فنی مشورہ اور دوسری سہولتیں ملیں گی وہ اگر موہوم نہیں تو مشتبہ ضرور ہیں، اس لئے کہ جن شرطوں پر امریکہ قرضہ دینا چاہتا ہے اور جن شرطوں پر ہندوستان لینا چاہتا ہے ان میں بہت بل ہے اور اس کا دور ہونا آسان نہیں۔ پنڈت جی کے ساتھ مالیات کے زبردست ماہر سر چنتامنی دیشمکھ مشیر کے طور پر موجود ہیں، اس لئے توقع ہے کہ وہ وزیر اعظم کو ان بھیدوں سے اور خطروں سے آگاہ کرتے رہیں گے جو اس قسم کے معاملات کی راہ میں چھپے ہوتے ہیں، اور غفلت یا جلدی میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔

آئین سازی کی رفتار

آئین ساز اسمبلی کا کام خاصی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے اور امید ہے کہ بہت جلد ختم ہو جائے گا۔ یہ فیصلہ ہوا ہے کہ ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو نئے آئین کے نفاذ کے بعد عام انتخاب تک جو ۱۹۵۰ء کے آخر یا ۱۹۵۱ء کے شروع میں ہوں گے۔ اسمبلی عارضی پارلیمنٹ کے طور پر کام کرتی رہے گی۔ مگر اس کے جو ممبر صوبوں کی کونسلوں کے بھی ممبر ہیں، استعفا دے دیں گے، اور ان کی جگہ صوبائی کونسلیں نئے ممبر منتخب کریں گی۔ اس میں اس بات کا خیال رکھا جائے گا کہ مسلمان ممبروں کی جگہ مسلمان، سکھوں کی جگہ سکھ، اور ہریجنوں کی جگہ ہریجن منتخب ہوں۔ ایک ہفتے کی بحث اس تجویز پر ہوئی کہ آئی سی ایس اور دوسری امپیریل سروس کے موجودہ ممبروں کو جو حقوق نئے آئین کے نفاذ کے وقت حاصل تھے وہ اس کے نفاذ کے بعد بھی حاصل رہیں گے۔ بہت سے حضرات نے جن میں اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر بھی شامل ہیں، اس موقع پر ان سروسوں پر جنہوں نے برطانوی حکومت کے زمانے میں تحریک آزادی کو کچلنے کی پوری کوشش کی تھی، خوب لعن طعن کی اور انہیں دوسرے سرکاری ملازموں کے مقابلے میں زیادہ حقوق دینے کی مخالفت کی۔ لیکن سردار ولبھ بھائی پٹیل نے اپنے ماتحتوں کی حمایت میں اس زور شور کی تقریر کی اور ان کی قابلیت، وفاداری اور کارگزاری کا ایسا سکہ جمایا کہ ساری مخالفت ہوا ہو گئی اور کسی کو تجویز کے خلاف رائے دینے کی ہمت نہیں ہوئی۔

باہر کی دنیا

چین میں کمیونسٹ حکومت کے قیام نے بین الاقوامی توازنِ طاقت کو بہت نمایاں طور پر بدل دیا ہے۔ چینی کمیونسٹ حکومت کے لئے چونکہ اپنے ملک میں ان گنت تعمیری کام کرنے ہیں، اس لئے امن اور صلح کی ضرورت ان کو سب سے بڑی آرزو ہوگی۔ اس کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں امن کے امکانات کچھ بڑھ گئے ہیں۔ روس نے ایٹم بم بنا لیا ہے اور اس واقعے سے بھی سمجھدار لوگوں نے یہی نتیجہ نکالا ہے کہ اس سے امن کا پلہ بھاری ہوگا۔ امریکہ کے بعض حلقوں میں یہ بات کبھی کبھی چپکے چپکے اور بیشتر کھلے بندوں کہی جاتی رہی ہے کہ روس سے جلد سے جلد فوجی کارروائی شروع کر دینی چاہیے تاکہ امریکہ ایٹم کے اجارے سے پورا فائدہ اٹھا سکے، اور روس کو نیست و نابود کیا جا سکے۔ جب تک یہ بات معلوم تھی کہ عام لوگوں کو یہ یقین دلایا جا سکتا تھا کہ روسی ایٹم بم نہیں بنا سکے ہیں۔ فوجی کامیابی کی امید بہت یقینی ثابت کی جا سکتی تھی۔ پچھلی جنگ میں امریکہ کو جان کی جو قربانیاں دینی پڑی تھیں وہ روس کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھیں، امریکی عوام کو جنگ کی تباہ خیزی کا پورا پورا تجربہ بھی نہیں ہے۔ انہیں یہ یقین دلا دیا جاتا کہ نئی جنگ سے تو انہیں روزگار کے مواقع زیادہ ملیں گے اور سرمایہ دار اور نفع بٹور سکیں گے تو ان کے مخالف جنگ جذبہ کو بڑی حد تک کمزور کیا جا سکتا تھا۔ یہی صورت یورپ میں ممکن تھی، مغربی یورپ کے لوگوں میں اب جنگ کا جذبہ بالکل ہی سرد پڑ جائے گا۔ کیونکہ اب انہیں یہ بات معلوم ہو گئی ہے کہ اگر امریکہ روس پر ایٹم برسا سکتا ہے تو روس لندن اور پیرس کو صفحۂ ہستی سے مٹا سکتا ہے۔ یہ احساس بہت سے لوگوں کی آنکھیں کھول دے گا۔ اور اب امن کی بات چیت زیادہ سنجیدگی اور خلوص سے ہوگی۔

فوجی میدان میں ایٹم بم کی دریافت نے جو کام کیا ہے سیاست کے میدان میں وہی نئی چینی حکومت کے قیام سے انجام پائے گا۔ چینی وزیر خارجہ نے مختلف ملکوں کو اطلاع دی کہ ان کی نئی حکومت دوسرے ملکوں سے سیاسی تعلقات قائم کرنے کے لئے تیار ہے۔ روس سے چینی حکومت کے تعلقات قائم بھی ہو چکے ہیں اور مشرقی یورپ کی کئی جمہوری حکومتوں نے بھی نئی چینی حکومت کو تسلیم کر لیا ہے۔ لندن سے ایک خبر آئی تھی کہ حکومت ہند بھی نئی حکومت کو جلد ہی تسلیم کرے گی کیونکہ اسے اس طرح یہ ثابت کرنے کا موقع ملے گا کہ تبت میں ابھی جو واقعات پیش آئے تھے ان سے حکومت ہند کو کوئی تعلق نہ تھا۔ اس مسئلے میں سب سے زیادہ لیت و لعل برطانیہ اور امریکہ کی طرف سے ہوگا۔ برطانیہ مشرق بعید کے ملکوں سے تجارتی تعلقات رکھنا چاہتا ہے اور برطانوی خارجی تجارت کا مفاد بعض مرتبہ حکومت کو بڑے کڑوے گھونٹ پینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ قیاس یہ ہے کہ برطانوی حکومت بھی جلد ہی نئی حکومت کو تسلیم کرے گی۔ اس سے ایک تو یہ امید ہے کہ چین سے برطانیہ کو تجارت کا حق مل جائے گا اور ہانگ کانگ جیسے نزاعی مسائل پر کم سے کم تھوڑے دن خاموشی رہے گی۔ امریکہ میں اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو یہ امید لگائے بیٹھے ہیں کہ شاید کوئی معجزہ چیانگ کو چین کی قسمت کا مالک بنا دے اور ان کے لئے یہ فیصلہ ظاہر ہے، بہت دشوار ہوگا کہ چینی کمیونسٹوں کی حیثیت کو قانوناً تسلیم کر لیا جائے، عملاً تو چین ان کا ہو چکا۔ اسے امریکہ بھی اب جھٹلا نہیں سکتا۔

الگ الگ ان حکومتوں کے لئے چینی حکومت کے قیام نے ایک دردِ سر کا سامان پیدا کر دیا ہے لیکن اس سے زیادہ دردِ جگر کا سامان نام نہاد متحدہ اقوام کے سامنے ہے۔ کہنے کو یونائٹڈ نیشنز کا ادارہ ایک جمہوری ادارہ ہے جس میں اکثریت کے فیصلے سب پر حاوی ہوتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جنوبی امریکہ کے چھوٹے چھوٹے لاتعداد ملکوں نے اسے امریکہ اور اس کے حلیفوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا دیا ہے۔ پچھلے دنوں ہی روس نے کئی ملکوں کی ممبری کی درخواست کے سلسلے میں ویٹو استعمال کیا تو سارا جمہوری پریس چیخ اٹھا تھا۔ لیکن بات صرف اتنی تھی کہ اگر نیپال کو ممبری کا حق پہنچتا ہے اور روس کی شرکت صرف سیٹا نیا اور امریکہ کو ایکا ہمدردی فراہم کرنے کے لئے ہی نہیں ہے تو مشرقی یورپ کے ملکوں کا قصور کیا ہے جنہوں نے اپنے یہاں جمہوری حکومتیں بنا کر شخصی استبداد سے نجات حاصل

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

بزمِ بے تکلف

"یا اللہ خیر! یہ سویرے سویرے کون سی بلا نازل ہوئی؟ ارے! آپ ہیں؟ بھئی خوب آئے بابو صاحب۔ اس وقت آپ ہی کی ضرورت تھی۔ آج صبح تڑکے سے دل پر کچھ گھبراہٹ سی ہے اور خمیرہ گاؤزبان جو کچھ بچا کچھا رہ گیا تھا وہ چوہے کھا گئے"

"ظاہر ہے شاعر کے گھر کے چوہے بھی خفقانی ٹھہرے۔ مگر میری آپ کو کیا ضرورت تھی؟ کیا میں کوئی خمیرہ یا معجون ہوں؟"

"واہ بابو صاحب واہ! آپ کو آج تک اپنی خاصیت کی خبر نہیں۔ اجی آپ تو طرفہ معجون ہیں۔ مزاج، قوام چاشنی ایک سے ایک بڑھ کر دلچسپ اور پھر تاثیر کا کیا کہنا

باعثِ فرحتِ دلِ بے تاب
رافعِ قبضِ خاطرِ احباب"

واللہ خوب کہی مگر یہ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ معجون کی تعریف ہے یا مسہل کی؟ آخر آپ نے جلّاب کا قافیہ کیوں نہیں باندھا"

"جلاب بھی کوئی باندھنے کی چیز ہے؟ آپ جس شاعر یا حکیم سے جایئے پوچھ لیجئے۔ اچھا اب اس ذکر کو چھوڑیئے یہ بتلایئے کہ آپ کے اندر پھر قیصر رنگا کے دوست میاں چیانگ کائی شک کا کیا حال ہے؟"

"حال کیا ہوتا ڈٹا ہوا ہے میدان میں"

"کمال کیا آپ نے حریف نے پیچھے ڈھکیلتے ڈھکیلتے سمندر تک تو پہنچا دیا اور آپ فرماتے ہیں کہ ڈٹا ہوا ہے"

"اجی وہ موسیٹوں کیا ڈھکیلتا۔ ہمارے پہلوان نے آپ ہی ڈھکیلی کھائی میاں خوجی کی طرح"

"کیا کہتے ہیں، کہیں اب کہ ڈھکیلی میں غرقاب سے بحرین کے اندر نہ پہنچ جائے"

"تو اس میں کون سا غضب ہو جائے گا۔ وہاں بھی میرا شیر مگر مچھ کی طرح اینڈتا پھرے گا مگر دیکھو انصاف سے کہنا۔ ایسے دم خم کسی کے دیکھے ہیں؟ مٹھی بھر آدمیوں کو لئے کشتیوں میں اسی شان سے اکڑ رہا ہے جیسے اب بھی ساری چینی فوج کا سپہ سالار ہو"

"بابو صاحب جب تک سدھ بدھ نہ ہو خالی دم خم سے کام نہیں چلتا۔ آپ نے یہ نئی حرکت بھی ملاحظہ کی؟ مادام تن یات سین کی گرفتاری کا حکم صادر فرمایا ہے۔ کوئی پوچھے کہ میاں چرکٹ تم مادام کو کیا گرفتار کروگے۔ کہیں اسی دام میں آپ ہی نہ پھنس جاؤ"

"ارے وہ بچارا تو پہلے ہی گرفتاری رشتے میں جکڑا ہوا ہے بقول شخصے ع خانہ زادِ زلفت ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؟"

"کاش ایسا ہی ہوتا مگر اس کی وحشت سے تو زنجیر بھی پناہ مانگتی ہے اب سنا ہے کینٹن سے ہانگ کانگ کی تیاریاں ہیں"

"کیا کیا جائے

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں"

آتشِ سیّال

خلیل الرحمٰن اعظمی

اب نہ ٹوٹیں گے کبھی میری ان آنکھوں سے گہر
اب نہ کچلی ہوئی روحوں سے دھواں اٹھے گا
اب نہ شرمائے گی ناکام امنگوں پہ حیات
سازِ مطرب سے نہ اب شورِ فغاں اٹھے گا
اب نہ لے کر کبھی موہوم دھندلکوں کا غبار
وادی و کوہ سے یہ ابرِ رواں اٹھے گا

سالہا سال یہ افسردہ خیالوں کا افق
لے کے آیا ہے دمکتی ہوئی صبحوں کا فسوں
موسمِ گل کے حسیں قدموں کی آہٹ سن کر
جیب و دامن سے بھی آزاد ہوا ہے یہ جنوں

جس نے نادیدہ بہاروں کا ترانہ چھیڑا
یک بیک جیسے یہ مرغانِ چمن جاگ اٹھے
پھول برسائے گئے کیسے یہ صحراؤں میں
چونک کر آج غزالانِ ختن جاگ اٹھے
جیسے تخئیل میں ٹوٹی ہو کہیں اک زنجیر
جیسے خوابوں میں کبھی اپنا وطن جاگ اٹھے

میں نے اس طرح چمکتی ہوئی ان راہوں کو
کتنی ہی بار نئی زیست کا عنواں سمجھا
ناخداؤں نے تو ہنس ہنس کے ڈبو دی کشتی
اور میں اس کو نئے دور کا طوفاں سمجھا

اب یہ دیوانے ابھرتے ہیں اسی طوفاں سے
پھیلتی آج ہواؤں میں ہے زخموں کی مہک
میکدے آتشِ سیّال سے خود جل اٹھے
نئے انداز سے گونج اٹھی یہ ساغر کی کھنک
آج رقصندہ ہے پھر قطرۂ شبنم پہ شرار
ایک پیغامِ بغاوت تھی یہ غنچوں کی چٹک

میری جن آنکھوں نے اشکوں کا سہارا ڈھونڈا
اب دہکتے ہیں انھیں آنکھوں میں یہ انگارے
اب نکھرتی ہے فضاؤں میں لہو کی سرخی
اب کہاں روکے سے رکتے ہیں یہ غم کے دھارے

جرائم کس طرح روکے جائیں

(نفسیاتی نقطۂ نظر سے)

خواجہ جلیل احمد

(۳)

موجودہ نظریہ عدل ہر مجرم کو معصوم قرار دیتا ہے لیکن ایسا سمجھنا یقیناً صحیح نہیں ہے۔ اکثر عادی مجرمین جرم کی نوعیت اور سزا سے واقف ہوتے ہوئے بھی ارتکاب جرم کرتے ہیں اور اگر ایسا فرض بھی کیا جائے جو یقیناً نفسیاتی تعلیم کے منافی ہے پھر بھی عملاً مجرمین پر تشدد کرنا پڑا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ گرفتاری کے بعد پولیس مجرمین کے ساتھ بہت بُرا سلوک کرتی ہے جس کا قانوناً اسے کوئی اختیار نہیں۔ اس صورت حال کو بھی روکنے کی اشد ضرورت ہے۔ یہ تو رہا قانون کا عملی پہلو لیکن جہاں تک ہمارے اصل مقصد کا سوال ہے۔ ہم ہمیشہ ایسے حالات پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے جن میں جرائم کا ارتکاب ناممکن ہو جائے۔ واقعات شاہد ہیں کہ جرائم کی کثیر تعداد معاشی دقتوں کا نتیجہ ہوتی ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب ہمارے پاس گزر اوقات کے لئے روپے ہوں گے تو ہم یقیناً چوری نہیں کریں گے۔ علاوہ ازیں بعض حکومتوں نے (جن میں سوویت روس بھی شامل ہے) اپنا معاشی نظام تسکین بخش بنا کر جرائم کی تعداد کم کر دی ہے۔ اس موقع پر مجھے کمیونزم کی تعریف مقصود نہیں۔ یقیناً اس نظام میں بہتیری خرابیاں ہیں لیکن جو اچھی بات ہے اسے ہمیں تسلیم کرنا ہی ہوگا۔ بقول جواہر لال نہرو روس کی اور کمزوریوں سے قطع نظر انھوں نے بے کاری اور بے روزگاری کا مسئلہ قطعاً ختم کر دیا ہے۔ ہمیں اس ملک میں بھی ایسے حالات پیدا کرنا ہیں جو معاشی تکالیف کو ختم کر دیں۔ پھر اخلاقیات پر اس کا بالواسطہ اور "ارتکاب جرائم" پر براہ راست اثر پڑے گا۔ اگر میں بھولتا نہیں ہوں تو شاید رسکن نے ایک موقع پر کہا ہے کہ ماحول اخلاقیات کو درست کرتا ہے۔ حالات کے سدھر جانے پر پبلک کی بہبودی انسانیت کی بہتری غرض کہ ہر اچھی چیز کرنے کو جی چاہتا ہے۔ دور کیوں جائیے کسی دن بھوکے رہ کر خود دیکھ لیجئے اور اس کا اندازہ کیجئے کہ اخلاقی افعال کے برتنے کا زیادہ خیال دل میں پیدا ہوتا ہے یا بھوک مٹانے کا۔ ایک بھوکے سے یقیناً یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عوام کی بہتری کی کوشش کرو جس کی حالت خود ابتر ہو وہ کسی کے کیا کام آ سکے گا۔ ہم کو اور ہماری حکومت کو اس ہمہ گیر نفسیاتی حقیقت کو ہر وقت اپنے سامنے رکھنا ہوگا۔ اس کے جواب میں ہو سکتا ہے کچھ لوگ مہاتما گاندھی اور دوسرے رہبران قوم و ملت کی مثال دیں۔ لیکن وہ لوگ مثتنیات میں سے ہیں۔ ساری آبادی مہاتما گاندھی یا امام حسینؓ نہیں بن سکتی۔ یقیناً ہمارا آخری مقصد یہی ساری آبادی بلکہ ساری دنیا کو آخرکار اسی نمونے پر ڈھالنے کی کوشش کرنا ہے۔ لیکن فی الحال اس مفلوک الحالی کے زمانے میں عوام کی ذہنیت کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

انسان کا ہر فعل سوائے ان افعال کے جو خود بخود ہوتے ہیں اور جن کو نفسیات اور فزیالوجی ریفلکس ایکشن یا اضطراری حرکات کا نام دیتی ہے، اپنے پیچھے ایک مقصد پوشیدہ رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی شخص نے روٹی چرائی تو یہ چوری مختلف مقاصد اور خیالات کی بنا پر کی جا سکتی ہے۔ اول شدید گرسنگی کی حالت میں، دوم معمولی بھوک کی حالت اور اخلاقی اور سماجی پابندیوں سے منکر ہونے کی صورت میں، سوم معمولی اشتہا اور معمولی اخلاقی پابندی کے باوجود مناسب موقع ملنے کی صورت میں وغیرہ وغیرہ۔ اس مثال سے یہ بخوبی واضح ہو گیا کہ روٹی چرانے کی ایک حرکت جو بظاہر یکساں معلوم ہوتی ہے۔ مختلف مقاصد اور خیالات کے ماتحت کی گئی۔ ہر فعل کے ارتکاب کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ لیکن ہمارا قانون ہر روٹی کی ایک خاص مقدار کی چوری پر یکساں سزائیں دے گا، کیونکہ ان کے نزدیک ہر شخص اپنے فعل کا قطعی ذمہ دار ہے، بشرطیکہ وہ صحیح دماغی حالت میں ہو، اور علاوہ ازیں قانون یہ بھی فرض کرتا ہے کہ اس کو اس فعل کے جرم ہونے کا احساس تھا، اور وہ اس کی سزا سے بھی واقف تھا۔ حالانکہ ہو سکتا ہے ایک جاہل آدمی کسی معمولی چیز کی چوری کرے اور اس کو اس کا تو علم ہے کہ ایسا کرنا بُرا ہے لیکن اس پر سزا بھی ہو سکتی ہے، اس سے وہ ناواقف ہو۔ بہرحال سزا کے تعین میں نفسیاتی اسباب کا خیال رکھنا پوری طرح انصاف کرنے کے لئے بہت ضروری ہے۔ "غیر طبعی نفسیات" جو پہلی جنگ کے بعد کی پیداوار ہے اور "عام نفسیات" کی ایک شاخ ہے ایسے ایسے دماغی امراض دریافت کر چکی ہے جن کا

> ...... طبعی نفسیات نے ......
> ایسے ایسے دماغی امراض دریافت کر چکی ہے، جن کا مریض اکثر اوقات عام لوگوں کی طرح کام کاج کرتا ہے اس کی گفتگو، اس کی تقریر، تحریر غرضکہ کسی حرکت سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ دماغی مریض ہے لیکن دراصل اس کے اندر خاص حالات کی بنا پر کچھ ایسی بنیادی تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں، جن کی بنا پر وہ جرم کرتا ہے ...... مجرمین کا دماغی معائنہ کرنے کے بعد امریکی ماہرین نے پتہ لگایا ہے کہ دماغی کمزوری اور جرم میں بہت قریبی رشتہ ہوتا ہے ......

مریض اکثر اوقات عام لوگوں کی طرح کام کاج کرتا ہے، اس کی گفتگو، اس کی تقریر، تحریر، غرض کسی حرکت سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ دماغی مریض ہے۔ لیکن دراصل اس کے اندر خاص حالات کی بنا پر کچھ ایسی بنیادی تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن کی بنا پر وہ جرم کرتا ہے۔ مثلاً ایک قسم کے مریض جو جنسی بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں سیڈسٹ کہلاتے ہیں۔ ان کو محبوب کو تکلیف دینے، نقصان پہنچانے حتیٰ کہ قتل کر دینے میں لطف حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ فرانس میں ایک سیڈسٹ آٹھ دس قتل پراسرار طور پر کرنے کے بعد گرفتار ہوا اور آپ کو سن کر شاید تعجب ہو کہ مقتول سب خوبصورت عورتیں تھیں، ان کو چھرے سے ہلاک کیا گیا تھا اور چھرے ایسے مقامات پر مارے گئے تھے جہاں سے کوئی نفسانی لذت حاصل کی جاتی ہے۔ موجودہ قانون کی رو سے اس شخص کو پھانسی ہونی چاہیئے۔ لیکن نفسیاتی تحقیقات کی رو سے وہ بے قصور ہے، پھانسی سے زیادہ اس کے علاج کی ضرورت ہے چنانچہ اس کو مستقل طور پر محبوس کر کے پاگل خانہ بھیج دینا اس کے ساتھ مناسب انصاف ہوگا۔ اس قسم کی اور بھی بہتیری مثالیں دی جا سکتی ہیں جو ثابت کرتی ہیں یا تو جج کے لیئے یہ ضروری قرار دیا جائے کہ وہ نفسیات کا ماہر ہو ورنہ اگر ایسا ناممکن ہو جیسا کہ دراصل ہے۔ کیونکہ ایک ہی شخص بیک وقت قانون اور نفسیات دونوں کا ماہر نہیں ہو سکتا تو ہر عدالت میں ماہرین نفسیات کا تقرر کیا جائے۔

مختلف پاگل خانوں اور دوسری تربیت گاہوں میں مجرمین کا دماغی معائنہ کرنے کے بعد امریکی ماہرین نے پتہ لگایا ہے کہ دماغی کمزوری اور جرم میں بہت قریبی رشتہ ہوتا ہے چنانچہ ایک جیل میں سو مجرمین کا جو چوری، بدمعاشی، اور آوارگی کی بنا پر سزایاب ہوئے تھے۔ دماغی معائنہ کیا گیا، ان میں سے صرف

ایک کو چھوڑ کر بقیہ سبھی دماغی حیثیت سے معمولی آدمی نہیں تھے، اُن میں سے ۴۳ کی ذہنی عمر اپنی اصلی عمر سے تین سے کر چھ سال تک کم تھی، ان کی جسمانی عمر کا اوسط ۱۳ء۸ تھا اور دماغی عمر اس سے تقریباً ۴½ درجہ کم یعنی ۹ء۲ تھی۔

یہ اور اسی قسم کے دوسرے نتائج یہ ثابت کرتے ہیں کہ جرم کے اسباب میں نفسیاتی وجوہات کتنی زبردست اہمیت رکھتی ہیں اور قانون کا یہ رویہ کہ ہر شخص اپنے فعل کا ذمہ دار ہے کس قدر سطحی ہے۔

عورتوں اور بچوں کے جرائم پر ہمیں خاص طور سے غور کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ دماغی امراض ان میں جلد پیدا ہوتے ہیں۔ لہٰذا زناکاری، طلاق، بے رحمی، اغوا، آوارہ گردی کے مقدمات فیصل کرتے وقت منصفین کا فرض ہے کہ حالات کا بغور مطالعہ کریں، کیونکہ عام طور سے یہ جرائم دماغی کمزوری اور دوسری ذہنی علالتوں کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں۔ ذہنی حیثیت سے کم عمر لڑکے اور لڑکیاں اور عورتیں سماج کے لئے کتنی مضر ثابت ہو سکتی ہیں، اس کا اندازہ پولیس کی رپورٹوں سے ہو سکتا ہے، لڑکیوں اور عورتوں کی ذہنی کمزوری کا پتہ اس وجہ سے کم چلتا ہے کہ وہ ایسے پیشے اختیار کرتی ہیں جن میں دماغی قابلیت کی کمی بیشی کا اندازہ نہیں ہوتا، چنانچہ اگر دماغی معائنہ کیا جائے تو بیشتر بدکار لڑکیاں اور عورتیں مختلف علالتوں میں مبتلا پائی جائیں گی۔ ایسی لڑکیاں اکثر یا تو پیشہ کرنے لگتی ہیں یا دوسری بری عادات کا شکار ہو جاتی ہیں، یہی حال لڑکوں کا ہے۔ لڑکوں میں جنسی مجرموں کی بڑی تعداد یقیناً دماغی حیثیت سے کم عمری کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ایل وائیسی ہالنگ ورتھ نامی ایک امریکی ماہر نفسیات نے بھی اسی قسم کے اعداد و شمار دیئے ہیں، اُن سے پتہ چلتا ہے کہ دماغی کم عمری کے باعث عموماً جنسی جرائم سرزد ہوتے ہیں۔

مجرموں کی ذہانت کے امتحانات سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کی ذہنی عمر مختلف جرائم کی نوعیت سے مختلف ہوتی ہے مثلاً جعل سازی کے مجرمین عام طور سے اور مجرموں کے مقابلے میں زیادہ ذہین و طباع ہوا کرتے ہیں۔ لیکن تقریباً نصف یا نصف سے زیادہ جنسی جرائم کے مرتکبین غبی اور ذہنی حیثیت سے کمزور ہوتے ہیں، تاہم بعض ماہرین کے تجربات شاہد ہیں کہ اکثر مجرمین ذہنی طور سے بالکل طبعی حیثیت رکھتے ہیں
بہر حال ان تمام متضاد باتوں کو ملا کر یکجا غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہر جرم دماغی کمزوری کا نتیجہ نہیں ہوتا کیونکہ اکثر مرد اور عورتیں جو سادہ زندگی بسر کرتی ہیں، باوجود کمزور دماغی کے جرم کی طرف مائل نہیں ہوتیں۔ اس سلسلے میں نیویارک اسٹیٹ کمیشن فار مینٹل ڈیفکٹوز کی رپورٹ کافی دلچسپ ہے۔ اس کمیشن کی تحقیقات سے یہ ثابت ہوا کہ پوری آبادی میں سے تقریباً ½ فی صدی افراد دماغی حیثیت سے کمزور کہے جا سکتے ہیں۔ ان افراد کو یقیناً مجرم بننے سے روکا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ ابتدائی عمر میں ان کی ذہنی کمزوری کا پتہ لگا لیا جائے، چنانچہ اکثریت کو ایسے دماغی ہسپتالوں میں رکھا جا سکتا ہے جہاں اِن کا مناسب علاج کیا جا سکے اور بقیہ نسبتاً بہتر لوگوں کو اُن کے گھر ہی پر مناسب نگرانی میں رکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس طرح سے قبل اس کے کہ وہ مجرم بن سکیں اُن کے مختلف درجات قائم کر کے علاج اور مناسب تربیت دینی شروع کی جا سکتی ہے۔

اس مسئلہ میں اسکول اور کالج کافی مدد دے سکتے ہیں، کیونکہ طالب علموں کا ذہنی معائنہ کر کے اور ان کے روزمرہ کے کام کے مطابق اِن کو یکجا کر کے علیحدہ تعلیم دی جا سکتی ہے۔ ہمارے ملک میں تو ابھی واقعتاً نفسیات کے محکمے کا وجود ہی نہیں ہے لہٰذا اس کی سخت ضرورت ہے کہ تقریباً ہر یونیورسٹی اور کالج اپنے اپنے نفسیاتی محکمہ جات کھولیں اور اس کام کو جلد سے جلد شروع کر دیا جائے، کیونکہ ملک میں جرائم کی روز افزوں ترقی کو روکنے کا یہ ایک بہترین ذریعہ ہو سکتا ہے۔

ہیلے نامی ایک مشہور ماہر نفسیات نے ایک مرتبہ ۸۲۳ مجرمین کا دماغی معائنہ کیا اور ان کے سارے حالات دریافت کئے تو اُسے معلوم ہوا ان میں سے زیادہ تعداد تو دماغی حیثیت سے کمزور لوگوں کی تھی لیکن اس کے بعد دوسرا نمبر ایسے لوگوں کا تھا جن کے گھر کا ماحول خراب تھا۔ گھر کے ماحول کی خرابی کے علاوہ آب و ہوا جغرافیائی حالات کے اعتبار سے ملک کی طبعی حالت، موسم اور وقت کی تبدیلیاں بھی جرم کے ارتکاب سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ گرمی کے موسم میں مارپیٹ، جھگڑے فساد اور دوسری قسم کی لڑائیاں عام رہتی ہیں۔ دماغی مریض بھی اس موسم میں زیادہ تشدد پر اُتر آتے ہیں۔ چنانچہ میں ایک صاحب کو جانتا ہوں جن کا مرض ہر گرمی کے شروع ہوتے ہی شدت اختیار کر لیتا ہے اور وہ پھر اس عالم میں بقول خود ہر وقت پستول لے کر لوگوں کو مارنے کی فکر میں مستعد نظر آتے ہیں لیکن برسات کے آتے ہی مرض کی شدت میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سردی کے موسم میں بھی کھانے پینے کا سامان غائب کرنے اور کپڑے وغیرہ کی چوریاں مستقل طور سے شروع ہو جاتی ہیں جاڑے کی لمبی راتیں بھی ویسے چوری کے لئے کافی مفید ثابت ہوتی ہیں۔ راتوں کے علاوہ موسم کی اچھائی بھی اکثر جرائم کی ترغیب دینے کا باعث ہوتی ہے، کیونکہ اس وقت جسمانی توانائی بڑھ جاتی ہے اور پھر اپنے اظہار کا مناسب طریقہ نہ پا کر جرم کی طرف مائل ہو جاتی ہے شاعر صاحبان اکثر اچھے موسم میں گناہ کی لذت محسوس کرنے لگتے ہیں اور خود ہی نہیں بلکہ اوروں کو ترغیب بھی دیتے ہیں۔

ایسے میں گر گناہ نہ کرتا گناہ تھا

لیکن یہ ذوق گناہ تو ایسا ہے جس کی پیدائش افزائش اور اشاعت سوسائٹی کے لئے مضر ہونے کے بجائے مفید سمجھی جاتی ہے اس لئے پولیس کو گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ان تمام باتوں سے ہم کو بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ جرائم کے انسداد کے لئے نفسیات کا استعمال کس قدر ضروری حیثیت رکھتا ہے۔

دو کتابیں

(بسلسلہ صفحہ ۲)

اور حسن کاری کا مرقع ہے جس میں مستند اور واضح خیالات پیش کئے گئے ہیں۔

بعد کے آٹھ مزاحیہ اور طنزیہ مضامین اپنی سنجیدہ ظرافت اور متوازن طنز کی وجہ سے ممتاز نظر آتے ہیں لیکن ان میں وہ زور نہیں جو مزاح کی صورت میں ہنسنے پر اور طنز کی صورت میں تیر کھانے یا تیر کھلتے دیکھ کر مسکرانے پر مجبور کرے۔

ڈاکٹر عابد حسین کی نثر نگاری کی سب سے بڑی خصوصیت سادگی اور پرکاری کا میل ہے، کوئی جملہ اور کوئی فقرہ الجھا ہوا نہیں، ہر چیز صاف ستھری اور رواں دواں ہے جیسے کوئی گہری ندی صاف شفاف پانی کے ساتھ متانت سے بہتی چلی جا رہی ہو۔ فلسفیانہ انداز نظر رکھنے والوں کے یہاں جو پیچیدگی نظر آتی ہے اُس کا شائبہ تک ڈاکٹر عابد حسین کی تحریروں میں نہیں ملتا مشکل سے مشکل مقام بھی ان کے قلم سے سلجھ کر نکلتا ہے سنجیدہ نثر میں سادگی اور رنگینی کا یہ میل بڑی علمی اور ذہنی ریاضت کے بعد حاصل ہو سکتا ہے ڈاکٹر سید عابد حسین نے ہمیشہ ذہنی ایمانداری اور خلوص کے اشارے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے یہاں نہ مبالغہ ہے نہ تنگ دلی، نہ خیال آرائی ہے نہ خشکی۔ ان کی نثر نگاری کے لئے سادگی، شگفتگی توازن اور گہرائی کے لفظ استعمال کئے جا سکتے ہیں۔

ذمہ دارانہ مخالفت

(بسلسلہ صفحہ ۳)

ضم کر کے ترقی کا قدم اُٹھایا ہے۔ زیادہ اخلاقی جرأت اور اخلاقی ذمہ داری کا ثبوت شری جے پرکاش نرائن نے اس بات سے دیا کہ یوپی اور مدراس کے ڈسٹرکٹ بورڈوں میں سوشلسٹ پارٹی کی ناکامی کے دھبے کو مٹانے کے لئے انھوں نے کسی حیلے اور بہانے کا سہارا نہیں لیا۔ انھوں نے اس الزام کی پرزور تردید کی کہ کانگریسی حکومتوں نے عام طور پر انتخابات میں دست اندازی کر کے اور بے جا دباؤ ڈال کر سوشلسٹ پارٹی کے اُمیدواروں کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے صاف صاف اقرار کیا کہ پارٹی کی ناکامی کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس کی تنظیم کمزور ہے اور ابھی تک عوام کو خصوصاً کسانوں کو اپنی پالیسی اور پروگرام اچھی طرح نہیں سمجھا سکی۔

ہندوستان کی خوش قسمتی ہے کہ اس طوفانِ بے تمیزی میں جو آزادی کے بعد ہماری سیاست میں برپا ہو گیا ہے ایک صحت مند اور ذمہ دار حزب مخالف پیدا ہو رہا ہے جو جمہوریت کی کشتی کے لئے لنگر کا کام دے گا۔

کسانوں کے لئے برف خانے

ڈی، ایس، سکسینہ

(ڈی، ایس سکسینہ صاحب ایک پرجوش اور مخلص نوجوان ہیں، جنھوں نے تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لیا تھا اور اب امریکہ سے برف خانے کی صنعت میں مہارت حاصل کرکے آئے ہیں۔ اور آج کل علی گڈھ کے ایک کارخانے میں کام کر رہے ہیں۔ وہ اس صنعت کو سارے ملک خصوصاً دیہات میں پھیلانے کو اپنی زندگی کا مشن سمجھتے ہیں اگر نئی روشنی کے پڑھنے والوں میں سے کوئی صاحب ان سے اس بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہیں تو برف خانہ علی گڈھ کے پتے سے خط و کتابت کریں۔)

ریاستہائے متحدہ امریکہ اور کینیڈا کے وسیع علاقوں میں کسانوں اور دوسرے لوگوں کو جو برف خانوں سے کام لیتے ہیں، روپے اور وقت کی بڑی کفایت ہوتی ہے اور وہ بڑی پریشانی سے بچ جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ تھوڑے تھوڑے دور پر مشترک برف خانے موجود ہیں جہاں وہ آسانی سے اپنی چیزیں پہنچا سکتے ہیں۔ ہمیں بھی اس سے سبق لینا چاہیئے اور اگر ہوسکے تو سارے ملک میں برف خانوں کا جال بچھا دینا چاہیئے۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ ہمارے ملک میں صرف ذخیرہ کرنے کا مناسب انتظام نہ ہونے کی وجہ سے اتنی غذا ضائع ہوتی ہے جو چار کروڑ اسی لاکھ آدمیوں کے لئے سال بھر کو کافی ہو۔ اس کے علاوہ اس کی بچی کچی غذا اور طرح طرح سے برباد ہوجاتی ہے۔ اگر غذا کو برف خانوں میں رکھنے کا مناسب انتظام ہو تو نہ صرف ہماری صحت میں ترقی اور کارکردگی میں اضافہ ہوگا بلکہ ہمارے پاس فاضل غذا محفوظ رہے گی جسے ہم ان سالوں میں جب فصل اچھی نہ ہو استعمال کرسکیں گے یا باہر بھیج کر اس کے بدلے اپنی ضروریات کی چیزیں یا خدمات حاصل کرسکیں گے۔

ہمارے ملک میں آج کل شاید عام رجحان یہ ہے کہ سب صنعتوں کو ایک جگہ جمع کردیا جائے۔ برف خانوں کی صنعت کا بھی یہی رخ معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً صوبۂ متحدہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس میں برف خانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ ان کی مجموعی سمائی اتنی ہے کہ ۹۰۰۶ من آلو ذخیرہ کئے جاسکتے ہیں مگر ان میں سے صرف ایک فرخ آباد میں ۵۳۲۰ من کی سمائی کے برف خانے ہیں یعنی کل صوبے کی سمائی کا چوتھائی سے زیادہ ایک جگہ جمع ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پہلے کے مقابلے میں جب کہ بیج کو محفوظ رکھنے کا کوئی انتظام تھا ہی نہیں یہ اچھی خاصی ترقی ہے۔ مگر صنعت کی نشو ونما کا رخ غلط ہے۔ اس لئے کہ ان بڑے برف خانوں میں جو بڑے شہروں کے اندر ہیں پھلوں اور ترکاریوں کا ذخیرہ غذا کے طور پر ہونا چاہیئے۔ ان سے بیج کے ذخیروں کا کام نہیں لینا چاہیئے۔ موجودہ منصوبہ بندی کو کسی طرح صحیح تسلیم نہیں کیا جاسکتا اس سے آلو کی تقسیم صوبے میں ناہموار ہوگی اور دیہات کو برف خانے کی صنعت سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ملے گا۔

دیہات میں ذخیرہ کرنے کا انتظام نہ ہونا اس صنعت کی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ موجودہ صورت یہ ہے کہ آلو جو دیہات میں پیدا ہوتا ہے شہروں میں ذخیرہ کرنے کے لئے لایا جاتا ہے اور پھر جب بونے کا وقت آتا ہے تو اسے دیہات میں لے جانا پڑتا ہے ایک تو یہ خواہ مخواہ بوجھ کا ادھر سے ادھر، اور ادھر سے ادھر ڈھونا۔ دوسرے ڈھونے کا ذریعہ بار آور وقت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سا بیج برباد ہوجاتا ہے، عام طور پر کسی کو اس کا پتہ بھی نہیں چلتا، مگر پیداوار کی مجموعی مقدار پر اس کا صریحی اثر پڑتا ہے۔

پھر بیج والوں کے منافع کا سوال ہے۔ موجودہ حالت میں دیہاتیوں کو اپنا آلو سستے سے سستا بیچنا پڑتا ہے، اور پھر بیج کے لئے مہنگے سے مہنگا خریدنا پڑتا ہے

ہمارے خیال میں ان سب باتوں سے بچنے کا طریقہ یہی ہے کہ دیہات میں چھوٹے چھوٹے برف خانے کھولے جائیں۔ جن کی سمائی اتنی ہو کہ ایک گاؤں یا آس پاس کے دو تین گاؤں کا آلو بیج کے لئے ذخیرہ کرسکیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے برف خانے اتنے ہی اچھے ہوں گے جتنے بڑے برف خانے اور ان کی قیمت اتنی کم ہوگی کہ گاؤں والے انھیں خرید سکیں۔

سب سے آسان ترکیب یہ ہے کہ ہائیڈرو الکٹرک والوں سے اتحاد عمل کی درخواست کی جائے اور ہر ٹیوب ویل کے ساتھ ایک ایک برف خانہ کھول دیا جائے۔ اس میں اتنے فائدے ہیں:

۱۔ بجلی کی طاقت میسر ہوگی۔

۲۔ شروع میں اگر ٹیوب ویل چلانے والے کو تھوڑا تھوڑا معاوضہ دے دیا جائے تو وہ برف خانے کی دیکھ بھال بھی کرتا رہے گا۔

۳۔ کسانوں سے میل جول میں بڑی آسانی ہوگی۔

۴۔ جگہ بہت مناسب رہے گی۔

ایک سال کے اندر اندر ہم ان ضلعوں میں جہاں ٹیوب ویل ہیں برف خانوں کا ایک جال پھیلا سکتے ہیں۔ اس طرح ہم کو کسانوں سے قریبی تعلقات پیدا کرنے کا موقع ملے گا۔ ان کا مال کو لانے لے جانے کا خرچ بچ جائے گا۔ سستے بیج کی وجہ سے ان کی آمدنی میں معقول اضافہ ہوجائے گا۔

اگر یہ برف خانے کامیاب ہوں تو پھر ہم ان میں اور کمرے کا اضافہ کرکے، دوسری مقامی پیداوار مثلاً آم، امرود، کیلے، ترکاریاں، انڈے، پنیر وغیرہ کو ذخیرہ کرسکتے ہیں۔ اس طرح کسانوں کے خوشحالی میں اچھا خاصا اضافہ ہوجائے گا اور پھر غذا کے مسئلے کو جو آج ہمارے ملک کا سب سے اہم مسئلہ سمجھا جاتا ہے، حل کرنے میں بہت بڑی مدد ملے گی کوئی شخص جس میں حب وطن کا ذرا سا شائبہ بھی ہے اس تجویز کی اہمیت سے انکار نہیں کرسکتا۔

ذیل کے نقشے سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ ۲۰۰ من کی سمائی کا ایک برف خانہ آلو کے بیج ذخیرہ کرنے کے لئے کتنے میں تیار ہوسکتا ہے۔

کمرے کا سائز - ۱۲ × ۱۵ × ۱۵ فٹ

دیواریں - ۱۸ انچ اینٹ + ۴ انچ کارک + آدھ انچ سیمنٹ پلاسٹر۔

فرش - ۴ انچ کنکریٹ + ۴ انچ کارک + ۳ انچ کنکریٹ۔

چھت - ۱½ انچ لکڑی + ۶ انچ کارک۔

سامان	۵۵۰۰ روپے
ٹھنڈے کا پائپنگ اور نمی کنٹرول	۱۰۰۰ 〃
انسولیشن اور دروازہ	۳۵۰۰ 〃
عمارت	۱۲۰۰۰ 〃
لگانے کا خرچ	۳۰۰۰ 〃
	[illegible] 〃

عمارت کا خاکہ

۲۵'

برف خانہ

۱۵'

شیڈ کے لئے کمرہ

۲۰'

اسکیل ایک انچ = ۱۵ فٹ

کباڑی

سید سخی حسن نقوی

(......... چرب زبانی کباڑی کے کردار کا ایک اہم جزو ہے، جس کے بغیر کامیاب کباڑی بننا ناممکن ہے۔ چالاک کباڑی کی زبان ہمیشہ قینچی کی طرح چلتی ہے۔ چیزوں کی تعریف پر آئے گا تو زبان اس سے دو ہاتھ آگے چلے گی......... اگرچہ مال کی تعریف میں وہ کمزوری اور حضرت نوح دونوں کو نیچا دکھا دیتا ہے۔ لیکن گاہک پر مال خریدنے کے لئے کبھی زور نہیں دیتا جیسے اسے کچھ پروا نہیں چاہے خریدو، چاہے مت خریدو.........)

فالسکی کمی اور کرنسی کے پھیلاؤ سے ہندوستان ان دنوں جس اقتصادی بحران سے گذر رہا ہے اس کا کچھ نہ کچھ اثر عملی قدر پر اب جیسا کی ہر فرد نے محسوس کیا ہے "بہت سا کاغذ اور بہت سا افلاس ایک ساتھ پایا جاسکتا ہے" یہ الفاظ انیسویں صدی میں واشنگٹن ارونگ کی زبان سے نکلے تھے، لیکن مادر وطن پر من وعن آج بھی صادق آ رہے ہیں عہد مغلیہ میں آنا پیسے کا سوا سیر اور گھی پیسے کا چھٹانک بکا کرتا۔ یہ باتیں ہمارے لئے قصہ پارینہ بن چکی ہیں۔ آج کل پورا سوا سیر آٹا آٹھ آنے میں اور چھٹانک گھی روپے میں بھی میسر نہیں۔ خدا بھلا کرے بناسپتی گھی اور کنٹرول آٹے جارج سٹکنس کا جس نے موجودہ نسل کی توانائی اور صحت کے لئے یہ نیک کام کیا۔ اختیا فاقے کرتے کرتے تھک جاتی ہے۔ مگر دماغ اسکیمیں چلتے بنانے نہیں تھکتے۔ سوچتی ہے بس کھانا شروع کردے۔ مگر گئے گئی کے کساد سے چارہ بھی مہنگا ہوگیا اور اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ لوگ گلستی کے ساتھ بچہ کشی کا اقدام کریں اور دختر کشی جیسی دیرینہ اور مقدس رسوم کو پھر سے زندہ کرلیں اور اس سے بھی کام نہ چلے تو خود کشی پر آمادہ ہوجائیں، بغاوت کریں، جیل جائیں۔ یا ان باتوں کے لئے ہمت نہ ہو تو پھر کباڑی کی دکان کھول بیٹھیں اور ہوسکے تو کسی بڑے آدمی سے اس کا افتتاح کرالیں۔

کسی چھوٹے آدمی کا کباڑی کی دکان کھولنا، اور کسی بڑے آدمی کا اس کی رسم افتتاح انجام دینا، بشرطیکہ احساس کمتری موجود نہ ہو، کوئی ذلت کی بات نہیں ہے۔ اگر سلیقے کے ساتھ کیا جائے تو ہر کام اعلیٰ درجے اور ہر پیشہ بلند حیثیت اختیار کرلیتا ہے۔ دنیا میں کتنے آدمی ہیں جو کباڑی کی دوکان رکھتے ہوئے بھی کباڑیت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ کباڑیت کا عنصر تھوڑا بہت ہر جگہ پایا جاتا ہے، ریل میں، جیل میں، تھانہ تحصیل میں، سرکاری دفتروں میں، مکتب خانہ میں، عالی شان کوٹھیوں میں، فینسی بند کالونوں میں ڈالمیا اور برلا کے کارخانوں میں، زندگی کے ہر شعبہ میں، دنیا کے ہر گوشہ میں، حتی کہ شاعر کے کلام میں اخباروں کے لیڈر میں، لیڈروں کی تقریروں میں کس جگہ کباڑ نہیں ملتا! پانچوں انگلیوں کی طرح غزل کے سب اشعار یکساں طور پر اچھے نہیں ہوتے۔ دس پانچ قطعی عمدہ تو دو چار کباڑ خانے کے لئے ضرور ہوتے ہیں اور مشاعروں میں خاصی داد حاصل کرلیتے ہیں۔ اسی طرح جن لیڈروں کو تقریر کا دورہ پڑتا رہتا ہے کبھی کبھی جذبات سے متاثر ہوکر ایسی بھی باتیں کہہ ڈالتے ہیں جو کباڑی بازار میں ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہیں اور "یو، این، او" میں جوتیوں میں دال بٹوا دیتی ہیں۔

بعض لوگ پیدائشی شاعر ہوتے ہیں یا پیدائشی لیڈر یا پیدائشی جنرل، لیکن کوئی کباڑی کبھی پیدائشی کباڑی نہیں ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں پیشے نسلاً بعد نسل چلتے ہیں اور جس کا باپ بڑھئی ہے وہ بڑھئی اور جس کا لوہار ہے وہ لوہار بن جاتا ہے۔ اکثر اوقات ڈاکٹر کا بیٹا حکیم، وکیل کا بیٹا مختار اور ماسٹر کا بیٹا منشی ضرور بن جاتا ہے لیکن کباڑی کے لئے یہ ضروری نہیں۔ کباڑی کا نہ باپ کباڑی ہوتا ہے نہ بیٹا۔ بلکہ ابتدا میں تو وہ خود بھی کباڑی نہیں ہوتا اور جب کباڑی بننے کا فیصلہ کرلیتا ہے تو اول اناڑی اور بہت سا تجربہ حاصل کرنے کے بعد کھلاڑی کے درجے پر پہنچتا ہے۔ کسی کباڑی کو آج تک یہ نہیں دیکھا گیا کہ اس نے بحیثیت کباڑی کے اپنی تجارت کی ابتدا کی ہو۔ کباڑی تانگہ اور ٹھیلہ والوں کی طرح دوسری شاہراہیں طے کرکے مختلف کاروبار میں اچھی طرح قسمت آزمائی کرکے، ساری دنیا کا چکر کاٹنے کے بعد، "زمین گول ہے" کا عملی ثبوت دیتا ہوا کباڑی کی منزل پر آکر ٹکتا ہے اور کباڑی ہوتے ہوئے بھی کبھی کئی دھندے چلاتا رہتا ہے

ہر کباڑی بیک وقت کباڑی بھی ہوسکتا ہے اور حجام بھی یا کباڑی بھی اور لوہار بھی۔ اگر آپ کو کسی ایسے حجام سے بال بنوانے کا اتفاق ہو جو بدقسمتی سے کباڑی بھی ہے تو یقین کیجئے آپ کی خوب خوب حجامت بن جائے گی۔ کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ حجام کباڑی جن کا بنیادی پیشہ "حجامت" اور ثانوی "کباڑیت" ہوتا ہے وہ عام طور پر کباڑ کے گاہک کو حجامت کے گاہک پر ترجیح دیتے ہیں۔ کتنے سر ادھورے کتنی ڈاڑھیاں بے منڈی اور کتنے بال بے بنے چھوڑ دئے جاتے ہیں۔ گاہک بے چارہ اپنی نصف ڈاڑھی منڈوائے بیٹھا ہے اور کباڑی صاحب ٹھاٹھ سے کباڑ خانے میں سودا چکا رہے ہیں۔ اگر کباڑی کا بنیادی پیشہ لوہار ہے تو جان لیجئے آپ کے مکان پر سب خیریت ہے۔ شہر کے چوروں اور اچکوں کو زہر سے ہلاک کردیا گیا، پولیس کا محکمہ توڑ دیا گیا۔ تالے کنڈی سے بے خبر رات کو پاؤں پھیلا کر سویئے اور رات بھر خراٹے لیجئے۔ کیونکہ آپ دیکھیں اگر آپ بزاز بنئے یا بساطی کی دکان پر جائیں اور وہ موجود نہ ہوں اور دوکان داری کے اوقات میں دوکان سے غائب ہوجائیں تو ان کی تجارت ٹھپ ہوجائے اور وہ تباہ ہوجائیں۔ بخلاف اس کے کباڑی اگر غائب رہے تو کچھ نقصان نہیں کیونکہ جب وہ نئے نئے الو کی تلاش میں نئے نئے شکار پھانسنے کی جستجو میں، چیزوں کی قیمت اصلی قیمت سے کم دے کر مال خریدنے کی فکر میں سرگرداں پھرتا ہے تو اس کا کباڑ گاہکوں کے استقبال کے لئے موجود رہتا ہے اور اگر دوکان خالی پڑی رہے تو بھی کسی کی مجال نہیں ہوتی کہ اس پر ٹیڑھی نظر ڈال سکے اور کوئی چیز اٹھا کر چمپت ہوجائے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ قیمت کے لحاظ سے تمام چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ جوہری کی دوکان پر مسلح سپاہی کی نگرانی میں رکھی جاسکیں۔

کباڑی کے لئے کاہل ہونا بھی ضروری ہے آپ چاہیں کسی چھوٹے موٹے شہر میں کباڑی کی دوکان کھول لیں تو یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ آپ تھوڑے بہت کاہل نہ ہوں اور "ٹال مٹول وقت کی چور ہے" کے قائل نہ ہوں۔ علیٰ ہذا جو کاہل ہیں ان کے لئے بہترین مشورہ یہ ہے کہ بے سوچے سمجھے فوراً کباڑی بن جائیں۔ ایسے لوگوں میں جو لاپروا، نکمے، لاابالی اور بے کار ہوں اور کاروبار سے کوئی خاص مس نہ رکھتے ہوں اچھے قسم کے کباڑی نکل سکتے ہیں۔ کباڑی کا نعرہ ہوتا ہے "میں سب کچھ کرسکتا ہوں سوائے کام کے"۔

چرب زبانی کباڑی کے کردار کا ایک اہم جزو ہے جس کے بغیر کامیاب کباڑی بننا ناممکن ہے۔ چالاک کباڑی کی زبان ہمیشہ قینچی کی طرح چلتی ہے۔ چیزوں کی تعریف پر آئے گا تو زبان اس سے دو ہاتھ آگے چلے گی۔ تعریفوں کا طوفان ایکسپرس ایسا چھوٹے گا

ڈاکٹر سید حسین

مُشتاق احمدؔ

مصر میں ہند کے سفیر ڈاکٹر سید حسین عجیب گوناگوں شخصیت کے مالک تھے۔ اگر ذہنی ایمان داری ایک ڈپلومیٹ کی امتیازی شان سمجھی جاسکتی ہے تو ڈاکٹر سید حسین کا دنیا کے چوٹی کے مدبروں میں شمار ہو سکتا ہے۔ دیانتداری اور حق پرستی میں ڈوبے شل تھے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا اور پھر اپنے فیصلے پر پہاڑ کی طرح اٹل رہنا اپنے مقصد میں کامیابی کی پوری امید رکھنا نتائج کی پروا کئے بغیر اصول کی حمایت میں جان لڑا دینا یہ تھی سید حسین کی شخصیت۔

گفتگو میں کبھی وہ شیریں کلامی اور حلاوت کہ ذہن مدتوں اس کے مزے لیتا رہے کبھی وہ غضب کا کھراپن۔ وہ دو ٹوک جواب کہ مخاطب ان سے بات کر کے پچھتائے جہاں موسم کی دل آویزی اور اسی طرح کے بے ضرر مسائل زیر بحث ہوتے۔ ڈاکٹر سید حسین کی لچھے دار گفتگو کے آگے بڑے بڑے قصہ گو کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے، لیکن جہاں بنیادی اصول اور مقاصد کا سوال آتا تھا وہاں نادلیں کرنا، سمجھوتہ کرنا، اصول اور مقاصد کو خوش خلقی پر قربان کر دینا، سید حسین نے سیکھا ہی نہ تھا، وہاں تو بس منہ توڑ جواب تھا۔ ادھر یا اُدھر۔ مخالف اگر خود غرضی یا اوچھاپن دکھاتا تو سید حسین اس کا منہ نوچ لیتے تھے۔

ڈاکٹر سید حسین ایسے مدبر نہ تھے جو بین الاقوامی عدالت معمولی نفع و سود کے لئے معاملہ کریں۔ لیکن ساتھ ہی اپنے ملک کا مطالبہ واضح کرنے کی بے پناہ قوت رکھتے تھے یہ ناممکن تھا کہ ہندوستان کے پیغام کی کوئی غلط ترجمانی کرے۔ یہ ان کی قوت برداشت سے باہر تھا

اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس باقاعدہ تقرر سے کہیں پہلے ڈاکٹر سید حسین ہندوستان کے غیر سرکاری سفیر تھے، مصر، ترکی، عراق، لبنان اور شام میں آزاد ہند کا پہلا سفیر وہی شخص تھا جو امریکہ میں غلام ہندوستان کے سفیر کی حیثیت سے ۲۵ برس تک ان تھک کام کرتا رہا تھا۔ امریکن پبلک کو ہند کے مطالبہ آزادی سے روشناس کرتے رہنا ہند برطانیہ کے پروپیگنڈے مسکت جواب دیتے رہنا ۲۵ برس تک ڈاکٹر سید حسین کا یہی کام تھا۔ ڈاکٹر سید حسین اپنے اس کام میں تھکنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے جب آزادی کی لڑائی ختم ہو گئی تو اس ملک کا پیغام جس کی انھوں نے مدتوں خدمت کی تھی عرب ممالک میں پہنچانے کا بوجھ بھی انہی کے کندھوں پر ڈالا گیا۔

کیا وطن میں کیا وطن سے باہر ڈاکٹر سید حسین ہمیشہ ایک سپاہی تھے۔ آزادی وطن کی راہ میں لڑتے رہنا اور تھکنے کا نام نہ لینا ہی اس سپاہی کی زندگی کا مقصد تھا۔ انگلستان سے تعلیم ختم کر کے جب یہ ہندوستان پہنچے تو اپنے کو اسی دم ہند کی آزادی کی لڑائی میں جھونک دیا جن دنوں انڈین ہوم رول لیگ کے جھنڈے کے نیچے لڑی جا رہی تھی ۱۹۱۶ء میں یہ بمبئی کرانیکل کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں تھے۔ جس کے ایڈیٹر بی جی ہارنیمن جیسے شہرۂ آفاق شخص تھے۔

نوجوان ڈاکٹر سید حسین کی وطن پرستی نے پنڈت جواہر لال نہرو کے والد پنڈت موتی لال نہرو کا دل موہ لیا۔ وہ انھیں الہ آباد لے گئے اور اپنے مشہور اخبار انڈیپنڈنٹ کی ادارت ان کے سپرد کی۔ سید حسین نے جرنلسٹ بن کر عملی سیاست کو نہیں چھوڑا بلکہ اس میدان میں بھی پیش پیش رہے چنانچہ مولانا محمد علی مرحوم کے ساتھ خلافت وفد کے ایک ممبر کی حیثیت سے یہ بھی انگلستان گئے

اس کے بعد مہاتما گاندھی نے نان کوآپریشن اور خلافت کی تحریک شروع کی، اور سید حسین انگلستان سے امریکہ پہنچے، تاکہ اس جہان دلیس کو ہندوستان کی جنگ آزادی کا مطلب سمجھائیں اور اسے اپنا ہمدرد بنائیں۔

سید حسین کے امریکہ کے طویل قیام کا صرف ایک مقصد تھا —— ہندوستان کی جنگ آزادی کو ہندوستان سے باہر لڑیں۔ یہ لڑائی برابر کی نہ تھی۔ حالات ان کے خلاف تھے اور دشمن زبردست، سلطنت برطانیہ کا پورا محکمہ خارجہ ان کے اور انھی جیسے چند ہندوستانیوں کے پیچھے لگا دیا گیا۔ ان غریبوں کے پاس اپنے ملک کی آزادی کی اُمید اور اس پر ایمان کامل کے علاوہ اس زبردست فوج سے مقابلہ کرنے کے لئے کوئی اور ہتھیار نہ تھا۔

موصوف نے اہل امریکہ ہندوستان کی جنگ آزادی کا مقصد سمجھانے کے علاوہ اس کی عظیم الشان تہذیب و تمدن سے بھی روشناس کرایا۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے امریکہ کی کوئی ۳۰ بڑی یونیورسٹیوں میں تقریریں کیں

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

NAI RASHNI

DELHI

جلد ۳ | نمبر ۱۶ | ۲۷ر اکتوبر سنہ ۴۹ء | ایڈیٹر :- ڈاکٹر سید عابد حسین

سائنس کے بچپن کے کھلونے

(اب سے سو سال پہلے سائنس کو یکایک یہ احساس ہوا کہ اس نے بچپن سے گذر کر بلوغ کی حد میں قدم رکھا ہے بہت سی نئی نئی چیزیں ایجاد ہوئیں جنھیں دیکھ کر لوگ سائنس کی معجز نمائی پر سر دھنتے تھے مگر آگے چل کر اُن میں سے بہت سی چیزیں بچوں کا کھیل ثابت ہوئیں۔ نمونے کے طور پر چند ایجادوں کا ذکر سنئے جن پر آپ کو ہنسی آئے گی۔ کیا عجب ہے کہ سو سال بعد دنیا (اگر ایٹم بم کی ہلاکت سے بچ گئی) ان ایجادوں کو بھی جن پر ہم آج ہم فخر کرتے ہیں محض ہنسنے اور دل بہلانے کی چیزیں سمجھے۔)

[illegible] میں دنیا میں ایجاد و اختراع کی لہر بڑے زور شور سے اُٹھی تھی، منتشر دور ڈنکے بجاتا ہوا آن پہنچا تھا۔ لوگ ہر نئی چیز کو نعمت جانتے تھے۔ ہر موجد کو نوع انسانی کا محسن سمجھ کر سر آنکھوں پر بٹھلاتے تھے۔

اس زمانے کی بہت سی ایجادیں کاغذی ناؤ کی طرح تھوڑے دن چل کر رہ گئیں بعض میں واقعی خداداد ذہانت کی جھلک ہوتی تھی مگر ——— بس ایک تماشہ بن کر رہ جاتی تھی۔ بعض محض بے تکی اور بے ہنگم تھیں۔

اکثر موجد محض اس پر قناعت کرتے تھے کہ دوسروں کی ایجادوں میں ذرا سی ترمیم کرلیں مگر یہ ترمیمیں عجیب و غریب ہوتی تھیں۔ ایک فرانسیسی بنجامن فرانکلن کی کتاب کا ترجمہ اپنی زبان میں کر رہا تھا۔ وہ فرانکلن کے برق ربا (LIGHT NING CONDUCTOR) کا حال پڑھ کر اس قدر متاثر ہوا اور اس کے دل میں بجلی گرنے کی ایسی ہیبت بیٹھ گئی کہ اس نے اپنی چھتری میں ایک برق ربا لگا لیا۔ اب یہ حضرت پیرس کی سڑکوں پر اپنی چھتری کی شام میں ایک کلس لگائے پھرا کرتے تھے اور پیچھے پیچھے ایک لمبا سا تار لٹکتا جاتا تھا۔ ان کا خبط اس قدر بڑھ گیا کہ انھوں نے اپنی ریشمی ہیٹ میں ایک موم جامہ لگا لیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ گرجے کے کلس کی طرح اس پر بھی بجلی کا اثر ہو سکتا ہے۔

[illegible] میں ایک انگریز نے ایک جیبی چھتری ایجاد کی۔ اس میں ڈنڈا نہیں تھا بس کپڑا تھا اور تیلیوں کا ڈھانچہ۔ جہاں پانی برسنا شروع ہوا اور اس چھتری کو جیب سے نکال کر سر پر منڈھ لیا۔

ان ہی دنوں سگرٹ پینے کی ایک مشین ایجاد ہوئی تھی جس میں یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ لکھتے یا پڑھتے وقت آنکھوں میں دھواں نہ جانے پائے۔ یہ ایک عینک کی شکل کی چیز تھی جسے ناک پر جما کر کانوں میں اٹکا لیتے تھے۔ بیچ میں ایک ہولڈر لگا تھا جس کے ذریعے سگرٹ ہونٹوں میں لگا رہتا تھا اور ہاتھ خالی رہتے تھے۔ جب سگرٹ پینے سے جی بھر جائے تو سگرٹ کو زبان کی نوک سے ہٹا دیتے تھے اور اطمینان سے سانس لے کر، پانی پی کر، یا باتیں کرکے پھر سگرٹ کو بغیر ہاتھ لگائے زبان کی مدد سے ہونٹوں پر لے آتے تھے۔

ایک صاحب نے کمانی دار جوتے بنائے تھے جن کو پہن کر آدمی اونچائی سے بے کھٹکے کود سکتا تھا، کیا مجال جو ٹانگ ٹوٹ جائے۔

ایک نوع انسانی کے محسن نے گھر والیوں پر رحم کھا کر اُن کے لئے بڑے کام کی چیز نکالی تھی۔ اس نے ایک جھولا کرسی کو بیلن اور رسی کے ذریعے ایک طرف دودھ بلونے کی متھانی سے اور دوسری طرف بچے کے پالنے سے جوڑ دیا تھا۔ گھر والی مزے میں کرسی پر بیٹھی جھولتی تھی اور مکھن بنتی جاتی تھی۔ اُدھر مکھن نکالنے کو اور بچے کو جھولا جھلانے کا کام خود بخود ہوتا جاتا تھا۔

مشہور موجد ایڈیسن نے ایک خاتون کے لیے جو سینے کی مشین پاؤں سے چلاتے چلاتے تھک جاتی تھیں، ایک انوکھی مشین بنائی۔ وہ انسان کی آواز کی لہروں کو قوت محرکہ میں تبدیل کرنے کے تجربے کر چکا تھا۔ اُن سے فائدہ اُٹھا کر اس نے مشین کے ساتھ ایک چھوٹا سا موٹر جوڑ دیا جس میں ایک اس قسم کی چھلنی منڈھی ہوئی چیز لگی تھی جیسے ٹیلیفون یا مائکروفون کا دہانہ۔ یہ آلہ سینے والی کے منہ کے سامنے رہتا تھا اس کا کام بس یہ تھا کہ باتیں کرتی رہے، اس کی آواز کی لہریں موٹر کو حرکت میں لے آتی تھیں اور مشین چلنے لگتی تھی۔

اصولی حیثیت سے تو ایڈیسن کا خیال بالکل ٹھیک تھا، لیکن اس نے اس بات کو مدنظر نہیں رکھا تھا کہ انسان کی آواز میں اُتار چڑھاؤ ہوتا ہے (بقیہ صفحہ ۲ پر)

فہرست مضامین

جس کی وجہ سے مشین کی رفتار بے قاعدہ اور ناہموار رہے گی اور پھر یہ کہ خواتین بھی کبھی نہ کبھی باتیں کرتے کرتے اُکتا جاتی ہیں اور مسلسل زبان چلانے سے بھی اتنی ہی تکان ہوتی ہے جتنی پاؤں چلانے سے۔

ایڈیسن کی ہدایت کے مطابق وہ خاتون آلے کے سامنے شعر خوانی کرتی تھیں یا کوئی کتاب بلند آواز میں پڑھا کرتی تھیں، لیکن تھوڑے ہی دن میں وہ اس سے تنگ آگئیں اور پھر سے اپنی پاؤں کی مشین چلانے لگیں۔

ایک اور سینے کی مشین کوئی ۵۰ سال ہوئے انگلستان میں ایجاد ہوئی تھی اور بعض گھروں میں استعمال بھی ہوئی تھی۔ اس میں پہیے لگے تھے اور ایک چھوٹا سا کتا جوت دیا جاتا تھا جو کولھو کے بیل کی طرح چلتا رہتا تھا، مگر انسداد بے رحمی کی انجمن نے مداخلت کرکے اس مشین کے استعمال کی ممانعت کرا دی۔

بلجیم کے ایک موجد نے اس خیال سے کہ کمرے کی گھٹی ہوئی ہوا سے سر میں درد ہونے لگتا ہے تازہ ہوا لانے کے لئے ایک آلہ لاؤڈ اسپیکر کی شکل کا بنایا تھا اس کا چوڑا سرا پلنگ کے سرہانے رہتا تھا اور پتلا دیوار میں ایک سوراخ میں لگا دیا جاتا تھا اور اس کے ذریعے باہر سے ہوا چھن چھن کر آتی تھی سب سے پہلے تو یہ ایجاد خاصی مقبول ہوئی، مگر کچھ دن کے بعد اس کا فیشن جاتا رہا بہت سے لوگ شکایت کرتے تھے کہ یہ بھونپو جو منہ پھیلائے رات بھر سر پر کھڑا رہتا ہے اس کی وجہ سے بھیانک خواب نظر آتے ہیں اور آدمی گھبرا کر اٹھتا ہے تو اس کا سر بھونپو سے ٹکراتا ہے اور اس چوٹ سے سر میں درد اس سے زیادہ ہوتا ہے جتنا گھٹے ہوئے کمرے میں سونے سے۔

ایک شخص نے ایک پہیہ دار آرام کرسی بنائی تھی۔ اس کے ہتھوں میں دو پنکھے لگے ہوئے تھے اور پہیے بھی آدمی کرسی پر بیٹھتا تھا پنکھے چلنے لگتے تھے۔

کچھ دن پہلے تک ریل کا سفر خاصا خطرناک تھا اکثر گاڑی پٹری سے اتر جاتی تھی یا لڑ جاتی تھی۔ اس سے بچنے کے لئے ایک فرانسیسی نے یہ تجویز سوچی کہ ریل کی شکل کے بہت بڑے بڑے پہیے بنائے جائیں اور ان کے اندر مسافروں کے ڈبے ہوں ان پہیوں کا سلسلہ زمین پر لڑھکتا چلا جائے گا نہ پٹریوں کی ضرورت ہوگی اور نہ گاڑی لڑنے کا خطرہ۔ موجد نے اس اسکیم پر بہت کچھ خرچ کیا اور ٹرین کے نمونے بھی تیار کئے لیکن پیٹنٹ آفس نے اسکیم کو اس اعتراض کے ساتھ نامنظور کر دیا کہ اس میں کھیتوں اور راہ چلتے آدمیوں اور جانوروں کے لئے خطرہ ہے۔ ایک اور فرانسیسی نے اس سے بھی زیادہ اُپج سے کام لیا۔ اس نے یہ حکمت لڑائی کہ ریل گاڑیوں کی چھتوں پر بھی پٹریاں ہوں۔ اگر دو گاڑیوں کا سامنا ہو تو ایک دوسری پر چڑھ جائے اور وہاں سے کود کر پھر پٹری پر چلنے لگے۔

ایک صاحب نے جنھیں تجارت کے سلسلے میں بہت سفر کرنا پڑتا تھا اور ریل میں بیٹھے بیٹھے بدن اکڑ جاتا تھا، اپنے بازوؤں، سر اور گردن کو آرام دینے کے لئے ایک ترکیب نکالی۔ ایک لمبے تکیے سے دو کھونٹے لٹکے رہتے تھے جن میں وہ اپنے بازو ڈال لیتے تھے اسی طرح دو کھونٹے پیچھے ہوتے تھے جو بیچ میں ایک تکیہ لٹکا رہتا تھا اسی پر وہ اپنا سر رکھ لیتے تھے۔ یہ سارا بکھیڑا اسباب رکھنے کے جالی کے مچان میں لٹکا دیا جاتا تھا۔ یہ چیز خاصی مقبول ہوئی اور بڑے پیمانے پر بن کر بکنے لگی۔ ان دنوں براعظم یورپ میں یہ منظر اکثر نظر آتا تھا کہ ایک شخص اسباب رکھنے کے مچان سے آدھا لٹکا ہوا آرام سے سو رہا ہے۔

بھلا یہ کیوں کر ممکن ہے کہ عجیب و غریب ایجادوں کی ذیل میں چوہوں کے مل [illegible] ذکر نہ آئے یہ بات ایک سنکی انگریز ہیٹن نامی کو ایک انوکھی قسم کا کھلونا دیکھ کر سوجھی جو جنگ نپولین کے زمانے میں ایک فرانسیسی قیدی نے بنایا تھا اس شخص نے بے شغلی سے اکتا کر ایک چھوٹا سا گول پہیہ بنایا تھا جو ایک دھرے پر گھومتا تھا۔ اس پہیے میں چوہے کو بند کر دیتا تھا چوہا گھبرا کر دوڑتا تھا، اور جوں جوں اس کی رفتار بڑھتی جاتی تھی، پہیے کے چکر بھی تیز ہوتے جاتے تھے ہیٹن نے اس کھلونے کا غور سے مطالعہ کیا، اور اسے بڑے پیمانے پر بہت بڑی تعداد میں تیار کیا بہت سے گول پہیوں میں اس نے جتنے زیادہ چوہے بھی مل سکے بھر دئے اور پہیوں کو سوت کاتنے کی چرخیوں سے جوڑ دیا۔ تھوڑے دن بعد اس نے اعلان کیا کہ ایک چوہا دن بھر میں ۱۰ میل لمبا تار کات لیتا ہے اور بعض بعض کی کارگزاری تو ۱۵ میل تک پہنچ جاتی ہے مشین بالکل سائنس کے اصولوں پر بنی تھی۔

چوہوں کے ساتھ وہ بہت اچھا سلوک کرتا تھا، انھیں روٹی، پنیر اور شکر کھلاتا تھا۔ رات کو سب چوہوں کو پہیوں سے نکال کر ان کے اصطبل میں سلا دیا کرتا تھا۔ دوپہر کو ان کو ایک گھنٹے کی چھٹی ملتی تھی اور ہفتے میں ۶ دن کام کرنے تھے۔

اس طرح ہر چوہا سال میں ۵۰۰۰ میل تار کاتتا تھا یعنی اتنا اتنا لمبا کہ سارے برطانیہ اور آئرلینڈ کے گرد لپیٹا جا سکے۔

مگر یہ ہیٹن صاحب اپنے مزدوروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کے باوجود محنت کی نفسیات سے واقف نہ تھے۔ انھیں یہ اندازہ نہ تھا کہ اس قسم کے بے لطف کام سے چوہے بھی اکتا جائیں گے۔ ہوا یہ کہ چوہوں کا جوش بہت جلد ٹھنڈا ہو گیا، اور ان کی رفتار دھیمی ہو گئی۔

سال بھر بعد حساب کرنے سے معلوم ہوا کہ ہیٹن صاحب کو بے پیسے کے مزدوروں کے باوجود ان لوگوں کے مقابلے میں جو اجرت دے کر مزدور رکھتے تھے صرف ۱۰ شلنگ کی بچت ہوئی۔

حصہ داروں نے روپیہ واپس لے لیا اور کارخانہ بند ہو گیا۔ اب ہیٹن بیچارے نے اشتہار دیا کہ وہ چوہوں سے کام لینے سے پہلے انھیں باقاعدہ استقلال سے کام کرنے کی تربیت دے گا۔

اس نے ایک بڑا پھرکا جو [illegible] اور ۱۵۰۰۰ چوہوں کے [illegible] سے یقین تھا کہ بہت سے پہیوں [illegible] میل لمبے تار روزانہ کاتنے [illegible] اور خوب نفع ہوگا۔ مگر بیچارہ اس اسکیم کو چلانے نہ پایا تھا کہ موت کا شکار ہو گیا۔

کیا سر کے بالوں کا گرنا

رک سکتا ہے؟

وہ حضرات جن کا سر بالکل صاف ہو چکا ہو اور وہ جن کے بال گرتے رہتے ہیں، ہر سال گرتے ہوئے بالوں کو روکنے کے لئے طرح طرح کی دواؤں پر کروڑوں روپے خرچ کرتے ہیں۔

لیکن علمی تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ بوڑھوں کا ذکر کیا ذکر ہے جوانوں کے گرے ہوئے بال بھی کسی قسم کی مالش، کنگھی، ہیر ٹانک، الٹرا وائلٹ ریز، وٹامن یا مقوی دواؤں کے استعمال سے دوبارہ نہیں اُگ سکتے۔

اگرچہ بال خورے اور اسی قسم کے امراض کا علاج کرنے والے بڑے لمبے چوڑے دعوے کرتے ہیں لیکن حقیقت میں ان میں کوئی طبیب یا سائنس داں نہیں ان میں بس تین ہی صفتیں ہوتی ہیں۔ سر پر بال، بے محنت روپیہ کمانے کا شوق اور کاروبار کا سلیقہ۔

"استعمال سے پہلے" اور "استعمال کے بعد" کی تصویریں جو اشتہاروں میں نظر آتی ہیں، ان لوگوں کی ہوتی ہیں جن کے بال کسی لمبی بیماری یا اعصابی صدمے یا جلدی عارضے کی وجہ سے گر گئے تھے کسی دوا کے استعمال سے نہیں بلکہ قدرتی طور پر خود بخود اُگ آئے۔

ہیر ٹانک سے صرف بال چکنے اور چمکدار ہو جاتے ہیں، اس میں معمولی دوائیں ہوتی ہیں جنھیں ہر شخص جانتا ہے جو بالوں کو اُگانے، [illegible] یا بال جھڑنے کو دور کرنے کے لئے بالکل بے کار ہیں۔

اب سلفا گروپ (SULPHA GROUP) کی دواؤں کا استعمال بال اُگانے کے لئے شروع ہوا ہے اور یہ بہت خطرناک ہیں۔ ان سے اکثر کھجلی ہی [illegible] کرتے ہیں [illegible] کو ان کی عادت ہو جاتی ہے [illegible] کی وجہ سے ان کے استعمال [illegible] اثر نہیں کرتیں۔ وٹامن کے انجکشن جو سر میں لگائے جاتے ہیں اور بھی خطرناک ہوتے ہیں اگرچہ یہ نظریہ بہت مشہور ہے کہ بال خون [illegible] کی وجہ سے ہوتا ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہے کہ معمولی جراثیم کو مارنے والی دوائیں [illegible] کرسکتی ہیں۔ ضرورت ایسی دوا کی ہے جو ان خاص جراثیم کو مار سکے۔

کبھی کبھی مگر بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ سر کی مالش سے

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

۲۴ راکتوبر ۱۹۴۹ء

سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

وزیراعظم جواہر لال نہرو دلوں کی دنیا میں سکندراعظم کی شان سے نئے نئے شہر و دیار فتح کر رہے ہیں اُن کے سفر امریکا کی خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دل کش شخصیت نے واشنگٹن اور نیویارک میں مشرق و مغرب کے باہمی تعصب کے طلسم کو توڑ کر امریکی عوام کے قلوب کو اسی آسانی سے موہ لیا ہے جیسے وہ ہندستانی عوام کے دلوں کو تسخیر کر لیتے ہیں۔ جیسا پر جوش اور شاندار استقبال ان کا ہو رہا ہے ایسا مغرب کے بڑے بڑے قائدوں کا تو ہوا ہوگا مگر کسی مشرقی کا آج تک نہیں ہوا تھا۔ اہل علم کے طبقے نے بھی پنڈت جی کا خیر مقدم بڑے خلوص اور تپاک سے کیا۔ جب کولمبیا یونیورسٹی کے اسپیشل کانووکیشن میں انھیں ایل، ایل۔ ڈی کی اعزازی سند دی جا رہی تھی تو کولمبیا اسکول آف انٹرنیشنل افیرس کے ڈائرکٹر پروفیسر ڈیس نے کہا " پچھلے دو سال میں کولمبیا یونیورسٹی نے بہت سے ممتاز مہمانوں کو لبیک کہا ہے مگر ان میں سے کوئی ہمارے آج کے مہمان سے زیادہ ممتاز اور ہمارے خیر مقدم کا ان سے زیادہ مستحق نہیں تھا" یونیورسٹی کے پرووسٹ پروفیسر البرٹ جیکبس نے پنڈت جی کا تعارف ان الفاظ میں کرایا:-

" پنڈت جواہر لال نہرو آزادی ہند کے جلیل القدر داعی اول کا مرید خاص، حریت کی پرخار راہ میں اپنے ہم وطنوں کا اولوالعزم رہنما، از سر نو زندگی پانے والی قوم کا دانش مند مشیر اور کارساز، ایک عظیم الشان ملک کے لوگوں کے ارادوں اور حوصلوں کا نامور ترجمان جس کی ذہنی قیادت نے مغرب کے گہرے علم کو مشرق کی گراں بہا میراث اور لافانی روایات میں سمو دیا ہے، کمزور قوموں کا حامی و مددگار، جسے عالم گیر امن اور صلح کی سچی لگن کی بدولت ساری نوع انسانی کی تعظیم اور تحسین کی دولت حاصل ہے۔ کولمبیا بڑے فخر کے ساتھ اپنے ایک ممتاز فرزند کی حیثیت سے اس کا خیر مقدم کرتی ہے اور سب سے بڑی عزت جو اس کے اختیار میں ہے بخشتی ہے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی کو اپنے سفر کے سب سے بڑے مقصدوں یعنی ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ہندوستان کی ذہنی اور اخلاقی ساکھ قائم کرنے اور امریکیوں اور ہندوستانیوں میں باہمی دوستی کا احساس پیدا کرنے میں توقع سے زیادہ کامیابی ہو رہی ہے، مگر اس سے ہمیں یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے کہ ہندوستان کی صنعتوں کی ترقی کے لئے بہت بڑے پیمانے پر مالی اور فنی امداد ملنے کی جو امیدیں ہمارے ہاں بہت سے لوگوں نے امریکہ سے باندھ رکھی تھیں وہ پوری ہو جائیں گی، اس قسم کی مدد دینا امریکی عوام اور اہل علم کے اختیار میں نہیں ہے جنھوں نے پنڈت جی کا اس جوش اور خلوص سے استقبال کیا ہے بلکہ امریکی سرمایہ داروں کے ہاتھ میں اور جہاں تک ہم دور سے اندازہ کر سکتے ہیں یہ حضرات پنڈت جی کے خیالات اور ان کی پالسی سے زیادہ خوش نہیں ہوئے، جو اخبارات ان کے نفس ناطقہ سمجھے جاتے ہیں وہ بہت کچھ ظاہرداری سے کام لے رہے ہیں۔ مگر ان کے لہجے سے مایوسی صاف جھلک رہی ہے۔ شاید وہ سمجھ رہے تھے کہ ہندوستان بھی مغربی یورپ کی طرح ان کے سرمائے کا نیازمند بار بردار اور ان کی سیاست کا آلۂ کار بن جائے گا، لیکن پنڈت جی کی مختلف تقریروں خصوصاً ان کے کولمبیا یونیورسٹی کے خطبے سے اُن کے یہ خیالات دھواں بن کر اُڑ گئے ہم میں سے جو لوگ بہت خوش اعتقاد ہیں ان کو بھی یہ خیال دل سے نکال دینا چاہیئے کہ امریکہ کے خداوندانِ دولت ہندوستان میں ایک آزاد صنعت اور آزاد سیاست کی نشو و نما کے لئے کوئی خاص مدد دیں گے۔ یہ ضرور ہے کہ پنڈت جی کے اس سفر کے بعد ہندوستان اور امریکہ میں تجارتی کاروبار جو دونوں کے لئے مفید ہو بڑھ جائے گا۔ ممکن ہے امریکی حکومت یا بین الاقوامی بنیک ہمیں کچھ قرض بھی دے اور بعض من چلے سرمایہ دار ہمارے ہاں کچھ تھوڑا بہت روپیہ بھی لگائیں لیکن امریکی سرمائے کی ریل پیل جس سے ہماری صنعت ایک دم سے کہیں سے کہیں پہنچ جائے، اگر کسی طرح ممکن بھی تھی تو اب قطعاً ناممکن ہو گئی۔

غالباً اس سے ہمارے ملک کے سرمایہ داروں کو جو یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ امریکی سرمایہ بڑے پیمانے پر ہندوستانی سرمائے کے ساتھ مل کر ہندوستان کا استحصال اور اس پر حکومت کرے گا اس صورت حال سے صدمہ اور مایوسی ہوگی اور شاید ان لوگوں کو بھی جو ہندوستان میں فوری صنعتی ترقی چاہتے ہیں خواہ وہ کسی کے ہاتھوں اور کسی کے فائدے کے لئے ہو۔ لیکن جن لوگوں کے دل میں قومی غیرت و حمیت کا احساس اور قومی آزادی کی قدر ہے جن کے نزدیک ملک کی خوش حالی سے مراد ایک خاص طبقے کی نہیں بلکہ عوام کی خوش حالی ہے ان کو سچی خوشی ہوگی، کہ ہندوستان ایک بہت بڑے خطرے سے بچ گیا۔ اگر ہم حالات کو غور سے دیکھیں تو ہندوستان مغربی یورپ کے ملکوں کی طرح امریکہ کے آگے ہاتھ پھیلانے پر مجبور نہیں ہے۔ اس کی ساکھ اچھی ہے اس کے پاس اندرونی وسائل کافی اور محنت کرنے والے بے شمار ہیں۔ اگر وہ اپنے فرزندوں اور کسانوں میں یہ احساس پیدا کر سکے کہ یہ حکومت ان کی ہے اور ہر معاملے میں اُن کے مفاد کو ترجیح دیتی ہے تو وہ اپنا لہو پسینہ ایک کر کے اور زمین کا سینہ چیر کر معدنی اور نباتی دولت کا ڈھیر لگا دیں گے اور اپنا پیٹ کاٹ کر وہ سرمایہ فراہم کر دیں گے جو باہر سے مشینیں اور صنعتی ترقی کے دوسرے لوازم مہیا فراہم کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اگر وہ اپنے متوسط طبقے کے نوجوانوں کے دل میں ایک نئی زندگی کا جوش اور حوصلہ پیدا کر سکے تو یہ لوگ اپنے دماغ کو کھپا کر اور پتہ مار کر وہ فنی مہارت حاصل کر لیں گے جو صنعت کی روح رواں ہے۔ ہندوستان کا اصلی مسئلہ باہر سے مالی سرمایہ فراہم کرنے کا نہیں ہے بلکہ اس جسمانی، اخلاقی اور ذہنی سرمایے سے کام لینے کا ہے جو خود اس کے اندر موجود ہے۔ لیکن اس دولت سے فائدہ اُٹھانے کے لئے سچے جمہوری سیاسی نظام اور اشتراکی معاشی نظام کی ضرورت ہے جس کا خواب ہم میں سے بہت سے لوگ دیکھ رہے ہیں۔ ان خواب دیکھنے والوں کی وصیت اپنے سب سے بڑے قائد اور مدبر جواہر لال نہرو سے یہی ہے کہ آپ شوق سے مغربی اور مشرقی ملکوں سے خلوص اور محبت کا رشتہ جوڑئیے امریکہ، انگلستان، روس اور چین کی دوستی اور اعتماد حاصل کر کے ان کے باہمی اختلافات دور کرنے اور عالم گیر امن اور صلح قائم کرنے کی کوشش کیجئے، لیکن یہ یاد رکھئے کہ آپ کی آواز میں اتنا ہی اثر ہوگا جتنی مادی اور اخلاقی قوت آپ کے ملک کے پاس ہوگی۔ اس لئے آپ کا اصلی کام یہی ہے کہ "تلاش امریکہ" کے ساتھ ساتھ "تلاش ہند" کے کام کو مکمل کیجئے، یعنی جو قوت کے خزانے آپ کی چشم بصیرت کو اپنے ملک کے اندر نظر آئے ہیں ان کو کھولنے کے لئے ایک منصفانہ سیاسی یا معاشی نظام کی کنجی تلاش کیجئے۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی موجودہ معاشی حالت اور متوسط طبقے کی بے چینی دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر دو چار سال کے اندر ہندوستان کی صنعت کو غیر معمولی فروغ نہ ہوا اور افلاس اور بے روزگاری کے مسئلے کا حل نہ نکلا تو یہاں انقلاب کا زلزلہ شاید اور ملکوں سے زیادہ شدت کے ساتھ آئے گا جس میں یہ خطرہ ہے کہ کہیں ہماری نئی ریاست کا جو ابھی اچھی طرح بننے نہیں پائی، شیرازہ ہی نہ بکھر جائے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اس خطرے کو روکنے کے لئے جو فوری صنعتی ترقی درکار ہے وہ بیرونی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتی، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ایک منصفانہ سیاسی اور معاشی نظام کے اندر جس میں سب کا بوجھ کم و بیش برابر ہو، یہ جادو ہوتا ہے کہ لوگ سخت سخت تکلیفیں جھیلنے پر خوشی سے راضی ہو جاتے ہیں اگر ہندوستان میں اشتراکی جمہوری نظام قائم ہو جائے یا اس کے قائم ہونے کے آثار نظر آنے لگیں تو یہی لوگ جو آج افلاس اور گرانی کی وجہ سے بے چین اور بیزار ہیں۔ ان مصیبتوں کو خوشی سے برداشت کرنے لگیں گے اور محض ۴

۴ اندرونی وسائل سے کام لے کر صنعت کی تعمیر اور ترقی کا کام جو آج اتنا کٹھن اور صبر آزما [illegible] نظر آتا ہے ہنستے کھیلتے انجام دیں گے۔

ہندوستان — دنیا کی رفتار — پاکستان

آئین کی دوسری پڑھائی پوری ہوگئی

۱۷ اکتوبر کو آئین ساز اسمبلی کا اہم اور دشوار کام جو تقریباً تین سال سے ہو رہا تھا ختم ہوگیا۔ اسمبلی کا پہلا جلسہ ۹ دسمبر ۱۹۴۶ء سے شروع ہوا تھا اور ابتدائی مرحلوں کو طے کرنے کے بعد اگلے مہینے اس نے مقاصد کا مشہور و معروف رزولیوشن پاس کیا تھا۔ اس کے بعد ایک سال کے عرصے میں آئین کا پہلا مسودہ مرتب ہوکر ۲۸ فروری ۱۹۴۸ء کو شائع کیا گیا۔ اور ۴ نومبر ۱۹۴۸ء کو ڈرافٹنگ کمیٹی کے صدر ڈاکٹر امبیڈکر نے اسے اسمبلی کے سامنے پیش کیا۔ اس کے بعد اسمبلی کے چار اجلاسوں میں آئین کی پہلی اور دوسری پڑھائی ہوئی اور بڑی بڑی بحثوں اور معرکوں کے بعد خدا خدا کر کے ۳۸۶ دفعوں اور ۸ ضمیموں کا یہ ضخیم آئین مکمل ہوگیا اب نومبر کے پہلے یا دوسرے ہفتے میں آئین ساز اسمبلی پھر جمع ہوگی اور ۲۸ نومبر سے پہلے تیسری پڑھائی ختم کر کے جس میں غالباً صرف لفظی اور جزوی ترمیمیں ہوں گی، آئین کو آخری بار قطعی طور پر منظور کرے گی اور ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو اس کے نفاذ کا اعلان کر دیا جائے گا۔

مشرقی پنجاب کی وزارت پھر بدلی

دنیا میں فرانسیسی قوم سیاسی تلون کے لئے مشہور ہے چنانچہ وہاں جنگ سے پہلے وزارت کی عمر ایک دو سال سے زیادہ نہیں ہوتی تھی اور جنگ کے بعد تو دو چار مہینے کی رہ گئی۔ ہمارے ملک میں مشرقی پنجاب اور مدراس اس لحاظ سے فرانس کے قریب قریب پہنچتے ہیں کہ یہاں بھی پچھلے سوا دو سال میں ان دونوں صوبوں میں وزارت تین بار بدل چکی ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ فرانس میں یہ تبدیلی مختلف سیاسی پارٹیوں کی باہمی کشمکش اور اصولی اختلافات کی بنا پر ہوتی ہے اور ہمارے ملک میں محض ذاتی اغراض اور شخصی رقابتوں کی بنا پر۔ ابھی چھ مہینے ہوئے مشرقی پنجاب کی کانگریس اسمبلی پارٹی نے چند ووٹوں کی اکثریت سے ڈاکٹر گوپی چند بھارگو کی جگہ سری بھیم سین سچر کو اپنا لیڈر چنا اور سچر صاحب کی وزارت قائم ہوئی جس میں کانگریس پارلیمنٹری بورڈ کے حکم سے ڈاکٹر بھارگو اور ان کے دو ایک ساتھی شریک کئے گئے۔ اب اس اسمبلی کانگریس پارٹی نے بہت بڑی اکثریت سے ڈاکٹر بھارگو کو دوبارہ پارٹی لیڈر منتخب کیا ہے شری سچر اور ان کی وزارت نے استعفا دے دیا اور ڈاکٹر بھارگو کو پھر نئی وزارت بنانے کا اختیار دیا گیا ہے۔ اب تک انھوں نے صرف شری پرتھوی سنگھ آزاد کو اپنی وزارت میں لیا ہے اور وزیروں کا انتخاب غالباً وہ پارلیمنٹری بورڈ سے مشورے کے بعد کریں گے۔ مگر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو شری سچر کے گروپ سے کسی وزیر کے لینے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

تارکین وطن کی جائداد کا نیا ضابطہ

مرکزی حکومت نے ۱۸ جون کو تارکین وطن کی جائداد کے بارے میں جو ضابطہ نافذ کیا تھا اور جس سے ہندوستانی مسلمانوں کو جائز شکایتیں تھیں وہ اب منسوخ کر دیا گیا ہے اور ایک نیا ضابطہ بنایا گیا ہے جس سے یہ شکایتیں دور ہو جائیں گی۔ اس ضابطے میں تین باتیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) "تارک وطن" کی تعریف میں صرف وہ لوگ آتے ہیں جو واقعی ترک وطن کر کے پاکستان چلے گئے یا جنھوں نے وہاں کسی تارک وطن کی جائداد جائز یا ناجائز طریقے پر حاصل کر لی ہے۔

(۲) طریق کار میں یہ تبدیلی کی گئی ہے کہ کسٹوڈین اگر کسی شخص کو تارک وطن سمجھے تو ایک دم سے اس کی جائداد پر قبضہ نہیں کرے گا بلکہ پہلے اس کو نوٹس بھیج کر یہ ثبوت پیش کرنے کا موقع دے گا کہ وہ تارک وطن نہیں ہے۔

(۳) کسٹوڈین کے فیصلے کی اپیل ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں اور جج کے فیصلے کی ہائی کورٹ کے بنچ میں ہوسکے گی۔

اس سے پہلے یہ سرکولر جاری ہو چکا ہے کہ جس مشترکہ جائداد کا کوئی شریک پاکستان میں چلا گیا ہے اس کے دوسرے شریک کو جو ہندوستان میں موجود ہے یہ چاہئے کہ جانے

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

مہاجرین کے مطالبے

شیخوپورہ میں مہاجرین کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس میں مہاجرین کی طرف سے حکومت پاکستان سے مطالبے کئے گئے۔ مسٹر حسین شہید سہروردی نے اپنی طویل تقریر میں مہاجرین کی مشکلات اور دقتوں کو بیان کیا اور حکومت پاکستان پر الزام لگایا کہ اس نے اب تک مہاجرین کے لئے کچھ بھی نہیں کیا ہے اور وہ مہاجرین میں اور مہاجرین اور انصار میں اختلاف پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ انھوں نے حکومت سے حسب ذیل مطالبے کئے:۔

(۱) ہر مہاجر خاندان کو کم سے کم ۱۲½ ایکڑ زمین دی جائے۔

(۲) جب تک مہاجرین کی مالی حالت اچھی نہ ہو جائے، ان سے زمین اور مکان کے کرائے نہ لئے جائیں۔

(۳) مہاجرین سے جو ٹیکس وصول ہوں وہ صرف مہاجرین کے کام کے لئے مخصوص کر دئے جائیں۔

مرکزی مہاجرین کمیٹی کا جسے ابھی حال میں حکومت پاکستان نے مہاجرین کی بحالی کے لئے مقرر کیا ہے ذکر کرتے ہوئے موصوف نے فرمایا کہ یہ محض عوام کو دھوکہ دینے کے لئے بنائی گئی ہے اور چونکہ یہ حقیقی مہاجرین پر مشتمل نہیں ہے اس لئے وہ مہاجرین کے فائدے کے لئے کچھ نہیں کرسکتی۔ انھوں نے ایک نمائندہ کمیٹی کے تقرر کا مطالبہ کیا جسے مہاجرین کا اعتماد حاصل ہو اور وہ ایسے مہاجرین پر مشتمل ہو جو ابھی تک آباد نہیں کئے جاسکے ہیں۔ سہروردی صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ مہاجرین کو موجودہ مسلم لیگ پر قطعی بھروسہ نہیں ہے مگر پبلک سیفٹی ایکٹ کے خوف سے وہ اس کا کھل کر ذکر نہیں کرتے۔ انھوں نے پورے ملک میں نئے انتخابات کا مطالبہ کیا۔

شیخوپورہ کے ضلع مسلم لیگ کے صدر نے اپنی افتتاحی تقریر میں "مغربی پاکستان انجمن مہاجرین" کو یقین دلایا کہ وہ جب بھی مکانوں اور زمینوں کے کرایے سے مہاجرین کو مستثنیٰ کرانے کے لئے کوئی ایجی ٹیشن کریں گے تو شیخوپورہ ضلع مسلم لیگ کی ان کو پوری طرح اعانت حاصل ہوگی۔

جوٹ کا مسئلہ مشکل ہوتا جارہا ہے

پاکستانی روپے کی قیمت نہ گھٹانے کی وجہ سے جو مسائل پیدا ہوئے ہیں ان میں جوٹ کا مسئلہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور اس کا مشرقی پاکستان کی معاشی حالت پر بہت برا اثر پڑ رہا ہے۔ وہاں کے عوام کی بڑھتی ہوئی بے اطمینانی اور پریشانی کو روکنے کے لئے وزیر اعظم پاکستان آج کل مشرقی پاکستان کا دورہ کر رہے ہیں اور عوام کو مطمئن کرنے کے لئے طرح طرح کے وعدے کر رہے ہیں مگر حکومت کے سکے کی پالیسی کا عوام کی حالت پر اتنا گہرا اثر پڑ رہا ہے کہ جب تک کوئی ٹھوس تدابیر نہ اختیار کی جائیں محض ان طفل تسلیوں سے کام نہیں چلے گا۔ حکومت پاکستان کو بھی اس کا پوری طرح احساس ہے۔ اس لئے ۲۳ اکتوبر کو ڈھاکہ میں وزیر اعظم، وزیر مال اور وزیر تجارت کی ایک مخصوص کانفرنس منعقد ہونے والی ہے، جس میں جوٹ کے مسئلے پر جو دن بدن اہمیت اختیار کرتا جارہا ہے غور کیا جائے گا۔

اخباروں کی ہڑتال

کراچی کے ایک انگریزی روزنامہ "سندھ آبزرور" کے چیف ایڈیٹر مسٹر علی محمد راشدی نے بعض اختلافات کی وجہ سے اسٹاف کے کچھ لوگوں کو نکال دیا تھا، اس پر ان کی ہمدردی میں ان کے دوسرے ساتھیوں نے اسٹرائک کر دی۔ منتظمین نے کام جاری رکھنے کے لئے پولیس سے مدد لی۔ پولیس نے اسٹرائک کرنے والوں کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا، اس سے اسٹرائک کرنے والوں کے ہمدردوں میں اضافہ ہوگیا، اور "سندھ آبزرور" کی حدود سے نکل کر پورے کراچی اور پھر پورے مغربی پاکستان کا مسئلہ بن گیا۔ مسٹر راشدی نے ایک بیان میں اپنی پوزیشن صاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے

(بقیہ صفحہ [illegible])

بزمِ بے تکلف

"کہئے میر صاحب مزاج اچھے ہیں"

"مزاج تو آج کل کسی بے حس، بے حیا کے اچھے ہوں گے، بس یوں سمجھ لو کہ اچھے ہیں"

"ابھی آپ کیا کسی سے کم ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات ہے کہ جئے چلے جاتے ہیں"

"مطلب یہ ہے کہ ہم بھی بے حیائی میں کسی سے کم نہیں۔ صاف کہو نہ کہ بے حیا کیوں سہے"

"کیا مجال! بھلا میں نقل کفر کر سکتا ہوں"

"شاباش کافر بھی بنا دیا۔ اور جو کچھ کہنا ہو کہہ لو"

"تو میر صاحب! آپ تو بال کی کھال نکالتے ہیں۔ مگر آخر بات کیا ہے۔ آج اتنے بیزار کیوں ہیں"

"بیزاری نہ پوچھو کیا ہے؟ یہی مہنگائی اور میاں کنٹرول کی بدولت دنیا کی نعمتیں ہاتھ سے جاتی رہیں۔ مٹھائی چھوٹی، بیل چھوٹے، گھی چھوٹا، مکھن چھوٹا ———"

"اور دودھ چھوٹا"

"لاحول ولا قوۃ! چاہے بات کرنا نہ آئے، مگر بیچ میں لقمہ ضرور دیں گے، دودھ بچپن کا چھوٹتا ہے یا ہم جیسے بڈھوں کا"

"مگر میر صاحب جب دودھ عنقا ہو جائے اور آپ جیسے بوڑھے دودھ کے لئے ترسیں تو اس مطلب کو کس طرح ادا کیا جائے"

"پھر وہی بازاری عامیانہ لفظ۔ یوں کہو کر دودھ تو اب چڑیا کا دودھ ہو گیا"

"واہ میر صاحب ہمیں تو عامیانہ لفظ پر ٹوکتے ہیں اور آپ سوقیانہ فقرہ کہہ گئے۔ اچھا یہ بتلائیے کہ جن نعمتوں کا آپ نے ذکر کیا وہ تو سب پہلے ہی چھوٹ گئی تھیں۔ اب نئی مصیبت کون سی آئی جس سے چھٹی کا دودھ آ گیا"

"ہاں ہاں تمہیں کبھی تمیز نہ آئے گی، خیر میں کہہ یہ رہا تھا کہ لے دے کے ایک چائے رہ گئی تھی، اب اس کے بھی چھوٹنے کی نوبت آ گئی۔ چائے کا مزا شکر سے تھا اور شکر اب نصیب دشمناں ہو گئی۔ جو بیچتے کھاتے لاٹھیاں اور گولیاں کھانے کا حوصلہ رکھتے ہوں وہ کنٹرول کی شکر لانے کا حوصلہ کرے"

"دیکھئے اب سمجھا کہ آپ اتنے کڑوے کیوں ہو رہے ہیں۔ نئی طبی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ جسم میں شکر کی کمی ہو تو آدمی چڑچڑا ہو جاتا ہے"

"تمہیں والدین کی قسم سچ بتاؤ، کہیں مذاق تو نہیں کر رہے ہو"

"توبہ میر صاحب بھلا شکر کے معاملے میں مذاق کا کیا کام۔ آپ جس سائنس والے سے چاہے پوچھ لیجئے۔ اور آپ خود ہی دیکھئے نا، جب سے شکر کا توڑا ہوا ہے، ہندوستان اور پاکستان میں لوگ کتنے جھگڑالو ہو گئے ہیں۔ بھائی بھائی سے دوست دوست سے لڑ رہا ہے۔ کہیں ممدوٹ اور دولتانہ میں کشمکش ہے، کہیں خان صاحب اور مردم خور میں، کہیں راجا اور سرکاشم میں، کہیں بھارگو اور سچر میں۔ اور ہاں ابھی ہم دونوں میں جھوڑ ہوتے ہوتے رہ گئی"

"بھئی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ جب ایسی بات ہے تو پھر ہماری دیسی سرکار دساور سے شکر کے جہاز بھر بھر کے کیوں نہیں منگاتی کہ ان دل والوں اور آرٹ صفیوں کا مزاج درست ہو جائے اور انھیں جھک مار کر شکر سستی کرنی پڑے"

"ذرا کان ادھر لائیے تو کہوں۔ دیکھئے بڑے راز کی بات ہے۔ اپنے تک رکھئے۔ قصہ یہ ہے میر صاحب کہ ہماری تو ساری بدیسی پالیسی شکر ہی پر چل رہی ہے۔ بتلائیے ہم نے سب سے پہلے دوستی کا رشتہ کس سے جوڑا؟ آسٹریلیا سے، پھر انڈونیشیا سے۔ اس کے بعد دوستی بڑھ کے کس سے چلی؟ جاپان سے۔ یہ تینوں ملک بس یوں سمجھئے کہ شکر کی کان ہیں۔ اب تک ہم اپنے دیس کے شکر چوسنے والوں کو دوست سمجھ کر شیر بادام ملا بنا کر کھاتے تھے لیکن اب ان ملکوں سے شکر حاصل کر کے اتنے سستے ہم شکر بیچیں گے کہ یہ معدے والے مقابلے کو نیچا رکھ کر یا بیٹھ کر رہ گئے تو نکل آئیں گے"

"دیکھو اگر تم کہہ رہے ہو تو تمہارے منہ میں گھی شکر۔ ورنہ پھر جھوٹے کے منہ میں آگے کہوں کیا؟"

کس کے لئے ہے!؟ سروش عسکری طباطبائی

یہ ناز یہ شوخی مری جان کس کے لئے ہے
یہ حسنِ دلاویز و جواں کس کے لئے ہے

اللہ رے یہ ابروئے خم دار کا عالم
یہ چاند یہ خنجر یہ کماں کس کے لئے ہے

اس روحِ گلستاں کا ہی رُخ کون سی جا ہے
موجِ نفسِ عطر فشاں کس کے لئے ہے

یہ زلف یہ قشقہ یہ صفِ نشترِ مژگاں
یہ فوج یہ پرچم یہ نشاں کس کے لئے ہے

پیمانہ بکف، نغمہ بہ لب، گل بہ گریباں
یوں حشر بداماں مری جاں کس کے لئے ہے

پیدا ہے جو سینے میں چمک دردِ وفا کی
یہ گوہرِ نایاب و گراں کس کے لئے ہے

کیسی دلِ ناوک میں یہ بھڑکی ہے نئی پیاس
گل برگ سے ہونٹوں پہ زباں کس کے لئے ہے

غزل آفتاب عالم

ہر طرح رنگ وہ محفل کا بدلتے ہی رہے
جام گردش میں رہا ہونٹ لرزتے ہی رہے

اس طرح لٹتا رہا گلشنِ ہستی اپنا
اُس طرف گیسوئے تقدیر سنورتے ہی رہے

ہمت و عزم کے ماتھے پہ شکن آ نہ سکی
کتنے طوفان سفینے سے الجھتے ہی رہے

ہو سکی تم سے مکمل نہ جنوں کی تصویر
یوں تو ہم رنگ طبیعت کا بدلتے ہی رہے

خضر بن کر بھی نہ پایا کوئی منزل کا سُراغ
کارواں کتنے سرِ راہ بھٹکتے ہی رہے

کتنے ترسے ہوئے ہونٹوں کو سہارا نہ ملا
یوں تو ساغر تری محفل میں چھلکتے ہی رہے

عورت کا درجہ
گاندھی جی کی نظر میں

صالحہ عابد حسین

گاندھی جی کے خیال میں عورت اگر کسی حیثیت سے مرد سے کم ہے تو صرف حیوانیت کی طاقت میں ورنہ انسانیت کے لحاظ سے اس کا درجہ مرد سے کم نہیں بلکہ بلند ہے ....

گاندھی جی کا عقیدہ تھا کہ عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق اور اُن کے مساوی درجہ ملنا چاہئے۔ اور اُن کو سب کاموں میں برابر کا حصہ لینا چاہئے۔ مگر اُن کی طبیعت اور سمجھ میں بلا کا توازن تھا۔ اس مقصد پر اُنھوں نے زور دیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی واضح کردیا کہ عورت کا جو ایک خاص کام گھرداری اور بچوں کی پرورش اور تربیت ہے وہ کچھ کم اہم نہیں، اُن کے نزدیک یہ کام بھی اتنا ہی اہم اور قابل قدر ہے جتنا اور کوئی قومی کام اور اس صبر آزما اور کٹھن کام کے لئے عورت ہی موزوں ہے۔

کہتے ہیں کہ قدیم زمانے میں ہندوستان کی عورت کو سماج میں بڑا اونچا درجہ حاصل تھا اور اس کو مرد کے برابر حقوق ملے ہوئے تھے۔ مگر یہ سنہری زمانہ صدیوں پہلے کبھی ہوگا۔ اب تو سیکڑوں برس سے ہمارے ملک کی عورت جانوروں سے بدتر، لونڈی غلاموں سے زیادہ خراب حالت میں زندگی گذارتی رہی ہے۔ ایک ہزار برس گذرے پچھم سے ایک قوم ہندستان میں حملہ آور کی حیثیت سے آئی تھی اور پھر یہیں رچ بس گئی اور یہاں رہ کر ہندستانی ہوگئی۔ اس نے بہت کچھ ہندستان سے سیکھا اور بہت کچھ اُسے سکھایا، بہت کچھ اس سے لیا، بہت کچھ اُسے دیا۔ یہ لوگ ایک نئے مذہب کے پابند اور ایک ترقی یافتہ سماجی تصور کے حامی تھے اُن کے مذہب میں عورت کا درجہ بہت بلند مانا گیا تھا، اور اُسے انسانیت کے سارے حقوق بڑی فیاضی سے عطا کئے گئے تھے۔ مسلمان جب تک اسلام کی حقیقی روح کو سمجھتے اور اس کے بنیادی احکام پر عمل کرتے رہے، انھوں نے سماج میں عورت کو وہی درجہ دیا جو اسلام نے اُسے عطا کیا تھا۔ لیکن جیسے جیسے وہ اسلامی روح سے دور ہوتے گئے، ان کے ہاں بھی عورت کے حقوق غصب ہوتے گئے اس پر محض فرائض کا بوجھ بڑھتا رہا، اور اس کا سماجی درجہ پست سے پست تر ہوتا گیا۔ اس تحریک کا اثر ہندستان میں نمایاں طور پر نظر آتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندستانی عورت خواہ وہ ہندو تھی یا مسلمان انسانیت کے درجے سے گرگئی، وہ اپنے حقوق سے محروم، جہالت کی اندھیری کوٹھری میں قید، اپنی تنگ اور تاریک زندگی گذارتی رہی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ صبر اور ہمت سے اور ایک حد تک خوش دلی اور قناعت کے ساتھ زندگی بسر کررہی ہے، لیکن اصل میں وہ ایک کنوئیں کے مینڈک کی طرح تھی جو اسی کو ساگر سمجھتا ہے اور اس میں مگن رہتا ہے۔ نہ باہر سے روشنی کی کرنیں اس تک پہنچتی تھیں، نہ اندر اتنی روشنی تھی کہ وہ اس میں اپنی ذات کا صحیح جلوہ دیکھے اور اپنی صفات اور امکانات کو پہچان سکے۔

لیکن گذشتہ صدی کے آخر میں جب مغربی تعلیم اور تہذیب کا ہند میں بھی چرچا ہوا تو ایک بہت محدود طبقے میں عورت کی آزادی کی آواز اُٹھی اور یہ مطالبہ کیا گیا کہ اُسے قید و بند سے نکل کر کھلی ہوا میں سانس لینے کا اور "تعلیم" اور "تہذیب" سے مستفید ہونے کا موقع ملنا چاہئے۔ مگر اس طبقے میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو دور سے مغربی تہذیب کی چمک دمک دیکھ کر چندھیا گئے تھے اور اسی کو اپنانا چاہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نئے زمانے کی پڑھی، لکھی، آزاد خیال اور فیشن ایبل عورتوں میں سے بیشتر بالکل تتلی بن گئیں۔ تتلی بھی ایسی جن کے نقش و نگار مصنوعی تھے اور غازے کی طرح رنگ روغن عارضی۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ دراصل یہ جدید تتلی بھی جو محض زینت محفل بننے کی اُمنگ رکھتی تھی، اسی طرح مرد کی باندی تھی جس طرح وہ پرانی گڑیا جو گھر کی زینت بنا کر بٹھادی گئی تھی۔ اُسے اپنے فعل کی صرف اسی حد تک آزادی تھی جہاں تک اس کا آزاد خیال اور تعلیم یافتہ شوہر اس کی اجازت دے ... اس کی ذاتی شخصیت اور رائے کو یہاں بھی دخل نہ تھا، کیونکہ ابھی اس کی اپنی شخصیت بن ہی نہ پائی تھی۔

میں نے یہ [illegible] تصویریں جو دکھائی ہیں یہ بحیثیت مجموعی صحیح ہیں۔ اگرچہ ہزاروں میں چند ایسے نمونے بھی مل سکتے ہیں جن میں خود اعتمادی اور خودداری تھی جو پرانی اور نئی دونوں حالتوں میں اپنی ایک نمایاں اور انفرادی شخصیت رکھتی تھی، لیکن ان کی گنتی اتنی کم تھی کہ انھیں شاید انگلیوں پہ گنا جا سکتا ہے۔

جب گاندھی جی نے ہندوستان کی رہنمائی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تو انھوں نے صرف سیاست ہی کو نہیں سنبھالا بلکہ ہر قسم کی معاشرتی اور سماجی اصلاح کا بار بھی اپنے مضبوط کندھوں پر اٹھالیا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ سیاست پوری قومی زندگی نہیں بلکہ اس کا ایک حصہ ہے اور جب تک لوگوں کی سماجی، اخلاقی اور ذہنی تربیت صحیح اصولوں پر نہیں ہوگی صرف سیاست کا کھیل نہ قوم کو آزادی دلا سکتا ہے نہ اُس کے تمام مرضوں کا علاج کرسکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے ہمہ گیر پروگرام میں مختلف قسم کے تعمیری کاموں کو جگہ دی اور جہاں تک سماجی اصلاح کا تعلق ہے انھوں نے دوسرے سچے انسانی رہبروں کی طرح سب سے پہلے اپنی توجہ اور کوشش مظلوموں کے حقوق واپس دلانے اور پست اور کچلے ہوئے لوگوں [illegible] کی طرف مبذول کی۔ ایک طرف ہندوستان کو [illegible] کی غلامی سے نجات دلانا چاہتے تھے اور دوسری طرف اچھوتوں کو اونچی ذاتوں کے پنجۂ ظلم سے آزاد کرانا ...... عورت کو مرد کی غلامی سے چھٹکارا دلا کر اُسے خود اعتمادی اور سچی آزادی کی نعمت عطا کرنا چاہتے تھے اور کس قدر عظیم الشان کامیابی ہوئی، انھیں اس کوشش میں! انھیں صدیوں کی ذہنیت کو بدلنا تھا۔ بہتے ہوئے دھارے کے خلاف تیرنا تھا لیکن انھوں نے ہر قسم کی مشکلوں اور مخالفتوں کو جھیلا اور لوگوں کے خیال اور عمل کے سانچوں کو بدل دیا۔ جب تک ہمارے دیس کا وجود دنیا میں باقی ہے وہ اپنے محسن اعظم کے احسان کے بوجھ سے دبا رہے گا۔

گاندھی جی نے ہندوستانی عورت کے لئے کیا کچھ کیا اور ان کی بدولت اس نے کیا کچھ پایا اس مضمون میں اُسے تفصیل سے بیان کرنا ممکن نہیں۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ کوئی صاحب قلم جو گاندھی جی کے بہت قریب رہا ہو اس بارے میں ان کے تمام خیالات اور ان کی تحریروں اور تقریروں کو تفصیل سے لکھے اور اُسے دیس کے مرد اور عورت دونوں کے سامنے پیش کرے اور ان کی تعلیم کا یہ جز زیادہ سے زیادہ دیس میں پھیلایا جائے۔ میں یہاں مختصر طور پر چند موٹی موٹی اور اہم باتیں جن کی بدولت ہند کی عورت کی حالت سنبھلی اور اس کے متعلق گاندھی جی کے خیالات اور جذبات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گی۔

گاندھی جی کے دل میں عورت کی بڑی عزت تھی وہ اسے اہنسا اور ستیہ، ایثار اور جفاکشی [illegible]

اور محبت کی دیوی سمجھتے تھے، لیکن ان کے خیال میں عورت کے لئے محض نسوانی حسن کا مجسمہ ہونا (جن کی وجہ سے آج کل کی اصطلاح میں اُسے "صنف نازک" کا خطاب دیا گیا ہے) کافی نہیں بلکہ اُن کے ساتھ اس کی سیرت کی تکمیل کے لئے اس میں نڈر پنا، بہادری، خود اعتمادی اور عزت نفس کی ضرورت بھی ہے۔

اگرچہ گاندھی جی نے عمر بھر عورتوں کے حقوق کے بارے میں بہت سے مضمون لکھے، بہت سی تقریریں کیں، لیکن وہ جب کسی جماعت سے مخاطب ہوتے تھے تو حقوق سے زیادہ اس کے فرائض کی طرف اُسے متوجہ کرتے تھے۔ یہی اصول انھوں نے عورتوں کے بارے میں بھی اختیار کیا۔ وہ جانتے تھے کہ جب عورت کو اپنے فرائض کی ادائیگی کا پورا پورا موقع ملے گا تو اسے حقوق خود بخود حاصل ہو جائیں گے۔ انھوں نے عورتوں کو بتایا کہ ان پر خدمت کا بار مرد سے بھی زیادہ ہے۔ عورت کا نصب العین انسانیت کی سیوا ہونا چاہئے جس میں ہر قسم کی خاندانی، سماجی، معاشرتی اور قومی خدمت آجاتی ہے۔ سماج کا فرض ہے کہ عورت کو اس کے اس اہم فرض کی ادائیگی کا پورا پورا موقع دے اور عورت کا دھرم ہے کہ اس راہ میں جو رکاوٹیں پیش آئیں ان کو سر کرلے، اور اس ضمن میں جو تکلیفیں اُٹھانا پڑیں انھیں خاموشی اور انکسار سے برداشت کرے۔ وہ جانتے تھے کہ مردوں نے عورتوں کے حقوق غصب کئے ہیں اور انھیں اس کا تاوان ادا کرنا چاہئے مگر ساتھ ہی وہ عورتوں سے بھی مطالبہ کرتے تھے کہ وہ خود اپنی سیرت اور کردار اور جد و جہد کے ذریعے اپنے حقوق واپس لیں۔ ایک جگہ عورتوں کی آزادی کے عنوان سے لکھتے ہیں :

"اس میں شک نہیں کہ مرد عورتوں کو نظر انداز کرنے کے بلکہ اُن کے ساتھ بدسلوکی کرنے کے ملزم ہیں اور انھیں اس کا مناسب کفارہ دینا چاہئے۔ لیکن ان عورتوں کو جنھوں نے اوہام کی زنجیریں توڑ دی ہیں اور اپنے حقوق کا احساس رکھتی ہیں، خود بھی اصلاح کا تعمیری کام کرنا چاہئے ...."

ان کا بالکل صاف اور واضح نظریہ تھا کہ عورت اور مرد کا درجہ اور حقوق بالکل مساوی ہیں اور انھوں نے بار بار اس کو دہرایا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

"میں عورت کے حقوق کے معاملے میں کسی قسم کی مصالحت کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ میرے خیال میں اس پر کوئی ایسی قانونی پابندی نہیں لگنی چاہئے جو مرد پر نہ لگی ہو۔ میرے نزدیک لڑکے اور لڑکیوں سے کامل برابری کا سلوک ہونا چاہئے ...."

گاندھی جی کے خیال میں عورت اگر کسی حیثیت سے مرد سے کم ہے تو صرف حیوانیت کی طاقت میں ورنہ انسانیت کے لحاظ سے اس کا درجہ مرد سے کم نہیں بلکہ بلند ہے۔

"عورت کو صنف نازک کہنا اس کی توہین ہے یہ مرد کی زیادتی اور بے انصافی ہے۔ اگر طاقت سے مطلب حیوانی طاقت ہو تو اس میں شک نہیں کہ عورت میں حیوانیت مرد سے کم ہوتی ہے۔ لیکن اگر طاقت سے روحانی قوت مراد لی جائے تو عورت مرد سے بدرجہا افضل ہے ...."

گاندھی جی کا عقیدہ تھا کہ عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق اور ان کے مساوی درجہ ملنا چاہئے اور ان کے سب کاموں میں برابر کا حصہ لینا چاہئے مگر ان کی طبیعت اور سمجھ میں بلا کا توازن تھا، اس مقصد پر انھوں نے زور دیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ عورت کا جو ایک خاص کام گھر داری اور بچوں کی پرورش اور تربیت ہے وہ کچھ کم اہم نہیں۔ اُن کے نزدیک یہ کام بھی اتنا ہی اہم اور قابل قدر ہے جتنا کوئی اور قومی کام اور اس صبر آزما اور کٹھن کام کے لئے عورت ہی موزوں ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں :

"میں جو نظام زندگی چاہتا ہوں، اس میں ہر شخص کو اپنی صلاحیت کے مطابق کام کرنا ہوگا اور اُسے اس کا معاوضہ ملے گا۔ عورتیں بھی ان دوسرے کاموں میں شرکت کریں گی۔ مگر ان کا اصلی کام گھر کا کام ہے ...." ایک اور جگہ انھوں نے زیادہ وضاحت سے اس مسئلے پر بحث کی ہے اور یہ حصہ یہاں نقل کرنے کے قابل ہے۔

"میرے خیال میں جس طرح مرد اور عورت اصل میں ایک ہیں، ان کا مسئلہ بھی بنیادی طور پر ایک ہی ہونا چاہئے۔ روح دونوں میں ایک ہی ہے۔ دونوں ایک سی زندگی بسر کرتے ہیں، ایک کا دوسرے کی عملی مدد کے بغیر زندہ رہنا محال ہے۔"

"مگر کچھ ایسا ہوا کہ مرد عورت پر حکومت کرنے لگا، اور مدتوں سے کر رہا ہے۔ اس سے عورت میں احساس کمتری پیدا ہو گیا ہے اور وہ مرد کی اس خود غرضانہ تعلیم کو سچ سمجھتی ہے کہ وہ مرد سے گھٹیا ہے مگر جو عارف مردوں میں گذرے ہیں انھوں نے عورت کے مساوی درجے کو تسلیم کیا ہے۔"

"پھر بھی اس میں کوئی شبہ نہیں کسی نہ کسی نقطہ پر پہنچ کر دونوں الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ گو اصل میں دونوں ایک ہیں مگر یہ بھی مانی ہوئی بات ہے کہ جسمانی لحاظ سے دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اس لئے دونوں کے کام بھی مختلف ہونے چاہئیں۔ ماں کے فرائض جو عورتوں کی بہت بڑی اکثریت کو ہمیشہ انجام دینے پڑیں گے وہ صفات چاہتے ہیں جو مردوں میں ہونے ضروری نہیں ...... عورت در اصل گھر کی مالک ہے، مرد روزی کماتا ہے، عورت اسے رکھتی ہے اور بانٹتی ہے۔ وہ ہر لحاظ سے خبرگیری کرنے والی ہے۔ بچوں کو پالنا اس کا خاص حق ہے جس میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ اگر وہ خبرگیری نہ کرے تو انسان کی نسل مٹ جائے۔"

"میرے خیال میں اس بات میں مرد اور عورت دونوں کی ذلت ہے کہ عورت کو گھر چھوڑ کر گھر کی حفاظت کے لئے بندوق اُٹھانے پر مجبور یا آمادہ کیا جائے .... گھر کو اچھی حالت میں رکھنا بھی اتنا ہی بہادری کا کام ہے جتنا اُسے باہر کے حملوں سے بچانا .... عورتیں لوہار اور بڑھئی نہیں ہیں۔ لیکن کھیتوں میں مرد عورت دونوں کام کرتے ہیں جس میں بھاری کام مرد کے ہاتھوں نبٹتا ہے۔ عورتیں گھر کی دیکھ ریکھ کرتی ہیں۔ وہ بھی خاندان کی قلیل آمدنی میں تھوڑا سا اضافہ کرتی ہیں لیکن اصل کمانے والا مرد ہی ہے کاموں کی اس تقسیم کو ماننے کے بعد بھی دونوں جنسوں کے لئے قریب قریب ایک سے عام صفات ضروری ہیں ...."

(باقی آئندہ)

اقبال کے چار شعر

رضا لائبریری، رام پور ۱۳ اکتوبر ۱۹۶۶ء

محترمی، تسلیم مع التکریم

امید ہے کہ آپ کا مزاج اب قرین صحت و عافیت ہوگا۔ اس خط کے ساتھ ڈاکٹر اقبال مرحوم کی ایک نظم ارسال کر رہا ہوں۔ یہ اسی ہفتے کی فتوح ہے۔ اس کی شان نزول یہ ہو کہ نواب صاحب جنجیرہ (جزیرہ) بیگم جنجیرہ اور عطیہ بیگم فیضی (ہمشیرہ بیگم جنجیرہ) اور چند دیگر اصحاب کے ساتھ ۱۹۰۸ء میں یورپ کے سفر کو تشریف لے گئے تھے بیگم صاحبہ نے وقتاً فوقتاً اپنے اعزہ کے نام خط لکھے اور اس میں اپنے سفر کے واقعات سنائے واپسی پر ان سب خطوں کو عطیہ بیگم فیضی صاحبہ نے "سیر یورپ" کے نام سے مرتب کر دیا۔ یہ سفرنامہ اسی زمانے میں چھپ کر شائع بھی ہوا تھا میں کئی دن ہوئے اسے پڑھ رہا تھا کہ ۱۰ جون ۱۹۰۸ء کے واقعات میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کا نام نظر پڑا۔ یہ ان حضرات میں سے ایک تھے جنھیں بیگم صاحبہ نے چار پر مدعو کیا تھا۔ چنانچہ سفرنامے میں یہ الفاظ لکھے گئے ہیں : (صفحہ ۷۰)

"مسٹر اقبال نے اس روز یہ شعر فی البدیہہ کہہ کر میری کتاب میں درج کر دئے جنھیں یہاں نقل کرتی ہوں :

اے کہ تیرے آستانے پر جبیں گستر قمر
اور فیض آستاں بوسی سے گل بر سر قمر
روشنی لے کر تری موج غبارِ راہ سے
دیتا ہے لیلائے شب کو نور کی چادر قمر
کاروانِ قوم کو تجھ سے ہے زینت اس طرح
جس طرح گردوں پہ صدرِ محفل اختر قمر
شمع بزم اہل ملت را چراغ طور کن
یعنی ظلمت خانۂ ما را سراپا نور کن

اقبال مرحوم کے یہ شعر بانگ درا میں شامل نہیں ہیں۔ اس لئے ان کا ملنا خاصا دلچسپ نظر آ رہا ہے۔ بظاہر ان کے نہ ہونے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ بیگم صاحبہ کی تعریف میں لکھے گئے اور وہیں ان کی کتاب میں درج کر دئے گئے تھے ان کی نقل اقبال نے اپنے پاس نہ رکھی اور نہ موضوع کی عدم افادیت کے پیش نظر یاد رکھا، ورنہ ضرور بانگِ درا میں چھپ جاتے چونکہ ان پر نظر ثانی تک نہ ہو سکی ہے اس لئے دوسرے مصرع کے پہلے لفظ "دیتا ہے" میں چستی بھی نہیں ہے امید ہے کہ ان تبرکات کو آپ سفرنامہ مذکورہ (سیر یورپ صفحہ ۷۰) کے حوالے کے ساتھ نئی روشنی میں شائع فرمائیں گے۔ مخلص عرشی

ملک راج آنند

ایک انقلاب پسند ادیب

خواجہ احمد عباس

> ملک راج ایک کے بعد ایک کتنے ہی ناول لکھ چکے ہیں جن میں سے کئی تو انگریزی کے علاوہ یورپ کی سب بڑی زبانوں میں چھپ چکے ہیں۔ نئے ہندوستانی ادیبوں میں صرف ملک راج آنند کے ناول ہی روس میں کئی لاکھ کی گنتی میں چھپ اور بکے ہیں۔ ترقی پسند ہندوستانی تاریخ میں ملک راج آنند کا ایک شاندار مقام ہے کیونکہ انھوں نے اپنے ناولوں میں ہندوستانی عوام کا، قلیوں، مزدوروں اور کسانوں کی زندگی کا سچا روپ دکھایا ہے اور ہمیں سکھایا ہے کہ جو ادیب زندگی سے تعلق نہیں رکھتا وہ بے کار ہے.....

ہمارے ملک کے ادیبوں میں اگر سب سے اونچا نہیں تو سب سے انوکھا مقام ضرور ڈاکٹر ملک راج آنند کا ہے۔

وہ اپنے ملک سے زیادہ غیر ملکوں میں مشہور ہیں، وہ کھدر پہنتے ہیں مگر کانگریسی نہیں ہیں۔ اُن کے سجے ہوئے گھر میں ایک طرف اگر ہزار دو ہزار برس پرانی پتھر کی مورتیاں رکھی دکھائی دیں گی تو دوسری طرف نئی مصوری کے عجیب نمونے۔ الماریوں میں آرٹ اور انقلاب، شاعری اور کمیونزم پر کتابیں ساتھ رکھی ملیں گی اور اگر ڈاکٹر آنند گھر پر نہ ملیں تو سمجھ لیجئے کہ وہ یا تو آرٹ سوسائٹی میں مصوری پر لیکچر دے رہے ہیں یا کسی سیاسی پلیٹ فارم پر کھڑے شہری آزادی کے لئے دھواں دار تقریر کر رہے ہیں، اور اتنی دیر میں اگر دروازے کی گھنٹی بجے اور ان سے کوئی ملنے آ جائے تو آپ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کوئی آرٹسٹ ہے جو ملک راج سے اپنی نمائش کے بارے میں صلاح کرنے آیا ہے، یا سی۔ آئی۔ ڈی کا آدمی ہے جو ان کا پاسپورٹ ضبط کرنے آیا ہے۔

ملک راج آنند فن کار انقلابی ہے یا انقلابی فن کار ہے؟ کیا وہ دراصل فن کار اور ادیب ہے جو انقلاب اور عوامی حکومت کو زندگی کے اعلیٰ مقاصد سمجھتا ہے، اور اپنے فن کی خاطر ان کی خدمت کرتا ہے یا وہ ایک انقلابی ہے جو انقلاب کی خاطر فن سے کام لیتا ہے اور اپنے قلم کو تلوار بنا کر سرمایہ داری نظام پر حملہ کرتا ہے؟ ان سوالوں کا جواب شاید خود ملک راج آنند بھی نہیں دے سکتے۔ اپنے دل اور نظریے کو بھلا کون الگ الگ کر کے دیکھ سکتا ہے؟ اور پھر ہو سکتا ہے کہ یہ سوال بے کار بھی ہوں۔ جیسے زندگی اور فن کے مستقل رشتے کو کوئی نہیں توڑ سکتا اسی طرح ملک راج آنند جیسے ترقی پسند ادیب کی زندگی میں اور ان کے لکھے ہوئے ادب میں فن اور انقلاب کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔

پچھلے ۲۰۔۳۰ برس میں جو ہمارے ملک میں جو انقلابی طوفان اُٹھا ہے وہ سب ہی کی زندگی پر اثر انداز ہوا ہے۔ ادیب اور فن کار جن کے دل و دماغ اوروں سے زیادہ ہر بات کو محسوس کرتے ہیں بھلا کب انقلاب سے بے پروا رہ سکتے ہیں؟ ملک راج آنند (جو پشاور میں پیدا ہوئے) جس گھرانے اور جن حالات میں پلے وہ انقلابی تو کیا ترقی پسند بھی نہ تھے۔ ان کے والد ذات کے ٹھٹھیرے تھے جو اپنی برادری کو چھوڑ کر انگریزی فوج میں جمعدار ہو گئے تھے۔ ان کی والدہ کسان کی بیٹی تھیں جو اپنا زیادہ وقت پوجا پاٹ میں گزارتی تھیں۔ ان کے بڑے بھائی [illegible] کھیلتے تھے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ایسی زمین میں نہ انقلابی خیالات کے بیج پنپ سکتے ہیں اور نہ آرٹ کی محبت پروان چڑھ سکتی ہے۔

مگر ایسے گھرانے میں ملک کو بچپن ہی سے ایسے حالات ملے جنہوں نے انھیں ادیب اور انقلاب کے راستے پر ڈال دیا۔ ان کے پتا کو پڑھنے کا بہت شوق تھا اور گھر میں کتابیں بہت تھیں۔ [illegible] کی زندگی ہی میں ملک نے اردو اور انگریزی کی بہت سی موٹی موٹی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ڈارون، اسپنسر، مل، ٹیگور، اقبال، جن میں سے بہت سی وہ اس وقت سمجھے بھی نہیں مگر پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔

ان کے والد کو فن کی بھی تھوڑی بہت سمجھ تھی۔ ایک تو ان کی برادری کے ٹھٹھیرے اور سنار سیکڑوں برس سے سونے چاندی تانبے کی خوب صورت چیزیں بناتے آئے تھے۔ امرتسر کے دربار صاحب کے گنبد پر سونے کا کام انہی کے باپ دادا نے کیا تھا اور پھر ملک کے والد کے پاس کانگڑے کے مصوروں کی بنائی ہوئی بہت سی تصویریں بھی تھیں۔ اس طرح نوجوان ملک راج کو فن میں دلچسپی اور فن کی پہچان دونوں اپنے باپ سے ملیں۔

اور بچوں کی طرح ملک کا زیادہ وقت اپنی ماں کے پاس ہی گزرتا تھا، ان کی ماں کو سیکڑوں لوک کہانیاں یاد تھیں جو وہ اپنے بچوں کو سنایا کرتیں۔ جب کبھی ننھا ملک اپنی ننھیال جاتا تو اپنے نانا اور دوسرے کسانوں کی زبانی وہ کہانیاں بھی سنتا جو پنجابی، دیہاتی سماج کے زبانی ادب میں شامل ہیں۔ ان کہانیوں کو سن سن کر ملک خود بھی کہانیاں سوچنے، سنانے اور لکھنے لگا۔ نظموں اور گیتوں کا بھی ملک کو بچپن ہی سے شوق تھا اور اقبال کی اردو نظمیں تو انھیں بہت پسند تھیں۔ سولہ برس کے تھے کہ خود اردو میں نظمیں لکھنے لگے۔ اسی زمانے میں انھیں [illegible] بستر پر [illegible] جب [illegible] اکثر دیکھا گیا ہے کہ [illegible] والا دل و دماغ زیادہ کام کرنے لگتا ہے۔ بیماری نے [illegible] کتنے ہی شاعر اور فن کار پیدا کئے ہیں۔ کشمیر کے عوامی شاعر عاصی نے اپنی پہلی فارسی نظم اس وقت لکھی جب وہ خطرناک بیماری سے موت اور زندگی کے بیچ میں جھول رہے تھے۔ کرشن چندر نے اپنی پہلی کہانی بیماری کے دنوں میں لکھی۔ اسی طرح نوجوان ملک کی لمبی بیماری نے انھیں مصنف بنا دیا اور پھر وہ اپنے کالج میگزین میں لکھنے لگے اور اس کے ایڈیٹر بھی بنے۔

امرتسر سے بی اے کر کے ۱۹۲۵ء میں ملک آگے پڑھنے کے لئے ولایت گئے اور لندن یونیورسٹی میں فلسفہ پڑھنے کے لئے نام لکھایا۔ پڑھنے اور کھوج کرنے سے جہاں انھوں نے ہندوستان کے فلسفے کو سمجھا اور پرکھا وہ وہاں یورپ کے نئے سائنٹفک خیالات سے بھی مستفید ہوئے اور ان کے دماغ میں بھی پرانے خیالات کے بارے میں وہی شکوک پیدا ہونے لگے جو ہر ملک کے ترقی پسند اور انقلابی ادیبوں کو پرانی دنیا اور پرانی قدروں کو چھوڑنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ساتھ ساتھ لندن میں رہ کر انھیں سامراج اور سرمایہ داری نظام دونوں کو پاس سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستانی نوجوانوں کے ساتھ انگلستان میں اچھوتوں کا سا برتاؤ کیا جاتا تھا، اور سمجھ دار اور تھوڑے بہت ترقی پسند انگریز بھی ہندوستانیوں کو آزادی کا حق دینے کو تیار نہ تھے۔ ہندوستانی نوجوانوں کے دل سامراج کی نفرت سے بھرے ہوئے تھے مگر ملک جیسے ہوشیار نوجوانوں نے سامراج کا دوسرا پہلو بھی دیکھا جب [illegible] کی ہڑتال میں انگریز سرمایہ داروں نے اپنی قوم اور محنت والے انگریز مزدوروں کو بالکل اسی طرح سختی سے دبایا جس طرح ہندوستان میں [illegible] آزادی [illegible] کے پاس رہتی ہیں۔

۲۹ء میں جب وہ پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر ہندوستان آئے تو غیر ملکی مال کے بائیکاٹ کی نئی تحریک شروع ہی ہوئی تھی۔ نوجوانی کے جوش کے ساتھ وہ اس تحریک میں کود پڑے اور لاہور میں غیر ملکی کپڑا جلانے اور غیر قانونی جلوس نکالنے پر دوسرے نوجوانوں کے ساتھ گرفتار ہو گئے۔ مقدمہ چلا اور انھیں تین مہینے کی قید ہو گئی۔ جیل سے نکلنے پر انھوں نے دیکھا کہ ہندوستان کی یونیورسٹیاں اُن جیسے ترقی پسند خیالات والے کو کوئی جگہ دینے والی نہیں اس لئے انھوں نے سوچا ولایت جاکر اپنے قلم سے ہندوستان کی آواز کو دنیا میں پھیلایا جائے۔

پیرس اور لندن میں رہ کر انھوں نے کئی کتابیں ہندوستانی تمدن اور ادب کے بارے میں لکھیں ایک ناول لکھنا بھی شروع کیا مگر ۳۲ء میں ہندوستان کی نئی انقلابی تحریک کو پاس سے دیکھنے کے لئے وہ پھر ہندوستان لوٹے اور یہاں کئی مہینے تک گھومے وہ اچھوتوں کی بُری حالت سے بہت متاثر ہوئے اور انھیں ایسا لگا جیسے ہندوستان کی ساری سیاسی سماجی اور اقتصادی تاریخ ایک لفظ "ہتک" کے چاروں طرف گھوم رہی ہے۔ انگریز ہندوستانیوں کی ہتک کر رہے تھے۔ ہندوستانی خود اپنے اچھوت بھائیوں کی ہتک کر رہے تھے۔ زمیندار اور جاگیردار کسانوں کی تذلیل کر رہے تھے اور سرمایہ دار مل مالک مزدوروں کی "ہتک"۔ پُرانا جاگیرداری سماج اور نیا سرمایہ داری سماج سب انسانوں کا ہی نہیں انسانیت کی ہتک کر رہا تھا۔ ہر طرف اس "ہتک" کے خلاف دلوں میں آگ بھڑک رہی تھی اور جوالا مکھی پھٹنے ہی والا تھا۔ ان خیالات کو لے کر انھوں نے اپنا ناول (UNTOUCHABLE) اچھوت لکھا جس میں ایک اچھوت لڑکے بکھا کی زندگی کا صرف ایک دن دکھایا گیا ہے کہ اس پر کیا گذری، اس نے کیا سوچا، کیا محسوس کیا اور کیا سپنے دیکھے۔ اس ایک دن میں اس کے ساری زندگی کا نچوڑ ہے۔ اس ناول میں اچھوتوں کے ساتھ زبانی ہمدردی ہی نہیں بلکہ چھوت چھات کے سماجی اور اقتصادی پہلوؤں پر پوری روشنی ڈالی گئی ہے۔ واپس لندن جاکر انھوں نے ایک کے بعد ایک پورے شہر کے پبلشروں کو ناول بھیجا مگر ہر جگہ سے واپس آگیا۔ ہندوستان کے بارے میں دو قسم کے ناول ان دنوں انگریزی میں چھپا کرتے تھے یا پرانے افسروں کے لکھے ہوئے جن میں شکار، شیر ہاتھی، راجہ، مہاراجہ، صاحب لوگ اور کالے کالے جانوروں جیسے ہندوستانی "نیٹو" ہوں۔ یا پھر ان ہندوستانیوں کے لکھے ہوئے جو بیسویں صدی میں بھی پُرانے زمانے کے سنہری سپنوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ بھلا ملک راج کے ناول کو کون پسند کرتا جس میں زندگی کا خوفناک مگر حقیقی رُخ تھا......

پورے دو برس ملک نے بڑی مشکلات کے ساتھ گذارے جب لندن میں رہنے کو پیسے نہ رہے تو ایک گاؤں میں رہنے لگے۔ دو وقت کھانے کی بجائے ایک وقت کھانے لگے کئی کئی دن فاقے سے بھی گذر جاتے۔ پر انھوں نے ہمت نہ ہاری اور نہ لکھنا چھوڑا۔ اور اُن دنوں میں اپنا دوسرا ناول "قلی" پورا کر لیا۔ جو ایک ایسے پنجابی لڑکے کی تصویر ہے، جو گاؤں سے نکل کر نئے ہندوستان کی سرمایہ دار سماج کی مشین میں پس کر مر جاتا ہے۔ دو برس کے بعد ایک پبلشر نے (UNTOUCHABLE) یعنی اچھوت" چھاپنا منظور کر لیا۔ شائع ہوتے ہی کتاب اور اس کے مصنف دونوں کا بڑا نام ہوا اور پھر "قلی" نے تو سارے یورپ میں ملک راج آنند کا نام روشن کر دیا۔

جب سے ملک راج ایک کے بعد ایک کتنے ہی ناول لکھ چکے ہیں جن میں سے کئی تو انگریزی کے علاوہ یورپ کی سب بڑی زبانوں میں چھپے ہیں نئے ہندوستانی ادیبوں میں صرف ملک راج آنند کے ناول ہی روس میں کئی لاکھ کی گنتی میں چھپے اور بکے ہیں۔ ترقی پسند ہندوستانی تاریخ میں ملک راج آنند کا ایک شاندار مقام ہے۔ کیونکہ انھوں نے اپنے ناولوں میں ہندوستانی عوام کا، قلیوں مزدوروں اور کسانوں کی زندگی کا سچا روپ دکھایا ہے، اور ہمیں سکھایا ہے کہ جو ادب زندگی سے تعلق نہیں رکھتا وہ بے کار ہے۔ اگر آج انگلستان اور یورپ میں لاکھوں پڑھے لکھے ہندوستان کی سماجی زندگی کے بارے میں کچھ جانتے ہیں تو وہ بہت کچھ ملک راج آنند کے ناولوں ہی کا فیض ہے۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ آج ہندوستان سے زیادہ ولایت والے ملک راج آنند کے نام اور کام کو جانتے ہیں اُن کے بہت کم ناول ہندوستانی زبانوں میں چھپے ہیں، اردو میں صرف "قلی" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک راج آنند کی کتابیں ہندی، اردو ہی میں نہیں بلکہ ملک کی ہر زبان میں پھیلیں۔ پڑھی جائیں اور سمجھی جائیں۔

ملک راج آنند نے ناول ہی نہیں لکھے ہر ترقی پسند تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مل کر لندن میں ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی انجمن کو سب سے پہلے انھوں نے ہی شروع کیا۔ جب اسپین میں عوامی حکومت اور فرانکو کی فاشزم کی لڑائی ہو رہی تھی، اس وقت وہ اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے اسپین گئے تاکہ وہاں کے عوام کو ہندوستان کی دوستی اور ہمدردی کا پیغام پہنچائیں۔

دوسری بڑی لڑائی کے خاتمے پر ملک راج آنند ہندوستان واپس آگئے اور جب سے بمبئی میں رہتے اور کام کرتے ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین ہو یا عوامی تھیئٹر۔ سول لبرٹیز یونین یا امن عالم کے لئے کوئی جلسہ یا جلوس۔ فن کاروں کی کوئی کانفرنس یا ترقی پسند فلم بنانے کی کوئی کوشش۔ ملک راج ہر ایسے کام میں آگے آگے ہیں جو عوام کی بھلائی کے لئے ہو۔ یہی نہیں ان کی ہر لکھائی عوام کو انقلاب کا راستہ دکھاتی ہے ایسا انقلاب جو دنیا میں اور ہندوستان میں سامراج اور اقتصادی بے انصافی کو ختم کر دے گا اور ہر ملک میں عوامی حکومت۔ بھائی چارہ اور امن و امان قائم کرے گا۔

ادب کے بارے میں ملک راج کی کیا رائے ہے؟ وہ کہتے ہیں "میں حقیقت نگاری کو مانتا ہوں۔ مگر ایسی حقیقت نگاری جس میں فن اور شاعری کی چاشنی بھی ہو...... ایک طرف میں چاہتا ہوں کہ ایک نیا انقلابی انسان جنم لے اور دوسری طرف ایسا فن اور ادب چاہتا ہوں جو انسانیت سے بھرپور ہو...... میں سمجھتا ہوں کہ فن کا ایک انقلابی مقصد ہے۔ فن سے ہم زندگی کو بدل سکتے ہیں........ اگر فن کار اپنے فرض کو سمجھتا ہے اور عوام کی ضرورتوں کو دھیان میں رکھتا ہے، اگر وہ سچائی کو پرکھ سکتا ہے اور عوام کو نئی زندگی کا راستہ دکھا سکتا ہے تو وہ سچ مچ کا انقلابی ہے، اور ان انسانوں کے ساتھ ہے جو آج کی سماج کے ڈھونگ اور ڈھچر توڑ کر ایک نئی دنیا بنائیں گے"

اگر یہ پوچھا جائے ملک راج انقلابی ہے یا فن کار تو کہنا پڑے گا کہ وہ انقلابی بھی ہے اور فن کار بھی یا یہ کہ نہ صرف انقلابی ہے نہ محض فن کار........ وہ ایک انسان ہے جو دوسرے انسانوں سے پریم کرتا ہے۔ اور ان کے ساتھ بھلائی اور ترقی کے لئے لکھتا ہے، بولتا ہے اور لڑتا ہے۔

ہندوستان (بہ سلسلہ صفحہ ۴)

والے کے حصے کی مقدار کسٹوڈین کو بتا دے اور اس کے بقدر کرایہ یا لگان ادا کرتا رہے۔ اگر موجود شریک کا حصہ زیادہ ہے تو جائداد کا انتظام اسی کے ہاتھ میں رہے۔

پاکستان (بہ سلسلہ صفحہ ۴)

اس افسوس ناک واقعہ کا سبب یہ بتایا کہ چونکہ میں نے پریس مجلس مشاورت کے صدر کی حیثیت سے سول اینڈ ملٹری گزٹ کے خلاف کارروائی کرنے کی حمایت کی تھی اس لئے شری دالمیا کے اخبار کے حمایتیوں نے چند ایسے مطالبات کئے جن کا پورا کرنا میرے بس سے باہر تھا اور اس بہانہ لوگوں نے اسٹرائک کر دی۔ موصوف کے خیال کے مطابق سندھ یونین آف جرنلسٹ بھی چونکہ شری دالمیا کے حامیوں میں سے ہے اس لئے وہ اس اسٹرائک کو ہوا دے رہی ہے۔ لیکن مسٹر رشدی کے اس بیان کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا ہے، تمام پاکستان کے اخبار نہایت شدومد سے "سندھ آبزرور" کے منتظمین اور کراچی کی لوکل گورنمنٹ کی مذمت کر رہے ہیں۔ اب اس جھگڑے کو پنچایت کے ذریعے طے کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے

شہریت کے تقاضے

سلطان عالم خاں

شاید یہ بات دلچسپی سے سنی جائے کہ سماج کا وجود بنی نوع انسان سے زیادہ قدیم ہے۔ انسان کے وجود سے پہلے اکثر جانور سماجی رہن سہن کا تصور رکھتے تھے اور اجتماعی زندگی کے فائدے حاصل کرتے تھے جس سے آہستہ آہستہ اُن کی دماغی نشو و نما ہوتی رہی۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے جانور اور پرند مثلاً ہرن، بھیڑ، کتے، کبوتر اور شہد کی مکھیاں اپنے غول کے ساتھ رہنا پسند کرتے ہیں اور آرام و تکلیف اور خطرہ میں ایک دوسرے کے ساتھی اور مددگار رہیں، سماجی زندگی کے ذریعے ضروریات زندگی مثلاً غذا، تحفظ وغیرہ کا مسئلہ آسانی سے حل ہو جاتا ہے، اس سے ذہنی نشو و نما میں بھی امداد ملتی ہے تقسیم کار اور امداد باہمی کے ذریعے کشمکش حیات آسان بنتی ہے اور قوت عمل مضبوط ہوتی ہے۔

شہریت کا تخیل اتنا ہی قدیم ہے، جتنی سماج کی ابتدا بلکہ یوں سمجھئے کہ ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے ہر قسم کی شہریت میں کچھ عناصر مشترک ہیں۔ پہلے غیر ملکیوں، غلاموں، عورتوں، بچوں اور جماعت کے بعض اور ارکان کے علاوہ جو کوئی مخصوص حق نہیں رکھتے تھے، اور سب شہری نظام سلطنت میں عملی حصہ دار تھے، اس کی بنیاد پر جماعت سے کچھ حق طلب کرتے تھے، اور اس کی طرف سے کچھ ذمہ داریاں رکھتے تھے۔ قدیم رومن تہذیب میں شہریت کا تصور سکونت پر نہیں بلکہ انفرادیت پر قائم تھا، لیکن ۲۱۲ء میں یہ انفرادی حق شہریت سلطنت کے تمام رقبہ میں نافذ کر دیا گیا۔

درمیانی زمانے سے انیسویں صدی کے آغاز تک شہریت کا مقصد صرف یہ تھا کہ جاگیرداری مداخلت سے تحفظ اور آزادی حاصل ہو مگر یہ کوشش بے کار سی بن جاتی تھی، اس لئے کہ شہریت کا مرتبہ متمدن ممالک مثلاً انگلستان میں صرف زمینداروں اور مالکان آراضی تک محدود تھا جو معاشی فوائد کو لاشرکت غیرے اپنی اجارہ داری سمجھتے تھے اس لئے کہ سارا سیاسی اقتدار ان کے ہاتھ میں تھا، سچ پوچھئے تو جاگیرداری نظام اور ذات پات کی تمیز نے بعض ملکوں میں اس پاکیزہ نظریہ کو ایک غلط عملی جامہ پہنایا اور سماج کی دشواریوں کا حل تلاش کرنے کے بجائے اس میں اور پیچیدگیاں ڈال دیں۔

قدیم دنیا شہروں کی دنیا تھی اور موجودہ دنیا کا رجحان بھی شہروں کی طرف ہے۔ درمیان میں دسویں صدی تک شہروں کا زوال رہا لیکن گیارھویں صدی سے ان میں از سر نو زندگی کی رونق اور چہل پہل پیدا ہوگئی شہریت کا موجودہ تصور جو قدیم شہری اور قومی

> ......شہریت کا موجودہ تصور جو قدیم شہری اور قومی ریاستوں کی میونسپلٹی سے لیا گیا ہے دو عناصر کا مجموعہ ہے۔ ایک تو تخیل آزادی جس کی بنیاد قدیم اخلاقی فلسفہ اور درمیانی زمانہ کے انفرادیت کے حقوق پر ہے۔ دوسرے ایک سیاسی وحدت کی ممبری کا تخیل، جس میں پبلک فیصلوں یا تجویزوں پر امداد باہمی کے طور پر عمل ہو۔ اس ذمہ داری میں فوجی خدمت اور محصول بھی شامل ہیں......

ریاستوں کی میونسپلٹی سے لیا گیا ہے، دو عناصر کا مجموعہ ہے، ایک تو تخیل آزادی جس کی بنیاد قدیم اخلاقی فلسفہ اور درمیانی زمانے کے انفرادیت کے حقوق پر ہے دوسرے ایک سیاسی وحدت کی رکنیت کا تخیل جس میں پبلک فیصلوں یا تجویزوں پر امداد باہمی کے طریقۂ عمل پر ہو۔ اس ذمہ داری میں فوجی خدمت اور محصول بھی شامل ہیں برخلاف اس کے اینگلو سیکسن اور رومن ریاستوں کے جرمن حکومت نے شہریت کے فرائض میں جبریہ تعلیم کے قانون کو بھی شامل کر لیا تھا۔

ممالک متحدہ امریکہ میں شہریت کے تصور پر وہاں کے خداوندان سیاست کی رنگینی کا کافی اثر پڑا خصوصاً نئے آزادی کے منشور میں "زندگی، آزادی اور آرام و آسائش کے لوازمات" شامل کر رکھے ہیں اور انھوں نے ولغریبیوں کو اصلی طور پر ملکی حقوق سمجھ رکھا ہے۔ اگرچہ شہریت کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں، لیکن امریکہ کے چیف جسٹس ویٹ نے اس کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ صاف اور واضح ہے، ان کا کہنا ہے کہ بغیر لوگوں کے قوم نہیں بن سکتی۔ کسی سیاسی گروہ کا تخیل یہ ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کی جماعت اپنے مشترکہ مفاد کی خاطر کام کرے۔ فرد جماعت کا فرماں بردار بنے اور اس کے عوض میں حفاظت کا طلب گار ہو، اس رشتے کے لئے نام کی تلاش ہوئی کہ آخر فرد ریاست یا ملک کا کیا کہلائے، اس کے لئے تین لفظ استعمال ہوئے رعایا، باشندہ اور شہری۔ نام کے انتخاب میں طرز حکومت کو بڑا دخل ہے۔ موجودہ جمہوری دور میں لفظ 'شہری' کا استعمال زیادہ بڑھتا جا رہا

ہے، اس سے مراد ہے قوم کا فرد اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ شہریت کا لفظ جمہوریت کے ساتھ کچھ گھل مل سا گیا ہے۔

کبھی کبھی یہ غلطی ہوتی ہے کہ شہریت سے مراد محض شہر کے بسنے والے لوگوں کے حقوق سمجھے جاتے ہیں، لیکن یہ صحیح نہیں بلاشبہ قدیم مصر سے لے کر موجودہ امریکہ تک انسان کی ذہنی اور دماغی نشو و نما شہری رقبہ میں ہوئی۔ یہ صحیح ہے کہ بیسویں صدی میں روم میں سب سے بڑی میونسپلٹی تھی اور وہاں ایک شورہ کا انتظام تھا، سچ تو یہ ہے کہ میونسپلٹی یا بلدیہ کا تخیل یہیں سے شروع ہوا العساق بھی مصنف دنیا رومن جورس پروڈنس (اصول قانون) کو مانتی ہے۔ انقلاب فرانس سے یونانی اور رومن شہریت کی ابتدا ہوئی۔

عام شہریت کے علاوہ غیر حقیقی شہریت بھی خاصہ درجہ رکھتی ہے۔ اس کے ذریعے غیر ملکیوں کو بعض شرائط اور پابندیوں کے ساتھ شہری تسلیم کیا جاتا ہے غیر حقیقی شہریت کا حق انگلستان میں کبھی پوری طرح تسلیم نہ ہو سکا، لیکن ممالک متحدہ امریکہ میں اس کی حمایت کی جاتی رہی۔

یہ امر مسلم ہے کہ شہریت کا حق دیہاتیوں کو بھی اسی طرح حاصل ہے جیسے شہر میں رہنے والوں کو، بالخصوص ہمارے جیسے ملک میں جہاں ۹۰ فی صدی لوگ دیہات میں بستے ہیں اور زیادہ ضروری ہے کہ امداد باہمی کا اصول جو شہریت کی جان ہے دیہات میں بھی نافذ کیا جائے۔ دنیا میں دیہاتی زندگی نہ صرف سماجی بلکہ معاشی طور پر بھی کمزور ہو گئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آبادی دیہاتوں سے شہروں کی طرف برابر منتقل ہو رہی ہے۔ فرانس اور امریکہ میں جہاں زراعت سائنس میں تبدیل ہو کر رہ گئی ہے منتقلی اور بھی زیادہ نمایاں ہے، مغربی ملکوں میں بلجیم اور ڈنمارک کی حکومتوں نے ایک بڑی حد تک اس کا حل تلاش کر لیا ہے اس قسم کے حل میں گھریلو صنعتوں کی ترقی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ سوئٹزرلینڈ اور ناروے میں بجلی کے ذریعے دیہاتی صنعتوں کو استحکام مل چکا ہے ہمارے ملک میں یہ مسئلہ اور بھی زیادہ اہم ہے۔ اس لئے کہ ہمارے شہریوں کا اصل پیشہ زراعت ہے، اس سلسلے میں کاشت کا از سر نو انتظام اور امداد باہمی کے طریقے کا رواج بڑا ضروری ہے اگرچہ ہمارے آج کے موضوع کے لئے اس پر تفصیلی بحث غیر متعلق ہے۔

ابتدائی زمانے میں گاؤں حقیقی اور پھر مصنوعی یا بناوٹی برادری کے تعلق سے بندھا رہا۔ دیہاتوں کو مضبوط بنانے اور ان کی پرانی شان واپس لانے کے لئے یہی ضروری ہے کہ دیہات میں امداد باہمی کا جال بچھ جائے۔ جاپان کی ترقی کا راز اس میں مضمر تھا کہ اس ملک کے ۸۰ فی صدی گاؤں میں امداد باہمی کی انجمنیں موجود تھیں، ہندوستان میں کاشتکاری کی قومی صنعت کا مرتبہ دیا جاتا ہے

...کی پچھلی تاریخ پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ اصل اختراکیت [illegible] موجود تھا اور [illegible] طالب [illegible] معاشی حالت [illegible] تقاضا یہ بھی ہے [illegible] کے علاوہ اس کے لئے [illegible] سامان [illegible] ان تمام مسائل کا حل صرف شہریت کی صحیح تعلیم ہی میں مل سکتا ہے، جو پڑوسی کو اس کا صحیح حق دلوا سکتی [illegible]

آج دنیا انتہائی پیچیدہ بن کر رہ گئی ہے اور شہریت کے تقاضے اور ان کا حل ہی اس گتھی کو سلجھا سکتا ہے مگر ابھی تک اس طرف عام طور پر اتنی توجہ نہیں دی گئی جتنی ضروری تھی۔ اس کی بھی ضرورت ہے کہ شہریت کے متعلق لوگوں کو صحیح ٹریننگ دی جائے۔ مطلق العنان حکومتیں لوگوں کے دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئیں مگر جمہوریت کا تقاضا ہے کہ عقل اور دلائل کی روشنی میں ہم وفاداری کا سبق سیکھیں۔ ایک عالمگیر بھائی چارہ کی بنیاد ڈالیں اور اس کو پروان چڑھائیں۔ شہریت کی ٹریننگ کے لئے یونیورسٹیاں صحیح جگہ نہیں جہاں طالب علم اس عمر میں پہنچتے ہیں کہ ان کی عقل و شعور پختہ ہو جائیں۔ تعلیمی نصاب میں یہ ٹریننگ خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں استاد کی بڑی ذمہ داری ہے، اور وہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔ اس کی شخصیت اور معمولات زندگی طلبا پر بڑا اثر ڈال سکتے ہیں۔ بورڈنگ ہاؤس کی رہائش آئندہ زندگی میں پڑوسی کے حقوق سکھانے میں بڑی معاون ہو سکتی ہے۔ نصاب میں عملی تجربات کا موقع ہونا چاہئے۔ اسکاؤٹ اور گرل گائیڈ تحریک کا یہی مقصد ہے۔ براڈکاسٹنگ بھی اس ٹریننگ میں امداد پہنچا سکتی ہے۔

بچے والدین طالب علم یا تاجر ہونے کے علاوہ جمہوریت کے شہری کے لئے کچھ اور چیزیں بھی ضروری ہیں۔ یہ لازمی ہے کہ اس کے دل میں پڑوسیوں اور اپنے ساتھیوں کی بھلائی کی لگن ہو۔ سماجی زندگی کا اسے پورا احساس ہو۔ اپنے فوری مفاد یا اپنی مخصوص جماعت کے مفاد کو عام مفاد پر قربان کر سکتا ہو۔ عام مفاد کی خاطر اپنے حصے کا پورا کام کرے لیکن ان سب باتوں کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جمہوریت کا شہری آزاد رائے کا حامی ہو۔ وہ اپنے پڑوسی کے حقوق کا ویسا ہی نگہبان ہو جیسا اپنے حقوق کا۔ آزادی کا [illegible] اور دوسروں کی انفرادیت کا احترام کرنے والا ہو اور مخالف رائے سے رواداری کا سلوک کرتا ہو۔ وہ اکثریت اور اقلیت کے جھگڑوں سے مذہبی تنگ نظری اور تعصب سے پاک ہو، وہ اس پر عقیدہ رکھتا ہو کہ تبادلہ خیالات کے فیصلے رائے عامہ پیدا کرنے کا طریقہ صحیح ہے اور قوت کے استعمال کا غلط۔ ان اخلاقی خوبیوں کے علاوہ اس میں ذہنی خوبیاں بھی ہونی چاہئے۔ یہ کافی نہیں کہ وہ سچائی کا پرستار ہو بلکہ یہ بھی جانے کہ سچائی کیسے اور کہاں ملتی ہے

گذشتہ سو سال میں شہریت نے ترقی کر کے ووٹ کا حق حاصل کیا۔ ابتداء میں حق رائے دہندگی محدود تھا، اور ملکیت یا کسی حد تک تعلیمی معیار پر اس کی بنیاد تھی لیکن رفتہ رفتہ یہ حق ہر بالغ کو پہنچا دیا گیا ہے، اور اب اس میں جنس کی تمیز بھی اٹھ چکی ہے۔ عام رائے دہندہ سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ موجودہ سیاسیات اور معاشیات کے پیچیدہ مسئلوں پر صحیح رائے قائم کر سکے گا۔ وہ یہ رائے ضرور رکھتا ہے کہ امن و امان کا دور دورہ ہو لیکن اس کے حصول کا طریقہ نہیں جانتا۔ اس کی تمنا ہے کہ بے روزگاری کا سوال حل ہو اور معیار زندگی اونچا ہو۔ لیکن یہ نہیں جانتا کہ کیسے ہو۔

ایک تعلیم یافتہ جمہوریت میں ایک رائے دہندہ کو یہ بھی جاننا چاہئے کہ اس کی ذمہ داریاں نہ صرف اس کے اپنے ملک سے وابستہ ہیں بلکہ تمام دنیا سے جو سائنس کی بدولت آج سمٹ کر بہت چھوٹی رہ گئی ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ انصاف سب کے لئے یکساں ہو، وہ جانے کہ حکومت کا بنیادی اصول پنچایت ہے قوت نہیں۔ ہر بچہ کو بلا کسی امتیاز کے پوری جسمانی اور دماغی نشو و نما کا سامان بہم پہنچنا چاہئے۔ جمہوریت کے شہری کو لازم ہے کہ بہترین نمائندہ منتخب کرے اور انتخاب کے بعد اس پر پورا اعتماد اور بھروسہ رکھے ہمیشہ انتخاب کے موقع پر ایمانداری ہمت اور قابلیت کو ترجیح دے اور ایک ذمہ دار رائے عامہ کے بنانے میں امداد کرے۔ ہو سکتا ہے یہ ایک محض آئیڈیل ہو۔ پڑوسی کے حق پہچانو۔ شہریت کا بنیادی گر ہے۔ چنانچہ مذہبی اور انسانی دونوں زاویہ نگاہ سے شہریت ایک عظیم الشان برادری کا نظریہ ہے۔ تہذیب کا گہوارہ وہیں رہا ہے جہاں قدرت نے فیاضی کے ساتھ اپنی نعمتیں اتاری ہیں۔ اسی واسطے پہلے پہل شہریت کا تخیل بھی ایسے ہی مقامات پر ظہور میں آیا۔ مصر، روم، یونان اور بابل کی تاریخ میں شہریت کے تخیلات کی جھلک نظر آتی ہے۔ زمانے کے ساتھ ساتھ اس کی صورتوں میں بھی تبدیلیاں آتی رہیں، اور رفتہ رفتہ اس کی تکمیل ہوتی گئی۔

ابتدائی دور سے انسان نے زندگی اور جائداد کے تحفظ کی ضرورت محسوس کی۔ شروع میں اسے خاندان کی تنظیم پر انحصار کرنا پڑا۔ اس کے بعد جاگیرداری نظام کا دور آیا۔ جاگیرداری سے سلطنت کا ارتقا ہوا اور شاہنشاہیت کا زمانہ آیا۔ اس کے بعد دستوری شاہنشاہیت نے جنم لیا اور رفتہ رفتہ آج دنیا غیر مذہبی جمہوریت کے آغوش میں پناہ لیا چاہتی ہے۔ پہلے سماج کی بنیاد مذہب پر رکھی جاتی تھی لیکن آج معاشیات پر رکھی جاتی ہے اس لئے شہریت کا روپ بھی بدلتا رہا لیکن بنیادی اصول برابر اپنی جگہ پر قائم ہے اور اب تو ایک مرتبہ پھر دنیا لامرکزیت کی طرف کھنچی جا رہی ہے، جہاں سے حقیقت میں شہریت کی ابتدا ہوئی تھی۔

دیہاتی مثل ہے پاس کا نائی اور دور کا بھائی برابر ہوتا ہے۔ سچ پوچھئے تو اس مقولے میں شہریت کی تعلیم کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے۔ آج ہم جس نازک ادوار سے گذر رہے ہیں اس کی [illegible] یہ ہے کہ ہم شہریت کے اعلیٰ اور پاک نظریے کو اپنائیں اور اپنی آزادی کو برقرار رکھنے اور اپنے ملک کو [illegible] شاہراہ ترقی پر آگے بڑھانے کے لئے اس سے پورا پورا نفع حاصل کریں۔ ہمارے سامنے بڑے اہم اور نازک مسئلے ہیں جن کا حل شہریت کی صحیح تعلیم ہی میں مل سکتا ہے۔ شرنارتھی، چھوت چھات صوباتی اور دیہاتی تعصب، فرقہ وارانہ سوال، پردہ نابالغوں اور بیواؤں کی شادی، مشترکہ خاندان، صنعت و حرفت اور کاشت و ملکیت کا از سر نو انتظام اور اسی قسم کے بہت سے دوسرے مسائل ہیں جن سے حکومت اور تولیت پر براہ راست اثر پڑتا ہے، کیونکہ حکومت محض قانون کے ذریعے ان کا حل نہیں نکال سکتی۔ ان کے حل کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ ہم صحیح شہری بنیں۔ سماج کے ہر ممبر کو اپنا ہمسایہ سمجھ کر اس کے حقوق دیں، اور حکومت اور سماج کے لئے جو ہماری ذمہ داریاں ہیں انھیں پورا کریں اور اس کے عوض میں اندرونی اور بیرونی تحفظ اور حقوق طلب کریں جن میں ضمیر کی اور مذہب کی آزادی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمارا اونچا اور مضبوط شہری بننا حکومت کے لئے بڑا مفید ثابت ہو گا۔ آپ نے فرانس اور انگلستان کے شہریوں کے دوران جنگ کے کارنامے پڑھے ہوں گے۔ یہ شہریوں کی تنظیم تھی جس نے انگلستان کو شکست قبول کرنے سے روکا اور شکست خوردہ فرانس کو اتنی جلد پھر دنیا کے ممتاز ممالک کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا۔

شہری کے وہ تمام فرائض گننا جو ہمسایہ کے متعلق اس کے ذمے عائد ہوتے ہیں بڑا مشکل ہے۔ یہ صرف تاریخ تجربہ اور روایات کی روشنی میں محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ وقت کے اعتبار سے ان کی رسمی شکل بھی بدل سکتی ہے۔ مگر جہاں تک اسپرٹ اور بنیادی اصول کا تعلق ہے اس میں مطلق فرق نہیں آتا، بلکہ ایک طرح پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ اپنے کو دہرا رہی ہے اور دنیا مادیت سے بیزار ہو کر پھر شان دار ماضی کی طرف پلٹ رہی ہے جو روحانیت سے زیادہ قریب تھا اس لئے شہری کو اپنی جگہ پر پہنچنے کا سنہرا موقع ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ ایک مرتبہ پھر سچائی اور اہنسا ہمارے فرائض شہریت میں ہمارے لئے مشعل ہدایت بن جائیں، تاکہ ہندوستان کی ذہنیت آفتاب بن کر چمکے ✦

کیا سر کے بالوں کا گرنا رک سکتا ہے؟

(بسلسلہ صفحہ ۲)

کچھ روئیں سے اُگ آتے ہیں مگر یہ بال نہیں ہوتے اور عموماً آدھا انچ بڑھنے کے بعد جھڑ جاتے ہیں۔

الٹرا وائلٹ ریز کا علاج اگر کسی ماہر کی نگرانی میں ہو جو اس کی حدود کو جانتا ہے اور اس کے خطروں سے واقف ہے تو اس سے تھوڑا بہت فائدہ ہو سکتا ہے مگر زیادہ توقع اس سے بھی نہیں رکھنی چاہئے (ماخوذ)

نئی روشنی دہلی

ادارۂ تحریر:
ڈاکٹر سید عابد حسین، صالحہ عابد حسین
عبداللطیف اعظمی

شرح چندہ ممالک غیر

ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دوسرے ملکوں کے لئے "نئی روشنی" کا چندہ حسب ذیل ہے

سالانہ ... ... دس روپے
ششماہی ... ... ساڑھے پانچ روپے
فی پرچہ ... ... چار آنے

شرح اشتہارات

ڈھائی روپے فی انچ سنگل کالم
(ایک صفحہ میں چار کالم ہوتے ہیں) مینیجر

تاریخ اشاعت:- یکم، ۸، ۱۶، ۲۴ چندہ:- سالانہ چھ روپے ششماہی للعہ

دفتر "نئی روشنی" جامعہ نگر دہلی

طابع و ناشر:- عبداللطیف اعظمی (بی اے، جامعہ) مطبوعہ: جید پریس دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۳ نمبر ۱۷	یکم نومبر ۴۹ء	ایڈیٹر:۔ ڈاکٹر سید عابد حسین

امام حسین علیہ السلام

صالحہ عابد حسین

ہزارہا سال کی تاریخ کے ورق اُلٹ جائیے مگر حسینؑ کا ثانی نظر نہیں آئے گا دُنیا میں بڑے بڑے بہادر، بڑے بڑے فاتح اور سورما گذرے ہیں جنھوں نے کارھائے نمایاں کئے لیکن زمانے کی گردش نے اِن کارناموں کو دھندلا کر دیا اور اُن کی عظمت کو مِٹا دیا لیکن کربلا کے میدان میں جو عظیم الشان قربانی کی گئی تھی اُس کی یاد آج تیرہ سو برس بعد بھی اُسی طرح تازہ ھے۔

امام حسینؑ کی شان میں خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

شاہ است حسینؑ، بادشاہ است حسین — دین است حسینؑ، دین پناہ است حسینؑ
سرداد، نہ داد دست در دست یزید — حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؑ

اور یہ کس حسینؑ کی شان میں ہے؟ وہ جو محمد مصطفےٰ کا پیارا نواسہ ہے، جس کی شان میں ہادی برحق نے فرمایا ہے کہ "حسین منی و انا من الحسین" جس کی ناز برداری اور خاطر حضور کو بے انتہا مطلوب تھی اور جس کو آں حضرت نے بارہا اپنی پیٹھ پر سوار کیا ہے۔ وہ حسینؑ جو سیدۃ النسا فاطمہ زہرا کا لخت جگر اور گود کا پالا ہے جس نے اس ماں کی گود میں تربیت پائی ہے جو صفات و اخلاق میں محمدؐ کا دوسرا نمونہ تھیں اور جن کی جود و سخا اخلاق و مروت، ریاضت اور عبادت آج تک ضرب المثل ہے۔

وہ حسینؑ جس نے علی مرتضیٰ جیسے بہادر، سخی و فیاض اور صاحب علم و فضل کے سایہ میں بچپن اور جوانی گذاری اور جس کے ساتھ کھیلنے والا ساتھی حسنؑ مجتبےٰ جیسا حلیم منکسر المزاج، خوش خلق اور صلح کل بھائی تھا جس انسان نے دنیا کے ایسے بے مثل اشخاص کی تربیت اور تعلیم پائی ہو اس کی صفات عالیہ کی کیا انتہا ہو سکتی ہے؟ یہی وجہ تو ہے کہ حسینؑ کی شان کرم، اُن کی شجاعت و بہادری، عظمت و بزرگی، صبر و استقلال، ایمان کی پختگی اور جن کی مظلومی اور مصیبتوں کی انتہا آج تیرہ سو برس بعد بھی دنیا کو حیرت میں ڈال رہی ہے۔

ہزارہا سال کی تاریخ کے ورق الٹ جائیے مگر حسینؑ کا ثانی نظر نہیں آئے گا۔ دنیا میں بڑے بڑے بہادر، بڑے بڑے فاتح اور سورما گذرے ہیں جنھوں نے کارہائے نمایاں کئے، لیکن زمانے کی گردش نے ان کے کارناموں کو دھندلا کر دیا اور ان کی عظمت کو مٹا دیا۔ لیکن کربلا کے میدان میں جو عظیم الشان قربانی کی گئی تھی اس کی یاد آج تیرہ سو برس بعد بھی اُسی طرح تازہ ہے۔

آخر اس واقعہ میں ایسی کیا خاص بات ہے جس سے تمام دنیا کے لوگوں پر اثر پڑتا ہے اور ساری دنیا میں حسینؑ کا نام عزت اور احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ بظاہر یہ ملک عرب کی ایک معمولی سی لڑائی ہے جس میں دو شخص خلافت کے دعوے دار ہیں، اور جس میں حسینؑ کی تھوڑی سی فوج یزید کی ہزاروں کی فوج سے لڑ کر ختم ہو جاتی ہے اور حسینؑ کے دشمن یزید کو فتح حاصل ہوتی ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ گو ظاہر میں شکست حسینؑ کی ہوئی مگر اسی سے انھوں نے ابدی حیات حاصل کر لی۔ شہادت حسینؑ کی ہوئی اور خاتمہ یزیدیت کا۔

قتل حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد (جوہر)

امام حسینؑ کی اس فتح کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے یہ جنگ حکومت اور دولت کے لیے، ملک گیری کے لئے، کسی ذاتی دشمنی یا انتقام کے لیے نہیں کی تھی، بلکہ حسینؑ نے تو اخلاق اور شرافت، آزادی اور ایمان کی سلامتی، حق کو قائم رکھنے اور باطل کو مٹانے کے لیے اپنی جان کی بازی لگائی تھی۔

یزید چاہتا تھا کہ اسلام کے روشن چہرے کو داغ دار کر دے اور اسلام نے اخوت مساوات، انصاف اور جمہوریت کا جو سبق پڑھایا ہے اسے لوگوں کے دل سے مٹا دے۔ ایسے شخص کا رسول خدا محمد مصطفےٰ کا جانشین ہونا مذہب اسلام کے لئے ایسا سخت خطرہ تھا جس کا خیال بھی ہولناک ہے۔ یزید نے تختِ خلافت پر قبضہ کرتے ہی مدینے کے حاکم کو حکم بھیجا کہ جلد سے جلد سب اہل مدینہ خصوصاً حسینؑ ابن علی، عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ سے میری بیعت لو۔ حاکم مدینہ نے امام حسینؑ کو بلا کر یزید کا پیام سنایا۔ آپ نے فرمایا کہ یزید فاسق و فاجر ہے وہ اسلام (بقیہ صفحہ ۲ پر)

فہرست مضامین

کے ظاہری احکام کی پابندی بھی نہیں کرتا ہے، اور اسلام کی باطنی خوبیوں سے بھی منکر ہے۔ اس کی بیعت کرنا اسلام کو خطرے میں ڈالنا ہے، اس لئے میں ایسے شخص کی بیعت نہیں کر سکتا۔ حاکم مدینہ نے یہ باتیں یزید کو لکھ بھیجیں۔ یزید نے حیلہ سازی، لالچ اور جبر غرض ہر طریقے سے لوگوں سے اپنی خلافت منوالی تھی اور اب اسے صرف حسینؑ اور ان کے خاندان اور ہم خیال ساتھیوں سے بیعت لینا باقی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر نواسۂ رسول میری بیعت کر لیں گے تو پھر کون ہے جو میرے خلیفۂ رسول ہونے سے منکر ہو سکے۔

حسینؑ کے بیعت کرنے کے معنی یہ تھے کہ نواسۂ رسول تک نے (جن کے گھر سے اسلام نکلا ہے اور اس کی اصلی روح کو جاننے اور سمجھنے والے ہیں) اس شخص کی بیعت کر لی یعنی (معاذ اللہ) اس کو اپنا ہادی اور رہنما مان لیا تو اس کی ہر بات اور ہر فعل کو اسلام کے موافق سمجھا جاتا اور (خدانخواستہ) ساٹھ سال کے اندر اندر مذہب اسلام اور اسلامیت دنیا سے رخصت ہو جاتی۔

حسینؑ جانتے تھے کہ یزید کے حکم سے انکار کا لازمی نتیجہ موت ہے۔ آپ راہ حق میں جان دینے کو تیار تھے مگر اس طرح کہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ حسینؑ نے کس مقصد کے لیے جان دی۔ آپ نے اپنے دوستوں اور عزیزوں کو جمع کر کے اپنا مقصد بتایا اور مدینے سے مکہ معظمہ جانے کا قصد ظاہر کیا چنانچہ آپ نے خاندان کی سب عورتوں، بچوں (سوا ایک بیمار بیٹی فاطمہ صغریٰ کے)، اور مرد عزیزوں اور چند دوستوں کو ساتھ لیا اور مکہ معظمہ روانہ ہو گئے۔ وہاں چند روز قیام کے بعد کوفہ والوں کے خطوط آنے شروع ہوئے کہ یہاں آکر ہماری ہدایت کیجئے اور ہمیں گمراہی سے بچائیے۔ آپ نے اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیل کو وہاں حالات دیکھنے اور لوگوں سے معاہدۂ وفاداری لینے کے لئے اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا، اتنے میں حج کا زمانہ قریب آچکا تھا۔ حضرت کا ارادہ تھا کہ خود حج کے بعد روانہ ہوں مگر آپ کو معلوم ہوا کہ یزید کے بہت سے آدمی یہاں لگے ہوئے ہیں کہ چپکے سے حسینؑ کو شہید کر دیں۔ اول تو امام حسینؑ کو یہ گوارا نہ تھا کہ آپ کی وجہ سے خاص مکہ معظمہ میں قتل و خون ہو اور اس کی حرمت میں فرق آئے۔ دوسرے آپ جانتے تھے اگر چپکے سے آپ کو شہید کر دیا گیا تو دنیا کو خبر نہ ہوگی کہ حسینؑ کو کس نے مارا اور کیوں؟ یہ مشہور ہوگا کہ کسی دشمن نے قتل کر دیا، لیکن حسینؑ کو تو یزید کی حرکتوں کا راز فاش کرنا تھا۔ حق اور باطل، ایمان اور کفر، یزیدیت اور حسینیت کا فرق دکھانا تھا۔ حسینؑ کو تو یہ دکھانا تھا کہ جب کبھی دنیا میں حق اور باطل، انصاف اور ظلم، ایمان اور کفر کا مقابلہ ہو تو انسان کو حق، انصاف اور ایمان کی حمایت کے لئے جان، مال، آل اولاد سب کچھ قربان کر دینا چاہئے۔ حسینؑ جانتے تھے کہ اس جنگ میں انھیں ظاہری فتح نہیں ہو سکتی، اگر وہ دنیاوی فتح چاہتے تو فوج جمع کرتے، لوگوں کو اپنی طرف کرنے کی کوشش کرتے اور پروپیگنڈا کے وہ سب اصول برتتے جو جنگ میں برتے جاتے ہیں۔ مگر اس کے برعکس وہ ہر موقع پر لوگوں کو جتا دیتے تھے کہ میں لڑائی فتح کرنے کے لئے نہیں بلکہ جان دینے کے لئے جا رہا ہوں، اُن کے ساتھ چھوٹے چھوٹے بچے، بہت سی عورتیں، کمسن لڑکے اور تھوڑے سے جوان اور کچھ بوڑھے تھے۔ غرض امام حسینؑ اپنے مختصر سے قافلے کے ساتھ حج سے پہلے ہی کوفے کی جانب روانہ ہو گئے۔ سخت گرمی کا زمانہ تھا اور گرمی بھی عرب کی جان لیوا گرمی اور صحرائے عرب کا سفر! گرمی اور سفر کی تکلیفیں سہتے ہوئے، جب کوفے سے کچھ فاصلے پر پہنچے تو آپ کو ایک شخص سے معلوم ہوا کہ کوفیوں نے دغا کی، اپنے اقرار سے پھر گئے اور آپ کے ایلچی مسلم کو بیدردی سے قتل کر دیا لیکن حسینؑ کے ارادے میں فرق نہیں آیا اور آپ نے وہاں جانے کا فیصلہ برقرار رکھا۔ تھوڑی دور راستے پہنچے تھے کہ یزید کی فوج کے ایک افسر "حر" نے ایک ہزار سواروں کے ساتھ آ کر حسینؑ کا راستہ روک لیا مگر اس حالت میں کہ سردار اور فوج اور گھوڑے سب پیاس سے نیم جان تھے۔ بھلا حسینؑ کسی انسان کو، خواہ وہ دشمن ہی ہو، پیاس سے بیقرار کس طرح دیکھ سکتے تھے۔ آپ نے اپنا سب پانی حر اور اس کی پیاسی فوج کو پلا دیا۔ اس واقعہ نے حر کے دل پر بہت گہرا اثر کیا، پھر بھی اس نے ابن زیاد (حاکم کوفہ) کے حکم کی تعمیل کی اور امام حسینؑ کو اس راستے سے اپنا رخ دوسری طرف پھیرنے پر مجبور کیا۔

محرم کے مہینے کی دوسری تاریخ تھی کہ امام حسینؑ کربلا کی سرزمین پہنچے۔ امام حسینؑ کے چھوٹے بھائی عباسؑ نے دریائے فرات کے کنارے خیمے نصب کئے۔ لیکن ابھی پوری طرح خیمے لگے بھی نہ تھے کہ دشمن کی فوج آ گئی، اور کہا کہ دریا کے کنارے یزید کی فوج اترے گی آپ صحرا میں جا کر خیمے لگائیے۔ علیؑ کے بہادر بیٹے عباسؑ کو جلال آ گیا تلوار کھینچ لی اور چاہتے تھے کہ سرکش فوج کا منہ پھیر دیں کہ حسینؑ نے اپنے بہادر بھائی کو روک دیا اور کہا بھائی ہمیں ایسی معمولی باتوں کے لئے لڑنا نہیں ہے، چلو صحرا ہی میں رہیں گے خدا تو ہر جگہ موجود ہے۔ عباسؑ نے بڑے بھائی کے حکم پر سر تسلیم خم کر دیا اور دریا سے بہت دور تپتے ہوئے لق و دق صحرا میں جہاں نہ پانی کا نام تھا، نہ کسی درخت کا نشان، اوپر تپتا ہوا سرخ آفتاب تھا اور نیچے تپتی ہوئی ریت حسینؑ کے خیمے نصب کئے گئے۔ یزید کی فوجوں پر فوجیں آ رہی تھیں اور دریا کے کنارے اترتی تھیں یہاں تک کہ دور دور تک دریا پر دشمن کا قبضہ ہو گیا۔ صحیح روایات میں یزید کی فوج کم سے کم ۳۰ ہزار تک بتائی جاتی ہے اور حسینؑ کی فوج کتنی تھی صرف ۷۲ نفوس جن میں لڑکے، جوان، بوڑھے، یہاں تک کہ ایک چھ مہینے کی جان علی اصغر تک شامل تھے۔

۶ محرم کو عمر بن سعد جو یزید کی فوج کا افسر تھا، شان و شوکت سے کربلا میں آیا اور امام حسینؑ کو پیام بھیجا کہ یا تو یزید کی بیعت کرو ورنہ سر کٹانے کو تیار ہو جاؤ۔ حسینؑ نے بیعت سے انکار کیا اور اسے بھی سمجھانے اور ہدایت کی راہ دکھانی چاہی، لیکن اس نے کہا کہ یزید کا حکم ہے کہ حسینؑ سے کسی نہ کسی طرح بیعت لی جائے اور ابن زیاد حاکم کوفہ کا حکم ہے کہ اگر حسینؑ بیعت نہ کریں تو ان کو قتل کر دیا جائے۔ بار بار حسینؑ نے ان سب کو حق کا راستہ دکھانے کی کوشش کی مگر دنیا کے لالچ اور حرص و طمع نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی اور دل سیاہ کر دئے تھے۔

۷ محرم کو عمرو بن سعد نے امام حسینؑ پر پانی بھی بند کر دیا کہ شاید پیاس کی تکلیف سے مجبور ہو کر بیعت پر راضی ہو جائیں۔ صحرائے عرب کا تپنا، آفتاب کی تمازت، لو کی شدت اور اس پر پانی کی نایابی!! کہتے ہیں حضرت عباسؑ نے اس صحرا میں سات جگہ کنوئیں کھودے مگر کسی میں بھی پانی نہ نکلا۔ ایک دن بچے کچے پانی سے کام چلا دوسرے دن حضرت عباسؑ لڑ بھڑ کر چند مشکیں بھر لائے اور کمسن بچوں کو تھوڑا بہت پانی میسر ہو گیا، لیکن دسویں کی شب اور عاشورے کے دن تو پانی دیکھنے کو بھی نہ تھا۔ ۹ محرم کو ابن سعد لڑائی پر تیار تھا۔ مگر امام حسینؑ نے اس سے ایک رات کی مہلت لی تاکہ زندگی کی یہ آخری رات اپنے معبود حقیقی کی عبادت میں بسر کریں۔ رات کو آپ نے سب ساتھیوں اور عزیزوں کو جمع کر کے کہا "کل لڑائی ہے اور تم لوگوں میں سے جو اس میں شریک ہوگا اس کا مارا جانا یقینی ہے۔ یزید، ابن زیاد اور ابن سعد صرف میرے دشمن ہیں۔ اگر تم لوگ میرا ساتھ چھوڑ کر کہیں جانا چاہو گے تو وہ تمھیں نہیں روکیں گے۔ تم لوگوں میں سے جو جانا چاہے، بخوشی چلا جائے میں اجازت دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر آپ نے شمع گل کر دی کہ جانے والوں کو شرمندگی نہ ہو۔ مگر حسینؑ کے ساتھی بھی ان کی شان کے مطابق تھے، انھوں نے کہا مولا اگر ہم ستر مرتبہ زندہ کئے جائیں اور ہر مرتبہ آپ کی رفاقت میں سخت سے سخت تکلیف دے کر مارے جائیں تو وہ موت ہمیں ہزار زندگیوں سے بہتر معلوم ہوگی۔ غرض پہلے امام اور ان کے ساتھیوں نے رات عبادت الٰہی میں بسر کی۔ اُدھر خیموں میں اہل بیت حسینؑ کی سلامتی کی دعائیں … اپنے عزیزوں قریبوں کو سمجھانے میں رات گزاری، کوئی ماں اپنے کمسن بچوں کو ہدایت دے رہی تھی کہ دیکھو … پہلے ماموں پر تم جاں نثار کرنا۔ کہیں نوجوان بیوی شوہر کو جنگ کی ترغیب دیتی تھی، کہیں بیوہ ماں بیٹے کو قربانی کے لئے تیار کرتی تھی، کہیں بہنیں بھائیوں سے آخری دفعہ رخصت ہو رہی تھیں اور کہیں بیٹیاں باپ سے اور ماں جوان بیٹے سے وداع ہوتی تھی۔ آخر روز عاشورہ کی ہولناک صبح نمودار ہوئی۔ حسینؑ کے منجھلے بیٹے علی اکبر نے لحن داؤدی سے فجر کی اذان دی، اندر بیبیوں نے اور باہر حسینؑ اور اُن کے رفقا نے نماز صبح ادا کر کے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ حسینؑ خدا سے دعا کر رہے تھے کہ یارب میرے نانا کی امت کو گمراہی سے نکال اور ہدایت دے اور مجھے اس امتحان میں ثابت قدم رکھ۔

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
یکم نومبر ۱۹۴۸ء

جشن — یا — ماتم؟

کچھ اوپر تیرہ سو سال سے محرم ہر سال آتا ہے اور کربلا کے شہیدوں کی یاد تازہ کر جاتا ہے، خصوصاً سید الشہداء امام حسینؑ کی یاد جو حق کے پرستاروں کے لئے ایک گراں بہا سرمایہ ہے، کرۂ ارض کی غیر اقلیت میں پھیلے ہوئے کروڑوں مسلمان اور بہت سے غیر مسلم اس محسن خلق کے آگے محبت اور عقیدت کی نذر پیش کرتے ہیں جس نے انسانیت کے مرجھائے ہوئے پودے کو اپنے اور اپنے پیاروں کے خون سے سینچ کر پروان چڑھایا۔

لیکن حسینؑ کے عقیدت مندوں میں اس لحاظ سے فرق ہے کہ بعض ان کی دل گداز مصیبتوں کو یاد کر کے روتے ہیں اور ان کے حیرت انگیز کارناموں کا خیال کر کے خوش ہوتے ہیں اور ان پر فخر کرتے ہیں یہاں تک کہ جاہل عوام نے جن کی محبت کی سچائی اور عقیدت کی گہرائی میں کوئی شبہ نہیں ہے محرم کو اپنے مذاق اور ظرف کے مطابق ہولی اور دیوالی کی طرح ایک خوشی کا میلہ بنا دیا ہے۔

آئیے ذرا تھوڑی دیر کے لئے رسم و دستور سے الگ ہو کر عقل اور اخلاق کے نقطۂ نظر سے اس سوال پر نظر ڈالیں کہ شہیدوں کے زندۂ جاوید کارناموں کو یاد دلانے کا کون سا طریقہ مناسب اور مفید ہے کیا ہم ان کی شہادت کو ایک الم ناک حادثہ سمجھ کر نوحہ و غم کا موضوع بنائیں، یا اس کے شاندار پہلو پر زور دے کر جشن اور قصیدے کا موضوع قرار دیں۔

بظاہر دوسری بات زیادہ معقول معلوم ہوتی ہے ہر شہید کا واقعۂ شہادت روح انسانی کی قوت اور عظمت کی گویا ایک جیتی جاگتی مثال ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی کمزور مخلوق جو خود اپنی خواہشات اور جذبات اور زمانے کے حالات اور واقعات کے ہاتھوں میں ایک کھلونا ہے اور سیل حوادث میں تنکے کی طرح بہتا رہتا ہے جب دل پر رکھ لے تو چٹان کی طرح گڑ جاتا ہے موجوں کے تھپیڑے سہتا ہے طوفان سے ٹکر لیتا ہے اور چاہے ڈوب جائے مگر اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا، یہی گوشت پوست کا انسان جب ایمان کی حرارت سے معمور ہو جاتا ہے تو حق کی خاطر سر کٹا دیتا ہے، مگر باطل کے آگے سر نہیں جھکاتا اس لئے ہر شہید کا واقعۂ شہادت تحسین و آفریں کا، فخر و مسرت کا موقع ہے۔ آہ و فریاد، نالہ و بکا کا نہیں۔ اس کے علاوہ جو شخص نفسیات سے سرسری واقفیت رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ رنج و الم کے جذبات سے طبیعت میں پستی، قوت ارادی میں سستی اور قوت عمل میں کمزوری پیدا ہوتی ہے اور فخر اور خوشی کے جذبات سے ہمت بڑھتی ہے اور حوصلہ بلند ہوتا ہے، اس لئے اخلاقی اصول کا تقاضا بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ شہیدوں کی یاد میں صف ماتم نہ بچھائی جائے، بلکہ جشن آزادی منایا جائے۔

لیکن ذرا ٹھہریئے، اتنی جلدی فیصلہ نہ کیجئے۔ ذرا غور تو کیجئے کہ کیا واقعی شہیدوں کی شہادت کا تابناک پہلو اس کے المناک پہلو سے زیادہ نمایاں یا اہم ہوتا ہے؟ آپ نے یہ تو دیکھا کہ اس قسم کے واقعات ایک فرد خاص کی روحانی قوت اور عظمت کا ثبوت دیتے ہیں مگر اس کو نظر انداز کر دیا کہ ان سے عام انسانوں کی کمزوری اور کمتری ثابت ہوتی ہے۔ آپ نے یہ محسوس نہ کیا کہ ان سے روح انسانی کے عالم گیر اور ابدی المیے پر روشنی پڑتی ہے کہ ساری دنیا میں صدیوں تک ناحق اور ناانصافی کا وجود چار و ناچار برداشت کیا جاتا ہے اور صرف کبھی کبھی، کہیں کہیں ایسا ہوتا ہے کہ حق اور انصاف کی خاطر جان کی بازی لگائی جائے۔

خصوصاً واقعہ کربلا امام حسینؑ اور ان کے عزیزوں اور رفیقوں کا شاندار کارنامہ ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام کا اور انسانیت کا عبرت ناک المیہ ہے۔ وہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ جو ہادی برحق دنیا کے لئے اسلام کے نام سے توحید اور تقوے، عدل اور مساوات کا پیام لایا تھا اس کی آنکھ بند ہوئے چالیس ہی سال گذرے تھے کہ ایک ایسا شخص اس کا جانشین بن بیٹھا جس کی ساری زندگی اسلام کے پیام کی نفی تھی۔ اس کو اکثر لوگ فاسق فاجر اور بعض ملحد اور مشرک سمجھتے تھے اس نے عالمگیر برادری اور برابری کی تحریک کو اپنے خاندان یا زیادہ سے زیادہ اپنی قوم کے سیاسی اقتدار کی تحریک بنا دیا تھا۔ اسلام کو عرب امپریلزم کے سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ مگر المیہ یہ نہ تھا کہ اس نے پیغمبر اسلام کی خلافت کا دعویٰ کیا تھا، المیہ یہ تھا کہ مسلمان اس دعوے کو مانتے تھے اور جو نہیں مانتے تھے وہ اس سے انکار کرنے کی جرأت نہیں رکھتے تھے۔ اس پس منظر میں حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کی شہادت کو دیکھئے تو اس کا المناک پہلو پوری وضاحت اور شدت سے آپ کو نظر آئے گا اور آپ کا دل خود کہے گا بے شک یہ موقع رنج و الم کا ہے۔ وہ رنج و الم نہیں جو آہ و زاری میں پانی بن کر بہہ جاتا ہے۔ یا دھواں بن کر اڑ جاتا ہے۔ بلکہ وہ جو دل میں بیٹھ جاتا ہے اور دل کو پکڑ لیتا ہے جو روح کو آلائشوں سے پاک و صاف اور ایک انوکھی اخلاقی دولت سے مالا مال کر دیتا ہے جسے سوز و درد کہتے ہیں۔

سرمایۂ درد تو ضائع نہ تواں کرد
اشکے کہ ز دل خیزد در سینہ شکستم من

جن حضرات کو یقینی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے محرم کی عزاداری پر اعتراض ہے ان کے پیش نظر غالباً وہ پر شور سینہ کوبی ہوگی جو سطحی یا عامیانہ مذاق کے مرد اور عورتیں کرتی ہیں اور جس کا نام "ماتم" رکھا گیا ہے۔ وہ خاموش جگر کاوی نہ ہوگی جو اہل ذوق اور اہل درد کیا کرتے ہیں اور جس کا کوئی نام نہیں وہ اس اصطلاحی "رقت" کو دیکھتے ہوں گے جس سے رومال اور دامن بھیگ جاتے ہیں۔ اس حقیقی رقت سے واقف نہ ہوں گے جس سے دل اور روح کی کھیتی سیراب ہوتی ہے

جن مسلمانوں میں تاریخی نظر اور علمی بصیرت ہے وہ یہ جانتے ہیں کہ واقعہ کربلا کی یادگار جسے محرم کی عزاداری کہتے ہیں، اخلاقی تعلیم اور دینی تبلیغ کی ایک زبردست تحریک تھی اور ایک حد تک اب بھی ہے یا اگر نہیں ہے تو بنائی جا سکتی ہے۔ اگر ہم سال میں ایک بار دس دن یا کم سے کم چار دن بھی اس شمع شہادت کی روشنی میں جو حسین ابن علی نے جلائی تھی اپنے مذہب و اخلاق کا جائزہ لیں تو ہمیں یہ محسوس ہوگا کہ مسلمانوں کی تاریخ کا یہ زمانہ جس سے ہم گذر رہے ہیں دو نسل کے مسلمان خصوصاً ہند و پاکستان کے مسلمانوں کے لئے سنہ ۶۰ھ سے بہت کچھ مشابہ ہے۔ ہم روحانی اسلام اور اخلاقی اسلام کے دھارے سے الگ ہو کر سیاسی اسلام کے بھنور میں سرگرداں ہیں۔ ہم اپنا تصور ایک انسانی جماعت کی حیثیت سے نہیں لیتے جو ہر جگہ دوسری جماعتوں کے ساتھ اخلاقی رشتوں سے مربوط ہے بلکہ کہیں "اکثریت" کی حیثیت سے اور کہیں "اقلیت" کی حیثیت سے اور کہیں "غالب" کی حیثیت سے اور کہیں "مغلوب" کی حیثیت سے۔ ہمارا سارا دھیان سمٹ کر سیاسی نقطے پر جمع ہو گیا ہے۔ ہمارے نزدیک ساری زندگی کا ساری کائنات کا صرف ایک مسئلہ ہے کہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں ان کی حکومت رہے اور جہاں ان کی اقلیت ہے وہاں ان کے حقوق محفوظ ہوں۔ ہماری نظر میں یہ مسائل کوئی اہمیت نہیں رکھتے کہ مسلمانوں کی حکومت خلق خدا کے لئے رحمت بنے عذاب نہ بنے اور مسلمانوں کے حقوق خود ان کے لئے برکت ثابت ہوں لعنت نہ ثابت ہوں غرض ہمارا معیار اقدار آج وہی ہے جو سنہ ۶۰ھ میں عرب کے لوگوں کا تھا۔ اس وقت امام حسینؑ کی شہادت نے مسلمانوں کو روحانی ہلاکت سے بچایا تھا آج ان کی یاد اور ان کی مثال بچا سکتی ہے؟

باہر کی دنیا

(بقیہ سلسلہ صفحہ ..)

لیکن ان جلسوں سے جہاں بہت سے سیاسی فائدے ہیں وہاں یہ نقصان بھی ہے کہ عام کارکنوں کو سوشلزم کا موقع بہت کم ملتا ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ چین جیسے ملک میں جہاں افلاس اور جہالت کی کثرت ہے کسی نئی حکومت کو مقبول بنانے کے لئے اس کے علاوہ کوئی اور صورت بھی نہیں جو چینی کمیونسٹوں نے اختیار کی ہے۔

دنیا کی رفتار

ہندوستان

حفاظتی کونسل میں

یو۔ این۔ او بہت سی مجلسوں کمیٹیوں اور اداروں پر مشتمل ہے مگر اس ساری عمارت کی بنیاد حفاظتی کونسل (SECURITY COUNCIL) ہے۔ یہ مجلس گیارہ ممبروں پر مشتمل ہے جن میں سے پانچ یعنی امریکہ، انگلستان فرانس، روس اور چین کو کونسل میں مستقل نشستیں حاصل ہیں۔ باقی نشستیں غیر مستقل ہیں۔ اور انتخاب کے ذریعے سے پر کی جاتی ہیں۔ اس کا کام یہ ہے کہ جتنے ملک یو۔ این۔ او کے ممبر ہیں ان کے ایسے جھگڑے جن سے دنیا کے امن میں فوراً خلل پڑنے کا اندیشہ ہے طے کرے۔ اس سال کونسل میں تین جگہیں خالی ہوئی تھیں جن میں سے ایک کینیڈا کی تھی اور ہندوستان اس جگہ کا امیدوار تھا۔ پاکستان کے وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خاں صاحب نے بڑی کوشش کی کہ ہندوستان کا انتخاب نہ ہونے پائے۔ انھیں یہ اعتراض تھا کہ ہندوستان نے خود اپنا مقدمہ اس پنچایت کے سامنے پیش کر رکھا ہے اس لئے اس کونسل میں شامل ہونے کا حق نہیں ہے۔ اس اعتراض کو لوگوں نے تسلیم نہیں کیا اس لئے کہ جو ملک پہلے اس کے ممبر ہیں ان میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کا کوئی نہ کوئی معاملہ کونسل کے سامنے پیش نہ ہو۔ جب انتخاب ہوا تو ۵۰ ووٹوں میں سے ۵۶ ووٹ ہندوستان کو ملے۔ یہ نہیں معلوم ہوا کہ ایک مخالف ووٹ کس کا تھا مگر اس کا اندازہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کے لئے فخر و مسرت کا مقام ہے کہ آزاد ریاستوں کی صف میں شامل ہونے کے دو ہی برس بعد وہ اس عزت اور اعتماد کی جگہ کے قابل سمجھا گیا۔

بڑا خطرہ ٹل گیا

ہند اور پاکستان کے تعلقات آج کل اتنے کشیدہ ہو رہے ہیں کہ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی فساد کی جڑ بن سکتی ہے۔ ایسی صورت میں تین سو کشمیری نظر بندوں کی بھوک ہڑتال بڑی خطرناک چیز تھی اور خدا کا شکر ہے کہ وہ بہ خیر و خوبی ختم ہو گئی معلوم ہوا کہ پاکستان کی حکومت نے ان نظر بندوں کو رہا کر کے امرتسر بھیجنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اور ادھر ہندوستان میں امرتسر اور جموں کے کیمپ میں جو پاکستان جانے والی عورتیں رکی ہوئی تھیں انھیں پاکستان جانے کی اجازت دے دی گئی ہے۔

آساں نہیں ہے صلح تو دشوار بھی نہیں

ہند اور پاکستان کے تعلقات کا یہ پہلو قابلِ غور ہے کہ جتنے چھوٹے بڑے جھگڑے آپس میں پیدا ہو گئے ہیں خواہ وہ سیاسی ہوں یا معاشی، سرحد کے بارے میں ہوں یا کاروبار کے بارے میں عام طور پر نہایت آسانی سے طے ہو جاتے ہیں۔ سمجھوتہ دونوں طرف کے چھوٹے چھوٹے عہدہ دار، بڑے بڑے افسر، صنعت کار، تاجر جن جلسوں میں جمع ہوتے ہیں وہاں فضا عام طور پر خوش گوار بلکہ دوستانہ رہتی ہے اور ایک دوسرے کے نقطۂ نظر پر معقولیت اور ہمدردی سے غور کرتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا ہرگز صحیح نہیں کہ ہندوستان اور پاکستان کے عام باشندوں میں آپس میں مخالفت یا نفرت ہے اور وہ صلح کے راستے میں حائل ہوتی ہے۔ مخالفت یا اختلاف جو کچھ بھی ہے دو مسئلوں میں ہے ایک کشمیر کا دوسرے تارکین وطن کی جائداد کا اور ان دونوں کا ہند اور پاکستان کے عام باشندوں کے مفاد سے کوئی تعلق نہیں، صرف چند اشخاص یا ایک چھوٹے سے طبقے کے مفاد سے ہے۔ اس لئے جب کبھی ان دونوں معاملوں، خصوصاً کشمیر کے معاملے میں یہ کہا جاتا ہے کہ حکومتیں اگر چاہیں بھی تو سمجھوتا نہیں کر سکتیں اس لئے کہ عوام میں بے حد جوش ہے اور اگر ان کی مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ ہوا تو حکومتوں کو توڑ کر اور نظم و نسق کو درہم برہم کر کے رکھ دیں گے اس میں شک نہیں کہ عوام میں خصوصاً پاکستان کے عوام میں کشمیر کے معاملے میں بڑا جوش ہے

(بقیہ صفحہ ۲۰ پر)

باہر کی دنیا

ایشیا کی معاشی بحالی

کوئی ۹، ۱۰ روز سے ایشیا اور مشرق بعید کے معاشی کمیشن (ای سی اے ایف ای) کا پانچواں اجلاس سنگاپور میں ہو رہا ہے۔ صنعت اور تجارت کی کمیٹی کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایشیا کی معاشی حالت اب وقت اتنی ہی خراب ہے جتنی جنگ کے زمانے میں یا اس سے پہلے تھی۔ جنگ کو ختم ہوئے چار سال ہو چکے ہیں مگر اب تک اس کی معاشی بحالی کے سلسلے میں کوئی بڑا قدم نہیں اٹھایا گیا تمام مشکل اور پیچیدہ مسائل اسی طرح موجود ہیں اور پچھلے تین سال میں کمیشن نے جو کچھ کیا ہے، اس کی حقیقت ابتدائی کوشش سے زیادہ نہیں۔

جن وجوہ سے ایشیا کی معاشی ترقی میں کوئی نمایاں کام نہیں ہو سکا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) تعمیر و ترقی کی کوئی اسکیم بنانے سے قبل ان خرابیوں کی اصلاح کرنی ہے، جو جنگ کی وجہ سے معاشی اور سماجی زندگی میں پیدا ہو گئی ہیں (۲) ادائگیوں کا ناموافق توازن ابھی تک درست نہیں ہو سکا ہے (۳) ایشیائی ملکوں میں صنعتی سرمایہ کی بہت سخت کمی ہے۔

ان کے علاوہ پچھلے دس سال کی مدت میں ایشیا کی معاشی زندگی میں بہت بڑی تبدیلیاں ہوئی ہیں مثلاً (۱) ان علاقوں میں جہاں اناج اور کھانے پینے کی کثرت تھی اب وہاں بہت سخت کمی ہو گئی ہے۔ (۲) افراطِ زر اور نقل و حمل کی مشکلات کی وجہ سے بیرونی تجارت میں بہت کمی ہو گئی ہے (۳) بیشتر ملکوں کے سیاسی حالات اس قدر غیر یقینی ہیں کہ صنعتوں میں لوگ روپیہ لگاتے گھبراتے ہیں

ان حالات سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ ایشیائی ملکوں کی معاشی اور بحالی حالت اس وقت تک درست نہیں کی جا سکتی جب تک ایشیا اور مشرق بعید کا یہ معاشی کمیشن، سیاسی اثرات سے الگ ہو کر خالص امن اور انسانیت کی خاطر کام نہیں کرے گا۔ ایشیا کی تعمیر و ترقی کے لئے اس وقت سب سے زیادہ زور یورپی اور امریکی سرمایہ پر دیا جاتا ہے، لیکن اس کو قبول کرنے میں سب سے بڑا خطرہ سیاسی اثرات کا ہے اگر اس بارے میں جمہوری ممالک اپنے نقطۂ نظر میں بنیادی تبدیلی کر لیں تو معاشی کمیشن کی کامیابی یقینی ہے۔

چین میں جنتا راج

چین میں کمیونسٹوں کی پیش قدمی بدستور جاری ہے لیکن دنیا کی نگاہ اس سے زیادہ اس پر ہے کہ وہ اپنے مقبوضہ علاقے میں انتظام کیسا کرتے ہیں اور بیرونی ممالک خصوصاً بیرونی تجارت کے متعلق ان کی پالیسی کیا ہے۔

شنگھائی کے ایک قریبی گاؤں کے رہنے والے کسان سے پوچھا گیا کہ کمیونسٹ راج کی پانچ ماہی مدت کے بارے میں اس کی کیا رائے ہے تو اس نے جواب دیا کہ "نیشنلسٹوں کے زمانہ حکومت میں ٹکس ہی ٹکس اور کمیونسٹوں کے راج میں جلسے ہی جلسے"۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت چین میں کمیونسٹ جلسوں سے وہ کام لے رہے ہیں جو بڑے بڑے ہتھیاروں سے نہیں لئے جا سکتے تھے۔ یہ جلسے دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک تو کمیونسٹ افسروں کے ہوتے ہیں جن میں پالیسی کا تعین ہوتا ہے یا کسی مقررہ پالیسی کی وضاحت کی جاتی ہے۔ پھر مختلف مسائل کو حل کرنے کے وسائل اور ذرائع سوچے جاتے ہیں۔ جب تک کسی مسئلے کے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح بحث مباحثہ نہ ہو جائے، حکومت کوئی قدم نہیں اٹھاتی۔ دوسرے عوام کے ہوتے ہیں جن میں عام جنتا کو حکومت کے بارے میں معلومات دی جاتی ہیں۔ کمیونزم کی خوبیاں بتائی جاتی ہیں، پیچیدہ مسائل کو سمجھایا جاتا ہے اور ان کے ذریعے

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

بزمِ بے تکلف

آدمی جسے کہتے ہیں وہ تو سوتے میں سنسار یعنی سپنوں کی دنیا ہی میں نصیب ہوتی ہے۔ یوں تو آزاد جمہوری ریاست میں ہر شہری کو (جس میں غضبانی، دیہاتی، پہاڑی اور جنگلی بھی شامل ہیں) ہر قسم کی مذہبی، لامذہبی، معاشی، سیاسی، قیاسی، تہذیبی، زبانی، کاہد بادی، چرب باغاری کی آزادی حاصل ہو، مگر پھر بھی عقل، شرع، قانون، آمدنی، نیلس، رسم و رواج، بیوی، ساس کے ہیے کرکٹے، پہرے بیٹھے ہیں جہاں منہ تو یہ پرنے نکلنے کا ذرا سا موقع بھی نہیں ملتا۔ بس آزادی کے پنجرے میں مُرغ کی طرح اکیلے سے بیٹھے رہتے ہیں۔ بہت ہوا تو اپنے پنجرے کے اندر ہی ادھر ادھر پھدک کر بیٹھ گئے۔ ہاں سوتے میں البتہ جاگتے جیل کی یہ سب پابندیاں عدم ہو جاتی ہیں۔ سب بیڑیاں کٹ جاتی ہیں۔ بہ قول شاعر

مند گئیں جب انکھڑیاں تب سو رُسب آنند ہیں

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ زمان و مکان کی قید بھی جس نے آئن اسٹائن تک کو پریشان کر رکھا ہے اُٹھ جاتی ہے اور ہمارا پنچھی دم کے دم میں سینکڑوں ہزاروں میل بلکہ برسوں آگے پیچھے وقت اور جگہ کے جس نقطے پر چاہتا ہے جا پہنچتا ہے۔

ابھی کل رات ہی کا تو ذکر ہے کہ الف لیلہ میں سوتے جاگتے کا قصہ پڑھتے پڑھتے آنکھ لگ گئی، دیکھتے کیا ہیں کہ نئی دنیا کا ایک غدار شہر ہے جس کا نہ کہیں اور نہ چھور، چاندی کی سڑکیں، سونے کی عمارتیں، مارشل پلڑے کے درخت، ڈالر کے پتوں سے لدے ہوئے۔ سڑکوں پر خلقت کا وہ ہجوم کہ تھالی پھینکو اور وہ کسی مردانے یا زنانے ہیٹ میں اٹک کر نہ رہ جائے، تو سروں ہی سر ہولے کہیں تک چلی جائے اور سنتے کیا ہیں کہ لاکھوں، کروڑوں گلوں سے ایک ہی ایک ہی نعرہ نکل کر فضائے آسمانی میں گونج رہا ہے — "زندہ باد ——— زندہ باد" "زندہ باد" سے قبل ایک رعب دار سے لفظ کی سی جھنکار سنائی دیتی تھی۔ پہلے ہم سمجھے کہ یہ انقلاب کا لفظ ہے مگر غور سے سنا تو معلوم ہوا کہ ہمارا ہی شبھ نام ہے۔ اگر کہیں جاگتے میں ہم نقارۂ خدا یعنی زبانِ خلق سے اپنے حق میں "زندہ باد" کا نعرہ سن لیتے تو شاید ایسا دھچکا لگتا کہ فوراً ہی "مردہ باد" ہو جاتے مگر اس وقت یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ لوگ عمر بھر سناتے رہے ہیں اور ہم سنتے رہے ہیں۔ ہاں، تو آپ سے کہنا بھول گئے کہ ہم ایک بیش قیمت ایرانی قالین پر کارچوبی گاؤتکیہ لگائے بیٹھے تھے اور قالین غنے بخنہ ہوا میں تیرتا چلا جا رہا تھا۔ خیر تو یہ جادو کا قالین تھوڑی دیر میں ایک بہت بڑے ہال میں جا کر ہوا میں معلق ہو گیا۔ ہمارے پہنچتے ہی سارا ہال جو خواتین اور حضرات سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا تالیوں سے گونج اٹھا۔ اس کے بعد ہمارے کان میں یک آواز آئی جس کے متعلق یہ کہنا مشکل تھا کہ کسی اور کی ہے یا خود ہماری کہ "جلدی ہو سو ہو، اب تو کہہ ہی ڈالو" چنانچہ ہم نے کہنا شروع کیا:—

بہنو اور بھائیو۔ ابھی چند روز ہوئے، آپ اُفقِ مشرق کے مہرِ درخشاں کا استقبال کر چکے ہیں جس کے مقابلے میں ہم ایک ذرۂ ناچیز ہیں یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ بات ہم محض انکسار سے کہہ رہے ہیں۔ آپ کی بڑی ذرہ نوازی ہے کہ آپ نے ہمارا استقبال بھی اسی شان سے کیا۔ ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ یہاں آنے سے ہماری غرض، قرضہ یا ڈگری یا کپھول لینا نہیں، یہاں تک کہ ہم پلڈیسیں بھی لینا نہیں چاہتے۔ ہاں اگر پریس ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ہمارا مقصد صرف اتنا ہے کہ آپ کا شکریہ ادا کریں اور آپ سے شکایت کریں۔ شکریہ اس کا کہ آپ کے اربابِ علم و فن نے جو آپ کے دل و دماغ ہیں ہمارے محترم قائد کو سر آنکھوں پر بٹھایا اور آپ کے اربابِ محنت نے جو آپ کے دست و بازو ہیں ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس کا ہمارے دل پر بہت گہرا اثر ہوا۔ مگر اسی کے ساتھ ہم کو یہ شکایت ہے کہ آپ کے اربابِ دولت نے جنھیں آپ کا شکم و معدہ کہنا چاہیے

(بقیہ صفحہ ۸ پر)

شاہِ شہیداں

سید کاظم حسین محشر (؟)

یہ کس کے نام کے چرچے ہیں اہلِ دل کی محفل میں
یہ کس کا ذکر سُن کر درد اُٹھتا ہے ہر اک دل میں
یہ کس کی یاد آتے ہی رواں ہوتے ہیں اشکِ غم
یہ کس کے حال پر صدیوں سے ہی صرفِ بُکا عالم
جہاں میں افتخارِ نوعِ انساں کس کو کہتے ہیں
مسلماں فخر سے **شاہِ شہیداں** کس کو کہتے ہیں
علی مرتضیٰ کا لال ہے زہرا کا پیارا ہے
محمد کا نواسا چرخِ ایماں کا ستارا ہے
بچائی دے کے جاں انسانیت کی آبرو جس نے
زمانے میں کیا اسلامیت کو سُرخ رو جس نے
عزیز و اقربا کو نذرِ ایماں کر دیا جس نے
خدا کی راہ میں خوش ہو کے اپنا سر دیا جس نے
سہی تشنہ دہانی اور فاقوں کی اذیت بھی
اُٹھائی آہ جس مظلوم نے میت پہ میت بھی
زہے صبر و تحمل آفریں اس عزم و ہمت پر
ادا شکرِ خدا کرتے تھے ہر تازہ مصیبت پر
تصور کی نگاہیں دیکھتی ہیں دل لرزتا ہے
جبیں سجدے میں ہے ہر زخمِ تن سے خوں ٹپکتا ہے
گلے پر خنجرِ قاتل لبوں پر کچھ دُعائیں ہیں
نجاتِ اُمتِ عاصی کی حق سے التجائیں ہیں
ترے قرباں! اے انسانیت کے محسنِ اعظم
حیاتِ تازہ بخشے قوم کو اے کاش تیرا غم

خدا توفیق دے نقشِ قدم پر تیرے چلنے کی
عطا ہمت ہو اہلِ قوم کو گر گر کے سنبھلنے کی

اقبال کی وطن دوستی

محمد ابراہیم ڈار

اقبال اپنی شاعری کے آخری دور میں بھی عارف ہندی، گوتم بدھ اور برتری ہری کا ذکر ادب تحسین اور احترام کے ساتھ کرتے ہیں، "شعاع اُمید" میں وہ مسلمان اور برہمن دونوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنا چاہتے ہیں، "جاوید نامہ" میں وہ میر جعفر اور میر صادق کو دین، وطن اور آدمیت کے لئے ننگ کا موجب قرار دیتے ہیں .... اس وسیع النظری اور کشادہ دلی کے باوجود یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ زندگی کے آخری دور میں اقبال نے ابنائے وطن کی جنگ آزادی میں کسی ہمدردی یا دلچسپی کا اظہار نہیں کیا بلکہ اُن کا تعلق آل پارٹیز مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ سے رہا جن کے سالانہ اجلاسوں کی صدارت بھی انھوں نے منظور کی۔ اس دور میں اقبال مسلمانوں کے لئے حقوق طلبی کی مہم میں سرگرم رہے اور اُنھیں ملک کی ان تحریکوں سے قطعاً کوئی تعلق نہ تھا جو آزادیٔ وطن کے حصول کے لئے آزاد خیال رہنماؤں کے نزدیک بہت ضروری تھیں........

اقبال کے عقیدت مندوں اور قدردانوں کو یہ بات قطعاً گوارا نہیں کہ اس بلند پایہ شاعر کی زندگی کے بعض ایسے پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا جائے جن کی وجہ سے ان کے نزدیک اس کی عظمت میں کوئی کمی محسوس ہوتی ہو گویا ان کے خیال میں اقبال ایک ایسا انسان ہے جو تمام بشری کمزوریوں سے منزہ ہے اور اس کا نظام فکر ایسا جامع اور مکمل ہے جس میں کسی قسم کے نقص یا خامی کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ دوسری طرف ایک ایسا گروہ بھی موجود ہے جو اقبال کی شاعرانہ عظمت تک کا منکر ہے۔ اس افراط اور تفریط کے درمیان اعتدال کا تقاضا یہ ہے کہ اقبال کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ ان ناخوش گوار باتوں کو بھی تسلیم کر لیا جائے جو اقبال کی شخصیت یا ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں اور جو بعض حضرات کے خیال میں محل نظر ہیں۔ آج غالب کی شاعرانہ عظمت سے کس انصاف پسند کو انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے زبردست سے زبردست مداح کے لئے بھی یہ بہت دشوار ہے کہ نواب شمس الدین کے سلسلے میں مخبری کی ذمہ داری سے اُسے بچا سکے، ہندوستانی فرہنگ نگاروں کے ساتھ اُن کے ناروا اور بے جا سلوک کی حمایت کر سکے یا آئین اکبری کی اشاعت پر اس کی نکتہ چینی کو درست بتا سکے۔ اگر یہ یا اس قسم کی دوسری خامیاں غالب کی شاعرانہ عظمت کے متعلق ہمارے تصور پر اثر انداز نہیں ہو سکیں تو اقبال کی زندگی کے بعض واقعات ہمارے دلوں سے اقبال کی عظمت و بزرگی کے خیال کو کیوں کر دور کر سکتے ہیں۔ ۱۹۱۸ء میں پنجاب کے لفٹننٹ گورنر سر مائیکل اوڈوائر کے ایما پر گورنمنٹ ہاؤس میں اقبال اپنی نظم "پنجاب کا جواب" سناتے ہیں جس کا ایک شعر ملاحظہ ہو:-

جو کچھ کہ ہے عطائے شہ محترم سے ہے
آبادیٔ دیار ترے دم قدم سے ہے

اور اس دعا پر نظم ختم کرتے ہیں:-

قائم رہے حکومت آئیں اسی طرح
دبتا رہے چکور سے شاہیں اسی طرح

۱۹۲۶ء میں مرحوم سر محمد شفیع کے ساتھ مل کر اقبال لاہور میں ایک الگ لیگ قائم کرتے ہیں جس کے سکریٹری وہ خود تھے۔ لاہور اسٹیشن پر اقبال سائمن کمیشن کا سواگت کرتے ہیں، حالانکہ لبرل پارٹی کے رہنما بھی اس کمیشن سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ یہ چیزیں اس قدر واضح اور آشکارا ہیں کہ لاکھ کوشش کیجئے ان پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ان چیزوں سے شاعر اور مفکر کی حیثیت سے اقبال کی عظمت میں کوئی کمی پیدا نہیں ہوتی۔

اس سلسلے کی ایک اہم کڑی اقبال کی وطن دوستی ہے، جیسا کہ خواجہ غلام السیدین صاحب نے بیان کیا ہے۔ اقبال اپنی شاعری کے آخری دور میں بھی عارف ہندی، گوتم بدھ اور برتری ہری کا ذکر ادب، تحسین اور احترام کے ساتھ کرتے ہیں، "شعاع اُمید" میں وہ مسلمان اور برہمن دونوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ جاوید نامہ میں وہ میر جعفر اور میر صادق کو دین، وطن، اور آدمیت کے لئے ننگ کا موجب قرار دیتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اگر اقبال نے گوتم بدھ کو اولوالعزم انبیا کی صف میں پیش کیا ہے تو یہ ان کی اس وسیع النظری کی بدولت ہے جو مذہب، نسل اور وطن کی حدود سے بالاتر ہو کر انسانیت کی صحیح قدروں کو متعین کرنے میں ایک صاحب دل کی رہنمائی کرتی ہے، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ گوتم بدھ کے ذکر کے بعد وہ اقبال کے [illegible] بہشت کی زندگی کے ایک اہم ماخذ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس وسیع النظری اور کشادہ دلی کے باوجود یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ زندگی کے آخری دور میں اقبال نے ابنائے وطن کی جنگ آزادی میں کسی ہمدردی یا دلچسپی کا اظہار نہیں کیا بلکہ ان کا تعلق آل پارٹیز مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ سے رہا جن کے سالانہ اجلاسوں کی صدارت بھی [illegible] اس دور میں اقبال مسلمانوں کے لئے [illegible] کی مہم میں سرگرم رہے اور انھیں ملک کی ان تحریکوں سے قطعاً کوئی تعلق نہ تھا جو آزادیٔ وطن کے حصول کے لئے آزاد خیال رہنماؤں کے نزدیک بہت ضروری تھیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جب اقبال نے ہندوستان کے اندر "اسلامی ہند" کا نعرہ بلند کیا، آج پاکستان شاعر کے متخیلہ "اسلامی ہند" سے خواہ کتنا مختلف کیوں نہ ہو اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان اسی نعرے کی صدائے بازگشت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اقبال میر جعفر اور میر صادق جیسے غداران ملت سے سخت ناراض ہیں لیکن یہاں ہم اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ ان دو کی مسلمان حکمرانوں سے غداری تھی اور شاید یہی وجہ اقبال کے عتاب اور ناراضگی کی ہے۔ میر جعفر اور میر صادق کی مذمت کرنے کے بعد اقبال میر جعفر کی روح کو اب بھی سرگرم عمل پاتے ہیں اگرچہ وہ خود جہاں سے رخصت ہو چکا ہے:-

کہ شب ہندوستاں آید بروز
مرد جعفر زندہ روح او ہنوز
تا ز قید یک بدن وا می رہد
آشیاں اندر تن دیگر نہد
گاہ او را با کلیسا ساز باز
گاہ پیش دیریاں اندر نیاز
پیش ازیں چیزے دگر معبود او
در زمان ما وطن معبود او
ظاہر او از غم دین دردمند
باطنش چوں دیریاں زنار بند
جعفر اندر ہر بدن ملت کش است
ایں مسلمانے کہن ملت کش است
از نفاقش وحدت قومی دونیم
ملت او از وجود او لئیم

وہ کون سا گروہ ہے جس کی طرف اقبال یہاں اشارہ کر رہے ہیں، یہ کہیں مسلمان وطن دوستوں کا گروہ تو نہیں؟ یہ کون ہے جو اہل دیر کا طوق نیاز اپنی گردن میں ڈالے ہوئے ہے، یہ کون سا مسلمان ہے جو بقول اقبال کے وطن کو معبود ٹھہراتا ہے، یہ کون ہے جو بظاہر دین کے غم سے فگار ہے، لیکن باطن میں اہل دیر کی طرح زنار بدوش ہے، یہ کون مسلمان ہے جو ملت کش ہے، جس کے نفاق کی بدولت قوم کا شیرازہ بکھر چکا ہے اور جس کے وجود نے ملت کو بدبختی کے گڑھے میں ڈھکیل دیا ہے، اس سوال کا جواب ایک اور صرف ایک ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ یہاں اقبال کے سامنے

... وہ گروہ ہے جو ملک کی ... کی جماعت کے ساتھ اشتراک عمل کا حامی ہے اور ... جماعت اسلامی ... جنگ میں جماعت ایسا شاہکار قیمت بھی نہیں ... لیکن اقبال کے نزدیک ان کی یہ بہادری ... کی شان نہیں تھی بلکہ عہد جاہلیت کے ... شاعر عنترہ کی یادگار ہے جس کا نام شجاعت کے ... ضرب المثل ہے۔

اقبال کے اس واضح اور صریح بیان کے بعد ہمارے ... سمجھنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ اقبال اپنی ... عصری یا حب وطن کے ... سے ...

اقبال ... فرماتے ہیں کہ وہ ایک بہتر معاشرتی نظام کی تلاش میں ایک ایسے نظام معاشرت کو نظر انداز ... جس کا سب سے بڑا مقصد نسل، رنگ ... ذات پات کے خطرناک امتیازات کو مٹانا ہے لیکن یہاں یہ اہم بات ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس نظام معاشرت کے پیرو کہاں تک اس کے صحیح تقاضوں کو پورا کرتے ہیں، ہم اکثر عقیدہ مندی سے اسلام کے شاندار اصولوں کا تصور ہی کرتے ہیں، لیکن اس حقیقت کو یک سر فراموش کر جاتے ہیں کہ یہ شاندار اصول عالمگیر سچائیاں ہیں اور ہماری صحیح قدر و قیمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہم کس حد تک ان شاندار اصولوں کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہوئے ہیں، اقبال کا ایک ممدوح اورنگ زیب ہے جو حکمرانی کے تمام اوصاف سے متصف ہے، اور جس کی دینداری کا ہر کس و ناکس کو اعتراف ہے لیکن ہمیں اس اعتراف کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی تسلیم کرنی پڑے گی کہ اس کے ذہنی دائرے میں وہ وسعت نہ تھی جو اس جیسے عظیم الشان اور بو قلموں خوبیوں کی وجہ سے بے نظیر شہنشاہ میں ہونی چاہیے تھی، وہ اپنے بھائی دارا کو محض اس بنا پر ملحد کہتا ہے کہ اس کے مذہبی خیالات میں ایک ہمہ گیری اور وسعت ہے۔ وہ محض صوفیوں کا حلقہ بگوش ہی نہیں بلکہ ویدانت کا بھی قائل ہے، اور تصوف اور ویدانت کے دو دریاؤں کا سنگم تیار کرتا ہے۔ دارا شکوہ، شیخ محمود شبستری صاحب گلشن راز کی تقلید میں اسلام مجازی سے بیزاری ظاہر کرتا ہے، اور کفر حقیقی کو خوش آمدید کہتا ہے یہ وہی بزرگ ہیں جن کی مثنوی سے متاثر ہو کر اقبال جاوید گلشن راز کی داغ بیل ڈالتے ہیں اور جن کی شان میں وہ یہ کہتے ہیں:

زجهد شیخ تا این روزگارے
نزد مردے بجان ما شرارے

اس کے باوجود یہ دیکھ کر ہمیں سخت تعجب ہوتا ہے کہ اقبال اورنگ زیب کے ہم نوا ہو کر دارا شکوہ پر الحاد کا الزام لگاتے ہیں اور اورنگ زیب و دارا کی جنگ کو کفر و دین کی کارزار قرار دیتے ہیں حالانکہ بیچارہ دارا ... کو حنفی مذہب اور قادری مشرب بتاتا ہے اور اس کی تصنیفات سفینۃ الاولیاء اور سکینۃ الاولیاء

... اس کے اس دعوے کی شاہد ہیں۔ اقبال کا یہ شعر ملاحظہ ہو:-

تخم الحادے کہ اکبر پرورید
باز اندر فطرت دارا دمید

اورنگ زیب ان کی نظر میں کفر و دین کی جنگ کا اسلامی ترکش کا آخری تیر ہے۔

درمیان کارزار کفر و دیں
ترکش ما را خدنگ آخرین

کور ذوقان داستانہا ساختند
وسعت ادراک او نشناختند

اقبال کے یہاں ایک عجیب قسم کا تضاد پایا جاتا ہے دارا شکوہ کو بعض عقائد کی بنا پر ان کی نظر میں ملحد ٹھہرتا ہے، لیکن حلاج جسے محض الحاد و زندقہ کے الزام میں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے ان کے ایوان فکر میں خودی کا شارح اور مفسر ہے بلکہ مرگ آباد عالم میں قیامت برپا کرنے میں اقبال کا پیش رو ہے چنانچہ اس کی زبان سے کہلواتے ہیں:

آنچہ من کردم تو ہم کردی بترس
محشرے بر مردہ آوردی بترس

بعینہ یہی تضاد اقبال کے یہاں حضرت مولانائے روم اور بلبل شیراز خواجہ حافظ کے سلسلے میں پایا جاتا ہے مرشد رومی کے خوان کرم سے ذلہ ربائی کا اظہار وہ بار بار والہانہ شیفتگی اور عقیدت کے ساتھ کرتے ہیں لیکن بلبل شیراز ان کی نظر میں ایک ساحر ہے جو اپنی خوش نوائی اور عشوہ آفرینی سے لوگوں کو گمراہ کرتا ہے وہ میخواروں کی ملت کا فقیہ اور بے چاروں کی امت کا امام ہے۔ اس کا ساغر احرار کے سزاوار نہیں اور اس کی محفل ابرار کے شایان نہیں، خواجہ حافظ پر اس درجہ عتاب اس لئے ہے کہ وہ تسلیم و رضا اور صبر و قناعت کی تلقین کرتے ہیں۔ کیا یہی چیزیں صوفیائے کرام کے یہاں قدر مشترک کی حیثیت نہیں رکھتیں اور کیا حکیم پاک زاد کے کلام میں جابجا ان کا ذکر نہیں ملتا، پھر حافظ پر یہ لعن طعن کیوں؟ حافظ اور اقبال کے سلسلے میں ایک بھولے ہوئے واقعہ کا ذکر دلچسپ رہے گا۔ تحریک خلافت کے زمانے میں امرتسر کے نامور شاعر جناب محمد حسین عرشی نے چند فارسی اشعار میں اقبال کو مخاطب کرتے ہوئے ان سے رونق ہنگامہ احرار بننے کی درخواست کی، اس کے جواب میں اقبال نے عرشی صاحب کو یقین دلایا کہ ان کا پیمانہ ہرگز نہیں ٹوٹا بلکہ بدستور سلامت ہے اور "رندان پختہ کار کے شیوہ" کی توضیح اقبال نے خواجہ حافظ کے اس شعر سے کی:-

دانا چو دید بازیِ این چرخ حقہ باز
ہنگامہ باز چید و در گفتگو ببست

مندرجہ بالا سطور میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے ہمارا مقصود اقبال کی تنقیص نہیں بلکہ اس بے جا وکالت کے خلاف احتجاج ہے جو آئے دن اقبال کے بعض قدر شناسوں کی جانب سے دیکھنے میں آتی ہے۔ اگر ہم ہندو دھرم اور تہذیب کے سرچشموں سے سیراب ہو کر اخلاقی قدروں کو جانچتے ہیں اور مرحوم چترنجن داس کے تیار کردہ میثاق بنگال کے خلاف محض اس لئے آواز اٹھاتے ہیں کہ اس میں مسلمانوں کے مطالبات کو تسلیم کر لیا گیا تھا اور پھر بھی ان کی عظمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا تو کوئی وجہ نہیں کہ اقبال عہد حاضر کی وطنیت کے مخالف ہونے کی پاداش میں معتوب ٹھہرائے جائیں اور ہم انھیں اس الزام سے بچانے کے لئے وطن دوستی ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کی باتوں کی بنا پر اقبال کی عظیم المرتبت شخصیت یا ان کی شاعرانہ عظمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ حقیقت بھی فراموش نہ کرنی چاہیے کہ انسان کا کمال اس بات میں ہے کہ اس میں کم سے کم خامیاں پائی جائیں، ورنہ ایسا کامل انسان تو کہاں مل سکتا ہے جو تمام خامیوں سے پاک ہو، بقول ایک عرب شاعر کے:-

ومن ذا الذی ترضیٰ سجایاہ کلّہا
کفی المرءَ نبلاً أن تعدّ معائبہ

"ایسا کون شخص ہے جس کی تمام عادتیں لوگوں کو پسند ہوں، ایک آدمی کی شرافت کے لئے یہ بات کافی ہے کہ اس کے عیوب گنتی کے ہوں"

باہر کی دنیا

(بہ سلسلہ صفحہ ۴)

عوام سے براہ راست رابطہ پیدا کیا جاتا ہے۔ ان جلسوں میں بڑے سے بڑا کمیونسٹ شریک ہوتا ہے اور یہ چھ چھ سات سات گھنٹے تک جاری رہتے ہیں۔ ایک نیوز ایجنسی کا بیان ہے کہ کمیونسٹ لیڈر ان جلسوں کی وجہ سے اس قدر مشغول رہتے ہیں کہ وہ بمشکل رات کو تین چار گھنٹے سو پاتے ہیں۔

عام جلسوں میں سب سے زیادہ زور اس پر دیا جاتا ہے کہ یہ جنتا کا زمانہ ہے چنانچہ حکومت کا نام "جنتا راج" رکھا گیا ہے، فوج کو "جنتا کو آزادی دینے والی فوج" کہتے ہیں، کرنسی کو "جنتا نوٹ" کہا جاتا ہے۔ پےکنگ کے ایک اخبار کا نام ہے "جنتا روزنامہ"

اخبارات کے ایڈیٹروں کے الگ روزانہ جلسے ہوتے ہیں جن میں اس دن کی خبروں، ان کی سرخیوں اور اداریے کے متعلق گفتگو ہوتی ہے اور کمیونسٹ کارکن انھیں ہدایتیں دیتے ہیں، اسی طرح کسانوں اور مل کے مزدوروں کے بھی الگ الگ جلسے ہوتے ہیں جن میں ان کے مسائل کے متعلق تقریریں کی جاتی ہیں۔

یہ جلسے کبھی کبھی بہت طویل ہوتے ہیں۔ چنانچہ کچھ دن ہوئے تہذیبی کام کرنے والوں نے پےکنگ میں ایک جلسہ منعقد کیا تھا جو ۱۴ دن تک جاری رہا روزانہ صبح کے چھ بجے عام جلسہ شروع ہوتا تھا کھانے کے بعد مختلف گروپ کی الگ الگ بیٹھکیں ہوتیں اور شام کو وہ تھیٹر میں شریک ہوتے جہاں یا تو کوئی نیا کمیونسٹ ڈراما پیش کیا جاتا یا محض گانے ہوتے

(بقیہ صفحہ ۳ پر)

مختصر تبصرے

"اردو غزل"

ڈاکٹر مسعود حسین

روح اقبال کے مصنف ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کی یہ دوسری ادبی پیش کش ہے، جسے مصنف نے نہایت معمولی کاغذ پر اوسط درجے کی کتابت و طباعت کے ساتھ حیدرآباد دکن سے شائع کیا ہے، قیمت للعہ

"اردو غزل" بقول مصنف "عام ڈگر سے ذرا الگ ہٹ کر" غزل کا فنی اور نفسیاتی جائزہ بھی ہے اور "قدما کے زمانے سے لے کر عہد حاضر تک کے مشہور غزل گو شاعروں کے کلام کا انتخاب بھی"۔ "عام ڈگر" سے غالباً مصنف کا اشارہ ان تنقیدات غزل کی جانب ہے جن میں یا تو فنی خم و پیچ کا تشدد کے ساتھ تذکرہ ہوتا ہے یا مغربی ادبیات کے زیر اثر غزل کی "گردن بے تکلف اور بے تکان" مارنے کی ترغیب ہوتی ہے۔ کبھی کبھی اجتماعی پس منظر کا نقش ناتمام بھی غزل کو دیا کر دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین تنقید کے ان پہلوؤں کو بیکار کہے بغیر فن کو انفرادی نفس کا ایک حسین اور پرکار تصرف سمجھتے ہیں جو "شاعر کی داخلی کیفیات اور تمدنی احوال" کا نتیجہ ہوتا ہے جس کے "اسلوب میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں لیکن اس کی بنیادی حقیقت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔"

یہ بنیادی حقیقت بطور اسلوب غزل رمز و ایما سے مرتب ہوتی ہے جو شاعری کی جان بلکہ ایمان ہیں۔ اس لئے غزل پر تنقید کرتے وقت انفرادی نفس کی ان کیفیتوں کا کھوجنا ضروری ہے جن سے علامات کی تخلیق ہوتی ہے، علامات سے فنی پہلوؤں کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر یوسف حسین نے اپنے مضامین کے آخری حصے میں تشبیہہ، استعارہ، کنایہ، مجاز مرسل وغیرہم کی پوشیدہ ایمائی برقیات پر کافی زور دیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے حسرت کی "نکات سخن" سے بعض جگہ اختلاف کرتے ہوئے بھی استفادہ کیا ہے، بعض اوقات حسرت کی غیر سائنسی تنقید کا علمی جواز بھی پیش کیا ہے۔ مثلاً مولانا حسرت موہانی نے اپنے رسالہ "نکات سخن" میں جمع کے استعمال کو محاسن سخن میں شمار کیا ہے۔ صـ ۱۶۲) لیکن انھوں نے یہ نہیں بتلایا کہ ایسا کیوں ہے؟ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ تغزل کے لئے رمزی اور ایہامی کیفیت ضروری ہے۔ صیغۂ واحد کے استعمال سے تفرد اور تعین کی ضرورت پیدا ہوتی ہے اور یہ خیال ہو سکتا ہے کہ شاعر نفس واقعہ کو بیان کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ اس کے پیش نظر لفظوں کے معمولی معنی کے بجائے اشتباہ کا رمزی اور ایمائی اثر ہوتا ہے۔ صیغۂ جمع سے چونکہ یہ مقصد بہتر طور پر حاصل ہوتا ہے اس لئے اس سے کلام کی تاثیر اور حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔"

اس قسم کی ژرف بینی کے نمونے "اردو غزل" میں جا بجا ملیں گے۔ مصنف اپنے مخصوص انداز میں نفس اور عمل شاعر سے متعلق بعض پتے کی باتیں کہہ جاتا ہے۔ غزل گو شاعر کے رمز و ایہام کے متعلق مصنف کا خیال ہے "معلوم ہوتا ہے جذبۂ حقیقت اور دھوپ چھاؤں جھولا جھولنا پسند کرتا ہے۔" یہ شاعر کی نفسیات سے متعلق گہری بات ہے۔ شاعرانہ وجدان کے وقت شعور تخیل کی رنگین فضاؤں میں تحلیل سا ہو جاتا ہے لیکن تخلیقی عمل کے وقت بھی ابلاغ کے حقیقی سانچوں کا شعور شاعر کو رہتا ہے۔ دھندلا سہی، ورنہ تخلیقی عمل ناممکن ہو جائے۔

غزل کی صوفیانہ واردات کا سلسلہ مجاز سے ملا کر مصنف نے فکر بلیغ کا مزید ثبوت دیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ عشق مجاز کی خواہشیں ہی معرفت کی امواج نشاط بن جاتی ہیں "مجازی حسن چاہے کتنا نامکمل اور زوال پذیر ہو لیکن اس کی گہرائیاں عالمگیر ہیں"۔ تصوف کے سلسلے میں مصنف کے ان خیالات کے بارے میں معلوم نہیں، اہل صدق و صفا کیا کہیں گے، لیکن نفس انسانی کی عظمت کو اس سے بہتر طور پر مسلم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات مصنف کی حقیقت بینی اور اس گہرے سماجی شعور پر دلالت کرتی ہے، جو ادبی اور تاریخی نظر کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔

غزل کی بات جب چھڑتی ہے تو صداقت، حسن اور افادہ کے مسائل خود بخود اٹھ کھڑے ہوتے ہیں "اردو غزل" اس اعتبار سے تشنہ رہ گئی ہے۔ صرف چند بلیغ اشارے ملتے ہیں، مثلاً "جمالیاتی تجربہ خود علم کی اعلیٰ ترین شکل ہے، جس کی بدولت صداقت اور افادیت کے تضاد کو رفع کیا جا سکتا ہے"، اس قسم کے بیانات پر تفصیل سے بحث کرنے کی ضرورت تھی، تاکہ مصنف کا جمالیاتی نقطۂ نظر بخوبی واضح ہو جاتا۔ مصنف حقیقت بیں ہوتے ہوئے بھی عینیت کی طرف جھکا ہوا ہے۔ اسی لئے شاید اقبال سے متاثر ہو کر اس نے اجتماعی مقاصد کو "انفرادیت کے پہلو میں عشق کی کسک" سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اجتماعی شعور "عشق کی کسک" سے کہیں زیادہ عقل اور عمل کی روشنی سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ انفرادیت کی گہرائیوں سے کھنچی ہوئی کمان کی مانند نہیں ابھرتا، بلکہ عقل اور تجربے کی روشنی میں جذبات کے جھٹ پٹے سے دھنک کے رنگوں کی طرح نکھر اٹھتا ہے۔ اسی لئے اخلاق شخصیت کے رجحانات سے تعبیر ہوتا ہے، یہ گویا اس کی ایک اور لنک ہے!

ڈاکٹر یوسف حسین کا عام انداز بیان یہ ہے کہ وہ اپنے دعوے کی دلیل کے طور پر کثرت سے اشعار نقل کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات ان کی مزید اور غیر ضروری شرح بھی کرتے جاتے ہیں، اس کو کسی حد تک کم کیا جا سکتا تھا۔ ان کی جگہ اس قسم کے خیال انگیز اور چونکا دینے والے "تنقیدی ریمارک" سے پر کرنی چاہئے تھی جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ انھوں نے ایہام و رمز کے ارتقا پر "تمدنی احوال" سے مطلق روشنی نہیں ڈالی۔ رمز و ایما، فنی خم و پیچ سے بھی تعلق رکھتے ہیں لیکن ان کا ایک سماجی پس منظر بھی ہے۔ ایہام ایک مخصوص سماج اور مخصوص انداز فکر سے پیدا ہوتا ہے، دوسرے الفاظ میں بے پردہ اور در پردہ بات کہتے وقت شاعر ماحول کے تقاضوں سے بھی مجبور ہوتا ہے۔

"اردو غزل" غزل پر جامع اور محیط کتاب نہیں لیکن عام ڈگر سے ہٹ کر ضرور ہے۔ اس سے غزل کی روایت ایک مرتبہ پھر مستحکم ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ منتخب کیا ہوا انتخاب نہ صرف مزاج غزل کو بے نقاب کرتا ہے بلکہ اس "ذوقیات" کی صحت کا بھی غماز ہے جو صرف رچ بس کر پیدا ہوتی ہے۔ تنقید کی طرح انتخاب بھی ہمہ گیر نہیں۔ بعض اوقات اچھے شعرا کے بس دو شعروں پر اکتفا کیا گیا ہے، کچھ نئے غزل گو نظر انداز بھی ہو گئے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ تنقید اور انتخاب دونوں میں مصنف کے پیش نظر ایک مخصوص ادوار تھی۔

بزم بے تکلف

بہ سلسلہ صفحہ ۵

ان کو تر لقمہ سمجھ کر ہڑپ کرنے کی کوشش کی۔ آپ انھیں جتا دیجئے کہ ہیرا جتنا صاف شفاف اور چمک دار ہوتا ہے اتنا ہی سخت اور تیز بھی ہوتا ہے وہ سر پر سجتا ہے پیٹ میں نہیں پچتا۔ اس کی جگہ طرۂ کلاہ ہے۔ قعر شکم نہیں۔ بس یہی چند لفظ ہیں آپ سے کہنے تھے۔

خدا حافظ"

ہندوستان

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

لیکن وہ آپ ہی آپ پیدا نہیں ہوا بلکہ پروپگنڈا کے سارے وسائل سے کام لے کر ابھارا گیا تھا اور اگر اس کو قائم رکھنے کی کوشش نہ کی جائے تو رفتہ رفتہ اعتدال پر آ جائے گا۔ اور لوگ معقول بات کو سننے اور ماننے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔

گوسبی ہوٹل میں

ایک رات کا مہمان

مارک ٹوین

(امریکی ڈالر فاشزم کی بدحواسیاں اب ایک نئی منزل میں داخل ہو گئی ہیں اب تک تو غیر امریکی سرگرمیوں کی تحقیقاتی کمیٹی امریکہ کے موجودہ شہریوں کی جانچ پڑتال کرتی تھی کہ وہ "امریکی" ہیں یا "غیر امریکی" ——— لیکن اب سُنا گیا ہے کہ ماضی کے امریکی عوام اور فن کاروں کا بھی محاسبہ کیا جا رہا ہے چنانچہ معلوم ہوا ہے کہ نیویارک کے تعلیمی بورڈ نے مشہور امریکی مزاح نگار مارک ٹوین (مرحوم) کی کتاب "کنیکٹی کٹ کا ایک امریکی، شاہ آرتھر کے دربار میں" غیر قانونی یعنی غیر امریکی قرار دے دی۔ ذیل میں اسی مرحوم معتوب مصنف کا ایک افسانہ ملاحظہ کیجئے۔)

منہاج برنا

یہ ۱۸۶۷ء کی بات ہے کہ جب میں اور میرا دوست رائیلی واشنگٹن میں اخباری نامہ نگار تھے۔ اس وقت کوئی آدھی رات کا عمل ہوگا، طوفانی جھکڑ چل رہے تھے اور برف گر رہی تھی پنسلوا ایونیو کی طرف تھا اور ہم اپنے گرم کوٹوں کو اپنے جسم سے اچھی طرح لپیٹے تیزی سے بڑھے چلے جا رہے تھے کہ دفعتہً سڑک کے ایک لیمپ کی روشنی ایک آدمی پر پڑی جو بڑی تیزی سے ہماری مخالف سمت میں چل رہا تھا گویا کوئی بڑی مہم سر کرنے جا رہا ہو، لیکن، ہمارے قریب پہنچتے ہی یہ شخص یک لخت کھڑا ہو گیا اور رائیلی کی طرف ہمدردی کے انداز میں دیکھتے ہوئے بولا ———

عجیب اتفاق ہے، آپ مسٹر رائیلی ہیں نا؟

رائیلی ایک بہت ہی خوش مذاق اور چلتا پھرتا آدمی تھا، پبلک زندگی میں اُسے کافی اہمیت حاصل تھی وہ قدرے تکلف سے رُکا، پھر نووارد کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور پھر جواب دیا "ہوں، میں مسٹر رائیلی ہوں۔ کیا آپ میری ہی تلاش میں تھے ———؟"

جی ہاں۔ بالکل۔ میں آپ ہی کی تلاش میں تھا ———" اس آدمی نے خوشی خوشی جواب دیا ——— "یہ میری انتہائی خوش قسمتی ہے کہ میں نے آپ کو ڈھونڈھ نکالا .... میرا نام لکنس ہے۔ سان فرانسسکو ہائی اسکول میں استاد ہوں، لیکن جوں ہی مجھے معلوم ہوا کہ سان فرانسسکو کے پوسٹ ماسٹر کی جگہ خالی ہے، میں نے طے کر لیا کہ اُسے حاصل کر کے رہوں گا۔ چنانچہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں آپ کے سامنے ہوں۔"

"جی ...." رائیلی نے بہت خندہ پیشانی کے ساتھ آہستہ آہستہ کہا "جیسا کہ آپ نے ابھی فرمایا مسٹر لکنس .... آپ میرے سامنے ہیں .... تو آپ نے وہ جگہ حاصل کر لی؟"

"نہیں تو .... پوری طرح تو ابھی حاصل نہیں کر سکا ہوں۔ لیکن اب مجھے یہی کام کرنا ہے .... میں ایک درخواست لایا ہوں جس پر محکمۂ تعلیمات کے سپرنٹنڈنٹ، اساتذہ اور دیگر دو سو سے زائد آدمیوں کے دستخط ہیں۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اگر آپ میرے ساتھ تھوڑی عنایت اور مہربانی سے پیش آئیں تو براہ کرم میرے ساتھ پیسفک ڈیلی گیشن سے ملنے چلیں آپ کا بڑا احسان ہوگا۔ اس کام کو جلد سے جلد انجام تک پہنچا دینا چاہتا ہوں اور پھر اپنے گھر واپس ہونا چاہتا ہوں ———"

"معاملہ خاصا اہم ہے ——— تو کیا آپ آج ہی رات، اسی وقت ڈیلی گیشن سے ملنے چلیں گے ———"

رائیلی نے یہ بات جس لہجے میں کہی، اس میں کسی مزاح یا طنز کا نشتر نہ تھا۔

"ہاں آج رات۔ ہاں یقیناً، ضرور چلوں گا ——— میرے پاس زائد وقت بالکل نہیں ہے بیشتر اس کے کہ میں بستر پر دراز ہوں۔ میں ان سے وعدہ لے لینا چاہتا ہوں۔ صاحب میں باتونی آدمی نہیں کام کرتا ہوں کام ———"

"اچھا ——— تو تم صحیح آدمی سے ملے ہو تم کب آئے۔؟"

"بس کوئی ایک گھنٹہ ہوا ———"

"اور کب جا رہے ہو؟"

"نیویارک کل شام اور سان فرانسسکو پرسوں صبح"

"ٹھیک ——— اچھا کل تم کیا کرو گے؟"

"کروں گا کیا معنی ——— مجھے اپنی درخواست کے ساتھ پریذیڈنٹ سے ملاقات کرنی ہے اور پھر ڈیلی گیشن سے اپنا تقرر کروانا ہے۔ اس میں میرا خیال ہے کوئی پیچیدگی نہیں ———"

"جی ہاں، قطعی نہیں ——— یہ ٹھیک ہے۔ اور پھر کیا کرو گے؟"

"دو بجے دن کو سینٹ کی ایکزیکٹو کا جلسہ ہوگا وہاں اپنے تقرر کی تصدیق کرانا ہے۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا میری باتوں کو ———؟"

"ہاں، ہاں .... بالکل ...." رائیلی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "تم ٹھیک کہتے ہو .... پھر تم شام کی ٹرین سے نیویارک روانہ ہو جاؤ گے اور پرسوں صبح اسٹیمر سے سان فرانسسکو کیلئے ہے نا ———"

"بالکل جناب بالکل۔ یہی پروگرام ہے۔"

رائیلی نے ایک لمحے کچھ اور سوچا اور پھر بولا:

"کیا تم ایک دن ٹھیر نہیں سکتے۔ یا دو دن؟"

"اُفوہ۔ آپ بھی کمال کرتے ہیں .... یہ طریقۂ کار میرا نہیں۔ میں وقت کو ضائع کرنے والا آدمی نہیں .... میں وہ آدمی ہوں جو کام کرنا جانتا ہے اور بے تکان کام کرتا۔ سمجھے آپ ———"

طوفان اپنے پورے زور شور کے ساتھ جاری تھا اور برف بڑی شدت سے ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اُمڈ رہی تھی۔ رائیلی ایک دو لمحوں کے لئے بالکل خاموش ہو گیا، غالباً وہ کسی خیال میں گم تھا، کچھ دیر کے بعد وہ سر اُٹھا کر بولا "کیا تم نے اس شخص کے بارے میں کچھ سُنا ہے جو گوسبی ہوٹل میں ٹھیرا تھا .... نہیں شاید تم اس سے واقف نہیں ———"

رائیلی کچھ ہٹ کر فٹ پاتھ کے جنگلے کے قریب آگیا اور اس آدمی کو بھی جنگلے سے لگا کر کھڑا کر دیا تاکہ اُسے کھڑے رہنے میں زیادہ تکلیف نہ ہو، پھر اس نے اپنی کہانی کو بڑے مزے لے لے کر اور بہت آہستہ آہستہ سنانا شروع کیا گویا اس وقت وہ سخت برفانی جھکڑوں میں نہیں کھڑے تھے بلکہ موسم بہار میں کسی باغ کے سبزے پر بیٹھے خوش گپیوں میں مشغول تھے۔

تو میں تمھیں اس آدمی کا حال سُناتا ہوں، یہ جیکسن کا زمانہ تھا اس وقت گوسبی یہاں کا خاص ہوٹل تھا، ایک سہانی صبح کو ۹ بجے کے قریب یہی شخص جس کا میں ذکر کر رہا ہوں تیزی سے بہت ہی تزک و احتشام کے ساتھ شہر میں داخل ہوا، یعنی عالم یہ تھا کہ وہ ایک بہت ہی شاندار چار گھوڑوں والی رئیسانہ گاڑی میں بیٹھ کر آیا تھا جس کا کوچوان تک بہت خوش پوش تھا۔ گاڑی میں اپنے ساتھ وہ ایک کتا بھی لایا تھا جسے غالباً وہ بہت عزیز رکھتا تھا، اس کی گاڑی گوسبی کے سامنے میں جا کر رُکی، بس پھر کیا تھا ہوٹل کا مالک اس کا منیجر اور دیگر ملازمین دوڑے دوڑے باہر آئے تاکہ اس معزز مہمان کا خیر مقدم کریں اور اپنے ہوٹل کی زینت بڑھائیں ——— لیکن اُس نے فوراً کہا "زحمت کی ضرورت نہیں ———" وہ بہت پھرتی کے ساتھ گاڑی سے باہر نکلا اور کوچبان سے وہیں ٹھیرنے کے لئے کہا۔ اس نے بتایا کہ اس وقت بہت عجلت میں ہے، کھانا کھانے تک کے لئے اس کے پاس وقت نہیں۔ صورت یہ ہے کہ اس کا

کچھ قرضہ حکومت پر آتا ہے جس کو اسے وصول کرنا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ خزانہ جائے گا۔ اپنا روپیہ وصول کرے گا اور پھر فوراً ہی ٹینسی واپس ہو جائے گا کیونکہ وہ بہت عجلت میں ہے۔"

"خیر صاحب۔ رات کے کوئی دس بجے وہ واپس آیا۔ فوراً ہی بستر بچھانے اور گھوڑوں کو گاڑی سے کھول کر اصطبل میں باندھنے کا حکم دیا اور کہا کہ اب اپنا قرضہ کل صبح وصول کروں گا ——— یہ واقعہ جنوری کا ہے۔ جنوری ۱۸۳۳ء کا۔ آپ مجھے ۹ تین جنوری اور بدھ کا دن ———"

"پانچویں فروری کا واقعہ ہے کہ اس نے اپنی شاندار گاڑی فروخت کر دی اور اس کے بدلے میں ایک دوسری سستی سی گاڑی خرید لی۔ کہنے لگا کہ روپیہ گھر لے جانے کے لئے یہ گاڑی بھی کافی ہے، مجھے دکھاوے اور فیشن سے نفرت ہے ———

۱۱ اگست کو اس نے اپنے گھوڑوں کا ایک جوڑا بیچ ڈالا کہ میرا ہمیشہ سے خیال ہے کہ گاڑی کے لئے چار کے بجائے دو گھوڑے کافی ہوتے ہیں۔ خصوصاً پہاڑی علاقوں کے راستوں کو طے کرنے کے لئے جہاں آدمی کو بہت سنبھال کر گاڑی چلانی پڑتی ہے ...... اور پھر میرے قرضے کی رقم بھی کچھ ایسی زیادہ نہیں۔ دو گھوڑے اس رقم کو آسانی کے ساتھ گھر لے جا سکتے ہیں۔

۱۳ دسمبر کو اس نے ایک اور گھوڑا بیچ دیا۔ کہا کہ دقیانوسی گاڑی کے لئے دو گھوڑوں کی بالکل ضرورت نہیں۔ حقیقت میں ایک گھوڑا اسے زیادہ آسانی کے ساتھ کھینچ سکتا ہے اور پھر آج کل جاڑے ختم ہو رہے ہیں۔ اور راستے ابھی اچھی حالت میں ہیں۔

۱۷ فروری ۱۸۳۵ء کو اس نے اس پرانی دقیانوسی گاڑی کو بھی بیچ دیا اور اس کے بعد ایک پرانی، لیکن ہلکی پھلکی بگھی خرید لی۔ کہنے لگا کہ "موسم بہار کے اوائل میں راستوں کی جو حالت ہوتی ہے اور وہ جس قدر پھسلن اور کیچڑ سے بھرے ہوتے ہیں ان کے لئے تو بگھی ہی ٹھیک رہے گی اور پھر میری تو یہ دیرینہ تمنا ہے کہ کبھی پہاڑی راستوں پر بگھی چلاؤں۔"

یکم اگست کو اس نے بگھی کو بھی فروخت کر ڈالا اور اس کی جگہ ایک گھٹیا قسم کا یکہ خرید لیا کہنے لگا کہ "میں چاہتا ہوں کہ میرے ہم وطن مجھے یکے میں آتا ہوا دیکھیں۔ انھوں نے ایسا یکہ اپنی تمام عمر میں نہ دیکھا ہوگا ———"

"اچھا جناب خدا آپ کا بھلا کرے۔ ۲۹ اگست کو اس نے اپنے حبشی کوچبان کو بھی بیچ دیا کہا کہ یکہ کے لئے کوچبان کی ضرورت نہیں اور یکہ میں دو آدمیوں کی جگہ بھی بڑی تنگی سے نکلتی ہے۔ اور پھر کہنے لگا کہ یہ بھی بڑی خوش قسمتی ہے اور روز روز ایسی خوش قسمتی کس کو نصیب ہوتی ہے کہ کوئی ایسے بھتیرے، ناکارہ اور تھرڈ کلاس حبشی کے لئے نو سو ڈالر دیدے۔ اور میں تو پہلے ہی اس حبشی سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا، مگر نکالتے ہوئے ترس آتا تھا۔

۱۸ مہینے کے بعد یعنی ۱۵ فروری ۱۸۳۶ء کو اس نے یکہ بھی فروخت کر ڈالا اور گھوڑے کے لئے زین خرید لی۔ کہنے لگا کہ "گھوڑے کی سواری کے ڈاکٹر مجھے ہمیشہ مشورہ دیتے رہے ہیں۔ دراصل میری صحت کے لئے شہسواری نہایت ضروری ہے اور پھر اس موسم میں راستے بڑے خراب ہوتے ہیں۔ پہیے کہیں بھی پھسل سکتے ہیں۔ اس لئے خواہ مخواہ اپنی جان کیوں خطرہ میں ڈالی جائے۔

۹ اپریل کو اس نے زین بھی بیچ ڈالا۔ بولا کہ اپریل کی بارش میں خراب ہو جانے والے گھٹیا قسم کے زین سے میری زندگی کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ اب مجھے اتنی مشق ہو گئی ہے کہ گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر آسانی سے سوار ہو سکتا ہوں۔

۲۴ اپریل کو اس نے اپنا گھوڑا بھی بیچ ڈالا۔ کہنے لگا کہ میری عمر صرف ۵۷ سال کی ہے اور اب بھی تندرست، توانا اور ہٹا کٹا ہوں اس موقع کو گھوڑے کی سواری سے ضائع کرنا حماقت ہے ———

یہ موسم ——— جس میں پیدل چلنا شائد دنیا کا بہترین اور خوشگوار ترین شغل ہے .... تازہ اور لو بھرے پودوں اور ہرے بھرے درختوں سے ڈھکے جنگلوں میں سے گذرنا اور پرفضا پہاڑوں پر چلنا .... کیا کہنے ہیں اور ایسے آدمی کے لئے جو سچ مچ آدمی ہے رہی میری دولت تو جب وہ مل جائے گی تو اسے کتا بھی اٹھا کر چل سکتا ہے، لہٰذا میں کل علی الصباح ہی اٹھ جاؤں گا۔ اپنا قرضہ وصول کروں گا اور گوسبی ہوٹل کو ایک پرجوش رخصتی سلام کرتے ہوئے پاپیادہ ٹینسی روانہ ہو جاؤں گا ———

۲۲ جون کو اس نے اپنا کتا بھی بیچ ڈالا۔ کتا لغو چیز ہے، ایک خواہ مخواہ کا بار ہے جبکہ آپ ہرے بھرے جنگلات میں ایک خوشگوار اور فرحت افزا سفر کر رہے ہوں۔ کتا ایک زبردستی کی مصیبت ہے۔ ایک بلائے بے درماں ہے۔ جب دیکھو گلہریوں کا پیچھا کرتا ہے۔ ہر شخص پر بھونکتا ہے۔ آس پاس کے مکانوں میں گھس جاتا ہے۔ کبھی تالاب میں گھس کر اپنے جسم کو گندہ کر لیتا ہے۔ غرض ایک مصیبت ہی مصیبت ہوتا ہے۔ کوئی شخص اس وجود کے ساتھ جس کے ہوتے ہوئے فرشتے بھی پاس نہیں پھٹکتے کیوں کر نیچر کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہو سکتا ہے ——— اور رہی میری دولت جو میں وصول کروں گا تو اسے میں خود اٹھا سکتا ہوں کتا مال کے معاملے میں ذرا غیر ذمہ دار ہوتا ہے۔ میرا تجربہ ہے اچھا تو یارو! خدا حافظ! میں کل صبح ہی اپنی مضبوط ٹانگوں اور جیتے جاگتے دل کے ساتھ ٹینسی روانہ ہو جاؤں گا ———"

یہاں پہنچ کر رائیلی نے توقف کیا۔ ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ اس سکوت میں صرف ہوا کے چلنے اور برف کے گرنے کی آواز مخل تھی۔ مسٹر ملکنس نے یک لخت بہت بے چینی کے ساتھ پوچھا ——— "اچھا تو پھر ——— ؟"

"پھر؟ یہ تیس سال پہلے کی بات ہے ———"

"اچھا تو پھر ———"

"وہ آدمی میرا بہت گہرا دوست ہے۔ وہ ہر شام کو مجھے خدا حافظ کہنے آتا ہے۔ آج بھی کوئی ایک گھنٹہ ہوا وہ مجھے ملا تھا۔ وہ حسب معمول کل صبح ٹینسی روانہ ہو جائے گا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ کل ضرور اور سرمائے میں پوچھنے سے پیشتر اپنا قرضہ وصول کر کے یہاں سے چل دے گا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ بہت خوش تھا کہ کل وہ ٹینسی روانہ ہو جائے گا اور وہاں ایک بار پھر اپنے دوستوں اور گھر والوں سے مل سکے گا"

"(ایک اور خاموش وقفہ) ——— اجنبی نے دوبارہ اس سکوت کو توڑا ——— بس قصہ ختم ہو گیا ———"

"ہاں قصہ ختم ہو گیا ———"

"خوب ——— میرے خیال میں رات کے وقت اور ایسی رات کے وقت .... یہ کہانی کافی طویل تھی۔ .... لیکن اس کا مقصد؟ ———"

"جی مقصد ؟ ——— کوئی خاص مقصد نہیں ———"

"پھر بھی۔ کچھ تو آخر ———"

"اس کا کوئی خاص مقصد نہیں۔ صرف بات اتنی ہے کہ اگر آپ کو سان فرانسسکو جانے اور اپنا تقرر کرانے کی بہت جلدی نہ ہو تو میرا مشورہ یہ ہے کہ ایک رات کے لئے گوسبی ہوٹل میں قیام کیجئے اور آرام سے سو رہیے۔ اچھا خدا حافظ ———"

اتنا کہہ کر رائیلی میرا ہاتھ پکڑ کر چل دیا اور حیرت زدہ اسکول ٹیچر کو وہیں کھڑا کا کھڑا چھوڑ دیا۔ وہ اس وقت لیمپ کی روشنی میں بت کا ایک حصہ معلوم ہو رہا تھا۔

بے چارے کو پوسٹ ماسٹر کی جگہ نہ مل سکی۔

اور صبر کی توفیق عطا فرما، حسین دعا فرما رہے تھے بار الٰہا انہیں توفیق دے کہ حسینؑ کی حمایت میں بہادری اور استقلال دکھلائیں اور جان دیں۔ اندر خواتین حسینؑ کی سلامتی کے لئے دست بدعا تھیں، اور بی بی زینب سید مرسل کی جان سے زیادہ پیارے بھائی کے لئے گڑگڑا گڑگڑا کر خدا سے دعائیں کر رہی تھیں۔

ابھی حسینؑ عبادت سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ فوج اشقیا کی طرف سے بہت سے تیر آکر گرے اور کئی آدمی اسی میں شہید ہو گئے۔ حسینؑ تلوار لٹکا کر کھڑے ہوئے، سب سے پہلے خیمے میں جا کر اہل حرم سے رخصت ہوئے۔ باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ سامنے مجاہد سر کٹانے کو تیار کھڑے ہیں ان میں حبیب بن مظاہر جیسے مقدس بوڑھے بھی ہیں جو حضور رسول اللہ کا زمانہ دیکھ چکے ہیں۔ بڑے بڑے بہادر جوان بھی ہیں۔ علیؑ کے جاںباز بیٹے حسینؑ کے اپنے بیٹے۔ زینبؑ کے کم سن فرزند، جعفرؑ کے دونوں لال، سب شجاعت و جرأت میں یگانۂ روزگار، نہ چہروں پر فکر نہ دل میں ہراس، حسینؑ پہ اور راہ حق پر جان دینے کے لئے ہشاش بشاش تنے ہوئے کھڑے ہیں۔ ان بہتر مجاہدوں میں ایک مجاہد ایسا بھی تھا جو ان لڑنے والوں کی صف میں شامل نہیں تھا، یعنی علی اصغر امام حسینؑ کا چھ مہینے کا بچہ جو چھوٹا سا بیٹا باپ کی نصرت کے لئے تیار تھا۔

حسینؑ مسکراتے ہوئے اپنی مختصر مگر یگانۂ روزگار فوج کے قریب آئے۔ ان کو صبر و استقلال کی ہدایت کی اور پھر سب کے دشمن کی فوج کے سامنے جا کر دیر تک انہیں ایمان اور حق کی راہ دکھانے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر سوا ایک شخص حر کے کسی کے دل پر اثر نہ ہوا، وہی حر جس نے حسینؑ کا راستہ روکا تھا اور آپ نے اس کی پیاسی فوج کو سیراب کیا تھا۔ حر حسینؑ کے خلق کی شان دیکھ چکا تھا وہ فوج مخالف سے گھوڑا اڑاتا ہوا آیا اور آکر امام حسینؑ سے معافی مانگی اور ان سے اجازت لے کر سب سے پہلے لڑ کر حسینؑ پر جان نچھاور کر دی۔ پھر تو ایک کے بعد ایک بہادر آتا حسینؑ سے اجازت جنگ مانگتا آپ اسے گلے سے لگا کر صبر کی سل دل پر رکھ کر اجازت دیتے وہ یزید کی فوج میں جاتا، حسب دستور اپنا نام و نسب ظاہر کرتا، مبارز طلب کرتا، اور اپنی تلوار کے جوہر دکھاتا ہوا بیسیوں نابکاروں کو مار کر خود بھی شہید ہو جاتا۔ حسینؑ انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھتے ہوئے جلتے اور اس کی لاش کو لا کر صحرا میں لٹا دیتے، اتنا وقت اور سامان نہ تھا کہ دفن کر سکتے، آخرکار یہ وقت آگیا کہ سب رفیق و انصار کے علاوہ حضرت عباس کے علاوہ بھائی امام حسینؑ کے فرزند اور مسلم کے بچوں نے بھی شہادت پائی۔ اب زینبؑ کے بچے جنگ میں جانے پر مصر تھے حسینؑ کو بہن اور بھانجوں سے اور زینبؑ کو حسینؑ اور ان کے بچوں سے بے انتہا محبت تھی۔ لیکن ماں بیٹوں کے اصرار سے مجبور ہو کر حسینؑ نے بھانجوں کو بھی اجازت دیدی اور یہ دونوں بہادر میدان کارزار میں نہ بھولنے والی شجاعت اور کارنامے دکھا کر شہید ہو گئے اور صابر امام کی صابرہ بہن نے بچوں کی شہادت پر انتہائی صبر جمیل دکھایا، منہ سے اُف بھی نہ کی۔ آخر حسینؑ کی فوج میں سوا اکبر و عباسؑ علی کے کوئی اور باقی نہ رہا، عباس نے خیمے میں بیوی اور بہن زینب سے رخصت لی اور ہتھیار لگا کر کھڑے رہے تھے کہ حسینؑ کی چار سال کی بچی سکینہ جسے چچا سے اور چچا کو اس سے بے حد الفت تھی، ان کے پاس آئیں اور سوکھا مشکیزہ چچا کو دیا اور اپنے خشک لب جو پیاس سے پھٹے پڑ گئے تھے انہیں دکھلائے اور پانی کی طالب ہوئیں شجاع اور بہادر عباس تڑپ اٹھے اور برداشت نہ کر سکے آخر بھائی سے عرض کیا، آقا اب مجھ سے بچوں کی پیاس نہیں دیکھی جاتی، اجازت دیجئے کہ ایک مرتبہ یہ کوشش کر لوں کہ بچوں کے خشک لب تر ہو سکیں۔ حسینؑ نے با دل پر درد اپنے چہیتے بھائی کو جن کو بیٹے سے زیادہ چاہتے تھے اجازت جنگ دیدی، اور حضرت عباس مشکیزہ لے کر کسی نہ کسی طرح لڑتے بھڑتے نہر فرات تک پہنچے۔ مشکیزہ بھرا اور واپس ہوئے کہ کسی طرح یہ مشک خیمے تک پہنچا دیں مگر عباس کی وفا اور استقلال کی مثال کہاں ملے گی کہ تین دن کے تشنہ دہاں بہادر نے اپنے لب خشک اس لئے تر نہیں کئے کہ حسینؑ پیاسے ہیں۔ نہر سے نکلتے ہی فوج دشمن نے چاروں طرف سے گھیر لیا، دونوں بازو شانے سے جدا ہو گئے، مشکیزہ تیر سے چھد گیا، اور عباس زخموں سے چور چور ہو کر گر پڑے اور شہید ہو گئے۔ ان کی شہادت کے بعد اٹھارہ برس کا کڑیل جوان بیٹا علی اکبر حسینؑ سے مرنے کی اجازت کا طالب ہوا اور حسینؑ نے حق کی راہ میں جان دینے کے لئے اسے بھی اجازت دیدی۔ چنانچہ علی اکبر بھی داد شجاعت دے کر شہید ہو گئے اور وقت ظہر تھا کہ حسینؑ کی مختصر فوج کا خاتمہ بالخیر ہو گیا۔

امام حسینؑ کی اس وقت کی حالت کون بیان کر سکتا ہے ۷۲ گھنٹے کی بھوک اور پیاس اور وہ پیاس جس کا ہم آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ عرب کا تپتا ہوا صحرا، ریت کے جلتے ہوئے ذروں کا اڑنا، بدن پر لوہے کے اسلحہ جنگ جو آگ کی طرح تپ رہے تھے، دل پر درد، داغ، بھائی کے غم میں کمر شکستہ، بیٹے کے صدمے سے بینائی میں فرق، اہل حرم کی بے کسی، بے بسی اور بے قراری دیکھ کر دل ٹکڑے ٹکڑے اور اس حالت میں جا جا کر پیاروں کی لاشیں اٹھا کر لانا، یہ حسینؑ ہی کا دل تھا کہ سب مصائب کو بے مثل صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کیا اور سوا خدا کے شکر کے کوئی دوسرا لفظ زبان مبارک پر نہ آیا۔

یزید کی فوج مبارز طلب کر رہی تھی حسینؑ اپنی کمر پٹکے سے باندھ کر اپنی چہیتی بہن زینبؑ اور سب اہل حرم سے رخصت ہو کر خیمے میں گئے۔ دیکھا بہن مچھلی کی طرح تڑپ رہی ہیں، گلے سے لگایا اور صبر کی ہدایت کی اور دوسری سب خواتین کو صبر اور خدا پہ بھروسہ رکھنے کی تلقین کر کے خیمے سے باہر آنا چاہتے تھے کہ آپ کی بیوی رباب والدہ علی اصغر اپنے نیم جاں لال کو ہاتھوں پر لئے آپ کے پاس آئیں اور کہا۔ مولا علی اصغر پیاس سے جاں بلب ہیں اسے میدان جنگ میں لے جا کر دشمنوں کو اس کی حالت دکھا دیجئے، وہ اس معصوم پر ضرور ترس کھائیں گے اور پانی کے چند قطرے اس کے حلق میں ڈال دیں گے۔ امام حسینؑ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ وہ جانتے تھے کہ دشمن اسے بھی پانی نہ دیں گے۔ مگر آخری حجت یہ بھی تمام کرنی تھی۔ آپ علی اصغر کو ہاتھوں پر لئے فوج مخالف کے سامنے گئے اور کہا یہ کہ بچہ پیاس سے نیم جان ہے، کیونکہ اس کی ماں کا دودھ صدموں اور بھوک پیاس نے خشک کر دیا ہے۔ صرف چند قطرے پانی کے اسے پلا دو۔ لیکن حسینؑ کے سوال کا جواب ایک تیر سے ملا جو حسینؑ کے بازو کو چھید کر علی اصغر کے گلے میں پیوست ہو گیا اور وہ معصوم تڑپ کر باپ کے ہاتھوں پر ختم ہو گیا۔ حسینؑ نے آسمان کی طرف دیکھا کہ مرثیہ حالت بے قراری میں منہ سے نکلا " رضاً بقضائہٖ وتسلیماً لامرہٖ فانا للہ وانا الیہ راجعون " اور پھر فرمایا بار الٰہی حسینؑ کی یہ آخری نذر تھی۔ اسے قبول کر۔ اب سوا اپنے سر کے میرے پاس کچھ باقی نہیں۔ اب وہ تیری راہ میں نثار کرتا ہوں آپ نے اپنی تلوار سے ایک ننھی سی قبر کھود کر بچے کو دفن کیا اور خود فوج دشمن کے مقابلے پر آئے۔ پہلے انھیں حق کی راہ دکھانے کی ایک آخری کوشش اور کی مگر ہر بات کا جواب تیر و نیزے سے ملا۔ حسینؑ عرب کے سب سے بڑے بہادر اور شجاع کے بیٹے اور خود بہت بڑے بہادر تھے باوجود صدموں اور ضعیفی کے آپ اس بہادری سے لڑے کہ دشمنوں کی فوج میں ابتری پھیل گئی۔ مگر ایک اور ہزاروں کا مقابلہ ہی کیا، آپ کے تن اطہر پر تلواروں، نیزوں اور تیروں اور پتھروں کے ہزاروں زخم لگ گئے اور زخموں سے چور چور ہو کر گھوڑے سے گر پڑے۔ صحرا کی تپتی ہوئی ریت زخموں میں پیوست ہو رہی تھی، ہزاروں شقی ننگی تلواریں لئے گرد کھڑے تھے کہ ہادی برحق کے نواسے کے کان میں عصر کی اذان کی آواز آئی، حسینؑ انتہائی کوشش اور بڑی مشکل سے قبلہ رو ہوئے اور اپنا سر مبارک بارگاہ خداوندی میں سجدے کے لئے خاک پر رکھ دیا۔ شمر ملعون یزید کی فوج کا ایک شقی القلب افسر آگے بڑھا، دیکھا حسینؑ سجدے میں کچھ کہہ رہے ہیں۔ سمجھا ہمارے لئے بد دعا کر رہے ہوں گے، کان لگا کر سنا تو کیا سنا کہ حسینؑ فرما رہے ہیں " پروردگار میرے نانا کی امت کو راہ راست دکھا اور یہ گمراہ ہیں انھیں راہ حق پر چلنے کی ہدایت دے "

زینبؑ نے بھائی کے گھوڑے کو خالی دیکھا جس نے بیٹوں کے صدمے میں آہ تک نہ کی تھی، وہ صابرہ بے قرار ہو کر اپنے سے بے خبر ننگے پاؤں، سر کھلا ہوا، قتل گاہ کی طرف دوڑتی ہوئی آئیں تو دیکھا کہ شمر نے امام حسینؑ کا سر مبارک جسم سے جدا کر دیا ہے اور اسے نیزے پر چڑھا رہا ہے۔

اے حسین ابن علیؑ! اے کربلا کے بھوکے پیاسے مہمان!! اے مجاہد اعظم، اے صابروں کے سرتاج

برزمینے کہ نشان کف پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

ادارہ تحریر۔
ڈاکٹر سید عابد حسین ۔ صالحہ عابد حسین
عبداللطیف اعظمی

شرح چندہ ممالک غیر

ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دوسرے ملکوں کے لئے "نئی روشنی" کا چندہ حسب ذیل ہے۔

سالانہ ... ... دس روپے
ششماہی ... ... ساڑھے پانچ روپے
فی پرچہ ... ... چار آنے

شرح اشتہارات

ڈھائی روپے فی انچ سنگل کالم
ایک صفحہ میں چار کالم ہوتے ہیں (منیجر)

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۳ | نمبر ۱۹ | ۱۶ر نومبر ۱۹۴۹ء | ایڈیٹر:- ڈاکٹر سید عابد حسین

یو این او کی ایک جھلک

۱۵ر اکتوبر

برادرم عابد صاحب

السلام علیکم - دلی سے روانہ ہوتے وقت میں نے وعدہ کیا تھا کہ اور کچھ نہ ہو پایا تو نئی روشنی کے لئے ہفتہ وار خط ضرور لکھتا رہوں گا۔ اور کچھ نہیں ہو پایا اور نئی روشنی کی تھوڑی سی خدمت بھی نہیں ہو سکی - مگر میں لکھتا تو کیا لکھتا - کینیڈا میں جو کامن ویلتھ کانفرنس ہوئی تھی اس کے بیشتر لوگ یہاں تھے جو کانفرنسوں اور کمیٹیوں میں شرکت پیشے کے طور پر نہ کرتے ہوں تب بھی سال میں دو چار دفعہ ان میں ضرور شریک ہوتے ہیں۔ قریب قریب سب ایک دوسرے کو جانتے تھے ، اور جو پہلے سے نہیں جانتے تھے انھوں نے میرے نزدیک "دلی را دلی می شناسد" کے اصول کو ثابت کر دیا ، اور بہت جلد گھل مل گئے - میری حالت آپ کو معلوم ہے ، بات کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تب بھی چاہتا ہوں کہ کسی طرح ٹال جاؤں - اس کے علاوہ سر جی وجے راگھوچاریہ نے مجھے اپنا چھوٹا بھائی اور مددگار بنا لیا - اور سونے کے کمرے سے کانفرنس کے ہال اور وہاں سے کھانے کے کمرے تک جانے کے لئے جغرافیہ کے جو سبق ضروری تھے وہ مجھ سے دن میں چار مرتبہ یاد کرتے تھے - یہاں یو ، این ، او میں ایسے کسی بزرگ کی خدمت کرنے کا شرف حاصل نہیں - باقی نقشہ وہی ہے - بیشتر نمائندے یو ، این ، او اس کے متعلق کونسلوں اور کمیٹیوں اور دوسری بین قومی کانفرنسوں میں کئی مرتبہ شریک ہو چکے ہیں ، اور ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہیں - میرے لئے ہر صورت نئی ، ہر بات نرالی تھی - اب جگہ سے اور آدمیوں سے اور کام کے طریقوں سے کسی قدر واقف ہو گیا ہوں تو آپ کو لکھنے کی ہمت ہوئی ہے - یو ، این کے بارے میں [illegible] تقریر ہندوستانی میں اور ایک انگریزی میں آل انڈیا ریڈیو کے لئے کر چکا ہوں اور ان دونوں [illegible] اصل آپ کو بھیج رہا ہوں - ان سے یو ، این ، او کے طریق کار کا کچھ اندازہ ہو جائے گا - اس وقت تک جو بڑی کارروائیاں ہوئی ہیں - ان کا مختصر حال سن لیجئے۔

قوموں کے نمائندے جمع ہوتے ہیں تو پہلے صدر کی طرف سے کچھ ارشاد ہوتا ہے ، پھر نئے صدر کا اور سات نائب صدروں کا انتخاب ہوتا ہے ، اور اس کے بعد قوموں کے نمائندوں کو اپنے جذبات ظاہر کرنے یا ایک دوسرے کی ہدایت یا تنقید کے لئے تقریریں کرنے کا موقع دیا جاتا ہے - شروع میں نمائندے ذرا تکلف کرتے ہیں - اس لئے کہ ہر ایک چاہتا ہے کہ دوسروں کی بات سن کر اپنی کہے - پھر صدر کو احساس ہوتا ہے کہ تقریروں کا سلسلہ اور کسی طرح بند نہ ہوگا اور وہ نمائندوں سے درخواست کرنے لگتا ہے کہ کوئی خاص بات کہنا نہ ہو تو تقریر نہ کریں - اس مرتبہ متحدہ ریاستوں کے نمائندے مسٹر ایچیسن نے پہلے دن تقریر کی - گویا پہلی توپ داغ کر زبانی جنگ کا سلسلہ شروع کیا - لیکن لڑائی متحدہ ریاستوں ، برطانیہ اور روس اور اس کے ساتھیوں تک محدود رہی - ہندوستانی ڈیلیگیشن کے لیڈر سر این ، بی ، راؤ کی تقریر صلح جوئی کی ایسی مثال تھی کہ پاکستانی بھی اس پر اعتراض نہیں کر سکتے تھے ، اور باقی تقریریں بھی صلح پسندی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں عراق کے نمائندے کی تقریر ذرا لمبی اور ناصحانہ انداز میں تھی ، مگر اس میں بڑی سچائی اور گہرائی تھی ، اس وجہ سے وہ بہت پسند کی گئی۔

۲۷ر ستمبر سے عام اسمبلی کی چھ کمیٹیوں کے جلسے ہو رہے ہیں - پہلی کمیٹی میں سیاسی مسائل پر بحث ہوتی ہے اور یہیں آتش باری کا تماشا بھی زیادہ نظر آتا ہے - لیکن ایسی کوئی کمیٹی نہیں ہے جس میں روس اور اس کے ساتھی گولہ باری نہ کرتے ہوں اور اس کا جواب برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کی طرف سے نہ دیا جاتا ہو - میں پہلے تیسری کمیٹی میں تھا جس کا میدان انسانی حقوق کے مسائل ہیں - یہ اب تک بردہ فروشی کے متعلق ایک قانون کے مسودے پر غور کرتی رہی ہے اور ابھی تین چار دن ہوئے اسے منظور کیا ہے - اس مسئلے پر بحث جاری تھی کہ میں دوسری کمیٹی میں جو معاشی مسائل پر غور کرتی ہے بھیج دیا گیا ، اور پھر چوتھی کمیٹی میں جس کا حصہ ان علاقوں کے مسائل ہیں جو ٹوگولینڈ ، کیمرون اور ٹینگینیکا کی طرح بعض حکومتوں کی تولیت میں دے گئے ہیں اور جن کے مفاد کے تحفظ کے لئے تولیتی کونسل یو ، این کے ایک مستقل رکن کی حیثیت سے قائم کی گئی ہے - چوتھی کمیٹی ابھی ایجنڈا کے پہلے مسئلے ، یعنی کونسل کی سالانہ رپورٹ پر بحث کر رہی ہے - ہر موقع پر روس اور اس کے ساتھی انتہا پسندی کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ دلیلیں سنتے سنتے طبیعت عاجز آ جاتی ہے مگر اس کے باوجود اگر کبھی وہ چبھتی ہوئی بات کہتے ہیں تو اس کی انھیں داد ملتی ہے اور کوئی صحیح اعتراض کرتے ہیں تو اس کا اثر ہوتا ہے - تولیتی علاقوں کے بارے میں جو "سیاسی" ریزولیوشن منظور ہوا ہے ، اُسے چکوسلوواکیہ کے نمائندے نے پیش کیا ، اور اسے ہم بیچ میں بیٹھنے والوں نے اپنی تجویزوں کے ساتھ ملا کر منظور کرا لیا - اگرچہ برطانیہ اور فرانس نے اس کی سختی سے مخالفت کی - اس کامیابی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ چکوسلوواکیہ کا نمائندہ ہم لوگوں سے ملتا ہے ، باتیں کرتا ہے ، جھگڑتا نہیں - (بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

فہرست مضامین

قیمت فی پرچہ ۲ر

مختصر تبصرے

دو کتابیں

خواجہ احمد فاروقی

۱- کوکھ جلی :- از راجندر سنگھ بیدی - مطبوعہ کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی نمبر۱، قیمت تین روپے
۲- ادب اور سماج :- از سید احتشام حسین - مطبوعہ کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی　　قیمت دو روپے ۱۲؍

۱- کوکھ جلی :- آزادی کے ملنے کے بعد جو طوفان اٹھا، اس میں ادب کی شمع کو روشن رکھنا، آسان نہیں تھا مگر ہمارے وہ ادیب جو معاشرت کے صحیح ترجمان اور انسانی زندگی کے سچے عکاس تھے وہ اس شمع کو مضبوطی کے ساتھ بلند کئے رہے۔ بلکہ بعض نے تو اس کو اس شان سے فروزاں کیا کہ ان کی کوششوں سے گرد و پیش کی تاریکی چھٹ گئی اور دور ——— امید کا روشن ستارہ بھی طلوع ہوتا ہوا نظر آیا۔

راجندر سنگھ بیدی کا شمار بھی ان ہی مصنفوں میں سے ہے۔ ان کے ان مجموعے میں فن کی پختگی اور زبان کی چاشنی کم اور بہت کم ہے۔ لیکن شکست و ریخت کے اس دور میں ہم ان چیزوں کی توقع بھی نہیں کر سکتے ——— کیا کم ہے کہ ان کے افسانوں میں نیا شعور، نیا احساس، اور نیا یقین ہے۔ وہ انسان کی کھوئی ہوئی عظمت کا پتہ لگانا چاہتے ہیں۔ زندگی کی تہوں کو کھولنے کے خواہش مند ہیں، وہ خوابوں اور حقیقتوں کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ سیاسی، اقتصادی اور جنسی مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں سماج کے حسن اور غلاظت پر ناقدانہ نظر ڈال کر ان میں صحت مند عناصر کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ہماری متنوع اور رنگا رنگ زندگی کی مصوری ہی نہیں، رہنمائی کرتے ہیں اور زندگی کے خاکے میں انفرادیت ہی کا نہیں اجتماعیت کا رنگ بھرنا چاہتے ہیں۔ غرض نفسیات کی عقدہ کشائی ہماری پوشیدہ امنگوں اور خون گشتہ آرزوؤں کا اظہار ——— ان سب کی ہلکی جھلک ان کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔

"لمس" میں سر جیو رام کی زندگی پر کیسا سخت طنز ہے وہ در اصل اس طبقہ کا نمائندہ ہے جو انگریز کی بدولت عالم وجود میں آیا اور جس کا مقصد حیات صرف انجمن آرائی اور عزت فروشی ہے۔ غریب عوام کا اس طبقہ کے ہاتھوں کیا حال ہوتا ہے اور وہ کس طرح ان بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ وہ سب اس آئینے میں نظر آ جاتا ہے۔ ایک اور قابلِ ذکر افسانہ "کوکھ جلی" ہے جو اس مجموعے میں بیت الغزل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ سماج کے جنسی مسائل پر ایک ابدی زہر خند ہے اور تکنیک کے اعتبار سے مکمل ہے گھمنڈی نے جس ماحول میں آنکھ کھولی ہے، اس میں جنس کے طوفان خیز جنسی رجحانات کا حشر یہی ہو سکتا تھا، جو ہوا، اس کی ماں جو ایک شرابی کی بیوی رہ چکی ہے، اس کا کردار بڑی صحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ صرف چند لکیروں سے پوری تصویر کھینچ دی ہے۔

اس مجموعے میں ایک اور قابل ذکر افسانہ "عورت" ہے حیرت ہوتی ہے کہ بیدی نے اتنے بہت سے جذبات اس مختصر سے افسانے میں کیسے مقید کر دئے ہیں۔ ایک عورت پہلے ماں ہے اس کے بعد کچھ اور ——— وہ سب کچھ برداشت کر سکتی ہے لیکن اپنے مادرانہ جذبات کی توہین نہیں۔ اور اگر کوئی ان جذبات کا احترام کر سکتا ہے تو وہ بہت سی مفاہمتوں کے لئے آمادہ ہو سکتی ہے۔

بیدی کے تمام افسانے پڑھنے کے قابل ہیں، لیکن سب تخلیقی کارنامے نہیں ہیں مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو ان کا فن ابھی ناپختہ اور خام ہے، ان کی زبان لکنت کرتی ہے، اور خیالات میں وہ ہمواری اور روانی نہیں ہے جو پختہ کاری کی علامت ہو، زبان کی لغزشیں اور خیالات کا الجھاؤ قدم قدم پر ملتا ہے، لیکن ان کا نقطۂ نظر صحیح اور صحت مند ہے، اور در اصل یہی وہ نخلستان ہے جہاں بیٹھ کر پڑھنے والے کی ساری تھکن اور پیاس دور ہو جاتی ہے۔

۲- ادب اور سماج :- یہ سید احتشام حسین کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ادب کے اہم مسائل پر غور کیا ہے، اور سنجیدگی اور ایمانداری کے ساتھ اپنی رائے پیش کی ہے، انھوں نے پورے خلوص کے ساتھ زندگی اور ادب کے رشتے کو پہچاننے کی کوشش کی ہے اور سماجی حقائق کو سمجھ کر زندگی کے خارجی اور داخلی رشتوں کو واضح کیا ہے۔ انھوں نے کوشش کی ہے "کہ ادب کے پائدار حصوں کی قدر و قیمت متعین کریں اور اجالے کو اندھیرے سے الگ کر دکھائیں" ان کا ایک مخصوص نقطۂ نظر ہے آپ اس سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن ان کے خلوص پر شبہہ نہیں کر سکتے۔ ان کا خیال ہے کہ جس طرح ایک مخصوص فلسفہ حیات کے بغیر اچھا ادب پیدا نہیں ہو سکتا اسی طرح اچھی تنقید بھی بغیر ایک زاویہ نگاہ کے ممکن نہیں ہے۔ یہ زاویہ نگاہ اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب نقاد کا ہاتھ کائنات کی نبض پر ہو اور وہ انفرادیت اور اجتماعیت کے رشتوں کو اچھی طرح پہچانتا ہو ——— احتشام حسین ان مقاصد کو تنظیم، ترتیب، انتخاب اور تعبیر کے ذریعے حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور یہ کام بغیر فلسفیانہ کاوش اور سائنٹفک طریق کار کے ممکن نہیں۔

یہ کہنا صحیح نہیں کہ احتشام حسین ہر جگہ ان اصولوں کے برتنے میں کامیاب رہے ہیں۔ بعض جگہ وہ اس بلندی تک پہنچنے میں رہ گئے ہیں، بعض جگہ ان کی تنقید فرض نگاری یا تاریخ نویسی کی کوشش بن کر رہ گئی ہے۔ کہیں کہیں توازن اور بصیرت کی کمی ہے، اس لئے بعض مضامین چھپتے ہی باسی ہو گئے ہیں، بعض ایسی حالت میں لکھے گئے ہیں کہ ان میں وہ تحقیق اور تلاش نہیں جو ہونا چاہئے۔ "اردو ادب میں آزادی کا تخیل" اس اعتبار سے سطحی مضمون ہے۔ بالخصوص غدر سے پہلے کے رجحانات کا جائزہ پورے طور پر نہیں لیا گیا اگر غور سے دیکھا جاتا تو مومن جیسے غزل گو کے یہاں بھی، جو کوچہ رقیب میں سر کے بل جانے کو تیار ہے، اور غضب وصل غیر کھلنے کے لئے تیار ہے آزادی کے نقوش مل جاتے، اس کی مثنوی جہادیہ جس میں غیر ملکی حکومت سے اظہار بیزاری کیا گیا ہے۔ محض عشق پردہ نشین کا کفارہ نہیں ہے بلکہ اس دور کے سیاسی رجحانات کا مرقع ہے۔ آزادی کا مفہوم اور اس کی تعبیر بڑا مباحثہ انگیز مسئلہ ہے۔ اور ہر دور میں اس کی مختلف تفسیریں ہوتی رہی ہیں۔ لیکن ادب اور سیاست کی تاریخ میں ان واقعات سے چشم پوشی ممکن نہیں کہ ظفر رنگون میں نظر بند رہے۔ آزردہ جیل گئے۔ شیفتہ کو قید و بند کی تکلیفیں اٹھانا پڑیں۔ مولانا فضل حق کو عبور دریائے شور کی منزل ملی اور وہ انڈمان ہی میں سپرد خاک ہوئے۔ صہبائی ان کے دو بیٹے اور میر نیاز علی قصہ خواں کو توپ سے اڑا دیا گیا اور ان کی لاشیں دریا میں پھنکوا دی گئیں۔

کیوں کر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

منیر شکوہ آبادی نے قید فرنگ میں جو تکلیفیں اٹھائیں وہ لوح تاریخ پر کندہ ہیں۔

آئے باندھے میں مقید ہو کے ہم
سو طرح کی ذلت و تحقیر سے
کوٹھری تاریک بائی مثل قبر
تنگ تر تھی حلقۂ زنجیر سے
پھر الہ آباد لے جائے گئے
ظلم سے، تلبیس سے، تزویر سے
جو الہ آباد میں گذرے ستم
ہیں فزوں تقریر سے، تحریر سے
پھر ہوئے کلکتہ کو پیدل رواں
گرتے پڑتے پاؤں کی زنجیر سے
ہتھکڑی ہاتھوں میں بیڑی پاؤں میں
ناگوار ترقیس کی تصویر سے
سوئے مشرق لائے مغرب سے مجھے
تھی غرض تقدیر کو تشہیر سے

اس مجموعے کا بڑا حصہ حالی اور پیروئ مغرب سے بھرا ہوا ہے بحث یہ ہے کہ حالی کے یہاں پیروئ مغرب سے مراد مغربی تہذیب کی تقلید ہے یا مغرب کی ... احتشام حسین ادب کے قدیم و جدید دونوں حصوں کے

(بقیہ صفحہ ۴۹ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

۱۶ر نومبر ۴۹ء

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم

وزیر اعظم جواہر لال نہرو کا سفر امریکہ خیر و خوبی سے ختم ہوگیا، اور اب وہ ۱۵ر نومبر کو دہلی واپس آ رہے ہیں۔ اس سفر کے نتیجے کے بارے میں جو خیالات ہم نے سہو گتمبر کے اداریے میں ظاہر کئے تھے ان کے ماننے میں شاید پہلے بہت سے لوگوں کو تامل ہوا ہوگا مگر اب اس کی تصدیق ہوتی جاتی ہے کہ ہمارا اندازہ صحیح تھا۔ جو لوگ اس سفر کا مقصد یہ سمجھتے تھے (اور ان میں خود پنڈت نہرو بھی شامل ہیں) کہ ہندوستان کی ذہنی اور اخلاقی ساکھ امریکہ میں قائم ہو جائے، اور امریکی قوم اور ہندوستانی قوم کے درمیان دوستی کا رشتہ استوار ہو جائے۔ ان کے نقطۂ نظر سے سفر ہر طرح کامیاب رہا، لیکن جو حضرات یہ توقع رکھتے تھے کہ اس سفر کے بعد امریکی دولت کے دریا ہندوستان میں بہنے لگیں گے، ان کے لئے یہ نتیجہ مایوس کن رہا۔ ان کا ردِ عمل اس سفر کے بارے میں یہ ہے :-

ع - تماشا کامیاب آیا، تمنا بے قرار آئی

بات یہ ہے پنڈت جی کی سب سے پہلی تقریر کے بعد جو انھوں نے امریکی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں کی وال سٹریٹ کے سرمایہ داروں کو یہ معلوم ہوگیا کہ ہندوستان امریکی بلاک میں شامل ہونے کو یعنی امریکہ کے ساتھ مل کر روس کے خلاف محاذ جنگ بنانے کو تیار نہیں ہے اس لئے سیاسی حیثیت سے ان کی دلچسپی ہندوستان سے کم ہوگئی۔ اب اگر وہ اپنا سرمایہ ہندوستان میں لگانے کے مسئلے پر غور کریں تو خالص کاروباری نقطۂ نظر سے ظاہر ہے کہ ان کے سرمائے کے لئے صرف ایک ہندوستان کا میدان نہیں بلکہ مشرق وسطیٰ اور جنوب مشرقی ایشیا میں اور میدان بھی موجود ہیں اور وہاں انھیں یہ امید ہے کہ نفع کمانے کے علاوہ اپنی سیاسی مقاصد بھی حاصل کر سکیں گے۔ اس لئے قرین قیاس یہ ہے کہ ان کی نظر انتخاب ہندوستان پر مشکل سے پڑے گی۔ شاید ہی ان میں سے کچھ ایسے من چلے نکلیں جو اپنے سیاسی دائرۂ اثر سے باہر سرمایہ لگانے پر تیار ہوں۔ اب رہی امریکی حکومت اگر وہ ایک خود دار اور خود رائے ہندوستان کی مدد کرنے پر تیار بھی ہو تو کچھ بہت زیادہ مدد نہیں کر سکتی اس لئے کہ اس کے وسائل پر مارشل ایڈ وغیرہ کی وجہ سے بہت زیادہ بوجھ پڑ چکا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہند اور امریکہ میں تجارتی اور مالی معاہدے کی گفتگو جاری ہے اور اس میں کامیابی کی امید بھی ہے، لیکن اس معاہدہ کا دائرہ اتنا وسیع نہ غالباً بہت بڑا نہیں ہوگا۔

اب سوال یہ ہے کہ جو طرزِ عمل ہندوستان نے اختیار کیا۔ وہ صحیح اور مفید ہے یا نہیں؟ بہت سے امریکی اور برطانوی حضرات جنھیں ہندوستان کی بھی ہمدردی کا دعویٰ ہے یہ کہتے ہیں کہ اگر ہندوستان امریکی بلاک میں شریک نہ ہوا تو خود بھی اپنا نقصان کرے گا اور دنیا کے امن کو بھی ضرر پہنچائے گا ——— اپنا نقصان اس طرح کہ وہ امریکی دولت کی بہتی گنگا میں ہاتھ نہیں دھو سکے گا اور امن کو ضرر اس طرح کہ اس کے غیر جانب دار رہنے سے تیسری جنگ عظیم کا خطرہ کم نہیں ہوگا بلکہ کچھ بڑھ ہی جائے گا۔

دوسرے اعتراض پر ہم پہلے غور کریں گے اس لئے کہ یہ بہت اہم اور بہت سخت ہے۔ یہ اس مفروضے پر مبنی ہے کہ جنگ در اصل روس کرنا چاہتا ہے اور ساری دنیا امن کی طلب گار ہے۔ اس لئے روس کے خلاف تمام دنیا کے ملکوں کا جتنا بڑا جتھا بن جائے گا اتنا ہی زیادہ اس بات کا امکان ہے کہ وہ دب کر جنگ کرنے سے باز رہے گا۔ اگر ہندوستان اس جتھے سے الگ رہتا ہے تو گویا امن کے امکان کو کم کرنے کا مجرم ہوتا ہے لیکن ہمیں اس مفروضے کو ماننے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ دوسری جنگ عظیم کے ختم ہونے کے بعد سے اب تک روس کی کسی بات سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ وہ تیسری جنگ چھیڑنے کا جمہوری ملکوں سے زیادہ خواہش مند ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو برلن کا معاملہ اتنا اشتعال انگیز تھا کہ جنگ کسی طرح رک ہی نہیں سکتی تھی۔ دنیا کی حکمت عملی ہمیشہ اس اصول پر مبنی رہی ہے کہ اگر دنیا کی دو بڑی قوتوں کے مقاصد یا اغراض ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوں تو دونوں کی طرف سے جنگ شروع کرنے کا یکساں خطرہ رہتا ہے، لیکن کوئی اس وقت تک میدان میں نہیں کودتا جب تک اسے اپنی قوت کے زیادہ ہونے کا یقین یا دھوکہ نہ ہو۔ اس لئے جنگ کو روکنے کے لئے توازن قوت کے اصول پر عمل کیا جاتا ہے یعنی اس کی کوشش کی جاتی ہے کہ دونوں فریقوں کی قوت تقریب قریب برابر رہے۔ کوئی اتنا طاقتور نہ ہو جائے کہ جنگ کی صورت میں اس کی کامیابی صریحی نظر آئے۔ اس لحاظ سے دیکھئے تو امریکی جتھے میں شمالی اور مغربی یورپ کی ریاستیں اور اٹلی، ترکی یونان وغیرہ شامل ہیں۔ روسی جتھے میں جس میں اب تک صرف مشرقی یورپ کی چند ریاستیں ہیں، زیادہ طاقتور ہے آیندہ اگر چین روس سے فوجی معاہدہ کرے تب جا کر دونوں جتھوں میں کچھ تھوڑا بہت توازن پیدا ہوگا۔ اس لئے جو ملک امریکی جتھے میں شامل ہو کر اس کے پلڑے کو اور جھکا دے۔ وہ امن کے امکان کو کم کر دے گا۔ یا ہندوستان جو اس سے الگ رہنا چاہتا ہے بنایا۔ کوئی یہ کہے کہ امریکہ اور برطانیہ تو اس قدر صلح پسند واقع ہوئے ہیں کہ ان کی طرف سے جنگ کی ابتدا کا گمان بھی نہیں ہو سکتا لیکن اتنا حسن ظن دنیا کے کسی بھی ملک سے رکھنا مشکل ہے اور اگر یہ حسن ظن ہو بھی کہ وہ کسی صورت اور کسی حالت میں بھی جنگ کا آغاز نہیں کریں گے تو اس کو کیا کیجئے گا کہ جب جنگ کا مسالہ تیار ہو تو اس میں بغیر کسی خاص ارادے کے محض اتفاق سے بھی چنگاری پڑ کر آگ سلگ سکتی ہے اور مسالہ تیار رہنے کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ ایک فریق اتنا زیادہ قوی ہو جائے کہ اس کی کامیابی یقینی معلوم ہونے لگے۔ غرض ہمارے خیال میں تو ہندوستان اور دوسرے غیر جانب دار ملک ان دونوں جتھوں سے جن کی طاقت قریب قریب برابر ہے یا جتھے والوں سے الگ رہ کر امن کی خدمت کر رہے ہیں۔

اب رہا دوسرا اعتراض وہ یہ ہے کہ ہندوستان امریکی جتھے سے الگ رہنے کی وجہ سے اس کا موقع کھو رہا ہے کہ بے شمار امریکی سرمایہ لگا کر اپنی صنعت کو ایک دم سے کہیں سے کہیں پہنچا دے۔ اگر ہم اس بات کو جو بہت مشتبہ ہے، مان لیں کہ امریکہ کسی شرط پر بھی ہندوستانی صنعت کو زیادہ فروغ پانے میں مدد دے گا، اور دنیا کے بازاروں میں اپنا ایک مقابلہ کرنے والا پیدا کرے گا تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس خطرے کو نظر میں رکھتے ہوئے جو ہندوستان کو جنگ کی صورت میں برداشت کرنا پڑے گا ہندوستان کو اس قیمت پر اپنی آزادی عمل بیچ دینی چاہئے۔ یہ ظاہر ہے کہ اب بھی جب روس نے ایٹم بم بنا لیا ہے اس لڑائی کی زد سے جو یورپ یا ایشیا یا افریقہ میں ہو امریکہ بہت کچھ محفوظ رہے گا اور اس کا سارا قہر ان ملکوں پر ٹوٹے گا جو میدانِ جنگ بنیں گے۔ ممکن ہے غیر جانب داری کی صورت میں بھی ہندوستان کے میدان جنگ بننے کا کچھ امکان ہو لیکن کسی جتھے میں شامل ہونے کے بعد تو یہ امکان یقین کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ اور میدان جنگ بننے کے بعد ہندوستان مع اپنی اس صنعت کے، جو امریکی سرمائے کی مدد سے سالہا سال میں بنے گی دو ایک سال میں تہس نہس ہو جائے گا۔

غرض آیندہ جنگ کے خطرات ساری دنیا کے لئے اور خود ہندوستان کے لئے اس قدر ہولناک ہیں کہ ہر سمجھ دار آدمی پنڈت نہرو کی اس پالیسی کی تائید کرے گا کہ ہندوستان کو جنگی جتھوں سے الگ رکھیں اور اپنی غیر جانبداری سے فائدہ اٹھا کر ان دونوں میں صلح کرانے کی کوشش کریں۔ یہ پالیسی کتنی ہی دشوار اور اس کی کامیابی کتنی ہی مشتبہ کیوں نہ ہو ہندوستان کے لئے کوئی اور پالیسی ہو ہی نہیں سکتی۔

آزادی نمبر

چونکہ ۲۶ جنوری سنہ ۵۰ء کو ہندوستان کے نئے آئین کے نفاذ کا اور ہندوستانی ریپبلک قائم ہونے کا اعلان ہوگا اس لئے ادارۂ "نئی روشنی" کی خواہش ہے کہ ۲۴ جنوری کا پرچہ "آزادی نمبر" کے نام سے نکالا جائے۔ خیال ہے کہ اس کا حجم ۲۴ سے لے کر ۳۲ صفحے تک رکھا جائے۔ "نئی روشنی" کے قلمی معاونوں سے درخواست ہے کہ اس نمبر کے لئے مختصر اور رنگین مضامین ترجمے اور نظمیں عنایت فرمائیں۔ یہ سب چیزیں ذیل کے کسی موضوع سے تعلق رکھتی ہوں تو بہتر ہے :-

۱۔ ہندوستان کی تحریکِ آزادی
۲۔ تحریکِ آزادی کے بڑے علم برداروں کی سیرت اور سوانح حیات۔

(بقیہ صفحہ ۴ پر)

ہندوستان

دنیا کی رفتار

باہر کی دنیا

معاشی الجھن دور کرنے کی نئی کوشش

حکومت ہند نے ہندوستان کے صنعتی مسائل کو حل کرنے کے لئے ایک مرکزی مجلس مشورہ قائم کر رکھی ہے جو کارخانوں کے مالکوں، مزدوروں اور حکومت کے نمائندوں پر مشتمل ہے۔ ۱۳ نومبر کو اس کی اسٹینڈنگ کمیٹی کا جلسہ نئی دہلی میں وزیر صنعت ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کی صدارت میں شروع ہوا جس میں سردار ولبھ بھائی پٹیل بھی شریک ہوئے۔ سردار نے ایک مختصر سی زبانی تقریر کی۔ اس کے بعد ان کا لکھا ہوا خطبہ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی نے سنایا۔ سردار نے موجودہ معاشی بحران کے چار علاج تجویز کئے:

۱۔ اشیاء کی قیمتیں کم ہونی چاہئیں۔

۲۔ باہر سے مال کی درآمد گھٹنی چاہیے تاکہ ہندوستان کے پاس دوسرے ملکوں کے سکوں کا جو ذخیرہ ہے وہ گھٹنے نہ پائے۔

۳۔ عام لوگوں میں اعتماد پیدا ہونا چاہیے تاکہ وہ صنعت میں سرمایہ لگاتے ہوئے نہ جھجکیں۔

۴۔ موجودہ کارخانوں کی پیداوار میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہونا چاہیے۔

انھوں نے ان چاروں چیزوں کے لئے عملی تدبیریں بتائیں۔ تیسری شق کے بارے میں جو اس وقت سب سے اہم ہے، انھوں نے فرمایا کہ لوگ صنعتوں میں سرمایہ لگاتے ہوئے دو وجہوں سے تامل کرتے ہیں۔ ایک تو عام شکایت یہ ہے کہ براہ راست ٹیکس کی شرح بہت زیادہ ہے دوسرے بہت سے لوگ جنھوں نے انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے رقمیں چھپا رکھی ہیں، ڈرتے ہیں کہ اگر ان رقموں کو نکالیں گے تو صرف یہی نہیں کہ ان پر ٹیکس ادا کرنا پڑے گا، بلکہ بدنامی بھی ہوگی اور سزا بھی پائیں گے۔ سردار نے وعدہ کیا کہ فنانس منسٹر آئندہ بجٹ میں براہ راست ٹیکسوں کے معاملے پر نظر ثانی کریں گے اور اس کا بھی اطمینان دلایا کہ لوگوں سے چھپی ہوئی رقموں پر انکم ٹیکس وصول کرنے کا ایسا انتظام کیا جائے گا کہ ان کے نام ظاہر نہ ہونے پائیں۔

کمیٹی نے بہت غور و بحث کے بعد طے کیا کہ کچھ کمیٹیاں جن میں صنعت کے مالکوں، مزدوروں اور حکومت کے دو دو نمائندے ہوں گے۔ ہندوستانی اور بیرونی ماہرین کی مدد سے پیداوار میں اضافے کی لمبی چوڑی اسکیم بنائیں گی۔ اور ان کے علاوہ کچھ اور کمیٹیاں اس غرض سے مقرر کی جائیں گی کہ مختلف صنعتوں کے لئے زیادہ پیداوار کی منزلیں مقرر کر کے ان تک پہنچنے کی فوری تدابیر اختیار کریں۔

اس طرح کی کمیٹیاں تو پہلے بھی بہت ہو چکی ہیں مگر اس بار ایک نئی بات سننے میں آئی ہے جس سے امید بندھتی ہے کہ کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔ کہا جاتا ہے کہ سردار ولبھ بھائی پٹیل جنھیں ریاستوں کے زبردست اور پیچیدہ مسئلے سے اب قریب قریب فرصت مل گئی ہے اپنی ساری توجہ معاشی بحران کو دور کرنے پر صرف کریں گے۔ خدا کرے ان کا ناخن تدبیر اس گتھی کو سلجھانے میں بہت جلد کامیاب ہو تاکہ معاشی بحران بڑھتے بڑھتے معاشی ابتری تک نہ پہنچ جائے۔

وزیر اعظم کی صاف گوئی

وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے لندن سے روانہ ہونے سے پہلے پریس کانفرنس میں اخبار نویسوں کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے ہندوستان کی بیرونی پالیسی کے بارے میں ہر سوال کا جواب اس قدر صاف گوئی اور وضاحت سے دیا جس کی مثال ارباب سیاست اور خصوصاً بدیسی معاملات کے وزیروں کی تقریروں میں بہت کم ملتی ہے۔ کشمیر، ملایا، چین، انڈوچائنا، اسرائیل وغیرہ کے بارے میں جو باتیں انھوں نے کہیں وہ نئی نہیں ہیں۔ اتنی وضاحت سے نہ سہی مگر پہلے بھی کہی جا چکی ہیں۔ لیکن تبت کے متعلق انھوں نے پہلی بار کہا ہم تبت پر چین کا اقتدار تسلیم کرتے ہیں۔ اگر ان کے الفاظ صحیح نقل کئے گئے ہیں تو یہ ایک نہایت اہم اعلان ہے جس سے چین کی کمیونسٹ حکومت اور ہندوستان کے درمیان تصادم کے سارے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔

اگلے مہینے انڈونیشیا آزاد ہو جائے گا

ہیگ کی گول میز کانفرنس بحیثیت مجموعی کامیاب رہی اور انڈونیشیا کو اختیارات منتقل کرنے کے لئے جو فیصلے ہوئے ہیں ان سے انڈونیشی رہنما بالکل مطمئن ہیں لیکن نیو گنی کے متعلق ابھی اطمینان نہیں ہوا ہے کیونکہ ڈچ نمائندوں نے اس کی آزادی تسلیم نہیں کی ہے۔ انڈونیشی نمائندے رہنے معاہدے کی اس شق کو ابھی تک نہیں مانا ہے۔ انڈونیشیا کے آزاد ہو جانے کے بعد نیو گنی کے مسئلے پر ڈچ حکومت سے مساوی حیثیت میں دوبارہ بات چیت کرنی چاہتے ہیں۔

ہیگ کانفرنس کے فیصلوں کی تصدیق کے لئے بہت جلد انڈونیشی ریپبلکن پارلیمنٹ اور ان پندرہ ریاستوں کی پارلیمنٹ کا، جو ریاستہائے متحدہ انڈونیشیا کی رکن ہوں گی، ایک مشترکہ کنونشن بلایا جائے گا۔ تصدیق کے بعد ان کے نمائندے ایک صدر چنیں گے۔ صدر تین آدمیوں کو نامزد کرے گا جو کابینہ منتخب کریں گے پھر ایک لیڈر چنا جائے گا جو ریاستہائے متحدہ انڈونیشیا کا پہلا وزیر اعظم ہوگا۔ اس کے بعد ۳۰ دسمبر سے پہلے پہلے وزیر اعظم کا ایک نمائندہ ہیگ جائے گا اور ڈچ ملکہ سے اختیارات کی منتقلی کی باقاعدہ تحریر لائے گا۔

اس طرح آئندہ مہینے میں نئے سال سے قبل انڈونیشیا صدیوں کی غلامی کے بعد آزادی سے ہمکنار ہوگا اور اپنی قسمت کا خود مالک ہوگا۔

اطالوی نوآبادیات کے متعلق فیصلہ

اطالوی نوآبادیات کا مسئلہ کئی سال سے زیر غور ہے۔ مگر ان سے مختلف بڑی طاقتوں کا مفاد وابستہ ہے اس لئے اب تک کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا تھا۔ مگر اب یو، این، او کی سیاسی کمیٹی نے ان کے بارے میں فیصلہ کر دیا ہے جو جمہوریت پسندوں کے لئے بالکل اطمینان بخش تو نہیں ہے مگر موجودہ حالت میں یہی غنیمت ہے، اس فیصلے میں ہندوستانی نمائندے کی کوشش کو بڑا دخل ہے اور اس نے ہندوستان کی عزت اور وقار بڑھایا۔ ملکوں کی نگاہ میں بہت بڑھا دیا ہے۔

اطالوی نوآبادیات کے متعلق سیاسی کمیٹی نے فیصلے کئے ہیں ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

لیبیا۔ جنوری ۱۹۵۲ء سے قبل لیبیا مکمل طور پر آزاد ہو جائے گا اور لیبیا کے چار علاقوں — سائرینیکا، ٹریپولی ٹینیا اور فیضان کے نمائندوں پر مشتمل ایک قومی اسمبلی بنے گی جو آزاد لیبیا کے لئے دستور مرتب کرے گی۔

اس کام میں یو، این کا ہائی کمشنر دس ممبروں پر مشتمل ایک مشاورتی کمیٹی لیبیا کی مدد کرے گی، اس کونسل کے مصر، فرانس، اٹلی، پاکستان، برطانیہ، امریکہ، لیبیا کے تینوں علاقوں کے ایک ایک نمائندے اور لیبیا کی اقلیتوں کے نمائندے ممبر ہوں گے۔

اریٹیریا کے باشندوں کی رائے معلوم کرنے اور ان کے مستقبل کے متعلق مناسب اور صحیح فیصلہ کرنے کے لئے یو، این کا ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا گیا ہے۔

سمالی لینڈ کو فی الحال عارضی طور پر اٹلی کی تولیت میں دے دیا گیا اور دس سال کے بعد اس کو آزادی دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس فیصلے سے خاص طور پر جمہوریت پسندوں کو سخت اختلاف ہے۔ خود سیاسی کمیٹی کے ممبروں کی خاصی تعداد اس کی مخالف تھی اور وہ اسے براہ راست یو، این کی تولیت میں دینا چاہتی تھی۔ مگر آخر میں بوجوہ اٹلی کی تولیت میں دینے پر مجبور ہو گئی۔ مگر اس کے ساتھ اٹلی پر بڑی حد تک پابندیاں عائد کی گئی ہیں جس سے اٹلی کے اختیارات محدود ہو جاتے ہیں۔

آزادی نمبر (بسلسلہ صفحہ ۳)

۴۔ آزادی کے ڈھائی سال میں ہندوستان کی حالت کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ

۵۔ ہندوستان کی آئندہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کا اندازہ

اس تجویز پر اسی صورت میں عمل ہو سکتا ہے جب ہماری اپیل کا خاطر خواہ جواب ملے۔

کاش میں جانتا

ابو حاکم

قتل کا ایسا عجیب و غریب مقدمہ میں نے اپنی عمر میں نہیں دیکھا تھا۔ اخبارات نے اسے "بنی سرخیوں" میں اپنے مقدمے سے تعبیر کیا تھا۔ اگرچہ تو اس مقدمہ میں جہاں بوڑھی عورت کو قتل کیا گیا تھا پیچیدگی نہیں تھی۔

جب سرکاری وکیل نے مقدمہ پیش کیا تو حاضرین میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جسے اس کا ہلکا سا امکان بھی نظر آتا ہو کہ ملزم جو ہتھکڑیاں پہنے کٹہرے میں کھڑا تھا سزا سے بچ جائے گا۔

وہ ایک بہت مضبوط اور بہت بدصورت آدمی تھا۔ اس کی آنکھیں خونی تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ساری طاقت اس کی بانہوں میں سما گئی ہے —— بدصورت آدمی کو کوئی نہیں بھلا سکتا —— اور یہ ایک بہت اہم نکتہ تھا۔ اس لئے کہ نالش کی طرف سے چار گواہ پیش ہوئے تھے جو ملزم کو پہچانتے تھے، اور جنھوں نے اسے چھوٹے سرخ رنگ کے مکان سے نارتھ روڈ اسٹریٹ میں بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔

مسز سالومن سونے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں کہ انھوں نے کسی دروازے کے بند ہونے کی آواز سنی۔ وہ سمجھیں یہ انہیں کا دروازہ ہے۔ وہ فوراً کھڑکی کے پاس گئیں اور ایڈم کو (ملزم کا نام یہی تھا) مسز پارکر کے گھر کی سیڑھیوں پر دیکھا وہ اسی وقت باہر آیا تھا اور دستانہ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ہتھوڑا بھی تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ اس نے ہتھوڑا سامنے کے دروازے سے بچے کے درخت کے تنے میں پھینک دیا۔ پھر بھاگنے سے قبل اس نے مسز سالومن کی کھڑکی کی طرف دیکھا —— شاید اس کو یہ ڈر تھا کہ ممکن ہے کوئی اسے دیکھ رہا ہو —— اور اسی حرکت کی وجہ سے گلی کی روشنی میں اس کا چہرہ صاف نظر آ گیا —— وہ ہانپ رہا تھا اور اس کی آنکھیں ڈر سے کھلی ہوئی تھیں، بالکل اس جانور کی طرح جسے مارنے کے لئے کوڑا اٹھایا جا رہا ہو۔

میں نے مسز سالومن سے بعد میں گفتگو کی جو قدرتی طور پر اس مقدمے کے حیرت انگیز فیصلے کو سن کر خوف سے سہمی ہوئی تھیں، اور میرا خیال ہے یہی حال سب گواہوں کا تھا۔ ہنری ہیمبلٹ اسٹریٹ سے دیر میں واپس آ رہا تھا، اور جس کی مرضی سے نارتھ روڈ ہیٹر شیٹ پہ جہاں اس نے خوف زدہ ایڈم دیکھتے بھاگتے دیکھا تھا، اور بوڑھا ہیلر جو کرسی گرنے کی سی آواز سے جاگ گیا تھا، اور فوراً اٹھ کر مسز سالومن کی طرح اپنی کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا تھا —— اس نے بھی یہ ایڈم کی شکل دیکھی اور جب وہ [illegible] تو اس کی خوفناک آنکھیں اور پریشان چہرہ ال کو بھی ایک دوسرے گواہ نے بھی دیکھا تھا قسمت مجھ طرح اس کی مخالف تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس نے دن دہاڑے یہ قتل کیا ہو۔

"میں جانتا ہوں" سرکاری وکیل نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "کہ وکیل صفائی اپنی بحث میں یہ دعویٰ کرے گا کہ ملزم کی شناخت غلطی کی ہے۔ ایڈم کی بیوی بھی آپ سے کہے گی کہ ایڈم ۱۴ فروری کو ۲ بجے رات کے وقت اس کے پاس تھا۔ لیکن جب آپ سرکاری گواہوں کی باتیں سن لیں گے اور غور سے قیدی کا حلیہ ملاحظہ کر لیں گے تو مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے دل میں غلط شناخت کا خیال بھی نہ لائیں گے۔"

وارش پانے والے سپاہیوں اور اس کا معائنہ کرنے والے سرجن کی گواہیوں کے بعد مسز سالومن کی پکار ہوئی۔ وہ ایک مثالی گواہ تھی۔ رحم، ایمانداری اور فکر کے جذبات اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہے تھے۔ وہ خطرے سے بے نیاز ہو کر بے دھڑک بولی۔ اس کے دل میں کسی طرح کا کینہ نہ تھا اور نہ اس اہمیت کا احساس تھا کہ وہ مرکزی عدالت فوجداری میں ایک سرخ گون پہنے ہوئے جج کے سامنے کھڑی ہے اور وہ اس کے الفاظ بڑے غور سے سن رہا ہے —— اس نے کہا "ہاں میں سیڑھی سے نیچے اتری، اور میں نے پولیس اسٹیشن کو فون کیا۔"

"اور تم اسی آدمی کو عدالت میں دیکھ رہی ہو؟"

اس نے اپنے سامنے خونی آنکھوں والے بے ڈھنگے آدمی کو کٹہرے میں دیکھا جو بڑے سختی کے ساتھ اپنی غیر جذباتی آنکھوں سے گھور رہا تھا۔

"ہاں" اس نے جواب دیا "یہی آدمی ہے۔"

"تمہیں بالکل یقین ہے؟"

اس نے سادگی سے کہا "جی مجھے غلطی نہیں ہو سکتی۔"

"اچھا شکریہ" جج نے وکیل صفائی کو جرح کو کہتے ہوئے کہا۔

اگر آپ نے بھی قتل کے مقدموں میں اتنی ہی بار شرکت کی ہے جتنی میں نے تو آپ پہلے سے سمجھ جائیں گے کہ وکیل صفائی کیا رویہ اختیار کرے گا۔

"مسز سالومن! تمہیں یاد رکھنا چاہئے کہ ایک شخص کی موت اور زندگی تمہاری شہادت پر منحصر ہے۔"

"[illegible] جانتی ہوں۔"

"تمہاری بینائی بالکل درست ہے؟"

"جی، مجھے کبھی عینک کی ضرورت نہیں پڑی۔"

"تم ایک پچپن سالہ عورت ہو؟"

"جی نہیں، چھپن سال کی۔"

"اور پھر تم نے اس آدمی کو سڑک کے دوسرے کنارے سے دیکھ لیا؟"

"جی ہاں۔"

"یہ رات کے دو بجے کا وقت تھا، [illegible] تمہاری آنکھیں بہت ہی اچھی ہوں گی۔"

"نہیں جناب، چاندنی چھٹکی ہوئی تھی، جب آدمی نے اوپر دیکھا تو روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔"

"اور تمہیں بالکل شبہ نہیں کہ جو آدمی تم نے دیکھا وہ یہی قیدی تھا۔"

مجھے معلوم نہیں وکیل کیا بات کہنا چاہتا تھا۔ اس جواب کے علاوہ جو بڑے حوالے کس جواب کی توقع ہو سکتی تھی۔

"ذرا بھی شبہ نہیں حضور، یہ چہرہ ایسا نہیں جسے بھلایا جا سکے۔"

وکیل نے مڑ کر حاضرین پر نظر ڈالی، پھر بولا "عدالت میں جو لوگ موجود ہیں، تمہیں غور سے دیکھ کر، تم بتا تو نہ سکو گی؟" پھر ایک لمحہ توقف کے بعد خود ہی آواز دی "ذرا مسٹر ایڈم کھڑے ہو جاؤ۔" اور پیچھے سے ایک مضبوط، تو کی ہیکل، وحشی آنکھوں والا آدمی کھڑا ہو گیا —— وہ کٹہرے والے ملزم کی بالکل تصویر تھا۔ اس کا لباس بھی وہی تھا۔ ہلکے نیلے رنگ کا سوٹ، اور دھاری دار ٹائی۔

"اب مسز سالومن خوب سوچ لو، کیا اب بھی تم قسم کھا کر کہہ سکتی ہو کہ جس آدمی کو تم نے مسز پارکر کے باغیچے میں ہتھوڑا پھینکتے ہوئے دیکھا تھا وہ یہی قیدی ہے، اور یہ آدمی نہیں جو اس کا جڑواں بھائی ہے؟"

وہ قسم ہرگز نہیں کھا سکتی تھی۔ اس نے ایک پر نظر ڈالی اور پھر دوسرے پر، وہ ایک لفظ بھی نہ بول۔ وہی بے رحم وحشی جو کٹہرے میں بانہیں ملائے بیٹھا تھا، وہی حاضرین عدالت کے پیچھے کھڑا ہوا نظر آ رہا تھا، دونوں مسز سالومن کو غضب ناک آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

مقدمہ ختم ہو گیا، کوئی گواہ قسم کھانے کو تیار نہ تھا۔

اس طرح وہ آدمی کمزور شہادت کی وجہ سے بری کر دیا گیا، لیکن مجھے اس بات کا علم نہیں کہ قتل اس نے کیا یا اس کے جڑواں بھائی نے، یا اسے سزا ملی یا نہیں۔ مجھے تو یہ بتانا ہے کہ اس غیر معمولی مقدمہ کا انجام ایسا غیر معمولی ہوا جو خواب و خیال میں بھی نہ آ سکتا تھا۔ میں مسز سالومن کے ساتھ عدالت سے باہر آیا اور ہم مجمع میں گم ہو گئے [illegible] انتظار

(بقیہ صفحہ [illegible])

پرل بک سے ملیے

زہرہ سیدین

پرل بک امریکہ میں پیدا ہوئی۔ چھوٹی سی عمر میں اس کے والدین جو مشنری کی حیثیت سے چین جا رہے تھے، اسے اپنے ساتھ لیتے گئے۔ اس کا بچپن کا زمانہ دریائے ینگ سی کے کنارے شہر چیانگ کیانگ میں گذرا۔ پندرہ برس تک اس کی تعلیم و تربیت اس کی ماں ہی نے کی۔ اور پرل بک کو ادب سے جو لگاؤ ہے اس کا سہرا اس کی ماں ہی کے سر ہے۔ پرل بک کا بیان ہے کہ میری ماں ہی نے مجھے اس حسن سے آشنا کیا جو الفاظ اور ان کے معنی میں جھلکتا ہے۔

امریکہ میں اس نے اعلیٰ تعلیم پائی۔ گریجویٹ بنی اور پھر چین واپس چلی آئی۔ ۱۹۱۷ء میں اس کی شادی ایک نوجوان امریکن ڈاکٹر جان بک سے ہوگئی۔ ڈاکٹر بک بھی ایک مشنری تھا جو کاشتکاری کا کام کرتا تھا۔ پرل نے خود بھی اپنے شوہر کے ساتھ اس ملک میں کام شروع کر دیا جسے وہ اپنے وطن کی طرح عزیز رکھتی تھی اور جس میں اسے اپنی زندگی کا بڑا حصہ گذارنا تھا۔ آئندہ پندرہ سال اسے نان کنگ ہی میں اپنا گھر بنانا تھا، اور اپنی دونوں بیٹیوں کی پرورش کرنی تھی۔ اسی یونیورسٹی میں وہ ادب کی پروفیسر مقرر ہوئی اور اس نے اپنی مشہور و مقبول کتابیں لکھیں۔

اس نے چینی کسانوں کو اپنی بنجر زمینوں کی کاشت میں جان توڑ کوشش کرتے دیکھا، اور ان افلاس زدہ مرد اور عورتوں کی صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جو اپنی مصیبتوں کی رواداری، سمجھ داری، خلوص اور وفاداری سے برداشت کرتے تھے۔ اس کی لاثانی کتاب "گڈ ارتھ" اس گہرے مطالعے کا پھل ہے اور یہ وہی کتاب ہے جس نے امریکی ادب میں اپنی جگہ بنالی۔ اس پر مختلف انعامات دیے گئے۔ اس کا ایک بہت مقبول فلم بنایا گیا اور ۱۹۳۸ء میں ادب کا نوبل پرائز ملا۔ وہ پہلی امریکن خاتون تھی جسے یہ بے مثال اعزاز نصیب ہوا۔ اس کی بعض اور تصانیف میں جن پر انعامات دیے گئے اس کے ماں اور باپ کی مشہور سوانح عمریاں The Exile اور Fighting Ange[l] شامل ہیں۔

اس کا مقصد اس پیچیدہ دنیا کے مسائل کو ان کی حقیقی صورت میں لوگوں کے سامنے پیش کرنا تھا۔ اس نے بہادری کی تصویریں، بچوں کی کہانیوں اور کتابوں میں کھینچی ہیں۔ اس کی ایک کتاب میں ایک جاپانی لڑکے کی کہانی ہے جس نے اپنا سارا گھر طوفان میں تباہ ہوتے دیکھا، لیکن اس سخت صدمے کے باوجود اس نے اپنی زندگی کی نئے سرے سے تعمیر کی۔ اس کتاب پر اسے وہ خاص انعام ملا جو بچوں کی کتابوں کے لئے رکھا گیا ہے۔

ایک مرتبہ پرل نے کہا تھا کہ میں اگر ناول نہ لکھوں تو خوش اور مسرور نہیں رہ سکتی۔ مجھے ان کی شہرت اور مقبولیت کی پروا نہیں ہے۔ میں ان بدقسمت لوگوں میں سے ہوں کہ جب تک کسی ناول کے لکھنے میں مصروف نہ ہوں یا لکھنے کی تیاری نہ کر رہی ہوں مجھے اپنی زندگی خالی خالی سی لگتی ہے۔ اس کی تصانیف ۲۸ ناولوں اور ۲۳ بچوں کی کتابوں پر مشتمل ہیں، جن میں کچھ سوانح عمریاں ہیں۔

پرل بک نے بہت مختلف ممالک کے دلچسپ لوگوں سے ملاقات کی ہے، اور ان کے خیالات کو اپنی کتابوں میں شامل کیا ہے۔ اس نے روس کے متعلق اپنی کتاب Talk about Russia ماشا سکوٹ سے ملنے کے بعد لکھی ہے جو ایک امریکن اخبار فروش کی روسی بیوی ہے۔ اس نے اپنا مقالہ American Argument مشہور نیگرو مغنی پال روبسن کی بیوی ایسلانڈا سے ملاقات کے بعد لکھا۔ کئی سال بعد اپریل ۱۹۴۹ء میں اس کا ایک اور بہترین ناول Kinsfolk چھپا۔ اس ناول کا پس منظر امریکہ اور چین سے لیا گیا ہے یعنی وہ دو ملک جن سے وہ بخوبی واقف ہے۔

۱۹۳۲ء میں اس کی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی ہوئی۔ اس نے مشنری کے کام سے استعفیٰ دے دیا۔ ۱۹۳۴ء میں اس نے اپنے پہلے شوہر ڈاکٹر بک سے طلاق حاصل کرلی اور جان ڈے پبلشنگ کمپنی میں کام شروع کر دیا اور ۱۹۳۵ء میں اس کی شادی رچرڈ والش سے ہوگئی جو اس پبلشنگ کمپنی کے صدر اور رسالہ "ایشیا" کے ایڈیٹر ہیں۔

پرل بک دیہاتی زندگی کو دل سے پسند کرتی ہے شہروں کی زندگی کو وہ قریب قریب غیر مہذب اور وحشیانہ زندگی سمجھتی ہے۔ ہفتے میں صرف دو دن وہ نیویارک رہتی ہے۔ والش اور مسز والش کے پانچ لے پالک بچے ہیں۔ پرل کی اپنی دو بیٹیاں ہیں، اور چھ نواسے، نواسیاں ہیں۔ اس نے مشرقی پنسلوینیا میں ایک چھوٹے سے خوبصورت مقام پر چار سو ایکڑ زمین لے کر اپنا گھر بنا لیا ہے پرل چینی طریقوں سے بنجر زمین کو زرخیز بنانے کا گر جانتی ہے۔ اس نے دو سال تک کاشتکاری کا تمام انتظام اپنے ہاتھ میں رکھا۔ اب والش کے پاس گائیں، سور، بھیڑیں، چوزے اور اصیل مرغ ہیں۔ یہ چیزیں ان کے اور ان کے ساتھیوں کی خوراک کے لئے کافی ہیں۔ علاوہ اس کے اپنی پھلوں اور ترکاریوں کی کاشت ہوتی ہے۔

یہ سب کام زیادہ تر پرل بک خود ہی کرتی ہے اور اس کے علاوہ بہترین چینی کھانا بھی پکا سکتی ہے۔ فارم ہاؤس کے گرد جو صحن ہے وہ چینی وضع کا ہے اس کے پاس کچھ چینی فرنیچر بھی ہے جن میں وہ ڈیسک بھی شامل ہے جس پر بیٹھ کر نان کنگ میں اس نے "گڈ ارتھ" لکھی تھی۔

پرل کا دن بہت مصروفیت میں گذرتا ہے وہ صبح چھ بجے اٹھ کر سب سے پہلے باغبانی کرتی ہے۔ پھر دوپہر تک لکھتی رہتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ وہ چینی میں سوچتی ہے اور پھر انگریزی میں اس کا ترجمہ کرتی جاتی ہے۔ دوپہر کا وقت پڑھنے، کھیتی کی دیکھ بھال کرنے اور اپنے بچوں کے کام کے لئے مخصوص ہے۔ شام کو زیادہ تر ایسٹ ویسٹ ایسوسی ایشن کا کام کرتی ہے۔ یہ ایک تہذیبی ایسوسی ایشن ہے جس کی بنیاد خود پرل نے رکھی تھی۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ امریکہ اور ایشیا کے باشندوں کے درمیان بہتر مفاہمت پیدا کی جائے

(ترجمہ)

دو کتابیں

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

اچھی طرح واقف ہیں اور ان کی سلامت روی اس ہنگامۂ دار و شورش میں بھی قائم رہی ہے ممکن ہے حالی نے اس ترکیب کے لکھنے میں غلطی کی ہو یا جدت برتی ہو، لیکن جن لوگوں نے حالی کا صحیح مطالعہ کیا ہے وہ پیروئ مغرب سے مراد مغربی شاعری کی تقلید ہی لے سکتے ہیں اور کچھ نہیں مغربی تہ ریزی شاعر تصوف کا ذکر قطعی بے محل اور مہمل سی بات ہے۔

"اردو ڈرامہ" اور "غالب" دونوں مضمون دلچسپ ہیں۔ دونوں میں خارجی تجزیہ کی کوشش کی گئی ہے احتشام حسین ادب کو سماجی پس منظر کے ساتھ دیکھنے کے عادی ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اصول ادب اور زندگی کی نشو و نما کے عمل کے ساتھ وابستہ ہیں۔

ان تنقیدی مضامین کی ایک اہمیت ہے۔ لیکن اب ہم اردو کے ایسے بلند پایہ نقادوں سے جیسے کہ احتشام حسین ہیں، یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ تنقید پر کوئی مستقل تصنیف پیش کریں گے اس کے علاوہ ہر وہ مضمون جو کسی رسالے کے لئے لکھا جائے، کتاب میں شامل کرنے لئے نہیں ہوتا۔ اگر وہ شامل ہی کیا جائے تو نظر ثانی کے بعد۔ افسوس ہے کہ مصنف کو اس کی مہلت نہیں مل سکی۔

عملی نفسیات کی فتوحات کے چند نمونے

(۲)

خواجہ جلیل احمد

فنونِ لطیفہ بھی عملی نفسیات کے حلقۂ اثر سے باہر نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر موسیقی کو لیجئے۔ نفسیاتی تجربات کی مدد سے ہم بآسانی اس بات کا پتہ لگا سکتے ہیں کہ کون سا سُر اور کون سی گت کس موقع کے لئے مناسب ہوگی یا کوئی خاص راگ، گیت یا شعر کس انداز اور زیر و بم کے ساتھ زیادہ لطف پیدا کرنے کا باعث ہوگا۔ اسی طرح ہم یہ بھی بآسانی دریافت کر سکتے ہیں کہ کون سے خطوط اور کن رنگوں کی کتنی آمیزش مصوری کے ایک شاہکار کی ایک تخلیق کر سکتی ہے۔ اسی طرح فنِ معماری اور سنگ تراشی کے متعلق منحنی یا مستقیم خطوط اور ان کے مجموعہ جات کے بہترین نمونوں کا بھی تعین کیا جا سکتا ہے۔

بالعموم فنونِ لطیفہ کے مختلف نمونوں کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی چند مخصوص قسم کے اسباب و علل پر منحصر ہوتی ہے۔ مثلاً کسی سُر یا گیت کو ہم اس لئے پسند کرتے ہیں کہ وہ ہمیں کسی ایسے گیت کی یاد دلاتا ہے جو ہمیں بے انتہا پسند ہو۔ اسی طرح ہماری پسندیدگی کا تعین اس طرح بھی کیا جا سکتا ہے کہ کوئی راگ اس فطری انداز میں نہیں گایا جا رہا ہے جس کا وہ دراصل مستحق ہے۔ اسی طرح جو راگ ہماری توجہ کو منعطف کر لینے کی طاقت زیادہ قوت خود میں رکھتا ہے بہت پسند کیا جاتا ہے۔ اس طرح گویا ہماری پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے ارتقائی مفعولی، فاعلی اور طبعی پہلو ہو سکتے ہیں اور جو رنگ تصویر یا صناعی اور سنگ تراشی کا نمونہ مجموعی یا کم سے کم انفرادی طور پر ان پہلوؤں میں سے کہیں جو کیفیات یا کم سے کم ایک پہلو کے لئے کشش کا باعث نہیں ہوتا، ہمیشہ ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے حالانکہ اصولی طور پر فنونِ لطیفہ کے وہی نمونے شاہکار کہلانے کے مستحق ہیں جو ان مجموعی کیفیات (نفسیاتی اور جسمانی) کو اپیل کرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ موسیقی کو پسند کرنے کے لئے انسان کے کل جملہ آلہ ہائے حسّیات کا انتہائی ذکی الحس ہونا ضروری ہے اور یہی سبب ہے کہ بعض لوگ ایک خاص گیت، یا راگ پر سر دھننے لگتے ہیں، اور دوسرے اسی پر خاموش رہتے ہیں۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ ایک نارمل انسان کسی گیت سے اگر وہ واقعی عمدہ کہلانے کا مستحق ہے، غیر متاثر رہے۔ انسان کی اسی طبعی ساخت سے فائدہ اٹھا کر کسی بھی گیت کو مختلف افراد کے سامنے (جس کے الفاظ، عبارت اور ساخت پر اعتماد ہو) بطور مسابقہ پیش کیا جا سکتا ہے اور پھر ان کے اختلاف اور موافقت آرا کی بنا پر اس کی عمدگی یا غیر عمدگی کا کافی صحیح حد تک تعین کیا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ موسیقی کے سلسلے میں نسلی اور قومی اختلافات کو ضرور دخل ہوتا ہے۔ (مثلاً ہندوستانیوں کے لئے انگریزی موسیقی اور یورپینوں کے لئے ہندوستانی موسیقی کا سمجھنا اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے) لیکن چونکہ موسیقی سے محظوظ ہونے کی انسان میں بلا تفریق قوم و ملت ایک مخصوص کائناتی صلاحیت ہوتی ہے اس لئے غیر مانوس زبانوں کے راگ بھی دل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ موسیقی سے محظوظ ہونے میں ہمیشہ ہمارے ذاتی تجربات، رجحانات اور ذہنی کیفیات کو دخل ہوتا ہے چنانچہ ان لوگوں کے دل کو جو کسی خاص شعر یا گیت سے اتنا متاثر ہوتے ہیں کہ بعض اوقات ان پر بے ہوشی یا نیم بے ہوشی کی کیفیات طاری ہو جاتی ہیں۔ اکثر کسی خاص واقعہ کی یاد (جو ان کے تجربات سے وابستہ ہی) تڑپا دیتی ہے اور قانونِ ارتباطِ خیال کے سبب سے ان پر وہی سابقہ تجرباتی کیفیات اپنی انتہائی شدت سے دوبارہ طاری ہو جاتی ہیں اور وہ اس میں اتنی لذت محسوس کرتے ہیں کہ عارضی طور پر ان کا جسمانی اور دماغی نظام اس نفسیاتی تناؤ کو برداشت نہیں کر سکتا اور نتیجتاً بے ہوشی یا نیم بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے حال و قال کی محفلوں کے جملہ حادثات کا تجزیہ اسی زاویۂ فکر سے ہو سکتا ہے۔

موسیقی کے بعد مصوری کا نمبر آتا ہے۔ یہ امر بدیہی ہے کہ پس منظر کی خوبی کسی بھی تصویر کی خوبیوں کو دوبالا کر دیتی ہے۔ چنانچہ اسی ہمہ گیر حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے پس منظر کا تعین ہر مصور کے لئے باعث دقت ہوتا ہے اور اس کی کامیابی کا بڑی حد تک اسی تعین کی خوبی پر دار و مدار ہوتا ہے۔ ایک عام مقولہ ہے کہ ہر شے اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ مثلاً سیاہی کا وجود، سپیدی کی خوبیوں کو واضح کرتا ہے۔ اسی طرح اور دوسرے رنگوں کی کشش اور حسن میں ان کے معاون رنگوں کی موجودگی سے اضافہ ہو جاتا ہے۔ نفسیات نے اسی حقیقت سے فائدہ اٹھا کر یہ کلیہ بنا لیا ہے کہ مجموعی حیثیت سے کسی تصویر کے حسن پر اس کے بدصورت اجزا بُرا اثر نہیں ڈال سکتے۔ ہو سکتا ہے کہ انتہائی بھدے رنگ باوجود اپنی انفرادی بدصورتی کے اور رنگوں کے ساتھ مل کر تصویر کو اور زیادہ دلکش بنا دیں۔ اسی طرح موسیقی میں صرف سریلی تانوں ہی سے کام نہیں لیا جاتا بلکہ وہ آوازیں اور سر و تال جو انفرادی طور پر کانوں پر بار ہوتے ہیں۔ اس انداز سے کسی راگ میں پیش کئے جا سکتے ہیں کہ نہ صرف ان کی ناگواری زائل ہو جائے بلکہ وہ پورے گیت یا راگ کا لطف دوبالا کر دیں اس لئے کوئی نیا راگ ایجاد کرتے وقت سُریلی آوازوں کے ساتھ ساتھ بھدی اور بے ہنگم آوازوں کا بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

موسیقی کی مختلف تانوں کی تحقیقات کرتے وقت نفسیات، طبیعیات کی سرحدوں میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس کی عمدگی یا غیر عمدگی کے متعلق مختلف آرا کا تعین کرنے کے مختلف طریقے ہیں۔ ایک طریقہ جس کو طریقۂ انتخاب کہہ سکتے ہیں یہ ہوتا ہے کہ مختلف رنگ یا گیت مختلف اشخاص کو باری باری دکھلائے یا سنائے جاتے ہیں اور اس کے بعد ان کی آرا کو بالترتیب نوٹ کر لیا جاتا ہے۔ اور اس طرح کسی فنکاری کے نمونے کے متعلق رائے قائم کی جاتی ہے۔ لیکن میری رائے میں یہ طریقہ متناقض ہے کیونکہ انفرادی فیصلوں پر اتنا اعتبار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی بنا پر کسی شاہکار کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم کی جا سکے۔ اس سے زیادہ بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ مختلف فنکاری کے نمونوں کو اس طرح پیش کیا جائے کہ مفروضہ دس نمونوں میں سے ہر ایک نمونہ دوسرے کے مقابلے میں کیا جا سکے مثلاً ا کو ب کے ساتھ اور پھر ا کو ج کے ساتھ اور پھر ا کو د کے ساتھ پیش کیا جائے اور اس طرح کوئی بھی نمونہ ایسا نہ ہو جس کو کسی بھی دوسرے نمونے کے مقابلے میں نہ رکھا گیا ہو۔ اس طریقے سے جو رائے قائم کی جائے گی وہ زیادہ قابلِ یقین اور سائنٹیفک ہوگی۔

اس کے علاوہ فنونِ لطیفہ کے نوادر کی خوبیوں کا تعین افراد کی جذباتی شدت اور استقلال کے تعین سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ مختلف آلات جو نبض، دل کی دھڑکن اور سانس کی رفتار کا تعین کرتے ہیں معمول کے جسم سے منسلک کر دئے جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد کسی تصویر، راگ یا گیت کو اس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ بالعموم گیت ایسے مقام سے گایا جاتا ہے جو معمول کی نظر سے پوشیدہ ہو۔ اب اگر معمول نارمل (اوسط درجہ کا) ہے تو وہ یقیناً ان تحریکات سے متاثر ہوگا اور ان تاثرات کا براہِ راست اثر سانس، نبض اور دل کی دھڑکن پر پڑے گا۔ اس طرح نبض، سانس اور دل کی دھڑکنوں کا تعین کر کے مختلف افراد کے پیش کردہ اعداد و شمار کی بناء پر یہ رائے قائم کی جائے گی کہ کون سا گیت یا تصویر بہترین کہلانے کی مستحق ہے۔

میرے خیال میں اگر حکومت یا کسی ادارے کو سال کی بہترین نظموں اور غزلوں کا تعین کرنا ہو تو اس کا فیصلہ بجائے عوام اور چند ججوں پر چھوڑنے کے معمل گاہوں کے ذریعے کیا جائے۔ مثلاً وہ نظم یا غزل بہترین قرار دی جائے جس میں سننے والے سامعین کی بڑی تعداد کی نبض کی رفتار اور سانس کا زیر و بم زیادہ شدید ہو اور پھر ان کیفیات کا نظم یا غزل کے ختم ہونے کے بعد بھی، مقداری تعین کیا

جائے اور جس غزل یا نظم کے اثرات دیرپا ہوں اس کو بہترین قرار دیا جائے مفہوم کی مزید وضاحت کے سلئے یوں سمجھئے کہ بعض غزلیں یا نظم انسان کو عارضی ہیجانی اور سطحی طور پر متاثر کرتی ہیں اور بعض کا اثر شدید اور دیرپا ہوتا ہے، لیکن ان میں ہنگامہ کا شائبہ نہیں ہوتا۔ بعض جنسی جذبات کو براہ راست اپیل (متاثر) کرتی ہیں اور بعض صرف دل کے نازک تاروں (صرف شاعرانہ زبان میں) کو چھو لینے پر اکتفا کرتی ہیں۔ بعض فلسفیانہ اور صوفیانہ نکات انسان کو اس مادی دنیا سے بلند کر کے تصوف کے عالم بالا میں پہنچا دیتے ہیں اور بعض سطح زمین سے ایک قدم اوپر نہیں اٹھنے دیتے۔ لہذا تجربہ کرنے کے قبل اس بات کا تعین کر لینا چاہیے کہ کن کیفیات اور تاثرات کو نظم یا غزل کی عمدگی کا معیار قرار دیا جائے گا اور اس کے بعد سائنسی بنیاد پر ان کا تجربہ کرنا چاہیے۔ لیکن اس قسم کے تجربات کے قبل معمول کے چناؤ میں کافی احتیاط برتنی چاہیے اور نفسیاتی تجزیے کے بعد صرف مستند اور غیر مریضانہ ذہنیت کے مالک افراد کو منصفین کا درجہ دینا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ بعض لوگ بالکل جاہل اور کندۂ ناتراش افراد کو بحیثیت منصفین ترجیح دیں گے۔ کیونکہ ایسے افراد کے فیصلے عصبیت سے پاک اور مبرا ہوں گے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شاعری اصطلاحی چیز ہے اور اس کو پسند یا ناپسند کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں اس لئے منصفین کی حیثیت سے فن کاروں ہی کا انتخاب زیادہ مفید ہوگا۔ حالانکہ بعض حالات میں ان کے ذاتی نظریات اور تعصبات ان کی قوت فیصلہ کو ضرور متاثر کریں گے۔ لیکن اس کا علاج اس طرح ممکن ہے کہ ان کو حتی الامکان ذاتی تعصبات کو پرے رکھ دینے کی ہدایت کر دی جائے۔ ان تجربات کو قطعی سائنسی حیثیت دینے کے لئے ہمیں مختلف معمولوں پر مختلف اوقات میں تجربہ کرنا ہوگا اور صرف یہی نہیں بلکہ ہر ایک معمول کو ایک خاص نظم مختلف اوقات میں سنائی جائے گی۔ تاکہ غلطی کا کم سے کم امکان ہو، مختلف اوقات پر تجربہ کے دہرانے کی افادی حیثیت یہ ہے کہ بعض لمحات ایسے ہوتے ہیں جن میں انسان کی طبیعت پژمردہ ہوتی ہے اس وقت شعر کیا بڑی سے بڑی دنیاوی مسرت دل کو خوش کرنے سے قاصر رہتی ہے، لیکن کچھ لمحات میں جب طبیعت حاضر رہتی ہے معمولی سے معمولی شعر میں مزا آ جاتا ہے۔ اس لئے مختلف اوقات کے نتائج کا اوسط نکال کر ہر فرد کے انفرادی فیصلہ کا تعین کیا جائے گا۔

یہاں پر یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ افراد کے جمالیاتی ذوق کے تعین کے لئے سانس کا اتار چڑھاؤ اور خون کی گردش کی تیزی یا سستی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ سانس کی گہرائی اور رفتار کے تعین کے لئے نیموگراف نام کا ایک آلہ استعمال کیا جاتا ہے اور اسی طرح نبض کی رفتار اسفگموگراف سے معلوم کی جا سکتی ہے۔ ان آلات کی مدد سے کافی صحیح حد تک جمالیاتی ذوق پر جسمانی اثرات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً پروفیسر مائیرس کا خیال ہے کہ وہ لوگ جو تیز قدمی کے عادی ہیں اس راگ کو زیادہ پسند کرتے ہیں، جس میں آواز کا زیر و بم شدید ہوتا ہے۔

(باقی آئندہ)

یو، این، او کی ایک جھلک

(بسلسلہ صفحہ ۱)

روسیوں کو اپنی کوئی تجویز منظور کرانے کی خواہش نہیں ہوتی۔ وہ تقریریں کرتے ہیں، ووٹ دیتے ہیں اور جلسہ ختم ہوتے ہی خدا جانے کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔

دنیا کو زیادہ دلچسپی ان معاملوں سے ہے جن پہلی کمیٹی میں بحث ہوتی ہے۔ ہندوستان کی اس تجویز سے کہ ایٹمی قوت کے استعمال کا مسئلہ بین قومی عدالت میں پیش کر کے اس کا عدالتی فیصلہ کرایا جائے۔ سب کو بہت اطمینان ہو گیا، اس لئے کہ سب اس بحث سے عاجز آ گئے تھے لبیا کے معاملے میں بھی ہندوستان کی تحریک سے بعض بنیادی باتیں بحث سے پہلے ہی مان لی گئیں۔ گفتگو بیشتر موضوع کے قریب ہی رہی اور اب اُمید ہے کہ ایک روز میں لبیا کے بارے میں خاطر خواہ فیصلہ ہو جائے گا۔ اس درمیان میں جنوبی امریکہ والوں نے یہ کہہ کر کہ ہم پہلے یہ منوا لیں کہ اٹلی کو سومالی لینڈ کا متولی مقرر کیا جائے گا تب لبیا کے معاملے میں ہندوستان، برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کی تجویز کو منظور کریں گے۔ سب کو ذرا گڑبڑا دیا۔ مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ لبیا، اریٹریا اور

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

ادارۂ تحریر:۔
ڈاکٹر سید عابد حسین ، صالحہ عابد حسین
عبداللطیف اعظمی

سومالی لینڈ کے مستقبل پر الگ غور کیا جائے گا اور اوگیڈن کے بارے میں اس وقت تک فیصلہ ملتوی ہی نہ رکھا جائے گا۔ جب تک کہ حبش کے بارے میں سمجھوتہ نہ ہو جائے۔ ایرٹیریا کے مستقبل پر عام گفتگو کے دوران میں پاکستان اور حبش کے درمیان ذرا چٹ پٹی باتیں ہوگئیں۔ اس کی تفصیل پھر کبھی لکھوں گا۔

آپ کا مخلص
محمد مجیب

بزم بے تکلف بسلسلہ صفرہ

خیر مقدم کرتے ہیں اور یہ دعا کرتے ہیں کہ ہند اور پاکستان کے اینٹھے ہوئے تعلقات کو درست کرنے کا مسئلہ جسے انجمن اقوام کی حکمت اور فطرت اب تک حل نہیں کر سکی ہے ان دونوں انجمنوں کی حماقت اور ظرافت سے حل ہو جائے ✦

تاریخ اشاعت :۔ یکم ، ۸ ، ۱۶ ، ۲۴ چندہ :۔ سالانہ ۶ ششماہی للعمر
دفتر نئی روشنی جامعہ دہلی
طابع و ناشر :۔ عبداللطیف اعظمی (بی اے جامعہ) مطبوعہ :۔ جید برقی دہلی

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۳ نمبر ۲۱ | یکم دسمبر ۱۹۵۹ء | ایڈیٹر:- ڈاکٹر سید عابد حسین

اہل علم کی آواز

(۲۰ر نومبر کے "نئی روشنی" میں تہذیبی اتحاد کی کانفرنس کا ذکر کیا گیا تھا جو ۲۴ر اکتوبر سے ۳۰ر اکتوبر تک مہابلیشور میں منعقد ہوئی تھی۔ کانفرنس یونیورسٹیوں اور دوسرے علمی اور تہذیبی اداروں کے نمایندوں پر مشتمل تھی مندرجہ ذیل اعلان کو جو کانفرنس کے بعد شائع کیا گیا۔ ہم ہندوستان کے اہل علم کی آواز کہہ سکتے ہیں)

اس وقت ہماری تہذیب ایک نازک دور سے گذر رہی ہے، اور اس کی بہت سی اہم سماجی ذہنی اور اخلاقی قدریں خطرے میں ہیں، اس کی وجہ سے ہماری قومی شخصیت کی بنیادیں کمزور ہوگئی ہیں، اور ہماری عمومی زندگی اور دیانت کے معیار پست ہوگئے ہیں۔ اس کی شہادتیں ہمیں چاروں طرف ملتی ہیں، اور کوئی شخص جس میں سماجی نظر اور سماجی احساس ہے انھیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ سب لوگ جو ملک کے خیرخواہ ہیں اور اس کے مستقبل کو بہتر بنانے کے خواہش مند ہیں، جن میں استاد، ادیب، مفکر، فن کار سب شامل ہیں۔ اس صورت حال پر غیر جانبداری کے ساتھ تنقیدی نظر ڈالیں اور اس کی اصلاح کی کوشش کریں۔

ہم سب نے جو اس کنونشن میں شریک ہوئے، بہت سے ان بنیادی مسئلوں پر بحث کی جو اس نازک زمانے میں پیدا ہوئے ہیں اور کافی غور اور بحث کے بعد ہم نے ان کے بارے میں اپنے خیالات کو مندرجہ ذیل بیان کی شکل میں مرتب کیا ہے۔ ہم سب بحیثیت مجموعی اس بیان سے اتفاق رکھتے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ ہمیں اپنے دلیس میں ان خیالات کا ہر ممکن طریقے پر پرچار کرنا چاہیے ممکن ہے کہ ہمارے بعض شریک کار جو تہذیب کے مختلف شعبوں میں کام کرتے ہیں، ان میں سے بعض خیالات کو بالکل بدیہی بلکہ پیش پا افتادہ کہیں۔ لیکن ہمارے تو محض اس امر کا واضح ثبوت ہوتا ہے کہ موجودہ صورت حال اس قدر نازک ہوگئی ہے کہ اس قسم کے خیالات کا باضابطہ اعلان کرنا ضروری ہے۔ ہمیں اس بات کا دکھ بھرا احساس ہے کہ ہماری قومی زندگی میں کمزوری سے بعض ایسے رجحانات زور پکڑ رہے ہیں جن کی وجہ سے ہم تہذیبی خطرے میں پڑ گئے ہیں۔

۱۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ باوجود اہم ذہنی اختلافات کے ہم سب انسان دوستی کے وسیع اور مشترک فارم پر جمع ہو کر انسانی قدروں کو محکم کرنے کے لئے مل جل کر کوشش کر سکتے ہیں۔ انسان دوستی کا مفہوم یہ ہے کہ ہم ہر انسان کو ہمیشہ انسان کے قابل احترام سمجھیں اور اس کے اس حق کو تسلیم کریں کہ وہ بلا کسی تعصب اور صلاحیتوں کو پھیلنے اور پھولنے کا بہترین موقع ملنا چاہیے۔

۲۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس کے مکمل ارتقار کے لئے تمام ضروری مادی اور ذہنی سہولتیں مہیا کی جائیں مسئلے سماجی ادارے یا اجتماعی تحریکیں جو اس ارتقار کے رستے میں حارج ہوں، انسان دوستی اور آزادی کی روح کے منافی ہیں۔

۳۔ ہم حقیقی قومی اتحاد اور ایک جاندار قومی تہذیب کی نشوونما کے لئے سماجی انصاف کو ایک شرط لازم سمجھتے ہیں۔ اس کے بغیر قومی اتحاد مصنوعی اور عارضی ہوگا، اور اس کی بنیاد جبر پر ہوگی، اور قومی تہذیب میں نہ وسعت ہوگی نہ قوت۔ سماجی انصاف کا مطالبہ یہ ہے کہ عوام کے مادی اور ذہنی معیار کو اونچا کیا جائے، اور اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ یونیورسٹیاں اور دوسرے تعلیمی ادارے اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کریں جو تعلیم یافتہ طبقے اور عوام میں حائل ہو گئی ہے۔

۴۔ ہمارے خیال میں مادی اور روحانی قدروں کو ایک دوسرے کی نقیض سمجھنا اور ایک کو مغرب سے اور دوسری کو مشرق سے وابستہ سمجھنا بالکل غلط اور غیر مناسب ہے ایک اچھی سماجی زندگی کے قیام کے لئے ہر قوم کے واسطے ایک معقول مادی اور تمدنی نظام اتنا ہی ضروری ہے جس قدر اخلاقی اور تہذیبی قدروں پر ایمان اور اگر ہم ان میں سے ایک کو بھی نظر انداز کریں گے تو اس سے زندگی کی تکمیل کا امکان جاتا رہے گا۔

۵۔ ہم تاکید کے ساتھ اس امر پر زور دیتے ہیں کہ ہمارا تہذیب کا تصور جامع اور وسیع ہونا چاہیے جو ہر قسم کی ملکی، نسلی، جغرافی اور لسانی تنگ نظری کو مسترد کرے اور ہر قسم کے صالح تہذیبی عناصر کا خیر مقدم کرے۔ ہمیں کثرت میں وحدت کا جلوہ پیدا کرنا ہے، لیکن اس وحدت کا مفہوم یکسانی نہیں بلکہ وہ اختلافات کو کھلے دل سے قبول کرتی ہے، اور ان کو سمجھنے، پرکھنے اور جہاں تک ہو سکے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

۶۔ خود اپنی تہذیب کا مطالعہ کرنے میں ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اپنے اس اجتماعی ورثے کی صحیح تنقید کریں۔ نہ ماضی کو محض اس وجہ سے رد کرنے کے قابل سمجھیں کہ وہ گذر چکا ہے نہ ایک رومانی اور احمقانہ انداز میں رجوع بہ ماضی کا نعرہ لگائیں بلکہ ماضی اور حال میں، اندر اور باہر سے جو عنصر بھی قابل قدر معلوم ہو اس کا خیر مقدم کریں۔ اگر اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے تو ہمیں ان تمام لسانی، اجتماعی اور فرقہ وارانہ تعصبات کو یک قلم مسترد کرنا ہوگا جو ہماری تہذیب پر حاوی ہو گئے ہیں اور جن کی وجہ سے قومی زندگی میں سخت اختلافات اور

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

فہرست مضامین

مختصر تبصرے

دو ہندی کتابیں

سید احتشام حسین رضوی

۱۔ شعر و شاعری، از ادیا پرشاد گوئلیہ، ناشر: بھارتیہ گیان پیٹھ کاشی۔ قیمت [illegible] مجلد۔
۲۔ میکسم گورکی۔ از مہندر رائے۔ ملنے کا پتہ: انڈین بک ڈپو، امین الدولہ پارک لکھنؤ۔ قیمت [illegible] مجلد۔

۱۔ لسانی نقطۂ نظر سے یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے، کہ بنیادی طور پر ہندی اور اردو ایک ہیں۔ حالات نے ان کے ارتقا کی شکلیں مختلف کر دیں۔ اس لئے اگر تعصبات سے الگ ہو کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک زبان کا جاننے والا دوسری زبان نہ صرف آسانی سے سیکھ سکتا ہے بلکہ سیکھ کر فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہندی اردو کے مسئلے پر شدید اختلاف کے باوجود اس حقیقت کو تمام انصاف پسند ہندوستانی تسلیم کرتے ہیں کہ اردو کے ارتقا میں ہندوؤں کا اور ہندی کی ترقی میں مسلمانوں کا اتنا اہم حصہ رہا ہے کہ ان زبانوں کو مذہبی نہیں کہا جا سکتا۔ اگر زبانوں کو مذہبی کہا جانے لگے تو سارا فلسفۂ لسان غلط ہو جائے گا۔ دونوں زبانیں ایک ہیں اس لئے ان کا ایک ساتھ مطالعہ بڑے مفید نتائج برآمد کرے گا۔

بہر حال اس وقت ہندی ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے یہاں یہ جذبہ تیزی سے پیدا ہو رہا ہے کہ وہ ہندوستان کی ایک بہت ہی اہم اور ترقی پسند زبان یعنی اردو کے متعلق معلومات حاصل کریں۔ اس سلسلے میں جتنی بھی کتابیں نظر سے گذری ہیں ان میں انصاف پسندانہ تنقیدی نقطۂ نظر سے بہت کم کام لیا گیا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک ایک طرف تو لوگوں کے ذہن تعصبات سے پاک نہیں ہیں اور دوسری طرف لکھنے والوں کا اردو ادب کا مطالعہ وسیع نہیں ہے۔ ان دونوں باتوں کا پتہ کسی کتاب کے مطالعہ سے چل سکتا ہے۔ شعر و شاعری یعنی کتاب زیر تبصرہ بھی اس عیب سے پاک نہیں۔ یہ کتاب چھ سو بیس صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے اس میں اردو شعرا اور شاعری کے متعلق چند مباحث ہیں اور سب سے اہم چیز دس ابواب میں اکتیس مشہور شعرا کا انتخاب ہے۔ ابواب تاریخی ترتیب سے مرتب کئے گئے ہیں جن میں میر تقی میر سے لے کر موجودہ دور کے نوجوان شعرا تک کی اچھی نظمیں اور غزلیں انتخاب کی گئی ہیں۔ دس حصے جن عنوانات کے ماتحت مرتب ہوئے ہیں ان کے نام یہ ہیں:۔

ابتدا، ترنگ، افتتاح، سنگم، روشنی، نیا سویرا، بیداری، ستی کامران، ترقی پسندی اور تموج شیریں۔

یہ عنوانات خود اپنے دائرہ انتخاب کا پتہ دیتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ چند اہم شعرا چھوٹ گئے ہیں لیکن جو کتاب میں شامل کئے گئے ہیں ان کے انتخاب سے مؤلف کے وسیع مطالعہ اور سخن فہمی کا پورا ثبوت ملتا ہے۔ مشکل عربی، فارسی الفاظ کے معنی فوٹ نوٹ میں دے دئے گئے ہیں جس سے کم اردو جاننے والوں کو سہولت ہوگی۔ کتاب کی ترتیب میں کافی سلیقہ برتا گیا ہے اور طباعت بھی قابل تحسین ہے۔ ہندی میں غالباً اردو کا یہ سب سے اچھا اور نمائندہ انتخاب ہے اور جناب رام نریش ترپاٹھی کے انتخاب پر اضافہ ہے۔

شعرا کے انتخاب کے علاوہ جو ابتدائی تعارفی صفحات ہیں، ان میں البتہ بہت سی بحث طلب باتیں اٹھائی گئی ہیں۔ پیش لفظ [illegible] کا سنسکرت، پالی اور ہندی کے مشہور عالم راہل سانکرتیاین نے لکھا ہے۔ حیرت ہے کہ بہت سی زبانوں کے عالم ہونے کے باوجود راہل جی نے اردو کے بدیسی ہونے کا ذکر کیا ہے وہ مختلف تمدنوں کے ارتباط اور تہذیبی اثرات کے تداخل سے واقف ہیں پھر بھی انھیں یہ شکایت ہے کہ اردو نے فارسی کا اثر قبول کر لیا اور میں فارسی، عربی کے الفاظ اور فارسی بحروں کے انتخاب کا ذکر انھوں نے اس طرح کیا ہے گویا یہ سب کچھ ہندوستانی تہذیب کی دشمنی میں کیا گیا۔ ان کے خیال میں اردو کے شعرا نے ہندی بحروں کا "بائیکاٹ" جان بوجھ کر کیا۔ یہ خیالات علمی اور تاریخی نقطۂ نظر سے بالکل غلط ثابت ہوں گے۔ موصوف نے خود ہی اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ مسلمانوں نے موسیقی میں ہندوستانی موسیقی کا "بائیکاٹ" نہیں کیا۔ کیا موصوف اس کا سبب بتا سکیں گے کہ مسلمانوں نے صرف شاعری ہی میں کیوں ہندوستانی اثرات کو قبول کرنے سے انکار کیا اور موسیقی، تعمیر اور مصوری میں اختلاط کا عمل کیوں جاری رہا؟ یہاں راہل جی کی علمیت پر جذباتیت کا غلبہ ہے، اسی طرح اور بعض باتیں بحث طلب ہیں۔ لیکن اس مختصر سے تبصرے میں ان سے الجھنا ممکن نہیں ہے۔

خود مؤلف نے بھی ایسی ہی غلطیاں کی ہیں۔ انھوں نے امیر خسرو کو اردو کا جنم داتا قرار دیا ہے اور خسرو کے کارناموں کو ہندوستانی تمدن کا جز مانا ہے۔ لیکن اردو کے عروج کو بدیسی کہا ہے۔ یہاں بھی وہی غلطی ہے یعنی زبان پر جو تمدنی اثرات تاریخ کے ناگزیر تقاضوں سے پڑتے رہے انھیں تسلیم کرنے سے انکار کیا گیا ہے اس جگہ اس مسئلے کو چھیڑنے کا [illegible] نہیں [illegible] وہ کہ نئی کر ہندوستانی قومیت اور [illegible] کی روشنی میں دیکھا جائے، ورنہ یہ بات بڑی [illegible] سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اردو کی شاعری [illegible] کے نئے [illegible] سے وابستہ نہیں تھی۔ گوئلیہ صاحب نے اردو غزل کے متعلق اور علامات و اشارات شاعری کے متعلق بھی بعض باتیں ایسی کہی ہیں جنھیں تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ان خامیوں [illegible] میں ان کی غلطیاں درست کر لی گئیں اور انتخاب میں کچھ اور نئے شعرا کو شامل کر لیا گیا تو یہ کتاب ایک بے نظیر تالیف ثابت ہوگی۔

کتاب کی زبان ہر جگہ یکساں نہیں ہے، کہیں آسان ہے کہیں مشکل۔ ذرا سی محنت سے یہ خامی بھی دور کی جا سکتی تھی۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ ہندی ادب میں یہ انتخاب ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۔ سری مہندر چندر رائے نے ہندی میں میکسم گورکی کی سوانح عمری لکھ کر ہندی ادب میں ایک دلچسپ کتاب کا اضافہ کیا ہے۔ انھوں نے پہلے یہ کتاب بنگالی زبان میں شائع کی تھی، پھر ہندی میں ترجمہ کر کے انڈین پریس الہ آباد سے شائع کی ہے۔ ہندی ترجمے میں بیڈھب بنارسی (ہندی کے مزاح نگار شاعر) نے بھی ان کی مدد کی ہے۔ اس کی زبان صاف اور رواں ہے اور انداز بیان بہت ہی دلکش ہے۔ مصنف کے سامنے میکسم گورکی کی خود نوشت سوانح عمری تھی، کیونکہ ترتیب اور انداز بیان میں اسی کے جلوے نظر آتے ہیں۔ گورکی کا نام ہندی اردو تو کیا دنیا کی کسی زبان میں بھی اب تعارف کا محتاج نہیں رہ گیا ہے۔ انقلاب روس نے جس اشتراکی حقیقت نگاری اور انسان دوستی کو جنم دیا گورکی اس کا مجسمہ تھا۔ اس کی ساری زندگی ایک انقلابی زندگی تھی۔ اس کا وجود اس حقیقت کا واضح اعلان تھا کہ عوام سے رشتہ جوڑ کر ادیب کے قلم میں غیر معمولی توانائی آ جاتی ہے۔ گورکی ایک ایسے گھر میں پیدا ہوا جس کی مالی اور اخلاقی حالت بہت خراب تھی اس نے بچپن میں زندگی کے بہت سے تجربے حاصل کر لئے، بہت سے پیشے اختیار کئے۔ بہت سی سیاسی انجمنوں میں حصہ لیا، بہت سے سفر کئے بہت پڑھا اور بہت کچھ لکھا۔ تجربہ اس کا معلم اور ماحول اس کا مدرسہ تھا۔ حالات نے اسے تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں دیا، لیکن اپنی محنت سے اس نے دنیا کے اہم ترین علوم اور بہترین مصنفین کا مطالعہ کیا اور مصنف کی حیثیت سے وہ مرتبہ حاصل کیا کہ دنیا کے اعلیٰ مصنفوں، مفکروں اور انسان دوستوں کی جو فہرست بھی بنائی جائے گی اس میں گورکی کا نام ضرور ہوگا۔ اس لئے گورکی کی زندگی کا مطالعہ ناول سے زیادہ دلچسپ اور تاریخ سے زیادہ سبق آموز ہے۔ افسوس یہ ہے کہ آخر کتاب کے آخری دو صفحوں نے مصنف کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا ہے۔ یوں تو سیاسی حالات کے تجزیہ میں مصنف نے کئی جگہ لغزشیں کی ہیں لیکن گورکی کی موت کا تذکرہ کرتے

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

ہفت روزہ
نئی روشنی
دہلی

یکم دسمبر ۱۹۴۹ء

ہمارا آئین

ہمارے مشترک فکر و تصور کا آئینہ

خدا کا شکر ہے کہ ہماری آئین ساز اسمبلی کی تین سال کی محنت ٹھکانے لگی اور ہندوستان کا آئین تیسری پڑھت کے بعد آخری شکل میں منظور ہو گیا۔ اسمبلی کے موجودہ اجلاس میں جو ۱۴ نومبر سے ۲۶ نومبر تک رہا کوئی ستر اسی ممبروں نے اپنی اپنی رائے آئین کے بارے میں ظاہر کی جس میں معروضی تنقید بہت کم، شاعری بہت زیادہ تھی اور اس شاعری میں قصیدہ، مناجات، رجز، ہجو ملیح، ہجو قبیح، مرثیہ، غرض تعریف اور مذمت، شکر اور شکایت کا کوئی رنگ چھوٹنے نہیں پایا، سرسری نظر سے دیکھنے والے کو حیرت ہوگی کہ جس آئین کے بارے میں اتنا شدید اختلاف رائے ہے وہ قریب قریب اتفاق رائے سے کیونکر پاس ہو گیا، لیکن ذرا غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ اختلاف رائے بہت کچھ تو محض گرمیٔ محفل کی خاطر ہے اور جتنا حقیقی ہے وہ ان چھوٹے چھوٹے حلقوں کی طرف سے ہے جو ملک کے آئندہ سیاسی معاشی اور تہذیبی نظام کے بارے میں ایک دوسرے سے متضاد تصورات رکھتے ہیں۔ یہ لوگ اصولاً موجودہ آئین کو ناقص قرار دیتے ہیں، لیکن عملی مصلحت کے لحاظ سے اس کو غنیمت جانتے ہیں کہ آئین اگر اس سرے پر نہیں آیا جس پر وہ لانا چاہتے تھے دوسرے سرے پر بھی نہیں پہنچنے پایا، یہ بیچ کی راہ جسے آئین سازوں نے اختیار کیا ہے، ایسے تصورات پر مبنی ہے۔ جو ہر مذہب خیال کے لوگوں میں بڑی حد تک مشترک ہیں، ایک جمہوری ریاست کے آئین سے ہم اس سے زیادہ اور کیا توقع کر سکتے ہیں۔

آئین کے بنیادی تصورات پر بحث کرنے سے پہلے ہم ان اعتراضوں پر ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں جو آئین پر کئے گئے ہیں، چھوٹے چھوٹے اعتراض تو بے شمار ہیں۔ ان کا ذکر کرنے کی نہ گنجائش ہے اور نہ ضرورت ہے۔ ہم صرف بڑے بڑے اعتراضوں کو لیں گے۔

وہ اعتراض جو نذیر الدین احمد صاحب اور دو ایک اور خورده گیر ممبروں نے کیا ہے کہ آئین کی زبان درست اور چست نہیں یا اس کی ترتیب ڈھیلی اور بے ربط ہے وہ صریحی طور پر بے بنیاد ہے۔ عام طور پر موافق اور مخالف سب اس بات پر متفق ہیں کہ آئین کی دفعات نہایت قابلیت صحت و وضاحت اور سلیقے سے ترتیب دی گئی ہیں۔ آئین بنانے والوں سے جو کوتاہیاں بھی ہوئی ہوں مگر اس کے قلم بند کرنے والوں نے اپنے فرض کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے۔

اب رہا یہ اعتراض کہ آئین ضرورت سے زیادہ کڑا ہے، اس میں لوچ بالکل نہیں۔ ہمارے خیال میں یہ اعتراض اپنی جگہ درست ہے۔ اگر ہم صرف ایک خاکہ بنا دیتے اور حسب ضرورت اس میں رفتہ رفتہ رنگ بھرتے تو اچھا تھا تاکہ ہمیں بدلتے ہوئے حالات کے لحاظ سے روز روز آئین میں ترمیم نہ کرنی پڑتی۔ لیکن کیا کیا جائے یہ ہمارے قومی مزاج کا معاملہ ہے۔ ہم انگریزوں اور امریکیوں کی طرح تجربے کے نہیں، فرانسیسیوں کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ منطق کے قائل ہیں ہمارے ذہنوں نے دھرم شاستر اور فقہ کے آغوش میں تربیت پائی ہے جہاں ہر ممکن اور ناممکن صورت حال کے لئے پہلے سے قاعدے اور ضابطے بنا دئے جاتے ہیں، ہمارے بہت سے آئین سازوں کو تو اس تفصیل کے بعد بھی اجمال کی شکایت رہ گئی ہے، ان کا بس چلتا تو احکام غسل اور آداب طعام کو بھی آئین میں شامل کر دیتے۔

اسی طرح یہ اعتراض بھی ایک حد تک صحیح ہے کہ آئین میں مرکزی حکومت کو بہت زیادہ اختیارات دے دئے گئے ہیں جس کی وجہ سے صوبوں کی خود اختیاری کے ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ واقعی اگر یونین کا صدر اپنے خاص اختیارات کا جو اسے آئین نے دئے ہیں بے جا استعمال کرے تو صوبوں کی حکومتیں محض کٹھ پتلی بن کر رہ جائیں گی، لیکن آئین میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ ان اختیارات سے صرف ہنگامی حالت میں کام لیا جائے گا، جب صوبے کی حکومت کے معطل ہو جانے یا امن و امان کے درہم برہم ہو جانے کا شدید خطرہ ہو۔ اپنے ملک کے اور عام طور پر دنیا کے حالات کو دیکھتے ہوئے ان خطروں پر قابو پانے کا انتظام کرنا مقدم تھا صوبوں کی داخلی خود اختیاری کو خطرہ جب پیدا ہوگا تو دیکھا جائے گا۔ آخر مرکزی پارلیمنٹ کے ممبروں کو صوبوں کے باشندے ہی منتخب کریں گے اور یونین کا صدر اور اس کی کیبنٹ مرکزی پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہوگی۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ صوبوں کی حکومتوں کے اختیارات غصب کر کے بیٹھ جائیں، اور پارلیمنٹ ان سے کچھ نہ کہے۔

بعض حضرات کو یہ شکایت ہے کہ آئین مہاتما گاندھی کے فلسفے کے مطابق نہیں بنایا گیا، یہاں فلسفے سے ان کی مراد غالباً صرف معاشی نظام ہے اس لئے کہ جہاں تک سیاسی نظام کا تعلق ہے مہاتما گاندھی کوئی الگ فلسفہ نہیں رکھتے تھے، بلکہ مغرب کی لبرل جمہوریت کے قائل تھے۔ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ موجودہ آئین نے گاندھی جی کے معاشی نظام کو جو خود کفیل دیہی معیشت پر مبنی تھا اختیار نہیں کیا، لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب کانگریس نے جو گاندھی جی کی اپنی پارٹی تھی، کبھی بہ حیثیت جماعت اس نظام کو قبول نہیں کیا تو آئین ساز اسمبلی سے جو مختلف پارٹیوں پر مشتمل ہے یہ توقع کیوں کر کی جا سکتی تھی۔ ہاں سیاسی اور سماجی جمہوریت کی اخلاقی روح جس حد تک مہاتما گاندھی اسے کانگریس والوں اور عام ہندوستانیوں کے اندر پھونکنے میں کامیاب ہوئے تھے، ہندوستان کے آئین میں بھی موجود ہونی چاہیے تھی، اور ہے۔

اسی قسم کا اعتراض ایک دوسرے نقطۂ نظر سے یہ ہے کہ ہمارا آئین ہم کو سیاسی آزادی اور مساوات دینا چاہتا ہے، اور اس کے لئے کچھ انتظام بھی کرتا ہے، لیکن معاشی آزادی اور انصاف کا صرف نام ہی نام لیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ہم کو کچھ بھی نہ دے سکے گا اس لئے کہ سیاسی آزادی بغیر معاشی آزادی کے محض ایک بے معنی لفظ ہے۔ اس اعتراض میں اتنی اصلیت ضرور ہے کہ آئین لبرل جمہوریت کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ اشتراکی جمہوریت کی اس میں محض اتنی سی جھلک ہے کہ حکومت کو مفاد عامہ کے لئے زرعی اور صنعتی املاک "مناسب معاوضہ دے کر" ضبط کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ اشتراکی نظام معیشت کا قائم کرنا مقاصد میں داخل نہیں کیا گیا اس لئے یہ اندیشہ ہو سکتا ہے کہ صنعت کو قومی ملک بنانے کا اختیار محض صفحۂ کاغذ تک موجود رہے اور کبھی برتا نہ جائے۔

ان سب باتوں کے باوجود آئین میں وہ خوبی موجود ہے جو عملی حیثیت سے اس کی ساری کوتاہیوں کی تلافی کر دیتی ہے۔ وہ ان لوگوں کے زیادہ سے زیادہ اشتراک خیال پر مبنی ہے جنہیں ہندوستان کی رائے عامہ کا نمائندہ کہا جا سکتا ہے، اس لئے اس کا بہت کچھ امکان ہے کہ وہ کامیابی سے نافذ ہو سکے گا۔ کتنا ہی اچھا آئین بنا دیا جاتا اگر اسے رائے عامہ کی تائید حاصل نہ ہوتی تو محض بیکار تھا۔

بہت سے حضرات جو ہماری طرح اشتراکی جمہوریت کے حامی ہیں اس پر چیں بہ جبیں ہوں گے اور یہ کہیں گے کہ جن لوگوں کے اشتراک خیال کو یہ آئین ظاہر کرتا ہے وہ ملک کی آبادی کی ایک چھوٹی سی پرت کے نمائندے ہیں عوام کے نمائندے نہیں ہیں۔ ہم ان حضرات سے یہ عرض کریں گے اب تک جتنے چھوٹے بڑے انتخابات، کونسلوں، اسمبلیوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں کے ہوئے، ان سے مجموعی طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عوام انہیں لوگوں کے ساتھ ہیں، آپ کے ساتھ نہیں ہیں۔ جس دن آپ نے عوام کو ساتھ لے لیا، آپ اسی آئین کے ذریعے سے یا اس میں تھوڑی سی ترمیم کر کے ملک میں ایک جمہوری اشتراکی نظام قائم کر لیں گے۔ آئین کو محض ضد میں برا کہنا آپ کو زیب نہیں دیتا، یہ جیسا بھی ہے ہمارے اجتماعی دل و دماغ کے فکر و تصور، احساس و وجدان، حوصلے اور آرزو کا آئینہ ہے اگر ملک اس سطح تک پہنچ جائے جہاں یہ آئین اسے پہنچانا چاہتا ہے تو اور اونچا اٹھنا بہت آسان ہو جائے گا۔ اس لئے آپ اس کی مخالفت کرنے کے بجائے یہ کوشش کیجئے کہ اس کے نافذ کرنے کی قوت آپ کو حاصل ہو جائے۔ یہ ان چیزوں میں سے ہے جو خود بری نہیں ہوتیں صرف دوسروں کے ہاتھ میں بری معلوم ہوتی ہیں۔

دنیا کی رفتار

ہندوستان

آئین منظور ہوگیا

۲۶ نومبر کو آئین ساز اسمبلی نے ہندوستان کے نئے آئین کو جو ایک تمہید ۳۹۵ دفعات اور آٹھ تعیقات پر مشتمل ہے منظور کرلیا۔ وہ منظر جب اسمبلی کے اراکین اپنی تین سال کی محنت کو سوارت ہوتے دیکھ کر ایک دوسرے کو، صدر اسمبلی کو اور وزیر قانون شری امبیڈکر کو مبارک باد دے رہے تھے بڑا پُر اثر تھا۔

آئین کی چند دفعات تو فوراً نافذ ہوگئیں اور باقی کا نفاذ ۲۵ جنوری ۱۹۵۰ء کو جمہوریہ ہند کے نئے پریسیڈنٹ کے انتخاب کے بعد ۲۶ جنوری سے ہوگا۔ فوراً نافذ ہونے والی دفعات میں سے زیادہ تر ایسی ہیں جن میں ان مسائل کا ذکر کیا گیا ہے جو پرانے گورنمنٹ انڈیا ایکٹ سے نئے آئین کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے پیدا ہوں گے اور ان کے حل کرنے کا اختیار پریسیڈنٹ کو دیا گیا ہے اور ایک دفعہ ۳۹۲ ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ عارضی پریسیڈنٹ کے انتخاب تک موجودہ گورنر جنرل پریسیڈنٹ کے فرائض انجام دیں گے۔

ادھر آئین مرکزی اسمبلی میں منظور ہوا اور اُدھر ریاستوں کے ہر یونین کے راج پرمکھ نے اور نظام حیدرآباد نے یہ اعلان کردیا کہ وہ بھی اس آئین کو منظور کرتے ہیں اور اس کی تعمیل کا اقرار کرتے ہیں۔ اس طرح اب ریاستوں کے مجموعوں کی اور حیدرآباد کی قانونی حیثیت بالکل وہی ہوگئی جو انڈین یونین کے صوبوں کی ہے۔

آئین کی ایک دفعہ جو اسی وقت نافذ ہوگئی یہ ہے کہ نئے انتخابات تک موجودہ آئین ساز اسمبلی مرکزی پارلیمنٹ کے فرائض انجام دیتی رہے گی۔

کسانوں کا جلسہ

۵ مارچ کو لکھنؤ میں کسانوں کا جلسہ جو سوشلسٹ پارٹی کے اہتمام میں ہونے والا تھا پُرامن طریقے سے ہوگیا۔ کئی ہزار کسانوں کا منظم مجمع جس کے آگے آگے آچاریہ نریندر دیو ایک جیپ میں سوار اور پیچھے پیچھے چار ہاتھی سوشلسٹ پارٹی کے جھنڈوں سے آراستہ چلے جارہے تھے گومتی کے کنارے سے روانہ ہوکر شہر کی گلیوں میں سے ہوتا ہوا کونسل ہاؤس تک پہنچا اور وہاں سے امین آباد جاکر جلسے میں شریک ہوا۔ اس مظاہرے کا مقصد حکومت کی خاتمہ زمینداری کی موجودہ پالیسی کے خلاف احتجاج بتایا جاتا ہے۔ سوشلسٹ پارٹی کا مطالبہ یہ ہے کہ سارے صوبے میں زمینداری ایک دم سے بغیر زمینداروں کو معاوضہ دیے ہوئے ختم کردی جائے اور کسانوں کو بغیر لگان میں اضافہ کئے ہوئے زمین کی ملکیت کے حقوق حاصل ہوجائیں۔ قاعدے سے تو ایسے مطالبوں کی تائید سارے صوبے کے دیہات میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہونی چاہیے تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر کسان حکومت کی عملی مشکلات کو سمجھتے ہیں، اور اس پر دباؤ ڈالنا نہیں چاہتے، پھر بھی حکومت کو اس مظاہرے سے یہ سبق لے کر اپنی پالیسی میں ایسی ترمیمیں کرنی چاہئیں کہ خاتمہ زمینداری کی حد سے زیادہ سست رفتار جو خود زمینداروں خصوصاً چھوٹے چھوٹے زمینداروں کے لئے سوہانِ روح بنی ہوئی ہے تیز ہوجائے۔

دو جواں ہمت بوڑھے

پچھلے ہفتے صدر کانگرس ڈاکٹر پٹابھی سیتارامیہ کی ستر سالہ اور ہریجن سیوک سنگھ کے روحِ رواں شری ٹھکر بابا کی اسّی سالہ سالگرہ دلّی میں منائی گئی۔

ڈاکٹر سیتارامیہ آزادی کی فوج کے ان سپہ سالاروں میں ہیں جنھوں نے نہ صرف اپنے وطن اندھرا میں بلکہ ہندوستانی ریاستوں میں تحریکِ آزادی کا جھنڈا سنبھالنے میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ...لڑائی جنگ کے بغیر چپکے چپکے بہت سے مورچے سر کئے ہیں نہ صرف اپنے وطن اندھرا دیس میں بلکہ ہندوستانی ریاستوں میں تحریکِ آزادی کا جھنڈا سنبھالنے میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔

شری اے۔ وی۔ ٹھکر جو عام طور پر ٹھکر بابا کے نام سے مشہور ہیں ایک دوسری جنگِ آزادی کے ہیرو ہیں جو ہریجنوں کے سماج میں برابر کا حصہ دلانے کے لئے خود اپنے ملک کی قدامت پسندی اور تاریک خیالی کے خلاف لڑی گئی۔

خدا ان جواں ہمت بوڑھوں کی عمر اور حوصلوں میں برکت دے۔

باہر کی دنیا

مان نہ مان......

برطانوی دارالعوام میں پچھلے دنوں بیرونی مسائل پر جو مباحثہ ہوا ہے اس نے ایک بار پھر چین کی کمیونسٹ حکومت کے ماننے جانے کے سوال کو بحث کا موضوع بنادیا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ایسا معلوم ہونے لگا تھا کہ مغربی یورپ کی حکومتیں اسے ناگزیر مصیبت سمجھتے ہوئے بھی چین کی نئی حکومت کو تسلیم کرلیں گی۔ برطانیہ کے متعلق تو سبھی کا خیال تھا کہ چینی حکومت کو تسلیم کرنے میں اس کی طرف سے دیر نہ ہوگی۔ چنانچہ کچھ عرصہ پہلے ان سطروں میں یہ پیشین گوئی کی گئی تھی کہ اپنے تجارتی مفاد کے پیش نظر برطانوی حکومت یہ کڑوا گھونٹ جلدی پی لینے پر آمادہ ہوجائے گی۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ برطانیہ کے کم و بیش سبھی سیاسی حلقوں کی رائے اس کی حمایت میں ہے، لیکن امریکہ کی مرضی ابھی یہ نہیں تھی۔ امریکہ کے سکریٹری آف اسٹیٹ کا اپنا رجحان یہی معلوم ہوتا ہے کہ چینی حکومت کو تسلیم کرلیا جائے لیکن امریکہ میں ابھی ایسے لوگوں کی خاصی بڑی تعداد ہے جو اس موہوم امید کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں کہ شاید چین کی قسمت پر پھر چیانگ کا قابو ہوسکے، اور یہ لوگ وہ ہیں جن کا بہت اثر ہے۔ اُن کی مرضی کے خلاف کوئی بات آسانی سے نہیں کی جاسکتی۔ چنانچہ برطانیہ کی قطعاً آزاد حکومت کو بھی ان کے ابرو کے اشاروں کی وجہ سے رک جانا پڑا ہے لیکن اس فیصلے پر عمل کرنے میں دیر ہوسکتی ہے، اس سے بچا نہیں جاسکتا۔ اس سلسلے میں ایک بہت اہم بات یہ ہے کہ برطانوی ماہرین کی جو کانفرنس ابھی کچھ دن ہوئے سنگاپور میں ہوئی تھی اس نے بھی چینی کمیونسٹ حکومت کے تسلیم کرلینے کا مشورہ دیا ہے۔ مشرق بعید میں فرانسیسی عہدہ داروں نے البتہ اس کے خلاف مشورہ دیا ہے انھیں اس کا اندیشہ ہوگا کہ اس طرح چینی کمیونسٹوں کا اثر شاید ہند چین میں زیادہ تیزی سے پھیل جائے۔ ایک بات جو غیر جانب دار خارجی سیاست کے دعووں کے پیش نظر بالکل سمجھ میں نہیں آتی یہ ہے کہ ہندوستان نے اپنے پڑوس کی نئی حکومت کو تسلیم کرنے میں اتنی دیر لگائی۔

مہاجن کا دباؤ

پچھلے دنوں برطانوی دارالعوام نے فیصلہ کیا ہے کہ لوہے اور فولاد کی صنعت کو قومی ملکیت کے تحت لانے کے سوال کو ملتوی کردیا جائے۔ یہ بات تو بظاہر برطانیہ کی اندرونی سیاست سے تعلق رکھتی ہے جس سے ان کالموں میں بحث نہیں کی جاتی ہے۔ لیکن اس مسئلے کا ایک پہلو ایسا بھی ہے جو ایک بین الاقوامی اہمیت رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ فیصلہ امریکہ کے دباؤ کا نتیجہ ہے۔ سوشلزم پر تقریباً ایک سال پہلے ایک امریکی مصنف کی ایک بڑی اچھی کتاب شائع ہوئی تھی۔ اس میں پیشین گوئی کی گئی تھی کہ برطانیہ کی سوشلسٹ حکومت گلابی اشتراکیت سے آگے نہیں بڑھ پائے گی اور اس کی ایک بڑی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ امریکہ سوشلزم کو برداشت نہیں کرسکتا۔ یہ پیشین گوئی بالکل صحیح ثابت ہوتی ہے۔ اس سے ہم بھی ایک نتیجہ نکال سکتے ہیں۔ شاید ہمارے ملک کے پیٹ بھرے طبقے کو یہ نتیجہ بالکل پسند نہیں آئے گا، لیکن ہندوستان کے عوام کی بہبود کے پیش نظر اس نتیجہ پر زیادہ سے زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے اور وہ سبق یہ ہے کہ ہم نے امریکہ سے قرض لیا تو صرف انھی کرنے کی اجازت دے گی جو امریکہ کو پسند آئے (مثلاً یہ کہ ہم صنعتوں کی توسیع میں زیادہ جلدی نہ کریں۔ امریکہ سے اس کو منگوائیں، وغیرہ وغیرہ)

انڈونیشیا کی آزادی

خبر آئی ہے کہ انڈونیشیا کی سیدرلسی پرنسپل کونسل نے ہیگ کے سمجھوتے کو تسلیم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان جماعتوں میں مسلم پارٹی بھی شامل ہے۔ مسلم پارٹی کی سیاست کا معاشی پہلو کیا ہے، کیا ہے، اس معاملے پر زیادہ روشنی ڈالنا ممکن نہیں ہے۔ مختصر لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ پارٹی کچھ زیادہ ترقی پسند نہیں ہے۔ سوشلسٹوں نے اس سمجھوتے کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے گو وہ اس کی مخالفت بھی نہیں کریں گے۔ غیر جانبداری کا یہ رویہ بھی ملکوں میں سوشلسٹ پارٹیوں کا طرۂ امتیاز بن کر رہ گیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ سوشلسٹ عام طور پر قطعی فیصلہ نہ کرپانے کے لئے بدنام ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۸ پر)

بزمِ بے تکلف

یوں تو دلی نے اس تین چار برس میں طرح طرح کے کھیل تماشے دیکھے۔ بڑے بڑے دنگل ہوتے، نئے نئے سرکس آئے، لندن کی بڑی پنچایت کی کمیٹی منڈلی آئی، ذرہ بھروں کا طائفہ آیا، میاں ماؤنٹ بیٹن آئے، بی آزادی آئیں مگر ان سب چیزوں کا لطف ہمارے لیڈروں نے اٹھایا۔ ہمارے پلّے آر و دھاڑ کے سوا کچھ بھی نہ پڑا، ہاں جب کامن ویلتھ سے جو کا روپ سے بھی آگے ہے کرکٹ کے کھلاڑی آئے تو سارے شہر میں ہل چل مچ گئی، ہر طرف چرچا ہونے لگا کہ لو میاں اب مزا آئے گا، گوروں اور کالوں میں سرِ میدان دو دو ہاتھ ہوں گے اور معلوم ہو جائے گا کہ کون کتنے پانی میں ہے۔

پالی کے دن ساری دلی کھیل کے میدان کی طرف کھنچی چلی جا رہی تھی ہم جیسے لوگ بھی جو کرکٹ میں بالکل کورے ہیں کھیل کے شوق میں جا پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ میدان کے بیچ میں تین تین میخیں آمنے سامنے گڑی ہیں، دونوں طرف میخوں کے سامنے ایک ایک گورا ہاتھ میں تھاپی لئے کھڑا ہے اور ان دونوں کے آس پاس گیارہ کلے صاحب سارے میدان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اب ہم حیران کہ یہ میخیں کیسی ہیں اور دو اور گیارہ میں مقابلہ کیسے ہو سکتا ہے جی میں آیا کہ کسی سے پوچھیں، مگر پھر سوچا لوگ ہنسیں گے کہ کرکٹ کی الف، بے تک تو جانتے نہیں اور کھیل دیکھنے کو آموجود ہوئے۔ لہٰذا دیر تک چپ چاپ دیکھتے رہیں تو معلوم ہو جائے گا کہ کھیل کا سر کدھر ہے اور دُم کدھر ہے۔ آدمی ہم سمجھدار ٹھیرے۔ بہر حال تھوڑی دیر میں تاڑ ہی گئے۔ بات یہ ہے کہ ایک طرف کے دو آدمی چوڑی چوڑی تھاپیوں سے مسلح ہوتے ہیں اور دوسری طرف کے گیارہ نہتے رہتے ہیں۔ ان گیارہ میں سے دو باری باری سے ان تھاپی والوں کو گیند کھینچ کر مارتے ہیں کہ ان کی ٹانگ یا کمر یا سر توڑ دیں۔ گیند باجب گیند پھینکتا ہے تو اس کے پاس ایک ڈاکٹر سفید جھاڑ جھولا پہنے زخمیوں کی مرہم پٹی کے لئے تیار رہتا ہے۔ سامنے کا تھاپی والا، تھاپی سے فقط اپنا بچاؤ نہیں کرتا بلکہ گیارہ نہتوں میں سے کسی کا نشانہ باندھ کر گیند کو اس زور سے مارتا ہے کہ لگ جائے تو بس مزہ ہی آجائے نہتا جس کی طرف گیند جاتی ہے کوشش کرتا ہے کہ صاف بچ جائے اور اگر یہ نہ ہو سکا تو آنکھ ناک بچا کر گیند کو ہاتھ سے روک لیتا ہے۔ اتنی دیر میں دونوں تھاپی والے ادھر سے اُدھر دوڑتے رہتے ہیں۔ کھیل میں بہت سی باریکیاں ہیں جو آپ کو پھر کبھی بتائیں گے۔ اس وقت تو ہم نے موٹی موٹی باتیں بیان کر دی ہیں۔

اب اُس دن کے کھیل کا حال سنئے ہماری طرف کا ہر گیند باز گورے کی کبھی داہنی ٹانگ کبھی بائیں ٹانگ، کبھی کولھے، کبھی گردن کو تاک تاک کر گیند پھینک رہا تھا بڑی ہوشیاری کے ساتھ کہ کہیں میخوں میں نہ لگ جائے نہیں تو گورا سر پیر سلامت لے کر پالے سے چلا جائے گا۔ اُدھر تھاپی والا گورا سارے بدن کا زور لگا کر گیند کو تھاپی سے مار کر ہمارے ہندوستانیوں کے سینے یا سر پر رسید کرنا چاہتا تھا اور ہمارے بھائیوں کی کوشش یہ تھی کہ انھیں گیند کی ہوا بھی نہ لگنے پائے۔ اس میں شک نہیں کہ گورے تھے بڑے چپیت۔ کبھی بھدے سے چوٹ کھا جائیں تو اور بات ہے نہیں تو جھٹ پٹ پینترا بدل کر ہمارے وار ہیں پلٹ دیتے تھے۔ پر ہمارے کھلاڑیوں کا کیا کہنا۔ بڑی پھرتی سے گیند کو جھکائی دے کر بے داغ بچ جاتے تھے اور وہ بھناتی ہوئی پلّے کے باہر چلی جاتی تھی۔ بہت کم ایسا ہوا کہ گیند کو ہاتھ سے روکنے کی نوبت آئی ہو۔ اب رہی چوٹ تو ایک کے سوا کسی کا بال تک بیکا نہیں ہوا۔ غرض گوروں کا گیند کو تھاپیوں سے مارتے مارتے اور میخوں کے درمیان ادھر سے اُدھر دوڑتے دوڑتے دم نکل گیا۔ فقط دو بار ہمارے گیندیوں سے چوک ہو گئی۔ گیند ان کے ہاتھوں سے چھوٹ کر میخوں میں جا لگی اور دو گورے جان بچا کر میدان سے رفو چکر ہو گئے باقی دو کو ہمارے نہتے کھلاڑیوں نے ایسا رگیدا، ایسا رگیدا کہ پناہ مانگنے لگے۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو سینکڑوں بار انھیں میخوں سے میخوں تک ڈبل مارچ ویسل کرنی پڑی سورج ڈوبنے لگا تو ان کی جان چھوٹی، کھیل ختم ہوا، ہم خوش خوش گھر آئے کہ چلیے میاں آج کرکٹ بھی دیکھ لیا۔

سوزِ ناتمام

سروش عسکری طباطبائی

جذب ہے خام ابھی، سوز ہے ناکام ابھی
کامیابی کا محبت میں نہ لے نام ابھی

نذرِ نومیدیٔ جاوید ہوئی جاتی ہے
دل میں باقی تھی جو اک حسرتِ ناکام ابھی

نگہِ شوق تو ہے صرف نظارہ اے دوست
جانِ مشتاق ہے حسرت کشِ پیغام ابھی

تو جو چاہے تو نگاہِ غلط انداز سے لے
کارِ صد شیشہ و صد ساغر و صد جام ابھی

یہ جو اک نغمۂ رنگیں ہے فضا میں محفوظ
جب رہا تھا کوئی دیوانہ ترا نام ابھی

لوٹ لی جھوٹی تسلی سے کسی نے وہ بھی
تھی تڑپنے میں جو اک لذتِ بے نام ابھی

عشق منزل سے بھی کوسوں نکل آیا آگے
عقل گمراہ ہے سرگشتۂ اوہام ابھی

کامیابی کا نہ مفہوم بدل دوں تو سہی
دلِ ناکام سے لینا ہے مجھے کام ابھی

خشک ہے سیلِ مصائب تنک آبی سے سروش
اور مرا ذوق ہے لب تشنۂ آلام ابھی!

غزل

باقر مہدی

جہاں رنج و محن میں رہ کر جسے کسی کی خبر نہیں ہے
ہزار انساں بنا پھرے وہ مگر کبھی وہ بشر نہیں ہے

بدل گیا ہے نظامِ الفت جنوں کا دامن رفو ہوا ہے
مگر فریبِ خرد وہی ہے دلوں پہ کچھ بھی اثر نہیں ہے

وہی پرانے ہیں عہد و پیماں وہی ہیں سوزِ دروں کے عنواں
جو زندگی کو سنوار سکتی ابھی تری وہ نظر نہیں ہے

وہ شورِ طوفاں ہے تیرگی میں پناہ مشکل ہے روشنی میں
یہ کس کی کشتی ہے ڈوبنے کو کہ نا خدا کو خبر نہیں ہے

نہ جوشِ آوارگی رہا ہے نہ شوقِ منزل ہے دل میں باقی
ہیں ڈگمگائے ہوئے قدم یوں کہ جیسے ذوقِ سفر نہیں ہے

ہزار ماہ و نجوم چمکے حسین صبحیں بھی آئیں لیکن
غمِ محبت کو جو مٹا دے ابھی وہ شام و سحر نہیں ہے

بچے اور ان کی جبلت

(۲)

سید محمد حسنین

۴۔ غصہ

غصہ کا جذبہ دوسرے جذبات کی بہ نسبت بچے میں زیادہ تیز ہوا کرتا ہے۔ اس کی تیزی یا زیادتی بچے کے لئے بڑی خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ خوف کی طرح غصہ سے بھی اعصاب پر شدید اثر پڑتا ہے اور اس کی وجہ سے بچہ ضدی، تنک مزاج، چڑچڑا، جھگڑالو اور فسادی ہوجاتا ہے۔

بچے کی خودسری اور تجسس اسے کسی اقدام پر آمادہ کرتی ہے۔ اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اس میں کامیابی و لطف حاصل کرے۔ بات اس کے منشا کے بموجب اور نتیجہ اس کے مرضی کے مطابق ہو۔ ناکامیابی اسے صدمہ پہنچاتی ہے اور مخالفت اسے خفا کردیتی ہے۔ غصہ کسی اقدام کی دوسروں پر روکنا ہوا کرتا ہے کبھی نتیجے کی ناکامی بچے کو غصہ دلاتی ہے، اور کبھی نتیجے سے پہلے کوئی غیر متوقع مداخلت اسے برہم کردیتی ہے۔

چھوٹے بچے اپنے کاموں میں دوسروں کی مداخلت یا مخالفت سے چڑ جاتے ہیں۔ دودھ پلانے میں ماں کا بچے کے منہ سے دفعتاً پستان چھین لینا فوراً بچے کے چہرے پر خفگی کے علامات پیدا کردیتا ہے، کھیلتے یا کھاتے ہوئے کسی کا رکابی یا کھلونے کو ایک دم سے اٹھا لینا بچے کو برہم کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔ بچے کو چڑانا ایک طرح سے ان کی مخالفت ہوتی ہے جن سے ان کو جلد غصہ آجاتا ہے۔

بڑے بچوں میں غصہ کا جذبہ اس قدر جلد نہیں بھڑکتا ان کی تھوڑی بہت سمجھ بوجھ انہیں صبر اور تسکین کی طاقت بھی عطا کردیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پانچ چھ برس کے بچے ان باتوں پر خفا نہیں ہوتے جن پر دو تین برس کے بچوں کو غصہ آجاتا ہے۔

ماں کو غصہ ور بچے کے ساتھ بہت ہی [illegible] سے برتاؤ کرنا چاہئے۔ بچے کے غصہ پر ماں کی خفگی جلتی پر تیل کا کام کرتی ہے۔ جب بچے کو غصہ آئے تو ماں کو چاہئے کہ پہلے وہ غصہ کی وجہ معلوم کرے اور سمجھا بجھا کر اسے رفع کرنے کی کوشش کرے، جب وہ دیکھے کہ اس کی نرم اور معقول گفتگو غصہ کے اثر کو دور کرنے میں کامیاب نہیں ہوتی تو اسے بچے سے فوراً اپنی توجہ ہٹا لینی چاہئے۔ اس سے بات نہ کرے، اسے پیار نہ کرے۔ اسے دیکھ کر منہ پھیرے ماں کی بے اعتنائی کو چھوٹا سا بچہ بھی فوراً محسوس کرنے لگتا اور اس کا غصہ فوراً ٹھنڈا پڑ جائے گا۔

بچے کا غصہ بالخصوص اس کی تیز مزاجی ماں کے لئے اکثر بڑی تکلیف دہ ہوجاتی ہے [illegible] سے نہیں کبھی اسی طرح بچے کے تیز غصہ کو ماں کی خفگی ٹھنڈا نہیں کرسکتی۔ اس وقت ڈانٹنا، جھڑکنا یا مارنا پیٹنا ہرگز مفید ثابت نہ ہوگا۔ سزا دینے کی یہ روش نہایت مہلک ہے۔ مارپیٹ سے بچے کو صرف جسمانی تکلیف پہنچتی ہے۔ درحقیقت اسے کوئی سزا نہیں ملتی یعنی عبرت نہیں ہوتی۔ بلکہ ماں کی برافروختگی سے بچے کے نفس کے شدید طور پر مجروح ہوجانے کا بہت امکان رہتا ہے۔

۵۔ ضد

چھوٹے بچوں میں غصہ کا دیر تک رہنا عموماً ضد یا ہٹ کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ ضد ان میں عموماً غصہ کا ایک نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ کم دیکھنے میں آتا ہے کہ کوئی بچہ غصہ ظاہر کئے بغیر ضد یا ہٹ شروع کردے۔ ہاں اور بڑی عمر میں یہ کیفیت ممکن ہے۔ بڑی عمر کے لوگوں میں ضد ان کی شخصیت کا ایک قابل قدر عنصر ہوتی ہے۔ ان کی ثابت قدمی، اصول پروری یا استقامت اسی ضد کا پرتو ہوا کرتی ہے۔ وہ جس بات کو اپنے نزدیک صحیح سمجھتے ہیں یا جس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں اس سے پیچھے نہیں ہٹتے۔

بچے کی لاغری، جسمانی کمزوری یا خوراک کی کمی بھی ضد یا ہٹ کا سبب ہوا کرتی ہے، تندرست اور صحت مند بچوں میں یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ ایسے بچوں میں ضد ان کے جذبہ تجسس یا خود [illegible] فعل میں رکاوٹ پڑنے سے پیدا ہوتی ہے بچہ اپنی بڑی بہن کو ہوبہو سکنا کھیلتے دیکھتا ہے تجسس اور خود [illegible] اسے اس فعل کی طرف رجوع کرتی ہے اس کی تمنا ہوتی ہے کہ بڑی آپا کی طرح وہ خود بھی سنا کھیلے۔ [illegible] سے [illegible] وہ [illegible] نہیں دیتی۔ وہ اصرار کرتا ہے لیکن جواب [illegible] صاف انکار ہوتا [illegible] اس کی تکرار ضد کا [illegible] اختیار کرلیتی ہے۔ ممکن ہے یہ ضد تیز ہوکر بدکلامی، بدتمیزی یا کسی دوسری صورت ہی کا باعث بنا [illegible]۔

ماں کو چاہئے کہ [illegible] فوراً اس کی طرف رخ کرے اور ان اسباب کو دور کرے یا ہوشیاری اور چالاکی سے بچے کی توجہ کسی دوسری طرف مبذول کردے۔ ضد کی حالت میں ماں کا بچے کو [illegible] تم ایسا کرو تو میں یہ دوں گی [illegible] برتاؤ بہت مضر کر [illegible] اگر تم ضد کرنے لگتے تو میں تمہیں چاکلیٹ نہ دوں گی ماں کا بچے کو لالچ دلانا۔ بس اب چپ ہوجاؤ میں تمہیں فوراً میٹھے میٹھے چاکلیٹ دوں گی [illegible] نہیں دوں گی اس وقت تو ضد میں بچے کو [illegible] میں کامیابی ہوجاتی ہے، اور ماں اس [illegible] آسانی سنبھال لیتی ہے۔ مگر آگے چل کر یہ طریقہ بچے کے حق میں مضر ثابت ہوتا ہے۔ اولاً بچے کو ہر ضد پر کامیابی کے طور پر اسے کوئی عمدہ نفیس شے مل جایا کرتی ہے اور وہ اپنی ضد کی قدر و قیمت سے اچھی طرح واقف ہوجاتا ہے۔ اگر وعدہ کرلینے کے بعد پورا نہ کیا گیا تو ماں پر اس کا اعتماد ختم ہوجاتا ہے اور ایسا کرنا بچے کی نگاہ میں اسے جھوٹا بنا دیتا ہے۔

(باقی آئندہ)

باہر کی دنیا

بسلسلہ صفحہ ۴

انڈونیشیا کی نئی حکومت اگلے مہینے میں جنم لے گی۔ خبر آئی ہے امریکہ نے انڈونیشیا کو براہ راست مدد دینے کا فیصلہ کیا ہے مغربی یورپ کے بعض حلقوں میں انڈونیشیا سے ایک امید باندھی جارہی ہے۔ یہ امید یہ ہے کہ انڈونیشیا کی قومی حکومت کمیونزم کے خلاف ایک محاذ بنانے پر تیار ہوجائے گی۔ انڈونیشیا کی ریپبلکن پارٹی تنہا خود شاید اس قسم کی امید پیدا کرسکتی، لیکن نئے سمجھوتے کی رو سے کچھ اور پارٹیاں بھی حکومت میں شامل ہوں گی اور ان کے آنے سے اینگلو سیکسن سیاست دانوں کے چہرے پر رونق سی دکھائی دینے لگی ہے۔

(ا، س)

لہو پکارے گا آستیں کا

(بقیہ بسلسلہ)

سے وہ آگ جو وہاں جل رہی تھی، اس کے کپڑوں میں لگ گئی تھی آگ بجھانے کی بہت کوشش کی گئی، مگر کامیابی نہیں ہوئی، صفائی کے گواہوں کی دلیلیں اور ایک بہت مشہور بیرسٹر کی جرح —— لوگوں کو شبہ ہوتا جاتا تھا کہ سیٹھ جی اور اس کے ساتھی صاف چھوٹ جائیں گے۔

گوبند جی، نیم جی، اور سیٹھ جی کے چہروں پر اطمینان کی جھلک نظر آنے لگی تھی —— وہ سوچ رہے تھے، دل روپے میں سب بل ہے، وہ سچ کو جھوٹ سفید کو سیاہ بنا سکتا ہے —— وہ سب کچھ خرید سکتا ہے سب کچھ ——۔

اچانک سیٹھ کا چہرہ بھیانک حد تک سیاہ پڑ گیا اور وہ تھر تھر کانپنے لگا۔

گواہوں کے کٹہرے میں ایک عورت کھڑی رانی کے قتل کی شہادت دے رہی تھی —— یہ سیٹھانی تھی۔

اور اپنی تنگ اور تاریک کوٹھری میں رانی کی ماں چپ چاپ بے حس و حرکت پڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دھوئیں سے سیاہ چھت کو تکے جارہی تھی —— تکے جارہی تھی —— جانے اسے وہاں کیا نظر آرہا تھا ——

لہو پکارے گا آستیں کا

صالحہ عابد حسین

"نہیں نہیں ——— میں ایسا نہ کرنے دوں گی"
"تو بچے کی جان ہاتھ سے دھوئے گی"
"اتنا بڑا پاپ؟ ایسا ظلم! نہیں مجھ سے نہ ہوگا۔ ——— کچھ اور کرو ——— کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ وہ جو تیری دشا نکلی ہے۔ اس کی سونئیاں لگواؤ ——— دان پن کرو ———"

"وہ سب کر چکے ——— سب بیکار ——— ان سے للو کو کچھ فائدہ نہیں ہوتا ——— مجھے تو پورا وشواش ہے کہ گورو جی مہاراج کی بتائی ہوئی بھینٹ دینے میں ہمارا للو اچھا ہو جائے گا ——— ."

"اُف ——— ہائے ——— اتنا بڑا پاپ ———"

"کیا پاپ پاپ لگا رکھا ہے ——— پاپ کیا ہوتا ہے؟ اور کون نہیں کرتا اس دنیا میں پاپ۔ سارا جگت ہی پاپی ہے ——— جو کھل گیا وہ پاپ ہے جو چھپا رہے اُسے پاپ کون کہتا ہے؟"

"آخر پرماتما کو بھی ایک دن منہ دکھانا ہے ——— دنیا سے چھپا لو ——— پر بھگوان تو سب کچھ جانتا ہے"

"سب بتا دیا ہے گورو جی مہاراج نے مجھے ——— ہزاروں روپے دان کر دوں گا ——— سارا پاپ دُھل جائے گا ———"

"نہیں نہیں اتنا بڑا اپرادھ کسی دان کسی پن سے نہیں دُھل سکتا ——— تمھیں بھگوان کا ڈر نہیں تو اس کام کے نتیجے ہی سے ڈرو ——— اگر کھل گیا تو ———"

"کھل کیسے جائے گا ——— مذاق ہے ——— روپے کی تھیلیوں کا منہ کھول دوں گا ——— سارے بھیدیوں اور گواہوں کو خرید لوں گا ——— تو جانتی نہیں ——— روپے میں سب بل ہے ——— ایک دفعہ کو بھگوان بھی اس کے آگے جھک جائے ———"

"کیسی ناستکوں کی سی باتیں کرتے ہو ———"

"اے بھگوان انھیں شما کر ——— انھیں سمجھ دے ——— ان کے دل میں دیا دھرم جگا ——— بھگوان ان کے ادھرم کرموں اور ان باتوں کا بدلہ میرے بچے ——— میرے اکلوتے لاڈلے ——— للو سے نہ لیجو ——— بھگوان میرے بچے کو بچا لے ———"

"جب تک بھینٹ نہ دے گی بچہ اچھا نہ ہوگا ——— دیوی کی بھینٹ چڑھانا ہی ہوگی"

"تو میری بھینٹ دے دو ——— میرے بلیدان سے کیا دیوی خوش نہ ہوگی؟"

"تیری بھینٹ سے کام نہیں چلے گا ———"

"ہائے تمھارا دل کیسا کٹھور ہے ——— ارے بچہ بچہ سب کا برابر ——— کون بھلا اپنے بچے کو ———"

"ارے کسی مفلس قلاش کا بچہ لے لوں گا ——— منہ مانگی قیمت دوں گا منہ مانگی ———"

"نہیں تم نہیں جانتے ——— کوئی ماں دنیا میں ایسے کٹھور دل کی ——— ایسی ظالم ——— بے درد نہیں ہو سکتی ——— ہر ماں کو اپنا بچہ اتنا ہی پیارا ہوتا ہے، جتنا مجھے اپنا لال ———"

"تو نہیں جانتی ——— روپیہ ——— روپیہ میں تو ان بھکڑ گدڑوں کی جان ہوتی ہے جان ——— اور روپے سے کیا نہیں خریدا جا سکتا؟ دھرم ——— انصاف ——— بیوی ——— بچے ———"

"تمھارا دل روپے نے پتھر کا بنا دیا ہے ——— اور دوسروں کو بھی اپنا جیسا سمجھتے ہو ——— میں جانتی ہوں ——— دنیا میں کوئی ایسا نہیں ہوگا جو روپے کے لالچ میں اپنے بچے کی بھینٹ چڑھا دے ———"

"نہ سہی ——— ہم چال سے، فریب سے، کسی طرح کیا بچہ حاصل کریں گے ——— ہمارے بچے کی جان تو ہر حال بچنی چاہیے"

"پرماتما کے سامنے پرارتھنا کرو ——— سچے دل سے اس کے آگے سر جھکاؤ ——— وہی تمھارے بچے کو اچھا کر سکتا ہے ———"

"اُنھ ——— پرماتما ——— بھگوان ——— جاہل ——— عورت"

"ارے کسی غریب ماں کی کوکھ میں آگ نہ لگاؤ ——— اس کی آہ میں تمھارا سب کچھ بھسم ہو جائے گا ———"

"مورکھ عورت ——— نادان ——— ہمارا بچہ سیٹھ کا بچہ ہے، لاکھوں کا مالک ——— اس کی جان بچنا ہی چاہیے ——— اور لیٹرے مکوڑوں کی طرح پیدا ہوئے ہوئے گندے ——— بدصورت ——— بچے ——— یوں بھی تو کم بخت مرا ہی کرتے ہیں فاقوں سے، بیماریوں سے، حادثوں سے ——— ان کا کیا ہے ——— کروڑوں میں سے ایک کم ہی ہو گیا تو کون سا غضب ہو جائے گا ———"

"میں یہ پاپ اپنے سر نہ لوں گی ——— تم نے کچھ کیا تو میں تمھارا ساتھ نہ دوں گی ——— نہ دوں گی"

"کہے دیتا ہوں کہ اگر تو نے زبان کھولی یا میرے کام میں روڑا اٹکایا تو پہلے تیری ہی جان میرے ہاتھوں جائے گی"

"اُف ——— اے بھگوان ——— میں کیسے سمجھاؤں انھیں ——— " اور ماں نے اپنے بیمار بچے کے پلنگ کی پٹی پر سر دے مارا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی

صدیوں کی غلامی میں جکڑی، مردوں کے پنجے میں پھنسی مجبور بے بس، بے ہمت عورت، جو اپنے ایمان، دھرم اور انسانیت کو بچانے کے لئے بھی پتی دیوتا سے بغاوت نہ کر سکتی تھی۔

اور سیٹھ جی مہاراج ایک ہاتھ سے اپنی میلی دھوتی کھسکا کر گنبد نما توند کو جلدی جلدی سہلا رہے تھے اور دوسرے ہاتھ سے اپنی کھڑی ہوئی مونچھوں کے سخت بال غصے میں مروڑ رہے تھے۔ ان کے دل کی طرح ان کے چہرے کا رنگ بھی سیاہ تھا، اور آنکھیں کثرتِ شراب نوشی کے سبب لال تھیں اور جسم آوارگی اور پرخوری کے باعث تھل تھل کرتا تھا ——— وہ تیز تیز کمرے میں ٹہل رہے تھے اور ان کے بھاری قدموں سے جیسے دھرتی کانپ کانپ اٹھتی تھی۔

سیٹھ کے منہ چڑھے چہیتے منیم نے جو سیٹھ کا داہنا بازو۔ اس کی کالی کمائی میں برابر کا شریک، بے ایمانی اور آوارگی کا ساتھی اور اس سے بڑھ کر کائیاں تھا۔ کمرے کے دروازے سے جھانکا اور اپنی چھوٹی چھوٹی مکار آنکھیں جھپک کر غور سے سیٹھ کو دیکھا اور اشارے سے باہر بلا کر کہا۔ "سیٹھ جی ——— اتنے پریشان کیوں ہوتے ہو ——— میں سب انتظام کر لوں گا"

"مگر ——— مگر یہ کم بخت سیٹھانی! جانے اس پہ کیا بھوت سوار ہے، مانتی ہی نہیں"

"اجی آپ ہی رو دھو کر چپ ہو جائیں گی"

"اس نے غصے میں کہیں سے کہہ دیا ——— پولیس میں خبر کر دی تو ———؟"

"کیا باتیں کرتے ہو سیٹھ جی! وہ کیسی ہی دھرماتما سہی، پتی اور پتر کا پریم اُسے جکڑے رہے گا ——— اور پھر بھلا ہماری دلو ——— گھر ——— چار دیواری میں قید استریاں اتنی ہمت کر سکتی ہیں، تم اطمینان رکھو سیٹھ جی میں سب سنبھال لوں گا"

"تم جانو۔ پر دیکھو معاملہ سب چوکس ہو ——— کوئی چول ڈھیلی رہ گئی تو میری تمھاری دونوں کی جان کا خطرہ ہے"

"مجھے سکھلاتے ہو سیٹھ جی! ہم سے بڑھ کر ہوشیار اور کائیاں کون ہوگا بھلا؟ فکر نہ کرو ——— سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اچھا اب روپیہ نکالو ——— روپیہ۔"

"کتنا بس" "یہی کوئی دس ہزار" "دس ہزار ——— ارے باپ رے ——— اتنا روپیہ کیا ہوگا؟"

"آپ نے آدمی کی جان اتنی سستی سمجھ رکھی ہے مہاراج اور پھر تو صرف بھیدیوں کا منہ بند کرنے ہی میں خرچ ہو جائے گا"

"مگر ——— یہ تو بہت ہے ——— میں لٹ جاؤں گا"

"سیٹھ جی کس سے چھپاتے ہو؟ آخر یہ لاکھوں روپیہ تجوری میں بند آخر یہ کیا ہوں گے؟ ایک بچہ تو دونوں ہاتھ سے جا رہا ہے ——— کسی دن انکم ٹیکس والوں کو پتہ لگ گیا تو ..." سیٹھ جی ڈر کے مارے اور دھیان سے بیٹھ گئے۔ "اچھا، اچھا ...... پر یہ دھیان رکھنا ——— بچے کی عمر ——— بس اپنے ——— جگو جتنی ہی ہو ———"

"ہاں، ہاں ——— سب دیکھ لیا جائے گا ——— شام

سقراط

ضیاء الفاروقی

سقراط ایک فلسفی تھا، معلم اخلاق تھا اور ایک مذہبی آدمی تھا۔ لیکن وہ رسم و رواج اور روایات کا دشمن تھا ...... وہ سڑکوں پر، پارکوں میں، تھیٹروں میں جوانوں سے ملتا اور ان کو زندگی کے راز بتاتا۔ نیکی و بدی کی ماہیتوں پر روشنی ڈالتا اور اس طرح نوجوانوں میں ایک فلسفی کا ذہن پیدا کرنے کی کوشش کرتا اس نے نوجوانوں کی موجودگی میں اس زمانے کے بڑے بڑے فلسفیوں کی زندگیاں ادھیڑ کر رکھ دیں اور بتایا کہ ظاہر و باطن میں کتنا فرق ہوتا ہے ....

آج سے تقریباً چوبیس سو سال پہلے کی بات ہے یونان کے شہر ایتھنس میں ایک بت تراش رہتا تھا، اس کی بیوی دائی کا کام کرتی تھی۔ اس دائی کے بطن سے ۴۶۹ ق۔م میں سقراط پیدا ہوا۔ والدین کو یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ لڑکا ان کی شہرت کا سبب بنے گا۔ یہ لڑکا بڑا ہوا اس نے اپنے زمانے کے مروجہ علوم کی تحصیل و تکمیل کی جنگ تماشی میں مہارت حاصل کی، وطن کی خدمت کی ایتھنس کی فوج میں ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے سپاہ گری کے امور انجام دیئے۔ رکن فرائض کی ذمہ داریوں کو سنبھالا اور آخر میں لامذہبی اور نوجوانوں کو خراب کرنے کے جھوٹے الزام میں زہر کا پیالہ پیا۔

تاریخ کا یہ ایک انوکھا پہلو ہے کہ صداقت کیش روحوں کو ہمیشہ مصائب و آلام کی تنگ گھاٹیوں سے گزرنا پڑا۔ ایسے لوگ زمانے کے ساتھ قدم نہیں اٹھا سکتے تھے انھوں نے ظلم سہے، مصیبتیں جھیلیں، گالیاں کھائیں، قید خانوں کو آباد کیا، پھانسی کے تختے پر چڑھے زہر کا پیالہ پیا۔ مگر سچائی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور عارضی آرام و راحت جھوٹی شہرت و عظمت کی خاطر انسانیت کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ نہیں لگایا، وہ ایسے طبائع لے کر آئے تھے کہ ان کے لئے زمانہ سازگار نہیں ہو سکتا تھا۔ بالآخر وہ زمانے کے اوپر سے گزر گئے

جلتے ہیم رساں کر بسازی بعالمے
یا ہمتے کہ از سر عالم تواں گذشت

سقراط بھی ان لوگوں میں سے تھا جو زمانہ اور حکومت کے ساتھ قدم نہیں اٹھا سکتے تھے، اس کا علم اس کی استقامت اور اس کی صداقت یہ سب کی سب تاریخ نے اپنے اوراق میں محفوظ کر لی ہیں۔ آج یونان کی پہاڑیاں اور ندیاں اپنے دامن میں آثار قدیمہ کی وہ بیش بہا یادگاریں لئے ہوئے ہیں جنھیں سقراط نے دیکھا تھا۔ جہاں اس نے فطرت کی رنگینیوں سے لطف اٹھایا تھا مگر ان یادگاروں کا سب سے زیادہ روشن پہلو وہ ہے جہاں اس نے انسانی فطرت کی نیرنگیوں اور اخلاقی قوت کی سحر نمائیوں کی تصویر کھینچی ہے، تاریخ اُسے بھلانا چاہے تو بھی نہیں بھلا سکتی ہے

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

جس زمانے کا یہ قصہ ہے، اس وقت یونان کا ہر شہر ایک ریاست ہوا کرتا تھا۔ شہر کے لوگ اپنی حکومت کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ یہ لوگ منتخب ہو کر شہر کے نظم و نسق کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیتے تھے۔ ایتھنس ایک بڑا اور مشہور شہر تھا، آج بھی یہ پورے یونان کی تخت گاہ ہے۔

سقراط ایک فلسفی تھا، معلم اخلاق تھا، اور ایک مذہبی آدمی تھا، لیکن وہ رسم و رواج اور روایات کا دشمن تھا، وہ ان دیوتاؤں کی پرستش نہیں کرتا تھا جو اہل ایتھنس کے خدا تھے، بلکہ ایک ایسی طاقت پر ایمان رکھتا تھا جو سب سے اعلیٰ، قادر مطلق اور پوشیدہ ہے یونان والے اُسے برداشت نہیں کر سکتے تھے وہ سڑکوں پر، پارکوں میں، تھیٹروں میں جوانوں سے ملتا اور اُن کی زندگی کے راز بتاتا۔ نیکی اور بدی کی ماہیتوں پر روشنی ڈالتا اور اس طرح نوجوانوں کے دماغوں میں ایک فلسفی کا ذہن پیدا کرنے کی کوشش کرتا۔ اس نے نوجوانوں کی موجودگی میں اس زمانے کے بڑے بڑے عالموں کا خاکہ اڑایا بڑے بڑے فلسفیوں کی زندگیاں اُدھیڑ کر رکھ دیں اور بتایا کہ ظاہر و باطن میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو اپنے آپ کو نیکیوں اور اچھائیوں کا مجموعہ سمجھتے تھے اور تمام لوگوں کو فریب میں مبتلا رکھتے تھے، اس کی جرح کے آگے نہ ٹھہر سکے۔ اس کا انداز گفتگو نرالا تھا۔ وہ اسٹیج پر آکر تقریریں نہیں کرتا تھا بلکہ بات چیت کا قائل تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی نوجوانوں میں بھی سوالات کرنے کی عادت ہو گئی۔ وہ سقراط کی باتیں سنتے اور گھر جا کر اسی کے انداز گفتگو کی نقل کرتے اور اس طرح اپنے بزرگوں اور ہم عصروں کو پریشان کرتے، وہ لوگ جو سقراط کی نکتہ چینی کی تاب نہیں لا سکتے تھے اس کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے اور انھوں نے اس پر لامذہبی اور جوانوں کو خراب کرنے کا الزام لگایا۔ حکومت نے بھی افترا پردازوں کا ساتھ دیا اور

اس طرح تاریخ کا وہ عظیم الشان مقدمہ وجود میں آیا۔ جو غیر فانی ہے اور جس کی یاد اب بھی صداقت کے علمبرداروں کے لئے حوصلہ افزا ہے۔ اس پر مقدمہ چلایا گیا اور عدالتی تحقیقات کے لئے اُسے جج کے سامنے آنا پڑا۔ وہ آیا اور اُس نے کہا۔

"ہم وطنو! میری عمر اس وقت ستر سال کی ہے میں اپنی زندگی میں پہلی بار عدالت میں لایا گیا ہوں۔ مجھے عدالتی آداب و روایات سے کوئی واقفیت نہیں ہے۔ اس لئے میری کوتاہیوں کو نظر انداز کر دینا۔ ہاں میرے الفاظ پر غور کرنا جو تمھیں سچائی اور صداقت کی تعلیم دیں گے۔ میرے اوپر یہ الزام ہے کہ میں بدخرم ہوں، عوام کے معتقدات میں دخل دیتا ہوں۔ نئے آسمان اور نئے زمین کی باتیں کرتا ہوں اور برائی کو اچھائی ثابت کرتا ہوں میرے دوستو! میری یہ بدنامی اس وجہ سے ہے کہ میں ایک خاص قسم کی فہم و ادراک کا حامل ہوں، وہ فہم و ادراک جو انسان کا حصہ ہے، میں نے دیکھا کہ وہ اشخاص جو اپنے کو عاقل و دانا کہتے ہیں۔ احمق اور نادان ہیں اور وہ جنھیں سوسائٹی میں کوئی پوزیشن حاصل نہیں ہے صاحب فہم اور عقل مند ہیں۔"

غرض سقراط نے ایک طویل تقریر کی، مگر ججوں کی جماعت مطمئن نہ ہوئی اور اُسے موت کی سزا دی گئی۔ موت کا پیغام سُن کر سقراط مطلق نہ گھبرایا۔ اس نے کہا کہ میں مرنے جا رہا ہوں۔ ہر آدمی پر زندگی کے آخری لمحات میں کچھ حقیقتیں منکشف ہو جاتی ہیں، اور اس میں پیغمبرانہ خصوصیات ابھرتی ہیں۔ آج جبکہ میں موت کی آغوش میں ابدی سکون حاصل کرنے جا رہا ہوں، اے اہل وطن! میں تم سے کہتا ہوں کہ میرے بعد تم پر ایک بڑی مصیبت آنے والی ہے۔ موت سے بھی زیادہ ہیبت ناک اور جانکاہ۔ تم نے مجھے اس لئے یہ سزا دی کہ تم اپنے معائب پر پردہ ڈال لو، مگر یہ پردہ چاک ہو کر رہے گا، وہی نوجوان جن کی بربادی کا سہرا میرے سر ہے، تمھاری زندگیوں کا خاتمہ کر دیں گے اور تمھیں اپنے اعمال کی سزا دیں گے تم اپنے معائب اور قبائح کو چھپانے کے لئے ایک شریف النفس آدمی کو موت کے گھاٹ اتار رہے ہو، یہ وہ جرم اور گناہ ہے جس کی پاداش میں تمھیں جلد ہی اپنا سر دینا ہوگا۔ یہی میری پیشین گوئی ہے۔

موت میرے لئے ایک نعمت ہے۔ موت یا تو لاشیئیت اور عدم و فنا حالت ہے اور یا روح کا ایک دوسری دنیا میں ہجرت کر جانا ہے۔ اب اگر پہلی بات صحیح ہے تو موت ایک ایسی نیند کے مانند ہے جو خوابوں کی دنیا سے بھی پرے ہے، اور اس طرح ایک غیر زمانی سکون کی آرام گاہ ہے۔ زندگی کی تمام راتیں اور ان کے حسین خواب سب کے سب اس ایک ابدی نیند پر قربان اور اگر موت نام ہے روح کے ہجرت کر جانے کا، تو یہ بھی ایک نعمت ہے۔ موت کے بعد میں ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاؤں گا جہاں انصاف اور سچائی کا خون نہیں ہوتا، جہاں سکون ہی سکون ہے جہاں اس دنیا کے ظالم اور ریاکار ججوں کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا وہ دنیا جہاں مقدس اور صداقت کیش روحوں سے ملاقات ہوگی، اس لئے اگر مجھے بار بار بھی مرنا پڑے تو بھی میرے لئے سعادت ہے۔ لہٰذا

اسے مجرا مرت کا مغالطہ ہوا ہو اور آمید ہے
کہ وہ اور جان لو کہ ایک اچھے اور نیک انسان کو نہ تو زندگی
میں کوئی غم ہے اور نہ موت ہی میں کوئی خسارہ۔ خدا اسے
نہیں بھول سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ میرا وقت آچکا ہے
اس لئے مجھے مرنا چاہیئے۔ میں اپنے ججوں سے ناراض
نہیں ہوں، اور نہ مجھے کچھ شکوہ ہے۔ اب ہم اور تم جدا
ہوتے ہیں، تم اپنی راہ جا رہے ہو اور میں نے اپنا راستہ
اختیار کیا ہے۔ میں مرنے جا رہا ہوں اور تم زندہ رہوگے
میری موت اچھی ہے یا تمہاری زندگی، اس کا علم صرف
خدا کو ہے وہ دانا اور بینا ہے۔

اس کے بعد وہ قید خانے کی چار دیواری کے اندر پہنچایا
گیا، یہاں سے اس کی زندگی کا نیا باب شروع ہوتا ہے
وہ زندگی جو فنا ہونے والی تھی اور جس کا موت سے درمیانی
فاصلہ صرف ایک ماہ کی مدت تھی، اس مختصر سی زندگی
میں جو قید خانے سے شروع ہوتی ہے انسانی فکر و نظر
اور اخلاقی احساسات کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔ آپ
کہیں گے کہ جب اس کے لئے موت کا فیصلہ صادر ہو چکا
تھا تو یہ ایک ماہ کا وقفہ کیسا! اسے کیوں یہ چند ایام زندہ
رہنے کو مل گئے اس کی ایک وجہ ہے جو سرسری سی ہے
مگر یہ حقیقت ہے کہ اگر یہ لمحات اسے میسر نہ آتے تو اس کے
کیریکٹر کا ایک اہم پہلو باقی رہ جاتا اور بہت سی اخلاقی
معلومات کی ایک دنیا پردۂ خفا میں سوئی رہتی۔ قسمتی
سقراط کی زیست کے یہ چند لمحے انسانیت کی خوش
سے یوں میسر آئے کہ اہل ایتھنز کا یہ عقیدہ تھا کہ تھیسیس
ایک جہاز میں سوار ہو کر سات لڑکوں اور سات لڑکیوں
کے ساتھ کریٹ بھاگ گیا تھا، اور اس طرح اس نے
اپنی اور ان معصوموں کی جان بچائی تھی انھوں نے اپالو
سے منت مانگی تھی کہ اگر وہ محفوظ رہے تو وہ ہر سال
ایک مشن ڈیلس کو بھیجا کریں گے۔ وہ اس وقت تک ان
روایات کے قائل تھے۔ وہ زمانہ ان کے لئے بڑا متبرک تھا
اور اس مدت میں کسی کو موت کی سزا نہیں دی جاتی تھی یہی
وجہ ہے کہ سقراط کی موت ایک ماہ بعد واقع ہوئی، کیونکہ
اس زمانے میں یونانیوں کا یہ متبرک تہوار تھا۔

قید خانے میں کم بیش اسے ایک ماہ رہنا پڑا یہ زمانہ
اس نے بڑے اطمینان سے گزارا۔ اب وہ قید خانے
میں اپنے دن گزار رہا ہے، اس کے احباب اور تلامذہ
آتے ہیں، ملاقات اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری
رہتا ہے۔ موت سے ایک یا دو دن پہلے کی بات ہے
صبح کا سہانا وقت ہے، اس کا ایک عزیز اور متمول دوست
اس کو جہاز واپس آنے کی خبر دینے آیا ہوا ہے۔ اس کا
نام کریٹو ہے۔ وہ سقراط اور کریٹو میں گفتگو شروع ہوتی
ہے۔

سقراط۔ کریٹو آج بہت سویرا ہے، تم اس وقت کیوں آئے
ہو ابھی سورج بھی طلوع نہیں ہوا، آخر جیلر نے تمہیں
آنے کی اجازت کیسے دی؟

کریٹو۔ سقراط! وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے، ایک بار میں
نے اس کے ساتھ احسان کیا تھا۔

سقراط۔ تمہیں آئے ہوئے دیر ہوئی ہوگی۔ تم نے مجھے کیوں
نہیں جگا لیا۔

کریٹو۔ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ آپ کس قدر گہری نیند سو رہے ہیں
مجھے حیرت ہے کہ وہ شخص جس کی زندگی کا پیمانہ لبریز
ہو گیا ہے اور جسے زہر کا پیالہ پینا ہے، وہ کیسے اتنے
سکون کے ساتھ سو سکتا ہے۔ میرا تو یہ عالم ہے کہ
کہ اس کے تصور ہی سے میں کانپ اٹھتا ہوں

سقراط۔ اس آدمی کو موت کے آجانے سے ملول نہیں ہونا
چاہیئے جو میری عمر کو پہنچ گیا ہو۔

کریٹو۔ مگر دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ بوڑھے لوگ بھی جب مصیبت
کی آمد سے پیچ و تاب کھاتے ہیں اور اطمینان سے نہیں
مرتے۔

سقراط۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ تم نے یہ نہیں بتلایا کہ تم اس
وقت میرے پاس کیوں آئے ہو۔

کریٹو۔ میں آپ کو ایک خبر سنانے آیا ہوں جو المناک اور
پر درد ہے۔ وہ جو آپ کے لئے اتنی دردناک نہ
ہو، مگر آپ کے احباب کے لئے بڑی ہی دل شکن اور
حوصلہ فرسا ہے۔

سقراط۔ کیا جہاز واپس آگیا ہے اور مجھے مرنا ہے۔

کریٹو۔ ابھی نہیں، لیکن مجھے قابل وثوق ذرائع سے معلوم
ہوا ہے کہ جہاز کل تک پہنچ جائے گا۔ اور کل کا دن آپ
کی ستر سالہ زندگی کا آخری دن ہوگا۔

سقراط۔ کوئی غم نہیں اگر خدا کی یہی مرضی ہے۔

کریٹو۔ آہ سقراط! وقت کم ہے، اور میری یہ عرض ہے
کہ آپ یہاں سے فرار ہو جائیں۔ لوگ تیار ہیں آپ کو
کہیں دور پہنچا دیں گے آپ کے یہاں سے چلے جانے
کے بعد ہمارا جو بھی حشر ہو ہم اسے برداشت کر لیں گے
آپ ہماری خاطر اپنی جان نہ گنوایئے۔ سارے اعتراضات
تسلیم ہیں دنیا ہمیں کیا کہے گی کہ ہم اپنے ایک
عزیز دوست کے کام نہ آسکے۔ یہ ہماری بزدلی اور
لاپروائی پر محمول کیا جائے گا۔ اس میں ہماری بڑی
بدنامی ہوگی۔ آپ تھسلی چلے جایئے وہاں میرے
دوست ہیں وہ آپ کو آرام سے رکھیں گے۔ آپ کو
اپنی بیوی اور بچوں کا واسطہ للہ اٹھئے اور میرے
ساتھ چلئے، صرف آج کی رات باقی ہے، ورنہ اس
کے بعد سوائے کف افسوس ملنے کے اور کچھ نہیں ہاتھ
آئے گا۔

سقراط خاموش ہو جاتا ہے، کیونکہ اس وقت وہ ایک
ایسے موڑ پر کھڑا ہوا ہے جس کا ایک راستہ اسے نیکی
اور عظمت کی طرف لے جاتا ہے اور دوسرا بدنامی اور
تباہی کے غار کی طرف۔ اس کا ضمیر بول اٹھتا ہے اور کہتا
ہے کہ اگر مجھے سو بار جینا اور مرنا پڑے تب بھی میں راہ مستقیم سے
اپنے قدم نہیں ہٹا سکتا، مجھے ایذائیں دیں، کوڑے ماریں
اور ہر وہ تکلیف پہنچائیں جو انسانی طاقت پہنچا سکتی
ہے۔ مگر میں صداقت کا دامن نہیں چھوڑ سکتا۔ میں اپنے
خیالات اور افکار کو غلط دھارے پر نہیں ڈال سکتا۔

مجھے اسیر کریں یا مار ڈالا کا ڈمیں
مرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے

دنیاوی علائق کی محبت اور زہر کے پیالے کی تلخ سچائی
کا وہ مقابلہ نہیں کر سکتی، یہ دنیا، بیوی بچے احباب و اعزا یہ
سارے سامان ہیچ ہیں، حکایت تشنہ و سراب سے زیادہ
ان کی حقیقت نہیں۔ مگر صداقت موجود ہے جس پر
سیکڑوں زندگیاں نثار۔ ہزاروں علائق قربان
تمنائیں فدا۔ وہی مرد، مرد کہلانے کے مستحق ہیں
جو وقت کی دشواریوں اور حالات کی تاریکیوں میں بھی
انسانی عظمت کے روشن پہلو کو نظر انداز نہیں ہونے دیتا
اور اپنے دامن کو آلودگیوں سے یوں بچا لیتا ہے
کبھی ان دشواریوں سے اسے سابقہ ہی نہیں پڑا تھا۔
قابل مبارک باد ہیں وہ لوگ جو سچائی کی خاطر جان دیتے
ہیں اور صد آفریں و تحسین ان اشخاص پر جو حق کے لئے
خندہ پیشانی کے ساتھ موت سے ہم آغوش ہو جاتے ہیں

جانتا ہوں مسکرانا سب کو آتا ہے مگر
تیغ کے سایہ میں آکر مسکرا سکتا ہے کون

نادان ان کا مذاق اڑاتے ہیں، ضمیر فروش ان کی
قربانیوں پر تمسخر کرتے ہیں "اصحاب مصلحت" ان کی ناعاقبت
اندیشانہ زندگی کی پناہ لیتے ہیں اور کم ہمت وقت کے ساتھ
چلنے کی فلاسفی کی اشاعت کرتے ہیں۔ ان ناعاقبت
اندیشوں کو اس مقام کی کوئی خبر نہیں۔ یہ شہیدان صداقت
ابدی سکون و راحت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اگر
وہ اس حقیقت سے واقف ہوتے تو موت کی تمنا
کرتے تھکتے اور زہر کے پیالوں کو بغیر جھجکے ہونٹوں
سے لگا لیتے۔

عقل اگر داند کہ دل دربند زلفش چوں خوش است
عاقلاں دیوانہ گردند از پئے زنجیر ما

یہ لوگ مر جاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ کبھی نہیں
مرتے یہ لوگ زمانے کی ریت پر اپنے وہ نقوش قدم
چھوڑ جاتے ہیں جو آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ
کا کام دیتے ہیں۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ اپنے اندر درس
عبرت کی ایک دنیا رکھتا ہے اور ان کا ہر عمل حقائق و
معارف کا دفتر ہوتا ہے، یہی ان کی غیر فانی زندگی ہے

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

سقراط نے کہا کہ میرے پیارے دوست اگر میں فرار
ہو جاتا ہوں تو سوسائٹی اور اسٹیٹ کا جرم کرتا ہوں
جن برائیوں کے خلاف میں ہمیشہ جہاد کرتا رہا آج انہیں
کا ارتکاب کروں۔ یہ ناممکن ہے۔ میں اس خدا کے سامنے
کیسے حاضر ہو سکوں گا جو حاضر و ناظر ہے۔ میں ان روحوں
کو کیسے منہ دکھلاؤں گا جو میرا انتظار کر رہی ہیں۔ میں موت
کو ... پر ترجیح دیتا ہوں۔ کریٹو یہ میرے ضمیر کی
آواز ہے۔ اب تمہارا کچھ کہنا فضول ہے، ...
خدا کی مرضی پر ہے اور دیکھو یہ مجھے کہاں لے جاتی ہے۔

دوسرے دن جو اس کی موت کا دن تھا، تمام احباب
جمع ہوئے۔ بیوی بچے بھی آتے تمام دن مختلف ...
میں کریٹو نے سقراط سے دریافت کیا کہ اس کی تجہیز و
تکفین کیسے کی جائے گی۔ سقراط نے حاضرین کو مخاطب
کر کے کہا کہ جس طرح تمہیں آسانی ہو مگر میں پہلے تمہارے
ہاتھ لگ جاؤں۔ آہ کریٹو! میں اتنی دیر تک بکتا رہا اور
تم کچھ نہ سمجھ سکے۔ میں نے بار ہا کہا کہ میں یہاں سے دور
کسی اور دنیا میں جا رہا ہوں، تم یہ خیال کرتے ہو کہ مرنے
کے بعد میں وہی سقراط رہ جاؤں گا۔ نہیں ہرگز نہیں

[illegible] اور [illegible] جہاں فنا نہیں، جہاں موت نہیں، اور جہاں بقا اور ابدیت کے [illegible] میں ہیں تم لوگ جان جاؤ گے اور پھر میں اس دنیا میں نہیں رہوں گا۔ [illegible] میرے نعش کو جس طرح چاہنا دفن کرنا۔

اس کے بعد وہ اٹھا اور غسل کے لئے ایک دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ غسل کے بعد جب وہ واپس آیا تو سورج غروب ہو رہا تھا اور درختوں کے سائے لمبے ہو گئے تھے۔ وہ اپنے بچوں کے پاس آیا، ان سے کچھ باتیں کیں اور انھیں گھر بھیج دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جیلر آیا اور اس نے کہا:

"سقراط! مجھے یقین ہے کہ تم دنیا کے سب سے اچھے آدمی ہو۔ جتنے لوگ اب تک یہاں آئے ان سب میں تم سا شریف النفس شخص میں نے کسی کو نہیں پایا۔ مجھے امید ہے کہ تم مجھے معاف کرو گے۔ میں نے دیکھا ہے کہ جب میں زہر کا پیالہ لاتا ہوں تو لوگ مجھ سے [illegible] ہیں اور مجھے گالیاں دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں حکومت کے حکم کی تعمیل کرتا ہوں، میرا اس میں کوئی قصور نہیں، میں تو نوکر ہوں۔" اس کے بعد وہ [illegible] اور واپس چلا گیا۔

سقراط نے اس کی طرف دیکھا اور کہا "تم کتنے اچھے اور خلیق ہو، تمھاری شرافت اور اخلاق یہ سب کا سب ناقابلِ فراموشی ہے؟"

کریٹو نے کہا "سورج ابھی پہاڑی پر چمک رہا ہے، کچھ لمحات باقی ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ لوگ زندگی کے آخری لمحات میں اپنی تمام آرزوؤں کو پوری کرنے کی [illegible] کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ جب مرنا ہی ہے تو جی کی ہوس تو نکال لیں، کوئی کھاتا ہے، کوئی پیتا ہے، پیالوں کی جگہ خم کے خم لنڈھاتا ہے، اور کوئی اپنی جانِ تمنا کی آغوش میں لیٹ کر اس کے آنسوؤں سے اپنے دامن کو تر کرنا چاہتا ہے!"

یک دست جام و بادہ و یک دست زلف یار
رقصم چنیں میانۂ میدانم آرزوست

سقراط نے کہا "یہ کہ وہ لوگ جن باتوں پر عمل کرتے ہیں، ٹھیک کرتے ہیں، کیونکہ ان کا خیال ہوتا ہے کہ اس طرح وہ فائدے میں رہیں گے، میری دانست میں اس زندگی کا لطف ہی کیا جو پہلے ہی مٹ چکی ہو۔" اس اثنا میں زہر کا پیالہ آ چکا تھا۔ سقراط نے اُسے مسکراتے ہوئے ہونٹوں سے لگا لیا۔

اس طرح اپنے زمانے کے سب سے بڑے، سب سے سچے اور سب سے زیادہ شریف النفس انسان کا خاتمہ ہو گیا۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

اہل علم کی آواز

(بہ سلسلہ [illegible])

[illegible] پیدا ہو گئی ہیں۔

۷۔ ہمیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ تمام تعلیمی اور سماجی [illegible] کام [illegible] ملک میں ایک جمہوری انداز نظر پیدا کرنا چاہئے جس کا نصب العین [illegible] یہاں [illegible] جمہوری ریاست اور ایک [illegible] پر مبنی معاشرے کی بنیاد ڈالے جس میں تمام شہریوں کو یکساں مواقع حاصل ہوں، اور ان میں ذات پات، رنگ، نسل، جنس، مذہب، سماجی حیثیت یا سیاسی خیالات کی وجہ سے کوئی بے جا امتیاز [illegible] برتا جائے۔

۸۔ ہمارا یقین ہے کہ کوئی قدر زندگی میں ایک فعال قوت نہیں بن سکتی جب تک وہ افراد اور جماعتوں کے تجربے کی بھٹی میں سے نہ گزرے۔ آج کل ہمارے اصول اور عمل، ہمارے نظریات اور ہمارے اعمال میں ایک خلیج حائل ہے جو بڑھتی جاتی ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ہم [illegible] طور پر جن اصولوں اور خیالات سے عقیدت رکھتے ہیں انھیں اس طرح پیش کیا جائے کہ وہ ہمارے عمل کے لئے قوت محرکہ بن سکیں۔

۹۔ ہمارا یقین ہے کہ آزادیٔ خیال نہ صرف صنعتی، سماجی اور اخلاقی ترقی کے لئے ضروری ہے بلکہ شرفِ انسانی کا ایک لازم جزو ہے۔ سماجی اور تعلیمی اداروں میں آزادیٔ خیال کی قدر اور اس کے لئے گنجائش ہونا چاہئے اور اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ میں قوتِ فکر و تنقید کو بیدار کرنا چاہئے، اور ان میں ایک معقول پسند سائنٹفک ذہنیت کی تشکیل ہونی چاہئے جس کو وہ اپنی زندگی اور کام کے ہر شعبے میں استعمال کر سکیں۔ اس ذہنیت کا تقاضا ہے کہ ہم غیر جانبدار ہو کر سوچیں یعنی اپنے خون کی گرمی کے بل بوتے

نہیں بلکہ اپنے دماغ سے اور اس طرح خود کو ایک حد تک نامعقول تعصبات، توہمات اور جنبہ داری سے محفوظ رکھیں۔

۱۰۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم کوئی بلند قومی مقصد اور نصب العین اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتے جب تک افراد کی سیرت میں دیانتداری اور اعلیٰ معیاروں کے ساتھ لگن پیدا نہ ہو۔ گذشتہ زمانے میں ہماری تعلیم کی توجہ زیادہ تر نظری چیزوں پر رہی ہے۔ اب ضرورت ہے کہ سیرت کی تربیت پر زیادہ زور دیا جائے۔

۱۱۔ ہمارے خیال میں ضروری ہے کہ ہم ملک میں فرقہ وارانہ، صوبائی یا علاقہ وارانہ ذہنیت پر زور دینے کے بجائے ایک قومی ذہنیت پیدا کرنے پر زور دیں اور اپنی تعلیم گاہوں اور دوسرے اثر آفریں اداروں کو اس مقصد کے لئے کام میں لائیں۔

۱۲۔ چونکہ اس ثقافتی انقلاب کی جد و جہد میں سب سے زیادہ حصہ ہمارے استادوں کو لینا ہے، اس لئے یہ اشد ضروری ہے کہ ان کا مادی اور ذہنی معیار کافی بلند کیا جائے۔

دو ہندی کتابیں

(بہ سلسلہ صفحہ ۲)

ہوئے تو مہندر چندر رائے نے لفظ بہ لفظ روس کے دشمنوں کے الفاظ دُہرا دئے ہیں۔ امریکہ، برطانیہ اور دوسرے سرمایہ دار ملکوں کے پروپگنڈے سے متاثر ہو کر وہ یقین کے ساتھ لکھتے ہیں کہ گورکی کو اسٹالین نے زہر دلوا دیا۔ حالانکہ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ گورکی بوڑھا تھا، دق کا مریض تھا اور مدت سے بیمار تھا۔ آخری وقت میں نمونیہ کا شکار ہو گیا۔ لیکن پھر بھی وہ کہتے ہیں کہ اسے اسٹالین نے اپنا دشمن اور مد مقابل سمجھ کر راہ سے ہٹا دیا۔ جس کا کوئی ثبوت نہیں۔ اگر اس کتاب میں غلط بیانی سے بھرے ہوئے دو صفحے نہ ہوتے تو یقیناً یہ کتاب ہندی ادب میں ایک اہم جگہ حاصل کر سکتی تھی۔ آخری دو صفحوں کا انداز بیان بھی پوری کتاب سے مختلف اور کمزور ہے۔ بنگالی کتاب میں یہ حصہ نہیں تھا۔ ہندی میں بڑھایا گیا ہے۔

تاریخ اشاعت: یکم، ۱۸، ۱۶، ۲۲
دفتر: "نئی روشنی" جامعہ نگر، دہلی
چندہ سالانہ ... ششماہی ...
طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی، بی اے، جامعہ
مطبوعہ: ... دہلی

NAI RASHNI

DELHI

8 DEC 1949

جلد ۲	نمبر ۲۲	۸ر دسمبر ۱۹۴۹ء	ایڈیٹر: ڈاکٹر سید عابد حسین

تہذیب کو کیوں کر بچائیں

خواجہ غلام السیدین صاحب کا خطبہ صدارت جو ۲۶ر اکتوبر کو بھابلیشور کی تہذیبی اتحاد کی کانفرنس میں پڑھا گیا۔

(۱)

اب کسے فکر ہے کہ تصویریں بنائے یا شاعری کرے یا زبان کے میدان میں معنی آفرینی کرے یا مادے کی ساخت کے بارے میں دماغ لڑائے۔ یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے روم میں آگ لگی ہو اور کوئی بیٹھا بانسری بجائے! کسے فکر ہے کہ اخبار اور رسالے نکالے۔ کاغذ پر روشنائی یا فضا میں خیال آفریں جملے بکھیرے جو جنگ کے شور و شغب میں طوطی کی آواز بن جائیں یا ان اُمیدوں کا نوحہ پڑھے جو یاسی ہوگئی ہیں۔ اب فکر کا چراغ جلانے سے کیا حاصل؟ پیادہ فوج کے دستے کے مقابلے میں ایک نقاد کی کیا حیثیت ہے؟......

اگر ہم ان قدروں کو بدلنا چاہتے ہیں جو آج کل کی دنیا میں راسخ ہوگئی ہیں اور خود اپنی قوم کے دل و دماغ میں سے وہ ناگوار اور نازیبا رجحانات خارج کرنا چاہتے ہیں جو انہیں مسخ کرنے کے لئے کوشاں ہیں تو موجودہ صورت حال کے لئے ہمیں اپنی ذمہ داری کو کھلے دل سے قبول کرنا چاہئے، اس کی اصلاح کے لئے اپنے تمام وسائل استعمال کرنے چاہئیں......

اس مجلس کی انتظامیہ کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے میں آپ سب دوستوں کا تپاک سے خیر مقدم کرتا ہوں۔ یہ کوئی رسمی جملہ نہیں بلکہ درحقیقت مجھے اس بات کی بہت خوشی ہے کہ اتنے بہت سے حضرات اور خواتین جو اپنے افراد اور جماعت سے کام لے کر ہماری ذہنی اور عملی زندگی کو نئے سانچوں میں ڈھال سکتے ہیں، اس مسئلے پر غور اور تبادلۂ خیال کرنے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ دراصل یہ ایک معروف قسم کی کانفرنس نہیں بلکہ کچھ ایسے کم و بیش ہم خیال لوگوں کا دوستانہ اجتماع ہے جن کو تعلیم اور تہذیب کے مسئلوں میں دلچسپی ہے اور جو اس بات کے خواہش مند ہیں کہ اپنی قومی زندگی کی بہترین قدروں کی حفاظت کریں اور ان کو مستحکم بنائیں اور زمانے کے جو نئے تقاضے اور مطالبات ہیں ان میں اور قومی ذہنیت میں ہم آہنگی پیدا کریں۔ یاد رکھئے کہ اس وقت صرف ہمارا ہندوستان ہی ایک انقلابی دور میں سے نہیں گذر رہا ہے بلکہ ہم جس دنیا میں اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں اس میں بھی سائنس، صنعت و حرفت اور جنگ کے نئے اور خوفناک طریقوں نے پرانے مسئلوں کو ایک بالکل نئی شکل دے دی ہے۔ اگر ہم خود کو اس نئی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار نہ کر سکے اور ان مسئلوں کو معقول طریقے پر حل نہ کر سکے تو ہم نہ اپنی آزادی کو قائم رکھ سکیں گے، نہ اس میں معنی پیدا کر سکیں گے، نہ ترقی کر سکیں گے، نہ دنیا کے سامنے کوئی قابل قدر چیز پیش کر سکیں گے۔ ہماری تاریخ کا جو دور ابھی ختم ہوا ہے اس میں ہم سیاسی لحاظ سے بڑی حد تک بے بس تھے اور ہر قسم کی پالیسی کا تعین ایک بیگانہ حکومت کے ہاتھ میں تھا۔ اس صورت حال کا نفسیاتی اثر یہ ہوا کہ ہم میں ایک ایسی غیر ذمہ دارانہ ذہنیت پیدا ہوگئی جسے مستقبل کی تشکیل کی کوئی خاص فکر نہ تھی اور جس نے ملک کی باگ ڈور پر سے اپنا ہاتھ اٹھا لیا تھا۔ بے شک بہت سے لوگ اور بعض جماعتیں ایسی تھیں جن پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ لیکن میں اس وقت عام مروجہ ذہنیت کا ذکر کر رہا ہوں جس کو اس میں شک تھا کہ منظم اور اجتماعی کوشش سے کوئی خاص نتیجہ نکل سکتا ہے اور وہ بہت اطمینان سے تمام خرابیوں اور کمزوریوں کی ذمہ داری بدیشی حکومت کے سر ڈال دیتی تھی۔ لوگ نہ صرف سیاسی غلامی کے مضر اثرات بلکہ خود اپنی کمزوریاں اور ناکامیاں بھی اسی کھونٹی پر لٹکا دیتے تھے۔ لیکن اب آزادی حاصل کرنے کے بعد یہ صورت حال بالکل بدل گئی ہے اور اب ہمیں اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں دونوں کی پوری ذمہ داری قبول کرنی ہوگی۔ اس کے لئے ہمیں انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے زیادہ بے لاگ اور گہری تنقیدی نظر سے احتساب نفس کرنا ہوگا اور اپنے قومی مسائل کو زیادہ فعالانہ طریقے پر حل کرنا ہوگا۔ اس کانفرنس کو بلانے کا ایک بڑا جواز یہ ہے کہ ہمیں اس نئے چیلنج کا مقابلہ کرنا ہے جو سیاسی اور انتظامی حکام کے ساتھ ساتھ استادوں، مصنفوں اور مفکروں کو بھی درپیش ہے۔

ممکن ہے بعض لوگ یہ خیال کریں کہ اس دنیا میں جہاں ہر طرف قوت کی کشمکش اور اسی کا اختیار ہے، جہاں جبر اور تشدد کی حکمرانی ہے اور ایٹم بم دنیا کی قسمت کا فیصلہ کرنے والا بن بیٹھا ہے۔ ہم لوگوں کا جن کے ہاتھ میں قلم اور زبان کے سوا کوئی اور طاقت نہیں یہ خیال کرنا کہ ہم واقعات کی روش کو روک سکتے ہیں یا ان کے دھارے کو بدل سکتے ہیں۔ ایک بے جا ادعا اور خود پسندی ہے۔ میں بہت ادب اور انکسار کے ساتھ (بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

فہرست مضامین

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
۸ دسمبر ۱۹۴۹ء

دنیا میں امن کیسے — قائم — ہو؟

نومبر کے آخری ہفتے میں کلکتے میں آل انڈیا پیس کانگریس کا اجلاس ہوا اور دسمبر کے پہلے ہفتہ میں شانتی نکیتن میں ورلڈ پیسفسٹ میٹنگ شروع ہوئی۔ دونوں کا مقصد مشترک ہے یعنی اس مسئلے پر غور کرنا کہ دنیا کو جنگ کے خطرے سے بچانے کے لئے اور سچا امن قائم کرنے کی غرض سے کیا تدبیریں اختیار کی جائیں، لیکن جن جماعتوں کی طرف سے یہ جلسے منعقد ہوئے ان کے اصول و عقائد اور ان کے طریق کار میں بہت فرق ہے

پیس کانگریس کمیونسٹ خیال کے لوگوں کی طرف سے ہوئی تھی جو سمجھتے ہیں کہ جنگ سرمایہ داری نظام کا ایک لازمہ ہے اور اس کو روکنے کی آخری اور قطعی تدبیر یہ ہے کہ ساری دنیا میں سرمایہ داری نظام کی جگہ کمیونسٹ نظام قائم ہو جائے۔ جہاں تک جنگ کے فوری خطرے کا تعلق ہے ان کے نزدیک خطرہ یہ ہے کہ انگلو امریکی بلاک سوویٹ روس اور اس کے ساتھی ملکوں پر حملے کی تیاریاں کر رہا ہے اور اس کی روک تھام اس طرح ہو سکتی ہے کہ دنیا کے اور ملک انگلو امریکن بلاک کا ساتھ نہ دیں۔ موجودہ پیس کانگریس مقامی ہے اور اس کا خطاب خاص طور سے ہندوستانیوں سے ہے اس کا خیال ہے کہ ہندوستانی انگلو امریکی بلاک میں شامل ہو چکا ہے یا ہونے والا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ ہندوستان کی رائے عامہ اس پالیسی کی مخالفت کرے اور اس میں انفعالی طریقۂ کار نہیں بلکہ فعالی (ACTIVE) طریقہ اختیار کرے جس کی وہ تشریح نہیں کرتی۔

ورلڈ پیسفسٹ میٹنگ یورپ اور امریکہ کی پیسفسٹ انجمنوں اور ہندوستان کے گاندھی وادیوں کی طرف سے ہو رہی ہے۔ مغربی پیسفسٹ عام طور پر عیسائیت کا مذہبی عقیدہ اور عیسائیت کا جمہوری عقیدہ رکھتے ہیں وہ جنگ کا سرچشمہ موجودہ اقتصادی نظام کو نہیں بلکہ قوموں کی باہمی نفرت، لالچ اور ملک گیری کی ہوس کو سمجھتے ہیں، ان کا طریق کار یہ ہے کہ تلقین اور تبلیغ کے ذریعے سے قومی اور نسلی تعصبات کو مٹانے لالچ اور ہوس کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ جنگ کے زمانے میں وہ یہ منفی اقدام کرتے ہیں کہ خود فوج میں بھرتی نہیں ہوتے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی نیک نیتی قابل قدر ہے اور انھوں نے قوموں کے درمیان دوستی اور برادری کے جذبات پیدا کرنے کی دل سے کوشش کی ہے۔ لیکن یہ ایک روشن حقیقت ہے جس کا انھیں خود بھی احساس ہے کہ وہ اب تک جنگ کو روکنے میں بالکل ناکام رہے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے وہ اس سال ہندوستان میں جمع ہوئے ہیں کہ گاندھی جی کے ستیہ اور اہنسا کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اگر ممکن ہو تو گاندھی وادیوں کے ساتھ مل کر اپنی جماعت کی ازسرنو تنظیم کریں۔

شانتی نکیتن کی میٹنگ میں جو کارروائی اب تک ہوئی ہے اس سے ان حضرات کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ عام مقصد اور جذبات کی ہم آہنگی کے باوجود گاندھی وادیوں کا عقیدہ اور طریق کار ان سے بہت کچھ مختلف ہے شری کمارپا نے میٹنگ کو بتایا کہ اہنسا کا فلسفہ ہمی لٹریچر کو موجودہ اقتصادی نظام کے اندر مضمر سمجھتا ہے اور جنگ کو اس کا نتیجہ جانتا ہے۔ انھوں نے اور سیوا گرام کے حلقے کے دوسرے مقرروں نے اس پر زور دیا کہ کامل امن کے لئے ضروری ہے کہ بڑے پیمانے کی صنعتوں کے مرکز بند نظام کے بجائے لامرکزی اقتصادی نظام قائم کیا جائے جس میں چھوٹے چھوٹے دیہی علاقے معاشی حیثیت سے خود کفیل ہوں انھوں نے اس پر بھی روشنی ڈالی کہ ظلم استبداد، معاشی لوٹ اور جنگ کا مقابلہ کرنے کے لئے ستیہ گرہ کا طریقہ محض انفعالی مقاومت کا نہیں بلکہ فعالی مزاحمت کا ہے مگر اس میں تشدد سے کام نہیں لیا جاتا۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ مغربی امن پسند گاندھی وادی اہنسا کو کس حد تک اپنانے کے لئے تیار ہوتے ہیں یہ تو بہت مشکل معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس معاشی نظام کو قبول کریں جو گاندھی جی کے نام سے منسوب ہے اور جس کے علمبردار آج کل شری کمارپا ہیں۔ لیکن اگر وہ صرف ستیہ گرہ کا طریق کار ہی اختیار کر لیں تب بھی یہ امید ہو سکتی ہے کہ ان کی تحریک میں ایک نئی جان پڑ جائے گی اور ان کی کوششیں قیام امن میں پہلے سے زیادہ موثر ہوں گی۔ شاید ہندوستان کے گاندھی وادی بھی اختلافات کے باوجود ایک حد تک ان کے ساتھ اشتراک عمل کرنے کو تیار ہو جائیں۔

امن کے مسئلے کے مستقل حل جو کلکتے اور شانتی نکیتن کی کانفرنسوں میں پیش کئے گئے ہیں ایک دور دراز منزل کی راہ دکھاتے ہیں۔ ان فلسفوں کو ماننے والے جن پر یہ حل مبنی ہیں اپنی اپنی راہ پر چل کر امن کی منزل تک پہنچنے کی کوشش کرتے رہیں گے اور آنے والا زمانہ بتائے گا کہ ان کی کوشش کہاں تک کامیاب ہوئی۔ لیکن اس وقت تو امن کی بھوکی دنیا اس مسئلے کا کوئی فوری حل چاہتی ہے خواہ وہ عارضی ہی کیوں نہ ہو۔ اس وقت تو لوگ اس آرزو میں ہیں کہ تیسری جنگ عظیم جس کا خطرہ کچھ دن پہلے ہمارے سروں پر منڈلا رہا تھا اور اب بھی پوری طرح دور نہیں ہوا ہے زیادہ سے زیادہ مدت کے لئے ٹل جائے تاکہ ہمیں اطمینان سے بکھری ہوئی زندگی کو سمیٹنے کا، اجڑے ہوئے گھروں کو بسانے کا ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے کا اور انسانیت کے سینے میں تعمیر اور تخلیق کے مایوس جذبوں کو ابھارنے کا موقع ملے۔

امن قائم کرنے کی جو فوری تدبیر کلکتے کی پیس کانگریس نے بتائی ہے اس کے ہمیں صرف اتنے حصے سے اتفاق ہے کہ ہندوستان کو انگلو امریکی بلاک سے الگ رہنا چاہئے۔ ہمارے خیال میں اب تک الگ ہے اور حکومت کی قطعی پالیسی ہے کہ آئندہ بھی الگ رہے پھر بھی رائے عامہ کو اس معاملے میں چوکس رہنا چاہئے اور ہر اس چیز کی مخالفت کرنی چاہئے جو ہمارے ملک کو کسی فوجی جتھے میں دھکیل دے یا کسی بیرونی طاقت کا آلۂ کار بنا دے۔ شانتی نکیتن کی کانفرنس ابھی شروع ہی ہوئی ہے لیکن اس میں کسی نے ضمنی طور پر ایک تجویز پیش کی ہے جو گہرے غور و فکر کی محتاج ہے تجویز یہ ہے کہ امن پسندوں کی جماعت ہندوستان اور پاکستان کی باہمی کشیدگی کو دور کرنے اور ان میں مصالحت کرانے کی کوشش کرے اگر اس خیال کو وسعت دی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ امن پسندوں کو ان سب ملکوں میں مصالحت کی کوشش کرنی چاہئے جن کے آپس میں ٹکرانے کا اندیشہ ہے۔ امن کے لئے سب سے بڑا خطرہ اس وقت یہ ہے کہ دنیا کی بہت سی قوموں پر ایک دوسرے کا خوف آسیب کی طرح سوار ہے اور ہر قوم میں ایسے ارباب غرض موجود ہیں جو اپنے فائدے کے لئے منظم پروپگنڈہ کے ذریعے سے اس خوف کو اور بھڑکا رہے ہیں۔ امن پسند جماعتیں عام طور پر اپنی ساری طاقت اس کوشش میں صرف کرتی ہیں کہ مختلف قوموں کو تخفیف اسلحہ پر آمادہ کریں۔ ظاہر ہے کہ جب تک ان قوموں پر خوف کا بھوت چڑھا ہوا ہے اس قسم کی اپیلوں کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ ضرورت اس کی ہے کہ امن پسند اپنے اپنے ملک میں جھوٹ کی اس مہم کا مقابلہ کریں جس کے ذریعے سے دوسرے ملکوں کی فوجی تیاریوں، سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے من گھڑت افسانے پھیلائے جاتے ہیں۔ فولاد اور یورینیم کے اسلحہ سے پہلے اعصابی جنگ کے ہتھیاروں کو جو ریڈیو، اخبار اور اشاعت کی دوسری ایجنسیاں استعمال کرتی ہیں کند کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر امن پسند ستیہ گرہ کی روحانی طاقت سے کام لے کر اپنے اپنے ملک میں جھوٹ اور افترا پردازی کے شیطانی لشکر کا مقابلہ کریں تو یہ امن کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

دنیا کی رفتار

ہندوستان

شب رو ہوائی ڈاک کا معرکہ

کچھ دن سے اخباروں میں حکومت ہند کی وزارت رسل و رسائل کے خلاف ایک زبردست مہم چھڑی ہوئی تھی کہ اس نے رات کی ہوائی جہازی سروس سے ڈاک بھیجنے کا جو انتظام کیا ہے اس کی وجہ سے ہوائی جہازوں کی کمپنیوں کو بہت نقصان پہنچ رہا ہے۔ کہا جاتا تھا کہ وزارت نے ہوائی جہاز سے ڈاک لانے لے جانے کا ٹھیکہ ایک نئی کمپنی کو دے کر پرانی کمپنیوں کی حق تلفی کی۔ اس کے علاوہ نئی سروس کے شروع ہونے کی وجہ سے پرانی کمپنیوں میں مسافروں کی تعداد کم ہو گئی ہے اور ان کی آمدنی بہت گھٹ گئی ہے۔ اس مہم کا زور اتنا بڑھا کہ پارلیمنٹ میں روہنی کمار چودھری صاحب کی طرف سے شب رو ہوائی ڈاک کو بند کر دینے کی تجویز بھی پیش ہو گئی مگر وزیر رسل و رسائل رفیع احمد قدوائی صاحب نے جو مفصل اور مدلل بیان پارلیمنٹ میں دیا اس سے ظاہر ہو گیا کہ حکومت پر جو الزام لگائے جا رہے ہیں وہ بالکل بے بنیاد ہیں۔ حکومت نے نئی کمپنی کو ٹھیکہ دینے سے پہلے پرانی کمپنیوں سے کہا تھا کہ اگر وہ اپنے مقررہ کرایے میں کمی کرنے پر تیار ہوں تو ٹھیکہ ان ہی کو دیا جائے گا لیکن سب نے ایک سرے سے انکار کر دیا اور یہ عذر پیش کیا کہ جو کرایہ گورنمنٹ دینا چاہتی اس پر سروس چلانے میں سراسر نقصان رہے گا۔ قدوائی صاحب نے اعداد و شمار کی مدد سے یہ ثابت کیا کہ نئی کمپنی اسی کم کرایے پر کامیابی سے سروس چلا رہی ہے۔ پرانی کمپنیوں کو اس کی وجہ سے کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا ہے۔ انھوں نے اس حقیقت کا بھی انکشاف کیا کہ حکومت کے خلاف یہ سارا ایجی ٹیشن حکومت ہند کے ایک پرانے افسر کی کوشش سے ہو رہا ہے جو اب ٹاٹا کے بورڈ آف ڈائرکٹرز میں ہیں۔ پارلیمنٹ کا پوری طرح اطمینان ہو گیا کہ ہوائی کمپنیوں کی شکایت بے اصل ہیں اور حکومت کا فیصلہ مناسب تھا۔ چودھری صاحب کی تجویز بغیر رائے لیے ہوئے ملتوی کر دی گئی۔

حالت سدھر رہی ہے

۵ر نومبر کی پریس کانفرنس میں وزیر اعظم کی زبان سے پہلی بار یہ بات سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ ملک کی معاشی حالت رفتہ رفتہ سدھر رہی ہے۔ وزیر اعظم نے اپنے اس قول کی تشریح نہیں کی لیکن دوسرے سوالوں کے جو جوابات انھوں نے دئے۔ ان سے ان پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ ایک تو غلّے کی پیداوار بڑھانے کی مہم کامیاب ہو رہی ہے۔ صوبوں کی حکومتوں کو غذائی مسئلے کی اہمیت کا پورا احساس ہو گیا ہے اور وہ اسے حل کرنے میں اپنے سارے وسائل سے حکومت کی مدد کر رہے ہیں۔ دوسرے کارخانوں کے مالک جو پہلے حکومت کی معاشی اسکیموں میں ہر طرح روڑے اٹکاتے تھے اب حکومت سے تعاون کر رہے ہیں۔ بچے ہوئے سرمایے پر انکم ٹیکس ادا کرنے کے بارے میں گفت و شنید ہو رہی ہے، اور اس گتھی کے جلد سلجھنے کی امید ہے۔ اس کے علاوہ تجارتی مال کی درآمد برآمد کی جو رپورٹ حال میں شائع ہوئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ برآمد اچھی خاصی بڑھ گئی ہے۔ چنانچہ ستمبر کے مقابلے میں اکتوبر کے مہینے میں کم یاب سکوں کے ملکوں میں تین کروڑ روپے کا مال زیادہ بھیجا گیا۔ اس تین کروڑ میں سے دو کروڑ کا اضافہ ڈالر کے ملکوں کو جانے والے مال میں ہوا ہے۔ ان سب باتوں سے امید ہوتی ہے کہ ہمارا معاشی بحران انتہائی نقطے پر پہنچ کر اب افاقے کی طرف مائل ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ ابھی مرض کے دور ہونے اور صحت کے عود کرنے کی منزل بہت دور ہے۔ حکومت نے اپنے اخراجات کو کم کرنے، ندیوں کے بند باندھ کر بجلی پیدا کرنے، نئے کارخانے قائم کرنے کی جو تجویزیں مرتب کی ہیں ان کے پورے ہونے سے پہلے گرانی، افلاس اور بے روزگاری کے [illegible]

پاکستان

اسلامی ملکوں کی معاشی کانفرنس

پاکستان اپنے قیام کے بعد ہی سے اس کوشش میں تھا کہ اُسے اسلامی ملکوں کی قیادت اور سیادت حاصل ہو جائے اسی طرح جیسے ہندوستان کو عملاً ایشیائی ملکوں کی قیادت مل گئی ہے۔ اسی سلسلے میں مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں صاحب اسلامستان کی تحریک کا پیام لے کر اسلامی ملکوں میں گئے اور انھوں نے اسلامی ملکوں کے نمایندوں سے براہ راست بات چیت کی۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی اسلامی ملکوں کی معاشی کانفرنس بھی ہے جو ۲۵ر نومبر سے کراچی میں ہو رہی ہے اس کانفرنس میں ترکی، مصر، ایران، عراق، سعودی عرب، انڈونیشیا، مسقط، عمان، افغانستان، شام، الجیریا، لیبیا، ٹیونس اور جزائر مالدیپ کے نمایندے شریک ہوئے ہیں اور پاکستان کو توقع ہے کہ اس کانفرنس کے نتائج بہت دور رس ہوں گے۔

وزیر مالیات غلام محمد صاحب نے اپنے طویل خطبے میں اسلامی ملکوں کا بہت تفصیل سے تجزیہ کیا ہے اور صاف صاف لفظوں میں تسلیم کیا ہے کہ بحیثیت مجموعی اسلامی ملکوں کی حالت بہت پست اور گری ہوئی ہے اور خوش قسمتی سے جن ملکوں کو سیاسی آزادی حاصل ہے وہ معاشی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں: موصوف نے اگرچہ اس پر زور دیا کہ "ہمارا مغربی جمہوریتوں اور روسی بلاک میں سے کسی سے بھی کوئی تعلق نہیں ہوگا" جہاں معاشی اور صنعتی تنظیم کا ذکر کیا ہے وہاں مغربی سرمایہ اور مغربی ماہرین فن کو دعوت عام بھی دی ہے اور اسی کے ساتھ یہ خوش فہمی بھی ظاہر کی ہے کہ موجودہ بدلے ہوئے حالات میں مغربی سرمایہ اور مغربی فنی ماہروں کی امداد قبول کرنے سے ہماری سیاست یا مختاری پر کوئی اثر نہیں پڑنے کا۔

کانفرنس کی تجویزیں

کانفرنس نے جو مختلف کمیٹیاں مقرر کی تھیں انھوں نے کچھ عملی تجویزیں پیش کی ہیں۔ ان میں سے چند اہم تجویزیں یہ ہیں

(۱) مسلم ریاستوں کا ایک بین الاقوامی معاشی ادارہ قائم کیا جائے تاکہ وہ زمینداری اور بیرونی تجارت، صنعت، کان کنی، انشورنس، بنک، بحری اور ہوائی آمد و رفت کے وسائل کو ترقی دے۔

(۲) ان ریاستوں کے موجودہ زمینداری اور لگان داری کے نظام میں اسلامی احکام کے مطابق ترمیم کی جائے، تاکہ کاشتکاروں کو غلامی اور بیگار سے نجات ملے اور ان کے معاشی حقوق کا تحفظ ہو۔

(۳) زراعت میں مشینوں سے کام لیا جائے۔ پیداوار کو بڑھانے کے لیے سائنس کے مختلف وسائل استعمال کئے جائیں۔ جنگلوں کی ترقی اور توسیع پر خاص زور دیا جائے۔

(۴) مالیات کے پیچیدہ مسائل مثلاً بجٹ، شرح مبادلہ وغیرہ پر باہمی غور کیا جائے بلکہ بین الاقوامی ادارے کے قائم ہونے کا انتظار کیا جائے۔

(۵) سرمایے اور محنت میں ہم آہنگی ہو اور مزدوروں کو زندگی کی کل ضرورتیں مہیا کی جائیں۔

(۶) مسلم ریاستیں، ایک دوسرے سے تجارتی رعایت کے اصول پر تجارتی [illegible] کریں۔ سکے، اوزان اور پیمانے وغیرہ کا اعشاری نظام اختیار کیا جائے۔

(۷) مسلم ریاستوں میں صنعتی اور فنی ماہروں کا شمار کیا جائے اور ان کا ایک مشترک خزینہ ہو جس میں سے ہر ریاست کو ضرورت کے مطابق ماہرین فن مہیا کئے جائیں، سب مسلم ریاستیں سائنس اور صنعت کی تعلیم کی اسکیمیں باہمی مشورے سے بنائیں تاکہ تعلیمی اداروں میں غیر ضروری خرچ اور تکرار نہ ہو۔ حکومتوں سے درخواست کی جائے کہ صنعتی تعلیم اور سائنس کی تعلیم کے لئے کافی روپیہ مہیا کریں۔

۲۸ر دسمبر کی شام کو کانفرنس کا جو جلسہ ہوا اس میں مختلف کمیٹیوں کی رپورٹیں جن میں مندرجہ بالا تجویزیں پیش کی گئیں تھیں اتفاق رائے سے منظور کی گئیں۔

بزم بے تکلف

"لو بی مبارک ہو۔ ہمارے دیس کا آئین بن گیا"

"بس رہنے دو اپنی مبارک سلامت، تمھیں تو ہر وقت دیس کی دھن رہتی ہے کچھ گھر کی بھی خبر ہے۔ نہ آٹا نہ دال ہے، نہ ڈلی کتھا ہے، چولھا ٹھنڈا پڑا ہے پاندان اجڑا ہوا ہے۔ آئے وہاں سے آئین بن گیا"

"ہے ہے کیسی بری فال منہ سے نکالتی ہو، خدا تمھارے پاندان کو مانگ کوکھ سے ٹھنڈا رکھے"

"تمھاری ان مسخرے پن کی باتوں سے میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے"

"چلو چولھا گرم ہونے کا سامان تو ہو گیا۔ اب غصہ تو تھوک دو۔ میں ابھی پاندان اور برتن لے جاکر بنیے کے ہاں گروی رکھتا ہوں اور آٹا، دال، ڈلی، کتھا لاتا ہوں مگر پہلے اسمبلی کا ایک لطیفہ سن لو یہ تمھیں میرے سر کی قسم"

"سچ کہتی ہوں میں سر پیٹ لوں گی۔ لڑکا مدرسے سے دن بھر کا بھوکا آ رہا ہوگا، اور تمھیں لطیفے سوجھ رہے ہیں"

"اری نیک بخت آج اخبار کے دفتر سے ساڑھے دس روپے لایا ہوں سمجھیں؟ مبلغ ساڑھے دس روپے نقد جس کے آدھے سوا پانچ روپے ہوتے ہیں تمھارے لاڈلے لڑکے نے جسے تم بھوکا سمجھ کر غم کھا رہی ہو اٹھنی راستے ہی میں ہتھیالی اور چاٹ خرید کر مٹھے کے ڈٹھے چٹ کر گیا۔ باپ بچارا وضع دار ٹھیرا۔ بازار میں کیسے کھاتا، بیٹھ چاٹ کر رہ گیا۔ چار روپے اسے اور دیئے کہ جنس خرید کر لائے۔ چھ روپے جیب میں ہیں۔ کہو اب بھی لطیفہ سنو گی یا نہیں"

"کیسے نہ سنوں گی۔ جانتی ہوں کہ جب تک موا لطیفہ حلق میں اٹکا رہے گا نہ تم کو چین آئے گا اور نہ مجھے چین لینے دوگے۔ اچھا جلدی سے اگل دو، پھر میں جاکر چولھا جلاؤں"

"واہ ری تقدیر! کیا جل ککڑی بیوی پائی ہے لطیفہ اس انداز سے سنیں گی جیسے کونین کا انجکشن لگ رہا ہو۔ خیر تو ذرا دی لکھنا ہے کہ اسمبلی میں کئی دن سے ہمارے آئینی بندوقچی مشت بعد از جنگ کے طور پر دنادن زنائے کی تقریریں داغ رہے تھے۔ ان میں ایک آسام کی سرما دی کے سورما ہیں جن کے منہ سے دھواں دھار جوش میں ابلتی ہوئی تقریریں سن کر آتش فشاں کے دہانے کا شبہہ ہوتا ہے۔ مگر اس مرتبہ وہ کچھ ایسے مزے میں تھے کہ بس ایک چھوٹی سی پھل جھڑی چھوڑنے پر قناعت کی۔ فرماتے ہیں کہ آئین میں گائے اور عورت کی حفاظت کا تو اہتمام کیا گیا ہے مگر گائے اور عورت سے حفاظت کی کوئی تدبیر نہیں کی گئی"

بس یہی لطیفہ تھا جو پیٹ میں نہیں سماتا تھا وہ جوالا مکھی سورما بھی تمھارے ہی بھائی ہیں جنھیں گائے جیسی بے زبان اور عورت جیسی بے ..... بے ....."

"ہم سمجھ گئے۔ بے لگام کہنا چاہتی ہو"

"تمھاری سمجھ پر اللہ کی سنوار۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ وہ مردوے کس مٹی کے بنے ہیں جنھیں گائے جیسی بے زبان اور عورت جیسی بے بس مخلوق سے حفاظت کی ضرورت"

"خیر شکر ہے کہ تم نے عورت کی بے زبانی کا دعویٰ نہیں کیا۔ اب رہی بے بسی یہی تو وہ سان ہے جس پر چڑھنے کے بعد عورت کی زبان میں اس قیامت کی کاٹ آجاتی ہے کہ خدا کی پناہ"

"تو کاٹ دو نہ اس کی زبان۔ بس اسی کی کسر ہے"

"تو یہ تو یہ تم بھی کیسی کل جبھی ہو، زبان کاٹنے کا کیا ذکر ہے۔ ہاں اگر ایٹم بم کی نگرانی کے لیے کوئی کمیشن مقرر ہو تو ..."

"تو ہے جوالا مکھی کی نگرانی بھی منظور ہی جائے، اچھا اب میری جان چھوڑو مجھے کھانا پکانا ہے، تم بیٹھے دیکھتوں میں جا کر لطیفے بگھارو"

اشارہ

روش صدیقی

تیری منزل ترے دل میں ہے، ستاروں میں نہیں
رنگ و بو، تیرے لہو میں ہے، بہاروں میں نہیں
تیرے دامن میں یہ شعلے ہیں شراروں میں نہیں
زندگی، کیا انھیں مبہم سے اشاروں میں نہیں؟
کیوں خود اپنی ہی تجلّی سے گریزاں ہے تو
بے خبر روح صنم خانۂ امکاں ہے تو

روشنی

(م، و، باغی)

اپنی دیوانہ خرامی کی میں کھاتا ہوں قسم
تیری دنیا میں کبھی اب نہ اندھیرا ہوگا

تیرے اترے ہوئے چہرے پہ نہ ہوگی رونق؟
تجھ پہ ہنستے ہی رہیں گے یہ محلات بلند؟
تیری رگ رگ میں سما جائے گا افلاس کا غم؟
مٹی ہو کر جائے گی مخمور جوانی تیری؟
یوں ہی کمھلایا رہے گا تیری سیتا کا سہاگ؟
سب یوں ہی بھوک کی دنیا میں تڑپتے ہوں گے؟
تیری تقدیر پہ روئے گا شفق خونیں اشک؟
لو کچھ تیرے سینے سے دھواں اٹھے گا؟
یوں ہی رہ رہ کے ترے گام میں لغزش ہوگی؟
اپنی دنیا میں بھٹکتا ہی پھرے گا اے دوست؟

وہ افق پر تری منزل کا ستارا چمکا
تیری نبضوں میں جوانی کی روانی آئی
وہ پڑی بام فلک پر تری آہوں کی کمند
وہ ہوئی صبح وہ گردوں کی ہیں زنجیریں
دیکھ وہ آہنی صدیوں کے شکنجے ٹوٹے
اب زمانے میں اجالا ہی اجالا ہوگا

اپنی دیوانہ خرامی کی میں کھاتا ہوں قسم
تیری دنیا میں کبھی اب نہ اندھیرا ہوگا

نفسیات اور تجارت

خواجہ جلیل احمد

(۱)

تجارتی دنیا میں جو اب تک شعبہ ہائے "کامرس" اور "اقتصادیات" کی دست نگر سمجھی جاتی تھی موجودہ علم نفسیات کی جدید ترین فتوحات میں سے ہے۔ یوں تو کہنے کو اقتصادیات خریدنے والے اور بیچنے والے کے رشتوں پر بحث کرتی ہے لیکن درحقیقت فریقین کی صحیح نفسیات کا اندازہ لگانا نفسیات ہی کی قسمت میں تھا۔ اقتصادیات نے ہمیں بتایا کہ اشیائے ضرورت کی تقسیم اس انداز سے ہونی چاہیے اور اس تقسیم کے لیے ایسے حربے استعمال کرنے چاہئیں کہ خریدار کو مجبوراً بیچنے والے کے دام تزویر میں گرفتار ہو جانا پڑے۔ خواہ اس میں کیسا ہی اور کتنا ہی خسارہ کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ یہ نظریہ ناروا ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی استبداد انہ تھا کیونکہ اس میں خریدار کو ہمیشہ جھلاتا رہتا تھا لیکن نفسیات نے بروقت ہماری امداد کی اور انسانی فطرت کا بغور مطالعہ کر کے خریدار اور فروخت کنندگان کے مابین اس جبری رشتہ کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن تجارت کی ترقی کے لیے بہرحال ان دونوں پارٹیوں کا ایک دوسرے کے نزدیک آنا ضروری تھا۔ لہٰذا اس کا حل یہ تجویز ہوا کہ بیچنے والا اس حقیقت کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھے کہ اسے صرف اپنے مال کو فروخت ہی نہیں کرنا ہے بلکہ خریدار کو اس کی حسب حیثیت ایسا مال مہیا کرنا ہے جو نہ صرف اس کی ضرورت کا کفیل ہو سکے بلکہ اس سودے سے اسے دلی اطمینان نصیب ہو اور لٹ جانے کا احساس ختم ہو جائے۔ یہ نظریہ اگر ایک طرف انسانیت کی اعلیٰ قدروں پر مبنی تھا تو دوسری طرف اسے ذہنی عدم دیانت داری کا خاتمہ کر دیا۔ اب بیچنے والا عوام کو مال مہیا کرنے کا ذریعہ ہی نہیں رہا بلکہ وہ صحیح معنوں میں عوام کا خادم ہو گیا اور اپنے خریداروں کی صحیح ضرورت کا پتہ لگانے کی خاطر اس کی ذہنی کیفیات کا تجزیہ اس کے جملہ فرائض میں سے ایک اہم فریضہ قرار پایا لیکن ضرورت کنندگان کا یہ ذہنی انقلاب اس وقت تک شرمندۂ معنی نہیں ہو سکتا جب تک ان میں خود اپنی فطرت اور عام انسانی فطرت کی گہرائیوں کو سمجھنے کی اہلیت نہ ہو اور یہ کام صاف ظاہر ہے بلا نفسیاتی تجربات کی امداد کے ناممکن ہے لہٰذا تجارت کے مسئلے میں نفسیاتی علم کا حصول ناگزیر ہو گیا ہے۔

جیسا ہم کہہ چکے ہیں اقتصادیات اور نفسیات دونوں ہی خرید و فروخت کے مسئلہ کو اپنے اپنے طور پر حل کرنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن اول الذکر اگر فروخت کنندہ کو خریدار کی طرف نظر جمائے رکھنے کی ہدایت کرتی ہے تو نفسیات خریدار کی خواہش کا احترام کرنا سکھاتی ہے۔ ایک خریدار کی جیب پر ڈاکہ ڈالتی ہے اور دوسری اس کی خواہش کو پورا کرتی ہے اور معاوضے میں مناسب رقم قبول کرتی ہے۔ بہ نظر ظاہر دیکھنے سے دونوں کا مقصد ایک ہی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ایک اخلاقیات سے قطع نظر صرف مال کی فروخت کا انتظام کرتی ہے۔ دوسری مال کی نکاسی کے ساتھ ساتھ خریدار کو تسکین بھی بخشتی ہے۔ یہ تسکین کس طرح حاصل ہوتی ہے قدرے دقیق مسئلہ ہے۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ نفسیاتی نظائر کا پیرو اپنے مال کے فروخت کا اشتہار دیتے وقت صرف انھیں نفسیاتی حربوں سے کام لیتا ہے جو خریدار کے دل میں صرف انھیں خواہشات کو ابھار سکے جن کے حصول کی اس میں مقدرت ہے۔ ورنہ اگر پروپیگنڈے اور غلط قسم کی اشتہار بازی سے اس کے دل میں ایسی خواہش پیدا ہوئی جس کے حصول کی سعی اس کو نان شبینہ کو محتاج بنا دے گی تو اس کے لیے مشتہر مورد الزام ہوگا۔ بالعموم ہمارے صنعتی ادارے اس قسم کے پچر اور بازاری حربے عوام کو بہکانے کے لیے استعمال کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سادہ لوح اور ان پڑھ لوگ ان کے جال میں پھنس کر اپنی گاڑھے پسینے کی کمائی بھی کھو بیٹھتے ہیں اور بعد میں اس حرکت پر پشیمان بھی ہوتے ہیں، کیوں کہ انھوں نے ایک مخصوص شے کو کچھ اور سمجھ کر خریدا تھا لیکن وہ نکلی کچھ اور۔ یہ اول درجے کی بددیانتی ہے اور حکومت کا فرض ہے کہ ایسے مشتہرین کو گرفت میں لینے والے قوانین وضع کرے تاکہ پبلک کو دھوکا دینے کا امکان کم ہو جائے۔ میرے خیال سے ہم میں سے ہر شخص اس قسم کے ہزارہا اشتہارات سے جن کی بنیاد جھوٹ اور بے ایمانی پر ہوتی ہے۔ بخوبی واقف ہوگا۔ اس لیے ہم خواہ مخواہ مثالیں دے کر مضمون کو طویل نہیں کرنا چاہتے۔ بہرحال موجودہ تجارتی نفسیات" اس حرکت کے خلاف سخت احتجاج کرتی ہے اور سچائی اور دیانت داری کو اپنا رہبر بنا کر ایسے اشتہارات سے کام لیتی ہے جو عوام کے دل میں چیزوں کی خرید کی خواہش کو ضرور پیدا کر سکیں لیکن ان کو کسی مغالطے میں نہ مبتلا کریں۔ یہی سبب ہے کہ نفسیاتی نظائر کے پیرووں کے قائم کردہ اداروں کے یہاں سے جو چیزیں خریدی جائیں گی وہ خریدار کی خواہش کے مطابق اس کی ضروریات کو رفع کریں گی، اور اس سے اسے دلی تسکین حاصل ہوگی۔

بالعموم انسان کی اکثر و بیشتر خواہشات کا سرچشمہ اس کی فطری جبلتیں ہوتی ہیں جو کہ مسلّمہ حیثیت رکھتی ہیں مثلاً قوت نمو کو لیجیے ہر انسان فطری طور پر جینا چاہتا ہے اور اچھی طرح جینا۔ اب اس اچھی طرح زندگی بسر کرنے کے لیے اسے سارے لوازمات برتنے پڑتے ہیں۔ اس جبلت کے تحت میں کھانا کھانا، کپڑے پہننا، غرض کہ چھوٹی اور بڑی ہزاروں ہی باتیں آ جاتی ہیں۔ اسی طرح خطر سے بھاگنا اور اظہار خودی بھی انسانی جبلتوں میں شامل ہیں۔ ان جبلتوں کے بھی اپنی اپنی جگہ پر بہت سے مطالبات ہوتے ہیں اور ان مطالبات کو مختلف ماحول اور سوسائٹیاں مختلف ناموں سے یاد کرتی ہیں لیکن یہاں ایک بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ یہ خواہشات اور مطالبات جو براہ راست جبلتوں کی تحریک سے مرہون منت ہوتے ہیں اکثر مسخ شدہ صورت میں ہمارے اور دنیا کے سامنے آتے ہیں اور بعض حالات میں تو ان کی شکل اتنی تبدیل ہو جاتی ہے کہ ان کی اصلیت کا پتا چلانا ہی دشوار ہوتا ہے۔ لیکن ذرا سے غور و فکر اور تسلسل قائم کر کے ہم ان کے سرچشمہ یا منبع کو دریافت کر سکتے ہیں۔

ہمارے یہ مطالبات بیشتر حالات میں اتنے غیر واضح اور مبہم ہوتے ہیں کہ ہم اپنے اندر صرف ایک بے چینی سی محسوس کر کے رہ جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم کو اس کا پورا پورا احساس نہیں ہوتا کہ وہ کون سے ذرائع ہیں جن کو اختیار کر کے ہم اپنی بے چینی کو دور کر سکتے ہیں۔ خیال کے طور پر جنس کے جذبے اور اس سے متعلقہ مطالبہ محبت کو لیجیے۔ ابتدائی محبت میں واقعی ایک عجیب سی خلش اور بے چینی رہتی ہے۔ خواہ مخواہ طبیعت گھبراتی ہے۔ اور کسی کام میں جی نہیں لگتا اور تھوڑی سی شاعرانہ تعلّی ہی سہی لیکن بے اختیار زبان پر یہ یا اسی کی قسم کے دوسرے اشعار آ جاتے ہیں:-

> دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
> آخر اس درد کی دوا کیا ہے

اور ہم اس مخصوص "درد" کی کوئی دوا نہ پا کر بے چین اور بے بس ہو جاتے ہیں۔ جگر کے یہ اشعار:-

> بے تاب ہے بے خواب ہے معلوم نہیں کیوں
> دل ماہی بے آب ہے معلوم نہیں کیوں
> بے نام سی اک یاد ہے کیا جانیے کس کی
> بے وجہ تگ و تاب ہے معلوم نہیں کیوں
> دل آج بھی سینے میں دھڑکتا تو ہے لیکن
> کشتی ہی تہہ آب ہے معلوم نہیں کیوں

اسی کیفیت کے آئینہ دار ہیں اور صرف انھیں اشعار پر کیا منحصر ساری کی ساری غزل اسی غیر مبہم اور غیر واضح مطمح نظر کے اظہار کا نمونہ ہے۔ لیکن یہ مطالبہ صرف اولین محبت میں اپنی غیر واضح شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے بعد میں ہم اپنی نفسیاتی کیفیات کا تجزیہ کر کے اس مسئلے کا حل دریافت کر لیتے ہیں اور ہمیں پتہ چلتا ہے کہ "ملاقات محبوب" یا "وصل محبوب" کے سوا اس بیمار دل کا درماں اور کچھ نہ تھا۔

بالکل اس رومانی کیفیت سے ملتے جلتے اور فطری جبلتوں کے مطالبات ہوتے ہیں مثلاً بھوک کو لیجیے

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

دو کتابیں

(بہ سلسلۂ صفحہ ۲)

بغاوت عظمت رفتہ کے اوپر جینے والوں سے
بغاوت دورِ حاضر کی حکومت سے ریاست سے
بغاوت سامراجی نظم و قانون و سیاست سے
بغاوت سخت پتھر کی طرح بے حس خداؤں سے
بغاوت مفلسی کی عاجزانہ بددعاؤں سے
بغاوت درد سہنے سے بغاوت دکھ اٹھانے سے
بغاوت ایک انساں کے سوا سارے زمانے سے

لیکن محض بغاوت پر زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔ زندگی اور تخلیق بغاوت کے علاوہ کچھ اور بھی طلب کرتی ہیں بغاوت تعمیر شاید کر سکے تخلیق نہیں کر سکتی تخلیق کے لئے بغاوت کے علاوہ فنکاروں کی اپنے گرد و پیش سے تنفر کے علاوہ اس کے صحیح فہم اور ادراک کی بھی ضرورت ہے۔ بغاوت جبھی کامیاب ہو سکتی ہے جب اس کے پاس وہ ایمان و الیقان ہو جو زندگی کی بے ربطگی میں ربط۔ اس کی بے راہ روی میں تمکین اور اس کے خلفشار میں سکون پیدا کر سکے پچھلے دو صدیوں سے انسان نے اس ایمان و الیقان کو سیاسی آئین میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہے۔ بتلانے کی ضرورت نہیں وقت کے رجحانات کی وجہ سے سردار جعفری بھی آخرکار ایک سیاسی آئین ہی میں دنیا کے سارے امراض کی تلاش کرتے ہیں۔ ان کے قلب و نظر ایک ایسے سیاسی آئین کی طرف مرکوز ہوتے ہیں جس کی شریعت ان تمام باتوں کا دعویٰ کرتی ہے جن کے خواب نوجوان شاعر دیکھتا ہے اس امر کے قطع نظر کی سیاسی آئین کہاں تک اس درد کا درمان ہو سکتا ہے۔ شاعر ایسے آئین کی طرف مائل نظر آتا ہے جیسے اس کا کوئی ذاتی تجربہ نہیں، نہ اس کو اس کا موقع ملا ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے اس آئین کی کارفرمائی دیکھ سکے۔ اس آئین کے متعلق جو کچھ اس کی معلومات ہیں وہ صرف ان تفسیروں پر مبنی ہیں جو اس آئین کے خداوندوں نے اپنے پیروکار اور معتقدین کے لئے لکھی ہیں۔ یہ تفسیریں موجودہ زمانے کی ابتری پر بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کرتی ہیں کہ یہ سب کچھ ایک مخصوص نظام کی وجہ سے ہے۔ یہ نظام ٹوٹا اور اس کی جگہ ہمارے نظام نے لی تو دنیا کی ساری بیماریاں زندگی کی ساری گتھیاں دور ہو جائیں گی مجھے اس وقت اس دعوے کی صداقت سے بحث نہیں۔ البتہ یہ دیکھنا ہے کہ اس ایمان بالغیب کا نوجوان شاعر اور اس کے فن پر کیا اثر پڑتا ہے۔ شاعر اس سیاسی آئین کو لبیک کہتا ہے۔ اس میں اسے ایسے الیقان کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو شاید اس ظلمت کو حجاب تک اس کے ذہن اور تخیل کو محصور کئے ہوئے تھی دور کر دے۔ لیکن یہاں ایک بات یاد رکھنے کی ہے۔ یہ الیقان کتابی ہے تجرباتی نہیں۔ یہ نہ دماغ اور شعور کی قدرتی پیداوار ہے، نہ کسی صاحب دل کی نظر کیمیا اثر کا معجزہ ہے بلکہ حالات حاضرہ کا ردعمل ہے۔ ذہن کی ایک پرواز ہے جس میں گریز کے انداز کارفرما ہیں۔ بہرحال شاعر کے جذبات مشتعل ہوتے ہیں۔ اس کی دل کی دنیا جگمگ اٹھتی ہے

اس نئے ایمان کا اظہار شاعر طرح طرح سے کرتا ہے کبھی کہتا ہے

پکڑ کر ہاتھ مسند سے اٹھا دیتا ہوں سلطاں کو
بٹھا دیتا ہوں لاکر تخت پر قیصر کے دہقاں کو
میرے ہونٹوں پہ نغمے کانپتے ہیں دل کے تاروں کے
میں ہولی کھیلتا ہوں خوں سے سرمایہ داروں کے

سرمایہ داری، خون، دہقاں، مزدور، انقلاب اب لوازمات شاعری بن جاتے ہیں۔ غالب کو اگر مشاہدۂ حق کی گفتگو کے لئے بادہ و ساغر کی ضرورت پڑتی تھی تو سردار جعفری کو حق گوئی کے لئے اشتراکیت، پروپیگنڈا درکار ہیں۔ لیکن یہ بادہ بھی نیا اور ساغر بھی نیا اور شاعر بھی ان لوازمات کو برتنے کے لئے بھی مزاولت اور ریاض چاہیئے۔ نوجوان شاعر اس لئے ان نئے ساز و سامان کا استعمال اس صفائی اور چابک دستی سے نہیں کر پاتا جس طرح غالب اپنے بادہ و ساغر کا کرتا ہے۔

سردار جعفری کا اسلوب بیان، اُن کی شوخیٔ تخیل۔ ان کی شعریت، ان لوازمات کا بار مشکل سے اٹھا پاتی ہیں۔ انداز بیان کا ستھراپن اور توازن بگڑ جاتا ہے تخیل، ذہنی کاوشوں اور فلسفۂ اشتراکیت کی موشگافیوں میں پھنس کر اپنی شوخی اور سبک رفتاری کو بڑی حد تک کھو دیتا ہے۔ شعریت شدید جانب دارانہ پروپگنڈا کی شکار ہو جاتی ہے۔ ادھر دنیا کا نقشہ جلد جلد بدلنا شروع ہو جاتا ہے۔ روس کا جرمن سے مردانہ وار مقابلہ برلن کی فتح۔ روسی سپاہیوں کی بے مثال بہادری، روس کی اقتصادی ہمت ان سب کا اثر نوجوان شاعر پر بہت گہرا پڑتا ہے۔ اور وہ آخرکار لال شاعر، سرخ پرچم کا شاعر۔ اشتراکیت کا شاعر بن جاتا ہے۔ اب کبھی وہ بمبئی کے ملاحوں کی بغاوت پر خوش ہوتا ہے کبھی تلنگانہ کے کسانوں کی سرفروشیوں پر مسرت کے شادیانے بجاتا ہے۔ کبھی لینن کے عظمت کے گیت گاتا ہے۔ کبھی روسی سپاہی کی بہادری پر درود بھیجتا ہے، اور کبھی انقلاب چین کو حیات نو کا پیش خیمہ گردان کر وجد کرتا ہے اور کہتا ہے۔

"اب ہوا چین کا نام گنگناتی ہے
اب فضا چین کے نام پر مسکراتی ہے

اور

چین سب سے بڑا گیت سب سے حسین نظم ہے
چین ایک حوصلہ، ایک امنگ، اک عزم ہے

لیکن یہ سب کہتے ہوئے شاعر کا لب و لہجہ تلخ و تند ہو جاتا ہے کبھی کبھی تو اس کی آواز میں ہسٹریائی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسلوب بیان پا شکستہ اور زبان زخم خوردہ ہو جاتی ہے۔ خیالات گنجلک اور غیر مربوط، تصورات مبہم اور پیچیدہ ہو کر رہ جاتے ہیں اور شعریت مجروح ہو جاتی ہے۔ مجموعے کی چند ابتدائی نظمیں مثلاً تذبذب مزدور لڑکیاں، انتظار نہ کر، وہم و خیال کو ملاحظہ کیجئے اور ان کا مقابلہ دوسری نظموں مثلاً خواب، سیلاب چین وغیرہ سے کیجئے تو واضح ہو جائے گا کہ ان تمام باتوں کا شاعر کے فن پر کیا اثر پڑا ہے۔

مستقبل بتائے گا کہ سردار جعفری اس منزل سے کب اور کیوں کر نکلتے ہیں۔ اگر اُن کی شعریت ان کی موجودہ جانبدارانہ شاعری سے عہدہ برآ ہو سکتی تو امید کی جا سکتی ہے کہ شاید وہ ایک دن اس مقام پر پہنچ جائیں جہاں سے غالب کہتا ہے

عشاق فریب حق و باطل سے جدا ہیں

نوکِ نشتر

کنہیا لال صاحب کپور کے ۱۴ مضامین کا مجموعہ ہے۔ مجھے ندامت کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میں نے کپور صاحب کی دو پہلی کتابیں۔ سنگ و خشت، اور شیشہ و تیشہ نہیں پڑھیں۔ نوکِ نشتر ہی ان کی پہلی کتاب ہے جس سے متلطف ہوا ہوں۔

میں اپنے کو ہرگز ہرگز ان صاحب بصیرت حضرات میں تصور نہیں کرتا جو محض لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ جاتے ہیں۔ نوکِ نشتر کے نام سے بس میں اتنا ہی سمجھا کہ ہوگی کسی ترقی پسند کی کوئی نئی کتاب۔ ان حضرات کے اختراع کا ہمیشہ سے قائل ہوں کتابوں کا نام بھی تجویز کرتے ہیں تو ایسا کہ خواہ مخواہ آدمی کی نگاہ اور جیب پر چوٹ لگے۔ میں نے یہی سب کچھ سوچ کر کتاب اٹھائی۔ اور پہلا مضمون برج بانو شروع کیا۔ پہلے دو صفحوں تک تو یہی سمجھتا رہا کہ مساوات کی کوئی داستاں ہوگی لکھنے والا انسانوں کی بہیمیت کا نقشہ کھینچ کر ثابت کرے گا کہ یا تو ہم لوگ آزادی کے قابل نہیں تھے یا ہمیں آزادی کی سخت قیمت ادا کرنی پڑی یا دلوں میں جو ان فسادات سے ناسور پڑ گئے ہیں ان پر آنسو بہائے گا، صف ماتم بچھائے گا اور سینہ کوبی کر کے مضمونوں کو ایک اضطرابی نعرہ پر ختم کر دے گا۔ لیکن دوسرے صفحے پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ ایں چیزے دیگر است جہاں نہ فسادات کے خونی مناظر کی عکاسی ہے نہ قتل و غارتگری کے افسانوں پر خون کے آنسو ہیں بلکہ کچھ ایسی لطیف اور مزے دار چٹکیاں ہیں جن سے پڑھنے والا ایک ہی وقت میں تلملا بھی اٹھتا ہے اور محظوظ بھی ہوتا ہے جو رلاتی بھی ہیں اور ہنساتی بھی

کپور صاحب ہنسا ہنسا اور رلا رلا کر بڑے پتے کی بات کہہ جاتے ہیں، اور کڑواہٹ سے کڑوی بات بھی اس انداز سے کہتے ہیں کہ سننے والا بدمزہ نہیں ہوتا۔ طنز کی اس سے بڑی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ برج بانو میری رائے میں طنز کی ایک کامیاب مثال ہے۔ اس میں طنز کے نشتر کا اس چابک دستی سے استعمال کیا گیا ہے کہ معمول کو شروع میں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس کے نشتر چبھایا جا رہا ہے۔ اس کے جراحت کا پتہ اسی وقت چلتا ہے جب پورا نشتر پیوست ہو جاتا ہے۔ لیکن نشتر سے جو ٹیس پیدا ہوتی ہے اس میں بھی ایک لذت ہے۔ بہرحال برج بانو ایک کامیاب طنز ہے اس کی کامیابی کی ایک اور بھی وجہ ہے۔ کپور صاحب ایک ہوشیار جراح کی طرح جانتے ہیں کہ نشتر کہاں تک لگایا جا سکتا ہے۔ برج بانو کو وہ جہاں لاکر ختم کرتے ہیں ٹھیک وہی مقام ہے جہاں اسے ختم ہونا چاہیئے تھا۔

اس میں اگر ایک فقرہ کا بھی اضافہ ہو جاتا تو طنز کا سارا اثر اور کیف جاتا رہتا۔

طنز ایک ایسا نازک آلۂ حرب ہے کہ اس کا استعمال کرنے والا اگر ہوشیار نہیں تو خود اپنے ہاتھ زخمی کر لیتا ہے۔ اس کے ہاتھ سبک اگر نہ پڑیں تو خون خرابہ ہو جاتا ہے۔ صاحب طنز کا دائرۂ عمل محدود ہوتا ہے۔ وہ نہ صورت حال کا تجزیہ کرتا ہے نہ اس کی نقاشی وہ تو کھٹی رگ پکڑتا ہے۔ اور اس میں ایسی چٹکی لیتا ہے کہ سارے جسم کو اس رگ کا احساس ہو جائے۔ وہ دبے ہوئے اور پوشیدہ پھوڑوں کو تلاش کر کے ان پر نشتر لگاتا ہے تاکہ گندہ مواد سطح زخم پر آ جائے اور اس کا اندمال ہو سکے۔ کپور صاحب اس نشتر کے صحیح استعمال سے واقف ہیں۔ ان کے ہاتھ منجھ گئے ہیں۔ نوک نشتر میں شاید ہی کوئی کپور صاحب کے ہاتھوں سے بچا ہو۔ "سخن فہم" ہیں۔ مشاعرہ اور مشاعرے سے زیادہ ایسے پرگو شاعروں پر ایک ضرب کاری لگائی گئی ہے جن کے سینے پر اپنے کلام کا اس قدر شدید بوجھ ہوتا ہے کہ اس کو پھیلائے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتے۔ ایسے شاعروں کو کوئی نہیں جانتا۔ ہمیشہ مُصر رہتے ہیں۔ اک ذرا چھیڑ دیجئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ "سخن فہم" ایک پر لطف اور سبق آموز طنز ہے۔ اس کا اختتام البتہ ذرا کھنچ گیا ہے اور کچھ آپے باہر ہو گیا ہے۔ شاید ممن صاحب کے کلام کا جادو اتنا اثر کر گیا کہ کپور صاحب اپنی چابک دستی بھول گئے "شن شن شان" ذرا ضرورت سے زیادہ واضح ہو گیا اتنا واضح کہ اس میں طنز کی سادگی اور پرکاری کافور ہو گئی۔ "شہید اور غنڈے" "ہجرت کے فائدے" "فلم ڈائرکٹر کے نام" "زندہ باد"۔ طنز کے چند کامیاب نمونے ہیں۔ ان سب میں بلا کی چوٹیں ہیں۔ "فلم ڈائرکٹر کے نام" مختصر لیکن جامع طنز موجودہ فلم سازی کی "بدنامیوں اور رسوائیوں پر" قابل قدر چیز ہے۔ مجموعی طور پر نوک نشتر طنزیات میں ایک قابل قدر اضافہ ہے پیش لفظ میں کپور صاحب نے دھمکی دی ہے کہ اب وہ ایک مدت تک کوئی کتاب نہیں لکھیں گے۔ خدا کرے وہ اس دھمکی کو پورا نہ کر سکیں۔ آمین

بچے اور اُن کی جبلّت

(۳)

محمد حسنین

۶۔ نفرت

طنز، تحقیر، بغض، کینہ، عناد کی شاخیں نفرت کے تنے سے پھوٹتی رہتی ہیں۔ شروع شروع میں یہ جذبہ نفرت کی صورت میں نمودار نہیں ہوتا، بلکہ ناپسندیدگی خفگی اور چڑ کی منزلیں طے کرتا ہوا نفرت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

بچوں کے ساتھ بڑوں کی ضد بچہ میں نفرت کا بیج بوتی ہے جس قدر ہم کسی بات پر جسے بچہ ناپسند کرتا ہے یا جس میں کوئی دلچسپی یا کشش اُسے نظر نہیں آتی اصرار کرتے ہیں اسی قدر بچے میں اس بات سے چڑ اور نفرت بڑھنے لگتی ہے —— بچہ اپنا جوتا اتار پھینکتا ہے اس میں اُسے کوئی اچھائی نظر نہیں آتی۔ ماں چاہتی ہے کہ یہ ننگے پاؤں نہ رہے۔ ماں کی خواہش بلاشبہ قابل قدر ہے۔ وہ بچے کے جوتا پہننے پر اصرار کرتی ہے جوتا اتار پھینکنے پر اس کی تنبیہ کرتی ہے اور کبھی خفا ہو کر اسے کھیلنے سے اٹھا لیتی ہے۔ دونوں پیروں کو اچھی طرح دھو کر زبردستی جوتا پہنا دیتی ہے۔ یہ سب باتیں بچے کی مرضی کے خلاف ہوتی ہیں۔ ناپسندیدگی یا رضامندی سے بچے کو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ وہ جوتے سے کڑھنے لگتا ہے۔ ماں کی زبردستی یا ضد اس کی کڑھن کو تیز اور تیز تر کرتی جاتی ہے، اور آخر جوتا ماں سے نفرت کا سبب بن جاتا ہے۔

نفرت بھی خوف، غصہ اور ضد کی طرح جسمانی کمزوری سے تیز ہو جاتی ہے۔ وہ بچے جو پیدائشی کمزور لاغر یا کسی جسمانی نقص کا شکار رہیں۔ نفرت کے جذبے سے بہت جلد متاثر ہوتے ہیں۔ بدرنگ، بدشکل بدوضع یا لاغر بچے حسین شکیل، خوبصورت جمیل یا تندرست بچوں کی صحبت میں وہ لطف نہیں اٹھاتے جو کانے، کن کٹے، لولے، لنگڑے بچوں کی صحبت میں حاصل کرتے ہیں ایسے بچوں میں دوسرے بچوں سے ان کی نفرت کا سبب محض ان احساس کمتری کا ہوتا ہے۔ بچے کی کسی بات سے یا شے سے ناراضگی کو جلد جلد دور کر دینا چاہیئے۔ اس لئے کہ بچے کی یہ مخصوص نفرادی کیفیت عمر کے بڑھتے ہی مستقل ہونے لگتی ہے اکثر تعلیم یافتہ لوگ بڑی عمر میں بھی کسی معمولی روزمرہ کی چیز سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ دسترخوان پر انواع و قسام کے لذیذ کھانوں کے درمیان اروی کا قلیہ یا بیگن کا بھرتہ دیکھ کر بلا مبالغہ ان کی اشتہا پر جیسے اوس پڑ جاتی ہے۔ ان کی اس نفرت کا اگر ہم کھوج لگائیں تو اس کا سلسلہ بچپن تک پہنچے گا، اسی طرح بچوں کا کسی خاص مضمون کو ناپسند کرنا آگے چل کر ان کے عزم و عمل میں سد راہ بن جایا کرتا ہے۔ ہماری قوم میں بیشتر طلبہ کی ریاضی سے وحشت بچپنے کی اسی نفرت کا نتیجہ ہے۔

ص ۴ مثال کے لئے جرمنی کے ڈکٹیٹر ہٹلر کا نام لینا کافی ہے جس نے یورپ کو تہ و بالا کر دیا بلکہ ساری دنیا میں ہلچل ڈال دی جن لوگوں نے اس کی زندگی کے حالات پڑھے ہیں وہ جانتے ہیں کہ کس طرح بچپن کے ناگوار اثرات نے اس کے دل میں نفرت کی آگ بھڑکا دی اور بغض و عناد، حسد اور کینے کے جذبات جن کا نفرت سے چولی دامن کا ساتھ ہے پیدا کر دیے۔ پہلی جنگ عظیم میں شکست کھانے کے بعد ساری جرمن قوم میں ضد، غصے اور بیزاری کی ایک عام کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن اس بے پناہ نفرت نے جو ہٹلر کے سینے میں بچپن سے پرورش پا رہی تھی اپنی قوم کی اس غیر معین کیفیت کو یہودیوں، جمہوریت پسندوں اور اشتراکیوں سے نفرت کی معین شکل دے دی اور ان کی سیرت اور اخلاق کو بالکل مسخ کر دیا۔

لیپ چا

شیخ حبیب اللہ

سائنسی ذرائع آمد و رفت نے ہماری دنیا کو تنگ کر دیا ہے۔ بااین ہمہ بیسیوں اپنے گمنام گوشے اس دنیا میں موجود ہیں جہاں عجیب و غریب اشیا اور حیرت انگیز خلقت مشہور ہے۔ ان انجانی خلقت میں لیپ چا بھی ہیں جو ہمالیہ کی ترائیوں میں بسلج مان ہیں۔ اب ان کی تعداد قلیل ہے۔ کیوں کہ قوی ترقوموں کی دست درازیوں نے انھیں اور بھی گمنام گوشوں میں پناہ گزیں ہونے پر مجبور کر دیا۔ اول اول اہل تبت نے اس قوم پر حملہ کیا اور انھیں وادیوں میں ڈھکیل دیا۔ جب تب بتیوں نے جگہ خالی کی تو نیپالیوں نے اپنا سکہ جما لیا۔ یہی سبب ہے کہ اب لیپ چا صرف نامعلوم وادیوں اور پہاڑوں میں پائے جاتے ہیں۔

لیپ چا شرمیلے اور تنہائی پسند ہوتے ہیں وہ پیدائشی قدرت پسند ہیں انھیں زراعت کے فن سے واقفیت نہیں۔ ان کی آبادی سکم اور کلیم پونگ میں پائی جاتی ہے۔ سکم کے لیپ چاؤں نے اپنے قدیمی کلچر کو برقرار رکھا ہے۔ مگر کلیم پونگ کے لیپ چا نیپالیوں میں ضم ہو گئے ہیں۔ کیونکہ ان دونوں کے درمیان رشتۂ مناکحت ہے۔ پادریوں نے بھی ان کے درمیان تبلیغ کا کام شروع کر دیا ہے اور انھوں نے انگریزی پڑھنا بھی شروع کر دیا ہے۔

ہر چند کہ ان میں تہذیب حاضر کی روشنی نہیں پہنچی ہے مگر شاید یہ اسی ظلمت کا طفیل ہے کہ وہ خوش و خرم ہیں۔ یہ لوگ ہنوز اسی قدیم کاشت کاری پر عمل پیرا ہیں یعنی اونچی زمینوں میں جوار باجرا بوتے ہیں اور وادیوں میں تھوڑا بہت چاول۔ جہد للبقا نے انھیں بھائی چارگی اور آپس کا میل جول سکھا دیا ہے وہ تھوڑے پر قناعت پذیر ہیں اور کبھی انھیں وافر اناج اور کافی مویشی حاصل ہو جاتے ہیں تو پھر خوب سیر شکم ہو کر کھاتے ہیں۔ اُن کا کوئی مذہب و عقیدہ نہیں اور یہی سبب ہے کہ پادری اپنی تبلیغ میں بہت کامیاب ہیں۔ یہ قوم اتنی توہم پرست ہے کہ انھیں ہر ٹیلے پہاڑ اور چشمے میں فوق البشریت نظر آتی ہے۔ ان میں بھی ایک پجاری ہوتا ہے جس کا کام صرف تقریب منانا اور قربانی کا جانور کاٹنا ہوتا ہے۔ اچھے اور برے کی انھیں تمیز تو ہے۔ مگر نجات کیا ہے انھیں معلوم نہیں۔ لیپ چا کسی فلسفی کے تخیل کی خلقت نہیں البتہ انھوں نے اپنی زندگی کو کسی تنظیمی جماعت کے ذریعے تشکیل کیا ہے بلکہ ان کی زندگی تجربے کی نہائی پر پٹ کر تیار ہوئی ہے انھیں سائنس و فن سے لگاؤ نہیں۔ ان کی زندگی سادہ معمولی ہے۔ کیونکہ ان کی ضروریات بھی سادہ و معمولی ہیں، اور اسی میں ان کی خوشی جھلکتی ہے۔

(ماخوذ)

دنیا پر امریکہ کیوں چھایا ہوا ہے؟

محمد امین

آج ساری دنیا پر امریکہ ہر لحاظ سے چھایا ہوا ہے۔ شمالی کرہ ہو خواہ جنوبی، مغربی ہو یا مشرقی ہر طرف اور ہر دیش میں امریکہ ہی امریکہ کی دھوم مچی ہوئی ہے ہمارے ملک میں پہلے امریکہ کا چرچا کم تھا لیکن وزیر اعظم کے وہاں جانے سے یہاں بھی آج کل اخباروں میں امریکہ ہی کے ڈھول پٹ رہے ہیں۔ پچھلی جنگ سے پہلے برطانیہ ایک لحاظ سے دنیا پر چھایا ہوا تھا لیکن دوران جنگ میں اس کے اقتدار کی بنیاد ڈانواڈول ہو گئی اور جنگ ختم ہوتے ہوتے وہ ایک دوسرے نمبر کی طاقت بن کر رہ گیا۔ اس درمیان میں امریکہ آگے بڑھتا رہا اور اپنے قدرتی ذرائع کو جنگ کے مقاصد کے لئے استعمال کرتا رہا۔ اندرونی طور سے وہ اپنے حلقۂ اثر کو دن بدن بڑھاتا رہا اور خاموشی سے بحیثیت ایک بین الاقوامی قوت کے برطانیہ کی جگہ کو پر کرتا رہا۔ آج اس کا شمار دنیا کی سب سے بڑی طاقتوں میں ہے۔

کیا وجہ ہے کہ دوران جنگ میں امریکہ اتنی تیزی سے ترقی کر گیا اور جنگ ختم ہونے کے بعد سے اب تک وہ دنیا کے بہت سے ملکوں پر چھا چکا ہے اور بہتوں پر قدم جمانے کی کوشش کر رہا ہے؟

معاشی اور صنعتی نقطۂ نظر سے پایہ کی بات یہ ہے کہ جس ملک میں اچھے قسم کا کوئلہ اور لوہا کثرت سے پایا جاتا ہے وہ ملک ایک نہ ایک دن ضرور ترقی کرتا ہے امریکہ کی معدنیات کا نقشہ اٹھا کر ہم دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہاں جنوب مشرقی پلیٹو کے علاقے میں کئی سو میل ایک ایسا خطہ ہے جہاں کوئلہ ہی کوئلہ پایا جاتا ہے۔ یہاں سے کوئلہ لاکھوں ٹن نکالا جاتا ہے اور امریکہ کی مختلف صنعتوں میں استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امریکہ میں دنیا کے ذخیرہ کا ۰ ۰ ۰ ۵ فی صدی کوئلہ موجود ہے یہ کوئلہ گھٹیا اور بے کار نہیں ہے۔ بلکہ خوبیوں کے لحاظ سے لوہے کو گلانے کے لئے بہت ہی مؤثر اور مفید ہے۔

بڑی جھیلوں کا علاقہ امریکہ میں بھلا کون نہیں جانتا۔ یہاں جھیل سوپیریر کے جنوب اور مغرب میں زمین کی تہہ کے اندر لوہے کی ان گنت کانیں ہیں۔ کوئلے کی طرح یہاں کا لوہا بھی بہت عمدہ اور پایہ کا ہوتا ہے۔ بڑی جھیلوں کے ذریعے ذرائع آمد و رفت میں بڑی آسانی ہے چنانچہ

جلد ہی کوئلہ جھیلوں کے راستے سے کوئلے کی کانوں کے قریب آنے لگا۔

کوئلہ اور لوہے کے اتصال سے یو، ایس، اے میں لوہے اور فولاد کی صنعت ابھر آئی۔ ابتدا میں لوہے کی صنعت کا مرکز کوئلہ کی کان کا علاقہ رہا اور پٹس برگ اس کا خاص شہر تھا، لیکن جوں جوں پانی اور ریلوں کے ذریعے آمد و رفت میں ترقی ہوئی حالات بدلنا شروع ہو گئے اور کچھ دنوں کے بعد کوئلہ اب لوہے کے علاقے میں جانے لگا جھیلوں کے راستے سے کوئلہ ڈولیتھ اور شکاگو تک با آسانی پہنچ جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈولیتھ اور شکاگو سے لے کر پٹس برگ تک کا تمام علاقہ لوہے اور کوئلے کی صنعت کے لئے مخصوص ہو گیا۔ جھیلوں کے کنارے جو شہر آباد تھے وہاں پر بھی دونوں دھاتوں کے میل جول سے لوہے اور فولاد کی صنعت ابھر آئی اور تیزی سے ترقی کر گئی۔

دوران جنگ میں لوہے کی صنعت سے اسلحہ و ہتھیار تیار کرنے میں پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا اور ہر محاذ کو ٹینک، مشین گن، ہوائی جہاز، گولہ بارود اور جیب سے امریکہ نے پاٹ دیا۔ جنگ ختم ہونے کے ساتھ ہی سارا کا سارا صنعتی نظام بدل گیا، اور امریکہ نے ٹینک، مشین گن اور جیب کے بجائے ٹریکٹر، انجن اور بسیں تیار کرنا شروع کر دیں۔ موجودہ زمانے کی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے اس نے اپنے یہاں کا تیار شدہ مال ہر ملک میں بھیجنا شروع کر دیا۔ جرمنی، جاپان اور اٹلی کے شکست کھا جانے کے بعد دنیا کا بازار اس کے لئے کھلا تھا۔ برطانیہ کی کمر ٹوٹ چکی تھی اس لئے دیکھتے دیکھتے امریکہ تمام دنیا کی تجارت پر چھا گیا۔

لیکن امریکہ کے سرمایہ دارانہ نظام کا دار و مدار صرف لوہے اور کوئلے کی صنعت پر نہیں ہے بلکہ بہت حد تک پٹرول یعنی مٹی کے تیل کو بھی دخل ہے۔

ارضیات کے ماہروں کا اندازہ ہے کہ دنیا میں مٹی کے تیل کا ذخیرہ بہت محدود ہے اور جو کچھ بھی ہے وہ موجودہ خرچ کے لحاظ سے بمشکل بیس پچیس سال تک چل سکتا ہے اس کے بعد تیل کے اور ذخیرے اگر نہیں معلوم ہوئے تو سمجھئے کہ ساری دنیا میں پٹرول کا کال پڑ جائے گا اور پھر پتہ نہیں کہ کیا ہو۔ بہر حال یوں سمجھئے کہ جو کچھ بھی تیل کا ذخیرہ موجود ہے اس کا دو تہائی حصہ یو، ایس، اے میں ہے۔ لیکن چونکہ پٹرول کا خرچ وہاں سب سے زیادہ ہے اس لئے امریکیوں کو یہ فکر لگ گئی ہے کہ کہیں انھیں کے تیل کے چشمے سب سے پہلے نہ خشک ہو جائیں۔ چنانچہ جلد ہی کہ یہ احساس وہاں کے ماہرین اور سرمایہ داروں کو ہوا اسی دن سے ان لوگوں نے تیل کے نئے نئے چشمے معلوم کرنے کے لئے اور ملکوں میں جد و جہد شروع کر دی۔ حال میں عرب کی سرزمین میں تیل کے بہت سے نئے چشمے معلوم کئے گئے ہیں اور اس کی وجہ سے امریکہ میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔

یو، ایس، اے میں سب سے زیادہ پٹرول ٹکساس کی ریاست میں نکالا جاتا ہے۔ اس کے بعد کیلی فورنیا کا نمبر ہے۔ بہت سا تیل راکی پہاڑ اور اپلیشین پلیٹو میں بھی ہے اور وسطی میدان کے مغربی علاقے میں بھی۔ یوں سمجھئے کہ یو، ایس، اے میں اس سرے سے اس سرے تک تیل کے چشمے ہی چشمے ہیں اور ان کا ذخیرہ اربوں گیلن ہے۔

یو، ایس، اے میں اور بھی بہت سی دھاتیں پائی جاتی ہیں مثلاً سونا، چاندی، تانبا، جستہ اور یورینیم۔ راکی پہاڑ کا علاقہ ان دھاتوں کے لئے مخصوص ہے اور اندازہ ہے کہ ابھی اور بھی بہت سی قیمتی دھاتیں وہاں پوشیدہ ہیں جو ذرائع آمد و رفت کی آسانی حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ معلوم ہوتی رہیں گی، اور یو، ایس، اے کو خوش حال بنانے میں مددگار ثابت ہوں گی۔

یو، ایس، اے میں ہر قسم کی فصل، غلہ ہو خواہ خام پیداوار ہر چیز بہت افراط سے ہوتی ہے۔ وہاں کی آب و ہوا اور دوسرے جغرافیائی حالات ایسے ہیں کہ وہاں ہر فصل کے لئے ایک ایک خطہ مخصوص ہے۔ یو، ایس، اے کے وسطی میدان میں اگر ہم جنوب سے شمال کی طرف جائیں تو کھیتوں میں ہمیں کئی طرح کی فصلیں لہلہاتی ہوئی ملیں گی بالکل جنوب میں خلیج میکسیکو کے ساحل کے ساتھ ساتھ گنے اور چاول کی کاشت بڑے پیمانے پر ہوتی ہے۔ ذرا اور شمال کی طرف بڑھئے تو آب و ہوا میں تبدیلی محسوس ہوگی اور بارش کم ہوتی جائے گی چنانچہ گنے اور چاول کی کاشت سے متصل شمال کی طرف روئی کا خطہ ہے۔ اس علاقے میں مشرقی پلیٹو اور راکی پہاڑ کے درمیان دریائے

مسی سی پی کے بیسن میں کپاس ہی کپاس کے کھیت میں گے کپاس کی کاشت یہاں بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہوتی ہے۔ اور یہاں کی کپاس دنیا میں سب سے عمدہ مانی جاتی ہے زیادہ تر اس سے بہترین قسم کے سوتی کپڑے تیار ہوتے ہیں۔ سوتی کارخانے اس خطے کے مشرقی حصے میں شمال سے جنوب کی طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ کوئلہ اور کپاس دونوں آس پاس پائے جانے کی وجہ سے بڑی آسانی ہے۔ ایک نہیں ہزاروں کارخانے ہیں جو نہ صرف سوتی کپڑا بناتے ہیں بلکہ مصنوعی ریشم اور کپاس کی ملاوٹ سے ایک خاص قسم کا چمکدار کپڑا تیار کرتے ہیں۔ جو ہمارے ملک میں بھی بہت رائج ہے۔

روئی کے خطے سے ذرا اور شمال کی طرف بڑھئے تو ہم ایک ایسے خطے میں داخل ہوں گے جہاں کے قدرتی حالات گیہوں اور مکا کی فصل کے لئے بہت موزوں ہیں چنانچہ اس علاقے میں گیہوں اور مکا دونوں کی کاشت باری باری سے ہوتی ہے۔ ذرا اور اوپر کی طرف چلئے تو موسم سرد ہوتا جائے گا اور گیہوں کے بجائے مکا کی کاشت مخصوص ہوتی جائے گی یہاں تک کہ ہم ایک ایسے خطے میں پہنچ جائیں گے جہاں صرف مکا ہی مکا نظر آئے گا۔ اس علاقے میں نہ صرف یہ کہ مکا کی فصل اعلیٰ پیمانے پر تیار ہوتی ہے بلکہ لاتعداد سوروں کی بھی پرورش ہوتی ہے۔ مکا کی جڑ سوروں کی غذا کے لئے بہت مفید ہوتی ہے۔ چنانچہ فصل کٹ جانے کے بعد سور مع اپنے بچوں کے کھیتوں میں ہانک دئے جاتے ہیں اور وہ خود بخود اپنے تھوتھنوں سے زمین کھود کھود کر مکا کی جڑوں سے اپنی غذا حاصل کرتے ہیں۔ چھ مہینے کے اندر اندر سور کے بچے بڑے ہو کر موٹے تازے اور ہٹے کٹے ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد وہ شکاگو بھیج دئے جاتے ہیں جو دنیا میں گوشت کی صنعت کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ یہاں روزانہ ایک لاکھ سے زیادہ سور مشین کی مدد سے ذبح کئے جاتے ہیں اور ان کا گوشت ڈبوں میں بھر کر امریکہ کے دوسرے علاقوں میں اور باہر کے ملکوں میں بھیجا جاتا ہے۔ امریکہ کی صنعتی ترقی کا اندازہ تھوڑا بہت اس سے بھی ہوتا ہے کہ وہاں سور کے جسم کی کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی، بجز اس چیخ کے جو ذبح کرتے وقت اس کے منہ سے نکلتی ہے۔ شکاگو نہ صرف گوشت کی سب سے بڑی منڈی ہے بلکہ وہ یو۔ ایس۔ اے کا دوسرا سب سے بڑا شہر ہے اور وسطی میدان میں تجارتی معاشی اور صنعتی نقطۂ نظر سے سب سے بڑا مرکز۔

بڑی جھیلوں اور مکا کے خطے کے درمیان ایک ایسا علاقہ ہے جہاں کی آب و ہوا گھاس کی پیداوار کے لئے بہت موافق ہے چنانچہ یہاں گائے بھینس لاتعداد پائی جاتی ہیں۔ اور ان سے دودھ، پنیر، مکھن، کریم لاکھوں پونڈ حاصل کی جاتی ہیں۔ یہاں پر زیادہ تر مویشی دودھ حاصل کرنے کے لئے پالے جاتے ہیں، اور سارا کام سائنس کی مدد سے جدید طریقے پر ہوتا ہے۔ اس خطے میں مرغیاں بھی بہت پالی جاتی ہیں، اور ان کے انڈے بہت افراط سے ہوتے ہیں۔

کپاس، مکا اور گیہوں اور خالص مکا اور مویشی کے خطے سے ذرا مغرب کی طرف چلئے تو ہمیں حالات بدلتے ہوئے نظر آئیں گے۔ سالانہ بارش کم ہوتی جائے گی۔ اور سردیوں کی شدت بڑھتی جائے گی۔ یہاں کی مٹی کالی ہے، اور گیہوں کے لئے بہت موزوں۔ لہٰذا وسطی میدان کے جو راکی پہاڑ کے دامن میں واقع ہے شمال سے جنوب تک گیہوں ہی گیہوں کی کاشت ہوتی ہے۔ اوپری حصے میں فصل بہار کا گیہوں اور جنوبی حصے میں فصل سرما کا گیہوں سائنس کے جدید طریقے پر لاکھوں ٹن پیدا ہوتا ہے۔ یہاں کے کسان اور زمیندار بہت سا گیہوں اپنے مویشیوں کو بھی کھلاتے ہیں، اور اس کے باوجود ہر سال لاکھوں ٹن ان کے پاس بچ رہتا ہے۔

وسطی میدان کا مغربی حصہ جو راکی پہاڑ سے متصل ہے زیادہ خشک اور پہاڑی ہے۔ قدرتی حالات تو اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہاں بھی کسی فصل کی کاشت ہو۔ لیکن امریکہ کے لوگ سائنس میں اس قدر آگے بڑھے ہوئے ہیں کہ انھوں نے گیہوں کی ایک ایسی قسم پیدا کر لی ہے جو خشک موسمی حالات برداشت کر سکتی

یو۔ ایس۔ اے (زراعت)

نمبر	خطہ
۱	چاول کا خطہ
۲	کپاس کا خطہ
۳	مکا اور گیہوں کا خطہ
۴	مکا کا خطہ
۵	مویشیوں کا خطہ
۶	گیہوں کا خطہ
۷	سبزی اور رسیلے پھل کا خطہ
۸	تمباکو کا خطہ
۹	بھیڑوں کا خطہ
۱۰	پھلوں کا خطہ

ہے اور بخوبی اُگ سکتی ہے۔ چنانچہ اس حصے میں بھی خشکی کو برداشت کرنے والا گیہوں بڑے پیمانے پر ہوتا ہے۔ اس لئے مغرب کی جانب قدرتی حالات بھیڑوں کے لئے موزوں ہیں۔ چنانچہ یہاں لاکھوں بھیڑ پالی جاتی ہیں اور ان کا اون مشرقی پلیٹو کے سوتی اور ریشمی اور اونی علاقے کے شہروں میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں کے کارخانوں میں اونی کپڑے تیار کئے جاتے ہیں۔

اب ذرا وسطی میدان سے مشرق کی طرف چلئے۔ آہستہ آہستہ آپ مشرقی پلیٹو سے گذر کر بحر اوقیانوس کے ساحل پر آ جائیں گے۔ یہ ساحل شمال سے جنوب کی طرف پھیلا ہوا ہے اور خاصا لمبا چوڑا میدان ہے۔ اس کی مٹی میں زیادہ تر ریت ہے۔ لہٰذا یہ تصور کرنا کہ یہاں بھی کوئی مفید چیز پیدا ہو سکتی ہے ذرا مشکل ہے۔ لیکن یو۔ ایس۔ اے کے کسان اس قدر عقل مند، ہوشیار اور جفاکش ہیں کہ اس ریتیلی مٹی کو بھی انھوں نے بے کار نہیں چھوڑا۔ سال میں بارش یہاں بہت کافی ہوتی ہے اور مٹی میں تھوڑی بہت کھاد ملا دینے سے وہ زرخیز ہو جاتی ہے چنانچہ یہاں کا سارا ساحلی میدان رسیلے اور چھوٹے چھوٹے پھلوں

اور سبزیوں کی کاشت کے لئے مخصوص ہو گیا ہے مشرقی پلیٹو سے نیچے اُترتے ہی شمال سے جنوب تک بڑے بڑے شہروں کی ایک قطار ہے۔ ان شہروں میں چھوٹے چھوٹے رسیلے پھلوں اور سبزیوں کی بڑی بڑی منڈیاں ہیں۔ ساحلی علاقے میں شمال سے جنوب تک حالات ایسے ہیں کہ سب سے پہلے جنوبی حصے میں پھل اور سبزی کی فصل تیار ہوتی ہے۔ موٹر اور ٹرک میں بھر کر جلدی سے ان کو شمال کے بڑے شہروں میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ اس موسم میں چونکہ وہاں فصل تیار نہیں ہوتی۔ اس لئے جنوبی حصے کے کسان منہ مانگا دام وصول کرتے ہیں۔ آہستہ آہستہ موسم کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ جنوب سے شمال کی طرف فصل پکتی جاتی ہے اور کٹتی جاتی ہے اور یہ سلسلہ سال بھر جاری رہتا ہے۔

ساحلی میدان کا درمیانی حصہ جو مشرقی پلیٹو کے دامن میں ہے وہاں کے موسمی حالات اور زمین کی ساخت دونوں تمباکو کی کاشت کے لئے بہت موزوں ہیں۔ پہلے پہل یہاں کپاس کی کاشت ہوتی تھی، لیکن آہستہ آہستہ اس کی جگہ تمباکو نے لے لی اور کپاس کی کاشت مغرب کی طرف سمٹ گئی۔ یہاں تمباکو زیادہ تر مصنوعی کھاد کی مدد سے پیدا کیا جاتا ہے، اس کا خاص مرکز ورجینیا کی ریاست ہے اس لئے ورجینیا کا تمباکو دنیا میں مشہور ہے۔

آئیے اب ذرا تازہ پھلوں کا جائزہ لیں۔ انگور، سیب، ناشپاتی، سنترے، لیموں اور ہزاروں انواع و اقسام کے پھل بے شمار ہوتے ہیں۔ مغربی ساحلی علاقے میں بحر الکاہل کے کنارے یو۔ ایس۔ اے کی مشہور ریاست کیلی فورنیا ہے اس ریاست میں خاص بات یہ ہے کہ اس کی آب و ہوا بحر رومی ہے یعنی دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ یہاں بارش سردیوں میں ہوتی ہے۔ آب و ہوا موافق ہونے کی وجہ سے اس ریاست میں ہزاروں طرح کے لذیذ خوش خائقہ اور عمدہ پھل کروڑوں لاکھوں کی تعداد میں ہوتے ہیں۔ انگور سے شراب بنتی ہے اور انگور کو خشک کر کے کشمش اور منقہ تیار کیا جاتا ہے۔ کیلی فورنیا سے ہزاروں پونڈ انگور کشمش، منقہ، سیب، آڑو، سنترے، لیموں اور دوسرے پھل، مشرقی شہروں میں اور باہر کے ملکوں میں بھیجے جاتے ہیں۔

بحر الکاہل کے ساحل پر مچھلی بھی بہت پکڑی جاتی ہے

الاسکا جو شمالی مشرقی کینیڈا کا ایک حصہ ہے، یو، ایس ملک کا ایک علاقہ ہے اور مچھلیوں کے لئے بہت مشہور ہے، یو ایس، اے میں کئی طرح کی آب و ہوا پائی جاتی ہے۔ اس لئے یہاں کے جنگلات بھی کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ راکی پہاڑ کے مشرقی اور مغربی دونوں ڈھلوان جنگل سے ڈھکے ہوئے ہیں جس کی لکڑیاں بڑے بڑے کارخانوں میں ہزاروں چیزیں بنانے میں استعمال ہوتی ہیں، بحر الکاہل کے ساحل پر واشنگٹن کی ریاست میں ایک قدرتی پارک ہے جس کا نام یلو اسٹون نیشنل پارک ہے اس کی خوبی یہ ہے کہ یہاں بجز گھاس اور جھاڑیوں کی کاٹ چھانٹ کے کوئی چیز بھی مصنوعی نہیں ہے۔ اس پارک میں ہم مقابل ایک ٹھنڈے پانی کا چشمہ ہے اور دوسرا گرم پانی کا۔ چنانچہ اگر آپ کبھی یو، ایس چلے جائیں اور ٹھنڈے اور گرم پانی کا لطف لینا چاہیں تو ان چشموں میں باری باری غسل کرکے تجربہ کیجئے۔ وہاں کی سبزی اور منظر بے حد حسین اور دلچسپ ہیں۔ کیلی فورنیا کی ریاست میں ہالی وڈ ایک ایسی جگہ پر واقع ہے جہاں قدرتی سینیری کا کیا کہنا ہے۔ اسی لئے یہاں کی فلم سازی کی صنعت دنیا میں سب سے زیادہ مشہور ہے۔ یہاں سے ہزاروں فلم تیار کرکے دنیا کے ملکوں میں بھیجی جاتی ہیں اور اس طرح امریکہ کی بیرونی تجارت کی آمدنی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے

بجلی بھی یو، ایس، اے میں خاصے بڑے پیمانے پر پیدا کی جاتی ہے۔ آبشار نیاگرا اپنی نوعیت کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا قدرتی آبشار ہے اور اس سے کروڑوں کیلوواٹ بجلی کی طاقت حاصل کی جاتی ہے اور شمالی مشرقی شہروں میں استعمال ہوتی ہے۔ علاوہ اس کے مشرقی پیڈمونٹ کے دامن میں جتنے شہر آباد ہیں ان کا الگ پاور ہاؤس ہے۔ راکی پہاڑ کے علاقے میں بھی کافی بجلی پیدا کی جاتی ہے۔

آب پاشی کا بندوبست یو، ایس، اے کے بعض علاقوں میں اپنی آپ مثال ہے۔ آپ نے ٹینیسی ویلی اتھارٹی کا نام سنا ہوگا۔ اس کا یہ نام دریائے ٹینیسی سے لیا گیا ہے۔ ٹینیسی ویلی اتھارٹی ایک ایسا منصوبہ ہے جس سے بیک وقت بجلی کی طاقت حاصل کی جاتی ہے آب پاشی ہوتی ہے، سیلاب کی روک تھام کی جاتی ہے اور کروڑوں ایکڑ زمین پر نہایت عمدہ قسم کی کاشت کی جاتی ہے۔ قبل اس کے کہ یہ اسکیم عمل میں آئی دریائے ٹینیسی ایک بہت ہی خطرناک دریا تھا۔ ہر سال اس کے بیسن میں ایک بہت بڑا سیلاب آتا تھا اور اس کی زد میں بہت سے گاؤں اور قصبے آکر بہہ جاتے تھے۔ علاوہ اس کے اس کی وادی میں قدرتی موسلادھار بارش اور سیلاب سے ہزاروں من زرخیز مٹی بہہ جاتی تھی اور زرخیز میدان دن بدن بنجر ہوتا جاتا تھا۔ کاشتکاری غیر یقینی تھی اور اس علاقے کے کسان جاہل، سست اور مفلوک الحال تھے۔ صدر روزویلٹ نے اپنے انجنیروں کی مدد سے اس بلا کو روکنے کی تدبیر کی اور کروڑوں ڈالر خرچ کرکے دریائے ٹینیسی پر بہت سے بند بنا دیئے اور سارے کے سارے علاقے کو سیلاب کی بلا سے بچا لیا۔ آج اس علاقے کے کسان یو، ایس، اے میں سب سے زیادہ خوش حال اور روشن خیال ہیں۔

اسی طرح کیلی فورنیا کی وادی میں بھی آب پاشی کی بڑی بڑی اسکیمیں کام کر رہی ہیں، اور ان سے نہریں نکال کر سینچائی کا کام لیا جاتا ہے۔

الغرض امریکہ میں قدرتی ذرائع اور وسیلے افراط ہیں، اور امریکہ بیک وقت ان سب سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ علاوہ اس کے وہاں کے لوگ تعلیم یافتہ سائنس داں اور محنتی ہیں۔ یہاں بڑے بڑے سرمایہ دار ماہرین اور منتظم بھی ہیں جو دن رات اپنے ملک کو نئی راہ پر لے چلنے کے لئے سرگرداں رہتے ہیں اور کروڑوں ڈالر صرف کرتے رہتے ہیں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ وہاں کا ایک معمولی قلی روزانہ ۴۰ روپے کماتا ہے، اس کی ہمت دیکھئے کہ وہ ان روپوں کو زمین دوز نہیں کرتا بلکہ روز کی روز آمدنی خرچ کرتا رہتا ہے چنانچہ امریکہ میں لوگ کہتے ہیں کہ روپیہ پانی کی طرح بہتا ہے۔

امریکہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جو کام بھی شروع کرتا ہے اس میں پوری پوری مہارت حاصل کرتا ہے، یہی نہیں بلکہ وہ نئی نئی چیزوں کی ایجاد میں بھی لگا رہتا ہے۔ اس نے ایٹم بم ایجاد کیا، ٹیلی ویژن ایجاد کیا۔ اندرونی طور سے دل کی دھڑکن گھبرانا اور پریشانی کو معلوم کرنے والی مشین ایجاد کی۔ مصنوعی بارش کا طریقہ معلوم کیا اور ریگستان کو لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں تبدیل کرنے کا ڈھنگ بتایا ان سب باتوں سے امریکہ کی ساکھ اور بھی قائم ہے۔

قدرتی ذرائع صنعت و حرفت اور کھیتی باڑی کے لحاظ سے وہ اس قدر مالا مال ہے کہ باوجود بے شمار خرچ کے اس کے پاس اربوں ڈالر ہر سال بچتا ہے اور اس طرح اس کی دولت بڑھتی رہتی ہے، دولت منجمد ہوتا جاتا ہے، اسی لئے وہ ہر ملک کو ادھار دینے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے اور روس کے خلاف اپنے حلقۂ اثر کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔

تہذیب کو کیونکر بچائیں؟

(بہ سلسلہ صفحہ ۱)

اس خیال کی ہمت کو چیلنج کرتا ہوں اور اس کے مقابلے میں اس حقیقت پر زور دینا چاہتا ہوں جو بہت پرانی ہے۔ لیکن اس زمانے میں اس کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے) کہ خیال میں جنگ کے خوفناک ترین ہتھیاروں سے زیادہ طاقت ہے اور انسانوں کے معاملات کا آخری فیصلہ انسان کی قوت فکر ہی کر سکتی ہے نہ کہ وہ آلات جو اس فکر نے اختراع کئے ہیں۔ پہلی عالم گیر جنگ کے زمانے میں امریکہ کے مشہور رسالے نیو ریپبلک نے اس حقیقت کو نہایت واضح طور پر بیان کیا تھا اور اس کے الفاظ اس قابل ہیں کہ انھیں اس موقع پر دہرایا جائے:۔

"اب کسے فکر ہے کہ تصویریں بنائے یا شاعری کرے یا زبان کے میدان میں معنی آفرینی کرے یا مادے کی ساخت کے بارے میں دماغ لڑائے، یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے روم میں آگ لگی ہو اور کوئی بیٹھا بانسری بجائے! کسے فکر ہے کہ اخبار اور رسالے نکالے کا غذ پر روشنائی یا فضا میں خیال آفریں جملے بکھیرے جو جنگ کے شور و شغب میں طوطی کی آواز بن جائیں۔ یا ان امیدوں کا نوحہ پڑھے جو باسی ہو گئی ہیں۔ اب فکر کا چراغ جلانے سے کیا حاصل؟ پیادہ فوج کے دستے کے مقابلے میں ایک نقاد کی کیا حیثیت ہے؟ .... لیکن حقیقت یہی ہے کہ توپوں کے مقابلے میں آخری دلیل انسان کی قوت فکر ہی ہے۔ بندوق کا تصور انسان کے ذہن ہی میں پیدا ہوا تھا۔ فوجوں کی نظم و ترتیب اسی کا کارنامہ ہے۔ جنگی جہازوں کا وجود فزکس اور کیمسٹری کی ترقی کے بغیر ممکن نہ تھا۔ انسانوں ہی نے تخریب کا یہ حیرت انگیز مرقع تیار کیا ہے۔ انھوں نے اس کا خواب دیکھا اس کو خیال کی قوت سے عملی شکل دی اور اس کو منظم کر دکھایا۔ لیکن اب یہ طاقت ان کے بس سے باہر ہو گئی ہے اور اس پر ایسی پوشیدہ قوتوں نے اپنا قبضہ کر لیا ہے جن کو انسان سمجھ نہیں پائے۔ اور وہ اسے اس وقت تک رام نہ کر سکیں گے۔ جب تک وہ خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ نہ کر لیں کہ ہمیں اس تخریب کے دیو کا سر کچلنا ہے اور ایک ایسے تمدن کی تنظیم کرنی ہے جو پوری طرح ان کے قابو میں ہوگا، اور کوئی مشین اس کے ساتھ غداری نہ کر سکے گی۔ ایک تلوار کے بنانے میں اتنی ہی قابلیت کی ضرورت ہے جتنی ایک ہل کے بنانے میں لیکن تلوار پر ہل کو ترجیح دینے کے لئے انسانی قدروں کو زیادہ معقول سمجھنا درکار ہے۔ یہ جانتے ہوئے ہم قوت فکر کو بے کار سمجھ کر چھوڑ نہیں سکتے۔ وہ کتنی ہی کمزور اور ناپختہ ہو اس کے سوا اور کون سی قوت ہے جو جنگ کی حماقت اور مشتعل جذبات کی آگ کو ٹھنڈا کر سکتی ہے۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ہماری زندگی کیسی غیر محفوظ بنیادوں پر قائم ہے اور ہماری تہذیب اور تمدن کس قدر کم مایہ تنگ نظر اور غیر محتاط ہیں۔ لیکن ہم مستقبل کو اس طرح بہتر نہیں بنا سکتے کہ جہالت اور خوف کے اندھیرے میں پہلے سے زیادہ ٹھوکریں کھائیں۔ اگر ماضی میں ہمارا فکر بے بس اور ناکارہ رہا ہے تو ہم فکر کا دامن چھوڑ کر خود کو نہیں بچا سکتے۔ کیونکہ بد اعمالیوں اور غلط کاریوں کے نامبارک حلقے کو توڑنے کا محض ایک طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ہم اس پر برابر بے لاگ اور بے امان تنقید کرتے رہیں۔ در اصل جنگ کا گناہ اور ذمہ داری ان تمام لوگوں پر عائد ہوتی ہے جو اپنی زندگی بے فکری کے ساتھ بسر کرتے رہے ہیں جنھوں نے کبھی غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی جو اپنی بے معنی مصروفیتوں میں اس طرح پھنسے رہے کہ انھیں دنیا کی کوئی فکر نہیں ہوئی۔ جو آگے بڑھتے ہوئے ڈرتے تھے انقلاب سے ڈرتے تھے ....

تو ..... ایک جھوٹے اور فریب دہ امن کے خواہاں تھے اور کبھی ایک معقول زندگی کی قیمت ادا کرنے کو تیار نہیں ہوئے!"

یہ خیالات صرف امریکہ ہی پر نہیں بلکہ ساری دنیا پر صادق آتے ہیں اور یہ آج بھی اتنے ہی برمحل ہیں جیسے ۱۹۱۸ء میں تھے۔ اگر ہم ان قدروں کو بدلنا چاہتے

رجسٹرڈ نمبر ڈی ۲۰۷

جامعہ نگر (دہلی)

ادارۂ تحریر

ڈاکٹر سید عابد حسین ۔ صالحہ عابد حسین

عبد اللطیف اعظمی

نئی روشنی

ہفتہ وار

دہلی

ہیں جنہیں کل کی دنیا بہت زیادہ جنگی ہے اور (اپنی) قوم کے دل و دماغ میں سے وہ ناگوار اور نازیبا رجحانات نکال دینا چاہتے ہیں جو انہیں مسخ کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ موجودہ صورت حال کے لئے ہم اپنی ذمہ داری کو خلوص دل سے قبول کرتا ہے اور اس کی اصلاح کے لئے اپنے تمام وسائل استعمال کرنے چاہئیں۔ ممکن ہے ہمیں اس میں کامیابی ہو، ممکن ہے نہ ہو، لیکن کوئی شخص زندگی کے ساتھ پہلے سے شرطیں نہیں کر سکتا اور در اصل ایک پر خلوص کام کرنے والے کے لئے کسی نیک مقصد کے لئے کام کرنا کامیابی سے زیادہ اہم ہے اس لئے ہمیں بے جا انکسار اور یاس پرستی اور شکست کی ذہنیت کو ترک کر کے اس بات کا عہد کرنا چاہئے کہ ہم اپنے اپنے حلقۂ اثر میں اپنی پوری قوت سے کام لے کر ایک اخلاقی اور ذہنی انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کریں گے جو اس سیاسی انقلاب سے بھی زیادہ ضروری ہے جو ابھی ہمارے ملک میں ہوا ہے۔

(باقی آئندہ)

نفسیات اور تجارت

(بہ سلسلہ صفحہ ۶)

بچہ بھوک سے بے چین ہوتا ہے تو روتا ہے اُسے خود اپنی اس کیفیت کا احساس نہیں ہے وہ صرف بے چینی سی محسوس کر سکتا ہے اور کرتا ہے، لیکن ہوشیار ماں سمجھ جاتی ہے کہ اس کے لال کو اس وقت بھوک ستا رہی ہے وہ فوراً دودھ سے اس کی بے چینی کا علاج کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مسئلے میں بچہ اپنے مطالبات کے پورا کرنے میں دوسرے کی امداد کا دست نگر ہوا۔ لیکن یہ کیفیت صرف بچوں ہی پر طاری نہیں ہوتی، بعض اوقات نوجوان اور مسن اصحاب بھی اپنے مقصد کا تعین کرنے میں قاصر رہتے ہیں۔ مثلاً کسی شخص کے کپڑے پھٹ گئے ہیں اب تن پوشی کے لئے اُسے کپڑے خریدنے ہیں۔ بے شک کپڑے خریدنے کی خواہش اس کے ذہن میں واضح طور پر موجود ہے لیکن کون سا کپڑا اس ضرورت کو پورا کرنے کا کام دے گا۔ اس مسئلے میں اس کا نظریہ غیر واضح ہے (جہاں دیدہ اور تجربہ کار اشخاص اس کلیہ کے مستثنیات ہیں، کیونکہ وہ اپنے سابقہ تجربات کی بنا پر ابتدا ہی سے کپڑے کا ذہنی خاکہ تیار کر لیتے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کا فیصلہ پچھلے پروپیگنڈے اور اشاریت کا مرہونِ منت ضرور ہوتا ہے) لہٰذا وہ کپڑا بیچنے والوں کے پروپیگنڈے سے جو زبانی اور تحریری دونوں صورتوں میں ہو سکتا ہے۔ متاثر ہوتا ہے۔ مثلاً وہ کسی دوست کی صلاح سے متاثر ہو کر ایک مخصوص کپڑا خرید سکتا ہے یا وہ رسائل کے اشتہارات یا دوکاندار کی چرب زبانی سے مرعوب ہو کر کسی خاص کپڑے کے لئے اپنی رائے دے سکتا ہے۔ بہر صورت اس خرید و فروخت میں پروپیگنڈے کا دخل کسی نہ کسی صورت میں ضرور ہوگا۔ نفسیات انسان کی اسی غیر متعین اور مبہم ذہنی کیفیت سے فائدہ اُٹھا کر فن پروپیگنڈا کو تجارت میں استعمال کرتی ہے۔

(باقی آئندہ)

تاریخ اشاعت:- یکم ۰۸، ۱۶، ۴۷

چندہ سالانہ ۶ ششماہی ۳

دفتر "نئی روشنی" جامعہ نگر، دہلی

طابع و ناشر - عبد اللطیف اعظمی (دہلی کے جامعہ)

مطبوعہ - جید برقی پریس

NAI RASHNI
DELHI

جلد ۲۶ نمبر ۲۳ | ۱۶ دسمبر ۱۹۴۹ء | ایڈیٹر ڈاکٹر سید عابد حسین

تہذیب کو کیوں کر بچائیں

(۲)

اس جد و جہد میں ہمارے پاس ایک بہت بڑی دولت ہے ۔ مہاتما گاندھی کا کام ، ان کی یاد اور ان کی روشنی کی رہ نمائی........گاندھی جی نے ہمیں ایک نیا راستہ دکھایا تھا اور انھوں نے ہمارے لئے اخلاقی اور روحانی قدروں اور عمل دانش مندی کی ایک بیش بہا دولت چھوڑی ہے ۔ انھوں نے ان دیواروں کو توڑا جو عوام اور خواص لیڈروں اور تعلیم یافتہ لوگوں اور باقی لوگوں کے بیچ میں حائل تھیں اور اب ہمارے لئے موقع ہے کہ ہم اب اُن کے نقش قدم پر چل کر عوام اور خواص دونوں میں ایک ایسا ذہنی انقلاب پیدا کریں کہ ان دو مختلف لفظوں کا استعمال بھی بڑی حد تک غیر ضروری ہو جائے ۔

اس جدوجہد میں ہمارے پاس ایک ایک بہت بڑی دولت ہے ، مہاتما گاندھی کا کام ، اُن کی یاد ، اور ان کی روشنی کی رہ نمائی ۔ میں محض رسمی طور پر یا آج کل کے رواج کی پابندی کی خاطر اس موقع پر گاندھی جی کا ذکر نہیں کرنا چاہتا بلکہ اس وجہ سے کرتا ہوں کہ ان کی شخصیت میں ہمیں موجودہ صورت حال کو سمجھنے اور اس کی اصلاح کرنے کے لئے بڑی واضح ہدایت ملی ہے ۔ انھوں نے ہماری تاریخ میں دو بڑے بڑے کام کئے ہیں جو ایک دوسرے سے الگ بھی ہیں اور مربوط بھی ۔ ایک طرف تو انھوں نے ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد کی اور ایسی شان دار تحریک چلائی جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی ، اور انھیں اپنی زندگی ہی میں اس کی کامیابی نصیب ہوگئی ۔ یہ بجائے خود ایک ایسا کارنامہ تھا ۔ جالیس کروڑ بندگان خدا کو آزاد کرانا اس کی وجہ سے تاریخ کے ایوان میں ان کے لئے ایک بلند مقام محفوظ ہو گیا ہے ۔ لیکن وہ اصل وہ ایک سیاسی لیڈر سے بہت بلند درجہ رکھتے تھے ۔ کیونکہ وہ ایک مصلح ، ایک معلم ، ایک نئے پیغام کی آواز بھی تھے اور انھیں لوگوں کے ذہنی اور اخلاقی انقلاب کی بھی اتنی ہی فکر تھی جتنی سیاسی انقلاب کی ' بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ سیاسی انقلاب بھی اسی وجہ سے چاہتے تھے کہ اس کے بغیر سماجی اور اخلاقی انقلاب پیدا کرنا بہت مشکل تھا ۔ وہ جانتے تھے کہ سیاسی آزادی کے بغیر ہندوستان اپنی مخصوص اور بہترین تہذیبی ، اخلاقی اور روحانی روایتوں کے مطابق زندگی کی تشکیل نہیں کر سکتا اس لئے ان کے سامنے مقصد یہ تھا کہ ہندوستان نہ صرف آزاد ہو بلکہ اس آزادی کا اہل ثابت ہو ۔ اس دوسرے اور زیادہ بڑے کام میں انھیں مقابلۃً محدود کامیابی حاصل ہوئی ۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے ایک حیرت انگیز حد تک سیاسی جنگ کو تشدد اور نسلی نفرت کی آلودگی سے پاک رکھا اور در اصل تعجب کی بات یہ نہیں کہ کبھی کبھی لوگ اس بلند معیار سے نیچے گر گئے جو گاندھی جی نے ان کے سامنے رکھا تھا بلکہ یہ تعجب کی بات ہے کہ اس قدر کم ایسا ہوا ! لیکن لوگوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کے جہاد میں ان کی کامیابی دو وجہوں سے محدود رہی ۔ جب کوئی قوم جنگ آزادی میں مصروف ہوتی ہے تو لوگوں کی توجہ زیادہ تر اس کے سیاسی رخ پر لگی رہتی ہے اور یہی صورت حال ہندوستان میں تھی ۔ اس دوران میں اخلاقی قدروں کی علم برداری تو زیادہ تر گاندھی جی اور ان کے ایک چھوٹے سے ایک مخصوص حلقے کے حصے میں تھی ، اس لئے عام لوگوں کو زیادہ تر سیاسی ستیا گرہ کی ، مل جل کر احتجاج کرنے ، قانون توڑنے اور بہادری کے ساتھ اس کی سزا بھگتنے کی تربیت ملی ۔ یہ چیزیں سیاسی جدوجہد کے ہنگامے میں بہت مفید اور ضروری ہوتی ہیں ۔ لیکن جب آزادی کے بعد قوم کے سماجی نظام کو از سر نو تعمیر کرنا ہو تو یہ مقابلۃً غیر ضروری اور کبھی کبھی نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں اس منزل پر پہنچ کر کامیابی کے لئے ضبط کے ساتھ اور مل جل کر کام کرنے کی ضرورت ہے ، خود اپنے بنائے قانون کا احترام کرنے کی ضرورت ہے معاملات میں رواداری اور باہمی لین دین کی ضرورت ہے اور ذاتی فائدے کے مقابلے میں اجتماعی فائدے کو مقدم رکھنے کی

فہرست مضامین

قیمت فی پرچہ ۳ ،

ضرورت ہے کہ یہ صفات مختلف تعلیمی اور سماجی اداروں کے ارادی اور غیر ارادی اثرات کی مدد سے پیدا کی جاسکتی ہیں۔ اگر ہندوستان کی آزادی کا مطلع فرقہ وارانہ فساد، خون ریزی اور نفرت کی وجہ سے مکدر نہ ہوا ہوتا تو لوگ آزادی کے نئے دور میں ایک خاص امنگ اور تعمیر کا حوصلہ لے کر داخل ہوتے لیکن ہوا یہ کہ پہلے ہی دن سے ملک کو فرقہ وارانہ فسادات کی مصیبتوں، قانون کی خلاف ورزی اور اقتصادی نظام کی ابتری سے دوچار ہونا پڑا جس کی وجہ سے [illegible] تبدیلی کا سلسلہ عارضی طور پر خطرے میں پڑ گیا اور انتظام آفتوں نے لوگوں کے خون سے اس نئی آزادی کا رنگ دھندلا دیا! اگر گاندھی جی کچھ اور زندہ رہ جاتے تو وہ اپنی حیات بخش اور پختہ کار شخصیت کی پوری طاقت اس مقصد کے لئے استعمال کرتے اور ان کی محبت، دانش مندی اور روحانی فیض کی بدولت ہماری قومی زندگی میں سے زہر کا اثر زائل ہو جاتا اور ہماری قوم کی روحانی صحت خطرے میں نہ پڑتی۔ لیکن یہ نعمت ہماری قسمت میں نہ تھی، تاہم ۱۵ اگست کے بعد جب چند مہینے کہ ان کی روشنی ہمارے ملک کو منور کرتی رہی تو ان ہی کی ذات تھی جو ہمارے اور اس جنون، انتشار اور تشدد کے بیچ میں ایک دیوار بن کر حائل ہو گئی تھی جو ہندوستان اور پاکستان میں پلیگ کی طرح پھیل گیا تھا۔ یہ خیال کر کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں کہ اگر گاندھی جی اس وقت اس آگ میں نہ کود پڑتے اور امن اور شرافت کی خاطر اپنی جان کی بازی نہ لگا دیتے تو صرف مسلمانوں کی اقلیت ہی کا نہیں بلکہ سارے ہندوستان اور اس کی بہترین قدروں اور آدرشوں کا کیا حشر ہوتا۔ جس وقت سارا ہندوستان آزادی کا جشن منا رہا تھا (جس حد تک بھی ان حالات میں لوگ ایسا کر سکتے تھے) تو خدا کا یہ ناتوان بندہ، یہ سالک راہ بنگال کے گاؤں گاؤں مارا مارا پھر رہا تھا تاکہ فرقہ وارانہ فساد کی آگ کو بجھائے۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ آزادی کی جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ ملک کے ایک ایک گھر اور ایک ایک جھونپڑی میں اور لوگوں کے دلوں اور دماغوں میں اس جنگ کو جاری رکھنا اور اس میں فتح حاصل کرنا ضروری ہے۔ انھوں نے کم از کم اتنا تو کیا کہ عارضی طور پر اس جنون کے سیلاب کو روک دیا اور قوم کو سانس لینے کی اتنی مہلت مل گئی کہ وہ اپنی روحانی قوتوں کو مجتمع کر سکے جس طرح ایک سانس اکھڑے مریض کو آکسیجن سے کر اتنی مہلت مل جاتی ہے کہ وہ زندہ رہنے کے لئے ایک اور جدوجہد کر سکے۔

ایک دوسرا نفسیاتی سبب بھی تھا جس کی وجہ سے ہمیں اس مقصد میں پوری کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر ہم لوگوں میں ان صفات کو پیدا کرنا چاہتے ہیں جو آزادی کی مدافعت اور قیام کے لئے ضروری ہیں تو یہ ایسی حالت میں اچھی طرح نہیں ہو سکتا جب وہ سیاسی غلامی کی منزل میں ہوں۔ بے شک ان کی بنیاد ڈالی جا سکتی ہے اور شاید گنے چنے لوگوں میں وہ پیدا بھی ہو جائیں، لیکن عام لوگوں میں آزادی کی صفات اور ذہنیت اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب انھیں آزادی کی فضا میں زندگی بسر کرنے کا موقع ملے۔ لہٰذا یہ توقع کرنا غلط ہے کہ جن لوگوں کو آزاد اور جمہوری اداروں کا کوئی تجربہ حاصل نہ ہو سکے بغیر آزادی اور جمہوریت کے لئے تیار کیا جا سکتا ہے۔ ہاں اب وہ وقت ہے کہ ہم وہ تجربہ حاصل کریں۔ اگر آزادی نارمل حالات میں حاصل ہوتی تو ہم سہولت کے ساتھ یہ تجربہ حاصل کر سکتے تھے لیکن موجودہ حالات نے ہم لوگوں کی ذمہ داری جو استاد اور معلم اور ذہنی قیادت کا کام کرنے والے ہیں بہت زیادہ کٹھن بنا دی ہے اور ہمارے لئے ضروری ہے کہ اس صورت حال پر سنجیدگی اور ٹھنڈے دل سے غور کریں اور یہ طے کریں کہ بد دیانتی اور انتشار کی جو قوتیں زور پکڑ رہی ہیں ان کو روکنے کے لئے اور ملک میں دیانت داری اور باہمی مفاہمت کی فضا پیدا کرنے کے لئے ہم کیا تدبیریں اختیار کر سکتے ہیں۔ گاندھی جی نے ہمیں ایک نیا راستہ دکھایا تھا اور انھوں نے ہمارے لئے اخلاقی اور روحانی قدروں اور عملی دانش مندی کی ایک بیش بہا دولت چھوڑی ہے۔ انھوں نے ان دیواروں کو توڑا جو عوام اور خواص لیڈروں اور تعلیم یافتہ لوگوں اور باقی لوگوں کے بیچ میں حائل تھیں۔ اور اب ہمارے لئے موقع ہے کہ ہم ان کے نقش قدم پر چل کر عوام اور خواص دونوں میں ایک ایسا ذہنی انقلاب پیدا کریں کہ ان دو مختلف لفظوں کا استعمال بھی بڑی حد تک غیر ضروری ہو جائے۔

میں اس وقت ان مشکلوں کا جواب کریں گے پہلے سے کوئی اندازہ نہ کر سکتا ہوں نہ کرنا چاہتا ہوں۔ میرا مقصد تو یہ ہے کہ مسئلے کی جو تصویر میرے ذہن میں ہے اسے آپ کے سامنے پیش کر دوں۔ میرے خیال میں اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ ہمیں مصمم ارادے کے ساتھ اور منظم طور پر تنگ نظری، تعصب اور مذہبی جنون کے مختلف رجحانات سے لڑنا [illegible] نے ہماری تعلیمی نوعیت کو شل کر دیا ہے۔ گو ہماری سماج پر ایسے دور گذرے ہیں جب معاشرتی امتیازات اور ناانصافیوں کا زور تھا مگر مجموعی طور پر ہمارے ہاں انسانیت اور رواداری کی کمی نہیں رہی۔ اپنی تاریخ کے بہترین زمانوں میں ہم نے ان فلسفیانہ اور مذہبی خیالات کو جو مختلف ملکوں سے آئے بدیسی سمجھ کر رد نہیں کیا بلکہ ان کا خیر مقدم کیا اور انھیں جذب کر کے اپنی تہذیب کا جزو بنا لیا۔ اور جب کبھی ہم نے ان صحت مند روایات کو ترک کر دیا تو ہم تنزل اور پستی کے گڑھے میں گر گئے۔ ہمارے بڑے بڑے اہل قلم اور اہل فکر، گاندھی، ٹیگور، اقبال، رادھا کرشنن نے بار بار اس پر زور دیا ہے کہ ہندوستان کی عظمت اور ترقی کا زمانہ وہی تھا جب اس نے اپنے دل و دماغ کے دروازے کھلے رکھے اور اس کا تنزل اسی وقت سے شروع ہوا جب اس نے اپنے گرد ایک حصار کھینچ کر نئے تہذیبی عناصر اور رجحانات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اگر یہ اصول پہلے صحیح تھا تو آج کل جب زمین کی طنابیں کھنچ گئی ہیں اور سائنس اور صنعت نے ساری دنیا کے لوگوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا ہے، اور بھی زیادہ صحیح ہے۔ اس لئے ہر تحریک جو تفریق اور تعصب پر زور دیتی ہے خواہ وہ فرقہ پرستی ہو یا صوبہ پرستی، ہندوستان کی حقیقی تہذیبی روح کے منافی ہے اور اس سے ہماری سیاسی اور اخلاقی قوت کے گھٹنے کا اندیشہ ہے۔ ہمیں اپنے اسکولوں اور کالجوں اور سیاسی اور تہذیبی اداروں کے ذریعے سے اس بڑھتے ہوئے خطرے کا مقابلہ کرنا چاہئے اور اس کا اہتمام کرنا چاہئے کہ تہذیبی اور مذہبی اختلافات ہماری بنیادی قومی وحدت کو برباد نہ کریں۔ بجائے [illegible] اپنے صوبے [illegible] محبت ہے، لیکن سچی محبت کا دائرہ تنگ نہیں بلکہ بہت وسیع ہوتا ہے کوئی وجہ نہیں کہ ان چیزوں کی محبت قومی وحدت یا انسانی وحدت کے وسیع تر مقاصد کی راہ میں حائل ہو۔ یہ ضرور ہے کہ ایک محدود اور قریب کے مقصد کی لگن آسانی سے پیدا کی جا سکتی ہے اور لوگوں کو مشترک تعصبات اور اختلافات کی بنیاد پر جلد متحد کیا جا سکتا ہے لیکن تعلیم کا تو کام ہی یہ ہے کہ تنگ تصورات کی جگہ وسیع تصورات، اور قریب کے مقصد کی جگہ دور کے مقصد کی تلقین کرے اور غلط راہ کے بجائے خواہ وہ کتنی ہی سہل اور دلکش کیوں نہ ہو کٹھن اور دشوار گذار صحیح راہ دکھائے۔ معلم میں اور معمولی سیاسی مبلغوں میں یہی فرق ہے۔ وہ لوگوں کے تعصبات اور اندھے جوش سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ اس لئے ان کا کام اسی طرح بنتا ہے کہ لوگ جو بات سننا چاہتے ہیں وہی کہیں اور اسی کی آواز میں آواز ملائیں مگر سچا معلم اور مفکر دھارے کے ساتھ بہنا اور عام تعصبات کی ہم نوائی کرنا ہرگز گوارا نہیں کر سکتا۔ اس کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ صحیح قدروں کی تلقین کرے۔ وہ لوگوں کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش ضرور کرتا ہے تاکہ ان پر اثر ڈال سکے، لیکن ان کی تعریف کی پروا نہیں کرتا۔ اس میں دھارے کے خلاف تیرنے کی ہمت ہونی چاہئے۔ اگر ہم اپنے اندر ایک سچے معلم کی روح پیدا کرنا چاہتے ہیں تو سارے نفسیاتی وسائل سے جو ہمیں میسر آ سکیں، ہمیں اپنے نوجوانوں میں روشن خیالی، وسعت نظر اور رواداری پیدا کرنی چاہئے۔ میں بہت ادب سے یہ عرض کروں گا کہ اگر ہم معلموں کے سامنے اس چیز کی جسے ہم صحیح سمجھتے ہیں حمایت کرنے اور اس چیز کی جسے غلط سمجھتے ہیں مخالفت کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تو ہم ہرگز معلمی منصب کے لائق نہیں ہیں۔

دوسرا مسئلہ ہمارے سامنے یہ ہے کہ ہماری شہری زندگی کا عام معیار گر رہا ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ ہماری پبلک لائف میں رشوت ستانی، عزیز نوازی اور بد دیانتی کا زور ہے، ہماری کارکردگی گھٹ گئی ہے، ہم میں ضبط اور تعاون کی صلاحیت نہیں۔ ان سب چیزوں کے خلاف ہمارے لیڈر بار بار احتجاج کر چکے ہیں۔ میں اتنا سادہ دل نہیں ہوں کہ ان سب بیماریوں کا جن کی جڑیں ہمارے سماجی اور معاشی ماحول میں ہیں، واحد علاج تعلیم اور تلقین کو سمجھوں۔ لیکن مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ ایک مکمل سماجی اور معاشی نظام بھی

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی

چین کی خانہ جنگی کا آخری دور

چین میں کومن تانگ پارٹی اور کمیونسٹ پارٹی کی خانہ جنگی جو ۲۰ سال سے جاری تھی کومن تانگ کی کامل شکست پر ختم ہوتی ہوئی نظر آرہی ہے۔ کومن تانگ کی حکومت جو اب تک چار راج دھانیاں بدل چکی ہے اب چوتھی راج دھانی چنگکو کو چھوڑ کر جزیرہ فارموسا میں منتقل ہو گئی ہے۔ اس کے قائم مقام صدر جنرل لی امریکا گئے ہیں تاکہ پھر ایک بار امریکی حکومت سے سامان جنگ اور مالی امداد کے لئے درخواست کریں اور خیال ہے کہ چیانگ کائی شیک جنھوں نے مصلحتاً صدارت کے عہدے سے چھٹی لے لی تھی، پھر سے صدر کے فرائض سنبھال لیں گے۔ ظاہر ہے کہ کومن تانگ حکومت کا بر اعظم سے بھاگ کر ایک جزیرے میں پناہ لینا گویا قطعی شکست کا اعتراف ہے۔ غالباً اس کے بعد شفقی فوجیں جو جنوب کے دو صوبوں میں اور شمال مغرب میں کومن تانگ کی طرف سے لڑ رہی تھیں ہمت ہار بیٹھیں گی اور ہتھیار ڈال دیں گی۔ اب چیانگ کائی شیک کو لے دے کے یہ امید رہ گئی ہے کہ انھیں امریکہ سے اتنی مدد مل جائے جس کے سہارے وہ اچھے دنوں کے انتظار میں فارموسا میں قدم جمائے رہیں۔ بظاہر امریکا سے مدد ملنے کے آثار نظر نہیں آتے۔ پھر بھی چونکہ چیانگ کائی شیک کے پاس کافی سونا اور تھوڑی بہت بحری اور ہوائی قوت ہے اس لئے شاید وہ ایک مدت تک فارموسا میں رہ سکیں۔ لیکن ان کا بحری اور ہوائی بیڑہ بھی بہت سی خشکی کی فوجوں کی طرح ان کو چھوڑ کر کمیونسٹوں سے جا ملا تو انھیں فارموسا سے بھی بھاگنا پڑے گا اور اپنی بے ملک کی حکومت کسی [illegible] ملک مثلاً جزائر فلپین میں لے جانی پڑے گی۔ [illegible] چین کی خانہ جنگی [illegible] دوسرے ملکوں کے [illegible] موجودہ صدی کی دوسری چوتھائی میں چین کے عوام اپنے ملک کی استبدادی حکومت اور جاگیرداری نظام سے عاجز آچکے تھے کومن تانگ (نیشنلسٹ پارٹی) ڈاکٹر سن یات سین کی رہنمائی میں جمہوری انقلاب اور چنگ چن تانگ (کمیونسٹ پارٹی) سوشلسٹ انقلاب کے لئے جدوجہد کر رہی تھی۔ ۱۹۲۴ء میں ان دونوں نے متحد ہو کر کمیونسٹوں کی مدد اور مشورے سے انقلابی فوجوں کی نئی تنظیم کی۔ تین سال کی کشمکش کے بعد پیکنگ کی استبدادی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور جمہوریہ چین کی بنا ڈالی۔ مگر اسی چیانگ کائی شیک نے جو کومن تانگ کے داہنے بازو کا لیڈر تھا بائیں بازو کے خلاف بغاوت کر کے نان کنگ میں اپنی الگ حکومت قائم کر لی اور کمیونسٹوں اور دوسرے انتہا پسندوں کو بے دردی سے کچلنا شروع کیا۔ کومن تانگ کے بائیں بازو سے تو بہت جلد اس کی مصالحت ہو گئی مگر کمیونسٹ پارٹی کے وجود کو وہ کسی طرح برداشت کرنے کو تیار نہ تھا۔

کمیونسٹ پارٹی کچھ عرصے تک جنوبی چین میں کومن تانگ سے چھاپہ مار لڑائی لڑتی رہی۔ اس کے بعد اس نے جنوب سے ہجرت کر کے شمال مغربی چین کے ایک چھوٹے سے علاقے میں جس کی سرحد سوویت روس سے ملتی تھی اپنی ایک جداگانہ حکومت قائم کر لی اور اپنے افسروں کو روس میں فوجی ٹریننگ دلا کر ایک مضبوط فوج تیار کرنا شروع کی۔

اب چیانگ کائی شیک نے اپنی زندگی کا مقصد یہ قرار دے لیا کہ کمیونسٹوں کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیں بجائے اس کے کہ وہ کچھ عرصے تک اپنی قوتوں کو ملک کے اہم معاشی مسائل، قحط، افلاس، بے روزگاری، بھوک کے حل کرنے میں صرف کرتے، انھوں نے سارا زور چینی کمیونسٹوں کی چھوٹی سی ریاست کو مٹانے کی کوشش میں لگا دیا۔ اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر جاپانیوں نے منچوریہ پر حملہ کر دیا۔ کمیونسٹوں نے یہ پیش کش کی کہ مشترک بیرونی دشمن سے لڑنے کے لئے وہ کومن تانگ سے تعاون کرنے کو تیار ہیں مگر چیانگ کائی شیک نے ان کو جاپانیوں سے زیادہ خطرناک سمجھ کر یہی فیصلہ کیا کہ پہلے ان سے نبٹ لیں پھر جاپانیوں کو بھی دیکھ لیں گے۔ کئی سال تک چین کی صورت حال یہ رہی کہ جاپانی فوجیں نئے نئے علاقوں پر قبضہ کرتی جاتی تھیں اور کومن تانگ کی فوجیں ان سے لڑنے کے بجائے کمیونسٹوں سے لڑ رہی تھیں۔ خود چیانگ کائی شیک کے بہت سے ساتھی اس پالیسی کے خلاف تھے۔ مگر چیانگ کی زبردست شخصیت کے سامنے ان کی ایک نہ چلتی تھی۔ آخر جب جاپانی بالکل سر پر پہنچ گئے اور کومن تانگ کی حکومت کو بھاگ کر چنگکنگ میں پناہ لینی پڑی تو چیانگ کے رفیقوں نے انھیں زبردستی اس پر آمادہ کیا کہ کمیونسٹوں سے صلح کریں اور ایک متحدہ قومی محاذ بنا کر جاپانیوں سے لڑیں۔ مگر پھر بھی انھوں نے اپنی بہترین فوج کو جو جدید ترین امریکی سلاح جنگ سے مسلح تھی، جاپانیوں کے مقابلے میں بھیجنے کے بجائے شمال مغرب میں رکھا تاکہ کمیونسٹوں کی نگرانی کرتی رہے۔ ادھر کمیونسٹ انفرادی خطروں کی پرواہ نہ کر کے بڑی بے جگری سے جاپانیوں سے لڑتے رہے اور انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ کومن تانگ سے زیادہ محب وطن ہیں، پھر کومن تانگ امریکی مدد لے کر امریکہ کی نیاز مند بن گئی اور کمیونسٹوں نے روس سے دوستی کے باوجود اس سے کچھ زیادہ مدد نہیں لی اور اسے اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا۔ اسی وقت سے چین میں کومن تانگ کے مقابلے میں کمیونسٹوں کو زیادہ ہر دل عزیزی حاصل ہونے لگی۔ اس کے بعد جیسے جیسے نیشنلسٹ چین میں معاشی ابتری بڑھتی رہی عوام کمیونسٹوں کی طرف اور زیادہ مائل ہوتے گئے۔ جاپان کی شکست کے بعد کمیونسٹوں کو منچوریہ میں بہت سا سامان جنگ ہاتھ آگیا اور ان کی قوت بہت بڑھ گئی۔ مگر چیانگ کائی شیک نے اس حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں اور اسی زعم میں رہے کہ کمیونسٹوں کو مٹا کر رہیں گے۔ ان کے بہت سے ساتھی چاہتے تھے کہ کمیونسٹوں سے صلح کر لی جائے اور کمیونسٹ بھی ابتدا میں اس پر آمادہ تھے مگر چینی سرمایہ اور جاگیردار طبقہ جو کومن تانگ پر حاوی ہو گیا تھا۔ چیانگ کی زبان سے برابر انکار کرتا رہا۔ نیشنلسٹ چین کی معاشی حالت روز بروز بگڑتی گئی عوام میں شورش اور بغاوت بڑھتی رہی اور خود کومن تانگ کی فوجیں اس کا ساتھ چھوڑ کر کمیونسٹوں سے ملتی رہیں۔

یہ ہے ایک سرسری جائزہ واقعات کے اس سلسلے کا جس کا انجام ہم دیکھ رہے ہیں۔ خدا خدا کر کے چین میں خانہ جنگی اکثر جگہ ختم ہونے پر آئی ہے اور قومی وحدت کے آثار نظر آنے لگے ہیں لیکن اس وقت جب ملک کی تھوڑی بہت صنعت ہی نہیں بلکہ تجارت اور زراعت بھی تباہ ہو گئی ہے۔ بڑے بڑے علاقے فقر و فاقے کا شکار ہیں اور جا بجا بد امنی اور لوٹ مار کا دور دورہ ہے۔ نئی حکومت کمیونسٹ ہونے کے باوجود روس کی ابتدائی غلطیوں سے بچ کر احتیاط اور سلامت روی سے قدم اٹھا رہی ہے اور امید ہے کہ بہت جلد ملک کی بگڑی ہوئی حالت کو سنبھال لے گی۔ پھر بھی اسے ملک کی معاشی زندگی کے معیار کو ہندوستان جیسے ملک کی سطح تک پہنچانے کے لئے بھی برسوں کی کوشش اور محنت درکار ہے۔ اس لئے اس کے نادان دوستوں اور دشمنوں کا یہ پروپاگنڈا بالکل بے بنیاد معلوم ہوتا ہے کہ وہ برما انڈونیشیا ہندوستان یا پاکستان پر محض تبلیغی جہاد کے لئے حملہ کرے گی۔ موجودہ حالت میں اس کا یہ قدم اٹھانا خودکشی سے کم نہیں ہوگا اور جو حقیقت بینی اور مصلحت اندیشی اس نے اب تک دکھائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اقدام خودکشی کی ہرگز مرتکب نہیں ہوگی۔ خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان کی حکومت چین کی نئی حکومت کو جلد سے جلد تسلیم کرنے پر تیار ہے۔ برطانیہ کا ارادہ بھی کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ صرف امریکہ اب تک حیص بیص میں ہے۔ لیکن واقعات کی منطق اتنی زبردست ہوتی ہے کہ دیر سویر سب اس کے ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں ●

ہندوستان　دُنیا کی رفتار　باہر کی دنیا

مردم شماری اور انتخابات

معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان کی مردم شماری ۱۳ مارچ ۱۹۵۱ء کو ہو گی۔ اس کی بنا پر یہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کی مرکزی پارلیمنٹ اور صوبوں کی کونسلوں کے نئے انتخابات کبھی اپریل ۱۹۵۱ء میں ہوسکیں گے۔ اس لئے کہ مردم شماری سے کئی مہینے پہلے ایک بہت بڑا عملہ اس کام میں لگا رہے گا اور انتخابات کے لئے مزید عملے کا رکھنا ممکن نہیں ہوگا۔ ہمارے خیال میں حکومت کو اس کی کوشش کرنی چاہیے کہ انتخابات اکتوبر یا نومبر ۱۹۵۱ء میں ہو جائیں تاکہ جو نئی حکومت بنے وہ ۵۲-۱۹۵۱ء کا بجٹ خود تیار کرے یا کم از کم اس میں اپنی مرضی کے مطابق ترمیم کرسکے۔ اس طرح آیندہ کے لئے ایک اچھی مثال قائم ہو جائے گی اور معمولی حالات میں ہر نئی حکومت اپنا آیندہ سال کا بجٹ خود بنایا کرے گی۔

ہندوستان کے فرانسیسی مقبوضات

یہ دیکھ کر کہ چندر نگر کی رائے شماری کا نتیجہ ہندوستان کے حق میں نکلا فرانسیسی حکومت اپنے بقیہ مقبوضات میں جو ہندوستان کے مغربی ساحل پر واقع ہیں رائے شماری کرانے میں کچھ زیادہ مستعدی نہیں دکھا رہی ہے۔ پہلے رائے شماری کی تاریخ ۱۱ دسمبر مقرر ہوئی تھی مگر وہ ملتوی کر دی گئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہند اور فرانس کی حکومتوں میں رائے شماری کے انتظامات کے بارے میں کچھ اختلاف تھا۔ اب یہ خبر آئی ہے کہ رائے شماری مارچ ۱۹۵۱ء میں ہوگی اور جہاں تک اس کے انتظام کا تعلق ہے بہت سے امور دونوں حکومتوں کے اتفاق رائے سے طے ہو گئے ہیں خصوصاً نگرانی کا مسئلہ جس پر سب [illegible] اب یہ تجویز ہے کہ بارہ نگراں دونوں کے مشورے سے مقرر کئے جائیں گے جن میں سے چار [illegible] ملکوں کے ہوں گے کچھ تھوڑا سا اختلاف اب بھی باقی ہے مگر امید ہے کہ وہ بھی بہت جلد دور ہو جائے گا۔

اور رائے شماری کے مزید التوا کی کوئی وجہ نہیں رہے گی۔

ذرا صبر سے کام لیجئے

جب سے حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ مدراس کے بارہ ضلعوں کو الگ کرکے آندھرا کا صوبہ بنایا جائے گا لسانی صوبوں کی تحریک بہت زور پکڑ گئی ہے۔ بمبئی کے کنڑی بولنے والے علاقے کے لوگوں کو جو اپنا کرناٹک کا صوبہ الگ بنانا چاہتے ہیں اتنا جوش آگیا کہ انھوں نے عملی احتجاج شروع کر دیا چنانچہ ان کے پندرہ نمایندوں نے بمبئی کی آئین ساز کونسل کی ممبری سے استعفیٰ دے دیا۔ اور مرکزی پارلیمنٹ کے دس ممبروں پر بمبئی کے وزیر شری پاٹل اور حکومت ہند کے وزیر شری دواکر پر بھی زور ڈالا جا رہا ہے کہ استعفا دے دیں لیکن مشکل یہ ہے کہ کرناٹک کا صوبہ بننے کی تجویز انتظامی اور مالی حیثیت سے قابل عمل اسی وقت ہوسکتی ہے جب میسور کی ریاست بھی اس میں شامل ہو اور جہاں تک اندازہ کیا گیا ہے میسور کے لوگ اس پر راضی نہیں ہیں۔ اس کا حل یہی ہے کہ کرناٹک کے صوبے کا مطالبہ کرنے والے اہل میسور کو اپنا ہم خیال بنائیں آخر اس قسم کے احتجاج کا جو یہ حضرات کر رہے ہیں مقصد کیا ہے؟ یہی نہ کہ حکومت کرناٹک کا الگ صوبہ بنانا منظور کرلے؟ یہ مقصد پہلے ہی حاصل ہو چکا ہے اس لئے کہ کانگریس کی بنائی ہوئی لسانی صوبوں کی سب کمیٹی بھی اور حکومت ہند بھی اس اصول کو منظور کر چکی ہے کہ ہر بڑا علاقہ جس میں ایک زبان بولنے والے بستے ہیں الگ صوبہ بنا دیا جائے۔ مگر اس کی ضروری شرط یہ ہے جس پر کسی کو اعتراض نہیں ہوسکتا کہ پہلے ان صوبوں کے معقول اور مناسب نقشے بنا لئے جائیں اور ان کی حدبندی کے سلسلے میں موجودہ صوبوں میں جو جھگڑے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے انھیں باہمی گفت و شنید سے طے کرلیا جائے۔ آندھرا کے لوگوں نے اسی شرط کو پورا کر دیا۔ انھوں نے عدم تشدد [illegible]

۔ ساتھ تامل ناڈو کے لوگوں سے سمجھوتا کرلیا اور مدراس کو [illegible] ہو گئے۔ جو لوگ ان کی ریس میں الگ صوبہ مانگ رہے ہیں [illegible] اس معاملے میں بھی ان کی تقلید کرنی چاہیے کہ صبر و تحمل کے ساتھ عملی دقتوں کو جو ان کی راہ میں حائل ہیں دور کرنے کی تدبیریں کریں کہ دھمکیں احتجاج اور [illegible] استعفوں سے یہ حل نہیں ہو سکتیں۔

چین کی نئی راجدھانی

سال بھر میں پانچویں مرتبہ دارالسلطنت بدل کر چیانگ کی "قومی" حکومت اب چین کی سرزمین سے باہر فارموسا میں پناہ گزیں ہو گئی ہے اور اب وہاں لڑائی جاری رکھے گی۔ ایک اندازے کے مطابق قومی حکومت کی فوج میں تین چار لاکھ سپاہی باقی ہیں۔ اگر یہ اندازہ صحیح ہے تو ان کی مدد سے چین پر دوبارہ قبضہ کرنے کی امید دیوانے کے خواب سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی لیکن قومی حکومت نے فارموسا میں پہنچ کر پناہ لی ہے۔ فارموسا جاپان کے قبضہ میں تھا۔ اسے چین کے سپرد یہ کہہ کر دیا گیا تھا کہ صلح نامے میں اس کے باقاعدہ منتقل کر دیئے جانے کا فیصلہ ہوگا۔ جاپان سے ابھی تک کوئی صلح نامہ نہیں ہوا ہے۔ اس لئے قانونی موشگافیوں کی گنجائش ہے۔ امریکہ کے بعض حلقے عرصے سے اس موضوع پر بہت کچھ کہہ رہے ہیں لیکن اگر یہ اعلان کیا گیا کہ فارموسا چین کے زیر نگیں نہیں تو چیانگ کی قومی حکومت اس کے دفاع کے لئے فارموسا سے جنگ جاری نہ رکھ سکے گی۔ اس صورت میں فارموسا پر اگر کمیونسٹوں نے حملہ کیا تو اس کے دفاع کے لئے کوئی اور صورت اختیار کرنی پڑے گی۔ امریکہ یا اور کوئی ملک ڈان کو کزاٹ بننے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ خصوصاً اس لئے کہ چین میں چیانگ کا دوبارہ لا بٹھانا اب کسی کے بس میں نہیں ہے۔ جنرل لی امریکہ بظاہر چیانگ کی مرضی کے خلاف تشریف لے گئے ہیں۔ ممکن ہے اختلاف کی یہ نمائش اس امید پر مبنی ہو کہ امریکہ لی صاحب سے زیادہ امید رکھتا [illegible]

کرنے پر تیار ہو جائے گا۔ ان کا مقصد تو بہرحال یہی ہے کہ فارموسا کی موجودہ غیر واضح قانونی حیثیت سے فائدہ اٹھایا جائے۔

سُرخ چین کا سیاسی محاذ

اس سلسلے میں ایک خبر سے بعض حلقوں میں بڑی پریشانی پھیل گئی ہے۔ وہ خبر یہ تھی کہ مشرق بعید میں ایک اور کومن فارم بنانے کا ارادہ کیا گیا ہے۔ اس نئے ادارے کے مقاصد میں ایک بات یہ ہے کہ کومن فارم پڑوس کے ملکوں کی جنگ آزادی میں زیادہ سے زیادہ مدد دے گا۔ سرخ چین کی فوجیں ہند چینی کے قریب پہنچ گئی ہیں۔ اس لئے اس سے سب سے زیادہ اندیشہ فرانس کی جمہوری حکومت کو ہونا چاہیے۔ لیکن ہندوستان کے بعض اخبارات اس خبر پر بہت چراغ پا ہیں۔ بات محض اتنی سی ہے کہ کامن ویلتھ کے وزرائے خارجہ کی جو کانفرنس کولمبو میں ہونے والی ہے اور جو ان گنت مشورے ہو چکے اور ہو رہے ہیں ان کے پیش نظر سرخ چین کو ایک سیاسی محاذ بنانا ہوگا۔ ورنہ اتنی بات تو معمولی سمجھ کے آدمی کے دماغ میں آجانی چاہیے کہ نئے چین کے سامنے جو تعمیری کام ہے وہ اتنا عظیم الشان ہے کہ اسے پورا کرنے میں چین کو اپنی تمام صلاحیت اور ساری طاقت خرچ کردینی ہوگی۔

جمہوری ملکوں کی جمہوریت

متحدہ اقوام کی جنرل اسمبلی نے کثرت رائے سے ایک تجویز پاس کی ہے [illegible]

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

بزمِ بے تکلف

حضرت دیوان غالب نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

ظاہر ہے کہ محشرِ خیال، محض ٹھونس جانے کی ترکیب ہے مطلب دراصل یہ ہے کہ ہر شخص اپنی جگہ ایک بزم بے تکلف ہے۔ اکیلا بیٹھا ہو تب بھی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے من کے اندر ایک انجمن بھی ہوئی ہو۔ ابھی پرسوں کا ذکر ہے ہم گھر کو روٹھ کر جنگل کی طرف نکل گئے۔ جنگل تو شیخ جی کی چھچھی داڑھی کی طرح کچھ یوں ہی سا تھا مگر سناٹا غضب کا تھا۔ انسان کا تو کیا ذکر ہے کوئی قیس تک نظر نہ آیا کہ ہم اپنے آپ کو یہی کہہ کر تسکین دیتے۔

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

ہم نے سوچا خیر دو نہ سہی ایک ہی سہی ذرا بیٹھ کر تو دیکھیں کیسی گذرتی ہے یوں بھی تھوڑی سی دیر میں صحرا نوردی کا مزا اچھی طرح چکھ چکے تھے۔ جوتے کی کیلیں خار مغیلاں کا کام دے رہی تھیں۔ خیر ایک جگہ چھاؤں گھنی دیکھ کر جا بیٹھے اور ہم جن خیالات میں دیر سے غوطہ کھا رہے تھے ان میں بالکل ڈوب گئے۔ اب آپ مانیں یا نہ مانیں مگر ہمیں یہ احساس ہوا کہ ہمارے اندر ایک "میں" نہیں بلکہ کئی "میں" ہیں اور ان میں آپس میں تو تو میں میں ہو رہی ہے۔ گفتگو لمبی تھی جو تھوڑی بہت یاد رہ گئی ہے آپ کو سناتے ہیں:-

ا۔ بھلے آدمی تجھے شرم نہیں آتی اپنا سارا وقت بے کار کھوتا ہے۔ جب دیکھو بیٹھا اونگھ رہا ہے یا گپ شپ کر رہا ہے۔

ب۔ کیا خوب! وہ بے چارہ مشاہدۂ نفس میں مصروف ہو تو تمہارے نزدیک اونگھنا ہوا۔ مبادلۂ خیال کرے تو گپ شپ ٹھیری۔

ج۔ اجی رہنے بھی دو یہ دماغی رتوندی کا مریض بھلا کیا مشاہدۂ نفس کرے گا اور مبادلۂ خیال کی بھی ایک ہی کہی۔ اس کے خیالات وہ گھسے پٹے سکے ہیں جنھیں کوئی ٹکے کو نہیں پوچھتا۔ گھوم پھر کر اسی کے پاس آجاتے ہیں۔

د۔ میاں اصل بات یہ ہے کہ اس بے روزگاری کے زمانے میں بچارا کرے تو کیا کرے۔

ا۔ کرے یہ کہ ہاتھ پاؤں ہلائے۔ دوڑے دھوپے۔ روزگار نہ سہی اس کی تلاش ہی سہی، کچھ شغل تو ہو۔ بیٹھا مکھیاں تو نہ مارے۔

ب۔ افسوس اس زر پرست دنیا میں زر کی تلاش میں مارا مارا پھرنا بھی مفید شغل سمجھا جاتا ہے۔ مگر بیٹھ کر مکھیاں مارنا جس سے حفظانِ صحت میں مدد ملتی ہے، بے شغلی کہلاتا ہے۔

ج ارے تو یہ کوئی سچ مچ کی مکھیاں تھوڑی ہی مارتا ہے۔ خیالی مکڑی کا جالا بن کر خیالی مکھیوں کا شکار کرتا ہے۔

د۔ بھئی ذرا تو ترس کھاؤ اس بچارے پر جسے زمانے کی چکی نے پیس ڈالا ہے

ا۔ اس نالائق نکمے نکھٹو کو تم بچارا کہتے ہو۔ ہٹا کٹا آدمی مزدوری بھی کرتا تو پیٹ بھرنے کو مل جاتا۔ دوسروں کے لئے نہ سہی کم سے کم اپنے لئے تو کچھ کرے۔

ہم یہ بکواس سن کر دل ہی دل میں کھول رہے تھے۔ آخر ضبط نہ ہوا اور ہم نے بگڑ کر کہا۔ "ایسے نالائق نکمے نکھٹو کے لئے جیسے کہ ہم ہیں تم کیوں کچھ کریں؟ مانگنے دو بھیک، کرنے دو فاقے، ہماری جوتی سے"

اس کے بعد سناٹا چھا گیا، سنسان جنگل تھا اور ہم تھے۔

اور وقت نے کہا؟

باقر رضوی

غزلوں کے سُنانے کا یہ ہنگام نہیں ہے
سوئی ہوئی مخلوق کو نعروں سے جگا دے

مینا کی نہ حاجت ہے نہ بادہ کی ضرورت
اب دمِ شمشیر سے اب پیاس بجھا دے

رکھ ساز سے مطلب، نہ ترنم سے علاقہ
جنگاہ میں تلوار کی جھنکار سُنا دے

افسانۂ ماضی کو نہ کر یاد خدا را
اب حال کی دکھتی ہوئی باتوں سے مزا دے

"—— اگر اب بھی تو......."

بوسوں پر جو گائے تھے محبت کے ترانے
ہوں یاد اگر اب بھی تو للّٰہ بھلا دے

آرائش و تزئین کا یہ وقت نہیں ہے
اب سر سے کفن باندھ لے ہتھیار سجا دے

غازہ نہ لگا چہرۂ تابندہ پہ زنہار
دنیا کے رُخِ زرد کو گلنار بنا دے

سلجھائے گا اُلجھے ہوئے بالوں کو کہاں تک
اب دہر کی بگڑی ہوئی زلفوں کو بنا دے

اب شمعِ شبستاں نہ جلا بزمِ طرب میں
اس پر جو مصر ہوں انھیں محفل سے اٹھا دے

یخ بستہ جو الفاظ ہیں حاجت نہیں ان کی
اب آتشِ الفاظ سے اک آگ لگا دے

ہے چہرۂ دنیا پہ گناہوں کا پسینہ
للّٰہ اُسے تیغ کے دامن کی ہوا دے

آتا ہی نیا دور بدل جائے گی دنیا
سونے دے امیروں کو غریبوں کو جگا دے

کرشن چندر کی کہانی

خواجہ احمد عباس

کرشن چندر نے سینکڑوں کہانیاں لکھی ہیں۔ کشمیر کی سندر وادیوں سے لے کر بمبئی کی گندی چالوں تک اس کی کہانیاں بکھری پڑی ہیں۔ اس نے اَن داتا کی کہانی لکھی ہے اور کالو بھنگی کی کہانی بھی۔ بنگال کے کال کی کہانی بھی اور پانچ روپے کی آزادی کی کہانی بھی .... اس غالیچہ کی کہانی بھی جس پر جوانی نے شراب لنڈھائی ہے۔ اور اس لال باغ کی کہانی بھی جہاں انسان نے انسان کا خون کیا۔ "پشاور ایکسپریس" کی بھیانک کہانی بھی۔ اور پورے چاند کی رات کی مدھر پریم بھری کہانی بھی .... یہاں تک کہ جب وہ دنیا کی ہر چیز کی کہانی لکھ چکا تو اس نے کہانی کی کہانی بھی لکھ ڈالی ....

ہاں تو کرشن چندر نے اتنی بہت کہانیاں لکھی ہیں، مگر اس کی کہانی اب تک کسی نے نہیں لکھی۔ ویسے کہا جا سکتا ہے کہ کرشن کی ہر کہانی ایک ڈھب سے اس کی اپنی کہانی ہوتی ہے۔ وہ اپنی ہر کہانی میں ایک نیا جنم لیتا ہے اور جب اپنے بنائے ہوئے کیریکٹر کو مارتا ہے تو ساتھ میں خود بھی مر جاتا ہے۔ پھر اگلی کہانی میں پیدا ہوتا ہے۔ نت نئی کہانیاں لکھنا بھی تو آواگون کا ایک چکر ہے ....

کرشن چندر کی کہانی کسی نے نہیں لکھی۔ خود اس نے بھی ابھی نہیں لکھی اور نہ میں اس وقت یہ لمبی کہانی لکھنے بیٹھوں گا۔ مگر جو کوئی کرشن چندر سے ملا ہے اس نے یہ کہانی پڑھی نہیں تو "دیکھی" ضرور ہے۔ یہ کہانی قدرت نے کرشن کے چہرے پر برس کے ساتھ گہری ہوتی ہوئی لکیروں میں لکھدی ہے، اور میرا اپنا خیال ہے کہ یہ کہانی کرشن چندر کے قلم سے لکھی ہوئی سب کہانیوں سے زیادہ دلچسپ، رومانی اور ڈرامے سے بھری ہوئی ہے۔

پندرہ سولہ برس ہوئے جب کرشن نے لکھنا شروع کیا تو وہ کرشن چندر ایم اے کہلاتا تھا۔ بڑھیا سوٹ پہنا کرتا تھا اور ہر کتاب کے ساتھ اس کے خوب صورت چہرے کی تصویر ضرور ہوتی تھی جس کی چمکیلی بڑی آنکھیں۔ کالے چمکدار بال۔ اور گوری رنگت نے بہت سے دل موہ لئے۔ اب اس کے بال سوکھے سخت اور آدھے ہو گئے ہیں اور اُڑنے جا رہے ہیں۔ اس کی آنکھیں دنیا میں نہ جانے کیا کچھ دیکھ کر اندر کو دھنس گئی ہیں ان کے ارد گرد کالے حلقے پڑ گئے ہیں مگر عینک کے موٹے موٹے شیشوں میں سے بھی وہ اسی طرح چمکتی ہیں۔ اس کے کبھی کے جوان اور ہشاش بشاش چہرے پر سوچ پریشانی محنت اور دوڑ دھوپ نے گہری لکیریں ڈال دی ہیں۔

کرشن چندر کی عمر ابھی ۳۶، ۳۷ برس ہی کی ہے۔ اسے لکھتے ہوئے مشکل سے سولہ برس ہوئے ہوں گے۔ مگر اس عرصے میں اس نے کوئی بیس کتابیں لکھی ہیں۔ اس کی کہانیوں کا ترجمہ نہ صرف ہندوستان کی بلکہ دوسرے ملکوں کی کئی زبانوں میں بھی ہو چکا ہے۔ اس کے اردو ناول کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں اور ہندی ایڈیشن نکل رہا ہے۔ کوئی اردو یا ہندی کا پرچہ ایسا نہیں جو کرشن کی کہانی چھاپنا اپنی خوش قسمتی نہ سمجھتا ہو۔ مگر کرشن چندر ابھی تک "کلاسیک" دیا "کریا ٹرا لیکٹ" بھی نہیں بنا۔ اسے اپنے بڑے پن کا بالکل احساس نہیں ہے۔ اُسے اپنی کہانیوں سے اتنی ہی محبت ہے جتنی اپنے بچوں سے .... مگر نہ وہ اپنے بچوں کے لاڈ کرتا ہے اور نہ اپنی کہانیوں کے۔ بچوں کی دیکھ بھال ان کی ماں کرتی ہے اور کہانیوں کے لاڈ پیار اُن کے پڑھنے والے۔ خود کرشن کی زبان سے اس کی کہانیوں کی تعریف میں آپ کبھی ایک لفظ نہ سنیں گے، وہ ابھی تک اپنی تخلیقوں سے پورے طور سے مطمئن نہیں ہے۔ اسی لئے اس کی تحریر میں ٹھہراؤ نہیں پیدا ہوا اور اس کا آرٹ ابھی تک پروان چڑھ رہا ہے۔

کرشن چندر ایک مشہور ادیب ہونے کے باوجود ہمارا آپ جیسا انسان ہے جس نے اپنی زندگی میں بہت سے پاپڑ بیلے ہیں۔ جرنلسٹ رہا ہے۔ ایڈیٹری کی ہے۔ کالج کے لڑکوں کو پڑھایا ہے۔ ریڈیو کی نوکری کی ہے۔ فلم کے لئے مکالمے لکھے ہیں۔ فلم ڈائرکٹ کیا ہے۔ بیکاری اور غریبی کے فرے بھی جھیلے ہیں۔ پریم بھی کیا ہے اور شادی بھی۔ دل لگایا بھی ہے توڑا بھی ہے جوڑا بھی۔ انقلاب [illegible] کا نعرہ بھی لگایا ہے اور مشاعروں کی محفلوں میں بھی گھسا یا ہے۔ وقت پڑنے [illegible] دیا ہو [illegible] کا بھی۔ وہ ترقی پسند اور انقلابی پارٹیوں کے ساتھ ہے۔ مگر کسی پارٹی میں نہیں ہے۔ وہ دھرم، مذہب، ذات پات کے بندھنوں سے آزاد ہے۔ سامراج اور فرقہ پرستی کا دشمن ہے، جنتا اور لوک راج کا ساتھی۔

اس نے ہزاروں روپے کمائے ہیں، اس سے زیادہ خرچ کئے ہیں۔ ہمیشہ قرض کے جال میں جکڑا رہتا ہے، پھر بھی ہر ترقی پسند پرچے کے لئے مفت کہانی لکھنے کو تیار رہتا ہے۔ اس کی ناک کی ہڈی بڑھی ہوئی ہے، اور اسے ہمیشہ زکام رہتا ہے۔ اس کی بچیاں دبلی ہیں۔ بیوی اکثر بیمار رہتی ہے، اور وہ ان کا علاج کرنے میں اتنا ہی لاپروا ہے جتنا اپنا علاج کرنے میں .... اس کے ارد گرد دو قسم کے آدمیوں کی بھیڑ رہتی ہے، وہ جن سے وہ پہلے قرض لیتا رہتا ہے اور وہ جنہیں وہ قرض دیتا رہتا ہے .... وہ ہمیشہ سفید قمیص اور اودی پتلون پہنتا ہے کیونکہ کوٹ اس کے پاس ہے ہی نہیں اور اس کی جیب میں کبھی دو روپے سوا دو پیسے سے زیادہ نہیں ہوتا۔ "پانچ روپے کی آزادی" بہت کم ہی نصیب ہوتی ہے ....

.... یہ اور بات ہے کہ گھر میں کھانے کو نہ ہو۔ مگر کہانی لکھنے کے لئے اسے سب سے بڑھیا کاغذ کا رائٹنگ پیڈ چاہیے۔ گھٹیا کاغذ پر اس کا قلم چلتا ہی نہیں۔ وہ ٹائم ٹیبل سے کبھی کام نہیں کرتا، لکھنے پر آئے تو ایک دن میں پوری کہانی لکھ ڈالے نہیں تو پندرہ دن تک ایک لفظ نہ لکھے۔ باتیں جتنی چاہے کرا لیجئے اور دنیا کے کسی موضوع پر .... پالیٹکس، لٹریچر، فلم، ڈراما یا محض گھریلو گپ شپ ....

غرض کرشن چندر میں کوئی خاص بات نہیں ہے بس معمولی سیدھا سادھا آدمی ہے، ہم آپ جیسا۔ شاید اسی لئے اس کی کہانیوں میں ہمارے آپ جیسے معمولی آدمیوں کے جیون کی اتنی سچی تصویر ملتی ہے۔

فاؤسٹ اور اقبال

یحییٰ امجد

(جرمنی کے شہرۂ آفاق شاعر گوئٹے کی ولادت کا دو صد سالہ جشن ۹ دسمبر ۱۹۴۹ء کو بہت سے ملکوں کے ادبی حلقوں میں منایا گیا ہم یحییٰ امجد صاحب کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اس موقع کے مناسب ذیل کا مضمون جس میں گوئٹے کے نظریۂ زندگی کا مقابلہ اقبال کے تصور حیات سے کیا گیا ہے عنایت فرمایا۔)

(۱)

اس مقالہ کا مقصد صرف ان نظریات کی طرف اشارہ کرنا ہے جو گوئٹے کے فاؤسٹ اور کلام اقبال میں مشترک محسوس ہوتے ہیں اور جن کے درمیان ایک سرسری نگاہ ڈالنے پر بھی ایک ایسا ربط یا تعلق نظر آتا ہے جسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ فاؤسٹ جس کا شمار دنیا کی بلند ترین فلسفیانہ نظموں میں ہوتا ہے گوئٹے کی تصانیف میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی عظمت کا بڑا راز یہ ہے کہ شاعر نے کمال وضاحت اور جامعیت کے ساتھ فلسفہ حیات کے مسائل کو شاعرانہ آرٹ کا لباس پہنا کر پیش کیا ہے۔ اقبال کی فاؤسٹ سے دلچسپی کا ثبوت پیام مشرق کی نظم جلال و گوئٹے سے ملتا ہے۔

نکتہ دان المنی را در ارم
صحبتی افتاد با پیر عجم

شاعری کو ہمچو آن عالی جناب
نیست پیغمبر و لیکن دارد کتاب

خواند بر دانائے اسرار قدیم
قصۂ پیمان ابلیس و حکیم

گفت رومی اے سخن را جان نگار
تو ملک صید استی و یزدان شکار

فکر تو در کنج دل خلوت گزید
این جہان کہنہ را باز آفرید

سوز و ساز جان بہ پیکر دیدہ
در صدف تعمیر گوہر دیدہ

ہر کسے از رمز عشق آگاہ نیست
ہر کسے شایان این درگاہ نیست

داند آن کو نیکبخت و محرم است
زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است

ہمیں کلام اقبال اور فاؤسٹ میں حیرت انگیز یکسانی نظر آتی ہے وہی عقل و دل کی کشمکش میں دل کی فضیلت فیضان عشق کے ذریعے حقیقت کے مشاہدے کی جستجو شیطان کا تصور بحیثیت ایک تخلیقی قوت کے جو صراط مستقیم سے بھٹک گئی ہے اور ایک سراپا امید اور قوت افزا پیغام حیات۔

اس یک رنگی کا سبب گوئٹے اور اقبال کی ذہنی مماثلت ہے۔ دونوں شاعر حیات ہیں۔ دونوں کی شاعری حکیمانہ ہے۔ دونوں عقل و دانش کے مزاج داں ہوتے ہوئے بھی وجدان کے قائل ہیں۔ دونوں جد و جہد کو زندگی اور غفلت کو موت سمجھتے ہیں اور دونوں انسانی زندگی کے لامحدود امکانات اور نفس انسانی کی کائنات میں فوقیت کے قائل ہیں جن کا اظہار خود علامہ نے پیام مشرق میں فرمایا ہے۔

ہر دو دانائے ضمیر کائنات
ہر دو پیغام حیات اندر ممات

ہر دو خنجر صبح خند آئینہ فام
او برہنہ من ہنوز اندر نیام

ہر دو گوہر ارجمند و تابدار
زادۂ دریائے ناپیدا کنار

کلام اقبال اور فاؤسٹ سے بعض اساسی تصورات خصوصاً نظریہ حیات، تصور علم اور تصور شیطان کو لے کر اقتباسات کے ذریعے مقابلہ کرنے سے مذکورۂ صدر حقیقت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

نظریہ حیات

گوئٹے ہنگامۂ ہستی کو محض کسی اندھی مشیت کی تخلیق نہیں بلکہ اعلیٰ مقاصد کا نظام سمجھتا ہے، وہ فوارۂ حیات کو بند غم جان کر توڑنا نہیں بلکہ روحانی ترقی کی ایک منزل سمجھ کر اس سے مانوس ہونا چاہتا ہے، زندگی باوجود اس کلفت و کشاکش کے اس کے نزدیک ایک نعمت ہے جس میں جمال پیدا کرنا ہر انسان کا فرض ہے۔ اس کا ذوق نظر اس امر کا خواہاں ہے کہ ہم اپنی شرافت نفسی اور بلندی کردار کے جوہر سے تہذیب و شائستگی کا ایک حسین اور خوش نما پیکر تیار کریں۔ اقبال کے روح ارضی کے استقبالیہ نغمہ کی طرح شیطان کا (جو گوئٹے کے نزدیک روح ارضی کا حلیف ہے) یہ نغمہ،

"افسوس صد افسوس
تو نے مسمار کر دیا
خوب صورت دنیا کو
اپنے زبردست گھونسے سے
وہ ٹھہر گئی، ریزہ ریزہ ہو گئی
ایک دیوتا نے اسے پاش پاش کر دیا!
ہم اس کے ٹکڑوں کو
عدم کی طرف لے جا رہے ہیں
اور اس برباد حسینہ پر
نوحہ کر رہے ہیں۔
اے زمین کے سورما بیٹے
اسے نئی شان سے تعمیر کر
اپنے سینے میں اپنے دل میں
اس کی پھر سے بنیاد رکھ
زندگی کا ایک نیا دور
روشن ضمیری سے شروع ہو
اور اس کی تہنیت میں
نئے گیت گائے جائیں"

جس کی بدولت فاؤسٹ کے دل میں پھر زندہ رہنے کی خواہش عود کر آتی ہے۔ گوئٹے کی رجائیت اور ایک پر امید اور خوش نما مستقبل کا پتہ دیتا ہے۔

تہذیب و شائستگی کے اس حسین اور خوش نما پیکر کی یافت کے لئے انسان کو اپنے طبعی ماحول سے مسلسل جنگ کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے نئے نئے مقاصد متعین کرنا اور انھیں حاصل کرنے کی سعی میں سرگرم رہنا، ایک مقصد کے حاصل ہوتے ہی ایک بلند تر مقصد کے حصول کی کوشش کرنا اور اس طرح راہ طلب میں آگے بڑھتے رہنا ایک امر ناگزیر ہے۔ وہ آسمان سے روشن ترین ستارہ مانگتا ہے اور زمین سے بہترین نعمتیں قریب و بعید کی کوئی چیز ایسی نہیں جس سے اس کے اضطراب قلب کو تسکین ہو۔

اس بے قراری اور بے چینی، اس سعی پیہم اور جد و جہد مسلسل کا نام زندگی ہے۔ سکون روح انسانی کے لئے موت کا پیغام ہے۔ شیطان سے معاہدہ کرتے وقت فاؤسٹ کے یہ الفاظ

"اگر میں کبھی چین سے بستر کاہلی پر لیٹوں تو میں اپنی جان ہارا۔ اگر تو کبھی بہلا پھسلا کر مجھے میری زندگی سے مطمئن کر دے اور عیش و عشرت سے دھوکا دے تو وہ دن میری زندگی کا آخری دن ہو۔ میں یہ شرط لگاتا ہوں"

گوئٹے کے فلسفۂ عمل کی روح رواں ہے۔

اس راہ طلب میں روح انسانی کو نور ہدایت کی ضرورت رہتی ہے اور گوئٹے کے نزدیک وہ جوہر "انوثیت" ہے یہ محبت، عقیدت اور تسلیم و رضا کا ابدی جوہر ہے جو کل کائنات میں جاری اور ساری ہے اور جس کی جھلک یہ عاشق کو اپنی معشوق کی صورت و سیرت میں نظر آتی ہے۔ اگر فاؤسٹ روح انسانی شیطان (جو لذت پرستی اور خالص عقل کا پیکر مجسم ہے اور انکار و نفی کی روح) پر غالب آ سکتا ہے تو گریچن کی مدد سے جو جوہر انوثیت کا پیکر ہے۔

اقبال بھی گوئٹے کی طرح ایک سراپا امید، قوت افزا اور اخلاقی تصور پیش کرتا ہے اور نیابت الٰہی کے منصب جلیل کو حاصل کرنے کا وہی طریقہ

تبلاتا ہے جو گوئٹے کے ہاں پایا جاتا ہے۔ اقبال نے اپنے فلسفۂ حیات کو اپنی مخصوص اصطلاح خودی کے ذریعے ظاہر کیا ہے۔ حیات کی اصل خودی ہے جس میں بقائے دوام کی صلاحیتیں مضمر ہیں۔

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

اس کی زندگی عمل اور جدوجہد ہے وہ خیر خواہ ٹکراتی ہے اور اپنے ارتقا اور نشوونما کا سامان پیدا کرتی ہے۔

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہب ......زمانہ
کھا کھا کے طلب کا تازیانہ
اس راہ میں مقام بے محل ......ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے

اعمال آرزوؤں اور مقاصد سے پیدا ہوتا ہے اور بلند سے بلند تر مقام پر پہنچنے کا اضطراب طالب خودی کو دم بھر چین نہیں لینے دیتا۔

چہ کنم کہ فطرتِ من بمقام در نہ سازد
دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوبروئے
تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے
سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

تکمیل خودی یا منصب الٰہیہ کو حاصل کرنے کے لئے گوئٹے کی طرح اقبال کے یہاں بھی ایک راہ نما کی ضرورت ہے اور وہ راہ نما عشق ہے۔ عشق سے مراد اس مردِ کامل کی محبت ہے جو خودی کی معراج پر پہنچ چکا ہے۔ یہ کہ اس برتر شخصیت سے تکمیل خودی کا راز سیکھے اور اپنی قوت کو منشر نما دے کر اپنی شخصیت یا خودی کو استوار کرے۔

گوئٹے اور اقبال کے نظریہ حیات میں اتنی مماثلت ہونے ہوئے بھی ایک فرق ہے جہاں تک شرافت نفسی اور بلندیٔ کردار کے جوہر سے تہذیب و شائستگی کا ایک حسین پیکر تیار کرنے کا تعلق ہے وہ جن ساتھ ساتھ ہیں جن اقبال آگے بڑھتا ہے اور اس پیکر سے ایک زندہ جاوید تمدن اور عالم گیر انسانیت کی بنیادیں اٹھاتا ہے۔ (باقی آئندہ)

کے مطالعے میں محو رہتے ہیں اور انھیں اس کی فرصت نہیں ملتی کہ طالب علموں کے سامنے آج کی دنیا کا ایک مکمل اور مربوط نقشہ پیش کر سکیں اور یہ بتا سکیں کہ اس میں ان کی جگہ کہاں ہے یا ان میں قدروں اور معیاروں کا احساس پیدا کر سکیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے طالب علم کالج کی تعلیم ختم کرنے کے بعد عموماً فکر و احساس سے ... ہوتے ہیں۔ محنت اور دیانت داری سے کام کرنے اور سنجیدگی طور پر سوچنے کے عادی نہیں ہوتے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ آگے چل کر وہ سستی، نا اہلی اور سطحی پروپگنڈا کے شکار ہو جاتے ہیں۔ ہماری قوم کی یہ نفسیاتی کیفیت ہے جس سے ہمیں نبٹنا ہے میں یہ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ ہماری قومی زندگی میں جو بے راہ روی پچھلے دنوں دیکھنے میں آئی یعنی سیاسی پارٹیوں کی تفرقہ پسندی ان کا اختلافات سے فائدہ اٹھا کر فساد برپا کرنا۔ ان کی تنگ خیالی تعصب اور رجعت پرستی محض سیاسی مظاہر نہیں ہیں بلکہ گہری نفسی اور اخلاقی بیماری کی علامتیں ہیں۔ جس چیز کو سطحی نظر سے دیکھنے والے افراد یا سیاسی جماعتوں کی کشمکش سمجھتے ہیں اس کی تہہ میں مختلف ذہنیتوں اور اخلاقی قدروں کی کشمکش ہے۔ معلم کی حیثیت سے ہم اس جنگ میں جو عقل، تہذیب، رواداری، انسانیت کی قوتوں اور تعصب، تنگ نظری، تاریک خیالی اور اندھی ماضی پرستی کی قوتوں میں ہو رہی ہے۔ خدا ہمیں یہ توفیق دے کہ ہم اس لڑائی میں مہاتما گاندھی کی حکمت و بصیرت اور جواہر لال کی شجاعت کے ساتھ پاک صاف ہتھیاروں سے جی توڑ کر لڑیں۔

باہر کی دنیا (بہ سلسلہ صفحہ ۴)

جس میں جنوبی افریقہ کی حکومت سے کہا گیا ہے کہ اس کی تولیت میں جو نو آبادیاں ہیں وہ ان کے متعلق معلومات بہم پہنچاتا رہے۔ اس تجویز کی مخالفت کرنے والوں میں سر فہرست دنیا کے تین سب سے بڑے جمہوریت پسند ملک ہیں۔ امریکہ، انگلستان اور فرانس، ظاہر ہے جنوبی افریقہ کو جب اتنی شہ مل رہی ہو تو پھر وہ کسی کو کیوں خاطر میں لائے؟ جنوبی افریقہ کی حکومت نے ایسا کرنے سے پہلے ہی انکار کر دیا ہے۔ لیکن جنرل اسمبلی کی یہ ہمت کہ وہ نو آبادیات کے مسئلے پر بحث کی اجازت دے اور ایک آدمی کو یہ موقع دے کہ وہ کچھ آنکھوں دیکھی بات سنائے اس بات پر برطانیہ بہت خفا ہے۔ مدت ہوئی پنڈت نہرو نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا "سامراج شاہی بہت سخت جان ہے اور برطانوی سامراج خاص طور سے"۔ اب پنڈت جی کا خیال ہے کہ برطانیہ میں سامراجی طاقت بننے کی صلاحیت ہی نہیں۔ چودھری چوری سے گیا، ہیرا پھیری سے تو نہیں؟

ا، س

تبت بیداری

تبت میں اس وقت اگرچہ سکون ہے اور پچھلے دنوں چینی کمیونسٹوں کے حملے کے ڈر سے وہاں جو پریشانی پیدا ہو گئی تھی وہ فی الحال دور ہو گئی ہے مگر پھر بھی حکومت پوری احتیاط اور انتہائی ہوشیاری کے ساتھ سرحدوں کی نگرانی کر رہی ہے اور اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے ہر قسم کے خطرے کے مقابلے کے لئے تیار ہے۔

چین نے تبت پر اپنی سیادت اور حکمرانی کا ہمیشہ مطالبہ کیا ہے اور تبت کے لوگوں نے اس سے ہمیشہ انکار کیا ہے۔ چینی کمیونسٹوں نے بھی اس مطالبے کو دہرایا ہے۔ وہ تبت کو "عوامی ریپبلک" کا ایک حصہ سمجھتے ہیں اور جیسا کہ پیکنگ سے اعلان کیا گیا ہے کمیونسٹوں کے پروگرام میں اس پر قبضہ کرنا بھی شامل ہے۔

چینی کمیونسٹ تبت کے شمال میں سنکیانگ (چینی ترکستان) اور مشرق میں کم بم، جے کنڈو، ڈرگے، لی تانگ، اور بے تانگ کے اضلاع پر قبضہ کر چکے ہیں اور اب تک تبت پر حملہ نہ کرنے کے حسب ذیل اسباب بیان کئے جاتے ہیں۔

روس
منگولی عوامی ریپبلک
سن کیانگ
چینی ترکستان
چین
تبت

(۱) خود چین میں کمیونسٹ حکومت کو ابھی مستحکم کرنے کی ضرورت ہے اور اس میں کافی وقت لگے گا (۲) سرخ چین کو فی الحال تبت سے کوئی مادی مدد نہیں ملے گی (۳) ایک ایسے ملک میں جہاں کافی اناج پیدا نہیں ہوتا بہت بڑی فوج رکھنی پڑے گی (۴) زبردستی قبضہ کرنے سے بہت سے ملک مخالف ہو جائیں گے جس سے بین اقوامی سیاست میں بہت سی الجھنیں پیدا ہو جائیں گی۔

اس لئے چینی کمیونسٹ، اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے نسبتاً سہل اور محفوظ طریقہ اختیار کرنا چاہتے ہیں، یعنی تبت پر حملہ کرنے سے پہلے ہر طرح پانچویں کالم کے ذریعے اپنے لئے پوری طرح زمین ہموار کر لینی چاہتے ہیں تبت کے آس پاس جن علاقوں پر ان کا قبضہ ہے ان میں بہت کافی تعداد میں ایسے تبتی بھی ہیں جن پر کمیونسٹوں کو پورا بھروسہ ہے۔ جس وقت حالات اجازت دیں گے چینی کمیونسٹ ان کو تبت میں داخل کر دیں گے اور وہ وہاں ایسے حالات پیدا کر دیں گے کہ بغیر کسی بڑی لڑائی کے تبت پر کمیونسٹوں کا قبضہ ہو جائے گا۔

اگرچہ تبت کی فوج کے پاس کافی تعداد میں نئے ہتھیار نہیں ہیں لیکن پھر بھی اس نے کافی تیاری کر لی ہے اور حکومت کو امید ہے کہ ضرورت پڑنے پر دوسرے ملکوں سے اس کو ہر طرح کی مدد حاصل ہو گی۔

تہذیب کو کیوں کر بچائیں؟ (بہ سلسلہ صفحہ ۲)

جو ابھی بہت دور معلوم ہوتا ہے ——— بجائے خود، لوگوں کے دل و دماغ کو نہیں بدل سکتا بلکہ اس کے ساتھ شعوری تعلیمی کوشش بھی ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے معلموں اور تعلیمی اداروں نے اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا ہے۔ وہ امتحان اور نصاب تعلیم کے جھگڑوں میں گرفتار اور اپنے مخصوص مضامین

نفسیات اور تجارت

(۲)

خواجہ جلیل احمد

ہر انسان ایک مخصوص عمر گزارنے کے بعد عادات کا بندہ بن کر رہ جاتا ہے ..... نفسیات انسان کی اسی عمومی کمزوری سے فائدہ اٹھاتی ہے اور اسی فطری قانون کو نظر رکھ کر کارخانہ دار زیادہ سے زیادہ مال پیدا کرتے ہیں کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ اگر ان کا کوئی مخصوص مال پبلک کو پسند آگیا ہے اور وہ اس کے عادی ہو گئے ہیں تو وہ باوجود ذہنی مخالفت کے اس کی خرید جاری رکھیں گے

پہلا مضمون ہے ... [illegible] ... ہے جو یقیناً ایک نفسیاتی مسئلہ ہے ہم بعد میں بحث کریں گے اس سے قبل خریدار کی چند نفسیاتی خصوصیات کا ذکر مقصود ہے۔ مثلاً انسانوں میں مختلف "عادات" کے ہمہ گیر اثرات کو لیجئے۔ ہر انسان ایک مخصوص عمر گذارنے کے بعد عادات کا بندہ بن کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص سگریٹ نوشی شروع کرتا ہے۔ ابتدا میں تو بلاشبہ وہ سگریٹ کی مختلف اقسام کا ذائقہ چکھتا ہے لیکن بعد میں وہ ایک مخصوص سگریٹ کو پسند کرنے لگتا ہے اور دوسروں کو اس پر ترجیح دیتا ہے۔ تھوڑے عرصے تک اس سلسلے کو قائم رکھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو اگر اس مخصوص برانڈ کے سگریٹ کے علاوہ اور دوسرے سگریٹوں سے نفرت ہو جاتی ہے اور وہ اس سے زیادہ بہتر قسم کے سگریٹ پینے سے احتراز کرتا ہے۔ نفسیات انسان کی اسی عمومی کمزوری سے فائدہ اٹھاتی ہے اور اسی فطری قانون کو نظر رکھ کر کارخانہ دار زیادہ سے زیادہ مال پیدا کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر ان کا کوئی مخصوص مال عوام کو پسند آگیا ہے۔ اور وہ اس کے عادی ہو گئے ہیں تو وہ باوجود ذہنی مخالفت کے اس کی خرید جاری رکھ سکیں گے۔ مثال کے طور پر سائیکلوں کو لیجئے۔ ہرکولیس سائیکل نے اپنی پائداری اور خوب صورتی کی بنا پر اتنی شہرت حاصل کی کہ آج بھی اگر کوئی نئی سائیکل خریدنے کا ارادہ کرتا ہے تو پہلے ہرکولیس کی قیمت دریافت کرتا ہے حالانکہ جرمنی کی بائیسکلیں بھی مضبوطی میں ہرکولیس سے کم نہیں ہوتی تھیں یہی حال کچھ ہے کہ ہندوستان میں تمام امریکن اور انگریزی سامان کا ہوا خواہ پروپیگنڈے کے اثر سے یا واقعیت کی بنا پر عوام کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ ان دو ممالک کا مال ہندوستانی مال کے مقابلے میں بدرجہا بہتر ہوتا ہے [illegible] تحریک آزادی اور قومی مال [illegible] آج بھی جب ہندوستان آزاد ہے [illegible] ان دونوں ممالک کے مال کو ہندوستانی مال پر ترجیح دیتے ہیں اسی طرح جاپانی مال ہندوستان میں اپنی کم قیمت کی بنا پر بدنام ہوا اور اب یہ عام ہو گیا کہ کمزوری اور گھٹیا پن کا دوسرا نام جاپانی قرار پا گیا۔ حالانکہ میں نے ذمہ دار اور معتبر ذرائع سے سنا ہے کہ جاپان کی الٹھارہ اٹھارہ روپے کی بائیسکلیں بڑی عرصے تک کام دے جاتی تھیں جب کہ امریکن اور برٹش بائیسکلوں کی قیمت [illegible] کی حد تک اور [illegible] گئی تھی یہ کیا تھا صرف انسانی دماغ کے عادت کے ماتحت ایک مخصوص سمت میں کام کرنے کا مظاہرہ۔

ممکن ہے اور امکان کا کوئی سوال نہیں یہ واقعہ ہے کہ بعض لوگ اس کلیہ کے مستثنیات میں سے ہوتے ہیں لیکن عام طور پر پبلک عادت کی پابند ہوتی ہے اور اگر سو اشخاص میں سے اسی یا پچاسی (حالانکہ میرا خیال ہے کہ ۹۹ فی صدی افراد عادات کے غلام ہوتے ہیں) آدمی بھی ایسے نکل آئے جو مخصوص عادات کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے تو پھر کارخانہ دار کا پو بارہ ہے اور وہ بلا خسارے کے خوف کے مال تیار کر سکتا ہے۔

بعض لوگ جو اس نقطہ نظر کو مبالغہ آمیز سمجھتے ہیں یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان عادات اور فطری خواہشات کے ماتحت خریداری نہیں کرتا بلکہ وہ عقل سے کام لے کر اور سوچ بچار کرکے کسی خاص شے کی خریداری کا فیصلہ کرتا ہے لیکن ذرا اپنی روزانہ خرید پر ایک نظر ڈالئے اور سچے دل سے بتائیے کہ کتنی دفعہ آپ نے کسی چیز کی خرید میں منطقانہ استدلال سے کام لیا ہے ممکن ہے بعض لوگ جذبات کی رو میں نہ بہتے ہوں اور خریداری میں "عادت" کی پابندی سے بچ کر عقل کا استعمال کرتے ہوں لیکن ایسے لوگوں کی تعداد کتنے فی صدی ہے؟ اور کیا یہ تعداد نظر انداز نہیں کی جا سکتی بیچنے والا تو صرف اسی میں خوش ہو جائے گا کہ صرف پچاس فیصدی اشخاص اس کی چیز کو پسند کرتے ہیں بالعموم اوزاروں، آلات اور اس قسم کی دوسری اشیاء کی خریداری آدمی سوچ سمجھ کر کرتا ہے۔ لیکن ماہرین نفسیات نے اس کا بھی حل نکال لیا ہے وہ ان غیر دلچسپ ہتھیاروں اور اوزاروں کا دنیا کی دیگر مرغوب اور پسندیدہ چیزوں سے ایسا رشتہ قائم کر دیتے ہیں کہ بلا خریداری کے بن نہیں پڑتی مثال کے طور پر کسی گل دان کو لیجئے۔ یوں تو کسی بھی گلاس کی شکل کی چیز میں پھول بآسانی رکھے جا سکتے ہیں اور میرے خیال سے ایسے گلدان میں مقابلتہً کافی پھول آسکیں گے اور پانی کی بھی گنجائش زیادہ ہوگی لیکن اسی بھدے گلاس کی کمر اگر ذرا مخروطی رکھ دی جائے تو پھر نہ صرف اس کی دلکشی دوبالا ہو جائے گی بلکہ وہ ہاتھوں ہاتھ بک جائے گا اس وجہ سے اس کی کمر کی ساخت انسانی کمر کی ایسی ساخت سے ملتی جلتی ہے جو تمام لوگوں کو پسند ہے۔ اسی طرح بعض غیر دلچسپ کتابوں کے سرورق کی دیدہ زیبی ان کی فروخت کا باعث ہوتی ہے۔ یہ دیدہ زیبی صرف مخصوص اور مسحور کن رنگوں کی آمیزش اور کسی محبوب جمالیاتی مذاق کے استعمال سے پیدا کی جا سکتی ہے۔

در اصل کسی چیز کی فروخت [illegible] اس چیز پر [illegible] ہوتا ہے [illegible] والا پبلک [illegible] کبھی خواہشات کو اپنے پروپیگنڈے اور اشتہارات سے ابھار سکتا ہے اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ یہ خواہشات [illegible] طاقت ور ہیں کہ انسان کو ان پر ہے خریدنے پر [illegible] یا نہیں مثلاً ابتدائی خواہش محنت کی [illegible] اور بال بچوں کی پرورش اور نگہداشت [illegible] طاقت ور ترین خواہشات میں سے ہیں کیوں کہ یہ براہ راست طاقت ور جبلتوں سے متعلق ہیں اسی طرح مہمان نوازی اور [illegible] تفریح کی خواہشات اس سے کم تر درجے کی ہیں۔ اب اگر مشتہرین نے اول الذکر قسم کی زیادہ سے زیادہ خواہشات کو اپیل کرنے کی کوشش کی ہے تو یقیناً ان کا پروپیگنڈا کامیاب ہوگا اور مال خاطر خواہ فروخت ہوگا۔ مثال کے لئے لکس صابن کو لیجئے۔ بالعموم لکس کے اشتہار میں ایکٹرسوں کی خوب صورتی کا ذکر ہوتا جن کا حسن مشتہرین کے نقطہ نظر سے محض لکس سوپ کی بدولت برقرار ہے یا لکس سوپ ہر حسینوں میں شہرت و عزت اور محبوب کی نظر میں پسندیدگی کا باعث ہوگا کیوں کہ یہ جلد کی حسین تہوں کو ان کی قدرتی حالت میں قائم رکھتا ہے۔ اسی طرح محض افغان اسنو کے استعمال سے حسن و ملاحت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا جو اور کریموں اور پاؤڈروں کے استعمال سے ناممکن ہے وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ یہ خواہشات انسان میں کافی طاقت ور ہوتی ہیں، اس لئے ان کی بھڑکتے ہی خرید و فروخت شروع ہو جائے گی۔ اکثر فروخت کنندگان اسی نظریے کے ماتحت تصاویر سے اشتہارات کا کام لیتے ہیں مثلاً کسی فلم ایکٹرس (نرگس، گیتا، بالی [illegible] یا وغیرہ) کی ایک عمدہ سی تصویر رنگین کاغذ پر کھنچوائی اور اس کے نیچے یہ لکھ دیا کہ یہ ہمیشہ افغان اسنو یا لکس سوپ استعمال کرتی ہے خواہ اس غریب کو ان دونوں چیزوں سے کوئی سروکار نہ ہو اور وہ کوئی تیسری "حسن افزا" دوا کا استعمال کرتی ہو لیکن ناممکن ہے کہ نفسیاتی حربہ کام نہ کرے۔ لوگ تو عقل کے پیچھے [illegible] لے کر پھرتے ہیں وہ فی الفور بلا تحقیق کئے دونوں چیزوں کی خرید شروع کر دیں گے۔ لیکن [illegible] طریقہ کار بعض دفعہ انتہائی ناکامی کا باعث ہوتا ہے [illegible] تصویر [illegible]

بنانے یا انتخاب میں غلطی کی گئی ہو؛ اسی طرح بعض مضحکہ خیز ہستیوں کا چلا چلا کر کسی شے کا پروپاگنڈا کہ عوام کو اس شے کی خرید پر مجبور کرنا گیا اس سے برگشتہ کر دیتا ہے اس لئے اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرنے کے عملی طریقے پر زیادہ زور دینا چاہئے۔

علاوہ ازیں عوام کی ذہنی اور مالی استطاعت کا خیال رکھنا بھی مشتہرین کا فرض ہے کیونکہ اگر انھوں نے ایسے الفاظ یا تصاویر کے ذریعے اپنے مال کا پروپاگنڈا کیا جس کا سمجھنا عوام کے لئے دشوار ہے تو پھر کامیابی کی کوئی اُمید نہیں۔ دوسری یہ کہ مختلف الطبائع ہونے کے باوجود بالعموم عوام کچھ خاص چیزوں کو پسند کرتے ہیں اور کچھ کو ناپسند، اس اہم حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے ورنہ خاطر خواہ کامیابی دشوار ہوگی۔

یہاں تک کہ ہم نے زیادہ تر خریدار کی ذہنی کیفیات کا تجزیہ کیا ہے۔ اب ہم مختصراً فروخت کنندگان کا بالخصوص جن میں مختلف کمپنیوں کے ایجنٹ صاحبان شامل ہیں، ذکر کریں گے۔ اس سلسلے میں سب سے ضروری چیز انسان کی ذہنی اور جذباتی کیفیات کا علم ہے چنانچہ ایجنٹ یا فروخت کنندہ جتنا زیادہ انسانی فطرت کو سمجھتا ہوگا اتنا ہی اس کی کامیابی کا امکان ہے۔ "دوست کیسے بنائے جائیں" نامی کتاب کے مصنف نے ایک ایجنٹ کا قصہ بیان کیا ہے جو دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ سبق آموز بھی ہے۔ اور تجارتی معاملات میں مشعل ہدایت کا کام کر سکتا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ یہ ایجنٹ جس بیمہ کمپنی کے لئے کام کرتا تھا اس کے سارے ملازمین میں اسی کے فروخت کردہ حصے سب سے زیادہ ہوتے تھے۔ کمپنی کا مالک اس کی دیانت داری اور قابلیت کا بے انتہا معترف تھا اور اس کی ذات پر فخر کرتا تھا ایک دن اس کے جی میں آئی کہ لاؤ اس کی کامیابی کا راز تو معلوم کر لیا چنانچہ اس نے اس کو بلایا کہ بھئی تم کون سا نسخہ لوگوں کو رام کرنے کا استعمال کرتے ہو اس پر وہ مسکرایا اور جواب دیا کہ "میں دن میں جتنے لوگوں سے ملتا ہوں ان کے نام گھر کا پتہ، بال بچوں کی کیفیت، علالت و تندرستی کے متعلق معلومات غرض کہ ایک ایک چیز تفصیل وار نوٹ کر لیتا ہوں۔ اب اگر میرے کسی گاہک کا لڑکا بیمار ہے اور میری اس سے پندرہ دن بعد ملاقات ہوئی تو میں پہلے اس کے لڑکے کی خیریت دریافت کرتا ہوں، یہ چیز یقیناً کاروباری سطح سے بلند ہے اور اس شخص کے دل میں میری وقعت بڑھ جاتی ہے، اور وہ یہ سوچ کر خوش ہو جاتا ہے کہ باوجود چند ملاقاتوں کے اس شخص کو میرا کتنا خیال ہے اسے میرا ہی خیال نہیں بلکہ میرے گھریلو معاملات میں بھی اسے دلچسپی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسری تیسری ملاقات پر بلا مزید دباؤ کے وہ حصے خریدنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح میں لوگوں کی دلچسپیوں، اور دیگر مصروفیات کے متعلق معلومات فراہم کر لیتا ہوں اور ان سے ملنے پر نوٹ بک کی مدد سے یا حافظہ ہی سے کام لے کر انھیں چیزوں کے متعلق گفتگو کرتا ہے۔ ظاہر ہے اس طرح ان کی دکھتی رگ پکڑی جاتی ہے اور مجھ سے بیمہ کمپنی کے ایجنٹ کی حیثیت سے نہیں بلکہ انسان یا دوست کی طرح سے ملنے لگتے ہیں اور دوستی کے بعد ایک معمولی سی چیز یعنی کاروباری بات چیت کوئی اہمیت نہیں رکھتی اور میرا کام بن جاتا ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ خوش اخلاقی سے انسان دشمن کو بھی دوست بنا لیتا ہے اور تجارت جیسے خشک پیشے میں تو اسی کی مدد سے شیرینی پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس اہم گیر اصول کی حقیقت کو پرکھنا ہو تو کسی بھی شہر میں جن دوکانداروں کا کام اچھا چل رہا ہو مل کر دیکھ لیجئے۔ ننانوے فی صدی اصحاب ایسے ملیں گے جو انتہائی با اخلاق ہیں برخلاف اس کے بد اخلاق انسان ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں فرض کیجئے کسی مجبوری کی وجہ سے کوئی شخص ان کے یہاں سے وہ چیز خرید تا بھی ہے جو اوروں کے یہاں نہیں ملتی تو پھر بھی خریدار کے دل میں اس کی طرف سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ خدا سے چاہتا ہے کہ کاش دوسروں کے یہاں وہ چیز ملنے لگے۔ تو وہ اس کی دکان پر تھوکے بھی نہیں۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ہندو دوکاندار اس مسئلے میں مسلمانوں سے کہیں بلند ہیں۔ ان کے اخلاق کی وسعت خواہ وہ ظاہری ہی کیوں نہ ہو بلند ترین تجارتی معیار پر پوری اُترتی ہے۔ برخلاف اس کے بالعموم مسلمان دوکاندار انتہائی کم خلق اور بدتمیز ہوتے ہیں۔ اس کو اس کی بھی تمیز نہیں ہوتی کہ گاہک سے کس طرح بات کرنی چاہئے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اوروں سے تجارت میں پیچھے رہتا ہے۔ کاش کہ ان بدخلقوں کو اب بھی ہوش آ جائے۔

تجارتی معاملات میں نفسیات کا بہت کافی دخل ہے اور میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ وہ تجارت ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتی جس کی پشت پر نفسیاتی اصول کام نہ کر رہے ہوں۔ مقالے کے طوالت کی خوف سے ہم مشتے نمونہ از خروارے کے قول پر عامل ہو کر اس بحث کو ختم کرتے ہیں +

رام پور
ٹمبر اینڈ ٹرنری کمپنی لمیٹڈ

ہماری بنائی ہوئی بابنوں (BOBBINS) کے بل پر
کپڑے کے کارخانے چل رہے ہیں
جوہر دار لکڑی کا نفیس فرنیچر
کھڑکیاں، دروازے وغیرہ
ہر چیز ایسی فٹ جیسے سانچے میں ڈھلی ہو
ستھرا اور باریک کام
نوک پلک سے درست

دی مغل لائن لمیٹڈ

سب سے پرانی ہندوستانی جہازراں کمپنی

بحر احمر اور ماریشس

کی بندرگاہوں کو مسافروں اور مال لے جانے والے جہازوں کا بیڑہ

بمبئی سے

عدن، جدہ، پورٹ سوڈان اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمد و رفت باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور اُمید ہے کہ ضرورت پڑنے پر ہم دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز روانہ کر سکیں گے

مزید معلومات کے لیے

حسب ذیل پتہ پر لکھیے

ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی - ۱۶ بنک اسٹریٹ بمبئی

جوالا فیبرکس لمیٹڈ

آرام دہ، ملائم، نفیس

ہوزری

کی کان ہے

بنیان　　　موزے

بش شرٹ　　اسپورٹس شرٹ

وغیرہ

سیاں اور مصری روئی سے
ریشم نما تاروں سے بنے ہوئے
پائدار
اور
کفایت
کے سانچے میں ڈھلے ہوئے

آپ کی فرمائش

مشرقی طرز کے زرق برق نفیس اور نایاب کپڑوں کے لیے

مفت لال، گگل بھائی اینڈ کمپنی کو یاد رکھیے

مینجنگ ایجنٹ

اسٹینڈرڈ ملز کمپنی لمیٹڈ
انڈین بلیچنگ ڈائنگ اینڈ پرنٹنگ ورکس لمیٹڈ
نیو جاسنا ملز لمیٹڈ
سورت کاٹن اسپننگ اینڈ مینوفیکچرنگ کمپنی لمیٹڈ
شرک اسپننگ اینڈ مینوفیکچرنگ کمپنی لمیٹڈ
نیو شرک اسپننگ اینڈ مینوفیکچرنگ کمپنی لمیٹڈ

کیا کیا مال تیار ہوتا ہے؟

کورا سوت اور رنگین سوت کٹ پیس دھلے ہوئے، کوری اور دھلی ہوئی چادریں کورا اور دھلا ہوا رنگا ہوا چھپا ہوا، لٹھا لانگ کلاتھ، کوری دھلی ہوئی دھوتیاں کورا دھلا ہوا کرتے قمیص کا کپڑا، دھاری دار کرتے قمیص کا کپڑا کوری دھلی ہوئی ساڑھیاں، کورا دھلا ہوا زین، دھلا ہوا ٹوئل منڈھے ہوئے میز پوش، چار خانہ، دھاری دار کپڑا، چھپا ہوا وائل وغیرہ وغیرہ

ملنے کا پتہ:- مفت لال، گگل بھائی اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۲۹- چرچ گیٹ اسٹریٹ بمبئی

ہفتہ وار **نئی روشنی** دہلی

اعزازی مدیر: ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب، صالحہ عابد حسین صاحبہ
عبداللطیف اعظمی

تاریخ اشاعت: یکم ۸، ۱۶، ۲۲، ۲۲   چندہ سالانہ ۶ر ۔ ششماہی ۳ر

دفتر: "نئی روشنی" جامعہ نگر دہلی

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی بی اے جامعہ   مطبوعہ: ... پریس دہلی

NAI RASHNI

DELHI

جلد ۳ | نمبر ۲۴ | ۲۴ر دسمبر ۱۹۶۹ء | ایڈیٹر:- ڈاکٹر سید عابد حسین

چالیس کے بعد ورزش کیا معنی؟

جب آدمی چالیس سال کی عمر کو پہنچ جائے تو جسم کو ایک پر لطف سکون کا احساس ہونا چاہیے۔ لیکن لاکھوں اعصابی مزاج کے امریکی کسی طرح اس پر تیار نہیں ہوتے کہ قدرت کو اپنا کام کرنے دیں۔ بدقسمتی سے ان کا ایمان ہے کہ ورزش تو انھیں کرنی ہی چاہئے۔ حالانکہ بہ حیثیت طبیب کے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس عمر میں ورزش غیر ضروری بلکہ مضر ہے ....

امریکہ میں بہت سے لوگوں کو ورزش کا شوق خبط کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ وہ مضحکہ خیز طریقے سے اپنے ہاتھوں اور پیروں کو توڑ مروڑ کر دائرے اور زاویے بناتے ہیں۔ وہ اتوار کو ہفتہ بھر کا گولف اکٹھا کھیل ڈالتے ہیں۔ شام تک ان کا دم نکل جاتا ہے اور اگر بستر پر اس طرح گرتے ہیں کہ منہ سے بات نکلنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ بعض تو یہ حرکتیں اس لئے کرتے ہیں کہ انھیں اچھی لگتی ہیں اور بعض اس لئے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس سے انھیں سکون ملے گا اور اس سے ان کی فکریں اور پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔

۱۹۵۵ء میں امریکہ میں صحت جسمانی تربیت اور تفریح کے ایسوسی ایشن نے ایک کمیٹی مقرر کی تھی، جس نے امریکی طبی ایسوسی ایشن کی مدد سے ورزش کے بارے میں اپنی رپورٹ مرتب کی ہے۔ اس رپورٹ میں ایک جگہ کہا گیا ہے کہ چالیس سال سے زیادہ عمر والوں کے طبی معائنے سے یہ ظاہر ہوا کہ ان میں سے بہت سے لوگ جتنی ورزش کرتے ہیں اس سے بہت کم کرنی چاہئے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کو ورزش کرنی ہی ہے تو کم سے کم اس کا یقین کر لیجئے کہ آپ کی صحت اسے برداشت کر سکتی ہے اور یاد رکھئے کہ محض تندرستی کا احساس اس کا ثبوت نہیں ہے کہ آپ تندرست ہیں۔ ہر سال مکمل طبی معائنہ کرانا ضروری ہے۔

چالیس سال کی عمر کے بعد ورزش کو منہ کا نوالہ نہ سمجھنا چاہئے۔ بہت سے لوگ اس دھوکے میں رہتے ہیں کہ وہ چست اور تندرست ہیں اور اس چستی اور تندرستی کو قائم رکھنے کے لئے ورزش کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ اکثر المناک ہوتا ہے۔

اگر آپ ورزش کا ارادہ کریں تو اپنے قلب کا خیال رکھئے۔ اُسے زیادہ سے زیادہ آرام اور سکون کی ضرورت ہے۔ بڑا محنتی فرد ہے مگر ان تھک نہیں ہے۔ آپ پوچھیں گے کیا یہ صحیح نہیں کہ ایک صحت مند قلب سخت ورزش کو برداشت کر سکتا ہے؟ .... بے شک کر سکتا ہے۔ اس پر سب ڈاکٹر متفق ہیں مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ چالیس سال کی عمر والے صحت مند قلب پر اگر بیس سال کی عمر کے نوجوان کا بوجھ ڈال دیا جائے تو شاید وہ صحت مند نہ رہے۔

اگر آپ نے پہلے کبھی ورزش نہیں کی ہے تو ادھیڑ عمر میں اس کمی کو پورا کرنے کی امید نہ رکھئے۔ چالیس سال کی عمر کا آدمی اگر اپنے اعصاب کو سکون دینے کے لئے یا اپنے آپ کو رستم وقت ثابت کرنے کے لئے ورزش شروع کرے تو وہ رستم نہیں شیخ چلی کہلائے گا۔

آپ کو گولف کھیلنے میں لطف آتا ہو تو ضرور کھیلئے مگر سہولت اور اطمینان سے لیکن اگر اس خوف سے کہ گھر پر کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا اور بیوی ڈانٹ بتلائے گی آپ سر پٹ بھاگیں اور ہانپتے کانپتے گھر پہنچیں تو کھیلتے وقت بھی اور کھانا کھاتے وقت بھی آپ اپنے قلب پر بوجھ ڈال رہے ہیں۔

کھیلنے کا طریقہ یہ ہے کہ آہستہ آہستہ مزے لے لے کر کھیلئے۔ مزے سے نہائیے اور سیر گشت کرتے ہوئے گھر پہنچ کر گرم گرم کھانا کھائیے۔

ادھیڑ عمر والے کو اپنی قوت احتیاط سے خرچ کرنی چاہئے۔ اس لئے کہ اس میں اب وہ نوجوانی کا لوچ نہیں رہا ہے۔ ۶۰ برس کی عمر کے آدمی میں ۲۰ سال کے لڑکے کے مقابلے میں کام کرنے کی قوت آدھی رہ جاتی ہے۔

میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ادھیڑ عمر کے آدمی بالکل ہاتھ پاؤں نہ ہلائیں۔ اگر صحت ٹھیک ہو تو معتدل ورزش میں کوئی مضائقہ نہیں۔ تھوڑا سا گولف کھیل لیجئے، ذرا دیر تیر لیجئے، اپنے ہم عمروں کے ساتھ ایک دو سیٹ ٹینس کے کھیل لیجئے، گھنٹہ بھر باغبانی یا چہل قدمی کر لیجئے۔ غرض اس قسم کی ہلکی ورزشیں جائز ہیں مگر اس سے زیادہ .... الفقط۔

اب آپ کو تندرست اور چست رہنے کے لئے سب سے اچھی ورزش بتاؤں جب آپ کھانے کی میز پر بیٹھیں اور کوئی بھوک سے زیادہ کھانے پر اصرار کرے تو آپ اپنے سر کو ایک بار بائیں طرف سے داہنی طرف کو جنبش دیجئے اور پھر بائیں طرف سے داہنی طرف کو۔

یہی اچھی صحت کا نسخہ ہے اور یہی لمبی عمر کا۔ زندگی گھڑ دوڑ نہیں ہے۔ اس دوڑ میں وہی جیتے گا جو سست ہے اور دبلا پتلا۔ (بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

فہرست مضامین

قیمت فی پرچہ ۲۰ پیسے

فاؤسٹ اور اقبال

(۲)

یحییٰ امجد

نظریۂ علم

گوئٹے پہلے عقل کی تضحیک کرتا ہے اور اس کی کم مائگی اور بے بضاعتی پر توجہ دلاتا ہے۔ عقل زندگی کے راز ہائے سربستہ کو افشا نہیں کر سکتی اس لئے وہ عقل کے مقابلے میں دل کو سراہتا ہے۔ فاؤسٹ کی زبانی جو اگنر کو جب وہ علم کی تعریف میں رطب اللسان ہے وہ یہ کہہ کر جھڑک دیتا ہے: "کیا کتاب وہ مقدس سرچشمہ ہے جس کے دھاروں سے تمہاری پیاس ہمیشہ کے لئے بجھ جائے گی نہیں! اچھی تسکین اور تقویت اگر حاصل ہو سکتی ہے تو دل سے" اس پر یہ حقیقت بھی آشکارا ہے کہ "کائنات کے اندرونی نظام سے واقف ہونے، مبدأ حیات اور قوت تخلیق کا معاہدہ کرنے کے لئے کچھ ادھر کا بھی اشارہ ہونا لازمی ہے۔ بغیر اس کے نظام فطرت دن کی روشنی میں بھی ایک راز سربستہ رہتا ہے۔ فاؤسٹ جب سائنس کے آلات سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

"اے سائنس کے آلات تم بھی میرا منہ چڑاتے ہو، تمہاری پھرکیاں اور دندانے تمہارے پرزے اور کمانیاں مجھ پر ہنستی ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ میں حقیقت کے دروازے پر کھڑا ہوں اور تم اس کی کنجی ہو، تمہاری ساخت تو بڑی پیچ دار ہے، مگر قفل کا کھٹکا ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ نظام فطرت دن کی روشنی میں بھی ایک راز سربستہ ہے اور جو حقیقت تیرے ذہن پر خود بخود منکشف نہ ہو اس پر بیرم اور پیچ کا زور نہیں چلتا ...... کیا اچھا ہوتا کہ میں اپنی چھوٹی سی زندگی ان چھوٹی چیزوں کے درمیان عرق ریزی میں نہ کھوتا تو وہ اسی حقیقت کا اعادہ کرتا ہے۔

گوئٹے کے نزدیک طلب و حقیقت کی جو آگ روح انسانی میں بھڑکتی ہے وہ علم کے چھینٹوں سے نہیں بجھتی، کتابی علم کی طرف سے جو بے اعتمادی اس کے دل میں پائی جاتی ہے اس کا اظہار فاؤسٹ کے ان اشعار سے اچھی طرح ہوتا ہے۔

"افسوس اے فاؤسٹ! تو نے فلسفہ، قانون
اور طب کی خاک چھانی اور ستم تو یہ ہے
کہ دینیات میں بھی سر کھپایا مگر کم بخت،
سادہ لوح! تو جہاں تھا وہیں ہے ایک قدم
بھی آگے نہیں بڑھا؛ تو فاضل کہلاتا ہے
بلکہ علامہ اور دس سال سے اپنے شاگردوں
کو انگلیوں پر نچاتا ہے حالانکہ تو جانتا ہے
کہ علم انسان کی پہنچ سے باہر ہے ہائے یہ
خیال مجھے سوہان روح ہو گیا ہے"

لیکن یہ سمجھنا غلطی ہوگی کہ گوئٹے عقل کا دشمن ہے۔ عقل کو بھی زندگی کا خادم شمار کرتا ہے اور ایک بہترین عطیہ الٰہی۔ گوئٹے اس کا احساس ہے کہ "عشق کے جنون تخلیق و عمل پر اگر عقل کی روک نہ رہے تو تمام انسانی معاملے درہم برہم ہو جائیں۔ یونان قدیم کی مشہور حسینہ ہیلن (جو کلاسکی حسن کی مظہر ہے) اور فاؤسٹ (جو رومانی جرمن روح کی مثال ہے)، کے وصال کے پردے میں" یہی بات کہنا چاہتا ہے۔

اقبال جو خود عقل و دانش کا مزاج داں ہے اور اس کی رگ رگ سے باخبر ہے، عقل کے لئے کچھ اسی طرح کا خیال رکھتا ہے۔

انجام خرد ہے بے حضوری
ہے فلسفۂ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت
ہیں ذوق عمل کے واسطے موت

اقبال کے نزدیک عقل کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس میں جرأت رندانہ کی کمی ہے، عقل اسباب و علل کی بھول بھلیوں میں الجھ کر حقیقت کو بھلا دیتی ہے

عقل در پیچاک اسباب و علل
عشق چوگاں باز میدان عمل
عقل را سرمایہ از بیم و شک است
عشق را عزم و یقیں لاینفک است

تمدن کا انحصار اس کی تخلیقی قوت پر ہوتا ہے اور اقبال کے نزدیک ایک ایسا تمدن جو خالص عقلیت پر مبنی بہت جلد غیر تخلیقی ہو جائے گا۔

بایں ہمہ اسے عقل کی اہمیت کا اقرار ہے "اسے احساس ہے کہ زندگی میں جو توازن اور ہم ربطی پائی جاتی ہے وہ عقل ہی کی بدولت ہے۔ اگر عشق کے جنون تخلیق و عمل پر عقل کی روک نہ رہے تو سارا نظام زندگی درہم برہم ہو جائے" انسانی عمل کو سعادت کی راہ پر لگانے کے لئے عقل و عشق کا امتزاج ایک بدیہی امر ہے۔

غربیاں را زیرکی ساز حیات
شرقیاں را عشق راز کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس
کار عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چوں با زیرکی ہمسر شود
نقش بند عالم دیگر شود

اور اس طرح عقل جو خدمت انجام دیتی ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔

تصور شیطان

شیطان گوئٹے کے نزدیک عشرت حیات اور عمل کی روح کا ایک جزو ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ انسان کے دل میں زندگی کی محبت اور عمل کا ولولہ پیدا کرے مگر اپنی خلقت کی خاص کوتاہی کے باعث وہ دونوں پہلوؤں میں حد سے گذر گیا ہے، عشرت حیات کے سرچشمے سے اُسے بے قید جسمانی لذتوں کا پرستار اور قوت عمل نے اُسے تحصیل ایزدی کا [illegible] بایں ہمہ گوئٹے کے نزدیک انسان کے [illegible] شیطان کا ہونا ضروری ہے اور وہ صدائے غیبی کے ذریعے "جب تک انسان راہ طلب میں ہے اس کا بھٹکنا لازمی ہے۔ انسان کا ہمت عمل جلد سرد ہو جاتا ہے؛ اور اُسے آرام کی ضرورت رہتی ہے۔ اس لئے ہم اسے تیرا سا مصاحب دیتے ہیں جو اُسے بہلائے اُبھارے اور شیطانی قوت تخلیق دے؟ فاؤسٹ میں اسی حقیقت کا انکشاف کرتا ہے۔

اسے احساس ہے کہ زندگی کی یہ تمام ہنگامہ آرائی شیطان ہی کی بدولت ہے، شیطان اور فاؤسٹ کے مکالمے میں شیطان کا یہ دعویٰ

"اے زمین کے بے کس فرزند میرے بغیر
تیری زندگی کا کیا حال ہوتا؟ میں نے تجھے برسوں
تخیل کے خرافات سے محفوظ رکھا، میں نہ ہوتا
تو کرۂ ارض سے تو کب کا کھسک گیا ہوتا۔

اسی نظریے کی تائید کرتا ہے

شیطان کی عظمت کا راز یہ ہے کہ وہ اپنے مقابلے کے لئے بھی خدا سے ایک حریف پختہ تر مانگتا ہے لیکن جب ایک بندۂ صاحب نظر مل جاتا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں۔ فاؤسٹ کو بہکانے کی اجازت ملنے پر اس کے یہ الفاظ "میں تیرا شکر گذار ہوں، مردوں سے بیوپار کرنے کا مجھے خود شوق نہیں مجھے تو جیتا جاگتا انسان چاہئے، لاشوں سے ہمیشہ کوسوں دور رہتا ہے۔ مرے ہوئے چوہوں سے بلی کو کیا کام" اس کی اولوالعزمی کا ثبوت دیتے ہیں۔

اقبال بھی شیطان کو بدی کی قوت نہیں بلکہ خودی اور تخلیق کی عظیم الشان قوت سمجھتے ہیں جو محبت اور اطاعت کی راہ مستقیم سے بھٹک گئی ہے، ابلیس کی نافرمانی میں اقبال کو اس دنیا کی رونق، خیر و شر کی تمام کش مکش اور محفل ہستی کی تمام ہنگامہ آرائی نظر آتی ہے۔ "تسخیر فطرت" میں ذات باری سے شیطان کا خطاب اس حقیقت کی اچھی طرح عکاسی کرتا ہے۔

نوری نادانیم سجدہ بہ آدم برم
او بہ نہاد است خاک من بہ نژاد آذرم
می تپد از سوز من خون رگ کائنات
من بہ دو صرصرم من بہ غو تندرم
پیکر انجم ز تو گردش انجم ز من
جاں بجہاں اندرم زندگی مضمرم
تو بہ بدن جاں دہی شور بجاں من دہم
تو بہ سکون رہزنی من بہ تپش رہبرم

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

ہفتہ وار
نئی روشنی
دہلی
۲۲ر دسمبر ۱۹۴۹ء

مسلمان ملکوں کی معاشی کانفرنس

جب سے پاکستان بنا ہے، اس کے ارباب اختیار اس فکر میں تھے کہ ان عرب اور غیر عرب ملکوں کو جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے ایک رشتۂ اتحاد میں مربوط کریں۔ اس اتحاد کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں: تہذیبی، سیاسی اور معاشی۔ تینوں ہی صورتوں پر غور کیا گیا، مگر قابل عمل صرف تیسری صورت معلوم ہوئی۔

جہاں تک تہذیبی اتحاد کا تعلق ہے ایک حد تک وہ پہلے سے موجود ہے۔ سب کا مذہبی عقیدہ کم و بیش ایک ہے لیکن اس سے آگے اتحاد کی راہ میں ایسی رکاوٹیں ہیں جن کو دور کرنا بہت مشکل ہے۔ ان میں سے اکثر ملک صدیوں سے جداگانہ قومیت کا بہت قوی اور گہرا احساس رکھتے ہیں۔ عرب ملکوں کو چھوڑ کر اور سب کی زبان، طرز معاشرت، ذوق جمال الگ الگ ہے۔ ایک بہت بڑا فرق ان میں یہ ہے کہ جدید مغربی تمدن کے ساتھ ان کا رویہ بہت مختلف ہے۔ کوئی اسے آنکھ بند کر کے ایک دم سے قبول کرنے کو تیار ہے کوئی جیس بیس میں ہے کہ قبول کرے یا نہ کرے اور کوئی اسے وبائی مرض سمجھ کر اس سے دور رہنا چاہتا ہے۔ جب تک یہ اختلاف موجود ہے مسلمان ملکوں میں اتنا تہذیبی اتحاد بھی نہیں ہو سکتا جتنا یورپ اور امریکہ کے ملک آپس میں رکھتے ہیں۔

سیاسی اتحاد اور بھی زیادہ مشکل بلکہ سر دست ناممکن نظر آتا ہے۔ چھوٹے ملک بڑے ملکوں سے سیاسی اتحاد کا رشتہ قائم کرتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کہیں ان کے اندر ضم ہو کر نہ رہ جائیں۔ اس کے علاوہ بہت سے ملکوں میں سرحدی علاقوں کے بارے میں رقابتیں ہیں جیسے پاکستان اور افغانستان میں، ایران اور ترکی میں، شرق اردن اور مصر میں، سعودی عرب اور یمن میں پھر امریکہ اور انگلستان کا مسلمان ملکوں پر کھلا ہوا اور چھپا ہوا اثر اتنا ہے کہ وہ اس اتحاد کو روک سکتے ہیں اور روکیں گے۔ پاکستان کی حکومت نے ان مشکلات کو محسوس کر کے سیاسی اتحاد کا خیال چھوڑ دیا۔ مگر چودھری خلیق الزماں جن کی سیاسی نظر اتنی کمزور ہے کہ کھلی ہوئی حقیقتوں کو بھی نہیں دیکھ سکتے، "اسلامستان" کا پیام لے کر عراق سے انگلستان تک سب اسلامی ملکوں میں ہو آئے۔ وہ مسلمانوں کے جذبات کو بھڑکانے کے لئے ایک طرف سے ہندوستان اور دوسری طرف سے روس کے خطرے کا ہوا دکھاتے پھرے، مگر چند سر پھرے غیر ذمہ دار لوگوں کے سوا کسی نے ان کی تحریک اسلامستان کی تائید نہیں کی۔ ان کی ناکام کوشش سے صرف ایک فائدہ ہوا۔ اس خیال کی مزید تصدیق ہو گئی کہ مسلمان ملکوں کا سیاسی اتحاد ناقابل عمل ہے۔

صرف تیسری صورت یعنی معاشی اتحاد کی تجویز ایسی تھی جس میں حکومت پاکستان کو امید کی جھلک نظر آتی تھی۔ اکثر مسلمان ملک خالص زراعتی ہیں۔ بعض میں معدنی دولت بھی ہے۔ لیکن صنعت برائے نام ہے اور ابھی ایک مدت اس کی ترقی کا امکان بھی نہیں ہے۔ پاکستان میں تھوڑی بہت صنعت موجود ہے اور اسے ترقی دینے کے کچھ وسائل بھی ہیں۔ اس لئے مسلمان ملک جب اور ملکوں کے مقابلے میں ایک دوسرے سے قریب ہیں اگر معاشی میدان میں مل کر کام کریں تو ان میں سب کا فائدہ ہے۔ اس کے علاوہ امریکہ کی یہ پالیسی ہے کہ ایشیائی ملکوں کی معاشی حالت کو درست کرنے کے لئے مارشل ایڈ کے پیمانے پر تو نہیں مگر ایک چھوٹے سے پیمانے پر مدد دے تاکہ وہ سیاسی اور معاشی حیثیت سے اس کے دائرۂ اثر میں آ جائیں۔ اس کے لئے وہ یہ ضروری سمجھتا ہے کہ مغربی یورپ کی طرح یہاں بھی معاشی گروپ بن جائیں اور ان میں باہمی تعاون ہو۔ جنوب مشرقی ایشیائی گروپ سے ابھی وہ زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کر رہا ہے اس لئے کہ وہ بغیر ہندوستان کی شرکت کے نہیں بن سکتا اور ہندوستان ذرا سرکش معلوم ہوتا ہے۔ مشرق وسطی اور متصل ملکوں کا "اسلامی گروپ" بنانا زیادہ سہل اور کار آمد نظر آتا ہے۔ اس سازگار حالات کو مد نظر رکھ کر پاکستان نے "اسلامی ملکوں کی سیاسی کانفرنس" منعقد کی، جس کی کارروائی آپ اخباروں میں پڑھ چکے ہیں۔

کانفرنس اس لحاظ سے بہت کامیاب رہی کہ اس میں افغانستان سے لے کر ٹیونس اور الجیریا تک سب مسلمان ملکوں کے نمائندے شریک ہوئے اور انھوں نے ان سب ملکوں کے معاشی مسائل اور ان کے حل کرنے کی تدبیروں پر غور کیا، ان کا ٹھوس نتیجہ یہ نکلا کہ معاشی تعاون کے لئے ایک مستقل ادارہ بن گیا جس کے صدر پاکستان کے وزیر مالیات غلام محمد منتخب ہوئے لیکن معاشی تعاون اور معاشی اتحاد میں فرق ہے۔ معاشی اتحاد کے لئے کم سے کم شرط یہ ہے کہ باہمی تجارت کی راہ میں درآمد برآمد کے لیسنس اور محصول وغیرہ کی جتنی پابندیاں ہیں وہ اٹھا دی جائیں۔ یہ مسئلہ چھیڑا تھا مگر اس پر غور کرنا اس وقت مناسب نہیں سمجھا گیا۔

بہر حال معاشی تعاون کی جو تجویزیں اس کانفرنس میں منظور ہوئی ہیں ان سے آگے چل کر جب پاکستان کی صنعت فروغ پانے لگے گی خود اس کو اور دوسرے مسلمان ملکوں کو بہت فائدہ ہوگا۔ اس وقت بھی دو فائدوں کی امید ہے۔ ایک یہ کہ آپس میں تجارت کچھ بڑھ جائے گی۔ دوسرے یہ کہ امریکہ سے مدد ملنے میں آسانی ہو گی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ کانفرنس کے ختم ہونے میں امریکہ سے مسٹر میک گی پاکستان پہنچے اور انھوں نے پاکستان کے ساتھ امریکہ کے دوستانہ جذبات کا اظہار کیا اور اسی کے ساتھ لیاقت علی خاں صاحب کو امریکہ جانے کی دعوت دی۔

یکم جنوری ۱۹۵۰ء سے "نئی روشنی" کی طباعت اور اشاعت کا انتظام مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ کوشش بھی کی جائے گی کہ اخبار کو صورت کے لحاظ سے زیادہ خوشنما اور دلکش اور مضامین کے لحاظ سے زیادہ دلچسپ اور مفید بنایا جائے۔ نئے سال سے کئی چیزیں نئی شروع ہوں گی

۱۔ "نئی روشنی" کے مدیر کا ایک ناول "آزادی کی زنجیریں" جس میں موجودہ زمانے کے ایک نوجوان کی نفسیاتی کش مکش کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ بہ اقساط شائع ہوگا۔

۲۔ عرب اور غیر عرب مسلم ممالک کی سیاست اور عام حالت پر مستند مضامین جن کے لکھوانے کا خاص انتظام کیا گیا ہے ہر دوسرے تیسرے ہفتے چھپتے رہیں گے

۳۔ دو ہفتے میں ایک بار اور ضرورت ہوئی تو ہر ہفتے "نئی روشنی" کے پڑھنے والوں کے مختصر مراسلات مسائل حاضرہ اور علمی ادبی مسائل کے بارے میں شائع کئے جائیں گے

۴۔ صرف وہی خطوط چھاپے جائیں گے جنھیں ادارہ منتخب کرے۔ لمبے خطوں کو مختصر کر کے دیا جائے گا۔ عبارت میں حسب ضرورت جزوی اصلاح بھی کی جائے گی۔

۵۔ پڑھنے والے مختلف مسائل کے بارے میں جو سوالات کریں گے ان کے جواب ادارے کی طرف سے یا اگر زیادہ پیچیدہ ہوئے تو ان مسائل کے ماہرین کی طرف سے شائع کئے جائیں گے۔ یہاں بھی انتخاب سے کام لیا جائے گا۔ صرف ان سوالات کے جواب دئے جائیں گے جو عام دلچسپی کے ہوں۔

"نئی روشنی" کی مالی حالت ابھی تک قابل اطمینان نہیں ہے لیکن قدر دانوں کی ہمت افزائی نے ہماری ہمت بڑھا دی ہے اور ہم نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ جہاں تک ہم سے ہو سکے گا ہم اسے جاری رکھیں گے۔ پھر بھی جب تک کوئی اخبار اپنا خرچ خود نہ نکالے چند دوستوں کی امداد سے نہیں چل سکتا اور نہ اسے چلنا چاہئے۔ ضرورت اس کی ہے کہ پڑھنے والوں میں سے جو حضرات یہ محسوس

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

دُنیا کی رفتار

ہندوستان

کشمیر کا قضیہ

کشمیر کمیشن کی رپورٹ خدا خدا کرکے شائع ہوئی اور سیکورٹی کونسل کو اس پر غور کرنے کا موقع ملا۔ مختصر رپورٹ کا خلاصہ یہ ہے کہ کمیشن جنگ کے روکنے میں تو کامیاب رہا، لیکن ہند اور پاکستان میں سمجھوتہ کرانے میں اُسے کامیابی نہ ہوئی اور نہ ہونے کی اُمید ہے۔ اس لئے مناسب ہوگا کہ کمیشن کو توڑ دیا جائے اور دونوں ملکوں کے درمیان مصالحت کا کام کسی ایک شخص کے سپرد کیا جائے۔ رپورٹ کے ساتھ دو اختلافی نوٹ تھے ایک بلجیم کے نمائندے کا جس نے لکھا ہے کہ کشمیر کی طرف سے ہند کی آئین ساز اسمبلی میں چار نمائندوں کا نامزد کیا جانا قانوناً درست تھا لیکن سیاسی حیثیت سے نامناسب تھا دوسرا چیکوسلواکیہ کے نمائندے کا جس نے کمیشن کی ناکامی کے دو سبب بتائے۔ (۱) اس نے دونوں فریقوں کو راضی رکھنے کے خیال سے دو اہم سوالات یعنی آزاد کشمیر کی فوج، اور شمالی سرحدی علاقے کے بارے میں خاص کرکے ایسی گول گول باتیں کیں جن کا مطلب حکومت ہند نے کچھ سمجھا اور حکومت پاکستان نے کچھ اور (۲) اس نے گول میز کانفرنس کو جس پر دونوں ملک راضی ہوگئے تھے بے وجہ ملتوی کرا دیا اور مسٹر اٹیلی اور اس کے بعض ممبروں نے پریسیڈنٹ کو چپکے سے اشارہ کر دیا کہ وہ اس معاملے میں مداخلت کرکے ثالث مقرر کرنے کی رائے دیں اور پھر یہی تجویز اپنی طرف سے بھی پیش کر دیں حالانکہ سیکورٹی کونسل نے جو ہدایتیں دی تھیں ان کی رو سے اس قسم کی تجویز پیش کرنے کا حق تھا اور نہ مسٹر اٹیلی اور پریسیڈنٹ شروع ہی کو۔ یہ نوٹ سے کمیشن کے باہمی اختلافات اور اس کے طریق کار پر روشنی پڑتی ہے اور یہ بھی طرح ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت ہند ثالثی کی تجویز کو رد کر دینے میں بالکل حق بجانب تھی۔

سیکورٹی کونسل کا یہ اقدام قابلِ تعریف ہے کہ اس نے رپورٹ کے بارے میں تند و تیز اور بے نتیجہ بحثوں کے چھڑنے سے پہلے اپنے پریسیڈنٹ سے درخواست کی ہے کہ وہ ہند اور پاکستان کے نمائندوں سے گفتگو کرکے اس کی کوشش کریں کہ وہ سیکورٹی کونسل کی طرف سے کسی ایسے شخص کے تقرر کو خوشی سے منظور کرلیں جو ان میں مصالحت کرا دے۔ اصل بات یہ ہے کہ کشمیر کے قضیے کو تو زمانے اور واقعات کی منطق نے قریب قریب طے کر دیا ہے۔ اب ضرورت اس کی ہے کہ کوئی مصلحت بیں اور موقع شناس آدمی جس پر فریقین کو اعتماد ہو بیچ میں پڑکر یہ سمجھائے کہ حقیقت کو تسلیم کرلینا کمزوری نہیں بلکہ بڑی مضبوطی اور دانش مندی کی بات ہے۔

ہندو کوڈ بل

ہندوستانی پارلیمنٹ کے موجودہ اجلاس میں سب سے بڑا اور معرکے کا مسئلہ ہندو کوڈ بل کا ہے جیسا کہ ہم پہلے ایک بار کہہ چکے ہیں یہ بل پچھلے چند سال میں کئی بار اسمبلی کے سامنے آچکا ہے۔ اس بل کے مخالف اسمبلی کے اندر اور باہر تعداد میں کم ہیں مگر ان کی مخالفت اس قدر شدید ہے کہ اب تک حکومت اس کو نظر انداز کرکے بل کو قانون بنا دینے میں پس و پیش کرتی رہی اور معاملہ برابر ٹلتا رہا مگر اس بار وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے مضبوطی کے ساتھ اعلان کر دیا ہے کہ حکومت بل کو ملتوی نہیں ہونے دے گی۔ اور اگر اسمبلی نے اسے منظور نہ کیا تو استعفا دے دے گی۔ مگر وہ مخالفوں کی رائے کا احترام کرتے ہوئے اس پر راضی ہوگئے ہیں کہ ایک کمیٹی جو دونوں فریقوں پر مشتمل ہو بل پر نئے سرے سے غور کرے اور اس کی کوشش کی جائے کہ جزوی ترمیموں کے بعد اسے اتفاق رائے سے پاس کیا جائے۔

مگر جیسا کہ وزیر اعظم نے اپنی ۱۹ دسمبر کی تقریر میں فرمایا اس وقت حکومت کو زیادہ اصرار اس پر ہے کہ ہندوؤں کا سماجی قانون ایک کوڈ کی شکل میں آجائے اور یہ اصول مان لیا جائے کہ آئین ساز مجلس اس میں حسب ضرورت ترمیم کر سکتی ہے۔

پاکستان

ناقابل تلافی نقصان

پچھلے ہفتے پاکستان میں دو ایسے حادثے ہوئے ہیں جن کا غم انگیز یاد ایک عرصے تک بھلائی نہ جاسکے گی۔ ایک تو کراچی سے کوئی ۵۰ میل کے فاصلے پر ہوائی جہاز کا نہایت اندوہناک حادثہ پیش آیا جس میں ۲۶ مسافروں میں سے ایک بھی نہ بچ سکا۔ ان میں پاکستان کے دو قابل اور ہونہار نوجوان جنرل اور پانچ عرب ملکوں —— ٹیونس الجیریا، مراقش، مصر اور دمشق —— کے نمائندے بھی تھے جن کے غم میں پورا عالم اسلام شریک ہے۔

دوسرا واقعہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کی اچانک وفات ہے آپ برصغیر ہند کے چوٹی کے عالموں میں سے اور پاکستان کے سب سے بڑے عالم تھے۔ آپ کی زندگی کا سب سے بڑا حصہ خالص مذہب کی خدمت میں گذرا۔ اگرچہ آپ جمعیتہ العلماء کے اہم عہدہ دار رہے تھے پھر بھی سیاست سے بڑی حد تک الگ رہے مگر جب مسلم لیگ کا بہت زیادہ زور بڑھا، تو آپ بھی اس میں شریک ہوگئے اور آپ نے جمعیتہ العلماء کے مقابلے میں جمعیتہ الاسلام کی بنیاد رکھی۔ آپ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے بھی ممبر تھے، اور لوگوں کا بیان ہے کہ آپ ہی کی کوششوں سے "بنیادی قرارداد" میں اسلام کا نام آیا ہے۔

غرض دونوں فوجی جنرلوں اور مولانا عثمانی کی وفات سے پاکستان کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ ہم اپنے پڑوسی کے اس غم میں پوری ہمدردی کے ساتھ شریک ہیں۔

پہلے روس یا امریکہ؟

جس زمانے میں ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت نہرو کو امریکہ کے پریسیڈنٹ مسٹر ٹرومین کا دعوت نامہ ملا تھا، اسی زمانے میں پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر لیاقت علی خاں کو روس کا دعوت نامہ ملا۔ اس وقت عام طور پر اس کو حریفانہ کارروائی سمجھا گیا تھا مگر معلوم نہیں کن اسباب کی بنا پر وزیر اعظم ابھی تک روس نہیں جاسکے ہیں اب انہیں امریکہ سے بھی دعوت نامہ ملا ہے جسے انہوں نے قبول فرما لیا ہے اور مئی میں جانے کا پروگرام بن گیا ہے۔ اس سے ہندوستانی اور پاکستانی کے اخبارات کو ایک دلچسپ موضوع بحث مل گیا ہے۔ لیاقت علی صاحب روس جائیں گے یا امریکہ؟ اس سلسلے میں بعض اخبارات نے قیاس آرائی کی ہے کہ وزیر اعظم پاکستان کے ابھی تک روس نہ جانے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سامنے چند مقاصد تھے جن کے بارے میں روس کی طرف سے کوئی امید افزا جواب نہیں ملا، توقع ہے کہ ان دونوں ملکوں میں سفارتی تعلقات قائم ہوجانے کے بعد اس سلسلے میں پھر گفتگو ہوگی۔ روس میں پاکستانی سفیر شعیب قریشی صاحب ماسکو پہنچ گئے ہیں۔ امید ہے کہ روسی سفیر بھی بہت جلد پاکستان آجائے گا۔

قیوم خاں کی مخالفت جاری ہے

صوبہ سرحد میں ریڈ شرٹ عامہ کو دیکھنے اور عبد القیوم خاں اور ان کی وزارت کی بڑھتی ہوئی مخالفت کو ختم کرنے میں ان کی حکومت اپنی تمام کوششوں کے باوجود بالکل ناکام رہی ہے۔ چند ضمنی انتخاب ہونے والے ہیں اس لئے رائے عامہ کو ہموار کرنے کے سلسلے میں لیاقت علی خاں ابھی حال میں صوبہ سرحد کا دس روزہ دورہ کرکے کراچی واپس آئے ہیں۔ حسب معمول اس دورے میں بھی انہوں نے عوام کی توجہ کو دوسری مسائل یعنی کشمیر کی طرف منعطف کرنے کی کوشش کی ہے مگر عوامی لیگ کے رہنما جس مستعدی اور استقلال سے کام کر رہے ہیں اس کے پیش نظر امید ہے کہ وزیر اعظم صاحب زیادہ عرصے تک عوام کی توجہ کو اصل مسائل سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔

ع۔ ل

بزمِ بے تکلف

"خیر تو ہے شیخ جی! آپ کچھ پریشان سے معلوم ہوتے ہیں۔ کیا نصیب دشمناں بکریوں کی طبیعت پھر کچھ ناساز ہو گئی؟"

"نہیں جی بکریاں تو خدا کے فضل سے سب اچھی ہیں۔ یہ بکری کی بیماری نہیں آدمی کا آزار ہے جس نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔"

"آدمی کی نہ کہیے۔ اس نے تو اللہ میاں کا بھی ناک میں دم کر دیا۔ ایسا ظلوم جہول تو آج تک پیدا ہی نہیں ہوا۔"

"کیا خوب! آپ بھی کیا سمجھے ہیں۔ بھلے آدمی آخر آدمی کے بشر کے سوا کچھ اور بھی تو معنی ہیں؟"

"اچھا سمجھ گیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ آپ بھی اہلِ پنجاب کی طرح آدمی کو مرد کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔"

"ارے مرد آدمی کچھ تو عقل سے کام لے۔ میں کوئی عورت ہوں جو مرد کے ظلم کی فریاد کرتا پھروں گا؟"

"یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔"

"اب تو مجھے یہ شبہ ہوتا ہے کہ تم حماقت سے نہیں شرارت سے کام لے رہے ہو۔ تمھیں نہیں معلوم کہ آدمی نوکر کو کہتے ہیں۔"

"ارے توبہ! آپ نوکر کا ذکر کر رہے تھے۔ مگر شیخ جی آپ کا نوکر تو دیکھنے میں آپ سے بھی زیادہ جنتی معلوم ہوتا ہے۔ اس نے آپ کا ناک میں دم کیسے کر لیا؟"

"تم کسے کو کہہ رہے ہو۔ وہ بچارا تو کئی مہینے ہوئے مر گیا۔"

"ع۔ افسوس کہ موت نے گھسیٹا۔ پھر اب مرحوم کی گدی کس نے سنبھالی ہے؟"

"اسی کا ایک بھتیجا ہے صفائی۔ مگر جتنا وہ مستعد اور بے عذر تھا اتنا ہی یہ نکما اور حجتی ہے۔ فرماتے ہیں [illegible] چراؤں گا یا تو گھر کا کام کرا لیجیے یا بکریاں چروا لیجیے۔ اب بتائیے میں کیا کروں۔ اس عمر میں خود بکریاں چراؤں؟"

"خیر عمر کی تو کوئی بات نہیں۔ آخر جیسے مرحوم بھی آپ کی طرح پچاس کے لگ بھگ تھے، اور بکریاں چراتے تھے۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کا اپنی ریش و فش بکریوں کی صحبت میں دیکھا جانا مناسب نہیں۔ لوگ نہ معلوم کیا سمجھیں۔"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ آزادی شریفوں کی کیا درگت بنائے گی۔ آدمیوں کو ایسے دن لگے ہیں جیسے وہ آقا ہوں اور ہم نوکر۔"

"شیخ جی آزادی بچاری سے آپ کیوں خفا ہیں، نوکر شاہی تو انگریزوں کے زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ مگر ایک بات تو بتائیں، انصاف سے کہیے گا۔ آپ کسی آدمی سے یہ توقع کیسے کر سکتے ہیں کہ صبح اٹھ کر آپ کے بچوں کے پوتڑے دھوئے۔ آپ کے لیے پانی کا سبیتا کرے، ناشتہ تیار کرے، برتن دھوئے، مسالہ پیسے، بازار سے سودا لائے، کھانا پکائے۔ دوپہر سے ڈنڈا لیے، بکریوں کے پیچھے پیچھے پھرے، کسانوں اور مالیوں سے جھک جھک کرے اور شام کو گھر آئے تو پھر وہی صبح کا سا چکر آدھی رات تک چلتا رہے۔ آدمی نہ ہوا گھن چکر ہو گیا۔"

"تو یہ کوئی انوکھی بات تھوڑا ہی ہے۔ آخر جیسے مرحوم بھی تو آدمی تھا۔ وہ یہ سب کام کرتا تھا یا نہیں؟"

"شیخ جی آدمی تو تھا مگر یہی سب کام کرتے کرتے بچارا مرحوم ہو گیا۔ آپ چاہتے ہیں کہ صفائی بھی جلدی سے وفات پا جائے۔"

"موت زندگی تو خدا کے ہاتھ ہے۔ اس پر کس کا اختیار ہے؟"

"شیخ جی یہ اختیار کبھی کبھی بندے کی طرف بھی منتقل ہو جاتا ہے۔ جو شخص ایک گوشت پوست کے انسان سے مسلسل اٹھارہ گھنٹے کام لے وہ ملک الموت نہیں تو اس کا داہنا ہاتھ ضرور ہے۔"

"تم نے تو میرا دل ہلا دیا مگر کام تو آخر ہونا ہی ہے، میں کروں تو کیا کروں؟" م

"ہم بتائیں آپ یہ کیجیے کہ آدمی کو آدمی سمجھیے، خود بھی آدمی بن جائیے اور اس کا بوجھ ہلکا کیجیے۔"

آزمائش

فضا ابن فیضی

نہ تن کی آزمائش ہے نہ سر کی آزمائش ہے
محبت دردِ دل، خونِ جگر کی آزمائش ہے

خزف کی انجمن میں لعلِ تر کی آزمائش ہے
یہ دنیا ہی فریبِ خیر و شر کی آزمائش ہے

کشاکش جلوۂ و ظلمت کی ہے صرف اس قدر یعنی
گریبانِ شب و جیبِ سحر کی آزمائش ہے

ہر ایک تخریب میں خوش رنگیٔ تعمیر پنہاں ہے
خزاں بھی موسمِ دیوانہ گر کی آزمائش ہے

ابھی تہذیب اپنے دورِ طفلی سے گذرتی ہے
ابھی دنیا میں تہذیبِ بشر کی آزمائش ہے

ستارے تیری ہی شوخیٔ نظارہ کا پرتو ہیں
فلک تیرے ہی آہنگِ سفر کی آزمائش ہے

مہ و انجم ترے دامن کی زینت ہیں مگر نادل
یہ دوری تیری پروازِ نظر کی آزمائش ہے

تو اپنے عصر کا روح الامیں ہے بے خبر انساں
فرازِ عرش تیرے بال و پر کی آزمائش ہے

لبِ ناقوس سے ابلا ہے پھر ایک شورِ حریت
سرودِ ممبر و محراب و در کی آزمائش ہے

ضرورت کی فضا میں شعلۂ ایجاد ہے رقصاں
شکستِ آئینہ، آئینہ گر کی آزمائش ہے

وہ ایک سرجوشِ بیداری جسے ہم موت کہتے ہیں
اسی خوابِ حیاتِ مختصر کی آزمائش ہے

رکا ہے کارواں اپنا سیاست کے دوراہے پر
خضر کا امتحاں ہے راہ بر کی آزمائش ہے

غلط ہوتا ہے کب آخر غمِ دورِ ملوکیت
مئے جمہور کے کیف و اثر کی آزمائش ہے

دوا ہوتی ہے جتنی کچھ مرض بڑھتا ہی جاتا ہے
نگاہِ دوربینِ چارہ گر کی آزمائش ہے

کھلے جاتے ہیں ٹانکے اور بھی کچھ ضربِ سوزن سے
نہ پوچھو! اضطرابِ بخیہ گر کی آزمائش ہے

مزاجِ خسروی برہم ہے کیوں میری فقیری پر
فقیری سطوتِ تاج و کمر کی آزمائش ہے

تمھارا زہر کا اک ساغرِ لبریز ہے ساقی!
ترے بادہ کشانِ معتبر کی آزمائش ہے

مکان و لامکاں میں اے فضا دیوانگی میری
جمودِ دانشِ اہلِ نظر کی آزمائش ہے

تہذیب کی صبح

سید سخی حسن نقوی

ہزاروں برس پہلے ایک آدمی تھا۔ دیکھنے میں تو سچ مچ آدمی تھا مگر عادتیں سب جانوروں جیسی تھیں، ہماری اور تمہاری طرح وہ اور اس کے بچے دو پاؤں پر سیدھے کھڑے ہو سکتے تھے۔ ہماری طرح اس کے دو ہاتھ، دو ٹانگیں، کان، آنکھیں اور سب باتیں ویسی ہی تھیں جیسی ہماری ہیں، مگر نہ اس کے سر پر ٹوپی تھی نہ پیر میں جوتا نہ بدن پر کپڑا۔ ننگ دھڑنگ ادھر ادھر ڈھوروں کی طرح چارے کی تلاش میں آوارہ پھرتا تھا۔ اگر اس قسم کا جانور انسان آج ہمارے باغ میں گھس آئے تو ہم اسے فوراً کانجی ہاؤس میں بند کر دیں۔ مگر اس وقت نہ کانجی ہاؤس تھے، نہ بند کرنے والے، وہ تھا اور اتنی بڑی عظیم الشان دنیا، اس کے لئے آسمان کے سوا دوسری چھت اور زمین کے علاوہ کوئی اور بچھونا نہ تھا، شیر چیتے، ہاتھی اور دوسرے خوفناک جانور اس وقت بھی موجود تھے، اس لئے وہ جان بچانے کے لئے پہاڑ کی کھوؤں اور غاروں میں جا گھستا تھا۔ لیکن ذرا سوچئے کہ اگر ہمارے سونے کے کمرے میں ہاتھی گھس آئے تو ہم کتنے گھبرائیں۔ غاروں میں جنگلی جانور بھی گھس آتے تھے اور اس کی نیند کو خراب کیا کرتے تھے، اس لئے وہ ڈر کے مارے درختوں پر چڑھ جایا کرتا تھا اور بعض اوقات خونخوار جانوروں کے خوف سے اسے ساری رات وہیں بسر کرنی ہوتی تھی اور پیڑ کے گدے اس کے لئے نرم نرم بچھونے کا کام دیتے تھے۔ اس کے کھانے ر عام طور سے پھل پھلار ہوا کرتے تھے۔ اور جب پھل نہ ملتے تو بے چارہ درختوں کے پتے چاب کر گذارہ کر لیا کرتا تھا، اپنی بیگم صاحبہ اور بچوں سے ان کی گفتگو سننے کے قابل ہوا کرتی تھی، عجیب خیالی آوازیں نکال کر یا سیٹیاں بجا بجا کر وہ آپس میں بات چیت کیا کرتے تھے۔ اور کتنا لطف آتا ہوگا جب ان کے بچے صبح صبح اٹھ کر اپنے ابا جان اور اماں جان کو بجائے تسلیم اور نمستے کے خیاؤں خیاں سلام کرتے ہوں گے۔

آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ اس ہزاروں برس پہلے کے انسان اور جانوروں میں کوئی خاص فرق نہ تھا۔ مگر جس عقل کی وجہ سے انسان آج دنیا کا مالک بن بیٹھا ہے وہ اس میں ہزاروں برس پہلے بھی موجود تھی اور سچ پوچھئے تو یہ عقل ہی ایسی چیز ہے جس نے حیوان اور انسان میں فرق پیدا کر دیا ہے، اس لئے ہم لوگ اس شخص کو جس میں عقل نہیں ہوتی یا کم ہوتی ہے اکثر الو گدھے کا خطاب دے دیا کرتے ہیں۔ اگر آپ سے پوچھا جائے کہ بچوں کو چور سپاہی کھیلنا یا گڑیاں کھیلنا کس نے سکھایا ہے تو وہ جواب دیں گے کہ ہمارے بڑوں نے کیونکہ جو کام وہ اپنے بڑوں کو کرتے ہوئے دیکھتے ہیں وہی کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح انسان نے بھی وہی کرنا شروع کر دیا جو جانور کرتے تھے۔ مثلاً جانور گھاس پھوس اور درخت کے پتے کھاتے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی وہ بھی کھانے لگا۔ جانور غاروں میں چھپتے تھے وہ بھی غاروں میں چھپنے لگا۔ عقل اس میں موجود تھی اس لئے ضرورت پڑنے پر جب اس نے اپنی عقل کو استعمال کیا تو اپنے آرام کے لئے ایسی چیزیں معلوم کر لیں جو اُن کے لئے بڑی ضروری تھیں۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ سب سے پہلی چیز جو اس نے معلوم کی وہ آگ تھی۔

آپ نے سُنا ہوگا کہ کبھی کبھی جنگلوں میں آپ ہی آپ آگ لگ جاتی ہے۔ یہ آگ جن یا بھوت نہیں لگاتے بلکہ یہ ہوتا ہے کہ دو پتھروں کے آپس میں ٹکرانے سے شعلہ نکلتا ہے اور آس پاس کے سوکھے گھاس پھوس آگ پکڑ لیتے ہیں اور جنگل کا جنگل بھڑک اٹھتا ہے، شاید آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ ریل کے پہیے جب پٹری سے رگڑ کھاتے ہیں تو چنگاریاں نکلا کرتی ہیں۔ اور دور کیوں جائیے۔ ابھی ابھی تجربہ ہو جائے گا۔ انگلی کو ہتھیلی پر رگڑئے تو انگلی گرم ہو جاتی ہے۔ کیا تعجب ہے کہ ایک دن رات کے وقت انسان نے شیر کو بھگانے کے لئے موٹا سا پتھر پھینک کر مارا ہو اور وہ پتھر کسی دوسرے پتھر سے ٹکرایا ہو اور شعلے سے آس پاس کی سوکھی گھاس جلنے لگی ہو۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ اس قسم کے تجربے سے وہ آگ بنانا سیکھ گیا۔ اس طرح جب پہلی بار آگ جلی ہوگی تو اس نے ضرور یہ کوشش کی ہوگی کہ یہ بجھنے نہ پائے اور وہ خود اس کی بیگم صاحبہ اور اس کے بچے آگ میں برابر خشک پتیاں اور لکڑیاں ڈالتے رہتے ہوں گے، لیکن آہستہ آہستہ اُنھوں نے یہ بھی سیکھ لیا کہ دو پتھروں کو رگڑ کر جو شعلہ نکلے اُسے سوکھی گھاس پر ڈالیں اور جب چاہیں آگ بنالیں۔

جو آرام ہمیں بجلی کی روشنی، بندوق اور ہیٹر پہنچا رہے ہیں وہ ہزاروں برس پہلے کے لوگوں کو آگ نے پہنچایا۔ جاڑے میں وہ اور اس کے بیوی بچے آگ سے تاپتے تھے۔ اُن کے غاروں میں اندھیرا اور ٹھنڈ رہتی تھی۔ آگ سے وہ اُنھیں گرم اور روشن کر لیتے تھے۔ اور سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ خونخوار جانور آگ سے ڈر کر اس کے پاس نہ پھٹکتے تھے۔ اور رات کو اسے ڈر کے مارے پیڑ کے تدو کی ہلنے نہ

کھائی پڑتی تھی، اور غار کے سامنے جب وہ آگ جلا دیتا تو جانور اس کی طرف رخ نہ کرتے تھے اور وہ اطمینان سے رات بھر [illegible] سویا کرتا تھا۔

آگ معلوم کرنا تھا کہ انسان ترقی کے راستے پر پڑ گیا، ہمارے آپ کے لئے آگ کی کوئی حقیقت نہیں ہے، لیکن میری بات مانیں تو میں یہ کہوں گا کہ ریل، ہوائی جہاز اور ریڈیو کے موجد سے ہمارا آگ کا موجد کسی طرح کم نہ تھا۔

جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اور انسان نے اپنی عقل سے کام لیا، اس نے ایک اور بڑی زبردست چیز ایجاد کر ڈالی۔ یہ چاقو کی ایجاد تھی۔ آپ کہیں گے کہ یہ بھی کوئی ایجاد تھی، اور واقعی چاقو تم لوگوں کے لئے نہایت ہی معمولی چیز ہے لیکن غور کیا جائے تو اس کا شمار دنیا کی بڑی سے بڑی ایجادوں میں ہونا چاہئے کیونکہ اس ایجاد سے اس نے نہ معلوم کتنی اور چیزیں معلوم کر لیں۔ چاقو اس طرح ایجاد ہوا کہ انسان پھل پھلار یا مچھلیاں کھایا کرتا تھا۔ بعض پھل ایسے ہوتے ہیں جو دانت سے نہیں توڑے جا سکتے، اور ان کے لئے چاقو کی سخت ضرورت پڑتی ہے۔ اس لئے وہ اخروٹ جیسے سخت پھلوں کو دو پتھروں سے توڑ لیا کرتا تھا موٹے اور گول پتھر کو اگر توڑ کر اگر دو ٹکڑے کر دئے جائیں تو دونوں حصوں کے کناروں پر بڑی تیز دھار بن جاتی ہے۔ اگر آپ اس کے کناروں پر ذرا زور سے انگلی پھیر دیں تو آپ کی انگلی کٹ جائے۔ اور خون بہہ نکلے۔ کیونکہ اس کا کنارہ چاقو کی طرح بالکل تیز ہوتا ہے۔ ایک دن اتفاق سے اخروٹ توڑنے میں پتھر کے دو ٹکڑے ہو گئے اور انسان نے یہ معلوم کر لیا کہ موٹے اور گول پتھر کا کنارہ ٹوٹنے کے بعد تیز ہوتا ہے، اس کے بعد ایک عرصے تک پتھر کے ٹکڑوں کی دھار سے گوشت اور پیڑ کی پتیاں اور شاخیں کاٹنے کا کام لیتا رہا۔ اصل میں یہی اس کا پہلا چاقو تھا۔ مگر یہ ایسا تھا کہ اگر کہیں ہم دیکھ پائیں تو کبھی اسے چاقو کہنے کے لئے تیار نہ ہوں، انسان بھی اس سے خوش نہ تھا۔ اور زیادہ دن نہ گذرے کہ اس نے ایک اور چیز معلوم کر لی۔ اگر ہم موٹے گول پتھر کو توڑ کر ٹکڑے کر دیں تو وہ ٹکڑے نہایت عمدہ پتریوں کا کام دیتے ہیں جب انسان نے یہ معلوم کر لیا تو اس نے باقاعدہ پتھر کی چھوٹی چھوٹی تیز پتریاں چھیلنا شروع کیا، اور ان پتریوں سے وہ بہتر چاقو بنانے لگا۔ جو اس کے پہلے چاقو سے زیادہ تیز اور عمدہ تھا۔ موٹے موٹے ٹکڑوں سے وہ ایک ایسی چیز بنانے لگا جسے ہم کلہاڑی کہتے ہیں چلتے چلتے اُسے ایک اور چیز معلوم ہوئی وہ یہ کہ پہلے جب اسے چاقو بنانا ہوتا تھا تو جو ٹکڑے عمدہ ہوتے اُنھیں وہ رکھ لیتا۔ اور اُنھیں کام میں لاتا اور باقی ٹکڑوں کو بیکار سمجھ کر پھینک دیا کرتا تھا۔ اب اس نے یہ معلوم کر لیا کہ جن ٹکڑوں کو وہ پھینک دیا کرتا تھا انھیں بھی کام میں لایا جا سکتا ہے جب اسے یہ معلوم ہوا ہوگا تو ضرور پچھتایا ہوگا اور سخت غصہ آتا ہوگا۔ اب وہ ان ٹکڑوں کو پھینکنے کی بجائے کام میں لانے لگا۔

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

روس کی طاقت کا راز

محمد امین

روس کا نظام حکومت دنیا کے تمام ملکوں سے مختلف اور نرالا ہے۔ اس کی بنیاد عوام کی بھلائی، انسان سے محبت، خلوص اور نیک نیتی پر ہے۔ وہ اشتراکیت کا علمبردار ہے۔ مزدور اور کسان اس کی سماج کی دو آنکھیں ہیں اور دنیا کے تمام مزدور کسان غریب اور پس ماندہ طبقے کے ساتھ اس کی ہمدردی ہر ادارہ کے لئے روس ایک مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

روس کی ترقی اور کامیابی کا راز اس کے پنج سالہ منصوبوں میں مضمر ہے۔ ۱۹۲۸ء سے چار پنج سالہ پروگرام کے ذریعے اس نے غیر معمولی ترقی کی ہے، پہلے اس کی معاشی زندگی کا دارومدار کاشت کاری پر تھا، لیکن اب روس کا شمار دنیا کی سب سے بڑے صنعتی ملکوں میں ہوتا ہے۔ سوائے امریکہ کے کوئی بھی اس کا ہم مقابل اور ہم پلہ نہیں۔ ۱۹۴۶ء سے اس کا چوتھا پنج سالہ پروگرام شروع ہوا ہے اور امید ہو کہ آئندہ پندرہ سال کے اندر اندر وہ دنیا کا سب سے بڑا صنعتی، معاشی اور سیاسی ملک بن جائے گا۔

آج روس میں ہزاروں کارخانے ہیں۔ ہزاروں لوہے اور کوئلے کی نئی نئی کانیں ہیں، کروڑوں میل لمبی ریل ہے، سینکڑوں ایکڑ زمین پر آب پاشی کا انتظام ہے، بجلی کی طاقت حاصل کرنے کے لئے بڑے بڑے پاور ہاؤس ہیں اور سمندر کے ساحل پر پچاسوں جدید اور عمدہ قسم کی بندرگاہیں ہیں۔

یہ زبردست کامیابی یوں ہی نہیں ہوگئی ہے اور نہ کسی سرمایہ دار کی ذاتی کوشش سے بلکہ یہ سب کچھ ایک خاص منصوبہ بندی کے مطابق ریاست کے ہر ہر فرد کی پیہم کوشش کا نتیجہ ہے۔ سائنس، معدنیات، صنعت و حرفت، زراعت، تعلیم، ریلوے، ٹیلیفون، مکانات۔ الغرض ہر چیز کو ترقی دینے کے لئے حکومت اسکیمیں بناتی ہے۔ ہر کام کے لئے الگ الگ کمیسار (وزارتیں) ہیں۔ ہر شعبہ اپنا اپنا پنج سالہ پروگرام بناتا ہے اور اس کے بعد سارے پروگراموں کو اکٹھا کرکے مرکزی حکومت تمام ملک کے لئے ایک مکمل منصوبہ تیار کرتی ہے، اور ہر ریپبلک کے لئے الگ الگ کوٹا مقرر کرتی ہے۔ اس کے بعد سارا ملک ایک سرے سے دوسرے سرے تک کم سے کم وقت میں منصوبہ پورا کرنے کی کوشش میں منہمک ہو جاتا ہے۔

روس ایک بہت وسیع ملک ہے۔ اس کا رقبہ اسی لاکھ مربع میل سے بھی زیادہ ہے، یعنی یہ ممالک امریکہ، کینیڈا، الاسکا، میکسیکو کے مجموعی رقبے سے بھی زیادہ ہے۔ اس کی سلطنت خشکی کے حصے پر ایک سرے کر دوسرے سرے تک یورپ اور ایشیا میں ایک مسلسل قطعہ زمین پر پھیلی ہوئی ہے۔

یورپ اور ایشیا کے بہت سے ملکوں کی سرحد روس سے ملتی ہے اور جنوب میں اس کی سرحد ۲۵ ہزار میل تک مسلسل پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی آبادی ۲۰ کروڑ ہے، جو امریکہ، کینیڈا، الاسکا اور میکسیکو کی مجموعی آبادی سے تقریباً دو کروڑ زیادہ ہے۔ کاشت کا رقبہ ۹ لاکھ مربع میل ہے۔ اس کے مقابلے میں امریکہ میں صرف ۵ لاکھ مربع میل زمین کاشت کے قابل ہے روسی ترکستان میں ۲۵ لاکھ مربع میل ریگستان ہے جو بہت جلد کاشت کے قابل ہو جانے کی خصوصاً اور جب کہ مصنوعی بارش اور سمندر کے کھاری پانی کو آب پاشی کے قابل بنانے کا طریقہ معلوم کیا جا چکا ہے۔

امریکہ کی طرح یہاں بھی معدنیات کی فراوانی ہے، بعض معدنیات میں وہ امریکہ سے بہت پیچھے ہے لیکن زیادہ تر معدنیات ایسی ہیں جن میں روس کا شمار دنیا میں اول درجے پر ہے۔

لوہا اور کوئلے کی یہاں بھی بہت افراط ہے۔ ۱۹۲۸ء تک زیادہ تر کوئلہ اور لوہا اس کے یورپی علاقے سے نکلتا تھا۔ لیکن جوں جوں اس کے پنج سالہ پروگرام کامیاب ہوتے گئے، اسی لحاظ سے اس نے نئے نئے علاقوں میں لوہا اور کوئلہ ڈھونڈھ نکالا۔

بحیرۂ اسود کے قریب صرف ڈونز بیسن میں پہلے کوئلہ نکالا جاتا تھا لیکن دوران جنگ میں جب اس علاقے کے تمام کارخانے یورال پہاڑ کے پیچھے منتقل کئے گئے تو معلوم ہوا کہ سائبریا کی سرزمین قدرتی خزانوں سے بھری ہوئی ہے اس وقت ڈونز بیسن کے علاوہ مغربی سائبریا میں کزلسک بیسن، قازقستان میں کراگنڈا جو پہلے اسٹیپ کے ریگستانی علاقے میں پوشیدہ تھا کا کیسیا، مشرق بعید اور الٹائی پہاڑ یل کے دامن میں لامحدود قدرتی وسائل ہیں۔ یورال کے علاقے میں بھی کوئلہ کا ذخیرہ موجود ہے، اور مشرق میں دریائے امور کی وادی میں بھی کوئلے کے امکانات ہیں۔ قیاس ہے کہ روس میں امریکہ کے مقابلے میں کوئلے کا ذخیرہ زمین کے اندر کئی گنا زیادہ ہے اور خرچ کی موجودہ رفتار کے حساب سے ہزاروں برس کے لئے کافی ہے اور یہاں کا سارا کوئلہ لوہے کو گلانے کے لئے بہترین ثابت ہوا ہے۔

پہلے لوہے اور فولاد کی صنعتیں زیادہ تر ڈونز بیسن اور ماسکو کے علاقے میں تھیں لیکن جیسے جیسے لوہے کی نئی نئی کانیں معلوم ہوتی گئیں اسی لحاظ سے صنعت کا مرکز بھی منتقل ہوتا گیا۔ سائبریا کے دو قصبوں ——— نوواسی برسک اور ارکوتسک میں زمین کے اندر سے معدنیات نکالنے کے آلے بنائے جاتے ہیں۔ اسٹالن گراڈ میں انجن، یورال اور چلیابنسک میں ٹریکٹر، ویگن اور بجلی کے بڑے بڑے سامان سورڈوولسک میں ڈیزل انجن اور ساک میں زراعتی مشینیں، تاشقند میں آٹا پیسنے والی مشین، سیمی پلٹنسک میں جو کہ قازقستان کے اسٹیپ میں ہے دریا سکو، لینن گراڈ اور خارکو میں بجلی کی مشین تیار ہوتی ہے۔ یوکرین، یورال اور سائبریا کا وسطی اور مغربی حصہ لوہے کی صنعت کا مرکز ہے۔

قازقستان، یورال اور وسطی ایشیا کے علاقے میں حکومت کی توجہ زیادہ ہے۔ یورال کے علاقے میں بہترین لوہا پایا جاتا ہے اور اس سے ایک ہزار میل مشرق میں مغربی سائبریا کے کزنسک بیسن میں بہترین کوئلہ۔ دونوں علاقوں کے درمیان گورنمنٹ نے آمد و رفت کا ایسا انتظام کیا ہے کہ ایک سمت سے کوئلہ جاتا ہے تو دوسری سمت سے لوہا آتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کزنسک اور میگ نی ٹوگورسک جو جنوبی یورال میں ہے دونوں جگہوں میں لوہے اور فولاد کی صنعت نے تیزی سے ترقی کی ہے۔ خوش قسمتی سے اب یورال کے علاقے میں بھی عمدہ قسم کا کوئلہ مل گیا ہے۔ لہٰذا اب کوئلہ سائبریا سے لانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی بلکہ وہ بہنے او پر آپ بھی سرکرے گا دریائے آمور کی وادی میں لوہا اور کوئلہ ساتھ ساتھ پایا جاتا ہے چنانچہ وہاں بھی لوہے اور فولاد کی صنعت کو ترقی دی جا رہی ہے تاکہ بحرالکاہل کے ساحل پر جنگی جاپان کے مدمقابل جہاز بنانے کی صنعت تیزی سے ترقی کر سکے۔

پٹرول کی پیداوار کے لئے شروع شروع میں باکو کا علاقہ مشہور تھا۔ لیکن ۱۹۲۸ء کے بعد خاص طور سے نئے ذخیرے اور تیل کے چشمے معلوم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ پچھلی جنگ عظیم چھڑنے سے چند سال پیشتر سوویٹ حکومت نے کئی ہزار سائنس دانوں کو اسی کام کے لئے متعین کیا تھا۔ ان دنوں وہاں چار ہزار سے زیادہ لوگ زمین کے اندر مختلف قسم کی معلومات، معدنیات، تیل کے چشمے، یورینیم وغیرہ معلوم کرنے کے لئے دن رات کام کر رہے ہیں۔ تیل کے چشمے کا بہت بڑا ذخیرہ کاکیشیا میں قراز کی سنے پاس معلوم ہوا ہے۔ علاوہ اس کے جنوبی یورال کے علاقے میں بھی ایک بہت بڑا خطہ اس سے بھرا پڑا ہے۔

علاوہ تیل، کوئلہ اور لوہے کی صنعت کے روس میں بجلی کی طاقت نے بھی دن دونی رات چوگنی ترقی کی ہے ماسکو یعنی لینن گراڈ اور ڈونز کے اضلاع میں بجلی کی طاقت کروڑوں کیلوواٹ حاصل کی جاتی ہے اور مختلف

صنعتوں میں استعمال ہوتی ہے۔ لیکن حکومت نے زیادہ توجہ اور مستعدی سے ہر خطہ میں الگ الگ بجلی پیدا کرنے کا انتظام کیا ہے۔ سائبیریا کے ینیسی، وانگارا، ینی سی کی وادیوں میں اور کاکیشیا اور انگارا کے علاقوں میں بھی بجلی حاصل کرنے کی بڑی بڑی اسکیمیں کام کر رہی ہیں۔ سائبیریا اور وسطی ایشیا میں بھی بجلی پیدا کرنے کے ذرائع لامحدود ہیں۔ سائبیریا کے پوشیدہ قدرتی خزانے کا راز معلوم کرنے کے لئے جوں جوں روسی حکومت دلچسپی لے رہی ہے ویسے ہی دن بدن نئی نئی بیش بہا دھاتیں، معدنیات، صنعت و حرفت کے لئے خام پیداوار کے امکانات بڑھتے جا رہے ہیں۔

دوران جنگ اور جنگ کے بعد کے زمانے میں یہ علاقے اتنی تیزی سے ترقی کی ہے کہ اب وہاں ہر قسم کی صنعت و حرفت، لوہے اور فولاد، بجلی اور ٹریکٹر، انجن اور زراعت کی مشین، کھاد اور کیمیکل ہر ایک کی بنیادیں [illegible] سے سائبیریا موجودہ روس کے صنعتی ڈھانچے کا دل کہا جاتا ہے۔

جدید کوشش کی بنا پر ماہرین طبقات الارض کا اندازہ ہے کہ روس کی سرزمین میں خصوصاً سائبیریا اور وسطی ایشیا کے خطوں میں ان گنت معدنیات کے خزانے پوشیدہ ہیں۔ اب تک جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ نہ صرف کوئلہ، لوہا اور تیل کا بے شمار ذخیرہ موجود ہے بلکہ سونا، چاندی، پلیٹنم، ریڈیم، یورینیم، جواہرات، پوٹاش اور نمک، مینگنیز، المونیم، جست، سیسہ، تانبا اور پارہ بہت کافی مقدار میں موجود ہے اور اب ان میں سے تقریباً سبھی دھاتیں زمین سے نکالی بھی جانے لگی ہیں ——— ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ روس جوں جوں اپنی منصوبہ بندی کو مکمل کرنے میں کامیاب ہوتا جائے گا ویسے ہی اس کی طاقت ——— صنعتی، اقتصادی اور سیاسی بڑھتی جائے گی اور دس پندرہ سال کے اندر اندر وہ ہر لحاظ سے نہ صرف ایک زبردست ملک ہو جائے گا بلکہ ہر چیز کی پیداوار میں وہ دنیا کے تمام ملکوں سے آگے بڑھ جائے گا۔

قدرتی نباتات زیادہ تر جنگلات کی شکل میں موجود ہیں ویسے یہاں گھاس کا بھی ایک بہت بڑا میدان ہے جسے اسٹیپ کہتے ہیں۔ روس میں شمالی علاقہ جو ٹنڈرا یعنی شمال کے سرد خطہ کے فوراً بعد ہے جنگل کی دولت سے لدا پڑا ہے۔ یہاں نہ صرف ہزاروں قسم کی قیمتی لکڑیاں پائی جاتی ہیں، بلکہ ان جنگلوں میں سمور والے جانور بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کا شکار پہلے تو بے تکے طور سے ہوا کرتا تھا، لیکن اب قاعدہ اور ایک تنظیم کے ماتحت ہوتا ہے جو جانوروں کی تعداد اور ان کی نسلوں کا خاص خیال رکھتی ہے۔

جنگل کی لکڑیاں بڑے بڑے کارخانوں میں استعمال ہوتی ہیں اور انھیں گل کر نہ صرف کاغذ بنایا جاتا ہے بلکہ مصنوعی ریشم کے لئے ایک سار بھی جنگلی حصے کے جنوبی حصے میں اس سرے سے اس سرے تک لکڑی کے بڑے بڑے کارخانے ہیں جو ضروریات کے مطابق مختلف کاموں کے لئے لکڑیاں، فرنیچر مہیا کرتے رہتے ہیں۔

جنگل کے بعد اسٹیپ کا علاقہ ہے جہاں کی مٹی سیاہ ہوتی ہے اور آب و ہوا کچھ کچھ سوکھی۔ بارش تھوڑی ہوتی ہے لیکن جو کچھ ہوتی ہے وہ پھوار کی شکل میں۔ لہٰذا پانی رس رس کر زمین کے اندر جذب ہوتا رہتا ہے۔ قدرتی ماحول گھاس کی پیداوار کے لئے بہت موزوں ہے۔ اس بڑے میدان میں ہزاروں لاکھوں مویشی پالے جاتے ہیں جن سے دودھ، دہی، مکھن، پنیر اور کریم وغیرہ بڑے پیمانے پر حاصل کی جاتی ہیں۔ اس میدان کے بہت سے حصوں سے گھاس صاف کر دی گئی ہے اور زرخیز زمین میں گیہوں کی کاشت بہت بڑے پیمانے پر ہوتی ہے۔

روس نہ صرف معدنیات اور قدرتی نباتات کے لحاظ سے خود کفیل ہے بلکہ مختلف فصلوں کی پیداوار میں بھی وہ کسی ملک سے پیچھے نہیں ہے۔ روس کی سطح اور زمین کی ساخت کا نقشہ اٹھا کر آپ دیکھئے تو اندازہ ہوگا کہ اس سرے سے اس سرے تک وہاں میدان ہی میدان ہے۔ روس ۳۵ ڈگری شمالی عرض البلد سے ۷۵ ڈگری شمالی عرض البلد تک پھیلا ہوا ہے اور اس کی چوڑائی ۵ ہزار میل ہے چنانچہ یہاں طرح طرح کی آب و ہوا پائی جاتی ہے۔ گو سرد علاقوں کا خطہ زیادہ ہے۔ پچھلی جنگ عظیم سے پہلے کھیتی کا کل رقبہ ۹ لاکھ مربع میل تھا لیکن اب اس میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ سائبیریا، روسی ترکستان اور دوسرے وسطی ایشیائی ریپبلک میں پنج سالہ منصوبہ بندی کے پروگرام کے مطابق خاص توجہ کی گئی ہے اور نہ صرف یہ کہ ان علاقوں میں مختلف قسم کی فصلیں پیدا کی جاتی ہیں بلکہ روسی حکومت نے ان کی آبپاشی کا بھی انتظام کیا ہے اور گیہوں اور رائی اور جئی کی ایسی قسمیں معلوم کی ہیں جو سرد اور خشک دونوں علاقوں میں نہایت کامیابی کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں۔ انھیں علاقوں میں مصنوعی کھاد کی صنعتیں بھی موجود ہیں اور تجربے کے لئے نئی تجربہ گاہ۔

روس میں زراعت کی بنیاد جدید سائنس پر ہے اس کا سارا نظام آپس کے میل اور اتفاق پر منحصر ہے۔ دراصل کلکٹو فارمنگ اس کی جڑ ہے۔ یو ایس اے کی طرح یہاں بھی ہر ہر فصل کی پیداوار کے لئے مخصوص علاقہ ہے۔ چنانچہ یہاں یوکرین میں گیہوں، رائی اور جو کی پیداوار کثرت سے ہوتی ہے۔ چاول جنوب کے گرم خطوں میں آب پاشی کی مدد سے ہوتا ہے۔ آلو اور چقندر دریائے والگا کی وادی میں کثرت سے ہوتا ہے اور سائبیریا کے خطوں میں بھی اب کثرت سے پیدا ہونے لگا ہے۔

کپاس کے لئے کاکیشیا کا علاقہ، روسی ترکستان کا علاقہ اور وسطی ایشیا کے دوسرے علاقے بہت مشہور ہیں۔ یہاں کی کپاس بہت عمدہ اور اچھی ہوتی ہے۔ اور اس علاقے میں سوتی، اونی اور ریشمی کپڑوں کے بڑے بڑے کارخانے بھی ہیں۔ جنوب کے خشک اور [illegible] علاقوں میں تجربے کے بعد بکریاں اور بھیڑیں پالی جاتی ہیں جن کا اون نکال کر کارخانوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔ سائبیریا اور یورپی روس کے شمالی سرد علاقوں میں بھی حکومت نے کم وقت میں پکنے والی جو اور جئی کی فصل کی کاشت جدید پیمانے پر شروع کی ہے، اور ۹۰ فی صدی اس میں کامیاب ہے۔ ان علاقوں میں روسی حکومت کا نعرہ ہے کہ قدرتی غیر موافق حالات پر انسان کو فوقیت حاصل کرنی ہے۔

کاشتکاری کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر حلقہ میں اپنی ایک تجربہ گاہ ہے، جہاں بیج، بہتر نسل اور ان کی مختلف قسموں پر دن رات تجربہ ہوتا رہتا ہے۔ کئی سال کے تجربے کے بعد روسی حکومت نے گیہوں، جو، آلو، چقندر، کپاس کی ایسی قسمیں معلوم کی ہیں جو بیماری کے حملوں سے بالکل محفوظ رہتی ہیں اور فی ایکڑ پیداوار غیر معمولی طور سے زیادہ ہوتی ہے۔ سال بہ سال اسی بیج کا استعمال بڑھتا جاتا ہے اور اس طرح ہر فصل کی پیداوار میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ روس صنعت، زراعت، تعلیم ہر میدان میں بڑے پیمانے پر تجربہ کر رہا ہے۔ اس تجربے میں اسے ممکن ہو کہیں کہیں پر ناکامیابی ہوتی ہو، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہے اور اس لئے وہ تیزی سے ہر چیز میں ترقی کر رہا ہے۔ صنعت و حرفت کا کوئی پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ لوہے اور فولاد کی صنعت کے ساتھ ساتھ موٹر، بجلی، ریل، جہاز، کاشتکاری کی مشین، ٹریکٹر [illegible] سے اور جتنی بھی صنعتوں کا تعلق ہے سبھی اس علاقے میں ابھر رہی ہیں اور تیزی سے ترقی کر رہی ہیں۔ زراعت کے معاملے میں روسی حکومت اس بات کی قائل ہے کہ ایک انچ زمین بھی بے کار نہیں چھوڑی جانی چاہئے۔ چنانچہ وہ دن رات بنجر اور بے کار زمین میں فصلوں کی کاشت بڑھاتی جاتی ہے اور اس کی کامیابی کے لئے سبھی وہ چیزیں جو درکار ہیں وہ مہیا کر لی ہے۔ جیسے ٹریکٹر، مصنوعی کھاد، مشین، آب پاشی، نئے اور بہتر بیج۔

صنعت و حرفت اور زراعت کی ترقی کے ساتھ ساتھ روسی حکومت تعلیم سے بھی غافل نہیں ہے۔ تعلیم اور سائنس کے مختلف شعبوں میں نئے نئے تجربے کے لئے بہترین انتظام ہے۔ روس کا ہر فرد اپنے رجحانات اور دلچسپی کے بل بوتے پر زیادہ سے زیادہ اور اونچی سے اونچی تعلیم حاصل کر سکتا ہے۔ اور اس کے بعد وہ روس کی بڑی تجربہ گاہ میں خود بھی محو ہو جاتا ہے اور اپنے ملک اور قوم کو آگے بڑھانے میں مدد کرتا ہے۔

سیر و تفریح اور سینما کا بھی بہت اچھا بندوبست ہے۔ ہر شہر اور ہر قصبے میں سینما اور ریڈیو کا استعمال بہت عام ہے، لیکن یہ کہا جائے تو شاید وہ مناسب ہوگا کہ ان چیزوں کا جتنا اچھا استعمال روس میں ہوتا ہے کسی ملک میں بھی نہیں ہوتا۔

ایک شعر

ضیاء الفاروقی

۱۵ اگست سنہ ۱۹۴۷ء کو آزادی ملی اور وہ خواب جو الہلال اور البلاغ کے صفحات خطبات اور مکتوبات میں دیکھا اور دکھایا گیا تھا شرمندۂ تعبیر ہوا۔ گویا ہندوستان کو منزل مل گئی اور قافلہ رک گیا۔ کانگریس کی انقلابی سرگرمیوں کا پھیلاؤ سمٹنے لگا یا یوں کہئے کہ موجیں ساحل پر پہنچ کر منتشر ہونے لگیں۔

بہم رساں کہ بازی بعالمے
یا ہمتے کہ از سر عالم تواں گذشت

غالباً ۱۹۴۶ء کی جولائی تھی۔ میرے ایک دوست نے مجھے ایک نوٹ بک دکھائی جس میں ہندوستان کے بڑے بڑے لیڈروں کے آٹوگراف تھے۔ میں نوٹ بک کے صفحات الٹتا رہا۔ ایک صفحہ پر نظر جم گئی۔ اس پر ابوالکلام آزاد لکھا ہوا تھا اور ایک شعر پیغام عمل دے رہا تھا۔ شعر یہ تھا:

بہم رساں کہ بازی بعالمے
یا ہمتے کہ از سر عالم تواں گذشت

ناظرین اگر اجازت دیں تو اس شعر کی تفسیر خود مولانا کے الفاظ میں بیان کر دوں۔ غبار خاطر میں اس شعر کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں:

"پہلا طریقہ اختیار نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کی طبیعت ہی نہیں لایا تھا۔ ناچار دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑا ؎

کار مشکل بود ما بر خویش آساں کردہ ایم

جو نامرادیہ دوسرا طریقہ اختیار کرتے ہیں وہ تو راہ کی مشکلوں اور رکاوٹوں سے ناآشنا ہوتے ہیں اور نہ اپنی ناتوانیوں اور درماندگیوں سے بے خبر رہتے ہیں۔ تاہم وہ قدم اٹھا دیتے ہیں، کیونکہ قدم اٹھائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ زمانہ اپنی ساری ناموافقتوں اور بے اعتنائیوں کے ساتھ بار بار ان کے سامنے آتا ہے اور طبیعت کی عاجزی و درماندگیاں قدم قدم پر دامن عزم و ہمت سے الجھنا چاہتی ہیں، تاہم ان کا سفر جاری رہتا ہے۔ وہ زمانے کے پیچھے نہیں چل سکتے تھے لیکن زمانے کے اوپر گذر جا سکتے تھے اور بالآخر بے نیازانہ گذر جاتے ہیں۔"

اس شعر نے میرے دل و دماغ کی دنیا بدل ڈالی اور اگر میں اس مبارک جولائی کو اپنی زندگی کا سرمایہ سمجھوں تو مبالغہ نہ ہوگا کیونکہ مجھے اپنی ذہنی اور شعوری ارتقا کا حال معلوم ہے اور میں دیانتداری سے معترف ہوں کہ یہ شعر میرے لئے ایک نئی زندگی کا پیغام تھا، دعوت عمل تھا، تازیانۂ حرکت تھا۔ اس سے پہلے میں ایک شدید قسم کا فرقہ پرست تھا، تنگ نظر تھا اور رجعت پسندی ہی میں مسلمانوں کی بقا دیکھتا تھا۔ اس سے پہلے میں نے مولانا کی کوئی تصنیف نہیں دیکھی تھی۔ شعر نے دل میں وہ گداز پیدا کر دیا جو دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی ترغیب دلاتا ہے۔ میں نے سوچا کہ صفحۂ قرطاس پر زندگی کے نقوش بکھیرنے والا کسی عظیم شخصیت کا مالک ہے۔ پھر کچھ بعد دیگرے میں نے مولانا کی تمام تصنیفیں پڑھ ڈالیں اور پھر کیا ہوا، بندھن ٹوٹے گتھیاں سلجھیں، تاریکی چھٹی اور زندگی کی صبح طلوع ہوئی، اب راہ صاف دکھائی دینے لگی تھی، اور اگرچہ منزل کا پتہ نہ تھا مگر میں مطمئن تھا کہ سڑک سیدھی ہے اور کوئی کھٹکا نہیں ہے۔ مولانا کے مطالعے سے مجھے جو بصیرت ملی اس نے مجھے ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء کے جذباتی علی گڑھ کی دنیا میں اپنے دل و دماغ کو محفوظ رکھنے کا حوصلہ دیا اور میں نے اس نعرے کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا جس کے تیز دھارے پر پورا علی گڑھ بہا جا رہا تھا۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی ملی اور وہ خواب جو "الہلال" اور "البلاغ" کے صفحات، خطبات اور مکتوبات میں دیکھا اور دکھایا گیا تھا، شرمندۂ تعبیر ہوا۔ گویا ہندوستان کو منزل مل گئی اور قافلہ رک گیا۔ کانگریس کی انقلابی سرگرمیوں کا پھیلاؤ سمٹنے لگا یا یوں کہئے کہ موجیں ساحل پر پہنچ کر منتشر ہونے لگیں۔ انقلاب کے بعد ہندوستان نئے مسائل میں الجھا ہوا ہے۔ مسلمان کی جرأت رندانہ سلب ہو گئی ہے۔ اس کی ذہنی پستی کا یہ عالم ہے کہ اعلیٰ اخلاقی قدروں کو پہچان نہیں سکتا۔ اپنے حقوق اور اپنے فرائض کے حدود میں تمیز نہیں کر سکتا۔ جذبۂ عمل یکسر مفقود ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاموشی سے موت کا منتظر ہے۔ ملک و قوم کے حالات مولانا کو آواز دے رہے ہیں۔ مسلمانوں کی مسجدیں، ممبر اور پلیٹ فارم انھیں پکار رہے ہیں مگر ہر پکار، ہر آواز، ہر چیخ صدا بصحرا ثابت ہوتی ہے اگر یہ صحیح ہے کہ انسان کی زندگی ایک ہوتی ہے اور اپنی وہ زندگی مولانا گذار چکے تو مندرجہ بالا شعر کی تردید ہوتی ہے۔ جو اپنے پیغام اور اپنی روح کے لحاظ سے ابدی معلوم ہوتا ہے اور جس کی پکار قید و زمان و مکان سے آزاد ہے اور شاید یہی آفاقی تصور تھا جو آٹوگراف دیتے وقت مولانا کے سامنے ایک نصب العین کی شکل میں نمودار ہوا تھا۔ ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا اس وقت ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہے۔ نظام عالم ایک نئی تشکیل کا محتاج ہے۔ ان حالات میں مولانا کے سیاسی افکار اس جدید تشکیل میں کہاں تک ممد ہو سکتے ہیں۔ "بازی بعالمے" اور "از سر عالم تواں گذشت" کے لئے ہمیں موجودہ زمانے کی کشمکش کو سمجھنا ہے اور پیچھے مڑ کر دیکھنے کے بجائے آگے دیکھنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ نئے مسائل میں ڈوب کر ابھرنا ہے۔ اپنی "قوت تسخیر" سے کام لینا ہے اور ایک نیا جہان بنانا ہے۔

فاؤسٹ اور اقبال

(بسلسلہ صفحہ ۲)

آدم خاکی نہاد دوں نظر و کم سواد
زاد در آغوش تو پیر شود در حرم

اقبال کا شیطان بھی گوئٹے کے شیطان کی طرح ایک باوقار اور پر عظمت ہستی ہے۔ اسے بھی کمزور انسان سے بیوپار کرنے کا شوق نہیں۔ جاوید نامہ میں نالۂ ابلیس

اے خداوند صواب و ناصواب
من شدم از صحبت آدم خراب
صید خود صیاد را گوید بگیر
الاماں از بندۂ فرماں پذیر
ہیچ گہ از حکم من سر بر نتافت
چشم از خود بست و خود را در نیافت
از چنیں صیدے مرا آزاد کن
طاعت دیروزۂ من یاد کن
پست از و آں ہمت والائے من
وائے من، اے وائے من، اے وائے من
بندۂ صاحب نظر باید مرا
یک حریف پختہ تر باید مرا
آں چناں تنگ از فتوحات آدم
پیش تو بہر مکافات آدم
اے خدا یک زندہ مرد حق پرست
لذتے یابم کہ شاید در شکست

اس کی ہمت بلند اور وسعت نظر کا بین ثبوت ہے۔

خاتمہ کلام پر اس بات کو پھر دہرانا چاہتا ہوں کہ اس مضمون کا مقصد یہ نہیں کہ اقبال کے بعض افکار کے ماخذ کو تلاش کر کے اس کے درجہ کمال میں کوئی کمی پیدا کی جائے، اقبال ان منفکر شاعروں میں سے

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

"روشنی" اور اس کا مصنف

مختار احمد

تیغ کی شاعری اتنی ہی جان دار ہے جتنا اس کا تخلص فرسودہ ہے۔ یہ اس کی شخصیت کا ایک عجیب تضاد ہے جو اس کی روزمرہ زندگی کا ایک پہلو بھی ہے۔ اس کے حلق سے چائے اس وقت تک نہیں اترتی جب تک وہ ٹھنڈا پانی نہ پیتا جائے۔ اس کی سیاسی نظمیں پڑھئے۔ آپ کی نگاہیں اس سیلاب سے دوچار ہوں گی جو گرجتا، گونجتا، چٹانوں اور پہاڑوں سے ٹکراتا، لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جا رہا ہے اور اس کی رومانی نظمیں دیکھئے۔ ان آنسوؤں کی طرف نگاہ اٹھائیے جو ستاروں کے رخساروں سے ڈھلک کر رات کے سینے پر جھلملا رہے ہیں۔

یہ بات عرصے تک میری سمجھ میں نہیں آئی شخصیت دوہری بھی ہو سکتی ہے۔ مگر اتنی متضاد شخصیت! آوارگی اجنبی سڑکوں پر جو شخص بجھے ہوئے چہرے اور جھکی ہوئی آنکھوں سے گمنام آسودگی کی تلاش کرتا ہو، جو شخص اپنے سینے میں ایک بیکراں سناٹے کا گھنگھور اندھیرا لئے کر یونیورسٹی کی سڑکوں پر رات رات بھر "روشنی" کی تلاش میں گھومتا ہو، وہی شخص اتنے سلجھے ہوئے ذہن کا طالب علم اور اتنے عظیم سیاسی آہنگ کا نباض کیوں کر ہو سکتا ہے؟ پہلے مجھے یہ شبہہ ہوا تھا کہ کہیں ایک شکستہ محبت، سیاست سے انتقام تو نہیں لے رہی ہے۔ لیکن پھر میرے لئے یہ چیز معمہ بن گئی کہ تیغ رومانی دور سے گزر کر سیاسی دور میں نہیں آیا وہ اب تک رومانی اور سیاسی دونوں نوع کی نظمیں لکھتا ہے۔

میں ذاتی رموز کا احترام کرتا ہوں لیکن شاید تیغ کو خود اس کی کوئی پروا نہیں۔ لاہور کے رسالے کائنات میں اس نے مختصر سوانح حیات لکھتے ہوئے کہا ہے۔

"میں نے آج تک اپنی نظموں میں کبھی جھوٹ نہیں بولا ...."

یہ بات اگر سچ ہے (اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم اسے سچ نہ سمجھیں) تو آئیے ہم "روشنی" کے مصنف کی ذہنی تاریخ مرتب کریں۔ اگر مصنف نے نظموں کے نیچے ان کی تاریخ لکھ دی ہوتی تو شاید اس ترتیب میں زیادہ آسانی ہوتی۔ لیکن پھر بھی یہ تجزیہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

رومانی نظموں میں سے صرف ایک نظم "جیت" نشاطیہ ہے اور باقی تمام حزنیہ۔ "جیت" کے پہلے چار شعر یہ ہیں:۔

اس کی بے باکیوں میں غصہ تھا
اس کے غصے میں پیار تھا ساتھی
آج اس نو بہار کے رخ پر
کس غضب کا نکھار تھا ساتھی
ایک سرکش امنگ سینے میں
اس طرح اپنا سر اٹھاتی تھی
اس کے نم عارضوں کے سائے میں
اس کی سانسوں کی آنچ آتی تھی

لیکن شاید یہ ناچتا ہوا لمحہ عظیم وقت کی برنائیوں کا دھوکا تھا" اس لئے کہ اور کسی نظم میں اس تاثر کا اشارہ بھی نہیں۔ اس کے بعد انتہائی المیہ نظمیں آتی ہیں ——— "جستجو" "خودکشی" "ایک المیہ کردار سے" "مجھے مرنے دو" "احساس" "خود فروشی" وغیرہ ——— "خود فروشی" میں وہ سب کچھ مل جاتا ہے جس کی ہمیں تلاش تھی

اب اندھیرا ہی اندھیرا میرے سینے میں
روشنی عزم چراغاں کا جگر توڑ گئی
جس پہ رکھ دی تھی محبت نے مہ و خور کی اساس
وہ کرن بھی مرے حالات سے منہ موڑ گئی

....

اور ؎

کس کی جرأت ہے کہ تجدید کا اظہار کرے
ہاں مگر اس سے یہ ادنیٰ سی شکایت ہے ضرور
اک چرائے ہوئے ناپاک تبسم کے عوض
اس نے بیچا ہے سلگتے ہوئے اشکوں کا غرور

.... خود فروشی میں ہی یہ دو شعر بھی ہیں ؎

آج کل حسن بھی ہے دولت و ثروت کا غلام
آج کل عشق بھی جاگیر ہے سرمائے کی

اور ؎

چند مایوس سی چیخوں میں ڈھلے جاتے ہیں
مرے نغمے، مرے آنسو، مری آہیں، امراض

ان اشعار کے یہ معنی نکلتے ہیں:۔

۱۔ شاعر کا محبوب سرمایہ دار طبقے کا فرد ہے۔

۲۔ شاعر اس سے بیشتر کم از کم ایک لمحہ کے لئے اپنے محبوب کی غلط فہمیاں دور کر سکا ہے۔

۳۔ لیکن محبوب نے اس کے سلگتے ہوئے اشکوں کی پروا نہ کرتے ہوئے اسے ٹھکرا دیا ہے۔

۴۔ اور نہ صرف ٹھکرا دیا ہے بلکہ اس کے عوض ایک ناپاک تبسم خرید لیا ہے۔

غزلوں کے یہ شعر سنئے:۔

اس کرے پہ جس پہ سجدے کر چکی تھی زندگی
چھا گئی تھیں موت کی خاموشیاں کل رات کو
کون یہ کہتے دیپک نے کر لاپروائی کر گذرا تھا
اور بھی بڑھنے لگا سناٹا اور بھی گہرے ہو گئے سائے

دنیا سکوں تو میسر ہوا ہو ذرہ ذرہ کی ہے [illegible] تیغ میں
یہ ادا اسے زندگی ہم نہیں کہہ سکیں گے مگر [illegible] زندگی ہو

اس نوجوان عصر ترقی پسند میں
وہ کہنہ بادہ وقت پیالہ ہے آج بھی
سینہ پہ رنگ عام سنبھلتا نہیں ہنوز
نغمہ بہ طرز خاص پریشاں ہے آج بھی

ان اشعار کے بعد شاید اس کی ضرورت نہیں رہتی کہ میں اپنے بیان کے ثبوت میں اور کچھ کہوں ...... اور نہیں مجھے تیغ کے رومانی شعور اور سیاسی آہنگ کا راز معلوم ہوتا ہے۔

اگر میرا خیال غلط ہے تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ لیکن ان نظموں کے مطالعے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایک سرمایہ پرست محبوب سے محبت کا انجام اتنا بھیانک نہ ہوتا تو ہم تیغ سے کسی اچھی سیاسی نظم کی توقع نہیں کر سکتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ تیغ کی بعض سیاسی نظمیں بالکل صفر ہیں۔ "یہ دنیا" "تیور بدلے گئے" "طوفان سے پہلے" "طلسم ٹوٹ گیا" اور "سیاسی مخبر" جیسی عظیم نظموں کے مصنف نے "عزم و عظمت" اور "آزادی کی پہلی سالگرہ" جیسی گھٹیا نظمیں بھی لکھی ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں تیغ نے سیاست سے شکستہ محبت کا انتقام نہیں لیا ہے، اس کی زیادہ تر سیاسی نظموں میں ایک ایسا ذہن جھلکتا ہے جس نے طبقاتی کشمکش کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہے، اسے سوچا اور سمجھا ہے اور اسے اپنے دل کی گہرائیوں میں جگہ دی ہے ———

یہ کہنے کی شاید ضرورت نہیں کہ تیغ صرف اشتراکی ہی نہیں بلکہ مارکسی نظریے کا حامی ہے۔ "الحاد" کا اتنا بے باکانہ اظہار اردو شاعری میں غالباً اب تک ہوا ہے .... جوش ملیح آبادی بھی "خدا" کے متعلق یہی راستہ اختیار کرتے رہے

ع گر ہے تو تعجب جو نہیں ہے تو تعجب

انھوں نے جہاں "نئی حمد" اور "ارتقا" لکھی ہے وہاں "میرا سیدی ہوں عیدی" اور ——— "تمازتِ شادی" "ارکانِ اکائی کے ساتھ" جیسی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ تیغ جوش سے یقیناً متاثر ہیں۔ ان کے یہاں بھی وہی پیارا انداز ہے جو جوش کے کلام میں ہے۔ لیکن اس کے باوجود کافی تنوع اور گہرائی بھی ——— ہم اپنے عقائد کی بنا پر اسے غلط کہہ سکتے ہیں لیکن اس کے خلوص سے انکار نہیں کر سکتے۔

"طلسم ٹوٹ گیا" ایک سیاسی نظم ہے۔ لیکن اس کے پہلے دو بند اسی فلسفے کی ترجمانی کرتے ہیں کہ "سرمایہ داروں نے خدا کے تصور کو استحصال کے لئے ایجاد کیا اور فائدہ اٹھایا۔"

بلندیوں پہ شراروں کی گفتگو سن کر
ستارے کانپ رہے تھے کہ جانے کیا ہوگا
فضا میں گونج اٹھا قہقہہ امارت کا
یہ اہرمن نہ ہلا گر، تو پھر خدا ہوگا

عطا کیا ہے کہ مہر و مہر کے گنبدپچوں سے
بہ صد غرور بہ صد ناز مسکراتا رہا
اسی کے فیض سے دنیا میں مالدار انسان
لہو کے اشک جو اکر گہر بناتا رہا

"اور انسان پیدا ہو گیا" تو بڑے ہنگامے پیدا کر چکی ہے۔ کانپور کی انجمن اتحاد المسلمین نے اس پر فتوے پاس کئے۔ گورکھپور میں تحفظ مسلمین کے اداروں نے شور مچایا، الہ آباد کے "الانصاف" نے لمبے چوڑے مضمون شائع کئے۔ اور ساغر نظامی تک نے لکھا کہ "یہ نظم عہد کے جپ ہے ...... اس کے بعض اشعار میں الحاد تو ہے لیکن اس دور میں اتنی فیصلہ کن باتوں کی کیسے اجازت دی جا سکتی ہے۔" "دنیا" میں اپنی نظم پر ساغر کا یہ ریویو پڑھ کر تیغ نے کہا تھا ——— فیصلہ کرنے کا وقت تو یہی ہے، کل تو سب یہی کہیں گے جو میں آج کہہ رہا ہوں"۔

تیغ کی بعض نظموں میں انانیت ہے۔ یہ انانیت کم موقعوں پر سطحی اور زیادہ تر جگہوں پر بہت لطیف ہے۔ "ایک المیہ کردار سے" کے یہ اشعار سنئے:

مری خودی بھی ہے زخمی تری خودی کی طرح
مرا ضمیر مگر تابناک شعلہ ہے
ترا مزار ہے اینٹوں کا ایک نقش بلند
مرا مزار مرا دل ہے میرا چہرہ ہے

تری نظروں سے غم بیکراں جھلکتا ہے
مری نگاہ غم بیکراں کا ساحل ہے
تجھے بھی کاش مری طرح یہ خبر ہوتی
کہ ضبط فن کے تقاضوں کی پہلی منزل ہے

جو زہر پی نہ سکا تو حیات سے ڈر کے
وہ زہر اب بھی بدستور پی رہا ہوں میں
شدید کرب میں تجھے تو خودکشی کر لی
شدید تر غم ہستی میں جی رہا ہوں میں

تیغ کی آواز میں جھنجلاہٹ اور نعرے نہیں ہیں بلکہ اس میں خلاقانہ ٹھہراؤ کے ساتھ ساتھ ستاروں کی خنکی ہے۔ اس کی مشہور نظم "روشنی" کی تابناک کرنیں اس کا بہترین ثبوت ہیں:

میری ہمدم مرے خوابوں کی سنہری تعبیر
مسکرا دے کہ مرے گھر میں اجالا ہو جائے

عجیب سی بات ہے کہ جس کلام میں سسکتی ہوئی جوانیوں، بلکتے ہوئے بچوں اور فاقہ زدہ انسانوں کی اصلی حالت کا ذکر ہو اسے پروپاگنڈا کہہ دیا جاتا ——— اور جو شاعر گردوپیش کے حالات سے منہ موڑ کر اپنی ایک الگ سی دنیا بساتا ہے۔ اسے ادب و آرٹ کا خدا قرار دیتے ہیں ——— اس کے جواب میں، میں تیغ ہی کا وہ جملہ جو اس نے ساغر کے ریویو کو دیکھ کر کہا تھا یہاں دہراؤں گا ——— "کل تو سب یہی کہیں گے جو میں آج کہہ رہا ہوں ——— لیکن آج؟"

چالیس کے بعد ورزش کیسی؟

(بہ سلسلہ صفحہ ۱۱)

"یہ غلط فہمی عام طور پر پھیل گئی ہے کہ موٹے آدمی کو اپنا وزن کم کرنے کے لئے زیادہ دیر تک سخت ورزش کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک خواہ مخواہ مرد آدمی رات کو ڈٹ کر کھانا کھاتے تھے، سگار جلا کر منہ میں رکھتے تھے اور فرماتے تھے "میں کچھ موٹا ہو گیا ہوں ذرا ٹہل آؤں تاکہ زائد غذا تحلیل ہو جائے۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اس زاید غذا کے تحلیل ہونے کے لئے کوئی ۲۰ میل چلنے کی ضرورت ہے۔

آخر میں بس اتنی بات کہنی ہے کہ اگر آپ کو محض اعصاب کو سکون دینے کے لئے ورزش کرنے کا خیال آئے تو جا کر تھوڑی دیر پلنگ پر چپ چاپ لیٹ جایئے اور جب تک یہ خیال دل سے دور نہ ہو جائے لیٹے رہیے

(ماخوذ)

تہذیب کی صبح

(بہ سلسلہ صفحہ ۶)

تو جب وہ ذرا بڑے اور چیتے ہوتے تھے اُن کی ہڈی سے جانوروں کی کھالوں سے چربی اتارا کرتا تھا جو ٹکڑے پتلے اور لمبے ہوتے تھے ان سے کھالوں میں سوراخ کر کے انھیں ایک دوسرے سے باندھ دیتا۔ اب تو وہ بہت ٹھاٹھ سے رہنے لگا۔ کیونکہ وہ کپڑے بھی پہننے لگا۔ چاہے وہ کھال کے ہی ہوتے تھے اور جگہ جگہ کھال کے پتلے پتلے فیتوں سے بندھے ہوتے تھے پتھر کے جو ٹکڑے سب سے تیز اور عمدہ ہوتے تھے اُن سے وہ تیر کی نوک بناتا تھا اور پھر یہ نوک ایک پتلی سی لکڑی میں لگا کر وہ تیر بنانا سیکھ گیا۔ اور اس کے بعد رفتہ رفتہ اُسے کمان کے ذریعے تیر چلانا بھی آ گیا۔ اب اُسے کھانا تلاش کرنے میں اتنی دقت نہ ہوتی تھی۔ کیونکہ اس کے پاس اب تیر کمان موجود تھے۔ اور وہ جب چاہتا جانوروں کو مار کر ان کا گوشت مزے سے کھا لیا کرتا تھا اگر بڑے جانور جیسے شیر یا چیتا اُسے ستانے کی کوشش کرتے تو وہ جھٹ اپنا تیر کمان نکال کر ان پر تیر چلاتا جانوروں کے لئے یہ ایک نئی چیز تھی، چوٹ کھا کر وہ چیختے چنگھاڑتے ہوئے بھاگتے اور اسے اکیلا چھوڑ جایا کرتے تھے۔ ان باتوں کو اگر کوئی بڑی بوڑھی سُن لیں تو کہیں یہ بھی خاک پتھر زمانہ تھا کہ جو چیز دیکھو پتھر کی۔ چاقو پتھر کے، کلہاڑیاں پتھر کی، تیر کمان پتھر کے، ہر چیز پتھر کی۔ اسی لئے ہم تاریخ میں اس زمانے کو پتھر کا زمانہ کہتے ہیں۔

جب ہم دفتر کے کام پر سے لوٹتے ہیں تو ہمارا کتنا دل چاہتا ہے کہ ہم تھوڑی بہت تفریح کریں کھیلیں، کودیں، سنیما جائیں یا ریڈیو میں اچھے اچھے گانے یا مزے مزے کی کہانیاں سنیں۔ اتنے پرانے زمانے میں ان چیزوں کا تو ذکر ہی کیا۔ انسان کو روٹی تک مشکل نصیب نہ ہوتی تھی۔ لیکن پھر بھی جب اسے کوئی کام کرنے کو نہ ہوتا تو وہ تفریح بھی کیا کرتا تھا اور کسی طرح سے اپنا دل بہلاتا تھا۔ اس نے پتھر کی باریک باریک سوئیاں بنا رکھی تھیں۔ ان سوئیوں کی مدد سے وہ اپنے محل کو سجایا کرتا تھا یعنی اپنے تنگ اور تاریک غاروں کی چھتیں اور صاف دیواروں پر طرح طرح کی شکلیں بنایا کرتا تھا۔ یہ ایسے ہیں کہ ایک رنگی تصویر بنانا بہت آسان ہوتا ہے۔ یک رنگی تصویر تو ہم بھی بہت آسانی سے بنا سکتے ہیں لیکن ہماری طرح اس کے پاس پنسلیں اور برش نہ تھے اور نہ قلم نہ کاغذ نہ رنگ اس لئے وہ اپنی پتھر کی سوئیوں سے فرصت میں بیٹھ کر جانوروں کی تصویریں کھودا کرتا تھا۔ یہ شکلیں بعض غاروں میں آج تک موجود ہیں یہ بڑی بھدی اور بھونڈی ہیں اور کوئی انھیں اگر دیکھے تو نہ معلوم کتنا ہنسے۔ لیکن زیادہ ہنسنا ٹھیک نہیں ہے اور نہیں اس انسان کا زیادہ مذاق نہ اڑانا چاہیئے۔ کیونکہ ذرا یہ بھی سوچیے کہ یہی انسان ہمارا سب کا دادا تھا۔

تو ہمارے یہ عجیب و غریب دادا جان بڑے چالاک بھی تھے۔ آپ نے یہ تو سن لیا کہ خونخوار جانوروں سے جان بچانے کے لئے کبھی تو وہ ڈر کے مارے پیڑ پر چڑھ جایا کرتا تھا۔ ذرا سمجھ آئی تو پتھر پھینک کر مارنے لگا۔ اس کے بعد تیر کمان سے ڈرانے لگا۔ مگر اس کے دقیانوسی تیر کمان سے بھلا شیر چیتے کیا قابو میں آتے ہوں گے۔ اس لئے وہ ان کے مارنے کے لئے ایک عجیب ترکیب کرتا تھا۔ وہ یہ کہ کسی وقت جب اُسے کوئی ڈر نہ ہوتا تو اطمینان سے بیٹھ کر ایک گہرا سا گڑھا کھود ڈالتا۔ اس گڑھے کے اوپر بہت معمولی اور کمزور ٹہنیاں رکھتا۔ ان ٹہنیوں پر گھاس پھوس پھیلا دیتا، ایسے کہ یہ معلوم نہ ہو کہ یہاں بھی کوئی کھلا تھا۔ جانور غریب بھلا ان چالاکیوں کو کیا جانیں ایسے نہ ہوں تو انھیں جانور کون کہے۔ وہ تیر کھا کر غصے میں اس گڑھے پر سے گذرتے۔ جوں ہی اس پر پہنچتے، دھڑام سے اندر۔ پھر اوپر کھڑے کھڑے وہ خوب ہنستا، قہقہے لگاتا۔ اپنی زبان میں خوشی کے گیت گاتا، اور نہ معلوم کیا کیا کرتا ہوگا اور اوپر سے اس غریب جانور کی اتنی مرمت کی جاتی کہ وہ بے چارہ ساری چوکڑی بھول جاتا۔ اور ساری عمر کا کھایا پیا اگل دیتا۔ اس زمانے میں ایک جانور ہوتا تھا جسے میمتھ کہتے ہیں۔ یہ جانور بڑا ہی خوفناک تھا۔ ڈیل ڈول میں ہاتھی سے بھی زیادہ اس کے مارنے کے لئے انسان نے اسی قسم کے جال تیار کئے تھے، اس جانور کے پھنسنے کا حال ہمیں غاروں کی اک بھدی اور پیچیدہ تصویر سے ہی ہوا ہے۔

یہ سب باتیں اس زمانے کی ہیں جب تہذیب کا دن نکلنا بس شروع ہی ہوا تھا۔ صبح کا وقت سہانا ہوتا ہے کہ تہذیب کی کہانی بھی اتنی ہی دلچسپ تھی۔